کی سلسلے وار مقبول ترین کہانی

ابتدائیہ

فرہاد علی تیمور کی "دیوتا" کتابی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ڈائجسٹوں کی تاریخ کی یہ طویل ترین کہانی ہے۔

یہ فروری ۷۷ء میں شروع ہوئی اور آج بھی جاری ہے۔ قارئین کی بے انتہا فرمائش تھی کہ "دیوتا" کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ تاکہ لاکھوں قارئین اس کہانی کا شروع سے لطف اٹھا سکیں۔ اس سلسلے میں سسپنس ڈائجسٹ کو ہزاروں خطوط ہر ماہ موصول ہوتے ہیں۔

کسی بھی کہانی کو کتابی شکل میں شائع کرنا مشکل ترین کام ہے۔ جس میں سب سے زیادہ دقت طلب مسئلہ قسطیں جمع کرنے کا ہوتا ہے۔ کیونکہ پرانے رسالے جمع کرنا ایک دشوار ترین مرحلہ ہے۔ اور خصوصاً سسپنس ڈائجسٹ تو روزِ اوّل سے جتنا چھپتا تھا۔ اس سے زیادہ ہی اس کی مانگ رہتی تھی۔ نتیجتاً اس کی آفس فائل کی کاپیاں تک غائب ہو گئیں۔

میں اپنے بھائی اور دوست معراج رسُول مدیر سسپنس ڈائجسٹ کا مشکور ہوں کہ انہوں نے نہ صرف تمام قسطیں جمع کر کے دیں بلکہ میرے پیچھے دن رات لگ کر اس کو مکمل بھی کرایا۔ قارئین کو بھی اس سلسلے میں ادارہ سسپنس ڈائجسٹ کا مشکور ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ کتاب اس بات کا ثبوت ہے کہ سسپنس کو اپنے قارئین کا کتنا خیال ہے۔

چونکہ یہ کہانی انتہائی طویل ہے اور اب تک تقریباً ڈائجسٹ سائز کے ۲۰۰۰ صفحات پر چھپ چکی ہے اور ہنوز جاری ہے۔ اس لیے اس کہانی کو مختلف حصّوں میں شائع کیا جا رہا ہے تاکہ قارئین اس کو آسانی سے حاصل کر سکیں اور ان کی جیب پر ایکدم بوجھ نہ پڑے۔ فی الحال اس کہانی کے پانچ حصّے ترتیب دیے جا چکے ہیں۔ جو کہ علیحدہ علیحدہ شائع کیے جا رہے ہیں۔

آپ کا تعاون اگر حاصل رہا تو سسپنس اور جاسُوسی کے دیگر مقبول سلسلے بھی اس کے بعد پیش کیے جائیں گے۔ اس سلسلے میں آپ کو جو کہانی بھی مطلوب ہو اس کے لیے ہمیں خط لکھیں تاکہ جب وہ کتاب تیار ہو جائے تو ہم براہِ راست آپ کو مطلع کر سکیں۔

غلام کبریا

میرا نام فرہاد علی تیمور ہے۔ میرے والد تیمور علی شاہ کوٹ تحصیل و ضلع شیخوپورہ کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ ہماری زمینیں پانچ سو ایکڑ رقبے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اناج کی فراوانی، مال و زر کی افراط اور زندگی کا ہر عیش و آرام ہمیں میسر تھا۔ اس کے باوجود میں ایسا بدنصیب تھا کہ مجھے اپنی ماں کا دودھ نصیب نہ ہوا۔ میرے پیدا ہوتے ہی وہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ جب میں چھ برس کا ہوا تو میرے والد بھی اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے اور میں اتنی بڑی دنیا میں تنہا رہ گیا۔ تنہائی سے مراد یہ نہیں ہے کہ میرے دیگر عزیز و اقارب نہیں تھے۔ سب ہی تھے۔ مگر اس کم عمری میں، میں ان کا محتاج بن گیا تھا۔

میرے چچا ناصر علی شہری زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ زراعت اور زمینداری سے انھیں دلچسپی نہیں تھی۔ وہ میرے والد کو ایک پسماندہ دیہاتی سمجھ کر دُور کی صاحب سلامت رکھتے تھے۔ لیکن ان کے فوت ہوتے ہی وہ پانچ سو ایکڑ اراضی پر قابض ہونے کے لیے شاہ کوٹ آگئے۔ میں ناسمجھ بچہ تھا۔ اپنے گھر اور پنڈ کے باہر کی دُنیا کو نہیں جانتا تھا۔ جب انھوں نے پیار سے مجھے گود میں اٹھایا اور بیٹا کہہ کر سینے سے لگایا تو میرے ننھے سے دل میں اور میری چھوٹی سی دُنیا میں باپ کی جو کمی تھی وہ پوری ہوگئی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ رشتے دار محبت کے نام پر کس طرح فریب دیتے ہیں۔ انھوں نے زمین، جائداد کے تمام کاغذات اپنی تحویل میں لیے اور وہ زمینیں دوسروں کو ٹھیکے پر دے کر مجھے اپنی انگلی پکڑائی اور لاہور لے آئے۔

وہ کسی کی انگلی پکڑ کر زندگی گزارنے کا پہلا موقع تھا۔ میں کسی کا محتاج نہیں تھا لیکن چھوٹی سی عمر میں محتاج بن کر رہنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ مال روڈ پر چچا کی ایک چھوٹی سی دکان تھی جسے وہ بڑھا رہے تھے کیونکہ والد مرحوم کی دولت اب انھیں بہت بڑا تاجر بنا رہی تھی۔ پہلے جین مندر کے قریب تین کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان تھا مگر اب وہاں دو منزلہ کوٹھی بن رہی تھی۔ اس گھر کا ماحول میرے مزاج کے خلاف تھا۔ چچی مجھ سے نفرت کرتی تھیں۔ بات بات پر جاہل گنوار کہہ کر دھتکارتی رہتی تھیں۔ ان کے بچے بھی ان کے نقشِ قدم پر چلتے تھے۔ کھیل کود کے دوران مجھے یوں دھتکارتے جیسے کوئی نیچ ذات کا لڑکا ان کے قریب آگیا ہو۔

چچا ناصر علی کے صاحبزادے کا نام ظہیر علی تھا۔ وہ مجھ سے دو سال بڑا تھا مگر قد و قامت کے لحاظ سے میرے سامنے مچھر تھا۔ وہ ہمیشہ دھینگا مشتی کرتا رہتا تھا۔ میں نے کئی بار اس کی پٹائی کی تھی لیکن اسے اپنی شکست کا احساس اس لیے نہیں ہوتا تھا کہ چچی انتقاماً میری پٹائی کر دیتی تھیں۔

ان کی بڑی صاحبزادی کا نام عزرا تھا۔ وہ مجھ سے تین سال بڑی تھی۔۔ اپنی ماں کی طرح مغرور اور بدمزاج تھی۔ خدا نے حُسن دیا تھا اور چھوٹی سی عمر میں نزاکت بھی وہی تھی۔ کبھی اس کے سر میں درد ہوتا تھا کبھی پیروں میں — اور مجھے اس کے پاؤں دابنے پڑتے تھے۔ اگر انکار کرتا تو مجھے ڈانٹ ڈپٹ کر سمجھایا جاتا کہ میں چھوٹا بھائی ہوں اور بڑی بہن کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔

اسی لحاظ سے ایک چھوٹی بہن تھی۔ اس کا نام شاہینہ تھا۔ وہ ابھی گود کی بچی تھی۔ ماں کی گود سے زیادہ مجھ پر لدی رہتی تھی۔ اس کے لیے یہ سمجھایا جاتا تھا کہ میں بڑا بھائی ہوں اور چھوٹی بہن کو تمام دن گود میں اٹھائے پھرنا بھی میرے فرائض میں شامل ہے۔ اگرچہ چچا جان میری دولت اور جائداد پر سانپ بن کر بیٹھے تھے تاہم وہ اکثر میری حمایت کرتے تھے۔ انھوں نے ایک دن اپنی بیگم سے کہا:

"میں نے تمھیں ہزار بار سمجھایا ہے کہ فرہاد کو ملازم نہ سمجھو۔ بیٹے کی طرح لاڈ پیار سے رکھو۔ اگر وہ بدک کر اپنی پھوپھی کے ہاں چلا گیا تو زمینوں کی آمدنی بھی اس کے ساتھ چلی جائے گی۔"

میں دروازے کے باہر فرش پر بیٹھا اسکول کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا اور ان کی باتیں بھی سُن رہا تھا۔ چچی نے جواب دیا:

"میں کب چاہتی ہوں کہ لڑکا یہاں سے جائے مگر کیا کروں، اس کی آنکھیں دیکھ کر وحشت سی ہوتی ہے۔ آپ نے شاید غور نہیں کیا۔ کبھی غور سے دیکھیے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ہے۔ وہ میری طرف دیکھتا ہے تو میں ٹھٹھک سی جاتی

ہوں۔ میں سچ کہتی ہوں' اس کے اندر کوئی بدرُوح گھُسی ہُوئی ہے۔"

چچی کی باتیں سن کر میں اپنی آنکھوں کو چھُو کر دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کیا واقعی میرے اندر کوئی بدرُوح گھُسی ہوئی ہے ——؟ اس وقت مجھے اپنے والدِ مرحوم کی باتیں یاد آئیں۔ ایک بار انھوں نے کہا تھا:

"میرے بیٹے کی آنکھوں میں قدرتی چمک ہے، فرشتوں کا نُور ہے۔ یہ اپنے مخاطب کا دل موہ لیا کرے گا۔"

والدِ مرحوم کے محبت آمیز اور چچی کے نفرت انگیز قیاسات میرے کچّے دماغ میں گڈمڈ ہونے لگے۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں آیا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ مجھے اپنی آنکھیں بہت اچھی اور بہت ہی پُرکشش نظر آئیں۔ آئینے کے سامنے عورت ہو یا مرد سب ہی خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ میری آنکھوں میں نیکی اور محبت کی چمک ہے یا بدی اور نفرت کی چنگاریاں ——؟

حقیقت جو کچھ بھی ہو، ویسے یہ سوچ کر خوشی ہو رہی تھی کہ چچی میری آنکھوں سے ڈرتی ہیں۔ وہ مجھ سے بڑی تھیں۔ مجھے گالیاں دیتیں تو میں جواباً گالیاں نہیں دے سکتا تھا۔ وہ مجھے مارتیں تو میں پلٹ کر ان پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ مگر قدرتی طور پر مجھے ایک ایسا ہتھیار مل گیا تھا جس سے میں انھیں ڈرا سکتا تھا۔ میرے دماغ میں جو بات آئی، میں اسی پر عمل کرنے لگا۔ اب اکثر یُوں ہونے لگا کہ جب بھی چچی سے سامنا ہوتا تو میں انھیں تیز چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیتا —— وہ دہشت زدہ سی ہو کر مجھے گالیاں دینے لگتیں۔ کبھی میری اچھی طرح پٹائی کر دیتیں۔ ایسے وقت میں نے یہی دیکھا کہ وہ میری آنکھوں میں نہیں دیکھتی تھیں۔ مجھے گالیاں دیتے وقت مجھ سے نظریں چُراتی رہتی تھیں۔ کبھی مارنے سے پہلے میرا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے سے مجھے دُوسری طرف گھُما دیتی تھیں تاکہ میرا منہ دوسری طرف ہو جائے اور میں انھیں اپنی آنکھوں سے وحشت زدہ نہ کر سکوں۔ کئی بار انھوں نے بڑی بڑی قسمیں کھائیں کہ وہ میری آنکھیں پھوڑ ڈالیں گی۔

یوں ہمارے درمیان نفرتیں پروان چڑھ رہی تھیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ میں اس ماحول سے نفرت اور عداوت کا درس لے رہا تھا —— چچی کی گالیاں۔ چچا جان کی دوغلی محبت، ظہیر کی عداوت اور غزالہ کا تحکمانہ انداز۔ یہ تمام جیتے جاگتے نفرت انگیز عناصر میرے اندر لاوے کی طرح پکتے رہتے تھے۔ ہاں اس جہنم میں صرف ایک محبت کرنے والی ہستی تھی اور وہ تھی ننھی شاہینہ۔ ان دنوں وہ سات برس کی تھی اور میں بارہ برس کا تھا۔ چچی اسے بھی سمجھاتی تھیں کہ وہ میرے ساتھ نہ کھیلا کرے مگر جب وہ بالشت بھر کی تھی جب ہی سے میری گود میں کھیلتی آئی تھی۔ مجھ سے اتنی مانوس ہو گئی تھی کہ اپنی ماں، بہن اور بھائی کے روکنے ٹوکنے پر بھی میرے پاس چلی آتی تھی۔ جب وہ ننھی ننھی باہیں میری گردن میں ڈال کر مجھے بھائی جان کہتی تو میں اس بے غرض اور پاکیزہ محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اسے چومنے لگتا۔ بس وہی میری ایک بہن تھی، میری دُنیا تھی اور میری زندگی تھی۔

ان ہی دنوں کی بات ہے۔ ایک رات چچا جان کاروبار کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ غزالہ اور ظہیر اپنے ننہال میں تھے۔ شاہینہ میرے بستر پر آ کر لیٹ گئی تھی۔ چچی نے بھی اس رات بڑی فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ شاہینہ میرے پاس سوئے گی۔ وہ اجازت دے کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ میں رات گئے تک شاہینہ کو پریوں اور شہزادوں کی کہانیاں سناتا رہا۔ وہ معصوم بچی کہانیاں سنتے سنتے سو گئی۔ نیند کی حالت میں وہ زیادہ معصوم لگ رہی تھی۔ میں نے اس کی پیشانی کو محبت سے چومتے ہوئے سوچا کہ میری شاہینہ آرام دہ پلنگ پر سونے کی عادی ہے اور میں فرش پر سوتا ہوں۔ وہ محض اس لیے آرام سے سو گئی تھی کہ وہ ایک بھائی کا بستر تھا لیکن میں چاہتا تھا کہ میری بہن ہمیشہ پھولوں کی سیج پر سوئے۔ میں وہاں سے اُٹھ کر چچی کے کمرے کی طرف جانے لگا تاکہ ان سے کہہ دوں کہ وہ شاہینہ کو اٹھا کر اس کے بستر پر لے جائیں۔

چچی کی خوابگاہ کا دروازہ اور کھڑکیاں بند تھیں۔ میں نے بے دھڑک دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔ چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر چچی کی آواز سنائی دی:

"کون ہے؟ فرہاد کیا تم ہو؟"

"جی ہاں، شاہینہ سو گئی ہے۔ اسے اٹھا کر لے جائیے۔"

"اسے سونے دو۔ میں بعد میں آ کر اسے لے جاؤں گی۔ تم میری نیند خراب نہ کرو۔"

"چچی، آپ نیند میں رہیں گی اور وہ بے چاری فرش پر پڑی رہے گی۔"

"گدھا کہیں کا۔" ان کی غصّہ بھری آواز سنائی دی "جب دیکھو بحث کرنے پر تُل جاتا ہے۔ جا —— بھاگ جا یہاں سے —— نہیں تو جوتے لگاؤں گی۔"

میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ضدی ہوں۔ میں وہیں کھڑا رہا اور دروازے کو گھورتا رہا۔ اگر وہ دروازہ کھلا ہوتا تو میں خود ہی شاہینہ کو اٹھا کر لے جاتا اور چچی کے پاس سلا دیتا۔ مگر چچی ایسی بدمزاج تھیں کہ اٹھ کر دروازہ تک نہیں کھول رہی تھیں۔

نہ جانے میں کتنی دیر تک اس دروازے کو گھورتا رہا۔ پھر مجھے دروازے کے پیچھے سے دھیمی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ وہ کسی مرد کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہا تھا:

"ڈارلنگ! تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ وہ لڑکا چلا گیا ہے۔"

"نہیں، تم نہیں جانتے۔" چچی کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی "مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے اس کی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ کتنی ہی بار میں نے خواب میں اس کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ وہ کسی انسان کا بچہ نہیں ہے۔ شیطان کا بچہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

میں نے اپنی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے۔ اس وقت مجھے احساس ہُوا کہ میں بہت دیر سے دروازے کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہوں اور خیالی نظروں سے چچی کے بند کمرے کی تاریکی میں بھٹک رہا ہوں۔ اور اپنی نظروں سے پوچھ رہا ہوں کہ آپ دروازہ کیوں نہیں کھولتیں؟

وہ دروازہ ذرا سا کھل گیا۔ ان کے کمرے میں واقعی تاریکی تھی۔ کاریڈور کی روشنی میں مجھے صرف ان کا چہرہ اور شانے نظر آئے۔ پھر انھوں نے یہ کہہ کر ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا کہ تم جاؤ میں آ رہی ہوں۔

میں سر جھکا کر کاریڈور سے چلتا ہُوا اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ اس وقت میرے کچے ذہن میں یہ بات پک رہی تھی کہ چچی کے کمرے میں کون شخص ہے اور کیوں ہے؟ وہ واقعہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ کسی حد تک سمجھنے کی کوشش بھی کی، تو

دماغ پر دھند سی چھا گئی۔ کچھ سمجھنے اور نہ سمجھنے کے درمیان الجھ گیا۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ چچی کا گھبرانا، کمرے کی تاریکی اور ایک اجنبی مرد کی آواز ان سب میں ایسی اسراریت تھی کہ ان کے متعلق سوچتے سوچتے میری عمر غیر محسوس طریقے سے جوانی کی طرف کروٹ بدلنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد چچی میرے کمرے میں آئیں۔ انھوں نے مجھے غصّے سے دیکھا پھر شاہینہ کو میرے بستر سے اٹھانے کے لیے جھک گئیں۔ اسی وقت میں نے پوچھا:

"کیا آپ سے کوئی ملنے آیا ہے؟"

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگیں۔ ذرا دیر کے لیے ان پر گھبراہٹ طاری ہوئی۔ پھر وہ سنبھل کر میری جانب بڑھتی ہوئی بولیں:

"اتنی رات کو کون ملنے آئے گا؟ کیا تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے؟"

"میں نے آپ کے کمرے میں کسی کی آواز سنی تھی۔ اس لیے میں پوچھ رہا......"

بات پوری ہونے سے پہلے ہی انہوں نے میرے منہ پر تھپڑ جما دیا۔ پھر میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے بولیں:

"تو نے کس کی آواز سنی تھی؟ وہ تیرا کوئی باپ ہوگا —— میرے سامنے کا چھوکرا اور مجھے اتنی بڑی بات کہہ رہا ہے —— میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ چل بتا کون ہے میرے کمرے میں —— کون تیری ماں کا یار ہے جس کی آواز تو نے سنی ہے......"

میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا کر کہا:

"خبردار —— میری ماں کا نام نہ لینا۔ ورنہ میں لحاظ نہیں کروں گا۔" میں ڈٹ کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میرا وہ چیلنج ایسا تھا کہ وہ قدرے حیرانی سے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھنے لگیں۔ میں بارہ برس کا تھا مگر قد میں ان کے برابر ہو گیا تھا۔ شاید پہلی بار وہ میرے اونچے قد کو توجہ سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر وہ پیچھے ہٹ کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے بولیں:

"لو دیکھو —— یہاں کوئی نہیں ہے —— تمھیں دھوکا ہُوا ہے۔ تم نے کسی کی آواز نہیں سنی ہے۔"

"میں نے سنی ہے۔" میں پاؤں پٹختا ہُوا کمرے کے اندر چلا گیا اور چاروں طرف اس شخص کو تلاش کرنے لگا۔ اتنی دیر میں چچی واپس جا کر شاہینہ کو لے آئی تھیں۔ اسے بستر پر سلاتے ہوئے انھوں نے کہا:

"کیا ابھی تک تسلی نہیں ہوتی ہے؟ جاؤ یہاں سے۔ دفع ہو جاؤ۔ کم بخت اونٹ کی طرح لمبا ہو رہا ہے۔ مارتی ہوں تو میرے ہی ہاتھ دکھنے لگتے ہیں۔ اچھی بات ہے تمہارے چچا کو آنے دو۔ وہی تمہاری خبر لیں گے۔"

میں لاپرواہی سے "اونہہ" کہتا ہُوا اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔ مگر مجھے فوراً ہی نیند نہیں آئی۔ میں دیر تک اس شخص کے متعلق سوچتا رہا جس کی آواز میں نے سنی تھی مگر وہ نظر نہیں آیا تھا۔ شاید چچی نے اسے جگا دیا تھا یا کہیں چھپا دیا تھا۔ میں ان کی مکاری کو نہ سمجھ سکا۔

رات کو دیر سے آنکھ لگی تھی اس لیے صبح دیر تک سوتا رہا۔ پھر چچا جان کی گرجدار آواز سن کر ہی میری آنکھ کھلی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ غصّے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہہ رہے تھے:

"نمک حرام! جس تھالی میں کھاتا ہے، اسی میں چھید کرتا ہے۔ کیا اسی دن کے لیے میں تیری پرورش کر رہا ہوں؟"

میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سوالیہ نظروں سے انہیں تکنے لگا۔ چچی نے ہاتھ نچا کر کہا:

"اے ہے کیسی معصوم سی صورت بنا کر اپنے چچا جان کو دیکھ رہا ہے۔ جیسے کچھ جانتا ہی نہیں۔ ذلیل کمینے۔ اسی دن کے لیے میں شاہینہ کو تیرے پاس آنے سے روکتی رہتی تھی......"

"تم چپ رہو بیگم ——!" چچا جان نے کہا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے "کیوں بے، کل رات تو نے شاہینہ کو پیار کیا تھا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا "جی ہاں!"

یہ جواب سنتے ہی چچا جان نے ایک زور کا طمانچہ میرے منہ پر رسید کیا۔ میں اپنا توازن نہ سنبھال سکا، بستر پر گر پڑا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ چھوٹی بہن کو پیار کرنا جرم ہے۔ لیکن اس طمانچے نے بہن بھائی کے مقدس رشتے میں کھوٹ پیدا کر دیا۔

انھوں نے میرا گریبان پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا:

"تو اتنا نڈر ہو گیا ہے کہ غلطی بھی کرتا ہے اور بے حیائی سے اعتراف بھی کرتا ہے۔ بول تُو نے کیوں پیار کیا تھا؟"

انھوں نے دوسرا طمانچہ رسید کیا۔ میں نے روتے ہوئے کہا:

"آپ مجھے کیوں مار رہے ہیں؟ میں تو روز ہی شاہینہ کو پیار کرتا ہوں۔"

چچی نے جلدی سے کہا:

"اور روز ہی اس معصوم بچی کو گندی گندی حرکتیں سکھاتا ہے۔ اگر کل رات میں دیکھ نہ لیتی تو۔ ۔ ۔" وہ گندی حرکتوں کی تفصیلات بیان کرنے لگیں۔ میں حیرانی سے آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے ان کا منہ تک رہا تھا۔ مجھ پر ایسی باتیں منکشف ہو رہی تھیں، جنہیں میں پہلے نہیں جانتا تھا۔ لیکن وہ گھناؤنی باتیں مجھ سے منسوب کی جا رہی تھیں۔ صرف اتنا ہی نہیں، مجھ پر اچھے خاصے الزامات عاید کرنے کے بعد چچی جان نے اپنے بچاؤ کے لیے کہا:

"یہ لڑکا وقت سے پہلے سیانا ہو گیا ہے۔ جب میں نے ایسی گندی حرکتیں دیکھنے کے بعد اسے دھمکی دی کہ میں تمھارے چچا جان سے شکایت کروں گی تو جانتے ہیں اس نے کیا کہا؟ اس نے مجھے بھی دھمکی دی۔ کہنے لگا، چچا جان آئیں گے تو میں تو کہوں گا کہ چچی کے کمرے میں کل رات کوئی آدمی آیا تھا۔ ہائے ہائے یہ بات سننے سے پہلے میں مر کیوں نہ گئی۔ آپ نے کبھی میرے متعلق ایسا سوچا بھی نہ ہوگا۔ مگر اس حرامی نے کیسی کیسی باتیں کہہ دیں۔ میں تو اس گھر میں اب ایک منٹ بھی نہیں رہوں گی...."

یہ باتیں سن کر چچا جان آگ پر رکھے ہوئے لوہے کی طرح تپ گئے تھے۔ انھوں نے ہاتھوں سے، لاتوں سے اور گھونسوں سے اس قدر مجھے مارا تھا کہ میرے جسم کی ہڈی ہڈی دُکھنے لگی تھی۔ وہ مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ اپنی چچی کے قدموں پر گر کر معافی مانگو ورنہ وہ مجھے ننگا کر کے گھر سے نکال دیں گے، اور شاہینہ کو تو اب کبھی میرے قریب پھٹکنے نہیں دیں گے۔

میں بھی ایک ضدی تھا۔ میں مار کھاتے کھاتے مر جانا پسند کر رہا تھا لیکن چچی کے ناپاک قدموں کو چھو کر معافی مانگنا گوارا نہیں کر رہا تھا۔ چچا جان مجھے مارتے مارتے بے حال ہو گئے۔ وہ مجھے کھینچتے ہوئے اپنے کمرے کے قریب لائے اور وہاں ایک اسٹور روم میں مجھے بند کر دیا۔ پہلے انھوں نے دھمکی دی تھی کہ چچی سے معافی نہ مانگنے کی صورت میں وہ مجھے گھر سے نکال دیں گے۔ لیکن وہ مجھے اپنی نظروں سے دور نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں اس بات کا اندیشہ تھا کہ میں اپنی پھوپھی کے پاس چلا جاؤں گا۔ پھر ان کی شہ پا کر زمین و جائیداد کے کاغذات کا مطالبہ کروں گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مار پیٹ سے میرے دل میں دہشت بٹھا کر مجھے اپنے زیرِ اثر رکھنا چاہتے تھے۔

انہوں نے مجھے اسٹور میں بند کرنے کے بعد صبح سے شام تک بھوکا پیاسا رکھا۔ میں نے کئی بار دروازے کو پیٹ پیٹ کر فریاد کی۔ جواب میں صرف ایک بار مجھے شاہینہ کی آواز سنائی دی۔ وہ دوسری طرف سے دروازے کو پیٹ پیٹ کر مجھے پکار رہی تھی۔ لیکن اسی وقت اس کے ماں باپ کی آواز سنائی دی۔ چچی اسے جھڑکتی ہوئی وہاں سے لے گئیں۔ تھوڑی دیر بعد چچا جان نے دروازہ کھول دیا۔

صبح سے شام تک بھوکا رہنے کے باعث میری ضدی طبیعت ذرا مضمحل سی ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود میں بھوکا پیاسا اس گھر سے چلا جاتا۔ لیکن شاہینہ کی محبت نے میرے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔ پھر یہ کہ چچا جان بھی نرم پڑ گئے تھے۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ مجھے اپنے ساتھ ڈائننگ روم میں لے گئے۔ وہاں شاہینہ اپنی ممی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دوڑ کر آئی اور بھائی جان کہتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ میرے جی میں آیا کہ اسے محبت سے چوم لوں مگر مجھے طمانچے یاد آ گئے۔

آہ — ان طمانچوں نے کیسی غیریت پیدا کر دی تھی۔ شاہینہ کچھ پرائی پرائی سی لگ رہی تھی۔ چچا جان ہم دونوں کو گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اسی وقت چچی نے شاہینہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا اور اسے وہاں سے لے جانے لگیں۔ وہ میرے پاس آنے کے لئے چیختی چلاتی رہی۔ لیکن وہ اسے گھسیٹتی ہوئی لے گئیں۔

میں بے بسی سے سر جھکا کر چچا جان کے ساتھ کھانے کی میز پر آ گیا۔ ملازم میز پر کھانا چن رہا تھا۔ جب وہ چلا گیا تو چچا جان نے نرم لہجے میں کہا۔

"فرہاد — میں ہمیشہ تجھے بیٹا بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ کیا شاہینہ تجھے بہت اچھی لگتی ہے؟"

"جی ہاں۔" میں نے خلوصِ دل سے جواب دیا۔

"اچھی بات ہے، میں شاہینہ سے تمہاری شادی کر دوں گا۔"

میں نے چونک کر سر اٹھایا اور انہیں حیرانی سے دیکھنے لگا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ شاہینہ سے میری شادی بھی ہو سکتی ہے۔ میرے سامنے شاہینہ ہوتی یا کوئی دوسری لڑکی ہوتی۔ اس عمر میں، میں بہن کے سوا کسی دوسرے رشتے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن چچا جان سوچ رہے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بیٹی کی رشوت دے کر مجھے اپنے قابو میں رکھنا چاہتے تھے۔

"شاہینہ میری بہن ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔"

چچا جان نے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"اسے بہن کہہ کر اپنی گندی ذہنیت کو نہ چھپاؤ۔ تمہارے اور شاہینہ کے متعلق کیا فیصلہ کرنا چاہیئے، یہ میں بہتر سمجھتا ہوں۔ خاندان میں جتنی لڑکیاں ہوتی ہیں، وہ شادی سے پہلے بہن ہوتی ہیں۔ ان میں سے اگر کسی سے شادی ہو جائے تو وہ بیوی بن جاتی ہے — تم مجھ سے بحث نہ کرو، چپ چاپ کھانا کھاؤ۔"

میں نے بھی بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

دوسرے دن شاہینہ کو اس کے نانا نانی کے ہاں بھیج دیا گیا۔ وہ اپنے ماں باپ کے لئے دردِ سر بن گئی تھی۔ میرے سوا کسی کے پاس رہنا نہیں چاہتی تھی۔ لہٰذا اسے ایک طویل مدت کے لئے مجھ سے دور کر دیا گیا۔ یہ سب چچی کے مشورے پر ہوا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ شاہینہ ابھی بچی ہے۔ جیسے جیسے اس کی عمر گزرتی جائے گی، وہ مجھ سے دور رہ کر مجھے بھولتی جائے گی۔ پھر میری شریکِ حیات بنانے کے لئے چچی اسے اپنے طور پر ٹریننگ دیں گی کہ شاہینہ بیوی بننے کے بعد کس طرح مجھے یہاں گھر داماد بن کر رہنے پر مجبور کرے گی۔

اس وقت میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ شاہینہ مجھ سے دور رہ کر مجھے یاد کرتی ہے یا نہیں — لیکن میں اکثر تنہائی میں اسے یاد کرتا تھا اور گھنٹوں ایک جگہ بیٹھ کر ان نفرتوں کے متعلق سوچتا تھا، جو مجھے اس گھر سے مل رہی تھیں۔ چچا جان کہتے تھے کہ میں دوسرے بچوں سے مختلف ہوں۔ جہاں بیٹھتا ہوں، وہیں بیٹھا رہ جاتا ہوں۔ جس چیز کو دیکھتا ہوں اسے پوری توجہ سے یوں دیکھتا رہ جاتا ہوں جیسے اس چیز کو نگاہوں کے ذریعے اپنے اندر جذب کر رہا ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ میں کند ذہن اور غبی ہوں۔ شاید تعلیم حاصل نہیں کر سکوں گا۔ یہی سوچ کر انہوں نے اپنے بچوں کو ہائی سوسائٹی کے انگلش اسکول میں داخل کرایا تھا اور مجھے متوسط طبقے کے ایک ہائی اسکول میں پڑھنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔

اونچی مسند پر بیٹھ کر پڑھا جائے یا فرش پر — مقامات مختلف ہوتے ہیں لیکن مقصد ایک ہوتا ہے کہ تعلیم حاصل کی جائے — تعلیم کے دوران میری ذہانت چمکنے لگی۔ میں جو کسی چیز کو پوری توجہ سے دیکھتے رہنے کا عادی تھا۔ وہ عادت علم کے حصول میں کام آ گئی۔ میں جس سبق کو ایک بار توجہ سے پڑھتا تھا، وہ ہمیشہ کے لئے ذہن نشین ہو جاتا تھا۔ مجھ پر نام رکھنے والے چچا جان کی اولاد کند ذہن اور غبی ثابت ہونے لگی اور میں ہر سال امتحانات میں اول آنے لگا۔

شاہینہ اپنے نانا کے ہاں رہنے کے لئے پنڈی گئی تو وہیں کی ہو کر رہ گئی۔ پانچ سال کے بعد وہ ایک دن کے لئے لاہور آئی تھی لیکن اُس دن میں دوستوں کے ساتھ چھانگا مانگا چلا گیا تھا۔ چچی کو ایک ہفتہ پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ میں ایک دن کے لئے لاہور سے باہر جا رہا ہوں۔ شاید اسی لئے انہوں نے شاہینہ کو صبح سے شام تک کے لئے بلا لیا تھا۔ پھر شام ہونے سے پہلے ہی اسے اس کے ماموں کے ساتھ رخصت کر دیا۔ جب مجھے اس کی آمد و رخصت کا علم ہوا تو دل کو ایک ہلکی سی ٹھیس پہنچی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ چچی کی سازش کامیاب ہو گئی ہے۔ وہ مجھے بھول چکی ہے۔ اب وہ آئندہ میری زندگی میں آئے گی تو اس کا ایک نیا روپ ہوگا، نیا ڈھنگ ہوگا۔ وہ بچپن کی شاہینہ مر چکی ہوگی۔

تین سال اور گزر گئے۔ میں نے دسویں جماعت کا امتحان دیا۔ اور جب نتیجہ نکلا تو میں صوبے بھر میں اول آیا تھا۔ غزالہ اور ظہیر تھرڈ ڈویژن میں آئے تھے۔ انہیں تعلیم سے زیادہ ہائی سوسائٹی میں وقت گزارنے سے دلچسپی تھی۔ میرے والد کی زمینوں سے حاصل ہونے والی آمدنی کی بدولت وہ شاہانہ زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے پاس گھومنے پھرنے کے لئے کاریں تھیں اور میں سائیکل چلاتا تھا۔ ان کا معیارِ زندگی جتنا بلند تھا، اتنے ہی ان کے اخراجات بھی تھے۔ غزالہ اور ظہیر ہمیشہ دولتمند گھرانوں کے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ تفریحی پروگرام بناتے رہتے تھے اور مجھے یوں نظر انداز کر دیتے تھے جیسے میں ان کے گھر کا کوئی ملازم ہوں۔

لیکن بڑھتی ہوئی عمر کی مناسبت سے میرے چہرے کے نقوش اور قد و قامت سے اب ایسا مردانہ وقار جھلک رہا تھا کہ ظہیر کی زنانہ شخصیت میرے سامنے پھیکی پڑ گئی تھی۔ میں نے بارہا محسوس کیا تھا کہ اس کے ساتھ گھومنے پھرنے والی لڑکیاں مجھے عجیب لگن سے دیکھتی ہیں۔ کوٹھی کے پائیں باغ میں ایک بیڈمنٹن کورٹ بنایا گیا تھا۔ ایک شام میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ ظہیر کی ایک گرل فرینڈ نے مجھے آواز دی۔

"ہیلو فرہاد — آؤ میرے ساتھ ایک گیم کھیلو۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "لڑکیوں کے ساتھ کھیل کر ہارنا اور جیتنا ایک برابر ہے۔"

"وہ کیسے؟" اُس نے حیرانی سے پوچھا۔ اس کے ساتھ دوسری لڑکیاں بھی پوچھنے لگیں۔ "ہاں ہاں بتاؤ، تمہاری اس بات کا مطلب کیا ہے؟"

"مطلب یہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "کہ لڑکی کو خوش کرنے کے لئے ہار جاؤ تو مرد کی توہین ہوتی ہے اور اگر جیت جاؤ تو لڑکی ناراض ہو جاتی ہے۔"

"واہ — یہ تو فضول سی منطق ہے۔" ایک لڑکی نے گردن جھٹک کر کہا۔

"منطق نہیں ہے۔" ظہیر نے طنز کیا۔ "دراصل یہ پینڈو ہے، اسے بیڈمنٹن کھیلنا نہیں آتا۔ یہ صرف گلی ڈنڈا کھیلنا جانتا ہے۔"

اس کے ساتھ کھڑی ہوئی لڑکی اس طنز پر قہقہہ لگانے لگی۔ میں نے قریب آ کر غصے سے کہا۔ "میں تمہارا سر بھی توڑنا جانتا ہوں۔"

وہ اپنی توہین کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریکٹ کھینچ کر مجھے مارا۔ میں نے بایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اب پتہ نہیں ریکٹ کچھ کمزور تھا یا میری کلائی میں فولاد کی سختی تھی کہ کلائی سے ٹکراتے ہی ریکٹ ٹوٹ گیا۔ وہاں کتنی ہی لڑکیوں کے منہ سے حیرت بھری "ہائے" نکل گئی۔ نازک اندام لڑکوں کے درمیان رہنے والی ان لڑکیوں کی نظروں میں، میں اس وقت ایک ہرکولیس سے کم نہ تھا۔

میں نے بائیں ہاتھ سے ڈھال کا کام لیکر دائیں ہاتھ سے ایک مکا ظہیر کی ناک پر ٹھونک دیا۔ اس کے دو ساتھی مجھ پر جھپٹ پڑے۔ ایک کو میں نے بغل میں دبایا اور کولہے پر رکھ کر دوسری طرف پھینک دیا۔ دوسرے کو میں نے گھونسوں پر رکھ لیا — غزالہ کے بوائے فرینڈ بھی اپنی مردانگی دکھانے آئے۔ اگر وہ ایک ساتھ پل پڑتے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت میری پوزیشن کیا ہوتی۔ مگر وہ یکے بعد دیگرے ذرا سوچ سوچ کر آ رہے تھے۔ ظہیر ایک گھونسے میں بیکار ہو گیا تھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ فوراً ہی چکرا کر بے ہوش ہو جائے۔

کچھ لڑکیاں چیختی ہوئی دور بھاگ گئی تھیں۔ کچھ ایسی تھیں جو ذرا پرے ہو کر بڑی دلچسپی سے میرے لڑنے کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ غزالہ ایک طرف کھڑی ہوئی بڑی خاموشی سے کبھی مجھے اور کبھی اپنے بوائے فرینڈ قیصر کو دیکھ رہی تھی۔ ایک وہی تھا جو غزالہ کے سامنے اپنی شکست تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بڑی جی داری سے لڑ رہا تھا اور بڑی بے حیائی سے مار کھا رہا تھا۔

لڑکیوں کی چیخ و پکار سن کر چچی دوڑتی ہوئی کوٹھی سے باہر آ گئیں۔ ان کے ساتھ دو ملازم بھی آئے۔ ملازموں نے سب سے پہلے ظہیر کو سنبھالا کیونکہ وہ ان کے مالک کا لاڈلا بیٹا تھا۔ چچی مجھے کوسنے اور گالیاں دینے لگیں۔

"کمینے — بدذات — میرا کھاتا ہے اور میرے بچے پر ہاتھ اٹھاتا ہے — آج تیرے چچا سے کہہ کر تجھے دھکے دے کر یہاں سے نہ نکالا تو میرا نام شمشاد بیگم نہیں — غنڈہ — لچا — لفنگا......"

اب میں بچہ نہیں تھا۔ مجھے اپنی پھوپھی سے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ سب میری دولت پر عیش کر رہے ہیں۔ اس لئے اُس روز میں شیر بن گیا تھا، میں نے کہا۔

"یہ کوٹھی میرے ابا جان کے پیسوں سے خریدی گئی ہے، آپ کے اچھے بھی مجھے یہاں سے نہیں نکال سکتے — آنے دیجئے چچا جان کو — میں بھی آج اپنی زمین جائیداد کا فیصلہ کروں گا۔"

یہ کہہ کر میں کوئی جواب سنے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے جانے لگا۔ ملازم ظہیر کو اٹھا کر پچھلے دروازے سے کوٹھی میں داخل ہو رہے تھے۔ میں کوٹھی کے اگلے حصے کی طرف جانے لگا۔ وہاں پورچ میں ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ کوٹھی کا چوکیدار ٹیکسی کی ڈِگی سے سامان نکال کر اندر لے جا رہا تھا اور ایک نوجوان لڑکی اپنا پرس کھول کر ٹیکسی کا کرایہ ادا کر رہی تھی۔

میں ایک لمحے کے لئے ٹھٹک گیا۔ وہ بھی مجھے دیکھنے لگی۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ وہ کس قدر حسین تھی۔ یہاں جتنی لڑکیاں آتی تھیں، ان میں سب سے حسین لڑکی غزالہ تھی۔ لیکن اس اجنبی لڑکی کے سامنے غزالہ کا حسن بھی ماند

پڑجاتا۔ میں نے دل میں کہا ــــ اونہہ، یہ بھی ان بڑے لوگوں کی کوئی رشتے دار ہے ــــ میں ناگواری سے آگے بڑھتا ہوا اس کے قریب سے گزرنے لگا۔ اسی وقت اس کی مترنم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"بھائی جان!"

میں ایکدم سے اچھل پڑا۔ ایکدم سے وقت اچھل کر آٹھ برس پیچھے چلا گیا۔ میری شاہینہ زندہ ہو گئی۔

ٹیکسی پورچ سے رینگتی ہوئی جا رہی تھی۔ وہ آگے بڑھتی ہوئی حیرانی سے بولی۔ "بھائی جان! آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟ میں شاہینہ ہوں۔"

میری آنکھیں خوشی سے بھیگنے ہی والی تھیں۔ میں نے اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر کہا۔

"میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ اتنی بڑی دنیا میں مجھ سے محبت کرنے والی ایک ہی ہستی ہے اور وہ تم ہو۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ تم مجھے بھول چکی ہو۔"

اس نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے پریوں اور شہزادوں کی وہ تمام کہانیاں یاد ہیں جو آپ سنایا کرتے تھے۔ یہاں سے پنڈی تک آپ کی برائیاں ہوتی ہیں۔ مگر میں جانتی ہوں کہ آپ کیا ہیں۔ میرا سارا بچپن آپ کی گود میں گزرا ہے۔ ایک بوڑھی ملازمہ نے بتایا تھا کہ ممی مجھے دودھ نہیں پلاتی تھیں، آپ مجھے فیڈر سے پلایا کرتے تھے۔ آپ ہی میری ماں ہیں، میرے باپ ہیں اور میرے بھائی ہیں۔ میں آپ کو کیسے بھول سکتی ہوں۔"

میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ نفرتوں کے اس تاریک جہنم میں ایک ایسی پاکیزہ محبت کی کرن پھوٹ پڑی تھی کہ میں خود کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھنے لگا تھا۔ میں نے فرطِ محبت سے جھک کر اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ اسی وقت چچی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔

"ارے رے ــــ بے حیا ــــ بے شرم، یہ کیا کر رہا ہے۔ خدا تجھے غارت کرے۔ نہ جانے کب تیرا جنازہ یہاں سے نکلے گا ــــ جا اپنی کسی بہن کو پیار کر۔ میری بیٹی ایسی ویسی نہیں ہے۔"

"میں اپنی بہن ہی کو پیار کر رہا ہوں۔"

میرے پیار کی پاکیزگی کو وہ نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی آئیں اور شاہینہ کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں پہلے ہی سمجھا چکی ہوں کہ اس لڑکے کی آنکھوں میں شیطان ہے، یہ تمہارا دل اپنی طرف کھینچ لیتا ہے مگر تم سمجھتی ہی نہیں ــــ سامان اندر بھجوا دیا اور یہاں کھڑی اس کے فریب میں آ رہی ہو۔ چلو یہاں سے ــــ"

شاہینہ مجھے بے بسی سے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں ــــ تم جاؤ ــــ ہماری تقدیر میں اسی طرح ملنا اور بچھڑنا ہے، لہٰذا ہم پھر ملیں گے۔"

وہ طوعاً و کرہاً اپنی ماں کے ساتھ کوٹھی کے اندر چلی گئی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ چچا جان کے آنے تک میں باہر وقت گزاروں گا کیونکہ وہاں رہنے سے چچی خواہ مخواہ باتیں سناتیں اور مجھ سے برداشت نہ ہوتا۔ میں بھی انہیں الٹی سیدھی سنا دیتا۔ لیکن اب میں ان کو محض اس لئے طرح دے رہا تھا کہ شاہینہ آ گئی تھی۔ وہ میری بہن تھی اور میں اس کے سامنے اس کی ماں سے لڑنا جھگڑنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ لہٰذا میں وہاں سے چلا گیا۔

چچا رات کے نو بجے تک گھر آ جاتے تھے۔ میں دس بجے کوٹھی میں پہنچا۔ تاکہ چچی پہلے اپنی سنا دیں پھر میں سناؤں گا۔ میں چچا کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ ظہیر کے کمرے کے قریب سے گزرتے وقت میں نے ان کی آواز سنی، وہ چچی سے کہہ رہے تھے۔

"بیگم! تم خواہ مخواہ اپنے بیٹے کی حمایت نہ کرو۔ میں فرہاد کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ظہیر کو نہیں چھیڑتا بلکہ ظہیر اسے چھیڑتا رہتا ہے۔ میں کئی بار دیکھ چکا ہوں کہ یہ کسی نہ کسی بہانے اس کی انسلٹ کرتا رہتا ہے۔ میں نے ہزار بار سمجھایا ہے کہ اگر تم سب اس سے محبت نہیں کر سکتے ہو تو نہ کرو، مگر نفرت بھی نہ کرو۔ کیا تم چاہتی ہو کہ وہ یہاں سے چلا جائے؟"

چچی نے جواب دیا۔ "میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ آپ کی بہن اسے بہکا رہی ہے۔ وہ اپنی پھوپھی کی باتوں میں آ رہا ہے۔ ابھی شام کو کہہ گیا ہے کہ یہ کوٹھی اس کے باپ کے پیسوں سے خریدی گئی ہے۔ آپ اسے کلیجے سے لگا کر رکھنا چاہتے ہیں اور وہ گرمی دکھا گیا ہے کہ آج آپ سے زمین جائیداد کا حساب کرے گا۔"

"ہوں ــــ!" چچا کی "ہوں" بڑی معنی خیز تھی۔ انہوں نے کہا۔ "آپا اسے بہکا رہی ہیں مگر وہ میرے سامنے کا بچہ ہے۔ ابھی نادان ہے، میں اسے سمجھا لوں گا۔ تم اپنے بیٹے کو سمجھاؤ کہ اس کے منہ نہ لگے۔ یہ بھول جاؤ کہ اس نے ظہیر پر ہاتھ چھوڑا ہے۔ دودھ دینے والی گائے کی لات کھانی ہی پڑتی ہے۔"

میں باہر کھڑا سوچ رہا تھا کہ مجھے کمرے میں جانا چاہیئے یا نہیں؟ اسی وقت چچا باہر آ گئے۔ مجھے دروازے کے سامنے کھڑا دیکھ کر پہلے تو ٹھٹھک گئے۔ پھر انہوں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگے۔ میں خاموشی سے ان کے پیچھے چلنے لگا۔ کمرے میں پہنچ کر انہوں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"میں بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ تمہیں دوست اور دشمن کی پہچان کراؤں ــــ تمہاری پھوپھی تمہیں بہکا رہی ہیں۔ وہ اپنی بیٹی زرینہ کی شادی تم سے کرنا چاہتی ہیں۔ اس کے لئے وہ جھوٹ بول رہی ہیں کہ شاہ کوٹ کی زمینیں تمہارے ابا مرحوم کی تھیں۔ جب تمہارے ابا مرحوم کا انتقال ہوا تم اس وقت چھ برس کے تھے۔ زمین جائیداد کے معاملات کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ ورنہ تمہارے ابا تمہیں بتا دیتے کہ وہ زمینیں دراصل میری ہیں اور میں نے انہیں ٹھیکے پر کاشتکاری کے لئے دی تھیں۔"

"چچا جان!" میں نے کہا۔ "صرف پھوپھی ہی نہیں، دوسرے رشتے دار بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ زمینیں میرے ابا جان کی ہیں۔"

انہوں نے اپنی الماری کھول کر چند کاغذات نکالے اور انہیں میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تم جاہل نہیں ہو، پڑھنا لکھنا جانتے ہو۔ زمینوں کے جو کاغذات میرے نام پر ہیں یہ اُن ہی کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں ہیں۔ ان میں باقاعدہ عدالت کے فیصلوں کی مہر لگی ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ ٹھیکے داری کا معاہدہ بھی ہے اور تمہارے ابا جان کے دستخط بھی موجود ہیں۔"

میں وہ فوٹو اسٹیٹ کاپیاں لیکر غور سے پڑھنے لگا۔ وہ پاکستان بننے سے قبل برٹش گورنمنٹ کے عدالتی کاغذات تھے اور یہ تصدیق کر رہے تھے کہ میرے چچا ناصر علی، شاہ کوٹ کی زمینوں کے مالک ہیں ــــ لیکن میں ان کاغذات کی صداقت پر یقین نہ کر سکا۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد کتنے ہی جعلسازوں نے ایسے ہتھکنڈے کئے تھے۔ دوسروں کی زمینوں پر اپنی ملکیت ثابت کرنے کے لئے جعلی کاغذات تیار کئے تھے۔ کتنے ہی جعلساز قانونی گرفت میں آ گئے تھے اور چچا کی طرح کتنے ہی ایسے تھے جو عیش کر رہے تھے۔ اگر ابا مرحوم کے کاغذات میرے پاس ہوتے تو ابھی میں ان کے فریب کا پول کھول دیتا ــــ میں نے ان فضول سے کاغذات کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

"صرف آدمیوں کی زبان جھوٹ نہیں بولتی، کاغذات بھی جھوٹ بولتے اور فریب دیتے ہیں۔"

وہ غصہ دکھاتے ہوئے بولے۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہو۔ میں نے ایک باپ بن کر تمہیں بچپن سے پالا، تمہیں تعلیم دلائی اور تم میری محبت اور احسانات کا یہ صلہ دے رہے ہو۔ ان کاغذات کو جھٹلا کر مجھے جھوٹا اور فریبی کہہ رہے ہو۔ اور یہ صرف اس لئے کہ تمہاری پھوپھی نے تمہیں زمین جائیداد کے خواب دکھا کر تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ وہ محترمہ اتنی ہی ہمدرد ہیں تو جاؤ ــــ ان سے جا کر کہو کہ مجھے عدالت میں چیلنج کریں۔ وہاں سچ اور جھوٹ کا فیصلہ ہو جائے گا ــــ مگر وہ کیا مقدمہ لڑیں گی۔ تین وقت کا کھانا پوری طرح نصیب نہیں ہوتا ہے، دو چار پیشیاں بھگتنے کے بعد ہی فاقوں کی نوبت آ جائے گی ــــ ذرا عقل سے کام لو فرہاد! یہ رشتے دار تمہیں بہکا کر اس کوٹھی سے نکلوا سکتے ہیں مگر وہ محبت اور خلوص نہیں دے سکتے جو میں دے رہا ہوں۔"

میں ان کی محبت اور خلوص سے متاثر نہ ہو سکا اور مزید کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے چلا آیا۔ میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ دوسرے دن شاہ کوٹ جاؤں گا اور وہاں کے پٹواری سے حقیقت معلوم کروں گا۔ کیونکہ پٹواریوں کے پاس تمام زمینوں اور زمینداروں کی ملکیت کے ریکارڈز موجود رہتے ہیں وہیں سے جھوٹ سچ کا پتہ چل جائے گا۔

میں اپنے کمرے میں آ کر ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ملازم نے آ کر کہا۔

"بی بی جی آپ کو بلا رہی ہیں۔"

گھر کے ملازم غزالہ کو بی بی جی کہا کرتے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ آج میں نے اس کے بوائے فرینڈ کا حلیہ بگاڑ دیا ہے اس لیے وہ بھی اپنی ماں کی طرح مجھے باتیں سنانا چاہتی ہے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ نہ جاؤں خواہ مخواہ بات بڑھے گی۔ وہ ایک کہے گی تو میں دس سناؤں گا۔ پھر میرے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ دل میں نفرت تھی اور یہ نفرت عداوت میں بدلنے والی تھی۔ میں یہی چاہتا تھا کہ وہاں عزت سے رہوں یا پھر لڑ جھگڑ کر نکل جاؤں۔

میں اس کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ آج کچھ ہونے والا ہے۔ مگر میں بزدل نہیں تھا کہ ایک لڑکی کا سامنا کرنے سے کترا جاتا۔ میں اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ میں اسے دیکھتے ہی ٹھٹھک گیا۔

وہ اپنے چہرے کو ایک بازو میں چھپائے ہوئے لیٹی تھی، دروازہ کھلنے پر اس نے ذرا سا ہاتھ ہٹا کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کا خمار تھا۔ ان دنوں میں بیس برس کا نوجوان تھا۔ عورت کو اس کی آنکھوں سے پہچاننے کا تجربہ نہیں تھا میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں نادان تھا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس دور میں دس برس کے بچے بھی ذہنی عیاشی کا کورس پڑھنا اور سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں بھی نادان نہیں تھا مگر شیطان بھی نہیں تھا۔ اس حد تک معصوم تھا کہ غزالہ کی خمار آلود آنکھوں کو دیکھ کر میں نے اسے نیند کا خمار سمجھا۔

وہ بڑی سنجیدگی سے بولی۔

"آؤ۔ دروازہ آہستگی سے بند کرو۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

میں نے دروازہ بند کیا اور پلنگ کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے بوائے فرینڈ کا نام لے کر کہا۔

"میں نے قیصر کو مارا ہے اور درد تمہارے سر میں ہو رہا ہے۔"

"تم مجھے طعنے نہ دو۔ بزدل ہمیشہ مار کھاتے ہیں۔ مجھے قیصر سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ آج تمہاری دلیری دیکھ کر میرے سوچنے کا انداز بدل گیا ہے۔"

میں سمجھنا چاہتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میری نظریں بہک گئیں۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہہ رہی تھی اپنے بدن کے نشیب و فراز سے پکار رہی تھی۔

مجھے خاموش دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا اس کوٹھی میں تم مالک کی حیثیت سے نہیں رہنا چاہتے؟"

میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"میں صرف اس کوٹھی کا ہی نہیں شاہ کوٹ کی زمینوں کا بھی مالک ہوں۔ اس کا فیصلہ بہت جلد ہو جائے گا۔"

وہ ہنسنے لگی اور ہنستے ہنستے کہنے لگی۔

"فیصلہ اتنا ہی آسان ہوتا تو تم اس طرح محتاجی کی زندگی نہ گزارتے۔ تم ایک ایک زینہ چڑھنے کی بجائے چھلانگ لگا کر تمام زمین جائیداد کے مالک بن جانا چاہتے ہو۔ اس طرح تم میرے ڈیڈی کے دشمن بن سکتے ہو مگر کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ میں تمہاری دشمن نہیں ہوں فرہاد! میں تمہارے کام آنا چاہتی ہوں

اگر تم میرا ساتھ دو گے تو میں تمھیں ڈیڈی سے بہت کچھ حاصل کرنے کے طریقے سیکھا دوں گی۔"

"وہ طریقے کیا ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے لیٹے ہی لیٹے اپنا ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"پہلے دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ۔"

ایک مغرور اور بد دماغ لڑکی جو سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی، وہ دوستی کا ہاتھ بڑھا رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر دشمنی کی بجائے دوستی سے کام بنتا ہے تو ضرور بنانا چاہیے۔

میں نے دوستی کے خیال سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے بڑی گرمجوشی سے میرے ہاتھ کو کھینچ لیا۔ اپنی ملائم ہتھیلی اور انگلیوں کی نزاکت میں جکڑ لیا

وہ مصافحہ طویل ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ نہایت آہستگی سے اشارتی انداز میں میرے ہاتھ کو اپنی طرف مائل کر رہی ہے جس طرح ہلکے جھٹکے سے پتنگ کو ہوا کی آغوش میں سنبھالا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ مصافحہ کے جھٹکے سے مجھے سنبھال کر اور سنبھل کر بلا رہی تھی۔

میں سمجھ رہا تھا اور انجان بنا ایک خاموش بت کی طرح کھڑا رہا۔ آخر اسے زبان سے کہنا پڑا۔

"آؤ۔ یہاں بیٹھو۔ آج ہم بہت سی باتیں کریں گے۔ ہم ایک دوسرے کے دوست بن کر اپنے مستقبل کا پروگرام بنائیں گے۔"

وہ مجھے قریب بیٹھنے کی دعوت دے رہی تھی۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ شاید وہ اندر سے بھی کانپ رہی تھی۔ میں پلنگ کے سرے پر بیٹھ گیا میرا ہاتھ اب تک اس کی گرفت میں تھا۔ اس نے کہا

"تم کیسے پہاڑ ہو گئے ہو۔ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہو مگر میں تم سے چھوٹی نظر آ رہی ہوں۔ اور میں کون سی بڑی ہوں، تین برس کا فرق تو کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مرد اسی کو کہتے ہیں، جس کے ڈیل ڈول کے آگے عورت کی عمر چھپ جائے۔ مجھے چھپاؤ....."

میں عجیب الجھن میں پڑ گیا۔ اگرچہ وہ جوان اور بے حد حسین تھی مگر مجھ سے عمر میں بڑی تھی۔ میں نے کبھی اس انداز سے نہیں سوچا تھا جیسے وہ سوچ رہی تھی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"یہ..... یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"انجان نہ بنو فرہاد! ہائے، تمھارے نام میں کتنی رومانیت ہے۔ کیا مجھے دیکھ کر، میرے قریب آ کر تمھارا دل نہیں دھڑک رہا ہے۔

"یہ..... یہ بری بات ہے۔"

مجھے بہکتے دیکھ کر وہ اٹھ گئی۔ پھر مجھے سمجھانے لگی۔

"بری بات یہ ہے کہ تم مجھ سے کترا رہے ہو۔ کیا میں جوان نہیں ہوں، کیا میں حسین نہیں ہوں؟ مجھ میں کوئی کمی ہے بتاؤ؟"

"مم..... میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم کس طریقہ سے مجھے میرا حق دلاؤ گی؟"

"تم سے شادی کر کے۔"

"شادی؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم مجھ سے بڑی ہو۔ چچا چچی راضی نہیں ہوں گے۔"

"کیسے راضی نہیں ہوں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ تم بھی بھکاری ہی ہو۔ ایک دن ڈیڈی کہہ رہے تھے کہ شاہینہ کی شادی تم سے کر دیں گے اور تمھیں گھر داماد بنا کر رکھیں گے۔ تاکہ کوئی تمھیں زمینوں کے سلسلے میں بہکانے کے لیے یہاں سے نہ لے جائے۔ مگر میں ڈیڈی کا ارادہ بدل دوں گی۔ میں ان سے کہہ دوں گی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے جیون ساتھی بننا چاہتے ہیں۔ ڈیڈی اعتراض نہیں کریں گے۔ وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ تمھیں گھر داماد بنا کر رکھیں۔"

وہ باتوں کے دوران میرے دائیں سے بائیں مچل رہی تھی حد ہو گئی تھی ایسے موقعہ پر تو فرشتے بھی بہک جاتے۔ میں بھی بہک جاتا۔ مگر وہ گھر داماد والی بات میری خودداری پر ایک ہتھوڑے کی طرح لگی۔ جب تک میں ناسمجھ لڑکا تھا، وہ لوگ مجھ سے ملازموں جیسا برتاؤ کرتے رہے۔ اب وہ سمجھ رہے تھے کہ میں تعلیم حاصل کرتے ہی ان کے ہاتھ سے نکل جاؤں گا۔ لہٰذا وہ اپنی بیٹی کے آنچل سے باندھ کر رکھنا چاہتے تھے۔ وہ جہاندیدہ تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ مجھ جیسے جوان کو ان کی جوان بیٹی ہی باندھ کر رکھ سکتی ہے۔

میں ان کی مکاری اور چالبازی پر غصہ سے کھول گیا۔ میں نے غزالہ کی گداز باہوں کو دونوں ہاتھ سے تھام کر اسے اپنے سے الگ کیا۔ ایک نظر اس کی سلگتی ہوئی جوانی کو دیکھا اور فیصلہ کیا۔ اگر آج میں اس بدن کی لذت سے آشنا ہو گیا تو ایک بار پھر یہاں غلام بن کر رہ جاؤں گا۔ عورت کا نشہ بار بار مجھے پکارے گا اور میں بار بار بہکتا چلا جاؤں گا۔ چچا کی مثال میرے سامنے تھی۔ وہ اپنی مستقل مزاجی کے باوجود چچی کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ غزالہ نے بھی اپنی ماں سے بہت کچھ سیکھا ہو گا۔ ابھی تو وہ جسم کے دسترخوان پر اپنی جوانی کا ذائقہ پیش کر رہی تھی۔ اس کے بعد نہ جانے کیسی کیسی ادائیں اور کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کرنے والی تھی۔

میں نے فیصلہ کیا اور اسے پرے دھکیل کر وہاں سے اٹھ گیا۔ پھر اسے حقارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں ایسا احمق نہیں ہوں کہ تم سے شادی کروں اور یہاں غلام بن کر رہ جاؤں۔"

غزالہ کو اس کے والدین نے کبھی پھول کی چھڑی سے نہیں مارا تھا۔

اور میں نے بڑی حقارت سے اسے دھکیل دیا تھا۔ وہ بستر پر چاروں شانے چت ہو گئی تھی، پہلے چند ساعت کے لیے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ توہین کے احساس سے تلملائی، مجھے غرا کر دیکھا۔ مگر دیکھتے ہی جیسے پھر جذبات سے سلگ اٹھی۔ وہ عجیب کیفیات سے دوچار تھی۔ توہین کا احساس بھی تھا، غصہ بھی تھا اور میرے بازوؤں میں مچلنے کی دیوانگی بھی تھی میں آگ لگا رہا تھا اور میں ہی اس کی آگ بجھا سکتا تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھی۔ میں پلٹ کر جانے لگا۔ وہ دوڑتی ہوئی میرے سامنے آئی اور راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

"تم نہیں جا سکتے۔ تم کیسے پتھر ہو؟ تم مجھے کیوں نہیں؟ میں تمھیں غلام نہیں بنانا چاہتی۔ تمھیں اپنا بنانا چاہتی ہوں۔ تم شادی نہیں کرنا چاہتے، کوئی سودے بازی پسند نہیں کرتے، نہ کرو مگر میری بات کو سمجھو میں تمھیں نہیں جانے دوں گی۔"

"چھوڑو مجھے۔ میں تمھارے فریب میں آ کر اپنا مستقبل برباد نہیں کر سکتا۔ دور ہٹو....."

میں نے پھر اسے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے گئی اس بار توہین کا احساس اس پر غالب آ گیا۔ وہ جھلا کر چیخنے لگی۔

"سور۔ کمینے۔ میں تمھارا منہ نوچ لوں گی۔ تمھیں جان سے مار ڈالوں گی مگر تمھیں جانے نہیں دوں گی۔"

وہ میرا منہ نوچنے کے لیے اچھل کر میری طرف آئی۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ وہ لانبے اور نوکیلے ناخن نیل پالش کی سرخی میں نہائے ہوئے تھے اور اب میرے خون کی سرخی میں ڈوبنا چاہتے تھے۔ شاید لڑکیاں اسی لیے ناخن بڑھا کر رکھتی ہیں کہ بوقت ضرورت ان سے منہ نوچنے کا کام لیا جائے۔

میں اسے روک رہا تھا اور وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح بار بار مجھ پر جھپٹ رہی تھی ساتھ ہی چیختی بھی جا رہی تھی۔

"تم..... تم ذلیل..... کمینے..... ہمارا جھوٹا کھانے والے..... تم مجھے ٹھکرا رہے ہو۔ بڑے بڑے رئیس زادے میرے تلوے چاٹتے ہیں۔ تم بھی یہی کرو گے۔ ورنہ میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔ لیکن یہ توہین برداشت نہیں کروں گی۔ مجھ سے معافی مانگو۔ میں سلگ رہی ہوں، میں جل رہی ہوں۔ میری آگ بجھاؤ ورنہ میں تمھیں جلا کر خاک کر دوں گی۔ مٹی کے کیڑے تم مٹی میں مل جاؤ گے۔"

وہ چیخ رہی تھی، چلا رہی تھی۔ رات کے سناٹے میں وہ کمرہ اور وہ کوٹھی گونج رہی تھی۔ پھر چچا، چچی اور ظہیر وغیرہ کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ کمرے کا دروازہ پیٹ رہے تھے۔

"دروازہ کھولو، کیا ہو رہا ہے یہ۔ غزالہ تم کیوں چیخ رہی ہو؟ کون ہے کمرے میں، دروازہ کھولو....."

میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر دروازے کی طرف بھاگی۔ پھر دروازہ کھلتے ہی اپنی ماں سے لپٹ گئی اور روتے ہوئے کہنے لگی۔

"ممی! مجھے بچائیے۔ یہ بدمعاش میری عزت لوٹنا چاہتا ہے۔ میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ جب تک یہ کمینہ رہے گا، میں یہاں سے کہیں دور چلی جاؤں گی۔ مجھے یہاں سے لے چلیے ممی۔"

میں اس کے جھوٹ اور چلتر بازی پر حیران رہ گیا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ چچا نے آگے بڑھ کر میرا گریبان پکڑ لیا اور مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"حرام خور۔ تم اتنی کمینگی پر اتر آئے ہو۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ تمھاری بڑی بہن ہے۔ میں تمھاری بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دوں گا۔"

"اگر یہ بڑی بہن ہے تو میں اس پر تھوکتا ہوں۔ میں زندگی کے کسی موڑ پر ایسی لڑکی کو بہن نہیں کہہ سکتا، جو اپنے کمرے میں بلا کر گناہ کی دعوت دیتی ہو۔"

"یہ جھوٹ ہے ڈیڈی!" غزالہ نے چیخ کر کہا۔ "میں نے اسے بلایا تھا، صرف یہ کہنے کے لیے کہ قیصر ایک بہت بڑے آفیسر کا لڑکا ہے۔ تم نے اس پر ہاتھ اٹھا کر اچھا نہیں کیا ہے۔ اس پر یہ کمبخت کہنے لگا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ قیصر کو اپنا رقیب سمجھتا ہوں۔ پھر یہ کھلی بے شرمی کی باتیں کرنے لگا۔ آج اس بات کا فیصلہ کیجیے۔ یہ گھر میں رہے گا یا میں رہوں گی۔ میں آپ کی بیٹی ہوں کوئی بازاری لڑکی نہیں ہوں کہ اپنی ذلت برداشت کروں گی۔"

میں نے اس کی طرف پلٹ کر حقارت سے کہا۔

"تم بازاری عورت سے بھی بدتر ہو، پتہ نہیں اب تک کتنوں کے ساتھ منہ کالا کیا ہے۔"

چچا جان نے میرے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا۔

"تم میرے سامنے میری بیٹی کو بازاری کہہ رہے ہو، تم خود بازاری ہو۔ شریفوں کے ہاں رہنے کے قابل نہیں ہو نکل جاؤ یہاں سے۔"

انھوں نے دوسری بار طمانچہ مارنا چاہا۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر اس ہاتھ کو پرے جھٹک کر کہا۔

"بس اب مجھ پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ آج سے میں تمام رشتے توڑ رہا ہوں، تم لوگ بچپن سے مجھے بے وقوف بناتے آئے ہو، جوانی میں تمھاری بیٹی مجھے بیوقوف بنا کر اپنے اشاروں پر نچانا چاہتی ہے۔ میں تم لوگوں کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ اب یہاں میرا گزارا نہیں ہو گا۔ میں جا رہا ہوں مگر یاد رکھنا ایک دن اس کوٹھی کا مالک بن کر آؤں گا اور تم سب کو دھکے دے کر یہاں سے نکالوں گا۔"

یہ کہہ کر میں کمرے سے جانے لگا۔ دروازے پر ایک طرف غزالہ اپنی ماں سے لپٹی ہوئی کھڑی تھی، دوسری طرف شاہینہ اپنے بھائی ظہیر کے پیچھے کھڑی اپنی کٹورہ جیسی آنکھیں پھیلا کر مجھے گھور رہی تھی۔ میں اس کے سامنے آ کر ٹھہر گیا۔ چچا اور چچی دونوں ہی چیخ چیخ کر مجھے چیلنج کر رہے تھے کہ میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گا۔ زمین اور جائداد کے لیے میرے دعوے جھوٹے ہیں،

عدالت میرے حق میں فیصلہ نہیں سنائے گی۔

وہ بڑبڑا رہے تھے لیکن میں نے شاہینہ کے سامنے انھیں نظرانداز کر دیا تھا۔

"شاہینہ! یہاں جو کچھ ہو رہا ہے تمھیں اس کے متعلق سوچنا اور سمجھنا نہیں چاہیئے۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسی اخلاق سے گری ہوئی باتیں میری بہن کے کانوں تک پہنچیں، تم جاؤ یہاں سے....."

وہ میرا ہاتھ تھام کر التجا آمیز لہجے میں بولی۔

"آپ یہاں سے نہیں جائیں گے نا؟"

ذرا دیر کے لیے میرا فیصلہ کمزور پڑ گیا۔ میں اس معصوم کو اس گندے ماحول میں چھوڑ کر کیسے جاؤں؟ لیکن یہاں رہ کر میں اس کے لیے کیا کر سکتا تھا؟ ایک بھائی کا فرض پورا کرنے کے لیے لازمی تھا کہ میں وہاں سے چلا جاؤں اور اپنی تمام دولت اور جائداد حاصل کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دوں۔ میں نے دل پر جبر کرتے ہوئے کہا۔

"میں جاؤں گا! اپنی اور تمھاری بھلائی کے لیے جاؤں گا۔ آٹھ سال کی جُدائی ہمیں دُور نہ کر سکی۔ آئندہ بھی اس دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے دور نہیں کر سکے گی۔ میں بہت جلد تم سے آکر ملوں گا۔"

ظہیر غصّہ اور بے بسی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اب اس میں اتنی جراٴت نہیں تھی کہ وہ اکڑ کر شاہینہ کو مجھ سے باتیں کرنے سے روک دیتا۔ اس لیے وہ بڑی خاموشی سے شاہینہ کا بازو تھام کر ذرا پیچھے ہٹ گیا تاکہ میرے گزرنے کے لیے راستہ بن جائے۔ میں نے اس پر حقارت کی ایک نظر ڈالی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ وہاں آکر میں اپنے کپڑے، کتابیں اور دوسرا سامان باندھنے لگا۔ کوئی یہ دیکھنے نہیں آیا کہ میں اس گھر سے کیا لے جا رہا ہوں۔ میں نے اپنے لیے جو بھی چیز ضروری سمجھی اسے اٹھا کر رکھ لیا۔ پھر ایک گھنٹہ کے بعد اپنا بوریا بستر سمیٹ کر میں نے اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔

میں اپنی پھوپھی کے ہاں چلا آیا۔

پھوپھی شاہدرہ میں رہتی تھیں۔ پھوپھا کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ ایک اسکول میں بچوں کو پڑھایا کرتی تھیں۔ ان کی لڑکی زرینہ تقریباً میری ہم عمر تھی۔ تین وقت کی روٹیوں کے لیے وہ بھی محلّے والوں کے کپڑے سیتی تھی——— دونوں ماں بیٹی محنت مزدوری کر کے عزت آبرو سے زندگی گزار رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر پھوپھی میری بلائیں لینے لگی۔ میں نے کوٹھی چھوڑنے کی تفصیل سنائی تو وہ چچا جان کو کوسنے اور گالیاں دینے لگیں۔ وہ دو کمروں کے ایک کچّے مکان میں رہتی تھیں۔ انھوں نے ایک کمرہ میرے رہنے کے لیے مخصوص کر دیا۔ میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ اب کہیں ملازمت کروں گا اور ان پر بوجھ نہیں بنوں گا۔ میں نے اسی وقت ان سے کہہ دیا کہ میں ان کا بیٹا بن کر اس گھر کے اخراجات پُورے کروں گا۔ یہ سُن کر وہ ناراض ہو گئیں۔ انھوں نے ذرا سمجھا کر اور ذرا ڈانٹ ڈپٹ کر اپنا فیصلہ سُنا دیا کہ مجھے اپنی تعلیم جاری رکھنی ہو گی۔

ہم رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔ پھر میں اپنے کمرے میں سونے چلا آیا۔ بستر پر لیٹنے کے بعد مجھے نیند نہیں آئی۔ بہت سی سوچیں ذہن میں لپک رہی تھیں۔ چچا کی مکاریوں نے مجھے اپنی عمر سے زیادہ سوچنا سکھا دیا تھا۔ میں گہری سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ ان سے اپنا حق چھین لینے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ کہاں جانا چاہیئے؟ کن لوگوں کا تعاون حاصل کرنا چاہیئے؟ سب ہی سے تعاون کی توقع تھی، مگر چچا اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ میری طرف سے مقدمہ بازی کے لیے کوئی عدالت تک نہیں جائے گا کیونکہ میرے عزیز و اقارب میں سب ہی غریب تھے۔ جن کے پاس تھوڑی بہت پونجی تھی وہ اسے میری خاطر داؤ پر نہیں لگا سکتے تھے۔

چچا کے متعلق سوچتے سوچتے غزالہ کی بے حیائی یاد آگئی۔ اس وقت مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ جب وہ لڑکی بے حیا بن گئی تھی تو میں نے شرافت کیوں دکھائی؟ شاید اس لیے کہ اس وقت تک میں چچا کے رشتے کا خیال کر رہا تھا، اور میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ایک ناکردہ گناہ کا الزام مجھ پر عائد ہو جائے گا۔ اب وہ دشمن کی بیٹی تھی۔ اس وقت وہ میری نظروں میں کسی بازاری عورت سے کم نہیں تھی جسے کوئی بھی حاصل کر سکتا تھا اور جسے میں بھی حاصل کر کے وقتی طور پر انتقامی جذبے کو سکون پہنچا سکتا تھا۔

مگر اب وقت گزر چکا تھا۔ میں بستر پر لیٹا کروٹیں بدل رہا تھا۔

59

میری جوان نظروں کا پہلا نظارہ تھا۔ میں اسے بھول نہیں سکتا تھا۔

کہتے ہیں کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اسی طرح ایک بدن کے تصوّر سے دوسرا بدن روشن ہو گیا۔ نہ جانے کیسے اس تصور میں زرینہ کا سراپا جھلکنے لگا۔ شاید اس لیے کہ وہ بھی لڑکی تھی، جوان تھی۔ غزالہ کی طرح اس کا رنگ بھی اُجلا تھا۔

توبہ توبہ۔ میں اپنے دونوں گال پیٹنے لگا۔ ایک بے حیا کے متعلق سوچتے سوچتے میں اپنی اس محسنہ کا تصور کر رہا تھا جس کے گھر میں نہ جانے اپنی زندگی کا کتنا حصہ گزارنا تھا۔ میں نے جھلا کر زور سے اپنے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا تاکہ آئندہ زرینہ کے متعلق کوئی سستا خیال میرے دماغ میں نہ آئے۔ ایک بات میں کہ دوں کہ ہمارے تصور کی آنکھیں ہر جوان لڑکی کے لیے ننگی نہیں ہوتیں۔ شاہینہ بھی جوان ہو چکی تھی لیکن اس کے تصور کے ساتھ ایسی پاکیزگی جنم لیتی تھی جو صرف باپ بیٹی یا بھائی اور بہن کے رشتوں میں ہوتی ہے۔ حقیقتاً میں نے ایک باپ کی طرح اسے گود میں کھلایا تھا اور اسے بھائی کی محبت دے رہا تھا۔ اس کے برعکس زرینہ سے اتنا گہرا لگاؤ نہیں تھا، اسی لیے غزالہ اور زرینہ میرے ذہن میں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔

وہ رات سوتے جاگتے اور سوچتے ہوئے گزر گئی۔ صبح کسی نے میرے شانے کو ہولے سے جھنجھوڑ کر جگایا۔ آنکھ کھُلی تو نگاہوں کے سامنے زرینہ تھی مجھے یوں لگا جیسے میں اب تک اس کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ میں نے جلدی سے

آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی مترنم آواز کانوں میں رس گھولنے لگی۔

"اُٹھ جایئے! دس بج رہے ہیں۔ امّی اسکول چلی گئی ہیں، جاتے وقت انھوں نے کہا تھا کہ میں آپ کو نہ جگاؤں مگر ایسا بھی کیا سونا ہے۔ باہر جاکر دیکھیے دھُوپ نکل آئی ہے۔ کیا بڑی کوٹھیوں والے اسی طرح دن چڑھے تک سوتے ہیں؟"

آہ۔ اب میں کوٹھی والا کہاں رہا۔ میں تو اسی مقصد کے لیے یہاں سے آیا تھا کہ وہ کوٹھی اور تمام جائداد حاصل کروں گا۔ اگر اسی طرح سوتا رہا تو شاید کبھی اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو گی۔ میں نے اس وقت دل ہی دل میں عہد کیا کہ آج سے نیند کے نشے اور آرام طلبی سے گریز کروں گا۔ آج سے میرے لیے آرام حرام ہے۔ یہ عہد کر کے میں نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ نگاہوں کے سامنے مسکرا رہی تھی۔ جیسے صبح مسکراتی ہے، ویسے ہی اس کے چہرے پر تازگی تھی۔ بھوری آنکھیں، کھڑی ناک، رس بھرے ہونٹ، بیضوی چہرہ۔ چہرے سے نیچے نظریں گئیں تو میں نے فوراً ہی آنکھیں جھکا لیں۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اُف! غزالہ نے مجھ سے کتنی زبردست دشمنی کی تھی۔ اب بھی میری ہتھیلی کے سائے میں ریشمی دھڑکنیں بج رہی تھیں۔ ایک سے متعارف ہو کر دوسری کی طرف خیال بہک رہا تھا۔ میں جلدی سے اُٹھ کر نظریں چُراتے ہوئے منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔

مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے کس طرح ناشتہ کیا۔ کس طرح زرینہ کا سامنا کرنے سے کتراتا رہا۔ جب ڈیڑھ گھنٹے بعد شاہ کوٹ جانے والی بس میں آکر بیٹھا تو اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے پھُوپھی کے ہاں نہیں رہنا چاہیئے۔ میں بہت جلد کہیں ملازمت تلاش کروں گا۔ ملازمت نہ ملی تو بچّوں کو ٹیوشن پڑھاؤں گا اور کسی دوسری جگہ اپنی رہائش کا انتظام کروں گا۔

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ مجھے زمینوں کے چکّر سے ہی اتنی فرصت نہیں ملی کہ میں اپنے کھانے پینے اور رہنے کا الگ ٹھکانہ بناتا۔ میں روز صبح شاہ کوٹ جاتا تھا اور شام کو واپس آتا تھا۔ کبھی پٹواری سے ملاقات نہ ہوتی۔ کبھی ملاقات ہوتی تو وہ اپنی مصرُوفیات کا بہانہ کر کے مجھے ٹال دیتا۔ وہ مجھ سے کہہ چکا تھا کہ زمینوں کا اصل مالک ناصر علی ہے۔ لیکن میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے ریکارڈ میں زمیندار کی حیثیت سے کس کا نام درج ہے۔ چچا نے اس کے پیچھے اچھی خاصی رقم صرف کی تھی آخر ایک دن اس نے صاف طور سے کہہ دیا کہ وہ اپنا ریکارڈ نہیں دکھائے گا۔ اگر میں دیکھنا چاہوں تو کسی وکیل کے ذریعہ عدالت میں درخواست دے کر معلومات حاصل کر سکتا ہوں۔

میں مایوس ہو کر چلا آیا۔ اب تو میرے پاس شاہ کوٹ آنے جانے کے لیے بھی پیسے نہیں تھے میں کسی وکیل کی خدمات کیسے حاصل کر سکتا تھا۔ پھُوپھی اپنی حیثیت سے زیادہ میرا بوجھ اٹھا رہی تھیں۔ اُن کے مجبور کرنے پر میں نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ دو چار رشتے داروں نے مجھے سمجھایا تھا کہ میں وکیلوں اور عدالتوں کے چکر میں نہ پڑوں کیونکہ زمین کا جھگڑا کبھی ایک دو پیشیوں میں ختم نہیں ہوتا، سالہا سال تک مقدمہ چلتا رہتا ہے۔ جن کے پاس دولت ہوتی ہے وہی ایسی مقدمہ بازیاں کرتے ہیں۔

میں نے بظاہر ان کے مشوروں کو تسلیم کر لیا لیکن میرا ذہن اُلجھا ہوا تھا۔ کبھی پھُوپھی کی غرُبت کا خیال ستاتا تھا اور کبھی چچا سے انتقام لینے کا بھوت سر پر سوار ہو جاتا تھا۔ کئی بار میں نے سوچا کہ اس مکار چچا کو قتل کر دوں! اور ان کے ساتھ ان کی اولاد کا بھی خاتمہ کر دوں تاکہ ان کی آئندہ نسل ہی ختم ہو جائے اور کوئی میری دولت سے فائدہ اٹھانے والا نہ رہے لیکن اس طرح میں مجُرم بن جاتا اور میرا حق بھی مجھے نہ ملتا۔

ایسے ہی وقت میں نے کئی بار سوچا کہ مجھے کسی طرح کوئی غیبی طاقت حاصل ہو جائے جس کے ذریعہ میں اپنی زمین اور جائداد ان سے چھین لوں۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ جب اسے کامیابی کا سیدھا اور صحیح راستہ نہیں ملتا ہے تو وہ غلط راستہ اختیار کرتا ہے۔ کبھی مجرموں کی طرح سوچتا ہے اور کبھی خیال ہی خیال میں آرزو کرتا ہے کہ کہیں سے اسے طلسمی چراغ مل جائے یا حاضرات کا علم حاصل ہو جائے تاکہ وہ دشمنوں کو زیر کر سکے اور زمین میں چھُپے ہوئے خزانے حاصل کر کے اس دنیا کا امیر ترین آدمی بن جائے۔

میں بھی کچھ اس انداز سے سوچنے لگا۔ میرے اندر انتقام کا لاوا پک رہا تھا۔ کوئی راستہ نہ پا کر میں کوئی ایسا پُراسرار علم سیکھنا چاہتا تھا۔ جس سے میرے دشمن دہشت زدہ ہو کر میرے قدموں میں جُھک جائیں۔ یہ بچکانہ خیالات تھے لیکن جیسا کہ میری عادت تھی۔ میں جس چیز کو دیکھتا۔ اس میں اپنی نظریں پیوست کر دیتا تھا اور جو سوچتا۔ اسی خیال پر اپنی توجہ مرکوز کر دیتا تھا۔ اس عادت کے مطابق میری توجہ اسی خیال پر قائم ہو گئی کہ مجھے کچھ نہ کچھ حاصل کرنا چاہیئے۔ یعنی کوئی پُراسرار علم حاصل کرنا چاہیئے۔ یا کوئی جلالی وظیفہ پڑھنا چاہیئے۔ یا چلّہ کشی کرنی چاہیئے یا پھر کالا جادُو سیکھنا چاہیئے۔

کالے جادُو کا خیال میں نے دل سے نکال دیا۔ کیونکہ اسلام میں جادُو ٹُونے اور سفلی عمل کی ممانعت ہے۔ میں کوئی ایسا عمل سیکھنا چاہتا تھا جس کے ذریعہ چچا میرے زیرِ اثر آجائیں اور بلاچون وچرا تمام زمین اور جائداد میرے حوالے کر دیں۔ ایک علم ہے ہپناٹزم جس کے ذریعہ میں انھیں اپنا مطیع و معمول بنا سکتا تھا۔ ایک علم ہے ٹیلی پیتھی یعنی خیال خوانی کے ذریعہ میں ان کے دماغ میں چھُپی ہوئی باتوں کو پڑھ سکتا تھا۔ میرے شناساؤں میں ایسے علوم سکھانے والا کوئی استاد یا راہنما نہیں تھا۔ میں بازار سے اس سلسلے کی کتابیں خرید کر ان علوم کو پڑھنے، سمجھنے اور سیکھنے لگا۔

وہ کتابیں مجھے زندگی کے ایک نئے موڑ پر لے آئیں۔ یہ سچ ہے کہ محض کتابوں سے مکمل علم حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے کسی بڑے عالم و عامل کے مشاہدات و تجربات سے راہنمائی حاصل کرنی پڑتی ہے۔ پھر بھی ان کتابوں سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ میں ان علوم کو سمجھنے اور سیکھنے کے ابتدائی مراحل سے گزرتا چلا گیا۔

جو حضرات ہپناٹزم اور ٹیلی پیتھی سے دلچسپی رکھتے ہیں، وہ ارتکازِ توجہ کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ارتکازِ توجہ کے بغیر اس میدان میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جا سکتا اور میں تو بچپن ہی سے توجہ اور خیال کی قوت کو کسی ایک مقام پر مرکوز کر دینے کا عادی تھا لہٰذا شمع بینی کی مشقوں کے دوران مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

رات کو جب سناٹا چھا جاتا اور کسی کی مداخلت کا خدشہ نہ ہوتا اس وقت میں اپنے کمرے میں موم بتی شمع روشن کرتا اور شمال کی طرف رُخ کر کے بیٹھ جاتا اور شمع کی لو کو ایک ٹک دیکھتا رہتا۔ شمع بینی کے دوران میری توجہ صرف اس خیال پر قائم رہتی کہ میری آنکھوں میں مقناطیسی قوت پیدا ہو رہی ہے میں جسے چاہوں اپنی نگاہوں کے شکنجہ میں جکڑ سکتا ہوں۔ اگرچہ پہلے مرحلے میں مجھے ایسی جارحانہ طرز کی باتیں نہیں سوچنی چاہیے تھیں مگر میں اپنے حالات سے مجبور تھا۔ اس عمل کے دوران میرے دشمن پیشِ نظر رہتے تھے۔

پھر رفتہ رفتہ میں نے اپنے جوش اور جذبوں پر قابو پا لیا اور نہایت سکون اور سنجیدگی سے شمع کا مشاہدہ کرنے لگا۔ اب میں جلتی ہوئی لو پر نظریں جمائے دل ہی دل میں کہتا تھا۔

"اُس روشن لو میں جو چمک ہے وہ میری آنکھوں میں اُتر رہی ہے۔ اُس میں جو گرمی اور حرارت ہے وہ حرارت میری نگاہوں میں پیدا ہو رہی ہے۔"

کئی ماہ تک بلا ناغہ یہ مشق جاری رہی۔ ابتدا میں قدرے مایوسی ہوئی کیونکہ چند ماہ کے عرصہ میں ہی میں خود کو ہپناٹزم کا ماہر سمجھنے لگا تھا۔ خود کو ماہر عامل سمجھ کر وقتاً فوقتاً دوسروں کو گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا اور انھیں اپنے زیرِ اثر لانے کی ناکام کوششیں کرتا تھا۔ کئی بار ناکام ہونے کے بعد مجھے عقل آ گئی کہ اگر یہ علم سیکھنا اتنا ہی آسان ہوتا تو آج ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ہپناٹزم کے ماہر نظر آتے۔ اس عمل کے حصول کے لیے صبر و تحمل، خود اعتمادی اور کڑی مشقوں کی ضرورت ہے۔ لہٰذا میں پھر ایک بار سنبھل گیا اور دوسروں کے سامنے اپنی مقناطیسی آنکھوں کی نمائش کرنے کی بجائے صرف اپنی ذات میں ڈوب کر شمع بینی کی مشق کرنے لگا۔

کچھ عرصہ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ شمع کی لو پھیلتی ہوئی میری نگاہوں کا احاطہ کر لیتی ہے اور چاروں طرف مجھے اس گرم لو کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ اس طرح مجھے گرمی کا احساس ہونے لگا۔ پہلے پہل میں اپنے جسم میں رینگنے والی حرارت سے گھبرا گیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کا عادی ہو گیا۔ اب شمع کا وہ ننھا سا شعلہ میرے دماغ کو چھوتا تھا۔ میری آنکھوں میں اُترتا تھا اور نگاہوں سے خارج ہوتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

یہ میرے احساسات تھے۔ عملی طور پر میں کہاں تک کامیاب ہو چکا ہوں یہ میں نہیں جانتا تھا۔ ویسے میرے کالج کے ساتھی اکثر کہا کرتے تھے کہ میری آنکھوں میں کچھ عجیب سی کشش پیدا ہو گئی ہے۔ میرے لیے یہ کوئی نئی اطلاع نہیں تھی۔ میرے ابّا مرحوم یہ پیش گوئی کر چکے تھے۔ اسی بات کو جی تے مختلف انداز سے متنفر ہو کر دُہرایا تھا۔ مگر تب اور اب میں ایک ذرا سا فرق پیدا ہوا تھا۔ اب کوئی مجھ سے نگاہیں ملا کر باتیں نہیں کرتا تھا۔ باتوں کے دوران میرے مخاطب کی نظریں جھک جایا کرتی تھیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے میں اپنے ماموں سے ملنے گوجرانوالہ گیا تھا۔ ایک رات وہاں گزارنے کے بعد علی الصبح ایک ٹرین سے لاہور کے لیے روانہ ہوا۔ سردی کا موسم تھا۔ میرے جسم پر لنڈے بازار کا ایک بوسیدہ سا سوئٹر تھا لیکن سردی ایسی تھی کہ دانت بج رہے تھے۔ ٹرین میں بھی بھیڑ نہیں تھی۔ ورنہ انسانوں کے جسموں سے خارج ہونے والی حرارت سے کمپارٹمنٹ کی فضا قدرے گرم رہتی۔ میرے سامنے ایک بوڑھا شخص اپنی سیٹ پر پلتھی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے سر کے بال، داڑھی اور بھنویں سب سفید ہو گئی تھیں۔ جسم لاغر تھا مگر چہرے پر عجب تازگی تھی۔ وہ ایک پتلی سی گدڑی اوڑھے بیٹھا ہوا تھا جس میں بے شمار رنگ برنگے پیوند لگے ہوئے تھے۔

ہماری طرف جو کھڑکی تھی، وہ کھلی ہوئی تھی۔ میں اسے بند کرنے لگا تو بوڑھے بابا نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"رہنے دو بیٹا۔ ذرا ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔"

میں حیرانی سے انھیں دیکھنے لگا۔ یہاں سردی سے قلفی جمی جا رہی تھی اور بڑے میاں ٹھنڈی ہوا کھا رہے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ مجھ جیسے ہٹے کٹے نوجوان کی توہین ہے کہ میں سردی سے ٹھٹھر رہا ہوں اور یہ بوڑھے بابا سردی سے لطف اٹھا رہے ہیں۔ کیا یہ آگ سے بنے ہوتے ہیں؟

بوڑھے بابا نے مسکرا کر کہا۔

"میں آگ سے بنا ہوا نہیں ہوں، تمھاری طرح خاک کا پتلا ہوں۔"

شدید حیرانی سے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ بوڑھے بابا نے اس بات کا جواب دیا تھا جسے میں نے دماغ سے سوچا تھا۔ کیا یہ شدید حیرانی کا مقام نہیں تھا کہ جو بات میری زبان پر نہیں آئی تھی اسے انھوں نے سُن لیا تھا۔ اور اس کا معقول جواب دیا تھا۔

میں اُن کی طرف دیکھ رہا تھا، وہ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ انکی آنکھوں میں گہرائی تھی، گیرائی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ آنکھیں مجھے اپنی طرف کھینچ لینا چاہتی ہیں۔ لیکن کھینچ نہیں سکتیں، اپنی طرف مائل نہیں کر سکتیں۔ شاید اس لیے کہ میں شمع بینی کی مشق میں بہت آگے نکل گیا تھا۔

"ہُوں!" انھوں نے ایک لمبی ہُوں کے ساتھ کہا، "میرا خیال درست نکلا۔ تم شمع بینی کی مشق کر چکے ہو۔"

میں ایک دم سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ شمع بینی والی بات بھی میں نے خاموشی سے سوچی تھی مگر انھوں نے سُن لیا تھا۔ میں نے جلدی سے اُن کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"آ..... آپ کون ہیں؟ جو باتیں میں سوچتا ہوں، انھیں آپ سُن لیتے ہیں۔ اسے تو ٹیلی پیتھی کہتے ہیں۔ آپ یقیناً دوسروں کے خیالات پڑھ لیتے ہیں۔ میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ خیال خوانی ایک ایسا علم ہے کہ جسے مکمل طور پر سیکھ لینے کے بعد اس کا عامل دوسروں کے دماغ تک پہنچ جاتا ہے اور جو کچھ وہ

سوچتے رہتے ہیں اسے وہ سُنتا رہتا ہے۔"

انھوں نے میرے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے کہا۔

"تمھاری معلومات درست ہیں۔"

"بابا جی!" میں نے گڑگڑا کر کہا۔ "میں ایسے علم کے لیے بھٹک رہا ہوں۔ خدا کے لیے میری مدد کیجئے۔ مجھے اپنے علم کے خزانے سے ایک چٹکی بھیک دے دیجئے۔ میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"جو علم تمھیں حاصل ہو رہا ہے، تم ابھی اس کو اپنے کام میں لانا نہیں جانتے۔ خیال خوانی کا علم تو دور کی چیز ہے۔ دیکھو تم سردی سے ٹھٹھر رہے ہو۔ کیا اس سردی سے محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر نہیں کر سکتے؟"

"کیا تدبیر کروں؟ کیسے تدبیر کروں؟" میں نے پوچھا۔

"ہوں!" انھوں نے کہا۔ "ذرا سیدھے ہو کر بیٹھ جاؤ۔ میں تمھیں بتاتا ہوں۔"

میں ان کی ہدایت کے مطابق اپنی جگہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور انھیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ انھوں نے کہا۔

"مری کی برف باری یہاں کے موسم پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ سردی واقعی ناقابلِ برداشت ہے اور اس حالت میں میں نے کھڑکی کھلی رکھی ہے۔ تم ذرا اپنی دونوں ہتھیلیاں پھیلا کر انھیں توجہ سے دیکھو۔"

میں اپنی نگاہوں کے سامنے دونوں ہتھیلیاں پھیلا کر انھیں گہرے انہماک سے دیکھنے لگا۔ بوڑھے بابا کہہ رہے تھے۔

"اب اپنے علم کو کام میں لاؤ اور یہ خیال قائم کرو کہ تمھاری ہتھیلیوں پر شمع کی لویں روشن ہیں اور ان کی نادیدہ حرارت سے تمھاری ہتھیلیاں گرم ہو رہی ہیں۔"

میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ اپنے دماغ سے تمام منتشر خیالات کو جھٹک کر صرف ایک شمع کی لو کو اپنی ہتھیلیوں پر روشن کرنے لگا۔ میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔

"میری ہتھیلیاں گرم ہو رہی ہیں۔ میری نگاہوں کی حرارت سرد لہروں کو پگھلا رہی ہے۔ مجھے ایک راحت بخش اور پُرسکون حرارت کی ضرورت ہے، اور وہ حرارت ان ہتھیلیوں تک پہنچ رہی ہے۔"

ٹرین تیز رفتاری سے بھاگی جا رہی تھی۔ سرد ہوا کے جھونکے میری ہتھیلیوں تک آ رہے تھے۔ میں وہ فقرے بار بار دُہرا رہا تھا۔ ایک منٹ کے بعد ہی میری ہتھیلیوں پر دھیمی دھیمی سی حرارت رینگنے لگی، میری نگاہیں آنچ دے رہی تھیں۔ علم کی بند مٹھی کو کھول رہی تھیں۔ زندگی کی بساط پر پہلی بار عملی تجربے کا پانسہ پھینک رہی تھیں۔ میری ہتھیلیاں گرم ہونے لگیں۔ پھر وہ حرارت ہولے ہولے رینگتی ہوئی سرسراتی ہوئی، خون کی روانی کی طرح میری رگوں میں دوڑنے لگی اور میرے سارے جسم کو گرمانے لگی۔ وہ ایسی راحت بخش اور پُرسکون حرارت تھی جس کا میں متمنی تھا۔ میں مارے خوشی کے اپنے جسم کو ادھر اُدھر سے چھُو کر دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟" انھوں نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے فوراً ہی جھک کر اُن کے پاؤں پکڑ لیے۔

"بابا جی۔ آپ نے میری زندگی کا رُخ موڑ دیا ہے۔ میں جس راہ کی تلاش میں تھا، آپ نے وہ راہ دکھا دی۔ مجھے کچھ اور سکھائیے بابا۔ میں ہمیشہ آپ کے در کا بھکاری بن کر رہوں گا۔"

"بیٹے..... علم مانگنے سے نہیں ملتا، سیکھنے سے ملتا ہے۔ دیکھو میں نے تمھیں کچھ نہیں سکھایا۔ جس علم سے تم اپنے اندر حرارت محسوس کر رہے ہو، اسے تم نے خود سیکھا ہے میں نے تو ایک ذرا سی راہ نمائی کی ہے۔"

"تو پھر کچھ اور راہنمائی کیجئے۔ مجھے بتائیے کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے۔"

وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ کھڑکی سے سرد ہوا کے جھونکے بدستور آ رہے تھے۔ لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی ایسے کمرے میں بیٹھا ہوں، جہاں آتشدان میں لکڑیاں سلگ رہی ہیں اور اُن کی آنچ سے میں محظوظ ہو رہا ہوں۔

"لوگ یہ علم کیوں سیکھنا چاہتے ہیں؟" وہ کہنے لگے "اس لیے سیکھنا چاہتے ہیں کہ کسی کو بھی اپنے زیرِ اثر لا سکیں۔ کسی کو بھی اپنا معمول اور مطیع بنا کر اس سے ناجائز فائدے اٹھا سکیں۔ اگر تم بھی کسی غلط ارادے سے سیکھ رہے ہو تو اس ارادے سے باز آ جاؤ۔"

میں نے ان سے اپنے دل کی بات صاف صاف کہہ دی۔

"میں دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن ہوں۔ میں نے بچپن سے اب تک کسی کو اپنا دشمن نہیں بنایا۔ اگر کچھ لوگ دولت اور جائیداد کے لالچ میں خود ہی میرے دشمن بن جائیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تو صرف اپنے جائز حقوق حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ان کے پاس دولت ہے۔ عدالت کی جھوٹی دستاویزات ہیں۔ میرے پاس اپنی سچائی ثابت کرنے کا کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے کسی پُراسرار علم کے ذریعے اپنے حقوق حاصل کرنے چاہئیں۔ آپ ہی بتائیے کیا مجھے اپنے حقوق حاصل کرنے کا حق نہیں ہے؟"

"ہے ۔۔ دنیا کا کوئی بھی علم اسی لیے سیکھا جاتا ہے کہ اس کی روشنی میں انسان دیانتداری سے اپنے جینے کا حق حاصل کرے۔ مجھے یقین ہے کہ تم جو کچھ سیکھو گے اس سے کسی شریف یا غیر متعلق شخص کو نقصان نہیں پہنچاؤ گے اور دوسروں سے ناجائز فائدے حاصل نہیں کرو گے۔ تمھاری باتوں سے یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ تم اپنے دشمنوں کو تسخیر کرنا چاہتے ہو، اس کے لیے تمھیں تسخیر کی مشقوں سے گزرنا ہو گا۔"

وہ مجھے سمجھانے لگے کہ تسخیر کی ابتدائی مشقیں کیسی ہوتی ہیں اور اُن کی انتہا کیا ہے۔ میں غور سے ان کی ہدایات اور مشوروں کو سنتا اور سمجھتا رہا۔ وہ مختصر سا سفر کس طرح گزر گیا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ ہم دونوں لاہور کے اسٹیشن پر ٹرین سے اُتر گئے۔ میں نے عقیدت سے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"میں آپ کے قدموں میں رہنا چاہتا ہوں۔ آپ سے خیال خوانی کا علم سیکھنا چاہتا ہوں۔"

انھوں نے شفقت سے سمجھایا۔

"ایک وقت میں ایک ہی خیال قائم کرو اور ایک ہی علم سیکھو۔ ٹیلی پیتھی سیکھنے کی منزل ابھی دور ہے، جب وہ وقت آئے گا تو میں تم سے خود ہی رابطہ

قائم کروں گا، اب تم جاؤ میرے پیچھے نہ آنا۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے، مجھ سے دُور ہوتے چلے گئے۔ میں خاموشی سے انھیں دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں بھی سر جھکا کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا پلیٹ فارم سے باہر آگیا۔

اس کے بعد میرا شوق اور میری دیوانگی بڑھ گئی۔ میں دُوسری صبح مُنہ اندھیرے راوی کے کنارے گیا۔ بوڑھے بابا کی ہدایت کے مطابق التسخیر کی مشق کے لیے مجھے ایسی پُرسکون جگہ کی تلاش تھی، جہاں مداخلت کرنے والا کوئی نہ ہو۔ میں دریا کے کنارے کنارے چلتا ہوا تقریباً دس میل کا فاصلہ طے کر گیا۔ گھنے درختوں کے جھنڈ میں مجھے وہ جگہ مل گئی، وہاں سے انسانی آبادی دُور تھی۔ کبھی کبھی کسی لانچ کے گزرنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ پھر سناٹا چھا جاتا تھا۔ میں نے ایک درخت کے تنے پر ایک ننھا سا سیاہ دائرہ بنایا اور اس کے سامنے ذرا فاصلے پر پلتھی مار کر بیٹھ گیا۔

صبح سے شام اور شام سے صبح ہونے لگی۔ میں شام کو گھر جاتا تھا اور صبح سویرے اسی ویرانے میں چلا آتا تھا۔ مجھے کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کا ہوش نہیں تھا۔

میری داڑھی بڑھ گئی تھی۔ کئی کئی دنوں تک ایک ہی لباس پہنے رہتا۔ پھوپھی اور زرینہ سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی۔ وہ سمجھ گئیں میں کوئی علم سیکھنے کے چکر میں مستان بابا بن گیا ہوں۔ پھوپھی نے کئی بار ڈانٹ ڈپٹ کر مجھے میرے ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن میرے ارادے کمزور نہیں تھے۔

مشقوں کے دوران کئی بار مجھ سے غلطیاں ہوئیں۔ کئی بار ایک انجانا سا خوف طاری ہوا۔ کبھی وقتی طور پر میرا ذہنی توازن ڈگمگا گیا۔ کبھی تیز بخار میں مبتلا ہو گیا۔ اُن دنوں عجیب دیوانگی کا عالم تھا۔ جہاں ذرا طبیعت سنبھلتی میں پھر مشق شروع کر دیتا۔ مستقل مزاجی اور قوتِ ارادی کے بغیر میں اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

درخت کے تنے پر بناتے ہوئے سیاہ دائرے کو میں بتدریج بڑھاتا جا رہا تھا۔ پہلے وہ دائرہ چنے کے ایک دانے کے برابر تھا۔ جب وہ متواتر میری نگاہوں کی زد میں رہتے رہتے اوجھل ہونے لگا تو میں نے پیسے کے برابر سیاہ دائرہ بنایا۔ پھر رفتہ رفتہ سیاہ دائرہ چاند کے برابر ہو گیا۔ یہ ایک دو دن کی بات نہیں تھی۔ ان مشقوں سے گزرتے ہوئے پورے تین برس بیت گئے تھے۔ اس وقت تک میری آنکھوں میں ایسی قوت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ چاند کے برابر جو دائرہ تھا وہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ میں جہاں نظر اٹھا کر دیکھتا وہاں بے شمار روشن دائرے جگمگانے لگتے تھے۔ مجھے سیاہ دائرے کی تاریکی میں روشنی کا سراغ مل رہا تھا، یا یوں کہنا چاہیے کہ مجھے انسانی دماغ کے تاریک تہ خانوں میں اُترنے کا راستہ نظر آنے لگا تھا۔

اس کے بعد میں نے اپنی حالت سنبھال لی۔ میں شیو کرنے اور صاف ستھرے کپڑے پہننے لگا۔ تین سال کے بعد میں دیوانگی سے فرزانگی کی طرف آیا تو میری شخصیت میں بھی عجیب نکھار آگیا۔ میرے چہرے پر ایک نئی تازگی تھی۔ میری آنکھوں میں ایسی مقناطیسی قوت پیدا ہو گئی تھی کہ اس کا اثر سب سے پہلے زرینہ پر ہُوا۔ کیونکہ وہی میرے زیادہ قریب تھی۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ہر وقت ہمارا سامنا ہوتا رہتا تھا بلکہ وہ خود بخود اس طرح کھنچی چلی آتی تھی جیسے لوہا مقناطیس کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہماری نظریں ٹکرائیں تو وہ میری طرف دیکھتی ہی رہ گئی بظاہر تو وہ بہت ہی شرمیلی تھی لیکن سحرزدہ ہو جاتی تھی۔

ایکبار میں نے اس پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"نظریں جُھکا لو!"

اس کی نظریں فوراً ہی جُھک گئیں۔ دوسری بار میں نے کہا۔

"بیٹھ جاؤ!"

وہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"میری طرف دیکھو!"

وہ پھر میری جانب دیکھنے لگی۔ میرے ہر حکم کی تعمیل ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا یہ تو کوئی ثبوت نہیں ہے کہ وہ میری نگاہوں سے سحرزدہ ہو رہی ہے۔ وہ مجھ سے متاثر تھی یا مجھ سے مرعوب تھی اس لیے میرے حکم پر عمل کر رہی تھی۔ اس وقت میرے دماغ میں بات آئی کہ کیوں نہ میں اس پر تنویمی عمل کروں اور اسے اپنی معمولہ بنا کر اپنے علم کو عملی طور پر آزماؤں؟

دوسری صبح جب پھوپھی اسکول چلی گئیں تو میں نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ زرینہ میری اس حرکت کو چور نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں چلنے کے لیے کہا تو وہ شرمانے لگی۔ اچانک ہی اس کے رخسار تمتمانے لگے، وہ میرے پیچھے شرماتی لجاتی ہوئی میرے کمرے میں آگئی۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"بستر پر لیٹ جاؤ۔"

اس نے حیا سے بل کھا کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ میں نے قدرے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"جو کہتا ہوں وہ کرو، بستر پر لیٹ جاؤ۔"

ہپناٹزم کے لیے آواز بڑی اہم ہوتی ہے۔ میری آواز میں گونج اور گرج بھی تھی اور شہد کی سی شیرینی اور ملائمیت بھی۔ وہ چپ چاپ سکڑ کر میرے بستر پر لیٹ گئی۔

وہ سمٹ کر اپنے جسم کی پنکھڑیوں میں خود کو چھپانا چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔

"اس طرح نہیں۔ چت لیٹ کر اپنے ہاتھ پاؤں سیدھے کر لو اور میری طرف دیکھتی رہو۔"

اس نے نظریں اٹھا کر میری جانب دیکھا تو پھر دیکھتی رہ گئی۔ آہستہ آہستہ اس نے ہاتھ پاؤں سیدھے کر لیے اور چت لیٹ گئی۔

میری نگاہیں اس کی نگاہوں میں اُترنے لگیں۔ اس کی آنکھوں کے راستے اس کے دماغ تک پہنچنے لگیں۔ میں مکمل اعتماد سے سوچ رہا تھا کہ جس طرح سیاہ دائرے سے نور کا چشمہ اُبلتا ہے اسی طرح زرینہ کے دماغ کے سیاہ خلئے سے روشنی پھوٹ رہی ہے۔ انسان اپنے دماغ کے سیاہ خلئے میں جو راز چھپا کر رکھتا ہے زرینہ

وہ راز میرے سامنے اگلتی رہے گی۔

میں نے بھاری بھرکم لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔

"تم نہایت آرام اور سکون سے لیٹی رہو۔ میری آنکھوں کے سوا اس دنیا کا کوئی نظارہ تمھارے سامنے نہیں ہے۔ تم اپنے آس پاس کے ماحول سے غافل ہوتی جا رہی ہو......"

اس کی آنکھیں یوں کھلی ہوئی تھیں جیسے سوتے سوتے کھلی رہ گئی ہوں اس پر تنویمی نیند طاری ہو گئی تھی۔ میں رُک رُک کر کہتا جا رہا تھا۔

"اب تمھارے کان صرف میری آواز سُن رہے ہیں۔ میرے علاوہ اس دُنیا کی کوئی آواز تمھارے کانوں تک نہیں پہنچ رہی ہے۔ اب میں ایک سے دس تک گنتا ہوں۔ ہر گنتی پر تم اس دنیا کے نظاروں سے اور اس دنیا کی آوازوں سے دُور ہوتی جاؤ گی۔ اتنی دُور کہ جہاں صرف میری آواز سنائی دے گی اور تم میرے ہر سوال کا جواب دیتی رہو گی۔"

وہ بالکل خاموش پڑی ہوئی تھی اور پلکیں جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی جا رہی تھی۔ میں دو دو سیکنڈ کے وقفے سے گننے لگا۔ دس تک گننے کے بعد میں نے اسے مخاطب کیا۔

"میں تم سے مخاطب ہوں تم میری آواز سُن رہی ہو؟"

اس کی آواز دور کسی اندھے کنویں سے آئی۔

"ہاں، سُن رہی ہوں۔"

"تمھارا نام زرینہ ہے۔"

"میرا نام زرینہ ہے۔"

"نہیں۔ تمھارا نام حسینہ ہے۔" میں نے حاکمانہ لہجے میں کہا۔

"میرا نام حسینہ ہے۔" وہ ایک محکوم کی طرح بولی۔

"تم میری مطیع اور فرمانبردار ہو۔ میں جو کچھ پوچھوں گا تم صحیح جواب دو گی۔"

"میں صحیح جواب دوں گی۔"

"تمھاری عمر کتنی ہے؟"

"چوبیس برس!"

"دوسروں کو اپنی عمر کیا بتاتی ہو؟"

"سولہ برس!"

"تم میرے متعلق کیا سوچتی ہو؟"

"میں ہر وقت تمھارے متعلق سوچتی ہوں۔ تمھارا چہرہ، پہاڑ جیسا قد اور فولاد جیسا جسم ہر وقت میرے حواس پر چھایا رہتا ہے۔ پھر کچھ دنوں سے تمھاری آنکھیں مجھے پکار رہی ہیں۔ تم دیکھتے ہو تو میرا وجود تمھاری طرف پرواز کرنے پر مائل ہو جاتا ہے۔ میں بار بار تمھارے کمرے میں آتی ہوں مگر تم انجان بن جاتے ہو۔ میں سوچتی ہوں۔ ہاں میں یہی سوچتی رہتی ہوں کہ میری تمام حسرتیں پوری ہو جائیں۔"

وہ کہہ رہی تھی اور میں اس شرمیلی لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو ہوش و حواس میں رہ کر کبھی ایسی باتیں زبان پر نہ لاتی۔ لیکن وہ تنویمی نیند میں ڈوب کر اپنے ضاغ ... تاریکیوں سے بول رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"تمھارے دل میں کب سے یہ تمنائیں جاگ رہی ہیں؟"

وہ ہولے ہولے ٹھہر ٹھہر کر جواب دینے لگی۔

"بہت عرصہ سے۔ جب میں جوان ہو رہی تھی۔ میرے بدن سے ہلکی ہلکی تبدیلیاں ابھر رہی تھیں۔"

وہ ذرا دیر کے لیے رُک گئی۔ میں نے حکم دیا۔

"کہتی جاؤ۔ جتنی باتیں تمھارے دل میں ہیں اور دماغ میں ہیں، انھیں کتاب کے ایک ایک صفحہ کی طرح کھولتی جاؤ۔ تم میری فرمانبردار ہو اور میرے حکم پر عمل کر رہی ہو۔"

وہ عمل کرنے لگی۔ اس کے ساکت لبوں میں جنبش ہوئی اور وہ کہنے لگی۔

"میں رفتہ رفتہ بھٹکنے لگی۔ جب امی اسکول چلی جاتیں تو میں کبھی دروازے سے اور کبھی کھڑکی سے جھانک کر محلّے کی ویران گلی کو دیکھتی تھی۔ کسی کا انتظار کرتی تھی۔ میں نے اس محلّے کے ایک نوجوان قاسم کو دیکھا۔ پھر جمال پر نگاہ گئی۔ اس کے بعد ارشد کی طرف خیال گیا مگر میرے سامنے شرم کا پہرہ تھا اور خوف کی دیوار تھی۔ جذبات کے سیلاب میں بہنے کے باوجود دل میں دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں پکڑی نہ جاؤں پکڑی گئی تو میرے ساتھ میری امی بھی بدنام ہو جائیں گی۔

ایسے ہی وقت تم یہاں آگئے۔ تمھیں دیکھ کر پتہ چلا کہ مجھے تمھاری ہی تلاش تھی۔ تمھارے مردانہ حُسن کے سامنے وہ تمام نوجوان پھیکے پڑ گئے جنھیں میں دروازے اور کھڑکی کی اوٹ سے دیکھا کرتی تھی۔ میں تم میں دلچسپی لینے لگی۔ ابتدا میں میں نے محسوس کیا کہ تم چور نظروں سے مجھے دیکھتے ہو مگر مجھ سے دور ہی دور رہتے ہو۔ میری بے چینی بڑھنے لگی۔ میں تمھارے کمرے میں کسی کام کے بہانے آتی تو جان بوجھ کر اپنے شانے سے دوپٹہ ڈھلکا دیتی تاکہ تم مجھے چھونے اور چھیڑنے پر مجبور ہو جاؤ۔"

وہ تنویمی عمل میرے لیے باعثِ رحمت بن گیا تھا۔ مجھ پر ایک شرمیلی لڑکی کی جذباتی سازشوں کو آشکار کر رہا تھا۔ ان لڑکیوں کے دماغ میں جھانک کر دیکھو تو پتہ چلتا ہے کہ یہ بظاہر تو بے حس اور معصوم نظر آتی ہیں اور انجان بن کر جانے بوجھے اشاروں سے اپنی طرف مائل کرنے کی خاموش کوششیں کرتی رہتی ہیں۔ بہرحال وہ کہہ رہی تھی۔

"جب میں نے دیکھا کہ تم میری طرف مائل نہیں ہو رہے ہو تو ایک رات میں بہت مجبور ہو کر تمھارے کمرے میں آگئی۔ میں نے شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دیا میرے اندر جو آگ بھڑکتی رہتی تھی اسے بجھائے بغیر میں سکون سے نہیں سو سکتی تھی۔ لیکن تمھیں جاگتے دیکھ کر میں ٹھٹھک گئی۔

تم جاگ رہے تھے۔ اپنے بستر پر پلتھی مارے بیٹھے ہوئے تھے اور تمھارے سامنے ایک ہاتھ کے فاصلے پر ایک موم بتی روشن تھی۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم اس طرح کیوں بیٹھے ہو اور شمع کی لو کو اتنے انہماک سے کیوں دیکھ رہے ہو۔ میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شمع کے قریب تمھارے سامنے آگئی تاکہ تم مجھے دیکھ سکو۔

تم مجھے کیا دیکھتے ہو؟ میں تمھاری آنکھیں دیکھ کر لرز گئی۔ اُف خدایا! تمھاری آنکھوں کی پتلیاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اُن کی جگہ دو لویں سُلگ رہی تھیں اور ان کی گرمی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ میں دوبارہ تمھاری طرف دیکھتی۔ میں سر جھکائے اُلٹے قدموں دروازے تک آ گئی۔ اس وقت تک یہ سمجھ گئی تھی کہ تم کوئی عمل کر رہے ہو۔ ایسی صورت میں اگر میں مداخلت کروں گی تو اس کا نتیجہ بے حد خوفناک ہوگا۔

میں اپنے بستر پر آ کر گر پڑی۔ میرا دل گھبرا رہا تھا۔ تم کتنے پُراسرار اور دہشت انگیز بن گئے تھے کہ میں تمھارے ہی متعلق سہمی سہمی سی سوچتی رہی اور اپنے جذبات کو وقتی طور پر بھول گئی۔

پھر جیسے جیسے دن گزرتے گئے، تمھاری دیوانگی ظاہر ہوتی گئی۔ تمھیں کھانے کی فکر تھی نہ پہننے کا ہوش تھا۔ محلّے والے تمھیں مستان بابا کہنے لگے تھے۔ میں تمھاری طرف سے مایوس ہوگئی۔ جسے اپنا ہوش نہ ہو وہ بھلا مجھ سے کیا دلچسپی لے گا۔ یہ سوچ کر میری نگاہیں پھر دروازے اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگیں۔ میں گمراہی کے اس مقام تک پہنچ گئی تھی جہاں اپنے جذبات کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

کچھ ہی دنوں میں جمال سے اشارے بازی ہونے لگی۔ اس نے ایک خط لکھا کہ میں کسی بہانے اس سے آ کر ملوں یا اسے اپنے گھر میں آنے کا موقع دوں لیکن دونوں ہی باتیں ناقابلِ عمل تھیں۔ اگرچہ دن کے وقت میں گھر میں تنہا رہتی ہوں، مگر محلّے والوں سے ڈر لگتا ہے کہ کسی نے جمال کو میرے گھر میں داخل ہوتے یا باہر نکلتے دیکھ لیا تو برسوں کی بنی بنائی عزت خاک میں مل جائے گی۔ رات کو امی گہری نیند سوتی ہیں لیکن تمھارے کمرے کی بتی جلتی رہتی ہے۔ میں جمال سے ملنے باہر جانا چاہتی ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے شمع کی دو لویں مجھے گھور رہی ہیں۔ تم سامنے نہیں ہوتے پھر بھی تمھاری نگاہیں چبھتی رہتی ہیں۔

میں گھنٹوں تمھاری آنکھوں کے متعلق سوچتی رہتی ہوں۔ تم غصّے، یا پریشانی سے دیکھتے ہو تو تمھاری نظریں برچھی کی طرح سینے میں اُتر جاتی ہیں اور جب نرمی سے دیکھتے ہو تو میں ایک عجیب سی میٹھی سی کشش محسوس کرتی ہوں، بے اختیار تمھاری طرف کھنچی چلی جاتی ہوں۔ ویسے اب تو تم سنبھل گئے ہو۔ اب وہ مستان بابا والی بات نہیں ہے۔ میں پھر تمھارے متعلق سنجیدگی سے سوچ رہی ہوں۔ اب میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔ میں تمھیں مجبور کروں گی کہ تم مجھے اپنی شریکِ حیات بنالو۔"

میں اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ ایسی دوشیزہ تھی کہ مجبور نہ کرے، تب بھی میں اسے اپنا سکتا تھا لیکن میرے عزائم بلند تھے۔ میں شادی بیاہ کے چکّروں میں پھنس کر ایک عورت اور ایک گھر تک محدود نہیں ہونا چاہتا تھا۔ پھر یہ کہ مجھے زرینہ کی کمزوریاں معلوم ہوگئی تھیں۔ کبھی وہ میری طرف مائل ہوتی تھی، کبھی دوسرے نوجوانوں کی طرف۔ تو نہ سہی اور سہی والی بات تھی۔ وہ اپنی پیاس بجھانے کے لیے کسی بھی کنویں میں چھلانگ لگا سکتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تم مجھے کس طرح مجبور کرو گی کہ میں تمھیں شریکِ حیات بنالوں؟"

"تم پر میرے اور میری امی کے احسانات ہیں، تم ہمارے ہاں رہتے ہو، ہمارے ہاں کھاتے ہو، ہم اپنی ضرورتیں مار کر تمھاری ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ ان احسانات کے بدلے تم مجھ سے شادی کرو گے۔"

"بے شک مجھ پر تم لوگوں کے احسانات ہیں۔ میں ان کا بدلہ چکاؤں گا، مجھے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جانے دو۔ پھر مجھے جو دولت ملے گی اس کا ایک حصّہ تمھیں دے دوں گا۔ تمھارے دن پھر جائیں گے۔ تم عیش و آرام سے زندگی گزارو گی۔ کیا پھر بھی تم مجھے حاصل کرنا چاہو گی؟"

"ہاں۔ میں تمھیں حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ اگر احسانات کے بدلے حاصل نہ کر سکی تو دوسری تدبیر کروں گی۔"

وہ بڑی فرمانبرداری سے جواب دینے لگی۔

"میں نے امی کو ڈھکے چھپے انداز میں سمجھا دیا ہے کہ تم مجھے چاہتے ہو۔ اگر تم نے انکار کیا تو میں اپنی ایک رازدار سہیلی سے کہہ دوں گی کہ تم تنہائی میں مجھے پیار کرتے ہو۔ میری سہیلی پیٹ کی ہلکی ہے، کچھ ہی دنوں بعد یہ بات سارے محلّے میں پھیل جائے گی کہ تم غزالہ کے ساتھ بدنام ہو چکے ہو۔ امی بھی یقین کریں گی کہ وہی کھیل تم نے میرے ساتھ کھیلا ہے۔ پھر امی اور محلّے والے تمھیں مجبور کریں گے اور تم مجھے اپنانے سے انکار نہیں کر سکو گے۔ یہ درست ہے کہ اس طرح میں بدنام ہو جاؤں گی مگر اب میں رسوائیوں سے نہیں ڈرتی۔ نیک نامی نہ سہی، میں بدنام ہو کر تمھیں حاصل کرنا چاہتی ہوں۔"

میں حیرانی سے اسے تکنے لگا۔ وہ عام حالت میں ایک سنجیدہ، کم سخن اور بے ضرر سی لڑکی تھی لیکن میرا تنویمی عمل بتا رہا تھا کہ وہ مجھے پھانسنے کے کیسے کیسے منصوبے بنائے بیٹھی ہے، میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ بدنامی کے مقام تک پہنچ کر مجھے حاصل کرنا چاہتی ہے۔

میں نے اسے نفرت سے دیکھا۔ بظاہر وہ اتنی اچھی تھی کہ اس سے نفرت نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ حسین تھی، جوان تھی۔ اس کے جسم کے نشیب و فراز نگاہوں کو للچاتے تھے۔ وہ قابلِ محبّت تھی۔ مجھے صرف اس کی منصوبہ بندی سے نفرت تھی۔

"اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "کسی نے سچ کہا ہے کہ بد اچھا بدنام بُرا۔ میں بدنام نہیں ہونا چاہتا اور نہ ہی تمھیں بدنام کرنا چاہتا ہوں۔ تمھارے احسانات کا بدلہ چکانے کے بعد میں تم سے جواب طلب کروں گا اور دیکھوں گا کہ تم کس طرح مجھے بدنام کرتی ہو۔ ابھی تم میرا حکم مانو۔ میں جو کہتا ہوں اس پر عمل کرو۔ بولو تمھارے دل میں اب میری خواہش پیدا نہیں ہوگی۔"

وہ میرے حکم کے مطابق کہنے لگی۔

"میرے دل میں تمھاری خواہش پیدا نہیں ہوگی۔"

"تم مجھے بدنام نہیں کرو گی۔"

"میں تمھیں بدنام نہیں کروں گی۔"

"تم ایک شریف زادی کی طرح اپنے جذبات کو قابو میں رکھو گی۔"

"میں ایک شریف زادی کی طرح اپنے جذبات کو قابو میں رکھوں گی۔"

میں بار بار اسے تلقین کرتا رہا۔ وہ بار بار میرے فقروں کو دہراتی رہی۔ پھر میں نے کہا۔

"اب میں تنویمی عمل ختم کر رہا ہوں۔ تم آرام سے سو جاؤ۔ ایک گھنٹے کے بعد

بیدار ہو جانا۔ بیدار ہونے کے بعد بھی تم میری ہدایات پر عمل کرتی رہو گی۔ چلو اب سو جاؤ۔"

وہ عمل ختم کرنے کے بعد میں تھوڑی دیر تک کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پھر اپنی میز کے پاس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ مجھے جلد از جلد آمدنی کا کوئی ذریعہ پیدا کر کے اس گھر سے نکل جانا چاہیے۔ مجھے پیش آنے والے خطرات کا علم ہو گیا تھا۔ اب وہاں رہ کر بدنامی کو دعوت دینا سراسر حماقت ہوتی۔ غزالہ نے بھی مجھ پر جھوٹا الزام لگایا تھا۔ زرینہ بھی اس الزام سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ ان دونوں لڑکیوں کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ وقت آنے پر ان کی چالاکیوں کا حساب کروں گا۔ ابھی میرے حالات ساز گار نہیں تھے۔ میں کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا جو مجھے تباہی کے رستے پر لے جاتا۔ چاہے انتقام لینے کی حسرت دل ہی میں رہ جاتی اور کوئی لڑکی بیوی بن کر تمام عمر کے لیے میرے سر پر مسلط ہو جاتی۔ اسی لیے میں زرینہ سے کترا رہا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ بیدار ہو گئی۔ آنکھ کھلتے ہی وہ حیرانی سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ جلدی سے دوپٹے کو اٹھا کر اپنا جسم ڈھانپنے لگی۔ اس وقت وہ ایسی بھولی اور معصوم نظر آ رہی تھی جیسے مکر و فریب کے نام سے واقف نہ ہو۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ تنویمی نیند کے دوران اس نے اپنے دل کے تمام راز اُگل دیے ہیں۔ لہٰذا اپنی عادت کے مطابق اس وقت بھی معصومیت کا اظہار کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"زرینہ! میں نے تمھیں لیٹنے کے لیے کہا تھا۔ تم بستر پر لیٹتے ہی سو گئیں۔"

اس کی آنکھوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ سوچ رہی اور کچھ سہمی ہوئی ہے۔ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ میں کچھ عمل وغیرہ سیکھتا رہتا ہوں۔ شاید یہ سوچ رہی تھی کہ میں نے اس پر کوئی عمل تو نہیں کیا ہے؟ وہ لاکھ سوچے، مگر یہ نہیں جان سکتی تھی کہ میں تنویمی عمل کے ذریعہ اس کے سوچنے کے انداز کو اور اس کے تمام منصوبوں کو سمجھ چکا ہوں۔

وہ خاموشی سے اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔

یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ انسان کا اصلی چہرہ دیکھنے اور اس کے جھوٹ سچ کو سمجھنے کے لیے اس کے دماغ میں چھپی ہوئی باتوں تک پہنچنا ضروری ہے۔ علمِ تنویم کے عملی تجربے سے میں اس قابل ہو گیا تھا کسی کو بھی ہپناٹائز کر کے اس کے دماغ کے چور گوشوں تک پہنچ سکتا تھا۔ لیکن نہیں، میں نے غلط کہا۔ ہر شخص کو ہپناٹائز نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بہت زیادہ مستقل مزاج ہوتے ہیں۔ ان میں اتنی خود اعتمادی ہوتی ہے کہ وہ کسی کے معمول نہیں بنتے اور نہ ہی خود پر تنویمی نیند طاری کرنے کا موقع دیتے ہیں، البتہ ٹیلی پیتھی یعنی خیال خوانی کے ذریعہ ہر شخص کے چھپے ہوئے خیالات تک پہنچا جا سکتا ہے جیسے بوڑھے بابا نے میرے دماغ میں جھانک کر میرے چھپے ہوئے خیالات کو پڑھ لیا تھا۔

ایسے وقت میں بڑی شدت سے بابا جی کی کمی محسوس کر رہا تھا۔ اس اتفاقیہ ملاقات کے بعد پھر کبھی میں نے اُن کی صورت نہیں دیکھی تھی ویسے میں ابتدائی معلومات کے سہارے خیال خوانی کا علم سیکھ سکتا تھا۔ تنویمی عمل بھی میں نے اپنی ہی خود اعتمادی کے سہارے سیکھا تھا، لیکن اس عمل کو بروئے کار لانے کے لیے بابا جی کی راہنمائی حاصل ہو گئی تھی۔ بہر حال میں نے اللہ کا نام لے کر اپنے طور پر کشفِ سمعی کی مشقیں شروع کر دیں۔

کشفِ سمعی سے اس فضا میں بکھری ہوئی گم گشتہ آوازوں کو سننے کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ میں روزانہ صبح گھر سے دس میل دور چلا جاتا تھا اور گھنی درختوں کے جھنڈ میں پہنچ کر مراقبہ کرتا تھا۔ پہلے نگاہوں کی قوت سے دیکھنے اور کسی کے دماغ میں اُترنے اور انھیں اپنا مطیع و معمول بنانے کی مشقیں تھیں۔ اب قوتِ سماعت سے لوگوں کے دماغ کے خیالات کو سننے کی مشق جاری رہی لیکن سننے کا عمل کانوں سے نہیں تھا، دماغ سے تھا۔ میں اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لیا کرتا تا کہ کسی چڑیا کے چہچہانے یا پتے کھڑکنے کی آواز بھی کانوں تک نہ پہنچے۔ پھر آنکھیں بند کر کے اپنی تمام توجہ اس خیال پر قائم کر دیتا کہ میں اس کائنات میں صدیوں سے بکھری ہوئی آوازوں کو سُن رہا ہوں۔

یہ ایک دو دن کا عمل نہیں تھا، مہینوں اور برسوں کی کاوش درکار تھی۔ اسے میری دیوانگی کہیے یا مستقل مزاجی، میں دُھن کا پکا ہوں۔ جس کام کا قصد کرتا ہوں اسے تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیتا ہوں۔ اس عمل کے دوران میں آوازوں کی ایک نادیدہ اور پُراسرار دنیا میں سفر کرتا رہا۔ کبھی انجانی اور کبھی جانی پہچانی آوازیں۔ کبھی عجیب و غریب سحر انگیز آوازیں میرے دماغ کو چھوتی رہیں اور میں رازہائے سماعت کے پردے اٹھاتا رہا۔ کچھ عرصہ کے بعد آوازوں کی بھیڑ چھٹنے لگی۔ انتشار ختم ہونے لگا۔ میں ایک ہی وقت میں ایک ہی آواز سننے کی کوشش کرتا تھا اور باقی صداؤں کو ذہن سے جھٹک دیتا تھا۔

ایسے ہی وقت جبکہ میں ایک وقت میں ایک ہی آواز تک پہنچنے لگا تھا، مجھے بوڑھے بابا کی آواز سنائی دی، پہلے تو میں انھیں پہچان نہ سکا کیونکہ وہ میرے ہی دماغ میں بیٹھے میری ہی سوچ میں بول رہے تھے۔

"میں تمھارا خیال ہوں، پہلے اپنی سوچ کو سمجھو کہ یہ ہے کیا؟ ہر انسان کے دماغ میں دو سوچیں ہوتی ہیں، مثبت اور منفی۔ ہاں اور ناں۔ ایک سوچ تمھیں کسی بات کو قبول کرنے پر مائل کرتی ہے۔ دوسری سوچ اس بات سے انکار کرتی ہے یہ اچھا ہے، یہ بُرا ہے، یہ کرو، یہ نہ کرو، والی کشمکش ہر انسان کے دماغ میں ہوتی ہے اور ہم ٹیلی پیتھی کے ذریعہ کسی بھی شخص کی اس کشمکش کو پڑھتے اور سمجھتے رہتے ہیں۔ میں تمھاری سوچ کو پڑھ رہا ہوں۔ میں وہی بوڑھا ہوں جس سے تم ایکبار ٹرین میں مل چکے ہو۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تم سے رابطہ قائم کروں گا، وہ وعدہ پورا کر رہا ہوں۔"

اس وقت میری خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ ایسے وقت جبکہ میں ان کی شدید ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ وہ خود ہی میری سوچ میں آ کر سما گئے تھے اس وقت میں نے سوچا کہ ان سے پوچھوں وہ کہاں ہیں۔ میں ان سے کہاں ملاقات کر سکتا ہوں۔

لیکن میرے پوچھنے سے قبل ہی انھوں نے میری سوچ کو پڑھ لیا۔

"تم جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو اس کے لیے زبان ہلانے کی ضرورت نہیں ہے تم صرف سوچو، میں اسے سُن لوں گا۔"

میں ان کی ہدایت کے مطابق سوچنے لگا۔ "بابا جی! میں جب دنیا سے

سماعت میں سانسیں لے رہا ہوں، وہاں آوازوں کی بھیڑ چھٹ گئی ہے۔ اب ہر آواز فرداً فرداً سنائی دیتی ہے۔ اب آپ مجھے یہ بتایئے کہ میں اپنے مطلوبہ دوست یا دشمن کی سوچوں کو کس طرح سُن سکتا ہوں؟"

جواب میں بوڑھے بابا کی سوچ سنائی دی "تم صرف اسی کے دماغ تک پہنچ سکتے ہو جسے تم نے اپنی زندگی میں کبھی دیکھا ہو اور اس کے چہرے کو اور اس کی آنکھوں کو یاد رکھا ہو۔ کیونکہ ہر انسان کی آنکھیں اس کے خیالات کی چغلی کھاتی ہیں اور چہرہ ان خیالات کا ردعمل پیش کرتا ہے۔ کتنے ہی لوگ اس حقیقت کو سمجھتے ہیں لیکن چہرے اور آنکھوں کے ذریعہ کسی کے خیالات تک پہنچنے کے علم سے لاعلم رہتے ہیں۔

تم علم کی اس حد تک پہنچ گئے ہو، یہاں ہر انسان کے جانے پہچانے چہرے اور ان کی آنکھوں کے راستے سے تم ان کی سوچ تک پہنچ سکتے ہو۔ میں تمھیں راستہ دکھاتا ہوں۔ تم سب سے پہلے یہ فیصلہ کرو کہ کس کا چہرہ اور آنکھیں ایسی ہیں، جو تمھاری یادداشت میں محفوظ ہیں۔ پھر تم اس کے چہرے کو چشمِ تصور میں لاؤ اور اس کی آنکھوں میں جھانکو، تم فوراً ہی اس کے دماغ تک پہنچ جاؤ گے۔"

میں سوچنے لگا۔ کتنے ہی چہرے ایسے تھے جو میری یادداشت میں محفوظ تھے پھوپھی اور زرینہ کو متواتر کئی سالوں سے دیکھتا آرہا تھا، ان کے چہرے اور آنکھیں میں کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔ ان کے علاوہ بچپن سے جوانی تک کی یادیں تھیں۔ چچا جان، چچی، غزالہ اور ظہیر کے چہرے ایسے تھے کہ ہر وقت ان کی تصویریں نگاہوں کے سامنے کھنچ جاتی تھیں۔ اور جو میری زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی، وہ میری بہن شاہینہ تھی۔ اس کے سامنے جتنے رشتے تھے جتنی محبتیں تھیں، وہ سب ہیچ تھیں۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں اپنی بہن شاہینہ سے رابطہ قائم کروں گا۔

بابا جی نے میری سوچ کو پڑھ لیا۔ پھر میرے دماغ میں ان کا مشورہ گونجنے لگا۔

"یہ اچھی بات ہے کہ تم اس علم کی آزمائش ابتدا اپنی بہن سے کر رہے ہو۔ تم نے بہن کے رشتے کو تمام خود غرض رشتوں پر ترجیح دی ہے۔ میری دعا ہے کہ تمھارا علم ہمیشہ نیک مقاصد کے لیے استعمال ہوتا رہے۔ اب میں تم سے رابطہ توڑ رہا ہوں۔ تم اپنی شاہینہ سے رابطہ قائم کرو۔"

میں نے ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے شاہینہ کا تصور کیا۔ پلک جھپکتے ہی اس کی معصوم صورت میری نگاہوں کے سامنے آگئی۔ میں اس کی روشن آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ بابا جی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں فوراً ہی اس کے دماغ میں ابھرنے والی سوچوں کو اپنی اندرونی سماعت سے سننے لگا۔

پتہ نہیں شاہینہ کہاں تھی اور کس حال میں تھی لیکن میں اس کی سوچ کو سُن رہا تھا۔ وہ بہت ہی سہانے اور رنگین خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اپنے کسی محبوب کے خیالوں میں گم تھی۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ میری بہن اپنے جیون ساتھی کا انتخاب کرچکی ہے۔ میں نے مزید معلومات کے لیے اس کے دماغ پر دستک دی۔

"شاہینہ!" میں نے اپنی سوچ کی قوت سے اسے پکارا۔

وہ شاید ٹھٹھک گئی تھی۔ ایک ساعت کے لیے اس کی سوچ تھم گئی تھی پھر اس نے سوچا "یہ کیا ہے؟ میں اپنے آپ کو شاہینہ کہہ کر کیوں مخاطب کر رہی ہوں۔"

اسی وقت میری سوچ نے کہا "شاہینہ میں تمھاری سوچ ہوں۔ ہر انسان کے اندر دو مختلف سوچیں ہوتی ہیں۔ ایک مثبت دوسری منفی، ایک سوالیہ دوسری جوابیہ سوچ۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ انسان خود ہی سوالیہ انداز میں سوچتا ہے اور خود ہی جواب دیتا ہے۔ لہٰذا میں تمھاری سوالیہ سوچ ہوں، بتاؤ کیا تمھیں اپنے فرہاد بھائی جان کی یاد نہیں آتی؟"

اس کے خیالات سنائی دیئے "ہائے اللہ! میں اپنے بھائی جان کو کیسے بھول سکتی ہوں؟ وہی مجھے بھول گئے ہیں۔ تقریباً پانچ سال گزر گئے، انھوں نے میری خبر نہیں لی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بھائی جان کو الزام دوں یا اپنی تقدیر کو۔ نہیں، میری تقدیر ہی خراب ہے۔ بھائی جان خود ہی ممی اور ڈیڈی کے ظلم کا شکار ہیں، نہ جانے وہ کس حال میں ہیں؟ شاید وہ یہاں ایک آدھ بار مجھ سے ملنے آئے ہوں مگر میں تو پنڈی میں رہتی ہوں۔ اب یہاں دو روز کے لیے آئی تھی، سوچا تھا کہ شاید بھائی جان کی صورت نظر آجائے لیکن افسوس، آج شام کو واپس جارہی ہوں....."

میں نے اس کی سوچ کو ٹوک دیا "تم واپس نہ جاؤ۔ تمھارے بھائی جان کل تم سے آکر ملیں گے۔"

اُس کی آواز آئی "میں مجبور ہوں، یہاں رُک نہیں سکتی۔ پرسوں سے ایم اے فائنل کے امتحان میں بیٹھنا ہے اگر آج نہ گئی تو تمام سال کی محنت ضائع ہوجائے گی۔"

میری سوچ نے کہا "ہاں تعلیم کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ تمھیں ضرور جانا چاہیئے۔ لیکن اس وقت تم سب کچھ بھول کر اس نوجوان کے متعلق سوچو، جسے تم اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتی ہو۔ اب فرض کرو کہ کبھی تمھارے بھائی جان نے اس نوجوان کا نام پوچھا تو کیا بتاؤ گی؟"

"جو نام ہے بتادوں گی۔ کہوں گی کہ اُن کا نام زبیر ہے، میرے کلاس فیلو ہیں۔ وہ ایک کروڑپتی باپ کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ انھیں اس بات پر ناز ہے کہ ان پر ہزاروں لڑکیاں مرتی ہیں۔ اسی لیے مجھے بھی وہ ان ہزاروں لڑکیوں میں سمجھتے ہیں لیکن میں سستی محبت کی قائل نہیں ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھے اپنی شریکِ حیات بنالیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے سوچنے کا انداز کیسے بدلوں۔ کاش کہ وہ میرے، صرف میرے ہی ہوتے۔"

میری شاہینہ مایوس ہورہی تھی۔ میں نے اس کے دماغ میں مثبت سوچ کا اثر ڈالا "تم فکر نہ کرو، زبیر تمھارا اور صرف تمھارا ہی ہوگا۔ تم دل لگا کر پڑھو اور اچھے نمبروں سے پاس ہوجاؤ۔ ایک کامیابی دوسری کامیابیوں کے راستے ہموار کردیتی ہے۔ اس بات کا یقین کرو کہ زبیر تمھاری کامیابی اور تمھاری ذہانت سے متاثر ہوگا فی الحال تمھیں صرف امتحان کے متعلق سوچنا چاہیئے۔"

"ہاں۔ واقعی مجھے صرف اپنے پرچوں کے متعلق سوچنا چاہیئے۔ میری کامیابی اور ذہانت زبیر کو متاثر کرے گی۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوجائیں گے کہ میں ہی صحیح معنوں میں ان کی شریکِ حیات بن سکتی ہوں۔"

وہ سوچتی رہی۔ میں نے اس سے خیالات کا رابطہ ختم کردیا۔ میرا خیال تھا

کہ بوڑھے بابا ہم بھائی بہن کے خیالات کو پڑھ رہے ہوں گے لیکن میرے دماغ میں صرف میری ہی سوچیں تھیں، بابا جی نہیں تھے۔ شاید وہ اپنا فرض پورا کرکے پھر کہیں گم ہوگئے تھے۔ مگر میں ان کا پیچھا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں ابھی بہت سی معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے فوراً ہی ان کا تصور کیا۔

میری نگاہوں کے سامنے ان کی تصویر ابھرنے لگی۔ جھریوں والا چہرہ، سفید داڑھی، سفید بھنویں اور سر کے بال بھی سفید تھے۔ ان کے چہرے کے اطراف سفید دودھیا روشنی کا ہالہ تھا۔ میں ان کی بوڑھی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

وہ سوچ رہے تھے "آہ! موت کے سرہانے لیٹ کر اس بات کا پختہ یقین ہوجاتا ہے کہ ہم ایک معینہ مدت سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ اپنی مختصر سی زندگی میں ہم کیسے کیسے تماشے کرتے ہیں۔ اس دنیا میں سب سے زیادہ دولت، عزت اور سب سے اونچا مقام حاصل کرنے کے لیے سو طرح کے علوم سیکھتے ہیں، اور پھر غلط راستوں پر چل پڑتے ہیں۔ میں نے بھی جوانی کے ایام میں اپنے علم سے ناجائز فائدے اٹھائے ہیں۔ مجھ سے ایسے جرائم سرزد ہوتے ہیں، میں ایسا گنہگار ہوں کہ اپنے ماضی کو یاد کرکے خود ہی شرم سے گردن جھکا لیتا ہوں۔

صرف انسان کا بڑھاپا ہی ایسا ہے جو اسے سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور نیکیوں کی طرف مائل کرتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جب جوانی کا تمام جوش سرد پڑگیا اور جوان عورتوں کے سامنے میرا بڑھاپا گھٹنے ٹیکنے لگا تب مجھے احساس ہوا کہ مرد تمام عمر عورت کو فتح نہیں کرسکتا اور دولت ہمارے ساتھ قبر میں نہیں جاتی۔ ہم جو کچھ اس دنیا سے چھینتے ہیں آخر کار اسی دنیا کی جھولی میں اسے واپس ڈال کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیتے ہیں۔

اس حقیقت کا علم ہونے کے بعد میں نے توبہ کرلی جیسا کہ ہر انسان بڑھاپے میں توبہ کرتا ہے معلوم ہوتا ہے یہ عادت ہمیں ورثے میں ملی ہے۔ ہم تو لوسو چوہے کھانے کے بعد روزے نماز کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ آہ! ہمیں کس وقت خدا یاد آتا ہے۔ اب تو زندگی مجھ سے دور ہوتی جارہی ہے اور موت سرہانے آکر کھڑی ہوگئی ہے۔ میں نے ناجائز دولت کو ٹھکرا دیا ہے۔ عورتوں سے منہ موڑ لیا ہے۔ آج میری آخری سانسوں میں کوئی میرے ساتھ نہیں ہے۔ میں اس دنیا میں اکیلا آیا تھا، اکیلا جارہا ہوں....."

بوڑھے بابا کی سوچ نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ میں نے فوراً ہی ان کے دماغ پر دستک دی۔

"بابا جی! بابا جی!! آپ تنہا نہیں ہیں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔ مجھے پہچانیئے، میں فرہاد ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے مجھ سے خیال کا رابطہ قائم کیا تھا اور میری راہ نمائی کی تھی۔ آپ میرے وقت پر کام آئے ہیں، میں آپ کے وقت پر کام آنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتایئے، اس وقت آپ کہاں ہیں؟ میں ابھی آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔"

جواب میں وہ اپنی سوچ کی لہریں میرے دماغ تک پہنچانے لگے۔

"بیٹے! میں نے اسی لیے تمھاری راہ نمائی کی ہے کہ تم ہمیشہ دوسروں کے کام آتے رہو۔ اپنے فائدے کے لیے کسی کو نقصان نہ پہنچاؤ صرف اپنے جائز حقوق حاصل کرو۔ دشمن للکارے تو اس کا جواب دو، ورنہ اسے مسکرا کر ٹال دو۔ اسی سے تمھیں عظمت اور برتری حاصل ہوگی۔ تم میرے کام آنا چاہتے ہو، یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ تم اسی طرح میرے کام آسکتے ہو کہ میری نصیحتوں پر عمل کرتے رہو۔ جہاں تک میرے پاس آنے کا تعلق ہے تو تم نہیں آسکو گے۔ میں تم سے جتنا قریب ہوں اُتنا ہی دُور ہوں، اور اپنی زندگی کی آخری چند سانسوں میں ساری دُنیا سے نظر بچا کر موت کو گلے لگانا چاہتا ہوں، تم کچھ خیال نہ کرو۔ میرے پاس یہی چند سانسیں ہیں، اور میں تنہائی میں اپنے اچھے اور بُرے اعمال کا حساب کر رہا ہوں تم میری سوچ میں دخل نہ دو۔ جو نصیحتیں کرچکا ہوں اس پر عمل کرو۔ تمھاری اچھائی سے میرے اعمال میں ایک اچھے عمل کا اضافہ ہوجائے گا۔ اچھا خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر انھوں نے رابطہ ختم کردیا۔ اُن کی آخری خواہش کے مطابق میں نے بھی ان کی سوچ میں دخل نہیں دیا۔ مجھے ان سے بچھڑنے کا اس قدر صدمہ ہورہا تھا کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ میں بہت دیر تک وہاں گُم سُم بیٹھا رہا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر گھر کی طرف چل دیا۔ وہ بوڑھے بابا سے میری آخری ملاقات تھی۔

بہر حال بابا جی نے مجھ میں اتنا حوصلہ اور خود اعتمادی بڑھادی تھی کہ میں اپنے طور پر خیال خوانی کے علم میں عبور حاصل کرنے لگا۔ میرا دماغ ریڈیو سیٹ کی طرح مکمل ہوتا گیا جس میں دنیا جہان کی آوازیں بھری ہوتی ہیں۔ ریڈیو کے کانٹے کو جس اسٹیشن پر لگایا جائے صرف اسی اسٹیشن کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میرے دماغ میں بھی ایک کانٹا تھا جسے توجہ کہتے ہیں۔ میں اپنی توجہ کو جس ہستی کے تصور پر مرکوز کردیتا، اسی ہستی کی سوچ کی لہریں میری قوتِ سماعت تک پہنچنے لگتیں، یہی عمل خیال خوانی یا ٹیلی پیتھی کہلاتا ہے۔ میں مسلسل محنتوں اور کاوشوں کے بعد اس مقام تک پہنچ گیا کہ میلوں دُور بیٹھی ہوئی کسی بھی ہستی سے دماغی رابطہ قائم کرنے لگا۔ صرف ایک شاہینہ ایسی تھی جس سے میں رابطہ قائم نہ کرسکا کیونکہ وہ سینکڑوں میل دور پنڈی میں رہتی تھی۔ میں نے ابتدا میں عملی تجربات کے لیے بار بار زرینہ کو اپنی معمول بنایا۔ زرینہ جہاں بھی ہوتی، جس حالت میں ہوتی، لیٹی رہتی یا بیٹھی رہتی، میں اس سے دماغی رابطہ قائم کرلیتا۔ مجھے زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ میں سوچ کی لہروں کو اپنے دماغ سے اس کے دماغ تک پہنچا دیتا تھا اور اس سے کہتا تھا۔

"تم میری تابع فرمان ہو۔ تم نے میری آنکھوں کو خوب غور سے دیکھا ہے اور ہمیشہ دیکھتی رہتی ہو۔ اس وقت اگر تم تنہا ہو تو چشمِ تصور سے میری آنکھوں کو دیکھو۔"

اس کی سوچ کی لہریں میرے دماغ تک پہنچیں "ہاں میں تنہا ہوں۔ تمھاری آنکھوں کو اپنے سامنے دیکھ رہی ہوں۔ شمع کی لو کی طرح تمھاری آنکھیں سُلگ رہی ہیں۔ اللہ! میں کیا کروں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کبھی تمھیں نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ تم میری محسنہ ہو اور اب تمھارے احسانات کا بدلہ چکانے کا وقت آگیا ہے میں تمھیں اتنی دولت دوں گا کہ تم اتنی دولت کا کبھی تصور بھی نہیں کرسکتیں۔ بس یہ آخری تجربہ ہے اس کے بعد میں تمھیں زحمت نہیں دُوں گا۔"

میرا وہ آخری تجربہ بھی کامیاب رہا۔ وہ میری معمول بننے کے بعد میرے ہر حکم کی تعمیل کرتی رہی۔ اس عمل کے دوران اس کی آنکھیں کھلی رہیں۔ وہ چشم تصور میں میری آنکھوں کو دیکھتی رہی، اور میری سوچ کے زیر اثر چلتے پھرتے میرا کام کرتی رہی۔ ایسے وقت میں کسی کو قتل کرنے کا حکم دیتا تو وہ بے دریغ و بلا تامل اسے قتل کر دیتی۔ بہر حال میری ذہنیت مجرمانہ نہیں تھی، ورنہ آج سے پانچ سال پہلے ہی میں اپنے چچا کو قتل کر دیتا مگر اب مجھ میں ایسی صلاحیتیں پیدا ہو گئی تھیں کہ میں خون خرابے کے بغیر اپنی زمینیں اور زمینوں سے حاصل کی ہوئی دولت اور جائداد ان سے واپس لے سکتا تھا۔

میں اب تک ایک لڑکی پر تجربات کرتا رہا اور اپنی صلاحیتیں آزماتا رہا۔ پھر یہ سلسلہ میں نے ختم کر دیا۔ ایک مدت کے بعد اپنی محدود دنیا سے باہر آگیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ میں پہلی بار اس وسیع دنیا کے میدان عمل میں آگیا جہاں کتنے ہی ہنگامے اور قدم قدم پر للکارنے والے اور اکسانے والے دشمن میرا انتظار کر رہے تھے۔

میرا پہلا ٹارگیٹ میرے چچا جان تھے۔

ایک شام میں لارنس گارڈن میں ذرا وقت گزارنے چلا آیا۔ میں اکثر ذہنی سکون اور دماغی طراوت حاصل کرنے یہاں چلا آتا تھا۔ یہاں کی سرسبز و شاداب فضا اور رنگ برنگے پھولوں کے ماحول میں ساری تھکن اور پریشانیاں دور ہو جاتی تھیں۔ مسکراتی ہوئی حسیناؤں کے گلرنگ چہرے اڑتے ہوئے آنچل اور مہکتی ہوئی ادائیں میرے دل و دماغ کے دریچے کھول دیتی تھیں اور ان میں جھانک کر کہتی تھیں کہ تمہارے علم و عمل کے آگے جہاں اور بھی ہیں، اور وہ جہان رنگ و بو صرف ہماری زلفوں میں ہے۔ کبھی اس جہان میں بھی قدم رکھ کر دیکھو۔

ہاں۔ میں نے خود کو بہت سنبھالا تھا، گھر میں ایک نوخیز حسینہ تھی اس کے باوجود اپنے جذبات کو کچلتا رہا تھا۔ میرے اندر کتنے طوفان مچل رہے تھے، یہ میں جانتا تھا، اور یہ بھی جانتا تھا کہ جب بھی یہ جذباتی طوفان میرے ضبط کے بندھن توڑ کر نکلیں گے، میں ایک تنکے کی طرح ان کی زد میں آجاؤں گا اور اپنے عزائم کی تکمیل کا پھر کوئی راستہ مجھے نہیں ملے گا۔

میں تقریباً ایک گھنٹے تک پھولوں کی انجمن میں خراماں خراماں ٹہلتا رہا پھر گارڈن کے ایک دور افتادہ گوشے میں آگیا۔ رات کی سیاہی رفتہ رفتہ پھیلتی جا رہی تھی۔ اس طرف کسی کے آنے کا امکان نہیں تھا۔ میں ایک جھاڑی کے پیچھے آکر گھاس کے فرش پر پلتھی مار کر بیٹھ گیا۔ اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ لیے اور مراقبے میں چلا گیا۔

میرا رخ شمال کی طرف تھا۔ شمال سے جنوب کو بہنے والی مقناطیسی لہریں میرے دماغ تک پہنچ رہی تھیں اور میں اپنے خیال کی لہریں چچا کے دماغ تک پہنچا رہا تھا۔ ان کی تصویر میری نگاہوں کے سامنے تھی لیکن ان سے خیال کا رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ بہت ساری آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ چچا جان مجھ سے سینکڑوں میل دور ہیں، اگر اس شہر میں ہوتے تو فوراً ہی رابطہ قائم ہو جاتا۔

میں تھوڑی دیر تک سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں آج ہی سے اپنی زندگی کا ایک نیا باب کھولنا چاہتا تھا۔ میرے جسم پر معمولی سا لباس تھا۔ میری جیب میں گنتی کے پیسے تھے۔ میں لاکھوں کی جائداد کا حقدار ہو کر اب مزید مفلسی اور تنگ دستی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ چچی سے کچھ رقم وصول کر کے اپنا کام چلانا چاہیے کیونکہ چچی کے پاس بھی جو کچھ تھا وہ میرا ہی مال تھا۔ مجھے چوری نہیں کرنی تھی۔ جبراً کسی سے کچھ چھیننا نہیں تھا۔ اپنا ہی مال سود در سود وصول کرنا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے چچی سے دماغی رابطہ قائم کیا۔

میری نگاہوں کے سامنے پہلے ان کا چہرہ آیا۔ پھر جانی پہچانی نفرت سے بھری ہوئی آنکھیں۔ میں ان آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ان کی سوچ تک پہنچ گیا پہلے مجھے گنگنانے کی آواز سنائی دی۔ یقیناً چچی صاحبہ موڈ میں آکر گنگنا رہی تھیں۔ سُر ان کے دماغ سے نکل رہے تھے اور مجھ تک پہنچ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد گنگناہٹ ختم ہو گئی میں ان کے خیالات پڑھنے لگا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس وقت وہ آئینہ کے سامنے ہیں۔ ان کی سوچ کہہ رہی تھی۔

"آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ میں ابھی تک جوان نظر آتی ہوں میرے ملنے والے سب ہی لوگ مجھے میرے بچوں کی ماں نہیں کہتے، بڑی بہن سمجھتے ہیں۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ ابھی تک بڑھاپا مجھ سے دور ہے۔ جہاں دولت ہو، کھانے کے لیے مرغن غذائیں ہوں اور خاوند بوڑھا ہو تو عورت ہمیشہ جوان رہتی ہے۔ آج کی تقریب میں میں زمرد کی انگوٹھی اور ہیرے کی لاکٹ والا نیکلس پہن کر جاؤں گی۔ کہیں کہیں سے جھلک کھانے والا بڑھاپا میرے جواہرات کی جگمگاہٹ میں چھپ جاتا ہے....."

وہ اپنی دولت اور اپنے بوڑھے شباب کے متعلق سوچ رہی تھیں، اور کسی تقریب میں جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اس سے پہلے ہی مجھے ان کے پاس پہنچنا تھا۔ میرے خیال نے ان کے دماغ پر دستک دی۔

"ہیلو بیگم ناصر!"

میری سوچ جیسے ہی ان کے دماغ تک پہنچی، وہ ٹھٹھک گئیں۔ کیوں کہ ایک ساعت کے لیے وہ خالی الذہن ہو گئی تھیں۔ پھر انھوں نے سوچا۔

"یہ کیسی آواز ہے؟ کیا میں نے اپنے آپ کو بیگم ناصر کہا ہے؟"

"ہاں!" میرے خیال نے ان کے دماغ سے سرگوشی کی۔ "میں تمھارا اندر ہوں۔ تمھاری سوچ ہوں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان خود سوچتا ہے اور خود ہی جواب دیتا ہے۔ جواب دو، تم کہاں جا رہی ہو؟"

"غزالہ کی ایک سہیلی کے ہاں شادی کی تقریب میں جا رہی ہوں۔"

"اچھی بات ہے مگر جانے سے پہلے تمھیں کچھ بھولی ہوئی باتیں یاد کرنا چاہیے۔ تم ان آنکھوں کو یاد کرو جنھیں دیکھتے ہی تم ڈر جایا کرتی تھیں۔ ایک بار تم نے اپنے خاوند سے کہا تھا کہ اس لڑکے کی آنکھوں میں کوئی بدروح گھسی ہوئی ہے۔"

"ہاں!" چچی کی سوچ میں ایک لمبی سی 'ہاں' ابھری۔ "ہاں یاد آیا۔ وہ کمبخت فرہاد کی آنکھیں تھیں۔"

"کیسی آنکھیں تھیں؟ ذرا ان آنکھوں کو تصور میں لاؤ۔ دیکھو دیکھو وہ آنکھیں تمھارے خیالوں میں روشن ہو رہی ہیں۔ انھیں توجہ سے دیکھو!"

"ہاں۔ وہ نظر آرہی ہیں۔ تو بہ کیسی ڈراؤنی آنکھیں ہیں۔ پہلے تو ایسی نہیں تھیں۔ اُف! مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اس تصور سے نظریں ہٹانا چاہتی ہوں، مگر نہیں ہٹا سکتی۔ ایسا لگتا ہے جیسے میرا تمام وجود ان آنکھوں سے چپک کر رہ گیا ہے یہ کمبخت اچانک ہی مجھے کیسے یاد آگئیں؟"

میں نے خلا میں گھورتے ہوئے ان کی سوچ کو اپنی گرفت میں رکھا۔

"ان آنکھوں سے تمھارے خوف و دہشت کا پرانا رشتہ ہے۔ تم ان آنکھوں کو دیکھتی رہو گی۔ دیکھتی رہو گی اور تم دیکھ رہی ہو۔ تمھارا تصور، تمھاری سوچ اور تمھارا دماغ ان آنکھوں میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ تم اس دنیا سے غافل ہوتی جا رہی ہو۔ وہ آنکھیں حکم دے رہی ہیں۔ تم حکم کی تعمیل کر رہی ہو۔ بیٹھ جاؤ!"

ایک ذرا توقف کے بعد میں نے پوچھا۔ "کہاں بیٹھی ہو؟"

"میں نہیں جانتی کہ کہاں بیٹھی ہوں۔ ان آنکھوں کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔"

"دوطرفہ بصیرت سے کام لو۔ اپنی دماغی آنکھوں سے فرہاد کی آنکھوں کو دیکھتی رہو اور ظاہری آنکھوں سے اپنے ماحول پر نظر رکھو۔ بولو تم کہاں بیٹھی ہو؟"

چند لمحوں کے بعد ان کی سوچ کی لہروں نے کہا۔ "میں سنگار میز کے سامنے ایک کشن پر بیٹھی ہوں۔"

"ٹھیک۔ اب وہ آنکھیں تمھارے دماغ میں پیوست رہیں گی لیکن تم ظاہری آنکھوں سے اس دنیا کو دیکھتی رہو گی اور اپنے ملنے جلنے والوں سے حسب معمول باتیں کرتی رہو گی مگر تمھاری سوچ کو وہ سلگتی ہوئی آنکھیں کنٹرول کرتی رہیں گی۔ اب وہ آنکھیں تم سے پوچھتی ہیں۔ بتاؤ تمھارا خاوند ناصر علی کہاں ہے؟"

"وہ اس وقت کراچی میں ہے۔"

"تمھارا بیٹا ظہیر کہاں ہے؟"

"ظہیر غزالہ کے ساتھ اس کی سہیلی کی شادی کی تقریب میں گیا ہے۔"

"تمھاری دوسری بیٹی شاہینہ کہاں ہے؟"

"وہ پنڈی میں اپنے نانا کے ہاں رہتی ہے۔"

"اس وقت کوٹھی میں کتنے ملازم ہیں؟"

"ہمیں کھانے کی دعوت ہے اس لیے باورچی کو چھٹی دے دی ہے۔ صرف ایک ملازم کوٹھی کی نگرانی کے لیے موجود ہے۔"

"چلو۔ اپنی جگہ سے اٹھو اور اس ملازم سے جا کر کہو کہ ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ کوارٹر میں جا کر آرام کرے۔ جب ضرورت ہو گی تم اسے بلا لو گی۔ اور سنو! تم اپنی ہر حرکت کے متعلق سوچتی جاؤ کہ تم کیا کر رہی ہو اور کہاں جا رہی ہو؟"

وہ سوچنے لگیں۔ "میں کشن سے اٹھ رہی ہوں۔ اپنے بیڈ روم سے باہر جا رہی ہوں۔ میں کاریڈور سے گزر رہی ہوں، اب میں ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی ہوں اور اب مجھے ملازم کو آواز دینا چاہیے۔ چوکیدار، چوکیدار یہاں آؤ!"

تھوڑی دیر میں وہ چوکیدار کو حکم دے رہی تھیں کہ وہ کوارٹر میں چلا جائے، ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر وہ سوچنے لگیں۔

"چوکیدار واپس جا رہا ہے۔ میں بھی اپنے کمرے میں واپس جا رہی ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "تمھارے کمرے کے آئرن سیف میں کتنے روپے ہیں؟"

"تیس ہزار روپے ہیں۔"

"اور کیا ہے؟"

"زمرد کی انگوٹھی اور زیورات کے سیٹ میں ہیرے کی لاکٹ والا نیکلس ہے۔"

"تمھارے پرس میں کتنے روپے ہیں؟"

"ڈھائی ہزار روپے ہیں۔"

"تم اپنا پرس لے کر باہر پورچ میں آجاؤ۔ وہاں ایک اجنبی ٹیکسی میں آرہا ہے۔ تم اسے پہچانتی ہو لیکن اسے نہیں پہچانو گی۔ تمھاری یادداشت سے وقتی طور پر اس کا چہرہ گم ہو جائے گا۔ لہٰذا وہ تمھارے لیے ایک اجنبی ہو گا۔ تمھیں اس ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنا ہے۔ بولو جب تک وہ نہ آئے تم پورچ میں کھڑی اس کا انتظار کرتی رہو گی۔"

"ہاں۔ میں انتظار کرتی رہوں گی۔"

"اچھا۔ وہ آرہا ہے، پورچ کی طرف جاؤ۔"

چچی صاحبہ میرے حکم کے مطابق عمل کر رہی تھیں اور اپنی ہر حرکت کے متعلق سوچتی جا رہی تھیں۔

"میں نے سنگار میز پر سے اپنا پرس اٹھا لیا ہے۔ میں پھر اپنے بیڈ روم سے باہر جا رہی ہوں — میں کاریڈور سے گزر رہی ہوں — اب میں ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی ہوں اور یہاں سے گزرتی ہوئی باہر پورچ کی طرف جا رہی ہوں — اور اب میں پورچ کے برآمدے میں آکر کھڑی ہو گئی ہوں۔"

میری سوچ نے کہا۔ "شاباش! اسی طرح کھڑی رہو۔ وہ اجنبی آرہا ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے مراقبہ ختم کر دیا اور جھاڑیوں کے پیچھے سے اٹھ کر جانے لگا۔ اس وقت رات کی تاریکی پھیل گئی تھی۔ بجلی کے قمقموں سے لارنس گارڈن دور دور تک روشن تھا۔ رومانی جوڑے کہیں بیٹھے ہوئے تھے، کہیں ٹہل رہے تھے۔ گارڈن کے ریسٹورنٹ میں دل پھینک قسم کے رئیس زادوں کی بھیڑ نظر آرہی تھی۔ وہیں ایک میز پر قیصر نظر آگیا۔

وہی قیصر جو غزالہ کا بوائے فرینڈ تھا اور پانچ سال پہلے جس کی میں نے اچھی طرح پٹائی کی تھی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ٹھنڈی بوتل پی رہا تھا۔ ہمارے درمیان تقریباً بیس گز کا فاصلہ تھا۔ میں نے فوراً ہی اس سے دماغی رابطہ قائم کیا۔ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔

"اچھا۔ تو یہ فرہاد کا بچہ اسی شہر میں ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہاں سے جا چکا ہے۔ سور۔ کمینہ۔ اس نے غزالہ کے سامنے مجھے مارا تھا۔ اس کی وجہ سے وہ حسینہ ہاتھ سے نکل گئی۔ مجھے بزدل کہتی ہے۔ میں نے اس الو کے پٹھے سے انتقام نہ لیا تو میرا نام قیصر نہیں....."

اتنا سوچ کر وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ "بشیرے! اُس آدمی کو پہچان لے۔ وہ جو اُدھر سامنے والی روش پر کھڑا مجھے گھور کر دیکھ رہا ہے۔"

بشیرے نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ چند لمحوں بعد وہ قیصر سے کچھ کہنے لگا۔ میں ایک وقت میں ایک ہی شخص سے دماغی رابطہ رکھ سکتا تھا اس لیے بشیرے کی باتیں نہ سُن سکا۔ البتہ اس کے بعد قیصر کا جواب سُنائی دیا۔ اس کی باتیں اس لیے سُنائی دے رہی تھیں کہ انسان بولنے سے پہلے سوچتا ہے۔ سوچنے اور بولنے کی قدرتی ترتیب یہ ہے کہ پہلے دماغ سے سوچ کی لہریں نکلتی ہیں۔ پھر وہ لہریں قوتِ گویائی تک پہنچتی ہیں۔ اس وقت میں قیصر کے بولنے سے پہلے ہی اس کی سوچ کو پڑھ رہا تھا۔ وہ بشیرے سے کہہ رہا تھا۔

"اچھا تو تم اسے جانتے ہو۔ یہ شاہدرہ میں رہتا ہے —— ہاں بالکل ٹھیک —— ایک اسکول مسٹریس کے ہاں رہتا ہے۔ مجھے بھی یاد آگیا۔ غزالہ کہتی تھی کہ اس کی پھوپھی ایک اسکول مسٹریس ہے۔ یار! تم پتہ چلاؤ کہ یہ کہاں آتا جاتا ہے۔ میں اسے گھیر کر مارنا چاہتا ہوں۔"

بشیرے نے کچھ کہا۔ قیصر نے اس کا جواب دیا۔

"نہیں۔ ابھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں ہے۔ یہاں بیچ بچاؤ کرنے والے بہت سے لوگ آجائیں گے۔ میں اس کم بخت کو ایسی جگہ مارنا چاہتا ہوں، جہاں پانی نہ ملے۔"

میں نے دماغی رابطہ توڑتے ہوئے اپنے دل میں کہا۔

"میں بھی اس وقت تم سے الجھنا نہیں چاہتا۔ میرے لیے اتنی ہی اطلاع کافی ہے کہ تم مجھ سے انتقام لینا چاہتے ہو۔ اب میں تم سے محتاط رہوں گا۔"

میں دشمنوں سے کترا کر گارڈن سے باہر آگیا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر کوٹھی کی طرف روانہ ہوگیا۔ بہت عرصے کے بعد میں ایک ٹیکسی کی آرام دہ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ میرے دشمن میری دولت سے خریدی ہوئی ایئر کنڈیشنڈ کاروں میں کتنے مزے سے سیر و تفریح کرتے رہے ہیں اور میں سڑکوں پر پیدل چلتا رہا ہوں۔ اب انشاءاللہ وہ پیدل چلیں گے اور میں ایئر کنڈیشنڈ کار میں تفریح کے لیے نکلا کروں گا۔

میں زیادہ دیر خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہتا، زیادہ تر کام کی باتیں سوچتا ہوں۔ میں نے خوش آئند خیالات کو فوراً ہی ذہن سے جھٹک دیا اور دوبارہ چچی سے رابطہ قائم کیا۔ میں نے خیالوں کی خاموش زبان سے پوچھا۔

"کیا کر رہی ہو؟"

"پورچ کے برآمدے میں کھڑی ہوں۔"

"تم بالکل تنہا ہو؟"

"ہاں۔ تنہا ہوں۔ چوکیدار جا چکا ہے۔ نہ جانے وہ اجنبی کب آئے گا؟"

"کیا تم تنہائی سے بور ہو گئی ہو؟"

"ہاں۔ انتظار سے کوفت ہو رہی ہے۔"

"واقعی ہو رہی ہوگی۔ کچھ دیر پہلے تم آئینے کے سامنے گنگنا رہی تھیں۔ کوفت اور بوریت کو دُور کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کچھ گنگناتی رہو۔ تمھاری آواز بڑی سُریلی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ستر برس کی بڑھیا اپنی گذری ہوئی جوانی کا ماتم کر رہی ہے —— وہ سسکتی ہوئی آنکھیں تمھیں حکم دیتی ہیں۔ گنگناؤ......!"

یہ کہہ کر میں نے رابطہ توڑ دیا۔ پندرہ منٹ کے بعد جب ٹیکسی کوٹھی کے پورچ میں آکر رُکی تو وہ بے سُری آواز میں گنگنا رہی تھیں۔

میں ٹیکسی سے اُتر کر باہر آیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے پہچانتی ہیں یا نہیں —— نہیں، وہ میرے زیرِ اثر تھیں۔ میں نے ان کی یادداشت سے پُرانی جان پہچان کو مٹا دیا تھا۔ وہ مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھتی ہوئی گنگنا رہی تھیں۔

میں نے ان کے ہاتھ سے پرس لیا اور اس میں سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کو دیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے پرس کے تمام روپے اپنی جیب میں رکھے۔ اسے خالی کر کے انھیں دیتے ہوئے کہا۔

"تم بہت اچھا گا لیتی ہو۔ اب بس کرو، میرے ساتھ آؤ!"

وہ میرے ساتھ چلتی ہوئی کوٹھی میں داخل ہوئیں۔ میں نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ ان کی خوابگاہ میں پہنچ کر میں نے حکم دیا۔

"وہاں سامنے صوفے پر بیٹھ جاؤ!"

وہ بیٹھ گئیں۔ ان کے سامنے والے صوفے پر میں بیٹھ گیا۔ اس وقت بھی میں زبان سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا اور وہ اپنی سوچ کے ذریعے جواب دے رہی تھیں۔ میں نے پوچھا۔

"تمھاری سوچ پر میری آنکھوں کا پہرہ ہے۔ میری آنکھیں تم سے پوچھتی ہیں، بتاؤ تمھارے خاوند ناصر علی کے پاس زمینوں کے جو کاغذات ہیں، تم ان کے متعلق کیا جانتی ہو؟"

وہ سوچنے لگیں اور میں سُننے لگا۔

"میرے خاوند کے پاس دو قسم کے کاغذات ہیں۔ ایک اصلی ہیں جو زمینوں پر فرہاد کے باپ تیمور رسل کی ملکیت ثابت کرتے ہیں۔ دوسرے کاغذات جعلی ہیں۔ یہ کاغذات میرے خاوند اور پٹواری کی مشترکہ سازشوں سے تیار کیے گئے ہیں۔ اس کے صلے میں ہم پٹواری کو ہر ماہ ایک ہزار روپے دیتے ہیں۔ فرہاد کی پھوپھی اس فریب کو کسی حد تک سمجھتی ہے مگر ان کنگالوں کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے کہ وہ برسوں تک زمینوں کے لیے مقدمہ لڑتے رہیں۔"

"زمینوں کے اصلی کاغذات کہاں ہیں؟"

"بینک کے لاکرز میں ہیں۔"

"لاکر کس کے نام پر ہے؟"

"میرے نام پر۔"

"ناصر علی اتنی اہم دستاویزات تمھارے پاس کیوں رکھتا ہے؟"

"میں خود اسے اتنا موقع نہیں دیتی کہ وہ ایسی چیزیں اپنے پاس رکھے۔ کیا پتہ کل کو بھتیجے کی محبت جوش مارے اور وہ ایماندار بن کر اس کے کاغذات واپس کر دے۔ ایسی صورت میں میرا بیٹا کنگال ہو جائے گا۔ میرا خاوند میرے اشاروں پر ناچتا ہے۔ زمینوں اور دُکانوں کی تمام آمدنی میرے پاس لاتا ہے۔ میں وہ تمام رقم مختلف بینکوں میں رکھتی ہوں۔"

"تمھارے اکاؤنٹ میں کتنے رُپے ہیں؟"

"پندرہ لاکھ ستر ہزار روپے ہیں!"

"زیورات کہاں ہیں اور کتنی مالیت کے ہیں؟"

"زیورات لاکرز میں ہیں۔ ان کی مالیت تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے ہے۔"

"اس وقت اس کمرے کے آئرن سیف میں تیس ہزار روپے اور زیورات ہیں؟"

"ہاں تیس ہزار روپے اور زیورات ہیں۔"

"چلو اٹھو۔ اپنی کوئی اٹیچی نکالو اور سیف کے تمام روپے اور زیورات اس اٹیچی میں رکھ دو۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئیں اور الماری کے پاس جا کر اسے کھولنے لگیں۔ بے چاری چچی جان کتنی اچھی تھیں۔ جس دولت کو بے ایمانی سے حاصل کیا تھا، اسے بڑی ایمانداری اور فرمانبرداری سے میرے حوالے کر رہی تھیں۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب آگیا۔ الماری میں بہت سے قیمتی ملبوسات نظر آرہے تھے۔ ہینگرز میں کتنی ہی قیمتی ساڑیاں لٹک رہی تھیں۔ مجھے زرینہ اور پھوپھی کا خیال آیا، جن کے پاس پہننے کے لیے برائے نام معمولی سے کپڑے تھے۔ میں نے تمام ساڑیاں اور گرم شالیں نکالتے ہوئے کہا۔

"انھیں بھی اٹیچی میں رکھ دو!"

انھوں نے حکم کی تعمیل کی۔ پھر وہاں سے اٹیچی اٹھا کر آئرن سیف کے پاس آئیں۔ سیف میں سو اور پچاس کے نوٹوں کی کئی گڈیاں اور زیورات کے کئی سیٹ رکھے ہوئے تھے۔ ان میں زمرد کی انگوٹھی اور ہیرے کی لاکٹ والا نیکلس بھی تھا۔ میں نے تمام چیزیں اٹیچی میں رکھوا دیں۔ تجوری ایسے خالی ہو گئی جیسے جھاڑو پھیر کر گرد صاف کر دی گئی ہو۔ میں نے اٹیچی کو بند کرتے ہوئے کہا۔

"جاؤ۔ واپس اپنی جگہ جا کر بیٹھ جاؤ!"

وہ صوفے پر آکر بیٹھ گئیں۔ میں اٹیچی اٹھا کر ان کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"مرحوم تیمور رسل کی زمینوں کے اصلی اور جعلی کاغذات تم لاکرز سے نکال کر لاؤ گی؟"

"لاؤں گی!"

"کل بینک ہولی ڈے ہے، پرسوں صبح تم میری آنکھوں کی رہنمائی میں بینک جاؤ گی اور وہ کاغذات لاکرز سے نکال کر میرے حوالے کرو گی!"

"کروں گی!"

"اب تم بتاؤ، میرا نام کیا ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔ تم میرے لیے اجنبی ہو۔"

"شاباش! میرے یہاں سے جانے کے بعد تم یہ بھی بھول جاؤ گی کہ یہاں کوئی اجنبی آیا تھا۔ بولو، اجنبی کو بھول جاؤ گی!"

"اجنبی کو بھول جاؤں گی۔"

"اچھا اب میں جاتا ہوں۔ ذرا اپنی سُریلی آواز میں گنگناؤ!"

وہ گنگنانے لگیں۔ میں نے اپنے ایک کان میں انگلی ٹھونسی، دوسرے ہاتھ سے اٹیچی اٹھائی اور ان کی گنگناہٹ سے دُور ہوتا چلا گیا۔

کوٹھی کے احاطے سے باہر آکر میں کچھ دُور تک پیدل چلتا رہا۔ پھر ایک ٹیکسی مل گئی۔ میں پچھلی سیٹ پر آرام سے پھیل کر بیٹھ گیا۔ اپنی پہلی کامیابی پر میں کس قدر نازاں و مسرور تھا، یہ بیان نہیں کر سکتا۔ ابھی زمین کے کاغذات حاصل کرنے کا ایک اہم مرحلہ رہ گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پرسوں اس مرحلے سے بھی گذر جاؤں گا۔

راوی روڈ سے گذرتے وقت میں نے سوچا کہ راستہ سنسان ہے۔ میرے پاس بھری ہوئی اٹیچی ہے اور عام طور سے ٹیکسی ڈرائیوروں کی ذہنیت مجرمانہ ہوتی ہے مجھے اس ڈرائیور سے ہوشیار رہنا چاہیے اور اس کے دماغ میں چھپے ہوئے خطرناک ارادوں سے باخبر رہنا چاہیے۔

میں نے سیٹ کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں اور اس کی سوچ کو پڑھنے لگا۔ وہ ڈرائیو کر رہا تھا لیکن ایک ذہنی کش مکش میں مبتلا تھا۔

"میں کیا کروں؟ مجھ سے چوری اور بے ایمانی کیوں نہیں کی جاتی؟ جی تو چاہتا ہے کہ جو بھی مالدار سواری آئے، اس کا گلا دبوچ کر ساری رقم چھین لوں۔ میں یہ ٹیکسی چلا کر بہن کی ڈولی نہیں اٹھا سکتا۔ اس کا جہیز پورا نہیں کر سکتا۔ اس زمانے میں ایک بھائی مجرم بن کر ہی بہن کے ہاتھ پیلے کر سکتا ہے۔ میرے دوسرے ساتھی کہتے ہیں کہ میں بزدل ہوں، مجرم نہیں بن سکتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ میری شرافت کو بزدلی کہا جاتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ جو بزدل ہوتے ہوں، وہ شریف بن کر رہنے میں ہی بہتری سمجھتے ہوں لیکن سوچنے سمجھنے کے انداز میں بھی تو شرافت ہوتی ہے، خدا کا خوف ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بے ایمانی کے پیسوں سے بہن کو سہاگن بناؤں گا تو وہ سدا سُکھی نہیں رہے گی۔ اللہ تعالیٰ اسی دنیا میں بداعمالی کی سزائیں دے دیتا ہے.....!"

وہ سوچ رہا تھا اور میں سُن رہا تھا۔ انسان پیدائشی طور پر انسان ہی ہوتا ہے۔ وہ کبھی شیطان بن کر پیدا نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں آنے کے بعد اس کے اندر نیکی اور بدی کی کش مکش پیدا ہوتی ہے۔ اس ڈرائیور کے اندر بھی وہی کشمکش جاری تھی۔ نیکی کا جذبہ غالب آتا تو وہ ہزار مصائب و مسائل کا سامنا کرتے ہوئے بھی اپنا ایمان برقرار رکھتا اور اگر بدی غالب آجاتی تو وہ مجھے چاقو یا ریوالور دکھا کر مجھ سے اٹیچی چھین کر لے جاتا۔

میں بڑی خاموشی سے اس کے خیالات پڑھتا رہا اور انتظار کرتا رہا

کہ آخر وہ کس فیصلے پر پہنچے گا؟ ٹیکسی تیز رفتاری سے بھاگی جا رہی تھی۔ میں اپنی منزل کے قریب ہوتا جا رہا تھا لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا۔ آخرکار اس نے جھلا کر سوچا۔ ”میں اس سواری کی اٹیچی پر کیوں ہاتھ ڈالوں۔ کیوں کسی کو لُوٹوں۔ ابھی تو ایمانداری کا ایک راستہ باقی ہے۔ جب کچھ نہ بن سکے گا تو میں بہن کو سہاگن بنانے کے لیے اپنی ٹیکسی بیچ دوں گا۔ بلا سے میری روزی روٹی کا یہ واحد ذریعہ فروخت ہو جائے لیکن ایک بہت بڑے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گا....!“

میں نے اپنے محلّے کے قریب پہنچ کر اس سے کہا۔ ”بس یہاں روک دو۔“ ٹیکسی رُک گئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔“

”جی صاحب جی۔ پریشانی تو ہر انسان کے ساتھ ہوتی ہے۔ کسی کے ساتھ کم ہوتی ہے، کسی کے ساتھ زیادہ۔ مشکل تو یہ ہے کہ ہم دن رات محنت کر کے بھی اس پریشانی کو دُور نہیں کر سکتے....!“

”تم کتنے بھائی بہن ہو؟“

”صرف ایک بہن اور بوڑھی ماں ہے۔ باپ شرابی تھا۔ مرتے وقت اتنا قرضہ چھوڑ کر گیا کہ یہ ٹیکسی کے چار پہیّے ابھی تک اسے ادا کرتے آ رہے ہیں۔ پھر یہ کہ بہن کی شادی کی تاریخ مقرّر کی تھی، وہ تاریخ بھی تیزی سے قریب آ رہی ہے۔ وہ میری ایسی بہن ہے جسے میں نے گود میں کھلایا ہے۔ میں اس کے تمام ارمان پورے کرنا چاہتا ہوں۔“

اچانک ہی مجھے اپنی شاہینہ یاد آ گئی۔ اس لمحے میرے اور ڈرائیور کے سینے میں ایک بھائی کا دل تھا اور اس دل میں بہن کی تمام خوشیاں پوری کرنے کے ارمان تھے۔ میں نے اس سے کہا۔

”ذرا یہاں آ کر یہ اٹیچی اٹھا دو، بہت بھاری ہے۔“

وہ ذرا دیر کے لیے ہچکچایا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اٹیچی کو ہاتھ نہیں لگانا چاہتا ہے۔ ایمان ڈگمگا جانے کا اندیشہ ہے۔ پھر وہ اگلا دروازہ کھول کر باہر آیا اور اٹیچی اٹھانے کے لیے پچھلا دروازہ کھول دیا۔ اسی وقت میں نے بھی اٹیچی کا منہ کھول دیا۔ اوپر ہی سو اور پچاس روپے کی کتنی ہی گڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی دلی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ وہ اس وقت کس طوفان میں گھرا ہوا ہے۔ میں نے نوٹوں کی ایک گڈی اٹھا کر کہا۔

”بڑی زبردست آزمائشوں کے بعد نیکی کا پھل ملتا ہے۔ میں اس میٹھے پھل کا مزہ تمھیں چکھانا چاہتا ہوں۔ یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو....!“

وہ خاموشی سے پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔

”میری بہن کا نام شاہینہ ہے، تمھاری بہن کا نام کیا ہے؟“

”سکینہ!“ اس نے جواب دیا۔

”نام دو ہیں مگر رشتہ ایک ہے اس لیے سکینہ بھی میری بہن ہے۔ یہ میری طرف سے اس کی شادی میں خرچ کرنا....!“

میں اس کی گود میں نوٹوں کی گڈیاں پھینکنے لگا۔ ایک ۔ دو ۔ تین ۔ چار ۔۔۔ وہ تقریباً چھ سات ہزار روپے تھے۔ اس کا منہ حیرت سے کُھل گیا تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسے وقت اسے کیا کہنا یا کرنا چاہیے۔ میں نے زیورات کا ایک سیٹ نکال کر اس کی گود میں رکھا اور دو عدد ساڑیاں بھی رکھ دیں۔

یک بیک وہ جھک گیا۔ اس نے میرے گھٹنوں پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بس اس وقت وہ یہی کر سکتا تھا۔ کچھ کہنے کے لیے یا شکریہ ادا کرنے کے لیے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے اس لیے آنسوؤں سے کام لے رہا تھا۔

میری بھی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ پہلی بار اپنا جائز حق حاصل کرنے کے بعد میں اس دولت کا ایک حصّہ ایک نیک مقصد کے لیے دے رہا تھا۔ میں نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔

”بس اب اٹھ جاؤ۔ آنسو پونچھ لو۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ خدا نے مجھے دیا، میں اپنی سکینہ بہن کو دے رہا ہوں۔ تم یہ چیزیں میری بہن تک پہنچا دو۔“

میں نے اٹیچی بند کر کے اسے اٹھایا اور ٹیکسی سے باہر آ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”لایئے، میں اسے آپ کے گھر تک پہنچا دوں گا۔“

”نہیں۔ تم یہاں سے واپس جاؤ۔ میرا گھر نہ دیکھو۔ مجھے بھُول جاؤ۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ یہ احسان نہیں ہے۔ آسمانی امداد ہے۔ تم میرے کسی کام آنے کی بجائے گھر جا کر شکرانے کی نماز ادا کرو....!“

یہ کہہ کر میں اس کا جواب سُنے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ دُور اندھیری گلی میں جا کر میں نے پلٹ کر دیکھا، وہ ابھی تک ٹیکسی کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ شاید ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اسے ایمانداری کا پھل توقع سے زیادہ کیسے مل گیا؟ کہاں سے مل گیا؟ کیا آسمانی امداد اسی طرح ایک انسان کے ذریعے دوسرے انسان تک پہنچتی ہے؟

میں پھر پلٹ کر اپنے راستے پر جانے لگا۔ اب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ محلّے کی گلیاں سنسان ہو گئی تھیں۔ سردی کی وجہ سے لوگ جلد ہی لحافوں میں دبک جاتے تھے۔ تمام گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بند ہو جاتی تھیں۔ میں اب اطمینان سے گھر کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ پھوپھی کا مکان گلی کے موڑ پر تھا جیسے ہی میں موڑ پر پہنچا، مکان کے دروازے پر کسی کا سایہ دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ گلی کی نیم تاریکی میں پہلے وہ سایہ پہچانا نہ گیا پھر میں سمجھ گیا کہ وہ جمال ہے۔ گھر کے دروازے سے لگ کر کھڑے رہنے کا یہی مقصد ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ زرینہ سے عشق کر رہا ہے اور یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ زرینہ اب ضبط کے سارے بندھن توڑ کر جذبات کے سیلاب میں بہہ جانے کے لیے آمادہ ہو گئی ہے۔

میں دیوار کے ساتھ ساتھ دبے قدموں چلتا ہوا جمال کے پیچھے آیا۔

ذرا سی آہٹ ہوئی تو وہ چونکا مگر میں نے فوراً ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔ آدھ کھلے دروازے سے زرینہ ایک سائے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پیچھے ہٹ کر کمرے کی تاریکی میں گُم ہو گئی۔ جمال میرے پنجے سے اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے جھٹکا دیتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

”جمال! اگر میں بات بڑھاؤں گا تو یہ لڑکی بدنام ہو جائے گی۔ میں اس بار تجھے چھوڑ دیتا ہوں، آئندہ میں نے اس گھر کے سامنے سے تجھے گذرتے دیکھا تو تیری لاش گرا دوں گا۔ جا بھاگ جا....!“

میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ گرتے گرتے سنبھل گیا۔ پھر تیزی سے بھاگتا ہوا چلا گیا۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہونے تک میں وہیں کھڑا رہا۔ پھر دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ زرینہ کمرے کے ایک گوشے میں لالٹین روشن کر رہی تھی۔ اپنا چہرہ چھپانے کے لیے وہ میری جانب پشت کیے کھڑی تھی۔

ایسے وقت اس کے خیالات کو سمجھنا لازمی تھا کہ عشق کی ناکامی کا اس پر کیا ردِ عمل ہو رہا ہے، وہ کیا سوچ رہی ہے؟

ہاں وہ سوچ رہی تھی۔ ”اللہ میں کیا کروں؟ میری چوری پکڑی گئی ہے ۔۔۔ پکڑی گئی ہے تو میری بلا سے ۔۔۔ میں کب تک فرہاد سے ڈرتی رہوں گی؟ کیا میں عورت نہیں ہوں؟ کیا میرے جذبات نہیں ہیں؟ وہ خود تو پتھر ہے۔ نہ میرے پاس آتا ہے، نہ کسی کو آنے دیتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟ اچھی بات ہے۔ ابھی یہ مجھے میری غلطی پر ڈانٹے گا تو پہلے میں اپنے طور پر صفائی پیش کروں گی۔ اگر یہ نہیں مانے گا تو آج دو ٹوک فیصلہ ہو گا۔ میں ابھی شور مچاؤں گی کہ یہ میری عزّت سے کھیلنا چاہتا ہے اور جھوٹ موٹ کسی جمال کا نام لیکر مجھ پر تہمت لگا رہا ہے۔“

میں پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ لڑکی واقعی لاوے کی طرح اندر سے پک رہی تھی۔ جب تک اس کے اندر کی آگ سرد نہ ہوتی، اس کے سوچنے کا انداز کبھی نہ بدلتا۔ میں نے پھوپھی کی طرف دیکھا۔ وہ بے خبر سو رہی تھیں۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ ان کی معصوم اور شرمیلی بیٹی ان کے اعتماد کو دھوکا دے سکتی ہے اور مجھے خواہ مخواہ بدنام کر سکتی ہے اس لیے وہ بے چاری بڑے اعتماد سے گہری نیند سو رہی تھیں۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا زرینہ کے پاس آیا۔ اس کے بالکل قریب پہنچ کر میں نے محبت بھری سرگوشی میں اس کا نام لیا۔ ”زرینہ!“

وہ جلدی سے اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔ ”میں نے دستک سُن کر دروازہ کھولا تھا۔ میں سمجھی تھی کہ تم آئے ہو۔ میں ۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ جمال ہے۔“

اگر وہ جانتی کہ میں اس کے خیالات پڑھ چکا ہوں تو اتنی معصوم بن کر کبھی اپنی پارسائی نہ جتاتی ۔۔۔ جو کچھ بھی ہو، میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ لڑکی اپنے آپ کو سنبھال کر نہیں رکھ سکتی۔ اسے جب بھی موقع ملے گا، یہ کسی نہ کسی کو اپنے جسم کی سوغات پیش کر کے ہی رہے گی۔

میں نے بظاہر اس کی پارسائی کا یقین کر لیا۔ بحث کرنے سے بہتر یہی تھا کہ آج رات میں اس کی جھوٹی پاکبازی کا بھرم کھول دوں۔ میں نے کہا۔

”مجھے یقین ہے تم نے جمال کو نہیں بُلایا تھا۔ تم میرا انتظار کر رہی تھیں اس لیے کہ مجھ سے محبت کرتی ہو۔“

یہ کہہ کر میں اس کی طرف شوخی اور محبت سے دیکھنے لگا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ میں اتنی آسانی سے اس کی بات تسلیم کر لوں گا اور اتنی مدت کے بعد والہانہ انداز سے مسکرا کر دیکھوں گا۔ اچانک ہی اس کے چہرے پر تازگی آ گئی۔ وہ شرمیلی اداؤں سے مسکراتی ہوئی بولی۔

”میں تمھارے لیے روٹی لے آؤں....!“

”ابھی نہیں۔“ میں نے اس کی طرف اٹیچی بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اسے میرے کمرے میں لیجاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

وہ اٹیچی لیکر خاموشی سے سر جھکائے چلی گئی۔ میں پھوپھی کی چارپائی کے پاس آیا اور اُن کے قریب بیٹھ کر ان کے خوابیدہ دماغ کو پڑھنے لگا۔ ان کے دماغ میں عجیب گڈمڈ سے خیالات تھے۔ ایسے خیالات جو نہ تو خواب بن کر نظر آتے ہیں اور نہ جاگنے پر یاد رہتے ہیں۔ میں نے ان کے دماغ میں اپنے خیال کو پہنچایا کہ انھیں سکون سے گہری نیند سونا چاہیے اور صبح چھ بجے سے پہلے بیدار نہیں ہونا چاہیے۔

پھر وہاں سے اٹھ کر میں اپنے کمرے میں آیا۔ اٹیچی میز پر رکھی ہوئی تھی۔ قریب ہی زرینہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کے شانے پر سے دوپٹہ ڈھلکا ہوا تھا۔ شاید اس نے اپنی عادت کے مطابق جان بوجھ کر اسے ڈھلکا دیا تھا۔ مجھے اس وقت کی باتیں یاد آ گئیں، جب میں نے پہلی بار تنویمی عمل سے زرینہ کو اپنی معمولہ بنایا تھا۔ اس نے تنویمی نیند کے دوران اپنے دل کے سارے بھید کھولتے ہوئے کہا تھا۔

”میں تمھارے کمرے میں کسی کام کے بہانے آتی تو جان بوجھ کر اپنے شانے سے دوپٹہ ڈھلکا دیتی تاکہ تم مجھے چھونے اور چھیڑنے پر مجبور ہو جاؤ....!“

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اب میں ایک نئی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا اور یہ حقیقت کُھل رہی تھی کہ ایک لڑکی ظاہری شرم و حیا کے لباس میں رہ کر بھی کیسے کیسے زاویوں سے مرد کو اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

میں نے سوچا کہ اسے جی بھر کر دیکھنے سے پہلے اس کے احسانات کا بدلہ چکا دینا چاہیے۔ میں پانچ سال سے اس گھر میں تھا۔ انھوں نے میری ذات پر جو کچھ خرچ کیا تھا، اب میں اس سے کئی گُنا زیادہ انھیں دے سکتا تھا۔ میں نے اس کی جانب اٹیچی بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اسے کھول کر دیکھو!“

وہ چند لمحوں تک چُپ چاپ کھڑی رہی۔ اسے توقع تھی کہ میں اس کی طرف کھنچا چلا آؤں گا لیکن توقع کے خلاف میں اسے اٹیچی کھولنے کا فضول سا

حکم دے رہا تھا۔ مجبوراً اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے کھولا۔ پھر اس کے کھلتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ وہ نوٹوں کو کبھی زیورات کو اور کبھی ساڑیوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی۔

"اتنے روپے۔ اتنے زیورات۔ اتنی ساڑیاں۔ یہ کہاں سے لائے ہو؟ یہ سب کس کے لیے ہیں؟"

"نقد روپے میرے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "باقی زیورات اور ساڑیاں تمھارے لیے ہیں۔"

وہ حیرت اور بے یقینی سے میرا منہ تکنے لگی۔ میں نے زیورات کے ڈبے سے ہیرے کا جگمگاتا ہوا نیکلس نکالا پھر اس کے بالکل قریب آ کر پوچھا۔

"تم نے کبھی اصلی ہیرا دیکھا ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور اس جگمگاتے ہوئے ہیرے کو دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔

"میں اس ہیرے کو تمھارے گلے کا ہار بنا رہا ہوں"

میں اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن کے پیچھے لیجا کر نیکلس کی ہک لگانے لگا۔ میں نے محسوس کیا، وہ جذبات کی شدت سے تھرتھر کانپ رہی تھی۔ اگرچہ وہ برسوں سے ایک مرد کی قربت میں بہکنے کے لیے تڑپ رہی تھی، اس کے باوجود اپنے ارمانوں کی پہلی دہلیز پر سہمی سہمی سی لرز رہی تھی۔

پچھلے کئی برسوں سے تنویمی عمل کے دوران میں عامل رہا اور وہ معمولہ۔ اس وقت بھی وہ معمولہ تھی مگر ایک عامل کی طرح مجھے سحر زدہ کر رہی تھی۔ وہ مجھے ٹرانس میں لا رہی تھی۔ میں اسے ٹرانس میں لا رہا تھا ___ مٹھائی پر چاندی کا ورق چڑھا ہو تو بھلا لگتا ہے۔ عورت پر سونے چاندی کا لباس ہو تو بوجھ لگتا ہے۔ میں اس مٹھاس پر سے، ایک ایک ورق اتارنے لگا۔ مٹھاس، لذّت، حرارت، بے چینیاں، بے باکیاں، ایک نازک بدن میں کتنی سحر انگیزیاں چھپی ہوتی ہیں، انھیں میں سمجھ رہا تھا۔ کچھ سیکھ رہا تھا، کچھ اسے سکھا رہا تھا۔ میری زندگی کا ایک حسین اور رنگین باب کھل رہا تھا۔

طوفان ذرا دیر کے لیے تھم گیا۔

پھر تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ ہم نے مدّتوں سے صبر و ضبط کا جو بند باندھ رکھا تھا، وہ اس رات ٹوٹ گیا تھا اور ہم بار بار جذبات کے طوفان میں تنکوں کی طرح اُڑے جا رہے تھے۔

پہلے کی بات اور تھی۔ میں اس لذّت سے آشنا نہیں تھا۔ اب تو شیر کے منہ کو خون کا چسکا لگ گیا تھا۔ پیاس بجھنے کی بجائے بڑھتی جا رہی تھی۔ زرینہ نے رات کے دو بجے تک میرا ساتھ دیا۔ پھر میری دیوانگی دیکھ کر گھبرا گئی۔ مجھے بہلانے پھسلانے لگی اور ہاتھ جوڑ کر منتیں کرنے لگی۔ میں باز نہ آیا تو ایک بار وہ پانی پینے کے بہانے اٹھی اور بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اس وقت میری کیا حالت تھی، یہ میں ہی جانتا ہوں۔ یہ تو اپنے اپنے ہاضمے کی بات ہوتی ہے۔ کوئی شراب کے ایک ہی پیگ میں مدہوش ہو جاتا ہے۔ میں کم از کم چھ پیگ ہضم کر سکتا تھا اور اس وقت مجھے صرف چار ہی پیگ ملے تھے۔ جس بوتل میں کچھ نہ رہا ہو، وہ بھلا کیا پلائے گی۔ میں اس کی مجبوری سمجھ گیا۔ وہ ٹوٹنا نہیں چاہتی تھی اور میں ظالم بن کر توڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے صبر کر کے بستر پر لیٹ گیا۔

دوسری صبح وہ اپنی چارپائی سے نہیں اٹھی، لحاف اوڑھے لیٹی رہی۔ اس کی ماں نے وجہ پوچھی تو اس نے بہانہ کر دیا کہ پچھلی رات اسے بخار آیا تھا۔ اب بھی کمزوری ہے۔ اٹھنے سے سر چکراتا ہے ___ میں اپنے کمرے سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور اس خیال سے مسکرا رہا تھا کہ اس کی بے لگام جوانی کی ساری مستیاں ایک ہی رات میں ڈھل گئی ہیں۔ اب وہ بدنام ہونے کے لیے دروازے پر نہیں جائے گی اور نہ کسی جمال یا کمال کی آرزو کرے گی۔

میں اپنے بستر سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا۔ ساتھ ہی اٹیچی بھی لے گیا اور اسے پھوپھی کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ اتنے روپے اور زیورات دیکھ کر وہ حیران رہ گئیں۔ میں نے انھیں سب کچھ بتا دیا کہ وہ میرا مال ہے۔ سیدھے راستے سے نہیں ملا اس لیے ٹیڑھے راستے سے لایا ہوں۔ پہلے تو وہ بحث کرتی رہیں کہ میں نے مجرمانہ حرکت کی ہے لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ اسی ٹیڑھے راستے سے مجھے اپنی زمینوں کے کاغذات ملنے والے ہیں تو وہ خاموش ہو گئیں۔ میں نے گھر کے اخراجات کے لیے انھیں دو ہزار روپے دیے اور تمام زیورات ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سب زرینہ کے لیے ہیں۔ کہیں سے رشتے کی بات آئے تو فوراً اس کی شادی کر دیجیے۔ اب اس کے لیے جہیز کی کمی نہیں ہو گی۔"

میں نے ہزاروں روپے کے زیورات دے کر بڑی خوبصورتی سے انھیں یہ بات سمجھا دی کہ میں زرینہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ زرینہ چارپائی پر لیٹی ہوئی مجھے گھور کر دیکھ رہی تھی اور اشاروں میں ناراضگی ظاہر کر رہی تھی۔ میں اسے نظر انداز کر کے پھوپھی کے خیالات پڑھنے لگا۔ وہ سوچ رہی تھیں۔

"میں لڑکی کی ماں ہوں۔ فرہاد کے سامنے زبان کیسے کھولوں کہ تم ہی میری بیٹی سے شادی کر لو۔ چلو کوئی بات نہیں۔ اتنے سارے زیورات ہیں اور فرہاد جہیز بھی پورا دے گا۔ میری بیٹی کے لیے ہزار رشتے آ جائیں گے۔"

میں مسکرانے لگا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر زرینہ سے بولیں۔

"میں اسکول جا رہی ہوں۔ تمھارے لیے ڈاکٹر سے دوا لیکر ناہید کے ہاتھ بھیج دوں گی۔"

میں نے اٹیچی سے تین ہزار روپے نکال کر ان کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا "انھیں رکھیے۔ آج آپ اسکول نہیں جائیں گی۔ آپ گلبرگ جائیے۔ چچا کی کوٹھی کے آس پاس کوئی کوٹھی خالی ہو تو اسے کرائے پر حاصل کیجیے۔ جتنے ماہ کی پیشگی رقم مانگی جائے، اسی وقت ادا کر دیجیے۔ میں چچا کے قریب رہ کر انھیں کنگال بنانا چاہتا ہوں۔"

پھوپھی وہ رقم لیکر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد زرینہ ناراضگی سے بولی۔

"تم بے ایمان اور فریبی ہو۔ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے، پھر مجھے برباد کیوں کیا۔ کیا میری عزّت اتنی سستی تھی کہ مجھ سے کھیل کر فوراً ہی آنکھیں پھیر لیں۔"

میں نے ناگواری سے کہا "میں تم سے نہ کھیلتا تو کوئی دوسرا کھیل جاتا۔ مجھے نادان نہ سمجھو۔ میں نے تمھارے بے حیا جسم کو اس گھر سے باہر بھٹکنے نہیں دیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے نیک کام کیا ہے۔ تمھاری طرح میں بھی گناہگار ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تمھاری بے حیائی کا افسانہ اس گھر کی چار دیواری سے باہر نہ جائے۔ اگر تم اپنی کسی رازدار سہیلی سے اپنی رنگین رات کا ذکر کرو گی تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ تم بدنام ہوتی رہو گی اور میں کہیں دُور چلا جاؤں گا۔"

اس کی نظریں جھک گئیں۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ میری بلا سے وہ کچھ بھی سوچے۔ میں نے اس کے خیالات کو پڑھنا ضروری نہیں سمجھا۔ وہاں سے غسل کرنے کے لیے چلا گیا۔ اس سے نظریں پھیر کر جانے کی وجہ یہ بھی تھی کہ اسے دیکھ کر پچھلی رات کی تشنگی بڑھ رہی تھی اور میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ آج وہ میرے کام نہیں آ سکے گی۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کے بعد دل و دماغ ذرا ٹھنڈا ہوا۔ میں نے لباس پہنا۔ کچھ بڑے نوٹ جیب میں رکھے اور گھر سے نکل گیا۔

اس وقت تفریح کا موڈ ہو رہا تھا۔ خوب کھانے پینے، گھومنے پھرنے اور دونوں ہاتھوں سے دولت لٹانے کو جی چاہتا تھا مگر میں نے دل کو سمجھایا کہ کل تک مجھے صبر کرنا چاہیے۔ بینک کھلنے اور کاغذات لاکر سے نکلوانے تک مجھے چچی کی سوچ پر اپنا مکمل کنٹرول رکھنا تھا۔ اپنے اہم مقصد کو بھول کر وقت سے پہلے عیش و آرام کی طرف مائل ہونا دانشمندی نہیں تھی۔ یہ سوچ کر میں نے آرام طلبی کی بجائے دس میل کا فاصلہ طے کیا اور پھر انہی درختوں کے جھنڈ میں آ کر بیٹھ گیا۔

اس وقت آدھا دن گذر چکا تھا۔ سورج سر پر چمک رہا تھا مگر درختوں کے سائے میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں پلتھی مار کر مراقبے میں چلا گیا اور چچی کا دھیان کرنے لگا۔

چچی کے دماغ میں جھنجھلاہٹ اور پریشانی تھی۔ وہ سوچ رہی تھیں۔ "میں کیا کروں؟ کس سے کہوں کہ تجوری خالی ہو گئی ہے۔ میں نے چابی اپنے بلاؤز کے اندر رکھی تھی۔ پھر کوئی چابی کے بغیر آئرن سیف کیسے کھول سکتا ہے؟ کل رات سے اس کمرے میں کوئی ملنے والا نہیں آیا، کوئی ملازم بھی نہیں آیا ___ غزالہ اور ظہیر شام ہی کو یہاں سے چلے گئے تھے۔ خود میں نے آئرن سیف کو نہیں کھولا، پھر وہ تیس ہزار روپے اور زیورات کہاں چلے گئے؟"

چچی صاحبہ میری ہدایت کے مطابق یہ بھول گئی تھیں کہ پچھلی رات کوئی اجنبی ان کے پاس آیا تھا۔ اب ان کے فرشتے بھی یہ معلوم نہیں کر سکتے تھے کہ تجوری کیسے خالی ہو گئی۔

وہ سوچتے سوچتے ذرا ٹھٹھک گئیں۔ پھر ان کی سوچ نے کہا ___

"آں ___ کون غزالہ ___ آؤ بیٹی ___ دروازہ بند کر د . . . .!"

میں سمجھ گیا کہ چچی کے کمرے میں غزالہ آئی ہے۔ اچانک ہی پانچ سال پہلے کی غزالہ چشم تصوّر میں آ گئی۔ میں نے چچی سے دماغی رابطہ توڑ کر غزالہ کی سوچ سے رابطہ قائم کیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"کیا بات ہے ممی ___ آپ بہت پریشان نظر آ رہی ہیں؟"

جواب میں خاموشی چھا گئی۔ چچی کچھ کہہ رہی تھیں اور غزالہ سن رہی تھی۔ میں ایک ہی وقت میں دونوں سے رابطہ قائم نہیں کر سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد غزالہ کی سوچ نے کہا۔

"ممی! یہ کیسے ممکن ہے؟ جب چابیاں آپ کے پاس تھیں اور اس کمرے میں کوئی نہیں آیا تو پھر تجوری خالی کیسے ہو گئی؟"

وہ یقین نہیں کر رہی تھی اور چچی شاید اسے یقین دلا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے لیے دونوں ماں بیٹی سے خیال کا رابطہ ٹوٹ گیا کیونکہ میں غزالہ کے تصوّر میں کھو گیا تھا۔

میں زندگی کے کسی موڑ پر بھی غزالہ کو پیار سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجھے اس سے نفرت تھی۔ یوں تو ہوش و حواس کے عالم میں ہر انسان گناہ سے نفرت کرتا ہے لیکن گناہ کرنے کا کوئی نہ کوئی جواز بھی پیدا کر لیتا ہے۔ اس وقت بھی میں یہ سوچ رہا تھا کہ زرینہ نے مجھے بدنام کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ میں نے اس کے منصوبے کو ناکام بنا دیا اور غزالہ تو مجھے خواہ مخواہ بدنام کر چکی ہے۔ میں ایک ناکردہ گناہ کا الزام اٹھائے پھر رہا ہوں۔ پھر کیوں نہ میں اس کے حسن و شباب سے فیض حاصل کروں۔ انتقام تو میں ضرور لوں گا۔

انتقام کس طرح لوں گا، یہ میں نے نہیں سوچا۔ صرف یہ فیصلہ کر لیا کہ غزالہ سے آج رات ملوں گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد پہلے میں نے چچی کی سوچ سے رابطہ قائم کیا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ میں تمھارے ڈیڈی سے کہہ دوں گی کہ سیف کی چابی گم ہو گئی ہے یا میں کہیں رکھ کر بھول گئی ہوں۔ اگر انھیں پانچ دس ہزار روپے کی ضرورت ہو گی تو تم اپنے پاس سے دے دینا۔ کل بینک کھلتے ہی میں تمھارے روپے واپس کر دوں گی۔"

پھر غزالہ کچھ کہتی رہی۔ اس کے جواب میں چچی نے کہا۔

"ہاں بیٹی۔ بس میں یہ چاہتی ہوں کہ تمھارے ڈیڈی کے سامنے سیف کھولنے کی نوبت نہ آئے۔ میں چھ بجے انھیں ریسیو کرنے ایئر پورٹ جاؤں گی۔ ابھی تین گھنٹے باقی ہیں۔ اب تم جاؤ، میں ذرا آرام کروں گی۔"

شاید غزالہ وہاں سے جا رہی تھی۔ میں چچی کو چھوڑ کر اس کے دماغ میں جھانکنے لگا۔ اب اس کے سوچنے کا انداز بدل گیا تھا۔ وہ اپنی ماں کے خلاف سوچ رہی تھی۔

"اونہہ! ممی مجھے نادان سمجھتی ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی یقین کرنے کی بات ہے کہ سیف آپ ہی آپ خالی ہوگیا۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ پچھلے کئی ماہ سے ممی سرفراز پر مہربان ہیں۔ اس کے لیے نئے نئے سوٹ بنواتی ہیں۔ اس نوجوان چھوکرے کے ساتھ کلبوں میں جاتی ہیں اور خود کو دھوکا دیتی ہیں کہ وہ بوڑھی نہیں ہیں۔ سرفراز جیسے قلاش نوجوان اسی طرح بوڑھی دولت مند عورتوں سے عشق کرکے اپنی زندگی عیش و آرام سے گذارتے ہیں۔"

وہ سوچتی ہوئی کوٹھی کے باہر آئی کیونکہ اب وہ چوکیدار کو مخاطب کر رہی تھی۔

"چوکیدار! کیا رات کو تم ڈیوٹی پر نہیں تھے؟"

اس کا جواب سُن کر غزالہ نے ایک لمبی "ہوں" کے ساتھ سوچا۔

"ہوں۔ ممی نے رات آٹھ بجے چوکیدار کو چھٹی دے دی تھی اور خود یہاں تنہا تھیں۔ یقیناً انھوں نے اپنے عاشق کو بُلایا تھا۔ چوکیدار نے اپنے کوارٹر سے یہاں کسی گاڑی کے آنے اور جانے کی آواز سُنی تھی۔ سرفراز کسی ٹیکسی میں آیا ہوگا۔ میری ممی جان نے گذری ہوئی جوانی کی یاد تازہ کی ہوگی اور جس طرح ایک محبوبہ اپنے عاشق کے لیے جان بھی قربان کردیتی ہے اسی طرح انھوں نے سرفراز کے لیے تجوری خالی کردی ہوگی۔

اونہہ۔ بے چاری بوڑھی ممی! اپنی دولت سے جوانی کے خواب خرید رہی ہیں۔ اگر وہ اسی طرح نوجوان عاشقوں کو خریدتی رہیں تو پھر اس دولت میں سے ہمارا حصّہ کیا بچے گا؟ یہ ممی تو ہم سب کو کنگال بنادیں گی۔ مجھے اپنی فکر کرنی چاہیے۔ مال روڈ کی دُکانیں ظہیر کے نام پر ہیں۔ ڈیڈی کے مرنے کے بعد یہ کوٹھی اور شاہ کوٹ کی زمینیں بھی ظہیر کے نام ہوجائیں گی۔ اگر ممی کی عشق بازیوں کے باوجود لاکھ دو لاکھ روپے بچ رہے تو وہ بھی ظہیر کو ملیں گے۔ مجھے کیا ملے گا۔ جہیز کے نام پر تھوڑی سی خیرات ملے گی۔ نہیں، میں شاہینہ کی طرح احمق نہیں ہوں کہ اچھی خاصی دولت اور جائداد چھوڑ کر نانا جان کے ٹکڑوں پر پلتی رہوں۔ میں ممی کی عاشقانہ کمزوریوں سے فائدہ اٹھاؤں گی۔ ان کی رازدار بن کر انھیں مجبور کروں گی کہ وہ مجھے بھی کچھ کمیشن دیا کریں۔ میں مال روڈ کی کوئی دُکان اپنے نام لکھواؤں گی یا یہ کوٹھی اپنے نام کراؤں گی یا پھر اپنے طور پر کوئی جائداد بنانے کے لیے ان سے کم از کم ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کروں گی۔ ممی نے محض ایک عاشق کے لیے سیف خالی کرنے کی جو حماقت کی ہے، مجھے اس حماقت سے فوراً ہی فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

وہ سوچ رہی تھی، میں سُن رہا تھا اور ان عورتوں کی ذہنی قلابازیوں کے عجیب عجیب تماشے دیکھ رہا تھا۔ میری طرح اس دنیا میں چند ہی لوگ ہوں گے جو ٹیلی پیتھی کے ذریعے انسانوں کو ان کے اندر سے دیکھتے ہوں گے۔ ٹیلیویژن اور سینما کے اسکرین پر کوئی فلم اتنی دلچسپ، معلوماتی اور حیرت انگیز نہیں ہوسکتی جتنی کہ میں اپنے دماغ کی اسکرین پر دیکھ رہا تھا اور آیندہ بھی ہزاروں لاکھوں انسانوں کے اندر بیٹھ کر ان کے راز و اسرار کی نقاب کشائی کرسکتا تھا۔

میں نے غزالہ سے خیال کا رابطہ ختم کردیا تھا۔ اب ایک دولت مند باپ کی بیٹی اپنی دولت مند ماں کو کس طرح بلیک میل کرے گی؟ اس سے مجھے دلچسپی نہیں تھی کیونکہ وہ بلیک میلنگ کے ذریعے جو کچھ حاصل کرنے والی تھی وہ سب کچھ میں اس سے چھین سکتا تھا۔ فی الحال میں ظہیر کی طرف توجہ دینا چاہتا تھا۔ مجھے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ مال روڈ کی دکانیں اس کے نام پر ہیں۔ لہٰذا مجھے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جس سے وہ دکانیں میرے نام ہوجائیں۔ کیونکہ قانونی طور سے اصلی دستاویزات کے مطابق میں زمینوں کا مالک بن سکتا تھا لیکن اس کوٹھی پر اور دکانوں پر اپنی ملکیت ثابت نہیں کرسکتا تھا حالانکہ وہ سب کچھ میری ہی دولت سے حاصل کیا گیا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ جھگڑے فساد سے وہ جائداد حاصل نہیں ہوگی۔ ایک طرف میں چچی کو معمول بنا کر ایک ہی جھٹکے میں دستاویزات حاصل کرنے والا تھا، دوسری طرف ظہیر کو بھی معمول بنا کر اسے مجبور کرتا تو وہ دُکانیں میرے نام لکھ دیتا لیکن یہ بات دوسروں کو کھٹکنے لگتی کہ ظہیر نے فرہاد جیسے دشمن کے نام اپنی جائداد کیوں لکھ دی۔ ایسی صورت میں سب ہی یہ شبہ کرتے کہ میں نے کسی عمل یا تعویز گنڈوں سے ظہیر کو اپنی طرف مائل کرلیا ہے۔

کوئی نہایت ہی مناسب اور دانشمندانہ تدبیر سوچنے سے پہلے میں نے ظہیر کا تصور کیا تاکہ اس کے متعلق معلومات حاصل کروں۔ اس کی سوچ کو پڑھتے ہوئے پتہ چلا کہ وہ قدرے بیمار ہے۔ پچھلی رات شادی کی دعوت میں اس نے بہت زیادہ کھالیا تھا جس کی وجہ سے بدہضمی کا شکار ہوگیا تھا۔

اس کی سوچ کچھ یوں تھی "آہ۔ پلاؤ قورمہ کھاکے کس مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ صبح سے دوپہر ہوگئی ہے۔ ابھی تک ٹائلٹ میں جانے آنے سے فرصت نہیں مل رہی۔ دوا سے کچھ افاقہ تو ہوا ہے لیکن شام کو کلب کیسے جاؤں۔ اگر وہاں پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگی تو بار بار ٹائلٹ کی طرف بھاگتے دیکھ کر لڑکیاں ہنسی اڑائیں گی۔ ہاں وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ اب بھی درد محسوس ہورہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے، پیٹ میں ایک گولا سا ہے جو اِدھر اُدھر گھوم رہا ہے۔ میں بھی کیسی باتیں سوچ رہا ہوں، یہ سب وہم ہے۔۔۔۔"

اسی وقت میں نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر اس کی سوچ میں کہا۔

"یہ وہم نہیں ہے۔ میرے پیٹ میں واقعی ایک گولا ہے۔ اِدھر سے اُدھر گھوم رہا ہے۔ درد بڑھتا جارہا ہے۔ ہاں سچ مچ درد میں اضافہ ہورہا ہے۔"

اس کی سوچ سے پریشانیاں ظاہر ہونے لگیں۔ شاید وہ اپنے پیٹ پر اِدھر سے اُدھر ہاتھ پھیر کر دیکھ رہا ہوگا۔ میں اس کی حرکتوں کو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اس کے خیالات سے اندازہ لگا سکتا تھا۔ وہ بچپن ہی سے وہمی اور نازک مزاج تھا اور میں اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کی ہی سوچ بن کر کہہ رہا تھا۔

"واقعی درد بڑھتا جارہا ہے۔ میرے پیٹ میں جو گیس ہے، اس گیس کی وجہ سے گولے کا حجم بڑھتا جارہا ہے۔ میں سانس لیتے ہوئے تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔ کیا۔ کیا میری سانسیں رُک رہی ہیں۔ کک۔ کیا میں اتنی جلدی مرجاؤں گا۔۔۔۔؟"

اس کے خیالات ایک دم سے گڑبڑانے لگے۔ بیماری کے دوران موت کی دھمکی اس کے دماغ میں گھس گئی تھی۔ وہ فوراً ہی اللہ اللہ کرنے لگا۔ میں نے اس کی سوچ میں بیٹھ کر کہا۔

"ایسے وقت کلمہ پڑھنا چاہیے۔ پڑھو کلمہ شہادت۔۔۔۔"

اس کی مثبت سوچ نے کہا "کلمہ شہادت ــ مگر یہ کیسے پڑھا جاتا ہے؟ مجھے یاد ہے، جب میں بچہ تھا اور جب ہم غریب تھے، اس وقت ممی نے کلمہ پڑھنا سکھایا تھا لیکن وہ تو بچپن اور غربت کی باتیں ہیں۔ اب تو ممی بھی کلمہ بھول گئی ہیں۔ یہ تو بہت پُرانا دستور ہے۔ دولت مند گھرانوں میں ہیرے جواہرات ہوتے ہیں، شراب کی بوتلیں ہوتی ہیں، یورپ کے میٹلز سائکس ہوتے ہیں، صرف کلمہ نہیں ہوتا۔ وہ صرف دم نکلتے وقت یاد آتا ہے لیکن اس وقت تک ہم بھول چکے ہوتے ہیں ــ ممی ــ ممی جلدی آیئے ــ میری طبیعت گھبرا رہی ہے۔ میری سانسیں رُک رُک کر آرہی ہیں ــ مجھے کلمہ پڑھایئے ممی۔۔۔۔!"

میں نے اس کی سوچ میں کہا "ایسی ماں کو آواز دینے کا کیا فائدہ جو امّی سے ممی بن گئی ہو۔ مجھے خود ہی ذہن پر زور دے کر بھولے ہوئے ایمان کو یاد کرنا چاہیے ــ ہاں مجھے یاد کرنا چاہیے۔ ایمان وقتی طور پر چھپ سکتا ہے، مر نہیں سکتا ــ ہاں ٹھیک ہے ــ مجھے کچھ کچھ یاد آرہا ہے۔ وہ کلمہ کچھ یوں ہے۔"

میں رُک رُک کر، ٹھہر ٹھہر کر اس کی سوچ میں کلمہ پڑھنے لگا تاکہ وہ یہی سمجھے کہ اسے آہستہ آہستہ بھولا ہوا کلمہ یاد آرہا ہے۔ جب اس نے دو تین بار اچھی طرح پڑھ لیا تو میں نے کہا "ہاں! اب مجھے کچھ سکون مل رہا ہے۔ سانسیں درُست ہورہی ہیں ــ کسی نے درست کہا ہے کہ دولت جسمانی آرام پہنچاتی ہے اور ایمان سے قلبی سکون حاصل ہوتا ہے۔ مجھے بھی ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہورہا ہے۔"

میں نے اس سے رابطہ ختم کردیا۔ میں ظہیر کو بچپن ہی سے جانتا تھا۔ وہ مستقل مزاج نہیں تھا۔ اس کی سوچ ہمیشہ بدلتی رہتی تھی اس لیے مجھے یقین تھا کہ اب وہ کچھ دیر تک ایمان دھرم کی باتیں نہایت سنجیدگی سے سوچتا رہے گا۔

میں اس ویرانے سے اٹھ کر شہر کی طرف چل دیا۔ ظہیر کے متعلق میں نے سوچ لیا کہ میں کس انداز سے اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرسکتا ہوں۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ میں آہستہ آہستہ اس پر ایمان کا نشہ طاری کرکے اسے مولوی بنادوں گا۔ وہ دولت سے اپنی دنیا سنوارنے کی بجائے ایمان سے اپنی عاقبت سنوارے گا اور ہاتھ میں تسبیح لیکر گوشہ نشینی اختیار کرے گا اور مال روڈ کی دکانیں شاہینہ کے نام لکھ دے گا۔ ظہیر کو نیک راستے پر لگا کر میں دکانیں اپنے نام پر اس لیے نہیں لکھوانا چاہتا تھا کہ پھر وہ نیکی نہ ہوتی۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا کہ دکانیں اپنے نام کرنے کے لیے میں نے مذہب کو ایک حربے کے طور پر استعمال کیا ہے لہٰذا میں نے اپنی کوئی غرض یا لالچ نہیں رکھا۔ وہ دکانیں اسی کی بہن نیک طینت شاہینہ کے نام منتقل کرانے کا منصوبہ بنالیا۔

شہر پہنچ کر میں نے دو سوٹ کا کپڑا خرید کر درزی کو دیا۔ چار جوڑے ریڈی میڈ خریدے۔ جوتے، چپلیں، شیونگ کا سامان، زرینہ اور پھوپھی کے لیے کپڑے وغیرہ۔ جو بھی ضرورت کی چیزیں تھیں، وہ سب خرید کر گھر واپس آگیا۔ پھوپھی میرا انتظار کررہی تھیں۔ انھوں نے چچا کے سامنے والی ایک کوٹھی کرائے پر حاصل کرلی تھی۔ وہ چچا جان سے جل بھنی بیٹھی تھیں۔ ایک عرصے کے بعد چچا جان کے غرور کو نیچا دکھانے کا موقعہ مل رہا تھا اس لیے انھوں نے خاص طور سے ان کے سامنے کوٹھی حاصل کی تھی تاکہ دشمنوں کے سامنے رہ کر ان کی چھاتی پر مونگ دلتی رہیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا۔

"فرہاد! تم کہتے ہو کہ کل تمھیں اپنی زمینوں کے کاغذات مل جائیں گے۔ اللہ کرے وہ کاغذات مل جائیں، اس کے بعد میں تمھارے ساتھ ناصر علی کے پاس جاؤں گی اور اصل کاغذات دکھا کر اسے دس جوتے لگاؤں گی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے انھیں سمجھایا۔

"غصہ دکھانے سے کام بگڑ جائے گا۔ زمینوں کے کاغذات حاصل کرنے کے بعد بھی میں ان پر یہ ظاہر نہیں کروں گا کہ ان کی بہت بڑی کمزوری ہاتھ آگئی ہے۔ حالانکہ جعلسازی کے الزام میں میں انھیں عدالت تک گھسیٹ کر لے جاسکتا ہوں لیکن جب تک عدالت فیصلہ سُنائے گی، اس وقت تک انھیں دوسری جائداد اور نقد روپے کی حفاظت کا موقعہ مل جائے گا۔ وہ یہ ثابت کردیں گے کہ ان کی موجودہ کوٹھی، مال روڈ کی دکانیں اور بینک بیلنس سب کچھ ان کی کمائی سے حاصل کیے گئے ہیں۔ آپ خاموشی سے تماشہ دیکھتی جایئے۔ پہلے میں لاکھوں روپے کے بینک بیلنس پر ہاتھ صاف کروں گا ــ پھر انھیں کاغذات کی ہوا لگنے دوں گا۔"

"بیٹے! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے کس قسم کا عمل سیکھ لیا ہے۔ آخر تم کرتے کیا ہو؟ ذرا مجھے بھی تو بتاؤ کہ تمھاری وہ مغرور چچی تمھاری فرمانبردار کیسے بن گئی ہے؟"

"پھوپھی جان۔ کچھ راز ایسے ہوتے ہیں جو اپنے سگوں کو بھی نہیں بتائے جاتے۔ پھر یہ کہ آپ جان کر کریں گی بھی کیا؟ کیا آپ کے لیے اتنی خوشیاں کافی نہیں ہیں کہ ہمیں کامیابی نصیب ہورہی ہے اور اب زرینہ کی شادی دھوم دھام سے ہوجائے گی۔"

زرینہ اپنی ماں کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ میری باتیں سُن کر اُس نے "اونہہ" کے انداز میں منہ پھیر لیا۔ پھوپھی سر جھکائے شاید اپنی بیٹی کی شادی کے متعلق سوچ رہی تھیں۔ میں اپنے کپڑے لیکر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

جسم پر عمدہ لباس ہو۔ پاؤں میں نئے جوتے ہوں اور چہرہ کلین شیوڈ ہو تو شخصیت میں پہلے سے زیادہ نکھار آجاتا ہے۔ میں خود اپنے متعلق فیصلہ نہیں کرسکتا تھا کہ نیا اور مہنگا لباس پہننے کے بعد میری شخصیت میں

کیسی نمایاں تبدیلی آگئی ہے لیکن جب میں اپنے کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آیا تو منہ پھیرنے والی زرینہ مجھے یوں تکنے لگی جیسے اس کی نگاہیں مجھ سے چپک کر رہ گئی ہوں۔ اتنا تو سمجھ میں آگیا تھا کہ پھوپھی موجود نہ ہوتیں تو وہ بے اختیار کھنچی چلی آتی۔ اس بار میں نے "اونہہ" کے انداز میں اس سے منہ پھیر لیا۔ پھوپھی کے پاس کوٹھی کی چابیوں کے دو سیٹ تھے۔ میں نے ایک سیٹ دے کر کہا۔

"آپ زرینہ کے ساتھ کل شام تک کوٹھی میں آجائیں۔ یہاں یہ جتنی چارپائیاں، بستر، صندوق، پرانے کپڑے اور برتن ہیں، یہ سب غریبوں میں تقسیم کر دیجیے۔ کوٹھی کے لیے نئے سرے سے نیا سامان خریدا جائے گا۔"

میں تمام نوٹوں کی گڈیاں اور کپڑے وغیرہ ایک چھوٹے سے سوٹ کیس میں رکھنے لگا۔ پھوپھی نے کہا۔

"محلے کے کتنے ہی لوگ پوچھ رہے ہیں کہ ہم یہاں سے کہاں جا رہے ہیں؟ میں نے جھوٹ کہہ دیا کہ فرہاد کے چچا نے صلح کر لی ہے، اب ہم ان کے ساتھ رہیں گے۔ میں نے سوچا کہ ہم اتنی بڑی کوٹھی میں رئیسانہ زندگی گذاریں گے، کہیں لوگ یہ نہ سوچیں کہ ہمارے پاس چوری یا اسمگلنگ کا پیسہ آگیا ہے اس لیے مجھے ان کے سامنے باتیں بنانی پڑیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "جب تک زمینوں کے کاغذات ہاتھ نہیں آتے، ہمیں مجبوراً جھوٹ بولنا ہی پڑے گا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ آپ کل شام کو آجائیں۔"

یہ کہہ کر میں نے سوٹ کیس اٹھایا اور زرینہ کی جانب دیکھے بغیر مکان سے باہر آگیا۔ باہر شام رخصت ہو رہی تھی اور دور دور تک شب رنگ آنچل پھیلتا جا رہا تھا۔ میں ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر انارکلی پہنچا۔ وہاں سے میں نے ایک بریف کیس خریدا اور اپنی نئی کوٹھی میں آگیا۔ چچا جان کا مکان بالکل سامنے تھا۔ ہمارے درمیان صرف ایک سڑک گذرتی تھی۔ پھوپھی نے بہت ہی شاندار کوٹھی حاصل کی تھی۔ وہ کوٹھی صرف فرنیچر اور دیگر آرائشی سامان کی محتاج تھی۔ میں نے نوٹوں کی چند گڈیاں بریف کیس میں رکھیں۔ سوٹ کیس کو ایک کمرے میں لاک کیا۔ پھر گلبرگ مارکیٹ کے ایک فرنیچرز ہاؤز میں آکر ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کے لیے بہترین فرنیچرز کا انتخاب کرنے لگا۔

اس دنیا میں جتنے کھیل ہوتے ہیں، سب پیسوں سے کھیلے جاتے ہیں۔ کل میرے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ میں لنڈے بازار سے ایک جوڑا خرید سکتا۔ آج اتنی دولت تھی کہ میں دس ہزار روپے کے فرنیچرز خرید کر لے گیا۔ رات کے گیارہ بجے تک کوٹھی کے ڈرائنگ روم اور بیڈ روم قالینوں، صوفوں، کرسیوں، میزوں اور مسہریوں سے آراستہ ہو گئے۔ اس کے بعد میں ڈنر کے لیے ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں آگیا۔ وہاں کا ماحول نہایت ہی خوابناک اور رومان پرور تھا۔ آس پاس کی میزوں پر خوش نصیب جوڑے میز پر جھکے ہوئے کھا رہے تھے۔ کھانے سے زیادہ میٹھی سرگوشیاں کر رہے تھے اور زیر لب مسکرا رہے تھے۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی کھانوں پر پڑ رہی تھی اور ان کے شیڈز حسین چہروں کو نیم تاریکی اور دھندلی روشنی کے مابین کچھ چھپا رہے تھے اور کچھ اجاگر کر رہے تھے۔ جب حسن صاف چھپتا بھی نہ ہو اور سامنے آتا بھی نہ ہو تو نگاہیں بار بار اسی طرف اٹھنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ شاید اسی مقصد کے لیے شیڈز لگائے گئے تھے۔

اس وقت ایک تنہا میز پر کھاتے وقت مجھے تنہائی کا شدید احساس ہونے لگا۔ آدھی رات گذر رہی تھی اور آدھی رات گذرتی نظر نہیں آرہی تھی۔ اس رومان پرور ماحول میں زرینہ کی رنگین صحبتیں یاد آگئیں۔ وہ پہلی دوشیزہ تھی جس نے مجھے انسانی مسرتوں کے ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا تھا۔ اب عورت کا جسم نئی دلچسپیوں اور عشوہ طرازیوں سے مجھے اپنی طرف کھینچتا تھا۔ اس وقت بھی میں چاہتا تو آس پاس کی کسی مست شباب حسینہ کے خیالات کو پڑھ کر اسے اپنی طرف مائل کر سکتا تھا لیکن میں نے بہت پہلے ہی دل میں یہ عہد کر لیا تھا کہ اپنے علم کو گناہ یا کسی بھی غلیظ مقصد کے لیے استعمال نہیں کروں گا۔ جو خود ہی میری طرف مائل ہو جائے اسے قبول کرنے سے انکار نہیں کروں گا۔ یہ سوچتے ہی مجھے پھر غزالہ یاد آگئی۔ اس یاد کے ساتھ ہی اس کا سراپا نگاہوں کے سامنے طلوع ہو گیا۔ چاندنی سے تراشا ہوا بدن سفید نائٹی سے جھلمل جھلمل اشاروں کی طرح جھانکنے لگا۔ ایک مدت سے میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ ویسے دیکھے بغیر اتنا ضرور سمجھ رہا تھا کہ پہلے وہ فتنہ تھی اب قیامت بن گئی ہوگی۔

ایک وقت تھا جب اس نے خود کو میرے حوالے کرنا چاہا تھا اور میں نے نادانی سے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پہلے لذت گناہ ملتی ہے، پھر بدنامی ملتی ہے لیکن غزالہ کے سلسلے میں، میں پہلے بدنام ہو چکا تھا اور ایک عرصے کے بعد اس تک پہنچنے کے لیے سوچ رہا تھا۔ وہاں تک پہنچنا میرے لیے مشکل نہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ غزالہ میری موجودہ شخصیت کے سامنے پگھل جائے گی۔ اس کے لیے کسی علم و عمل کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اگر ضرورت ہوتی تو بھی میں غزالہ جیسی قیامت کے لیے اپنے علم کو کام میں نہ لاتا۔ مضبوط ارادے اور مستحکم منصوبہ بندی میرے کردار کی خصوصیات ہیں۔ میں اپنے جذبات کو علم کی مٹھی میں بند کر سکتا ہوں مگر علم کو جذبات کے دھارے پر نہیں چھوڑ سکتا۔

آدمی کی سوچ صحت مند ہو تو وہ بہت ساری غلطیوں سے بچ جاتا ہے۔ اس وقت بھی میں نے یہی سوچا کہ اگر یہ آدھی رات میں کسی کی زلفوں کے سائے میں جاگتے ہوئے گذار دوں گا تو صبح چچی صاحبہ کی سوچ کو اپنے کنٹرول میں نہیں رکھ سکوں گا۔ دوسری صبح مجھے اپنی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی نصیب ہونے والی تھی۔ اس کے لیے مجھے محتاط اور چاق و چوبند رہنا تھا اور اس کے لیے پر سکون نیند اور مکمل آرام کی ضرورت تھی لہٰذا مجھے بہکنے کی بجائے سنبھلنا تھا اور چپ چاپ اپنے نئے بیڈ روم میں جا کر سو جانا چاہیے تھا۔

میں نے یہی کیا۔ ڈنر سے فارغ ہو کر اپنی کوٹھی میں آیا۔ اپنے بیڈ روم کے ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھ کر میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور اس سگریٹ کے سلگنے تک اگلی صبح کے پروگراموں پر غور کرتا رہا۔ پھر سگریٹ بجھا کر بستر پر آیا۔ زندگی میں پہلی بار فوم کا ملائم لچکیلا بچھونا نصیب ہوا تھا۔ ایسے بستر پر

تو ایسی نیند آتی کہ صبح کی خبر نہ ہوتی اور میں دن چڑھے تک سوتا رہ جاتا۔ لہٰذا سونے سے پہلے میں اپنے آپ کو ٹرانس میں لایا۔ اپنی آنکھیں بند کر کے میں نے کہا۔

"میں سکون سے گہری نیند سو رہا ہوں لیکن میرے احساسات مجھے صبح پانچ بجے بیدار کر دیں گے۔"

سونے کے اس انداز کو قوت ارادی کہتے ہیں یعنی ارادہ اس قدر مضبوط ہو کہ خوابیدہ ذہن بھی وقت مقررہ پر بیدار کر دے ——— اور مقررہ وقت پر ٹھیک پانچ بجے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے باہر آکر دیکھا۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دور مشرقی آسمان کے کناروں پر مدھم سی روشنی نظر آرہی تھی۔ میں ضروریات سے فارغ ہو کر چھت پر آیا۔ چھت پر صرف ایک کمرہ تھا جس کی چھت ٹائلز کی تھی۔ میں اس کمرے میں بیٹھ کر حبس دم کی مشق کرنے لگا۔ یوں تو ہپناٹزم کی ابتدا میں، میں سانس آہستہ آہستہ لینے، اس سانس کو سینے میں روکنے اور پھر اسے آہستہ آہستہ چھوڑنے کی مشق کرتا رہا تھا لیکن اب میں ایک منٹ، دو منٹ، پانچ منٹ، پندرہ منٹ، آدھ گھنٹے اور ایک گھنٹے تک اپنے سینے میں سانس روکے رکھنے کی مشق کرنا چاہتا تھا۔ اس دنیا میں یوگا کی مشق کرنے والے چند ایسے لوگ ہیں جو چھ گھنٹے تک زمین میں زندہ دفن ہو جاتے ہیں۔ پھر چھ گھنٹے کے بعد زندہ سلامت اپنے مدفن سے نکل آتے ہیں۔

یوں بھی دیکھا جائے تو ہر جاندار کی زندگی کے لیے ہر پل سانس لینا لازمی ہے۔ اگر انسان اپنی سانسوں پر قابو پالے تو پھر اس سے بہت سی بیماریاں دور بھاگتی ہیں اور توت میں حیرت انگیز اضافہ ہوتا ہے۔ ایک حبس دم کا ماہر طویل دوڑ لگائے یا گھنٹوں دشمنوں کا مقابلہ کرے، اس پر تھکن غالب نہیں آتی اور نہ ہی وہ کسی کمزور انسان کی طرح ہانپتا ہے۔ انہی فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے حبس دم کی مشق شروع کر دی۔

جب اچھی طرح دن نکل آیا تو میں نے مشق ختم کر دی اور ناشتہ کرنے کے لیے بازار کی طرف چلا گیا۔ تقریباً آٹھ بجے واپس آکر میں اپنے بیڈ روم کے قالین پر پلتھی مار کر بیٹھ گیا۔ بینک کھلنے میں ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ میں نے مراقبے میں جانے کے بعد چچی سے دماغی رابطہ قائم کیا۔

اس وقت چچی صاحبہ ناشتے کے متعلق سوچ رہی تھیں۔ ان کا پروگرام تھا کہ وہ ناشتے کے بعد لباس تبدیل کریں گی۔ پھر اپنی کار میں بیٹھ کر بینک جائیں گی اور وہاں سے پچیس تیس ہزار روپے اور کچھ زیورات لا کر اپنے کمرے کے سیف میں رکھ دیں گی۔ چچا جان ابھی تک سو رہے تھے۔ ان کے بیدار ہونے سے پہلے ہی وہ بینک سے واپس آجانا چاہتی تھیں، تاکہ چچا جان کو سیف خالی ہونے کا علم نہ ہو۔

تھوڑی دیر بعد ان کی سوچ سے پتہ چلا کہ وہ لباس بدل چکی ہیں اور آئینے کے سامنے اپنے ہونٹوں پر لالی چڑھا رہی ہیں۔ اسی وقت میں نے ان کے دماغ پر دستک دی۔

"ہیلو بیگم ناصر!"

وہ ایک دم سے چونک کر سوچنے لگیں۔

"کیا میں نے خود کو بیگم ناصر کہا ہے؟ ہاں پہلے بھی ایک بار خود کو بیگم ناصر کہہ چکی ہوں — ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے۔"

میری سوچ نے کہا۔ "ہاں، ایسا پرسوں رات ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تمہیں وہ آنکھیں یاد آئی تھیں۔ دیکھو — دیکھو — وہ آنکھیں تمہارے تصور میں روشن ہو رہی ہیں۔ انہیں پہچانو — وہ کم بخت فرہاد کی آنکھیں ہیں۔ ایک بار تم نے کہا تھا کہ ان آنکھوں میں بدروح گھسی ہوئی ہے — بولو اب پہچان رہی ہو نا؟"

"ہاں پہچان رہی ہوں — وہ آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ میں انہیں نہیں دیکھنا چاہتی مگر دیکھتی جا رہی ہوں۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں کسی دوسری طرف کیوں نہیں دیکھ سکتی.....؟"

"تم کہیں نہیں دیکھ سکتیں۔ تم ان آنکھوں کے زیر اثر ہو —— یہ آنکھیں جو کچھ کہیں گی، تم اس پر عمل کرو گی — بولو عمل کرو گی؟"

"ہاں عمل کروں گی۔"

"پرسوں رات تم ان آنکھوں کے زیر اثر رہ چکی ہو۔ کیا تمہیں یاد آرہا ہے؟"

"ہاں، یاد آرہا ہے۔"

"تمہیں یہ بھی یاد آرہا ہے کہ ایک اجنبی تمہارے پاس آیا تھا۔"

"ہاں۔ ایک اجنبی آیا تھا۔"

"تم نے وعدہ کیا تھا کہ بینک کے لاکر سے تیمور نسلی کی زمینوں کے اصلی اور نقلی دونوں دستاویزات اس اجنبی کو لا کر دو گی۔"

"ہاں۔ وعدہ کیا تھا۔"

"اب اپنا وعدہ پورا کرو۔ اپنی الماری سے لاکر کی چابیاں اور تمام بینکوں کے چیک بکس نکالو۔"

"الماری کہاں ہے؟ مجھے صرف دو سلگتی ہوئی آنکھیں نظر آرہی ہیں۔"

"دو ظرفہ بصیرت سے کام لو۔ اپنی ظاہری آنکھوں سے اپنے آس پاس ماحول کو دیکھو اور باطنی آنکھوں سے ان سلگتی ہوئی آنکھوں کو دیکھتی رہو — بولو تمہارے سامنے کیا ہے؟ تمہیں کچھ نظر آرہا ہے؟"

"ہاں نظر آرہا ہے۔ میرے سامنے آئینہ ہے اور مجھے کمرے کی ہر چیز نظر آرہی ہے۔"

"اب تم الماری کے پاس جاؤ۔ جیسا میں نے کہا ہے، ویسا ہی کرو اور اپنی ہر حرکت کے متعلق سوچتی رہو کہ تم کہاں جا رہی ہو اور کیا کر رہی ہو؟"

میرے حکم کے مطابق وہ اپنی ہر حرکت کے متعلق سوچنے لگیں۔

"میں الماری کے پاس جا رہی ہوں — الماری کھول رہی ہوں۔ دراز میں لاکر کی چابیاں رکھی ہوئی ہیں — میں چابیاں اٹھا کر پرس میں رکھ رہی ہوں۔ چار مختلف بینکوں کی چیک بکس بھی اٹھا کر پرس میں رکھ رہی ہوں — دراز بند کر رہی ہوں — اب الماری بند کر رہی ہوں —— اس کے بعد مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

میں نے ہدایت کی ”یہ دو آنکھیں تمھارے دماغ میں پیوست رہیں گی اور تم ظاہری آنکھوں سے اس دنیا کو دیکھتی اور سمجھتی رہو گی۔ ابھی اپنے کمرے سے نکل کر بینک جاؤ گی۔ تمھارے راستے میں جو بھی ملنے جلنے والا آئے تم حسبِ معمول اس سے باتیں کرو گی۔ ابھی تم کوٹھی سے نکل کر اپنی کار میں نہ جاؤ۔ پیدل چلتی ہوئی کوٹھی کے مین گیٹ سے باہر آکر کھڑی ہو جاؤ۔“

ان کی سوچ مجھے بتلانے لگی۔ وہ اپنے بیڈ روم سے نکل کر کاریڈور سے گذرتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہی تھیں۔ اسی وقت ان کی سوچ نے کہا ”میں چلتے چلتے رُک گئی ہوں۔ مجھے میرا خاوند آوازیں دے رہا ہے، میں کیا کروں؟“

چچا جان رُکاوٹ بن رہے تھے۔ چچی کی توقع کے خلاف جلد ہی نیند سے بیدار ہو گئے تھے۔ میں نے کہا ”اپنے خاوند سے مسکرا کر باتیں کرو . . . . .“

وہ باتیں کرنے لگیں۔ چچا جان نے ان سے کچھ پوچھا تھا۔ وہ جواب دے رہی تھیں ”آپ — کیا آپ میرے ساتھ بینک جائیں گے لیکن میں تو . . .“

وہ کہتے کہتے رُک گئیں۔ میں نے فوراً ہی انھیں مشورہ دیا ”اپنے خاوند سے کہو ٹھیک ہے ہم ابھی جائیں گے۔ آپ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر لباس تبدیل کیجیے۔ اس وقت تک میں پاس والی کوٹھی سے ہو کر آتی ہوں۔“

انھوں نے میری ہدایت کے مطابق اپنے خاوند کو جھانسا دیا۔ اس کے بعد ان کی سوچ نے کہا ”وہ اپنے کمرے کی طرف لباس تبدیل کرنے جا رہے ہیں۔ میں ڈرائنگ روم سے گذرتی ہوئی باہر جا رہی ہوں — باہر پورچ میں کار کھڑی ہوئی ہے لیکن میں ڈرائیور کو نہیں بلاؤں گی — میں مین گیٹ کی طرف جا رہی ہوں . . . . .“

ذرا دیر بعد انھوں نے کہا کہ وہ مین گیٹ کے باہر آ کر کھڑی ہو گئی ہیں۔ میں نے کہا۔

”اب تم سامنے دیکھو۔ تمھارے سامنے جو کوٹھی ہے، اسے ذہن نشین کرو۔ بینک کے لاکر سے کاغذات نکال کر تم اس کوٹھی کے پچھلے راستے سے آؤ گی اور اس کوٹھی میں داخل ہو جاؤ گی۔ وہاں ایک کمرے میں وہ سلگتی ہوئی آنکھیں تمھارا انتظار کر رہی ہیں — اب آگے بڑھو اور کسی ٹیکسی میں بیٹھ کر پہلے اس بینک میں جاؤ جس کے لاکر میں کاغذات رکھے ہوئے ہیں۔“

وہ حکم کی تعمیل کر رہی تھیں اور سوچتی جا رہی تھیں۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد انھیں ٹیکسی مل گئی تھی۔ میں ان کے خیالات کو پڑھ رہا تھا اور اپنے بیڈ روم کے قالین پر بیٹھا ہوا ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ میں اس بات کے لیے بالکل تیار بیٹھا تھا کہ ان کے راستے میں کوئی رُکاوٹ آئے گی تو ان کی سوچ میں رہ کر انھیں اس رُکاوٹ سے نکال کر لے جاؤں گا لیکن انھیں کسی خاص پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ انھوں نے بینک پہنچ کر منیجر سے ملاقات کی اور اس کی موجودگی میں لاکر کھول کر دستاویزات نکال لیں تھوڑی دیر بعد وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر میری کوٹھی کی طرف آ رہی تھیں۔

جب وہ کوٹھی کے پچھلے گیٹ تک پہنچ گئیں تو میں نے حکم دیا — ”ٹیکسی ڈرائیور کو انتظار کرنے کے لیے کہو اور کوٹھی کے پچھلے دروازے سے آ جاؤ۔“

انھوں نے ڈرائیور کو انتظار کرنے کے لیے کہا اور میری رہنمائی میں کوٹھی کے اندر داخل ہو گئیں۔ میں انھیں بتا رہا تھا کہ ان کو کس کمرے سے گذرنا ہے، کس طرح کاریڈور کو پار کر کے میرے کمرے کے دروازے پر آنا ہے۔ اس کے بعد میں نے آنکھیں کھول کر دروازے کو گھورتے ہوئے کہا۔

”دروازہ کھولو . . . . . !“

دروازہ آہستہ آہستہ کھُلنے لگا۔ وہ سامنے سحر زدہ سی کھڑی تھیں اور سیدھی میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

”اندر آ جاؤ اور میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔“

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے میں آئیں۔ پھر میرے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئیں۔

”وہ کاغذات میرے حوالے کرو۔“

انھوں نے پرس کھول کر تہہ کیے ہوئے کاغذات نکالے اور میری طرف بڑھا دیے۔ میں اصلی دستاویزات کو کھول کر پڑھنے لگا۔ وہ کاغذات بتا رہے تھے کہ میرے دادا مرحوم نے اب سے پچپن برس پہلے شاہ کوٹ کی زمینیں جو کہ پانچ سو ایکڑ کے رقبے میں تھیں، انھیں میرے والد مرحوم کے نام لکھ دیا تھا۔ انھوں نے چچا ناصر علی کو عاق کرنے کے بعد صرف میرے والد کو جائز اور واحد وارث قرار دیا تھا۔

دوسری دستاویزات جعلی تھیں۔ میں نے فی الحال انھیں پڑھنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ ابھی بہت سارے کام پڑے تھے۔ ابھی چچی کے اکاؤنٹ سے نقد رقمیں حاصل کرنی تھیں۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنی آہنی الماری کھولی اور اس میں کاغذات کو حفاظت سے رکھ دیا۔ پھر خالی بریف کیس چچی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”اسے اپنے ساتھ لیجاؤ۔ اپنے اکاؤنٹ سے ایک لاکھ روپے نکالو اور اس میں رکھ کر یہاں لے آؤ۔ جس ٹیکسی میں تم جاؤ گی، اس کا کرایہ ادا کر کے اسے رخصت کر دینا۔ واپسی میں کسی دوسری ٹیکسی میں آنا — اب جاؤ . . . .“

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور بریف کیس اٹھا کر میرے کمرے سے باہر چلی گئیں — بے چاری بہت ہی سمجھدار تھیں۔ بچپن سے اب تک مجھ پر کتنے ہی ظلم توڑے تھے لیکن میرے والد مرحوم کی زمینوں سے حاصل کیے ہوئے لاکھوں روپے میرے ہی لیے حفاظت سے بینکوں میں رکھے تھے اور اب بڑی پابندی سے مجھے قسط وار ادا کر رہی تھیں۔

اب میں اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ وہ کس طرح میرے حکم کی تعمیل کرتی رہیں اور ہر ہفتے لاکھ دو لاکھ روپے بڑی فرمانبرداری سے مجھے لا کر دیتی رہیں۔ اس دوران میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ چچا جان کو کسی طرح بھی دوالیہ ہونے کا شبہ نہ ہو۔ اس کے لیے چچی کے سیف میں پچاس ہزار روپے رکھوا دیے تھے تاکہ ضرورت کے وقت وہ کچھ طلب کریں تو چچی ان کی ضرورت پوری کر دیا کریں۔ غزالہ نے اپنے منصوبے کے مطابق اپنی ممی سے ایک لاکھ روپے طلب کیے تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنی ممی کی رازداری

بن کر رہنے کی قیمت چاہتی تھی۔ میں نے چچی کو حکم دیا تھا کہ وہ غزالہ کو ایک لاکھ روپے کا چیک دے دیں۔ یہ فیاضی میں نے اس لیے دکھائی کہ مجھے خود پر اعتماد تھا اور میں جانتا تھا کہ کسی دن بھی غزالہ سے وہ ایک لاکھ روپے مع سود وصول کر لوں گا۔ جب تک میں چچی کو کنگال بناتا رہا اس وقت تک غزالہ کو ذہن سے دُور جھٹکتا رہا۔ اسے دُور سے دیکھنے سے بھی کتراتا رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے حُسن و شباب کی نرمی و گرمی سے میرے حواس پر چھا جائے۔ جو خواہش مرد کو کمزور بنا دیتی ہے، میں اس خواہش کو جبراً کچل دیتا ہوں۔

بہرحال تین ماہ کے عرصے میں، میں نے چچی کے تمام اکاؤنٹس سے روپے نکلوا لیے۔ ان کے کسی اکاؤنٹ میں سو روپے اور کسی میں دو چار سو روپے برائے نام چھوڑ دیے۔ چچی کی گھبراہٹ اور پریشانیاں قابلِ دید تھیں۔ جب بھی میں انھیں اپنے عمل سے آزاد کرتا، وہ اپنے بینک اکاؤنٹس کو دیکھ کر اختلاجِ قلب میں مبتلا ہو جاتیں۔ اب وہ کس کے سامنے اپنی تباہی کی داستان سُناتیں؟ کوئی ان کی بات کا یقین نہ کرتا کہ دولت پُراسرار طور سے غائب ہو رہی ہے۔ غزالہ تو صاف کہہ چکی تھی کہ وہ نوجوانوں کے عشق میں مبتلا ہو گئی ہیں اور اس رازداری کا معاوضہ بھی اس نے وصول کر لیا تھا۔ ان کی ہائی سوسائٹی میں بھی یہ بات مشہور تھی کہ نوجوان لڑکے اس بوڑھی بیگم کے اطراف پروانہ وار گھومتے ہیں۔ چچا جان نے اب تک ان پر شبہ نہیں کیا تھا مگر جب دیوالیہ ہونے کا علم ہوتا تو وہ بھی یہ سوال کرتے کہ لاکھوں روپے جب اپنوں میں سے کسی کو نہیں دیے گئے تو پھر وہ کہاں گئے؟

اس کا جواب چچی کے پاس نہیں تھا۔ وہ بڑی ہیرا پھیری سے چچا جان اور گھر کے اخراجات کو سنبھال رہی تھیں اور اپنے بیٹے ظہیر کی دکانوں سے آنے والی آمدنی سے اپنی تباہی پر پردہ ڈال رہی تھیں۔ میں ان کے خیالات پڑھ کر یہ معلومات حاصل کر رہا تھا۔ بس ایک بیٹا ہی ان کا سہارا رہ گیا تھا۔

ایسے وقت میں نے ظہیر کو ٹارگیٹ بنا لیا۔

ظہیر جیسا کمزور ارادے کا مالک بڑی آسانی سے میرا معمول بن گیا۔ ایک صبح لبرٹی مارکیٹ میں خلافِ توقع اس سے ملاقات ہو گئی۔ وہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ایک دکان کی جانب دیکھ رہا تھا، جہاں اس کی گرل فرینڈ کچھ خریدنے کے لیے گئی تھی۔ میں کار کے قریب سے گذر رہا تھا کہ ظہیر کی نظریں مجھ سے ٹکرا گئیں۔ پہلے تو اس نے میرے قیمتی سوٹ کو حیرانی سے دیکھا۔ میں اس کے خیالات پڑھ رہا تھا۔ اس وقت اس کی سوچ کہہ رہی تھی۔

”او گاڈ! کیا یہ فرہاد ہے — نہیں، مجھے تو دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا ہے . . . .“

اُس نے خود کو یقین دلانے کے لیے میرے چہرے کو دیکھا۔ چہرے کو دیکھا تو ہماری نظریں پھر ایک بار ٹکرائیں۔ میں نے فوراً ہی اس کی نظروں کو گرفت میں لے کر سوچ کے ذریعے کہا۔

”تم ان آنکھوں کو دیکھ رہے ہو۔ تم ان آنکھوں کو دیکھتے رہو گے۔ یہ آنکھیں تمھارے دماغ کو چھو رہی ہیں اور تمھارے ذہن کی وسعتوں کا محاصرہ کر رہی ہیں۔ اب تم میرے حکم سے سوچو گے اور میرے حکم سے بولو گے۔ بولو تمھارا نام کیا ہے؟“

”ظہیر ناصر!“ اس کی آواز دُور کسی اندھے کنویں سے آئی۔

”میری یہ دو آنکھیں تمھارے تصور میں ہمیشہ روشن رہیں گی۔ تم ان آنکھوں کے زیرِ اثر رہو گے۔“

”میں ان آنکھوں کے زیرِ اثر رہوں گا۔“

”تم پرائی لڑکیوں سے نہیں ملو گے۔“

”میں پرائی لڑکیوں سے نہیں ملوں گا۔“

”یہ زندگی چار دن کی ہے۔ تم اس حیاتِ فانی کو یادِ الٰہی میں گذارو گے۔“

”یہ زندگی چار دن کی ہے۔ میں اس حیاتِ فانی کو یادِ الٰہی میں گذاروں گا۔“

”کیا تم یہاں کسی کا انتظار کر رہے ہو؟“

”ہاں۔ میں شکیلہ کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ سامنے جنرل اسٹور میں گئی ہے۔“

”شکیلہ پرائی لڑکی ہے۔“

”ہاں۔ وہ پرائی لڑکی ہے۔ میں اس سے نہیں ملوں گا۔“

”تم یہاں سے کتابوں کی کسی دکان میں جاؤ اور وہاں سے ایسی کتابیں خریدو، جو نماز، روزے اور کلمات سیکھنے کے سلسلے میں تمھاری رہنمائی کر سکیں۔ کل صبح چھ بجے تک تم تنویمی عمل کے زیرِ اثر رہو گے اور میری ہدایات کے مطابق اور دینی کتابوں کے مطابق عمل کرتے رہو گے . . . .“

وہ میری ہدایات کو دُہرانے لگا۔ اتنے میں شکیلہ آ گئی۔ میں نے سوچ کے ذریعے ظہیر سے کہا۔

”شکیلہ کو پہچاننے سے انکار کر دو۔ تم یہاں سے تنہا جاؤ گے۔“

وہ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھنا چاہتی تھی، ظہیر نے تیور بدل کر پوچھا۔

”کون ہو تم؟ بغیر اجازت کار میں کیوں گھسی آ رہی ہو؟“

شکیلہ نے پہلے تو تعجب سے اسے دیکھا، پھر مسکراتی ہوئی بولی۔

”بہت خوب! تم ایسا بے تکا مذاق بھی کرتے ہو؟“

”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ تم میرے لیے پرائی ہو یعنی کہ نامحرم ہو۔ میں تمھارے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ بولی ”کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟“

”ہاں۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ یہ زندگی چار دن کی ہے اسے یادِ الٰہی میں گذارنا چاہیے۔“

اس بار شکیلہ نے تیور بدل کر طنزیہ انداز میں کہا۔

"مولوی صاحب۔ تم اتنے ہی پارسا ہو تو مسجد میں جا کر عبادت کرو۔ میرے شوروم کی کار میں بیٹھ کر میری توہین کر رہے ہو۔ اگر تمھیں اپنی عزت کا خیال ہے تو اپنے الفاظ واپس لو، مجھ سے معافی مانگو ورنہ میں دھکے دے کر اس کار سے باہر کر دوں گی۔"

تب پتہ چلا کہ وہ شکیلہ کے شوروم کی کار تھی اور ظہیر مالک بنا بیٹھا تھا۔ میں نے کار کی کھڑکی پر ہاتھ ٹیک کر ذرا جھکتے ہوئے ظہیر کے پاس بیٹھی ہوئی شکیلہ کو دیکھا۔ اس کی نظریں بھی مجھ پر جم گئیں۔ اتنی دیر بعد ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے جب وہ دکان سے نکل کر آ رہی تھی، تب میں نے صرف اس کے لباس کی جھلک دیکھی تھی۔ شکیلہ نے بھی شاید اس وقت مجھے نہیں دیکھا تھا کیونکہ اس کی آنکھیں میرے چہرے اور میرے لباس کو یوں تک رہی تھیں جیسے دکان کے شوکیس میں اپنے پسندیدہ گڈے کو دیکھ رہی ہو۔ گڈا میں نے اس لیے کہا کہ اس لڑکی کی آنکھوں میں ابھی بچپن کی معصومیت باقی تھی۔ اگر وہ جوان نہ ہوتی تو اس کے لیے یہی مشورہ مناسب ہوتا کہ وہ کسی کو بوائے فرینڈ بنانے کی بجائے ابھی گڈے گڑیا سے کھیلتی رہے۔ میں نے ظہیر سے کہا۔

"یہ ایک نامحرم کی کار ہے۔ تمھیں یہاں سے پیدل ہی جانا چاہیے۔"

اس نے میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔ میں ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ وہ کار سے نکل کر چپ چاپ ایک طرف بڑھتا چلا گیا۔ شکیلہ بھی کار سے باہر آ گئی تھی۔ وہ حیرانی سے کبھی ظہیر کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور کبھی مجھے سوالیہ نظروں سے تک رہی تھی۔ پھر اُس نے کہا۔

"تعجب ہے۔ اس کے سوچنے کا انداز اچانک ہی بدل گیا ہے۔ کبھی اللہ رسول کا نام نہیں لیتا تھا مگر ابھی مولویوں کی طرح گفتگو کر رہا تھا۔"

میں نے کہا۔ "انسان کے دل میں کسی وقت بھی ایمان آ سکتا ہے۔ وہ بھی انسان ہے۔ ایمان کی تلاش میں جا رہا ہے۔"

"آپ کون ہیں؟" اس نے پوچھا۔ "آپ نے اسے پیدل جانے کے لیے کہا، وہ پیدل چلا گیا۔ کیا یہ عجیب سی بات نہیں ہے؟"

"بظاہر عجیب سی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ میرا مقروض ہے۔ تمھارے یہاں آنے سے پہلے میں اپنی رقم کا تقاضا کر رہا تھا۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔" وہ کہنے لگی۔ "مال روڈ پر اس کی دو دکانیں ہیں۔ سُنا ہے کہ ہر ماہ پچیس تیس ہزار روپے کی آمدنی ہے۔ پھر یہ مقروض کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "آمدنی لاکھ روپے کی ہو تب بھی [illegible] کی قرض کے لیے ہاتھ پھیلاتا رہتا ہے۔ وہ اس لیے یہاں سے چلا گیا کہ میں تمھارے سامنے پھر تقاضا کروں گا۔"

وہ قائل ہو کر بولی۔ "ہاں۔ یہ میں نے بھی سُنا ہے کہ ظہیر جوئے اور ریس کا شوقین ہے۔"

"تم اسے کب سے جانتی ہو؟"

اس نے مجھے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ مجھے تم سے کیوں مخاطب کر رہے ہیں؟ ہمارے درمیان بے تکلفی تو نہیں ہے؟"

اس کے دیکھنے کے انداز میں تیکھا پن تھا مگر آنکھوں میں بچپنا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی بچی مجھ سے بڑی عورت کا کھیل کھیل رہی ہے۔ میں نے جواب دیا۔

"میں بچوں کو تم سے مخاطب کرتا ہوں۔"

وہ کار کے سامنے سے گھومتی ہوئی میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر اور سینہ تان کر بولی۔

"کیا میں بچی نظر آتی ہوں؟ کیا تمھاری آنکھیں کمزور ہیں؟"

میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ ایسے بھرے بھرے بدن کی لڑکی تھی کہ بدن کی شادابیاں لباس سے بغاوت کرتی نظر آ رہی تھیں۔ اس نے راستے کا خیال کیا تھا نہ آس پاس سے گذرنے والے لوگوں کی پرواہ کی تھی، بے دھڑک خود کو نمایاں کرنے میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کا یہ انداز بتا رہا تھا کہ وہ شکار کھیلنے والی لڑکی ہے۔ میں فوراً ہی اس کے خیالات کو پڑھنے لگا۔ وہ سوچ رہی تھی۔

"ہوں۔ یہ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ رہا ہے۔ دلچسپی سے دیکھ رہا ہے۔ اوپر سے کیسا پتھر نظر آتا ہے مگر اندر سے پگھل رہا ہے اور اسے پگھلنا چاہیے۔ ظہیر تو اب یہ کار نہیں خریدے گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خرید لے۔ میں بھی عجیب ہوں۔ غصہ دکھا کر ظہیر کو ناراض کر دیا۔ ایک گاہک ہاتھ سے نکل گیا، اب دوسرے کو آزمانا چاہیے مگر یہ خاموش کیوں ہے.....؟"

میری خاموشی کا خیال آتے ہی اُس نے پوچھا۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ کیا میں بچی نظر آتی ہوں؟"

میں اس کی تکنیک کو سمجھ گیا۔ پہلے وہ اپنی نمائش کر کے ثابت کرتی کہ وہ بچی نہیں ہے۔ پھر میری زبان سے اگلواتی کہ وہ جوان ہے۔ میں عام نوجوانوں کی طرح اس کے حسن و شباب کے گن گاتا! اس طرح ہماری مختصر سی ملاقات رومانس کی طرف کروٹ بدلتی۔ پھر وہ رومانس کی بھول بھلیوں میں کار کا سودا کرتی۔ ظہیر نے نہیں لی، تم خرید لو۔ صرف کار کی قیمت دینا۔ میں کمیشن کے طور پر مل جاؤں گی۔"

میں نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس کا تیر نشانے پر بیٹھا ہو۔ پھر میں نے ایک گہری سانس لیکر کہا۔

"ہاں۔ تمھارا سراپا دیکھ کر بہکنے کو جی چاہتا ہے مگر افسوس کہ ہم بے تکلف نہیں ہیں۔"

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "مگر تم بے تکلفی سے بہت کچھ کہہ گئے ہو۔ مرد بڑے چالاک ہوتے ہیں۔"

"عورتوں سے زیادہ نہیں ہوتے۔" میں نے بھی ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "ویسے ابھی تم شوروم کی بات کر رہی تھیں۔ کیا ظہیر یہ کار خریدنا چاہتا تھا؟"

"ہاں۔ پتہ نہیں کیسے کایا پلٹ گئی۔ وہ ایک دم سے مولوی بن کر

چلا گیا۔"

میں نے کار کی باڈی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"عجیب بات ہے۔ میں بھی آج اسی ارادے سے نکلا تھا کہ اپنے لیے ایک اچھی سی کار پسند کروں۔"

اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ میں نے اس کی سوچ کو پڑھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ "مجھے فوراً ہی اپنے مطلب کی بات نہیں کرنی چاہیے ورنہ یہ کار کی قیمت گرائے گا۔ مجھے اس کار کی اہمیت جتانا چاہیے۔"

وہ فخریہ انداز میں کار سے ٹیک لگا کر بولی۔

"یہ نیا ماڈل ہے۔ پچپن ہزار کے کتنے ہی گاہک ہیں۔ میں ظہیر کو دوستی کی وجہ سے پینتالیس ہزار میں دے رہی تھی۔ اچھا ہوا وہ چھوڑ کر چلا گیا۔ اب اسے شوروم میں لے جاؤں گی تو دس ہزار زیادہ ملیں گے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "ہاں۔ اتنا بڑا منافع چھوڑنا نہیں چاہیے۔ تم اسے اپنے شوروم میں لیجاؤ۔"

وہ ذرا بجھ سی گئی۔ اسے توقع تھی کہ میں بھی ظہیر کی طرح پینتالیس ہزار کی بات کروں گا۔ مجھے کتراتے دیکھ کر وہ فوراً ہی کار کا دروازہ کھولتی ہوئی بولی۔

"میرا ڈرائیو کرنے کا موڈ نہیں ہے۔ کیا تم مجھے پلازہ تک لے جاؤ گے۔ پلیز!"

اس نے بڑی عاجزی سے پلیز کہا۔ میں نے اسے مزید پریشان کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ کار کے سامنے سے گھومتی ہوئی میرے پاس والی سیٹ پر آ گئی۔ میں نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"شوروم کہاں ہے؟"

"پلازہ سینما کے پاس ہے۔ ویسے یہ بتاؤ، اس گاڑی کی رننگ کیسی ہے؟"

"بہت عمدہ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی حسینہ کی ملائم آغوش میں سفر کر رہا ہوں۔"

وہ ہنسنے لگی۔ "معلوم ہوتا ہے، بہت عرصے کے بعد گاڑی چلا رہے ہو۔ تمھارے پاس کون سی گاڑی تھی؟"

"میرے پاس گاڑی نہیں تھی۔ اب ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ کار نہ ہو تو لڑکیاں متوجہ نہیں ہوتیں۔ کار ہو تو خود ہی ہاتھ ہلا کر راستہ روکتی ہیں۔ باہر کھڑی ہو کر لفٹ مانگتی ہیں۔ اندر بیٹھ کر لفٹ دیتی ہیں۔"

وہ ہنستی ہوئی کھسک کر میرے قریب آ گئی۔

"میرے متعلق کیا خیال ہے؟ میں نے بھی پلازہ تک لفٹ مانگی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ مگر کار تمھاری ہے۔"

"یہ تمھاری بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں کسی کے شوروم میں اتنی اچھی گاڑی نہیں ہے۔"

"تم اسے کس کے شوروم سے لائی ہو؟"

"میرے انکل کا شوروم ہے۔"

"پھر تو تمھاری وجہ سے تمھارے انکل کا کاروبار خوب چل رہا ہو گا۔ تمھارے ساتھ کسی گاڑی میں بیٹھنے کے بعد مجال ہے کہ کوئی گاہک ہاتھ سے نکل جائے۔"

وہ پھر ہنستی ہوئی بولی۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم ہاتھ سے نہیں نکلو گے؟"

"ہاں۔ اگر اس کی صحیح قیمت معلوم ہو جائے۔"

"میں سچ کہتی ہوں۔ پچپن ہزار تک دام لگ چکے ہیں لیکن اصلی قیمت پینتالیس ہزار ہے۔"

"عورتوں سے کاروبار کی بات کرنا حماقت ہے۔ وہ اپنی قیمت بھی لگا دیتی ہیں۔"

وہ گھور کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔

"دیکھو، اگر تم چاہتی ہو کہ میں اسے خرید لوں اور تمھیں بھی مناسب کمیشن مل جائے تو بالکل صحیح قیمت بتا دو۔ میں خریدنے کے موڈ میں ہوں۔"

وہ سوچنے لگی۔ "ملک صاحب سینتیس ہزار میں دے سکتے ہیں لیکن چالیس ہزار مانگتے ہیں۔ میرے کمیشن کے پانچ ہزار ملا کر پینتالیس ہزار ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے ہی کمیشن میں کمی کر سکتی ہوں۔ پانچ ہزار کی بجائے تین ہزار لے سکتی ہوں۔ اتنا تو مجھے ملنا ہی چاہیے۔ میں کتنی بھاگ دوڑ کرتی ہوں، کیسے کیسے ناز و انداز سے گاہکوں کو پھانستی ہوں۔ کچھ لوگ تو ہلکے پھلکے رومانس پر اکتفا کر لیتے ہیں مگر کچھ لوگ مجھ [illegible] روم میں لیجاتے ہیں۔ کیا اتنے پاپڑ بیلنے کے بعد میں تین ہزار روپے کی حقدار نہیں بنتی؟

میں اپنے گاہکوں کو کیسے سمجھاؤں کہ میں کون ہوں؟ میں کیا ہوں؟ میرا چاہنے والا مجھے فریب دے کر چلا گیا۔ اپنے پیار کی نشانی کے طور پر دو بچے چھوڑ گیا۔ کوئی نہیں جانتا کہ میں دو بچوں کی ماں ہوں۔ میری آنکھوں کی معصومیت اور میرے چہرے کا بھولپن میری عمر کو چھپا لیتا ہے! اس دنیا میں بہت کچھ چھپانے سے کچھ کچھ منافع ملتا ہے۔ بعض اوقات کچھ بھی نہیں ملتا۔۔۔ گاہک براہِ راست ملک صاحب سے سودا کرتے ہیں، پیمنٹ کرتے ہیں، کار لیجاتے ہیں اور میں دیکھتی رہ جاتی ہوں۔

یہ گاہک بھی ضرورت سے زیادہ چالاک ہے۔ اگر میں نے اپنے کمیشن سے دو ہزار کم نہ کیے تو یہ ہاتھ سے نکل جائے گا.....!"

یہ سوچنے کے بعد اس نے شکست خوردہ لہجے میں مجھ سے کہا۔

"تم نے ٹھیک [illegible] سوچا ہے۔ میں نے اپنی قیمت دو ہزار لگائی تھی۔ میں یہ دو ہزار کم کر دیتی ہوں۔ یہ گاڑی تمھیں تینتالیس ہزار میں مل جائے گی۔ میں اپنے انکل سے.....!"

میں نے بات کاٹ کر کہا۔

"وہ تمھارے انکل نہیں ہو سکتے۔ صاف گوئی سے کام لو۔ تم کاروں کی دلالی کرتی ہو۔ تمھیں صرف کمیشن چاہیے۔ دیکھو میں صاف صاف کہتا ہوں،

میں کار کے مالک سے براہِ راست سودا طے کروں گا۔ سودا جیسے بھی طے ہو گا، تم ہمارے درمیان نہ بولنا۔ میں تمھاری محنت کا معاوضہ ادا کروں گا۔ تمھارا کمیشن تمھیں ضرور ملے گا۔"

"میں اس دھندے میں کئی بار دھوکا کھا چکی ہوں۔ لوگ وعدہ کرتے ہیں مگر کمیشن دینے کا وقت آتا ہے تو مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہتے ہیں۔ ساتھ جاتی ہوں، تب بھی پوری رقم نہیں دیتے ــــ لیکن نہ جانے کیوں میں تمھیں جھوٹا اور فریبی نہیں سمجھتی۔ تمھارا لہجہ بتاتا ہے کہ تم جو کہتے ہو اسے پورا کرتے ہو۔"

میں نے گنگا رام کے قریب کار روک کر کہا۔

"تم یہاں سے اپنی کار لے جاؤ، میں پیدل آؤں گا۔ ہم شوروم میں ایک دوسرے کے لیے اجنبی رہیں گے۔ اپنے شوروم کا نام بتاؤ؟"

"پلازہ موٹرس۔ وہ آگے جا کر بائیں طرف ہے۔"

میں کار سے اُتر گیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آئی اور ڈرائیو کرتی ہوئی مجھ سے آگے نکل گئی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا پلازہ موٹرس تک پہنچا۔ وہی کار شوروم میں کھڑی تھی۔ میں اس کے چاروں طرف گھوم کر اسے دیکھنے لگا۔ شوروم کا پروپرائٹر ملک حیات میرے قریب آ گیا۔ پھر ہم دونوں میں لین دین کی باتیں ہونے لگیں۔ میں سینتیس ہزار پر اڑا رہا۔ وہ چالیس ہزار سے نیچے اترتا رہا۔ مختصر یہ کہ ایک گھنٹے کے بعد چھتیس ہزار میں سودا ہو گیا۔ اس کا منیجر میرا چیک لیکر گیا۔ بینک قریب ہی تھا۔ گاڑی کے کاغذات اور رسیدیں تیار ہونے تک وہ رقم لیکر آ گیا۔ جب میں اپنی نئی کار میں بیٹھ کر سڑک پر آیا تو تسکین مجھے پہلے ہی اشارہ کر کے آگے جا چکی تھی اور گنگا رام کے قریب ایک فٹ پاتھ پر کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے پاس کار روک دی۔ وہ دروازہ کھول کر بیٹھنے لگی۔ میں ڈلیش بورڈ سے چیک بک نکال کر اس کے لیے رقم لکھنے لگا۔

میں لکھ رہا تھا، وہ پڑھ رہی تھی اور میں اس کے خیالات پڑھ رہا تھا۔ جب میں نے رقم کی جگہ پانچ ہزار روپے لکھے تو وہ شدید حیرانی سے میرا منہ تکنے لگی۔

وہ سوچ رہی تھی "کیا واقعی یہ پانچ ہزار کا چیک کیش ہو جائے گا؟ ملک صاحب کو چھتیس ہزار دینے کے بعد شاید اس کے اکاؤنٹ میں اب پانچ ہزار نہ ہوں۔ یہ مجھے ٹالنے کے لیے چیک دے رہا ہے۔"

میں نے اس کی سوچ کا جواب نہیں دیا۔ کار اسٹارٹ کی اور بینک کے سامنے آ کر رُک گیا۔ پھر میں اسے ساتھ لیکر بینک کے کاؤنٹر پر گیا۔ بیس منٹ کے بعد وہ چیک کیش ہو گیا۔ وہ پانچ ہزار روپے پرس میں رکھتے وقت خوشی سے کانپ رہی تھی اور اپنی سوچ میں مجھے دُعائیں دے رہی تھی اور یہ فیصلہ کر رہی تھی کہ ایسا فراخدل گاہک مجھے دس راتیں رہنے کے لیے کہے گا، تب بھی انکار نہیں کروں گی۔

جب ہم بینک سے باہر آئے تو اس نے میرے بازو کو تھام رکھا تھا۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا کہ وہ قدم قدم پر مجھ پر قربان ہوتی جا رہی ہے۔ کار کے قریب پہنچ کر میں نے کہا۔

"مجھے ایک ضروری کام ہے۔ اب تم یہاں سے جاؤ۔"

وہ حیرانی سے منہ کھول کر مجھے دیکھنے لگی۔

"کک۔ کیا تم مجھے ساتھ نہیں لیجاؤ گے؟"

"نہیں۔ یہاں سے تمھیں ٹیکسی مل جائے گی۔ میں تمھیں اس لیے ساتھ نہیں لیجاؤں گا کہ میں نے تمھاری قیمت نہیں دی ہے۔ یہ پانچ ہزار روپے تمھارے بچوں کے لیے ہیں۔ یہ بڑے ہی افسوس کا مقام ہے، ہم عورت کا لباس اتارتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ کسی کی ماں بھی ہے۔ میں تم سے بہت کچھ سیکھ کر جا رہا ہوں۔"

میں نے کار میں بیٹھ کر دروازے کو بند کیا۔ وہ گُم صُم کھڑی ہوئی تھی۔ مجھ سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن میں نے کچھ کہنے کا موقعہ نہیں دیا۔ کار اسٹارٹ کی اور تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا اس سے دُور ہوتا چلا گیا۔

تین ماہ کے عرصے میں اب تک چچا جان اور غزالہ سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ میں یہ چاہتا تھا کہ جب تک انھیں ہر اعتبار سے کمزور نہ بنا دوں اس وقت تک ان کا سامنا نہ کروں۔ اتفاق سے چچا جان کے گھر والوں نے بھی ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ میں نے پھوپھی اور زرینہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ خواہ مخواہ اپنی امارت کی نمائش نہ کریں۔ جب تک میں نہ کہوں اس وقت تک آمد و رفت کے لیے کوٹھی کا پچھلا راستہ اختیار کریں لیکن اُس روز نئی کار میں بیٹھ کر میں سامنے والے گیٹ سے اپنی کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوا۔ زرینہ نئی کار دیکھ کر مچل گئی کہ میں اسے سیر کراؤں۔ میں نے اس کی خواہش پوری کی۔ اسے ساتھ لے کر دوپہر تک گھومتا رہا۔ جب ہم کوٹھی میں واپس آئے تو چچا جان سے سامنا ہو گیا۔

وہ اپنی کوٹھی کے مین گیٹ سے باہر آ رہے تھے۔ میں نے کار ان کے قریب لیجا کر روک دی۔ پھر کار سے اُتر کر انھیں سلام کیا۔ وہ مجھے اچانک ہی اپنے سامنے دیکھ کر اس قدر حیران تھے کہ سلام کا جواب دینا بھول گئے۔ کبھی وہ کار کو دیکھ رہے تھے، کبھی میرے سوٹ کو اور کبھی میری بدلی ہوئی شخصیت کو۔ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"چچا جان! کیا آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟ میں فرہاد ہوں۔ آپ نے مجھے اپنی کوٹھی سے نکال دیا تھا اس لیے اب میں اس سامنے والی کوٹھی میں رہتا ہوں۔"

وہ حیرانی سے اور بے یقینی سے سامنے والی کوٹھی کو دیکھنے لگے۔ میں ان کے خیالات پڑھ سکتا تھا مگر پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے چہرے سے حیرانی، پریشانی اور ندامت ظاہر ہو رہی تھی۔ میں نے پھر مسکرا کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے، میری خوشحالی دیکھ کر آپ کو صدمہ پہنچا ہے۔"

"نن۔ نہیں بیٹے!" انھوں نے جلدی سے کہا "میں بہت خوش ہوں۔ اللہ تمھیں اور ترقی دے۔ آج کل تم کیا کر رہے ہو؟"

میں نے جواب دیا "جب اللہ ترقی دیتا ہے تو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اُدھر کا مال اِدھر آتا رہتا ہے۔"

"پھر بھی، کچھ تو معلوم ہو کہ کیا کرتے ہو؟"

ان کے دماغ میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر میں اتنا دولت مند کیسے بن گیا؟ میں نے جواب دیا۔

"آپ کی دولت مندی کا راز یہ ہے کہ میرے والد مرحوم کی زمین و جائداد نے آپ کو فرش سے عرش تک پہنچا دیا ہے لیکن یہ راز دنیا نہیں جانتی ــــ میری دولت مندی کے پیچھے بھی کوئی راز ہے۔ یہ دولت اور شان و شوکت کتنے ہی راز و اسرار سے گذر کر آتی ہے۔ یہ ہم دولت مند جانتے ہیں مگر اپنے راز ایک دوسرے کو نہیں بتاتے۔ مجھے افسوس ہے، میں فی الحال آپ کے سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا۔"

"بیٹے! تم اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ میں نے تمھارے ابا مرحوم کی زمینوں پر قبضہ جما رکھا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں تمھیں بیٹے کی طرح چاہتا ہوں۔ میں نے تمھارا حق نہیں چھینا ہے۔"

میں نے خوش دلی سے کہا۔

"چلیے میں مان لیتا ہوں۔ اب آپ کو الزام نہیں دوں گا۔"

"ہاں بیٹے! پرانی رنجشوں کو بھول جاؤ۔ خون کے رشتوں میں جھگڑے ہوتے ہیں مگر وہ رشتے ٹوٹتے نہیں ہیں۔ چلو، میرے ساتھ آؤ۔ اپنی چچی سے ملو۔"

مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی صلح کر لیں گے۔ میں نے بھی سوچا کہ چلو اچھا ہے، دشمنوں کے قریب رہ کر ان کی رہی سہی کمزوریاں معلوم ہوتی رہیں گی۔ چچا کو صلح صفائی پر آمادہ دیکھ کر زرینہ نے آگے بڑھ کر انھیں سلام کیا۔ میں نے تعارف کرایا۔

"یہ پھوپھی کی لڑکی زرینہ ہے۔"

چچا جان نے اسے رسمی دُعائیں دیں۔ پھر ہم ان کے ساتھ چلتے ہوئے کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور اپنی بیگم کو آوازیں دینے لگے۔ میری نظریں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ اس وقت مجھے اپنے دل کے چور کا پتہ چلا۔ میں غزالہ کو تلاش کر رہا تھا۔ چچا جان سے صلح کرتے وقت بھی میرے دماغ کے کسی چور گوشے میں غزالہ چھپی ہوئی تھی۔ شاید میں اسی کے لیے یہاں تک چلا آیا کیونکہ اسی کی وجہ سے یہاں سے نکالا گیا تھا۔ اس خوبصورت بلا سے خوبصورتی کے ساتھ ہی پچھلا حساب چکایا جا سکتا تھا۔

چچی ڈرائنگ روم میں آئیں تو مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔ میری آنکھوں نے انھیں پل بھر کے لیے ٹھہرا دیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھیں "اللہ! یہ تو وہی آنکھیں ہیں۔ یہ آنکھیں پہلی بار ٹیکسی میں آئی تھیں۔ پھر یہ آنکھیں...."

میں نے فوراً ہی ان کی سوچ کو اپنی گرفت میں لیا "بس آگے کچھ نہ سوچنا۔ جتنا ان آنکھوں کے متعلق سوچ چکی ہو اسے بھول جاؤ۔ آگے بڑھو۔ مجھے پہچانو اور میری آمد پر خوشی کا اظہار کرو۔"

ان کے چہرے کے تاثرات یکسر بدل گئے۔ وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھیں اور لہک کر بولیں۔

"آہا۔ یہ تو اپنا فرہاد ہے ــ بیٹا! تمھارے یہاں آنے سے مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ آخر اتنے دنوں تک کہاں غائب رہے ہو؟"

میں نے جواب دیا "بس آپ لوگوں کو یاد کرتا رہا اور اپنا مستقبل بنانے کی راہیں تلاش کرتا رہا۔ جو کچھ بھی ہوں آپ کے سامنے ہوں۔ خدا کے فضل سے لاکھ دو لاکھ روپے تو گھر کے سیف میں ہی پڑے رہتے ہیں۔"

چچا جان نے مسکرا کر کہا "ہاں بھئی تم بڑے آدمی بن گئے ہو مگر اپنی چچی کی طرح کنجوس بن کر نہ رہنا۔ میں ان سے کبھی پیسے مانگتا ہوں تو یہ بہانے کر کے ٹال دیتی ہیں۔ کیوں بیگم ٹھیک ہے نا؟ لیکن کل میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔ مجھے ایک لاکھ پچیس ہزار کی ضرورت ہے۔ تم صبح ہی بینک سے نکال کر لے آنا۔"

چچی کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ ان کے کسی اکاؤنٹ میں ایک لاکھ پچیس ہزار تو کیا پچیس سو بھی نہیں تھے۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں "کل یہ فرہاد کنگال تھا، آج ہم کنگال ہو گئے ہیں۔ میں اپنے خاوند سے بھی نہیں کہہ سکتی کہ بے ایمانی سے حاصل کی ہوئی دولت میں نے کہاں ضائع کر دی ہے۔ پھر کل کیا ہو گا؟ انھوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ کوئی بہانہ نہیں سنیں گے۔ مجھے کسی سے قرض مانگنا ہی ہو گا۔ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے بغیر میں اپنی تباہی کو نہیں چھپا سکتی۔ اگلے ماہ فصل کی کٹائی کے بعد جو رقم آئے گی، اس سے میں قرض ادا کر دوں گی۔ کیا۔ کیا فرہاد سے قرض مل سکتا ہے؟ یہ کم بخت تو بڑی ڈینگیں مار رہا ہے کہ گھر کے سیف میں لاکھ دو لاکھ روپے پڑے رہتے ہیں۔ کیا یہ اپنی چچی کو قرض نہیں دے گا؟ ضرور دے گا۔ ذرا محبت اور چاپلوسی سے کام نکالنا ہو گا۔ محبت اور نفرت کا بھی ایک ٹائم ٹیبل ہوتا ہے۔ محبت کا موقعہ ہو تو محبت کرنی چاہیے ورنہ نفرت سے دھتکارتے رہنا چاہیے۔ میں اب تک اسے گالیاں دیتی اور دھتکارتی رہی ہوں لیکن اب ٹائم ٹیبل کے مطابق اس سے محبت جتا کر بڑے پیار سے قرض حاصل کرنا ہو گا...."

وہ سوچ رہی تھیں۔ اس دوران چچا جان زرینہ سے باتیں کرتے رہے۔ میں نے چچی کی سوچ میں مداخلت کرتے ہوئے کہا "بے شک فرہاد اُلّو کا پٹھا ہے، ذرا بہلانے پھسلانے سے قرض دے دے گا۔ ابھی میں غزالہ کو بلاتی ہوں۔ اُسے چائے لانے کے لیے کہوں گی....."

یہ سوچتے ہی انھوں نے آواز دی "غزالہ۔ یہاں آؤ بیٹی! دیکھو فرہاد آیا ہے۔ ملازم سے کہو اس کے لیے چائے لے آئے۔"

چچا جان نے کہا "بیگم! کیا تمھاری یادداشت کمزور ہو گئی ہے؟ غزالہ تمھارے سامنے باہر گئی ہے اور تم اسے آواز دے رہی ہو۔"

میں نے چچی کے دماغ کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر بڑبڑانے لگیں۔

"ارے ہاں۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔ وہ تو گھر میں نہیں ہے۔ نہ جانے میرے دماغ کو کیا ہو جاتا ہے۔"

وہ اپنی انگلیوں سے پیشانی کو رگڑنے لگیں۔ اتنے میں ظہیر کی آواز سُنائی دی۔ وہ بڑی قرات سے سلام کرتا ہوا زینے سے اُتر رہا تھا۔

"السلام و علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ،...."

میں حیرانی سے اُسے دیکھنے لگا۔ اُس کے سر پر سفید گول ٹوپی تھی۔

اس نے کھدر کا کرتہ اور ٹخنوں سے اوپر تک شرعی پاجامہ پہنا تھا اور ہاتھ میں تسبیح لیے زیرِ لب بُدبُداتا ہوا ہمارے قریب آرہا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے تنویمی عمل کا اتنا گہرا اثر ہوگا اور وہ شام ہوتے ہوتے سر سے پاؤں تک مولوی بن جائے گا۔

چچا جان اسے گھور کر دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے ڈانٹ کر کہا۔

"تم نے ابھی تک اپنا حُلیہ نہیں بدلا ہے؟ آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے؟ صبح سے صرف اللہ رسول کی باتیں کر رہے ہو۔ آج دکانوں کی طرف بھی نہیں گئے۔"

میں نے کہا "چچا جان! آپ تو ایسے ناراض ہو رہے ہیں جیسے اللہ رسول کا نام لینا کوئی جُرم ہے۔ دکانداری تو روز ہی ہوتی ہے۔ کم از کم ایک دن عبادت کے لیے بھی مقرر ہونا چاہیے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم ہفتہ صفائی اور ہفتہ کمائی مناتے ہیں لیکن ہفتہ عبادت کبھی نہیں مناتے ....."

"بیٹے! تم دُرست کہتے ہو۔ مجھے ظہیر کی عبادت گذاری پر اعتراض نہیں ہے لیکن اس عمر میں لڑکا تسبیح لیکر بیٹھ جائے تو پھر دنیاداری کیسے ہوگی؟ صبح سے اس لڑکے کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ گوشہ نشینی اختیار کرنے والا ہے۔ یہ دیکھو۔ اب یہ صوفے پر بیٹھنے کی بجائے فرش پر بیٹھ رہا ہے۔"

ظہیر نے فرش پر پلتھی مار کر بیٹھتے ہوئے درویشانہ انداز میں کہا۔

"ایک دن ہمیں اسی فرش کے نیچے جانا ہے۔ یہ قیمتی صوفے اسی دنیا میں رہ جائیں گے۔ صرف عبادت ہمارے ساتھ جائے گی۔ یہ زندگی چار دن کی ہے۔ بہتر ہے کہ ہم اس حیاتِ فانی کو یادِ الٰہی میں گذار دیں ....."

چچا جان نے جھلا کر کہا "ابے کبھی تیرے باپ نے بھی عبادت کی تھی؟ عبادت کرنا ہے تو وقت پر کرو اور کاروبار بھی سنبھالو۔ چلو اٹھو یہاں سے ....."

انھوں نے زبردستی اس کا بازو پکڑ کر اٹھا دیا۔ میں نے ظہیر کے دماغ پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

"ظہیر! تمھارے والد دُرست کہتے ہیں۔ دین داری اور دنیاداری کے اوقات مقرر کرو۔ یہ عبادت کا وقت نہیں ہے۔ تسبیح جیب میں رکھ لو۔"

اُس نے تسبیح جیب میں رکھ لی اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ چچا جان یہ سوچ کر مطمئن ہوگئے کہ بیٹے پر ان کی ڈانٹ ڈپٹ کا اثر ہوا ہے۔ زرینہ ظہیر کو ایک تماشہ سمجھ کر دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت میرے دماغ میں یہ بات آئی کہ اگر زرینہ کی شادی ظہیر سے ہو جائے تو کیسا ہو؟

دونوں کا جوڑ مناسب تھا۔ اگر زرینہ پارسا نہیں تھی تو ظہیر بھی پارسا نہیں تھا۔ جب رشتہ طے ہو جاتا تو میں دونوں کو ایک دوسرے کا وفادار رہنے اور شرافت سے زندگی گذارنے کا سلیقہ سکھا دیتا۔ پھر یہ کہ اس شادی سے ہمارے خاندانی جھگڑے ختم ہو جاتے۔ بہرحال میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ رشتہ طے ہونے کے بعد چچا جان اور چچی وغیرہ راہِ راست پر آسکتے ہیں یا نہیں؟

میں نے پہلے زرینہ کے دماغ میں پہنچ کر اس کی سوچ میں کہا "ہائے اللہ! میں بار بار ظہیر کو کیوں دیکھ رہی ہوں۔ آں۔ ہاں۔ اس میں کوئی بات ہے۔ ہاں اچھا ہے۔ مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے ....."

زرینہ بیٹھے بیٹھے بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔ وہ اچانک ظہیر کے متعلق ایسا سوچ کر پریشان تھی کہ وہ ایسا کیوں سوچ رہی ہے۔ میں نے جواباً سوچا۔

"واہ کیوں نہیں سوچوں گی۔ کسی نہ کسی کے متعلق تو مجھے سوچنا ہی ہوگا۔ ظہیر کیا بُرا ہے۔ خوبصُورت ہے۔ دولت مند ہے۔ یہ فرہاد تو کبھی مجھ سے شادی نہیں کرے گا۔ بس یونہی میری جوانی سے کھیلتا رہے گا۔ نہیں اب بہت ہو چکا۔ اگر ظہیر مجھے پسند کرلے تو میں فرہاد کی طرف رُخ بھی نہ کروں۔ ہائے اللہ یہ شرعی پاجامہ پہن کر کتنا اسمارٹ لگ رہا ہے ....."

میں تھوڑی دیر تک اس کے سوچنے کا انداز بدلتا رہا۔ کبھی چچی یا چچا جان مجھ سے مخاطب ہوتے تو میں ان کی باتوں کا جواب دیتا۔ اس کے بعد پھر زرینہ کی سوچ کو ظہیر کی طرف مائل کر دیتا۔ اس دوران چائے آگئی۔ چائے پیتے وقت میں نے ظہیر کے دماغ پر اثر انداز ہو کر کہا۔

"یہ لڑکی جو فرہاد کے ساتھ آئی ہے اُسے مسکرا کر دیکھو اور اس سے تعارف حاصل کرو۔"

ظہیر نے فوراً ہی مسکرا کر زرینہ کو دیکھا۔ زرینہ بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس سے نظریں ٹکراتے ہی وہ ذرا جھجک گئی اور سر جھکا کر زیرِ لب مسکراتی ہوئی اپنے دوپٹے کے آنچل سے کھیلنے لگی۔ ظہیر نے کہا۔

"معاف کیجیے گا، میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ کیا آپ فرہاد کے ساتھ آئی ہیں؟"

چچی نے جواب دیا "بیٹا! یہ تمھاری پھوپھی کی بیٹی زرینہ ہے۔ تم نے بچپن میں اسے دیکھا تھا۔"

"اچھا!" ظہیر نے کہا "اب تو پہچانی نہیں جاتیں۔"

میں نے پھر اسے حکم دیا "اس کے حسن کی تعریف کرو اور اپنے ڈیڈی سے کہو کہ تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔"

وہ کہنے لگا "زرینہ! بے تکلفی معاف کرنا، میں دل سے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ تم بے حد حسین ہو۔"

زرینہ شرما کر اپنے سر پر آنچل رکھنے لگی۔ چچا جان نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"ظہیر! یہ کیا بکواس ہے۔ تمھیں ایسی بات کہنے سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ فرہاد کو اس بے تکلفی سے شکایت پیدا ہوگی کیونکہ آپا نے بہت پہلے سے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ زرینہ کی شادی فرہاد سے کریں گی۔"

میں نے جواب دیا "نہیں چچا جان! پھوپھی جان نے یہ رشتہ طے نہیں کیا ہے۔ ویسے بھی نہ تو زرینہ نے مجھ سے شادی کرنے کے متعلق سوچا ہے اور نہ میں سوچتا ہوں۔ میں نے تو اس کی شادی کے لیے پچاس ہزار کے زیورات اور ایک لاکھ روپے نقد پھوپھی جان کو دے دیے ہیں۔ کہیں سے اچھا رشتہ آئے گا تو پھوپھی جان اس کے ہاتھ پیلے کر دیں گی۔"

میری بات ختم ہوتے ہی ظہیر نے اپنے باپ سے کہا۔

"ڈیڈی! میں زرینہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ممی نے بھی ایک دن کہا تھا کہ وہ کسی گھریلو قسم کی لڑکی کو بہو بنانا چاہتی ہیں۔"

چچی تو یہ سُن کر ہی خوش ہوگئی تھیں کہ زرینہ اپنے جہیز میں پچاس ہزار کے زیورات اور ایک لاکھ روپے لیکر آئے گی۔ ان دنوں وہ اسی فکر میں رہتی تھیں کہ کس راستے سے انھیں بڑی سے بڑی رقم مل سکتی ہے۔ انھوں نے چچا جان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اپنے بیٹے کی تائید کی۔

"ہاں بیٹا! تم نے میرے منہ کی بات چھین لی ہے۔ میں کتنی دیر سے یہی سوچ رہی ہوں کہ زرینہ میری بہو بن جائے۔"

چچا جان نے اس رشتے سے انکار تو نہیں کیا لیکن اتنا کہا کہ زرینہ کی والدہ ان کی دشمن بن بیٹھی ہیں اس لیے وہ بیٹی ان کے گھر نہیں دیں گی۔ میں نے انھیں یقین دلایا کہ میں پھوپھی جان کو سمجھاؤں گا۔ اگر یہ رشتہ ہوگیا تو برسوں کی عداوتیں ختم ہو جائیں گی۔

اس کے بعد چچی ہنس ہنس کر مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہیں۔ جب میں زرینہ کے ساتھ ان کی کوٹھی سے نکلا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ چچی اسی فکر میں تھیں کہ کل صبح چچا جان کو ایک لاکھ پچیس ہزار روپے کہاں سے لاکر دیے جائیں گے۔ اس وقت میں ہی ان کی مصیبت میں کام آسکتا تھا۔ لہٰذا وہ میرے ساتھ پیار و محبت کی باتیں کرتی ہوئی میری کوٹھی میں آگئیں۔

انھیں دیکھتے ہی پھوپھی جان کے تیور بدل گئے۔ وہ چچی جان کو خوب جلی کٹی سُنانا چاہتی تھیں لیکن میں نے انھیں الگ لیجا کر، عاجزی سے سمجھایا کہ دشمن خود ہی چل کر ہمارے دروازے پر آئے تو اسے معاف کر دینا چاہیے۔ پھر میں نے یہ بھی سمجھایا کہ ظہیر بہت اچھا لڑکا ہے۔ نمازی پرہیزگار ہے۔ مال روڈ کی دکانیں اس کے نام ہیں۔ زرینہ اس گھر میں بہو بن کر جائے گی تو راج کرے گی۔ چچی اس کا رشتہ مانگنے آئی ہیں لہٰذا انھیں ایک بیٹی کی ماں بن کر مصلحت سے کام لینا چاہیے۔

میری باتیں ان کی سمجھ میں آگئیں۔ انھوں نے چچی کے پاس آکر انھیں گلے سے لگا لیا۔ جوان بیٹی کا طوق گلے سے اتارنے کے لیے وہ پُرانی دشمنی بھُول گئیں۔

میں اپنے بیڈروم میں آگیا۔ مجھے معلوم تھا کہ چچی میرے پاس ہاتھ پھیلانے آئیں گی ـــــ سچ کہتا ہوں۔ اس وقت ان کی بے بسی اور پریشانیوں کا خیال کرکے میرا دل موم ہونے لگا۔ میں نے سوچا کہ وہ دشمن ہی سہی مگر ایک عورت کو حد سے زیادہ پریشان کرنا مردانگی نہیں ہے۔ بس بہت ہو چکا، اس وقت مجھے ان کے کام آنا چاہیے۔

میں نے یہی کیا۔ جب وہ پھوپھی سے باتیں کرنے کے بعد میرے پاس آئیں تو گفتگو کے دوران میں نے خود ہی کہا کہ کسی سلسلے میں انھیں میری مدد کی ضرورت ہو تو وہ مجھے اپنا بیٹا سمجھ کر خدمت کا موقع دیں۔ انھوں نے خوش ہو کر میری بلائیں لیں۔ پھر اپنی محتاجی اور قلاشی پر پردہ ڈالتی ہوئی بولیں۔

"بیٹے! میں دوسروں کو قرض دے کر پچھتا رہی ہوں۔ چھ ماہ پہلے میرا بھائی اپنے کاروبار کے لیے مجھ سے دو لاکھ روپے لے گیا۔ اس نے اب تک واپس نہیں کیے۔ ظہیر مجھ سے تین لاکھ روپے اب تک لے چکا ہے۔ یہ سب باتیں میں تمھارے چچا جان سے چھُپاتی ہوں۔ اب ان سے کہہ نہیں سکتی کہ میرے اکاؤنٹ میں زیادہ رقم نہیں ہے۔ تم مجھے ایک لاکھ پچیس ہزار قرض دے دو، میں جلد ہی تمھیں لوٹا دوں گی۔"

میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے اپنی آہنی الماری کھولی اور ان کی مطلوبہ رقم نکال کر انھیں دے دی۔ وہ مجھ پر قربان ہوئی جا رہی تھیں۔ میری بلائیں لیکر لفظوں کے پھُول نچھاور کر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ مجھے دُعائیں دیتی ہوئی چلی گئیں۔

ان کے بدلے ہوئے رویّے کو دیکھ کر سب ہی یہ کہہ سکتے تھے کہ اب انھیں عقل آگئی ہے اور انھوں نے سچے دل سے ہمیں اپنا سمجھ لیا ہے۔ وہ آیندہ ایک دشمن کی عقل سے نہیں سوچیں گی ـــــ لیکن اس دنیا میں لاکھوں کروڑوں انسانوں کی سوچ کچھ اور ہوتی ہے، عمل کچھ اور ہوتا ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں زبان سے دُعائیں دیتے ہیں اور دل سے گالیاں نکالتے ہیں۔

چچی کی سوچ بھی یہی کہہ رہی تھی۔ وہ میرے پاس اتنی دولت دیکھ کر کُڑھ رہی تھیں اور یہ منصوبے بنا رہی تھیں کہ وہ کس طرح مجھے بیٹا کہہ کر اور مجھے ایک ماں کا پیار دے کر وقتاً فوقتاً مجھ سے رقمیں وصول کرتی رہیں گی۔

میں اپنی پیدائش کے بعد ہی ماں کی ممتا سے محروم ہو گیا تھا۔ چچی ماں کے بے لوث مقدس رشتے کی ڈمی بن کر میری محرومی سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھیں۔

اگر میں خیال خوانی کے علم سے واقف نہ ہوتا تو یقیناً ان کی جھُوٹی ممتا کے فریب میں آجاتا۔ اس وقت جی میں آیا کہ جو رقم میں نے قرض کے طور پر دی ہے اسے ابھی اُن سے چھین لوں۔ میرے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ میری آنکھوں کے زیرِ اثر وہ خود ہی ساری رقم واپس لاکر دے دیتیں لیکن دی ہوئی چیز کو واپس لینا مجھے اچھا نہیں لگا۔ جو مہربانی کر دی سو کر دی۔ آیندہ ان کے کام نہ آنے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسری صبح سب سے پہلے میں نے ظہیر کی خبر لی۔ اس کے دماغ تک پہنچنے سے پتہ چلا کہ وہ کلامِ پاک کی کوئی مختصر سی آیت یاد کر رہا ہے۔ مجھے یہ سوچ کر بے حد خوشی ہوئی کہ میرا علم کسی کو صراطِ مستقیم کی طرف لیجا رہا ہے۔ کاش کہ میں ہر انسان کو سیدھا راستہ دکھا سکتا لیکن یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ لوگ مختلف مزاج کے حامل ہوتے ہیں۔ ظہیر ایک ہی بار کی ہدایت پر نیکی کا راستہ اختیار کر رہا تھا۔ اس کے برعکس میں چچی صاحبہ کو بار بار ٹرانس میں لانے کے باوجود ان کے سوچنے کے انداز کو نہیں بدل سکا تھا۔ جو لوگ چچی کی طرح ٹھوکریں کھانے اور تباہ ہو جانے کے باوجود نہیں سنبھلتے پھر انھیں کوئی نہیں سنبھال سکتا۔

اس کے بعد میں نے چچی کی سوچ سے رابطہ قائم کیا! اس وقت ان کی سوچ سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ میں توجہ سے ان کے خیالات کو پڑھنے لگا۔ وہ گھبرائی ہوئی سی سوچ رہی تھیں ”اب کیا ہو گا؟ میں نے ان ہی کپڑوں کے نیچے وہ روپے چھپا کر رکھے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ فرہاد سے روپے لے کر میں سیدھی اپنے کمرے میں آئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ صبح ناصر کو روپے دوں گی۔ میں نے یہ الماری کھول کر یہاں کپڑوں کے نیچے نوٹوں کی گڈیاں چھپا دی تھیں۔ اب اپنے روپے سیف میں رکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ اسی ڈر سے میں نے یہاں روپے رکھے تھے مگر یہاں سے بھی غائب ہو گئے۔ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ یقیناً کوئی دشمن جادو یا کسی عمل سے مجھے تباہ کر رہا ہے اور میرا تو صرف ایک ہی دشمن ہے۔ فرہاد.....

لیکن نہیں۔ فرہاد دشمن ہوتا تو مجھے اتنی بڑی رقم کبھی نہ دیتا۔ کبھی زرینہ کا رشتہ ظہیر سے کرنے پر آمادہ نہ ہوتا ــــ بہرحال وہ دشمن ہو یا نہ ہو، میری اس بات پر کون یقین کرے گا کہ تمام بینکوں کے اکاؤنٹس سے میرے لاکھوں روپے غائب ہو گئے ہیں۔ صرف بینکوں سے نہیں، اس کمرے کے سیف سے اور الماری سے بھی روپے اور زیورات غائب ہو گئے ہیں.....“

وہ سوچ رہی تھیں۔ اب میں بھی حیرانی سے سوچ رہا تھا جس گھر کی دولت پر میں ہاتھ صاف کر رہا تھا، وہاں کوئی دوسرا ہاتھ کی صفائی دکھانے والا کیسے پہنچ گیا۔ یہ تو میرے لیے ایک چیلنج تھا۔ وہ میری ہی دی ہوئی رقم چُرا کر لے گیا تھا۔

کون ہو سکتا ہے وہ؟ گھر کا کوئی فرد ہی ہو گا۔ کیا ظہیر نے یہ حرکت کی ہے؟

میں نے ظہیر کے دماغ کو گرفت میں لیکر پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ مجرم نہیں ہے۔ مجھے بھی یقین تھا کہ وہ راہِ راست پر آنے والا ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

میں نے غزالہ کے خیال سے رابطہ قائم کیا مگر رابطہ قائم نہ ہوا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس شہر سے کہیں دُور چلی گئی ہے۔ چچی صاحبہ کے دماغ میں بیٹھ کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ پچھلی رات غزالہ کے ماموں آئے تھے۔ وہ ان کے ساتھ صبح چھ بجے پنڈی چلی گئی ہے۔ چچی کی سوچ نے مجھے بتایا کہ جب وہ مجھ سے روپے لیکر اپنی کوٹھی میں آئیں تو غزالہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی اپنے ماموں سے باتیں کر رہی تھی۔ جب چچی اپنے کمرے میں روپے رکھنے گئیں تو آس پاس یا کمرے کے باہر کوئی ملازم نہ تھا۔ چچا جان اپنے کمرے میں سو رہے تھے یعنی وہاں دو ہی افراد جاگ رہے تھے۔ ایک غزالہ اور دوسرا اس کا ماموں۔ اب مجھے ان دونوں پر شبہ تھا مگر وہ وہاں سے بہت دُور جا چکے تھے۔ میں فی الحال ان سے دماغی رابطہ قائم نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے ان میں سے جو بھی مجرم ہوتا، میں اس سے اپنی رقم مع سود وصول کر لیتا۔ اس وقت میں نے مجرم کو ڈھیل دے دی اور چچی کی پریشانیوں کو سمجھنے لگا۔

وہ سوچ رہی تھیں ”اب میں کیا کروں؟ ناصر سے کیسے کہوں کہ میں ایک لاکھ پچیس ہزار انھیں نہیں دے سکتی۔ وہ مجھ سے بینک کے اکاؤنٹس کا حساب طلب کریں گے۔ تمام چیک بکس اٹھا کر دیکھیں گے۔ انھیں معلوم ہو جائے گا کہ پچھلے تین ماہ میں، میں نے لاکھوں روپے بینک سے نکالے ہیں۔ وہ روپے کہاں گئے؟ یہ میں خود نہیں جانتی۔ زیادہ سوچنے کی کوشش کرتی ہوں تو میری سوچ میں گرہ پڑ جاتی ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ بات ناصر تسلیم نہیں کریں گے۔ کوئی بھی تسلیم نہیں کرے گا۔

پھر کیا ہو گا؟ پھر بدنامی کے راستے کھلیں گے۔ ناصر کا شبہ یقین میں بدل جائے گا کہ میں نوجوان لڑکوں سے دوستی کرتی ہوں اور ان پر اپنی دولت لٹاتی ہوں ــــ میں یہ بدنامی کیسے برداشت کر سکتی ہوں۔ میرا ایک جوان بیٹا ہے۔ جوان بیٹیاں ہیں ــــ میری بوڑھی جوانی ایک تماشہ بن جائے گی۔

آہ ــــ میں کیا کروں ــــ ابھی ناصر ناشتہ کرنے آئیں گے تو مجھے بینک جانے کے لیے کہیں گے۔ میں انھیں اتنی بڑی تباہی کی داستان نہیں سنا سکتی۔ ان کا منہ بند کرنے کے لیے دوبارہ فرہاد سے قرض نہیں مانگ سکتی۔ بچاؤ کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ مجھے دنیا والوں کا ڈر نہیں ہے۔ صرف ایک ناصر میرے لیے مصیبت بن گئے ہیں۔ اگر وہ مجھ سے حساب طلب نہ کریں تو پھر تباہی کا راز نہیں کھلے گا۔ ان کے سوا کس کی مجال ہے کہ کوئی مجھ سے ایک پیسے کا بھی حساب پوچھے ــــ لیکن اپنے اعمال کا حساب تو دینا ہی پڑتا ہے۔ عاقبت میں خدا حساب مانگتا ہے اور دنیا میں خاوند۔ اگر یہ خاوند نہ ہوتا تو میں کتنی آزاد ہوتی۔ مجھے کسی کا خوف نہ ہوتا۔ کوئی مجھ پر رُعب جما کر لاکھوں روپے کا حساب نہ مانگتا.....

ہاں اگر ناصر میرے راستے سے ہٹ جائے تو؟ تو ساری پریشانیاں دُور ہو جائیں گی۔

وہ کچھ دنوں کے لیے اس گھر سے چلا جائے ــــ اس شہر سے چلا جائے ــــ اللہ کرے کہ اس دنیا سے چلا جائے ــــ ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔

اگر ناصر رخصت ہو جائے تو پھر کسی دوسرے رشتے کو حق نہیں کہ وہ مجھے جوان چھوکروں سے عشق کرنے کا طعنہ دے ــــ ناصر کی آنکھ بند ہو جائے گی تو میرے اعمال کا کھاتہ کھولنے والا کوئی نہ ہو گا۔ یہ خوف، پریشانیاں جو تین ماہ سے زلزلے کے جھٹکوں کی طرح مجھے اندر سے تہس نہس کرتی آ رہی ہیں، یہ سب یک لخت دُور ہو جائیں گی اور میں آزادی اور سکون سے بقیہ زندگی گذار سکوں گی۔

بس اپنے بچاؤ کا ایک ہی راستہ ہے ــــ میری زندگی اور آزادی ناصر کی موت اور اعمال کا کھاتہ بند ــــ نہ میرا حاکم ہو گا نہ مجھ پر کسی کی حکومت ہو گی۔ نہ بانس رہے گا نہ بانسری بجے گی.....“

میں حیرانی سے ان کی سوچ کو سن رہا تھا۔ حیرانی اس بات کی کہ برسوں سے ساتھ نبھانے والی بیوی اپنے خاوند کی موت کا فیصلہ کر

تھی۔ اپنی بقا کے لیے خاوند کی فنا لازمی سمجھ رہی تھی۔

چچا جان نے ان کے لیے کیا نہیں کیا تھا؟ ان کی خاطر میرے ابا مرحوم کی جائداد پر ناجائز قبضہ جمایا تھا۔ مجھے فریب دیتے رہے تھے۔ ان کے لیے انھوں نے یہ عالیشان کوٹھی بنوائی۔ انھیں ریشم کے جوڑے پہنائے۔ انھیں جوانی سے بڑھاپے تک سونے چاندی ہیرے جواہرات سے سجا کر رکھا۔ ان کے لیے اس دنیا کو جنت بنا دیا ــــ بول عورت! اس سے زیادہ کیا چاہتی ہے؟ تیرا دل نہ بھرا۔ تیرا پیٹ نہ بھرا۔ اب پینے کے لیے خاوند کا صرف لہو باقی رہ گیا ہے؟

میرے بے خبر، بے ایمان چچا جان! بے ایمان زندگی کا ”ختم شُد“ اکثر بے ایمان بیویوں کے ہاتھوں سے لکھا جاتا ہے۔ آپ کی جانِ حیات، آپ کی حسین قلوپطرہ آپ کے لیے زہر کا پیالہ لیکر آ رہی ہے۔

کہاں ہیں چچی صاحبہ؟ کیا کر رہی ہیں؟

ان کا دماغ سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ پر عمل کر رہی تھیں۔ دودھ میں زہر گھول رہی تھیں۔

چچا جان کی عادت ہے، وہ صبح ناشتے میں دو اُبلے ہوئے انڈے کھاتے ہیں اور ایک گلاس دودھ پیتے ہیں ــــ اس روز وہ ان کی زندگی کا آخری ناشتہ تھا۔

میں نے چچی کی سوچ پر دستک دی ”بیگم ناصر! کیا کر رہی ہو ــــ؟“ ایک ساعت کے لیے وہ ٹھٹھک گئیں پھر ان کی سوچ نے جواب دیا۔

”ناصر کے لیے ناشتہ لیکر جا رہی ہوں۔“

میں نے حکم دیا ”انڈوں کی پلیٹ رکھ دو۔ صرف دودھ کا گلاس لیجاؤ اور اپنی ہر حرکت کے متعلق سوچتی جاؤ۔“

وہ سوچنے لگیں ”میں دودھ کا گلاس لیکر کچن سے نکل رہی ہوں۔ ڈائننگ روم سے گذر رہی ہوں ــــ اب کاریڈور میں آ گئی ہوں ــــ مجھے ناصر کے کمرے کا دروازہ نظر آ رہا ہے.....“

”رُک جاؤ!“

”میں رُک گئی ہوں۔“

”ناصر کے کمرے کے مقابل کس کا کمرہ ہے؟“

”میرا کمرہ ہے۔“

”اپنے کمرے میں جاؤ!“

”میں ناصر کے کمرے کی طرف سے پلٹ گئی ہوں اور اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔“

”دودھ کا گلاس سنگھار میز پر رکھ دو۔“

”میں دودھ کا گلاس سنگھار میز پر رکھ رہی ہوں۔“

”اب اپنا لیٹر پیڈ اور قلم لیکر کشن پر بیٹھ جاؤ۔“

”میں سنگھار میز کے خانے سے لیٹر پیڈ اور قلم اٹھا رہی ہوں اور اب کشن پر آ کر بیٹھ گئی ہوں۔“

”لیٹر پیڈ کے سادے کاغذ پر لکھو۔ میں اپنے مکمل ہوش و حواس کے ساتھ یہ اعتراف نامہ لکھ رہی ہوں کہ ہر انسان کو اپنی موت آپ مرنا ہے۔ یہ زہریلا دودھ میری زندگی کے لیے ہے اس لیے میں اسے پی رہی ہوں۔ میں اپنی موت کی آپ ذمّہ دار ہوں ــــ بقلم خود شمشاد بیگم زوجہ ناصر علی.....“

وہ میری سوچ کے مطابق لکھتی رہیں۔ اس کے بعد میں نے حکم دیا۔

”لیٹر پیڈ اور قلم سنگھار میز پر رکھ دو اور دودھ کا گلاس اٹھا لو۔“

”میں لیٹر پیڈ اور قلم میز پر رکھ رہی ہوں ــــ اور اب میں نے گلاس اٹھا لیا ہے۔“

”شاباش ــــ دودھ پی لو۔“

دوسرے لمحے وہ سوچ رہی تھیں ”میں دودھ پی رہی ہوں۔ آہ! کتنی تلخی ہے ــــ میرے حلق میں ــــ میرے سینے میں انگارے سلگ رہے ہیں۔ آں ــــ آں ــــ آنک ــــ میرے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا ہے ــــ آہ! میں اندر سے جل رہی ہوں ــــ جیسے میرا اکاؤنٹ، میرا سیف خالی ہو گیا، میں بھی خالی ہو رہی ہوں ــــ اب ــــ اب مجھ میں ــــ مجھ میں سوچنے کی بھی سکت نہیں ہے۔ تاریکی ــــ تاریکی ــــ نہیں ــــ نن۔ نہیں ــــ میں ــــ قبر کی تا۔ تاری۔ تاری کی.....“

گہری خاموشی اور سناٹا ــــ ایک عورت کی سوچ کے تمام دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے تھے۔

زندگی ناپائدار ہے۔ انسان اپنی دنیا میں نیکی اور بدی کا کھیل کھیلتے وقت اس حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے۔ بے چاری چچی بھی بھول گئی تھیں۔ اسی لیے اس دنیا کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی ہوئی ہمیشہ کے لیے گم ہو گئیں۔

میں چاہتا تو ان کے آخری خط میں ان کے ہاتھ سے بہت کچھ لکھوا سکتا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے تمام ڈھکے چھپے راز کھول دیتیں۔ یہ اعتراف کر لیتیں کہ انھوں نے چچا جان کے اعتماد کو کیسے ٹھیس پہنچائی ہے اور کس طرح جوان لڑکوں سے عشق کرتی رہی ہیں لیکن میں نے ایک بدکار عورت کی عزت رکھ لی۔ ایسی عورت جو اپنے فرمانبردار خاوند کو ہلاک کرنا چاہتی تھی، اس کے لیے سزائے موت کافی تھی۔ خس کم جہاں پاک.....

اب میں ان کے جنازے کو کاندھا نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ جھوٹی عزت، نفرت اور غرور کا اتنا بوجھ لیکر جا رہی تھیں کہ میں وہ بوجھ اپنے کاندھے پر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے ایک دن کے لیے شہر سے باہر جانے کا ارادہ کر لیا۔ لباس تبدیل کرتے وقت میں نے سوچا کہ ابھی تھوڑی دیر کے بعد چچا جان ناشتے کے لیے اپنی مُردہ بیگم کو آواز دیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ان کے کمرے میں آئیں اور ان کی لاش دیکھ لیں۔ پھر ماتم شروع ہو جائے گا۔ پولیس کو اطلاع دی جائے گی۔ اس کے بعد قانونی کارروائی کے لیے ان کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجی جائے گی۔ ابھی اس لاش کو قبر تک پہنچنے سے پہلے کتنے ہی مرحلوں سے گذرنا تھا۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد میں نے زمینوں کے کاغذات کی فوٹو

اسٹیٹ کاپیاں سیف سے نکالیں۔ کچھ نوٹوں کی گڈیاں جیب میں رکھیں۔ پھر پھوپھی کے پاس آ کر کہا۔

"میں پنڈی جا رہا ہوں، کل شام تک واپس آؤں گا۔"

میری بات سن کر زرینہ نے کہا "میں بھی پنڈی جاؤں گی۔ سُنا ہے کہ وہاں اسلام آباد کے نام سے نیا شہر بسایا جا رہا ہے۔ مجھے بھی لے چلو۔ میں وہ شہر دیکھوں گی۔"

میں نے جواب دیا "جب اسلام آباد مکمل طور سے آباد ہو جائے گا تو میں تمھیں لیجاؤں گا۔ بلکہ اس وقت تک ظہیر سے تمھاری شادی ہو جائے گی۔ وہی تمھیں لیجائے گا۔"

ظہیر کی بات پر اس نے سر کو جھکا لیا۔ ظہیر کے نام پر نہ تو وہ نفرت کا اظہار کرتی تھی نہ محبت کا۔ اس کی آرزو یہ تھیں کہ اس کی اپنی ایک بہت بڑی کوٹھی ہو، گھومنے پھرنے کے لیے کار ہو اور ہزاروں لاکھوں روپے کمانے والا خاوند ہو! اسی لیے وہ ظہیر کے نام پر خاموشی سے سر جھکا لیتی تھی۔

میں پھوپھی سے باتیں کرتا ہوا کوٹھی کے باہر آیا اور اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ پھر سر گھما کر چچا جان کی کوٹھی کی جانب دیکھا۔ وہاں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ابھی تک کسی کو چچی کی خودکشی کا علم نہیں ہوا تھا ورنہ وہاں سے رونے پیٹنے کی آواز سُنائی دیتی۔ کوئی ملازم دوڑتا ہوا ہمارے ہاں بھی اطلاع دینے آتا۔ میں نے پھوپھی سے پوچھا۔

"کیا آپ چچا جان کے ہاں جائیں گی؟"

"ہاں۔ ابھی میں یہی سوچ رہی تھی۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر آجاؤنگی۔"

میں نہیں چاہتا تھا کہ پھوپھی ایسے وقت وہاں جائیں۔ مناسب یہ تھا کہ پہلے چچا جان کو اپنی بیگم کی موت کی اطلاع ہوتی! اس کے بعد وہ پھوپھی کو اپنے غم میں شریک ہونے کے لیے بلاتے۔ میں نے کہا۔

"پھوپھی جان! ابھی وہ لوگ ناشتہ کر رہے ہوں گے۔ کھانے پینے کے وقت کسی کے ہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ آپ کم از کم دو گھنٹے کے بعد جائیں۔"

انھوں نے میری بات مان لی۔ میں کار اسٹارٹ کرنے کے بعد کوٹھی کے احاطے سے باہر آیا۔ پھر چچا جان کی کوٹھی کی جانب دیکھے بغیر تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا شاہ کوٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے مجھے پنڈی جانا چاہیے تھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ غزالہ یا اس کے ماموں نے پچھلی رات ایک لاکھ پچیس ہزار روپے چرائے ہیں اور دونوں ہی ایک ساتھ پنڈی گئے ہیں۔ مجھے وہ رقم ان سے چھین کر لے آنا چاہیے تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ چچی جان کی موت کی اطلاع ملتے ہی وہ سب لاہور آئیں گے۔ میں ان سے اسی شہر میں نمٹ لوں گا۔

ابھی مجھے ایک اور دشمن سے نمٹنا تھا اور وہ تھا پٹواری —— جس نے چچا جان سے مل کر مجھے دھوکا دیا تھا۔ میرے دادا مرحوم کی وصیّت کو بدل کر حکومتِ برطانیہ کے عدالتی جعلی دستاویزات تیار کیے تھے جن کی رُو سے چچا جان شاہ کوٹ کی زمینوں کے مالک بن بیٹھے تھے۔ شاہ کوٹ سے میل کے فاصلے پر میرے والد مرحوم کی تعمیر کی ہوئی حویلی ہے جس کے ہماری زمینیں پھیلی ہوئی ہیں۔ جب میں نے حویلی کے سامنے اپنی کار وہاں شادیانے بج رہے تھے۔ کھُلے میدان میں دیگیں چولہوں پر چڑھی تھیں۔ پتہ چلا کہ بوڑھا پٹواری کسی جوان چھوکری سے شادی رچا رہا ہے۔

چونکہ وہ پٹواری تھا اس لیے آس پاس کے بڑے بڑے زمیندار اس کی شادی میں شریک ہونے آئے تھے۔ میں اپنی کار سے باہر آیا سب کے سب کبھی مجھے اور کبھی میری قیمتی کار کو دیکھنے لگے۔ ان زمینداروں نے مجھے کبھی بچپن میں دیکھا ہوگا اس لیے مجھے نہیں پہچانا۔ میں نے کہا۔

"میں تیمور رسل مرحوم کا لڑکا ہوں۔ سُنا ہے کہ میرے چچا ناصر علی نے یہ حویلی پٹواری کو رشوت کے طور پر دی ہے۔ وہ رشوت کہاں ہے؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

میں پٹواری کی شان میں گستاخی کر رہا تھا۔ کچھ زمیندار ہوئی، کچھ زیرِ لب مسکرائے لیکن دو چار ذرا طیش میں آگئے۔ ایک سے کہا۔

"ذرا تمیز سے بات کرو صاحبزادے۔ یہ شہر نہیں ہے، پنڈ ہے۔ اکڑ دکھاؤ گے تو تمھاری لاش ہی یہاں سے واپس جائے گی۔"

میں نے مسکرا کر کہا "بے شک پنڈ کے لوگ دلیر ہوتے ہیں ایماندار بھی ہوتے ہیں۔ کسی کی بے ایمانی برداشت نہیں کرتے۔ اگر میں کر دوں کہ پٹواری بے ایمان ہے تو تم کس کا ساتھ دو گے، بے ایمان کا یا

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ سب ہی جانتے تھے کہ پٹواری بے ایمان اور جس حویلی پر قبضہ جمائے ہوئے ہے، وہ میرے والد مرحوم کی ہے۔

"آپ سب یہاں کے پُرانے باشندے ہیں۔ اپنے آباؤ اجداد زمانے سے ان زمینوں کا رتی رتی حال جانتے ہیں کہ کون سی زمینیں سے کس کی ملکیت رہی ہیں۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ میرے والد برسوں زمینوں کے مالک و مختار رہے تھے۔ اُن کے وفات پاتے ہی چچا جان پٹواری سے سازباز کی۔ پٹواری نے زمینوں کے جعلی دستاویزات تیار چچا جان کو یہاں کا مالک بنا دیا۔ یہ تمام باتیں آپ سب اچھی طرح

ایک زمیندار نے نرم لہجے میں کہا۔

"بیٹے فرہاد! ہمارے جاننے یا نہ جاننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ دیکھتا ہے۔ جو اپنی ملکیت ثابت کرتا ہے، وہی زمینوں کا مالک کہلاتا

"ہُم!" بوڑھے پٹواری کی بوڑھی غراہٹ سُنائی دی۔ دروازے پر کھڑا تھا۔ پھر میری طرف بڑھتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم پھر یہاں بکواس کرنے آگئے؟ پہلے جب آئے تھے میں چپلیں تھیں، بدن پر معمولی سا کپڑا تھا۔ اب تو سوٹ بوٹ میں پہچانے ہی نہیں جاتے۔ مزاج بھی بدل گیا ہے۔ اب کہو تو میں مزاج بدل دوں؟"

میں نے جیب سے دستاویزات کی فوٹو اسٹیٹ کا پیاں نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"پہلے اسے ایک نظر دیکھ لو، پھر اس شادی کو بھُول جاؤ گے اور بربادی پر رو ؤ گے۔"

"کیا ہے یہ؟" اس نے ایک جھٹکے سے اُن کاغذات کو لیا اور اسے پڑھنے لگا۔ یوں بھی اسے پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بوڑھا تجربہ کار پٹواری عدالتی کاغذات کو سونگھ کر ہی بتا سکتا تھا کہ وہ اصلی ہیں یا جعلی؟

انھیں سرسری نظروں سے دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ میں فوراً ہی اس کے خیالات پڑھنے لگا۔ وہ اپنی بدحواسی کو چھُپانے کے لیے یونہی کاغذات پر نظریں جمائے ہوئے تھا تاکہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ وہ پڑھ رہا ہے لیکن وہ سوچ رہا تھا۔

"یہ تو اصلی دستاویزات کی کاپیاں ہیں۔ یہ دستاویزات فرہاد کے ہاتھ کیسے لگیں۔ ناصر علی نے تو کہا تھا کہ انھیں جلا ڈالے گا مگر اب تو یہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں گی۔ یہ۔ یہ فرہاد بھی اب مفلس اور قلاّش نظر نہیں آرہا ہے۔ یہ قیمتی گاڑی، قیمتی سوٹ، یہ رعب اور دبدبہ اور اس کے للکارنے کا انداز بتا رہا ہے کہ مجھے عدالت تک گھسیٹ کر لیجائے گا۔ اوہ، میں کس مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ آج میری شادی ہے اور یہ بربادی کے لیے آگیا ہے مگر —— مگر ابھی مجھے اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔ یہ جوان لڑکا ہے۔ مجھ سے زیادہ قانونی ہیرا پھیری نہیں جانتا۔ اس پر دھونس جما کر کام نکالنا چاہیے......"

یہ سوچ کر اس نے دستاویزات کو حقارت سے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اونہہ۔ ان کاغذ کے ٹکڑوں سے مجھ پر رعب جمانے آئے ہو۔ یہ جعلی کاغذات ہیں۔ اصل وہی ہیں جو ناصر علی کے پاس ہیں۔"

میں نے دستاویزات واپس لیتے ہوئے کہا۔

"کل سے میں قانونی کارروائی شروع کروں گا اس سے پہلے میں نے سوچا کہ تمھیں اطلاع دے دوں تاکہ تمھارے دن کا چین اور راتوں کی نیندیں حرام ہو جائیں۔ اب تو یہ شادی بھی خانہ بربادی بن جائے گی۔ تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ میں قلاّش نہیں ہوں، برسوں تک مقدمہ لڑ سکتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں واپس جانے کے لیے پلٹ گیا اور کار کا دروازہ کھولنے لگا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔

"ٹھہرو۔ میری بات سُن لو۔ میں تمھارا دشمن نہیں ہوں اور نہ ہی چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے دشمنی کرو۔ میرے ساتھ حویلی میں چلو، میں تم سے ضروری باتیں کروں گا۔"

میں نے کار کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"جو کچھ کہنا ہے یہاں ان معزز آدمیوں کے سامنے کہو۔ تمھاری وجہ سے میں بھی دنیا والوں کے سامنے بچپن سے غریبی، مفلسی اور ذلت و رسوائی کی زندگی گذارتا آیا ہوں۔ میرے باپ کی دولت پر عیش کرنے والے مجھے لات جوتے مارتے اور گالیاں دیتے رہے۔ ان لات جوتوں میں تمھیں بھی برابر کا حصّہ ملنا چاہیے۔"

ایک زمیندار نے مجھ سے التجا کی۔

"فرہاد! پٹواری صاحب تم سے تنہائی میں باتیں کرنا چاہتے ہیں، آخر سُن لینے میں کیا حرج ہے؟"

"میں جانتا ہوں کہ یہ تنہائی میں کیا کہے گا۔ یہ اپنی پگڑی میرے قدموں میں رکھ دے گا اور مجھ سے عدالت تک نہ جانے کی التجا کرے گا کیونکہ ناصر علی کے نام جعلی دستاویزات اس نے خود تیار کیے ہیں اور میرے دادا جان کی طرف سے جعلی دستخط کیے ہیں۔ ایک بڑی رقم کے لالچ میں اور اپنے اثر و رسوخ کے گھمنڈ میں۔ اس نے سوچا تھا کہ فرہاد جیسا بچّہ اسے عدالت میں چیلنج نہیں کرے گا کیونکہ میں بے بس اور بے سہارا تھا۔ مقدمے بازی کے لیے میرے پاس دولت نہیں تھی لیکن اب میری تقدیر بدلتے دیکھ کر اسے اپنا بُرا انجام نظر آگیا ہے۔ اگر یہ آپ لوگوں کے سامنے اپنا جُرم تسلیم کرلے تو میں حویلی میں جا کر اس کی باتیں ضرور سُنوں گا۔"

تمام لوگ پٹواری کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ سب کے سامنے اپنے جُرم کا اقرار کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اس نے میرے قریب ہو کر عاجزی سے دھیمی آواز میں کہا۔

"فرہاد! خدا کے لیے میری عزت رکھ لو۔ پہلے حویلی میں چل کر مجھ سے بات کرلو۔ پھر جو تم کہو گے میں وہی کروں گا۔"

میں نے اس کے ندامت سے مُرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھا! اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ مجھے اُس پر ترس آگیا۔ یوں بھی میں مقدمہ بازی کے لمبے چکر میں پڑنے کی بجائے صلح صفائی سے کام نکالنا چاہتا تھا۔ میں نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا چلو —— مگر یہ نہ سمجھنا کہ میں تمھارے کسی فریب میں آکر قانونی کارروائی نہیں کروں گا۔ وہ تو میں ہر حال میں تمھیں عدالت تک گھسیٹ کر لے جاؤں گا۔ چلو۔"

وہ سر جھُکا کر میرے ساتھ چلتا ہوا حویلی کی بیٹھک میں آیا۔ پھر دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"فرہاد بیٹے! میں مجرم ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ جعلی دستاویزات مکمل کرتے وقت اس میں ایک ایسی غلطی رہ گئی ہے جسے تم بھی نہیں جانتے لیکن عدالت میں وہ غلطی چھُپی نہیں رہے گی۔ مجھے اس بڑھاپے میں جیل جانا ہوگا۔"

"کیا تمھیں احساس ہے کہ تم بوڑھے ہو چکے ہو؟"

"ہاں مجھے احساس ہے۔ میں تمھارے چچا کا ہم عمر ہوں۔"

"اور اتنے بوڑھے ہو کر شادی کر رہے ہو؟ کون ہے وہ بدنصیب عورت؟ عورت ہے یا لڑکی؟"

اس نے جھینپ کر گردن جھکالی۔ میں نے پھر پوچھا۔

"کون ہے وہ؟ کسی کھاتے پیتے گھر کی لڑکی تم سے شادی نہیں کرے گی۔ وہ کوئی غریب اور مجبور لڑکی ہوگی۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور سوچنے لگا "یہ میرے سامنے کا بچّہ کتنا چالاک ہوگیا ہے۔ فوراً ہی سمجھ گیا کہ وہ کوئی غریب اور مجبور لڑکی ہوگی لیکن اسے یہ نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ شادی کے لیے راضی نہیں ہے۔ میں اس سے شادی کرنے کی شرط پر اس کے باپ کا قرضہ معاف کر رہا ہوں۔ یہ بات اس لڑکے کو معلوم ہوگی تو خواہ مخواہ یہ رخنہ اندازی کرے گا۔ اس سے اپنے معاملے کی بات طے کرکے یہاں سے چلتا کرنا چاہیے۔"

اس کے خیالات پڑھتے ہی میں نے پوچھا۔

"کیا لڑکی بہت خوبصورت ہے؟"

"آں۔ ہاں — مگر میں — میں تو دستاویزات کی باتیں کر رہا تھا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جو تمھارا حق ہے وہ میں۔۔۔۔۔"

میں نے بات کاٹ کر کہا۔

"حق بحق دار رسید۔ میرے پاس اصلی دستاویزات موجود ہیں، میں اس سلسلے میں تم سے نمٹ لوں گا۔ ابھی لڑکی کی بات کرو۔ کیا تم اتنا نہیں سمجھتے کہ میں جوان ہوں اور مجھے حسین لڑکیوں کے ذکر سے دلچسپی ہوگی۔"

وہ سوچنے لگا "ہاں۔ میں آج کل کے جوان لڑکوں کی اس کمزوری کو بھول گیا تھا۔ مجھے فرہاد کی حسن پرستی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

اس نے خوشامدانہ لہجے میں بتیسی نکال کر کہا۔

"ہی ہی ہی۔ تم ایک لڑکی کی بات کرتے ہو، میں تمھارے لیے یہاں لڑکیوں کی لائن لگا دوں گا۔ تم جب بھی آؤگے، تمھیں یہاں نئی خوراک ملے گی۔ بس مجھے اپنا غلام سمجھو۔ مجھے ایک بار معاف کردو۔ وعدہ کرو کہ تم قانونی کارروائی نہیں کروگے۔"

"پھر میرا نام زمینوں کے مالک کی حیثیت سے تمھارے رجسٹر پر کیسے آئے گا؟"

"یہ کام بڑی آسانی سے ہوجائے گا۔ تمھارے چچا یہ زمینیں تمھارے نام لکھ دیں گے۔ عدالت سے حکم جاری ہوتے ہی تمھارا نام رجسٹر پر آجائے گا۔ اس طرح میری عزت بھی رہ جائے گی اور تمھاری زمینیں بھی تمھیں واپس مل جائیں گی۔"

"ہاں۔ یہ ملبا جگر ہے مگر میں دو شرائط پر اسے منظور کروں گا۔"

"تمھاری ہر شرط منظور ہے۔ کہو کیا چاہتے ہو؟"

"پہلی شرط یہ ہے کہ زمینیں میرے نام ہوتے ہی تم یہ علاقہ چھوڑ کر چلے جاؤگے ورنہ تمھاری صورت دیکھ دیکھ کر میرے دل میں انتقام کی خواہش بھڑکتی رہے گی۔"

"مجھے منظور ہے۔ میں برسوں کی عزت کو بحال رکھنے کی خاطر یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"دوسری شرط یہ ہے کہ تم شادی نہیں کروگے۔"

"آں!" وہ بوکھلا کر مجھے تکنے لگا۔

"کیا تمھیں یہ شرط منظور نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے عاجزی سے کہا "بیٹے! کوئی دوسری شرط پیش کر دیکھو، میری عزت کا خیال کرو۔ آس پاس کے تمام زمیندار میری شا شریک ہونے آئے ہیں۔ میں عین وقت پر انکار کروں گا تو میری بڑی بے ہوگی۔ سب ہی پیٹھ پیچھے میری ہنسی اُڑائیں گے۔"

"ہاں۔ اس طرح تمھاری کافی بے عزتی ہوگی لیکن میری شر مانوگے تو یہاں سے عدالت تک تمھاری عزت خاک میں مل جائے گی خود فیصلہ کرو کہ دو میں سے کون سی بے عزتی تمھیں پسند ہے؟"

"بیٹا! مجھ پر ترس کھاؤ۔ کون جان بوجھ کر اپنی بے عزتی پسند کر ہے۔ تم اس سے بھی بڑی کوئی شرط پیش کرو، میں اسے مان لوں گا۔"

"نہیں۔ جو کچھ مجھے کہنا تھا، وہ میں نے کہہ دیا۔ فوراً اپنا فیصلہ ورنہ میں یہاں سے جاتا ہوں۔"

"نن۔ نہیں بیٹے — مجھے کچھ سوچنے کی مہلت دو۔"

"مہلت نہیں دے سکتا، مشورہ دے سکتا ہوں اور مشورہ یہی کہ شادی سے انکار کردو۔ ذرا عقل سے کام لو۔ باہر جاکر کہہ دو کہ تمھارا جاگ اٹھا ہے۔ تم ایک کنواری لڑکی کو بیوی بنانے کی بجائے اسے بیٹی بنا ہو کیونکہ عمر میں تم اس کے باپ کے برابر ہو — اس طرح لوگ تمھاری نہیں اُڑائیں گے، بلکہ ان کی نظروں میں تمھاری عزت اور بڑھ جائے گی۔"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا "کیا مصیبت ہے۔ شام کو نکاح ہو والا ہے اور ابھی بیٹی کہہ دوں، کیسی عجیب سی بات ہے۔ یہ لڑکا مجھے کرنا چاہتا ہے۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ اس لڑکی پر اس کی نیت خراب ہے۔ اسی لیے تو پوچھ رہا تھا کہ وہ خوبصورت ہے یا نہیں؟ کم بخت حسن پرست ہے — ہاں ایک صورت ہے۔ اگر دل بہلانے کے لیے لڑکی اسے مل جائے تو یہ اپنی دوسری شرط بدل دے گا۔"

یہ سوچتے ہی اس نے ذرا ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"وہ — وہ بہت حسین ہے — ایک دم سولہ برس کی ہے۔ تم دیکھوگے تو بس دیکھتے رہ جاؤگے۔ تم نے اسے نہیں دیکھا ہے۔ پھر ہوں۔ تم جوان ہو۔ تمھارا دل اس پر آگیا ہے۔ تم میری بات مانو بات مانتا ہوں۔ دیکھو، میری عزت کا سوال ہے۔ میں اس سے شا کرلیتا ہوں، تم سہاگ رات منالو۔ اس طرح تمھاری خوشی پوری ہو گی اور میری عزت رہ جائے گی۔۔۔۔۔"

میرے جی میں آیا کہ ایک اُلٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کردوں لیکن میں اپنی دنیا کے کتنے بے غیرتوں کے منہ پر طمانچے مار سکتا تھا۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو اندر سے بالکل ننگے ہوتے ہیں اور اوپر سے عزت کا چڑھا کر رکھتے ہیں۔ باہر کی بے عزتی پسند نہیں کرتے، اندر کی بے غیر

کرتے ہیں۔ یہ بہت ہی محترم، معظم اور عزت شناس دلّال ہوتے ہیں اور اپنی نوبیاہتا دلہن کی پہلی رات کی دلّالی کرتے ہیں۔ ایسے گرگٹ نما چہرے بہت ہیں اور طمانچے مارنے والے ہاتھ کم ہیں۔ اس لیے میں نے ہاتھ نہیں اٹھایا، زبان سے کام لیا۔

"تم جسے دلہن بنا کر میرے پاس لاؤگے، وہ کسی غریب کی بیٹی ہے لیکن میں بہت اونچی رشوت لوں گا۔ دوسری شرط ختم کرنا چاہتے ہو تو اپنی بیٹی کو لے آؤ۔۔۔۔"

وہ لرز کر ایک قدم پیچھے چلا گیا۔ غصّے سے تھر تھر کانپنے لگا۔ اپنی دونوں مٹھیاں یوں بھینچنے لگا جیسے خیال ہی خیال میں میرا گلا گھونٹ رہا ہو۔ وہ سوچ کی بند کوٹھری میں مجھے ننگی ننگی گالیاں دے رہا تھا لیکن اوپر سے خود کو پُرسکون رکھنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔ میں نے کہا۔

"اس وقت تم پر جو گذر رہی ہے، وہی اس لڑکی کے باپ کے دل پر گذرے گی، جب تم اُسے بیاہ کر میرے کمرے میں چھوڑ جاؤگے۔ یا تو تم دونوں کی بیٹیاں شرافت اور عزت کی زندگی گذارنے کی حقدار ہیں یا پھر دونوں ہی رشوت کا مال ہیں۔ تم بتاؤ کہ وہ دونوں کیا ہیں؟"

اس نے بظاہر ندامت سے سر کو جھکا لیا۔ خدا کے فضل سے میں ظاہر اور باطن کو آئینے کی طرح دیکھ لیتا ہوں اس لیے میں اس کے نادم ہونے سے متاثر نہ ہوسکا۔ اس نے لجاجت سے کہا۔

"تمھاری باتوں سے میں بہت پریشان ہوگیا ہوں۔ مجھے صرف ایک گھنٹے کی مہلت دو۔ ذرا سوچنے کا موقعہ دو۔ اس کے بعد تم جو کہوگے، میں اسے تسلیم کرلوں گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں تمھیں مہلت دیتا ہوں۔ نکاح کا کون سا وقت مقرر کیا ہے؟"

"بعد نماز ظہر۔ ڈھائی بجے۔"

میں نے اپنی رسٹ واچ دیکھی۔ ایک بجا تھا۔ اس نے مجھے آرام کرنے کے لیے کہا اور باہر چلا گیا۔ جاتے وقت وہ بڑی تیزی سے ایسی کوئی تدبیر سوچ رہا تھا جس سے میری دوسری شرط کو بدل سکے لیکن اس وقت تک کوئی تدبیر اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ میں پلنگ پر آکر بیٹھ گیا۔ پھر جوتے اُتار کر آرام سے لیٹ گیا۔ مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ وہ میرے خلاف جیسی بھی چال چلے گا، میں اس کا توڑ کرلوں گا لہٰذا اس وقت میرا ذہن چچا جان کی طرف بھٹک گیا۔ میں تصور میں دیکھ رہا تھا۔ ان کی کوٹھی ماتم کدہ بنی ہوئی تھی اور پولیس والے چچی جان کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے لیجا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد کمرے کا دروازہ کھُلا تو میں خیالات سے چونک گیا۔ ایک نوجوان نے قریب آکر مجھے سلام کیا۔ اس کے بدن پر میلے کپڑے تھے اور چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔

"حضور!" اس نے بڑی عقیدت سے کہا "باہر سب لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ یہاں کے اصل مالک ہیں۔ میں اس حویلی میں بچپن سے ملازم ہوں۔ آپ کے کھیتوں میں بھی کام کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے، آپ کو دیکھ کر مجھے ایسی خوشی ہو رہی ہے جیسے بہت بڑی دولت مل گئی ہو۔"

یہ کہہ کر وہ میرے پاؤں دابنے لگا۔ میں نے اپنا پاؤں کھینچ کر کہا۔

"یہ کیا کر رہے ہو، میں ایسی خدمات کا عادی نہیں ہوں۔"

"لیکن میں تو آپ کا خادم ہوں، مجھے خدمت کا موقعہ دیجیے۔"

"نہیں۔ تم یہاں بیٹھو اور مجھ سے باتیں کرو۔"

وہ میرے قدموں کے پاس بیٹھ گیا اور سوچنے لگا "میں ایک معمولی نوکر ہوں۔ اپنے مالک سے کیا باتیں کروں۔ دل کا حال تو بیان نہیں کرسکتا۔ پتہ نہیں یہ دل کے کیسے ہیں۔ مجھے صرف خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیے وہ چاہے تو جمیلہ کو بربادی سے بچا سکتا ہے۔ اس شادی کو روک سکتا ہے۔ آہ جمیلہ! کبھی میں نے قسم کھائی تھی کہ تیری خوشیوں کے لیے جان دے دوں گا مگر جان دینے کا فائدہ کیا ہے؟ تجھے خوشیاں تو نہیں مل سکیں گی۔ غریب کی محبت ہمیشہ پٹواریوں اور زمینداروں کی سیج پر جاتی ہے۔ میں بھی دوسروں کی طرح یہ تماشہ دیکھتا رہ جاؤں گا۔"

"تم خاموش کیوں ہو؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"جی۔ میں — میں سوچ رہا ہوں کہ ایک ادنیٰ ملازم ہوں۔ اپنے مالک سے بھلا کیا باتیں کرسکتا ہوں؟"

"بہت سی باتیں کرسکتے ہو۔ مثلاً یہی بتاؤ۔ پٹواری جس سے شادی کرنا چاہتا ہے، کیا اس کا نام جمیلہ ہے؟"

"جی ہاں!" اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"بارات کہاں جائے گی؟"

"کہیں نہیں۔ جمیلہ اسی حویلی میں رہتی ہے۔ بچپن سے ہم دونوں۔۔۔"

وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ پھر بات بدل کر بولا "ہم دونوں اس حویلی میں کام کرتے ہیں۔"

"پھر تو تم اسے خوب اچھی طرح جانتے ہوگے۔ اسے چاہتے بھی ہوگے؟"

"جی!" اس نے ایسے چونک کر دیکھا جیسے دل کا بھید کھُل گیا ہو۔

پھر اسی وقت باہر سے پٹواری کی آواز آئی۔

"رحیم! اندر کیا کر رہا ہے؟ چل اِدھر آ۔۔۔۔"

اس نے اٹھتے ہوئے میری جانب اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ میں نے اجازت دے دی۔ وہ چلا گیا۔ باہر کا دروازہ بند ہوتے ہی کمرے کا دوسرا اندرونی دروازہ کھُلا۔ اس کے ساتھ ہی چھم سے پائل بجی، دھک سے دل دھڑکا اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

وہ کون تھی؟ میرے لیے اجنبی تھی۔ گلابی رنگ کے لباس میں گلاب کی طرح نگاہوں کے سامنے کھِل رہی تھی۔ گورے چٹے بدن سے چاندنی پھوٹ رہی تھی۔ چہرہ شہابی شہابی تھا، آنکھیں شرابی شرابی تھیں اور وہ شربت کی ٹرے اٹھائے میری طرف آرہی تھی۔

اس نے قریب آکر مجھے سلام کیا اور ٹرے کو میز پر رکھ کر ایک گلاس میں شربت ڈالنے لگی۔ معاً مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ کیا پٹواری کی یہ کوئی سازش ہے؟ ہوسکتا ہے اس نے شربت کی مٹھاس میں میری موت کو چھپا کر حسن و شباب کی ٹرے میں سجا کر بھیجا ہو ـــــ ایسا ہوسکتا تھا۔

وہ اپنی حنائی ہتھیلی پر گلاس سجا کر میرے سامنے آگئی۔ اس کی جھکی جھکی نظریں کہہ رہی تھیں "لیجیے۔ نوش فرمایئے!"

میں نے پوچھا "شربت زیادہ میٹھا تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔"

"پھر تو اس شربت میں حنائی ہاتھوں کی خوشبو رچی ہوگی!"

وہ شرما کر بل کھا گئی۔ نگاہوں کے سامنے پھولوں بھری ڈالی لچک گئی۔

"کون ہو تم؟"

"شادو۔ میں ـ میں دیناں پٹواری کی بب۔ بیٹی ہوں۔۔۔۔"

میں اس کے جھجکنے پر غور نہ کرسکا۔ یہ دیکھ کر ہی ذہن کو جھٹکا سا لگا تھا کہ اس ذلیل نے باہر اپنی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے اپنی بیٹی کو چارہ بنا کر میرے پاس بھیجا تھا۔ میں نے شادو کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"تم جانتی ہو کہ تمھارا باپ میرا دشمن ہے اس لیے یہ شربت پہلے تم پیو گی۔"

"میرے ابا کبھی تمھارے دشمن تھے، اب نہیں ہیں۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ اس شربت میں کچھ نہیں ہے۔ آپ اتنے اچھے ہیں۔ اتنے اچھے ہیں کہ میں بہت دیر سے چھپ چھپ کر آپ کو دیکھتی رہی ہوں۔ میں آپ کو زہر نہیں دے سکتی۔"

"یہ گلاس پی کر ثبوت دو۔ میں باتوں سے قائل نہیں ہوسکتا۔"

اس نے بڑی سنجیدگی سے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ پھر گلاس کو ہونٹوں سے لگا کر شربت پینے لگی۔

میرا شبہ غلط ثابت ہوا۔ اس نے گلاس خالی کردیا۔ پھر دوسری بار گلاس بھر کر میرے پاس لے آئی۔ میں نے گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"تمھارے باپ نے جو کچھ تمھیں سکھا پڑھا کر بھیجا ہے، وہ مجھے بتادو۔"

یہ کہہ کر میں فوراً ہی اس کے خیالات پڑھنے لگا۔ وہ اپنے دماغ کے اندر کہہ رہی تھی۔

"ایسے باپ پر ہزار بار لعنت ـــ کیا کوئی غیرت مند باپ اپنی بیٹی کو کسی مرد کی تنہائی میں بھیجنا گوارا کرسکتا ہے ــــ او نہہ کبھی نہیں۔۔۔۔"

اس کے سوچنے کا انداز ایسا تھا کہ میں سمجھ نہ سکا۔ میں سمجھنا چاہتا تھا لیکن اس کے آگے وہ سوچنے کی بجائے میری بات کا جواب دینے لگی۔

"میرے ابا بہت پریشان ہیں۔ اگر وہ مجھے کچھ سکھا کر یہاں نہ بھیجتے، تب بھی میں آپ سے درخواست کرتی کہ ان کی عزت رکھ لیجیے۔ اگر انھوں نے جمیلہ سے شادی نہیں کی تو ان کا بڑھاپا مذاق بن جائے گا ـــ آپ سمجھدار ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ انھیں کیسی شرمندگی ہوگی۔"

شادو مجھے الجھا رہی تھی۔ وہ سوچتے وقت باپ سے نفرت کر رہی تھی اور بولتے وقت بڑی ہمدردی سے اس کی حمایت کر رہی تھی۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں نے بار بار اس کی سوچ کو پڑھا لیکن اس کے بعد وہ زیادہ تر میرے متعلق سوچتی رہی اور متاثر ہوتی رہی جیسے مرد کسی جوان عورت کے متعلق گہری دلچسپی سے سوچتا ہے، وہی ازلی دلچسپی کے خیالوں میں تھی۔

جہاں تک میری سوچ کا تعلق ہے، میں اسے کبھی للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھتا لیکن وہ ایک کھلے ہوئے دعوت نامے کی طرح آئی تھی۔ دعوت کی خاموش تحریر کہہ رہی تھی۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف ـــ تحریر کہہ رہی تھی ـــ ج، س، م، ف (یعنی جواب سے مطلع فرمائیں) میرا ابا انتظار کر رہا ہے۔

ایسی حسین دعوت کون قبول نہ کرتا ہے؟ لیکن اسے قبول کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ میری وجہ سے جمیلہ پٹواری کی جہنمی زندگی سے وابستہ ہوجاتی۔ میں اپنی زندگی کے چند عیاش لمحوں کی خاطر ایک غریب لڑکی کی زندگی برباد نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"اب تم جاؤ اور اپنے باپ کو یہاں بھیج دو۔"

"آپ میرے ابا کی مجبوریوں کو سمجھ گئے ہیں نا؟"

اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے ہاتھ کو تھام لیا۔ اس کی حنائی نقش و نگار سے سجی ہوئی ہتھیلیاں ذرا نرم تھیں، ذرا گرم تھیں اور دُور تک بدن کی نرمی و گرمی کا یقین دلا رہی تھیں۔ حسین عورت اپنی خاموش ادا سے مرد کو اپنا معمول بنا لیتی ہے۔ اس کے سحر سے بچنے کے لیے میں نے اپنی آنکھوں سے کام لیا۔ وہ میری جانب پُراُمید نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ یک بیک میری نگاہوں کے تیور بدل گئے۔ میری آنکھوں سے مقناطیسی لہریں نکلیں اور اس کی آنکھیں مجھ پر جم کر رہ گئیں۔ وہ بالکل ساکت ہوگئی۔

میں نے بھاری بھرکم لہجے میں حکم دیا "میرا ہاتھ چھوڑ دو۔"

اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے پھر حکم دیا۔

"اب تم اپنے باپ کے پاس جاؤ اور اسے یہاں بھیج دو۔"

اس کی آواز جیسے کسی اندھے کنوئیں سے آئی۔

"میں اپنے باپ کے پاس کیسے جاؤں؟ میں نہیں جانتی کہ اس کی قبر کہاں ہے؟"

میں نے اسے تعجب سے دیکھا۔

"کیا تمھارا باپ مرچکا ہے؟"

"ہاں۔ مرچکا ہے۔"

"دیناں پٹواری تمھارا کون ہے؟"

"میرا سرپرست ہے۔ میں نے بچپن سے اس کے ہاں پرورش پائی ہے۔ وہ مجھے بیٹی کہتا ہے مگر بیٹی نہیں سمجھتا۔"

"وہ تمھارے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے؟"

"جیسے ایک دلّال کرتا ہے۔ یہاں اس کا کوئی بڑا صاحب آتا ہے تو وہ مجھے رشوت کے طور پر پیش کرتا ہے۔"

"کیا تم اُن صاحب لوگوں کو جانتی ہو؟"

"نہیں۔ میں کسی کو نہیں جانتی اور جاننا بھی نہیں چاہتی۔ ہاں اتنا سمجھتی ہوں کہ جب کبھی کسی کے ساتھ میری ایک رات کالی ہوتی ہے، پٹواری کے وارے نیارے ہوجاتے ہیں۔ وہ پیشکار کے ذریعے مثنی کی تاریکیوں میں گڑبڑ کر دیتا ہے۔ کبھی کسی متنازعہ زمین کا مقدمہ جیت لیتا ہے، کبھی کسی زمیندار کو مقدمے میں الجھا دیتا ہے۔ کبھی کسی کو مقدمے کی الجھنوں سے نجات دلا دیتا ہے۔ یہ جو اس نے اپنی جائداد بنائی ہے اور زمینیں حاصل کی ہیں تو اس حصول کے دوران میری جوانی لہو لہو ہوتی رہی ہے۔ میرے سرپرست، میرے مہربان میرے بناسپتی باپ کے گھر میں جتنے چراغ روشن ہوتے ہیں، ان میں میرا لہو جلتا رہتا ہے۔"

میں اسے ہمدردی سے دیکھنے لگا۔ مجھے اُس پر بڑا ترس آرہا تھا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی؟ ابھی اسے پیار کی لطافتوں کو سمجھنا تھا۔ کسی گبرو جوان کو دل دینا تھا۔ اسے اپنے دل میں بٹھانا تھا اور ایک چھوٹے سے گھر کی جنت کے سپنے دیکھنا تھا لیکن ایک بے رحم تاجر اس کے سپنوں کو اپنے منافع کے بھاؤ پر فروخت کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"تم جوان ہو۔ تمھارا دل کسی کو چاہتا ہوگا۔ تمھاری آنکھیں کسی کو پسند کرتی ہوں گی۔ تم کسی کا نام لو، میں اس سے تمھاری شادی کرادوں گا۔"

"پٹواری بھی یہی دلاسے دیتا ہے کہ بہت جلد کسی لڑکے سے میری شادی کرادے گا۔"

"میں تمھیں جھوٹے دلاسے نہیں دے رہا ہوں۔ تم بتاؤ کس کو چاہتی ہو؟"

"میں تمھیں چاہتی ہوں۔ میں بہت دیر سے تمھیں چھپ چھپ کر دیکھ رہی تھی۔ مجھے اپنی حیثیت معلوم ہے۔ تم بڑے آدمی ہو۔ شاید میں تمھارے قریب بھی نہیں آسکتی تھی مگر پٹواری نے یہ موقع دے دیا۔"

"لیکن میں نے شادی کے متعلق ابھی نہیں سوچا ہے۔ تم میرا خیال دل سے نکال دو۔ کسی اچھے نوجوان کو پسند کرو۔ میں تمھاری زندگی سنوار دوں گا۔"

یہ کہہ کر میں نے نظریں پھیرلیں اور خیال کا رابطہ ختم کردیا۔ یک بیک وہ ہوش میں آگئی۔ میں نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ کچھ حیرانی سے، کچھ پریشانی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"آں۔ کچھ نہیں!" اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ وہ سوچ رہی تھی "ابھی مجھے کیا ہوگیا تھا؟ کیا میں اس نوجوان سے باتیں کر رہی تھی؟ اس کی آنکھیں کتنی عجیب ہیں۔ مجھے ڈر بھی لگتا ہے اور اس کی طرف دیکھ جانے کو جی بھی چاہتا ہے۔۔۔۔"

میں نے کہا "شاید تم کچھ پریشان ہو۔ اسی لیے کہتا ہوں، ابھی یہاں سے جاؤ۔ پہلے میں تمھارے باپ سے باتیں کروں گا، پھر تمھارے کسی کام آؤں گا۔ اب جاؤ یہاں سے۔۔۔۔"

وہ اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد پٹواری کمرے میں آیا۔ اس نے کتے ہی خوشامدانہ انداز میں پوچھا۔

"بیٹے! تم نے شربت پی لیا؟"

میں نے اسے نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے بیٹا نہ کہو۔ جو بیٹی کو کسی کی تنہائی میں بھیجتا ہو، وہ کسی کا باپ یا بزرگ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ تم اپنے باراتیوں کو یہاں بلاؤ، میں تمھاری شادی یا بربادی کا فیصلہ سناؤں گا۔"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔

"فرہاد! میں تمھارے قدموں پر سر رکھنے کو تیار ہوں۔ مجھے لوگوں کے سامنے ذلیل نہ کرو۔"

"تم میرے قدموں پر سر رکھو گے، میں ٹھوکر سے اُڑا دوں گا۔ تم بیٹی کے رشتے کے دلال ہو۔ میں تمھیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ سنو! ابھی جمیلہ کی شادی رحیم سے ہوگی اور تم یہ تماشہ دیکھو گے۔ یہ حویلی چچا جان نے تمھیں رشوت کے طور پر دی ہے، تم ابھی اسے چھوڑ کر جاؤ گے اور اس کے کاغذات لاکر میرے حوالے کردو گے ورنہ عدالت میں، میں تم سے وصول کرلوں گا۔ آج سے بدنامی، ذلت اور رسوائی تمھارا مقدر بن چکی ہے۔"

اس کا منہ یوں لٹک گیا جیسے اب تب میں رونے ہی والا ہو اور وہ اندر ہی اندر رو رہا تھا اور اپنی بے بسی پر جھنجھلا رہا تھا۔ میری سنگدلی کا اسے یقین ہوگیا تھا۔ شادو جیسی حسین لڑکی مجھے موم نہ کرسکی تھی۔ وہ آخری حربہ بھی ناکام ہوگیا تھا اس لیے اب وہ اپنے انجام کے متعلق سوچ رہا تھا۔

"یہ مجھ پر کیسی تباہی آگئی ہے۔ جمیلہ سے شادی نہیں ہوگی۔ مجھے بوڑھا سمجھ کر قہقہے لگائے جائیں گے۔ ہاہاہا۔۔۔۔"

وہ اپنے اندر پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا۔ میں نے بھی اس کی دماغی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کی سوچ میں قہقہے لگائے "ہاہاہا۔ میں بوڑھا ہوں۔ ایک جوان چھوکری سے شادی نہیں کرسکتا۔ ہاہاہا۔۔۔۔"

وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔ جلدی سے اپنے سر کو تھام کر سوچنے لگا "یہ مجھے کیا ہوگیا ہے؟ مجھے خود پر قابو رکھنا چاہیے۔۔۔۔"

میں نے اس کی سوچ پر قابو پاتے ہوئے کہا "حالات قابو سے باہر ہیں۔ اب یہ شادی نہیں ہوسکے گی۔ مجھے اس حویلی سے نکلنا ہوگا۔ ہاہاہاہا ــ مجھے جعلسازی کے جرم میں جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔ ہاہاہاہا۔ یہ اُلو کا پٹھا فرہاد مجھ سے انتقام لیکر ہی رہے گا۔ اس انتقام سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ ہاہاہاہا۔۔۔۔"

وہ اچانک ہی اپنی بے بسی پر سچ مچ ہنسنے لگا۔ سوچ کے بہاؤ میں وہ قہقہے حلق تک آگئے تھے اور ہونٹوں کے بند دروازے کھول کر باہر نکل رہے تھے۔

میں نے سوچ کے ذریعے اسے ایک بہترین مشورہ دیا۔ ”ہاں، مجھے وقتی طور پر پاگل پن کا ڈھونگ رچانا چاہیے۔ پاگل بن جانے سے بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ لوگوں کا متفقہ فیصلہ ہو گا کہ ایک پاگل کی شادی کسی ہوش مند لڑکی سے نہیں ہو سکتی۔ مجھے انکار کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ شادی خود ہی رُک جائے گی۔ فرہاد کی دوسری شرط بھی پوری ہو جائے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرہاد مجھے پاگل سمجھ کر عدالت تک نہ گھسیٹے ۔ واقعی ایسے سنگدل دشمن کے انتقام سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ میں پاگل بن جاؤں۔ ۔ ۔ ۔“

یہ سوچتے ہی اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے اپنا گریبان چاک کر لیا اور ایک شرابی کی طرح اِدھر سے اُدھر لڑکھڑاتے ہوئے دیوانگی کا مظاہرہ کرنے لگا۔

”میں پاگل ہوں ۔ ہاہاہا ۔ تُو بھی پاگل، میں بھی پاگل، میرا باپ بھی پاگل، یہ ساری دنیا پاگل ہے ہاہاہاہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔“

میں نے بظاہر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے اس کے بازو کو تھام کر کہا۔

”ارے دیناں چاچا! یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ اگر تم پاگل ہو گئے تو میں تم پر مقدمہ کیسے کروں گا؟ نن ۔ نہیں ہوش میں آؤ ۔ ہوش میں آؤ دیناں چاچا۔ ۔ ۔ ۔ ۔“

اسے یقین ہو گیا کہ اس کی تدبیر کارگر ہو رہی ہے۔ اس نے مجھے پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔

”میں پاگل ہوں ۔ کُک کڑوں کوں ۔ میں مُرغے کی اولاد ہوں۔ کوک کوک کُک کڑوں کوں ۔ اب میں انڈے دوں گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔“

وہ اکڑوں بیٹھ گیا جیسے انڈے دینے کا قطعی فیصلہ کر چکا ہو۔ میں نے پھر اس کا بازو پکڑ کر کہا۔

”ارے یہ کیا کرتے ہو۔ مُرغے انڈے نہیں دیتے۔“

”ہاں!“ وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”ہاہا ۔ میری مرغی انڈے دے گی۔ کہاں ہے میری مرغی؟“

وہ ایک چھلانگ لگا کر دروازے کی طرف گیا۔ پھر اسے ایک جھٹکے سے کھول کر باہر نکل گیا۔ میں نے دروازے پر آ کر دیکھا۔ باہر تمام لوگ اس کے پھٹے ہوئے گریبان کو دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ اکڑوں بیٹھ کر کہہ رہا تھا۔

”کہاں ہے میری مرغی ۔ کُک کڑوں کوں ۔ مرغی مرغی پکاروں میں بن میں ۔ میری مرغی گئی کس چمن میں ۔ ہائے مرغی۔ ۔ ۔ ۔“

وہ چاروں ہاتھ پاؤں زمین پر ٹیک کر اس طرح رینگنے لگا جیسے مرغی کو تلاش کر رہا ہو۔ ذرا سی دیر میں اس کے چاروں طرف بھیڑ لگ گئی۔ کتنے ہی معزز لوگ اسے پکڑ رہے تھے اور جھنجھوڑ کر پوچھ رہے تھے کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ وہ ایسی حرکتیں کیوں کر رہا ہے؟ جواب میں وہ اُلٹی سیدھی ہانک رہا تھا۔

زمیندار میری طرف آئے۔ ایک نے مجھ سے پوچھا تو میں نے جواب دیا۔

”آپ لوگوں نے دیکھا ہے کہ میں یہاں اپنی زمینوں کے اصل کاغذ دکھانے آیا تھا۔ اس نے میرے چچا جان کے ساتھ مل کر مجھے ادر قانون کو دھوکہ دیا ہے۔ اس کا ٹھوس ثبوت میرے پاس دیکھ کر اس کے دماغ کو صدمہ پہنچا ہے اور یہ اپنا دماغی توازن کھو چکا ہے۔ مجھے تو اس سے ذرا بھی ہمدردی نہیں ہے۔ اگر آپ لوگوں میں سے کسی کو ہمدردی ہے تو اسے کہیں لے جا کر بند کر دیجئے ورنہ اس کا پاگل پن خطرناک صورت اختیار کر سکتا ہے۔ بہرحال آج نہیں تو کل جب بھی اس کی دماغی حالت درست ہو گی۔ میں اسے عدالت میں بلاؤں گا۔“

ایک زمیندار نے پٹواری کی طرف سے التجا کی۔

”فرہاد۔ یہ درست ہے کہ اس نے تمہیں دھوکہ دیا ہے لیکن قدرت کی طرف سے اسے سزا مل رہی ہے بیٹے! اسے معاف کر دو اور صلح صفائی سے اپنا حق حاصل کر لو۔“

میں نے کہا۔ ”اگر آپ سب یہ چاہتے ہیں کہ یہ عدالت تک نہ جائے تو میں آپ کی بات تسلیم کروں گا لیکن ابھی چند باتوں کا فیصلہ ہو جانا چاہئے۔“

”ٹھیک ہے جو فیصلہ عدالت میں ہونا چاہیئے۔ وہ یہاں ہو جائے گا اور ابھی ہو جائے گا۔“ سب لوگ مجھے یقین دلانے لگے کہ میرے حق میں فیصلہ ہوگا۔

ہم سب بیٹھک میں آ گئے۔ رحیم اور ایک ملازم پٹواری کو پکڑ کر لے آئے۔ اب وہ مرغے کی طرح بانگ نہیں دے رہا تھا لیکن کبھی سر جھکا کر ہاتھ نچا نچا کر زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اپنے پاگل پن کا ثبوت دے رہا تھا۔

جب تمام لوگ کرسیوں اور مونڈھوں پر بیٹھ گئے تو میں نے کہا۔

”یہ حویلی میری ہے کیونکہ یہ میری زمین پر ہے اور اسے میرے والد نے تعمیر کرایا تھا۔ کیا کسی کو اعتراض ہے۔“

میں نے چاروں طرف دیکھا کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ پٹواری نے اعتراف کے طور پر بانگ دی۔ کُک کڑوں کوں۔ میں نے اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

”یہ مرغ کی اولاد اب اس حویلی میں نہیں رہے گا۔ جتنی جلدی ہو اسے یہاں سے رخصت کر دیجئے۔ اس حویلی میں جو بچپن سے ملازم ہیں۔ وہ اب میرے ہی ملازم رہیں گے۔ ان میں جمیلہ اور رحیم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس لحاظ سے میں اپنی ملازمہ جمیلہ کی شادی ایک پاگل بڈھے سے نہیں ہونے دوں گا۔ جمیلہ کی شادی میری مرضی سے ہو گی۔“

سب چپ رہے۔ جمیلہ کے بڈھے باپ نے اٹھ کر کہا کہ وہ پٹواری کا قرض دار ہے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ وہ قرضہ میں اتار دوں گا۔ اس کے باپ نے خوش ہو کر کہا۔

”تو پھر جمیلہ کی شادی آپ ہی کی مرضی سے ہو گی۔“

میں نے رحیم سے کہا۔ ”رحیم! تم یہاں سے جاؤ اور آدھ گھنٹے کے اندر غسل کر کے صاف ستھرا لباس پہن کر آؤ۔ جمیلہ کا نکاح تم سے پڑھایا جائے گا۔“

رحیم کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ فرطِ مسرت سے کانپ رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دوڑتا ہوا آیا اور میرے قدموں سے لپٹ کر کہنے لگا۔

”آپ ہمارے لئے فرشتہ بن کر آئے ہیں۔ میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔“

میں نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔

”میں انسان ہوں۔ مجھے فرشتہ نہ بناؤ۔ چلو اٹھو۔ جو کہہ رہا ہوں۔ فوراً اس پر عمل کرو۔“

وہ اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ ذرا سی دیر میں یہ بات پھیل گئی کہ دولہا بدل گیا ہے۔ اب جمیلہ کی شادی رحیم سے ہونے والی ہے۔ پٹواری کے پاگل پن کی خبر پہلے ہی پھیل گئی تھی۔ تمام حویلی میں۔ کیا مردانے میں، کیا زنان خانے میں ہر جگہ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کسی کو حیرانی تھی کہ جمیلہ کی تقدیر کیسے بدل گئی کسی کو تجسس تھا کہ پٹواری پاگل کیسے ہو گیا۔ یہ دونوں باتیں نہ جانے وہاں کتنے دنوں تک دلچسپی کا باعث بننے والی تھیں جنہیں پٹواری سے ہمدردی تھی اور جنہیں میرے فیصلے پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ اسی وقت حویلی چھوڑ کر چلے گئے۔ کانٹے خود ہی راستہ صاف کر گئے۔

ایک گھنٹے کے بعد جمیلہ اور رحیم کا نکاح پڑھا دیا گیا پھر کھانے پینے اور ہنسنے بولنے میں شام ہو گئی۔ جب دعوت میں شریک ہونے والے رخصت ہو گئے تو میں برسوں کی بچھڑی ہوئی حویلی کو دیکھنے کے لئے اندرونی حصے میں چلا آیا۔ میں نے چھ برس کی عمر میں اس گھر کو چھوڑا تھا۔ ایک بوڑھی عورت نے مجھے وہ کمرہ بتایا جہاں میں نے جنم لیا تھا۔ وہاں کتنے ہی کپڑے اور کتنی ہی چیزیں ایسی تھیں جو ماضی کی یادیں تازہ کر دیتی تھیں۔ وہ بوڑھی مائی میرے والدین کی زندگی کا ایک ایک صفحہ کھولتی جا رہی تھی میں چشم تصور میں اپنی والدہ کی محبت اور والد کی عظمت کی کتنی ہی تصویریں دیکھتا جا رہا تھا پھر میں دالان میں آیا۔ وہاں چند عورتیں کھڑی ہوئی تھیں۔ مجھے بتایا گیا کہ ان میں سے کچھ میری دور کی رشتے دار ہیں۔ کچھ جمیلہ اور رحیم کے عزیز و اقارب ہیں۔ ان کے درمیان شادو سر جھکائے کھڑی تھی۔

اسے دیکھ کر مجھے یہ ندامت ہوئی کہ اس دوران میں اسے بھلا بیٹھا تھا مجھے پٹواری کے سامنے اس لڑکی کے مستقبل کا فیصلہ کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن فیصلہ کیسے ہوتا؟ وہ تو پاگل پن کا ڈھونگ رچا رہا تھا۔ میری کسی بات کا صحیح جواب نہ دیتا اور اب تو وہ اس حویلی سے جا چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ کل اس سے شادو کے متعلق باتیں کروں گا اتنے میں رحیم نے کہا۔

”حضور! یہ شادو نے پٹواری کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا ہے کہتی ہے کہ اسی حویلی میں رہے گی اور آپ کی خدمت کرے گی۔“

”میں یہاں رہنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ کل صبح چلا جاؤں گا۔ مجھے اپنی خدمت کرانے کے لئے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں مگر یہ یہیں رہے گی کہیں سے اس کے رشتے کی بات آئے تو میں اس کی شادی کرا دوں گا۔“

شادو نے سر کو جھکا لیا۔ رحیم مجھے دلہن کے کمرے میں لے کر آیا۔ جمیلہ سیج پر گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی جب اسے بتایا گیا کہ میں آیا ہوں تو اس نے ہاتھ اٹھا کر آداب کہا۔ وہ سیج سے اتر کر میرے قدموں کو چھونا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے روک دیا۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بزرگانہ انداز میں اسے دعائیں دیں اور رحیم سے کہا کہ آج سے وہ میرا خاص ملازم ہے۔ زمینوں کی آمدنی کا حساب اور حویلی کی نگرانی اس کے ذمہ ہو گی۔ اس کے عوض دونوں میاں بیوی کو کھانے کپڑے کے علاوہ دو سو روپے ماہوار ملا کریں گے۔ میں نے دو محبت بھرے دلوں کو ملایا تھا۔ ان کی شادی کرائی تھی۔ ان کے لئے رہائش اور روزگار مہیا کر رہا تھا اور اب میں ان کے دلوں کا حال پڑھ رہا تھا۔ وہ خوشی سے بے حال ہو رہے تھے۔ ان کے دلوں میں میرے لئے اتنی محبت تھی اتنی عقیدت تھی کہ اگر خدا کا حکم ہوتا تو وہ مجھے سجدہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے۔ اس وقت وہ سوچ رہے تھے کہ آج سہاگ کی پہلی رات کو وہ شکرانے کی نماز ادا کریں گے اور اپنے رب العزت کے سامنے ہاتھ پھیلا کر میری درازیٔ عمر کی دعائیں مانگیں گے۔

میں وہاں سے بیٹھک میں آ گیا۔ کمرے میں لالٹین کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ شہر کے ہنگاموں سے دور وہاں مکمل سناٹا اور سکون تھا۔ ایسی جگہ تنویمی عمل اور خیال خوانی کی مشقوں کے لئے نہایت ہی موزوں ہوتی ہے۔ میں نے اپنے جوتے اور لباس اتار دیئے۔ میرے جسم پر صرف ایک انڈرویئر رہ گیا۔ اس کے بعد میں یوگا کی مشقیں کرنے لگا۔

آدھ گھنٹے کے بعد میں بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔ اب مجھے پٹواری کی خبر لینی تھی اس حقیقت کو تو میں ہی جانتا تھا کہ وہ پاگل نہیں ہے لہٰذا وہ پاگل پن کے پس پردہ میرے خلاف کوئی سازش بھی کر سکتا تھا۔ میں تھوڑی دیر تک اس کے متعلق سوچتا رہا پھر آنکھیں بند کر کے اس کا تصور کیا۔ وہ جہاں بھی تھا تنہا تھا کیونکہ خیال ہی خیال میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔

”کیا مصیبت ہے۔ میں کب تک ان زنجیروں سے بندھا رہوں گا۔ میں نے تو معمولی سے پاگل پن کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک بے ضرر پاگل کو زنجیروں میں جکڑا نہیں جاتا مگر میرا بڑا بیٹا صمد مجھے خطرناک پاگل سمجھ رہا ہے اور دوسروں کو بھی سمجھا چکا ہے۔ میں اس کی چال کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ وہ مجھے پاگل خانے بھیج کر تمام زمین اور جائداد پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ پاگل دا پتر اپنے باپ کو واقعی پاگل سمجھ رہا ہے۔

ویسے وقتی طور پر پاگل بن کر میں دوستوں اور دشمنوں کے اصلی چہرے دیکھ رہا ہوں۔ میری گھر والی نے میرے پاگل ہو جانے پر ذرا بھی افسوس نہیں کیا وہ تو پہلے ہی مجھ سے خار کھائے بیٹھی تھی کیونکہ میں جمیلہ کو اس کی سوکن بنا کر لانے والا تھا۔ اب وہ خوش ہے اور میرے سامنے کئی بار ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ چکی ہے کہ میں ہمیشہ کے لئے پاگل ہو جاؤں۔ عورت کے لئے ایک پاگل خاوند اس ہوشمند خاوند سے ہزار درجہ بہتر ہوتا ہے جو سوکن لاتا ہے۔ میری بربادی اس کی خانہ آبادی ہے۔ اس لئے وہ بہت ہی خوش ہے اور بڑے سکون سے سو رہی ہے۔ دوسرے کمرے سے اس کے خراٹوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ صمد

میں اتو کا پٹھا بن کر جاگ رہا ہوں۔

مجھے زندگی کی بھوک لگی ہے کسی نے اب تک مجھے ایک لقمے کے لئے بھی نہیں پوچھا۔ یہ لوگ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ پاگلوں کو بھوک نہیں لگتی ہے۔ ہائے کوئی ہے جو اسے بے غیرت، کمینو۔ میں ساری عمر اپنی کمائی کھلاتا رہا۔ آج تم میں سے کوئی مجھے روٹی کا ایک ٹکڑا کھلانے والا نہیں ہے۔ ہائے یہ کیسی دنیا ہے۔ میں زہاد جیسے لوگوں سے سب کچھ چھینتا رہا اب میری اولاد وہ مال غنیمت مجھ سے چھین لینا چاہتی ہے مجھے پاگل سمجھ کر روٹی کا ایک ٹکڑا تک چھین چکی ہے۔ جب سے یہ دنیا آباد ہوئی ہے۔ چھیننے اور جھپٹنے کا عمل جاری ہے۔ آہ! اگر میں ساری عمر دولت سمیٹنے کی بجائے اپنی عاقبت سنوارتا تو آج مجھے پاگل بننے کی ضرورت پیش نہ آتی ایسے وقت یہ بات کتنی زہر کی اور کھری ثابت ہوتی ہے کہ اس دنیا کے لوگ ہم سے اس دنیا کی تمام چیزیں چھین سکتے ہیں لیکن نیکی سے حاصل کی ہوئی عاقبت کوئی نہیں چھین سکتا۔

خدایا۔ وقتی طور پر پاگل بن کر میں نے تیری دنیا کا اصلی چہرہ دیکھ لیا ہے۔ میں صدق دل سے توبہ کرتا ہوں۔ میرے پچھلے گناہ معاف کر دے میں نے اب تک جن لوگوں پر ظلم کیا ہے۔ اب اس کی تلافی کروں گا۔ جن کا نقصان کیا ہے۔ ان کا نقصان پورا کروں گا۔ میرا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ میں شادو کو بیٹی بنا کر دلالی کرتا رہا اور ایک باپ کے رشتے کی عظمت کو مجروح کرتا رہا۔ اب میں واقعی ایک باپ کا فرض ادا کروں گا اور اسے کسی اچھے گھرانے میں عزت و آبرو سے بیاہ کر رخصت کر دوں گا۔ کل صبح جمیلہ کے پاس بھی جاؤں گا۔ اس سے معافی مانگوں گا اور ایک باپ بن کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھوں گا۔ کاش کہ میری طرح دنیا کے تمام لوگ پاگل بن جاتے اور میری طرح نیکی اور سچائی کے راستے کو پا لیتے۔ یہ درست ہے کہ انسان بہت زیادہ عقلمندی کے زعم میں خدا سے دور ہو جاتا ہے۔ خدا تک پہنچنے کے لئے فرزانگی کی نہیں، دیوانگی اور جذبیت کی ضرورت ہے۔۔۔"

وہ سوچتے سوچتے ایک ساعت کے لئے رک گیا پھر کچھ دیکھنے لگا۔ اس کے متعلق اس کا دماغ سوچنے لگا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ دروازہ کھل رہا ہے اور اس کا بڑا بیٹا حمد و دہلیز پر کھڑا اپنے باپ کو گھور گھور کر دیکھ رہا ہے اور اب وہ دہلیز پار کر کے دروازے کو اندر سے بند کر رہا ہے۔ اس وقت پٹواری نے کہا۔

"دروازہ بند نہ کرو۔ میں پاگل نہیں ہوں میری زنجیریں کھول دو۔ دروازہ کھول دو۔ تم نے کیا سمجھ کر مجھے قید کر رکھا ہے؟"

"پاگل۔۔! "

حمدو کی سوچ بھی میرے دماغ تک پہنچ گئی پہلے پہل جب میں نے خیال خوانی کی ابتداء کی تھی۔ اس وقت میں صرف ایک ہی شخص کی سوچ کو پڑھ سکتا تھا اگر دو شخص باتیں کر رہے ہوں تو ایک وقت میں ایک ہی شخص کی سوچ کی لہریں میرے دماغ تک پہنچتی تھیں لیکن اب یہ علم رفتہ رفتہ وسعت اختیار کر رہا تھا۔

میری داستان حیات کے اس دلچسپ پہلو کو سمجھنے کے لئے کسی حد تک ٹیلی پیتھی کو سمجھنا ضروری ہے اور ٹیلی پیتھی کو سمجھنے کے لئے انسانی دماغ کی کارفرمائیوں کو سمجھنا لازمی ہے۔ ہمارا دماغ صرف ہماری اپنی باتیں نہیں سوچتا ہم جسے چھوتے ہیں۔ اس چھونے کے ردعمل کو بھی سوچتا ہے۔ ہم جس چیز کو چکھتے ہیں۔ اس چکھنے کی لذت کا تجزیہ بھی کرتا ہے کہ وہ کون سی چیز ہے اور اس کا مزہ کیسا ہے۔ ہم جسے سونگھتے ہیں اسے بھی ہمارا دماغ بتاتا ہے کہ وہ خوشبو کس نوعیت کی ہے۔ اسی طرح اپنے سامنے والے کی باتیں جب ہم کانوں سے سنتے ہیں تو وہ پہلے دماغ تک پہنچتی ہے اگر نہ پہنچیں تو ہم آواز کو لفظوں کی ترکیب کو کہنے والے کی زبان کو اور اس کے کہنے کے مفہوم کو نہ سمجھ سکیں تو یہ جو ہمارا دماغ ہے۔ یہ ایک شفاف آئینہ ہے۔ جو بھی سامنے آتا ہے وہ وقتی طور پر دماغ کے آئینے میں منعکس ہو جاتا ہے۔ سوچ کے سمندر کا نام دماغ ہے۔)

اور دماغ ایک ٹیپ ریکارڈر بھی ہے۔ اس ریکارڈر کے سامنے جو بولتا ہے۔ اس کی آواز ٹیپ پر ریکارڈ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح حمدو جو کچھ کہہ رہا تھا اسے پٹواری کے دماغ کا ٹیپ ریکارڈ قبول کر رہا تھا اور اس کے دماغی ریکارڈر کو میں سن رہا تھا۔

"پاگل۔۔!" حمدو کی آواز پٹواری کے دماغ سے نشر ہوئی۔ "ابا! تو پاگل ہے اور پاگل کو اس دنیا میں زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔"

"اوئے پاگل دے پتر بکواس نہ کر۔ میں پاگل نہیں ہوں تجھے کتنی بار سمجھایا کہ میں نے زہاد کو دھوکہ دینے کے لئے پاگل پن کا ڈھونگ رچایا تھا۔"

"ٹھیک ہے ابا۔ دنیا تو یہی سمجھتی ہے کہ تو سچ مچ پاگل ہے۔ ان کی سمجھ کے مطابق تجھے پاگل رہ کر فوراً خودکشی کر لینی چاہیئے۔ سب لوگ افسوس کریں گے اور یہی سمجھیں گے کہ تو نے دیوانگی کے عالم میں خود کو ہلاک کر ڈالا ہے ایک پاگل اپنے پاگل پن سے کسی وقت بھی موت کے منہ میں پہنچ سکتا ہے۔ تجھے عملی طور سے ثابت کرنا چاہیئے۔"

"میں خودکشی نہیں کروں گا۔ تیرا دماغ چل گیا ہے۔ میرا دماغ ابھی درست ہے۔ تیرے کہنے سے میں خودکشی نہیں کروں گا۔ ابھی مجھے زندہ رہنا ہے۔ ابھی مجھے اپنی غلطیوں کی تلافی۔۔۔ آں یہ۔۔۔ یہ تو کیا کر رہا ہے۔۔؟ یہ زنجیر کا حلقہ کیوں بنا رہا ہے۔۔؟ نن۔ نہیں۔ مجھ سے دور ہو جا۔ دیکھ میرے قریب نہ آ۔ نہیں یہ حلقہ میری گردن میں نہیں ڈالنا۔ میں سمجھ گیا ہوں۔ تیرے خطرناک ارادے کو سمجھ گیا ہوں۔ بے ایمان، بدذات اپنے باپ کو مار ڈالنا چاہتا ہے۔ اگر مرد کا بچہ ہے تو میرے ہاتھ کھول دے۔ میں تجھ سے نمٹ۔۔۔ آں۔ اوں۔ اوں۔ اونک۔۔۔۔"

پٹواری کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔ میں نے چشم تصور میں دیکھا۔ اس کی گردن زنجیر کے حلقے میں پھنسی ہوئی تھی اور حمدو جو کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ پٹواری کے ڈوبتے ہوئے ذہن سے نشر ہو رہا تھا۔

"ابا۔ تیرے دن پورے ہو گئے تو نے پاگل پن کا ناٹک شروع کیا تھا میں اس ناٹک کو اس کے صحیح انجام تک پہنچا رہا ہوں۔ تیرے مرنے کے بعد میں تیرے دونوں ہاتھوں کو کھول کر زنجیر کے حلقے پر رکھ دوں گا۔ دیکھنے والے یہی سمجھیں گے کہ تو نے وحشت و جنون کی حالت میں اس حلقے کو اپنی گردن میں پھنسا لیا تھا اور آخر کار اپنی زندگی تمام کر ڈالی۔۔"

پٹواری کی دماغی قوت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ اس کے دماغ میں دو سوچیں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ ایک تو وہ خود ہی سوچ ہی سوچ میں بیٹے کو گالیاں دے رہا تھا۔ دوسری آواز اس کے بیٹے کی تھی جو اس کے ماؤف ہونے والے دماغ میں دم توڑتی جا رہی تھی۔

پھر یک لخت پٹواری کے دماغ کا ٹیپ ریکارڈر آف ہو گیا۔ آواز بند ہو گئی۔ سناٹا چھا گیا تھا۔ شاید حمدو کچھ کہتا ہو گا لیکن میرا رابطہ پٹواری کے دماغ سے تھا چونکہ وہ دماغ ہمیشہ کے لئے چپ ہو گیا تھا۔ اس لئے اب وہ دنیا کی کوئی آواز نشر نہیں کر سکتا تھا۔ اب وہ ایسا ناکارہ ٹیپ ریکارڈر تھا جس کی مرمت اس دنیا کے کسی کارخانے میں نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔

میں جس دشمن سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے ہاتھوں اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ میں نے چند لمحوں کے لئے اس سے ہمدردی کی، طور پہ اپنے سر کو جھکا لیا۔ دشمن سے اس لئے ہمدردی ہوئی کہ وہ اپنے گناہوں اور غلطیوں پر صدق دل سے پچھتا رہا تھا۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے۔ انسان اچھی خاصی زندگی گزارنے کے بعد موت کے قریب پہنچ کر پچھتاتا اور توبہ کرتا ہے ایسے انسانوں سے صرف ہمدردی ہی کی جا سکتی ہے۔

میں پلنگ سے اتر کر دروازے کے پاس آیا اسے اچھی طرح ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ حویلی کے اندر جانے والا اندرونی دروازہ کھلا ہوا تھا میں اسے بند کرنے کے لئے آگے بڑھا تو دودھ آنگن میں شادو نظر آئی۔ وہ بوڑھی مائی کو سہارا دے کر ایک کمرے کی طرف لے جا رہی تھی اور بار بار اس دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں میں کھڑا ہوا تھا۔

اسے دیکھتے ہی دل میں گدگدی ہونے لگی۔ رات تھی تنہائی تھی اور آنگن میں شباب کی چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔

وہ گل بدن آتش گل کی طرح خیالی آنچ مجھ تک پہنچا رہی تھی۔ زرینہ کے سوا میں نے اب تک کسی لڑکی کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور جب سے زرینہ ظہیر سے منسوب ہوئی تھی۔ میں نے اسے بھی اپنی تنہائی میں آنے سے منع کر دیا تھا۔ دوسری لڑکیوں کے سلسلے میں میرا اصول یہ تھا کہ میں کسی سے عشق نہ کروں نہ اپنے جذبات کی تسکین کے لئے کسی کو جھوٹی محبت کا فریب دوں اور نہ ہی اپنے علم کو اس مقصد کے لئے استعمال کروں۔ ہاں اگر کوئی خود ہی کھلے ہوئے دعوت نامے کی طرح آ جائے تو اسے قبول کرنے سے انکار نہ کروں۔

اور شادو خود ہی میری طرف مائل تھی۔ اس وقت وہ آنگن سے جا چکی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ بوڑھی مائی کو کمرے میں چھوڑ کر ضرور واپس آئے گی۔

چڑھتی ندی اور چڑھتی جوانی کا بہاؤ ہمیشہ سمندر کی طرف ہوتا ہے اور میں شادو کے لئے ایک سمندر تھا۔

میں شادو کے متعلق رنگین اور سنگین باتیں سوچ رہا تھا۔ اسی وقت مجھے یاد آیا کہ شادو ایک مظلوم لڑکی ہے۔ پٹواری اس کی مرضی کے خلاف اس کی جوانی کا سودا کرتا رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ میرے پاس اپنی مرضی سے آئے گی لیکن اس رضامندی کے پیچھے یہ خواہش ہوگی کہ میں اسے ہمیشہ کے لئے اپنا لوں۔ اور اب میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ لہذا میں اسے خوش فہمی میں مبتلا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ کتنی معیوب سی بات تھی کہ دوسروں کی طرح میں بھی ایک گاہک بن کر اس کے ساتھ رات گزارنا چاہتا تھا۔

میں فوراً ہی دروازے سے پلٹ کر پلنگ کے پاس آ گیا۔ ہپناٹزم اور ٹیلی پیتھی کی مشقوں کے دوران میں نے جیسی ریاضت کی تھی جس طرح برسوں اپنے نفس کو مارتا رہا تھا اور جس طرح اپنے کسی فیصلے اور خیال کو کسی ایک نقطہ پر مرکوز کر دینے کا کمال خود میں پیدا کر لیا تھا۔ یہ تمام خوبیاں ایسے آزمائشی وقت میں کام آتی تھیں۔ شادو کیا چیز ہے۔ اس دنیا کی حسین ترین لڑکی بھی میرے فیصلے کو نہیں بدل سکتی تھی۔

میں بستر پہ آ کر بیٹھ گیا۔ میری نظریں دروازے پر جمی گئیں تھوڑی دیر بعد رات کے سناٹے میں چوڑیوں کا ترنم سنائی دینے لگا۔ وہ آ رہی تھی مجھے اس کا انتظار نہیں تھا مگر میں انتظار کر رہا تھا۔ جب انسان کے اندر ذرا بہکنے، ذرا سنبھلنے کی کشمکش پیدا ہو جائے تو وہ آنے والی کا انتظار نہ کرتے ہوئے بھی انتظار کرتا ہے۔ ایسے اس وقت میرا فیصلہ یہ تھا کہ میں اسے اپنی نگاہوں کے زیر اثر لاؤں گا اسے اپنا تابع فرمان بناؤں گا اور اسے اس کمرے سے واپس جانے کا حکم دوں گا۔ اس طرح وہ بلا چوں و چرا واپس چلی جائے گی۔

وہ دروازے پر آ گئی۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کمرے میں آتے ہی میری جانب دیکھے تاکہ میں فوراً ہی اسے اپنی نگاہوں کے زیر اثر لے آؤں لیکن وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ میں نے کہا۔

"دروازہ بند نہ کرو۔ میری طرف دیکھو۔" میری آواز اور میرے لہجے کا انداز ایسا تحکمانہ تھا کہ وہ سہم کر اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

پھر اس نے دروازے کی طرف گھوم کر میری جانب رخ کرتے وقت اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ اس کے بعد نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔

"میں آپ کی طرف نہیں دیکھ سکتی۔ پہلی بار جب میں یہاں آئی ہوئی تھی اور آپ کی آنکھوں میں دیکھا تھا تو میں بیان نہیں کر سکتی کہ مجھ پر کیا گزری تھی۔ پتہ نہیں آپ کی آنکھوں میں کیا ہے مجھے ڈر لگتا ہے۔ ایک انجانے سے خوف کے باوجود میرا دل میرا دماغ اور میرا سارا وجود آپ کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کی آغوش میں آ کر مر جاؤں۔"

اس کی باتوں میں کتنی شدید محبت تھی۔ خود کو میرے حوالے کر دینے کی کیسی دیوانگی تھی۔ میں نے ذرا نرم لہجے میں کہا۔

"تم ایک مظلوم لڑکی ہو۔ میں تمہیں کھلونا سمجھ کر نہیں کھیل سکتا اور نہ ہی تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنا سکتا ہوں۔ اس لئے حکم دیتا ہوں کہ یہاں سے چلی جاؤ۔"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں، میں نہیں جا سکتی۔ آپ کی آواز بھی آپ کی آنکھوں کی طرح میرے دماغ میں چبھتی ہے۔ آپ کتنے عجیب ہیں۔ عام انسانوں سے بالکل الگ ہیں۔ میں اپنے کمرے میں بہت دیر تک سوچتی رہی کہ آپ کی آنکھوں میں اور آپ کی باتوں میں جادو ہے۔ آپ کوئی علم جانتے ہیں۔ آپ میں کوئی ایسی پُراسرار قوت ہے جس کے زیرِ اثر میں آپ کا حکم مان کر اس وقت یہاں سے چلی گئی تھی۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتی ہوں کہ مجھ پر کسی طرح کا عمل نہ کریں۔ اپنی پُراسرار قوتوں کو ایک کمزور عورت پر آزمانا مردانگی نہیں ہے۔"

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ بات مردانگی کی آ گئی تھی مجھے سوچنا پڑا بلکہ تسلیم کرنا پڑا کہ میرے سامنے ایک عورت ہے جو ازل سے کمزور سمجھی جاتی ہے اور مرد شہ زور سمجھا جاتا ہے اور عورت سے زیادہ ذہین بھی سمجھا جاتا ہے پھر میں اپنی ذہانت کو کام میں لانے کی بجائے اپنے فاضل علوم کا سہارا کیوں لے رہا ہوں؟ کیا مجھے اس بات کا خدشہ ہے کہ وہ اپنے حسن و شباب کی جلوہ سامانیوں سے مجھ پر چھا جائے گی؟

نہیں، میں کچے ارادوں کا مالک نہیں ہوں۔ اگر اپنی پراسرار قوتوں کو ایک عورت پر آزمانا مردانگی نہیں ہے تو میں نہیں آزماؤں گا۔ ایک عام مرد کی طرح اس کا محاسبہ کروں گا اور اس کی قربت سے انکار کروں گا۔

یہ سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک وہ سامنے ہے میں اس کے خیالات نہیں پڑھوں گا اور نہ ہی اسے ہپناٹائز کروں گا میں یہ بھی نہیں اعتراف کرنا چاہتا تھا کہ مجھ میں پُراسرار قوتیں ہیں۔ میں نے اپنی نگاہوں کے نشتر کو چھپا لیا اور لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو میں کسی قسم کا جادو یا عمل نہیں جانتا ہوں میری آنکھیں پیدائشی طور پر ایسی ہیں۔ بہرحال میں تمہیں ایسی نظروں سے نہیں دیکھوں گا کہ تم سہم جاؤ۔ اب میری طرف دیکھو اور غور سے میری باتیں سنو۔"

اس نے اپنے چہرے سے دونوں ہاتھوں کو ہٹا لیا پھر جھکتے ہوئے میری طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ہائے کیسی دل میں کھب جانے والی نظریں تھیں۔ ہم مرد یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمیں ہپناٹزم سیکھنا پڑتا ہے اور یہ غزالی آنکھوں والیاں قدرتی طور سے سیکھی سکھائی آتی ہیں۔

واقعی مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ وہ اپنی ہرنی جیسی آنکھوں سے مجھے اپنا معمول بنا لے گی۔ اس بار میں نے اس سے نظریں چرائیں۔ میری نگاہیں اس کی خمار آلود آنکھوں سے اتر کر اس کے لبوں پر ٹھہر گئیں۔ اس کے لب گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح کھلے ہوئے تھے اور یوں کھلے ہوئے تھے جیسے پکار رہے ہوں۔ میں پھر گڑبڑا گیا۔

وہ سبک خرامی سے ذرا آگے بڑھی تو میں اسے نصیحتیں کرنا بھول گیا۔ اس کی چال میں ایسا بانکپن تھا کہ نگاہیں اس کے سراپے پر جم گئیں۔ وہ سہتے نزل تک دودھاری تلوار تھی جو قدم قدم پر کبھی ادھر سے اور کبھی ادھر سے دل کو کاٹ رہی تھی۔

آدم کی جنت سے اولادِ آدم کی زمین تک عورت اسی طرح مرد کے ارادوں کو کاٹتی رہی ہے۔ اس میدان میں وہ حسن و شباب، رنگ و بو اور نگاہوں اور اداؤں کے کتنے ہی جان لیوا اور دل لیوا ہتھیاروں سے لیس ہوتی ہے اور مرد بالکل نہتا ہوتا ہے۔ ایسے وقت باپ دادا کی نصیحتیں ہوا ہو جاتی ہیں۔ شر سے بچنے کی جتنی دعائیں ہوتی ہیں۔ وہ اٹک اٹک کر بھی زبان تک آنا بھول جاتی ہیں۔ سانپ کو پٹارے میں بند کرنے کا منتر ہم نے ہزار سال پہلے سیکھ لیا۔ عورت کو اس کی حد میں رکھنے کا منتر شاید ہزار سال بعد بھی نہ سیکھ سکیں۔

تب میں نے سوچا کہ میں ایک نعمت غیر مترقبہ سے انکار کیوں کر رہا ہوں۔ یہ تو کفرانِ نعمت ہے۔

جو خود ہی چل کر آئے اسے خوش آمدید کہنا بداخلاقی بھی ہے اور بہت بڑی حماقت بھی۔ ہماری تہذیب میں اس بات کی خاصی گنجائش ہے۔ وقت اور ماحول کے مطابق حرام کو حلال اور ناجائز کو جائز قرار دینے کی بہت سی تاویلات ہمیں مل جاتی ہیں۔

اب وہ جائز اور حلال نظر آ رہی تھی کیونکہ وہ اپنا بھلا بُرا سوچ کر آئی تھی۔ بیچاری کے دل میں سینکڑوں ارمان تھے اور ہمیں تو بچپن سے سمجھایا گیا ہے کہ کسی کا دل توڑنا گناہِ عظیم ہے۔

وہ میرے بالکل قریب آ گئی اتنے قریب کہ اب وہ ہی وہ تھی اور کائنات میں کوئی نہ تھا۔

وہ نہیں جانتی تھی اور اگر جانتی بھی تھی تو اس بات کی اہمیت سے واقف نہیں تھی کہ میری آنکھوں کے پیچھے کیسے انگارے چھپے ہوئے ہیں اگر اپنی نگاہوں کے لپکتے ہوئے شعلوں کو کام میں لاتا تو وہ ایک پل کے لئے بھی میرے سامنے نہیں ٹھہر سکتی تھی لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا کہ ایک مرد کی طرح سے کام لے کر ایک حوا کی بیٹی سے دامن بچاؤں گا۔

میں کوشش کر رہا تھا اور کوشش وہ بھی کر رہی تھی۔ میں پلنگ کے سرے پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ فرش پر گھٹنے ٹیک کر میرے گھٹنوں کی طرف جھک گئی۔

ان حسینوں کے انداز بھی نرالے ہوتے ہیں پہلے جھک جاتی ہیں اور پھر جھکا لیتی ہیں۔

ایسی صورت میں اپنی قوتِ ارادی سے کام لینے کا مطلب یہ تھا کہ میں پتھر بن جاؤں۔ میں اپنی نگاہوں کو کسی ایک نقطے پر جما دیتا اور اپنی بہکتی ہوئی سوچ کو شاداب سے ہٹا کر صرف اپنی ذات تک محدود کر دیتا تو اس کے لئے مجھے اپنے علم کو کام میں لانا پڑتا پھر وہی الزام آتا کہ میں اپنی پُراسرار قوتوں کو استعمال کر رہا ہوں۔ پھر کیا ضروری ہے کہ ایک عورت کے سامنے مرد آہن بن کر رہا جائے۔ اس کے لئے مرد بننا ہی کافی ہے۔

بہکنے کی جگہ بہکنا چاہئے

اور سنبھلنے کی جگہ سنبھلنا چاہئے۔ میں اتنی دیر سے خواہ مخواہ پرہیزگار بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ رات کی خاموشی اور لالٹین کی مدھم مدھم روشنی میں ایک حسینہ کی قربت جادو جگا رہی ہو تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایسے وقت پر ہر صاحبِ دل بہکنے کو سنبھلنے پر ترجیح دیتا ہے۔

وہ سر اٹھا کر پلنگ کے سرے پر بیٹھ گئی

تکلفات کا پہلا پردہ اٹھا دیا۔ پردے ایک ایک کر کے اسی طرح سرکتے ہیں اور اپنے بدن کی چادر نگری میں بھٹکنے پر مجبور کر دیتے ہیں وہ اپنی سندر نگری کے ہر موڑ پر جادو جگاتی گئی اور میں سحر زدہ ہو کر خود سے بیگانہ ہوتا گیا۔ اور اس نگری کے چپے چپے سے آشنا ہوتا چلا گیا۔

دوسرے دن مجھے واپس جانا تھا لیکن شاداب نے واپسی کا راستہ بھلا دیا میں دوسرے دن اور دوسری رات بھی اس کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہا۔ اس روز دور دور کے زمینداروں تک پٹواری کی موت کی خبر پہنچ گئی تھی۔ اس کے جنازے کو کندھا دینے بڑے بڑے لوگ آئے تھے۔ میں بھی تھوڑی دیر کے لئے وہاں گیا تھا۔ وہاں پولیس والے تحقیقات میں مصروف تھے کہ اسے کسی نے ہلاک کیا ہے یا اس نے جنون کی حالت میں خودکشی کی ہے؟ مجھے اس سے دلچسپی نہیں تھی کہ وہ کس نتیجے پر پہنچیں گے۔ میں نے اس کی موت پر افسوس کا اظہار کیا۔ اور وہاں سے واپس چلا آیا۔

تیسرے دن میں حویلی سے روانہ ہوا تو شاداب رو رہی تھی۔ میں اسے پہلے ہی سمجھا چکا تھا کہ میرے پاؤں میں چکر ہے۔ میں کہیں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتا۔ وقت کی طرح بہتا چلا جاتا ہوں لہٰذا میں اس حسینہ کی زندگی سے بھی رنگین لمحات کی طرح گزر گیا۔

لاہور پہنچتے ہی پھوپھی نے پچھلے دو دنوں کی رپورٹ سنائی کہ کس طرح چچی جان نے زہر پی کر خودکشی کی ہے اور کس طرح پولیس والے ان کی لاش اٹھا کر لے گئے تھے۔ شام کو لاش واپس کی گئی اور رات تک تجہیز و تکفین کی رسمیں ادا ہو گئیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ پنڈی سے غزالہ، شاہینہ اور ان کے ماموں وغیرہ آئے ہوئے ہیں۔

اور مجھے غزالہ اور اس کے ماموں کا ہی انتظار تھا۔ ان دونوں میں سے جو بھی چور تھا۔ وہ میرے ایک لاکھ پچیس ہزار روپے ہضم نہیں کر سکتا تھا۔ اب میں اسے بدہضمی میں مبتلا کرنا چاہتا تھا۔

جب میں چچا جان کے ہاں تعزیت کے لئے پہنچا تو ڈرائنگ روم میں سب سے پہلے شاہینہ نے مجھے دیکھا اور دوڑتی ہوئی آ کر میرے سینے سے لگ گئی۔ وہ اپنی ماں کی موت کے غم سے نڈھال ہو چکی تھی اور تھکے تھکے سے انداز سے رو رہی تھی۔ چچی جان جیسی بھی تھیں۔ شاہینہ ان کے کردار کے تاریک پہلوؤں سے واقف نہیں تھی۔ اس لئے ایک ماں کی جدائی پر آنسو بہا رہی تھی۔

میں اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر تسلیاں دیتے ہوئے صوفوں کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں غزالہ اور اس کے ماموں ایک صحت مند نوجوان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تینوں میری جانب دیکھ رہے تھے۔ ایک طویل مدت کے بعد میرا اور غزالہ کا سامنا ہوا تھا۔ وہ میری شخصیت کو بڑی حیرت سے، بڑی دلچسپی سے بلکہ تعریفی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ بہت عرصہ پہلے جب میں ایک دبلا پتلا سا نوجوان تھا۔ اور معمولی لباس میں ایک ملازم کی طرح اس گھر میں رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ مجھ سے بے حد متاثر تھی اور مجھے اپنی ریشمی بانہوں کا اسیر بنا لینا چاہتی تھی۔ اب بھی اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ مجھے کھو کر پچھتا رہی ہے۔

پھر وہ زیادہ دیر تک اپنی جگہ بیٹھی نہ رہ سکی پھر میری جانب بے اختیار کھنچی چلی آئی۔ قریب آ کر اس نے بڑی بے تکلفی سے مسکرا کر کہا۔

"ہیلو فرہاد! یہ تم ہو؟ بائی گاڈ پہچانے نہیں جاتے ہو۔ اتنے عرصے کے بعد تمہیں دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتی!"

یہ کہہ کر اس نے مصافحہ کرنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ شاہینہ مجھ سے الگ ہو گئی تاکہ میں اس سے مصافحہ کروں۔ میں نے اس کے گورے گورے گلابی گلابی ہاتھ کو دیکھا۔ وہ مصافحہ کے بہانے مجھے چھونے کے لئے بیتاب تھی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"تمہیں یاد ہو گا غزالہ۔ میں نے پہلے بھی تمہیں کبھی ہاتھ نہیں لگایا لیکن ایک رات تم نے مجھے بدنام کر کے اس گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب میں کس طرح دوستی کا ہاتھ بڑھا سکتا ہوں؟"

میں سمجھتا تھا کہ وہ نادم ہو جائے گی لیکن اس نے تو شرمانا یا نادم ہونا سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ بدستور مسکراتی ہوئی بولی۔

"گڑے مُردے نہ اکھاڑو فرہاد! پرانی باتوں کو بھول جاؤ۔ آؤ ہم ازسرِ نو ایک پائیدار دوستی کی ابتدا کریں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔"

شاہینہ نے میرا بازو تھام کر التجا کی "ہاں بھائی جان! صلح کر لیجئے۔ باجی بہت اچھی ہیں۔ آپ پچھلی باتوں کو بھول جائیں۔ کیا آپ میری بات نہیں مانیں گے؟"

میں اپنی گڑیا سی بہن کی بات کیسے نہ مانتا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور مصافحہ کرنے کے لئے غزالہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"غزالہ! اب مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔۔۔"

وہ مصافحہ ذرا طویل ہو گیا۔ میں اس کے ہاتھ کی نرمی اور گرمی کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ ایک کھیلی کھائی تجربہ کار عورت کی طرح میرے ہاتھ کی سختی سے میری مردانہ صفات کا دور دور تک اندازہ کر رہی تھی۔ اس کی سوچ بتا رہی تھی کہ وہ میرے لئے بکھرتی جا رہی ہے۔

پھر اس کے ماموں آ گئے ان کے ساتھ وہ نوجوان بھی میرے قریب آیا۔ غزالہ نے اس کا تعارف کرایا۔

"یہ میرے فرینڈ ہیں مسٹر قاسم کرمانی۔ پنڈی میں ان کا کاروبار ہے اور

قاسم یہ میرے کزن فرہاد علی ہیں۔ ایک طویل عرصے کے بعد ہماری ملاقات ہوئی ہے ویسے ڈیڈی نے بتایا ہے کہ یہ آج کل دولت سے کھیل رہے ہیں۔ بھئی مجھے تو بڑی خوشی ہو رہی ہے۔"

میں نے قاسم سے مصافحہ کیا۔ وہ میری طرح قد آور اور صحت مند تھا۔ ہم نے اس انداز میں مصافحہ کیا جیسے دو رقیب عزالہ کی جوانی کو جیتنے کے لئے پنجہ لڑا رہے ہوں۔ ہم تہذیب کے دائرے میں ہاتھ ملا رہے تھے لیکن اپنے اپنے ہاتھ کی گرفت سے اپنی اپنی قوت کا مظاہرہ کر رہے تھے اور ساتھ رسمی طور پر یہ کہہ رہے تھے کہ ہمیں ایک دوسرے سے مل کر بڑی خوشی ہو رہی ہے۔

ہم سب خوش تھے۔ عزالہ بھی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ وہاں اس المیہ کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ دو دن پہلے اس گھر کی ایک اہم ہستی موت کو گلے لگا چکی ہے وہاں صرف ایک شاہینہ اداس تھی۔ میں نے پوچھا۔

"چچا جان کہاں ہیں؟"

"اپنے کمرے میں ہیں۔" عزالہ نے منہ بنا کر کہا۔ "ممی کی موت کا مجھے بھی صدمہ ہے لیکن رونے پیٹنے سے ممی واپس تو نہیں آ جائیں گی۔ ڈیڈی کو نہ جانے کیسا صدمہ ہے کہ وہ رونے کی بجائے چڑچڑے ہو گئے ہیں کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ غصہ میں چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتے رہتے ہیں۔ تم ان کے پاس جاؤ گے تو بور ہو جاؤ گے۔ آؤ ہم کمرے میں چل کر باتیں کریں۔ کوئی اچھا سا پروگرام بنائیں۔ کچھ تو بوریت دور ہو گی۔"

وہ ماڈرن زمانے کی زندہ دل لڑکی تھی۔ زندگی کی باتیں کرتی تھی مرنے والوں کو یاد کر کے اپنی زندگی کے قیمتی لمحات ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی چچی جان نے بڑی شاندار اولاد پیدا کی تھی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے کہا۔ "ہم ضرور کوئی اچھا سا پروگرام بنائیں گے لیکن چچا جان سے ملاقات کرنا بھی ضروری ہے ورنہ انہیں شکایت ہو گی تم قاسم صاحب سے باتیں کرو۔ میں ان سے مل کر آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں چچا جان کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ شاہینہ میرے ساتھ تھی۔ اس نے کہا

"باجی ٹھیک کہتی ہیں۔ ڈیڈی نہ جانے کیوں چڑچڑے ہو گئے ہیں۔ میں ممی کو یاد کر کے روتی ہوں تو وہ مجھے ڈانٹ دیتے ہیں۔ بھائی جان یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ممی نے زہر کیوں پیا؟ وہ زندگی سے بیزار کیوں ہو گئی تھیں؟ ڈیڈی اب ان کا نام تک سننا پسند نہیں کرتے ہیں۔ میں یہاں کے حالات پر جتنا غور کرتی ہوں اتنا ہی الجھتی جاتی ہوں۔"

میں نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔

"جن باتوں سے ذہن الجھتا ہو اور ان کا کوئی حل نظر نہ آتا ہو تو ان کے متعلق زیادہ نہ سوچا کرو۔ جاؤ تم آرام کرو۔ میں چچا جان کو سمجھاؤں گا۔"

وہ خاموشی سے سر جھکا کر چلی گئی۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے چچا جان کی آواز سنائی دی۔

"کون ہے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ مجھے پریشان نہ کرو۔"

"چچا جان۔! میں ہوں فرہاد۔۔۔۔"

کمرے کے اندر ذرا دیر تک خاموشی رہی پھر دروازہ کھل گیا۔ وہ میرے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور سر کے سیاہ و سفید بال کھچڑی ہو گئے تھے۔ ان دو دنوں میں وہ اتنے بوڑھے ہو گئے تھے کہ پہچانے نہیں جا رہے تھے۔

میں کمرے میں آ گیا۔ انہوں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"تم اپنی چچی کی موت پر افسوس کا اظہار نہ کرنا، مجھے رسمی گفتگو سے نفرت ہے۔ وہ تمہاری سب سے بڑی دشمن تھی۔ تم بلا جھجک خوشی کا اظہار کرو۔"

"بے شک وہ میری دشمن تھیں لیکن بعض اوقات دشمن کی موت پر بھی افسوس ہوتا ہے۔ اس وقت میں آپ کی حالت پر افسوس کرنے آیا ہوں۔ جس بیوی کے اشاروں پر چلتے ہوئے آپ مجھ سے دشمنی کرتے رہے۔ آج اس کی موت پر نہ آپ آنسو بہا سکتے ہیں نہ خوش ہو سکتے ہیں۔ وہ مرنے والی آپ کے آنسو بھی لے گئی۔ آپ کی خوشیاں بھی لے گئی اور آپ ایک کمرے میں بند ہو کر اپنی زندگی کا حساب کر رہے ہیں کہ آپ نے اب تک کیا پایا ہے اور کیا کھویا ہے۔ آپ کی یہ پریشانی اور بدحالی بتاتی ہے کہ آپ نے صرف کھویا ہے اگر کچھ پایا ہے تو مجھے بتایئے؟"

وہ شکست خوردہ انداز میں ایک صوفے پر گر پڑے اور خالی خالی نظروں سے مجھے تکنے لگے۔ میں نے ان کی سوچ کو پڑھنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ مجھے ان کی طرف سے اب کسی نقصان کا اندیشہ نہیں تھا بلکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ میں ان کے لئے اب ایک مستقل دردِ سر بن گیا ہوں۔ انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"میں نے پایا ہے۔ ایک مستقل بدنامی پائی ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ میری بیوی نے خودکشی کیوں کی؟ میں جواب نہیں دے سکتا۔ سوچتا رہ جاتا ہوں کہ کیا جواب دوں۔ کچھ لوگ اس مرنے والی کے متعلق شرمناک باتیں کرتے ہیں۔ میں بھی یہی سوچنے پر مجبور ہوں کہ لوگ ٹھیک ہی بدنام کر رہے ہیں۔ اس عورت نے۔ اس فاحشہ نے اپنے عاشقوں میں ساری دولت لٹا دی ہے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے تعجب کا اظہار کیا حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے دبی کہا۔

"جو بات میں نے اب تک کسی کو نہیں بتائی ہے۔ وہ تمہیں بتا رہا ہوں لیکن اس سے پہلے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں ایک مجرم ہوں اور تمہارے بچپن سے تمہیں لوٹتا آ رہا ہوں۔ جو کچھ میں نے تم سے لوٹ کر اپنی عورت کو دیا۔ اس عورت نے وہ مالِ غنیمت اپنے عاشقوں میں تقسیم کر دیا۔ آج صبح میں ان بنکوں میں گیا تھا جہاں تمہاری چچی نے لاکھوں روپے جمع کر رکھے تھے۔ اب وہاں چند سو روپے سے زیادہ نہیں ہیں کئی لاکھ روپے اس عورت نے پچھلے چند ماہ کے عرصے میں نکالے ہیں۔ بنکوں کے کھاتوں سے یہ بات معلوم ہوئی ہے۔ وہ عورت لاکرز سے بھی لاکھوں کے زیورات اور ضروری دستاویزات نکال کر کسی کے حوالے کر گئی ہے۔

میں واقعی اپنے اعمال کا حساب کر رہا ہوں کہ میں نے تم سے نیکی نہیں کی۔ اس کے صلے میں میری بیوی نے مجھ سے نیکی نہیں کی۔ ہم یہ سوچ کر بے ایمانی

کرتے رہتے ہیں کہ جو ہو گا۔ وہ قیامت کے دن دیکھا جائے گا لیکن قیامت سے پہلے ہی قیامت آ جاتی ہے۔ وہ عزت دینے والا، وہ ذلت دینے والا اسی دنیا میں منہ کالا کر دیتا ہے۔ دیکھو بیٹے! میرا کالا منہ دیکھو۔ میں دو دن سے اس کمرے میں بند ہوں۔ تمہارا انتظار کر رہا ہوں کہ سب سے پہلے اپنے چہرے کی کالک تمہیں دکھاؤں گا۔

فرہاد۔ میرے بچے! میں سزا چاہتا ہوں اگر تم سزا نہ دے سکو تو کم از کم ایک بار میرے منہ پر تھوک دو۔ تھوک دو۔۔۔"

وہ اچانک ہی دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ڈھانپ کر رونے لگے۔ میں نے اس پتھر کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھے تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ وہ اپنی بیوی کی موت پر نہیں۔ اس بے غیرتی پر رو رہے تھے جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئی تھی۔ اس ناانصافی پر آنسو بہا رہے تھے۔ جو اب تک میرے ساتھ کرتے رہے تھے اور اس تباہی و بربادی کا ماتم کر رہے تھے جو لاکھوں روپے نقد اور زیورات کی صورت میں ان کی تجوری سے نکل گئے تھے۔

اب میرے سامنے ان کا خالی اور کھوکھلا وجود تھا جس کے اندر شان و شوکت مر گئی تھی۔ جس کے اندر سے غرور نکل چکا تھا اور وہ بوڑھے درخت کی طرح آسمان کی طرف سر اٹھائے رکھنے کی بجائے جڑ سے اکھڑ کر زمین کی پستی میں جھک گئے تھے۔

کچھ بھی ہو وہ میرے بزرگ تھے۔ میں انہیں اس طرح شرمسار ہو کر روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں آگے بڑھا۔ ان کے سامنے آ کر ایک سعادت مند بیٹے کی طرح گھٹنے ٹیک دیئے پھر میں نے ان کے ہاتھوں کو تھام کر کہا۔

"چچا جان! آپ میرے ساتھ جیسا بھی سلوک کرتے رہے ہیں۔ میں اس کا گلہ نہیں کروں گا کیونکہ جو کچھ میں نے کھویا تھا اسے کسی حد تک پا لیا ہے دراصل میں اس وقت چچی جان کی طرف سے صفائی پیش کرنے آیا ہوں۔"

وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"چچی جان۔ میری دشمن ضرور تھیں لیکن آخری وقت میری بھلائی کر گئی ہیں میں نہیں چاہتا کہ ایک بزرگ ہستی مرنے کے بعد بدنام ہوتی رہے لہٰذا میں مکمل ثبوت کے ساتھ ان کی طرف سے صفائی پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے آپ سے وصول کئے ہوئے لاکھوں روپے، زیورات کے سیٹ اور زمینوں کے اصلی اور جعلی دستاویزات مجھے دیئے ہیں۔"

وہ حیرانی سے اور بے یقینی سے مجھے تکنے لگے۔ وہ یقین نہیں کر سکتے تھے کہ چچی جان نے اصلی دستاویزات کبھی میرے حوالے کئے ہوں گے۔ میں نے جیب سے ان کاغذات کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں نکال کر انہیں دکھایا۔ وہ بڑے غور سے ان کاغذات کو دیکھتے رہے۔ میں نے کہا

"چچا جان۔! انہوں نے لاکھوں روپے اپنے عاشقوں میں تقسیم نہیں کئے یہ ان پر جھوٹا الزام ہے۔ وہ تمام روپے میرے پاس ہیں اور وہ اس جہاں فانی سے کوچ کرنے سے پہلے تمام زیورات بھی لاکرز سے نکال کر مجھے دے گئی ہیں۔"

یہ کہہ کر میں اتنی دیر بعد ان کے دماغ کو پڑھنے لگا۔ وہ مجھے حیرانی سے دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے۔

"کیا یہ ممکن ہے؟ کیا واقعی بیگم نے خود ہی ہماری ساری دولت اس کے حوالے کر دی تھی۔ ہماری دولت تو نہیں کہنا چاہیئے۔ دولت تو اسی لڑکے کی ہے میں دو دنوں سے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ اس لڑکے کو میں نے بچپن سے جو نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی تلافی کیسے کروں؟ لیکن مجھ سے پہلے ہی بیگم نے وہ سب کچھ اسے واپس کر دیا جو ہم اب تک اس سے چھینتے رہے تھے۔ یہ یقین نہیں آتا کہ بیگم نے اپنے کردار کی ایسی بلندی کا ثبوت دیا ہے لیکن یہ کاغذات ثبوت ہیں اور فرہاد خود ہی اعتراف کر رہا ہے کہ لاکھوں روپے اور زیورات اسے مل گئے ہیں۔ اور یہ اس اعتماد سے اعتراف کر رہا ہے کہ میں اس کے خلاف کوئی قانونی کاروائی نہیں کر سکوں گا کیونکہ زمینوں کے اصلی اور نقلی دستاویزات اس کے قبضے میں ہیں اور یہ عدالت میں میری جعلسازی کا ثبوت پیش کر سکتا ہے۔ اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے۔ میری یہی سزا ہونی چاہیئے۔"

یہ سوچ کر انہوں نے وہ کاغذات مجھے واپس کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کاغذات درست ہیں۔ اب تم مجھ پر مقدمہ چلاؤ اور اپنی زمین اور زمینوں سے حاصل کی ہوئی دولت وصول کر لو۔"

"چچا جان۔! میں ایسی گستاخی نہیں کروں گا۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔ آپ کی بدنامی ہمارے خاندان کی بدنامی ہے چچی جان جو کچھ مجھے دے سکتی تھیں۔ وہ انہوں نے دے دیا۔ اب آپ میری تمام زمین میرے نام لکھ دیجئے۔ اس طرح عدالتی انصاف کے بغیر ہمارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ یہ کوٹھی اور دکانیں اور دکانوں سے ہونے والی آمدنی اب بھی آپ کی ہو گی۔"

میری مہربانی اور رحم دلی نے انہیں اتنا متاثر کیا کہ وہ پھر رونے لگے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے میرے چہرے کو تھام کر میری پیشانی کو بوسہ دیا۔ پھر فرطِ عقیدت سے کہنے لگے۔

"بیٹا۔! تمہارے اندر تمہارے باپ کا خون بول رہا ہے۔ وہ بھی ایسے ہی رحم دل اور انسان دوست تھے اور مسکرا کر دشمنوں کو معاف کر دیا کرتے تھے مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ تمہاری چچی جان نے مرنے سے پہلے حتی الامکان تمہارا نقصان پورا کر دیا تھا اب میں بھی وہی کروں گا جو تمہاری خوشی ہو گی۔۔۔"

وہ بہت دیر تک اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے کہ وہ کس طرح تمام زمین اور جائیداد میرے نام منتقل کر دیں گے۔ اب ان کی باتوں میں کوئی کھوٹ نہ تھا اور نہ ہی ان کی سوچ میں کوئی فریب چھپا ہوا تھا مجھے بھی اطمینان ہو گیا۔ کرم پور ٹھیک ہے۔ سیدھی انگلی سے گھی نکل رہا ہے۔

اس دوران عزالہ دو بار کمرے میں آئی اور مجھے وہاں سے چلنے پر اصرار کرتی رہی۔ دوسری بار میں اس کے ساتھ باہر آ گیا ڈرائنگ روم میں قاسم گھور کر دیکھ رہا تھا کیونکہ عزالہ مجھ سے زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ مجھ سے نظریں۔۔۔ نہ ہی قاسم نے جبراً مسکرا کر کہا۔

"بھئی آپ بہت لکی ہیں۔ جب سے آپ یہاں آئے ہیں، غزالہ آپ ہی کی تعریفیں کئے جا رہی ہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے قاسم!" وہ اٹھلا کر بولی۔ "تعریفیں تو میں تمہاری بھی کرتی ہوں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ فرہاد سے ایک عرصے کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ اتنے سمارٹ ہو گئے ہوں گے۔ میں نے جتنی بھی تعریفیں کی تھیں، ان میں بے ساختگی تھی۔ بناوٹ نہیں تھی۔ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ میں خواہ مخواہ کی لگاوٹ اور بناوٹ کی عادی نہیں ہوں۔"

قاسم نے مسکرا کر کہا۔ "تم میں یہ بڑی خوبی ہے کہ تم بیک وقت کئی دوستوں کی دوستی کا دم بھرتی ہو اور ان دوستوں کو ایک دوسرے کا رقیب بننے پر مجبور کر دیتی ہو۔"

میں نے کہا۔ "قاسم صاحب! میں تو آپ کو اپنا رقیب نہیں سمجھتا۔ آپ چاہیں تو غزالہ کے ساتھ تنہا کہیں تفریح کے لئے جا سکتے ہیں۔"

"فرہاد!" غزالہ نے میٹھی ناراضگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو۔"

"نہیں غزالہ! ہمارا ساتھ تو ہمیشہ رہے گا لیکن قاسم صاحب مہمان ہیں۔ ہمیں ان کی خوشی کا خیال کرنا چاہیئے۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "ہاں! اس لحاظ سے تم درست کہہ رہے ہو لیکن ہم تینوں تفریح کے لئے نکلیں گے۔ پہلے ہم پلازہ میں انگریزی فلم دیکھیں گے۔ اس کے بعد شبانہ میں ڈنر کھائیں گے پھر فلیش کی بازی ہوگی۔ منظور ہے؟"

"منظور ہے۔" قاسم نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

میں نے کہا۔ "شبانہ کلب کے متعلق میں نے سنا ہے کہ وہاں وسیع پیمانے پر جوا کھیلا جاتا ہے۔ میرا یہ پہلا موقعہ ہوگا۔ تم مجھے بتا دو کہ مجھے کتنی رقم رکھنی چاہیئے۔"

غزالہ نے جواب دیا۔ "کلب کے ممبر وہاں کیش لے کر کھیلنے نہیں بیٹھتے ہیں۔ کھیلنے سے پہلے منیجر کو اپنا بنک اکاؤنٹ دکھاتے ہیں۔ اس اکاؤنٹ کی حد تک انہیں کھیلنے کی اجازت ہوتی ہے۔ ہارنے پر وہ چیک لکھ کر دے جاتے ہیں۔ دوسرے دن جیتنے والے کو وہ رقم کلب میں ادا کر دی جاتی ہے۔ میں وہاں کی ممبر ہوں۔ میں منیجر کو تمہارے بینک بیلنس کی ضمانت دوں گی۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "ٹھیک ہے پھر تو میں بڑی سے بڑی رقم ہارنے کو تیار ہوں۔"

"تم کھیلنے سے پہلے ہی ہارنے کا فیصلہ کر چکے ہو؟"

"اس لئے کہ مقابلہ پر تم بھی رہو گی۔ کسی حسین لڑکی کو جیتنے کے لئے تاش کی بازی ہارنی پڑتی ہے۔"

وہ خوش ہو کر قہقہے لگانے لگی۔ قاسم کو میرا جواب پسند نہیں آیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اب ہمیں چلنا چاہیئے۔" اس نے ناگواری سے کہا۔

"ذرا ٹھہریئے۔" میں نے کہا۔ "میں اپنی چیک بک لے کر آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں ڈرائنگ روم سے باہر آ گیا اور اپنی کوٹھی کی طرف جانے لگا۔ چیک بک میری جیب میں تھی۔ دراصل میں ان سے الگ ہو کر قاسم کے ذہن کو پڑھنا چاہتا تھا۔ اس کے بگڑے ہوئے تیور مجھے خیال خوانی پر مجبور کر رہے تھے۔

میں آہستہ آہستہ کوٹھی کی طرف بڑھتے ہوئے قاسم کی سوچ پڑھنے لگا۔ وہ ڈرائنگ روم میں غزالہ سے باتیں کر رہا تھا۔ بات کوئی سی ہو پہلے وہ دماغ میں آتی ہے پھر زبان تک پہنچتی ہے۔ قاسم کی باتیں اس کی زبان تک پہنچنے سے پہلے ہی میں اس کی سوچ کو سمجھ رہا تھا۔

اس نے غزالہ سے پوچھا۔ "تم ناراض کیوں ہو رہی ہو۔ آخر میری غلطی تو بتاؤ؟"

غزالہ کے جواب کو قاسم کے ذہن نے ریسیو کیا اور اسے میرے دماغ تک منتشر کیا۔ اس کا جواب تھا۔

"تم غلطی نہیں حماقت کر رہے تھے۔ تمہارے تیور بتا رہے تھے کہ تم فرہاد سے خار کھا رہے ہو اگر وہ کلب جانے سے انکار کر دیتا تو آج اس سے ٹکرا مر غا پورے کلب میں نہیں ملتا۔ پتہ نہیں کمبخت کس طرح اتنا دولت مند بن گیا ہے اگر آج تم نے اس کا بینک اکاؤنٹ خالی نہ کیا تو پھر میں تمہارا منہ بھی نہیں دیکھوں گی۔"

"ڈارلنگ! غصہ تھوک دو۔ میری حماقت کے باوجود وہ کھیلنے پر آمادہ ہے تم دیکھتی جاؤ آج میں اسے کنگال بنا دوں گا۔"

"میں جانتی ہوں کہ تم مانے ہوئے شار پر ہو۔ پتے بازی میں تمہارا جواب نہیں ہے لیکن فرہاد کو بھی میں بچپن سے جانتی ہوں۔ کیا تم نے اس کی آنکھیں نہیں دیکھیں؟ وہ بہت گہری نظر رکھتا ہے اگر اس نے تمہاری پتے بازی کو سمجھ لیا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔"

اس کے جواب میں قاسم نے مجھے ایسی شرمناک گالی دی کہ میں تلملا کر رہ گیا۔ بعض اوقات خیال خوانی عذاب بن جاتی ہے۔ دشمن کے دماغ میں چھپی ہوئی گندی سے گندی گالیاں سن کر بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ میں مجبور تھا۔ فوراً ہی گالی کے جواب میں اس کی زبان نہیں کھینچ سکتا تھا۔ ویسے میں نے قسم کھائی کہ اس گالی کا ایسا بدلہ لوں گا کہ وہ ساری زندگی یاد کرے گا۔ اور غزالہ کو تو میں اچھی طرح سمجھ گیا۔ وہ اپنی ماں پر گئی تھی۔ اس کا انجام بھی اس کی ماں کی طرح ہونا چاہیئے تھا لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ خوبصورت ناگن آسانی سے مر جائے۔ اس کی سزا یہ ہونی چاہیئے کہ وہ زندہ رہے اور ہر روز مرنے کی تمنا کرتی رہے۔

بہرحال اس وقت میں نے انتقام لینے کا خیال دماغ سے نکال دیا اور یہ سوچنے لگا کہ ایک شار پر کے ہتھکنڈوں سے مجھے کس طرح بچنا چاہیئے۔ اس وقت کوئی مناسب تدبیر ذہن میں نہیں آئی۔ جب میں کار لے کر اپنی کوٹھی کے احاطے سے باہر آیا تو غزالہ اور قاسم بھی اپنی کوٹھی سے نکل آئے تھے۔ غزالہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ قاسم پچھلی سیٹ پر چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ راستے میں یکے بعد دیگرے دونوں کے خیالات پڑھوں گا لیکن غزالہ میرے کانوں کے قریب ریکارڈ کی طرح بولتی رہی۔ مجھے اتنا موقعہ ہی نہ ملا کہ ان دونوں میں سے کسی کی سوچ کو پکڑ سکتا۔

سینما ہال میں بھی وہ بار بار مجھے متوجہ کرتی رہی۔ جب ہال میں تاریکی چھا گئی اور فلم کا ٹائیٹل شروع ہو گیا تو اسے مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔ وہ میرے اور قاسم کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ نیم تاریکی میں اس نے بڑی محبت سے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے سوچا۔

"اس کم بخت کی طرف آپ ہی آپ دل کھنچا جاتا ہے۔ ٹھیک ہے دل اور چیز ہے، دولت اور چیز ہے۔ میں اسے دل دینے سے پہلے اس کی دولت کا

کروں گی۔ اسے کنگال بناؤں گی۔ اسے اپنا محتاج بنا کر رکھوں گی۔ ممی بہت ہی سمجھ دار تھیں۔ ضرورت مند نوجوانوں کے آگے ان کی ضرورت کے مطابق پیسے پھینکتی تھیں اور انہیں اپنا عاشق بنا کر رکھتی تھیں۔ بس آخری وقت وہ سٹھیا گئی تھیں۔ نہ جانے کس کے لئے اپنی تجوری خالی کر دی تھی۔ اگر کہیں ایک لاکھ پچیس ہزار پر ہاتھ صاف نہ کرتی۔ تو وہ رقم بھی وہ کسی کو دے دیتیں۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ میں ان کی اولاد ہوں اور ان کے روپے میرے کام آ رہے ہیں۔"

وہ ایک لاکھ پچیس ہزار کے متعلق سوچ رہی تھی۔ میرے روپے چرانے والی میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً ہی اس کی اپنی سوچ میں کہا۔

"اب میں اپنے بینک بیلنس کا حساب کروں گی۔"

اس نے چونک کر سوچا۔ "آں۔ یہ کوئی حساب کرنے کی جگہ ہے ابھی مجھے فلم دیکھنی چاہیئے۔"

ہر انسان کے دماغ میں دو طرح کی سوچیں ہوتی ہیں۔ مثبت اور منفی۔ میں غزالہ بن کر اس کی منفی سوچ میں کہہ رہا تھا۔

"دولت کے سامنے فلم کی کیا اہمیت ہے۔ فلم تو پھر بھی دیکھی جا سکتی ہے مجھے یہ سوچنا چاہیئے کہ آج کے گیم میں اگر فرہاد کا پلڑہ بھاری رہا تو مجھے کتنی رقم تک کھیلنا چاہیئے۔ قاسم کے پاس کیا ہے؟ وہ کتنی رقم لگا سکتا ہے؟"

"وہ کیا خاک رقم لگائے گا۔" غزالہ کی سوچ نے کہا۔ "میں بھی کیسی بے تکی باتیں سوچ رہی ہوں۔ اس کے کھیل میں بھی میں ہی رقم لگاتی ہوں۔ اب تک وہ جیت میں رہا ہے۔ جیتنے کے بعد میں اس کی ضرورت کے مطابق جیب خرچ کے لئے ہزار دو ہزار دے دیتی ہوں کبھی اپنی جوانی سے بہلا دیتی ہوں۔ بیچاری ممی مجھے بہت اچھا فارمولا بتا گئی ہیں۔ اپنے کام کے آدمیوں کو اسی طرح احمق بنا کر رکھنا چاہیئے......"

وہ سوچتے سوچتے فلم کی طرف متوجہ ہونا چاہتی تھی۔ میں نے پھر اس کی منفی سوچ میں فلم سے اس کی توجہ ہٹا دی۔ کئی بار میں نے اس کے ننگے کردار کو اس کی سوچ میں دیکھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ قاسم کا پنڈی میں کوئی کاروبار نہیں ہے اس کا ذریعہ معاش یہی تاش کا کھیل ہے۔ پہلے بڑی بڑی رقمیں جیت لیا کرتا تھا اور تمام روپے عیاشی میں اڑا دیتا تھا۔ پھر پنڈی کے دولت مند جواری سمجھ گئے کہ وہ زبردست شار پر ہے۔ اس لئے وہاں کے لوگوں نے اس سے کھیلنا چھوڑ دیا۔ یہاں کی آمدنی کا ذریعہ ختم ہو گیا۔ ان ہی دنوں غزالہ سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ غزالہ نے جوانی کے قمار خانے میں اداؤں کی ترپ چال چلی اور کوئی رقم لگائے بغیر اسے جیت لیا۔ اب وہ اس کا اسیر تھا۔ اس کی اداؤں سے بہل جاتا تھا اور وہ جو جیب خرچ اسے دیتی تھی۔ اس سے مطمئن ہو جاتا تھا۔

فلم کے اختتام تک میں نے بہت کچھ معلوم کر لیا۔ وہاں سے ہم سیدھے شبانہ کلب پہنچے۔ کسی شاندار نائٹ کلب میں جانے کا وہ میرا پہلا موقعہ تھا۔ غزالہ نے مجھے بتایا کہ وہاں صرف کروڑپتی آتے ہیں۔ لاکھوں روپے جیت جانا یا ہار جانا ان کے لئے ایسا ہی تھا جیسے دس بیس روپے کہیں پھینک آئے ہوں۔ اس کلب کے گراؤنڈ فلور پر بار اور ریسٹورنٹ تھا۔ وہاں ہم نے رات کا کھانا کھایا۔ قاسم

اور غزالہ نے کھانے سے پہلے اسکاچ وہسکی کے کئی پیگ پیئے۔ مجھ سے بھی پینے کے لئے کہا گیا۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔ ان سے صاف کہہ دیا کہ میں نے پہلے کبھی شراب نہیں چکھی۔ اگر مجھے نشہ ہو گیا تو میں فلیش نہیں کھیلوں گا۔

میرا یہ عذر کام آ گیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مجھ جیسا تگڑا مرغا ہاتھ سے نکل جاتے اس لئے انہوں نے میرے لئے کافی منگوا دی۔ کھانے کے بعد ہم منیجر کے کمرے میں آئے۔ وہاں غزالہ نے کلب کے قانون کے مطابق میری اور قاسم کے بینک بیلنس کی ضمانت لی۔ پھر میرے لئے قاسم کے لیے اور اپنے لیے بیس بیس ہزار روپے کے ٹوکن لیے۔ وہ پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے گول ٹوکن تھے ان میں سفید ٹوکن دس روپے کے تھے، زرد ٹوکن پچاس روپے، سبز ٹوکن سو روپے، نیلے ٹوکن پانچ سو روپے اور سرخ ٹوکن ایک ہزار روپے کے تھے۔

ایک ملازم نے ٹوکن کی تینوں ٹرے اٹھائی اور کمرے کے پچھلے دروازے سے ہمیں تہہ خانے تک لے گیا۔ وہ زمین کی تہہ میں ایک ایئر کنڈیشنڈ قمار خانہ تھا۔ بڑے سے ہال میں دور دور تک میزیں بچھی ہوئی تھیں کتنی ہی میزوں پر کھیلنے والوں اور ہار کر تماشہ دیکھنے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ہم تینوں ہال کے وسط میں ایک میز کے اطراف بیٹھ گئے۔ ملازم نے ٹوکن کی ایک ایک ٹرے ہمارے سامنے رکھ دی اور ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ وہ ملازم ہماری میز کے لیے مخصوص تھا۔ غزالہ نے اپنے ہینڈ بیگ سے تاش کا نیا پیکٹ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"کون بانٹے گا؟"

قاسم نے سوچا۔ "ابھی دو چار بازیاں فرہاد کو جیتنا چاہیئے اس کے بعد تاش کی گڈی جب بھی میرے ہاتھوں میں آئے گی میں اپنے ہاتھ کا کمال دکھاؤں گا۔"

یہ سوچ کر اس نے میری جانب انگلی اٹھا کر کہا۔

"مسٹر فرہاد! آپ بانٹیے۔ پہلے دو چال بلائنڈ ہوگی اس کے بعد ہم اپنے پتے اٹھا کر دیکھ سکیں گے۔"

میں نے پیکٹ سے تاش کی گڈی نکال کر اس میں سے جوکر علیحدہ کیے اور پتے پھینٹنے لگا۔ قاسم اور غزالہ نے دس دس روپے کے ٹوکن میز پر پھینکے۔ میں بھی دس روپے بڑھا کر پتے بانٹنے لگا۔

اس وقت غزالہ سوچ رہی تھی۔ "میں تیسری چال میں پتے اٹھا کر دیکھوں گی اگر پتے بوگس ہوئے تو ڈراپ کر دوں گی اور اگر پتے بڑے آئے تو میں قاسم کو مخصوص اشارہ کروں گی۔ وہ اپنے پتے ڈراپ کر دے گا۔"

اس کی سوچ بتا رہی تھی کہ وہ دونوں مخصوص اشارات کے ذریعہ یہ سمجھ لیا کریں گے کہ کس کے پاس کون سے پتے ہیں۔ جس کے پاس کمزور پتے ہوں گے وہ کھیل چھوڑ دیا کرے گا۔ جس کے پاس بھاری پتے ہوں گے وہ میری حجامت بناتا رہے گا۔

پہلے قاسم نے پچاس روپے کی اندھی چال چلی۔ میں نے اور غزالہ

نے بھی پچاس پچاس کے ٹوکن دیئے۔ دوسری چال میں بھی وہی پچاس کے ٹوکن آگے بڑھے۔ تیسری چال سے پہلے قاسم نے اپنے پتے اٹھا کر دیکھے۔ جب ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو آنکھیں اس چیز کی تفصیل دماغ تک پہنچاتی ہیں۔ قاسم کی آنکھیں اپنے پتے پڑھ رہی تھیں اور میں اس کے دماغ سے سن رہا تھا

"یکہ، ڈگی اور چھکہ......"

وہ مایوس ہو گیا لیکن بظاہر مسکراتا رہا۔ یہ جتانے کی کوشش کرتا رہا کہ اس کے پاس اونچے پتے ہیں۔ ایک چالاک کھلاڑی صرف ایک بڑا پتا رکھ کر ایسے بلف دیتا ہے کہ اس کے سامنے دوسرے کھیلنے والے اپنے بڑے سے بڑے پتے چھوڑ دیتے ہیں۔ قاسم نے بھی یہی کیا۔ مجھے فریب دینے کے لیے دو سو کی چال چلی۔ میں غزالہ کی طرف متوجہ ہو گیا کیونکہ اب وہ اپنے پتے دیکھ رہی تھی۔

"بادشاہ۔ بیگم اور غلام....." غزالہ کی سوچ نے بتایا کہ اس کے پاس رن کے بڑے پتے ہیں۔ اس نے پتوں کو میز پر رکھ کر تین سو کے ٹوکن آگے بڑھا دیئے۔ پھر اپنی رسٹ واچ کو دیکھنے لگی۔

کلائی کی گھڑی کو دیکھتے وقت وہ سوچ رہی تھی "قاسم نے یہی بتایا تھا۔ گھڑی دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ میرے پاس بڑا رن ہے۔"

میں نے فوراً ہی قاسم کی سوچ کو پڑھا، وہ سوچ رہا تھا "غزالہ اپنی رسٹ واچ دیکھ رہی ہے یعنی اس کے پاس بڑا رن ہے لیکن اس نے صرف تین سو کی چال کیوں چلی؟ بہر حال میں اس کی چال بڑھاؤں گا۔"

یہ سوچ کر اس نے میری جانب دیکھا۔ میں اپنے پتے اٹھا کر دیکھنے لگا۔ میرے پاس دو ستے اور ایک تگی تھی۔ اب پوزیشن یہ تھی کہ وہ دونوں میرے پتے نہیں جانتے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کے پاس کیا ہے۔ قاسم مجھ سے ہار جاتا۔ لیکن غزالہ مجھ سے جیتنے والی تھی۔ دانشمندی تو یہ تھی کہ میں اپنی چال بند کر دیتا اور ان دونوں کو آپس میں کھیلنے دیتا لیکن میں نے بھی بلف چال چلی اور پانچ سو کا ایک ٹوکن آگے بڑھا دیا۔

قاسم نے اپنے پتے گڈی میں واپس رکھ دیئے اور سامنے رکھا ہوا لینا لائٹر اٹھا لیا۔ وہ میدان چھوڑ گیا تھا۔ اب غزالہ کی چال تھی، وہ سوچ رہی تھی "قاسم نے دائیں ہاتھ سے لائٹر اٹھایا ہے، اس کا مطلب ہے مجھے چال بڑھانی چاہیئے۔ جب تک وہ ہاتھ سے لائٹر نہیں چھوڑے گا، مجھے میدان نہیں چھوڑنا چاہیئے۔"

یہ سوچ کر اس نے سات سو کی چال چلی۔ میں چال چلنے سے پہلے بظاہر ہچکچانے لگا۔ پھر میں نے بھی ذرا رک کر سات سو کے ٹوکن بڑھا دیئے۔ قاسم سگریٹ سلگا رہا تھا۔ لائٹر بدستور اس کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ غزالہ کی حوصلہ افزائی ہو رہی تھی۔ اس نے ایک ہزار کا سرخ ٹوکن بڑھا دیا۔

قاسم نے مجھ سے کہا "فرہاد صاحب! مقابلے پر ایک عورت ہے اور آپ چال چلنے سے گھبرا رہے ہیں۔ بھئی یہ تو مردوں کی توہین ہے۔ غزالہ نے اگر ایک ہزار کی چال چلی ہے تو آپ کو دو ہزار کی چال چلنا چاہیئے۔"

وہ مجھے تاؤ دلا رہا تھا۔ میں نے غزالہ کو میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا

"غزالہ! میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تاش کی بازی ہار کر تمھیں جیتنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا میں تمھاری خاطر بڑی سے بڑی چال چلوں گا۔"

یہ کہہ کر میں نے ایک ہزار کے دو سرخ ٹوکن آگے بڑھا دیئے اور قاسم کی تائید میں کہا۔

"قاسم صاحب درست کہتے ہیں۔ مرد کو عورت سے پیچھے نہیں رہنا چاہیئے۔ اب میں تمھارے ساتھ ساتھ چلوں گا۔"

"یہ بات ہے؟" غزالہ نے مسکرا کر پوچھا "کیا تم میرے ساتھ چل سکو گے؟ اچھا میں بھی دیکھوں۔ یہ لو پانچ ہزار کی چال ہے۔ دیکھو مرد کی زبان ایک ہوتی ہے، میدان نہ چھوڑنا۔"

میں نے حساب لگایا۔ اس وقت میرے سامنے قاسم کے تین سو دس روپے اور غزالہ کے سات ہزار ایک سو دس روپے پڑے ہوتے تھے۔ میں نے یکبارگی ہزار روپے کے پندرہ ٹوکن بڑھا دیئے یعنی ان کی توقع کے خلاف پندرہ ہزار کی چال دی۔

وہ دونوں ہی بوکھلا کر مجھے دیکھنے لگے۔

غزالہ کی سوچ نے کہا "یہ کمبخت اب تک دھوکہ دیتا رہا۔ اس کے پاس یقیناً مجھ سے بڑے پتے ہیں۔"

قاسم سوچ رہا تھا "کیا یہ پندرہ ہزار کی دھونس جما رہا ہے۔ پتہ نہیں یہ بلف ہے یا واقعی بڑے پتے لے کر بیٹھا ہے۔ اگر غزالہ شو کرنے کے لیے کہے گی تو اسے تیس ہزار دینے پڑیں گے۔ پہلی ہی بازی میں تیس ہزار کا رسک لینا دانشمندی نہیں ہے۔ غزالہ کو میدان چھوڑ دینا چاہیئے....."

یہ سوچ کر اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے لائٹر کو میز پر چھوڑ دیا۔ غزالہ سمجھ گئی کہ اسے یہ بازی میرے حوالے کر دینی چاہیئے۔ اتنے بڑے پتے رکھ کر ہارتے ہوئے اسے دکھ پہنچ رہا تھا لیکن وہ بھی تیس ہزار دے کر شو نہیں کرانا چاہتی تھی۔ اس نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم نے میرا ساتھ دینے کے لیے کہا تھا لیکن اتنا آگے نکل گئے کہ میں تمھارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ کوئی بات نہیں، دوسری بازی میں دیکھا جائے گا۔ کوئٹ....."

اس نے اپنے پتے گڈی میں رکھ دیئے۔ میں جیتی ہوئی رقم کے تمام ٹوکن سمیٹ کر اپنی ٹرے میں رکھنے لگا۔ غزالہ نے بڑی محبت سے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے شو نہیں کرایا۔ اب تو تم جیت ہی گئے ہو۔ کیا اپنے پتے نہیں دکھاؤ گے؟"

"پتے دکھانا اصول کے خلاف ہے۔" میں نے کہا "لیکن تم اتنی محبت سے کہہ رہی ہو اس لیے میں انکار نہیں کروں گا۔ یہ دیکھو۔"

میں نے اپنے پتے الٹ دیئے۔ میرے پاس دو ستے دیکھ کر اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ میں نے اسے الو بنایا ہے۔ پھر اس نے گھور کر قاسم کو دیکھا کیونکہ اسی کے مشورے پر اس نے میدان چھوڑ دیا تھا۔ اگر وہ شو کراتی تو پہلی ہی بازی میں مجھ سے اٹھارہ ہزار روپے جیت کر لے جاتی۔

قاسم نے اپنی صفائی پیش کی "غزالہ! دراصل ہر شخص کے کھیلنے کا انداز جدا ہوتا ہے۔ ہم میں سے کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فرہاد صاحب ستے کے پیئر پر پندرہ ہزار کی چال چل سکتے ہیں۔ بہر حال یہ تو پہلی بازی تھی انشاءاللہ دوسری بازی تم جیت لو گی۔"

میں نے پتے پھینٹ کر پھر تین تین پتے تقسیم کیے۔ اس بار قاسم کا پلہ بھاری تھا۔ میرے پاس پہلے سے بھی کمزور پتے آئے تھے۔ غزالہ نے تین چالوں کے بعد اپنے پتے گڈی میں رکھ دیئے۔ قاسم محتاط ہو کر چال بڑھا رہا تھا وہ میرے پتوں کو نہیں جانتا تھا لہٰذا اس الجھن میں تھا کہ میں بڑے پتے لے کر کھیل رہا ہوں یا پہلے کی طرح چھوٹے پتوں سے بڑی رقم کی دھونس جما رہا ہوں۔

جب دوسری بازی تین ہزار کی رقم تک پہنچ گئی تو اس نے شو کرنے کے لیے کہا۔ میرے پاس تھا ہی کیا؟ وہ تین ہزار جیت کر لے گیا۔ اس بار تاش کی گڈی اس کے ہاتھوں میں گئی۔ اب اسے پتے بازی کا موقع مل رہا تھا اور میں اس کی سوچ کو توجہ سے پڑھ رہا تھا۔

پچھلی دو بازیوں میں انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ میں چھوٹے سے چھوٹے پتوں پر بھی بڑی سے بڑی رقم لگا دیتا ہوں۔ قاسم کو یقین تھا کہ وہ میری اس حماقت سے فائدہ اٹھا سکے گا۔ اس وقت وہ میز پر سے پتے سمیٹتے وقت تین یکے گڈی کے نیچے رکھ رہا تھا۔ جو کچھ وہ کر رہا تھا وہ اس کے دماغ سے میں سن رہا تھا۔ ایک شارپر کے پتے بانٹنے کا کمال یہ ہوتا ہے کہ گڈی کے اوپر والے پتے وہ دوسرے کھلاڑیوں کو دیتا ہے اور گڈی کے نیچے رکھے ہوئے پتے اپنے آگے ڈالتا ہے۔ یہ کام اتنی پھرتی اور مشاقی سے ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں اس کی مکاریوں کو نہیں دیکھ سکتیں۔ اس وقت بھی وہ پتے پھینٹ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ تین یکے گڈی کے کس حصے میں جا رہے ہیں۔ کبھی اوپر کبھی نیچے۔ جب پتے بانٹنے کا وقت آیا تو تین یکے گڈی کے نیچے تھے۔

اب پتے بانٹنے کے دوران اس کا دماغ اس کی راہنمائی کرتا۔ غزالہ کی طرف اور میری طرف پتے پھینکتے وقت اس کا ذہن کہتا "اوپر۔ اوپر" اور اوپر کے پتے ہمارے پاس آتے۔ اپنی طرف پتا پھینکتے وقت اس کا ذہن کہتا "نیچے!" اور انگلیوں کی فنکارانہ جنبش سے نیچے کا ایک پتا اس کے سامنے آجاتا۔

میں نے جان بوجھ کر اس کے ہاتھوں کی طرف نہیں دیکھا۔ انجان بن کر سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکالنے لگا لیکن میں نے اپنی سوچ کو قاسم کے دماغ میں بٹھا دیا تھا۔ وہ پتے بانٹ رہا تھا اور میں اس کی مثبت سوچ میں منفی سوچ بن کر حائل ہو رہا تھا جب وہ میری طرف پتے پھینکتا تو میں اس کے ذہن پر حاوی ہو کر کہتا "نیچے!" اور اس کی انگلیاں گڑبڑا جاتیں نیچے کا پتا میرے پاس گر جاتا۔ بانٹنے کے دوران وہ کئی بار ٹھٹھک گیا۔ میں نے اس کی منفی سوچ میں فوراً ہی سمجھایا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تو ٹھیک ہی بانٹ رہا ہوں بس یونہی ذرا دھیان بٹ گیا تھا لیکن انگلیاں تو پتے بازی کی عادی ہیں۔ ان انگلیوں سے غلطی نہیں ہو سکتی۔ پتے ٹھیک ہی گر رہے ہیں۔ ویسے میں دو تین چالوں کے بعد اپنے پتے اٹھا کر دیکھوں گا۔"

اس نے مطمئن ہو کر گڈی ایک طرف رکھ دی۔ ہم تینوں سو روپے تک بلائنڈ چلتے رہے۔ اس کے بعد غزالہ نے اپنے پتے اٹھا کر دیکھے۔ اس کے ذہن نے بتلایا کہ اس کے پاس یکہ، نہلا اور دہلا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ قاسم نے پتے بازی کی ہے۔ یقیناً قاسم ہی یہ بازی جیتے گا۔ لہٰذا مجھے شہ دینے کے لیے اس نے تین سو کی چال دی۔ اس کے بعد میں نے اپنے پتے اٹھا کر دیکھے۔ میرے پاس کلر کے ساتھ یکہ، دُگی اور تگی تھی۔ میں نے دو تین ملنے پر چھ سو کی چال دی۔ آخر میں قاسم نے اپنے پتے اٹھا کر دیکھے۔ اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔

"میرے پاس تین یکے آنے چاہیئے تھے مگر یہ تو یکہ، بادشاہ اور بیگم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بانٹنے کے دوران گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ایک یکہ میرے پاس ہے اور دو یکے فرہاد کے پاس گئے ہیں۔ ہاں اس کے پاس یکے کا پیئر ہے۔ اسی لیے اس نے چھ سو کی چال دی ہے۔ کوئی بات نہیں، اس وقت بھی میرے پاس سب سے بڑا رن ہے۔ اس الو کے پٹھے نے ستے کے پیئر پر پندرہ ہزار کی چال چلی تھی۔ اب تو اس کے پاس یکے کا جوڑا ہے۔ یہ بڑی سے بڑی چال چلے گا۔"

یہ سوچ کر اس نے ایک دم سے ایک ہزار کی چال دی۔ اسے یقین تھا کہ مجھ جیسا احمق چھوٹے پتے پر بھی اس کی بڑی چال کا جواب بڑی چال سے دے گا لیکن ابھی غزالہ کی باری تھی۔ وہ سوچ رہی تھی "میں قاسم کو کیسے بتاؤں کہ میرے پاس ایک یکہ ہے کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ فرہاد کے پاس یکے کا جوڑا ہے میں اسے کیسے بتاؤں؟ قاسم نے مجھے یہ نہیں بتلایا کہ میرے پاس تنہا یکہ ہو تو اس کا مخصوص اشارہ کیا ہو گا لیکن میں ایسا کیوں سوچ رہی ہوں؟ مجھے قاسم پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ وہ بہت بڑا شارپر ہے۔ اس نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی ہماری طرف یکے پھینکے ہیں اور اپنی طرف سب سے بڑے پتے رکھے ہوں گے۔"

میں نے غزالہ کو ٹوکا "کیا سوچ رہی ہو غزالہ! چال چلو!"

وہ چونک کر مسکرانے لگی۔ پھر اس نے بھی ایک ہزار کی چال دی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ہار جائے گی اور یہ بھی جانتی تھی کہ وہ جتنی رقم ہارے گی۔ وہ سب قاسم کی جیتی ہوئی رقم سمیت وصول کر لے گی۔

میں نے بھی ایک ہزار کا ٹوکن آگے بڑھا دیا۔ قاسم نے کہا۔

"بھئی، ہم کب تک اس طرح لنگڑاتے چلیں گے۔ چال کی رقم بڑھنی چاہیئے۔"

میں نے جواب دیا "آپ رقم بڑھائیں۔ میں بھی بڑھاؤں گا۔"

اس نے دو ہزار کی چال دی۔ اس کے جواب میں غزالہ نے تین ہزار کے ٹوکن بڑھائے۔ میں نے پندرہ ہزار کے سرخ ٹوکن گنتے ہوئے کہا۔

"یہ پندرہ عدد سرخ ٹوکن میرے لیے لکی ہیں۔ مجھے گرتے دیکھ کر سنبھال دیتے ہیں۔"

پندرہ ہزار کی چال دیکھ کر قاسم نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"میں غزالہ نہیں ہوں کہ بلف میں آجاؤں۔ یہ لیجیے میری طرف سے

لیکن آئندہ چال چلنے کے لیے ہمارے پاس بہت کم ٹوکن رہ گئے ہیں۔"

غزالہ نے میدان چھوڑ دیا۔ وہ اپنے پتے گڈی میں رکھتے ہوئے بولی۔

"تم دونوں ان ہی ٹوکنوں سے کھیل سکتے ہو۔ جتنے سفید ٹوکن یہاں موجود ہیں انھیں فرض کر لو کہ ان میں سے ہر سفید ٹوکن پانچ ہزار روپے کا ہے۔"

وہ مشورے دینے لگی کہ ہم کس طرح ان ہی ٹوکنوں سے کھیل آگے بڑھا سکتے ہیں۔ اسی وقت قیصر ہماری میز کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ وہی قیصر تھا جو چھ سال پہلے غزالہ کا بوائے فرینڈ تھا اور جس کی میں نے اچھی طرح پٹائی کی تھی۔

وہ مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے بعد غزالہ سے مسکرا کر بولا۔

"ہیلو غزالہ! بہت دنوں بعد نظر آئی ہو۔"

غزالہ نے جواباً مسکرا کر کہا۔ "آؤ بیٹھو۔ ان سے ملو، یہ قاسم کرمانی ہیں۔"

قیصر نے قاسم سے مصافحہ کیا۔ اس کے بعد غزالہ نے میرا تعارف کرایا۔

"قیصر تم انھیں تو پہچانتے ہوں گے۔ یہ میرے کزن فرہاد علی ہیں۔ یاد ہے ایک دن تم دونوں میں جھگڑا بھی ہو گیا تھا۔"

قیصر نے ناگواری سے کہا۔ "مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ جھگڑا ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ بہت جلد اس کا عبرتناک انجام سامنے آئے گا۔ تم دیکھو گی کہ مجھ سے ٹکرانے والے کا حشر کیا ہوتا ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں۔ ابھی میں ٹکرانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ ہاں تو قاسم صاحب! اب میری چال ہے یہ سمجھیے، یہ پچیس ہزار کی چال.....!"

غزالہ اور قاسم ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ اس وقت دونوں کی سوچ بدل گئی تھی۔ پچیس ہزار کی چال دیکھ کر وہ کھٹک گئے تھے کہ میرے پاس بڑے پتے ہیں۔ قاسم ذہنی طور پر الجھ گیا تھا کیونکہ اب تک میں دو بار چھوٹے پتوں پر بڑی رقم لگا چکا تھا۔ وہ کبھی سوچ رہا تھا کہ میں پہلے کی طرح بلف چال چل رہا ہوں، اور کبھی سوچ رہا تھا کہ واقعی میں بڑے پتے لے کر چال بڑھا رہا ہوں۔

قاسم کو سوچتے دیکھ کر میں نے کہا۔ "چال چلیے قاسم صاحب!"

"آں.....!" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر غزالہ سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ میں شو کرواؤں۔"

غزالہ نے سوچا۔ "قاسم اپنے ہاتھوں سے پتے بانٹنے کے بعد بھی نروس نظر آ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے پتے بازی میں ناکام ہوا ہے۔ اگر ایسا ہے تو شو کروانے کی کیا ضرورت ہے۔ فرہاد پچیس ہزار کی چال چل چکا ہے۔ اب شو کے لیے ہمیں پچاس ہزار دینے پڑیں گے۔"

وہ سوچ رہی تھی۔ قیصر نے کہا۔ "بڑی ہائی اسٹیکنگ ہو رہی ہے۔ شو کروانے کا مطلب یہ ہے کہ پچاس ہزار دینے پڑیں گے۔"

قاسم نے کہا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ فرہاد صاحب برابر چھوٹے پتوں پر رسک لیتے چلے آ رہے ہیں۔"

"لیکن تم پچاس ہزار کا رسک نہ لو۔" غزالہ نے کہا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟" قیصر نے قاسم کی حمایت کی۔ "اگر قاسم صاحب مجھے اپنے پتے دکھا دیں تو میں صحیح مشورہ دوں گا۔"

قاسم نے اپنے پتے قیصر کو دکھا دیے۔ انھیں دیکھ کر قیصر نے کہا۔

"بہت شاندار پتے ہیں۔ آپ کو پچاس ہزار دے کر شو کروانا چاہیے۔ آپ کے پاس اتنی رقم نہ ہو تو پچیس ہزار مجھ سے لیجیے۔ شرط یہ ہے کہ اگر آپ جیت جائیں تو میں دس ہزار منافع لوں گا۔"

غزالہ نے جلدی سے کہا۔ "منظور ہے قیصر! چلو پچیس ہزار کا چیک لکھ دو۔"

وہ جیب سے چیک بک نکال کر لکھنے لگا۔ میں نے سوچا چلو قیصر ہے۔ ایک اور دشمن کی جیب سے پچیس ہزار نکل رہے ہیں۔ غزالہ اور پھر قاسم نے قیصر کا چیک اور پچیس ہزار کے ٹوکن بڑھا کر کہا۔

"شو...!"

میں نے اپنے ایک پتے کو سیدھا کیا، پھر دوسرے کو اور پھر تیسرے کو سیدھا کیا تو قاسم، قیصر اور غزالہ تینوں کے چہروں کا رنگ اڑ گیا۔ اس وقت تینوں کے دماغ سے میرے لیے گالیاں نکل رہی تھیں۔ غزالہ اس وقت قاسم کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھی جیسے اپنے پتے بازی پر نازاں تھا۔ قیصر کے پچیس ہزار میری جیب میں آ رہے تھے۔ اس بات پر وہ جھنجلا رہا تھا اور قسم کھا رہا تھا کہ مجھ سے اپنی رقم وصول کر کے رہے گا۔

میں ان سب سے بے نیاز ہو کر جیتے ہوئے تمام ٹوکنوں کو گن رہا تھا۔ میں نے تین گھنٹے کے کھیل میں تقریباً ۸۰ ہزار روپے جیت لیے تھے۔ غزالہ سوچ رہی تھی کہ یہ تمام رقم اس کے اکاؤنٹ سے جائے گی۔ اس میں سے صرف پچیس ہزار قیصر نے دیے تھے۔ جب ہم منیجر کے کمرے کی طرف جانے لگے تو غزالہ اور قیصر پیچھے رہ گئے۔ میں قاسم کے ساتھ منیجر کے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہاں سے میں نے قمار خانے میں بیٹھی ہوئی غزالہ کے خیالات پڑھے۔ وہ قیصر سے کہہ رہی تھی۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں نے فرہاد کی خاطر تم سے منہ نہیں موڑا تھا۔ جس دن اس سے تمہارا جھگڑا ہوا تھا اسی رات میں نے ڈیڈی سے کہہ کر اسے کوٹھی سے نکلوا دیا تھا۔ پتہ نہیں یہ کمبخت اتنا دولت مند کیسے بن گیا۔ میں نے اس کے بینک بیلنس پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ قاسم ایک اچھا شکار ہے لیکن اسے بھی نہ جانے آج کیا ہو گیا ہے۔ اس کی غلطی کی وجہ سے میں اپنا آدھا بینک بیلنس ہار چکی ہوں۔ اب تم یہاں طعنے دینے آئے کہ میں تم سے بے رخی برت رہی ہوں۔ بائی گاڈ آج بھی میرے دل میں تمہارے لیے دبی جگہ ہے مگر تم مردوں کی یہ عادت بڑی خراب ہے۔ رقابت کی وجہ سے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگتے ہو۔ دیکھو قیصر اگر تم فرہاد کو مار ڈالنا چاہو گے تو ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اسے زندہ رہنا چاہیے۔ ہم اس سے دوستی کر کے اس کا دیوالیہ نکال سکتے ہیں۔"

قیصر کا جواب سنائی دیا۔ "اچھی بات ہے مگر تم اسے لوٹنا چاہتی ہو

تو میں تمہاری خاطر فی الحال اسے معاف کر دیتا ہوں۔ اگر تم ناکام ہو جاؤ تو مجھے بتا دینا۔ میں اسے ایسی جگہ گھیر کر ماروں گا جہاں اسے پانی بھی نہیں ملے گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

اس کے جاتے ہی غزالہ نے سوچا۔ "میرے بھی کتنے چاہنے والے ہیں۔ یہ قیصر آج بھی میرا دیوانہ ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس نے اپنی دولت سے متاثر کرنے اور میرا دل جیتنے کے لیے پچیس ہزار داؤ پر لگائے تھے۔ مجھے اس سے دوستی قائم رکھنی چاہیے۔ ایسے احمق عاشق برے وقت پر بڑے کام آتے ہیں۔ ویسے اب مجھے فرہاد کے متعلق سوچنا چاہیے۔ آج وہ مجھ سے بہت بڑی رقم لے جائے گا۔ میں تاش کی بازی نہ جیت سکی لیکن محبت کی بازی جیت کر اس سے اپنی رقم واپس لے لوں گی۔"

سوچنے کے دوران غزالہ کے دماغ نے کہا کہ اب اسے منیجر کے کمرے میں جا کر فرہاد کی جیتی ہوئی رقم کا چیک لکھ دینا چاہیے۔ وہ سوچتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ وہاں اس نے بڑی فراخدلی سے چیک لکھ دیا۔ منیجر نے مجھے یقین دلایا کہ دوسرے دن ایک بجے تک مجھے میری جیتی ہوئی رقم مل جائے گی۔ اس کے بعد ہم ہنستے بولتے کلب کی عمارت سے باہر آ گئے۔ جب میں پارکنگ ایریے سے کار لانے کے لیے گیا تو غزالہ قاسم کے ساتھ ایک طرف کھڑی رہی اور اس سے آہستہ آہستہ کہتی رہی۔ "قاسم تم راستے میں کہیں کار سے یہ کہہ کر اتر جانا کہ تم اپنے ایک انکل کے ہاں جا رہے ہو، اور ہم سے کل صبح ملاقات کرو گے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ پھر میں رات کہاں گزاروں گا؟" قاسم نے پوچھا۔

"کسی ہوٹل میں رات گزار لینا۔ مجھ سے زیادہ بحث نہ کرو۔ فرہاد کار لے کر آ رہا ہے۔ جو رقم وہ مجھ سے جیت کر لے جا رہا ہے اسے میں کسی طرح واپس لوں گی۔ آج تم نے مجھے بہت زبردست نقصان پہنچایا ہے۔"

"آج میں اتفاق سے ہار گیا۔ دوسری بار کھیلوں گا تو اس سے دوگنی رقم جیت کر دکھاؤں گا۔"

"میں تاش کی بازی کے بغیر ہی اس سے دوگنی رقم وصول کر لوں گی۔ لہٰذا فی الحال میں جو کہتی ہوں تم وہی کرو۔"

اتنے میں، میں کار ڈرائیو کرتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گیا۔ وہ دونوں چپ ہو گئے۔ غزالہ مسکراتی ہوئی میرے پاس اگلی سیٹ پر آ گئی۔ قاسم پچھلی سیٹ پر چلا گیا۔ میں نے کار آگے بڑھا دی۔ غزالہ نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تم نے بہت ہی شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا ہے لیکن کھیلنے سے پہلے خود کو اناڑی کہہ رہے تھے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں واقعی اناڑی ہوں۔ آج تو تقدیر مہربان تھی، اس لیے جیت کر جا رہا ہوں۔ ویسے ہار قاسم صاحب کی ہوئی تھی اور چیک تم نے لکھ کر دیا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

قاسم نے جواب دیا۔ "میرا اکاؤنٹ پنڈی کے بینکوں میں ہے۔ یہ کلب والے وہاں کا چیک قبول نہیں کرتے ہیں۔ میں کل صبح غزالہ کو اٹھتر ہزار کا چیک دے دوں گا۔"

وہ خود کو بے انتہا دولت مند ظاہر کر رہا تھا۔ میں مسکرا کر سن رہا تھا۔ مال روڈ پر پہنچ کر اس نے گاڑی رکنے کے لیے کہا۔ میں نے گاڑی روک دی۔ وہ غزالہ کی ہدایت کے مطابق یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ اپنے انکل کے ہاں رات گزارے گا۔ اس کے جاتے ہی جب میں نے دوبارہ کار اسٹارٹ کی تو غزالہ نے ناگواری سے کہا۔

"میں تو قاسم کو اپنا مہمان بنا کر پچھتا رہی ہوں۔ پتہ نہیں پنڈی میں اس کا بینک بیلنس کتنا ہے۔ اگر وہ ٹٹ پونجیا ثابت ہوا اور میری ہاری ہوئی رقم مجھے واپس نہ ملی تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ ہار کر بھی جیتے گا۔ وہ ساری رقم میں تم سے ہار جاؤں گی۔ تم سوچو کہ یہ کیسی بات ہے۔ وہ کھیلتا رہا اور میں ہارتی رہی۔ بہرحال مجھے اس بات کا دکھ نہیں ہے کہ میری اتنی بڑی رقم تمہارے پاس چلی گئی ہے۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ تمہارے لیے ہے۔ میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے یہی سوچ رہی ہوں کہ میں تمہارے لیے بنائی گئی ہوں۔"

اس نے ذرا قریب آ کر میرے شانے پر سر رکھ دیا۔ اس کی قربت سے مجھے پانچ چھ سال پہلے کی وہ رات یاد آ جاتی تھی جب

اس نے مجھ جیسے بے گناہ کو کیسے بدنام کیا تھا۔ ایک پہلو سے وہ قابل نفرت تھی، اس وقت بھی کار کی محدود فضا میں وہ اپنی قربت کی آنچ دے رہی تھی۔ اس کے لباس سے ایوننگ ان پیرس کی دھیمی دھیمی خوشبو اٹھ رہی تھی اور وہ مہک بتا رہی تھی کہ وہ مجھ پر شبابی خوشبوؤں کے خزانے لٹانے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔

میں بھی اس کی حسب منشا رومانی انداز میں گفتگو کرتا رہا اور اسے یقین دلاتا رہا کہ میں اس پر ہزار جان سے عاشق ہو چکا ہوں۔ جب ہم کوٹھی میں آئے تو رات کے دو بج رہے تھے۔ شاہینہ، چچا جان اور غزالہ کے ماموں اپنے اپنے کمروں میں سو رہے تھے۔ غزالہ میرے بازو میں اپنا بازو ڈالے جوانی کے نشے میں لڑکھڑاتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں آئی۔ اس نے مجھے ایک ایزی چیئر پر بیٹھنے کے لیے کہا اور لباس بدلنے کے لیے باتھ روم میں چلی گئی۔

میں نے ذرا دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ سب سے پہلے میں نے چچا جان کے خوابیدہ ذہن کو پڑھا پھر گہری نیند میں سونے والی شاہینہ کے دماغ میں جھانکا۔ اس کے بعد ماموں جان کے بھی خوابیدہ دماغ کو پڑھا اور ان تینوں کے ذہنوں میں یہ خیال قائم کر دیا کہ وہ صبح پانچ بجے سے پہلے بیدار نہیں ہوں گے۔

کچھ دیر بعد غ... باتھ روم سے باہر آ گئی۔ اس نے قاتلانہ انداز میں مسکرا کر مجھے دیکھا۔ سنگھار میز کے پاس بل کھاتی ہوئی گئی اور اپنے ریشمی وجود پر شینل کی خوشبو اسپرے کرنے لگی۔ سنگھار میز کے سہ طرفہ آئینوں میں وہ تین مختلف زاویوں سے نظر آ رہی تھی۔ ہر زاویے سے بجلی کی چاندنی پھوٹ

رہی تھی اور اس پر ریشم لہرا رہا تھا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر سوئچ بورڈ کے پاس آیا۔ ایسے وقت تیز روشنی بُری لگتی ہے۔ میں نے قمقمے بجھا دیئے، اور زیرو پاور کا بلب روشن کر دیا۔ خوابگاہ میں نیلی خواب آور روشنی دھیرے دھیرے انگڑائیاں لینے لگی۔ وہ شرمانے کی ادائیں دکھاتی ہوئی آہستہ آہستہ میری طرف آنے لگی۔ شرم و حیا تو اسے چھو کر نہیں گزری تھی۔ لیکن ایسے وقت ایک فاحشہ بھی ذرا شرما کر یہ جتلانے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ پہلی بار کسی مرد کی تنہائی میں آئی ہے۔

میں نے آہستگی سے کہا۔

"غزالہ! مجھے برسوں پہلے کی ایک رات یاد آرہی ہے۔ یہی خوابگاہ تھی ایسی ہی ہلکی نیلی جذبات انگیز روشنی میں تم اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھیں، اور مجھے دعوتِ گناہ دے رہی تھیں۔ اُس رات میں احمق تھا، تمھاری دعوت کو ٹھکرا کر چلا گیا تھا۔ اب مجھے عقل آگئی ہے۔ آج اُس رات کے افسانے کو میں تکمیل تک پہنچاؤں گا۔ افسانے کی ابتدا اس طرح ہو گی کہ میں ابھی خوابگاہ سے باہر جاتا ہوں، تم اُس رات کی طرح اپنے بستر پر لیٹ جاؤ۔ میں دستک دے کر آؤں گا اور تم حسبِ عادت دعوتِ گناہ دو گی۔۔۔۔"

یہ کہہ کر میں اس کا جواب سنے بغیر خوابگاہ سے باہر آگیا اور بند دروازے کے باہر کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن میں اس کی سوچ کے ذریعہ دماغ کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ فوراً ہی بستر پر لیٹ گئی تھی۔ اب میری نمائش کا وقت آگیا تھا۔ میں نے چند لمحات میں فیصلہ کیا کہ ایک ناگن کی دوستی مجھے تباہیوں کی پستی میں لے جائے گی۔ اگرچہ میرے پاس خیال خوانی کا علم تھا اس کے باوجود میں زیادہ خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ناگن پھر ناگن ہوتی ہے۔ کسی وقت بھی میری لاعلمی میں مجھے ڈس سکتی ہے۔

میں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے اس کی آواز آئی "آجاؤ"۔ میں دروازہ کھول کر خواب گاہ میں آیا۔ بستر کی نیلی چادر پر گلابی گلابی سا بدن پھول کی پنکھڑیوں کی طرح کھل رہا تھا۔ وہ میری جانب خمار آلود نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ خاموش نگاہوں سے مجھے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

"بے شک تم اتنی حسین ہو کہ مرد کی نگاہوں کو للچا دیتی ہو۔ تمھارے بدن کے یہ کھنچتے ہوئے نشیب و فراز دیکھ کر اچھے سے اچھے عابد و زاہد اپنی توبہ توڑ سکتے ہیں۔ میں بھی توبہ توڑنے آیا ہوں لیکن اس سے پہلے میں وہ بھولا ہوا افسانہ یاد کروں کہ مجھے کس طرح بدنام کر کے اس کوٹھی سے نکالا گیا تھا۔ میری خوبصورت ناگن! جو لوگ ذرا بھی سمجھدار ہوتے ہیں وہ آگ میں کودنے کی بجائے اسے بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں بھی تمھارے حیا بدن کی آگ میں جلنا نہیں چاہتا۔ تمھاری آگ بجھانے کے لیے پانی ہے۔ پانی نہ ہو تو شاید تھوک دینے سے بھی کام چلتا ہے۔ آخ تھو۔۔۔۔"

میں نے اس کے بدن پر تھوک دیا اور فوراً ہی پلٹ کر جانے لگا۔ وہ ایک دم سے لرز گئی تھی۔ اپنی ذلت اور توہین کے شدید احساس سے جیسے وہ پاگل ہو گئی۔ میں نے دروازے سے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے بالوں کو نوچتی ہوئی ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔

میں نے خوابگاہ کے دروازے کو باہر سے بند کیا اور تیزی سے چلتا ہوا اس کوٹھی سے باہر جانے لگا۔ وہ جو خود کو وینس کا شاہکار مجسمہ سمجھتی تھی اب پاگل ہو کر اپنے جسم کی بوٹیاں نوچ رہی تھی۔ ایک حسین اور مغرور عورت کا یہ سب سے خوبصورت انجام تھا۔

میرے قدم اپنی کوٹھی کی طرف اُٹھ رہے تھے اور میں اس کے جھلاتے ہوئے دماغ کو پڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی "میں۔ میں وہ عورت ہوں کہ دل والے میری راہوں میں اپنے دل بچھاتے ہیں۔ شاعر میری تعریف میں لفظوں کے پھول کھلاتے ہیں، اور وہ کمینہ مجھ پر تھوک کر گیا ہے۔۔۔۔"

اس سوچ پر اس کے دماغ نے اسے چیخنے پر مجبور کیا۔ چیخنے کے ساتھ ہی اس کے دماغ نے مشورہ دیا کہ وہ میرا منہ نوچ لے۔ لیکن میں اس کے سامنے نہیں تھا۔ وہ جھلائی ہوئی سوچ کے مطابق تکیے کو اٹھا کر نوچنے لگی۔

"سور، کمینہ۔ کیا سمجھ کر اس نے تھوکا ہے؟ جس بدن کو لوگ خوشبو کا گلدان کہتے ہیں، اسے اگالدان سمجھ کر گیا ہے۔ میں یہ توہین برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اسے جان سے مار ڈالوں گی۔ وہ بدذات خود کو سمجھتا کیا ہے؟ میں بھی اس پر تھوکتی ہوں۔ تم۔۔۔۔ مگر میرے تھوکنے سے اس بے عزتی کا احساس نہیں مٹ سکتا، جو وہ کر گیا ہے۔ مائی گاڈ! اُس نے نفرت سے مجھ پر تھوکا ہے۔ نہیں مجھے یقین نہیں آتا کہ میرے بدن پر اس کا تھوک ہے۔ مگر ہے۔ میں حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی۔ یہ تھوک ایک انگارے کی طرح میرے بدن سے چپک گیا ہے۔ اب جب بھی میں لباس اُتاروں گی مجھے اس کے نفرت سے تھوکنے کا انداز یاد آجائے گا۔"

میں اپنی کوٹھی کے احاطے میں پہنچ کر رک گیا اور اس کے دماغ میں بیٹھ کر اس کی سوچ میں گڑبڑ کرنے لگا۔ "ہاں، اُس نے ایسی نفرت سے تھوکا ہے جیسے میں طوائف سے بھی گئی گزری عورت ہوں۔ اس طرح اس نے مجھے اپنی نظروں سے گرا دیا ہے۔ اتنی دیر سے میں خود ہی اپنے آپ کو قابلِ نفرت سمجھ رہی ہوں۔"

وہ گڑبڑا کر سوچنے لگی "نہیں میں قابلِ نفرت نہیں ہوں۔ میں سب سے حسین لڑکی ہوں۔ سب ہی مجھ پر جان دیتے ہیں۔ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔"

میں نے منفی سوچ میں کہا "جو لوگ سامنے محبت ظاہر کرتے ہیں وہ میری پیٹھ پیچھے مجھ پر تھوکتے ہیں۔ فرہاد پہلا آدمی ہے جو سامنے تھوک کر گیا ہے۔"

اس کی مثبت سوچ نے کہا "میں فرہاد پر تھوک دوں گی۔"

میں نے منفی سوچ سے سمجھایا "صرف فرہاد پر تھوکنے سے انتقام کی آگ نہیں بجھے گی۔ جو اپنے مطلب کے لیے میرے حسن کی تعریف کرتے ہیں میری محبت کا دم بھرتے ہیں، ان جھوٹوں پر بھی تھوکنا چاہیے۔ قاسم بھی مطلب پرست ہے۔ قیصر بھی عیاش ہے۔ سب کے سب میری جوانی سے کھیلنے کے لیے میری خوشامدیں کرتے ہیں۔ میں ان سب پر تھوک دوں گی۔"

اس کا جھلایا ہوا ذہن قائل ہو گیا کہ وہ سب پر تھوکے گی۔ آج اس کی جو توہین ہوئی ہے اس کا انتقام وہ ہر مرد سے لے گی۔ اس وقت اس کی سوچ نے بتایا کہ ڈرائنگ روم میں فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔

میں نے اس کی سوچ میں کہا "پتہ نہیں اتنی رات کو کس نے فون کیا ہے۔ گھر کے لوگ سو رہے ہیں۔ مجھے ڈرائنگ روم میں جا کر سننا چاہیے کہ کس کی کال ہے۔"

اس نے منفی سوچ میں کہا "نہیں، میں نہیں جاؤں گی۔ کسی کی بھی کال ہو، وہ جہنم میں جائے۔"

میری سوچ نے پھر اسے سمجھایا "ہو سکتا ہے کہ فرہاد اپنی کوٹھی سے کال کر رہا ہو۔ مجھے فوراً ہی ریسیور اٹھا کر اس پر تھوک دینا چاہیے۔"

یہ بات اس کی کھوپڑی میں آگئی۔ اس کی سوچ بتا رہی تھی کہ وہ میری کال کی توقع میں غصے سے طنطناتی ہوئی خواب گاہ سے نکل کر جا رہی تھی۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر اُس نے فون کا ریسیور اٹھایا پھر چیختی ہوئی بولی۔

"سور کے بچے! اب تم مجھے فون کر رہے ہو۔ میں تم پر تھوکتی ہوں۔ آخ تھو۔"

ریسیور پر دوسری طرف کی آواز غزالہ نے سنی اور اسے غزالہ کے دماغ سے میں نے سُنا۔

"ارے رے۔ یہ تھوکنے کا کیا مطلب ہوا۔ کون ہو تم؟ کیا غزالہ ہو؟"

"ہاں، میں غزالہ ہوں۔ کسی بھی مرد کی آواز میرے دماغ میں کانٹے کی طرح چبھتی ہے۔ میں پھر ایکبار تم پر تھوکتی۔۔۔۔"

"ٹھہرو ٹھہرو۔ بھئی یہ کیا کر رہی ہو۔ میری آواز پہچانو۔ میں تمھارا قیصر ہوں۔"

میں نے قیصر کا نام سنتے ہی غزالہ کی سوچ میں کہا "مجھے قیصر پر بھی تھوکنا چاہیے، وہ بھی مرد ہے۔ میں اُس پر بھی تھوکوں گی۔"

غزالہ نے غصے سے پوچھا "قیصر تم بھی ایک مرد ہو؟"

"ہاں۔ میں مرد ہوں۔"

"تو میں تم پر بھی تھوکتی ہوں۔ آخ تھو!"

"ارے کیا ہو گیا ہے تمھیں؟ خواہ مخواہ تھوکتی چلی جا رہی ہو کیا فرہاد کی دوستی نے تمھارا دماغ خراب کر دیا ہے۔"

"فرہاد کا نام نہ لو۔ میں اس پر تھوکتی ہوں۔ تم نے کلب میں کہا تھا کہ اسے جان سے مار ڈالو گے۔ اب میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم اسے کس طرح مار ڈالو گے۔ قیصر جب تک تم اسے کتے کی موت نہیں مارو گے میرے کلیجے میں ٹھنڈک نہیں پہنچے گی۔ جتنی جلدی ممکن ہو تم مجھے اس کی موت کی خوشخبری سناؤ۔ میں اپنا حسن، اپنی جوانی اور اپنی دولت تم پر نچھاور کر دوں گی۔"

"جانِ من! تم کتنے بڑے انعام کا لالچ دے رہی ہو۔ یہ واقعی انعام ہے یا محض للچانے والی باتیں ہیں۔ دیکھو، بُرا نہ ماننا۔ پہلے بھی تم نے بڑے وعدے کیے اور [illegible] ٹرخا دیا۔"

"اب ایسا نہیں ہو گا، تم ابھی آؤ۔ میں ابھی وعدہ پورا کروں گی تمھارا اعتماد حاصل کروں گی۔ تم جو کہو گے وہ کروں گی مگر کسی طرح یہ خوشخبری سناؤ کہ وہ سور کا بچہ مر چکا ہے۔"

"اچھا میں ابھی آتا ہوں۔"

قیصر نے رابطہ ختم کر دیا۔ غزالہ پھر میرے متعلق غصے سے سوچنے لگی میں نے ذہنی رابطہ ختم کر دیا اور اپنے کمرے میں آکر سونے کے لیے لباس بدلنے لگا۔ اس دوران میں نے قیصر کی سوچ کو پڑھا۔ وہ اپنی کار ڈرائیو کرتا ہوا غزالہ کی طرف آرہا تھا اور یہ منصوبہ بنا رہا تھا کہ مجھے گھیر کر مارنا آسان سی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے وقت کا انتظار کرنا ہو گا۔ پتہ نہیں کتنا وقت لگے گا۔ دو دن یا چار دن یا چار مہینے۔ اُس وقت تک غزالہ کو بہلا پھسلا کر اپنا کام نکالنا ہو گا۔ ایسی حسین عورت بغل میں رہے تو سوسائٹی میں کچھ اور اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

اس کی سوچ پڑھ کر اس بات کا یقین ہو گیا کہ ابھی اس کی نظروں میں صرف غزالہ کے حسن و شباب کی اہمیت ہے۔ اس میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ وہ تنہا کہیں بھی مجھے للکار سکے۔ صرف رات کی تنہائی میں میری تھوکی ہوئی چیز کو چاٹنے آرہا تھا۔

میں اپنی خوابگاہ کا دروازہ اندر سے بند کر کے اطمینان سے سو گیا۔

دوسرے دن میں چچا کے ہاں گیا۔ غزالہ میرے سامنے نہیں آئی۔ میں چچا جان سے زمین جائداد کی باتیں کرتا رہا۔ پھر شاہینہ کے ساتھ تفریح کے لیے نکل گیا۔ اس کے بعد روز کا یہی معمول ہو گیا۔ میں اپنی لاڈلی بہن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے لگا۔ کبھی کبھی چچا جان کے ساتھ کچہری کے چکر لگانے پڑتے تھے کیونکہ وہ تمام زمینیں میرے نام لکھ رہے تھے۔ زمانے بھر کی غلاظتوں سے نکل کر ایک بہن کا ساتھ ملا تو مجھے پیار کی پاکیزگی کا شدت سے احساس ہوا۔ عورت محض ایک داشتہ نہیں ہوتی، وہ ماں بھی ہوتی ہے، بیٹی بھی ہوتی ہے اور شاہینہ جیسی بہن بھی۔ یہ تو میں جانتا ہی تھا کہ شاہینہ کے نازک سے دل میں زبیر کی محبت پروان چڑھ رہی ہے۔ ان ہی دنوں زبیر اپنی والدہ کے علاج کے لیے لاہور آیا ہوا تھا۔ ایک روز شاہینہ مجھے اس کے ہاں لے گئی۔ زبیر واقعی ایک خوبرو نوجوان تھا۔ گفتگو کے دوران میں نے اس کے خیالات پڑھے تو پتہ چلا کہ وہ بھی شاہینہ کو چاہتا

ہے لیکن محبت کا اظہار اس لیے نہیں کرتا کہ خود کو گمنام سمجھتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ شاہینہ اس کے پیچھے پھرتی ہے۔ شاہینہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی اس لیے کسی نہ کسی بہانے اس سے ملنے چلی آتی تھی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ زبیر کو کسی طرح مہذب انداز میں مجبور کردوں گا کہ وہ عزت و آبرو کے ساتھ میری بہن کا ہاتھ تھام لے۔

اس روز میں نے منصوبہ بنایا کہ زبیر کے دل میں شاہینہ کیلئے کس طرح تڑپ پیدا کرنی ہوگی۔ اس عمل کے لیے مجھے مکمل خاموشی اور ایسے پُرسکون ماحول کی ضرورت تھی جہاں کوئی مداخلت کرنے والا نہ ہو۔ میں زیادہ سے زیادہ زبیر کے دماغ کو اپنے کنٹرول میں رکھنا چاہتا تھا۔ اس طرح میں اپنی مرضی کے مطابق سوچنے پر مجبور کرسکتا تھا۔ اس مقصد کیلئے میں پھر راوی کے کنارے اُنہی درختوں کے جھنڈ میں جانے لگا۔ وہاں میں نے تنویمی عمل کے لیے تسخیر کی مشقیں کی تھیں اور خیال خوانی کے لیے کشف سمعی مشقوں سے گزرتا رہا تھا۔ اب بھی میرا یہ دستور ہوگیا۔ میں اسی درخت کے سائے میں بیٹھ جاتا تھا اور زبیر کے دماغ میں جھانک کر اس کی تمام دن کی مصروفیات کو سمجھ لیا کرتا تھا۔

پہلے دن جب میں نے اس سے دماغی رابطہ قائم کیا تو وہ اس وقت اپنے کمرے میں تھا اور لباس بدلتے ہوئے غزالہ کے متعلق سوچ رہا تھا صاف ظاہر تھا کہ غزالہ بھی اس کی شخصیت سے متاثر ہوئی تھی اور یہ سوچے بغیر کہ زبیر اس کی چھوٹی بہن کی نگاہوں کا مرکز ہے وہ عادتاً اسے بھی اپنی اداؤں سے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں یہ کیسے برداشت کرلیتا کہ وہ میری شاہینہ کے حق پر ڈاکہ ڈالے۔

میں نے زبیر کی سوچ میں کہا۔

”میں غزالہ کے متعلق کیوں سوچ رہا ہوں؟ بھلا شاہینہ سے غزالہ کا کیا مقابلہ؟ شاہینہ شرم و حیا کا مجسمہ ہے۔ ایک تعلیم یافتہ مشرقی دوشیزہ کی خوبصورت مثال ہے اور غزالہ بے حیائی کی ایک بدترین مثال ہے۔ وہ بازاری عورتوں کی طرح دیکھتی اور مسکراتی ہے۔ اس کی گفتگو میں رُومانس نہیں ہوتا، دعوتِ گناہ ہوتی ہے۔“

زبیر نے قائل ہوکر سوچا۔ ”ہاں، غزالہ کے ظاہر سے اس کے باطن کا پتہ چلتا ہے۔ پتہ نہیں اس کے کتنے عاشق ہوں گے لیکن میں تو محض وقت گزارنے کے لیے اس سے باتیں کرتا ہوں۔“

میری سوچ نے کہا۔ ”مرد پہلے باتوں کی چکناہٹ سے ہی پھسلتا ہے یہ بات غزالہ اچھی طرح جانتی ہے۔ کیا ضروری ہے کہ غزالہ جیسی عورتوں کو لفٹ دی جائے۔ میں غلاظت کی طرف جاؤں گا تو بدبو کے سوا کیا ملے گا۔ خوشبو کے قریب رہوں گا تو میرا وجود بھی معطر رہے گا۔ اور شاہینہ بلاشبہ سراپا خوشبو ہے۔“

جو بات ٹھوس دلائل کے ساتھ کہی جائے اس کی صداقت سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ زبیر بھی تعلیم یافتہ اور ذہین تھا اور اس حقیقت کو تسلیم کرتا تھا کہ شاہینہ صحیح معنوں میں ایک مثالی شریکِ حیات بن سکتی ہے۔

میں تین دن تک راوی کے کنارے آبادی سے دُور اس ویرانے میں جاتا رہا اور رفتہ رفتہ زبیر کو شاہینہ کی اہمیت کا احساس دلاتا رہا۔ دُوسرے دن وہ پہلی بار شاہینہ سے ملنے خود ہی اس کے پاس گیا۔ اصل بات یہ تھی کہ میں اس کی سوچ بن کر جو کچھ کہتا تھا زبیر اسے اپنے ضمیر کی آواز سمجھ کر قائل ہوتا جاتا تھا۔ تیسرے دن اس نے شاہینہ کے سامنے اپنی محبت کا اعتراف اور یہ بھی وعدہ کیا کہ اس کی والدہ کے صحت یاب ہوتے ہی وہ حچاجان سے شاہینہ کا رشتہ مانگنے آئے گا۔

میں خاموشی اور تنہائی میں سایہ دار درختوں کے درمیان مراقبے میں بیٹھا تھا اور شاہینہ اور زبیر کی محبت بھری باتیں سُن رہا تھا۔ اچانک مراقبے کے دوران میرے دماغ میں روشنی کے جھماکے ہونے لگے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی میری تنہائی میں مخل ہو رہا ہے۔ میں نے فوراً ہی آنکھیں کھول دیں۔

اس وقت شام کے سائے گہرے ہوگئے تھے۔ کسی قدر اندھیرا ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی قوتِ سماعت ایک آواز پر مبذول کردی۔ وہ ایک آواز نہیں تھی۔ کئی آوازیں تھیں ہلکے ہلکے قدموں کی چاپ۔ قدموں تلے چرچراتے ہوئے سوکھے پتوں کی صدائیں۔ وہ صدائیں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جارہی تھیں۔

میں بیٹھے ہی بیٹھے اِدھر اُدھر گردن گھما کر دیکھنے لگا۔

پھر مجھے فوراً اپنی طرف قیصر نظر آیا۔ اس کے دائیں بائیں بدمعاش کھڑے ہوئے تھے۔ تینوں کے ہاتھوں میں ہاکیاں تھیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھنے لگا۔ میرے بائیں طرف سے لشیرے کی آواز آئی۔

”قیصر! میری اطلاع غلط نہیں تھی۔ دیکھ لو۔ پتہ نہیں یہ سالا جنگل میں کس لیے آیا کرتا ہے۔“

قیصر نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”اپنی موت کو آواز دینے آیا کرتا ہے۔ آج وہ موت اس کے قریب آگئی بیٹے فرہاد! اپنے پیچھے دیکھو وہاں تمہارا باپ کھڑا ہوا ہے۔“

میں نے گھوم کر پیچھے دیکھا۔ وہاں چار آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ صورت شکل سے ہی غنڈے نظر آرہے تھے۔ ایک اُن میں سب سے زیادہ لحیم شحیم تھا اور بڑی سفاکی سے مسکراتا ہوا اپنا چاقو کھول رہا تھا۔ مجھے قیصر کی آواز سنائی دی۔

”یہ رامے شاہ ہے۔ یہ انسانوں کو جانوروں کی طرح ذبح کرتا ہے۔ ہم شاید تجھے زیر نہ کرسکیں لیکن یہ تجھے نکلنے کا موقع نہیں دے گا۔“

رامے شاہ۔ اچھرے کا مشہور بدمعاش اور قاتل۔ میں نے اس کا نام بارہا سنا تھا اور آج اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ آٹھوں میرے چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ میرے فرار ہونے کے راستے مسدود کر رہے تھے۔ میں تنہا کیا کرسکتا تھا؟ کیا یہاں میرا علم کام آسکتا تھا؟ نہیں۔ میں صرف خیالات پڑھ سکتا تھا۔ دشمنوں کے ہاتھوں کو، ہاکیوں کو اور چاقوؤں کو اپنی طرف بڑھنے سے نہیں روک سکتا تھا۔

میں ایک وقت میں کسی ایک کو اپنی آنکھوں سے ہپناٹائز کرسکتا تھا۔ اس وقت تک باقی سات مجھ پر پل پڑتے اور میرا قیمہ بنا کر رکھ دیتے۔

میں کسی کو مدد کے لیے نہیں پکار سکتا تھا کیونکہ مراقبے کے لیے میں نے ایسی ویران جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں سے شاذونادر ہی کسی انسان کا گزر ہوتا تھا۔ آج وہ جگہ میرا مدفن بن رہی تھی۔

ایسی بے یاری و مددگاری کے وقت کوئی پُراسرار علم اور شعبدے بازی کام نہیں آتی۔ ایک مرد صرف اپنی ذہانت اور بازوؤں کی قوت سے ہی اپنا بچاؤ کرسکتا ہے۔

میں اچانک ایسے درندے کی طرح غرانے لگا جس کے چاروں طرف شکاریوں نے گھیرا ڈال رکھا ہو۔

وہ لوگ بڑی ہوشیاری سے گھیراؤ کر رہے تھے۔ مجھ پر حملہ کرنے سے پہلے میرے فرار کے تمام راستے مسدود کر رہے تھے۔ ابھی شام کے گہرے سائے تھے۔ رات کی تاریکی ہوتی تو میں اس تاریکی سے کچھ فائدہ اٹھالیتا۔ پھر میں نے اچانک فیصلہ کیا کہ مجھے رامے شاہ سے فی الحال کترانا چاہیے کیونکہ اس کی مٹھی میں ننگا چاقو تھا اور اس کے دائیں بائیں دو غنڈے مجھ پر چھلانگ لگانے کے لیے تیار تھے۔ میں یک بیک پلٹ کر قیصر کی جانب لپکا۔ سب نے اپنی ہاکیاں سنبھال لی تھیں لیکن میں نے انھیں ڈاج دیا۔ قیصر کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی اس کے ایک ایسے ساتھی پر چھلانگ لگائی جو نشیب کی طرف کھڑا ہوا اپنے ہاتھوں میں ہاکی تول رہا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں اتنی پھرتی سے پینترا بدل کر اس پر چھلانگ لگاؤں گا۔ اس کے ہاتھوں میں ہاکی اٹھی رہ گئی اور میں [illegible] سے لپٹ [illegible] لڑھکتا چلا گیا۔ ہم دونوں لڑھک رہے تھے۔ میں ایک ہاتھ سے ہاکی چھین رہا تھا اور اپنے سر سے اس کی ناک پر ٹکریں مارتا جارہا تھا۔ دُور اونچائی پر اس کے ساتھیوں کے بولنے اور دوڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سطح زمین پر پہنچ کر ہاکی میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں نے اسے ٹانگوں پر رکھ کر سر سے اوپر دوسری طرف اچھال دیا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کے دھماکے قریب آتے جارہے تھے۔ میں نے پھرتی سے اٹھ کر اپنے مقابل کو اٹھنے کا موقعہ نہیں دیا۔ ہاکی کے ایک ہی وار سے اسے بے کار کردیا اور دوڑتے ہوئے دوسری طرف جانے لگا۔

میں اسی طرح اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔ ان سے دور بھاگنے کے دوران جو پہلے قریب آتا اس سے مقابلہ کرتا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ مجھے چاروں طرف سے گھیریں میں بھاگ کر ان سے دُور نکل جاتا۔ کچھ میں چالاکی سے کام لے رہا تھا کچھ وہ چالاکی سے کام لے رہے تھے۔ مجھے دریا کی طرف آبادی کی سمت جانے کا موقعہ نہیں دے رہے تھے۔ جنگل کے اندر ہی اندر رگیدتے جارہے تھے۔

بھاگتے ہوئے قدموں سے زمین دہل رہی تھی۔ کبھی ہاکیوں کے ٹکرانے کی کھٹاکھٹ گونج رہی تھی اور کبھی کراہیں اور چیخیں لہراتی ہوئی دُور دُور تک بھٹک رہی تھیں۔ وہ زخمی ہو رہے تھے، میں بھی زخمی ہو رہا تھا۔ میرے جسم کے کتنے ہی حصوں پر چوٹیں آئی تھیں۔ سر سے خون بہہ رہا تھا اور چہرے پر پھیل رہا تھا۔ ہر چوٹ پر میں زخمی شیر کی طرح بپھر جاتا تھا۔

وہ مان گئے۔ اُن کے سُست حملے بتا رہے تھے کہ وہ زخمی درندے کی تند مزاجی کو تسلیم کر رہے ہیں۔ میرے لڑنے کا انداز بھی ایسا تھا کہ وہ بیک وقت حملہ نہیں کرسکتے تھے۔ میں ینوٹ کے انداز میں ہاکی گھماتا ہوا دُور تک پینترے بدلتا چلا جاتا تھا۔ جو قریب آتا اس پر حملہ کرتا پھر ایک طرف بھاگتا چلا جاتا۔ رامے شاہ دُور ہی دُور سے میرا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ میرے ہاتھوں سے ہاکی گرے تو اپنے چاقو کی دھار مجھ پر آزمائے۔ اسے تو موقعہ نہ ملا مجھے ہی اس کے قریب پہنچنے کا موقعہ مل گیا۔ جب تک دوسرے میرے قریب پہنچتے، میں ہاکی سے اس کے سر پر ایک شدید ضرب لگاتا ہوا گزر گیا۔ اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور میں چھلانگ لگا کر ایک گھنی جھاڑی کے پیچھے چلا گیا۔

ایک طویل جنگ جاری تھی۔ اس وقت تک رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ ان کے تین ساتھی بے کار ہوگئے تھے۔ چوتھا رامے شاہ زخمی ہوگیا تھا۔ باقی چار دشمن محتاط ہوکر میرا پیچھا کر رہے تھے۔ اب وہ پھیلنے کی بجائے ایک ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ جھاڑی کے دوسری طرف سے آرہے تھے۔ میں وہاں سے گھوم کر پھر رامے شاہ کی طرف آگیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں تیزی سے اس کے قریب آیا اور ہاکی سے تابڑتوڑ حملے کرنے لگا۔

اُس کی چیخ و پکار سے جنگل کا سناٹا گونج رہا تھا۔ میں اس بدمعاش کو بالکل ہی بے کار کردینا چاہتا تھا جسے قیصر میرے قتل کے لیے کرائے پر لایا تھا۔ اور وہ اپنے خون میں نہا رہا تھا۔ اس میں اب چیخنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ وہ اُکھڑی اُکھڑی سانسیں لیتا ہوا مجھے رحم طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت پیچھے سے کئی ہاکیاں مجھ پر برس گئیں۔ میں اپنی ہاکی لہراتا ہوا پلٹا تو وہ دُور چھٹک گئے۔ میں گوشت پوست کا انسان ہوں فولاد کا مجسمہ نہیں ہوں کہ مجھ پر دشمنوں کے حملوں کا اثر نہ ہو۔ میں تو اس بُری طرح زخمی ہوگیا تھا کہ اب میرا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا تھا۔ میں آنکھیں بھینچ بھینچ کر دیکھنے اور پیروں پر کھڑے رہنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو اب تک زندہ سلامت نظر نہ آتا۔

لیکن اب میری قوّتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ میں گرتے گرتے ہاکی زمین پر ٹیک کر سنبھل گیا۔ ذرا سا جھک گیا۔ جھکتے ہی مجھے رامے شاہ کے قریب پڑا ہوا چاقو نظر آیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ چاروں سہمے ہوئے تھے اور سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں گرنے والا ہوں یا انھیں دھوکہ میں رکھ کر رامے شاہ کی طرح کسی ایک کی مرمت کرنے والا ہوں۔ میں نے اپنی آخری تمام قوتوں کو سمیٹ کر وہ چاقو اٹھالیا اور ایک شرابی کی طرح

لڑکھڑاتے ہوئے للکارا۔ میرے بائیں ہاتھ میں چاقو تھا اور دائیں ہاتھ میں ہاکی اور میں قیصر کی طرف پلٹ گیا۔ وہ اچانک ہی دوسری طرف گھوم کر بھاگنے لگا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر وہ تینوں بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ مجھے گرا نہیں سکیں گے۔ میں نے تنہا ایک ہاکی سے چار دشمنوں کو مار گرایا تھا۔ اب تو چاقو بھی ہاتھ آ گیا تھا۔ پھر وہ جان بچا کر کیسے نہ بھاگتے؟

ویسے ان کی بزدلی سے میری جان بچ گئی۔ وہ میرا آخری دم توڑتا ہوا حوصلہ تھا کہ میں ہاکی کا سہارا لیے کھڑا تھا اور آگے پیچھے ڈول رہا تھا۔ چاقو ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ پھر میں بھی گر پڑا۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ میں اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہ سکتا۔ وہ واپس آ کر اب بڑی آسانی سے مجھے ہلاک کر سکتے تھے۔ میں زمین پر گھسٹنے لگا۔ اس مقام سے دُور ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ تاریکی میں پہلے آس پاس کے درخت نظر آ رہے تھے۔ اب آنکھوں کے سامنے ایسا اندھیرا چھا گیا تھا کہ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس ایک زندگی سے محبت تھی اور اسی زندگی کا ننھا سا حوصلہ مجھے پناہ کی تلاش میں گھسیٹ رہا تھا۔

میرا جسم دُکھ رہا تھا۔ ہڈیاں چیخ رہی تھیں۔ زخموں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور میں جہنم کی تاریکیوں میں رینگ رہا تھا۔ کہیں پہ روشنی کی ایک ہلکی سی رمق بھی نہ تھی۔ اس وقت مجھ میں صرف دو قوتیں تھیں۔ ایک رینگتے رہنے کی، دوسری سنتے رہنے کی۔ میرے کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے کہ کہیں دشمن پلٹ کر نہ آ جائیں۔

نہیں، کسی کے قدموں کی آہٹ نہیں تھی۔ جھینگروں کی "چک چک چک" کانوں میں بج رہی تھیں۔ شاخوں کے جھومنے اور پتوں کے سرسرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرے ساتھ ساتھ وہ تمام آوازیں بھی رینگ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر تک میں اپنی زندہ لاش کو گھسیٹتا رہا۔ نہ جانے کتنی دُور نکل آیا تھا۔ آبادی سے قریب تھا یا آبادی سے بہت دُور چلا آیا تھا؟ بس پھر ہمت جواب دے گئی اور میں چاروں شانے چت ہو گیا۔

اب کوئی آئے اور مجھے ذبح کر ڈالے، تب بھی نہیں اُٹھوں گا۔ زندگی کے لیے جتنا لڑنا تھا لڑ چکا تھا۔ اب تو مرتے وقت آرام آ رہا تھا۔

میرا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ آنکھیں یوں پھیل گئیں جیسے پتھرا گئی ہوں۔ میں ہوش و حواس کی دنیا سے جا رہا تھا مگر واہ ری موت! اتنے زخم پہنچانے کے بعد بھی قریب نہیں آ رہی تھی۔ میرے آس پاس بھٹک رہی تھی اور مجھے کرب میں مبتلا کر رہی تھی۔

پھر میری آنکھیں بند ہوتے ہوتے رہ گئیں۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ کسی کے بھاری بھرکم قدموں کی دھمک سنائی دے رہی تھی۔ جنگل کے سناٹے میں زمین کی چھاتی دھڑک رہی تھی۔

آہ! شاید دشمن آ رہے تھے۔

نہیں۔ شاید کوئی ہمدرد آ رہا تھا۔

زندگی آ رہی تھی یا موت آ رہی تھی؟ وہ بھی قریب آ کر رک گئی پھر کسی مرد کی گرجدار آواز سنائی دی۔

"کون ہے بے تُو۔؟"

میں نے بڑی نقاہت سے آواز کی سمت گردن گھما دی۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر کوئی کھڑا ہوا تھا۔ رات کی تاریکی میں صرف اس کا سفید لباس جھلک رہا تھا۔ کوئی لانبا سا جُبّہ پہنے ہوئے تھا۔ وہ کوئی بھی تھا اس کی کرخت آواز سے پتہ چل گیا تھا کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔

پھر وہ قریب آ گیا۔ ہمارے درمیان ایک ننھا سا شعلہ لپکا۔ ایک لائٹر روشن ہوا۔ اس روشنی میں ایک سیاہی مائل چہرہ نظر آیا۔ سیاہ چہرے پر دو بڑی بڑی سُرخ آنکھیں یوں لگ رہی تھیں جیسے کوئی درندہ ابھی ابھی خون پی کر آ رہا ہو۔ اس کی بھنویں اتنی گھنی تھیں جتنی اس کی مونچھیں۔ وہ مونچھیں منگولین ٹائپ کی تھیں اور باچھوں سے نیچے لٹک رہی تھیں۔ وہ ایک ہاتھ سے مجھے یوں ٹٹول کر دیکھ رہا تھا جیسے قصائی بکرے کو دیکھتا ہے پھر وہ خوشی سے دانت نکال کر کہنے لگا۔

"اوہو ہو تگڑا ہے۔ ایکدم تگڑا ہے۔ کافی خون بہہ چکا ہے پھر بھی ایک بالٹی اور نکل آئے گا۔ ابے کون تجھے یہاں مرنے کے لیے چھوڑ گیا ہے۔ ایں؟"

میں نے جواب دینا چاہا مگر صرف ہونٹ کھُل کر رہ گئے۔ حلق میں سانسیں اٹک رہی تھیں۔ میری قوّت گویائی بھی جواب دے گئی تھی۔ اُس نے حقارت سے کہا۔

"سالا بول نہیں سکتا ہے۔ اپنے پیروں سے کیا خاک چلے گا۔ مجھے ہی گھسیٹ کر لے جانا ہو گا۔ کوئی بات نہیں بڑے آرام سے لیجاؤں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے لائٹر کو بجھا دیا۔ چند لمحوں بعد مجھے اپنے سر میں شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ اس نے میرے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ پھر وہ تکلیف انتہائی اذیّت ناک اور ناقابل برداشت ہو گئی کیونکہ وہ بالوں کو مٹھی میں جکڑے مجھے گھسیٹ کر لے جا رہا تھا۔ اُف! ایسی بے رحمی۔ ایسی سنگدلی۔ ایک قصائی بھی بکرے کو اس طرح گھسیٹ کر قربان گاہ تک نہیں لے جاتا۔ میں پہلے ہی ہوش و حواس کھو رہا تھا۔ اس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ میرے حلق سے ایک آخری کراہ نکلی۔ پھر مجھے ہوش نہ رہا۔ بے ہوشی کے اندھیروں میں گم ہو گیا۔

میں وقتی طور پر مر چکا تھا۔

یہ ایک طرح کی موت ہی تھی۔ میں اس دنیا کو دیکھ سکتا تھا نہ سُن سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میں سانس لے رہا ہوں یا نہیں۔ میں اپنے آپ سے غافل تھا۔ ہمارے لیے مر چکا تھا۔

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ پھر رفتہ رفتہ مجھے ہوش آنے لگا۔ پہلے قوت سماعت جاگی۔ کانوں میں دھیمی دھیمی سی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی

بڑبڑا رہا تھا، یا زیر لب کچھ کہہ رہا تھا۔ میں صاف طور سے نہیں سُن سکتا تھا۔ کیونکہ دماغ پر اب تک دُھند چھائی ہوئی تھی۔ میں بند آنکھوں کے پیچھے خود کو محسوس کرنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں؟

پھر دماغ سے دُھند چھٹنے لگی۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے جنگل میں دشمنوں سے مقابلہ کیا تھا۔ مقابلے کے نتیجے میں دشمنوں کا بھی بُرا حشر ہوا اور میں بھی زخموں سے چوُر ہو کر گر پڑا تھا۔ اس کے بعد ایک بے رحم قصائی کہیں سے آیا تھا اور میرے سر کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر مجھے گھسیٹتے ہوئے کہیں لے جا رہا تھا۔ پھر مجھے ہوش نہ رہا۔ اور اب ہوش آتے ہی میں خود کو پیال کے بستر پر محسوس کر رہا تھا۔

"میں کہاں ہوں؟"

یہ سوچتے ہوئے میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں اوندھا پڑا ہوا تھا۔ میرا چہرہ نمدار اور سوکھی گھاس پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے کروٹ بدل کر سیدھی طرح لیٹنے کی کوشش کی تو تمام بدن سے درد کی ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔ ایک تو خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے میں کمزور ہو گیا تھا۔ دوسرے اس بات کا علم ہوا کہ میں مضبوط رسیّوں سے بندھا ہوا ہوں۔ رسی کی لمبائی میرے بازوؤں سے جسم کے اطراف سانپ کی طرح لپٹی ہوئی پیروں تک بندھی ہوئی تھی۔ میں نہ تو اٹھ سکتا تھا نہ بیٹھ سکتا تھا۔ زمین پر پڑی ہوئی شہتیر کی طرح صرف ادھر سے ادھر لڑھک سکتا تھا۔

کڑھائی سے اچھل کر آگ میں گرنے والی بات تھی۔ قیصر اور رامے شاہ سے بچ کر میں ایک انجانے دشمن کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ آخر کسی کو مجھ سے کیا دشمنی تھی؟ میں کیوں اس طرح باندھ کر رکھا گیا تھا؟

میں پھر اس آواز کو سننے لگا۔ کسی مرد کی بھاری بھرکم سی آواز تھی۔ میں سر اُٹھا کر اپنے آس پاس دیکھنے لگا۔ وہ مٹی کا ایک کچا سا کمرہ تھا۔ چھت سے لٹکے ہوئے چھینکے میں تین چھوٹی بڑی ہانڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے بھوک محسوس ہوئی۔ نہ جانے میں کب سے بے ہوش پڑا تھا۔ کمرے میں دن کی روشنی سے پتہ چل رہا تھا کہ ایک رات گزر گئی ہے اور اب دوسرا دن گزر رہا ہے۔

میں رسیّوں کو توڑنے کے لیے کسمسانے اور زور آزمائی کرنے لگا۔ بھوک، پیاس، زخموں کی جلن اور ٹیسیں، تھکن اور کمزوری، پھر اُس پر زور آزمائی کی تو نقاہت سے ہانپتا رہ گیا۔ مگر اس رسی کا کچھ نہ بگڑا۔ میرا ہی زخم خوردہ جسم بُری طرح دُکھنے لگا۔ میں نے بے بسی سے دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازے کے دوسری طرف ایک اور کمرہ نظر آ رہا تھا اور وہیں سے کسی کے بڑبڑانے کی آواز آ رہی تھی۔

اس دروازے تک پہنچنے کے لیے میں پیال سے لڑھکتا ہوا مٹی کے کچے فرش پر آ گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہاں کون ہے اور کیا کر رہا ہے؟ اس کی بڑبڑاہٹ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ شاید وہ کوئی اجنبی زبان تھی یا کمزوری کی وجہ سے الفاظ وا[illegible] تھے۔ میں کچے فرش پر آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر ایک شہتیر کی طرح لڑھکتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔

دوسرا کمرہ بہت بڑا تھا مگر سامان سے بالکل خالی تھا۔ کمرے کے عین قلب میں وہ عظیم شحیم شخص کچے فرش پر پلتھی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر قینچی کی طرح بندھے ہوئے تھے۔ اس کی بڑی بڑی سُرخ آنکھیں اس دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں جو باہر کی طرف کھُلتا تھا۔

میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ وہی ظالم اور جابر تھا جو جبراً مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ رہا تھا اور شاید اسی طرح گھسیٹتے ہوئے مجھے یہاں تک لایا تھا۔ اس کے چاروں طرف سیندور کی دیکھاؤں سے دائرے بنے ہوئے تھے۔ چھوٹے سے دائرے میں بیٹھا ہوا کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔ اس کے سامنے قوس نما داؤ رکھا ہوا تھا۔ ایسا داؤ جس سے جلاد مجرموں کے سر قلم کرتے ہیں۔

اسے دیکھتے ہی میرے دماغ نے کہا کہ میں قربانی کا بکرا بنا کر لایا گیا ہوں اور وہ میرا سر کالے جادو کی کوئی رسم ادا کرنا چاہتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں پھر رسیّوں کی بندش میں تڑپنے اور مچلنے لگا۔ میں بزدلی اور بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہتا تھا۔ اس کمبخت نے میری بے ہوشی سے فائدہ اُٹھا کر مجھے بے بس کر دیا تھا۔ اتنی مضبوط رسّی سے باندھ رکھا تھا کہ میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتا ہی رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے یقین ہو گیا کہ میں اس شکنجے سے آزاد نہیں ہو سکوں گا۔ مجھے جھلانے اور زور آزمائی کرنے کی بجائے تحمل سے کوئی دوسری تدبیر سوچنا چاہیئے۔

میں سکون سے لیٹا رہ گیا۔ چند لمحوں تک بالکل خاموش رہا۔ پھر اس اجنبی کی سُرخ آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ کیا میں تنویمی عمل کے ذریعے اسے اپنا معمول بنا سکتا ہوں؟

نہیں۔ اس کے بھاری جثّے سیاہی مائل چہرے کی سختی اور خونخوار آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ خونی درندہ ہے اور ٹھوس قوّت ارادی کا مالک ہے وہ ہپناٹزم کے ذریعہ ٹرانس میں نہیں آئے گا۔ کالا جادو اور سفلی عمل سیکھنے یا جاننے والے اکثر پُراسرار قوتوں سے ٹکراتے رہتے ہیں اور لرزہ خیز واقعات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ کسی کے معمول نہیں بنتے، بلکہ دوسروں کو اپنا مطیع و معمول بناتے ہیں یا پھر اپنی مخالف قوتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ وہ تنویمی عمل کے ذریعہ میرے زیر اثر نہیں آئے گا۔

اسے سمجھنے کے لیے میرے پاس ایک ہی علم تھا۔ میں خیال خوانی کے ذریعہ اس کے خیالات پڑھ سکتا تھا اور اس کے متعلق کچھ معلومات حاصل کر سکتا تھا لہٰذا اس کی کمزوریاں تلاش کرنے کے لیے میں لیٹے ہی لیٹے مراقبے میں چلا گیا اور اپنی باطنی سماعت سے اس کے خیالات کو سننے لگا۔

وہ اجنبی زبان تھی۔ وہ جو کچھ زبان سے بڑبڑا رہا تھا۔ وہی اس کے دماغ میں بھی تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس زبان میں جاپ کر رہا ہے۔

میں نے اپنی سوچ کی لہروں سے اس کے دماغ پر دستک دی۔
"رُک جاؤ۔ میں حکم دیتا ہوں۔ یہ جاپ اور منتر دنتر بند کرو۔"
میری سوچ اس کی سوچ سے ٹکرائی۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی پتھر سے ٹکراتا ہے۔ اس پتھر پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور منتر پڑھتا رہا۔ میں پریشانی سے اسے تکنے لگا۔ اس کی نظریں بیرونی دروازے پر مرکوز تھیں اور دماغ پتھر ہوگیا تھا اس نے کسی علم سے اپنے اطراف ایسا حصار بنا رکھا تھا کہ کوئی اسے توڑ کر اس کے دھیان گیان کو منتشر نہیں کر سکتا تھا۔
اس وقت مجھے اپنی کم علمی کا احساس ہوا۔ اب تک میں نے عورتوں اور کمزور دماغ کے مردوں پر اپنا علم آزمایا تھا۔ ان کے خیالات پڑھ کر اور انھیں اپنے زیرِ اثر لا کر میں نے سمجھ لیا تھا کہ میں بہت کچھ حاصل کر چکا ہوں۔ ایک بلد چچا کے خیالات بھی پڑھے تھے مگر وہ بھی عورتوں کی طرح کمزور اور متاثر ہو جانے والا دماغ رکھتے تھے۔ صلاحیتیں تو اس وقت آزمائی جاتی ہیں جب کوئی جوڑ توڑ کرنے والا مقابل سامنے آتا ہے۔ اور میں تسلیم کر رہا تھا کہ وہاں اس اجنبی کے سامنے میری صلاحیتیں کام نہیں آئیں گی۔
عجیب بے بسی کا عالم تھا۔ نہ صلاحیتیں کام آ رہی تھیں۔ نہ جسمانی قوتوں سے رسیاں توڑ کر نکل سکتا تھا۔ سر پر لگنے والی چوٹوں نے ذہن کو بھی کسی حد تک مفلوج کر دیا تھا۔ کوئی تدبیر دماغ کو چھو کر نہیں گزر رہی تھی۔
پھر میں نے سوچنے کی بجائے زبان سے کام لیا اور جھلا کر چیخنے لگا۔
"کون ہو تم ؟ مجھے رسیوں سے کیوں باندھ رکھا ہے ؟ مجھ سے کیا دشمنی ہے ؟ یہ رسیاں کھول دو ورنہ میری دشمنی مہنگی پڑے گی۔"
میں اس لیے چیخ رہا تھا کہ میری آواز اس مکان کے باہر دُور دُور تک چلی جائے اور کوئی میری مدد کے لیے یہاں آ جائے۔
اس اجنبی پر میری چیخ و پکار کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس کی پلکیں تک نہ جھپکیں وہ جوں کا توں پتھر کے مجسمہ کی طرح بیٹھا رہا۔ صرف اس کے ہونٹ ہلتے رہے۔ مگر ہاں! باہر سے آواز سنائی دی۔
"چھم چھم۔ چھم چھم....." پائل بج رہی تھی۔
میں چونک کر اس آواز کو سننے لگا۔ دیوار کے دوسری طرف وہ پائل چھم چھماتی ہوئی بھاگ رہی تھی۔ میں نے آواز کی سمت منہ اٹھا کر کہا۔
"تم کون ہو ؟ رُک جاؤ۔ اس مکان کے اندر آؤ۔ میری مدد کرو۔ اگر تم اکیلی ہو تو اپنی بستی کے لوگوں کو بلا کر لاؤ۔ مجھے یہاں زبردستی باندھ کر رکھا گیا ہے۔ میری مدد کرو۔"
میری چیخ و پکار کا جواب نہیں ملا۔ وہ پائل بجتی اور قہقہے لگاتی رہی۔ پہلے وہ بیرونی دروازے کی جانب دیوار کے اس پار سنائی دے رہی تھی پھر وہ میرے بائیں طرف کی دیوار کے پار گنگناتی چلی گئی۔ میں ادھر سے اُدھر لڑھکتا ہوا آواز کی سمت دیکھتا جا رہا تھا، اور اس اجنبی عورت کو پکارتا جا رہا تھا، جو پائل چھنکاتی ہوئی جا رہی تھی۔
پھر وہ آواز تھم گئی۔ کہیں کوئی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ شاید اس کمرے کے پیچھے بھی کوئی کمرہ تھا جہاں وہ داخل ہوئی تھی اور اب آہستہ آہستہ چھم چھم کرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اس کی چال سے اور پائل کی جھنکار سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کوئی نوخیز حسینہ ہوگی۔ بوڑھی عورتیں پائل تو نہیں باندھتیں۔
میں نے اس لیے ایسا سوچا کہ نوخیز اور ناداں لڑکی ہوگی تو میں اسے آسانی سے ٹرانس میں لا کر رسیاں کھلواؤں گا۔ بس یہی ایک امید کی کرن نظر آ رہی تھی
وہ چھم چھم کی آواز اس کمرے میں آ گئی جہاں وہ کالی طبیعت کا اجنبی دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ میں جلدی سے لڑھکتا ہوا پھر اس دروازے تک پہنچ گیا اور چوکھٹ کے پار اپنا آدھا دھڑ نکال کر دیکھنے لگا۔
اس اجنبی کے پیچھے بھی ایک دروازہ تھا۔ وہ دروازہ کھلا تھا اور وہاں وہ کھڑی ہوئی تھی۔ سرخ ریشم کا گھاگھرا۔ سرخ ریشم کی چولی گھاگھرے کی لہر لہر پر روپہلی گوٹ لہرا رہی تھی۔ چولی پر رنگ برنگی موتیاں چمک رہی تھیں۔ چاندی کی پائل، سونے کے کنگن، کانوں میں جھمکے اور گلے میں بیش قیمت موتیوں کی مالائیں تھیں۔ اس کا بدن چاندی کی طرح اُجلا تھا اور اس چاندی کے بدن پر زیورات کا سنہرا عکس جھلملا رہا تھا۔ گھاگھرے کی سُرخی، جلال خون کی حدت بتا رہی تھی۔ ہلکے نیلے رنگ کی چولی میں زہر کی نیلاہٹ چھپی ہوئی تھی۔ اس حسینہ کی رنگت بیک وقت اُجلی اجلی بھی سنہری بھی تھی، سُرخی مائل بھی تھی اور زہریلی بھی۔ وہ انگڑائی نہیں لے رہی تھی مگر اس کے بدن کے تمام نشیب و فراز انگڑائی کی اٹھان پر تھے۔ اس عمر میں عورت کی ہر ادا ایک جذباتی انگڑائی کا سماں پیش کرتی ہے۔
میں ایک لمحہ کے لیے بھول گیا کہ میں کہاں ہوں ؟ اور کس طرح موت کی کھائی میں گرنے کے لیے آخری کنارے تک آ پہنچا ہوں ؟ مصائب کے اندھیروں میں بھی اگر کہیں روشنی کا جھماکا ہو تو ذرا دیر کے لیے نگاہیں وہاں جم جاتی ہیں۔ مجھ پر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔
وہ دُور ہی سے مجھے دیکھ کر بڑی نخوت سے مسکرائی اور ایک شانِ بے نیازی سے چلتی ہوئی میری طرف آنے لگی۔ اس نے سیندور سے بنے ہوئے دائرے میں قدم نہیں رکھا۔ اس دائرے سے کتراتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ وہ جتنی نزاکت سے چلتی ہوئی میرے پاس آئی تھی اتنی ہی شقاوت سے میرے سینے پر چھم سے پاؤں رکھتی ہوئی بولی۔
"کیسے ہوش میں آتے ہی یہاں تک چلا آیا۔ چل اپنی جگہ واپس جا....."
یہ کہہ کر اس نے ایک ٹھوکر ماری۔ میں عورت کی ٹھوکر کھا لوں مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے غرا کر اسے دیکھا۔ میری شعلہ فشاں آنکھوں سے جیسے چنگاریاں چھوٹی ہوں یا بجلیاں کوندی ہوں، اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ لڑکھڑا کر ذرا پیچھے چلی گئی۔
پھر دوسرے ہی لمحہ اس کی آنکھوں میں بھی خون اُتر آیا۔ میں فوراً ہی خیالات پڑھنے لگا۔ وہ سوچ رہی تھی۔
"ارے۔ اس کی آنکھوں میں تو بجلی بھری ہے۔ میں سنبھل نہ جاتی تو ابھی موم کی طرح پگھل جاتی۔ یہ تو کوئی گیانی جان پڑتا ہے۔"
یہ سوچ کر اس نے زبان سے پوچھا
"کون ہے رے تو ؟ سچ سچ بتا تو کالا علم جانتا ہے ؟"
میں نے اپنی نگاہوں کی آنچ کو دھیما کر دیا۔ اتنا تو سمجھ ہی گیا تھا کہ وہ میری نگاہوں کی حرارت سے نہیں پگھلے گی۔ لہٰذا میں اپنے علم سے اسے چونکانا اور محتاط کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے انجان بن کر پوچھا۔
"کالا علم کیا ہوتا ہے ؟"
"ہی ہی ہی ہی۔!" وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر ہنسنے لگی۔ "مجھ سے جھوٹ بولتا ہے۔ ارے تیری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تو کالے منتروں کا گیانی ہے۔"
"مجھے کالا منتر آتا تو ابھی ان رسیوں سے آزاد ہو جاتا۔"
اس نے آنکھیں سکیڑ کر ایسے دیکھا جیسے میری باتوں کا یقین نہ آیا ہو۔
"ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ تو ہماری محنتوں پر پانی پھیرنے اندر سے اڑ بیٹھا ہو اور اوپر سے اپنے کو مجبور بتا رہا ہو۔ میں ابھی معلوم کرتی ہوں کہ کتنے پانی میں ہے۔"
یہ کہہ کر اس نے دونوں پاؤں ذرا سا پھیلائے اور دونوں ہاتھوں ذرا سا اٹھا کر مٹکنے لگی۔ کسی اجنبی زبان میں کوئی سُریلا گیت گانے لگی۔ بڑی رسیلی آواز تھی۔ وہ ایک مخصوص تال پر مٹک رہی تھی
اگر کسی عیش کدے میں وہ ایسی حرکتیں کرتی تو دیکھنے والے جذبات سے بے قابو ہو جاتے مگر اس وقت وہ مجھے زہر لگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک ناچتے اور گاتے رہنے کے بعد وہ اپنا ایک ہاتھ سیندوری دائرے کے اندر لے گئی۔
میں نے حیرت سے دیکھا۔ اس کی ہتھیلی پر ایک ننھا سا شعلہ روشن ہو گیا تھا۔ وہ اپنی ہتھیلی دائرے سے باہر لے آئی۔ پھر اسے اپنے منہ کے قریب لا کر ایک پھونک ماری۔
"پھُوں.....!" وہ ننھا سا شعلہ فضا میں لہراتا ہوا میرے پاس آیا اور میں اچانک بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھر گیا۔ اُف! ایسی جلن اور ایسی اذیت تھی کہ میں ادھر سے اُدھر لڑھکتا ہوا چیخ رہا تھا، تڑپ رہا تھا۔ شعلے مجھے جلا رہے تھے۔ میں جہنم کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ قہقہے لگا رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔
"بچنے کی کوشش کر۔ اگر علم جانتا ہے تو اپنا علم کام میں لا۔ یہ تو معمولی سی شعبدے بازی ہے۔ دو ٹکے کا جادوگر بھی ان شعلوں کو بجھا سکتا ہے۔ بجھا اپنے جنتر منتر سے۔"
میں ایسا کوئی علم نہیں جانتا تھا اس لیے حلق کے بل چیخ رہا تھا۔
"میں کچھ نہیں جانتا۔ سوّر کی بچی! میں کوئی منتر نہیں جانتا۔ بجھا دے ان شعلوں کو۔ میں جلنا نہیں چاہتا۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ بجھا دے بجھا دے....."
میری آواز ڈوبنے لگی۔ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ اسی وقت نہ جانے اس نے کون سا عمل کیا کہ شعلے اچانک بجھ گئے۔ میرے تمام جسم میں ٹھنڈک سی محسوس ہونے لگی۔ عجیب بات تھی۔ جلنے کے بعد سوزش باقی رہ جاتی ہے۔ مگر میرے جسم کے کسی حصّہ میں جلن کا احساس تک نہ تھا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو بدن کے کپڑے بھی جوں کے توں سلامت تھے۔ ان پر ذرا بھی آنچ نہیں آئی تھی۔
وہ میری حیرانی پر مسکرا کر بولی۔
"میں تجھے جلانا نہیں چاہتی۔ تو تو قربانی کا بکرا ہے۔ آج ایک کالی بلی تیرے لہو سے اشنان کرے گی۔"
میں بوکھلا کر اس قوس نما داؤ کو دیکھنے لگا جو چھوٹے دائرے کے اندر اجنبی کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ اس کی چمکتی ہوئی دھار میرے لہو کی پیاسی تھی۔
"ہاہاہاہا!" وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر ہنسنے لگی۔ ہنسی کی تال پر اس کے زرخیز جسم کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔ پھر وہ کہنے لگی۔
"جہاں تک ہماری پہنچ ہے وہاں تک قانون کے ہاتھ نہیں پہنچتے۔ یہ مکان ایک فریبِ نظر ہے۔ باہر سے دیکھو تو صرف جنگل کی جھاڑیاں نظر آتی ہیں۔ نظر بندی اور سماعت بندی کا کالا منتر ایسا ہی ہوتا ہے کہ کسی کی نظر ہم تک نہیں پہنچتی اور ہماری آواز بھی کسی کے کانوں تک نہیں پہنچتی۔ تو لاکھ چلاتا رہے۔ یہاں تیری مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔"
وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ میں کتنی ہی بار چیختا رہا تھا۔ مگر کوئی میری مدد کے لیے نہیں آیا تھا۔ اور انھوں نے مجھے اس طرح بے بس کر رکھا تھا کہ میں اپنی مدد آپ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں آزاد ہوتے تو میں ان کے کالے منتروں سے بھی ٹکرا جاتا۔ یا تو وہ اس دنیا میں رہتے یا میں رہ جاتا۔ مگر اب بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ صرف خدا یاد آ رہا تھا۔
وہ پیال کی طرف جاتی ہوئی بولی۔
"اپنی جگہ واپس آ جا۔ میں تجھے بھوکا نہیں مارنا چاہتی۔ مرنے سے پہلے تجھے خوب پیٹ بھر کر کھا لینا چاہیے۔"
وہ میرے قریب سے گزر کر جا رہی تھی اور اب پُشت کی طرف سے نظر آ رہی تھی۔
اس کی چال ہی ایسی تھی یا وہ ضرورت سے زیادہ اِترا کر چل رہی تھی۔ میں نہیں جانتا، اس وقت میرے سر پر وہ قوس نما داؤ لٹک رہا تھا۔ موت کو قریب دیکھ کر بھوک پیاس اُڑ جاتی ہے مگر میں ذہنی اور جسمانی طور پر چاق و چوبند رہنا چاہتا تھا۔ تن درستی اور من درستی کسی وقت بھی کام آ سکتی تھی۔ اس لیے میں کھانے پر آمادہ ہو گیا اور کچھ فرش پر لڑھکتا ہوا پیال پر آ گیا۔
اس نے چھینکے پر سے ہانڈیاں اُتارنے کے لیے دونوں ہاتھ اُوپر اٹھائے۔ اس کی ایڑیاں بھی اُٹھ گئیں۔ وہ پنجوں کے بل کھڑی ہوئی تھی۔

میں نے سوچا کہ وہ لاکھ جادو ٹونے جانتی ہو اس کے باوجود جوان اور الھڑ دوشیزہ ہے، اس پر عشق و محبت کے داؤ آزما کر دیکھنا چاہیئے۔ اگر وہ جذبات میں بہہ گئی تو میں آسانی سے رسیاں کھلوا لونگا۔

وہ جھٹکے پر سے ہانڈیاں اتار کر میرے پاس بیٹھ گئی۔ اس کا گھاگھرا پنڈلیوں تک لہراتا تھا مگر بیٹھتے وقت وہ گھٹنوں کے اوپر تک اٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بہت بڑی حرافہ ہے۔ جان بوجھ کر میری نگاہوں کو گھٹنوں سے اوپر بہکا رہی ہے۔ میں نے بھی ایک عاشق کی طرح جذباتی لہجے میں کہا۔

"تم بہت حسین ہو۔ تم مجھے ایک بار مارنا چاہتی ہو، میں بار بار تم پر مرنا چاہتا ہوں۔ ایسا لاجواب حسن میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔"

وہ ایک برتن میں آلو بینگن کی بھاجی اور پوریاں نکالتی ہوئی بولی۔

"ہاں۔ یہ جسم سچ مچ لاجواب ہے۔ ایک برس پہلے جب میں نے اس جسم کو دیکھا تو دیکھتے ہی اس پر ہزار جان سے عاشق ہو گئی تھی۔"

اس کی بکواس میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے تعجب سے پوچھا۔

"تم نے اپنے جسم کو ایک برس پہلے دیکھا تھا، کیا اس سے پہلے تم اندھی تھیں؟"

وہ ہنستی ہوتی بولی۔

"میں اندھی نہیں تھی، بوڑھی تھی۔ ستّر برس کی بوڑھی۔ یہ جسم جسے تو دیکھ رہا ہے میرا نہیں ہے۔ صرف روح میری ہے۔ یہ جسم تو میں نے اپنے علم سے حاصل کیا ہے۔"

میں حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

اس کی روح ستّر برس پرانی اور جسم نیا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے؟ جادو ٹونے کے متعلق میں نے بہت کچھ سنا تھا اس وقت آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ کسی دوشیزہ کے جسم میں ایک بوڑھی جادوگرنی چھپی ہوئی تھی۔ یہ ایسی ناقابلِ یقین بات تھی کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تم دراصل بوڑھی ہو اور اپنے جادوئی عمل سے کسی نوجوان لڑکی کے جسم میں داخل ہو گئی ہو؟"

اس نے جواب دیا۔

"میں بوڑھی نہیں ہوں، کبھی بوڑھی تھی مگر میری روح اس جسم میں آ چکی ہے تو اب میں جوان کہلاؤں گی۔ روح کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ تو اُسے ستّر برس یا سو برس پرانی کہہ سکتا ہے مگر بوڑھی نہیں کہہ سکتا۔ لے اب پیٹ بھرلے۔"

اس نے پوری بھاجی کا ایک نوالہ بنا کر میری طرف بڑھایا۔ میں نے رسیوں کی بندش میں کسمساتے ہوئے کہا۔

"میرے ہاتھ کھول دو۔ میں اپنے ہاتھ سے کھاؤں گا۔"

"نہیں!" وہ میرے منہ میں نوالہ ٹھونستی ہوئی بولی۔ "مجھے نادان نہ سمجھ۔ کیدار نے مجھے بتایا ہے کہ تو بہت خطرناک ہے۔"

"کیدار کون؟" میں نے پوچھا۔

"وہ جو دوسرے کمرے میں بیٹھا جاپ کر رہا ہے۔"

وہ دوسرے کمرے سے اسی اجنبی شخص کے منتر پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"میں بیہوش ہو گیا تھا۔ وہ مجھے آسانی سے گھسیٹ کر لے آیا۔ پھر وہ کیسے کہتا ہے کہ میں خطرناک ہوں۔"

"کیدار نے کل رات اس جنگل میں چار آدمیوں کو دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک مر چکا تھا، دوسرا دم توڑ رہا تھا اور باقی دو بُری طرح زخمی ہو کر پڑے تھے بھاگ رہے تھے۔ کیا تو نے ان لوگوں سے مقابلہ نہیں کیا تھا۔"

"ہاں۔ وہ چار نہیں بلکہ آٹھ آدمی تھے۔"

اس حسینہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں فوراً اس کے خیالات پڑھنے لگا۔ وہ سوچ رہی تھی۔

"آٹھ آدمی؟ نہیں یہ جھوٹ کہتا ہے۔ کیا ایک تنہا آدمی آٹھ دشمنوں کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ مگر۔ ہاں۔ دیکھنے میں تو پہاڑ ہے چٹان کی طرح مضبوط ہے۔ اگر جان پر بن آئے تو آٹھ آدمیوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ کیدار جیسا سورما بھی مانتا ہے کہ یہ خطرناک ہے......"

وہ سوچ رہی تھی اور بے اختیار میرے چٹان جیسے پھیلے ہوئے سینے پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ میں نے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر کہا۔

"اگر مقابلہ پر مرد ہوں تو آٹھ کیا اٹھارہ سے بھی مقابلہ کر سکتا ہوں مگر ایک حسین عورت کو دیکھتے ہی مر جاتا ہوں۔"

وہ مجھ پر جھکتی ہوئی بولی۔

"ہاں۔ تو دیکھنے میں ایسا ہی ہے کہ کوئی بھی عورت تیرے آگ میں کود سکتی ہے۔"

کچھ دیر پہلے میں جادوئی شعلوں میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ شعلے مجھے سے جلا رہے تھے مگر یہ شعلہ میرے اندر پہنچ کر بھڑک رہا تھا۔ اگر میرے پاؤں آزاد ہوتے تو میں اس کی ساری شوخیاں اور مستیاں بھلا دیتا۔ اتنا تو میں شرطیہ کہتا ہوں کہ اس وقت اس پر بیخودی اور مستی کا عالم طاری ہو گیا تھا۔

مگر مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ میں اسے اور زیادہ متاثر کرنے کے لیے اپنے خیالات کی لہریں اس کے دماغ تک پہنچانے لگا۔ اس کے دماغ میں اس کی سوچ میں کہنے لگا۔

وہ ہاتے۔ اس قیدی کے اندر کتنے طوفان چھپے ہوئے ہیں۔ اگر میں اس کی رسیاں کھول دوں تو یہ مجھے ایسی مسرتیں دے گا، جو آج تک مجھے نہیں ملیں....."

ہر انسان کے اندر دو سوچیں ہوتی ہیں۔ مثبت اور منفی۔ ہاں اور ناں۔ اقرار اور انکار۔ وہ بھی پیار کرنے کے دوران اپنے دماغ سے لڑ رہی تھی۔

"نہیں۔ میں رسیاں نہیں کھولوں گی۔"

"کھولوں گی۔ یہ بہت خطرناک ہے۔"

"یہ دشمنوں کے لیے خطرناک ہے، مگر میرے حسن کا شیدائی ہے۔" میں نے اسے بہکایا۔

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں....." وہ تڑپ کر مجھ سے الگ ہو گئی اور متوحش نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے فوراً ہی آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت میری آنکھوں میں بلا کی مقناطیسی قوت آ گئی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس قوت سے واقف ہو جائے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ٹھوس ارادوں کی مالک ہے اتنی آسانی سے میری معمولہ نہیں بن سکے گی۔

اس وقت وہ سوچ رہی تھی۔

"مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں ہمیشہ ایک اٹل فیصلہ کرتی ہوں۔ ہاں یا ناں۔ مگر ابھی میرا فیصلہ ڈگمگا گیا تھا۔ اس مرد کی وجہ سے میری سوچ بدل گئی تھی۔ غلطی میری ہی تھی کہ میں اسے پیار کرنے کے لیے مچل گئی۔ یہی باتیں عورت کو کمزور بنا دیتی ہیں۔ اب میں اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔ یہ سچ مچ بہت ہی خطرناک ہے....."

وہ اٹل فیصلہ کر چکی تھی اس لیے اب اس کے دماغ پر جبراً حاوی ہونا دانشمندی نہیں تھی۔ میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"[illegible] کبھی نہیں بھول سکتا۔"

وہ جھڑک کر بولی۔

"مجھ سے ایسی باتیں نہ کر۔ میں تیری باتوں سے پگھلنے والی عورت نہیں ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک نوالہ میرے منہ میں ٹھونس دیا۔ میں نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔

"تمھیں پسند نہیں ہیں تو میں ایسی باتیں نہیں کروں گا۔ صرف اتنا بتا دو کہ یہ خوبصورت جسم کہاں سے چرا کر لائی ہو؟"

"کہیں سے بھی لائی ہوں۔ تجھے اس سے کیا لینا ہے؟"

"ہاں۔ اس جسم سے اب مجھے کچھ نہیں ملے گا۔ یہ میرے مقدر میں نہیں ہے۔ مگر تاج محل کی خوبصورتی دیکھ کر ہر شخص پوچھتا ہے کہ یہ کس نے بنایا اور کیسے بنایا؟ میں بھی یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ پھولوں سے تراشا ہوا جسم کس بدنصیب لڑکی کا ہے جسے تم نے حاصل کیا ہے اور کیسے حاصل کیا ہے؟"

یہ میں بھی جانتا ہوں اور تم بھی جانتی ہو کہ آج مجھے مرجانا ہے یہ آخری وقت مجھ پر بہت بھاری ہے تم باتیں کرتی رہو گی تو یہ وقت آسانی سے گزر جائے گا۔ میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں کیا اس کا جواب دینے میں تمھارا کوئی نقصان ہے؟"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں بھی وقت گزارنا چاہتی ہوں آدھی رات کے بعد تمھارے خون کی ضرورت پڑے گی۔ اس سے پہلے وہ نہیں آئے گی۔"

"کون؟"

"سامی۔"

"سامی کون ہے؟"

"وہی لڑکی۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "جس کا جسم تمھاری آنکھوں کے سامنے ہے۔"

میں اس پھول بدن کو ایک نئی دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ میرے سامنے سامی بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر وہ اندر سے سامی نہیں تھی۔ اس کا جسم چھین لیا گیا تھا اور روح نہ جانے کہاں بھٹک رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"میرے سامنے آدھی سامی ہے کیونکہ روح کے بغیر کوئی مکمل نہیں ہوتا۔ میں اس جسم کو کیا کہوں۔ سامی یا ایک جادوگرنی؟"

وہ ہنستی ہوئی بولی "مکان اسی کے نام سے پہچانا جاتا ہے جس کا اس پر قبضہ ہوتا ہے۔ اس جسم پر میرا قبضہ ہے اس لئے یہ میرے ہی نام سے پکارا جائے گا اور میرا نام چمپا ہے۔"

میں نے بدمزگی سے کہا۔

"جسم ہیرا، نام کنکر....."

"کنکر کو ہیرے کی چمک دینے کے لیے ہی میں نے اس جسم کا خوبصورت لیبل لگایا ہے۔ لیبل خوبصورت اور جاذب نظر نہ ہو تو مال کوئی نہیں خریدتا۔ اس دنیا کے بازار کا یہ پرانا دستور ہے۔ اب تو بڑے بڑے دولت مند اور اونچی حیثیت اور مرتبے والے مجھے حاصل کرنے کے لیے اپنی دولت اور عزّت تک کی بولی دیتے ہیں۔ عورت یہی چاہتی ہے کہ لوگ اس کے لیے تڑپتے رہیں اس کی آرزو کرتے رہیں۔ میری یہ خواہش پوری ہو رہی ہے مگر افسوس! میں کسی دولت مند اور گبرو جوان کو اپنانا چاہوں تو اسے اپنا نہیں بنا سکتی۔"

"کیوں نہیں بنا سکتیں؟"

وہ ناگواری سے بولی۔

"سامی کی روح بھٹک رہی ہے۔ جب بھی میں کسی مرد کے پاس جاتی ہوں وہ مجھے پریشان کرنے کے لیے آ جاتی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ اس کا یہ جسم کسی مرد کے سامنے سستا ہو جائے۔"

میں نے سامی کی آنکھوں میں جھانک کر چمپا کی روح سے کہا۔

"تعجب ہے۔ تم جادو منتر جانتی ہو پھر بھی سامی کی روح تمھیں پریشان کرتی ہے کیا تم اس پر قابو نہیں پا سکتیں؟"

"ہاں!" اس نے جواب دیا۔ "آج میں تمھاری بھینٹ دے کر اُسے اپنے قابو میں کروں گی۔"

میں ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر اسے غصے سے دیکھنے لگا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ مجھے غصے کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ اسے باتوں میں بہلانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ باتوں ہی باتوں میں اپنی کوئی کمزوری ظاہر کردے۔ دانشمندی یہی تھی کہ میں اس کی کسی کمزوری سے فائدہ اٹھاؤں اور اپنے ساتھ سامی کی رُوح کو بھی اس کے طلسم سے بچاؤں۔ میں نے فوراً ہی مسکراتے ہوئے کہا۔

" تم کہتی ہو کہ وہ اپنے جسم کو کسی غیر مرد کے ساتھ نہیں جب... تمھیں پریشان کرتی ہے۔ پھر اس وقت وہ تمھیں پریشان کرنے کیوں نہیں آئی؟"

"کیدار منتر پڑھ رہا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے ابھی تم سے کہا ہے کہ ایک کالی بلّی تمھارے لہو سے اشنان کرے گی۔ سامی کی رُوح اسی کالی بلّی کے جسم میں چھپی ہوئی ہے۔ جب تک کیدار جاپ کرتا رہے گا وہ بلّی کے جسم سے نکل کر یہاں نہیں آسکے گی۔"

میں نے پوچھا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تم سامی کے جسم کو گناہوں سے آلودہ کر سکتی ہو۔ وہ تمھیں پریشان کرنے نہیں آئے گی۔"

"ہاں۔ اس وقت وہ نہیں آئے گی مگر میں یہ قصّہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتی ہوں۔ اس کی رُوح کو ہمیشہ کے لیے اس کالی بلّی کے جسم میں قید کر دینا چاہتی ہوں۔ پھر وہ کبھی مجھے پریشان کرنے نہیں آئے گی۔"

"مجھے اس بے چاری سے ہمدردی ہے۔"

وہ ہنستی ہوئی بولی۔

"اپنی موت کو بھول کر اس سے ہمدردی کر رہے ہو؟"

"افسوس تو اسی بات کا ہے کہ وہ میرے ہی لہو سے بلّی کے جسم میں ہمیشہ کے لیے قید ہو جائے گی۔ یقین تو نہیں ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ مگر میں سچ اور جھوٹ کو دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہوں گا۔ میں اس بیچاری کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ ویسے اس کے متعلق کچھ نہ کچھ سنتے وقت ایک عجیب سی آسودگی محسوس کرتا ہوں۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ کون ہے؟ اور تم نے کس طرح اس کا یہ جسم حاصل کیا ہے؟"

اس نے ہانڈیوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"اس کا نام سامی پوکر ہے۔ وہ ایک انگریز کمشنر جان پوکر کی بیٹی ہے۔ باپ انگریز اور ماں ہندوستانی...... یورپ اور ایشیا کے جذباتی ملاپ سے سامی کو جو لاجواب حُسن ملا ہے وہ تمھاری نظروں کے سامنے ہے۔ تم اس حُسن و شباب کو آنکھوں سے دیکھ سکتے ہو مگر لفظوں میں اس کی صحیح اور مکمل تعریف نہیں کر سکتے۔ بس یہ ایسی چیز ہے کہ اسے دیکھ کر بے اختیار چھونے کو جی چاہتا ہے اور چھو کر کلیجے میں چھپا لینے کی خواہش ہوتی ہے۔ میں اسے اپنے کلیجے میں چھپا تو نہ سکی، خود اس جسم میں آکر چھپ گئی ہوں۔ یہی میری سب سے بڑی کامیابی ہے۔

میں نے اسے ناگپور میں دیکھا تھا۔ ان دنوں میں رُوح کو ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل کرنے کے منتر سیکھ رہی تھی اور جانوروں پر یہ منتر آزما رہی تھی۔ کیدار میرا چیلا ہے۔ اسے جادو منتر سیکھنے کا شوق ہے اس لیے میرا سا... لگا رہتا ہے۔ تو اُسے دیکھ چکا ہے وہ تیس برس کا گبرو جوان ہے۔ تیری ہا... شہ زور ہے۔ میں تو اس پر مرمٹی ہوں۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب... اپنے بوڑھے جسم کو چھوڑ کر جوان بن جاؤں گی تو اپنی جوانی کی پہلی رات اس کی آغوش میں گزاروں گی۔

جب جانوروں پر میرے تجربے کامیاب ہونے لگے تو میں... منتروں کو اپنے آپ پر آزمانا چاہا۔ پہلے میں زبان سے منتر پڑھتی تھی اب... لیے ان منتروں کو زبان کی بجائے رُوح کی گہرائیوں میں اتارنے کی ضرو... تھی۔ کچھ پُراسرار علوم ایسے ہوتے ہیں جو رُوح کی گہرائیوں میں چھپا کر رکھے... ہیں تاکہ جسم اگر مر جائے، کٹ جائے یا برباد ہو جائے تو رُوح منتروں... پر کچھ دیر تک اس دنیا میں موجود رہے، اور اپنے کسی بھی مطلوبہ جسم پر... ہو جائے۔

ان دنوں ہم ناگپور شہر سے تین میل دُور ایک جنگل میں رہتے تھے... جیسے یہاں جنگل جھاڑیوں کے بیچ یہ چھوٹا سا مٹی کا مکان ہے ویسے ہی... ایک چھوٹی سی کٹیا تھی۔ اس کٹیا کے چاروں طرف میں نے رکھشا کنڈل کھ... دیا تھا تاکہ ہماری کٹیا کسی کو نظر نہ آئے، اور نہ ہمارے منتر پڑھنے کی آواز کسی... کانوں تک پہنچے۔ وہاں میں کیدار کو دو طرح کے منتر سکھانے لگی۔ ایک منتر جسے پڑھ کر کسی کے جسم سے رُوح نکالی جاتی ہے۔ دوسرا وہ منتر جس کے ذریعہ اس رُوح کو کسی مطلوبہ جسم میں داخل کیا جاتا ہے۔ لیکن کیدار بہت کند ذہن ہے۔ اس کا بدن جیسے پتھر کی طرح سخت ہے ویسے ہی دماغ بھی پتھر ہے۔ اُلٹ پلٹ کر پڑھے جانے والے منتر اس کی کھوپڑی میں نہیں... اس نے اب تک صرف چھوٹے موٹے جادوئی تماشے دکھانے والے منتر سیکھے ہیں اور میں جو کچھ اسے سکھانا چاہتی تھی وہ اس کے لیے بہت کٹھن... جب اِدھر اُدھر سے اُلٹ پلٹ کر پڑھنے کا وقت آتا تو وہ تمام منتر بھو... جایا کرتا تھا۔

پھر بھی میں بڑے صبر سے اسے سکھاتی رہی۔ ان ہی دنوں ہم... دن شہر کی طرف گئے تو ہمیں سامی نظر آگئی۔ اس کے حُسن و شباب کو دیکھ کر ہم دونوں للچا گئے۔ کیدار نے کہا۔

"چھمیا! اگر تو اس چھوکری کے جسم میں چلی جائے تو میں ساری زندگی تیرا غلام بن کر رہوں گا۔ ماں قسم ایسی چنچل جوانی میں نے پہلے نہیں دیکھی۔"

وہ اپنی کوٹھی کے لان میں اپنی سہیلیوں اور دوستوں کے ساتھ منٹن کھیل رہی تھی۔ کھیل کے دوران اِدھر سے اُدھر تھرک رہی تھی، اچھل رہی تھی، کود رہی تھی، پارے کی طرح مچل رہی تھی اور ننگا ہوں کے... بجلی کی طرح لپک رہی تھی۔ میں بھی ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہو گئی...

نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں اس جسم کو حاصل کر کے رہوں گی۔

ہم دونوں رات گئے تک اس کوٹھی کے چکر لگاتے رہے۔ کوٹھی کے ملازم سونے کے لیے اپنے کوارٹروں میں چلے گئے تھے۔ صرف ایک چوکیدار پہرہ دے رہا تھا۔ ہم پائیں باغ سے داخل ہوئے۔ کیدار نے پیچھے سے جا کر چوکیدار کو دبوچ لیا۔ میں ان کی طرف سے بے فکر ہو کر کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ میں جانتی تھی کہ کیدار جیسے پہلوان کے شکنجے سے آزاد ہونا چوکیدار کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہم نے پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ کیدار اس چوکیدار کا خاتمہ کرنے کے بعد ایک ٹیکسی لے کر آجاتا اور میں سامی کو اپنے منتروں سے سحرزدہ کر کے اسے کوٹھی سے باہر لے آتی۔ پھر ہم اسے ٹیکسی میں بٹھا کر لے جاتے۔ ہم نے جو سوچا وہی ہوا۔ سامی کے ماں باپ اپنے کمرے میں سو رہے تھے۔ سامی کا کمرہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ہولے سے دستک دی۔ دو تین بار دستک دینے کے بعد اس نے دروازہ کھولا۔ اس کی آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کچی نیند سے اُٹھ کر آئی ہے۔ دروازہ کھول کر اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ میں نے اسے کچھ کہنے کا موقعہ نہیں دیا۔ فوراً ہی منتر پڑھنے لگی۔ اس کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر زبان لڑکھڑا گئی۔ وہ منتر کے زیر اثر آگئی تھی۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر زیر لب بدبداتی ہوئی کوٹھی کے باہر جانے لگی۔ وہ چپ چاپ میرے ساتھ ایسے چل رہی تھی، جیسے کوئی نیند کی حالت میں اٹھ کر چلتا ہے۔

کوٹھی کے مین گیٹ کے باہر آکر ہم دونوں ایک درخت کے سائے میں کھڑے ہو گئے۔ میں برابر منتر پڑھتی جا رہی تھی۔ آدھے گھنٹے کے بعد کیدار ٹیکسی لے کر آگیا۔ ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کیدار اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ تھا۔ پھر ٹیکسی چل پڑی۔

راستے میں ڈرائیور نے میری طرف پلٹ کر دیکھا اور کیدار سے پوچھا۔

"یہ بوڑھی مائی کیا گیتا کے اشلوک پڑھ رہی ہے؟"

کیدار نے جواب دیا۔

"ہاں۔ یہ بہت دھرم کرم والی ہے۔ جب تک جاگتی رہتی ہے کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی ہے۔"

ڈرائیور کی تسلی ہو گئی۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ میں منتر پڑھ رہی ہوں۔ آگے چل کر کیدار نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ ہمیں شہر سے باہر لے چلے۔ اس نے اتنی رات کو زیادہ دور جانے سے انکار کیا۔ کیدار نے چاقو نکال کر اس کی نوک ڈرائیور کی پسلی میں چبھو دی۔

"جہاں کہتا ہوں وہاں چلو، ورنہ چیخنے کی بھی مہلت نہیں ملے گی۔"

وہ ہمارے بتاتے ہوئے راستے پر مجبوراً چلنے لگا۔ جنگل کے ایک کچے راستے پر پہنچ کر کیدار نے ٹیکسی رکوا دی۔ میں سامی کے ساتھ اتر کر زیرِ لب بدبداتی ہوئی اس طرف جانے لگی جہاں ہماری کٹیا تھی۔ تھوڑی دور جا کر میں نے رات کے سناٹے میں ڈرائیور کی چیخ سنی۔ وہ اس کی زندگی کی آخری چیخ تھی۔ کیدار نے اسے ختم کر دیا تھا۔

کٹیا میں پہنچ کر میں نے منتروں کا جاپ ختم کر دیا۔ سامی ایکدم سے ہوش میں آگئی۔ اور چونک کر اس کٹیا کو دیکھنے لگی۔ پھر اسے اس طرح لائے جانے پر اس نے خوب شور مچایا۔ مجھے مارنے کے لیے دوڑی مگر کیدار نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ تو پہلے ہی اس کا دیوانہ تھا۔ اسے دیوانہ وار چومنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر وہ بہت ہی تیز طرار اور ضدی تھی۔ اسے اتنا بھی موقعہ نہیں دے رہی تھی کہ وہ اپنے ہونٹوں کی پیاس بجھا سکے۔ میں نے کہا۔

"کیدار! رُک جاؤ۔ یہ لڑکی میں اپنے لیے لائی ہوں۔ جب تک میں اس کا جسم حاصل نہ کروں، اُس وقت تک صبر کرو۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ اپنی جوانی کا پہلا نذرانہ تمھیں دوں گی۔ اسے رسیوں سے باندھ دو۔"

کیدار حکم کا بندہ ہے۔ وہ اسے رسیوں سے باندھنے لگا۔ سامی چیخ رہی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ چیخنا چلانا فضول ہے ہم نے کٹیا کے چاروں طرف نظر بندی اور سماعت بندی کی ریکھائیں کھینچ دی ہیں۔ نہ اس کی آواز کٹیا کے باہر جائے گی اور نہ کوئی یہاں تک اس کی مدد کیلئے آئے گا۔

آخر خوب چیخنے چلانے کے بعد میری باتیں اس کی سمجھ میں آگئیں۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ میں کسی طرح اس کی رُوح اس کے جسم سے نکال کر اپنی رُوح کو اس حسین سراپا میں ڈھالنا چاہتی ہوں۔ میری باتیں سُن کر اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ حیران پریشان ہو کر دیدے پھیلائے ہمیں تکنے لگی۔

یہ تو مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ کیدار برسوں میں بھی وہ منتر یاد نہیں کر سکے گا جو میں اسے سکھانا چاہتی تھی۔ میں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ ایک تختی پر وہ دونوں منتر لکھ دیئے۔ ایک انگیٹھی میں آگ روشن کر دی اور انگیٹھی کے پاس ایک مٹی کے برتن میں ماش کی دال رکھ کر کیدار سے کہا کہ وہ تختی سامنے رکھ کر منتر پڑھتا جائے اور ہر منتر کے بعد ماش کا ایک دانہ آگ میں پھینکتا جائے۔

عمل کچھ ایسا تھا کہ وہ جسم سے رُوح نکالنے کا منتر چالیس بار پڑھتا اور ماش کے چالیس دانے آگ میں پھینکتا۔ اس دوران میں آگ کے سامنے دم سادھے بیٹھی رہتی۔ اور اس منتر کو سُن سُن کر اسے اپنی رُوح میں جذب کرتی جاتی۔ اس کے بعد رُوح کو کسی جسم میں داخل کرنے کا منتر اسی طرح چالیس بار پڑھا جاتا۔ اس عمل میں بڑی ہیرا پھیری ہے۔ میں تمھیں تمام باتیں تو نہیں بتا سکتی۔ بس اتنا سمجھ لو کہ یہ عمل بھی کیدار کے پلّے نہ پڑا۔ تختی پر لکھ دینے کے باوجود اس منتر کو اُلٹ کر پڑھتے وقت اس سے غلطی ہو جاتی تھی۔ اگر کبھی صحیح پڑھ جاتا تو ماش کے دانے کو آگ میں پھینکنا بھول جاتا۔ اس کے دماغ میں گوبر بھرا ہوا تھا۔ لڑنے مرنے کے معاملے میں اُستاد تھا مگر دماغی کام کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

دو ہفتے تک یہی ہوتا رہا۔ میں ہر رات آگ روشن کر کے اسے پڑھنے

بٹھادیتی اور خود دم سادھ کر بیٹھ جاتی۔ سامی ایک کونے میں رسیوں سے بندھی فرش پر چپ چاپ بیٹھی ہمیں دیکھتی رہتی تھی۔ ایک ماہ گزرنے کے بعد کیدار نے پہلا منتر چالیس بار پڑھ لیا۔ میں نے اپنے اندر محسوس کیا کہ اب میں اپنی آتما کی شکتی سے جب چاہوں اپنے جسم سے باہر نکل سکتی ہوں۔

اب اس منتر کو اپنی آتما تک پہنچانا تھا جس کے ذریعہ میں سامی کے جسم میں داخل ہو سکتی تھی۔ میں نے سامی کو دیکھا تو وہ خاموش بیٹھی ٹکٹکی انگیٹھی سے اٹھنے والے شعلوں کو گھور رہی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھیں ایسی سرخ انگارہ ہو گئی تھیں جیسے اس کے اندر بھی کوئی آگ بھڑک رہی ہو۔ میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر کر کیدار سے کہا کہ اب وہ دوسرا منتر اسی طرح چالیس بار پڑھے۔

وہ پڑھنے لگا اور اپنی عادت کے مطابق غلطی کرنے لگا۔

پھر اسی طرح ہر رات انگیٹھی روشن ہوتی رہی۔ کبھی کبھی وہ صحیح پڑھتا تھا مگر آخر تک پہنچ کر کوئی غلطی کر جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ اسے پھر شروع سے پڑھنا پڑتا تھا۔ اس کی بار بار کی غلطی سے میری بھی سانس ٹوٹ جاتی تھی اور مجھے نئے سرے سے سمادھ لگانی پڑتی تھی۔

آخر ایک رات وہ چالیس بار صحیح پڑھ گیا۔ اس وقت مجھے اپنی آتما شکتی کا گیان ہوا۔ میری روح جسم سے نکل سکتی تھی اور کسی بھی جسم میں داخل ہو سکتی تھی۔ میں نے سامی کی طرف دیکھا تو وہ سانس روکے بیٹھی ہوئی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ میں سمادھ لگائے اب تک بیٹھی رہی تھی۔ بڑی عجیب سی بات تھی۔ وہ اس طرح کیوں بیٹھی ہوئی تھی۔ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے بیٹھے بیٹھے مر گئی ہے۔ میں نے کیدار سے کہا۔

”اس کی رسیاں کھول دو۔ اب میں اس کے جسم میں جاؤں گی۔“

وہ اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ پھر اس نے جیسے ہی اسے ہاتھ لگایا وہ ایک لاش کی طرح فرش پر لڑھک گئی۔ کیدار نے حیرت سے کہا۔

”ارے۔ یہ تو مر چکی ہے۔“

یہ سنتے ہی میں نے آتما کی شکتی سے فوراً ہی اپنے بوڑھے جسم کو چھوڑ دیا۔ میں اسی وقت سامی کے جسم میں داخل ہونا چاہتی تھی، مگر پہلی بار اپنے جسم سے آزاد ہوئی تھی۔ پہلی بار اپنی آتما کی شکتی سے اس دنیا کو دیکھ رہی تھی۔ میں کیا بتاؤں کہ روح کی بصارت سے یہ دنیا کتنی حسین اور رنگین نظر آتی ہے۔ جو حسن انسان کی ظاہری آنکھوں میں چھپا رہتا ہے اسے میں باطنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ میرے چاروں طرف رنگا رنگ نور کا ہالا چھایا ہوا تھا۔ میں کیدار کو دیکھ رہی تھی، مگر وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ کیا کوئی انسانی آنکھ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ کیدار اس وقت سامی کے مردہ جسم کو رسیوں سے آزاد کر رہا تھا۔ تب میں نے سامی کی لاش کے سامنے ایک نورانی سراپا دیکھا۔ اس سراپا کی کوئی شکل صورت نہیں تھی۔ وہ مجسم نہیں تھا مگر سامی کے قد کے برابر جھلمل جھلمل لہرا رہا تھا۔

میں سامی کی طرف بڑھی تو وہ مجھ سے ٹکرا گیا۔ میرا راستہ روکنے لگا تھا کہ وہ ہوا تھی، وہ کیسی شکتی تھی جو مجھے سامی تک پہنچنے نہیں دے رہی تھی۔ میں اس سے ٹکرائی مگر انجانی شکتی نے مجھے سامی تک پہنچنے کا راستہ نہ دیا۔ میں پلٹ کر اپنے بوڑھے جسم میں آ گئی۔

میرے بوڑھے جسم کو زندہ ہوتے دیکھ کر کیدار نے پوچھا۔

”کیا بات ہے چھمیا۔ تو اس کے شریر (جسم) میں کیوں نہیں گئی؟“

میں نے جواب دینے سے پہلے وحشت زدہ نظروں سے سامی کی لاش کی طرف دیکھا تو وہ اچانک زندہ ہو کر بیٹھ گئی اور قہقہے لگانے لگی۔ میں اور کیدار حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگے۔ تب اس نے کہا۔

”بوڑھی حرافہ! تیرا یہ آدمی جتنے دنوں سے منتر پڑھ رہا ہے اتنے دنوں میں ایک طوطا بھی اسے سن سن کر یاد کر لیتا۔ تو یہاں سمادھ لگا تھی میں یہاں سمادھ لگایا کرتی تھی۔ تو کوئی آسمان سے اتر کر نہیں آئی ہے کہ جو تو کر سکے وہ میں نہ کر سکوں۔ تیرے ہر عمل کو میں تیری طرح دہراتی گئی تھی۔ جو تو نے حاصل کیا ہے وہ میں نے بھی حاصل کر لیا ہے۔ اب آ، دیکھتی ہوں کہ تو کس طرح میرے جسم پر قبضہ کرتی ہے.....“

میں شدید حیرانی سے اسے دیکھتی رہی۔ میں کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ وہ اتنی چالاک ہو گی کہ میری طرح سمادھ لگا کر ان منتروں کو اپنی آتما میں جذب کرے گی۔ اسے کہتے ہیں کہ مور کھ کی ہزار دن اور چاتر کی ایک گھڑی۔ کیدار مہینوں میں جو نہ سیکھ سکا۔ اسے وہ ایک ذہین طالبہ کی طرح سبق کی طرح یاد کر گئی۔ میں نے غصہ سے تلملاتے ہوئے کہا۔

”کیدار! اس حرام زادی کو پکڑ کر مار۔ خوب اچھی طرح پٹائی کر۔“

کیدار نے آگے بڑھ کر اسے ایک ہاتھ جمایا تو وہ فوراً ہی مردہ ہو کر کیدار اسے پھر بھی تڑا تڑ مارے جا رہا تھا۔ میں نے جھلا کر کہا۔

”الو کے پٹھے! اب کسے مار رہا ہے۔ اسے کیا خاک تکلیف پہنچے گی۔“

وہ خجالت سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے دور ہوتے ہی وہ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی اور مجھے حقارت سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”تیری آتما میرے جسم تک آئے گی تو میں آنے نہیں دوں گی۔ تو ابھی دیکھ چکی ہے اور میرے قریب تیرا یہ آدمی آئے گا تو میں مردہ بن جاؤں گی۔ ہر طرح سے تیری مات ہے۔ اچھی طرح سوچ لے اور مجھے اپنے ساتھ یہاں سے جانے دے۔“

میں سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے مجھے الجھا دیا تھا۔ کیدار کی سمجھ میں بھی آ گیا تھا کہ وہ لڑکی اپنی آتما کی شکتی سے مجھے اپنے جسم میں داخل ہونے کا موقع نہیں دے رہی ہے۔ اس نے کہا۔

”چھمیا! تجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی۔ تو نے اس کے سامنے مجھے منتر پڑھنے کے لیے کیوں کہا تھا؟“

میں نے جھلا کر کہا۔

”تیرے ساتھ رہتے رہتے میری مت بھی ماری گئی ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ اتنے تیز دماغ کی لڑکی ہے۔ کیا جان بوجھ کر کوئی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارتا ہے؟“

کیدار اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔

”کیا اس کی آتما اپنے شریر سے الگ ہو کر مجھے نقصان پہنچا سکتی ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ صرف جسم چھوڑنے اور جسم میں داخل ہونے کے منتر سیکھ گئی ہے۔ اس کی آتما صرف دوسری آتماؤں سے لڑ سکتی ہے مگر زندہ انسانوں کو اپنی لاش تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔“

کیدار نے کہا۔ ”تو پھر تو اس کا خیال چھوڑ دے کیونکہ تو اس کی آتما سے نہیں لڑ سکتی اور میں اس کے جسم سے کھیل کر اپنی بھوک مٹا سکتا ہوں۔“

سامی گھبرا کر اسے دیکھنے لگی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ یہ سیدھی طرح نہیں مانے گی تو تو اس کی پارسائی ختم کر دینا۔ بول سامی! اب کیا کہتی ہے؟ اپنا جسم میرے حوالے کرے گی یا بے آبرو ہونا پسند کرے گی؟“

اس نے جواب دیا۔

”یہ جسم تیرے پاس ہو گا تو نہ جانے کتنوں کے آگے تو اسے کھلونا بنا دے گی۔ میں جب سے پیدا ہوئی ہوں تب سے اپنے وجود سے محبت کرتی ہوں۔ یہ دنیا عورت کو اس کی آتما سے اور اس کی ذہانت سے نہیں پہچانتی ہے۔ صرف اس کے خوبصورت جسم کو دیکھ کر اس پر مرمٹتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ کتنے ہی لوگ حسرت سے میرے جسم کو دیکھتے ہیں اور مجھے حاصل کرنے کے لیے دیوانہ وار اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ خوش نصیبی سے مجھے ایسا جسم ملا ہے تو میں اسے کیوں چھوڑ دوں۔ اس دنیا کے بازار میں کس لیے اپنی حیثیت گرا دوں؟ کیا جان بوجھ کر کوئی اپنے وقار، اپنی عزت اور اپنی شہرت کو دوسروں کے حوالے کرتا ہے؟ کبھی نہیں۔ اس جسم کی نشوونما کے لیے میں نے دن رات محنت کی ہے۔ ورزش اور کھیل کود کے ذریعہ اس کے ایک ایک حصہ کو جاذب نظر بنایا ہے۔ اسنو، پاؤڈر، کریم، لونڈر اور مہنگی خوشبوؤں سے اس میں رنگینی اور سنگینی پیدا کی ہے اور اس جسم کو بڑی محبت اور بڑے فخر کے ساتھ ایک خوبرو انجانے محبوب کی آغوش میں پیش کرنے کا خواب دیکھا ہے نہ جانے وہ انجانا محبوب کہاں ہے؟ اور کب مجھے ملے گا؟ اور تو ہے کہ اس سے پہلے ہی میرے جسم کو چھین لینا چاہتی ہے۔ تیری یہ آرزو کبھی پوری نہیں ہو گی۔ اگر تو مجھے اس آدمی کے حوالے کرنا چاہے گی تو اس کے قریب آنے سے پہلے ہی میں مردہ بن جاؤں گی۔ کیا یہ ایک لاش کی بے حرمتی کر سکے گا؟“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”تو لاش بن جائے گی تب بھی یہ تیرے جسم کو ننگا کرے گا۔ اس سے جیسے بھی ہو سکے گا، یہ تیری بے عزتی کرے گا۔ اس کے بعد تیرا سر مونڈ دے گا، تیری ناک اور کان کاٹے گا اور تجھے بدصورت بنا کر یہاں چھوڑ دے گا۔ جسے میں حاصل نہ کر سکوں گی اسے تیرے پاس بھی سلامت نہیں رہنے دوں گی۔ پھر فخر کرتی رہنا اپنی بدصورتی پر.....“

سامی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ مردہ بن کر اور ہمیں دھمکیاں دے کر بھی وہ اپنے جسم کی حفاظت نہیں کر سکے گی۔ میں نے کہا۔

”تو یہاں سے اپنا جسم لے کر جائے گی تو کیدار اسے برباد کر دے گا۔ اگر تو چاہتی ہے کہ یہ سلامت رہے تو پھر اسے چھوڑ کر چلی جا.....“

وہ بے بسی سے اپنے رس بھرے ہونٹوں کو چبا رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

”میں ابھی تم دونوں کے آگے بے بس ہوں مگر اس جسم کی حفاظت بھی کرنا چاہتی ہوں۔ اچھی بات ہے، میں اسے چھوڑتی ہوں مگر یاد رکھ۔ تو اس جسم میں آ کر سکون سے نہیں رہ سکے گی۔ جب بھی تو اسے کسی مرد کے حوالے کرنا چاہے گی، میں تیرے ارادوں کے سامنے دیوار بن جاؤں گی۔ تیرا جینا حرام کر دوں گی.....“

یہ کہتے ہی وہ مردہ بن کر فرش پر لڑھک گئی۔ میں انسانی جسم میں رہ کر اس کی روح کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسے دیکھنے کے لیے میں نے بھی اپنا جسم چھوڑ دیا۔

وہ نورانی سراپا نظر آ رہا تھا۔ سامی سے دور جھلملا رہا تھا۔ میں سامی کے قریب گئی تو اس نے مجھے نہیں روکا۔ اس کی آتما دور ہی رہی۔ میں فوراً ہی اس حسین جسم میں سما گئی۔“

چھمیا یہ کہہ کر ذرا دیر کے لیے چپ ہو گئی۔ میں اسے دیکھ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ میں کسے دیکھ رہا ہوں۔ سامی کو یا چھمیا کو؟

میری نگاہوں کے سامنے سامی کا حسین سراپا تھا لیکن ان غزالی آنکھوں کے پیچھے سے چھمیا دیکھ رہی تھی۔ اور اس کی شیریں زبان سے ایک چڑیل بول رہی تھی۔ اس وقت اس کی توجہ میری طرف نہیں تھی اس کا دھیان کیدار کی طرف تھا۔ وہ غور کر رہی تھی کہ جو کچھ اسے بتایا گیا ہے وہ صحیح طور سے پڑھ رہا ہے یا نہیں۔ پھر وہ مطمئن ہو کر بولی۔

”ٹھیک پڑھ رہا ہے۔ چھوٹا سا منتر ہے۔ اس لیے گڑبڑ نہیں کرے گا۔ مگر کچھ بھی ہو، ایک نمبر کا گدھا ہے۔ کوئی سی بات ہو جلدی اس کے دماغ میں نہیں گھستی۔ اس رات بھی جب میں پہلی بار سامی کے جسم میں جوان ہوئی تو اس نے یہی سمجھا کہ بوڑھی چھمیا مردہ ہو گئی ہے اور سامی پھر سے زندہ ہو کر اسے دیکھ رہی ہے۔

میں اٹھ کر مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھنے لگی تو اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔

”رک جاؤ! پہلے مجھے بتاؤ کہ چھمیا کی آتما کہاں ہے؟“

”میں تمہاری چھمیا ہوں۔“ میں نے دونوں بانہیں پھیلا کر کہا۔ ”مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر دیکھو۔“

”نہیں۔ تم سامی ہو۔ تم نے چھمیا کی آتما کو مار ڈالا ہے۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مورکھ! آتما کبھی نہیں مرتی اور نہ ہی اُسے کوئی مار سکتا ہے۔ اس جسم میں اگر سامی کی آتما ہوتی تو وہ تجھے کبھی اس طرح پیار سے نہ بُلاتی۔"

اس کی سمجھ میں بات آگئی۔ اس نے پوچھا۔

"سامی کی آتما کہاں ہے؟"

میں نے جواب دیا۔

"کچھ دیر پہلے میں نے اسے کٹیا میں دیکھا تھا، اب وہ یہاں ہے یا نہیں۔ اسے دیکھنے کے لیے مجھے اس جسم سے نکلنا ہوگا اور اب میں کسی قیمت پر یہ جسم نہیں چھوڑوں گی۔ ہائے دیکھو تو میں کیسی حسین اور جوان نظر آرہی ہوں۔"

میں اس جسم کو اِدھر اُدھر سے چھُو کر دیکھنے لگی۔ جوانی کا ایک عجیب نشہ تھا جو برسوں کے بعد مجھے نصیب ہوا تھا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ کیدار میرے حسن و شباب کی تعریف کرتا رہے۔

۔ اچانک ہی میری

سانسیں رُکنے لگیں۔ ایسا لگا جیسے کوئی مجھے سانس لینے سے روک رہا ہے۔ وہ سامی کی رُوح تھی جو میری ناک کے راستے اس جسم میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ ایک جسم میں دو رُوحیں نہیں سما سکتیں اس لیے اس کا راستہ رُکا ہوا تھا اور وہ میرے سانس لینے کے راستے میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی۔

میں بدحواسی میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی اس لیے لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑی۔

اور گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ اب سانس لینے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں بوکھلا کر اور دیدے پھاڑ پھاڑ کر اپنے آس پاس دیکھنے لگی۔ دیدے پھاڑنے سے کیا ہوتا ہے اس کی آتما مجھے نظر نہیں آسکتی تھی۔

"کیا ہوا چھمیا؟"

"وہ ... وہ سامی کی رُوح مجھے ستا رہی ہے۔ ابھی میری سانسیں رُکنے لگی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے ہوا میرے نتھنوں میں آکر پھنس گئی ہے۔ وہ میرے سانس لینے کے راستے میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔"

کیدار نے کچھ سوچ کر کہا۔

"سانس رُکنے سے بھلا تمھیں کیا تکلیف ہوگی۔ جب وہ ایسی حرکت کرے تو تم فوراً ہی اس کے جسم سے الگ ہو جاؤ۔"

"نہیں۔ میں اس جسم کو نہیں چھوڑ سکتی۔ چھوڑوں گی تو وہ پھر اس پر قبضہ کرے گی۔ میں نے کئی ماہ کی محنتوں کے بعد اسے حاصل کیا ہے۔ ہائے دیکھو میں کتنی خوبصورت ہو گئی ہوں۔ نہیں، میں اسے نہیں چھوڑ سکتی۔"

"تمھاری مرضی۔" کیدار نے جھُک کر میرا بازو پکڑ لیا اور زمین سے اٹھاتے ہوئے بولا "تم اپنا وچن پورا کرو۔ تم نے کہا تھا کہ جوان ہوتے ہی سب سے پہلے مجھے خوش کرو گی۔"

میں اپنا بازو چھُڑا کر اس سے الگ ہو گئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سامی کے جسم کو اس سے دور لے گئی اور پریشان ہو کر بولی۔

"مجھے اپنا وچن یاد ہے مگر وہ نہیں چاہتی کہ میں تمھارے قریب آؤں۔ وہ پہلے ہی کہہ چکی ہے کہ جب بھی میں یہ جسم کسی مرد کے حوالے کرنا چاہوں گی وہ میرے راستے کی دیوار بن جائے گی۔ کیدار! میں بڑی اُلجھن میں پڑ گئی ہوں۔ انسانی جسم میں رہ کر اس کی آتما سے نہیں لڑ سکتی اور میں یہ جسم چھوڑنا بھی نہیں چاہتی۔ تم ذرا صبر کرو۔ پہلے ہم یہاں سے کہیں دور چلے جائیں گے سامی کی رُوح زیادہ دیر تک منتروں کے بل پر جسم کے بغیر نہیں رہ سکتی اسے جلد سے جلد کسی دوسرے جسم میں داخل ہونا پڑے گا۔"

کیدار نے میری بوڑھی لاش کی طرف اشارہ کیا جو زمین پر پڑی ہوئی تھی۔

"تمھارا یہ جسم خالی پڑا ہے اگر رُوح زیادہ دیر تک منتروں کے بل پر نہیں رہ سکتی تو پھر وہ اس بوڑھے جسم میں کیوں نہیں آجاتی؟"

میں نے آس پاس دیکھتے ہوئے سوچا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے کہ وہ میرے بوڑھے جسم میں داخل نہیں ہوئی۔ شاید میرا بڑھاپا اور کالا کلوٹا جسم اسے پسند نہیں تھا لیکن ایسے وقت پسند یا ناپسند کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے خود اپنے بوڑھے جسم سے نکل کر دیکھا تھا۔ میری آتما منتروں کے باوجود ڈگمگا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے منتروں سے آزاد ہو کر اس دنیا سے دور آتما لوک کی طرف چلی جانا چاہتی ہے۔ سامی کسی جسم کے بغیر آخر کب تک اس دنیا میں رہ سکتی ہے؟

بہر حال جو کچھ بھی ہو، میں نے اسی وقت منتر پڑھ کر اپنی بوڑھی لاش کو شعلوں کی نذر کر دیا۔ تاکہ سامی کی آتما کچھ دیر کے لیے بھی اسے حاصل نہ کر سکے پھر ہم نے اپنا ضروری سامان سمیٹا اور وہاں سے جانے لگے۔ اس وقت تک میرا بوڑھا جسم جل کر کوئلہ بن چکا تھا۔ اور اب اس بات کا خدشہ نہیں تھا کہ سامی کی آتما بوڑھے جسم میں سما کر ہمارا پیچھا کرے گی۔

اس وقت چاند نکل آیا تھا اور جنگل کی ہریالی دور تک روشن ہو گئی تھی۔ ہم دونوں تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے شہر کی طرف جا رہے تھے آس پاس کے درختوں پر کبھی کبھی بندروں کے کھکھیانے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کبھی کوئی بندر اور بندریا ایک درخت سے دوسرے درخت پر چھلانگیں لگاتی ہوئی دور تک چلی جاتی تھی۔ ہم جنگلوں میں رہنے کے عادی ہیں اس لیے تمام جانوروں کی آہٹوں کو پہچانتے ہیں۔ ہاں مگر سامی کی آہٹ کو نہیں پہچان رہے تھے۔

شہر پہنچ کر ہم ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے لگے۔ ایک تپلی سی گلی سے گزرتے وقت ہم نے ایک مکان کے سامنے بندریا کا مُردہ جسم دیکھا شاید وہ کسی کی پالتو بندریا تھی۔ ہمیں کون سا اس کی لاش پر ماتم کرنا تھا۔ لہٰذا اس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے گزر گئے۔

جب ہم اسٹیشن پہنچے تو پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہی ایک کالی

بلی ہمارا راستہ کاٹتی ہوئی گزر گئی۔ یہ بُرا شگون تھا۔ میں اپنی جوانی کے نئے سفر کا آغاز کرنے والی تھی۔ ایسے وقت اس بلی نے میرے دل میں وسوسہ پیدا کر دیا تھا تاہم میں نے کیدار سے اپنی پریشانی کا ذکر نہیں کیا۔ اس وقت کلکتے جانے والی میل ٹرین کا وقت ہو گیا تھا۔ کیدار ٹکٹ لینے چلا گیا۔ میں پلیٹ فارم کے ایک اسٹال کے پاس کھڑی ہو گئی۔ میرے قریب سے گزرنے والے کتنے ہی مرد مجھے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں سامی کے جسم میں اور اس کے لباس میں بہت ہی اسمارٹ نظر آرہی تھی۔ ایک نوجوان پولیس انسپکٹر اپنی وردی میں اکڑتا ہوا میرے آس پاس گھوم رہا تھا۔ میں اس کی نظروں سے تاڑ گئی کہ وہ مجھ پر عاشق ہو گیا ہے۔ ویسے وہ اس قابل تھا کہ میں مسکرا کر اس کی ہمت افزائی کر سکتی تھی مگر میری جوانی کا پہلا حقدار کیدار تھا اس لیے میں اس سے نظریں چرانے لگی۔

کیدار ٹکٹ گھر سے واپس آیا تو اس کی گود میں ایک کالی بلی تھی۔ میں اسے دیکھتے ہی پریشان ہو کر بولی۔

"اسے کہاں سے اٹھا لائے ہو؟"

وہ بلی کے ملائم بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"میں ٹکٹ گھر کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ یہ میرے قدموں پر آکر لوٹنے لگی۔ بڑی پیاری اور صاف ستھری بلی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ رکھوں گا۔"

میں نے ناگواری سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ ذرا بھی پسند نہیں ہے، اسے چھوڑ دو۔"

کیدار نے میرے قریب ہو کر آہستگی سے کہا۔

"میں کچھ اور سوچ کر اسے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ ایک دن تم نے کہا تھا کہ جانوروں کو ان دیکھی آتمائیں نظر آجاتی ہیں۔ سامی کی رُوح تمھیں نظر نہیں آتی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بلی اسے دیکھتے ہی اس پر جھپٹ پڑے اس طرح ہمیں اس کی موجودگی کا پتہ چل جائے گا۔"

ہاں۔ یہ سچ ہے۔ کُتے بلیاں ان دیکھی روحوں اور بلاؤں کو محسوس کرکے غرانے لگتے ہیں۔ کیدار کی یہ بات میرے دل کو لگ گئی۔ پھر میں نے اعتراض نہیں کیا۔ وہ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر آیا تھا۔ میرے نئے جسم سے کھیلنے کے لیے اس نے سنگل برتھ کا ایک چھوٹا سا کمپارٹمنٹ ریزرو کرا لیا تھا۔ جب ہم کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تو گاڑی چلنے ہی والی تھی۔ کیدار نے بلی کو اوپری برتھ میں بٹھا کر کہا۔

"تم یہاں آرام کرو۔ کوئی خطرہ ہو تو ہمیں آگاہ کر دینا۔ میں اگلے اسٹیشن پر تمھیں دودھ پلاؤں گا۔"

اس نے کپڑوں کی گٹھری بلی کے قریب رکھ دی۔ میں نچلی برتھ پر انگڑائی لیتی ہوئی لیٹ گئی۔ کیدار نے مجھے سر سے پاؤں تک ایسے دیکھا جیسے ابھی چبا جائے گا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کر دی۔ پھر دروازے کو بھی بند کرنا چاہتا تھا کہ اچانک لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھُل گیا تھا اور وہاں وہی پولیس انسپکٹر کھڑا ہوا تھا۔

اس نے ہم دونوں پر ایک نظر ڈالی۔ پھر نیچے کھڑے ہوئے دو سپاہیوں سے کہا۔

"تم لوگ پاس والے کمپارٹمنٹ میں جاؤ۔ اگلے اسٹیشن پر یہاں آجانا ....."

یہ کہہ کر اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اسی وقت گاڑی چل پڑی۔ کیدار نے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"یہ ریزرو کمپارٹمنٹ ہے اور ہمارے پاس ٹکٹ ہے۔ آپ قانوناً اس کمپارٹمنٹ میں سفر نہیں کر سکتے۔"

اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں قانون کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ تمھارے جسم پر کھدر کا میلا کرتا اور پاجامہ ہے۔ اس لڑکی کے جسم پر ایک ایسی ریشمی ساڑھی ہے جس کی قیمت کم سے کم پانچ سو روپے ہوگی اور اس کی انگلی میں جو انگوٹھی ہے اس کا ہیرا اصلی ہے۔ یہ کسی بڑے گھر کی لڑکی ہے، اور تم ایک بے حد غریب آدمی ہو۔ کیا بتا سکتے ہو کہ اس میل ٹرین میں تم دونوں کا میل کیسے ہو گیا؟"

کیدار یوں بھی جھنجھلایا ہوا تھا کہ انسپکٹر رنگ میں بھنگ ڈالنے چلا آیا تھا۔ پھر یہ کہ وہ ہمیں قانونی گرفت میں لے رہا تھا اور اس الزام میں کیدار کو حوالات تک پہنچا سکتا تھا کہ وہ ایک امیر گھرانے کی لڑکی کو بھگا کر لے جا رہا ہے۔ اس طرح اگر بات بڑھتی تو میرے متعلق تحقیقات کے دوران پتہ چل جاتا کہ میں کمشنر جان پوکر کی بیٹی سامی پوکر ہوں۔ اور میں کیدار کو چھوڑ کر کسی کمشنر کی بیٹی بن کر نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اس وقت میں صرف کیدار کی بھوک تھی۔

میں نے انسپکٹر کو ٹالنے کے لیے کہا۔

"یہ میرے پتی ہیں۔ میں ان کی دھرم پتنی ہوں۔ ہم کلکتے پہنچ کر یہ ثابت کر دیں گے۔"

انسپکٹر نے مجھے بھوکی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کلکتہ بہت دور ہے۔ تم دونوں اگلے اسٹیشن پر میرے ساتھ تھانے چلو گے۔ وہاں میں اپنے طور پر معلوم کروں گا کہ تم کتنا سچ بول رہی ہو۔"

بات بگڑتے دیکھ کر میرے جی میں آیا کہ منتر پڑھ کر اس انسپکٹر کو شعلوں کی نذر کر دوں۔ ٹھیک ہے، وہ جل کر بھسم ہو جاتا مگر اگلے اسٹیشن پر اس کے سپاہی آنے والے تھے، اگر ہم اس کی جلی ہوئی لاش کو چلتی ٹرین سے باہر پھینک دیتے اور کمپارٹمنٹ میں اس کا نام و نشان تک نہ رکھتے تب بھی تحقیقات کے لیے ہمیں اسٹیشن پر اتار دیتے۔ اس وقت ہم بُری طرح پھنس گئے تھے۔ کیدار میرے حکم کا منتظر تھا۔ میرا اشارہ پاتے ہی انسپکٹر کو باہر پھینک سکتا تھا۔ لیکن میں نے مصلحت سے کام لیا۔ اس کی بھوکی نظروں کے جواب میں اچانک مسکرا کر کہا۔

"اسی ٹرین سے میرا کلکتے پہنچنا ضروری ہے۔ کیا ہم دوست بن کر آپس میں سمجھوتہ نہیں کر سکتے ہیں؟"

یہ کہہ کر میں نے اپنی انگلی سے ہیرے کی انگوٹھی نکال کر رشوت کے طور پر اسے پیش کر دی۔ اس نے انگوٹھی لے کر اپنی جیب میں رکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"اس انگوٹھی کے بدلے میں تمھارے ساتھی کو معاف کر دوں گا۔ اب رہ گئیں تم، میں تمھیں تنہائی میں معاف کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے ساتھی سے کہو کہ یہ دروازہ کھول کر باہر چلا جائے اور پائدان پر کھڑا رہے۔ اگلے اسٹیشن تک میری ڈیوٹی ہے۔ اس کے بعد تم اپنے ساتھی کے ساتھ عیش کرتی ہوئی کلکتے چلی جانا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" کیدار نے غصّہ سے چیخ کر کہا۔ "میں بزدل نہیں ہوں کہ اپنی دھرم پتنی کو تمھارے پاس چھوڑ کر باہر پائدان پر چلا جاؤں۔ میں تمھیں جان سے مار ڈالوں گا۔"

"کیدار!" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "کیا تم جیل میں سڑنا چاہتے ہو۔ ذرا عقل سے کام لو۔ صرف اگلے اسٹیشن تک کی بات ہے۔ انسپکٹر شریف آدمی ہیں یہ ہمیں کلکتے جانے کی اجازت دے دیں گے۔ جاؤ، باہر چلے جاؤ۔۔۔۔"

وہ تھوڑی دیر تک کھڑا بے بسی سے مٹھیاں بھینچتا رہا۔ میرے جسم کو ایسے دیکھتا رہا جیسے اس کے آگے کھانا رکھ کر اس سے چھینا جا رہا ہو۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ مگر میں کیا کرتی؟ مجبوری تھی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر جانے لگا۔ باہر کی تیز ہوائیں اندر آ رہی تھیں۔ ٹرین پوری رفتار سے رات کے اندھیرے کو چیرتی ہوئی جا رہی تھی۔

انسپکٹر نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"اب بتاؤ کہ تم کون ہو؟ اس گنوار کے ہتھّے کیسے چڑھ گئی ہو؟"

"یہ نہ پوچھو انسپکٹر صاحب! تم میری رشوت لے کر ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔ مرد کو اپنی بات کا دھنی ہونا چاہیے۔"

یہ کہہ کر میں نے ایک توبہ شکن انگڑائی لی۔ وہ سب کچھ بھول گیا۔ سحر زدہ سا ہو کر میرے قریب آیا اور میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھو کر کہنے لگا۔

"تم بہت سندر ہو۔ اتی سندر۔ تمھارے آگے وہ انگوٹھی کا اصل ہیرا بھی کانچ کا ایک ٹکڑا ہے۔ تمھارا چہرہ پھول سے زیادہ کومل ہے اور ہونٹ گلاب کی پنکھڑیاں ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ مجھ پر جھکنے لگا۔ اسی وقت اوپری برتھ سے غراہٹ سنائی دی۔ پھر دوسرے ہی لمحہ انسپکٹر بوکھلاہٹ میں چیختا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ کالی بلّی اس کی گردن پر پنجہ مارتی ہوئی ٹائلٹ کے دروازے کی طرف چلی گئی تھی۔ دوسری بار اس نے پھر چھلانگ لگائی اور اس کے چہرے پر خراشیں ڈالتی ہوئی نچلی برتھ پر جا کر بیٹھ گئی۔

انسپکٹر بوکھلایا۔ پھر جھلاّیا اور اسے پکڑنے کے لیے دوڑا۔ وہ اچھل کر برتھ کے دوسری طرف چلی گئی۔ انسپکٹر نے گالیاں دیتے ہوئے اس پر چھلانگ لگائی۔ وہ کود کر نیچے آ گئی۔ جب وہ نیچے آیا تو بلّی اچھل کر اوپری برتھ پر پہنچ گئی۔ پھر انسپکٹر کے پلٹنے سے پہلے ہی دوبارہ چھلانگ لگا کر اس پر آئی اور اس کے چہرے پر پنجہ کے نشان چھوڑتی ہوئی [illegible] طرف نکل گئی۔

کھٹ کھٹا کھٹ۔ کھٹ کھٹا کھٹ۔ بھاگتی ہوئی ٹرین تال دے رہی تھی۔ یا جیسے بے سُرا طبل جنگ بجا رہی تھی۔ اور [illegible] کمپارٹمنٹ میں ایک عجیب و غریب جنگ جاری تھی۔ میں [illegible] سی ایک کونے میں کھڑی ہوئی ایک انسان اور ایک بلّی کی لڑائی دیکھ رہی تھی۔ اتنا تو سمجھ ہی گئی تھی کہ وہ سامی ہے اور بلّی کے روپ [illegible] تک چلی آئی ہے۔

پھر انسپکٹر نے اسے پکڑ لیا اور غصّہ سے پاگل ہو کر [illegible] لگا۔ ذرا سی دیر میں بلّی کا جسم بے جان ہو گیا۔ اس نے حقارت سے اسے [illegible] کر ایک طرف پھینکتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"تم نے کیسی جنگلی بلّی پال رکھی تھی۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ اس سے [illegible] کر میں تمھارا خیال چھوڑ دیتا۔ میں ابھی تم سے بھی سمجھتا ہوں۔ [illegible] باہر پھینک دوں۔"

یہ کہہ کر وہ دروازہ کھولنے گیا۔ اس کے چہرے پر جابجا خراشیں پڑ گئی تھیں اور ان سے خون رس رہا تھا۔ اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا بلّی نے اچانک ہی زندہ ہو کر غراتے ہوئے اس پر چھلانگ [illegible] کھلے ہوئے دروازے پر کھڑا تھا، اس اچانک حملے سے لڑکھڑا گیا۔ پائدان پر کھڑے ہوئے کیدار نے اسے سنبھلنے کا موقعہ نہیں دیا۔ اسے [illegible] طرف کھینچ لیا۔ پھر دور تک انسپکٹر کی چیخ سنائی دیتی رہی۔ [illegible]
کیدار ایک ہاتھ سے ہینڈل پکڑے لٹکا ہوا تھا، وہ اچھل کر [illegible]
کھٹ کھٹا کھٹ۔ کھٹ کھٹا کھٹ۔ دروازہ [illegible] برتھ کے نیچے بیٹھی ہوئی مجھے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ میں نے [illegible] سے کہا۔

"یہ سامی ہے، اسے پکڑ کر باہر پھینکو۔"

وہ برتھ کے نیچے سے باہر آ گئی۔ کیدار اسے پکڑنے گیا [illegible] اوپری برتھ پر پہنچ گئی۔ میں نے سوچا کہ پھر وہی جنگ شروع [illegible] ٹرین کا اگلا اسٹاپ قریب آ رہا تھا۔ وہاں ہمارے پکڑے جانے کا [illegible] تھا بلکہ یقین تھا۔ جب تک انسپکٹر کی تلاش جاری رہتی، وہ ہمیں [illegible] میں رکھتے۔ میں نے کہا۔

"کیدار! اسے چھوڑ دو۔ زنجیر کھینچو۔ ہم جنگل کے راستے [illegible] نکل جائیں گے۔ یہ حرامزادی اوّل تو ہاتھ نہیں آئے گی۔ [illegible] مُردہ بن جائے گی۔ ہم اس سے بعد میں نمٹ لیں گے۔ پہلے [illegible] سے بچنے کی کوشش کرو۔"

کیدار نے زنجیر کھینچ دی۔ ٹرین رکتے رکتے بھی آدھ میل تک گھسٹتی چلی گئی۔ میں نے باہر نکلنے کے لیے دروازہ کھولا تو مجھ سے پہلے ہی سامی چھلانگ لگا کر باہر چلی گئی۔ یہ تو ہم سمجھ ہی گئے تھے کہ وہ آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ ہمیں اس وقت قانون سے بچنا تھا۔ اس لیے ہم ٹرین سے اترتے ہی جنگل کے اندر بھاگتے چلے گئے۔

ہم کہاں جا رہے تھے؟ یہ ہم نہیں جانتے تھے۔ ایک خوف تھا جو ہمیں بھگا رہا تھا۔ ہم جادو منتر کے ذریعہ پولیس اور قانون سے خود کو نہیں بچا سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ نظر بندی کی ریکھا کھینچ کر بیٹھ جاتے ایسے میں کوئی ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن ہم کب تک اس جنگل میں پولیس کی نظروں سے چھپے رہتے؟ اس وقت اس علاقہ سے جتنی دور نکل جاتے، اتنا ہی بہتر ہوتا۔ اس لیے ہم کبھی بھاگ رہے تھے کبھی تیزی سے چلتے ہوئے سانسیں درست کر رہے تھے۔ بھاگنے رکنے اور ہانپنے کے دوران جب بھی ہم نے پلٹ کر دیکھا تو اس جنگل کے اندھیرے میں سیاہ بلّی کی دو چمکتی ہوئی آنکھیں پیچھا کرتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ سائے کی طرح ہمارے ساتھ لگی ہوئی تھی اور ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

پھر نہ جانے ہم کتنی دور نکل آئے۔ آسمان پر صبح کی سپیدی جھلک رہی تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک چھوٹی سی بستی نظر آئی۔ ہم ٹھہر گئے۔ بستی سے دور کھڑے ہانپتے رہے۔ پھر میں نے کیدار سے کہا کہ ہمیں بستی میں نہیں جانا چاہیے۔ اگر پولیس ہمیں تلاش کرتی ہوئی یہاں تک آ گئی تو بستی والے قانون کا ساتھ دیں گے۔ لہٰذا ہمیں کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہیے۔ اس آبادی سے کترا کر نکل جانا چاہیے۔

یہ فیصلہ کر کے ہم ایک لمبا چکر کاٹتے ہوئے اس بستی سے دور نکل گئے کیدار نے کہا۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے، تم بھی تھک گئی ہو۔ ہم کچھ کھا پی کر تھوڑی دیر آرام کریں گے۔"

کیدار ایک لنگڑے آدمی کا بھیس بدل کر بستی کی طرف چلا گیا۔ میں رکھشا کنڈل بنا کر بیٹھ گئی۔ بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد نیند سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ مجھ سے بیٹھا نہ گیا۔ وہیں گھاس پر سو گئی۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد کیدار سوکھی روٹیاں اور آم کا اچار لے کر آیا۔ مجھے سوتے دیکھ کر اس نے دو روٹیاں کھائیں، پانی پیا اور باقی میرے لیے رکھ کر سو گیا۔ دوپہر کو میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا۔ ایک پولیس انسپکٹر اور چار سپاہی بستی کے کچھ لوگوں کے ساتھ ہمیں تلاش کر رہے تھے۔ میں انہیں دیکھ رہی تھی مگر وہ رکھشا کنڈل کے اندر مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ انسپکٹر نے ایک آدمی سے کہا۔

"تم تو کہتے تھے کہ وہ لنگڑا بھیک مانگ کر اسی طرف آیا ہے۔ مگر یہاں تو دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔"

"حضورا" آدمی نے جواب دیا۔ "میں نے جو دیکھا تھا وہی آپ سے کہہ دیا۔ پتہ نہیں وہ کہاں چلا گیا ہے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے دور نکل گئے۔ میں اطمینان سے روٹیاں کھانے لگی۔ جب دوپہر ڈھل گئی اور درخت کے سائے پھیلنے لگے تو میں نے کیدار کو جگایا اور اسے بتایا کہ پولیس ہمیں تلاش کرتی ہوئی اس طرف گئی ہے ہمیں دوسری طرف جانا چاہیے۔ کیدار نے کھڑے ہو کر دور دور تک دیکھا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم رکھشا کنڈل سے باہر آ گئے۔

اسی وقت سامی "میاؤں" کہتی ہوئی ایک درخت سے کود کر، ہم سے ذرا دور آ کر کھڑی ہو گئی۔ اور مجھے یوں غرا کر دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو کہ کہاں بچ کر جاؤ گی۔ میں پاتال تک تمھارا پیچھا کروں گی۔ میں نے جھلا کر کہا۔

"کیدار! اسے پکڑ لو اور یہاں سے دور اسے ایسی جگہ لے جا کر مارو کہ پھر اسے زندہ ہونے کے لیے دوبارہ کسی جانور یا عورت کا جسم نہ ملے۔"

کیدار اسے پکڑنے کے لیے دوڑا تو وہ بھاگنے لگی۔ اس جنگل میں اچھی خاصی دوڑ شروع ہو گئی۔ کیدار اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا اور میں کیدار کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ ایک گھنٹہ کے بعد وہ پریشان ہو کر بولا۔

"فضول ہے۔ میں اسے پکڑوں گا تو یہ مُردہ بن جائے گی۔"

میں نے سامی کو گالیاں دیتے ہوئے کہا۔

"مُردہ بن جائے۔ تو اسے زمین کھود کر گاڑ دینا۔ پھر میں دیکھوں گی کہ وہ دوسرا جسم کہاں سے پاتی ہے۔ اس جنگل میں تو جانور بھی نظر نہیں آتے ہیں۔"

میری بات ختم ہوتے ہی ایک ہرنی نظر آ گئی۔ وہ بہت دور درختوں کے جھنڈ سے چوکڑیاں بھرتی آ رہی تھی۔ اس کے بعد گھوڑوں کے ہنہنانے اور ٹاپیں مارنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہرنی دور نکل گئی تھی اور اس کے پیچھے جانے والے گھوڑ سوار ہمیں دیکھ کر رک گئے۔

وہ تعداد میں گیارہ تھے۔ ان میں دس سپاہی تھے لیکن ان کے جسموں پر بھارتی سپاہیوں کی وردیاں نہیں تھیں۔ میں انھیں دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ وہ کسی اسٹیٹ کے سپاہی ہیں۔ ان کے آگے ایک سفید گھوڑے پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی گردن اکڑائے، سینہ پھُلائے اپنی انفرادی شان و شوکت کا اظہار کر رہا تھا۔ اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اپنی نگاہوں سے میرے جسم کو ٹٹول رہا تھا۔

ایک سپاہی نے ہوائی فائر کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

"تم دونوں امنالہ کے مہاراج ادھیراج راجیت رائے کے چرنوں میں ہو۔ اپنے سروں کو جھکاؤ۔"

ہم نے سر جھکا کر پرنام کے لیے ہاتھ جوڑ دیے۔ میں نے جھکی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ راجیت رائے نے اپنی رائفل ایک سپاہی کی طرف اچھال دی تھی۔ سپاہی نے اسے ایک ہاتھ سے روک لیا تھا۔ پھر راجیت رائے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر کیدار کی طرف بڑھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اسے روندتے ہوئے گزر جائے گا۔ کیدار چھلانگ لگا کر زمین پر لڑھکتا ہوا دوسری طرف

چلا گیا۔ راجپت رائے نے آگے جاکر گھوڑے کو پھر اس کی جانب موڑ لیا۔ گھوڑا سرپٹ دوڑتا ہوا آیا۔ کیدار زمین سے اٹھ کر بھاگتا ہوا دور چلا گیا۔ تمام سپاہیوں نے اپنے گھوڑوں سے ایک دائرہ بنا کر اسے گھیرے میں لے لیا۔ راجہ بہادر کا مقصد یہی تھا کہ کیدار مجھ سے دور ہو جائے۔

میں تنہا کھڑی رہ گئی۔ بلی مجھ سے ذرا دور ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ راجپت رائے گھوڑے کو ڈُلکی چلاتا ہوا میرے سامنے آگیا۔ اس نے اب تک ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا تھا۔ شاید کمتر لوگوں سے بولنا اپنی توہین سمجھتا تھا۔ وہ چند لمحوں تک میرے بدن کے ہیرے کو ایک جوہری کی نگاہوں سے پرکھتا رہا۔ پھر اس کا گھوڑا میرے چاروں طرف گھومنے لگا۔

میرے پیچھے جاکر راجپت رائے نے میری ساڑھی کے آنچل کو پکڑ لیا اور اسے ہاتھ میں لے کر میرے جسم کا طواف کرنے لگا۔ پہلے نصف چکر پر میرے سینے پر سے ساڑھی ہٹ گئی۔ میں نے سینے کو چھپانے کے لیے اپنے ہاتھوں کی قینچی بنائی تو اس نے اپنا ہاتھ جھٹک کر اشارے سے گھورتے ہوئے کہا کہ میں اپنے ہاتھ ہٹا لوں۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ نہ کرتی تو وہ مجھے بھی گھوڑے سے روندتے ہوئے گزر جاتا۔

پھر وہ گھوڑے پر میرے اطراف چکر کاٹنے لگا۔ ہر چکر پر ساڑھی کا ایک گھیر کھلتا جا رہا تھا۔

مہابھارت کی تاریخ دہرائی جا رہی تھی۔ کورو کے ہاتھوں سے دروپدی کی ساڑھی کے پیچ کھل رہے تھے۔ اور یہ سب کچھ مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ اگر میں اپنے بوڑھے جسم میں ہوتی تو راجپت رائے مجھ پر تھوک کر گزر جاتا۔ مگر اب وہ ایک پروانے کی طرح میرے جوان جسم کا طواف کر رہا تھا۔ تاہم عورت حکومت کرنے والے مرد کو ہی ترجیح دیتی ہے۔

پھر میرے بدن پر ریشم کا لہنگا اور بلاؤز رہ گیا۔ سامی خاموشی سے تماشہ دیکھ رہی تھی۔ راجپت رائے نے اپنے ہاتھ آئی ہوئی ساڑھی کو ایک طرف پھینکتے ہوئے اپنے سپاہیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”راجپت رائے شکار گاہ سے کبھی خالی ہاتھ نہیں جاتا۔ اس ہرنی کو ہمارے راج محل میں پہنچا دو۔“

یہ کہہ کر اس نے وہاں سے جانے کے لیے گھوڑے کی باگ موڑ دی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”مہاراج! میری ایک پرارتھنا ہے۔“

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

”میرے ساتھی کو میرے ساتھ رہنے کی اجازت دیجیے۔“

اس نے گھور کر کیدار کی جانب دیکھا، پھر پوچھا۔

”یہ تیرا کون ہے؟“

میں راجہ بہادر کے سامنے کیدار کو اپنا یار نہیں بنا سکتی تھی۔ اسے اپنے ساتھ رکھنے کے لیے میں نے کہہ دیا کہ وہ میرا بھائی ہے۔ میرا وہ جھومر کام آگیا۔ راجپت رائے نے حکم دیا کہ کیدار کو بھی میرے ساتھ راج محل پہنچا دیا جائے۔

پھر وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر دوڑاتا ہوا ہماری نظروں سے دور چلا گیا۔

ہم دونوں سپاہیوں کے درمیان پیدل چلنے لگے۔ سامی بھی پیچھے آرہی تھی۔ کیدار نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ پھر مطمئن ہو کر دھیرے سے

”مجھے یقین ہے کہ راجہ صاحب تمھارے جسم سے نہیں کھیل سکیں گے“

میں سمجھ گئی کہ وہ سامی کے بھروسہ پر یہ بات کہہ رہا ہے۔ مجھے غصہ آیا۔ وہ کمبخت میرے پیچھے پڑ گئی تھی۔ میں نے اپنے غصہ کا اظہار نہیں کیا۔ میں کیدار پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ ایک راجہ کی سیج تک پہنچنے کے لیے میں خود ہی بے چین ہوں۔ راجپت رائے کی طرح کوئی راجہ ہو یا کیدار کی طرح کوئی بھکاری، میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں صرف اپنے جسم کی آگ کو ذرا سرد کرنا چاہتی تھی۔ یہ جسم میں نے محض نمائش کے لیے حاصل نہیں کیا تھا۔ اس جسم کے کچھ مچلتے ہوئے تقاضے بھی تھے اور وہ حرامزادی سامی ان تقاضوں کو نہیں سمجھ رہی تھی۔ کیدار نے کہا۔

”میں اب تک سامی کو دشمن سمجھ رہا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ مجھے بھی تمھارے قریب نہیں آنے دیتی۔ مگر اس وقت وہ میرے ساتھ بھلا ہی کر رہی ہے۔ یہاں سے بچ کر نکلنے کے بعد ہم سوچیں گے کہ اس سے کیسے چھٹکارا پایا جائے گا۔“

”اونہہ!“ میں نے کہا۔ ”تم ہمیشہ گدھے کے دماغ سے سوچتے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ سامی راجہ صاحب کو میرے قریب آنے سے روکے گی، انھیں زخمی کرے گی یا پریشان کرے گی تو وہ ہمیں آسانی سے چھوڑ دیں گے؟ ناکامی کا سارا غصہ ہم پر نہیں اتاریں گے؟ تم اپنی زندگی کی خیر مناؤ۔ وہ کسی حالت میں ہمیں مار ڈالنے کا حکم دے سکتے ہیں۔ ایسے موقعہ پر میں تو چھوڑ کر نکل جاؤں گی مگر تم اپنی جان کیسے بچاؤ گے؟“

کیدار اپنی کھوپڑی سہلانے لگا۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ تب میں نے اپنے مطلب کی بات سمجھائی کہ ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ میں راجہ صاحب کو ان کی توقع سے زیادہ خوش کر دوں تاکہ وہ ہمیں رخصت کر دیں۔ لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ سامی ہمارے درمیان نہ آئے۔ میں نے سوچ لیا کہ راج محل پہنچتے ہی اسے ٹھکانے لگانے کی کوشش کروں گی۔

اس دنیا میں ستر برس گزارنے کے بعد میں نے پہلی بار کسی راجہ کے محل کو اندر سے دیکھا۔ یہ سامی کے جسم کا احسان ہے کہ میں اتنے اونچے مقام پر پہنچ گئی تھی اور حیرانی سے اس محل کی سجاوٹ کو دیکھ رہی تھی۔ اور مسرت کے دوران میں نے کالی بلی پر توجہ نہیں دی کہ وہ محل میں داخل ہونے کے بعد کہاں چلی گئی ہے۔ کیدار بھی مجھ سے الگ کر دیا گیا تھا۔

وقت میں کسی سے متعلق نہیں سوچ رہی تھی، اپنے آپ میں مگن تھی۔ خود کو اس محل کی مہارانی سمجھ رہی تھی۔ محل کی چار داسیوں نے مجھے حوض کے صاف شفاف پانی میں اشنان کرایا۔ ریشم کا ایسا باریک لباس پہنایا جس میں بدن چھپ چھپ کر اشارے کرتا تھا۔ پھر مجھے بڑے سے آئینے کے سامنے بٹھا کر میرے بال سنوارے۔ سولہ سنگار سے میرے حسن و شباب کو شراب دو آتشہ بنا دیا اور مجھے خوشبوؤں میں بسا کر راجپت رائے کی خوابگاہ میں چھوڑ دیا گیا۔

راجہ صاحب ابھی نہیں آئے تھے۔ دو داسیاں اسی کمرے میں میرے لیے کھانے کی تھال پروس رہی تھیں۔ اسی وقت ایک داسی نے آکر خبر دی کہ رانی جی پدھار رہی ہیں۔ میں گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ وقتی طور پر ہی سہی، میں رانی جی کے راجہ کو یہاں چھیننے کے لیے آئی تھی۔ رانی ہو یا کوئی عورت یہ نہیں چاہتی کہ کوئی دوسری آکر اس کے پتی کو چھین لے۔ رانی جی بھی غصہ میں طنطناتی ہوئی آئی تھیں لیکن مجھ پر نظر پڑتے ہی ایسے ٹھٹھک گئیں جیسے اپنی سوچ سے زیادہ سندرتا دیکھ کر حیران رہ گئی ہوں۔

پھر انھیں خیال آیا کہ وہ میرے سامنے ایک دم پھیکی پڑ گئی ہیں اور ان کے ساتھ آنے والی داسیاں بھی مجھے ہی دیکھ رہی ہیں۔ وہ گالیاں دیتی ہوئی میرے قریب آئیں اور ہر گالی کے ساتھ ایک ایک سوال کرتی گئیں کہ میں کون ہوں؟ کہاں سے آئی ہوں؟ اور راجہ صاحب کے ہتھے کیسے چڑھ گئی ہوں؟

وہ اتنے غصہ میں تھیں کہ اگر میں راجہ صاحب کے حکم سے نہ لائی جاتی اور اپنی مرضی سے یہاں آتی تو وہ مجھے اسی وقت قتل کر دیتیں۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے کہا کہ میں مجبور ہوں اور زبردستی یہاں لائی گئی ہوں۔ اگر مجھے یہاں سے صحیح سلامت نکل جانے کا موقعہ ملے تو میں ابھی چلی جاؤں گی۔

وہ خود ہی سمجھتی تھیں کہ جوان لڑکیاں محل میں زبردستی لائی جاتی ہیں۔ انھوں نے مجھے حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھی بات ہے۔ آج کی رات گزار لے۔ جب راجہ صاحب آئیں تو انھیں اتنی شراب پلا دینا کہ وہ مدہوش ہو جائیں۔ پھر میں یہاں آکر تمھیں نکل جانے کا موقعہ دوں گی۔ اگر صبح ہونے سے پہلے تو یہاں سے نہ جا سکی تو پھر کبھی نہ جا سکے گی۔ بھگوان نے تجھے ایسا روپ دیا ہے کہ راجہ صاحب تیرے دیوانے ہو کر رہ جائیں گے، اور میں پاگل ہو کر تجھے جان سے مار ڈالوں گی۔ اس لیے میرے حکم کو اچھی طرح یاد رکھنا۔ انھیں زیادہ سے زیادہ پلا دینا۔ میں کسی وقت پہنچوں گی۔“

یہ کہہ کر وہ پلٹ گئیں اور تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میرے دل نے کہا کہ اگر راجپت رائے میرا دیوانہ بن جائے تو میں اس مغرور رانی کی جگہ لے سکتی ہوں۔ جو صاحب مجھے اور کیدار کو پولیس اور قانون کی دست رس سے بچا سکتے ہیں۔ مجھے کچھ عرصہ کے لیے اس خوبصورت محل میں جوانی کی راتیں اور مُرادوں کے دن گزارنے کا موقعہ مل رہا تھا۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کر لیا کہ رانی جی کا حکم نہیں مانوں گی۔

میں کھانے سے فارغ ہوئی تو ایک داسی ٹرالی میں شراب کی بوتلیں اور گلاس لے آئی۔ پھر وہ کمرے سے باہر چلی گئی اور راجہ صاحب نے اندر آکر دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ وہاں سے پلٹ کر انھوں نے مجھے ایسے دیکھا جیسے بن پیئے نشہ آگیا ہو۔ وہ میری طرف بڑھتے ہوئے نشیلے لہجے میں بولے۔

”میری سیج پر کتنی ہی کلیاں کھل چکی ہیں مگر ایسی منہ بند کلی پہلی بار دیکھ رہا ہوں، جسے دیکھتے ہی شراب کا نشہ بھول گیا ہوں۔ جو رس تم میں ہے وہ اس شیشے کی صراحی میں نہیں ہے۔“

وہ میرے ایک دم قریب آگئے۔ اسی وقت میں نے بلی کی غراہٹ سنی اور گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ میں ان سے کہنا چاہتی تھی کہ خطرہ ہے، وہ میرے قریب نہ آئیں مگر انھوں نے اپنے تجربے سے سوچا کہ پہلے پہل ہر لڑکی اسی طرح پیچھے ہٹتی ہے، ادائیں دکھاتی ہے، اپنا جسم چراتی ہے اور پھر خود کو ان کے حوالے کر دیتی ہے۔ یہی سوچ کر انھوں نے آگے بڑھ کر مجھے پکڑ لیا لیکن ان کا بھی وہی حشر ہوا۔ بلی روشندان سے چھلانگ لگا کر ان پر آئی اور پنجہ مارتی ہوئی پلنگ پر جا کر بیٹھ گئی۔

راجہ صاحب غصے سے جیسے پاگل ہو گئے۔ ایسے نازک موقعہ پر وہ ایک مکھی کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے اور وہ بلی انھیں پنجہ مار کر ان کے غیض و غضب کو پکار رہی تھی۔ انھوں نے چیخ کر کہا۔

”کہاں سے آگئی یہ بلی۔ نکالو اسے.....“ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس نے اچھل کر دوبارہ حملہ کیا اور ان کے چہرے پر خراشیں ڈالتی ہوئی قالین پر جاکر کھڑی ہو گئی اور دم اٹھا کر غرانے لگی۔ راجہ صاحب کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ دشمن کی طرح دوبارہ حملہ کرے گی۔ انھوں نے جھنجلا کر ٹرالی سے گلاس اٹھایا اور اس کا نشانہ لیا۔ وہ تو ہٹ گئی مگر گلاس قالین پر پہنچ کر چکنا چور ہو گیا۔ ایک راجہ یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اس کا نشانہ خالی چلا جائے۔ وہ ٹرالی پر رکھے ہوئے گلاسوں کو، شیشے کی صراحی کو اور بوتلوں کو اٹھا اٹھا کر بلی پر حملے کرنے لگا۔ وہ ادھر سے اُدھر اچھل رہی تھی، چھلانگیں لگا رہی تھی اور شیشے کے ٹکڑے تمام کمرے میں بکھرتے جا رہے تھے۔ یہ شور سن کر باہر کھڑے ہوئے سپاہی دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ راجہ صاحب غصہ سے پاؤں پٹختے ہوئے گئے اور دروازہ کھول کر کہا۔

”اس بلی کو پکڑو اور باہر لے جا کر اسے شوٹ کر دو۔“

سپاہی اسے چاروں طرف سے گھیر کر پکڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ داسیاں فرش پر بیٹھ کر شیشے کے ٹکڑے چننے لگیں۔ میں نے کہا۔

”راجہ صاحب! یہ بلی نہیں ایک چڑیل ہے۔ ہمیشہ میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ اپنے سپاہیوں کو حکم دیجیے کہ اسے محل سے دور کہیں جنگل میں لیجا کر اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں اور آج رات اس محل میں کتے بلی یا کسی بھی جانور کو نہ آنے دیں۔ یہ چڑیل جانوروں کے بہروپ میں چلی آتی ہے“

پتہ نہیں راجہ صاحب نے کہاں تک میری بات کا یقین کیا لیکن انھوں نے غصّہ میں حکم دے دیا کہ اس محل میں کوئی پالتو جانور بھی نہ رہے ورنہ پہریداروں کی شامت آجائے گی۔

بلّی ان کی گرفت میں آگئی تھی۔ وہ اسے لے کر باہر چلے گئے۔ ایک داسی شراب کی دوسری بوتلیں لے کر آگئی۔ دوسری داسیاں ابھی تک شیشے کے ٹکڑے قالین پر سے چن رہی تھیں۔ راجہ صاحب نے ایک گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے گرج کر کہا۔

"جاؤ۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ بھاگ جاؤ۔"

وہ سب اٹھ کر چلی گئیں۔ راجہ صاحب نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"میرا منہ کیا دیکھ رہی ہے، دروازہ بند کردے۔"

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کردیا۔

"اب یہاں آکر مجھے اپنے ہاتھوں سے پلا۔"

میں نے ان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"رانی جی نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کو پلا کر مدہوش کردوں۔ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو وہ مجھے جان سے مار ڈالیں گی۔"

"کیا؟" وہ غرا کر بولے۔ "کیا لکشمی یہاں آئی تھی؟"

"اگر رانی جی کا نام لکشمی ہے تو وہ یہاں آئی تھیں۔"

"میں اُسے شوٹ کردوں گا۔" دوسرا گلاس اٹھا کر انھوں نے پیا۔ پھر کہا۔ "وہ رانی ہے، میں راجہ ہوں۔ اسے دھکّے دے کر یہاں سے نکال دوں گا۔ وہ اتنی نڈر ہوگئی ہے کہ مجھ سے بھی لڑتی ہے۔ ابھی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں تجھے یہاں سے نکال دوں۔ نہیں تو وہ مجھے بھی قتل کردے گی۔ کبھی اس کے باپ نے بھی کسی کو قتل کیا ہے۔ ہاہاہاہا.... مجھے قتل کرے گی۔ مہاراج ادھیراج راجیت رائے کو قتل کرے گی۔ الّو کی پٹھی....!"

انھوں نے دوسرا گلاس بھی خالی کردیا۔ میں نے کہا۔

"رانی جی کے تیور بہت خراب تھے مہاراج۔ مجھے دو طرف سے خطرہ ہے۔ ایک تو رانی جی سے۔ دوسرا اس کالی بلّی سے....!"

وہ گلاس پٹخ کر غصّے سے بولے۔

"وہ بلّی اب تک مر چکی ہوگی۔ میرے سامنے اس کا نام نہ لے۔"

"شما کیجیے مہاراج! وہ چڑیل مجھے پہلے بھی پریشان کرچکی ہے، وہ کسی مرد کو میرے قریب نہیں آنے دیتی۔ کسی نہ کسی بہروپ میں میرے پاس چلی آتی ہے۔ آپ کسی سپاہی کو بُلا کر حکم دیجیے کہ اس کمرے کے آس پاس کسی انسان یا جانور کو نہ آنے دیں۔ یہاں تک کہ آپ کے محل کی کوئی داسی بھی اس دروازے کے قریب نہ آئے۔"

وہ گھور کر مجھے دیکھنے لگے۔ دو گلاس کا نشہ ان کی آنکھوں سے بول رہا تھا۔ انھوں نے جھوم کر کہا۔

"سپاہی کو بُلاؤ۔"

میں نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ باہر دو سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ان کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ حدِ نظر تک محل ویران تھا۔ راجہ صاحب نے کہا کہ کسی جانور کو اور ملازم یا ملازمہ کو اس کمرے کے قریب نہ آنے دیا جائے۔ پھر میں نے دروازے کو بند کردیا اور ان کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

"آج رات آپ رانی جی سے نمٹ لیں گے مگر آپ کے جانے کے بعد وہ مجھ سے بدلہ لیں گی۔"

"نہیں لے گی۔ اس کی کیا مجال ہے کہ وہ میری پسند کی کسی چیز کو ہاتھ لگائے۔ صرف میں ہاتھ لگا سکتا ہوں۔ اُف! اتنا وقت ہوگیا اور ابھی تک میں نے تمھیں ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ ذرا سا چھو کر نہیں دیکھا کہ تم کتنی کومل ہو۔"

وہ ٹرالی کے پاس سے لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھے۔ میں نے آگے بڑھ کر انھیں سہارا دیا۔

"بکواس مت کرو!" رانی جی کی آواز کمرے کے باہر سنائی دی۔ پھر ایک سپاہی کی آواز آئی۔

"ہم آپ کے سیوک ہیں مگر مہاراج کا حکم ہے کہ یہاں کسی کو..."

"یو شٹ اپ۔" رانی جی گرج رہی تھیں۔ "میں کوئی داسی نہیں، رانی ہوں۔ چلے جاؤ یہاں سے ورنہ تم سب کو اسٹیٹ سے باہر کردوں گی۔"

سپاہیوں کے جوتے فرش پر بجتے ہوئے دور چلے گئے۔ وہ ملازم تھے۔ راجہ اور رانی کے جھگڑوں میں نہیں پڑ سکتے تھے۔ شاید اسی لیے چپ چاپ وہاں سے چلے گئے تھے۔ راجہ صاحب غصّہ سے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر چیخ کر بولے۔

"لکشمی! یہاں سے چلی جاؤ ورنہ بہت بُرا ہوگا۔"

"اب کون سا بھلا ہو رہا ہے؟" وہ دروازہ پیٹتی ہوئی بولیں۔ "کھولیے.... دروازہ کھولیے....!"

"تم سیدھی طرح نہیں مانو گی۔" وہ طنطناتے ہوئے آگے بڑھے اور دروازے کو ایک جھٹکے سے کھول دیا۔ پھر ان کے کچھ کہنے سے پہلے رانی جی نے چوکھٹ پار کی۔ کمرے کی تیز روشنی میں میں نے ایک خنجر دیکھی۔ اس کے ساتھ ہی راجیت رائے کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ خنجر ان کے جسم میں پیوست ہوگیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے آئے۔ سینے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر جھکے۔ پھر جھکتے ہی چلے گئے۔ ان کے فرش پر گرتے ہی رانی جی نے چیختی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا۔

"میں نے تجھ سے کہا تھا کہ تجھے یہاں سے نکل جانے کا موقع دوں گی۔ چل میرے ساتھ آ، دیر نہ کر۔ کسی کو اگر معلوم ہوگیا کہ راجہ صاحب مارے گئے ہیں تو میں تجھے اس قتل کے الزام میں پھنسا دوں گی۔"

یہ کہہ کر اس نے خنجر کے دستے کو صاف کرکے یعنی اپنی انگلیوں کے نشانات مٹا کر اسے میری طرف پھینک دیا۔ وہ میرے قدموں کے پاس آ کر گرا۔ اس کا چمکتا ہوا پھل سرخ لہو میں ڈوبا ہوا تھا۔ اب وہ بڑی آسانی سے مجھ پر الزام لگا سکتی تھی کہ میں نے اپنی عزت بچانے کے لیے راجہ راجیت رائے کو قتل کردیا ہے۔

اس وقت میری بھلائی اسی میں تھی کہ میں رانی جی کے حکم پر چلوں۔ میں فوراً ہی کمرے سے باہر آگئی۔ رانی جی نے دروازے کو بند کیا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا حکم دے کر آگے بڑھ گئیں۔ آگے راہداری کے ایک موڑ پر دو سپاہی کھڑے ہوئے تھے۔ رانی جی کو دیکھتے ہی ادب سے جھک گئے۔ وہ تحکمانہ لہجے میں بولیں۔

"مہاراج نے بہت زیادہ پی لی ہے۔ اب ان کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ صبح تک آرام کریں۔ میں نے دروازے کو باہر سے بند کردیا ہے۔ تم دونوں کی ڈیوٹی وہاں صبح تک رہے گی۔ نہ تم دروازہ کھولو گے اور نہ ہی کسی کو دروازہ کھول کر اندر جانے کی اجازت دو گے۔ جاؤ!"

وہ دونوں راجہ صاحب کے کمرے کی طرف جانے لگے۔ رانی جی مجھے اپنے کمرے میں لے آئیں اور میرے ریشم کے باریک لباس کو دیکھ کر بولیں۔

"اونہہ! مرد کو دیوانہ بنانے کے لیے اپنے حسن و شباب کی نمائش کررہی ہے حرامزادی! اُتار دے اس لباس کو۔ اس الماری سے کوئی سادہ سی ساڑھی نکال کر پہن لے۔ اب یہاں تیرا چھنال پن کام نہیں آئے گا۔"

میں ان کی گالیاں سنتی رہی اور الماری سے ساڑھی نکال کر پہنتی رہی۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ اسے جلا کر راکھ کردوں۔ مگر صبر کر رہی تھی کیونکہ اب وہی ایک عورت ایسی تھی جو مجھے اس محل کے قید خانہ سے نکال کر لیجا رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"میرا ایک ساتھی اس محل میں ہے۔ مجھ پر ایک دیا اور کیجیے اسے میرے ساتھ کردیجیے۔ میں اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔"

وہ حقارت سے بولیں۔

"میں جانتی ہوں، ایک چھنال اپنے یار کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہ باہر تیرا انتظار کر رہا ہے۔ چل آ میرے ساتھ....!"

میں ان کے پیچھے چلنے لگی۔ محل کی داسیاں اور پہریدار جہاں بھی نظر آتے، سب نے ادب سے جھک کر ہمیں جانے کے راستہ دے دیا۔ رانی جی نے کچھ ایسی ہوشیاری سے کام کیا کہ صبح تک کسی کو راجہ صاحب کی موت کا علم نہیں ہوتا۔ اسی لیے ہم بلا روک ٹوک محل کے باہر آگئے۔ باہر ایک نئی سی سیاہ رنگ کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی پچھلی سیٹ پر کیدار بیٹھا ہوا تھا۔ میں بھی پچھلی سیٹ کی طرف جانے لگی تو رانی جی نے میرا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

"سامنے بیٹھو!"

میں چپ چاپ سامنے کی سیٹ پر آگئی۔ میں سمجھی تھی کہ ان کا کوئی ڈرائیور ہمیں اس علاقہ کے باہر چھوڑ آئے گا۔ مگر رانی جی خود کار چلانے کی جگہ آکر بیٹھ گئیں۔ ان کے انداز سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ بہت غصّہ میں ہیں اور ہم سے شدید نفرت کرنے کے باوجود ہمیں یہاں سے دور لے جانے پر مجبور ہیں۔ میں اس عورت کے مزاج کو سمجھ گئی تھی۔ وہ جو بولتی تھی وہ کر گزرتی تھی۔ اس نے راجہ کو دھمکی دی تھی کہ مجھے محل سے نکال دیا جائے ورنہ وہ راجہ صاحب کو ہی قتل کردے گی۔ اس دھمکی پر وہ عمل کرچکی تھی اور اب مجھے محل سے نکال کر لے جارہی تھی۔

کار تیزی سے چلتی ہوئی محل کے بڑے گیٹ سے باہر آگئی۔ پھر دم بہ دم بڑھتی ہوئی رفتار سے بھاگنے لگی۔ چاروں طرف رات کی گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں بستی کے کسی مکان سے روشنی نظر آجاتی تھی۔ کار کی کھلی ہوئی کھڑکیوں سے تیز ہوائیں سنسناتی ہوئی اندر آرہی تھیں۔ بستی سے دور ہونے کے بعد جب مجھے یقین ہوگیا کہ اب راجہ صاحب کے قتل کے الزام میں مجھے کوئی گرفتار نہیں کرسکے گا تو اس وقت مجھے سامی یاد آگئی۔ میں رانی جی کے سامنے سامی کا نام نہیں لینا چاہتی تھی اس لیے میں نے کیدار سے کالی بلّی کا ذکر کیا۔

"کیا تم نے محل میں اس کالی بلّی کو دیکھا تھا؟"

"نہیں، وہ مجھے نظر نہیں آئی۔" اس نے جواب دیا۔ "چلو اچھا ہے، اس سے ہمیشہ کے لیے پیچھا چھوٹ گیا۔"

"آں - ہاں - میں بھی یہی سوچ رہی ہوں کہ وہ مجھے پھر پریشان کرنے نہیں آئی۔ رانی جی مجھے راجہ صاحب سے بچا کر لائی ہیں۔"

کیدار نے رانی سے کہا۔

"بھگوان آپ کا بھلا کرے۔ ہم آپ کا احسان کبھی نہیں بھولیں گے....!"

رانی نے سوال کیا۔

"تم دونوں اُس کالی بلّی سے بہت ڈرتے ہو؟"

"ہاں!" میں نے کہا۔ "وہ بلّی نہیں چڑیل تھی۔ کیا آپ نے اُسے دیکھا ہے؟"

"اس محل میں کوئی بات مجھ سے چھپی نہیں رہتی۔ میں نے دیکھا ہے۔ سپاہیوں نے گڑھا کھود کر اسے زندہ دفن کردیا تھا۔ تم دونوں اس کالی بلّی کے متعلق سوچ رہے ہو، میرے بارے میں نہیں سوچتے کہ صبح راجیت رائے کی موت کی خبر پھیلے گی تو میں کس مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں گی؟ میں نے ہی اس مُردہ راجہ کا کمرہ بند کیا ہے اور وہاں دو سپاہیوں کا پہرہ لگایا ہے۔ قتل کا الزام صرف تم پر نہیں، مجھ پر بھی آئے گا۔ کیا میں محل میں واپس جا سکتی ہوں؟"

واقعی میں نے نہیں سوچا تھا کہ رانی جی محل میں واپس جا کر مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گی۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ ڈرائیور کو ساتھ لانے کی بجائے ہمارے ساتھ اکیلی کیوں آئی ہیں۔

"کیا آپ واپس نہیں جائیں گی؟"

"نہیں۔!"

"پھر کہاں جائیں گی؟"

"تمہارے ساتھ۔"

"مگر ہمارا تو کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔"

وہ یک بیک قہقہہ لگا کر بولیں۔

"ہم تینوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ میں راجہ راجیت رائے کی قاتل ہوں اور تمھیں وہاں سے بھگا کر لائی ہوں۔ اور تم دونوں پولیس انسپکٹر کے قاتل ہو۔"

میں نے چونک کر پوچھا۔

"آپ کیسے جانتی ہیں کہ ہم نے کسی پولیس انسپکٹر کو......"

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولیں

"تیرا کچا چٹھا میں نہیں جانوں گی تو اور کون جانے گا۔ اب تو میرا اور تیرا جنم جنم کا ساتھ ہے میری بوڑھی چھمیا۔ کیا تو نے اپنی پیاری، اکلوتی اور چہیتی کالی بلی کو اب تک نہیں پہچانا......؟"

میں گھبرا کر اس کی صورت دیکھنے لگی۔ پھر ہکلا کر بولی۔

"تت.... تم۔ سامی ہو......؟"

اس کی ہنسی تیز خنجر کی طرح میرے سینے میں اتر رہی تھی۔

میں حیرانی اور پریشانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

میرے سامنے امارا کی رانی لکشمی دیوی کار چلا رہی تھی اور اس لکشمی کے اندر سے سامی بول رہی تھی۔

"راجہ کے سپاہی مجھے زندہ دفن کرنے لے گئے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے مجھے گڑھے کے اندر پھینک کر مجھ پر مٹی ڈالنی شروع کی میں بلی کا جسم چھوڑ کر سیدھی راج محل میں واپس چلی آئی۔ رانی لکشمی دیوی کے کمرے کے پاس سے گذرتے ہوئے میں نے دیکھا۔ وہ ہاتھ میں تیزاب کی بوتل لئے اپنی داسی سے کہہ رہی تھیں کہ وہ ابھی راجہ صاحب کے کمرے میں جائیں گی اور تمھارے چہرے پر تیزاب پھینک دیں گی۔

تمہارا چہرہ یعنی میرا چہرہ۔ تم نے اگر میرا جسم چھین لیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرا جسم اور میرا چہرہ تمہارا ہو گیا ہے۔ آج نہیں تو کل میں اپنا یہ جسم تم سے چھین لوں گی۔ بہرحال رانی میرے چہرے پر تیزاب پھینک کر مجھے بدصورت بنانا چاہتی تھیں۔ تاکہ راجہ صاحب مجھے یعنی تمہیں دھکے دے کر وہاں سے نکال دیں۔ میں یہ کیسے برداشت کرتی۔ یہ تیزاب پھینکنا تو دور کی بات ہے میں تو کسی مرد یا کسی دشمن عورت کو اپنے جسم کے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتی۔ میں نے اسی وقت تمھارے سکھائے ہوئے منتروں سے رانی کی روح نکال کر انہیں مردہ بنا دیا۔ فرش پر ان کی لاش گر پڑی۔ داسی گھبرا کر ان کے پاس آئی۔ مگر اس سے پہلے ہی میں اس جسم میں داخل ہو گئی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول کر کہا۔

"گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ یک بیک میرا سر چکرا گیا تھا۔ اس لئے گر پڑی۔" پھر میں نے اٹھتے ہوئے کہا "میں اس عورت پر تیزاب نہیں پھینکوں گی۔ مجھے کہیں سے ایک خنجر لا کر دے۔ اور اس خنجر کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔"

وہ چلی گئی۔ میں نے کمرے سے نکل کر ایک سپاہی سے کہا کہ میری کار محل کے دروازے پر لے آئے اور راجہ صاحب کی داشتہ کے ساتھ جو کیدار [illegible] آیا ہے اسے کار تک پہنچائے میں ابھی آتی ہوں۔

سپاہی بھی چلا گیا۔ داسی ایک خنجر لے کر آ گئی۔ میں نے اس [illegible]

"کل صبح تمھیں منہ مانگا انعام دوں گی۔ تم اپنی زبان بند رکھو اور [illegible] چلی جاؤ۔"

اس کے جانے کے بعد میں راجہ صاحب کے کمرے کی طرف چ[illegible]

جو کچھ بھی ہوا۔ اسے تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ چھمیا! میں اب [illegible] ہوں۔ مجھ سے دشمنی نہ کر۔ چپ چاپ میرا جسم مجھے واپس کر دے۔ ہم [illegible] ہو جائے گا۔"

میں غصے سے دانت پیستے ہوئے سامی کو گھور کر دیکھنے لگی۔ میری [illegible] نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کی روح سے کس طرح پیچھا چھڑاؤں۔ کیدار نے [illegible] بڑھا کر اس کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا۔

"چھمیا۔ میں اسے گلا گھونٹ کر مار ڈالوں گا۔ اس جسم کے [illegible] اس جنگل میں جب تک یہ دوسرا جسم تلاش کرے گی۔ اس وقت تک [illegible] نکل جائیں گے۔"

سامی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بیوقوف۔ اکار کا اسٹیرنگ میرے ہاتھوں میں ہے۔ اس جسم [illegible] سے پہلے ہی میں کار کو کسی گڑھے میں گرا دوں گی۔ اس کے بعد میری اور [illegible] محفوظ رہے گی۔ اور تو نرک میں چلا جائے گا۔"

میں نے کیدار کو ڈانٹ کر کہا۔

"اسے چھوڑ دے۔ تو کیا سمجھتا ہے۔ کیا اس جنگل میں اسے کسی [illegible] بھی نہیں ملے گا؟ کیا تو بھول گیا کہ ہم پہلی بار اسے جنگل میں چھوڑ کر آئے [illegible] بن کر آ گئی تھی۔"

پھر میں نے سامی سے کہا۔

"اگر تو ضدی ہے تو میں بھی ضدی ہوں۔ میں دیکھوں گی کہ تو کب [illegible] اور کہاں تک میرا پیچھا کرے گی۔"

"میں اس دنیا کے آخری سرے تک تیرا پیچھا کروں گی۔ میں اپ[illegible] بغیر اپنے ماں باپ کے پاس واپس نہیں جا سکتی۔ کسی دوسری لڑکی [illegible] جاؤں گی تو وہ مجھے پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔ اس دنیا میں روح [illegible] پہچان نہیں ہوتی۔ ماں باپ بھی اپنی اولاد کو اس کے جسم سے پہچانتے [illegible] کہتی ہوں کہ میرا جسم مجھے واپس کر دے۔ نہیں کرے گی تو ہمیشہ اسی طرح [illegible] کا بوجھ اٹھائے بھٹکتی رہے گی۔ میں کبھی تجھے سکون سے نہیں رہنے دوں گی۔"

"اونہہ۔" میں نے طنز سے کہا "میرا سکون برباد کرنے والی تو کب [illegible] ہے۔ دن رات میرے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ اور تو اسی طرح پریشان [illegible] مجھے دلی پہنچنے دے۔ پھر میں تجھ سے ایسا انتقام لوں گی کہ تو میرا پیچھا کرنا بھ[illegible]

وہ ہنستی ہوئی بولی۔

"دلی دور ہے۔ ابھی تو میں تجھے ناگپور لے جا رہی ہوں۔ وہاں [illegible]

تم دونوں کی تلاش میں ہے۔ تو جانتی ہے کہ میرے ڈیڈی کمشنر ہیں۔ میں ان کے سامنے ثابت کر دوں گی کہ تو نے میرا جسم چھین لیا ہے میں تھانے میں یا بھری عدالت میں یہ تماشہ دکھاؤں گی کہ ہم دونوں کی روحیں کس طرح دوسرے جسموں میں منتقل ہو جاتی ہیں۔"

میں پریشان ہو کر کبھی اسے اور کبھی سامنے راستے کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ مجھے ایک نئی مصیبت میں پھنسانے کے لئے اسی جگہ لے جا رہی تھی جہاں سے ہم بھاگ کر آ رہے تھے۔ میں نے چیخ کر کہا۔

"گاڑی روک دے۔ میں ناگپور نہیں جاؤں گی۔"

وہ قہقہے لگانے لگی۔ اس کے قہقہے بتا رہے تھے کہ اس تیز رفتار گاڑی میں ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بگاڑیں گے تو گاڑی الٹ جائے گی اور کیدار کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی میں اور سامی کسی دوسرے جسم میں زندہ رہ جائیں گے لیکن سامی کا یہ حسین جسم جسے میں اتنی مصیبتیں جھیل کر بھی اپنائے ہوئے تھی۔ یہ کار کے حادثہ میں برباد ہو جاتا۔ میں کسی قیمت پر بھی یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ اس بدن میں ذرا سی بھی خراش آئے۔ اور نہ ہی سامی یہ پسند کر سکتی تھی کہ اسے کوئی نقصان پہنچے میں نے چونک کر کہا۔

"تو ہمیں صرف دھمکی دے رہی ہے۔ تو اس گاڑی کو کسی گڑھے میں نہیں گرا سکتی۔ کسی درخت سے نہیں ٹکرا سکتی۔ ایسا کرے گی تو صرف کیدار نہیں مرے گا تیرا یہ جسم بھی زخمی ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں یا سر پھٹ جائے یا چہرہ بگڑ جائے۔ کیا تو پسند کرے گی کہ اس پر ہلکی سی خراش بھی آئے؟"

وہ گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھاتی ہوئی بولی۔

"میرا جسم ابھی میرے پاس نہیں ہے تیرے پاس ہے۔ تو اچھی طرح سمجھتی ہے کہ اس جسم میں کتنی کشش ہے۔ تو خود ہی اسے برباد کرنا نہیں چاہے گی۔ اگر چاہتی ہے تو کیدار سے بول کہ وہ مجھے ہاتھ لگائے۔ میں ابھی اس گاڑی کو کسی درخت سے ٹکراتی ہوں۔"

میں ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر اسے غصے سے دیکھنے لگی۔ وہ کم بخت بہت چالاک تھی۔ میرے خیالات کو سمجھتی تھی کہ میں خود ہی اس جسم کی تباہی پسند نہیں کروں گی۔ میں بڑی بے بسی سے سامنے راستے کی طرف دیکھنے لگی۔ کار تیزی سے دوڑ رہی تھی اور ایک نئی مصیبت اتنی ہی تیزی سے ہمارے قریب آ رہی تھی۔

کیدار نے کھڑکی کے باہر جھانک کر راستے کے کنارے سنگ میل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ناگپور بیس میل پر ہے۔ چھمیا جلدی فیصلہ کر۔ یہ جسم تجھے تھانے کچہری تک لے جائے گا۔ چھوڑ دے اس منحوس بدن کو۔ اس سنسار میں سامی سے بھی زیادہ سندر لڑکیاں ہیں۔ تو اسی کے لئے کیوں پاگل ہو گئی ہے؟ چھوڑ دے اسے۔ میں ابھی اس کی خبر لیتا ہوں۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے کہ میں کار کے حادثہ میں مر جاؤں گا یا زخمی ہو جاؤں گا۔ کچھ بھی ہو۔ میں پولیس کے ہاتھوں میں نہیں جانا چاہتا۔"

یہ کہہ کر اس نے سامی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"ٹھہر جا۔ نادانی نہ کر۔ جب تک مجھے اس سے زیادہ خوبصورت جسم نہیں ملے گا میں اسے نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ مجھے ذرا سوچنے دے کہ میں تیرے بچاؤ کے لئے کیا کر سکتی ہوں۔"

کیدار نے جھنجھلا کر پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تیرے سوچتے سوچتے ہم ناگپور پہنچ جائیں گے۔ سمجھنے کی کوشش کر چھمیا! ہم نے کوئی معمولی جرم نہیں کیا ہے۔ ہم قاتل ہیں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی کار کی رفتار دھیمی ہونے لگی پھر وہ گاڑی ہلکے ہلکے جھٹکے کھا کر آگے بڑھنے لگی۔ ہمارے کچھ سمجھنے سے پہلے ہی سامی نے ایک جھٹکے سے گاڑی روکی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ پھر اس نے دور جا کر چیختے ہوئے کہا۔

"چھمیا۔ تیرے نصیب اچھے ہیں۔ پٹرول ختم ہو چکا ہے۔ چل باہر آ جا۔"

یہ سنتے ہی کیدار دروازہ کھول کر جلدی سے باہر نکلا [illegible] پکڑنے کے لئے دوڑا۔ وہ پلٹ کر بھاگنے لگی۔ میں بھی کار سے باہر آ کر ان کے پیچھے دوڑنے لگی۔ اب وہ آگے آگے تھی۔ اس کے پیچھے کیدار اور کیدار کے پیچھے میں بھاگ رہی تھی۔ میں نے چیخ کر کہا۔

"کیدار۔ اسے بچ کر نہ جانے دینا۔ یہ کسی ناری کے جسم میں رہے گی تو ہمیں تھانے کچہری تک پہنچا دے گی۔ اسے کسی جانور کے جسم میں ہی رہنا چاہیئے۔"

میں اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر کبھی تیزی سے چل رہی تھی کبھی دوڑ رہی تھی وہ دونوں مجھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ مگر مجھ سے زیادہ دور بھی نہیں تھے ان کے بھاگتے ہوئے قدموں سے اور جھاڑیوں کی سرسراہٹ سے پتہ چل جاتا تھا کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں۔

نہ جانے ہم کتنی دیر تک اور کتنی دور تک بھاگتے رہے۔ نہ وقت کا پتہ چل رہا تھا اور نہ ہی یہ معلوم ہو رہا تھا کہ ہم کتنا فاصلہ طے کر چکے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ البتہ میں بری طرح ہانپنے لگی تھی۔ سامی رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔ کبھی درختوں کی آڑ میں چھپ جاتی تھی۔ کبھی جھاڑیوں میں جا کر گم ہو جاتی تھی کیدار تیزی سے دوڑنے کے باوجود اسے پکڑنے میں ناکام ہو رہا تھا۔

پھر میں نے جنگل کے سناٹے میں کیدار کی چیخ سنی۔ آواز قریب ہی سے آئی تھی میں بھاگتی ہوئی ادھر پہنچی تو سامی اپنے ہاتھوں میں ایک درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ پکڑے ہوئے تھی۔ کیدار زمین سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے اٹھنے سے پہلے ہی سامی نے اس کے سر پر اس ٹہنی سے حملہ کر دیا۔ وہ پھر کراہ کر گر پڑا۔ میں اس کی طرف لپکی تو وہ ٹہنی پھینک کر بھاگنے لگی۔ میں کیدار کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر کراہتے ہوئے کہا۔

"میری فکر نہ کر۔ اسے کسی طرح پکڑ لے۔ میں تیرے پیچھے آ رہا ہوں۔"

میں اسے چھوڑ کر سامی کے پیچھے بھاگی۔ وہ آگے جا کر ذرا سانس درست کرنے کے لئے آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور پیچھے پلٹ کر دیکھتی جاتی تھی۔ میرے قدموں کی آواز سن کر اس نے سمجھا کہ کیدار آ رہا ہے۔ اس لئے بدک کر بھاگنے لگی

میں نے چیخ کر کہا۔

"سوّر کی بچی۔! مجھ سے بچ کر کہاں جائے گی۔ میں کیدار نہیں ہوں کہ تُو مجھ پر حملہ کرے گی۔ کرے گی تو اپنے ہی جسم کو نقصان پہنچائے گی۔"

اور یہ سچ بھی تھا۔ میں اس کے جسم میں اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ اور وہ پلٹ کر مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ آگے جا کر گنّے کے کھیت آ گئے۔ اسی جگہ پہنچ کر میں نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر میں اس سے لپٹ گئی۔ میری کوشش یہی تھی کہ میں اسے نیچے گرا دوں اور جب تک کیدار نہ آئے اسے اپنی گرفت میں دبوچ کر رکھوں۔

پھر وہ جیسے جان بوجھ کر گر پڑی۔ اور ہم ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو کر لڑھکنے لگے۔ کبھی وہ میرے نیچے آ جاتی تھی کبھی میں نیچے چلی آتی تھی۔ ایسے وقت وہ کوشش کرتی تھی کہ میرے جسم کو تکلیف نہ پہنچے۔ اس کے لئے بڑی مصیبت ہو گئی تھی۔ وہ مجبوراً اپنے ہی جسم سے لڑ رہی تھی۔ میں نے کئی بار اس کے چہرے کو نوچا کھسوٹا۔ اپنے ناخنوں سے خراشیں ڈال دیں۔ مگر اس نے ایک بار بھی اپنے ناخنوں سے حملہ نہیں کیا۔ بلکہ یہی کوشش کرتی رہی کہ زمین پر گرنے کے بعد میرے جسم کو کوئی نقصان یا تکلیف نہ پہنچے۔

رات کی خاموشی اور تاریکی میں دو عورتیں لڑ رہی تھیں۔ آکاش کے تارے ٹمٹماتے ہوئے اس عجیب و غریب لڑائی کو دیکھ رہے تھے۔ میں چھمیا تھی اور رانی لکشمی دیوی کے جسم کو نوچ کھسوٹ رہی تھی۔ وہ سامی تھی اور سامی کے ہی جسم سے لڑتے ہوئے اس جسم کی حفاظت کر رہی تھی۔

اتنے میں دور سے کیدار کی آواز سنائی دی۔

"چھمیا۔ تُو کہاں ہے؟"

اس کی آواز سنتے ہی سامی نے مجھے ٹانگوں پر رکھ کر ایک طرف اچھال دیا اتنی دیر کی لڑائی میں وہی ایک زیادتی اس نے مجھ پر کی تھی۔ پھر وہ اٹھ کر گنّے کے کھیتوں میں گھس گئی۔ میں نے کیدار کو آواز دیکر کہا کہ ہم گنّے کے کھیتوں میں ہیں سیدھے چلے آؤ۔ یہ کہہ کر میں نے دور اندھیرے میں اسے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ مجھے نظر نہیں آیا لیکن اس کی کراہیں مجھ تک پہنچ گئیں۔ میں سمجھ گئی کہ اسے سخت چوٹیں آئی ہیں اور وہ اس وقت دوڑ بھاگ کے قابل نہیں ہے۔

میں پلٹ کر کھیتوں میں گھس گئی تھوڑی دور پر مجھے سرسراہٹ سے سنائی دی۔ میں اس آواز کی سمت بڑھنے لگی۔ قد آور گنوں کے درمیان سے گذرتے وقت سرسراہٹ کی ایسی آوازیں ابھر رہی تھیں کہ سامی کے بھاگنے کی سمت کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ میں کچھ دور چلنے کے بعد رک جاتی تھی۔ اس کی آواز سنتی تھی۔ پھر جہاں سے سرسراہٹ کی آواز سنائی دیتی۔ اس طرف بڑھ جاتی۔ آخر اس کھیت سے گذر کر جب میں باہر آئی تو دور ایک کچے مکان کی کھڑکی سے لالٹین کی روشنی دکھائی دی۔ ہم کسی بستی کے قریب پہنچ گئے تھے۔

میں نے بستی کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اس وقت سامی میرے سامنے کچھ دور زمین پر بیٹھی ہوئی اپنے پاؤں کے ایک ٹخنے کو پکڑے کراہ رہی تھی شاید اسی کے پاؤں میں موچ آگئی تھی۔ میں نے لپک کر پھر اُسے دبوچ لیا۔ پھر ہمارے درمیان جدوجہد شروع ہو گئی۔ میں اسے مار رہی تھی اور اپنے ناخنوں سے اُسے نوچ کھسوٹ رہی تھی۔ وہ میرے نیچے دبی ہوئی جوابی حملہ کرنے کی بجائے خود کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسی وقت قریب ہی کہیں سے "میاؤں" کی آواز سنائی دی۔

بستی کی کوئی بلی اُدھر آنکلی تھی۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میرے نیچے دبا ہوا رانی لکشمی دیوی کا جسم بے جان ہو گیا ہے۔ میں اس سے الگ ہو کر ادھر اُدھر تاریکی میں گھورنے لگی۔

"میاؤں ۔ میاؤں ....." آواز دور ہوتی سنائی دی۔

پھر گنّے کے کھیتوں سے سرسراہٹ ابھری۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کیدار لڑکھڑاتا ہوا آ رہا تھا۔ میں دوڑ کر اس کے پاس گئی اور اسے بتایا کہ سامی نے رانی جی کا جسم چھوڑ دیا ہے۔ شاید پھر کسی بلّی کے جسم میں چلی گئی ہے۔ کیدار نے یہ سنتے ہی ایک بڑا سا پتھر اُٹھا لیا اور رانی لکشمی دیوی کے جسم کو کچلنے کے لئے چلا گیا۔

بلّی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور میرا دل گھبرا رہا تھا۔ حالانکہ میں یہی چاہتی تھی کہ وہ کسی جانور کے جسم میں چلی جائے اور پولیس والوں سے ہمارے خلاف شکایتیں نہ کر سکے۔ مگر پچھلی بار بلّی بن کر اُس نے کیسے ہنگامے کئے تھے۔

انہیں میں بھول نہیں سکتی تھی۔ اسے بھی بلی ہی کا جسم پسند آ گیا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ چھلانگیں لگا سکتی تھی۔ دشمنوں کو پنجے مار سکتی تھی اور اُچھل کر کسی درخت کی بلندی پر یا کسی کمرے کے روشندان تک پہنچ سکتی تھی۔

اس وقت آکاش کے ایک کنارے سے چاند طلوع ہو رہا تھا۔ چاند کا چہرہ سُرخ تھا۔ تاریکی آہستہ آہستہ چھٹ رہی تھی۔ کیدار واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں سونے کے زیورات تھے۔ رانی لکشمی دیوی کی لاش کو کچلنے سے پہلے اس نے زیورات اُتار لئے تھے تاکہ انہیں بیچ کر ہم کچھ عرصہ تک اطمینان سے زندگی گذار سکیں۔ اس نے پوچھا۔

"وہ بلّی کہاں ہے؟"

"پتہ نہیں ۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہی ہے۔"

"چھوڑو اسے ۔ آؤ ہم چلیں۔ وہ خود ہی تیرا پیچھا کرے گی۔"

ہم بستی سے کترا کر جانے لگے۔ بستی میں اس لئے نہیں گئے کہ وہاں ہم نے ایک کچلی ہوئی لاش چھوڑی تھی۔ وہاں کے لوگ ہم پر ہی شبہ کرتے۔ بہت دور جانے کے بعد میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ اس کا رنگ بھی سیاہ تھا اور چاند کی روشنی میں اس کی دونوں آنکھیں چمک رہی تھیں۔

اب ہم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ہم اس کالی بلّی کو پکڑنے کے لئے دوڑ لگاتے۔ کیدار زخمی تھا اور میں بُری طرح تھک گئی تھی۔ اس لئے وہ کم بخت بڑے اطمینان سے ہماری چھاتی پر مونگ دلنے چلی آ رہی تھی۔

آگے جا کر ایک ریل گاڑی نظر آئی۔ آؤٹر سگنل ڈاؤن نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس ویرانے میں کھڑی ہوئی تھی۔ ہم تیزی سے اُسی طرف دوڑنے لگے۔ کمپارٹمنٹ کی کھڑکیوں سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ کچھ لوگ جھانک رہے تھے۔ کچھ دروازے پر کھڑے ہوئے سگنل کی طرف دیکھ رہے تھے پھر سگنل ڈاؤن ہو گیا۔ ہم قریب پہنچ گئے تھے اور انجن سیٹی دے کر حرکت میں آگیا تھا۔ کیدار مجھے کھینچتے ہوئے لے جا رہا تھا۔ آخر دوڑتے دوڑتے ہم آخری ڈبّے کے پائدان پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم سے پہلے ہی وہ بلّی اُچھل کر کھلی ہوئی کھڑکی سے کمپارٹمنٹ کے اندر پہنچ گئی تھی۔

چھمیا ذرا دیر کے لئے خاموش ہو گئی۔

سامی کی داستان سُناتے ہوئے اسے پسینہ آ رہا تھا۔ وہ سامی کا جسم لئے میرے سامنے بیٹھی تھی اور سامی سے سہمی ہوئی تھی۔

میں رسیوں میں جکڑا ہوا پیال کے بستر پر پڑا ہوا تھا اور سامی کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے متعلق بڑی محبّت اور عقیدت سے سوچ رہا تھا۔ وہ اپنی جدوجہد سے اپنی چالاکیوں سے اور اپنے عزم و استقلال سے میرے دل و دماغ پر چھا رہی تھی۔ کاش کہ وہ اپنے جسم میں موجود ہوتی اور میں مرنے سے پہلے ایک بار اُس شیرنی کو اس حسین سراپا میں مکمل ہوتے دیکھ لیتا۔ کاش.....!

دوسرے کمرے میں خاموشی تھی۔ کیدار منتر نہیں پڑھ رہا تھا۔ چھمیا میرے پاس سے اٹھ کر کیدار کے پاس چلی گئی۔ میں پھر رسیّوں کو توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر بے سُود کوششیں تھیں۔ میرا جسم زخموں سے چُور تھا اور رسیاں بہت مضبوط تھیں۔ زنجیریں صرف حوصلوں سے نہیں ٹوٹتیں۔ اس کے لئے جسمانی قوّت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کیدار کے منتر پڑھنے کی آواز آنے لگی۔ پھر چھمیا چھم چھم پائل بجاتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ میں نے کہا۔

"تم سامی کو کالی بلّی کے جسم میں قید کرنے کے لئے میری بھینٹ دینا چاہتی ہو۔ مگر میں تو زخمی ہوں۔ زخمی جانور ہو یا زخمی انسان اس کی بھینٹ سوئیکار نہیں کی جاتی۔"

وہ میرے پاس بیٹھتی ہوئی بولی۔

"جب تمہاری بھینٹ دینے کا وقت آئے گا تو تمہارے جسم پر ایک زخم بھی نہیں رہے گا۔ تم تندرست ہو جاؤ گے۔ جادو دو طرح کے ہوتے ہیں۔ کالا جادو اور سفید جادو۔ کالا جادو دشمنوں سے انتقام لینے اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کے لئے سیکھا جاتا ہے اور سفید جادو کے ذریعہ دوسروں کو فائدہ پہنچایا جاتا ہے۔ کیدار سفید جادو کا وہ منتر جانتا ہے جس سے ایک انسان کی بیماری کو کسی جانور کے جسم میں منتقل کیا جاتا ہے۔ وہ تمہارے تمام زخموں کو ایک کتّے کے جسم میں منتقل کر دے گا۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"یعنی بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ میری قربانی لازمی ہے۔"

"ہاں۔ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ آج تمہیں اور سامی کو میرے منتروں سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔"

"آہ سامی ۔!" میں نے دل کی گہرائیوں سے اس کا نام لیا اور کہا۔ "تم سامی کے متعلق کہتی رہو۔ وقت اچھا گذر رہا ہے۔ اس کی جرأت اور مستقل مزاجی کے واقعات سن کر میں اپنی موت کو بھول جاتا ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ اس ٹرین میں سوار ہونے کے بعد کیا ہوا۔؟ کیا اُس کمپارٹمنٹ میں تم دونوں اسے نہیں پکڑ سکتے تھے؟"

"نہیں۔" چھمیا نے جواب دیا۔ "اس تیسرے درجے میں بہت سے مسافر تھے۔ ہم ان کے سامنے ایک بے زبان بلّی سے دشمنی نہیں کر سکتے تھے۔ پھر یہ کہ کیدار زخمی تھا۔ رانی لکشمی دیوی کے جسم سے لڑنے کے باعث میرے کپڑے بھی مٹی ہو گئے تھے۔ سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ہماری یہ حالت دیکھ کر مسافروں نے پوچھا کہ ہم کہاں سے آ رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔

"ہم امنارا اسٹیٹ سے آ رہے تھے کہ ڈاکوؤں نے ہمیں گھیر لیا۔ میرے پتی دیو نے بڑی بہادری سے ان کا مقابلہ کیا تھا اور مجھے میرے زیورات سمیت بچا کر یہاں تک لے آئے....."

اس وقت میرے دماغ میں جو آیا۔ وہ کہہ گئی۔ مسافروں نے ہم سے ہمدردی کی کسی نے منہ ہاتھ دھونے کے لئے پانی دیا۔ کسی نے کھانا لا کر آگے رکھ دیا۔ میں نے اور کیدار نے منہ ہاتھ دھو کر اپنا حُلیہ درست کیا۔ ہمیں بھوک نہیں تھی پھر بھی تھوڑا بہت کھا لیا۔ بد قسمتی سے وہ ٹرین ناگپور کی طرف جا رہی تھی ہم کانگڑہ کے اسٹیشن پر اُتر گئے۔ وہاں سے ہم دوسری ٹرین پر سوار ہوئے۔ وہ ٹرین اجمیر اور آگرہ ہوتی ہوئی امرتسر جا رہی تھی۔ دوسری رات اجمیر پہنچ کر ہم نے پھر ٹرین بدل لی اور دہلی پہنچ گئے۔

سامی ہمارے ساتھ لگی رہی۔ میں نے کیدار کو سمجھا دیا تھا کہ وہ اُسے نہ چھیڑے۔ اب میں کچھ نئے منتر سیکھ کر اسے اپنے قابو میں کرنا چاہتی تھی۔ دہلی میں میرے ایک گرو مہاراج ہیں۔ وہ کالے جادو کے بہت بڑے گُنی اور کرم کاری ہیں میرے دیس کے بڑے بڑے جادوگر ان کے آگے ڈنڈوت کرتے ہیں۔ میں پندرہ برس کی عمر سے اُن کی رکھیل تھی۔ وہ رات کو مجھے داسی بناتے تھے اور صبح باسی بنا کر دھتکار دیتے تھے۔ بارہ برس تک میری جوانی کو کیڑے کی طرح چاٹنے کے بعد انہوں نے مجھے تھوڑا سا علم سکھایا تھا۔ ایسا علم کہ جس کے ذریعہ آج میں دوبارہ جوان ہو گئی ہوں۔

میں سامی کے جسم میں گرو مہاراج کے پاس پہنچی تو وہ اچنبھے سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگے۔ جب میں نے ڈنڈوت کیا اور انہوں نے میرے ساتھ کیدار کو دیکھا تو پہچان گئے کہ میں چھمیا ہوں۔ وہ اسّی برس کے بڑھے ہیں۔ اتنے کمزور ہیں کہ اپنے بستر سے اٹھ نہیں سکتے۔ انہوں نے اپنے پاس بلا کر مجھے بٹھایا اور اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ سے مجھے چھُو کر کہا۔

"آہ ۔! میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور تو یہ جوانی لے کر آئی ہے۔ میرے کسی کام کی نہیں ہے۔ پر مجھے خوشی ہے کہ میرا دیا ہوا علم تیرے کام آ گیا۔ بول! میں تیرے لئے اور کیا کر سکتا ہوں۔"

میں نے کچھ کہنے سے پہلے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں کالی بلّی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے کیدار سے کہا۔

"تُو باہر چلا جا۔ اُس بلّی کا خیال رکھنا یہاں نہ آنے پائے۔ بلکہ باہر سے دروازہ بند کر دے۔"

وہ بلّی کو دھتکارتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ میں ایک بوڑھے

کے پاس ہوں۔ اور اس کے دیئے ہوئے جسم پر کسی گناہ کی سیاہی نہیں لگے گی۔

وہ چپ چاپ باہر چلی گئی۔ کیدار نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ پھر میں نے کہا۔

"مہاراج۔! آپ نے اس بلی کو دیکھا ہے۔ وہ بلی نہیں ایک بلا ہے جو میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔۔۔۔"

میں انہیں شروع سے تمام واقعات بتاتی رہی اور وہ سنتے رہے پوری داستان سننے کے بعد انہوں نے کہا۔

"تجھ سے بڑی غلطی ہوئی کہ تو سامی کے سامنے کیدار سے منتر پڑھاتی رہی۔ وہ مورکھ کا مورکھ ہی رہا اور اس چالاک لڑکی نے منتروں کو سیکھ لیا"

گرو مہاراج بہت کمزور ہو گئے تھے۔ باتیں کرتے وقت بھی ہانپنے لگتے تھے۔ وہ ذرا دیر تک اپنی سانسیں درست کرتے رہے پھر بولے۔

"تجھے یاد ہوگا۔ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ آتما کو ایک شریر (جسم) سے دوسرے شریر میں لے جانے کا منتر تجھے نہیں سیکھنا چاہیئے۔ منش کو مارنے کا کام یم راج کا ہے اور جلانے کا کام بھگوان کا۔ ہم اس گیان تک پہنچ کر سکھ چین سے نہیں رہ سکتے۔ میں نے بھی کتنے ہی شریر بدلے ہیں۔ اپنی عمر سے زیادہ زندگی گزار رہا ہوں۔ اب بھی چاہوں تو کسی جوان مرد کے شریر میں جا کر پھر ایک نیا جیون اپنا سکتا ہوں۔ مگر میں زندہ رہتے رہتے تھک گیا ہوں۔ اس سنسار میں ہم سے بھی بڑی شکتیاں ہیں۔ جو ہمیں ڈراتی ہیں۔ ہمارا پیچھا کرتی ہیں۔ جیسے سامی تیرا پیچھا کر رہی ہے۔"

وہ پھر رک کر سانس لینے لگے۔ میں نے پوچھا۔

"مہاراج! کیا کوئی شکتی آپ کا بھی پیچھا کر رہی ہے؟"

"ہاں۔ میری جیون کہانی بہت لمبی ہے۔ اور میں اس قابل نہیں ہوں کہ زیادہ باتیں کر سکوں۔ تو اتنا ہی سمجھ لے کہ بھگوان کی شکتی ہماری سمجھ میں نہیں آتی کیا تو سمجھ سکتی ہے کہ سامی کو وہ چالاکی اور وہ منتروں کا گیان کیسے مل گیا۔ یہ سب بھگوان کی لیلا ہے۔ ایک معمولی چھوکری کو ذرا سی شکتی دے کر تیرے پیچھے لگا دیا بس اس چھوکری کی طرح میرے بھی کتنے ہی دشمن ہیں۔ میں ان سے لڑتے لڑتے تھک گیا ہوں۔ اب مجھے مرتے وقت بڑا سکون مل رہا ہے۔ ایک دن تو بھی تھک جائے گی اور موت کی اچھا کرے گی۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"مہاراج! مجھے مایوس نہ کریں۔ میں کبھی نہیں تھک سکتی۔ میں اس چھوکری کی آتما سے ہار نہیں مان سکتی۔ کرپا کر کے کوئی ایسا منتر مجھے بتا دیجئے کہ اس منحوس سے میرا پیچھا چھوٹ جائے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ ہمیشہ کے لئے بلی کے شریر میں قید ہو کر رہ جائے۔"

"ہُم۔ اس کی آتما قید ہو سکتی ہے۔ ایک چھوٹا سا منتر ہے۔ وہ منتر ہر روز پچاس بار پڑھنا ہوگا۔ جس روز تو نہیں پڑھے گی۔ اس روز سامی کی آتما کو پھر دی ایک شریر سے دوسرے شریر میں جانے کی شکتی واپس مل جائے گی۔"

"میں پڑھوں گی۔ روز پچاس بار پڑھوں گی۔ اسے بلی کے شریر سے نکلنے نہیں دوں گی۔ مجھے وہ منتر سکھائیے مہاراج!"

وہ تھوڑی دیر تک آنکھیں بند کئے پڑے رہے۔ پھر منتر پڑھنے لگے میں بھی ان کے ساتھ ساتھ پڑھنے لگی۔ چھوٹا سا منتر تھا۔ سامی کے نام پر پچاس بار پڑھتے ہی مجھے یاد ہو گیا۔

اچھی طرح یاد کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔

"مہاراج۔! کیا ایسی کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ منتروں کے بغیر وہ بلی ہی بن کر رہ جائے۔؟"

"ہم۔!" وہ سوچنے لگے۔ پھر انہوں نے کہا "وہی کالے جادو کا کالا عمل یعنی کسی انسان کی بھینٹ دینی ہوگی۔ ابھی جو منتر سکھایا ہے۔ اسے چالیس دن تک روز پچاس بار پڑھنا ہوگا۔ پھر کسی جوان مرد یا جوان عورت کے خون سے اس بلی کو اشنان کرانا ہوگا۔ مگر یہ آسان نہیں ہے۔ بہت مشکل ہے۔ پہلے رکھشا کنڈل کھینچ کر اس کے اندر جاپ کرنا ہوگا۔ جس نوجوان کی بھینٹ دو گی۔ وہ بھی کنڈل کے اندر ہوگا۔ ٹھیک رات کے بارہ بجے تم اس بلی کو کنڈل کے اندر بلانے کا جاپ کرو گی۔ وہ آئے گی۔ نہ آنا چاہے گی۔ پھر بھی آئے گی۔ تمہارا منتر اسے کنڈل کی طرف کھینچے گا۔ اس بات کو اچھی طرح یاد رکھنا کہ جب وہ کنڈل کے قریب آ جائے تو تم سے پڑھنے میں ذرا سی بھی غلطی نہ ہو۔ بلی اور کنڈل کے درمیان کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ رکاوٹ ہو گی تو وہ کنڈل کے اندر نہیں آئے گی۔"

"رکاوٹ کیسے ہو سکتی ہے مہاراج۔؟ میں تو ایسے ویرانے میں یہ عمل کروں گی کہ کوئی رکاوٹ بننے نہیں آئے گا۔"

مہاراج کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ آ گئی۔

"تو یہ کیوں نہیں سوچتی کہ سامی ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ اب تک جیسی چالیں چلتی آئی ہے۔ اُن سے یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ کم بخت پھر تیرے عمل میں کوئی گڑبڑ کرے گی۔ نہ کر سکے تو اچھا ہی ہے۔ مگر تجھے ہوشیار رہنا چاہیئے۔"

"میں اُس تریا چلتر کو اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ اس سے پوری طرح ہوشیار رہوں گی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا مہاراج کہ وہ رکھشا کنڈل کے قریب آئے تو اس بھینٹ چڑھنے والے جوان کا خون اُس پر پھینک دوں اور کنڈل کے باہر ہی اسے اشنان کرا دوں۔؟"

"نہیں۔!" انہوں نے جواب دیا "جب تک بلی کنڈل کے اندر نہیں آئے گی۔ اس وقت تک نوجوان کی گردن نہیں کاٹی جائے گی۔ میں اسی لئے تجھے اچھی طرح سمجھا رہا ہوں۔ اس وقت تک نوجوان کی بھینٹ سویکار نہیں کی جائے گی۔ جب تک کہ بلی کنڈل کے اندر نہ آئے۔ تیرا سارا کام اس بلی سے بن سکتا ہے اور اسی بلی سے بگڑ سکتا ہے۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے۔۔۔۔"

چھمیا اپنے گرو مہاراج کی ضروری ہدایات دہرا رہی تھی ـــــ

اور میں سن رہا تھا اور میرے دل میں ایک نئی امید کی کرن پھوٹ رہی تھی۔ گرو مہاراج نے یہی کہا تھا کہ سارا کام سامی سے بن سکتا ہے اور وہی سامی سارا کام بگاڑ بھی سکتی ہے۔

سامی۔ سامی۔ تم کہاں ہو سامی۔؟ تم کیسی البیلی، کیسی نٹ کھٹ اور کتنی خطرناک ہو کہ دشمنوں کے دلوں میں دہشت بن کر بیٹھ جاتی ہو۔ مگر میرے دل میں امید کی کرن بن گئی ہو۔

میں کچھ یوں سوچ رہا تھا کہ یا تو خود کو بچانے کے لئے سامی کا سہارا لوں گا، یا پھر وہ اپنی عادت کے مطابق اپنے آپ کو بچانے کے لئے میرا سہارا لے گی۔ ایسے وقت ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بن جائیں گے۔

میں آنکھیں بند کئے سوچ رہا تھا کہ میں کس طرح اس کے کام آ سکتا ہوں یا وہ کس طرح میرے کام آ سکتی ہے، اسی وقت چھمیا نے میرے بازو کو جھنجوڑ کر پوچھا:

"کیا سو گئے ہو؟"

میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا، مسکرایا پھر کہا

"نہیں۔ میں سامی کے متعلق سوچ رہا ہوں، وہ اب تک تمہیں چرکے دیتی آئی ہے، آج بھی وہ ضرور گڑبڑ کرے گی۔ میں رسیوں سے بندھا ہوا ہوں۔ کیدار میری بے بسی سے فائدہ اٹھا کر مجھے رکھشا کنڈل کے اندر لے جا سکتا ہے، لیکن دیکھ لینا سامی اس کنڈل کے اندر نہیں آئے گی۔"

وہ قہقہے لگانے لگی، میرے سامنے قہقہوں کی تال پر سامی کا بدن تھرکنے لگا۔ اندر سے چھمیا کی ہنسی زہریلی تھی، اوپر سے سامی کا حسن جگمگاتی ہوئی کٹار کی طرح سینے میں اتر رہا تھا۔ وہ ہنستی ہوئی بولی۔

"میرے منتر اسے کھینچ کر یہاں لائیں گے۔ ضرور لائیں گے، جب وہ کنڈل کے قریب آ جائے گی تو مجھ سے پڑھنے میں کبھی غلطی نہیں ہوگی۔ میں کیدار نہیں ہوں کہ منتروں کے الٹ پھیر کو نہ سمجھوں۔ سامی لاکھ کوشش کرے، تب بھی مجھے منتر پڑھنے سے نہیں روک سکے گی، کیونکہ میں رکھشا کنڈل کے اندر محفوظ رہوں گی۔ اس کی کوئی تدبیر میرے آڑے نہیں آئے گی۔"

میں نے مایوس ہو کر پوچھا:

"تمہارے گرو مہاراج نے تمہیں چالیس دن تک وہ منتر پڑھنے کے لئے کہا تھا، کیا وہ چالیس دن پورے ہو چکے ہیں؟"

"ہاں۔ وہ دہلی میں ہی پورے ہو گئے تھے، میں اب بھی روز پچاس بار وہ منتر پڑھتی ہوں۔ سامی کی روح بلی کے جسم میں قید ہو گئی ہے۔ مگر میں دہلی میں کسی نوجوان کی بھینٹ نہ دے سکی۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا "پھر کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی؟"

"ہاں" وہ ناگوار ... حرا ... موقعہ نہیں دیا کہ میں کسی کے خون میں اسے اسنان کرا سکو

اس بار میں نے ہنستے ہوئے کہا:

"پھر بھی تم کہتی ہو کہ آج وہ گڑبڑ نہیں کرے گی؟"

"اس لئے کہتی ہوں کہ آج میں نے رکھشا کنڈل کھینچ لیا ہے۔ آج سے پہلے اس کا موقعہ نہیں ملا۔ ہوا یوں کہ میں چالیس دن تک جاپ کرنے کے لئے محلہ گھانسی رام میں ایک مکان کرائے پر لے کر رہنے لگی تھی۔ سامی اپنی عادت کے مطابق ہمارے ساتھ تھی۔ شاید یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کی روح بلی کے جسم میں کیسے قید ہو گئی ہے؟

میرا اندازہ ہے کہ وہ میرے ارادے کو سمجھ گئی ہے۔ پتہ نہیں وہ کیسے سمجھ گئی ہے کہ میں کسی کی بھینٹ دے کر اسے ہمیشہ کے لئے بلی بنا دینا چاہتی ہوں، اور پتہ بھی کیسے چلے، وہ کمبخت کبھی چھت پر بیٹھی رہتی ہے کبھی روشندان سے جھانکتی ہے، کبھی چپ چاپ آ کر میری چارپائی کے نیچے سو جاتی ہے، بس اس طرح اس نے کسی دن مجھے اور کیدار کو باتیں کرتے سن لیا ہوگا، تب ہی وہ میرے کام میں رکاوٹیں پیدا کرتی رہی تھی۔

مشکل تو یہ ہے کہ پہلے پہل اس کی حرکتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ وہ کیسی چال چل گئی ہے۔ ایک بار میں اسے گود میں اٹھا کر ایک پرچون کی دکان سے سودا خریدنے گئی۔ وہاں پہلے ہی دو چار گاہک کھڑے ہوئے تھے، سامی تیز نظروں سے ہر شخص کا جائزہ لے رہی تھی، ایک گاہک نے کچھ خریدنے کے بعد دکاندار کو ایک اٹھنی دی۔ دکاندار نے وہ اٹھنی لے کر ایک طرف رکھ دی۔ اچانک سامی نے تڑپ کر میری گود سے چھلانگ لگائی اور دکاندار کی گدی پر جا کر اس اٹھنی پر پنجہ مارنے لگی، پہلے تو اس کی وہ حرکت سمجھ میں نہیں آئی۔ مگر جب دکاندار نے اٹھنی کی طرف دھیان دیا تو وہ کھوٹی نکلی۔

تمام لوگ تعجب سے اس بلی کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک گاہک نے کہا "تعجب ہے، یہ بلی کھوٹے اور کھرے کو پہچانتی ہے"

دوسرے شخص نے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ یہ محض اتفاق ہو اسے پھر ایک بار آزماؤ۔"

دکاندار نے وہ اٹھنی ڈھیر ساری ریزگاری میں ملا دی۔ سامی آگے بڑھ کر اپنے پنجہ سے دوسری اٹھنیوں، چونیوں، دس پیسوں اور پانچ پیسوں کو ہٹا ہٹا کر اس ڈھیر میں کھوٹی اٹھنی تلاش کرنے لگی۔ ذرا سی دیر میں اس نے وہی اٹھنی منہ میں دبا کر ایک طرف رکھ دی۔ تمام لوگ خوشی سے تالیاں بجانے لگے، ایک پنڈت جی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے کہا۔

"آدمی آدمی انتر، کوئی ہیرا کوئی کنکر۔ اگر کوئی جانور بھی کنکر اور ہیرے کی پہچان کرے تو سمجھ لو کہ وہ اوشئے پچھلے جنم میں انسان تھا۔ یہ بلی بھی کوئی ناری تھی۔ اپنے پاپوں کو بھوگنے کے لئے اس جنم میں بلی بن گئی ہے۔"

سامی نے غرا کر دیکھا تو پنڈت جی گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئے پھر رام نام جپتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

میں اسے کھیل تماشہ سمجھ کر خاموش تھی، مگر سامی کا وہ تماشہ مجھے بہت مہنگا پڑا۔ ذرا سی دیر میں اسے ایسی شہرت حاصل ہو گئی کہ تمام محلے کے مرد، عورتیں اور بچے اسے دیکھنے کے لیے میرے مکان میں آنے لگے۔

ہمارے دھرم میں آواگون کے عقیدے کو سب ہی مانتے ہیں۔ جب لوگوں میں یہ بات پھیلی کہ پچھلے جنم کی کوئی ناری اس جنم میں بلی بن کر آئی ہے تو سب ہی اسے دیکھنے کے لئے میرے مکان میں آنے لگے۔ محلے کی عورتیں بھی سامی کو دیکھ کر عبرت حاصل کرنے آتی تھیں کہ عورت کو پاپ نہیں کرنا چاہیے۔

ورنہ وہ بھی اگلے جنم میں بلیاں بن جائیں گی۔

میں عجیب مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ کسی سے سامی کو چھپا کر نہیں رکھ سکتی تھی۔ یہ دھرم کا معاملہ تھا۔ میں انکار کرتی تو لوگ ناراض ہو جاتے، اس لئے میں اسے مکان کے باہر لے آتی تھی۔ مکان کے سامنے ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ لوگوں کی آمد و رفت اتنی بڑھ گئی کہ اس ہوٹل کا کاروبار بھی چمک اٹھا۔

اگرچہ سامی زبان سے نہیں بول سکتی تھی اور نہ ہی بلی کے جسم سے نکل سکتی تھی، کیونکہ میں روز بلا ناغہ پچاس بار منتر پڑھا کرتی تھی، پھر بھی وہ کمبخت لوگوں کی دلچسپیاں بڑھانے کے لئے نت نئے تماشے دکھاتی رہتی تھی۔ ایک دن وہ ہوٹل کی میز پر رکھے ہوئے اخبار پر بیٹھ گئی اور اسے یوں توجہ سے دیکھنے لگی جیسے اسے پڑھ رہی ہو۔ اور وہ بلاشبہ اُسے پڑھ رہی تھی۔

وہ تماشہ اتنا دلچسپ تھا کہ لوگوں کی حیرت اور دلچسپی اور بڑھ گئی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ یونہی تماشے کرتی ہے اور کچھ لوگ یقین سے کہہ رہے تھے کہ وہ پچھلے جنم کی پڑھی لکھی ناری ہے اس لئے ہندی اخبار پڑھ رہی ہے۔

پھر لوگ شرطیں باندھنے لگے۔ دو پارٹیاں ہو گئیں۔ دونوں پارٹیاں سامی کو آزمانا چاہتی تھیں۔ میں گھبرا گئی، مجھے خطرے کا احساس ہو گیا کہ سامی نے اپنی انسانی صلاحیتوں کو ثابت کر دیا تو کوئی دولتمند بڑی سے بڑی قیمت لگا کر اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، یا پھر کوئی اسے چرا کر لے جائے گا اور میں اسے کسی کے خون سے نہلا کر ہمیشہ کے لئے بلی نہیں بنا سکوں گی۔ مجھے جاپ کرتے ہوئے اڑتیس دن ہو گئے تھے، صرف دو دن باقی رہ گئے تھے۔ میں نے کیدار سے کہا کہ آج رات ہم چپکے سے وہ جگہ چھوڑ کر سامی کو کسی ویرانے میں لے جائیں گے اور چالیس دن پورے ہونے کے بعد اس کے لئے کسی نوجوان کی بھینٹ دیں گے۔

مگر رات ابھی دور تھی۔ صبح دس بجے ہوٹل کے سامنے لوگوں کی بھیڑ لگ گئی، ایک میلے کا سماں بندھ گیا۔ مرد، عورتیں اور بچے سب ہی موجود تھے، اس وقت ہوٹل کے مالک نے مجمعے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

" بہنو اور بھائیو! اس میز پر دس دنوں کے پرانے اخبار رکھے ہوئے ہیں اور میرے ہاتھ کی اس پرچی پر لکھا ہوا ہے " سترہ مارچ کا اخبار ڈھونڈھ کر نکالو" اب دیکھنا یہ ہے کہ ہماری یہ بلی موسی وہ اخبار ڈھونڈھ کر نکالتی ہے یا نہیں۔ اس بازی میں جو پارٹی جیتے گی، اسے شرط کے مطابق پانچ سو روپے دیئے جائیں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ کی پرچی سامی کے سامنے رکھ دی۔ وہ میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے جھک کر پرچی کی تحریر پر ایک نظر ڈالی، اور پھر اخبارات کے ڈھیر کے پاس آ کر ان پر شائع ہونے والی تاریخوں کو پڑھتی گئی اور انہیں ایک طرف ہٹاتی گئی۔ پانچ منٹ کے بعد ہی اس نے سترہ مارچ کا اخبار منہ میں دبایا اور ہوٹل کے مالک کے پاس آ گئی۔

ایک بلی نے ایسا چونکا دینے والا کام کیا تھا کہ تمام مجمعے میں کھلبلی مچ گئی، وہاں ایک فوٹو گرافر تھا۔ اس نے سامی کی تصویریں اتاریں۔ دو رپورٹر بھی تھے، میری تباہی کے لئے کیا کچھ نہیں تھا۔ اس کے اس نادر کی شہرت جنگل کی آگ کی طرح دور دور تک پھیل گئی۔

میں نے اور کیدار نے پکا ارادہ کر لیا کہ ہم اس کمبخت کو لے کر آج رات اس شہر سے دور چلے جائیں گے۔ ہوٹل رات کے گیارہ بجے بند ہو جاتا، اس کے بعد ہی محلے میں سناٹا چھا جاتا تھا، ہم رات کا کھانا کھانے کے بعد سامان باندھنے لگے، ہم نے سوچا تھا کہ جب رات گہری ہو جائے گی اور تمام محلے والے سو جائیں گے تو کوئی پوچھنے والا نہ رہے گا کہ ہم دوسرا جنم لینے والی ناری کو کہاں لے جا رہے ہیں، مگر اسی وقت مکان کے باہر ہمیں کئی بولیاں آوازیں سنائی دیں۔ پھر بھاری بوٹوں کی دھمک سے رات کا سناٹا لرزنے لگا۔ کیدار نے باہر نکل کر دیکھا تو وہاں فوجی نظر آ رہے تھے۔

ایک فوجی افسر ایک جیپ سے اتر کر سیدھا ہمارے مکان میں گھس آیا اس کے پیچھے تین مسلح جوان تھے، اس نے آتے ہی پوچھا :

" وہ بلی کہاں ہے ؟"

میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ میں کوئی بہانہ کرنا چاہتی تھی کہ سامی نے چارپائی کے نیچے سے میاؤں میاؤں کی آواز نکالی۔ میں ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر اس طرف دیکھنے لگی۔ ایک فوجی جوان نے آگے بڑھ کر اسے چارپائی کے نیچے سے نکال لیا۔ دوسرا جوان باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے ہاتھوں میں ڈھیر ساری دفتری فائلیں اٹھا کر لے آیا اور انہیں چارپائی پر رکھ دیا۔ آفیسر نے حکم دیا :

" دروازے کھڑکیاں بند کر دو۔"

اس کا حکم سنتے ہی فوجی جوان میرے مکان کی کھڑکیاں اور دروازے کھٹا کھٹ بند کرنے لگے۔ پھر آفیسر نے جیب سے قلم نکال کر کاغذ کی ایک چھوٹی سی پرچی پر کچھ لکھا اور اسے سامی کے سامنے لا کر بڑی آہستگی سے اور رازداری سے بولا :

" مجھے سیکرٹ سروس کی کونفیڈنشل فائل نکال کر دو۔"

اس کے لئے یہ کونسا مشکل کام تھا، وہ انگریز باپ کی بیٹی تھی اور انگریزی زبان اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس نے فائلوں کے ڈھیر سے انگریزی زبان میں " ایس۔ ایس۔ سی" لکھا ہوا فائل اپنے منہ سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ آفیسر کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں، اس نے سامی کو گود میں اٹھا کر کہا :

" شی از پرفکٹ اِن ہر پرفارمنس۔ یہ ہمارے ساتھ جائے گی اور ان دونوں کو حراست میں لے لو۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتا ہوا، دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ ایک نوجوان نے کیدار کے بازو کو پکڑ لیا۔ دوسرے نے مجھے پکڑ کر کہا۔ " چلو۔"

حکم حاکم مرگ مفاجات والی بات تھی۔ ہمیں ان کے حکم پر چلنا پڑا اس وقت میں نے سوچا کہ اس دنیا کی سب سے بڑی طاقت جادو نہیں ہے، دماغ ہے۔ سامی اپنی دماغی طاقت سے مجھے مات دے رہی تھی اور اب تو اس نے ایک نئی مصیبت میں گرفتار کرا دیا تھا، نہ جانے وہ فوجی ہمارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے۔ وہ ہمیں ایک ایسی عمارت میں لے گئے، جہاں فوجی جوانوں کا پہرہ تھا۔ ہمیں ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا اور وہ سامی کو لے کر عمارت کے کسی دوسرے حصے میں چلے گئے، شاید اسے مختلف طریقوں سے آزمانا چاہتے تھے، پتہ نہیں کیا چکر تھا۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ وہ زبان سے نہیں بول سکے گی اور نہ ہی کسی تدبیر سے ان فوجیوں کو اپنی اصلیت بتا سکے گی۔ میرے نصیب اچھے تھے کہ میں نے بروقت منتروں کے ذریعہ اُسے بلی کے جسم میں مقید کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہمیں ایک بڑے سے سجے سجائے کمرے میں بلایا گیا ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جو اپنے چہرے اور وردی سے کوئی بہت بڑا افسر معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھا ہوا شراب پی رہا تھا۔ اس کے آس پاس دو فوجی افسر ادب سے کھڑے ہوئے تھے۔ شراب پینے والے افسر نے مجھے اور کیدار کو گھور کر دیکھا اور پوچھا :

" وہ بلی تم کہاں سے لائے ہو ؟"

کیدار نے ہاتھ جوڑ کر وہی کہا جو ہم دوسروں سے کہہ چکے تھے یعنی وہ ہمیں ایک جگہ بھوکی پیاسی مل گئی تھی، ہم نے اسے دودھ پلایا تو وہ ہم سے مانوس ہو گئی۔

پھر ہم سے سوالات کئے گئے کہ ہم کون ہیں ؟ کہاں سے آئے ہیں ؟ اور کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ؟

میں نے جواب دیا کہ ہم خانہ بدوش ہیں، روزی روٹی کے لئے شہر شہر گھومتے ہیں، وہ بلی نئے نئے تماشے دکھاتی ہے، لوگ خوش ہو کر پیسے دیتے ہیں، اسی بلی کی کمائی سے ہم اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔

بڑے آفیسر نے اپنے پاس کھڑے ہوئے ایک افسر سے انگریزی میں کچھ کہا۔ وہ کسی حکم کی تعمیل کے لئے وہاں سے چلا گیا۔ دوسرے آفیسر نے مجھ سے کہا :

" اس بلی کی جتنی عادتیں تمہیں معلوم ہیں، وہ بتاؤ ؟"

میں نے جواب دیا :

" اس میں تمام انسانی عادتیں ہیں۔ وہ بول نہیں سکتی، مگر پڑھ لیتی ہے، اس کے سامنے جو باتیں کی جائیں، وہ انہیں سنتی اور سمجھ لیتی ہے، اسے کھوٹے اور کھرے کی پہچان ہے۔ اسے ایک بار جو چیز یا جو راستہ دکھا دو اسے وہ کبھی نہیں بھولتی۔"

میں کہتی جا رہی تھی اور ایک آفیسر بیٹھا ہوا اس کی تمام عادتوں کو ایک کاغذ کے پیڈ پر لکھتا جا رہا تھا۔ میرا بیان ختم ہونے کے بعد ایک فوٹو گرافر کمرے میں آیا اور مختلف زاویوں سے میری اور کیدار کی تصویریں اتارنے لگا۔ پھر بڑے آفیسر نے ہم سے کہا :

" ایسے سدھائے ہوئے جانور، غیر ملکی جاسوسوں کے پاس ہوتے ہیں ہم تمہیں جاسوس کیوں نہ سمجھیں ؟"

کیدار نے جلدی سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

" حضور مائی باپ، ہم جاہل گنوار ہیں، اس بلی کے ذریعے پیٹ پالتے ہیں، ہم کیا جانیں کہ جاسوسی کیا چیز ہوتی ہے۔ ہم بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہیں، ہم نے کبھی اپنے دیس سے غداری نہیں کی ہے۔"

فوٹو گرافر وہاں سے جا چکا تھا۔ بڑے افسر نے اپنے ماتحت سے کہا :

" کل صبح تک ان دونوں کے متعلق پوری معلومات حاصل ہو جانا چاہئیں، اس کے بعد ہی میں بلی کے بارے میں فیصلہ کروں گا۔"

اسی وقت وہ بلی ایک کھلے ہوئے دروازے سے دوڑتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ اس کے پیچھے ایک افسر اور دو فوجی جوان بھی دوڑتے ہوئے اس کمرے میں آ گئے، افسر نے اٹینشن ہو کر ہانپتے ہوئے کہا :

" سر! یہ بلی قابو میں نہیں آتی۔ یہ بار بار اس کمرے کی طرف آنے کی کوشش کر رہی تھی، ہم نے ہر طرح سے اسے روکا، مگر یہ آ ہی گئی۔"

بڑے آفیسر نے بلی کو دیکھا جو میرے قدموں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی پھر غرا کر بولا۔

" یہ بلی اس لڑکی سے مانوس ہے۔ دو چار روز دور رہے گی تو اسے بھول جائے گی۔"

" حضور" میں نے کہا۔ " یہ ساری دنیا کو بھول سکتی ہے، مگر مجھے نہیں بھول سکتی۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اس سے محبت جتا کر اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ میں تو اس سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہوں، مگر یہ مجھے نہیں چھوڑتی۔ ابھی یہ مجھ سے دور ہو گئی تو میں نے سوچا تھا کہ اب یہ میرے پاس نہیں آئے گی، مگر دیکھ لیجئے، یہ پھر یہاں آ گئی ہے، یہ میرے قریب رہ کر مجھ سے عجیب دشمنی کرتی ہے۔"

" کیسی دشمنی ؟"

" یہ میرے قریب کسی مرد کو نہیں آنے دیتی۔" میں نے کیدار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ " یہ میرے پتی ہیں، یہ بھی میرے بدن کو ہاتھ نہیں لگا سکتے جو بھی مجھے ہاتھ لگاتا ہے، یہ اس پر غرا کر حملہ کرتی ہے۔"

" بکواس ہے۔" بڑے آفیسر نے بے یقینی سے کہا۔ " تم اپنے پتی کے قریب جاؤ، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کتنا سچ بول رہی ہو۔"

میں جھجکتی ہوئی کیدار کے قریب ہو گئی، حالانکہ میرے لئے جھجکنے اور شرمانے کی بات نہیں تھی۔ میں تو کب سے ایسے موقعہ کی تلاش میں تھی مگر اتنے بڑے افسروں کے سامنے یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ میں ایک شرمیلی اور شریف عورت ہوں۔ غیر مردوں کی موجودگی میں اپنے پتی کے قریب نہیں جاتی۔ آفیسر نے کیدار کو حکم دیا۔

" اسے، آگے بڑھو اور اپنی پتنی کو پیار کرو۔"

کیدار سمجھتا تھا کہ سامی اسے کس طرح پریشان کرے گی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا:

" چھما کیجیے حضور! یہ بلی ایک بار مجھے بری طرح زخمی کر چکی ہے۔ میں اس کے سامنے ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔"

" ہم اس بلی کی ایک ایک عادت کو نوٹ کرنا چاہتے ہیں۔ تم انکار کروگے تو تمہارے سامنے تمہاری پتنی کو کوئی دوسرا پیار کرے گا۔"

کیدار نے سر جھکا کر کہا۔

" آپ کا حکم سر آنکھوں پر، مگر میں جانتا ہوں، میری پتنی کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔"

کیدار کی یہ بات ایک چیلنج بن گئی، بڑے آفیسر نے غصے سے اٹھ کر اپنے ماتحت کو حکم دیا۔

" بھوانی شنکر!"

" یس سر!"

بھوانی شنکر وہی افسر تھا جو سامی کو ہمارے مکان سے لایا تھا۔ بڑے آفیسر نے حکم دیا۔

" آگے بڑھو اور اس لڑکی کو پیار کرو۔"

سامی قالین پر بیٹھی سب کچھ سن رہی تھی اور سمجھ رہی تھی۔ بھوانی شنکر جیسے ہی حکم کی تعمیل کے لئے آگے بڑھا، وہ غرا کر اچھلی اور اسے پنجہ مارتی ہوئی دوسری طرف قالین پر جا کر لیٹ گئی۔ بھوانی شنکر کو یقین نہیں تھا کہ وہ حملہ کرے گی۔ وہ کیا، کسی نے بھی یقین نہیں کیا تھا۔ لہذا وہ غیر متوقع حملہ تھا وہ لڑکھڑا کر پیچھے چلا گیا۔ یہ اس کی توہین تھی کہ ایک بلی اسے پیچھے ہٹا دے، وہ جھلا کر پھر اس کی طرف بڑھا، مگر اس کی نظریں سامی پر تھیں کہ وہ حملہ کرے گی تو وہ اسے دبوچ لے گا۔ لیکن وہ بھی بلا کی چالاک اور پھرتیلی تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی اس کے قدموں کی طرف آئی۔ بھوانی شنکر نے جھک کر اسے پکڑنا چاہا، اسی وقت اس نے چھلانگ لگائی اور اس کی گردن پر پنجہ مارتی ہوئی ایک صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔

بھوانی شنکر تلملا کر رہ گیا، لیکن بڑے آفیسر نے ہاتھ اٹھا

" بس ختم کرو بھوانی شنکر، ہم سب مانتے ہیں کہ دشمنوں سے مقابلے میں تم کبھی شکست نہیں کھاتے، مگر جانوروں کے ساتھ لڑنے کے لئے جانور بننا پڑتا ہے اور ابھی اس کا وقت نہیں ہے۔ اس بلی سے دشمنی کرنے کی بجائے اس سے دوستی کرو۔ یہ تمہاری بہترین آلۂ کار بن سکتی ہے۔"

بھوانی شنکر نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ سامی بھی ہمارے ساتھ چلنے لگی۔ ہمارے پیچھے دو فوجی نوجوان تھے، وہ ہمیں ایک کشادہ کمرے میں لے گئے۔ سامی ایک ہی کمرے میں مجھے اور کیدار کو سونے نہیں دیتی تھی، محلہ گھانسی رام کے مکان میں ایک رات کیدار چپکے سے میرے پاس آیا تھا تو سامی اسے گھنٹوں پریشان کرتی اور ادھر سے ادھر نچاتی رہی تھی

وہ بے چارہ مجبور ہو کر دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا، یہ بات میں نے بھوانی شنکر سے بتائی تو اس نے دوسرے کمرے میں کیدار کے سونے کا انتظام کر دیا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد میں بستر پر لیٹ گئی اور سامی میرے پیروں کے پاس پلنگ کے نیچے جا کر سو گئی۔

دوسری صبح ہمارے لئے بہترین ناشتہ آیا اور مجھے حکم دیا گیا کہ میں بلی کو اس کی پسند کی چیزیں کھلاؤں۔ میں ایک ملازمہ کی طرح اس کا پیٹ بھرتی رہی اور دل ہی دل میں کڑھتی رہی۔ اس کا جسم تو ایک مصیبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ گرو مہاراج نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ہم قدرت کے ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہو کر سکھ چین سے نہیں رہ سکتے۔ دنیا میں ہم سے بڑی طاقتیں بھی ہیں جو ہمیں ڈراتی ہیں، ستاتی ہیں اور پیچھا کرتی رہتی ہیں۔

سامی بلاشبہ مجھے ستا رہی تھی، ایسے جسم اور جوانی کا کیا فائدہ جو ہر رات کانٹوں پر بسر ہو رہی تھی۔ اس نے مجھے شعلوں کی طرح دہکتا ہوا بدن دے کر پہرہ لگا دیا تھا کہ کوئی ان شعلوں کو بجھانے نہ آئے۔ نہ جانے وہ اس جسم میں رہ کر کیسے جوانی کے تقاضوں کو کچلتی تھی اور صبر کرتی تھی۔ آیا، اس نے ایک بار کہا تھا کہ وہ اپنے خیالی محبوب کا سپنا دیکھتی ہے، اپنے کنوارے پن کو اس کے لئے سنبھال کر رکھتی ہے۔ نہ جانے وہ کمبخت کا خیالی محبوب کہاں ہے؟ اگر وہ مجھے مل جاتا تو میں سامی کے سامنے اس کے حوالے کر دیتی۔ ایسی صورت میں سامی کو اعتراض نہیں ہونا چاہئے اس نے اسی محبوب کے لئے اسے سنبھال کر رکھا ہے۔"

چھمیا کی باتیں سن کر میں اس بدن کے بیش بہا سرمایہ کو دیکھا ٹھیک ہے کہ وہ کسی خیالی محبوب کی امانت تھا لیکن میں سامی کی زندگی کا پہلا شخص تھا میں نے مسکرا کر کہا۔

" چھمیا: میں سامی کا خیالی محبوب ہوں، شاید وہ میرے ہی لئے ہے۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔

سورج کا ساجن کوئی بھی ہو، یہ جسم مجھے جلا رہا ہے۔ میں اسے ٹھنڈک پہنچانا چاہتی ہوں۔"

" تو پھر یہ رسیاں کھول دے، ہم دونوں ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں گے۔"

وہ اچانک قہقہے لگانے لگی

" ارے تو مجھے نادان سمجھتا ہے؟ کیا میں تیری باتوں میں آ کر تیری رسیاں کھول دوں گی۔ ارے جا، اب تو ایک ہی رات کی بات ہے۔ تیری سامی تو وہ ہمیشہ کے لئے بلی بن جائے گی، اگر تو ہی اس کا خیالی محبوب ہے تو اس سے بہتر انتقام اور کیا ہوگا کہ میں اس کے سامنے ہی اس کے شہزادے کو قتل کر دوں گی اور اسی شہزادے کے خون سے اسے اشنان کراؤں

گی۔ ہا ہا ہا..."

وہ پھر قہقہے لگانے لگی۔ قہقہوں کے جھونکوں سے اس کے بدن کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔ سونے کے زیورات ہنسی کی ہر اٹھان پر لرز رہے تھے اور ان کے جھلملاتے ہوئے سنہری عکس میں بدن کا سونا تپ کر کندن بنتا نظر آ رہا تھا۔ ہائے وہ میرے سامنے تھی مگر سامی نہیں تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا:

" ہاں تم نادان نہیں ہو، اب میں تمہاری تمنا نہیں کروں گا۔ ان باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ وہ فوج کے آفیسر اسی سے کیا کام لینا چاہتے تھے؟"

" وہ اسے جاسوسہ بنا کر یہاں لے آئے ہیں:"

" کیسے؟"

" پہلے میں سمجھ نہ سکی کہ وہ اسے کس قسم کی ٹریننگ دے رہے ہیں، ایک بوڑھا افسر روز وہاں آتا تھا۔ ایک کمرے میں میں سامی کے ساتھ وہاں موجود رہتی تھی۔ پہلے تو انہوں نے یہی کوشش کی کہ میں وہاں موجود نہ رہوں لیکن سامی مجھے چھوڑ کر ان کی کوئی بات نہیں مانتی تھی۔ لہذا مجبور ہو کر انہوں نے مجھے بھی راز دار بنا لیا تھا۔

میں رفتہ رفتہ سمجھنے لگی کہ وہ بوڑھا افسر سامی کو اشاروں کی زبان سکھا رہا ہے جس طرح اسکاؤٹ اور نیوی فورس کے جوان ہاتھوں کے مختلف اشاروں اور زاویوں سے خفیہ پیغامات پہنچاتے ہیں۔ وہی پیغامات کے طریقے سامی کو سکھائے جا رہے تھے، وہ اپنے اگلے دونوں پنجوں اور گردن کے مختلف زاویوں سے پیغام رسانی کا فن سیکھ رہی تھی۔

اس دوران فوج کے جاسوسوں نے میرے اور کیدار کے متعلق بہت سی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ایک دن بڑے آفیسر نے جس کا عہدہ ہمیں معلوم ہو چکا تھا اور جو فوج کا کرنل تھا، اس نے ہمیں طلب کیا اور کہا:

" تم دونوں پتی اور پتنی نہیں ہو، ہماری اطلاعات کے مطابق آج سے ڈیڑھ ماہ پہلے تم نے ایک پولیس افسر کو چلتی ٹرین سے گرا کر ہلاک کیا ہے اس کے ماتحت جو سپاہی تھے انہوں نے تمہاری تصویر سے پہچان لیا ہے، اور اندارا اسٹیٹ کے سپاہیوں نے بھی تمہاری تصویر دیکھ کر بیان دیا ہے کہ تم راجہ راجپت رائے کی خواب گاہ میں گئی تھیں، وہاں تم نے ایک خنجر سے اسے ہلاک کیا۔ رانی لکشمی دیوی اپنے پتی کو مار کر اس اسٹیٹ کی حقدار بننا چاہتی تھی اس نے تمہارا ساتھ دیا اور تم دونوں کو راج محل سے نکال کر لے گئی، مگر تم دونوں نے اسے راج محل واپس جانے کا موقع نہیں دیا۔ پُردالستی کے قریب اسے بھی مار ڈالا۔ اس کی کچلی ہوئی لاش انہیں مل گئی اور یہ زیورات جو تمہارے جسم پر ہیں وہ رانی لکشمی دیوی کے ہیں۔"

میں اور کیدار گھبرا کر کبھی ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے کبھی اس کرنل کو دیکھ رہے تھے۔ ہمارے سامنے پھانسی کا پھندا لٹک رہا تھا۔ ہم اپنے جرم سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اس عمارت کے باہر ناگپور کے نسانہ اور اندارا اسٹیٹ میں بہت سے لوگ ہمیں مجرم کی حیثیت سے پہچانتے تھے۔

کرنل نے چبھتی ہوئی نظروں سے ہمیں دیکھ کر پوچھا:

" کیا تم دونوں سزائے موت سے بچ سکتے ہو؟"

مجھے بھلا کون مار سکتا ہے، زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ سامی کا یہ جسم پھانسی پر چڑھ جاتا اور میں یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ ہزار مصیبتوں سے حاصل کیا ہوا یہ جسم ضائع ہو جائے۔ پھر یہ کہ میں اگر بچ جاتی تو کیدار کسی صورت میں نہیں بچ سکتا تھا۔

میں نے کرنل کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ کیدار گھٹنے ٹیک کر بولا۔

" حضور مائی باپ، دیا کیجئے، ہم نے وہ سب اپنی جان بچانے کے لئے کیا تھا۔"

کرنل نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا:

" تمہاری اس چھمیا نے راجہ راجپت رائے سے یہ کہا تھا کہ تم اس کے بھائی ہو، یہاں آ کر تم دونوں پتی پتنی بن گئے۔"

" ہم نے جھوٹ کہا تھا حضور، نہ ہم بھائی بہن ہیں نہ پتی پتنی، ہم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں، مگر یہ بلی ہمیں ایک ساتھ رہنے نہیں دیتی۔"

" ایک بے زبان بلی تمہارے جھوٹ کی سزا تمہیں دے رہی ہے۔ لیکن اس دیس کی عدالت تمہیں اس سے بھی بڑی سزا دے گی اور وہ ہے سزائے موت، کیا تم دونوں عدالت تک پہنچنا چاہتے ہو؟"

کیدار گڑگڑانے لگا۔

" نہیں حضور! ہم پر رحم کیجئے، ہمیں بچا لیجئے۔ ہمیں قید منظور ہے ہم پھانسی کے تختے تک نہیں جانا چاہتے، بھگوان کے لئے ہمیں بچا لیجئے۔"

کرنل اس کی التجائیں سنتا رہا اور گہری ٹٹولتی نظروں سے ہمیں دیکھتا رہا، پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

" بکواس بند کرو، تم دونوں یہاں آزمائے جا رہے ہو۔ کل تمہاری آخری آزمائش ہے، اس کے بعد تم دونوں کے متعلق فیصلہ کیا جائے گا۔ جاؤ یہاں سے۔"

ہم وہاں سے اپنے اپنے کمرے میں بھیج دیئے گئے۔ ہم پر تین قتل کے الزامات تھے، حالانکہ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا تھا۔ پولیس انسپکٹر کو کیدار اور سامی نے چلتی ٹرین سے گرایا تھا۔ رانی لکشمی دیوی کا جسم حاصل کرنے کے لئے سادھو نے اسے مارا تھا، پھر اس کے جسم میں آ کر اس نے راجپت رائے کو خنجر سے ہلاک کیا تھا۔ ہر جگہ سامی پیش پیش تھی۔ بیچارے کیدار کا جرم صرف اتنا سا تھا کہ اس نے رانی کے مردہ جسم کو پتھر سے کچل دیا تھا۔ جرم سامی کر رہی تھی، الزام ہم پر آ رہا تھا۔ ہم کرنل سے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ سب جادو منتر کی کارفرمائیاں ہیں اور سامی بلی بن کر ہمیں جرائم میں الجھا رہی ہے۔

میں کمرے میں آ کر سوچتی رہی۔ پھر مجھے کرنل کی بات یاد آئی، اس نے کہا تھا کہ ہم آزمائے جا رہے ہیں، تعجب ہے کہ وہ کیسی آزمائشیں تھیں، ہم کو ان کا ہمیں علم نہیں تھا اور ہم نامعلوم آزمائشوں سے گزرتے جا رہے تھے اور کل آخری آزمائش تھی۔ میں الجھتی جا رہی تھی کہ پتہ نہیں وہ کس طرح ہمیں آزمائیں گے۔

اس رات میں سو نہ سکی. کبھی بستر پر کروٹیں بدلتی رہی اور کبھی اٹھ کر ٹہلتی رہی. میں تصور میں کیدار کو پھانسی کے تختے پر دیکھتی تھی اور اپنے متعلق سوچتی تھی کہ عین پھانسی کے وقت سامی کا جسم چھوڑ دوں گی۔ اس جسم کو چھوڑنے کے خیال سے ہی مجھے ایسا صدمہ پہنچتا تھا جیسے ابھی سے جان نکلی جا رہی ہے وہاں سے جان بچا کر نکلنے کی کوئی تدبیر بھی کام نہیں آسکتی تھی. عمارت کے اندر اور باہر فوج کے مسلح نوجوان ہمیشہ مستعد نظر آتے تھے. بس ایک ہی آسرا تھا، سامی کا آسرا. اسی کی وجہ سے ہم بچ سکتے تھے. اگرچہ اسی نے ہمیں یہاں لاکر پھنسایا تھا. اس کے باوجود وہ کبھی اس جسم کو پھانسی کے پھندے تک جانے نہ دیتی. فوجی افسران جو کام اس سے لینا چاہتے تھے وہ تمام کاموں سے انکار کر دیتی، اور میرے ہی پیچھے بھاگتی پھرتی. ہاں اس وقت وہی ایک ترپ چال کی طرح میرے ہاتھوں میں تھی.

دوسرے دن حسب معمول میں اور سامی ایک مخصوص کمرے میں رہے اب بھوانی شنکر بھی وہاں آیا کرتا تھا. سامی اپنی گردن اور پنجوں کے اشاروں سے جو سگنل دیتی. اسے بھوانی شنکر ایک کاغذ پر نوٹ کرتا اور اسے ذہن نشین کرتا رہتا تھا.

شام کو کرنل نے پھر مجھے طلب کیا. میں سامی کے ساتھ اس کمرے میں گئی تو کیدار وہاں موجود تھا، ایک ادھیڑ عمر کا انگریز. . . . کرنل کے قریب صوفے پر بیٹھا تھا. اسے دیکھتے ہی سامی اچھل کر اس کی گود میں چلی گئی. لیکن وہ مجھے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے دونوں بازو پھیلائے میری طرف لپکا. میں فوراً ہی پیچھے ہٹ گئی. وہ انگریزی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا اور وہ زبان میرے پلے نہیں پڑ رہی تھی. کرنل نے اس انگریز سے کہا:

" مسٹر جان پوکر، میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ انگریزی جانتی ہی نہیں پھر آپ جیسے انگریز کی بیٹی کیسے ہو سکتی ہے؟"

میں سمجھ گئی کہ وہ انگریز سامی کا باپ ہے اور مجھے سامی کے روپ میں دیکھ کر دھوکہ کھا رہا ہے. کرنل کے کہنے کے باوجود اسے یقین تھا کہ میں اس کی بیٹی ہوں. اس بار اس نے ہندی زبان میں مجھے مخاطب کیا.

" بیٹی: مجھے پہچانو، میں تمہارا باپ ہوں، میں کیسے مان لوں کہ تم صرف اپنی ماں کی زبان ہندی جانتی ہو اور باپ کی زبان انگریزی نہیں جانتیں."

" میں آپ کو نہیں پہچانتی، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں. میری ماں ایک ہندوستانی عورت تھی، اس نے کسی انگریز سے شادی نہیں کی تھی."

" شادی کی تھی. کیا تم اپنی ماں کو بھی بھول گئی ہو، وہ تمہاری جدائی میں تڑپ تڑپ کر اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے، کیا ماں کی موت کی خبر سن کر بھی تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں آئیں گے."

وہ کالی بلی سر جھکا کر عجیب سی آوازیں نکالنے لگی، وہ اپنی ماں کے مرنے کی خبر سن کر رو رہی تھی. کرنل اور دوسرے فوجی افسر اس کی اس حرکت کو بڑی حیرانی سے دیکھ رہے تھے اور سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اچانک یہ ایسی غمزدہ ہو کر کیوں رو رہی ہے.

لیکن کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا. ان کے دماغ حقیقت کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے تھے.

اس کا باپ بھی اسے نہیں پہچان رہا تھا، دنیا کا کوئی رشتہ ہو، صرف جسم سے پہچانا جاتا ہے.

وہ صرف سامی کے جسم کو پہچان رہا تھا جو میرے قبضے میں تھا. وہ بلی کو نہیں دیکھ رہا تھا جس کے اندر اس کی بیٹی چھپی ہوئی تھی، ماں کے لئے رو رہی تھی اور باپ کے قریب آکر اس کے جوتوں پر اپنا [illegible] رہی تھی.

اس دنیا کی ہر محبت جسم کے شوکیس میں سجی ہوئی ہے. اسی [illegible] جان پوکر بھی میرے شوکیس سے دھوکہ کھا رہا تھا. سامی کو باؤں کی ٹھوکر [illegible] ایک طرف ہٹا رہا تھا اور مجھے بار بار کہہ رہا تھا کہ میں تمہارا باپ ہوں، میں انکار کر رہی تھی. مجھے انکار ہی کرنا چاہئے تھا، جب تک [illegible] کسی نوجوان کی بھینٹ دے کر سامی کو ہمیشہ کے لئے بلی نہ بنا دیتی. اس [illegible] کمشنر جان پوکر کی بیٹی بننا قبول نہ کرتی. کیونکہ مجھ پر تین قتل کے الزام تھے اور وہ کمشنر مجھے ان الزامات سے نہیں بچا سکتا تھا. صرف وہی فوجی جو بلی کو اپنے خفیہ مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے اور اس کے [illegible] ضروری تھا کہ وہ میری اور کیدار کی حفاظت کریں.

جان پوکر بہت دیر تک اصرار کرتا رہا کہ میں اس کی بیٹی ہوں سامی بھی بار بار میری طرف آتی تھی. میری ساڑھی کے دامن کو پکڑ کر باپ کی طرف کھینچتی تھی یعنی اشارتاً کہتی تھی کہ میں اس کے باپ کے پاس جاؤں اور اس کے سینے سے لگ جاؤں. وہ باپ جو اسے بلی سمجھ کر [illegible] کر رہا تھا، اسے گود میں نہیں اٹھا رہا تھا، اسے سینے سے نہیں لگا رہا تھا پھر بھی وہ باپ کی آرزو پوری کرنا چاہتی تھی کہ وہ اس کے جسم کو یعنی [illegible] سینے سے لگا لے.

جب ایک رشتہ دوسرے رشتے کو گلے لگاتا ہے تو اس وقت [illegible] حاصل ہوتی ہے وہ روح کی گہرائی تک پہنچتی ہے. سامی کا مقصد [illegible] تھا کہ جان پوکر مجھے گلے لگائے اور اس کی مسرتوں کو سامی اپنی روح [illegible] میں محسوس کرے.

میں اتنی نادان نہیں تھی کہ اس کے باپ کے گلے لگ کر [illegible] کی بیٹی ظاہر کر دیتی، میں اپنی ضد پر قائم رہی اور مسلسل انکار کرتی رہی کرنل نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا:

" مسٹر جان پوکر! آپ خواہ مخواہ ہمارا وقت ضائع کر رہے [illegible] ایک خانہ بدوش لڑکی ہے. یہ اور اس کا ساتھی دونوں ہی خطرناک [illegible] یہ اب تک تین قتل کر چکے ہیں. کیا آپ کی بیٹی میں ایسے جرم [illegible] صلاحیت ہے؟"

جان پوکر نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا.

نہیں، میری بیٹی کسی کو قتل نہیں کر سکتی، مگر کیا بتاؤں [illegible]

سر سے پاؤں تک ہو بہو سامی ہے."

کرنل نے کہا." ایک ہی شکل کی دو لڑکیاں ہو سکتی ہیں. کیا آپ اس حقیقت سے انکار کریں گے؟"

" نہیں. میں انکار نہیں کرتا. مگر دو ہمشکل بھی کسی امتیازی نشان سے پہچان لئے جاتے ہیں. میری بیوی نے مجھے بتایا تھا کہ سامی کے بائیں کولہے پر ایک سیاہ تل ہے. آپ کسی عورت سے کہیں کہ اس لڑکی کو دوسرے کمرے میں لے جا کر چیک کرے، وہ سیاہ تل نہ ہوا تو میں اپنی گمشدہ بیٹی کی تلاش میں بھٹکنے کے لئے کہیں اور چلا جاؤں گا."

میں نے پریشان ہو کر فوراً ہی نظریں جھکا لیں، تاکہ میری آنکھوں سے پریشانی ظاہر نہ ہو جائے. میرے بائیں کولہے پر واقعی سیاہ تل ہے اور اس وقت میرا جھوٹ کھلنے والا تھا. میرا دماغ تیزی سے سوچنے لگا. ایک خیال آتا تھا کہ مجھے حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے. جان پوکر کو اور ان فوجیوں کو بتا دینا چاہئے کہ میرے پاس سامی کا جسم ہے لیکن اس کا دل اور دماغ نہیں ہے اور نہ ہی انگریزی بولنے والی زبان ہے لیکن میں اتنی جلد شکست تسلیم نہیں کرنا چاہتی تھی. میں آخر وقت تک ہمت ہارنے والی عورت نہیں ہوں میں نے سوچ لیا کہ تنہائی میں جو عورت میرا لباس اتارنے آئے گی، میں اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر منت وسماجت کروں گی کہ وہ اس تل کا ذکر نہ کرے.

تھوڑی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر کی عورت آئی، وہ بھی فوجی وردی میں تھی. وہ نام کی عورت تھی ورنہ چہرہ اور جسامت مردوں جیسی تھی. اس کی آنکھوں کی چمک اور جبڑوں کی سختی دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ وہ میری منت و سماجت اور آنسوؤں سے نہیں پگھلے گی. وہ کرنل کے سامنے اٹینشن ہو کر اس کی ہدایات سنتی رہی. پھر مجھے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئی.

سامی میرے پیچھے پیچھے آئی تھی جب اس نے دیکھا کہ میں صرف ایک عورت کے ساتھ کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے بند ہو رہی ہوں تو وہ مطمئن ہو کر اپنے باپ کے پاس چلی گئی. اس ادھیڑ عمر کی عورت نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا. پھر اس نے پلٹ کر میری جانب دیکھا تو اس کے دیکھنے کا انداز بدل چکا تھا. اس کی آنکھیں کسی مرد کی آنکھیں تھیں اور وہ آنکھیں میرے حسن و شباب کو للچا للچا کر دیکھ رہی تھیں.

کچھ عورتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں عورتوں کی خصوصیات نہیں ہوتیں ایسے رویے میں مردانہ پن ہوتا ہے، میں نے اسکو [illegible] کہا

" میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو، میں انکار نہیں کروں گی کیونکہ وہ بلی یہاں نہیں ہے، تمہیں کھیلنے سے کوئی نہیں روک سکے گا، لیکن میری ایک شرط ہے:"

" تمہاری خاطر مجھے ہر شرط منظور ہے بولو کیا چاہتی ہو."

" میں چاہتی ہوں کہ تم اس انگریز کے سامنے غلط بیان دو، اسے یہ کہہ کر ٹال دو کہ میرے کسی کولہے پر تل نہیں ہے."

" تم اپنے باپ کو ڈیڈی کیوں نہیں کہتیں. نفرت سے انگریز کہہ رہی ہو؟"

" ہم ہندوستانی ہیں، ہم نے انگریزوں سے نفرت کر کے ہی انہیں دیس سے نکالا ہے، میں ایک انگریز کی بیٹی کہلانا پسند نہیں کرتی، مجھے اپنی ماں سے بھی نفرت ہے کہ اس نے ایک انگریز سے شادی کی تھی، اس لئے میں نے انگریزی زبان نہیں سیکھی."

میرے منہ میں جو آیا کہتی گئی، اپنی جہالت پر پردہ ڈالنے کے [illegible] اچھی طرح جتا دیا کہ انگریزوں سے نفرت کی وجہ سے میں نے ان کی زبان نہیں سیکھی لیکن میں فضول باتیں کر رہی تھی کیونکہ وہ میری باتوں سے زیادہ میری جوانی سے متاثر ہو رہی تھی،

" تم بہت سندر ہو [illegible] جو تم چاہتی ہو [illegible] اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا

ہم بڑے ہال میں واپس آئے تو کرنل نے پوچھا کہ ہم نے اتنی دیر کیوں کر دی. اس عورت نے جواب دیا.

" یہ بہت شرمیلی ہے، لباس اتارنا نہیں چاہتی تھی. میں بہت [illegible] تک اسے سمجھاتی مناتی رہی. پھر بھی یہ راضی نہ ہوئی تو مجھے زبردستی [illegible] کا لباس اتارنا پڑا. میں نے اچھی طرح دیکھا ہے اس کے کولہوں [illegible] نہیں ہے."

اس کا بیان سن کر جان پوکر نے مایوسی سے مجھے دیکھا اور سر جھکا لیا.

کرنل نے کہا:

"مسٹر جان، مجھے آپ سے ہمدردی ہے، میں آپ کی دلجوئی کے لئے اس لڑکی کو آپ کے حوالے کر دیتا، آپ اسے پا کر بیٹی کا غم بھول جاتے، لیکن افسوس کہ یہ ایک مجرمہ ہے۔ اسے صرف قانون کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔"

جان پوکر نے کرنل سے رخصتی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں، میں بھی قانون کا احترام کرتا ہوں اور مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں نے آپ کا وقت ضائع کیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ جانے لگا، سامی کش مکش میں مبتلا ہو گئی۔ اپنے باپ کے پیچھے چلتے چلتے پلٹ کر مجھے دیکھتی رہی۔ وہ الجھ گئی تھی کہ باپ کے ساتھ جائے یا میرے ساتھ لگی رہے، آخر اسے رکنا پڑا۔ اس کا باپ چلا گیا۔ وہ اپنا جسم میرے پاس چھوڑ کر نہ جا سکی، شاید یہ سوچ کر کہ اس کا باپ آج نہیں تو پھر کبھی مل جائے گا لیکن اس جسم کو میں نے غیر مردوں کے حوالے کر دیا تو پھر اس کی دوشیزگی باقی نہیں رہے گی۔

میں اس کی مجبوریوں پر مسکرانے لگی۔ اس وقت یہ سوچ کر اطمینان ہوا کہ وہ مجھے ہی صرف پریشان نہیں کر رہی ہے، میں بھی اسے پریشان کر رہی ہوں، اس کے لئے اس سے بڑی سزا اور کیا ہو سکتی تھی کہ اس کا باپ وہاں آیا، مگر وہ ڈیڈی کہہ کر اس کے گلے نہ لگ سکی۔ اپنی ماں کی موت پر آنسو بہانے نہ جا سکی۔ وہ میرے پیچھے بھاگتے رہنے پر مجبور رہتی۔

وہ تھوڑی دیر تک سر جھکائے نڈھال سی بیٹھی رہی۔ پھر اس نے اچانک ہی غرا کر اس عورت کو دیکھا جس نے تِل کے متعلق غلط بیان دیا تھا۔ اس کا باپ جس ثبوت کے ذریعے مجھے اپنے ساتھ لے جاتا، اس ثبوت کو اس کے جھوٹ نے میرے کولہے پر سے غائب کر دیا تھا۔ اس جھوٹ اور فریب پر وہ تلملا گئی، وہ یکبارگی چھلانگیں لگاتی ہوئی آئی اور اچھل کر اس عورت کے منہ پر پنجہ مارتی ہوئی اس کا گریبان پکڑ کر جھول گئی۔ وہ عورت اس اچانک حملے سے لڑکھڑائی۔ پھر ذرا سنبھل کر اسے پرے ہٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ اتنی دیر میں سامی دو بار اس کے چہرے پر خراشیں ڈال کر خود اس سے دور ہو گئی۔ ایک صوفے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہاں سے وہ فرش پر آئی اور غراتی ہوئی اس عورت کے چاروں طرف چکر لگانے لگی۔ وہ دوسری بار حملے کا موقع ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ عورت بھی محتاط ہو کر پینترے بدل رہی تھی۔ کرنل نے پریشان ہو کر کہا۔

"اسے کیا ہو گیا ہے؟ اس کے تیور خطرناک ہیں، اسے پکڑو۔"

اس کا حکم سنتے ہی وہاں جتنے افسر تھے، سب کے سب اسے گھیرنے لگے، سامی نے گرفت میں آنے سے پہلے پھر ایک زبردست حملہ کیا، وہ عورت محتاط ہونے کے باوجود دھوکہ کھا گئی۔ اس نے بوکھلا کر چیخ ماری۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر گئے اور وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑا کر صوفے کے قریب ہی گر پڑی۔

اس حملے کے بعد سامی خود ہی بھوانی شنکر کی گود میں، ایسے اطمینان سے آ گئی جیسے انتقام کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی ہو، واقعی وہ انتقام لے چکی تھی جب اس عورت نے اپنی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹائے تو اس کی دائیں آنکھ زخمی نظر آ رہی تھی اور اس میں سے خون رس رہا تھا۔ سامی نے اپنے پنجے کے تیز ناخن اس کی آنکھ میں گڑا دیئے تھے، ایک افسر فوراً ہی اسے سہارا دے کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔ کرنل نے مجھ سے کہا:

"تم نے کہا تھا کہ یہ بلی صرف اس پر حملہ کرتی ہے جو بُری نیت سے تمہیں ہاتھ لگاتا ہے لیکن لیڈی ایکس نے تمہیں اس نیت سے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ پھر اس نے وحشیانہ انداز میں حملہ کیوں کیا؟"

میں کرنل سے یہ نہ کہہ سکی کہ لیڈی ایکس اپنی غلط بیانی کے باعث اس انجام کو پہنچی ہے، میں یہ نہیں بتانا چاہتی تھی کہ میرے بائیں کولہے پر تل ہے اور لیڈی ایکس نے میرے ایما پر جان پوکر سے جھوٹ کہا ہے۔ مجھے خاموش دیکھ کر ایک افسر نے پوچھا۔

"تم خاموش کیوں ہو؟ معلوم ہوتا ہے تم اس بلی کی کسی خاص عادت کو ہم سے چھپا رہی ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا: "میں خود اس بات پر حیران ہوں کہ اس نے لیڈی ایکس پر حملہ کیوں کیا، جب کہ وہ کسی ایسی ویسی نیت سے میرے قریب نہیں آئی تھی۔ ایسی حرکت اس نے پہلی بار کی ہے۔"

سامی غرا کر مجھے دیکھنے لگی، اس کے غرانے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ مجھ پر حملہ نہیں کر سکتی تھی، جیسا کہ میں بتا چکی ہوں وہ مجھ پر حملہ کر کے اپنے ہی شاداب جسم کو نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ لیکن کرنل نے اس کی غراہٹ سے سمجھ لیا، ضرور دال میں کچھ کالا ہے، اس نے بھوانی شنکر سے کہا۔

"تم اس بلی سے سگنلنگ کے ذریعے معلوم کرو، اس نے لیڈی ایکس پر حملہ کیوں کیا تھا؟"

بھوانی شنکر نے کرنل کے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے سامی کو صوفوں کے درمیانی میز پر کھڑا کر دیا۔ پھر کاغذ کا ایک پیڈ اور پنسل لے کر اس کے سامنے ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کر کرنل کے سوال کو دوہرانے لگا۔ سامی نے جواباً اپنے اگلے دونوں پنجے اٹھائے اور سگنل کی اشارتی زبان سے کچھ کہنے لگی، بھوانی شنکر وہ تمام باتیں کاغذ پر نوٹ کرتا جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کرنل سے کہا۔

"یہ بلی کہتی ہے کہ لیڈی ایکس نے فالز رپورٹ دی ہے۔ اس عورت کے بائیں کولہے پر سیاہ تل موجود ہے۔"

میں حیرانی سے سامی کی جانب دیکھنے لگی مجھے پتہ نہیں کہ وہ باتھ روم کے مختلف زاویوں سے ایسی مکمل باتیں کرنا سیکھ گئی ہے۔ اس طرح وہ میرے اور کیدار کے متعلق بھوانی شنکر کو بہت کچھ بتا سکتی تھی۔ اب مجھے اس سے بہت زیادہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

کرنل نے سیاہ تل کے بارے میں صحیح رپورٹ سن کر کہا۔

"میں نے خود ہی لیڈی ایکس کو سمجھا دیا تھا کہ اگر اس کے بائیں کولہے پر

تل ہو تو وہ جان پوکر کے سامنے آکر غلط رپورٹ پیش کرے، کیا تم جاننا چاہتی ہو کہ تمہارے باپ سے جھوٹ کیوں کہا گیا ہے؟"

میں پہلے نہیں جانتی تھی، اب سمجھ گئی کہ کرنل نے لیڈی ایکس کو جھوٹ بولنے کا حکم دیا تھا۔ میں نے اس پر ظاہر کیا کہ میں پہلے ہی سے اس کے ارادوں کو سمجھتی ہوں۔

میں نے کہا: "میں جانتی ہوں، آپ یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ انگریز مجھے یہاں سے لے جائے، اگر میں جاتی تو بلی بھی میرے ساتھ جانے کے لئے مچل جاتی، اگر اسے جبراً روکا جاتا تو وہ آپ لوگوں کے اشاروں پر چلنے سے انکار کر دیتی۔"

"گڈ" کرنل نے مسکرا کر کہا: "جھوٹ بولنے اور قتل کرنے والی عورت منصوبے بنانا اور دوسروں کے منصوبوں کو سمجھنا جانتی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ آج تمہاری اور کیدار کی آخری آزمائش ہے، میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم دونوں کس حد تک اپنی اصلیت چھپا کر رکھتے ہو، میں نے سزائے موت کی دھمکی دی مگر تم دونوں نے اپنی اصلیت ظاہر نہیں کی۔ جان پوکر نے تمہیں سیاہ تل سے پہچاننا چاہا۔ پھر بھی تم خود کو چھپاتی رہیں۔ مجھے ایسے ہی ضدی اور اٹل فیصلہ کرنے والوں کی ضرورت ہے جو موت کے منہ میں پہنچ کر بھی اپنے راز کی حفاظت کرتے رہیں۔ ایسے ہی لوگ سیکرٹ سروس کے ممبر بنتے ہیں، اور دوسرے ممالک میں جا کر اگر کبھی پکڑے بھی جائیں اور موت سے بدتر سزائیں بھی ملیں، تب بھی اپنی اصلیت ظاہر نہیں کرتے۔

میں تم دونوں کو قانون کے حوالے نہیں کروں گا: تم اور کیدار اس محکمہ میں رہو گے، بھوانی شنکر کے ماتحت رہ کر ٹریننگ حاصل کرو گے اور چھ ماہ بعد اس ملک سے باہر ایک اہم مشن پر جاؤ گے۔

مگر یاد رکھو! اپنے دیس کی وفاداری تمہیں فائدہ پہنچائے گی۔ اگر کسی مرحلہ پر تم میں سے کسی نے غداری کی تو وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔"

میں نے اور کیدار نے قسم کھائی کہ ہم وفادار بن کر رہیں گے، اور دوسرے ملکوں میں جا کر اپنے دیس کی بھلائی کے لئے کام کریں گے۔

سچ پوچھو تو میرے دل میں نہ دیس کی محبت تھی، نہ پردیس جانے کی خواہش تھی۔ لیکن پھانسی کے پھندے سے بچنے کے لئے اب اس دیس کو چھوڑ دینا ضروری ہو گیا تھا، اور یہ ہمارے لئے بہترین موقعہ تھا۔ سیکرٹ سروس والے خود ہی ہمیں دیس سے باہر لے جا رہے تھے۔

میں نے سوچ لیا کہ کسی دوسرے ملک میں جا کر ہی اس بلی کو کسی نوجوان کے خون سے نہلاؤں گی، وہاں اس کا موقعہ نہیں تھا۔ ہمیں عمارت کے اندر گھومنے پھرنے کی آزادی مل گئی تھی، مگر باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ویسے میں روزانہ پچاس مرتبہ منتر پڑھتی تھی تاکہ سامی کی آتما بلی کے جسم سے آزاد نہ ہو سکے۔

اس وقت سامی نے جب یہ سنا کہ خود کرنل بھی اس کے باپ کو دھوکا دینے میں شریک ہے اور اسی نے لیڈی ایکس کو حکم دیا تھا کہ اس کے باپ کے سامنے سیاہ تل کا ذکر نہ کیا جائے تو اس سازش پر وہ کرنل کو غرا کر دیکھنے لگی۔ اس کے غرانے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے اس پر حملہ کرنے ہی والی ہے، بھوانی شنکر نے خطرے کو بھانپ کر فوراً ہی اسے گود میں اٹھا لیا اور پیار سے اس کی ملائم پشت کو سہلاتے ہوئے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے لگا۔

"ایزی بے بی ایزی"... وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

سامی کی غراہٹ دھیمی پڑ گئی۔ سب نے یہی سمجھا کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہے، لیکن میں جانتی تھی کہ وہ کیسی ضدی ہے۔ ایک بار کسی کو دشمن سمجھ لے تو آخر وقت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ میں سمجھ گئی کہ کرنل کی بھی شامت آ گئی ہے۔"

یہ کہہ کر چھپا ذرا دیر کے لئے خاموش ہو گئی۔

میں رسیوں سے بندھا ہوا پیال کے بستر پر یوں پڑا تھا جیسے میرے ہاتھ پاؤں نہیں ہیں۔ ایک تو میں زخموں سے چُور تھا دوسرے کیدار نے کچھ ایسی مضبوطی سے مجھے باندھ رکھا تھا کہ اس رسی کا کھلنا تو دوسری بات ہے اس کے پیچ بھی ڈھیلے نہیں ہو رہے تھے، میں ایک اپاہج بن کے رہ گیا تھا۔ یہ سوچ کر ندامت سی ہو رہی تھی کہ سامی ایک لڑکی ہو کر ہزاروں ہنگاموں کو جنم دے رہی تھی، قدم قدم پر دشمنوں کے دانت کھٹے کر رہی تھی اور میں مرد ہو کر اپاہج کی طرح پڑا ہوا تھا۔

کیا میں مرد کی توہین برداشت کر سکتا ہوں؟ کیا میں خود کو اور سامی کو آنے والے خطرے سے نہیں بچا سکتا؟ یہ سوالات میرے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے، اور میں خود کو سمجھا رہا تھا کہ ایسے وقت جسمانی قوت کام نہیں آتی صرف دماغی قوت سے کام نکلتا ہے اور اس کے لئے مجھے صبر و تحمل سے کسی موقعہ کا انتظار کرنا ہو گا۔ سامی کی داستانِ حیات بھی یہی بتاتی تھی۔ میں رسیوں سے بندھا ہوا تھا۔ وہ منتروں سے بلی کے جسم میں قید ہو گئی تھی۔ نہ میں رسیوں سے آزاد ہو سکتا تھا، نہ وہ بلی کے جسم سے رہائی حاصل کر سکتی تھی۔ اس کے باوجود وہ ذہنی صلاحیتوں سے کام لے کر دشمنوں کو پریشان کر رہی تھی۔

میں نے چھپا سے کہا: "سامی اپنے باپ کے قریب آ کر بچھڑ گئی تھی اس بات کا اسے گہرا صدمہ تھا، اس کا بس چلتا تو وہ ان تمام لوگوں کو کچا چبا جاتی جنہوں نے اس کے باپ سے جھوٹ کہہ کر اسے باپ کی بیٹی سے جدا کر دیا تھا، کیا اس نے کرنل کو معاف کر دیا تھا؟"

چھپا یوں دانت پر دانت جمائے بیٹھی تھی جیسے خیال ہی خیال میں سامی کو دانتوں تلے پیس رہی ہو۔ پھر وہ نفرت سے بولی۔

"وہ دشمنوں کو معاف کرنا نہیں جانتی۔ اگرچہ میں بھی اس کی دشمن ہوں لیکن مجبوراً میری زیادتیوں کو برداشت کر رہی ہے۔ ورنہ اس نے لیڈی ایکس اور کرنل سے انتقام لے لیا تھا۔"

"کیسے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔

"شروع میں پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے اور بڑی خاموشی

سنے کیسی چالیں چل رہی ہے، اس وقت جبکہ بھوانی شنکر اسے گود میں لے کر سہلا رہا تھا کہ سامی نے اسے سگنل دیا. بھوانی شنکر نے کرنل سے کہا.

" یہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے دوسرے کمرے میں لے جاؤں، یہاں اسے چھوڑوں گا تو یہ آپ پر حملہ کرے گی "

کرنل نے اسے دوسرے کمرے میں جانے کی اجازت دے دی. مجھے بھی سامی کے ساتھ جانا پڑا. کیونکہ وہ مجھے تنہا کسی کے پاس نہیں چھوڑتی تھی دوسرے کمرے میں آکر بھوانی شنکر نے اسے ایک کرسی پر بٹھا دیا اور کاغذ اور پنسل لے کر سامنے کھڑا ہو گیا. سامی اگلے دونوں پنجے اٹھا کر سگنلنگ کے ذریعے اسے کچھ کہنے لگی، وہ تمام باتیں نوٹ کرنے کے بعد مجھے اور سامی کو وہاں تنہا چھوڑ کر باہر چلا گیا.

اس وقت تک میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ وہ بلی کے جسم میں قید ہے، نہ مجھے چھوڑ کر جا سکتی ہے اور نہ ہی مجھے نقصان پہنچا سکتی ہے. پندرہ منٹ کے بعد بھوانی شنکر دو فوجی جوانوں کے ساتھ آیا اور مجھ سے کہنے لگا.

" یہ بلی کہتی ہے کہ اس کی ایک خواہش پوری کی جائے، اگر پوری نہ کی گئی تو یہ ہمارا حکم ماننے سے انکار کرے گی اور ہمارے ساتھ کسی بھی مشن پر جانے سے انکار کر دے گی، تم جانتی ہو کہ یہ بلی ہمارے لئے کتنی اہم ہے ہم اس کی ادنیٰ سی خواہش پوری کرنے کے لئے اپنا بڑے سے بڑا نقصان بھی برداشت کر سکتے ہیں، ویسے تمہیں بارہ گھنٹے کے لئے قید کر دینے میں ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے "

یہ کہہ کر اس نے فوجی جوانوں کو اشارہ کیا، وہ دونوں میرے قریب آئے اور نائلون کی ڈوری سے میرے ہاتھ پاؤں باندھنے لگے. میں نے پریشان ہو کر سامی کی طرف دیکھا، پھر بھوانی شنکر سے پوچھا.

" یہ سب کیا ہو رہا ہے، میرے ہاتھ پاؤں باندھنے سے اس بلی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے "؟

بھوانی شنکر نے جواب دیا " مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ اس بلی کو کیا فائدہ پہنچے گا، ہم اپنے فائدے پر نظر رکھتے ہیں، اس کی یہ چھوٹی سی خواہش پوری کرنے میں ہمارا نقصان ہی کیا ہے، اگر تم بارہ گھنٹے تک اسی طرح بندھی رہو گی تو کونسی قیامت آ جائے گی؟

یہ چاہتی ہے کہ تمہیں باندھ کر تمہارے کمرے میں قید کر دیا جائے، اس کمرے میں کوئی نہیں جائے گا. کمرے کے باہر دروازے پر لیڈی ایکس پہرہ دے گی اور تم کسی سے بات نہیں کرو گی، تنہائی میں بھی نہیں بڑبڑاؤ گی. اس کے لئے ہم بارہ گھنٹے تک تمہارا منہ بند کر رہے ہیں "

وہ کہہ رہا تھا اور اس کے کہنے کے مطابق ایک فوجی جوان میرے منہ میں رومال ٹھونس کر میرے ہونٹوں کو بند رکھنے کے لئے پٹی باندھ رہا تھا.

آہ — تب سامی کی چال میری سمجھ میں آگئی. وہ چاہتی تھی کہ میری زبان اور میرے ہونٹ بند رہیں تاکہ میں اس روز پچاس مرتبہ منتر نہ پڑھ سکوں. ایک دن منتر پڑھنے کا ناغہ ہوتے ہی اس کی روح بلی کے جسم سے آزاد ہو جاتی. اسی لئے اس نے میرا منہ بند کروا دیا تھا. دونوں فوجی جوان مجھے اٹھا کر میرے کمرے میں لے گئے، وہاں مجھے بستر پر ڈال دیا اور سامی کو میرے پاس چھوڑ کر باہر چلے گئے.

تھوڑی دیر بعد بھوانی شنکر لیڈی ایکس کے ساتھ آیا. سامی کے سامنے اس نے یقین دلایا کہ اس کی خواہش کے مطابق لیڈی ایکس کمرے کے باہر پہرہ دے گی، وہاں میری مدد کرنے اور میرا منہ کھولنے کے لئے کیدار بھی نہیں آ سکے گا.

یہ کہہ کر بھوانی شنکر چلا گیا. لیڈی ایکس نفرت سے سامی کو دیکھ رہی تھی کیونکہ اس نے اس کی ایک آنکھ زخمی کر دی تھی، اس وقت اس کی آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی. وہ اپنی دوسری آنکھ سے سامی کو گھور کر رہ گئی. اس کا بس چلتا تو وہ اس کا گلا گھونٹ دیتی لیکن افسران اعلیٰ کا حکم تھا کہ سامی کی ہر زیادتی کو برداشت کیا جائے اور اسے کسی طرح کا نقصان نہ پہنچایا جائے.

وہ زیر لب بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئی. اور میرے کمرے کے دروازے کو باہر سے بند کر دیا. سامی میرے بستر کے قریب ایک میز پر بیٹھی مجھے گھور کر دیکھتی رہی. وہ جانتی تھی کہ ہر رات نو بجے جب میں اپنے کمرے میں سونے کے لئے آتی تو سونے سے پہلے وہ منتر پچاس بار پڑھتی تھی. دستور کے مطابق میں نے پچھلی رات دس بجے وہ منتر پڑھا تھا. اس وقت شام ہو رہی تھی. اب چار گھنٹے کے اندر پھر مجھے وہی منتر پڑھ لینا چاہیئے تھا اور میں نہیں پڑھ سکتی تھی.

میں نے انتظار کیا کہ سات بجے ڈنر کے لئے گانگ بجے گا تو لیڈی ایکس میرے لئے کھانا لائے گی. کھانے کے لئے تو میرا منہ کھولنا پڑے گا. اس وقت میں لقمے چبانے کے دوران وہ منتر پڑھ لوں گی.

سات بجے گانگ کی آواز سنائی دی، میری نظریں دروازے پر جم گئیں میں بہت دیر تک انتظار کرتی رہی، آٹھ بج گئے، پھر نو بج گئے، دروازہ نہیں کھلا، کوئی مجھے پوچھنے نہیں آیا. سامی نے ہر پہلو پر اچھی طرح سوچ لیا تھا شاید اسی نے بھوانی شنکر سے کہا ہو گا کہ مجھے اس رات کھانا نہیں دیا جائے. ایک گھونٹ پانی بھی نہیں پلایا جائے، میری کوئی ایسی ضرورت پوری نہ کی جائے جس سے منہ کھولنے کی ضرورت پیش آئے.

میں سامی کو گھور کر دیکھنے لگی اور دل ہی دل میں اسے گالیاں دینے لگی، کاش کہ میں دل ہی دل میں منتر پڑھ سکتی، پڑھنے کو تو پڑھ سکتی تھی، مگر منتر پڑھنے کے کچھ اصول ہوتے ہیں، کچھ پابندیاں ہوتی ہیں جن پر میں اس وقت عمل نہیں کر سکتی تھی.

وقت گذرتا جا رہا تھا، چوبیس گھنٹے پورے ہو رہے تھے. گرو مہاراج نے کہا تھا کہ چوبیس گھنٹے میں ایک بار ضرور منتر پڑھنا ہو گا. انہوں نے پچاس بار پڑھنے کو کہا تھا. میں ایک بار بھی نہیں پڑھ سکتی تھی. میں بے چینی سے ٹہلانے لگی. مجھے اس طرح باندھا گیا تھا کہ میں آزاد نہیں ہو سکتی تھی، تم میری مجبوریوں کو سمجھ سکتے ہو، کیونکہ تم بھی اس وقت رسیوں سے بندھے ہو "

چھیا کی بات سن کر میں نے پہلی بار قہقہہ لگایا. دراصل میں قہقہہ لگا کر سامی کی ذہانت پر اپنی مسرتوں کا اظہار کر رہا تھا. اس کی ذہانت کے آگے چھیا کے تمام منتر پانی ہو جاتے تھے، اس نے ہزار پابندیوں اور منتروں کے باوجود چھیا کو باندھ کر بری طرح بے بس کر دیا تھا.

سامی کے حوصلے اور صلاحیتیں یہ سکھا رہی تھیں کہ بڑی سے بڑی مصیبت کے سامنے بھی انسان کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہیئے بلکہ بڑی دلجمعی اور خود اعتمادی سے اپنی ذہانت کو کام میں لانا چاہیئے. سچ پوچھو تو وہ البیلی حسینہ مجھے موت کے منہ میں بھی زندہ رہنے کا حوصلہ دے رہی تھی.

" پھر کیا ہوا؟ میں نے پوچھا " کیا سامی کی روح بلی کے جسم سے آزاد ہو گئی "؟

" ہاں " چھیا نے جواب دیا " چوبیس گھنٹے کے بعد اس منتر کا اثر ختم ہو جاتا ہے، اس رات ٹھیک دس بج کر پانچ منٹ پر سامی نے بیٹھے بیٹھے آنکھیں بند کر لیں، وہ بڑی آہستگی سے میز پر سے لڑھک گئی. میں سمجھ گئی کہ اس کی روح بلی کے جسم کو چھوڑ چکی ہے.

اب نہ جانے وہ کیسے ہنگامے کرنے والی تھی. کبھی کبھی میں اپنے آپ کو کوستی ہوں کہ میں نے کیوں اس خطرناک لڑکی کا جسم حاصل کیا ہے. ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ جانے کس وقت کیا کر گذرے گی. جی میں آتا ہے کہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو جاؤں اور کہہ دوں کہ لے اپنا جسم واپس لے لے، اور بھگوان کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دے لیکن جب آئینے میں یہ دل موہ لینے والا حسین سراپا دیکھتی ہوں تو اس بدن کو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا. میں بھی ضد میں آجاتی ہوں اور فیصلہ کر لیتی ہوں کہ اس کا مقابلہ کرتی رہوں گی. اگر کبھی ہارنے کی گھڑی آئی تو اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے اس کے اس حسین جسم کو جلا کر راکھ کر دوں گی.

بہر حال بلی کے جسم کو بے جان ہوتے دیکھ کر میں کمرے میں چاروں طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگی، یہ میری حماقت تھی کہ میں اس کی روح کو دیکھنا چاہتی تھی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ روحیں انسانی آنکھوں کو نظر نہیں آتی ہیں بس غیر ارادی طور پر میں اسے گھورنے لگی تھی. تھوڑی دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور لیڈی ایکس اندر آگئی، اس نے بلی کے مردہ جسم کو دیکھا، شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ بلی سو رہی ہے.

وہ میرے قریب آتی ہوئی بولی.

" کیا بھوک لگ رہی ہے "؟

میں زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی، اس لئے " ہاں " کے انداز میں سر ہلا دیا.

" تمہیں کتنی بے دردی سے باندھا گیا ہے تکلیف تو ہو رہی ہو گی "

اچانک میں نے محسوس کیا کہ وہ طنزیہ انداز میں مجھ سے پوچھ رہی ہے لیڈی ایکس اس انداز میں باتیں نہیں کرتی تھی، میں نے اسے حیرانی اور پریشانی سے دیکھا تو وہ قہقہے لگانے لگی، پھر میرے کچھ سمجھنے اور کہنے سے پہلے ہی اس نے کہا.

" چڑیل، تو سامی کے جسم میں رہ کر سامی نہیں بن سکتی. اسی طرح اس لیڈی ایکس کے جسم میں سما کر میں لیڈی ایکس نہیں بن سکتی، مجھے اچھی طرح پہچان لے "

میں نے پہچان لیا، وہ سامی تھی. اس نے لیڈی ایکس کو ختم کر دیا تھا اور اس کے جسم میں سما کر میرے پاس آئی تھی. مجھے پریشان ہوتے دیکھ کر اس نے کہا.

" تو مجھے کسی ایک جسم میں قید کرنے اور مار ڈالنے کے لئے کتنے منتر سیکھے گی؟ اس دنیا کا کوئی منتر ہو. کوئی سائنسی شعبدہ ہو یا کوئی بھی علم ہو، سب دماغ سے پیدا ہوتے ہیں. تو اپنے گرو مہاراج کے دماغ سے سیکھے گی، میں اپنے دماغ سے اس کا توڑ کرتی رہوں گی.

میں بہت دنوں سے سوچ رہی تھی کہ میں اس منتر سے کیسے نجات حاصل کر سکتی ہوں جسے تو روزانہ پڑھتی ہے، میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ میں کسی طرح اپنا ایک ہمدرد اور مددگار پیدا کر لوں. اس کے لئے ضروری تھا کہ لوگ میری طرف متوجہ ہوں. لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے میں نے پہلی بار بنئیے کی دکان میں کھٹے اور کھرے سکے کی پہچان کی. گھر کے سامنے والے ہوٹل میں آئے دن نت نئے تماشے کرتی رہی. دھرم کے مطابق ہر مرد اور عورت کے دماغ میں آواگون کا یہ عقیدہ بٹھا دیا کہ میں پچھلے جنم میں ایک ناری تھی اور اس جنم میں بلی بن کر آئی ہوں. میرا خیال تھا کہ اس دوران کسی سے میری دوستی ہو جائے گی. اور میں اسے اپنا ہمدرد بنا لوں گی. میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ ہم سیکرٹ سروس کے محکمے میں چلے آئیں گے اور اس عمارت میں قید ہو جائیں گے.

یہ بھی اچھا ہی ..... ہوا، یہاں میں نے بھوانی شنکر کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ میرے ہر حکم کی تعمیل کرے، میں اچھی طرح سمجھتی ہوں، یہ سب مطلب کے بندے ہیں، اپنے مطلب کی خاطر میری ہر خواہش پوری کرتے ہیں اور یہ خواہش کس طرح پوری ہوئی ہے، یہ تم دیکھ رہی ہو، تم مجھے بلی کے جسم میں قید کرنا چاہتی تھیں، میں نے تمہیں قید کر دیا ہے، تمہیں اس قابل نہیں رکھا کہ ایک بار بھی منتر پڑھ سکو.

یہ درست ہے کہ میں تمہیں زیادہ دیر تک قیدی بنا کر نہیں رکھ سکتی تم بھوکی پیاسی رہو گی تو میرے ہی جسم کو تکلیف پہنچے گی، میں بلی کے جسم سے آزاد ہونے کے باوجود اپنے جسم کو تمہارے پاس چھوڑ کر نہیں جا سکتی. ورنہ میں لیڈی ایکس کے اس روپ میں عمارت سے باہر جانا چاہوں تو مجھے کوئی نہیں روکے گا.

ایک بار میں نے سوچا کہ میں سگنلنگ کے ذریعے بھوانی شنکر کو اپنی اور تمہاری داستان سنا دوں کہ کس طرح دو عورتوں کے درمیان جادو اور ذہانت کا مقابلہ جاری ہے لیکن یہ باتیں بھوانی شنکر کو بتانے میں مجھے اپنا فائدہ نظر نہیں آیا. وہ اور افسران اعلیٰ ہر حال میں یہی چاہتے ہیں کہ میں بلی بن کر ان کے ہم مشن میں کام آتی رہوں.

اب سے دو دن پہلے بھوانی شنکر نے مجھ سے میری حقیقت پوچھی تھی. ان

میں سے کئی افسروں کو شبہ ہے کہ میرے ساتھ کوئی جادوئی چکر ہے، اور کئی افسر جادو ٹونے کو احمقوں کی دماغی پیداوار کہتے ہیں، لیکن اپنے وہ میرے عقیدے پر سب متفق ہیں، میں نے بھی یہی جواب دیا ہے کہ شاید میں پچھلے جنم میں کوئی پڑھی لکھی عورت تھی، مجھ پر کسی نے جادو نہیں کیا ہے۔ یہ سب بھگوان کی لیلا ہے، اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی، اور وہ لوگ بھی زیادہ الجھنا نہیں چاہتے، انہیں اطمینان ہے کہ انھوں نے تمہیں اور کیدار کو اپنے شکنجے میں کس لیا ہے، تم دونوں نہیں دھوکہ دے کر کہیں جا نہیں سکو گے اور تمہاری وجہ سے میں بھی ان کے ساتھ رہوں گی اور ان کے کام آتی رہوں گی۔

اب میں کیا کر سکتی ہوں؟ یہی کہ میرا جسم جو تمہارے پاس ہے اسے تم سے چھین لوں، تمہارے سانس لینے کے راستے میں دیوار بن جاؤں۔ اس طرح ہمارے درمیان سخت مقابلہ ہوگا، اگر میں جیت گئی اور اپنے جسم میں سما گئی تو تمہاری روح یہاں کسی کے جسم میں سما کر عمارت سے باہر نہیں جاسکے گی کیونکہ تم پڑھی لکھی نہیں ہو، فوجی آداب سے ناواقف ہو اور نہ ہی کیدار کو یہاں چھوڑ کر جاسکتی ہو، حتیٰ کہ بلی کے جسم میں سما کر سگنلنگ کے خفیہ پیغامات کو نہیں سمجھ سکو گی۔ اسی طرح میں بھی اپنا جسم حاصل کر کے اس عمارت سے باہر نہیں جاسکوں گی ہم دونوں مجبور ہیں، ایک دوسرے کی مدد کے بغیر سیکرٹ سروس کے اس محکمے سے نجات حاصل نہیں کرسکیں گے۔

فی الحال دانشمندی یہ ہے کہ میں تمہیں اپنے ہی جسم میں رہنے دوں۔ اور خود بلی کے شریر میں رہ کر بھوانی شنکر کا اعتماد بحال رکھوں۔ اس دیس سے باہر جانے وقت میں سوچوں گی کہ مجھے کس طرح تم سے نمٹنا چاہیئے، ابھی اس حالت کو دیکھ کر سمجھ لو کہ میں جب چاہوں بھوانی شنکر سے کہہ کر تمہاری زبان بند کرسکتی ہوں، وہ مجھے اپنا آلۂ کار سمجھتا ہے، میں اسے اپنا آلۂ کار بنا کر جب چاہوں تمہارے منتروں کو روک سکتی ہوں، لہٰذا مجھے مجبوراً پھر ایک بار بلی کے جسم میں رہنا ہوگا تاکہ بھوانی شنکر کا اعتماد قائم رہے اور وہ ہمیں اس ملک سے باہر لے جائے . . . .

سامی کی زبان سے یہ سن کر اطمینان ہوا کہ وہ پھر بلی کے جسم میں سما جائے گی، وہ مجھ سے زیادہ سمجھدار ہے، یہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ بلی کے روپ میں سیکرٹ سروس والوں کی آلۂ کار بنے بغیر وہ مجھے وہاں سے نکال کر نہیں لیجا سکے گی۔ ہمارے درمیان ایک عجیب سی جنگ جاری ہے، ہماری آپس میں دشمنی ہے، لیکن ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور ہیں۔

میں سمجھ رہی تھی کہ سامی یہی باتیں بتانے کے لئے بلی کے جسم سے آزاد ہو کر لیڈی ایکس کے روپ میں آئی ہے، لیکن بات کچھ اور بھی تھی۔ وہ اس فریب کو نہیں بھولی تھی جو اس کے باپ کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اس نے مجھے نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں تیرا جنم کیسے ہوا تھا، شاید تو اپنے باپ کا نام بھی نہیں جانتی ہوگی، اسی لئے تو یہ بھی نہیں جانتی کہ بیٹی کی جدائی سے ماں باپ کے دلوں پر کیا گذرتی ہے، تو نے مجھے میرے ماں باپ سے جدا کر دیا۔ تیری وجہ سے میری ماں صدمے سہتے سہتے مرگئی، آج میرے ڈیڈی مجھ سے ملنے آئے تھے۔ لیکن تم سب نے مل کر انہیں دھوکہ دیا۔ تو نے، بھوانی شنکر نے، کرنل نے اور لیڈی ایکس نے پھر ایک باپ کو اس کی بیٹی سے جدا کر دیا۔ ڈیڈی جس طرح دل برداشتہ ہو کر یہاں سے گئے ہیں وہ صدمہ برداشت نہیں کرسکتی، میں تم سب سے گن گن کر بدلے لوں گی۔ بھوانی شنکر جو میرا سب سے بڑا ہمدرد ہے، میں اس دیس کے باہر جا کر اس سے بھی نمٹ لوں گی۔ لیڈی ایکس کا انجام تو دیکھ رہی ہے، اس کا جسم روح سے خالی ہو چکا ہے وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے، اب کرنل کی باری ہے اس نے میرے ڈیڈی کو دکھ پہنچایا ہے، میں اسے اس دنیا کے تمام دکھوں سے آزاد کرنے جا رہی ہوں۔ . . .

یہ کہہ کر وہ جانے لگی، میں اس سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن میرے منہ پر بندھی ہوئی پٹی نے کچھ نہ بولنے دیا۔ وہ اپنی سنا کر چلی گئی۔ دروازہ باہر سے بند ہو گیا تھا۔ میں بار بار دروازے کی طرف دیکھتی ہوئی اس کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔

وہ دوبارہ لیڈی ایکس کے روپ میں واپس نہیں آئی۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد اس عمارت میں فائرنگ کی آواز سنائی دی پھر خطرے کی گھنٹیاں گونجنے لگیں۔ کمرے کے باہر ننگے فرش پر فوجی بوٹوں کی دھمک سنائی دینے لگی، میری سمجھ میں یہی آیا کہ سامی نے ریوالور کی گولیوں سے کرنل کو ہلاک کر دیا ہوگا۔ ریوالور لیڈی ایکس کے ہولسٹر میں موجود تھا اور وہ بلا روک ٹوک کرنل کی خواب گاہ میں کسی بھی بہانے سے جاسکتی تھی۔

بہت دیر بعد میرے کمرے کا دروازہ کھلا۔ بھوانی شنکر اپنے دو ماتحت کے ساتھ آیا تھا سب سے پہلے اس نے مجھے دیکھا۔ میں اسی طرح بندھی ہوئی پڑی تھی جس طرح وہ مجھے چھوڑ کر گئے تھے، پھر اس نے بلی کی جانب دیکھا میری نظریں بھی میز پر گئیں جہاں وہ مردہ پڑی ہوئی تھی۔ لیکن اب وہ مردہ نہیں تھی۔ میز پر اطمینان سے بیٹھی ہوئی دائیں پنجے سے اپنے سر کو کھجا رہی تھی۔ بھوانی شنکر نے اس سے پوچھا۔

"کیا لیڈی ایکس اس کمرے کے اندر آئی تھی؟"

سامی نے اشاروں میں جواب دیا۔ بھوانی شنکر نے پوچھا کہ وہ کیوں آئی تھی اور کیا کہہ رہی تھی؟

وہ پھر اشاروں میں جواب دینے لگی۔ بھوانی شنکر نے اپنے ماتحتوں سے ان اشاروں کی وضاحت کی۔ سامی نے اسے بتایا کہ لیڈی ایکس کمرے میں آکر میرے ہاتھ پاؤں کھولنا چاہتی تھی، لیکن اس نے پھر پنجے مار کر اسے بھگا دیا۔

اس کا جواب سن کر دونوں ماتحت بھوانی شنکر سے تبادلہ خیال کرنے لگے ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ لیڈی ایکس کو کیا ہو گیا تھا، اس نے ایک ایسی عورت کو آزاد کرنا چاہا جسے باندھ کر رکھا گیا تھا۔ ان لوگوں کی گفتگو سے پتہ چلا کہ لیڈی ایکس کرنل کی خواب گاہ میں گئی تھی اور کرنل کے کچھ سمجھنے اور سنبھلنے سے پہلے ہی اس کی دونوں ٹانگوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ دو گولیاں دائیں ران میں اور دو گولیاں بائیں ران میں پیوست ہو گئی تھیں۔ کرنل کو فوری طبی امداد پہنچائی

جا رہی تھی، ان کا خیال تھا کہ وہ بچ تو جائے گا، لیکن دونوں پیروں سے اپاہج ہو جائے گا۔

سامی نے اسے اس طرح مارا تھا کہ وہ زندہ ... لیکن ایک اپاہج کی طرح زندگی گذارتا۔ مارنے والی سامی تھی مگر لیڈی ایکس قاتل سمجھی جا رہی تھی۔ وہ قتل کرنے کے بعد خود بھی مردہ بن کر کرنل کے قریب گر پڑی تھی، وہ آپ ہی آپ کیسے مر گئی تھی، یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، وہ لوگ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ قاتلہ بلی کے روپ میں ان کے سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔

بھوانی شنکر نے سامی سے اجازت لے کر مجھے آزاد کر دیا، انہیں شبہ تھا کہ میں نے وہاں سے فرار ہونے کے لئے لیڈی ایکس کو اپنی حمایتی اور آلۂ کار بنایا تھا۔ کرنل کو اسی سازش کے تحت زخمی کیا گیا تھا۔ اس خیال کے پیش نظر وہ مجھ سے کئی طرح کے سوالات کرتے رہے، ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ مجھے اذیتیں دے کر اس سازش کا اقرار کرنے پر مجبور کر دیتے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ مجھے ہاتھ بھی لگایا گیا تو سامی ان کی دشمن بن جائے گی اور ان کے کسی بھی مشن میں کام نہیں آئے گی

وہ میرے خلاف کوئی قدم نہ اٹھا سکے لیکن مجھ سے اور کیدار سے بہت زیادہ محتاط رہنے لگے، سامی ان کی نظروں میں پھول تھی اور ہم کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے، اس عرصہ میں مشن پر جانے کی تیاریاں مکمل ہو رہی تھیں، مجھے اور کیدار کو اسلامی تہذیب سکھائی جا رہی تھی، ہمیں جہاں بھی جانا تھا مسلمان بن کر جانا تھا لہٰذا ہمیں مسلمانوں کے رہنے سہنے، کھانے پینے اور بولنے کے آداب سکھائے جا رہے تھے۔ کیدار کا نام قادر بخش اور میرا نام سلمیٰ قادر رکھا گیا تھا۔ ہم دونوں کی حیثیت میاں بیوی کی تھی یعنی صرف میاں بیوی کا رشتہ تھا۔ سامی کب موقع دیتی تھی کہ میں ایک رات بھی اپنے میاں قادر بخش کے ساتھ گذار سکتی

بہر حال ٹریننگ حاصل کرنے میں چھ ماہ گذر گئے، ایک دن ہم دہلی سے بذریعہ ٹرین کاٹھیار روانہ ہو گئے، اس مشن میں بھوانی شنکر ہمارا لیڈر تھا۔ میرے، سامی اور کیدار کے علاوہ اس کے دو اور ماتحت تھے، وہ دونوں میری اور کیدار کی کڑی نگرانی کرتے تھے۔ سامی بلی کے روپ میں ہمیشہ بھوانی شنکر کے ساتھ رہتی تھی اور مجھے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھی

ایک رات ہم غیر قانونی طریقہ سے سرحد پار کر کے مشرقی پاکستان کے سرحدی شہر دیناج پور پہنچ گئے، وہاں ہم سب کے ڈومیسائل سرٹیفکیٹ تیار تھے جن کی رو سے ہم مشرقی پاکستان کے باشندے تھے اور قیام پاکستان کے وقت سے ڈھاکہ شہر میں رہتے آرہے تھے دوسرے دن ہم ڈھاکہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

جیسا کہ تم نے اخباروں میں پڑھا ہوگا یا ریڈیو کی خبروں میں سنا ہوگا وہاں زبردست سیلاب آیا ہوا ہے، کتنے ہی گاؤں اور شہر پانی میں ڈوبے ہوئے ہیں، ڈھاکہ شہر کے بھی کتنے ہی علاقے سیلاب کی زد میں آگئے تھے، ہم بھی بیارے سے وہاں پہنچے، اس شہر میں بھی ہمارے دیس کے کتنے ہی جاسوس بہترین رہائشی علاقوں میں رہتے ہیں۔ ہماری رہائش کا انتظام سنکھائی بازار کے پرانے علاقے میں کیا گیا تھا۔ یہ علاقہ بوڑھی گنگا کے قریب ہے اس لئے پانی میں ڈوبا ہوا ہے اس کی گلیوں اور مکانوں میں کہیں گھٹنے تک اور کہیں کمر تک پانی آگیا تھا بھوانی شنکر نے اس سیلاب زدہ علاقے میں رہنا پسند کیا۔ کیونکہ وہاں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے، مسلمان بہت کم نظر آتے ہیں۔ مجھے اور کیدار کو وہ جگہ اس لئے پسند آئی کہ ہم جس گلی میں تھے اس گلی کے آخری سرے پر کالی مائی کا مندر تھا۔ ہم کسی وقت بھی موقعہ پا کر بھوانی شنکر کا ساتھ چھوڑ سکتے تھے اور مندر میں جا کر کسی حصے میں رکھشا کنڈل کی ریکھا کھینچ کر اپنی منتروں کا جاپ کرسکتے تھے جو ابھی کیدار یہاں کر رہا ہے پھر یہ کہ مندر میں کسی نوجوان کی بھینٹ دی جاتی تو درگا مائی پرسن ہو کر اس بھینٹ کو سوئیکار کر لیتی۔

بھوانی شنکر ... مصروف رہا کیدار بھی گھومنے پھرنے چلا گیا، میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ مندر تک پہنچنے کے راستے کو اچھی طرح ذہن نشین کرلے، اس کے ساتھ بھوانی شنکر کا ایک آدمی بھی گیا تھا۔ ہماری رہائش دوسری منزل پر تھی، نچلی منزل کی نصف دیواریں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ گلیوں سے گذرنے کے لئے کشتی میں بیٹھ کر جانا پڑتا تھا مین روڈ پر جہاں پانی برائے نام تھا وہاں تک کشتی پہنچاتی تھی، پھر بھوانی شنکر کا ایک آدمی اس کشتی کو واپس مکان میں لے آتا تھا۔

میں تفصیل سے یہ باتیں اس لئے بتا رہی ہوں کہ تمہیں اس بات کا اندازہ ہو جائے کہ وہاں سے فرار ہونا کتنا دشوار تھا۔ ایک تو بھوانی شنکر کے آدمیوں کا پہرہ تھا دوسرے چاروں طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ اگرچہ مندر وہاں سے صرف سو گز کے فاصلے پر تھا لیکن وہاں تک پہنچنے کے لئے کشتی کی ضرورت تھی۔ کیدار تو تیر کر جا سکتا تھا۔ مجھے تیرنا نہیں آتا تھا اور سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ سامی میرے پیچھے ہمیشہ سائے کی طرح لگی رہتی تھی

سامی کتنی چالاک ہے، یہ میں ہی جانتی ہوں۔ وہ اپنے منصوبے کے مطابق مجھے وہاں سے نکال کر لے جاسکتی تھی لیکن ہمارے منصوبے کے مطابق فرار ہونا کبھی پسند نہ کرتی۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ مندر میں پناہ لینے کے بعد اپنے منتروں کے زور پر سامی کو بلاؤں گی۔

رات ہوتے ہی سناٹا چھا گیا، سیلاب کی وجہ سے کتنے ہی لوگ اپنے مکانوں میں تالے ڈال کر دوسرے علاقوں میں چلے گئے تھے کہیں دو چار مکانوں میں لالٹین اور مٹی کے دیئے روشن نظر آتے تھے۔ بجلی کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ ہمارے مکان میں بھی لالٹین کی روشنی تھی۔ رات کے دس بجے ایک کشتی مکان کی نچلی منزل میں آئی، اس میں ایک شخص ہاتھ میں مشعل لئے بیٹھا ہوا تھا اور اس مشعل کی روشنی میں ماجھی اپنی ناؤ کو دروازے سے باندھ رہا تھا

بھوانی شنکر نے بتایا کہ وہ ہمارے دیس کی سیکرٹ سروس کا ایک ایجنٹ ہے اور برسوں سے وہاں تخریبی کارروائیاں کر رہا ہے، اس کا نام سبھاش مکرجی تھا۔ بھوانی شنکر اسے ایک کمرے میں اہم بات چیت کے لئے لے کر آیا، جو رازکی باتیں تھیں وہ سامی کے سامنے ضرور ہوتی تھیں اور سامی کی وجہ سے بھوانی شنکر

مجھے بھی اپنے راز میں مجبوراً شریک کر لیتا تھا سبھاش مکرجی نے میری موجودگی پر اعتراض کیا تو بھوانی شنکر نے اسے بتایا کہ یہ بلی ہماری آلہ کار ہے اور اس عورت کے بغیر نہیں رہتی ہے، حتیٰ کہ اسے ایک کمرے میں چھوڑ کر دوسرے کمرے میں نہیں جاتی ہے۔

مکرجی سامی کو حیرانی اور بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایک بلی اہم معاملات میں آلہ کار بن سکتی ہے، اس نے بھوانی شنکر سے کہا۔

"مسٹر شنکر! یہ درست ہے کہ جانور بھی حیرت انگیز کرتب دکھاتے ہیں اور خفیہ پیغام رسانی کا کام بھی بخوبی انجام دیتے ہیں لیکن کل ہمارے مقصد کے لئے آپ اس بلی کو استعمال نہیں کر سکیں گے، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، کل صبح دس بجے ایک ملک کے وزیر خارجہ گورنر ہاؤس میں آرہے ہیں، دونوں ملکوں کے تعلقات اور زیادہ مستحکم بنانے کے لئے مزید معاہدے کئے جائیں گے اس کے بعد معاہدے کا فائیل یہاں کے وزارت خارجہ کے سیکرٹری کی تحویل میں رہے گا۔ اب یہ آپ بتائیں کہ آپ کس طرح سیکرٹری کے دفتر تک پہنچیں گے اور فلم کی ... دفلم تیار کریں گے؟"

بھوانی شنکر نے مسکرا کر سامی کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

"میں کچھ نہیں کروں گا، کل صبح یہ بلی گورنر ہاؤس جائے گی ظاہر ہے کہ وہاں کوئی نہیں جاسکتا، مگر یہ جاسکتی ہے، پہریداروں کی نظریں بچا کر سیدھی دروازے سے جاسکتی ہے یا روشندان کے ذریعہ کمرے میں داخل ہو کر وہاں کسی صوفے کے نیچے چھپ سکتی ہے، یہ معاہدے کے متعلق تمام باتیں سنے گی اور یہاں واپس آکر مجھے نوٹ کرائے گی۔"

مکرجی نے حیرانی سے کہا۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ ایک بلی انسانوں کی گفتگو کیسے سمجھ سکتی ہے اور کس طرح وہ پوری گفتگو آپ کو سنا سکتی ہے؟"

بھوانی شنکر نے فخر سے کہا۔ "یہ سب کچھ کر سکتی ہے، لیکن آپ کو یقین نہیں آئے گا، آپ ایسا کریں کہ اسے دوسرے کمرے میں لے جائیں اور اس کے سامنے ہندی یا انگریزی زبان میں کوئی بات کہیں، میں یہاں بیٹھا رہوں گا۔ یہ بلی یہاں آکر وہ بات مجھے بتا دے گی۔"

مکرجی نے بے یقینی سے سامی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم میرے ساتھ دوسرے کمرے میں چلو گی؟"

سامی بھوانی شنکر کے پاس سے اٹھ کر میرے پاس آگئی، کیونکہ مجھے چھوڑ کر وہ دوسرے کمرے میں نہیں جانا چاہتی تھی، میں اسے گود میں لے کر مکرجی کے ساتھ کمرے سے باہر چلی گئی۔

دوسرے کمرے میں مکرجی اس کے سامنے بیٹھ کر آہستہ آہستہ انگریزی زبان میں کچھ کہنے لگا۔ پھر ہم بھوانی شنکر کے کمرے میں آگئے۔ مکرجی نے جو کچھ کہا تھا، سامی اسے سگنلنگ کے ذریعہ بتانے لگی۔ بھوانی شنکر نے وہ باتیں نوٹ کرنے کے بعد کہا۔

"مسٹر مکرجی! آپ نے اس بلی سے کہا ہے کہ انسان پڑھنے لکھنے میں اپنی

زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ گذار دیتا ہے، تم ایک بے زبان بلی ہو، بھلا تم ... جانو کہ انگریزی لٹریچر کیا ہوتا ہے اور سیاسی معاہدے کس طرح کئے ... ہیں، اگر تم واقعی سمجھتی ہو اور اتنی ذہین ہو تو پھر میں یہی کہوں گا کہ تم ... کو بلّے بلیاں بن کر پیدا ہونا چاہئے، یہ بات مضحکہ خیز ہے، میں اس پر یقین نہیں کر سکتا۔"

بھوانی شنکر نوٹ کی ہوئی باتیں سنا رہا تھا اور مکرجی شدید حیرانی ... آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامی کو دیکھ رہا تھا۔ بھوانی شنکر نے قہقہہ لگاتے ہوئے ... "آپ اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیوں دیکھ رہے ہیں، کیا میں نے جو کچھ ... ہے، وہی باتیں آپ نے اس بلی سے نہیں کہی تھیں؟"

"ہاں" اس نے اعتراف کیا: "میں نے یہی باتیں اس سے کہی تھیں ... مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ انسانوں کی طرح باتیں سمجھتی ہے اور اشاروں میں ... بتا دیتی ہے، آپ اسے کہاں سے پکڑ لائے ہیں؟"

"بس یہ سمجھ لیجئے کہ کسی طرح ہمارے ہاتھ لگ گئی ہے۔"

"کیا آپ نے یہ نہیں سوچا کہ ایک بلی میں ایسی صلاحیتیں کیسے ... ہیں، کیا آپ کی عقل اسے تسلیم کرتی ہے؟"

"ایسی باتوں کو کوئی بھی عقلمند انسان تسلیم نہیں کرتا، لیکن جو باتیں نظروں کے سامنے پیش آرہی ہیں، ہم انہیں کیسے تسلیم نہ کریں۔ یہ بلی کہ... شاید یہ پچھلے جنم میں عورت تھی، اس جنم میں بلی بن کر پیدا ہوئی ہے، پہلے ... کے انوسار ایسا ہوسکتا ہے۔"

مکرجی نے جواب دیا۔ "دھرم کی بہت سی باتیں مضحکہ خیز ہیں ... ماننا۔ اس سائنسی دور میں ہماری عقل صرف ایک ہی ناقابل فہم علم کو مانتی ہے ... وہ علم ہے کالا جادو۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ یہ بلی جو کچھ بھی کر رہی ہے ... سب کالے جادو کے زیر اثر کر رہی ہے۔"

"مسٹر مکرجی! اگر آپ کی بات درست ہے، تب بھی ہمارے لئے ... پڑتا ہے، اگر کسی نے اپنے کالے عمل سے یہ بلی بنائی ہے تو ٹھیک ہے ... ہی رہے گی اور ہمارے کام آتی رہے گی۔"

"آپ غلط سوچ رہے ہیں، جادو کبھی دیرپا نہیں ہوتا، کسی وقت ... اس کا اثر ختم ہوسکتا ہے، فرض کیجئے کہ یہ بلی گورنر ہاؤس جاتی ہے ... وقت طلسم ٹوٹ جاتا ہے تب کیا ہوگا، آپ کی ساری پلاننگ چوپٹ ... گی، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جادو کا اثر الٹا ہو اور یہ بلی یہاں کی پولیس ... ٹھکانے تک لے آئے تو پھر ہمارا کیا حشر ہوگا؟"

اس کی باتیں سن کر بھوانی شنکر پریشان ہوگیا۔ وہ تھوڑی دیر ... کے بعد بولا۔

"اگر اس پہلو سے سوچا جائے کہ یہ بلی جادو کے اثر سے ایسا ... کرتی ہے تو پھر واقعی جادو کا اثر الٹا بھی ہوسکتا ہے، یہ ہمیں کسی دن ... گرفتار کرا سکتی ہے، لیکن میں کیسے مان لوں کہ یہ سب جادوئی حکمت ... ہمیں یہ یقین ہونا چاہئے کہ یہ صرف ایک بلی ہے اور کسی کالے عمل ...

اس میں انسانی صلاحیتیں پیدا کی گئی ہیں۔"

مکرجی نے کہا۔ "ہاں، ہمیں پہلے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ اس بلی کے پیچھے کیا بھید ہے، یہاں اس گلی کے آخری سرے میں درگا مندر ہے اس کے پجاری کالے علم کو خوب سمجھتے ہیں، وہ انتر گیانی ہیں، اندر کے بھید بتا دیتے ہیں۔ اس بلی کو دیکھ کر بتا دیں گے کہ یہ اوپر سے کیا ہے اور اندر سے کیا ہے؟"

مکرجی کی باتیں سن کر میں گھبرا گئی، سوچنے لگی کہ درگا کے مندر میں اگر کوئی انتر گیانی ہے تو وہ بلاشبہ اس بلی کی حقیقت کو سمجھ لے گا اور شاید مجھے بھی پہچان لے کہ میں اندر سے کیا ہوں۔

میں نے پریشان ہو کر سامی کی طرف دیکھا تو وہ بھی سر جھکائے خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ شاید وہ بھی سوچ رہی تھی کہ کالے جادو کا بھید کھل جانے سے اس کا کیا فائدہ ہے اور کیا نقصان ہے، میں وہاں سے اٹھ کر کیدار کی طرف جانے لگی تاکہ اسے صورتحال سے آگاہ کر دوں، سامی بھی میرے پیچھے چلی آئی۔

بھوانی شنکر اور مکرجی اس بات پر متفق ہو رہے تھے کہ درگا مندر کے پجاری کو یہاں بلانا چاہئے یا پھر سامی کو وہاں لے جانا چاہئے۔

میں نے دوسرے کمرے میں آکر کیدار کو ساری باتیں بتا دیں، کیدار نے پریشان ہو کر کہا۔

"یہ تو بڑی مصیبت ہے، کیا یہ سامی چاہتی ہے کہ یہ بھید کھل جائے؟"

"میں کیا جانوں کہ سامی کیا چاہتی ہے، میں نے چوبیس گھنٹے کے لئے منتر پڑھا تھا، یہ ابھی دس بجے تک بلی کے شریر میں قید رہے گی۔ جب تک یہ آزاد ہو کر کسی دوسرے روپ میں نہیں آئے گی، ہمیں اس کے خیال کا پتہ نہیں چلے گا کہ یہ کیا چاہتی ہے۔"

"چھیا! تجھے بھی سگنل والے اشاروں کو سیکھ لینا چاہئے تھا وہ بھوانی شنکر اس کے اشاروں کو سمجھ لیتا ہے اور ہم نہیں سمجھتے، اب تو ہی دیکھ لے کہ کیسی مشکل آپڑی ہے؟"

"ارے مورکھ! میں سگنل والے اشارے کیسے سمجھ سکتی ہوں وہ اشاروں سے انگریزی کے لفظ بولتی ہے اور مجھے انگریزی نہیں آتی، تو بیکار باتیں کیوں کر رہا ہے، ابھی جو مصیبت آئی ہے، اس کی بات کر، کوئی تدبیر سوچ کہ ہمارا بھید کسی طرح نہ کھلے۔"

وہ سوچنے لگا، اس کے دماغ میں تو گوبر بھرا ہوا ہے، اتنی جلدی اس کی کھوپڑی میں بات نہیں آسکتی تھی۔ دوسرے کمرے سے مکرجی باہر آرہا تھا شاید اسی پجاری کو بلانے جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہمارا بھید کھلنے والا تھا۔ پھر نہ جانے بھوانی شنکر اور اس کے آدمی ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتے، کیونکہ وہ ایک بلی کے بھروسے پر اپنے دیس سے دور ایک اہم مشن پر آئے تھے، اب انہیں کسی بھی مرحلے پر ناکامی کا اندیشہ ہوسکتا تھا اور وہ اپنی ناکامی ... ہمیں بھی عبرتناک سزا دے سکتے تھے

میں سوچ رہی تھی کہ اچانک سامی دوڑتی ہوئی بھوانی شنکر اور مکرجی کے سامنے آئی اور غرا کر مکرجی کو دیکھنے لگی، بھوانی شنکر نے ذرا جھک کر اسے پیار سے اپنی گود میں بلایا، لیکن وہ چھلانگ لگا کر کھڑکی کی چوکھٹ پر چلی گئی۔ وہاں سے اس نے نیچے جھانک کر دیکھا، نیچے گلی میں پانی بھرا ہوا تھا، گلی کے دوسری طرف کے مکان کا چھجا سات فٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ چھلانگ لگا کر چھجے پر پہنچ گئی۔ بھوانی شنکر نے چیخ کر اپنے آدمیوں کو آواز دی۔

"اسے دیکھو، یہ کہاں جا رہی ہے، اسے پکڑو۔"

ذرا سی دیر میں بھاگ دوڑ شروع ہوگئی۔ ایک ماتحت دوڑتا ہوا نچلی منزل میں گیا اور پانی میں چھلانگ لگا کر تیرتے ہوئے گلی کی طرف جانے لگا۔ بھوانی شنکر نے کھڑکی کے پاس آکر دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے سامی کو پکارا لیکن وہ پلٹ کر مکان کے اندر چلی گئی۔ وہ مکان آباد نہیں تھا، تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا وہ بھی اندھیرے میں گم ہوگئی۔

میں سامی کی چالاکی سمجھ گئی، وہ اس لئے بھاگ گئی تھی کہ درگا مندر کے پجاری سے اس کا سامنا نہ ہو، سامنا نہ ہوگا تو وہ پجاری نہ اسے دیکھ سکے گا۔ نہ اس کی اصلیت معلوم کر سکے گا، سامی نہیں چاہتی تھی کہ بھوانی شنکر کو کالے علم کا پتہ چلے، اگر پتہ چل جاتا تو وہ میرے جھوٹ اور فریب کی مجھے سزا دیتا۔ اس وقت وہ بلی کو بھی اپنا آلۂ کار سمجھنے کی بجائے ایک فریب سمجھتا اور اس کی کوئی بات تسلیم نہ کرتا۔ وہ میرے جسم کو اذیتیں دیتا تو سامی کو تکلیف پہنچتی، لہٰذا وہ پجاری سے دور رہنے کے لئے چلی گئی تھی۔ بھوانی شنکر سوچ رہا تھا کہ وہ فرار ہوگئی ہے لیکن میں جانتی تھی کہ وہ مجھے چھوڑ کر زیادہ دور نہیں جائے گی۔

رات کے گیارہ بجے تک وہ ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف چھلانگیں لگاتی رہی، کبھی ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی اور کبھی نگاہوں کے سامنے آجاتی تھی، دس بجے کے قریب مجھے خیال آیا کہ پچھلا منتر پڑھے ہوئے چوبیس گھنٹے گذر چکے ہیں، اگر میں نے پھر پچاس بار منتر نہ پڑھا تو سامی کی روح کسی وقت بھی بلی کے جسم سے آزاد ہوسکتی ہے، لیکن میں نے ڈھیل دے دی کہ وہ چاہے تو بلی کے شریر میں رہے یا کسی دوسرے روپ میں آجائے، جس طرح بھی اپنا، میرا اور کیدار کا بچاؤ کر سکتی ہے کرے۔ اتنا مجھے یقین تھا کہ وہ کسی روپ میں رہے، جانور کے جسم میں رہے یا انسان کے جسم میں، میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں کسی نوجوان کی بھینٹ دینے کے وقت اسے منتروں کے زور سے رکھشا کنڈل میں کھینچ لاؤں گی۔

ساڑھے دس بجے وہ غائب ہوگئی۔ پھر آدھے گھنٹے کے بعد گیارہ بجے سامنے والے مکان کے چھجے پر نظر آئی۔ بھوانی شنکر نے پھر سے پکارا تو وہ چھلانگ لگا کر کھڑکی پر آئی۔ اس کے بعد وہاں سے اس کے قدموں پر پہنچ گئی۔ بھوانی شنکر نے خوش ہو کر اسے گود میں اٹھا لیا اور اسے پچکارتے ہوئے مکرجی سے کہا۔

"یہ مجھ سے مانوس ہے، مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ دیکھ لیجئے کیسے واپس آگئی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ محض شرارت کرنے کے لئے ادھر سے ادھر بھاگ رہی تھی، ہم سب خواہ مخواہ پریشان ہو رہے تھے۔"

"واقعی"، مکرجی نے کہا۔ "میں بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ ہم بوکھلاہٹ میں یہ بھول گئے کہ اچھلنے کودنے والے جانور عادتاً ادھر

سے ادھر بھاگتے رہتے ہیں"

بھوانی شنکر نے سامی کو ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

" میری جان! تمہیں کیا ہو گیا تھا؟ تم یہاں سے بھاگ کر اس مکان میں کیوں چلی گئی تھیں؟"

سامی اشاروں میں جواب دینے لگی۔ بھوانی شنکر نے مسکرا کر اس کے جواب کی تشریح کی۔

" مسٹر مکرجی! کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ یہ کہتی ہے کہ سامنے والے مکان میں اسے چوہا نظر آ گیا تھا، یہ اسے شکار کرنے گئی تھی۔ یعنی یہ چوہے کے پیچھے بھاگتی رہی اور ہمارے آدمی اس کے پیچھے پریشان ہوتے رہے، اچھا آپ یہ بتائیے کہ چوہے شکار کرنے کی عادت سے کیا یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ حقیقتاً بلی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی جادوئی چکر نہیں ہے"

• نہیں مسٹر شنکر! میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ اس بلی کے پیچھے کوئی بھید ہے، آپ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ یہ بلی کی عادت کے مطابق چوہوں کے پیچھے بھاگتی ہے، یہ بھی تو سوچئے کہ اس میں انسانوں کی عادتیں کہاں سے آ گئی ہیں۔ میری بات مانیئے، میں اس پجاری کو یہاں بلا کر لاتا ہوں، یا پھر ہم اسے لے کر مندر میں چلتے ہیں، وہاں پتہ چل جائے گا کہ اصلیت کیا ہے"؟

میں سوچنے لگی کہ پھر اسی پجاری کی باتیں شروع ہو گئی ہیں۔ سامی نے اتنا وقت ضائع کیا، لیکن وہ لوگ پجاری کا خیال دماغ سے نہیں نکال سکے، اب تو اس اشتر گیانی کا سامنا کرنا ہی پڑے گا، تو پھر کیوں نہ ہم مندر چلیں تاکہ میں بھی مندر کو اندر سے دیکھ لوں اور درگا مائی کے درشن کر لوں اور اگر موقعہ ملا اور وہ پجاری میرے علم کے سامنے کمزور نظر آیا تو میں اس کی زبان بھی بند کر دوں گی۔ میں نے بھوانی شنکر سے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ سامی نے بھی اشاروں میں میرے خیال کی تائید کی، وہ سامی کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے ہمارے ساتھ مندر تک جانا پڑا۔

ہم زینے طے کرتے ہوئے نچلی منزل کے کمرے میں آئے۔ اس کمرے میں کمر تک پانی کھڑا ہوا تھا۔ پہلے مکرجی پانی میں اتر گیا، اس کے بعد میں بھوانی شنکر کا ہاتھ تھام کر پانی میں آ گئی۔ سامی بھوانی شنکر کے کاندھے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اتنے گہرے پانی میں چلتے وقت میرے قدم ڈگمگا رہے تھے، ہمیں زیادہ دور تک نہیں جانا تھا۔ دروازے کے باہر کشتی بندھی ہوئی تھی، جس کے ایک سرے پر مشعل روشن تھی، ہم کشتی میں بیٹھ گئے۔ مکرجی اسے کھول کر دھکیلتا ہوا بیچ گلی میں لے آیا پھر اس پر بیٹھ کر چپو چلانے لگا

میں سوچ رہی تھی کہ مجھے پجاری سے کس طرح نمٹنا چاہیئے۔ مشکل یہ تھی کہ میں بھوانی شنکر اور مکرجی کے سامنے کوئی منتر نہیں پڑھ سکتی تھی۔ میری کسی بھی غیر معمولی حرکت سے انہیں شبہ ہو جاتا کہ میں کالا علم جانتی ہوں۔ میں نے سامی کی طرف دیکھا۔ میں جتنی پریشان تھی وہ اتنی ہی مطمئن نظر آ رہی تھی۔

کشتی آگے بڑھتی گئی، مندر قریب آ گیا۔ ہم نے مشعل کی روشنی میں دیکھا مندر کے آہنی دروازے پر کچھ لوگ نظر آ رہے تھے۔ جب ہماری کشتی دروازے کے سامنے پہنچی تو اس وقت دو آدمی پجاری کو سہارا دے کر ایک کشتی میں بٹھا رہے تھے، پجاری کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ کشتی میں آتے ہی لیٹ گیا۔ اس کی ظاہری حالت سے پتہ چلتا تھا کہ وہ سخت بیمار ہے۔ مکرجی کے پوچھنے پر ایک شخص نے جواب دیا کہ ٹھاکر کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے ایک سیوک بھوجن لے کر ٹھاکر کے پاس آیا تھا۔ اس سمے ٹھاکر اچھی طرح بول رہے تھے، پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ بھوجن کرتے کرتے اپنے گلے پر ہاتھ رکھ کر جھکے کئی بار کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن نہ بول سکے، ہمارا خیال ہے کہ ان کے بھوجن میں کچھ ملا دیا گیا ہے، ہم اس بچے ہوئے بھوجن کو بھی ساتھ لئے جا رہے ہیں اس کے معائنہ سے پتہ چل جائے گا کہ ٹھاکر کی آواز بند ہونے کا کارن کیا ہے

اس کی باتیں سنتے ہی میں چونک کر سامی کو دیکھنے لگی، میں سمجھ گئی کہ اس نے کچھ گڑبڑ کی ہے، وہ بھی مجھے چپ چاپ اطمینان سے دیکھ رہی تھی۔ ہم وہاں سے واپس چلے آئے، بھوانی شنکر اور مکرجی بحث کر رہے تھے۔ مکرجی کہہ رہا تھا

" بھلا پجاری سے کون دشمنی کر سکتا ہے۔ یہاں سب ہی اس کی عزت کرتے ہیں، اس نے آج تک کبھی اپنے کالے علم سے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا پھر اچانک ہی اس کی آواز کیسے بند ہو گئی؟ کون اس سے دشمنی کر سکتا ہے"

بھوانی شنکر نے جواب دیا۔

" ایسا تو وہی کر سکتا ہے جو کالا علم جانتا ہو، اور اسے پجاری سے کسی قسم کا خطرہ ہو"

" ہاں۔ میں بھی اسی لائن پر سوچ رہا ہوں، کیا یہ عجیب سی بات نہیں ہے کہ ہم اس بلی کی اصلیت معلوم کرنا چاہتے تھے، ٹھیک اسی وقت پجاری کی زبان بند ہو گئی، وہ کہتے ہیں کہ اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی ہے کسی نے اس کے کھانے میں کچھ ملا دیا ہے"

" میرا خیال ہے کہ سیندور ملایا گیا ہے، سیندور کھانے والے کی آواز بیٹھ جاتی ہے"

" یقیناً اسے سیندور کھلایا گیا ہے" مکرجی نے کہا "لیکن کس نے دیا ہے؟ اس کا سیوک جو اس کے لئے بھات لے کر آتا ہے وہ بہت ہی بھروسے کا آدمی ہے، وہ پجاری سے ایسی دشمنی نہیں کر سکتا"

" پھر ایسا کون کر سکتا ہے"؟

" اسی نامعلوم ہستی نے ایسا کیا ہے، جس کے جادوئی اثر سے یہ بلی انسانی حرکتیں کرتی ہے، وہ نامعلوم ہستی یہ نہیں چاہتی تھی کہ ہم مندر جائیں اور پجاری اپنے گیان سے اس کی اصلیت بتا دے، میرا خیال ہے کہ کسی کالے علم سے اس کی آواز بند کی گئی ہے"

بھوانی شنکر اپنی آنکھیں سکیڑ کر سامی کو دیکھنے لگا۔ وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا کہ اس بلی کے متعلق کیا رائے قائم کرے، اس نے کہا۔

" پتہ نہیں سندور کا اثر کب تک رہے گا، پجاری تو کچھ بولنے کے قابل نہیں ہے، کیا دوسرا کوئی گیانی نہیں ہے"؟

" ہونے کو تو بہت سے ہو سکتے ہیں، لیکن میں کسی کو نہیں جانتا، ایسے ہی کسی گیانی کو تلاش کرنا ہوگا، میرا مشورہ ہے کہ کل آپ بلی سے کوئی کام نہ لیں۔ معاہدے کا فائیل آپ خود ہی حاصل کرنے کی کوشش کریں"۔

بھوانی شنکر نے جواب دیا " ایسی کسی مہم کے لیئے میں ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں، میں اس بلی پر بھروسہ کر کے یہاں تک آیا ہوں۔ آج تک اس نے دھوکہ نہیں دیا ہے، میرا ہر حکم مانتی ہے۔ محض ذرا سے شبہ پر اس سے کام نہ لینا دانشمندی نہیں ہے، کل میں اسے ضرور آزماؤں گا"

• اگر دھوکہ ہوا تو؟

• ہم محتاط رہیں گے، ابھی ہم تنہا بیٹھ کر پلاننگ کریں گے کہ ہمیں کس طرح اس سے کام نکالنا چاہیئے"

ہم اپنے مکان میں واپس آ گئے، بھوانی شنکر اور مکرجی ایک کمرے میں گئے اور اس کے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ میں سامی کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی۔ میں جانتی تھی کہ وہ میری بات کا جواب نہیں دے سکے گی، بلی کے روپ میں بے زبان تھی۔ پھر بھی میں نے بے چینی سے پوچھا۔

• مجھے بتاؤ سامی! پجاری کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا تم نے اسے سندور کھلایا ہے"؟

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلا دیا، اب میں اس سے یہ نہ پوچھ سکی کہ اس نے کس طرح اس کے بھات میں یا بھاجی میں سندور ملایا۔ سامی بھی اس وقت کسی دوسرے روپ میں آ کر مجھے تفصیل سے واقعہ نہیں سنانا چاہتی تھی۔ وہ اطمینان سے میرے بستر کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ مجھے بھی اطمینان حاصل ہو گیا تھا کہ اس نے ایک بہت بڑی مصیبت دور کر دی ہے۔

دوسری صبح بھوانی شنکر مجھے اور سامی کو اپنے ساتھ گورنر ہاؤس کی طرف لے گیا۔ اس نے سامی کو دو گھنٹے پہلے ہی گورنر ہاؤس کے احاطے میں چھوڑ دیا تاکہ وہ اس عمارت کے ہر گوشے کو اچھی طرح دیکھ لے اور اس کمرے کے متعلق بھی معلومات حاصل کر لے جہاں گورنر اور ایک غیر ملک کے وزیر خارجہ کے درمیان اہم گفتگو ہونے والی تھی۔ سامی کے جانے کے بعد بھوانی شنکر مجھے ایک ہوٹل میں لے کر آیا، وہاں پہلے ہی ایک کمرہ ہمارے لئے مخصوص تھا۔ اس کے دونوں ماتحت کیدار کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گئے تھے انہوں نے احتیاطاً سنگھاری بازار کا مکان چھوڑ دیا تھا، ان کی سوچ کے مطابق اگر سامی دھوکہ دینا چاہتی تو اسے اس ہوٹل کا پتہ معلوم نہ ہوتا، اس کی طرف سے کوئی خطرہ پیش آنے کی صورت میں انہوں نے وہاں سے فرار ہونے کے بھی انتظامات کر لئے تھے۔

لیکن سامی مجھے ان کی تحویل میں چھوڑ کر نہ تو کہیں جا سکتی تھی اور نہ ہی انہیں کسی طرح کا نقصان پہنچا سکتی تھی۔ بھوانی شنکر اسے ساتھ لئے ادھر سے ادھر گھومتا رہا، جب اسے یقین ہو گیا کہ کوئی اس کا پیچھا نہیں کر رہا ہے تو وہ میرے پاس آ گیا۔ اس نے فون کر کے مکرجی کو وہاں بلایا ہے، اس کے آنے کے بعد اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا، پھر کاغذ اور پنسل لے کر سامی کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں اور مکرجی خاموشی سے تماشہ دیکھنے لگے۔ سامی اپنے دونوں پنجوں اور سر کے مختلف زاویوں سے کچھ کہتی جا رہی تھی۔ اور وہ کاغذ پر نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ نوٹس مکمل ہونے کے بعد جب مکرجی نے اسے پڑھا تو حیران رہ گیا۔ بھوانی شنکر کی توقع کے مطابق سامی گورنر ہاؤس میں ہونے والی گفتگو کے اہم نکات ذہن نشین کر کے آئی تھی مکرجی نے کہا۔

" اس بلی نے دھوکہ نہیں دیا، لیکن اس بات کا یقین ہونا چاہیئے کہ اس کی رپورٹ درست ہے"

" مجھے پورا یقین ہے" بھوانی شنکر نے کہا "ہم ٹریننگ کے دوران اسے بارہا آزما چکے ہیں۔ اس نے کبھی غلط رپورٹ نہیں دی، یہ جو باتیں سنتی ہے، اسے ذہن نشین کر کے سگنلنگ کے ذریعہ مجھے بتا دیتی ہے"

مکرجی کو پھر بھی یقین نہیں آیا، وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ اپنے خاص آدمیوں کے ذریعہ صحیح معلومات حاصل کرے گا۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنے ایک نہایت ہی شاطر اسسٹنٹ کو سیکرٹری کے دفتر میں بھیجنا چاہتا تھا، اس نے اسے سامی کی پیش کی ہوئی رپورٹ سنا دی تھی۔ دو دن کے بعد مکرجی گھبرایا ہوا آیا۔ اس نے بھوانی شنکر کو بتایا کہ پچھلی رات اس کا اسسٹنٹ اس معاہدے کا فائل حاصل کرنے سیکرٹری کے دفتر میں پہنچا تھا، لیکن ٹھیک اس فائیل کو پڑھتے وقت گرفتار ہو گیا پتہ نہیں اس ملک کے جاسوس کب سے اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے، اسے عین وقت پر حراست میں لے لیا گیا۔

ایک شخص کی گرفتاری کے بعد بھوانی شنکر کو یہ اندیشہ ہوا کہ یہاں کی پولیس اس شخص کے ذریعہ ہمارے ٹھکانے تک پہنچ سکتی ہے، اس نے فوراً ہی وہ شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم اسی دن دوپہر کی فلائٹ سے راولپنڈی کے لئے روانہ ہو گئے۔ روانگی سے قبل بھوانی شنکر نے ہمیں بتایا کہ پنڈی میں ہمارے مسلمان عزیز رہتے ہیں، ہمیں ان عزیزوں کے نام، ان کی عمر اور ان کی تصویریں بتا دی گئیں، اس وقت ہمیں پتہ چلا کہ سیکرٹ سروس والے کتنی لمبی چالیں چلتے چلتے ہیں۔ پنڈی کے وہ نام نہاد عزیز بھی ہمارے دیس کے ایجنٹ تھے اور برسوں سے وہاں مقیم تھے۔

وہاں ہمیں خوش آمدید کہنے والوں میں احمد شیخ نامی ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ وہ سیکرٹریٹ میں کوئی اے کلاس آفیسر ہے وہ تمہاری حکومت کا ملازم ہے، تمہاری طرح مسلمان بھی ہے مگر مسلمان ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ ہر ملک اور قوم میں غدار ہوتے ہیں۔ ہماری حکومت اسے غداری کے صلے میں ہر ماہ پچیس ہزار روپے دیتی ہے، پنڈی، لاہور اور کراچی میں اس کی شاندار کوٹھیاں ہیں۔ ہر شہر میں اس کی ذاتی کاریں ہیں اور لاکھوں روپے کا بینک بیلنس ہے، شاید تمہارے ملک میں اس بات کی تفتیش نہیں ہوتی کہ آٹھ نو سو روپے ماہوار پانے والوں کے پاس اتنی دولت کہاں سے آ جاتی ہے"؟

چھمیا کی زبان سے یہ سچی اور کڑوی باتیں سن کر میں غصہ سے کھول رہا تھا۔ یہ کتنے شرم کی بات تھی کہ ہمارے ہی ہم مذہب اور ہم وطن دولت کے لالچ میں اپنے وطن سے غداری کر رہے تھے اور اپنی حکومت کی جڑیں کھوکھلی کر رہے تھے۔ چھمیا بتا رہی تھی کہ احمد شیخ کے ہمراہ ایک حسین عورت بھی تھی لیکن

مجھے اس وقت کسی کی خوبصورتی سے دلچسپی نہیں تھی، میں تو جب سے یہ سن رہا تھا کہ پنڈی میں احمد شیخ کی کوٹھی کس علاقہ میں ہے اور اس کی کوٹھی کا نمبر کیا ہے، میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ موت سے پہلے مجھے اتنی مہلت دے دے کہ میں غداروں کو ان کے عبرتناک انجام تک پہنچا سکوں۔ اس کے بعد میری تقدیر میں موت لکھی ہوگی تو میں خوشی سے مر جاؤں گا۔

میں اپنی سوچ میں گم تھا۔ پھر چھمیا کی یہ بات سن کر چونک گیا کہ سامی کسی خفیہ فائیل کی نقل لے آئی تھی۔ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

" وہ کیسے لے آئی ؟"

اس نے جواب دیا" احمد شیخ کے اوپر ایک آفیسر ہے، جس کا مکرم علی نام ہے، وہ بہت ہی سخت مزاج ہے لیکن محب وطن ہے، وہ خفیہ فائل اس کی تحویل میں تھی۔ مکرم علی اس پر کسی کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیتا تھا۔ کبھی گھنٹے دو گھنٹے کے لئے کسی ضروری کام سے باہر جاتا تو جانے سے پہلے اپنے دفتر کے دروازے پر اپنے ہاتھوں سے تالا لگاتا تھا۔ اس معاملہ میں وہ احمد شیخ اور اپنے چپڑاسی پر بھی بھروسہ نہیں کرتا تھا۔

احمد شیخ نے بھوانی شنکر کو بتایا کہ وہ فائیل آج کل مکرم علی کی میز پر رہتا ہے۔ جب تک صدر مملکت اپنے دورے سے واپس نہیں آئیں گے اس وقت تک مکرم علی اس فائیل کو دفتر سے باہر نہیں لے جائے گا اور نہ ہی اپنے ماتحت افسروں کو دفتر میں داخل ہونے کی اجازت دے گا۔

بھوانی شنکر نے احمد شیخ کے سامنے اپنا پلان پیش کیا۔ پلان یہ تھا کہ مکرم علی اپنے کام میں مصروف رہتا ہے۔ اگر وہ کالی بلی دفتر میں چپکے سے داخل ہو کر کسی الماری کے پیچھے چھپ جائے تو بات بن سکتی ہے، مکرم علی لنچ کے لئے باہر جاتے وقت دروازے کو باہر سے بند کر دیتا ہے، بلی اندر ہی رہ جائے گی، کسی کو شبہ نہیں ہوگا کہ اندر کوئی موجود ہے، اس وقت وہ میز پر چڑھ کر وہ مطلوبہ فائیل کھولے گی اور جو ضروری معلومات ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں، انہیں پڑھ کر ذہن نشین کرے گی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ الماری کے پیچھے چھپ جائے گی۔ مکرم علی واپس آکر دروازہ کھولے گا اور اپنے کام میں مصروف ہو جائے گا۔ بلی جس طرح چپکے سے گئی تھی، اسی طرح چپکے سے باہر آجائے گی۔

احمد شیخ نے ایک کاغذ پر مکرم علی کے دفتر کا مکمل نقشہ بنا دیا کہ میز کہاں ہے، الماری کس کونے میں ہے، فائلوں کے ریک کس طرف کی دیوار سے لگی ہوئی ہیں، اس ریک میں سے یا میز پر پڑی ہوئی فائلوں میں سے اسے کون سی فائل کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

سامی نے تمام باتیں سننے اور نقشے کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے پنجوں کے اشارے سے بتایا کہ تمام باتیں سمجھ گئی ہے۔ دوسرے دن احمد شیخ اسے اپنی کار میں بٹھا کر اپنے دفتر لے گیا۔ شام کو جب واپس آیا تو سامی اپنا کام مکمل کر چکی تھی، وہ بلی کے روپ میں گئی تھی اور ایک ذہین طالبہ کی طرح اہم معلومات ذہن نشین کر کے آگئی تھی۔

احمد شیخ ایک بلی کے کارنامے پر حیران تھا۔ وہ بے چارہ کیا جانتا تھا کہ

اس کے اندر ایک چالاک لڑکی چھپی بیٹھی ہے، کیدار نے میرے کمرے میں مجھ سے کہا۔

" یہ اچھا موقعہ ہے، یہ لوگ اپنے کاموں میں مصروف ہیں مری کی طرف روانہ ہو جائیں گے اور کسی جنگل میں رکھشا کنڈل بنا کر منتروں سے بلا لیں گے۔"

اس کے خیال کے مطابق فرار کا موقع مناسب تھا، ہمارے سخت پہرہ نہیں۔ صرف بھوانی شنکر کے دونوں ماتحت ہم پر کڑی نظر رکھ کیدار اپنی آزادی کے لئے ان سے ٹکرا سکتا تھا لیکن میں نے اسے نقلی عزیزوں کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، وہ لوگ ہمیں کسی مصیبت میں سکتے ہیں، دانشمندی یہ ہے کہ بھوانی شنکر سے ٹکرائے بغیر اس کی لاعلمی میں ہونے کا موقعہ تلاش کیا جائے۔

میری بات اس کی سمجھ میں آگئی، ہم اپنے منصوبے کے مطابق موقعہ کا انتظار کرنے لگے، اس دوران سامی تمہارے ہاں کے سیکرٹ دفتر میں گئی تھی اور وہاں سے بھی کچھ معلومات حاصل کر کے آئی تھی۔ تمہارے ملک کی ایک جاسوسہ بھوانی شنکر کی نظروں میں آگئی، وہ حیثیت سے احمد شیخ کے ہاں کچھ دنوں سے آرہی تھی۔ بھوانی شنکر صفائی کرتے وقت وہ اس کے سامان کی تلاشی لے رہی تھی کہ وہ اپنے ساتھ وہاں پہنچ گیا، وہ تنہا تھی اور یہ تعداد میں تین تھے، اس کے باوجود کر مقابلہ کیا وہاں سے بچ کر نکلنے کی کوشش کرتی رہی لیکن ناکام رہی۔ اسے بے بس کر دیا۔ اس کے زندہ رہنے میں ہم سب کے لئے خطرہ تھا۔ بھوانی شنکر نے اس کا گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا۔ اس وقت سامی تھی۔ وہ اچانک ہی اچھل کر ایک اونچی الماری پر چلی گئی، ہماری نظروں سے ہوگئی۔ بھوانی شنکر اور اس کے آدمیوں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ عورت کی نبض تھامے اور سینے پر ہاتھ رکھے اس بات کا اطمینان کر رہے وہ واقعی مر چکی ہے۔

وہ واقعی مر چکی تھی، اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ وہ لاش کو فرش پر چھوڑ کر کھڑے ہو گئے، ان کے الگ ہوتے ہی وہ ہوگئی اور اچھل کر کھڑے ہوتے ہی بھوانی شنکر کو ایک کک لگا دی۔ پیچھے گیا۔ اس کے دونوں ساتھی ایک مردہ عورت کو زندہ ہوتے دیکھ اور اسی بوکھلاہٹ میں اس سے مار کھا گئے، پھر ان کے درمیان ہونے لگا۔

میں نے الماری کی جانب دیکھا، بلی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ وہیں کہیں مردہ پڑی ہوئی ہے اور وہ جو مردہ عورت تھی۔ کی روح سما گئی ہے، میں اس کمرے سے نکل کر کیدار کے ساتھ آگئی۔ وہاں سے ہمیں مار پیٹ اور بھاگ دوڑ کی آوازیں سنائی دے رہی دیر بعد وہ بھاگتی ہوئی میرے کمرے میں آئی اور دروازے کو اندر باہر بھوانی شنکر اور اس کے آدمی دروازے کو پیٹ رہے تھے

ہوئے مجھ سے کہا۔

" تو یہاں اپنے یار کے ساتھ کیا کر رہی ہے؟ چڑیل تو سمجھتی ہے کہ میں دشمنوں سے لڑتے وقت تجھے بھول گئی تھی، یاد رکھ میں سب کچھ بھول سکتی ہوں، مگر اپنے اس جسم کو کبھی نظر نہیں کر سکتی جس پر تو نے قبضہ جما رکھا ہے میں ابھی یہ ہنگامہ اس لئے کر رہی ہوں کہ تجھے یہاں سے فرار ہونے کا موقعہ مل جائے، اب میں جو کچھ کہہ رہی ہوں اسے غور سے سن لے۔ میں بھوانی شنکر اور اس کے آدمیوں کو یہاں الجھاتی رہوں گی، تو یہاں سے چپ چاپ نکل جانا۔ آدھ گھنٹے بعد یہاں سے ایک ٹرین پشاور جائے گی، تو اسٹیشن پہنچ کر میرا انتظار کر، میں پھر بلی کے روپ میں وہاں آکر تجھ سے ملوں گی۔"

یہ کہنے کے بعد وہ فرش پر لیٹ گئی، اس نے کیدار سے کہا کہ وہ اس کا گلا گھونٹنا شروع کر دے اور مجھ سے کہا کہ میں دروازہ کھول دوں۔ اس کی ہدایت کے مطابق ہم نے عمل کیا۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ بھوانی شنکر اور اس کے آدمی دندناتے ہوئے اندر آئے۔ اس وقت کیدار فرش پر گری ہوئی عورت کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ وہ پھر مردہ ہو گئی تھی۔ بھوانی شنکر اور اس کے آدمی پھر اسے ٹٹول کر دیکھنے لگے، ایک نے کہا۔

" معلوم ہوتا ہے، یہ عورت جس دم کی ماہر ہے، یہ پھر زندہ ہو جائے گی، بہتر ہے کہ اس کے جسم کے ٹکڑے کر دیئے جائیں، پھر ہم اسے ایک بورئیے میں بند کر کے کہیں پھینک آئیں گے۔"

وہ لاش کے ٹکڑے کرنے سے پہلے اس کے ہاتھ پاؤں رسی سے باندھنے لگے، وہ بار بار زندہ ہو جانے والی ان کے لئے مصیبت بنی ہوئی تھی، اس لئے وہ اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے میں اس قدر مصروف ہو گئے تھے کہ ہماری طرف دھیان نہ دے سکے، میں موقعہ پا کر کیدار کے ساتھ وہاں سے نکل گئی۔

سامی کی ہدایت کے مطابق ہمیں ریلوے اسٹیشن کی طرف جانا چاہیئے تھا لیکن اب ہم آزاد ہو گئے تھے، اب ہمیں سامی کی مدد کی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی ہم اس کے منصوبے کے مطابق پشاور کی طرف جانا چاہتے تھے، ہم اپنی مرضی سے کہیں بھی جاتے تو سامی کو اپنے منتروں سے وہاں بلا لیتے۔ یہ سوچ کر ہم لاری اڈے گئے اور وہاں سے بس میں بیٹھ کر تمہارے اس شہر میں آگئے۔

اب اس رکھشا کنڈل کے باہر جو دنیا ہے اس سے ہمارا ناتا ٹوٹ چکا ہے۔ اس دنیا سے بھوانی شنکر تو کیا، تمہارے ملک کی پولیس بھی ہمارا ہاتھ پکڑنے نہیں آئے گی، صرف سامی منتروں کے بل پر آئے گی، نہ آنا چاہے گی تب بھی میرے منتروں سے کھنچی چلی آئے گی، آج اس کی تمام چالاکیاں دھری کی دھری رہ جائیں گی، اس کی ضد، اس کی ذہانت یا دنیا کی کوئی طاقت اسے یہاں آنے سے نہیں روک سکے گی اور اس کے ساتھ ہی تمہاری موت بھی اٹل ہے۔"

یہ کہہ کر چھمیا قہقہے لگانے لگی۔

میں بے بسی سے دانت پیستے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں رات کی تاریکی پھیل گئی تھی، دوسرے کمرے سے آنے والی روشنی میں اس کا چہرہ واضح نہیں تھا۔ میں اس سے نفرت کرتے ہوئے بھی سامی کے جسم کو نفرت سے نہیں دیکھنا چاہتا تھا، مگر وہ قہقہے لگا کر میری بے بسی اور مجبوری کا مذاق اڑا رہی تھی پھر وہ میرے پاس سے اٹھ گئی اور ایک موم بتی روشن کرنے لگی۔

نہ جانے کتنا وقت گذر گیا تھا اور میری موت کے لئے کتنا وقت باقی رہ گیا تھا، لیکن میرے دل میں موت کا ذرا بھی خوف نہیں تھا۔ مجھے اس بات کا شدید صدمہ پہنچ رہا تھا کہ دشمن میرے ملک کے اہم راز چرا کر لے جا رہے تھے اور میں انہیں روک نہیں سکتا تھا، ایک اپاہج کی طرح رسیوں سے بندھا پڑا تھا اس وقت میرے اندر جوش اور جذبات کی کیسی آندھی چل رہی تھی۔ میں بیان نہیں کر سکتا۔

بہت دیر بعد میرے دل میں خیال آیا کہ جوش اور جنون سے کچھ نہیں بنے گا، شیر دھاڑ سکتا ہے ٹکریں مار سکتا ہے، لیکن آہنی سلاخوں کو توڑ کر پنجرے سے نہیں نکل سکتا۔ شیر کی مثال میں نے غلط سوچی، کیونکہ وہ محض جسمانی قوت سے کام لیتا ہے اور خداوند کریم نے مجھے جسمانی قوت کے علاوہ دماغی قوت بھی دی ہے اور اس وقت میں دماغ سے کام لے سکتا تھا۔

اب میں نے اپنی ہر مجبوری کے پیش نظر اس کا حل سوچنا شروع کیا۔

پہلی مجبوری یہ تھی کہ میں اپنے بازوؤں سے لیکر ٹخنوں تک مضبوط رسیوں سے بندھا ہوا تھا اور ہزار کوششوں کے باوجود ان رسیوں کو نہیں توڑ سکتا تھا۔

دوسری مجبوری یہ تھی کہ چھمیا نے نظر بندی اور سماعت بندی کا عمل کیا تھا۔ میں کو مدد کے لئے پکارتا تو میری آواز اس کچے مکان کی چار دیواری کے پار نہیں جاتی اور نہ ہی جنگل سے گذرنے والے کسی بھولے بھٹکے مسافر کو یہ مکان نظر آتا۔ چھمیا نے ایسی زبردست منصوبہ بندی کی تھی کہ کوئی اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا۔

ہاں۔ رکاوٹ کی بات آئی تو مجھے چھمیا کے گرو مہاراج کی باتیں یاد آگئیں۔ انہوں نے سامی کے متعلق کہا تھا۔

" جب تک بلی کنڈل کے اندر نہیں آئے گی۔ اس وقت تک نوجوان کی گردن نہیں کاٹی جائے گی، سارا کام اس بلی سے بن سکتا ہے اور اسی بلی سے بگڑ سکتا ہے۔"

اس خیال سے مجھے تقویت حاصل ہو رہی تھی کہ سامی ہی چھمیا کی تمام محنتوں پر پانی پھیر سکتی ہے۔

میری زندگی اور موت کا انحصار سامی کے آنے یا نہ آنے پر تھا۔ اگر وہ سیندور سے بنے ہوئے کنڈل کے اندر آئے گی تو کیدار میری گردن اڑا دے گا۔ اگر وہ کنڈل کے باہر ہی رہے گی تو کیدار اور چھمیا میری بھینٹ نہیں دے سکیں گے، لیکن چھمیا کا دعویٰ تھا کہ سامی ضرور کنڈل کے اندر آئے گی، کیونکہ وہ منتروں کا توڑ نہیں جانتی تھی اور اس کی ذہانت اور چالاکیاں اس طلسم کدے میں کام نہیں آسکتی تھیں۔

نہ جانے میں کتنی دیر تک سوچتا رہا، پھر میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ چھمیا ایک انگیٹھی لے کر آئی، جس میں انگارے دہک رہے تھے، اس نے وہ

انگیٹھی میرے پاس رکھ دی، اس کے بعد وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں مٹی کے دو کوزے تھے، ایک کوزے میں لوبان تھا، دوسرے میں ماش کے دانے۔ اس کے پیچھے کیدار تھا۔ اس وقت اس کے جسم پر صرف ایک لنگوٹ تھی۔ اس کا سیاہی مائل کسرتی بدن پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ وہ ایک کتے کو کھینچتا ہوا لا رہا تھا۔

پھر وہ میرے قریب دو زانو ہو کر بیٹھ گیا، اس نے اپنے سامنے وہ کوزہ رکھ لیا جس میں ماش کے دانے تھے، چھمیا کے سامنے لوبان رکھا ہوا تھا اور ان دونوں کے درمیان وہ کتا کھڑا ہوا تھا۔ چھمیا نے اس کے گلے میں بندھی ہوئی رسّی کو پکڑ لیا۔ کیدار نے کوزے سے ماش کا ایک دانہ اٹھایا اور اسے میرے پاؤں کی ایڑی سے سر کی چوٹی تک پھیرتے ہوئے منتر پڑھنے لگا۔ اس دانے کا ایک پھیرا کرنے کے بعد اس نے اسے انگیٹھی میں ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی چھمیا نے تھوڑا سا لوبان انگاروں پر چھڑک دیا، یکبارگی بھک سے لوبان کا دھواں ابھرا اور وہ کتے کے سر کو پکڑ کر انگیٹھی کے قریب اس طرح لے آئی کہ وہ کتا اس دھوئیں میں سانس لینے پر مجبور ہو گیا۔

پھر یہ عمل جاری رہا۔ کیدار ماش کا ایک ایک دانہ اٹھا کر منتر پڑھتا ہوا اور اسے میرے جسم پر سے گذارتا ہوا انگیٹھی میں پھینک دیتا تھا اور چھمیا کتے کو انگیٹھی کے سامنے لا کر اسے لوبان کے دھوئیں میں سانس لینے پر مجبور کر دیتی تھی۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد مجھے اپنے اندر ایک نئی توانائی کا احساس ہوا۔ زخموں کی جلن اور ٹیسیں ختم ہو گئیں، اس کے ساتھ ہی میں نے کتے کی کراہیں سنیں۔ میں نے سر گھما کر اسے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس کے سر پر اور جسم کے دوسرے حصوں پر زخم نظر آ رہے تھے، جب وہ اس کمرے میں آیا تھا تو زخم خوردہ نہیں تھا۔

تب مجھے یاد آیا، چھمیا نے کہا تھا کہ کیدار ایک انسان کے جسم کے زخموں اور بیماریوں کو کسی جانور کے جسم میں منتقل کرنے کا منتر جانتا ہے، میری بھینٹ دینے سے پہلے وہ میرے تمام زخموں کو ایک کتے کے جسم میں منتقل کر دے گا۔

اور اس نے وہی کر دکھایا۔ میں رسیوں سے بندھا ہوا تھا۔ اپنے جسم کو چھو کر نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ میں سر سے پاؤں تک زخموں سے پاک ہو چکا ہوں اور اب میرے جسم کے کسی بھی حصے میں نہ زخم ہے، نہ جلن ہے اور نہ درد ہے۔

پھر چھمیا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کیدار سے کہا۔

" میں اس کتے کو باہر ہانک کر آتی ہوں، تم اس نوجوان کو لے چلو۔"

وہ کتے کی رسّی پکڑ کر اسے کھینچتی ہوئی باہر لے گئی، وہ تو ایک کتا تھا اسے دُم سے پکڑ کر کھینچا جا سکتا تھا لیکن مجھ جیسے انسان کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ کیدار نے انگیٹھی اور مٹی کے کوزے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیئے۔ اس کے بعد میرے سر کے بالوں کو اپنی مٹھیوں میں جکڑ کر مجھے گھسیٹ کر ایک طرف لے جانے لگا۔

اُف ــــ میں تکلیف کی شدت سے تڑپنے لگا۔ اپنی پوری قوت سے رسیوں کو توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ کیدار کو یقین تھا کہ وہ رسیاں نہیں ٹوٹ سکیں گی۔ وہ بڑی بے حسی اور بے رحمی سے ایک قصائی کی طرح مجھے کھینچتا ہوا قربان گاہ کی طرف لے جا رہا تھا۔

دوسرے کمرے میں پہنچ کر وہ مجھے سیندوری دائرے کے اندر لے گیا۔ دائرے کے بیچ لکڑی کا ایک چھوٹا سا کندا رکھا ہوا تھا، اس پر وہ بڑا داؤ رکھا ہوا تھا جس سے میری گردن اڑائی جانے والی تھی۔ سیندوری کنڈل کے باہر دو انگیٹھیاں دہکتے ہوئے انگاروں سے بھری تھیں، ان میں سے لوبان کا دھواں نکل رہا تھا۔ کمرے کی محدود فضا دھوئیں سے اس طرح بھر گئی تھی کہ ہر چیز دھندلی نظر آ رہی تھی۔

کیدار نے داؤ اٹھا کر ایک طرف زمین پر رکھ دیا۔ پھر وہ دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر مجھے اوندھا کرنے لگا۔ میں تڑپ رہا تھا، مچل رہا تھا اور ایک ناکام سی جدوجہد کر رہا تھا۔ وہ جدوجہد اس لئے ناکام تھی کہ درمیان ازلی مقابلہ نہیں تھا۔ میں بندھا ہوا تھا اور وہ آزاد تھا۔ آخر کار میں خود ہی زمین پر اوندھا ہو گیا، اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ وہ مجھے گھسیٹ کر لکڑی کے کندے تک لایا اور اس پر میری گردن رکھ دی۔

لکڑی کے کنارے پر میری ٹھوڑی اَڑ گئی تو چہرہ ذرا اوپر اٹھ گیا۔ میری نگاہوں کے سامنے وہ دروازہ نظر آیا جہاں سے سامی داخل ہونے والی تھی۔ دروازے کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے، کمرے میں جلنے والی روشنی کی روشنی باہر کچھ برآمدے تک پہنچ رہی تھی۔ برآمدے کے اس پار رات کی گہری سیاہی تھی کہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

باہر کی اس تاریکی کو دیکھ کر مجھے اپنے اندر ایک روشنی کا احساس ہوا۔ میرے دماغ نے کہا کہ اگر سامی اسی دروازے سے آئے گی تو میں خود کو موت کے منہ سے بچانے کی تدبیر کر سکتا ہوں، صرف اپنے آپ کو نہیں، سامی کو بھی ان کے منتروں سے نجات دلا سکتا ہوں۔

چھمیا سیندور کنڈل میں آ کر میرے بائیں طرف ذرا دور بیٹھی مار کر بیٹھ گئی تھی اور منتروں کا جاپ کر رہی تھی، سامی کو اپنی طرف کھینچ لانے والے منتر پڑھ رہی تھی۔

اس کے گرو مہاراج نے کہا تھا کہ بلی سیدھی کنڈل کے اندر چلی آئے گی، اس کے اور کنڈل کے درمیان کوئی رکاوٹ نہ ہو، ورنہ وہ سیندوری کنڈل کے اندر نہیں آئے گی۔ میرے دائیں طرف کیدار دونوں ہاتھوں سے داؤ پکڑے کھڑا تھا۔ اس کا داؤ بھی اس وقت چلتا جب سامی دائرے کے اندر قدم رکھتی۔

" سامی آ جا" چھمیا کے منتر اسے بلا رہے تھے۔

سامی آ جا: داؤ کی تیز دھار میرے لہو کی پیاسی تھی۔

اور میں دعا مانگ رہا تھا کہ سامی نہ آئے، اگرچہ اس کی داستان سن کر اسے دیکھنے کو جی چاہتا تھا، خواہ وہ بلی کے روپ میں آئے، میرے سامنے

کی آتما اور اس کی ذہانت ہی آتی، مگر میں نے اسے دیکھنے کی خواہش کو کچل دیا۔

" سامی نہ آنا: میری سلامتی اور اس کی روح کی آزادی اسی میں تھی کہ وہ نہ آئے"

بہت دیر ہو گئی وہ نہیں آئی۔

چھمیا چیخ چیخ کر، ہاتھ اٹھا اٹھا کر منتر پڑھ رہی تھی۔ وہ سامی کا جسم تھا اور اس کے اندر سے چھمیا کالی بلی کو پکار رہی تھی۔

میں نے کن انکھیوں سے کیدار کی جانب دیکھا۔ وہ ہاتھوں میں داؤ پکڑے بے چینی سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا، میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ خون رگ و پے میں لاوے کی طرح دوڑ رہا تھا۔ زندگی کی تمنا نہیں تھی، موت کا خوف نہیں تھا۔ میری نگاہیں کھلے دروازے پر ہی جمی ہوئی تھیں، اور میں کوہِ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑنے کے لئے بالکل تیار تھا۔

" میاؤں ۔۔۔"

کہیں سے سامی کی آواز آئی، کیدار نے داؤ کو سر سے بلند کر لیا۔

میری زندگی اور موت کے درمیان ایک ذرا سا فاصلہ رہ گیا۔

" میاؤں، میاؤں" جیسے کہہ رہی ہو، نہیں آؤں گی، نہیں آؤں گی۔

" آئے گی، آئے گی" چھمیا کے منتروں کی آواز اور بلند ہو گئی۔

کھلے ہوئے دروازے کے باہر برآمدے میں دھپ کی آواز آئی۔

اور سامی آ گئی۔

میاؤں میاؤں

برآمدے کی نیم تاریکی میں سامی کا سایہ خاکہ ابھرا اور میرا دل پیش آنے والے واقعات سے دھڑکنے لگا۔

اسے دیکھتے ہی چھمیا جوشیلے انداز میں چیخ چیخ کر منتر پڑھنے لگی۔ میں نیم وا آنکھوں سے برآمدے کی طرف دیکھ رہا تھا، جہاں سامی بلی کے روپ میں فرش پر لوٹ رہی تھی۔ وہ وہاں سے کمرے کے اندر نہیں آنا چاہتی تھی، منتر اسے جبراً کھینچ رہے تھے اور وہ ادھر سے اُدھر تڑپ رہی تھی۔ منتر کی گرفت سے نکلنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

اس کی کوشش ناکام ہی سہی لیکن اس جدوجہد سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ کتنی ضدی ہے۔ اتنی ضدی کہ ناکامی کا یقین ہونے کے باوجود ہمت نہیں ہارتی۔ پیش آنے والے طوفانوں سے لڑتی ہی چلی جاتی ہے۔

اب میرے لڑنے کی باری تھی۔ اب میری صلاحیتوں کو آزمانے کا وقت آیا تھا۔ وہ بے چاری اپنے طور پر کنڈل کے اندر نہ آنے کی کوششیں کر چکی تھی۔ اس وقت منتر کے بل پر فرش سے اٹھ کر اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے پاؤں دروازے کی طرف کھنچے آ رہے تھے۔

دروازے پر پہنچ کر اس نے سر اٹھا کر کنڈل کی جانب دیکھا تو مجھ سے نظریں ٹکرا گئیں۔ اسی وقت میری آنکھوں سے جیسے شعلہ لپکا۔ ایک بجلی سی لہراتی ہوئی سامی کی نگاہوں سے ٹکرائی۔ پھر وہ میری نگاہوں کی گرفت میں آ گئی، اور آگے بڑھتے بڑھتے ٹھٹھک کر رُک گئی۔

اس کے اگلے دو پاؤں دہلیز کے اندر تھے اور پچھلے دو پاؤں باہر تھے میں اس کی سوچ کو پڑھنے لگا۔ وہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتی ہوئی سوچ رہی تھی۔

" یہ کون ہے؟ اس کی آنکھیں کیسی غضب ناک ہیں؟ کاش کہ یہ مجھے اسی طرح دیکھتا رہے۔ او گاڈ! مجھے کتنا سکون مل رہا ہے۔ میں کسی جدوجہد کے بغیر ایک جگہ رُک گئی ہوں"

میں نے فوراً ہی اس کی سوچ کو اپنی گرفت میں لے کر اپنی سوچ کے ذریعے کہا۔

" میں تمہیں اسی طرح دیکھتا رہوں گا۔ تم بھی میری نگاہوں کی گرفت میں رہو گی۔ اپنے خیالات کو صرف میری ان دو سلگتی ہوئی آنکھوں تک محدود کر دو۔ میرے زیر اثر آ جاؤ۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس دنیا کی کوئی آواز نہ سنو۔

اور تمہارے کان کسی منتر کو نہیں سن رہے ہیں۔ تمہاری قوت سماعت مفلوج ہوتی جا رہی ہے۔ یوں کہ تم دور و نزدیک کی آوازوں سے محروم ہوتی جا رہی ہو......"

اس کی سوچ کی لہریں مجھ تک پہنچنے لگیں " ہاں میری قوت سماعت کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ میں تمہارے حکم پر عمل کر رہی ہوں۔ اس کے باوجود چھمیا کی دھیمی دھیمی آواز مجھ تک پہنچ رہی ہے"

وہ درست کہہ رہی تھی۔ چھمیا کے منتر کمزور نہیں تھے۔ ایک بلی کو جھنجھوڑتے ہوئے اس کی روح تک پہنچ رہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں میرے تنویمی عمل سے ٹکراتے ہوئے بلی کو کنڈل کی جانب کھینچ رہے تھے۔

وہ بے اختیار کھنچتی ہوئی کمرے کے اندر آ گئی۔ کنڈل کے اندر داخل ہونے کے لیے صرف ایک یا دو بالشت کا فاصلہ رہ گیا۔ چھمیا دونوں ہاتھ اٹھا کر فاتحانہ انداز میں منتر پڑھ رہی تھی۔ اس کی جیت ہونے والی تھی۔

اس کے منتر نے اسے کچھ اور قریب کھینچ لیا۔ کنڈل کے اندر آنے کے لیے سیندور کی ریکھا سے صرف دو انچ کا فاصلہ رہ گیا۔ کیدار نے داؤ کے دستے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اپنے سر سے بلند کر رکھا تھا۔ صرف چند لمحوں کی دیر تھی جیسے ہی سامی سیندوری ریکھا کے اندر پاؤں رکھتی، وہ ایک ہی وار میں میری گردن تن سے جُدا کر دیتا۔

میں نے بیک وقت خیال خوانی اور تنویمی عمل سے کام لیا۔ تنویمی عمل کے ذریعہ سامی کو روکنے کی بھرپور کوششیں کرنے لگا اور خیال خوانی کے ذریعہ چھمیا کی سوچ میں گڑبڑ شروع کر دی۔ جو منتر وہ پڑھ رہی تھی وہ اس کے دماغ سے نکل رہا تھا۔ میں اسی کے دماغ تک پہنچ کر اس کی منفی سوچ پیدا کر رہا تھا۔

" میں غلط پڑھ رہی ہوں۔ ہاں منتر کا وہ شبد کیا تھا؟ شاید وہ شبد بدل گیا ہے۔ میں ذرا سوچ لوں کہ وہ شبد کون سا ہے؟"

وہ پڑھتے پڑھتے اچانک رُک گئی۔ اس کی سوچ بن کر میں نے کہا تھا کہ وہ غلط پڑھ رہی ہے۔ اس لیے وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ کون سا لفظ ادا کر رہی ہے۔ اس کے اس طرح سوچتے ہی منتر کا تسلسل ٹوٹ گیا یعنی ایک

ذرا سی دیر کے لیے اس کا طلسم ٹوٹ گیا۔

وہ چند لمحات غنیمت تھے۔ میں نے فوراً ہی اپنی سوچ کی لہریں سامی تک پہنچائیں۔ "سامی بھاگو۔ واپس جاؤ۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ منتر پڑھے تم یہاں سے دور چلی جاؤ۔"

وہ یکبارگی پلٹ گئی اور چھلانگ لگا کر گھر سے باہر نکل گئی۔ چھمیا پھر اپنا منتر شروع کرنے والی تھی۔ اسے بھاگتے دیکھ کر اس نے چیختے ہوئے کہا۔

"کیدارا اسے پکڑلے۔ اگر وہ نکل گئی تو اسے کنڈل تک لانے کے لیے پھر نہ جانے کتنی دیر تک منتر پڑھنا ہوگا۔ پڑھتے پڑھتے میرا گلا سوکھنے لگا ہے۔"

کیدارا داؤ کو زمین پر رکھ کر سامی کے پیچھے بھاگتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی چھمیا منتر پڑھنے لگی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں خاموش پڑا ہوا سامی کو اس کے منتر سے بچا رہا ہوں۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے گردن گھما کر اس کی جانب دیکھا تو وہ بھی پڑھنے کے دوران مجھے سر گھما کر دیکھ رہی تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں کوئی عمل جانتا ہوں، کیونکہ وہ ایک بار طلسمی آگ میں مجھے جلا کر آزما چکی تھی۔ میں نے اپنا بچاؤ نہیں کیا تھا اس نے خود ہی آگ بجھا دی تھی اور یہ یقین کر لیا تھا کہ میں کالا جادو یا سفید جادو نہیں جانتا ہوں۔ اس لیے وہ میری طرف سے مطمئن ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور دروازے کی طرف منہ کر کے زور زور سے منتر پڑھنے لگی۔

میں نے دوسری طرف سر گھما کر دیکھا۔ قریب ہی وہ داؤ زمین پر پڑا ہوا تھا، جس سے میری گردن کاٹی جانے والی تھی۔ میرا سر لکڑی کے کندے پر رکھا ہوا تھا۔ میں وہاں سے کروٹ بدل کر زمین پر چت ہو گیا۔ پھر ایک اور کروٹ بدل کر داؤ پر آ گیا اور اس کی تیز دھار پر اپنے بازو کی ایک رسی رکھ کر رگڑنے لگا۔

ذرا سی دیر میں رسی کٹ گئی۔ پھر میں دوسری طرف کی رسی کاٹنے لگا۔ چھمیا کی پشت میری جانب تھی۔ وہ دروازے کی طرف منہ کیے اپنے منتر سے سامی کو بلا رہی تھی۔ وہ میری حرکتوں سے بے خبر تھی۔ اسے بڑی مدت کے بعد یہ موقع ملا تھا کہ وہ بلی کو میرے لہو میں ڈبو کر سامی کو ہمیشہ کے لیے اس کے جسم میں قید کر دے۔ اس لیے اس کی تمام توجہ اپنے منتر پر تھی اور وہ دروازے کے باہر تاریکی میں گھورتی ہوئی سامی کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔

میں رسیوں کی بندشوں سے آزاد ہو گیا۔ جسم کھل گیا تو یوں محسوس ہوا جیسے صدیوں سے زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اب آزادی ملی تو دل کھول کر قہقہہ لگانا چاہتا تھا۔ اب کسی کی مجال تھی کہ مجھے موت کی طرف لے جاتا۔ قدرتی طور پر یہ ثابت ہو گیا تھا کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ میں اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر میں نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر ایک بازو میں اس کی گردن دبالی یک بیک اس کے دیدے حیرانی سے پھیل گئے۔

"آنک۔۔۔!" اس کے منتر کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ وہ سر گھما کر اپنے دشمن کو دیکھنا چاہتی تھی لیکن میری مضبوط گرفت میں، وہ میری مرضی کے بغیر ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ میں جیب سے رومال نکال کر اس کے منہ میں ٹھونسنے لگا۔ اس کے بعد میں نے ایک جھٹکے سے اسے اپنی طرف گھما کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ وہ حیرانی اور پریشانی سے کبھی مجھے اور کبھی زمین پر پڑی ہوئی رسیوں کو دیکھ رہی تھی۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ میں نے داؤ سے رسیاں کاٹی ہیں۔ میں نے رسیاں اٹھا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھتے ہوئے کہا۔

"اب میں دیکھوں گا کہ تم کیسے منتر پڑھتی ہو؟ ایک بار سامی نے بھوانی شنکر سے کہہ کر تمہارا منہ بند کرایا تھا۔ اگر تمہارے پاس سامی کا یہ خوبصورت بدن نہ ہوتا تو میں تمہارا منہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیتا۔ فی الحال تم ایک کونے میں بیٹھی رہو۔ پہلے میں تمہارے یار سے نمٹنا چاہتا ہوں۔"

اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ وہ کمرے کے ایک کونے تک نہیں جا سکتی تھی۔ اس لیے میں نے اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ وہ سامی کا پُرشباب بدن تھا۔ میرے بازوؤں میں پھول کی طرح تھا اور خوشبو کی طرح لپٹ گیا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ وہ اسی طرح مجھ سے لپٹی رہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ جسے میں سینے سے لگائے رکھنا چاہتا ہوں اس کا صرف اوپری ڈھانچہ میرے بازوؤں میں ہے۔ اس کی اصل روح بلی کے جسم میں پناہ گزیں ہے۔

میں نے بے دلی سے اسے ایک کونے میں بٹھا دیا۔ اس کی اوڑھنی لے کر اس کے منہ پر باندھ دی۔ پھر اس کی طرف سے مطمئن ہو کر سامی کی سوچ سے رابطہ قائم کرنے لگا۔

میں نے اس کی سوچ کو پڑھتے ہوئے خیال کی اسکرین پر اسے دیکھا۔ وہ ایک درخت پر چڑھی ہوئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ جب کیدارا اسے پتھر پھینک کر مارے گا تو وہ اچھل کر دوسری شاخ پر چلی جائے گی۔ میں نے اس کی سوچ پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

"سامی! اس شخص کو یاد کرو، جس نے ہپناٹزم اور ٹیلی پیتھی کے ذریعے تمہیں کنڈل کے اندر آنے سے روک دیا تھا۔"

"ہاں" وہ سوچنے لگی۔ "جب میری مستقل مزاجی کے آگے چھمیا کی تمام کوششیں ناکام ہو گئی تھیں اور چھمیا مجھے ہمیشہ کے لیے بلی بنا دینا چاہتی تھی۔ ایسی ناامیدی اور مایوسی کے وقت اس آدمی نے میری مدد کی۔ ایسا آدمی نہیں دیوتا ہے۔ اس نے میری سوچ کو بھی کنٹرول کر لیا تھا۔"

"سامی! تم ٹھیک سمجھ رہی ہو۔ وہ آدمی تمہاری سوچ کو کنٹرول کر لیتا ہے۔ اس وقت بھی وہ تمہاری سوچ میں بول رہا ہے۔ وہ تمہاری زندگی کے تمام حالات سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ چھمیا نے تمہارے جسم پر قبضہ کر رکھا ہے اور تم اس سے اپنا جسم چھین لینے کے لیے ایک طویل جد و جہد میں مصروف ہو۔

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اپنے خوبصورت جسم کو اپنے خیالی محبوب کی امانت سمجھتی ہو۔ تم نے قدم قدم پر اس امانت کی حفاظت کی ہے۔ چھمیا کو کبھی اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ تمہارے جسم کو کسی غیر مرد کے سامنے ستا کرے۔ آفرین ہے تم پر۔ اور خوش نصیب ہے وہ شخص جو تمہارے خیالوں میں بستا ہے اور ایک دن تمہارے جسم و جان کا مالک بننے والا ہے۔"

یہ کہتے وقت اچانک اس کی سوچ میں ہلچل سی ہوئی۔ اس کی اضطراری سوچ سے پتہ چلا کہ کیدارا پتھر پھینک کر اسے مار رہا ہے اور وہ اچھل کر دوسری شاخ پر آ گئی ہے۔ پھر وہاں سے وہ ایک اور شاخ پر آئی ہے اور گھنے پتوں کے درمیان چھپ گئی ہے۔ وہاں چھپ کر وہ سوچنے لگی۔

"پتہ نہیں کب ان دشمنوں سے پیچھا چھوٹے گا۔ نہ یہ میرا پیچھا چھوڑتے ہیں اور نہ ہی میں انہیں اس وقت تک چھوڑ سکتی ہوں جب تک کہ اپنا جسم حاصل نہ کر لوں۔ ویسے اس آدمی کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ اگر وہ میری مدد کرے تو میں جلد ہی اپنا جسم حاصل کر لوں گی۔ لیکن پہلے میرا فرض ہے کہ میں اس کی مدد کروں۔ وہ رسیوں سے بندھا پڑا ہے اور یہ کیدارا اس کی گردن اڑانا چاہتا تھا۔"

میری سوچ کی لہروں نے اس سے کہا۔ "تم اس آدمی کی فکر نہ کرو، وہ خود کو تمام بندشوں سے آزاد کرا چکا ہے۔ اب اس نے چھمیا کو رسیوں سے باندھ کر ایک کونے میں بٹھا دیا ہے۔ سیندوری کنڈل میں تمہارے لیے جو خطرہ تھا وہ دور ہو چکا ہے۔ چھمیا کا منہ بند ہے۔ وہ منتر نہیں پڑھ سکے گی۔ لہٰذا تم اس کٹیا میں واپس آ جاؤ۔"

"میں کیسے واپس آ جاؤں؟ کیسے یقین کروں کہ خطرہ ٹل گیا ہے؟ پہلے مجھے اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ وہ شخص واقعی میری سوچ کے ذریعے مجھے واپس آنے کا حکم دے رہا ہے۔ ابھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ سب کچھ میں خود ہی سوچ رہی ہوں۔"

وہ درست کہہ رہی تھی۔ اگر سوچ کی کوئی آواز ہوتی تو وہ میری آواز سے یقین کر لیتی کہ میں اسے واپس بلا رہا ہوں۔ پھر یہ کہ جب سے ہمارا سامنا ہوا تھا۔ اس وقت سے سامی نے میری آواز نہیں سنی تھی۔ ہمارے درمیان صرف سوچ کے ذریعے رابطہ قائم تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ ابھی تمہیں یقین آ جائے گا۔ تم آپ ہی آپ یہاں چلی آؤ گی۔ اس وقت تم اس شخص کی آنکھوں کا تصور کرو۔ سوچو کہ ان آنکھوں میں کیسی بجلیاں بھری تھیں اور وہ تمہیں کنڈل کے اندر آنے سے روک رہی تھیں۔"

دوسرے ہی لمحے اس کی سوچ نے کہا۔ "ہاں۔ میں ان آنکھوں کو دیکھ رہی ہوں۔ اوگاڈ! یہ کیسی سلگتی ہوئی آنکھیں ہیں۔ مقناطیس کی طرح مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ یہ کیا بھید ہے کہ پہلے یہ آنکھیں مجھے آگے بڑھنے سے روک رہی تھیں۔ اب اپنی طرف بلا رہی ہیں۔"

"ہاں۔ تم ان آنکھوں کے متعلق سوچ رہی ہو۔ یہ آنکھیں تمہارے حواس پر چھا رہی ہیں۔ تمہارے سامنے ان آنکھوں کے سوا اور کوئی نظارہ نہیں ہے۔ اب یہ آنکھیں تمہیں حکم دیتی ہیں کہ درخت سے نیچے اتر آؤ۔ اور خود کو کیدارا سے چھڑا کر دو۔ بتاؤ کیا تم میرے حکم کی تعمیل کر رہی ہو؟"

"میں سوچ رہی ہوں کہ واقعی مجھے ہپناٹائز کیا جا رہا ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں کسی حد تک ان آنکھوں کے زیر اثر آ رہی ہوں لیکن وہ شخص اگر میرے حالات زندگی سے واقف ہے تو یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوگا کہ میں کتنی ضدی اور مستقل مزاج ہوں۔ میں اپنی مرضی کے خلاف کسی کے زیر اثر نہیں آ سکتی۔ میں اب تک چھمیا کے منتروں سے لڑتی رہی۔ اب اس شخص کے تنویمی عمل سے لڑتی رہوں گی۔ اگر وہ میرا ہمدرد ہے اور دوست بن کر رہنا چاہتا ہے تو یہاں آئے اور کیدارا سے میرا پیچھا چھڑائے۔ میں اس سے التجا کرتی ہوں کہ وہ میرے اس رویے کا برا نہ منائے۔ میں محتاط رہنے کی عادی ہوں۔"

واقعی میں یہ بھول گیا تھا کہ وہ کتنی ضدی اور مستقل مزاج ہے اس کی مرضی کے بغیر کوئی اسے ہپناٹائز نہیں کر سکے گا۔ لیکن میں ٹیلی پیتھی کے ذریعے اگر اس کی سوچ کو گڑبڑا دیتا تو اس کی مستقل مزاجی قائم نہ رہتی کیونکہ انسان کی خود اعتمادی اور ضد اس کی اٹل سوچ سے قائم رہتی ہے اور مجھے کسی کی بھی سوچ میں بیٹھ کر تہلکہ مچانا آتا تھا۔ سامی کی سوچ بھی ڈگمگا جاتی تو وہ بڑی آسانی سے معمول بن کر میرے پاس چلی آتی لیکن میں نے سوچا کہ مجھے اس کی خود اعتمادی اور مستقل مزاجی کی قدر کرنی چاہیے۔ اگر کبھی اس نے مجھے پریشان کرنے کے لیے بے جا ضد کی تو میں اس کی ساری خوش فہمی ختم کر دوں گا۔ میں جب چاہوں گا وہ کچے دھاگے سے بندھی چلی آئے گی۔

میں نے اس کی تعریف کی۔ "واقعی تم دلیر بھی ہو اور ضدی بھی۔ تم اب تک اپنی ذہانت اور مستقل مزاجی سے چھمیا سے سبقت حاصل کرتی رہی ہو۔ وہ شخص تمہاری قدر کرتا ہے اور اب تمہارے پاس آ رہا ہے۔ بتاؤ تم اس وقت کہاں ہو؟"

"میں کٹیا سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ اس کے قریب ہی ایک آم کے درخت پر بیٹھی ہوئی ہوں۔ نیچے کیدارا کھڑا ہوا ہے لیکن اتنے قریب ہونے کے باوجود وہ کٹیا نظر نہیں آ رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چھمیا نے نظر بندی کا عمل کر رکھا ہے۔"

"وہ شخص سب کچھ جانتا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ وہ آ رہا ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے سامی سے رابطہ ختم کر دیا۔ چھمیا ایک کونے میں بیٹھی چپ چاپ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھ رہی تھی اور یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں اتنی دیر سے خاموش کیوں کھڑا ہوا ہوں۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کسی عمل میں مصروف تھا۔

میں نے اسے دیکھتے ہوئے سوچا کہ اس چڑیل نے نظر بندی کا عمل کر رکھا ہے اگر میں اس کٹیا سے باہر جاؤں گا تو پھر باہر سے یہ کٹیا نظر نہیں آئے گی۔ میں راستہ تلاش کرتا رہ جاؤں گا اور وہ چڑیل وہاں آرام سے بندھی پڑی رہے گی۔ پھر ہو سکتا ہے کہ کسی تدبیر سے آزاد ہو کر وہاں سے فرار ہو جائے یہ سوچ کر میں چھمیا کے پاس آیا اور اسے اٹھا کر کاندھے پر رکھ لیا اس کے بعد میں نے زمین پر پڑے ہوئے داؤ کو ایک ہاتھ میں تھام لیا۔ وہ میرے کاندھے پر مچلنے لگی۔ یہ سمجھ رہی تھی کہ جس داؤ سے وہ میری گردن اڑانا چاہتی

تھی، اسی داؤ سے میں اس کا قیمہ بنانا چاہتا ہوں۔ میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

"چپ چاپ پڑی رہو۔ تمھارے پاس سامی کا جسم ہے اور میں اس جسم کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ ابھی تم چلو۔ سامی تمھارا فیصلہ کرے گی۔"

وہ ٹھنڈی پڑگئی۔ میں اسے اٹھائے ہوئے کٹیا سے باہر آگیا۔ باہر چاند نکل آیا تھا۔ چاندنی میں درختوں کے سائے پھیلے ہوئے تھے اس لیے دور تک کا منظر نہیں آتا تھا۔ میں نے ذرا دور جاکر چھمیا کو کاندھے سے اتار کر گھاس پر ڈال دیا۔ وہاں سے پلٹ کر میں نے کٹیا کی طرف دیکھا تو وہاں صرف اونچی جھاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ مجھے کٹیا نظر نہیں آئی لیکن چھمیا کو نظر آسکتی تھی اور وہ میری عدم موجودگی میں لڑھکتی ہوئی وہاں جاکر روپوش ہوسکتی تھی۔ میں نے اس کی رسیاں کھول کر اسے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر اس کی طرف سے مطمئن ہوکر سامی اور کیدار کی تلاش میں آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دور جاتے ہی وہ مجھے نظر آگیا۔ درختوں سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی میں دور سے اس کا ہلکا سا خاکہ نظر آرہا تھا۔ میں دبے قدموں اس کے قریب ہوتا گیا۔ وہ سر اٹھائے درخت کی شاخوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سامی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کے جسم پر صرف ایک لنگوٹ تھی۔ باقی جسم سرسوں کے تیل چپڑنے کے باعث چاندنی میں چمک رہا تھا۔ میں نے سوچا اگر میں نے اسے للکار کر مقابلہ کیا تو یہ میری حماقت ہوگی کیونکہ اس کے بدن پر اتنا تیل تھا کہ وہ کبھی میری گرفت میں نہ آتا، بار بار پھسل جاتا اس لیے میں نے پہلے ہی وار میں آخری فیصلہ کرنے کی ٹھان لی۔ وہ مجھ سے دس قدم کے فاصلے پر تھا۔ رات کے سناٹے میں میرے قدموں کی آہٹ اس کے کانوں تک پہنچ سکتی تھی لیکن سامی نے شاید مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ جس شاخ پر بیٹھی ہوئی تھی، اس پر اچھل رہی تھی۔ اس طرح درختوں کی پتیاں شور مچا رہی تھیں۔ رات کا سناٹا مجروح ہو رہا تھا اور کیدار سامی کو دیکھنے کے لیے اسی شاخ کی طرف متوجہ تھا۔ لیکن میرے قریب پہنچتے ہی اس کی چھٹی حس نے اسے چونکا دیا۔ وہ تیزی سے میری طرف پلٹ گیا۔ اسی وقت میرا داؤ بھی چل گیا۔ میں نے بڑی پھرتی سے بیٹھک مار کر اس کی ایک ٹانگ پر داؤ کی ضرب لگائی۔ داؤ کی دھار اتنی تیز تھی کہ وہ گردن اڑا سکتی پھر ٹانگ کیسے سلامت رہتی۔ اس کا بایاں پاؤں گھٹنے کے نیچے سے کٹ کر دور جا پڑا اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی مانند دھپ سے زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ وہ چیختے ہوئے دور لڑھکتا جا رہا تھا تاکہ میرے دوسرے حملے سے خود کو بچا سکے لیکن وہ کتنی دور لڑھک سکتا تھا۔ میں نے اس کی دوسری ٹانگ بھی اس کے جسم سے الگ کر دی۔

ایسے وقت کوئی خدا کو یا اپنے بھگوان کو آواز دیتا ہے۔ وہ چیخ چیخ کر چھمیا کو پکار رہا تھا کیونکہ وہی اسے خطرات سے بچاتی رہی تھی۔ وہ اوندھا پڑا ہوا تڑپ تڑپ کر دونوں ہاتھ زمین پر مار رہا تھا۔ میں نے اس کے دائیں ہاتھ پر داؤ کی ضرب لگائی۔ وہ ہاتھ شانے سے الگ ہوگیا۔ اب اس کے حلق سے صرف کراہیں نکل رہی تھیں۔ اس کی زبان چھمیا کو پکارتے پکارتے تھک گئی تھی۔ وہ اپنے لہو میں ادھر سے ادھر لوٹ رہا تھا۔ میں نے داؤ اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم بہت سخت جان ہو۔ اپنے جسم کے اعضا سے محروم ہونے کے بعد بھی زندہ رہوگے۔ میں نے دونوں پاؤں اس لیے کاٹے ہیں کہ آئندہ تم سامی کا پیچھا نہ کرسکو۔ دایاں ہاتھ اس لیے کاٹا ہے کہ پھر کبھی کسی بے گناہ انسان کو کالے جادو کی بھینٹ نہ چڑھا سکو۔ تمھارا بایاں ہاتھ کو صرف اس لیے معاف کر رہا ہوں کہ زندہ رہ کر اس ہاتھ سے روٹیاں کھا سکو۔ اب تم یہیں تڑپتے رہو۔ اگر تمھاری زندگی باقی ہوگی تو کوئی نہ کوئی تمھاری مدد کے لیے پہنچ جائے گا۔"

اتنے میں سامی درخت سے اتر کر آگئی۔ پہلے اس نے کیدار کی طرف دیکھا، اس کے جسم سے اتنا خون بہہ چکا تھا کہ اب اس میں تڑپنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ سامی اسے دیکھ کر میری طرف آنے لگی۔ میں نے کہا۔

"تم نے مجھے یہاں اپنی مدد کے لیے بلایا تھا یعنی صرف ایک خیال کے ذریعہ یہاں آنے کے لیے کہا تھا اور میں آگیا۔ اب تو یقین کرتی ہو کہ میں ایسا دوست ہوں جو تمھارے خیالات کو پڑھ کر تمھاری مدد کے لیے آجاتا ہے۔"

وہ میرے قریب آکر میرے قدموں پر لوٹنے لگی۔ اپنی محبت اور عقیدت ظاہر کرنے اور میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے اس کے پاس زبان نہیں تھی اس لیے وہ اپنا منہ میرے پیروں پر رگڑتی ہوئی سوچ کے ذریعے بول رہی تھی۔

"تم سچ مچ دیوتا ہو۔ اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ تمھاری مہربانی سے میں اپنا جسم حاصل کرلوں گی۔ تم ابھی چھمیا کے پاس چلو اور اسے مجبور کردو کہ وہ میرا جسم چھوڑ دے۔"

میں نے دونوں بازو پھیلا کر کہا۔ "میرے پاس آؤ۔ ہم ابھی اس کے پاس چلتے ہیں۔"

وہ اچھل کر میرے بازوؤں میں آگئی۔ میں اسے سینے سے لگا کر ملائم بالوں پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس وقت سامی میری آغوش میں تھی مگر اس کا جسم بہت دور ایک درخت سے بندھا ہوا تھا۔ جب کٹیا میں رسیوں سے بندھی ہوئی چھمیا کو بازوؤں میں اٹھایا تھا تو اس وقت سامی کا جسم میری آغوش میں تھا لیکن اس جسم میں سامی کی روح نہیں تھی وہ اب تک مکمل ہوکر میرے بازوؤں میں نہیں آئی تھی۔

میں نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم بلی کے جسم سے آزاد ہوگی؟"

"ابھی نہیں۔" اس کی سوچ نے کہا۔ "چھمیا منتر پڑھ چکی ہے۔ صبح تک اگر اس نے دوبارہ منتر نہ پڑھا تو میں بلی کے جسم سے آزاد ہو جاؤں گی۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا تم چھمیا کو کسی طرح مجبور کرسکتی ہو کہ وہ تمھارا جسم چھوڑ دے؟"

"ہاں۔ یہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ میں اسے اپنے جسم سے نکالنے کا منتر پڑھوں گی اور وہ اسی جسم میں سمائے رہنے کا منتر پڑھے گی۔ منتروں کی لڑائی میں جو جیت جائے گی وہ جسم اسی کا ہو جائے گا۔"

"تو پھر اطمینان رکھو۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "کل صبح کے بعد تم دونوں کے درمیان مقابلہ ہوگا اور تمھاری جیت ضرور ہوگی۔ ابھی تو میں نے اسے باندھ رکھا ہے۔ وہ منتر بھی نہیں پڑھ سکے گی۔ اب یہ بتاؤ کہ کل صبح کے بعد اگر اسے اسی طرح باندھ کر رکھا جائے تو کیا وہ منتر پڑھ سکے گی؟"

"ہاں، وہ منتر ایسے ہیں جو میری اور چھمیا کی روح کی گہرائیوں میں اتر گئے ہیں۔ ایک منتر سے کسی کے جسم سے اس کی روح نکالی جاتی ہے، دوسرے منتر سے ہم کسی کے بھی جسم میں داخل ہوسکتے ہیں۔ چھمیا ہزار بندشوں کے باوجود یہ دو منتر پڑھ سکتی ہے۔"

ہم اپنی اپنی سوچ کے ذریعہ باتیں کرتے ہوئے چھمیا کے قریب پہنچ گئے۔ وہ درخت سے بندھی ہوئی بڑی بے بسی سے مجھے اور سامی کو دیکھ رہی تھی۔ اگر وہ آزاد ہوتی تو کوئی نہ کوئی منتر پڑھ کر ہمیں بے بس کرنے کی کوشش کرتی۔ ویسے اب اسے رسیوں سے آزاد کرنا ضروری تھا کیونکہ میں اسے اور سامی کو اپنی کوٹھی میں لے جانا چاہتا تھا۔ ہم اس جنگل میں رہ کر اس وقت کا انتظار نہیں کرسکتے تھے۔ جب سامی اپنا جسم حاصل کرلیتی اور چھمیا کی روح کہیں بھٹکنے چلی جاتی۔ یہ اہم مرحلہ میری کوٹھی میں طے ہوسکتا تھا۔

میں نے سامی کو زمین پر چھوڑ دیا اور چھمیا کی رسیاں کھولنے لگا۔ سامی کی سوچ نے کہا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟ کیا اس کا منہ بھی کھول دو گے؟"

"ہاں۔ میں ابھی تمھیں اور اس چڑیل کو اپنی کوٹھی میں لے جاؤں گا۔ اگر اس کا منہ بندھا رہے گا تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ میں ایک دوشیزہ کو جبراً اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ آزاد ہوتے ہی منتر پڑھنا شروع کردیگی۔"

"تم فکر نہ کرو، میری موجودگی میں یہ کبھی صحیح منتر نہیں پڑھ سکے گی، میں اس کے دماغ میں بیٹھ کر اسی کے منتروں کو الٹ پلٹ کرتا رہوں گا۔"

"اوہ، تم کتنے اچھے ہو۔ میں تو بھول ہی گئی تھی کہ تم کسی کے بھی دماغ تک پہنچ کر اس کی سوچ میں ہلچل مچا سکتے ہو۔ تم واقعی حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک ہو۔ میرے دیوتا! تمھارا نام کیا ہے؟"

"فرہاد علی تیمور۔ تم صرف فرہاد کہہ کر مجھے مخاطب کرسکتی ہو۔"

چھمیا کی رسیاں کھل گئیں۔ منتر پڑھنے کے لیے اس کی زبان اور اس کے ہونٹ بھی آزاد ہوگئے۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ میں سامی سے سوچ کے ذریعہ گفتگو کرتا ہوں۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ میں کسی بھی انسان کے خیالات پڑھ لیتا ہوں۔ اس وقت میں چھمیا کے خیال کو پڑھ رہا تھا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ مجھے ابھی منتر نہیں پڑھنا چاہیے۔ اگر پڑھوں گی، تو یہ آدمی پھر میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دے گا۔ میں کسی بھی وقت اس کی غفلت سے فائدہ اٹھاؤں گی۔ آہ! میں نے کیا سوچا تھا اور کیا ہوگیا؟ گرو مہاراج نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ کنڈل کے اندر بلانے کے لیے سامی کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ میں نے تو یہی کوشش کی تھی کہ کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ راستہ بالکل صاف تھا۔ وہ سیدھی کنڈل کے اندر چلی آتی لیکن وہ خود نہیں آئی۔ نہ جانے اس کے اندر کیسی شکتی ہے۔ میرے منتر بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ ہاں، یاد آیا جب وہ کنڈل کے اندر آرہی تھی اس وقت میں منتر پڑھتے پڑھتے ایک ذرا رک گئی تھی۔ شاید کچھ غلطی ہوگئی تھی۔ بس اسی وقت اسے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ کچھ بھی ہو اس حرامزادی کے نصیب اچھے ہیں۔ اب الٹا مجھے مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ میں اس نوجوان کی بھینٹ دینے والی تھی۔ نہ جانے اب یہ میرے ساتھ کیسا سلوک کرے گا۔ کیدار بھی پتہ نہیں کہاں جاکے مر گیا ہے۔ وہ سامی کے پیچھے گیا تھا۔"

اس نے مجھ سے پوچھا۔ "کیدار کہاں ہے؟"

"کیا اپنے یار سے ملنا چاہتی ہو؟"

اس نے ناگواری سے مجھے دیکھ کر کہا۔ "ہاں۔ وہ میرا یار ہے۔ کہاں ہے وہ؟"

"وہ زندگی اور موت کے درمیان ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔"

"نہیں!" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "تم جھوٹ بولتے ہو۔ کیدار جیسا بلوان اتنی بے بسی سے موت کی طرف نہیں جائے گا۔ مجھے اس کے پاس لے چلو، وہ کہاں ہے؟"

ہم باتیں کرتے ہوئے اس جگہ آگئے جہاں کیدار اپنے لہو میں ڈوبا ہوا ایک لاش کی طرح خاموش پڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی چھمیا پر تھوڑی دیر کے لیے سکتہ طاری ہوگیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ جو کچھ وہ آنکھوں سے دیکھ رہی ہے وہ ایک حقیقت ہے لیکن وہ حقیقت سے انکار نہیں کرسکتی تھی۔ کیدار کو ایسی حالت میں دیکھ کر وہ چیخیں مارتی اور دوڑتی ہوئی اس کے پاس گئی، اور اس کے چہرے پر جھک کر دیکھنے لگی کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔

وہ کچھ اس انداز میں اس پر جھکی ہوئی تھی کہ اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ جب وہ اپنی مانگ سے سیندور نکال کر اپنی ہتھیلی پر ملنے لگی تو اچانک سامی میرے بازوؤں میں تڑپ گئی۔ میں نے سوچ کے ذریعہ پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

اس کی سوچ نے کہا۔ "چھمیا اپنے یار کا ماتم نہیں کر رہی ہے بلکہ ہتھیلی پر سیندور لگا کر اپنا منہ چھپائے زیر لب منتر پڑھ رہی ہے۔"

میں نے چونک کر چھمیا کی جانب دیکھا۔ چاندنی کے باوجود اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا کیونکہ اس پر درخت کا سایہ پڑ رہا تھا۔ مجھے اس کے ہلتے ہوئے لب دکھائی نہیں دیئے۔ لیکن سامی نے بلی کی تیز نظروں سے نیم تاریکی

میں اسے دیکھ لیا تھا۔

میں نے فوراً ہی اس کے دماغ تک پہنچ کر اس کے منتر کو سنا۔ وہ کچھ ایسے اگڑم بگڑم قسم کے الفاظ ادا کر رہی تھی جو میری سمجھ سے باہر تھے۔ میں نے بھی اسی طرح کے بے معنی الفاظ اس کی سوچ میں بولنے شروع کر دیے۔

"اگڑم بگڑم بگڑم۔ تریا چلتر چھمیا چھم چھم۔ بت تیری کی ایسم تیسم....."

چھمیا نے بوکھلا کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اس کے دماغ میں ہلچل مچتے ہی اس کی یادداشت گڈمڈ ہوگئی۔ جب دماغ ہی کنٹرول میں نہ رہے تو یادداشت کیسے قائم رہ سکتی ہے۔ وہ مذاویر کے لیے منتر بھول گئی۔ پھر میں اس کی سوچ میں خاموش ہوا تو اسے منتر یاد آگیا۔ وہ دوبارہ پڑھنے لگی۔ میں نے پھر ایک بار گڑبڑ کی۔ اس بار وہ پریشان ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اسے شبہ ہوا تھا کہ میں کوئی عمل کر رہا ہوں۔ میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"تم منتر نہیں پڑھ سکو گی۔ جب بھی پڑھنا چاہو گی، تمھارا دماغ تمھارا ساتھ نہیں دے گا۔ یقین نہ ہو تو پھر پڑھ کر دیکھ لو۔"

اسے یقین نہیں آیا۔ وہ تیسری بار پڑھنے لگی۔ میں نے سوچ کے ذریعے پھر مداخلت کی تو وہ پہلے کی طرح گڑبڑا گئی۔ اپنا منتر بھول کر مجھے حیرانی سے تکنے لگی۔ اسے اس بات کی حیرانی تھی کہ میں نے اس کی طرح کوئی منتر نہیں پڑھا تھا۔ میرے ہونٹ بند تھے پھر بھی اس پر اثر انداز ہوا تھا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر حیرانی سے بولی۔

"کیا تم انتر گیانی ہو؟"

"ہاں میں انتر گیانی ہوں۔ دلوں کے بھید جان لیتا ہوں۔ تم جب بھی منتر پڑھو گی میں اس منتر کو تمھارے دماغ سے مٹا دیا کروں گا۔ اب تمھاری بھلائی اسی میں ہے کہ میرے ساتھ خاموشی سے چلو اور کوئی منتر پڑھنے کی ہمت نہ اٹھاؤ۔ کل صبح جب سامی اس قابل ہو جائے گی کہ وہ بلی کا جسم چھوڑ سکے تو تم اس کا جسم اسے واپس دے دینا۔ اگر تم انکار کرو گی اور اس سے مقابلہ کرنے کے لیے منتر پڑھو گی تو میں اپنے گیان سے تمھیں پڑھنے کا موقع نہیں دوں گا۔ تم اپنے بچاؤ کے لیے جو کچھ کر سکتی ہو کرو لیکن تمھارے نصیب میں ناکامی ہو گی۔ تمھیں سامی کا جسم چھوڑ کر ہی جانا ہو گا۔"

وہ تھوڑی دیر تک چپ چاپ کھڑی سوچتی رہی: "ابھی اس آدمی سے ٹکرانا نادانی ہے۔ سامی کل صبح سے پہلے بلی کے جسم سے آزاد نہیں ہو سکے گی۔ اس وقت تک میں اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچ لوں گی۔ اگر موقع ملا تو اسے بلی کے جسم میں ہی قید رکھنے کے لیے پچاس بار منتر پڑھ لوں گی لیکن ابھی مجھے ہار مان کر اس آدمی کے ساتھ جانا چاہیے۔"

یہ سوچ کر چھمیا نے شکست خوردہ انداز میں سر کو جھکا لیا اور میرے ساتھ چلنے لگی۔ سامی میرے دونوں بازوؤں میں سینے سے لگی ہوئی تھی۔ ہم تقریباً ایک گھنٹے تک اس جنگل میں بھٹکتے رہے۔ پھر ہمیں راوی کا کنارہ نظر آگیا۔ ہم کنارے کنارے آگے بڑھنے لگے۔ اس وقت میں نے سامی سے پوچھا۔

"تمھارے ملک کا وہ جاسوس بھوانی شنکر کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتی کہ اب وہ کہاں ہوگا۔ جس روز چھمیا اور لیلا [illegible] ہوتے تھے، اسی روز میں نے بھی بنڈی میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔"

"کیا یہ درست ہے کہ تم نے میرے ملک کے اہم راز [illegible] تک پہنچائے ہیں؟"

"ہاں یہ درست ہے۔ میں بھوانی شنکر کا اعتماد حاصل کر کے [illegible] کو اپنے قابو میں رکھتی تھی۔ میں جب چاہتی اس کا منہ بند کرا دیتی تھی تاکہ منتر نہ پڑھ سکے۔ مجھے موقع ملتا تو میں بھوانی شنکر کو بھی زندہ نہ چھوڑتی کیونکہ مجھے میرے باپ سے جدا کرنے میں اس کا بھی ہاتھ ہے۔ لیکن چھمیا کے [illegible] ہونے کے بعد مجھے اس کا پیچھا کرنا پڑا۔ میں مجبوراً بھوانی شنکر جیسے دشمن کو یونہی چھوڑ کر چلی آئی۔"

"تم نے اسے چھوڑ دیا لیکن میں اس کا پیچھا کروں گا۔ اپنے ملک کا کوئی راز اسے لے جانے نہیں دوں گا۔ تم مجھے احمد شیخ کا پتہ بتاؤ۔ وہ کمبخت تمھارے ملک کا ایجنٹ ہے۔ میں اس کے ذریعے بھوانی شنکر تک پہنچوں گا۔ میرے ملک کے جتنے غدار میری نظروں میں آتے گئے، میں انھیں کتوں کی موت مار دوں گا۔"

"میرے دیوتا! تم نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ اب میں تمھارے ملک کے اہم راز چرا کر پچھتا رہی ہوں۔ میں اپنی شرمندگی کا اظہار نہیں کر سکتی۔ ہاں، میں اپنی غلطی کی تلافی کروں گی۔ میں تمھیں احمد شیخ کے پاس لے جاؤں گی۔ میری نظروں میں جتنے اس ملک کے غدار ہیں میں ان کی نشاندہی کروں گی۔ فی الحال میری مجبوری یہ ہے کہ میں چھمیا کے پاس اپنا جسم چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ تم مجھ پر اتنا احسان اور کرو کہ وہ جسم مجھے حاصل کر لینے دو۔ اس کے بعد تم مجھے جہنم کی آگ میں کودنے کے لیے کہو گے تو میں بلا جھجک کود جاؤں گی۔"

اس کے جواب میں میں نے کہا: "میں جانتا ہوں کہ تم نے اپنے جسم کی خاطر زمانے بھر کی پریشانیاں اٹھائی ہیں۔ تم ہر حال میں اپنے جسم کو اہمیت دو لیکن مجھے جلد از جلد احمد شیخ تک پہنچنا چاہیے۔ ورنہ بھوانی شنکر اس ملک سے نکل جائے گا۔"

سامی کی سوچ نے کہا: "میرا خیال ہے بھوانی شنکر اس ملک سے جا چکا ہے کیونکہ وہ صرف میری صلاحیتوں کے بھروسے پر یہاں آیا تھا۔ [illegible] کر احمد شیخ کے گھر میں تمھارے ہاں کی ایک جاسوسہ ملازمہ بن کر آئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ احمد شیخ وغیرہ یہاں کی انٹیلیجنس کی نظروں میں آ گئے ہیں۔ ایسے خطرات کے پیش نظر بھوانی شنکر میں اتنی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ اس سرزمین پر سانس لے سکے۔"

میں نے کہا: "اگر وہ جا چکا ہے تو میں سرحد کے پار بھی اس کا پیچھا کروں گا اور اپنے ملک کے رازوں سمیت اسے دفن کر دوں گا۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ تم میرے دیس تک اس کا پیچھا [illegible]

اس طرح میرا تمھارا ساتھ رہے گا۔ میں اپنے ڈیڈی سے مل سکوں گی اور وہاں تم جب جا ہو گے، تمھارے کام آتی رہوں گی۔"

ہم باتوں ہی باتوں میں آئندہ کا پروگرام مرتب کر رہے تھے۔ چھمیا چپ چاپ سر جھکائے ہمارے ساتھ چل رہی تھی۔ میں کبھی کبھی اس کی طرف دیکھ لیتا تھا کہ کہیں وہ منتر تو نہیں پڑھ رہی ہے۔ سامی بھی محتاط نظروں سے اسے دیکھتی رہتی تھی۔ آدھ گھنٹے بعد ہم شاہدرہ پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے تین بجے تھے۔ راستے اور گلیاں ویران تھیں۔ کوٹھی تک پہنچنے کے لیے رکشہ یا ٹیکسی ملنے کی توقع نہیں تھی۔ لیکن تقدیر مہربان تھی۔ ایک گلی سے گزرتے وقت ایک مکان کے سامنے ٹیکسی نظر آگئی۔ ہم نے قریب پہنچ کر دیکھا ٹیکسی چلانے والا پچھلی سیٹ پر خراٹے لے رہا تھا۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ وہ سو رہا تھا۔ اگر جاگتا رہتا تو دنیا جہان کے سوالات کرتا کہ ہم کون ہیں، کہاں سے آ رہے ہیں اور اتنی رات کو کہاں جا رہے ہیں؟ اور یہ کہ چولی اور گھاگھرا پہنی ہوئی لڑکی کہاں سے پکڑ لائے ہو؟

اتنے سارے سوالات سے بچنے کے لیے میں نے اس کے خوابیدہ دماغ میں جھانک کر دیکھا۔ وہ سوچ کی اسکرین پر خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے دماغ میں بیٹھ کر بار بار ہدایت کی کہ وہ اسی طرح سہانے خواب دیکھتا رہے گا اور صبح چھ بجے سے پہلے بیدار نہیں ہو گا۔

جب اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک جیب سے ٹیکسی کی چابی نکل آئی۔ سامی میری معیت کے دوران چھمیا کی نگرانی کر رہی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ سامی کی موجودگی میں منتر نہیں پڑھ سکے گی۔ میں نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر چھمیا کو بٹھایا۔ پھر دوسری طرف سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا۔

جب میں نے گاڑی اسٹارٹ کی تو رات کے سناٹے میں اس کے انجن کی آواز گونجنے لگی۔ اسی وقت مکان کے اندر سے کوئی عورت بڑبڑانے لگی۔

"ارے اتنی رات کو کہاں سے سواری ملے گی۔ گاڑی صبح لے جانا۔ تجھے تو ہون رات کمانے کی پڑی رہتی ہے۔ دو گھڑی آرام بھی نہیں کرتا ہے کمبخت..."

بڑبڑانے والی نہیں جانتی تھی کہ وہ کمبخت پچھلی سیٹ پر آرام کر رہا ہے۔ اس کے کچھ جاننے اور سمجھنے سے پہلے ہی میں تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا اس گلی سے نکل گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ راستے میں اگر پٹرولنگ پولیس نے روکا تو مجھے کس طرح نمٹنا ہو گا۔ لیکن ایسی کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ میں بخیریت ڈرائیو کرتا ہوا اپنی کوٹھی کے احاطے میں پہنچ گیا۔

پھوپھی جاگ رہی تھیں۔ گاڑی کی آواز سن کر باہر آگئیں۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"فرہاد! تم کہاں چلے گئے تھے؟ پورے چالیس گھنٹے سے غائب ہو۔ کہہ کر تو جانا چاہیے تھا۔ یہ گھاگھرا پہننے والی کو کہاں سے پکڑ لائے ہو؟"

"پھوپھی جان! یہ گھاگھرے والی بہت بڑی مصیبت ہے۔ اسی مصیبت میں الجھا ہوا تھا۔ سنیے میں آپ کو اطمینان سے بتاتا ہوں۔"

میں باتیں کرتے ہوئے اپنے بیڈروم میں آگیا۔ ہماری آوازیں سن کر نسرینہ بھی آگئی تھی۔ میں مختصر طور سے انھیں بتانے لگا کہ چھمیا ایک جادوگرنی ہے اور میں اسے قیدی بنا کر لایا ہوں۔ پھوپھی اور نسرینہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ میں پراسرار علوم جانتا ہوں۔ انھوں نے آج تک کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا کہ میں نے تنویمی عمل اور خیال خوانی کے ذریعہ اپنی کھوئی ہوئی دولت حاصل کی ہے۔ اس بات کو راز رکھنے میں ان کی ہی بھلائی تھی۔

انھیں اچھی طرح سمجھانے کے دوران میں نے چھمیا کو دوبارہ رسیوں سے باندھ کر قالین پر لٹا دیا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے پٹی باندھ دی تاکہ وہ میری عدم موجودگی میں منتر نہ پڑھ سکے۔ اس کے بعد میں پھوپھی اور نسرینہ کے ساتھ باہر آگیا۔ سامی کو چھمیا کے پاس چھوڑ دیا۔ زرینہ سے کہا کہ وہ ہمارے لیے ہلکا سا ناشتہ اور چائے تیار کرے، میں ابھی آتا ہوں۔

ان سے رخصت ہو کر میں دوبارہ ٹیکسی کی ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا۔ پھر وہاں سے ڈرائیو کرتے ہوئے دور ایک ایسی گلی میں ٹیکسی روک دی جہاں ٹیکسی ڈرائیور کو پریشان کرنے کے لیے کوئی سپاہی نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر ڈرائیور کی جیب میں ٹیکسی کی چابی اور پچاس روپے کا ایک نوٹ رکھ دیا تاکہ اس غریب کی حق تلفی نہ ہو۔ پھر گاڑی کے تمام دروازے لاک کر کے وہاں سے کوٹھی کی طرف واپس ہو گیا۔ میں نے یکطرفہ کرائے سے کہیں زیادہ رقم اسے دے دی تھی لیکن صبح آ کر اس کی الجھن دور نہیں کر سکتا تھا۔ وہ صبح چھ بجے اٹھ کر یہ سوچتا ہی رہ جاتا کہ اس کے ساتھ کیسا جادو کی تماشا ہوا ہے۔ وہ شاہدرہ کی ایک گلی میں سویا تھا اور گلبرگ کی ایک گلی میں بیدار ہوا ہے۔ اگر وہ کسی سے پوچھے گا یا تھانے میں جا کر شکایت کرے گا تو سب ہی اسے پاگل سمجھیں گے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایسی حماقت نہیں کرے گا۔ اگر پچاس کا نوٹ مفت میں ملتا ہے تو ہر شخص یہی چاہے گا کہ رات کو ایک جگہ سوئے اور صبح دوسری جگہ پچاس کے کھرے نوٹ کے ساتھ بیدار ہوتا رہے۔

راستے میں تنہا چلتے وقت میں نے سوچا کہ اس وقت چھمیا میری خواب گاہ میں بے زبان سامی کے ساتھ ہو گی اور میرے متعلق ضرور کچھ سوچ رہی ہو گی۔ میں نے فوراً ہی اس سے دماغی رابطہ قائم کیا۔ اس وقت وہ سوچ رہی تھی۔

"یہ سامی کی بچی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟ اب تو اس نے ایک یار بھی ڈھونڈ لیا ہے۔ وہ کمبخت انتر گیانی ہے۔ مجھے منتر پڑھنے کا موقع ہی نہیں دیتا ہے اور میں منتر بھی کیا پڑھوں گی مجھے جو کچھ بھی آتا ہے وہ شعبدے بازی ہے۔ میں انھیں وقتی طور پر آگ میں جلا سکتی ہوں۔ وہ آگ کی جلن محسوس کریں گے، چیخیں گے چلائیں گے۔ پھر چند لمحوں بعد وہ آگ خود ہی سرد پڑ جائے گی اور جلنے والے پھر اسی طرح صحیح سلامت نظر آئیں گے۔ مجھے ایسی کتنی ہی شعبدے بازیاں آتی ہیں۔ انھیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کا توڑ کالا علم جانتی ہوں، وہ کسی مددگار کے بغیر کام نہیں آ سکتا۔ کیدار جیسا کام آنے والا ساتھی بچھڑ گیا ہے۔ اب وہ مل بھی جائے تو میرے لیے بے کار ہے۔ کیونکہ اب وہ ایک ہاتھ اور دو پاؤں سے محروم

ہوگیا ہے۔ میرے کسی کام نہیں آئے گا۔ کاش کہ میں اپنے دیس میں ہوتی تو کسی بھروسے کے آدمی کو اپنا چیلا بنا کر اس سے کام نکالتی۔ پردیس میں رہ کر میں کچھ نہیں کر سکتی۔ اب تو یہی ہو سکتا ہے کہ میں کل تک صبر کروں۔ کسی اچھے موقع کا انتظار کروں۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے کامیابی نصیب ہو جائے۔ اگر ناکامی ہوئی تو میں اس کا جسم چھوڑ کر کسی دوسری نوجوان اور حسین لڑکی کے جسم کو اپنا لوں گی۔ سامی کی جوانی کو اپنا کر مجھے پریشانیوں اور مصیبتوں کے سوا کچھ نہیں ملا۔ ایک بار بھی کسی مرد کی آغوش میں نہ جا سکی۔ میں ایسے جسم پر تھوک کر چلی جاؤں گی.....“

چھمیا کی سوچ پڑھ کر مجھے ایک خطرے کا احساس ہوا۔ اب وہ کسی دوسری نوجوان لڑکی کے جسم میں جانے کے متعلق سوچ رہی تھی اور میری کوٹھی میں سب سے قریبی نوجوان اور حسین لڑکی زرینہ تھی۔ وہ چڑیل کسی وقت بھی اسے ہلاک کر کے میرے سامنے زرینہ کے روپ میں آ سکتی تھی۔

میں نے کوٹھی میں آ کر دیکھا تو زرینہ ناشتہ تیار کر چکی تھی۔ دونوں ماں بیٹی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ مجھے ذرا دیر کے لیے شبہ ہوا کہ وہ زرینہ کے روپ میں آ گئی ہے۔ میں نے فوراً ہی اس کے خیالات پڑھے۔ وہ مجھے کن انکھیوں سے دیکھتی ہوئی سوچ رہی تھی۔

”خود غرض کہیں کا۔ مجھ سے دل بھر گیا ہے تو اب باہر سے چولی خود گھاگھرے والی کو پکڑ کے لے آیا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ کالا جادو جانتی ہے۔ سب جھوٹ ہے۔ اتنی حسین لڑکی بھلا جادو ٹونے کو کیا سمجھے گی۔ یہی جناب عیاشی کے لیے اسے یہاں لے آئے ہیں۔ اونہہ!“

اس کی سوچ سے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ زرینہ ہے۔ میں نے پھوپھی سے کہا۔

”پھوپھی جان! میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ چھمیا کتنی خطرناک ہے۔ اگر وہ میری لاعلمی میں کوئی کالا منتر پڑھے گی تو آپ کو یا زرینہ کو نقصان پہنچے گا۔ لہٰذا آپ لوگوں کا ابھی یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ آپ ایک دن کے لیے زرینہ کو لے کر شاہ کوٹ چلی جائیں۔ کل واپس آ جائیے گا۔ میں آپ کو لاری اڈے تک چھوڑ آتا ہوں۔“

زرینہ گھور کر مجھے دیکھنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی ”اونہہ! کوٹھی خالی کرانے کا کیا خوب بہانہ نکالا ہے۔ ہم ماں بیٹی یہاں نہیں رہیں گی تو یہ جناب کھل کر اس کی جوانی سے کھیلیں گے۔ میں تو نہیں جاؤں گی۔“

میں نے پھوپھی جان کو الگ لے جا کر سمجھایا کہ چھمیا کا جادو زیادہ تر نوجوان لڑکیوں پر چلتا ہے۔ لہٰذا آج زرینہ کا اس کوٹھی میں رہنا مناسب نہیں ہے۔ پھوپھی جان اپنی بیٹی کی سلامتی کے لیے اسی وقت کوٹھی چھوڑنے کے لیے تیار ہو گئیں۔ زرینہ نے نہ جانے کے لیے کتنے ہی بہانے کیے لیکن ماں نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر ساتھ لے لیا۔ میں انھیں اپنی کار میں بٹھا کر لاری اڈے تک لے جانے لگا۔ راستے میں میں نے سامی سے سوچ کے ذریعہ رابطہ قائم کر کے اسے سمجھا دیا کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں واپس آ رہا ہوں۔ اس نے بھی

مجھے بتایا کہ چھمیا چپ چاپ فرش پر پڑی ہوئی چھت کی طرف [illegible] رہی ہے۔ شاید کچھ سوچ رہی ہے۔

میں احتیاطاً چھمیا کے خیالات پڑھنے لگا۔ اس کے خیالات [illegible] ذکر نہیں تھے۔ وہ اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچ رہی تھی۔ بار بار اس کے [illegible] میں یہی بات آتی تھی کہ وہ ناکامی کی صورت میں سامی کا جسم چھوڑ [illegible] اور کسی دوسری لڑکی کے جسم میں چلی جائے گی۔

میں نے دونوں ماں بیٹی کو لاری اڈے تک پہنچایا۔ واپسی [illegible] بھی احتیاطاً چھمیا کی سوچ کو سمجھتا رہا۔ جب میں کوٹھی کے احاطے [illegible] تو دن کا اجالا پھیل گیا تھا۔ میری نظریں چچا جان کی کوٹھی کی جانب [illegible] گئیں۔ وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ لوگ دیر تک سونے کے عادی [illegible] اس عرصے میں اتنی مصیبتوں اور ہنگاموں سے گزر چکا تھا کہ اپنے [illegible] اور غزالہ کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ [illegible] نے سوچا کہ اب اپنی خواب گاہ میں ناشتہ کرنے کے دوران ان کے بارے [illegible] معلومات حاصل کروں گا۔ اس وقت میں نے کچن میں ایک ٹرے پر [illegible] اور چائے کی کیتلی اور سامی کے لیے دودھ کا پیالہ رکھتے ہوئے اپنی بہن [illegible] کی سوچ کو پڑھنے لگا۔ اس کے خیالات سے پتہ چلا کہ وہ وہاں موجود [illegible] پنڈی چلی گئی ہے۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔ وہ ہمیں پیش آنے والے ہنگاموں سے بہت دور جا چکی تھی۔

میں ناشتے کی ٹرے لے کر اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ چھمیا اسی [illegible] پر لیٹی ہوئی تھی اور سامی ایک پہرے دار کی طرح اس کے قریب بیٹھی تھی۔ میں نے سامی کے سامنے دودھ کا پیالہ رکھتے ہوئے اسے بتایا کہ [illegible] جان اور زرینہ کو لاری اڈے پہنچا کر آ گیا ہوں۔ انہیں اس لیے دور بھیجا کہ چھمیا کہیں زرینہ کے جسم میں پناہ لینے کے لیے اسے مار نہ ڈالے۔ سامی اس اقدام کو سراہنے لگی۔ اس نے بھی یہی کہا کہ میں بھی جب ایک جسم [illegible] ہوں تو سب سے قریب نظر آنے والے کسی دوسرے جسم میں سما جاتی [illegible] چھمیا کے لیے بھی سب سے قریبی جسم زرینہ کا ہوتا۔ اچھا ہوا کہ اسے [illegible] دیا گیا۔

میں نے چھمیا کو فرش پر بٹھا دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں نہیں [illegible] صرف اس کا منہ کھول دیا تاکہ اسے کچھ کھلا سکوں۔ وہ کھانے سے انکار [illegible] لگی۔ میں نے زبردستی اس کے منہ میں ایک لقمہ ٹھونستے ہوئے کہا۔

”مجھے تمہارے بھوکے رہنے کی پرواہ نہیں ہے۔ یہ سامی کا [illegible] میں اسے بھوکا نہیں رکھنا چاہتا۔“

میں اسے جبراً کھلانے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں بھی کھا [illegible] سامی دودھ پی چکی تھی۔ کھانے کے بعد میں دو پیالیوں میں چائے [illegible] لگا۔ اتنے میں سامی قالین پر لیٹ کر اپنے ہاتھ اینٹھنے لگی۔ میں نے [illegible] کے ذریعہ پوچھا ”کیا بات ہے سامی؟“

اس نے جواب دیا ”میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں [illegible]

کا مطلب یہ ہے کہ چھمیا کے منتر کا اثر ختم ہو چکا ہے۔ میں جب چاہوں بلی کے جسم سے آزاد ہو سکتی ہوں۔ تم اس کی رسیاں کھول دو۔ میں اس سے نمٹ لوں گی۔“

میں نے اس کی رسیاں کھول کر ایک طرف پھینک دیا۔ اس سے ذرا دور بیٹھ کر اپنی پیالی اٹھائی اور خاموشی سے چائے پینے لگا۔ چھمیا رسیوں سے آزاد ہو کر ذرا دیر تک اپنے ہاتھ پاؤں سہلاتی رہی۔ پھر وہ بھی خوش ہو کر دوسری پیالی سے چائے پینے لگی۔ وہ بظاہر مسکرا رہی تھی اور دل میں سوچ رہی تھی کہ میں نے اچانک ہی اسے آزاد کیوں کر دیا ہے؟

میں نے سامی سے پوچھا ”تم خاموش کیوں بیٹھی ہو؟“

اس نے جواب دیا ”اسے اطمینان سے چائے پی لینے دو۔ جب میں اس جسم میں آؤں گی تو چائے کا اثر مجھ پر ہو گا اور میں فرحت اور تازگی محسوس کروں گی۔“

میں سامی کے اس خیال سے مسکرانے لگا۔ واقعی یہی بات تھی۔ ابھی ناشتے اور چائے سے چھمیا کی بھوک مٹ رہی تھی لیکن جب سامی اس جسم میں آئے گی تو ناشتے اور چائے سے اس کا پیٹ بھرا ہوا ہو گا۔

میں چائے پیتے وقت سوچنے لگا کہ ایسے وقت کسی باہر والے کی مداخلت نہیں ہونی چاہیے۔ اگرچہ میں نے کوٹھی کے بیرونی دروازے کو اندر سے بند کر دیا تھا لیکن چچا جان میری خیریت پوچھنے آ سکتے تھے کیونکہ میں نے پچھلے دو دن سے ان سے ملاقات نہیں کی تھی۔

میں نے فوراً ہی چچا جان سے دماغی رابطہ قائم کیا تو پتہ چلا کہ وہ ابھی تک سو رہے ہیں۔ اب اس کوٹھی میں ایک غزالہ رہ گئی تھی۔ میں نے ذرا دیر کے لیے اس کے دماغ میں جھانک کر دیکھا۔ اس کی سوچ نے بتایا کہ وہ اپنی خواب گاہ سے نکل کر کوٹھی کے باہر آ رہی ہے۔ صبح سویرے وہ قیصر کے متعلق سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن یہ بات اسے پریشان کر رہی تھی کہ وہ مجھ سے مقابلہ کرنے کے بعد بری طرح زخمی ہو کر آیا تھا اور غزالہ کی سوچ کے مطابق کسی ہسپتال میں زیر علاج تھا۔

میں خیال کی اسکرین پر غزالہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچتی ہوئی کوٹھی کے باہر آ گئی تھی اور اب میری کوٹھی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ جیسے جیسے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی ویسے ویسے ہی میری صورت اس کے تصور میں آ رہی تھی اور اس کے دل میں شدید نفرت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔

پھر اس نے اپنی کوٹھی کے احاطے سے باہر سڑک پر آ کر سوچا ”معلوم ہوتا ہے کہ مقابلے میں وہ فرہاد کا بچہ بھی مارا گیا ہے۔ اگر زندہ ہوتا تو اپنی کوٹھی میں ضرور نظر آتا۔ وہ ڈیڈی سے ملنے بھی نہیں آیا۔ خدا کرے کہ وہ مر گیا ہو۔ مجھے اس کے ہاں ابھی جا کر پھوپھی جان سے پوچھنا چاہیے۔“

وہ میری کوٹھی میں آنا چاہتی تھی اور ابھی میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے فوراً ہی اس کی سوچ بن کر اسے کوٹھی میں نہ آنے کا مشورہ دینا چاہا لیکن اسی وقت میری توجہ ہٹ گئی۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی چھمیا

اچانک ہی فرش پر گر کر تڑپ رہی تھی۔ میں نے پلٹ کر بلی کی طرف دیکھا تو وہ مردہ نظر آ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ سامی بلی کے جسم سے نکل کر چھمیا کی سانسوں میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی۔

ایسے وقت سامی کو میری مدد کی ضرورت تھی۔ میں فوراً ہی چھمیا کی سوچ کو پڑھنے لگا۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے منتر پڑھ رہی تھی۔ میں نے اسے مزید پڑھنے کا موقع نہیں دیا۔ پہلے کی طرح اس کے دماغ میں ہلچل مچانے لگا۔ اپنی سوچ کا توازن بگڑتے ہی وہ منتر بھول گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منتر کا تسلسل ٹوٹ گیا اور سامی کا پلہ بھاری ہو گیا۔ شاید چھمیا سمجھ گئی تھی کہ میری موجودگی میں وہ منتروں کے ذریعہ سامی سے مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ میں اسی طرح اس کے دماغ میں ہلچل مچاتا رہوں گا۔ اس لیے میرے سامنے پڑا ہوا جسم جلد ہی پُرسکون ہو گیا۔ اب اس میں تڑپ اور اضطراب نہیں تھا۔ اس وقت میرے سامنے جو بھی تھی وہ چپ چاپ آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی۔

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ وہ کون ہے؟ چھمیا ہے یا سامی ہے؟ میں نے اس کی سوچ کو پڑھا۔ چونکہ اس جسم میں اب تک چھمیا سمائی ہوئی تھی اس لیے میں نے اس سے دماغی رابطہ قائم کیا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ وہ میری خواب گاہ میں نہیں ہے۔ کوٹھی کے باہر لان میں کھڑی اپنے ہاتھوں کو اور اپنے جسم کے دوسرے حصوں کو چھو کر دیکھ رہی تھی۔ اس وقت وہ سوچ رہی تھی۔

”ہائے! یہ جسم بھی بہت خوبصورت ہے۔ خوبصورتی میں سامی کے جسم سے انیس بیس کا فرق ہے۔ سامی اب تب میں کھلنے والی کلی تھی اور یہ پھول ہے۔ لیکن یہ کون تھی، جس کا جسم میں نے حاصل کیا ہے؟ یہ اس کوٹھی میں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ فرہاد کی کوئی دوست ہے یا عزیزہ ہے.....“

اس کا خیال پڑھ کر میں تعجب سے سوچنے لگا کہ وہ کون لڑکی تھی جو میری کوٹھی میں آ رہی تھی اور چھمیا نے اس کے جسم پر قبضہ جما لیا تھا؟ پھر جلد ہی مجھے یاد آ گیا کہ غزالہ میری کوٹھی کی طرف آ رہی تھی۔ اس وقت دعا مانگ رہی تھی کہ خدا کرے فرہاد مر جائے مگر وہ خود ہی موت سے ٹکرا گئی۔ چھمیا کی سوچ سے یہی معلوم ہو رہا تھا۔ اگر اس نے غزالہ کا جسم حاصل کیا ہے تو پہلے اس نے منتر کے بل پر اس کی روح نکالی ہو گی۔ پھر اس کے خالی جسم میں سما گئی ہو گی۔

بلاشبہ غزالہ میری جان کی دشمن تھی۔ وہ مر چکی تھی لیکن اس کی موت سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑا تھا کیونکہ چھمیا نے اس کے مردہ جسم کو پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ اب غزالہ اور چھمیا دو دشمن عورتیں ایک حسین جسم کے سنگم پر آ ملی تھیں۔

اس وقت چھمیا سوچ رہی تھی ”اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کم از کم فرہاد کا سامنا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ انتر گیانی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے اس جسم کے اندر سے بھی ڈھونڈ نکالے۔ مجھے یہاں سے واپس جانا چاہیے۔“

یہ سوچتے ہی وہ پلٹ کر جا رہی تھی۔ سڑک پر پہنچ کر وہ سوچنے لگی۔ ”[illegible] جاؤں۔ میرا موجودہ نام کیا ہے؟ یہ جسم کہاں سے آیا تھا؟ کہاں رہتا تھا؟ میری ابھی بھی کوئی منزل نہیں ہے۔ اس دیس سے باہر نکلنے کے

لیے کہیں اطمینان سے بیٹھ کر منصوبہ بنانا ہوگا۔"

وہ سوچتے سوچتے رک گئی۔ اس کی ذہنی سماعت سے چچا جان کی آواز ٹکرائی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ جب کوئی ہمیں مخاطب کرتا ہے تو اس کی آواز ہمارے کانوں سے ٹکراتی ہے۔ اس آواز کو سب سے پہلے ہمارا ذہن قبول کرتا ہے اور ہمیں سمجھاتا ہے کہ ہمارا مخاطب کیا کہہ رہا ہے۔ اسی طرح چھمیا کا موجودہ دماغ چچا جان کی آواز کو قبول کر رہا تھا اور میں اس کی سوچ کے ذریعہ ان کی بھی باتیں سن رہا تھا۔ وہ غزالہ کو آواز دے کر پوچھ رہے تھے۔

"غزالہ! تم سڑک پر کھڑی کیا سوچ رہی ہو؟ کیا فرہاد کے پاس گئی تھیں؟" چھمیا سوچنے لگی "یہ بڈھا کون ہے؟ مجھے غزالہ کہہ رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس جسم پر میں نے قبضہ جمایا ہے اس کا نام غزالہ تھا۔ اس لحاظ سے یہ بوڑھا رشتے میں میرا کیا لگتا ہے؟ پتہ نہیں یہاں آس پاس میرے اور کتنے رشتہ دار ہیں؟ مجھے ان لوگوں سے بچنا چاہیے اور یہاں سے دور چلا جانا چاہیے۔"

اتنے میں چچا جان نے پھر پوچھا "تم خاموش کیوں ہو؟ جواب کیوں نہیں دیتی؟ کیا فرہاد ابھی تک واپس نہیں آیا؟"

اس نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا "جی نہیں، وہ اپنے گھر میں نہیں ہے اس کی پھوپھی بھی نہیں ہیں۔"

"بیٹی! تم اس کی پھوپھی کیوں کہہ رہی ہو؟ وہ تو تمہاری بھی پھوپھی ہیں کیا اپنی پھوپھی کہتے ہوئے شرم آتی ہے؟"

"جی نہیں۔ شرم کیوں آنے لگی۔ آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں، ابا جان!"

چھمیا کو معلوم نہیں تھا کہ غزالہ اپنے باپ کو ڈیڈی کہتی ہے۔ وہ بھوانی شنکر کے ماتحت رہ کر اسلامی تہذیب سیکھ کر آئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ تمام مسلمان لڑکیاں اپنے والدین کو امی اور ابا جان کہتی ہوں گی۔

چچا جان نے تعجب سے پوچھا "کیا بات ہے آج تم ڈیڈی کے بجائے ابا جان کہہ رہی ہو؟"

وہ پریشان ہو کر جلدی سے بولی "اوہ ڈیڈی! پتہ نہیں صبح سے میرے دماغ کو کیا ہو گیا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں اپنی پچھلی زندگی بھول گئی ہوں ابھی آپ نے مخاطب کیا تو میں سوچ رہی تھی کہ آپ میرے کون ہیں۔ جب آپ نے بیٹی کہا تو یاد آ گیا کہ آپ میرے ابا.... نن نہیں ڈیڈی ہیں...."

میں اس کی بوکھلاہٹ پر مسکرانے لگا۔ لیکن میں اس کے بعد اس کے خیالات نہ پڑھ سکا۔ میرے سامنے قالین پر پڑا ہوا سامی کا جسم جاگ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہی تھی۔ چند لمحوں تک وہ خاموشی سے گہری گہری سانسیں لیتی رہی۔ پھر جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے بدن کو ادھر ادھر سے چھونے اور خود کو مکمل سامی کے روپ میں دیکھنے اور محسوس کرنے لگی۔ لیکن وہ بیٹھے ہی بیٹھے اپنا سراپا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے وہاں سے فوراً ہی اٹھ کر قد آدم آئینے کے سامنے چلی گئی۔

وہ تھوڑی دیر کے لیے مجھے بھول گئی تھی۔ اُس نے آس پاس کے تمام ماحول کو فراموش کر دیا تھا۔ اس کے سامنے صرف ایک قد آدم آئینہ تھا، اور اس آئینے میں وہ تھی۔ عورت جب اپنے حسن و شباب پر خود ہی فریفتہ ہونے لگتی ہے تو اسے صرف اپنا ہی وجود سب سے حسین نظر آتا ہے۔ ویسے سامی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھی۔ وہ حقیقتاً اتنی حسین تھی کہ اس دنیا کا کوئی شاہجہاں اس کے لیے پھر ایک تاج محل تعمیر کر سکتا تھا۔

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قیامت خیز سراپا کو دیکھا۔ وہ آئینے کی صاف اور چکنی سطح پر ایک خوش رنگ کلی کی طرح کھل رہی تھی اور شراب کی بھری بوتل کی طرح کھل رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کی انگڑائی ٹوٹ گئی۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ اس نے جھینپ کر سر کو جھکا لیا۔ پھر زیر لب مسکراتی ہوئی بولی۔

"میرے دیوتا! میں خوشی سے پاگل ہو گئی تھی۔ یہ بھول گئی تھی کہ میرے دیوتا میرے پاس ہیں اور مجھے سب سے پہلے اپنے دیوتا کے چرنوں میں سر کو جھکانا چاہیے۔"

وہ آگے بڑھی اور میرے قریب آ کر قدموں پر جھکنے لگی۔ میں نے اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر اسے جھکنے سے روک دیا اور کہا۔

"نیکی کرنے اور کسی کے کام آنے والا انسان فرشتہ یا دیوتا ضرور کہلاتا ہے لیکن میرے مذہب میں کسی فرشتے یا دیوتا کو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔ تمہارے کہنے کے مطابق اگر میں دیوتا ہوں تو پھر تم دیوی ہو۔ تم نے عزم و ہمت کی ایک عمدہ مثال قائم کی ہے۔ اگر تم ہمت ہار جاتیں اور کسی مرحلے پر چھمیا سے شکست تسلیم کر لیتیں تو زندگی کے ایک حادثاتی موڑ پر ہماری ملاقات نہ ہو سکتی اور نہ ہی میں تمہارے کام آ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تم نے اپنے حوصلوں سے اپنے حسن و شباب کی کھوئی ہوئی دولت حاصل کی ہے۔ یہ جسم تمہاری جد و جہد کا انعام ہے۔"

"اور یہ انعام تم نے دیا ہے میرے دیوتا!"

"مجھے دیوتا نہ کہو، میرا نام فرہاد ہے۔"

"فرہاد!" اس نے بڑی محبت اور عقیدت سے میرا نام لیا۔ پھر میرے ایک ہاتھ کو اپنے نازک سے ہاتھوں میں لے کر میری ہتھیلی کی پشت کو بوسہ دینے لگی۔ وہ آتشیں لب جو دور ہی دور سے آگ لگاتے تھے، وہ میری ہتھیلی کی پشت پر آگ بھڑکا رہے تھے۔ میرے جسم کے رگ و پے میں آگ سیال مادے کی طرح بہہ رہی تھی۔ میرے جی میں آیا کہ بوسے کے جواب میں ایک بوسہ پیش کروں۔ پھر یہ سوچ کر ضبط کر لیا کہ جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ ابھی وہ مجھ سے متاثر ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ میری شخصیت کا رعب جم رہا تھا۔ ایک دیوتا اور محبوب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ آج وہ دیوتا سمجھ کر عقیدت سے چوم رہی تھی۔ کل محبوب سمجھ کر محبت سے گلے لگ سکتی تھی۔ لہٰذا اس وقت میں نے بڑے صبر و تحمل سے کام لیا۔

میرے صبر کا مجھے اچھا صلہ ملا۔ وہ میرے ہاتھ کو چومتے ہوئے سوچ

رہی تھی "ہائے! اس کے ہاتھ کتنے سخت اور مضبوط ہیں۔ اگر کوئی اس ہتھیلی کے شکنجے میں آ جائے تو تڑپتا یا تڑپتی رہ جائے گی۔ اس میں ہر وہ خوبی ہے جس کے خواب عورت دیکھتی ہے۔ دراز قد، چٹانی سینہ، آہنی بازو، یہ دلیر بھی ہے اور ذہین بھی ہے۔ صحیح معنوں میں یہ ایک مکمل مرد ہے۔ میں تو ایسے ہی ایک خوبرو آئیڈیل کی تلاش میں تھی لیکن میں اپنے اس خیال کا اظہار نہیں کروں گی۔ اپنے منہ سے کچھ کہتے اچھا نہیں لگتا ہے۔ نہیں، اچھا تو لگتا ہے مگر شرم آتی ہے۔ کاش کہ یہ میرے دل کی حالت جان سکتے۔ آں ہاں، میں تو بھول ہی گئی تھی کہ یہ دل کے بھید جان لیتے ہیں۔ جب میں بلی کے روپ میں تھی اور بول نہیں سکتی تھی۔ اس وقت یہ میری سوچ کو پڑھ لیتے تھے۔ میرے گونگے دماغ کو پوری طرح سمجھ لیتے تھے۔ کیا اس وقت بھی یہ میرے خیالات کو سمجھ رہے ہیں؟"

اس نے چونک کر مجھے دیکھنے کے لیے میری ہتھیلی پر سے سر اٹھایا۔ میں مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ پھر جھینپ گئی۔ میں نے آہستگی سے کہا۔

"میں خوش نصیب ہوں کہ تمہارے خیالوں میں بس رہا ہوں۔ اگر ہماری دوستی میں محبت کی مٹھاس اسی طرح گھلتی رہے تو ہماری دوستی پائیدار ہو جائے گی۔"

اس نے فوراً ہی گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ "دیکھئے میں بھی کتنی نادان ہوں۔ اپنا جسم حاصل کرتے ہی چھمیا کی دشمنی کو بھول گئی ہوں۔ کیا آپ ٹیلی پیتھی کے ذریعہ معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ اس وقت کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے؟"

"معلوم کر سکتا ہوں لیکن تم مجھے یک بیک "آپ" سے کیوں مخاطب کرنے لگی ہو؟ کیا "تم" والی بے تکلفی تمہیں پسند نہیں ہے؟"

وہ زیر لب مسکرا کر بولی "تم جیسا کہو گے ویسے ہی کہوں گی پلیز ابھی چھمیا کا پتہ چلاؤ۔"

"اچھی بات ہے۔ میں اس کی خبر لیتا ہوں لیکن جتنی دیر میں، میں مراقبے میں رہوں اس دوران تم ڈریسنگ روم میں جاؤ۔ اس کی الماری سے اپنی پسند کا لباس نکالو۔ اب تم ایک تعلیم یافتہ اور ذہین لڑکی ہو۔ تمہیں اسمارٹ بن کر رہنا چاہیے۔ یہ چولی اور گھاگھرا چھمیا جیسی جاہل عورت پر ہی سجتا تھا۔"

میرے مشورے کے مطابق وہ لباس بدلنے چلی گئی۔ میں تھوڑی دیر تک اس کے تصور میں کھویا رہا اور یقین کرتا رہا کہ کل جس حسینہ کی دلیری اور ذہانت کی داستان سن رہا تھا، آج وہ میرے گھر میں ہے اور میں اس کے دل میں گھر کر رہا ہوں۔

میں سمجھ رہا تھا کہ سامی اس وقت بھی میرے ہی متعلق سوچ رہی ہو گی۔ ایسے رومانس کی گھڑیوں میں بھلا کس کا دل چاہے گا کہ وہ دشمن کے متعلق سوچے؟ میرا دل بھی نہیں چاہتا تھا کہ میں چھمیا کے متعلق سوچوں مجھے خود پر اعتماد تھا کہ میں جب چاہوں گا، اس دشمن عورت کے منصوبوں کو خاک کر دوں گا۔ اسے اتنا موقعہ ہی نہیں دوں گا کہ وہ ہمیں نقصان پہنچا سکے۔

لہٰذا میں سامی کے خیالات پڑھنے لگا۔ اس وقت اس کے دماغ کے اندر ایک کشمکش جاری تھی۔ اس کا دماغ میرے ہی متعلق سوچنا چاہتا تھا لیکن وہ سوچنے سے کترا رہی تھی۔ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی کہ وہ دل کے بھیدی ہیں۔ شاید اس وقت بھی میرے خیالات کو پڑھ رہے ہیں نہیں، میں کچھ نہیں سوچوں گی۔ اف گاڈ! کیسے آدمی سے پالا پڑا ہے۔ میں اپنے دل کی کوئی بات ان سے چھپا نہیں سکوں گی۔"

میں نے اس کی مثبت سوچ میں کہا "ان سے کچھ چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ میرے من مندر کے دیوتا ہیں۔ میں ان سے محبت کرتی ہوں اور محبت کرنے والوں کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔"

اس کی منفی سوچ نے کہا "کبھی کبھی پردہ ضروری ہوتا ہے۔ ہر محبت کرنے والی عورت اپنے محبوب کو جس قدر چاہتی ہے، اس میں سے تھوڑی سی محبت اپنے دل میں چھپا کر رکھتی ہے جس طرح ٹافیوں کے پیکٹ کو الماری میں چھپا کر بچوں کو وقتاً فوقتاً ایک ایک ٹافی دے کر بہلایا جاتا ہے اسی طرح عورت دل کے پیکٹ سے محبت کی ایک ایک ٹافی نکال کر دیتی ہے۔ باقی دوسرے وقت کے لیے بچا کر رکھتی ہے لیکن فرہاد تو ایک نمبر کے جن ہیں۔ دل میں چھپی ہوئی تمام مٹھاس کو چوری چھپے چکھتے رہتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنے خیالات ان سے کیسے چھپاؤں؟ نہ چھپا سکتی ہوں نہ ان کے بارے میں سوچنا چھوڑ سکتی ہوں۔ ایسا نٹ کھٹ کہیں نہ دیکھا جو دماغ کے لاکرز توڑ کر سوچ کا سرمایہ چرا لیتا ہو۔ چور کہیں کے....."

میں نے مثبت انداز میں کہا "لیکن ابھی تو وہ چور نہیں ہیں۔ ابھی تو وہ مراقبے میں ہوں گے اور چھمیا کے متعلق معلومات حاصل کر رہے ہوں گے لہٰذا وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔ یہ اچھا موقعہ ہے۔ مجھے ان کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔"

وہ سوچنے لگی "میں کیا سوچوں؟ میری زندگی بھی عجیب ہے۔ میری ماں ایک ہندو ناری تھی۔ باپ ایک انگریز ہے اور اب میرا دل ایک مسلمان کی طرف کھنچا جا رہا ہے۔ میرے اندر کتنے ہی دھرم سمائے ہیں۔ ایسے میں دھرم کا مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ مذہب صرف محبت سے قائم رہتا ہے مجھے ہندو دھرم سے اس لیے محبت ہے کہ میں نے ایک ہندو ناری کا دودھ پیا ہے۔ مجھے عیسائیت سے اس لیے پیار ہے کہ میری رگوں میں ایک انگریز کا خون دوڑ رہا ہے اور مجھے مذہب اسلام سے اس لیے عقیدت ہوتی جا رہی ہے کہ جسے میں اپنے جسم و جان کا حقدار بنانا چاہتی ہوں، وہ مسلمان ہے۔ میں زندگی کے آخری سانس تک اسی کے ساتھ رہوں گی۔"

یہ سوچتے ہوئے وہ غسل خانے میں جا رہی تھی اور سوچنے کے دوران بولے ہوئے گنگنا رہی تھی۔ میں نے اس سے رابطہ ختم کر دیا۔ جو کچھ مجھے معلوم کرنا تھا میں اس سے بہت زیادہ معلوم کر چکا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس کے دل کے اندر چھپی ہوئی محبت کی ساری مٹھاس کو میں نے چوری چھپے چکھ لیا تھا اور وہ بیچاری اس چوری سے بے خبر تھی۔

اس وقت دل یہی چاہتا تھا کہ اس کے بے باز خیالات کو پڑھتا ہی رہوں اور یہ سلسلہ کبھی نہ ٹوٹے لیکن اس چڑیل چھمیا سے معاملہ نمٹانا بھی ضروری تھا لہٰذا میں اس کے ذہن میں جھانکنے لگا۔

میری پوزیشن کچھ یوں تھی کہ میں قالین پر پیٹھی ملائے بیٹھا تھا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ میں چشم تصور میں غزالہ کو دیکھ رہا تھا اور چھمیا کے خیالات پڑھ رہا تھا۔ وہ جو کچھ بھی سوچ رہی تھی اور اپنے آس پاس کے لوگوں کی جو آوازیں سن رہی تھی وہ سب آوازیں اپنے دماغ کے ٹیپ ریکارڈر سے میرے دماغ تک منتشر کر رہی تھی اور میں اپنے خیال کی اسکرین پر ان تمام واقعات کی مکمل فلم دیکھ رہا تھا جو اس پر گزر رہے تھے۔

وہ بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ بستر کے آس پاس چچا جان اور گھر کے ملازم کھڑے ہوئے تھے۔ قاسم بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ خاموشی سے لیٹی ہوئی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ چچا جان اور قاسم کی گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ غزالہ کی یادداشت گم ہو گئی تھی۔ اس نے قاسم جیسے قریبی دوست کو بھی نہیں پہچانا تھا۔ قاسم نے اس سے انگریزی زبان میں پوچھا تھا کہ اس کی یہ حالت کب سے ہے؟ لیکن وہ انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکی تھی جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی یادداشت اس حد تک ناقص ہو چکی ہے کہ انگریزی زبان بھی بھول گئی ہے۔ اسے طرح طرح سے یاد دلانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس سے ایک کاغذ پر اپنا نام لکھنے کے لیے کہا گیا لیکن وہ نہ تو انگریزی میں لکھ سکی اور نہ ہی اردو زبان میں حتیٰ کہ اپنے دستخط بھی نہ کر سکی۔

وہ بے چارے کیا جانتے تھے کہ انگریزی بولنے اور اسمارٹ بن کر رہنے والی غزالہ کی روح اپنے جسم کے مکان سے بے دخل کر چکی ہے اور اس مکان میں ایک جاہل گنوار چھمیا نے ڈیرا جما لیا ہے اور وہ یادداشت گم ہونے کا ناٹک کھیل رہی ہے۔

اس کا ناٹک حقیقت سے بالکل قریب تھا کیونکہ وہ واقعی غزالہ کی گزری ہوئی زندگی کے حالات سے واقف نہیں تھی۔ چچا جان وغیرہ کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے اور نہ ہی کبھی یہ یقین کر سکتے تھے کہ بیٹی کا جسم وہی ہے اور روح بدل گئی ہے۔ انھوں نے پریشان ہو کر قاسم سے کہا۔

"تم یہاں بیٹھو، میں ڈاکٹر شیرازی سے ملاقات کا وقت مقرر کرتا ہوں۔ وہ ماہر نفسیات ہیں۔ وہ ہی صحیح طور پر سمجھ سکیں گے کہ غزالہ کے ذہن سے پچھلی زندگی کیسے مٹ گئی ہے؟"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی چھمیا نے ملازموں کو بھی وہاں سے جانے کے لیے کہا۔ اس نے قاسم کو تاڑ لیا تھا کہ وہ کام کا آدمی ہے۔ ملازموں کے جانے کے بعد اس نے قاسم سے کہا۔

"میں بہت پریشان ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ کیا سچ مچ تم میرے دوست ہو؟"

"ہاں، یہ تمھارے ڈیڈی بھی کہہ چکے ہیں کہ میں تمھارا دوست ہوں۔ پنڈی کا رہنے والا ہوں۔ میرا نام قاسم ہے۔ ہم دونوں تنہائی میں کتنی ہی رنگین گھڑیاں گزار چکے ہیں۔ میں تمھارے بدن کی خوشبو پہچانتا ہوں یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم مجھے بھی بھول گئی ہو۔ بتاؤ غزالہ! میں تمھارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"کیا واقعی تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟ کیا میں جو کہوں گی وہ کرو گے؟"

"ہاں، تم پہلے بھی مجھے آزما چکی ہو، اب بھی آزما کر دیکھ لو۔ جو کہو گی میں وہی کروں گا۔ بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟"

چھمیا نے جواب دیا "اس ماحول میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں یہاں سے کہیں دور جانا چاہتی ہوں۔ ایسی حالت میں ڈیڈی مجھے کہیں جانے کی اجازت نہیں دیں گے کیونکہ میں یہاں کے راستے بھی بھول چکی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے میں ایک انجانی دنیا اور ایک انجانے گھر میں سانس لے رہی ہوں۔ کیا تم مجھے اس قید خانے سے دور کہیں لے جا سکتے ہو؟"

"میں تمھاری ہر خواہش پوری کر سکتا ہوں۔ تمھارے پاس جتنی رقم اور زیورات ہیں اسے ساتھ لے لو۔ تم مجھے اس شہر سے دور لے جانے کو کہتی ہو، میں تو تمھیں دنیا کے اس سرے سے اُس سرے تک لے جاؤں۔"

چھمیا نے پوچھا "کیا تم جانتے ہو کہ میں نے اپنی رقم اور زیورات کہاں رکھے ہیں؟"

قاسم نے ایک الماری کی جانب انگلی اٹھا کر کہا۔

"ہاں تم اس آہنی الماری سے کئی بار میرے سامنے رقمیں نکالتی رہی ہو۔ اس الماری کی چابی ڈریسنگ ٹیبل کے نچلے دراز میں ہے۔ اسے کھول کر دیکھو شاید تگڑی رقم ہاتھ آ جائے۔"

"اچھی بات ہے۔ ڈیڈی کو باہر جانے دو۔ میں یہاں سے اپنی تمام پونجی سمیٹ کر تمھارے ساتھ چلوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور دل ہی دل میں منصوبے بنانے لگی کہ اس گھر سے نکلنے کے بعد وہ قاسم کو اپنی جوانی سے بہلائے گی اور اسے سرحد پار اپنے ساتھ چلنے پر راضی کرے گی اگر وہ راضی نہ ہوا تو اپنے منتروں سے اسے ایسا ناچ نچائے گی کہ وہ اس کے اشاروں پر چلنے کے لیے مجبور ہو جائے گا۔

یہاں تک اس کے خیالات پڑھنے کے بعد میں نے اس سے رابطہ توڑ دیا۔ اس وقت سامی دروازہ کھول کر اندر آ رہی تھی۔ وہ آئی تو بلو بہاری آئی۔ میں چند لمحوں تک ساکت و جامد ہو کر اسے دیکھتا رہ گیا۔ غسل کرنے کے بعد وہ برسات کی چاندنی کی طرح نکھر گئی تھی۔ خواب گاہ کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے اور ان پر دبیز مخملی پردے پڑے ہوئے تھے اس لیے دن کے باوجود رات کا سماں تھا۔ کچھ اندھیرا تھا، کچھ اجالا تھا اور وہ اجالا بھی سامی کے دم قدم سے تھا۔

اس کے قدم دہلیز پار کرنے کے بعد یوں تھم گئے جیسے دو دھڑکتے ہوئے دلوں کے درمیان وقت تھم جاتا ہے۔ میری شوخ نظروں کی تاب نہ لا کر اس کی نظریں جھک گئی تھیں۔ وہ ٹیلی پیتھی نہیں جانتی تھی۔ میرے

خیالات نہیں پڑھ سکتی تھی تاہم ایسے وقت ہر نوجوان لڑکی اپنے چاہنے والے کی ایک ایک سوچ کو اچھی طرح سمجھتی رہتی ہے۔ وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ میری نگاہیں اس کے وجود کے چپے چپے پر بہک رہی ہیں۔ کہیں ٹھہر رہی ہیں کہیں پھسل رہی ہیں۔ ریشم کے بدن پر ململ کی ساڑھی یوں لپٹی ہوئی تھی جیسے جذبے جذبوں سے لپٹ جاتے ہیں۔ میں ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک قدم اس کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے بازوؤں میں مچل جائے گی کیونکہ میں اس کے چھپے جذبوں کو پڑھ چکا تھا۔ وہ دل ہی دل میں فیصلہ کر چکی تھی کہ مجھے اپنے جسم و جان کا مالک بنائے گی۔ پھر بھی ہمارے درمیان جب دو قدم کا فاصلہ رہ گیا تو میں نے اس کے جذبات کو سمجھنے کے لیے پھر ایک بار اس کے خیال کو پڑھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔

"میں کیا کروں؟ یہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہے ہیں جیسے بھوکا درندہ اپنے شکار کو دیکھتا ہے۔ میں کوئی شکار کی ہوئی چیز تو نہیں ہوں۔ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ یہ رفتہ رفتہ بڑے پیار سے مجھے اپنائیں گے۔ یہ درست ہے کہ مرد اور عورت کی دوستی جس انداز میں بھی شروع ہو، اس کا آخری ہدف بھوک مٹائی جاتی ہے لیکن بھوک کوئی سی ہو، اسے مٹانے کے لیے کچھ ایسے اصول ہوتے ہیں جن پر عمل کر کے پچھتاوا نہیں ہوتا بلکہ مرد اور عورت ایک دوسرے پر ناز کرتے ہیں۔

میں فرہاد کو کیسے سمجھاؤں؟ یہ تو مجھ سے زیادہ ذہین ہیں۔ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ ابھی تو ہماری ملاقات کو چند گھنٹے ہی گزرے ہیں۔ ابھی ہمیں کورٹ شپ کے ذریعہ پیار و محبت سے ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے۔ تاکہ جب ہم سہاگ کی سیج پر آئیں تو ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہ رہیں اور کبھی یہ شکایت کا موقع نہ ملے کہ ہم نے ایک دوسرے کو اچھی طرح نہیں سمجھا تھا۔ انسان اسی طرح بتدریج اپنے تقاضے پورے کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہم میں اور جانوروں میں کیا فرق رہے گا؟

ویسے میں موم کی عورت نہیں ہوں کہ کوئی مرد مجھے میری مرضی کے خلاف اپنے بازوؤں میں پگھلا دے۔ اگر کوئی اور ہوتا تو میں اسے کھلی کا ناچ نچا دیتی لیکن فرہاد سے میں خود کو برتر نہیں سمجھنا چاہتی۔ یہ میرے آئیڈیل بھی ہیں اور میرے دیوتا بھی۔ میں ان کے قدموں میں جھکنا چاہتی ہوں مگر مجھے یہ احساس نہ دلایا جائے کہ مجھے جبراً جھکایا گیا ہے......!"

سامی کے خیالات پڑھ کر میرے قدم رک گئے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں ہر انسان کی سوچ تک پہنچ جاتا ہوں۔ اسی لیے وہ سوچ رہی تھی کہ میں اس کے خیالات کو اچھی طرح سمجھ لوں۔ جو باتیں وہ زبان سے نہیں کر سکتی تھی اسے بڑی خاموشی سے سمجھا رہی تھی۔

اگر کوئی جائز بات ہو تو اسے سمجھ لینا دانشمندی ہے۔ میں اسے تعریفی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی جو مختصر سی ملاقات میں خود کو مقابل کے حوالے کر دیتی ہے۔ اسے زندگی گزارنے اور اپنی حفاظت آپ کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ میں نے اس کی جانب ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"سامی! ہم اچھے دوست ہیں اور اچھے دوست کبھی ایک دوسرے کو شکایت کا موقع نہیں دیتے۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں شرافت کے دائرے میں رہ کر دوستی نبھاتا رہوں گا۔"

وہ خوش ہو گئی۔ اس نے احسان مندی سے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ پھر میرے پھیلے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی۔

"مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میرا انتخاب غلط نہیں ہے۔ میں آپ کی ہوں اور آپ کی ہی رہوں گی مگر ابھی آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں نا؟"

"میں کبھی تم سے ناراض نہیں ہو سکتا۔ آؤ یہاں بیٹھو، میں تمھیں چھمیا کے متعلق بتاتا ہوں۔"

ہم ایک صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھا۔ اس نے مکمل طور پر خود کو میرے حوالے نہیں کیا تھا لیکن اپنے وجود کا ایک ننھا سا حصہ، ایک نازک سا ہاتھ میرے حوالے کر کے یقین دلا رہی تھی کہ وہ میری ہے۔ وہ ملائم ہاتھ محبت کا پیش لفظ ہے۔ اس پیش لفظ کے بعد وہ ورق ورق کھلے گی اور اپنے حسن و شباب کی رنگ بھری داستان سناتی رہے گی۔

فی الحال میں اسے چھمیا کی داستان سنا رہا تھا کہ کس طرح وہ غزالہ کے روپ میں آ کر یادداشت گم ہونے کا ناٹک کھیل رہی ہے اور اب قاسم کے ساتھ فرار ہونے کا منصوبہ بنا چکی ہے۔

سامی نے کہا "وہ جتنی جلدی یہاں سے دور چلی جائے ہمارے لیے اچھا ہے۔ وہ کمبخت قریب رہے گی تو ہم سے انتقام لینے کا موقع ڈھونڈتی رہے گی۔"

"وہ ایسا نہیں کرے گی۔" میں نے سامی کو یقین دلایا "وہ مجھ سے خوفزدہ ہے۔ غزالہ کے روپ میں اسے اس بات کا اندیشہ ہے کہ میں کسی وقت چچا جان سے ملنے آؤں گا تو اپنے گیان سے اسے پہچان لوں گا۔ جب تک اسے کیدار جیسا چیلا نہیں ملے گا، وہ میرا سامنا نہیں کرے گی اور میری موجودگی میں تمھیں بھی کبھی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔"

"ہاں یہ تو میں بھی سمجھتی ہوں کہ تمھارے سائے میں رہ کر مجھے کبھی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اچھا اب ذرا یہ دیکھ لو کہ وہ ابھی تمھارے چچا جان کے ہاں ہے یا وہاں سے جا چکی ہے۔"

میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ جب تک وہ قریب ہے، اس سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔ لہٰذا میں نے آنکھیں بند کر لیں اور چھمیا کی سوچ کی لہروں پر اپنی توجہ مرکوز کرنے لگا۔ وہ جو سوچ رہی تھی اس پر عمل کرتی جا رہی تھی۔ الماری کی تلاشی لینے کے بعد اسے صرف تین ہزار روپے نقد اور زیورات کے دو سیٹ ملے۔ قاسم کہہ رہا تھا۔

"کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ یہ تین ہزار سے کیا بنے گا؟ یہ دو سیٹ فروخت کرنے سے چار ہزار تک مل جائیں گے۔ ٹھیک ہے سب ملا کر سات ہزار ہو جائیں گے۔ میں کسی حد تک سامی کے ساتھ فلیش کھیلوں گا تو

ساتھ کے ستر ہزار بنالوں گا۔ ابھی یہاں سے فوراً نکل چلو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھارے ڈیڈی ڈاکٹر کو لے کر یہاں آجائیں۔"

اس کے بعد چھمیا کی سوچ نے بتایا کہ وہ نقدی اور زیورات ایک ہینڈ بیگ میں سمیٹ کر قاسم کے ساتھ کوٹھی سے باہر آرہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں سڑک پر آگئے۔ چھمیا محتاط نظروں سے میری کوٹھی کی جانب دیکھتی ہوئی دور ہوتی چلی جارہی تھی۔

میں نے آنکھیں کھول دیں اور سامی کو مسکرا کر دیکھنے لگا۔ اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"کیا ہوا؟ چھمیا کہاں ہے؟"

"وہ یہاں سے دور ہوتی جارہی ہے۔" میں نے اسے پوری تفصیل بتائی کہ کس طرح وہ غزالہ کی نقدی اور زیورات لے کر وہاں سے جاچکی ہے سامی نے اطمینان کی سانس لی۔ میں نے کہا۔

"اب دشمن کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اسے بھول جاؤ، اور یہ بتاؤ کہ احمد شیخ اور بھوانی شنکر کی خبر لینے کب چلو گی؟"

وہ جماہی لینے لگی۔ اس کی لانبی پلکیں نیند سے بوجھل ہورہی تھیں اس نے کہا۔

"کل سے سونا نصیب نہیں ہوا۔ اگر ہم تھوڑی سی نیند پوری کرکے منصوبہ بنائیں تو کیا حرج ہے؟"

"کوئی حرج نہیں ہے۔ دماغ کو سکون پہنچانے کے لیے سونا بھی ضروری ہے۔ تم زرینہ کے بیڈ روم میں جاکر سوجاؤ۔ اب شام کو ملاقات ہوگی۔"

سامی وہاں سے اٹھ کر جانا چاہتی تھی۔ اس کا ہاتھ اب تک میرے ہاتھوں میں تھا۔ میں نے کہا۔

"تم نے اپنا جسم حاصل کرنے کے بعد وہاں آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر میرے ہاتھ کو عقیدت سے چوم لیا تھا۔ کیا میں محبت سے نہیں چوم سکتا؟"

اس نے شرما کر گردن جھکالی۔ میں نے جھک کر اس کی ہتھیلی کے گلاب پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور ایک طویل بوسہ لیتے ہوئے اس کی جذباتی سوچ کو پڑھنے کا ارادہ کیا۔ وہ حقیقتاً بہت ہی چالاک تھی۔ اس نے فوراً ہی ہاتھ کھینچ کر کہا۔

"میں سب سمجھتی ہوں۔ تم شرارت سے باز نہیں آؤگے۔ میرے خیالات ضرور پڑھوگے۔ میں تو نہیں پڑھنے دوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ میرے پاس سے اٹھی اور تیزی سے چلتی ہوئی خوابگاہ سے باہر چلی گئی۔ میں مسکرا کر خالی دروازے کو دیکھتا رہا جن اداؤں سے وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر اور میرے پاس سے اٹھ کر لہراتی ہوئی اور بل کھاتی ہوئی گئی تھی وہ ادائیں دیر تک میرے چشم تصور میں جاگتی رہیں۔ پھر میں نے اٹھ کر دروازہ بند کردیا اور اپنے بستر پر آکر لیٹ گیا۔

نرم کے ملائم بیڈ پر ہاتھ پاؤں سیدھے کرتے ہی تھکن غالب آگئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑتا ہوا آیا ہوں اور تھک کر بستر پر گر پڑا ہوں۔ اب سب سے اہم کام یہ تھا کہ میں سوجاؤں۔ اس لیے سوگیا۔

بڑی گہری نیند تھی کوئی خواب نہیں تھا کوئی سوچ نہیں تھی بس لمبی تان کر سوتا رہا۔ پھر میرے حواس بیدار ہونے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ مخروطی انگلیاں ہولے ہولے میرے بالوں میں کنگھی کررہی ہیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے سامی کا سراپا ابھرنے لگا۔ اس کی گنگناتی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"اب اٹھ بھی جاؤ۔ شام ہورہی ہے۔"

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ مجھ پر جھکی ہوئی میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی اور اتنے پیار سے دیکھ رہی تھی جیسے ابھی مجھ پر قربان ہوجائے گی۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ سیدھی ہوکر بیٹھ گئی اور چائے کی پیالی بڑھاتی ہوئی بولی۔

"یہ بیڈ ٹی بھی ہے اور ایوننگ ٹی بھی۔ اسے پی کر باتھ روم میں جاؤ، غسل کرو، لباس تبدیل کرو۔ جب تک میں کھانا تیار کرتی ہوں۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر بولا۔

"کھانا پکانے میں وقت ضائع نہ کرو، ابھی ہم باہر جائیں گے۔ کسی اچھے ریسٹورانٹ میں ڈٹ کر کھائیں گے۔ پھر تم اپنے لیے شاپنگ کروگی۔ تمھارے پاس اپنا لباس اور اپنی ضرورت کی چیزیں ہونی چاہئیں۔ کل صبح ہم بذریعہ کار پنڈی جائیں گے اور سب سے پہلے احمد شیخ کی گردن پکڑیں گے۔"

سامی نے کہا "ابھی میں یہ سوچ رہی تھی کہ تم ہر ایک کے خیالات پڑھ لیتے ہو۔ پھر احمد شیخ اور بھوانی شنکر کے خیالات پڑھ کر کیوں نہیں معلوم کرتے کہ وہ اس وقت کہاں ہیں اور کیا کررہے ہیں؟"

میں نے چائے کی پیالی سے دو گھونٹ پینے کے بعد کہا۔

"ٹیلی پیتھی ایک وسیع علم ہے اور ابھی مجھے اس پر عبور حاصل نہیں ہوا ہے۔ کشف سمعی کے ذریعہ جب ہم اس دنیا میں بکھری ہوئی آوازوں کو سنتے ہیں تو وہ ایک دو آوازیں نہیں ہوتیں بلکہ اس دنیا میں جتنے انسان جانور اور دوسرے جاندار ہیں، سب کی آوازیں فضا میں ٹکراتی اور تحلیل ہوتی رہتی ہیں اور وہ تمام آوازیں گڈمڈ ہوکر ہماری دماغی سماعت سے ٹکراتی رہتی ہیں ان آوازوں کو سننے اور فرداً فرداً سمجھنے کا نام ٹیلی پیتھی ہے۔

آواز پر ریسرچ کرنے والوں کا کہنا ہے کہ اس دنیا میں جتنی آوازیں پیدا ہوتی ہیں وہ پیدا ہونے کے بعد کبھی نہیں مرتیں بلکہ فضاؤں میں تحلیل ہوکر ہواؤں میں جاری وساری رہتی ہیں۔ اس سلسلے میں سائنسدان ایسے آلات تیار کرنے میں کوشاں ہیں جو گزرے ہوئے زمانے کے لوگوں کی آوازیں ٹیپ کرسکیں۔

لیکن ٹیلی پیتھی ان آلات سے زیادہ گہرا علم ہے۔ ہم اس علم کے

ذریعہ آوازوں کا تجزیہ کرتے ہوئے انسانوں کی سوچ تک پہنچ جاتے ہیں۔ تمھاری سطحی معلومات کے لیے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ہر انسان کی سوچ شمال سے جنوب کی طرف بہنے والی مقناطیسی لہروں کی گرفت میں رہتی ہیں ہم ارتکاز توجہ سے انہی مقناطیسی لہروں کے ذریعہ انسانوں کی سوچ تک پہنچ جاتے ہیں۔

اب میں تمھارے سوال کا جواب دیتا ہوں کہ میں احمد شیخ اور بھوانی شنکر کی سوچ تک کیوں نہیں پہنچتا۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لو کہ جیسے ہر انسان کی گفتگو کا لہجہ الگ الگ ہوتا ہے ویسے ہی سوچنے کا انداز بھی الگ ہوتا ہے۔ میں تمھارے لہجے کو سمجھتا ہوں۔ چھمیا کے لہجے کو سمجھتا ہوں اور اپنے آس پاس دیکھے سمجھے ہوئے لوگوں کے بھی لہجے کو پہچانتا ہوں اسی لیے خیال خوانی کے وقت ان کے سوچنے کے انداز کو پہچان کر سمجھ لیتا ہوں کہ وہ سالی ہے یا چھمیا ہے، غزالہ ہے یا چچا جان ہیں۔ احمد شیخ اور بھوانی شنکر سے کبھی میرا سامنا نہیں ہوا۔ میں نہیں جانتا کہ ان کی گفتگو کا انداز کیا ہے۔ پھر ان کے سوچنے کے انداز کو کیسے سمجھ سکتا ہوں؟

میں اپنی معلومات کی حد تک یہ باتیں کہہ رہا ہوں۔ ویسے اس دنیا میں بڑے بڑے عالم موجود ہیں۔ وہ کسی ایسے اجنبی کے خیالات بھی پڑھ لیتے ہیں جسے کبھی دیکھا نہ ہو۔ وہ اس طرح کہ پہلے اس اجنبی کے متعلق معلوم کرتے ہیں کہ وہ کس جگہ ہے؟ کس علاقے میں ہے؟ اور کس مکان کے کس کمرے میں موجود ہے؟ وہ خیال خوانی کے ذریعہ زماں ومکاں کا سفر کرتے ہوئے اس کمرے تک پہنچتے ہیں۔ اس اجنبی کی سوچ کی لہروں کو گرفت میں لے کر اس کا نام پوچھتے ہیں اور اس طرح معلوم کرتے ہیں کہ وہی ان کا مطلوبہ شخص ہے۔

اب میں ایک ہی دن میں تمھیں ٹیلی پیتھی کے متعلق نہیں سمجھا سکتا بس اتنا سمجھ لو کہ میرا علم محدود ہے اور میں احمد شیخ اور بھوانی شنکر کے خیالات اس وقت تک نہیں پڑھ سکتا جب تک کہ ان سے ایک بار آمنا سامنا نہ ہوجائے۔"

سامی نے چائے کی خالی پیالی میرے ہاتھوں سے لیتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھ گئی۔ تم چوری چھپے میرے بھی خیالات پڑھتے رہتے ہو۔ میں تو اب کچھ سوچنے سے پہلے محتاط ہوجاتی ہوں۔ ہر وقت یہ خیال پریشان کرتا ہے کہ تم میرے ایسے جذبوں کو بھی پڑھ رہے ہو جن کا اظہار کرتے ہوئے ہر لڑکی شرماتی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی شرافت ہے؟"

میں نے مسکرا کر جواب دیا "میں تو اپنی دانست میں شریف ہوں۔ تم خواہ مخواہ شبہ کررہی ہو کہ میں ہر وقت تمھارے خیالات پڑھتا رہتا ہوں دراصل کہتے ہیں ناں کہ چور کی داڑھی میں تنکا۔ بس وہی بات ہے۔ تم چوری چھپے میرے متعلق سوچتی رہتی ہو اور سہمی رہتی ہو کہ کہیں میں تمھاری چوری تو نہیں پکڑ رہا ہوں۔"

"ہونہہ، چوری اوپر سے سینہ زوری۔ میں کبھی یقین نہیں کرسکتی کہ تم میرے خیالات نہیں پڑھتے ہو۔"

"اس بے یقینی کا ایک ہی علاج ہے کہ تم مجھ سے چھپ کر سوچا نہ کرو۔ جو سوچنا ہو، اسے میرے سامنے اپنی زبان سے کہہ دیا کرو۔ اس طرح یہ فائدہ ہوگا کہ ہمارے درمیان سے تکلفات کے پردے اٹھ جائیں گے۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "پردے اٹھا دو، بولو کیا سوچ رہی ہو بے تکلفی سے میرے سامنے کہہ دو۔"

اس کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے اس کی سوچ کو پڑھ لیا۔ اس کی سوچ نے بتایا کہ اس کے شانے پر میرا ہاتھ پہنچتے ہی اسے ایک عجیب سا سرور محسوس ہوا تھا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ کر بولی۔

بس رہنے دو۔ میں کچھ نہیں بولوں گی۔ تم اپنی عادت سے باز نہیں آؤگے۔ چور کہیں کے......"

وہ پیالی لے کر کمرے سے چلی گئی۔ میں بستر سے اٹھ کر مسکراتا اور گنگناتا ہوا باتھ روم میں چلا گیا۔

ایک گھنٹے کے بعد جب ہم کوٹھی سے باہر آئے تو میرے جسم پر سرج کا سوٹ تھا اور سامی کی گوری رنگت مہندی رنگ کی ساڑھی میں کھل رہی تھی۔ سیاہ بالوں میں زرد رنگ کا پھول یوں لگ رہا تھا جیسے رات کو سورج طلوع ہورہا ہو۔ کار میں اس کے ساتھ بیٹھتے وقت میں بید مسرور تھا۔ میرے برابر ایک ایسی دوشیزہ بیٹھی ہوئی تھی جو حسن میں یکتا، ذہانت میں بے مثال اور دلیری میں لاجواب تھی۔ میرے متعلق بھی اس کے خیالات کچھ ایسے ہی تھے۔ وہ مجھے اپنا جیون ساتھی مان کر فخر محسوس کررہی تھی۔

میں ڈنر کے لیے دانستہ شبانہ کلب میں پہنچ گیا۔ میرا خیال تھا کہ قاسم چھمیا کے اڑائے ہوئے زیورات کو فروخت کرکے وہاں جوا کھیلنے جائے گا۔ اس کے ساتھ چھمیا بھی غزالہ کے روپ میں موجود ہوگی۔ مجھے دیکھتے ہی وہاں سے بھی بھاگے گی اور گھبرا کر وہ شہر ہی چھوڑ دینے کا فیصلہ کرے گی۔

ہم ڈائننگ ہال میں پہنچے تو کتنی ہی نگاہیں ہماری طرف اٹھ گئیں۔ مجھے تو صرف چند عورتوں نے دیکھا لیکن سامی کو ہال میں بیٹھے ہوئے تمام جوان اور بوڑھے مرد یوں دیکھنے لگے جیسے مدتوں بعد بنارس کے آسمان پر طلوع آفتاب کا منظر دیکھ رہے ہوں۔ ہم دونوں ایک دیوار سے لگی ہوئی میز کے اطراف آکر بیٹھ گئے۔ بیرے نے ہمارے سامنے مینو لاکر رکھا۔ میں نے سامی سے کہا کہ وہ اپنی پسند کا کھانا منگوائے۔ وہ مینو دیکھ کر آرڈر نوٹ کرانے لگی۔ اتنی دیر میں میں نے چھمیا سے دماغی رابطہ قائم کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ قاسم کے ساتھ قمار خانے میں موجود ہوگی لیکن اس کے ذہن سے ریل گاڑی کی کھٹا کھٹ نشر ہورہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس شہر میں نہیں تھی، کہیں ٹرین میں سفر کررہی تھی۔

میں نے چھمیا کی سوچ میں کہا "میں اس دیس میں اجنبی ہوں۔ یہاں کے راستے نہیں جانتی۔ پتہ نہیں یہ ٹرین کہاں لے جائے گی۔"

وہ چونک کر سوچنے لگی "یہ دادا پتہ کیوں نہیں ہے۔ قاسم میرے

ساتھ ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ یہ ٹرین کراچی جاتی ہے۔"

میں نے پھر سوالیہ سوچ بن کر پوچھا۔ "کیا واقعی قاسم سرحد پار کرنے میں میرا ساتھ دے گا یا مجھے کوئی دوسرا ساتھی تلاش کرنا ہوگا؟"

اس کی جوابی سوچ نے کہا۔ "قاسم نے وعدہ کیا ہے کہ ہر مرحلے پر میرا ساتھ دے گا۔ اگر وہ وعدہ نبھاتا ہے تو اچھی بات ہے ورنہ میں اپنے منتروں سے اسے مجبور کردوں گی کہ وہ میرا ساتھ دیتا رہے۔"

میں نے چھیما سے رابطہ توڑ دیا۔ میرا حکم کی تعمیل کے لیے جا چکا تھا میں نے سامی سے کہا۔

"چھیما اس شہر میں نہیں ہے۔ وہ یہاں سے آٹھ سو میل دور کراچی کی طرف جا رہی ہے۔"

"کیا وہ تنہا ہے؟"

"نہیں۔ اس نے راہنمائی کے لیے قاسم کو ساتھ رکھا ہے۔ میرا خیال ہے وہ ایک دو دن میں سرحد پار چلی جائے گی۔"

"اچھا ہے جلد سے جلد چلی جائے۔ اب تو اس کا نام سننے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ اس کمبخت نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔"

"اس سے زیادہ تم نے اسے ہلکان کیا ہے۔ وہ جہاں بھی گئی تم نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ آخر اس نے تنگ آکر تمھارے جسم کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ جب تک تمھارے جسم میں رہے گی، تم اسے کسی مرد کی آغوش میں جانے نہیں دو گی۔ اب وہ آزاد ہے۔ تم سے پیچھا چھوٹ گیا ہے اور اب وہ بڑی فراخدلی سے قاسم کے سامنے غزالہ کی جوانی کا چارا ڈال رہی ہے۔"

"اونہہ! اب اس کا ذکر چھوڑو۔ یہ بتاؤ کیا غزالہ بہت خوبصورت تھی؟"

"ہاں۔ اس لحاظ سے بے حد حسین تھی کہ اسے تمھارے مقابل دیکھا نہیں گیا تھا۔ وہ شمع شب تھی، تم طلوع آفتاب ہو۔"

"تم مجھے خوش کرنے کے لیے تعریفیں نہ کرو۔ میں تو تم سے یہ کہہ رہی تھی کہ غزالہ اتنی حسین تھی۔ تمھاری کزن بھی تھی۔ کیا تم نے اس خوبصورتی کو حاصل نہیں کیا ہوگا؟"

میں نے ایک گہری سانس لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"کورٹ شپ کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ شادی سے پہلے ایک دوسرے کی اگلی پچھلی زندگی کے راز معلوم کیے جائیں۔ تم بھی اس فارمولے پر عمل کر رہی ہو۔"

"کیوں نہیں کروں گی۔ تمھاری اچھائی اور برائی کو سمجھنے کا مجھے پورا حق ہے۔ سچ سچ بتاؤ۔ کتنی چڑیلیں تمھاری زندگی میں آئی ہیں؟"

اس نے جل کر پوچھا تھا۔ میں ہنسنے لگا۔ وہ چاہے جتنی ذہین ہو، بالآخر ایک عورت تھی۔ میرے نام کے ساتھ کسی دوسری لڑکی کا نام برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں اسے جواب دینا چاہتا تھا مگر ویٹر کھانا لے کر آگیا تھا۔ اس نے

پرسلیقے سے کھانا چننے کے بعد جب وہ چلا گیا تو میں نے کہا۔

"اگر تمھیں معلوم ہو جائے کہ میری زندگی میں کون کون آئی تھی تو انھیں مار ڈالو گی؟"

"نہیں۔ انھیں تو معاف کر دوں گی کیونکہ وہ آکر جا چکی ہیں۔ آئندہ اگر کوئی تمھارے قریب آئے گی تو وہ اپنی موت کو آواز دے گی۔ جسم تمھاری تنہائی میں آئے گا تو وہ روح سے خالی ہو جائے گا۔ تم آزما ہی ہو کہ چھیما کی طرح میں ایک جسم سے روح نکالنا اور خود اس کے جسم میں داخل ہونے کے منتر جانتی ہوں۔"

میں اسے شوخ نظروں سے دیکھنے لگا۔ اتنی حسین دوشیزہ ہو تو کوئی بدذوق ہی کسی دوسری حسینہ کی تمنا کرے گا۔ آئندہ میری زندگی میں کوئی دوسری لڑکی آئے گی یا نہیں؟ یہ میں نہیں جانتا تھا لیکن اس وقت میں نے دعوے سے کہا۔

"تمھیں پانے کے بعد اب اور کچھ پانے کی تمنا نہیں ہے۔ ایک خوشگوار زندگی گزارنے کا پہلا اصول یہ ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کا اعتماد حاصل کرنا چاہیے۔ مجھے تم پر اس لیے اعتماد ہے کہ کوئی مجھ سے تمھارا کوئی راز چھپا نہیں رہ سکتا۔ تمھارے بتائے بغیر میں تمھارے رازوں کو پڑھ سکتا ہوں لیکن تمھیں اس وقت تک کچھ نہیں معلوم ہو سکے گا جب تک کہ میں نہ بتاؤں۔ اب تم ہی کہو کہ جو کچھ میں بتایا کروں گا کیا تم اس پر یقین کیا کرو گی؟"

وہ لقمہ چباتی ہوئی بولی۔ "یقین کرنا ہی ہوگا۔ اگر کبھی مجھے شبہ ہوا کہ تم مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو تو میں اپنے طور پر معلومات حاصل کروں گی۔"

"تمھاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم مجھ پر اعتماد نہیں کرو گی۔ بے اعتمادی سہی۔ یہ بھی ایک طرح کا ایڈونچر ہوگا کہ تم میرے متعلق معلومات حاصل کرتی پھرو گی۔"

وہ جواباً مسکرا کر کھانے میں مصروف ہو گئی۔ اس نے میری زندگی میں آنے والی لڑکیوں کے متعلق دوبارہ نہیں پوچھا کیونکہ وہ لڑکیاں گزرے ہوئے وقت کی طرح میری زندگی سے جا چکی تھیں۔ سامی صرف اتنا چاہتی تھی کہ آئندہ کوئی لڑکی اس کی جگہ نہ لے۔

میں نے کھانے کے بعد کافی کا آرڈر دیا اور سامی سے کہا۔

"تم کافی کا انتظار کرو، میں ذرا ٹائلٹ سے ہو کر آتا ہوں۔ یہاں لوگ تمھیں بڑی حسرت سے دیکھ رہے ہیں اور مجھے کباب میں ہڈی سمجھ رہے ہیں۔ میں تمھیں چھوڑ کر جاؤں گا تو انہیں ذرا دیر کے لیے خوشی حاصل ہو گی۔ انسان بڑا خود غرض ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جو چیز اسے حاصل نہ ہو، دوسرا بھی محروم ہو جائے۔"

میری بات پر وہ خاموشی سے مسکرانے لگی۔ میں ٹائلٹ کی طرف جانے لگا۔ کاؤنٹر کے قریب سے گزرتے وقت وہاں کھڑے ہوئے ایک نے ہاتھ اٹھا کر میرا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

"مسٹر! ذرا ٹھہریے۔ میں آپ سے ضروری گفتگو کرنا چاہتا ہوں میرا تعلق یہاں کی انٹیلی جنس سے ہے۔ غالباً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں آپ سے کیا پوچھنا چاہتا ہوں۔"

میں چند لمحوں تک خاموش رہا۔ اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے یہ ظاہر کرتا رہا کہ میں اسے سی آئی ڈی افسر کی حیثیت سے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پھر میں نے کہا۔

"جناب! میں کیسے جان سکتا ہوں کہ آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ آپ تکلف سے کام نہ لیں۔ جو پوچھنا چاہتے ہیں پوچھیں۔ میں ضرور جواب دوں گا۔"

میرے جواب دینے کا انداز ایسا تھا جیسے میں اسے کوئی اہمیت نہیں دے رہا ہوں۔ اس نے ناگواری سے پوچھا۔

"وہ لڑکی جو آپ کے ساتھ ہے، وہ کون ہے؟ کہاں کی رہنے والی ہے؟ اور اس کا نام کیا ہے؟"

اس کے سوالات نے سمجھا دیا کہ سامی کی پوزیشن خطرے میں ہے۔ وہ ایک غیر ملکی کی حیثیت سے پہچانی جا رہی تھی۔ اب مجھے فوراً ہی سامی سے رابطہ قائم کرنا تھا اور سی آئی ڈی افسر کو جواب دینے سے پہلے ذرا دیر کے لیے خاموش رہنا تھا۔ میں نے اپنی خاموشی کا جواز پیش کرنے کے لیے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا لیا اور اسے سلگانے لگا۔ اتنی دیر میں میں نے سامی سے دماغی رابطہ قائم کیا۔

"ہیلو سامی! ہیلو۔ میں فرہاد ہوں اور تم سے خیالی رابطہ قائم کر رہا ہوں۔ تم اسے اپنی سوچ نہ سمجھو۔ یہ فرہاد کی سوچ ہے، تم سمجھ رہی ہو نا۔۔؟"

یہ سوچتے ہوئے میں نے کن انکھیوں سے اس میز کی جانب دیکھا جہاں سامی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ میری دماغی کال پر چونک گئی تھی، اور گھوم کر کاؤنٹر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے سوچ کے ذریعے کہا۔

"ہاں، تمھارے خیالات مجھ تک پہنچ رہے ہیں لیکن تم نظروں کے سامنے ہو کر بھی سوچ کے ذریعے باتیں کیوں کر رہے ہو؟ تمھارے پاس وہ کون شخص ہے؟ کیا وہ ہمارے درمیان دیوار بنا ہوا ہے؟"

"ہاں۔ یہ ایک سی آئی ڈی افسر ہے۔ یہ تمھارے متعلق سوالات کر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان جو گفتگو ہو اسے تم بھی سنتی رہو۔ گفتگو کے دوران میری سوچ کی لہریں تمھارے دماغ تک پہنچتی رہیں گی۔ اب تم توجہ سے سنو کہ میں اپنے مخاطب سے کیا کہہ رہا ہوں۔"

اتنی دیر میں میں نے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ میں نے ایک کش لے کر دھواں چھوڑنے کے بعد کہا۔

"وہ لڑکی جو میرے ساتھ ہے اس وقت میری طرف پلٹ کر دیکھ رہی ہے۔ وہ میری منگیتر ہے۔ اس کا نام سمیعہ ناز ہے۔ چونکہ وہ میری شریک حیات بننے والی ہے۔ اس لیے میں اسے سمیعہ کی بجائے سامی کہہ کر مخاطب کرتا ہوں۔"

"آپ مس سمیعہ ناز کا پتہ بتائیے؟"

میں نے اپنی کوٹھی کا پتہ بتا کر کہا۔ "وہ میرے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کا کوئی نہیں ہے۔ مشرقی پاکستان میں ان کا چھوٹا سا خاندان تھا۔ ماں باپ اور ایک چھوٹی بہن۔ حالیہ سیلاب میں وہ لاپتہ ہو گئے ہیں۔ سامی اپنے ماموں کے ہاں پناہ لینے یہاں لاہور آگئیں۔ جس کوٹھی کا پتہ ابھی میں نے بتایا ہے وہاں ان کے ماموں کرایہ دار کی حیثیت سے رہتے تھے۔ جب سامی یہاں پہنچیں تو ان کے ماموں وہ کوٹھی چھوڑ کر جا چکے تھے اور میں وہاں اب کرایہ دار کی حیثیت سے رہتا ہوں۔ سامی وہاں آئیں تو میں انھیں بتا نہ سکا کہ ان کے ماموں وہ کوٹھی چھوڑ کر یا یہ شہر چھوڑ کر کہاں چلے گئے ہیں۔ یہ تنہا اور بے یار و مددگار تھیں۔ اس لیے میں نے اپنے ہاں پناہ دے دی۔ ہم بہت جلد ایک دوسرے سے گھل مل گئے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کے مزاج کو اتنی اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ اب کچھ دنوں میں ہماری شادی ہو جائے گی۔ جناب! اتنی باتیں میں نے بتا دیں۔ اب آپ بتا دیجئے کہ آپ خصوصاً سامی کے متعلق کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ جسے آپ سمیعہ ناز کہہ رہے ہیں، وہ دراصل سلمیٰ قادر ہے۔ آج سے چھ دن پہلے یہ پنڈی میں تھی۔ اسے احمد شیخ نامی ایک شخص کی کوٹھی میں دیکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی ملک کے دشمن تھے، وہ سب فرار ہو گئے ہیں۔ ہم انھیں تلاش کر رہے ہیں آج اتفاق سے یہ محترمہ نظر آگئی ہیں۔ آپ میرے ساتھ منیجر کے کمرہ تک چلیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ دونوں دور سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہیں اور مخصوص اشاروں سے ایک دوسرے کو کچھ سمجھاتے رہیں۔ آئیے۔"

میں اس کے ساتھ جانے پر مجبور ہو گیا۔ منیجر کے کمرے میں پہنچنے تک ہم خاموش رہے۔ اس خاموشی کے دوران میں نے سامی کو بتا دیا کہ میں منیجر کے کمرے میں جا رہا ہوں، وہ اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھی رہے۔ کوئی خاص بات ہوگی تو میں سوچ کے ذریعہ اس سے رابطہ قائم کر لوں گا۔

منیجر کے کمرے میں ایک ادھیڑ عمر کا شخص ریوالونگ چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی منیجر کو کمرے سے باہر جانے کے لیے کہا۔ اس کے جانے کے بعد میرے ساتھ آنے والے شخص نے ادھیڑ عمر کے آدمی کو "سر" کہہ کر مخاطب کیا اور اسے بتانے لگا کہ میں نے سامی کے متعلق کیا بیان دیا ہے۔

وہ ادھیڑ عمر کا آدمی انسپکٹر تھا اور میرے ساتھ آنے والا اس کا اسسٹنٹ تھا۔ انسپکٹر نے اس کی تمام باتیں سننے کے بعد مجھ سے کہا۔

"تم آٹھ بجے اس کلب میں سلمیٰ قادر کے ساتھ آئے ہو۔ اس وقت نو بج رہے ہیں۔ اس ایک گھنٹے میں ہم نے تمھاری کار کے نمبر کے ذریعہ تمھاری

متعلق جو معلومات حاصل کی ہیں، وہ یہ ہیں کہ تمھارا نام فرہاد علی تیمور ہے۔ کوٹھی کا پتہ وہی ہے جو تم نے میرے اسسٹنٹ کو بتایا ہے۔ ہمارے آدمیوں نے آس پاس کی کوٹھیوں میں تمھارے متعلق مزید معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ سامنے والی کوٹھی میں تمھارے چچا رہتے ہیں۔ تمھارے چچا ناصر علی نے بتایا ہے کہ تم تین دن سے لاپتہ ہو۔ تمھارے ساتھ تمھاری پھوپھی اور ان کی جوان لڑکی رہتی ہے۔ آج تمام دن وہ بھی نظر نہیں آئیں۔ سچ سچ بتاؤ کہ وہ دونوں کہاں ہیں اور تم تین دن سے کہاں غائب تھے؟"

"میں اپنی کوٹھی میں تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ سامی سے نئی نئی ملاقات ہے۔ میں اس کے ساتھ کوٹھی میں وقت گزار رہا تھا۔ میں نے اپنی پھوپھی سے کہہ دیا تھا کہ کوئی بھی رشتے دار مجھے پوچھنے آئے تو کہہ دیں کہ میں موجود نہیں ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ چچا جان نے مجھے تین دن سے نہیں دیکھا ہے اور نہ ہی وہ سامی کے متعلق کچھ جانتے ہیں۔ میری پھوپھی اور ان کی صاحبزادی آج صبح شاہ کوٹ گئی ہیں۔ کل تک واپس آجائیں گی۔ ویسے آپ سامی پر خواہ مخواہ شبہ کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ سلمیٰ قادر کسی حد تک اس کی ہمشکل ہو لیکن یہ سلمیٰ قادر نہیں ہے۔"

"یو شٹ اپ!" انسپکٹر نے زور سے میز پر ہاتھ مارا۔ اسی وقت تمام بتیاں بجھ گئیں۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ میں نے کہا۔

"آپ نے تو ہاتھ مار کر تمام بتیاں بجھا دیں۔ اب مجھے جانے دیجیے سامی تنہا ہے۔"

"خبردار! اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور ہے۔" اسسٹنٹ انسپکٹر نے گرج کر کہا۔ پھر اس کے بائیں ہاتھ میں ایک لائٹر روشن ہو گیا۔ اس کی روشنی میں ریوالور نظر آرہا تھا۔

اتنے میں ڈائننگ ہال کی طرف سے سامی کی چیخ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ میں اچھل کر کھڑا ہو گیا اور جھلا کر کہنے لگا۔

"یہ آپ لوگوں کی زیادتی ہے۔ آپ یہاں آرام سے بیٹھے ہیں اور وہاں میری منگیتر پر مصیبت آئی ہوئی ہے۔"

انسپکٹر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "تم بھی آرام سے بیٹھو۔ ہمارے آدمی سلمیٰ قادر کی نگرانی کر رہے ہیں۔ نہ تو وہ فرار ہو سکے گی اور نہ ہی کوئی زبردستی اسے بھگا کر لے جا سکے گا۔"

میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور سر جھکا کر سامی کی سوچ کو پڑھنے لگا۔ وہ سوچ رہی تھی۔

"کیا بات ہے، فرہاد خاموش کیوں ہیں۔ میں نے اسی لیے چیخ ماری ہے کہ وہ آواز سن کر مجھ سے رابطہ قائم کریں۔ مگر وہ ابھی تک خاموش ہیں......"

"میں خاموش ہوں مگر تمھیں سن رہا ہوں۔ تم بتاؤ کہ فائرنگ تم سے کتنی دور ہو رہی ہے؟ اس وقت تم کہاں ہو؟"

اس کی سوچ نے کہا۔ "اس وقت میں تین آدمیوں کے نرغے میں ہوں۔ ان میں سے ایک آدمی کو میں نے پہچان لیا ہے، وہ کھیوانی کا ماتحت ہے۔ وہ ریوالور کی زد پر جبراً مجھے کلب سے باہر لے جا رہا ہے۔ اس کے دو ساتھی میرے آگے ہیں اور فائرنگ کرتے ہوئے میرے لیے راستہ صاف کرتے جا رہے ہیں۔

اب وہ دوڑتے ہوئے اور مجھے کھینچتے ہوئے کلب کے کمپاؤنڈ میں آگئے ہیں۔ دوسری طرف سے بھی محتاط انداز میں فائرنگ ہو رہی ہے۔ شاید وہ انٹیلیجنس کے آدمی ہیں اور ہمیں زندہ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ ایک کار کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر مجھے جبراً بٹھایا جا رہا ہے۔ تم جانتے ہو کہ کوئی مجھ پر جبر نہیں کر سکتا۔ اس کہ مجھے موت کا ڈر نہیں ہے اگر وہ مجھے شوٹ کریں گے تو میں کسی دوسری لڑکی کے جسم میں پناہ لے لوں گی اور پھر ایک نئی زندگی شروع کروں گی۔ لیکن تم میری یہ مجبوری بھی جانتے ہو کہ میں اپنے موجودہ جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی۔ مجھے اپنے ظاہری وجود سے کتنی محبت ہے یہ تم جانتے ہو۔ ان کے ساتھ جانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ میں ان کے ذریعے شنکر تک پہنچ جاؤں گی۔ میرے وہاں تک پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ تم بھی مجھ سے دماغی رابطہ قائم کرکے کھیوانی شنکر کی گردن پکڑنے آجاؤ گے۔ ہمارا پروگرام بھی یہی تھا۔ اب اس کے آدمی خود ہی ہماری رہنمائی کر رہے ہیں۔ تم بتاؤ کیا میرے سوچنے کا انداز درست ہے؟"

"تم واقعی ذہین ہو سامی! دشمنوں کو راہنمائی کرنے دو۔ میرا دماغ ہمیشہ تمھارے ساتھ رہے گا۔ میں تمھارے پیچھے آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ راستوں کو پہچانتی جاؤ، تاکہ بعد میں میری راہنمائی کر سکو۔ میں تھوڑی دیر بعد پھر تم سے رابطہ قائم کروں گا۔"

یہ کہہ کر میں نے اس سے رابطہ توڑ لیا۔ اسی وقت تاریکی دور ہو گئی۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ انسپکٹر بدستور ریوالونگ چیئر پر بیٹھا ہوا تھا اور اسسٹنٹ میری طرف ریوالور تانے کھڑا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور انسپکٹر کے سامنے اٹینشن ہو کر کہنے لگا۔

"سر! وہ لوگ لے گئے۔ انھوں نے مین سوئچ آف کر دیا پھر وہ فائرنگ کرنے لگے۔ ہم ان کی طرح تاریکی میں اندھا دھند فائرنگ نہیں کر سکے کیونکہ دوسرے بے گناہ لوگ جو گھبرا کر ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے گولیوں کا نشانہ بن جاتے۔ پھر بھی ہمارے دو آدمی جیپ لے کر گئے ہیں، ان کی کار کا پیچھا کر رہے ہیں۔"

"بہت کمال کر رہے ہیں۔" انسپکٹر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "ہمارے آدمی اُن کا راستہ نہ روک سکے۔ اتنی تلاش کے بعد وہ لڑکی نظر آئی تھی۔ اسے بھی وہ لے گئے۔ تم سب ناکارہ ہو۔ اگر وہ ہاتھ نہ آئی تو میں سب کو ڈسمس کردوں گا۔"

پھر وہ اپنے اسسٹنٹ کو ہدایتیں دینے لگا کہ وہ ٹرانسمیٹر کے ذریعے

ان سے رابطہ قائم کرے جو سلمیٰ قادر اور اس کے ساتھیوں کا پیچھا کر رہے ہیں۔ میں تدبیریں سوچنے لگا کہ کس طرح ان لوگوں سے نجات حاصل کرکے سامی تک پہنچنا چاہیے۔ مشکل یہ تھی کہ میں انٹیلیجنس والوں کو کوئی نقصان پہنچا کر وہاں سے فرار نہیں ہونا چاہتا تھا کیونکہ وہ میرے ہی ملک کی سلامتی کے لیے پریشانیاں اٹھا رہے تھے۔ میں ان پر یہ بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں ٹیلی پیتھی کے ذریعہ دشمنوں تک پہنچ سکتا ہوں۔ ایسے علوم کو جہاں تک ممکن ہو، ایک راز کی طرح سینے میں چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ اسے عام طور سے تماشہ نہیں بنایا جاتا۔

اس وقت کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی تو میں نے سامی سے رابطہ قائم کیا۔ وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "ہیلو سامی! اس وقت تم کہاں سے گزر رہی ہو؟"

"او فرہاد! تم اتنی دیر کے لیے غائب نہ ہو جایا کرو۔ میں یہاں کے راستوں کو نہیں پہچانتی ہوں۔ اس وقت ہم ایک راؤنڈ اباؤٹ کو کراس کر رہے ہیں۔ اس گول چکر کے وسط میں ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ کا ہورڈنگ نصب ہے۔ ایک جیپ کار بہت دیر سے اس گاڑی کا پیچھا کر رہی ہے اور یہ اسے ڈاج دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

وہ سوچ رہی تھی۔ میں سن رہا تھا۔ اس دوران اس کے پاس بیٹھے شخص کی آواز سامی کے دماغ سے ٹکرائی اور میں نے اسے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو۔ یہ اس طرح باہر دیکھ رہی ہے جیسے راستہ پہچان رہی ہو۔ اگر کسی طرح یہ پھر بچ کر نکل گئی تو اپنے کسی یار کو ہمارے اڈے تک لے آئے گی۔"

دوسرے نے کہا۔ "اس کا باپ بھی بچ کر نہیں جائے گا، مگر آنکھوں پر پٹی ضرور باندھنا چاہیے۔"

سامی کی سوچ نے کہا۔ "فرہاد! یہ لوگ میری آنکھوں پر پٹی باندھنا چاہتے ہیں، اب کیا ہوگا؟ میں ان راستوں کی نشاندہی کیسے کروں گی؟"

میں تھوڑی دیر کے لیے گڑبڑا گیا۔ سامی کی آنکھیں بند ہونے کا مطلب یہ تھا کہ وہ وقتی طور پر اندھی ہو جاتی اور مجھے اس منزل کا پتہ نہ بتا سکتی، جہاں اسے لے جایا جا رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ وہ فکر نہ کرے میں کوئی تدبیر سوچ رہا ہوں۔

میں نے اسے تسلی دے دی مگر خود پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ میرے آس پاس انٹیلیجنس کے آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ اسسٹنٹ انسپکٹر ٹرانسمیٹر کے ذریعہ باتیں کر رہا تھا اور انسپکٹر کو بتاتا جا رہا تھا کہ ان کے آدمی کن راستوں سے گزرتے ہوئے دشمنوں کا پیچھا کر رہے ہیں۔ لیکن دس منٹ کے بعد اس نے مایوس کن اطلاع دی کہ جیپ میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے اور وہ ملتان روڈ کے کنارے رک گئے ہیں۔

انسپکٹر غصے سے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور میز پر ہاتھ مار کر اپنے ماتحتوں کو برا بھلا کہنے لگا۔ پہلے چند منٹ تک میں بھی مایوس ہو گیا تھا۔ سامی سے سوچ کا رابطہ تھا مگر اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی اس لیے وہ میری راہنمائی نہیں کر سکتی تھی۔ چند منٹ کے بعد میں نے ذہن سے ساری پریشانیاں نکال دیں۔ سامی کی طرف سے بے فکر ہو گیا اور اپنے دماغ کو پُرسکون بنا لیا کیونکہ اس کے بغیر توجہ کی یکسوئی ممکن نہیں تھی۔ پھر میں پوری توجہ سے اپنی صلاحیتوں کے متعلق سوچنے لگا۔ میری خیال خوانی کی صلاحیتیں یہ تھیں کہ میں کسی کا چہرہ دیکھ کر اس کی آنکھوں کے ذریعہ اس کی سوچ تک پہنچ سکتا تھا کیونکہ ہر انسان کی آنکھیں اس کی سوچ کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں آنکھیں انسان کی دلی حالات کی چغلی کھاتی ہیں لیکن میں نے ان تین افراد کے چہرے اور آنکھیں نہیں دیکھی تھیں جو سامی کو لیے جا رہے تھے۔ وہ سب میرے لیے مکمل اجنبی تھے۔ میں ان اجنبیوں سے آنکھوں کے ذریعہ رابطہ قائم نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی سوچ تک پہنچ کر انھیں کنٹرول کرنے کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ میں ان کی گفتگو کسی طرح سنتا۔ ان کی گفتگو کے انداز سے ان کے سوچنے کا انداز معلوم ہو جاتا۔ اس طرح میرے دماغ کی لہریں ان کی سوچ کو اپنی گرفت میں لے لیتیں۔

ایسا سوچتے وقت میرے ذہن میں یہ تدبیر آئی کہ جس کار میں سامی بیٹھی ہے۔ اس کے کار ڈرائیور سے ذہنی رشتہ جوڑنا چاہیے۔ میں نے فوراً ہی سامی کو مخاطب کیا۔

"ہیلو سامی! جو شخص کار ڈرائیو کر رہا ہے تم اس سے باتیں کرو خواہ کیسی ہی بے تکی باتیں ہوں۔ تم فوراً اسے گفتگو پر مجبور کر دو۔"

سامی نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ وہ کہنے لگی۔ "سنو! جو شخص یہ کار ڈرائیو کر رہا ہے۔ میں اس سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"کہو، کیا بات ہے؟" کسی نے سامی سے کہا۔ اس کی آواز سامی کے ذہن سے ٹکرائی اور میں اسے سننے لگا۔

سامی نے کہا۔ "میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"جہنم میں۔"

"جہنم کتنی دور ہے؟"

"جتنی بھی دور ہو۔ اب کوئی ہمارا راستہ نہیں روکے گا۔ تم اطمینان سے بیٹھی رہو۔"

"اطمینان سے کیسے بیٹھوں۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھی گئی ہے۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ چپ چاپ بیٹھی رہو۔"

سامی اسے چھیڑ چھیڑ کر باتیں کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس دوران میں نے ڈرائیو کرنے والے کی سوچ کو اپنی گرفت میں لے لیا اور سامی سے کہا کہ وہ خاموش ہو جائے۔ اس کے خاموش ہوتے ہی کار ڈرائیور خیالی پلاؤ پکانے لگا۔

"ہائے! یہ کمبخت کتنی حسین ہے۔ اسے دیکھتے ہی رال ٹپکنے لگتی

ہے۔ مگر باس کا حکم ہے کہ اسے چھیڑا نہ جائے اور نہ ہی اسے یہ بتایا جائے کہ اسے کہاں لے جا رہے ہیں۔"

میں نے اس کی مثبت سوچ میں کہا "ہاں، مجھے اس حسینہ کے متعلق سوچنے کی بجائے اپنے آگے پیچھے کا خیال رکھنا چاہیئے کہ آگے ہمیں کہاں تک جانا ہے اور پیچھے بھی دیکھتے رہنا چاہیئے کہ کوئی ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہا ہے؟"

اس کے دماغ نے حکم دیا کہ وہ عقب نما آئینے میں دیکھے۔ اس نے آئینے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

"نہیں کوئی پیچھا نہیں کر رہا ہے۔ پیچھا کرنے والی جیپ ملتان روڈ پر ہی رک گئی تھی۔ میں راستہ بدل کر قصور والی سڑک پر آ گیا ہوں دراصل ہمیں اسی سڑک پر جانا ہے۔ انھیں محض دھوکہ دینے کے لیے میں ملتان روڈ پر گاڑی دوڑا رہا تھا اب ان کے فرشتے بھی یہ سوچ نہیں سکتے کہ ہم قصور کے بارڈر کی طرف جا رہے ہیں۔"

میں نے اس سے رابطہ توڑ دیا۔ میری پریشانیاں بڑھ گئیں۔ وہ بارڈر کی طرف جا رہے تھے یعنی سامی کو سرحد پار لے جا رہے تھے۔ میں اس کی دوری کے خیال سے تلملا گیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو انسپکٹر ہاتھ میں ٹرانسمیٹر لیے کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ ملتان روڈ اور دوسری برانچ روڈ پر ناکہ بندی کا حکم دے رہا تھا۔

میں نے کہا "جناب! میں آپ کی راہنمائی کر سکتا ہوں کہ وہ میری سامی کو کہاں لے جا رہے ہیں۔"

"ہوں" انسپکٹر نے ٹرانسمیٹر آف کرتے ہوئے غرا کر کہا "اتنی دیر سے تم خاموش بیٹھے تھے۔ اب سچ بتاؤ گے۔ کیا پہلے ہی ان کے منصوبوں کے متعلق ہمیں نہیں بتا سکتے تھے؟"

"اگر مجھے ان کے منصوبوں کا علم ہوتا تو میں ضرور بتا دیتا۔ میں اپنے ملک کا وفادار ہوں۔ دوسرے یہ کہ سامی میری زندگی ہے۔ میں کبھی یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی مجھ سے میری زندگی چھین کر لے جائے۔ بہرحال میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں آپ لوگوں کی راہنمائی کس طرح کر سکتا ہوں۔ جناب! میرے سونگھنے کی حس بہت تیز ہے۔ ایک بار جس سے سامنا ہو جاتا ہے میں اس کے جسم کی مخصوص مہک سے آشنا ہو جاتا ہوں۔ اس وقت بھی تقریباً تیس میل دور سے سامی کی خوشبو میرے نتھنوں تک آ رہی ہے اور میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ ابھی قصور والی سڑک پر ہے اور وہ لوگ اسے بارڈر کی طرف لے جا رہے ہیں۔"

"کیا تم ہمیں احمق سمجھتے ہو؟" انسپکٹر نے کہا "کیا کسی انسان کے سونگھنے کی حس اتنی تیز ہو سکتی ہے کہ وہ سونگھ کر اس کے جانے کی سمت کا تعین کرے اور یہ بھی بتا دے کہ وہ کس مقام پر ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم بھی ان کے آدمی ہو۔ تم ان کے پروگرام سے پہلے ہی واقف تھے۔ اگر تم اس بات کا اقرار کرو گے تو مجرم بن جاؤ گے اس لئے محض سامی کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں ان کے پروگرام کے متعلق احمقانہ انداز میں بتا رہے ہو۔"

میں نے کہا "آپ یقین کریں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں ابھی یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ میرے سونگھنے کی حس کتنی تیز ہے۔ آپ اپنے کسی آدمی کو کمرے سے باہر بھیج دیجئے۔ وہ باہر کہیں بھی جائے گا۔ میں آپ کو یہاں بیٹھے بیٹھے بتاتا رہوں گا کہ وہ کہاں کہاں سے گزر رہا ہے۔"

ان کی دانست میں میں نے عجیب و غریب دعویٰ کیا تھا۔ انسپکٹر نے اپنے ایک آدمی سے کہا کہ وہ باہر چلا جائے اور پانچ منٹ تک کہیں وقت گزار کر چلا آئے۔ وہ آدمی جانے لگا۔ میں نے اس سے کہا۔

"ذرا ٹھہر جاؤ۔ میں ایک بار تمہیں قریب سے سونگھنا چاہتا ہوں۔"

وہ رک گیا۔ میں نے اس کے سامنے آ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ دراصل میں اس کی آنکھوں کے ذریعہ اس کی سوچ تک پہنچ رہا تھا۔ میں اس کے چاروں طرف یوں گھوم رہا تھا جیسے اس کے جسم کی مہک کو پہچان رہا ہوں۔ پھر میں نے اسے جانے کے لئے کہا۔ میں نے اس کی سوچ کو پڑھ لیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں مجھے کہہ رہا تھا کہ تمہارے اچھے بھی نہیں بتا سکیں گے کہ میں پانچ منٹ کہاں گزار کر آؤں گا۔

میں اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ وہ باہر جا چکا تھا۔ انسان کہیں بھی جانے کے لئے قدم اٹھاتا ہے تو وہ صرف آنکھوں سے دیکھ کر نہیں چلتا بلکہ قدرتی نظام یہ ہے کہ دماغ راہنمائی کرتا ہے کہ دائیں مڑ جاؤ، بائیں گھوم جاؤ۔ فلاں جگہ سے گزرتے جاؤ۔ اس کا دماغ بھی اسے کہہ رہا تھا اور میں اسے سمجھ رہا تھا۔

میں نے انسپکٹر سے کہا "اب میں آپ کے آدمی کے متعلق بتا رہا ہوں۔ اسے غور سے سنیئے۔ وہ اس وقت ڈائننگ ہال سے گزر رہا ہے اور ٹائلٹ کی طرف جا رہا ہے۔ ٹائلٹ کے دروازے پر پہنچ کر اس کے جسم کی مہک رک گئی ہے۔ نہ ادھر جا رہی ہے نہ ادھر جا رہی ہے۔ اسے جلد ہی وہاں سے ہٹ جانا چاہیئے کیونکہ ٹائلٹ کی بدبو اس کے جسم کی بو سے گڈمڈ ہو رہی ہے۔ ہاں اب وہ آگے بڑھ گیا ہے اور پاؤڈر روم کے دروازے پر آ گیا ہے۔ پاؤڈر روم میں شاید کچھ عورتیں اپنا میک اپ درست کر رہی ہیں۔ اسنو، کریم، پاؤڈر اور مختلف سینٹ کی خوشبوئیں اس آدمی کے جسم کی مہک سے لپٹ رہی ہیں۔ اب وہ وہاں سے واپس آ رہا ہے۔ وہ پھر ڈائننگ ہال میں آ گیا ہے۔ اس کی خوشبو مشرق کی طرف جا رہی ہے۔ ڈائننگ ہال کے مشرقی حصے میں بار کاؤنٹر ہے اس کے بدن کی مہک کاؤنٹر کے پاس رک گئی ہے۔۔۔"

میں ذرا دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ وہ آدمی کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہو کر میرے متعلق سوچ رہا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ اس کے جسم کی مہک کو پہچان سکتا ہوں لیکن یہ نہیں جان سکتا کہ وہ کاؤنٹر کے پاس کیا کر رہا ہے۔ اگر وہ اس ڈھائی منٹ میں ایک پیگ نوش کرے تو مجھے اس کا علم نہیں ہو گا اور اس کے افسر کو بھی معلوم نہیں ہو گا کہ اس

ہمت نے ڈیوٹی کے دوران شراب چکھی ہے۔ یہ سوچ کر اس نے کاؤنٹر سے ایک وہسکی کا پیگ لیا تھا اور اسے ایک ہی سانس میں ختم کر رہا تھا۔

میں نے انسپکٹر سے کہا "اس وقت اس آدمی کے جسم کی مہک کے ساتھ وہسکی کی مہک آ رہی ہے۔ اب وہ دونوں مہک آپس میں گڈمڈ ہو رہی ہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا آدمی وہسکی پی رہا ہے شاید وہ بقیہ ڈھائی منٹ وہیں گزارنا چاہتا ہے۔"

میرے کہنے کے مطابق وہ ڈھائی منٹ ختم ہونے سے چند سیکنڈ پہلے واپس آنے لگا۔ میں نے انسپکٹر سے کہہ دیا کہ اب اس کے جسم کی مہک واپس آ رہی ہے۔ میری رپورٹ ختم ہونے کے چند لمحے بعد وہ کمرے میں آ گیا اور انسپکٹر کے سامنے اٹینشن ہو گیا۔ انسپکٹر نے اس سے کہا کہ وہ پانچ منٹ کہاں اور کس طرح گزار کر آیا ہے اس کی پوری رپورٹ پیش کرے۔

اس نے وہی رپورٹ پیش کی جو میں پہلے ہی کر چکا تھا۔ اس کی باتیں سن کر انسپکٹر اور اس کے تمام ماتحت مجھے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے سب کچھ بتایا تھا۔ صرف وہسکی پینے والی بات چھپائی تھی لیکن جب انسپکٹر نے اس کا منہ سونگھنے کے لئے کہا تو میری بات کی تصدیق ہو گئی۔ وہ سب میری اس صلاحیت سے بے حد متاثر نظر آ رہے تھے۔ میں نے انسپکٹر سے پوچھا۔

"کیا اب بھی آپ یقین نہیں کریں گے کہ میں سامی کی خوشبو سونگھ کر دشمنوں تک آپ کی راہنمائی کر سکتا ہوں؟"

انسپکٹر نے سر ہلا کر کہا "ہاں، اب مجھے یقین آ گیا ہے لیکن میں تم پر مکمل اعتماد نہیں کر سکتا۔ میں تمہارے ساتھ وہاں تک چلوں گا۔ جہاں وہ سلمیٰ قادر کو لے گئے ہیں مگر ہمارے آس پاس مسلح افراد کا حفاظتی دستہ ہو گا اگر تمہاری طرف سے دھوکہ ہوا تو اسی وقت تمہیں شوٹ کر دیا جائیگا۔"

یہ کہہ کر اس نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ مجھے اپنی نگرانی میں باہر لے کر آئیں۔ ان کے ساتھ چلتے وقت میں نے سامی سے رابطہ قائم کیا۔

"ہیلو سامی! میں آ رہا ہوں۔ تم اپنی پوزیشن بتاؤ۔"

وہ بتانے لگی "میری آنکھوں سے پٹی ہٹا دی گئی ہے۔ اس وقت میں ایک کمرے میں ہوں۔ وہ لوگ کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر کے اسی مکان کے کسی کمرے میں موجود ہیں۔ کبھی کبھی ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کمرے کی دیواروں کا پلستر اکھڑا ہوا ہے۔ باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی ٹوٹی ہوئی ہے لیکن یہ دوسری منزل پر ہے۔ یہاں سے چھلانگ لگا کر فرار ہونا ممکن نہیں ہے۔ کھڑکی کے باہر چاندنی رات میں چاروں طرف جنگل نظر آ رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہاری رہنمائی کیسے کروں۔ میں خود نہیں جانتی کہ میں کہاں ہوں۔"

میں نے کہا "تم بے فکر رہو۔ میں اس شخص کے ذریعہ وہاں پہنچ رہا ہوں گا جو کار ڈرائیو کرتا ہوا تمہیں وہاں تک لے گیا ہے۔ اچھا اطمینان رکھو۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔"

اس دوران میں شبانہ کلب سے باہر آ کر ان لوگوں کے ساتھ کار میں بیٹھ رہا تھا۔ انسپکٹر وہاں پہلے سے موجود تھا اور ٹرانسمیٹر کے ذریعہ کسی کو ہدایتیں دے رہا تھا۔ جب کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھنے لگی تو میں نے اطمینان سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر اس ڈرائیور سے رابطہ قائم کیا جو سامی کو لے گیا تھا۔ اس کی سوچ نے بتایا کہ وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ جنگل کی ایک پگڈنڈی سے گزر رہا ہے۔ وہ جنگل سے گزرنے والے اس راستے کی طرف جا رہے تھے جہاں ان کی کار کھڑی ہوئی تھی۔

میں نے ان کی سوچ میں کہا "جنگل سے گزرتے وقت سمتوں کا تعین کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ کیا اس وقت میں سمجھ سکتا ہوں کہ پورب کدھر ہے اور پچھم کدھر ہے؟"

وہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا اس کے ساتھی نے پوچھا "تم کیا دیکھ رہے ہو؟"

اس نے جواباً پوچھا "کیا تم بتا سکتے ہو کہ پورب پچھم اور اتر دکھن کہاں ہیں؟"

اس کے ساتھی نے جواب دیا "جس مکان سے ہم آ رہے ہیں وہ پورب کی طرف ہے اور جس سڑک پر کار کھڑی ہوئی ہے۔ اس طرف پچھم ہے۔ تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا پھر کبھی آنے کی ضرورت پڑی تو تم راستہ بھول جاؤ گے؟"

"ہاں سمت معلوم کرنا اچھی بات ہے۔"

وہ مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو گیا تھا۔ مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ راستے کے کس طرف وہ مکان ہے۔ جہاں سامی کو قید کیا گیا تھا۔ میں نے کار سے باہر دیکھا۔ کار قصور جانے والی سڑک پر تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ ہمارے آگے ایک وین تھی اور پیچھے ایک جیپ آ رہی تھی۔

ان دونوں گاڑیوں میں مسلح سپاہی تھے۔ انسپکٹر سے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ سیدھے اس راستے پر تیزی سے چلتے رہیں اگر راستہ بدلنا ہو گا تو میں خود ان سے کہہ دوں گا۔ اس وقت تک مجھے خاموش رہنے کا موقعہ دیا جائے تاکہ میں سامی کی بو کو مسلسل پہچانتے ہوئے ان کی صحیح راہنمائی کر سکوں۔ اسی لئے انسپکٹر میری خاموشی کے دوران میری سوچ میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔

میں نے خیال خوانی کے علم کو ان سے چھپایا تھا۔ چھپانے کی وجہ یہ تھی کہ انٹیلیجنس کا کوئی بھی افسر یہ پسند نہ کرتا۔۔ کہ میں خیال خوانی کے ذریعہ اس ڈیپارٹمنٹ کے بہت سے رازوں تک پہنچ جاؤں۔ حالانکہ میں نے ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ میرے ملک کا چھوٹے سے چھوٹا راز بھی مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ میں نے اپنی حکومت

کے کسی شعبہ میں نہ کبھی جھانکنے کی کوشش کی تھی اور نہ آئندہ اس کا ارادہ تھا لیکن میں انٹیلیجنس والوں کو اپنی دیانتداری کا یقین نہیں دلا سکتا تھا۔ اس لئے میں نے خیال خوانی کی صلاحیتوں کو چھپا لیا اور ان کے سامنے یہی ظاہر کیا کہ میں کسی انسان کے جسم کی بو سونگھ کر اس کا پیچھا کر سکتا ہوں۔

اور اب میں انہیں اس طرح سمجھاتا ہوا سامی تک لے جا رہا تھا۔ میں نے پھر اس ڈرائیور سے رابطہ قائم کیا۔ وہ سڑک پر آ گیا تھا۔ اور اپنے ساتھی کے ساتھ کار میں بیٹھ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ کار اسی جگہ رہنی چاہیئے تاکہ اسے دیکھ کر میں اپنی منزل کو پہچان سکوں۔ جب وہ کار اسٹارٹ کر کے واپسی کے لئے موڑنے لگا تو میں نے اس کی سوچ میں بار بار چیخ کر کہا "ریورس گیر۔ ریورس گیر۔۔۔"

کار ڈرائیو کرنے والے اپنی سوچ کے خلاف گاڑی نہیں چلا سکتے۔ جو دماغی سوچ کہتی ہے۔ اس کے مطابق ہاتھ پاؤں عمل کرتے ہیں لہٰذا وہ ریورس گیر میں بے اختیار یوں ڈرائیو کرتا گیا کہ پیچھے ایک درخت سے گاڑی ٹکرا گئی۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" اس کے ساتھی نے بگڑ کر کہا۔

"آں۔!" وہ سر پکڑ کر سوچنے لگا کہ اسے کیا ہو گیا تھا۔ میں نے اسے سوچنے کا موقعہ نہیں دیا۔ اس کی سوچ میں جوشیلے انداز میں کہا۔

"مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ یہ اسپورٹ مین اسپرٹ ہے اگر میں ایکسیلیٹر پر پورا دباؤ ڈال کر ایک جھٹکے سے کار کو دوبارہ سڑک پر لے آؤں تو ایسے وقت اسٹیئرنگ کو قابو میں رکھنے کے لئے بڑی حاضر دماغی کی ضرورت ہو گی۔ ابھی میں ثابت کر سکتا ہوں کہ میں حاضر دماغ ہوں۔ یہ۔ یہ میں نے ایکسیلیٹر پر دباؤ۔۔۔۔"

سوچتے سوچتے اس نے ایک جھٹکے سے کار کی رفتار بڑھائی اس کی نگاہوں کے سامنے جو کچھ ہو رہا تھا۔ میں اسے اس کے ذہن سے دیکھ رہا تھا۔ کار جھٹکا کھا کر سڑک پر آئی تھی۔ اس کی حاضر دماغی میرے کنٹرول میں تھی۔ اس لئے وہ اسٹیئرنگ کو قابو میں نہ رکھ سکا پھر دوسرے ہی لمحے ایک دھماکہ ہوا۔ کار آگے جا کر دوسرے درخت سے ٹکرا گئی تھی مجھے اس کے ساتھی کی چیخ سنائی دی پھر خاموشی چھا گئی۔ صرف کار ڈرائیو کرنے والے کی دھیمی دھیمی کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔

ذرا دیر بعد اس کے کراہتے ہوئے ذہن سے دوسرے لوگوں کی آوازیں ٹکرانے لگیں۔ وہ آوازیں اس کے قریب آ رہی تھیں۔ ویران جنگل میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ ان کی مدد کے لئے وہاں دوسرے لوگ پہنچ جائیں گے۔ وہ شاید ان کے ہی آدمی تھے۔ کار کے درخت سے ٹکرانے کی آواز دور تک گونجی ہو گی جس مکان میں سامی قید تھی۔ اس مکان سے لوگ ان کی مدد کے لئے آئے ہوں گے۔

میں کار کی پچھلی سیٹ پر خاموش بیٹھا خیال کی اسکرین پر یہ ہنگامے دیکھ رہا تھا۔ کار تیز رفتاری سے اس منزل کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے انسپکٹر نے مجھ سے پوچھا۔

"تم اتنی دیر سے خاموش ہو کہیں کسی غلط راستے پر نہیں لے جا رہے ہو؟"

"نہیں۔ میں صحیح منزل کی طرف رہنمائی کر رہا ہوں"

"ہوں" اس نے عادت کے مطابق غرا کر کہا "اگرچہ تم ثابت کر چکے ہو کہ کسی انسان کی بو سونگھ کر اس کا پیچھا کر سکتے پھر بھی یقین نہیں آ رہا ہے۔ ایسی صلاحیت میں نے آج تک کسی انسان میں نہیں دیکھی۔ بہرحال میں پھر ایک بار وارننگ دے رہا ہوں کہ ہم سے فریب کرو گے تو تمہارا انجام تمہاری توقع سے زیادہ بھیانک ہو گا"

"آپ خواہ مخواہ دھمکیاں دے رہے ہیں۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ مجھے اپنی منگیتر سامی تک ہر حال میں پہنچنا ہے۔ میں اسے دشمنوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑوں گا۔ ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو یقین آ جائے گا کہ میں کسی دشمن ملک کا ایجنٹ نہیں ہوں بلکہ اس ملک کا وفادار ہوں۔ اب آپ پھر مجھے خاموش رہنے کا موقعہ دیں"

انسپکٹر خاموش ہو کر باہر دیکھنے لگا۔ میں نے پھر اس ڈرائیور سے دماغی رابطہ قائم کیا۔ کار کے درخت سے ٹکرانے کے باعث وہ صرف زخمی ہوا تھا اگر وہ ہلاک ہو جاتا یا بیہوش ہو جاتا تو اس کا دماغ بھی تاریکی میں ڈوب جاتا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ ہوش میں تھا اور اپنے دماغ سے دوسروں کی آوازیں مجھ تک نشر کر رہا تھا۔ ان کی باتیں سن کر اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ وہ سب اس کے ساتھی تھے اور اسی مکان سے دوڑتے ہوئے آئے تھے جہاں سامی قید کی گئی تھی۔

کچھ دیر بعد آگے جانے والی گاڑی ہماری کار کے برابر آ گئی۔ وین کی کھڑکی سے اسسٹنٹ انسپکٹر نے جھانک کر کہا۔

"سر۔ آگے بہت دور ایک کار نظر آ رہی ہے۔ اس کے آس پاس جو لوگ تھے۔ ہماری گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹس دیکھ کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں سوچ سمجھ کر آگے بڑھنا چاہیئے"

میں سمجھ گیا کہ وہی گاڑی ہے اور اس گاڑی کے قریب آنے والے مجرم احتیاطاً درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گئے ہیں۔ ان سے محتاط رہنا چاہیئے۔ شاید وہ ہمیں گھیرنے کی کوشش کریں گے۔

انسپکٹر نے مسلح جوانوں کو حکم دیا کہ وہ چاروں طرف پھیل جائیں۔ پھر فائرنگ کرتے ہوئے اس کار کے گرد گھیرا تنگ کر دیں جو درخت سے ٹکرائے کھڑی ہے۔ اس کے حکم سنتے ہی مسلح جوان گاڑیوں سے نکل کر درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے مورچے بنانے لگے۔ اسی وقت دوسری طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔

میں بھی کار کا دروازہ کھول کر زمین پر رینگتے ہوئے اس مکان

تک پہنچنا چاہتا تھا لیکن انسپکٹر نے ریوالور نکال کر کہا۔

"خبردار۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے میرے ساتھ ساتھ رہو گے۔ چلو جلدی سے دروازہ کھولو اور جھک کر دوڑتے ہوئے اس جھاڑی کے پیچھے چلے جاؤ میں تمہارے پیچھے رہوں گا اگر تم بھاگنے کی کوشش کرو گے تو میں شوٹ کر دوں گا"

میں نے بے بسی سے ریوالور کی جانب دیکھا پھر اس کے حکم کے مطابق دروازہ کھول کر دوڑتا ہوا ایک جھاڑی کے پیچھے آ گیا۔ انسپکٹر بھی ہاتھ میں ریوالور لئے میرا پیچھا کرتا رہا۔ میں بڑی کشمکش میں گرفتار ہو گیا تھا۔ مجھے سامی تک پہنچنے کی جلدی تھی اور انسپکٹر کے فرائض کا بھی خیال تھا کہ وہ جو سلوک میرے ساتھ کر رہا ہے۔ وہ عین قانون کے مطابق ہے ورنہ کوئی دوسرا ہوتا تو میں سامی تک پہنچنے کے لئے اس سے لپٹ پڑتا۔ اس کا ریوالور چھین لیتا اگر ہاتھا پائی میں کامیابی نہ ہوتی تو میں ٹیلی پیتھی کے ذریعہ اس کے دماغ میں کھلبلی مچا دیتا مگر افسوس جو شخص میری سامی تک مجھے جانے سے روک رہا تھا۔ وہ محب وطن تھا۔ قانون کا محافظ تھا اور ملک کی بھلائی کے لئے میرے راستے کی رکاوٹ بنا ہوا تھا

میں نے صبر کیا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر سامی سے رابطہ قائم کیا۔ اس وقت ہمارے آس پاس دور دور تک فائرنگ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ میں نے سامی کے دماغ پر دستک دے کر کہا کہ وہ فکر نہ کرے۔ میں بالکل قریب پہنچ گیا ہوں اور اس مکان سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر ہوں۔

سامی کی سوچ نے جواباً کہا "فرہاد! جلدی آؤ۔ ایک شخص میرے کمرے میں آیا ہے اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کمرے سے باہر لے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے جلدی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟"

میری سوچ نے کہا "وہ لوگ فائرنگ کی آواز سن کر خطرے کو سمجھ گئے ہیں۔ اس لئے تمہیں اس مکان سے دور کسی دوسرے اڈے کی طرف لے جا رہے ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہارے آس پاس کتنے آدمی ہیں؟"

"صرف ایک شخص ہے جو میرا ہاتھ پکڑے مجھے کھینچے لئے جا رہا ہے۔ میں اسے مخاطب کر رہی ہوں لیکن یہ کچھ بولتا ہی نہیں ہے دیکھو، سنو کہیں یہ گونگا تو نہیں ہے؟"

اس شخص کی آواز سامی کے ذہن سے ٹکرا کر مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ وہ ہانپنے کے انداز میں "ہوں ہوں ہاں ہاں" کی آوازیں نکال رہا تھا۔ میرے لئے ایک نئی الجھن پیدا ہو گئی۔ میں کسی گونگے کے خیال تک نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ نہ تو میں نے اسے دیکھا تھا اور نہ ہی اس کے سوچنے کے انداز کو سمجھتا تھا۔ اب تک میں اسی خیال میں تھا کہ جو سامی سے مخاطب ہو کر باتیں کرے گا۔ میں اس انجانے شخص کے دماغ تک پہنچ جایا کروں گا جیسا کہ اس ڈرائیور تک پہنچ گیا تھا اور اس کی کار کو ایک درخت سے ٹکرا دیا تھا۔

لیکن وہ گونگا میرے لئے ایک چیلنج بن گیا۔ میں اس کے دماغ تک پہنچ کر اسے ذہنی طور پر مفلوج نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے پھر بے بسی سے انسپکٹر کی جانب دیکھا۔ وہ ریوالور دکھا کر مجھے آگے بڑھنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ میں زمین پر اوندھے منہ لیٹ کر رینگنے لگا۔ ذرا دور جا کر میں نے مکان کی طرف اپنا رخ کیا۔ انسپکٹر نے ڈانٹ کر کہا۔

"رک جاؤ۔ دائیں طرف آگے بڑھو"

میں نے جھلا کر سر گھماتے ہوئے انسپکٹر کو دیکھا۔ وہ میرے اور سامی کے درمیان دیوار بن گیا تھا۔ اس وقت وہ بھی مجھ سے ذرا فاصلے پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا اور ریوالور والا ہاتھ اٹھائے مجھے گولی مار دینے کی دھمکی دے رہا تھا۔ اتنے میں اچانک ہی قریب سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ انسپکٹر کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ میں گولی لگی تھی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر گر پڑا تھا۔ میں فوراً ہی پلٹ گیا اور زمین پر لوٹتا ہوا ریوالور تک پہنچ گیا۔ اس وقت پھر ایک فائر ہوا لیکن اتنی دیر میں میں ریوالور اٹھا کر دوسری طرف لوٹتا چلا گیا تھا۔ ایک جگہ رک کر میں نے اس سمت دو فائر جھونک دیئے جہاں سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ میری بے تکی نشانے بازی کام آ گئی۔ میں نے ایک دشمن کو چیخ کر گرتے اور زمین پر تڑپتے دیکھا۔ دوسری طرف انسپکٹر اپنا زخمی ہاتھ پکڑے کراہ رہا تھا۔

"انسپکٹر صاحب!" میں نے کہا "زخمی ہاتھ کی مرہم پٹی کے لئے آپ اپنے کسی ماتحت کو آوازیں دیجئے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے سامی کی مہک مجھ سے دور ہو رہی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے مجھ سے دور لے جا رہے ہیں۔ میں انہیں یہ موقعہ نہیں دوں گا کہ وہ میری سامی کو مجھ سے چھین کر لے جائیں۔ اچھا میں جا رہا ہوں بہت جلد واپس آ کر یہ ثابت کر دوں گا کہ میں اپنے ملک کا وفادار ہوں"

یہ کہہ کر میں اس مکان کی طرف بڑھنے لگا۔ ساتھ ہی سامی سے بھی رابطہ قائم کیا۔ وہ سوچ رہی تھی۔

"نہ جانے فرہاد اب کتنی دیر میں رابطہ قائم کریں گے۔ بہرحال مجھے سوچتے رہنا چاہیئے۔ اس وقت یہ گونگا مجھے مکان کے پچھلے دروازے سے باہر لے آیا ہے اور مجھے اپنے کاندھے پر لاد کر ایک سمت بھاگا جا رہا ہے"

میں کبھی رینگ رہا تھا کبھی گھٹنوں کے بل تیزی سے چل رہا تھا اور کبھی جھک کر دوڑتے ہوئے مکان کی طرف جا رہا تھا۔ فائرنگ کی آواز سن کر میں پھر زمین پر گر پڑتا تھا۔ اس وقت مجھ پر دیوانگی طاری تھی۔ میری روح حیات مجھ سے چھینی جا رہی تھی۔ اس لئے میں

فائرنگ کے باوجود بار بار اٹھ کر بھاگ رہا تھا۔
میں نے سامی کو بتایا کہ اب میں مکان کے بالکل قریب پہنچ گیا ہوں۔ وہ مجھے بتائے کہ گونگا اسے کس سمت لئے جا رہا ہے۔
اس کی سوچ نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کہاں لئے جا رہا ہے۔ چاروں طرف درخت ہی درخت نظر آ رہے ہیں۔ کسی خاص سمت کا تعین کرنا مشکل ہے۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں۔ بس اتنا یاد ہے کہ مکان کے پچھلے دروازے سے یہ گونگا سیدھا بھاگتا ہوا جا رہا ہے۔ اب تک دائیں بائیں نہیں مڑا ہے تم بھی سیدھے چلے آؤ۔"
میں اس کی ہدایت کے مطابق سیدھا دوڑتا چلا گیا۔ فائرنگ کرنے والوں سے میں اتنی دور نکل آیا تھا کہ اب مجھے ان کی طرف سے خطرہ نہیں تھا۔ ریوالور یا رائفل کی گولیاں مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھیں بہت دور نکل آنے کے بعد میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ مکان نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ آگے پیچھے درخت ہی درخت نظر آ رہے تھے ان درختوں کے سائے میں چاندنی دم توڑ چکی تھی اور سائے اندھیرا پھیلا رہے تھے۔ دور تک سامی اور گونگے کا نام ونشان نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ سامی کو چیخنے کا مشورہ دینا چاہیے تاکہ اس کی آواز سے سمت کا تعین کیا جا سکے پھر خیال آیا کہ رات کے سناٹے میں اس کی آواز چاروں طرف گونجے گی جنگل خاموش ہے۔ اس کی آواز کو یہ جنگل بازگشت کی طرح چاروں طرف سے اچھالتا رہے گا بہتر یہ ہے کہ میں کچھ دور تک اور دوڑتا چلا جاؤں اگر سامی نظر نہیں آئے گی تو میں کوئی دوسری تدبیر سوچوں گا۔
تھوڑی دور تک دوڑتے رہنے کے بعد میں اچانک ہی ٹھٹھک کر رک گیا۔ جنگل کی خاموشی میں مشینی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ آواز بتدریج تیز ہوتی جا رہی تھی۔ فوراً ہی سمجھ میں آ گیا کہ وہ ہیلی کوپٹر کی آواز ہے کیونکہ اس کے پنکھے کی گردش کے باعث جو تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ اس کے ہلکے ہلکے جھونکے مجھ تک آ رہے تھے اور آس پاس درختوں کی پتیاں جھوم رہی تھیں۔
میں نے ہوا کے رخ سے اندازہ لگایا کہ ہیلی کوپٹر کس سمت ہے۔ میں اسی سمت تیزی سے دوڑنے لگا۔ کتنے ہی درختوں کو پیچھے چھوڑنے کے بعد میں پھر ایک بار ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا میری نگاہوں کے سامنے ایک وسیع میدان تھا۔ دور بہت دور اس میدان میں وہ اپنے کاندھے پر سامی کو اٹھائے ہیلی کوپٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ رہا تھا۔
میں آناً فاناً وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس لئے میں نے ہوائی فائر کیا تاکہ وہ ذرا دیر کے لئے ٹھٹھک جائیں۔ میں نے دوڑ لگاتے ہوئے دیکھا۔ میری فائرنگ کا ان پر اثر نہیں ہوا تھا۔ ونڈ اسکرین کے پٹ نے انہیں ڈھانپ لیا تھا اور ہیلی کوپٹر قدرے ڈگمگاتا ہوا زمین سے بلند ہو رہا تھا۔
"سامی۔!" میں دوڑتے ہوئے چیخنے لگا لیکن میں جتنی تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ وہ اتنی ہی تیزی سے بلند ہوتا جا رہا تھا۔ سامی مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔ ہائے ری میری بے بسی۔ آہ میری سامی! میں نے گھاس پر لیٹے ہی لیٹے ہانپتے ہوئے حسرت سے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ میرے اور میری سامی کے درمیان زمین و آسمان کا فاصلہ قائم ہوتا جا رہا تھا۔

میں شبنم آلود گھاس پر چاروں شانے چت لیٹا ہوا تھا۔ میں زمین کی پستی میں تھا اور سامی آسمان کی بلندی پر اور بلند ہوتی جا رہی تھی۔ چاندنی روشنی میں ہیلی کوپٹر صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے ریوالور والا ہاتھ اٹھا دیا۔ وہ اب بھی شوٹنگ رینج میں تھا۔ میں فائرنگ کر کے اسے گرا سکتا تھا۔
"سامی!" میں نے سوچ کے ذریعے کہا "میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں فائر کر رہا ہوں۔ ابھی ہیلی کوپٹر کو نیچے گرا دوں گا۔"
"نہیں فرہاد! ایسا نہ کرنا۔" اس کی سہمی ہوئی سوچ نے کہا "ہیلی کوپٹر اتنی بلندی سے گرے گا تو اس کے ساتھ میرا جسم بھی برباد ہو جائے گا۔"
"تم اپنے جسم کو چھوڑ دو۔ فی الحال اپنی روح کو کسی دوسرے جسم میں منتقل کر دو۔ اس طرح تم پھر میرے پاس آ جاؤ گی۔ مجھے تمہارے جسم سے نہیں، تمہاری روح سے محبت ہے۔ میں تم سے جدا ہو کر سکون سے نہیں رہ سکوں گا۔"
"نہیں فرہاد! تمہیں میری قسم ہے گولی نہ چلانا۔ میں اس ہیلی کوپٹر کے ساتھ اپنے جسم کو برباد نہیں ہونے دوں گی۔ تم کچھ عرصے کی جدائی برداشت کر لو۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے اپنے جسم کو حاصل کرنے کے لیے کتنی مصیبتوں کا سامنا کیا ہے۔ میں اس جسم کی حفاظت کے لیے اب بھی بڑے بڑے صدمے سہہ سکتی ہوں، تمہاری جدائی برداشت کر سکتی ہوں، لیکن اس جسم سے علیحدہ نہیں ہو سکتی.....!"
اس کی باتیں سن کر میرے دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔ میں اسے اتنی شدت سے چاہتا تھا کہ اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا تھا اور وہ ایسے برداشت کر رہی تھی جیسے اس کے جسم کے سامنے میری کوئی اہمیت نہ ہو۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ وہ میری خاطر اپنے جسم کی قربانی نہیں دے سکتی تھی۔
میں نے ریوالور والا ہاتھ نیچے گرا دیا۔ وہ مجھے اچھا سبق دے کر جا رہی تھی کہ انسان سب سے زیادہ اپنی ذات سے محبت کرتا ہے اس کے بعد کسی دوسرے کی چاہت دل میں رکھتا ہے۔ میں خواہ مخواہ اپنی جان سے زیادہ سامی کو اہمیت دے رہا تھا۔
میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ جس طرح سامی کو اپنا جسم عزیز ہے اسی طرح مجھے بھی اپنے مقاصد عزیز ہوں گے۔ میرا پہلا مقصد یہی تھا کہ میں

جوانی شنک سے انتقام لوں۔ میں اسے ایسا سبق سکھانا چاہتا تھا کہ اس کا انجام دیکھ کر پھر اس کے ملک کا کوئی سیکرٹ ایجنٹ ادھر کا رخ نہ کرتا۔
میں نے آخری بار حسرت سے ہیلی کوپٹر کی جانب دیکھا۔ چاندنی رات میں وہ نگاہوں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ اس کی دھیمی دھیمی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ اگرچہ مجھے سامی کے ضدی فیصلے پر غصہ آ رہا تھا، اس کے باوجود میں اس سے اس قدر ناراض نہیں ہو سکتا تھا کہ اسے بالکل ہی فراموش کر دیتا۔ وہ دماغ سے مٹنے والی ہستی نہیں تھی۔
میں نے چپکے سے اس کی سوچ کو پڑھنا چاہا لیکن نہ پڑھ سکا۔
اسی وقت رات کے سناٹے میں بہت سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے دور درختوں کی جانب دیکھا تھوڑی دیر بعد چند مسلح جوان نظر آئے۔ وہ بہت دور تھے پھر بھی میں نے انھیں پہچان لیا۔ وہ پولیس کے جوان تھے انھوں نے بھی دور سے مجھے دیکھ لیا تھا لیکن شاید پہچان نہیں سکے تھے اس لیے رائفلیں اٹھائے مجھے نشانے پر رکھتے ہوئے میری طرف بڑھتے آ رہے تھے۔ میں نے چیخ کر کہا۔
"میرا نام فرہاد ہے۔ میں وہی ہوں جس نے یہاں تک تمہاری رہنمائی کی ہے۔"
اسسٹنٹ انسپکٹر کی آواز سنائی دی "تمہارے پاس انسپکٹر صاحب کا ریوالور ہے، اسے ہماری طرف پھینک دو۔"
میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ریوالور کو پوری قوت سے ان کی طرف پھینک دیا۔ اسسٹنٹ انسپکٹر نے اسے اٹھا لیا۔ پھر وہ سب میرے قریب آ گئے۔ اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔
"کہاں ہے تمہاری سامی؟"
میں نے جواب دیا "مجھے افسوس ہے وہ لوگ اسے لے گئے۔ اگر آپ کے انسپکٹر صاحب میرا راستہ نہ روکتے تو میں سامی کو بھی روک لیتا اور دشمنوں کو بھی فرار ہونے کا موقعہ نہ دیتا۔"
اس نے کہا "بہرحال جو کچھ بھی ہوا اس پر بعد میں بحث ہو گی۔ ابھی تم خود کو زیر حراست سمجھو۔ اب چلو یہاں سے.....!"
میں ان کے درمیان سر جھکا کر چلنے لگا۔ راستے میں وہ مکان نظر آیا جہاں سامی کو قید کیا گیا تھا۔ اب وہ مکان سامی کے وجود سے خالی تھا۔ مجھے پھر اس کی یاد ستانے لگی۔ ہم سب خاموشی سے چل رہے تھے اس خاموشی سے فائدہ اٹھا کر میں سامی کے خیالات پڑھنے لگا۔
وہ سوچ رہی تھی "میں اتنی دیر سے فرہاد کو اپنے خیالوں میں پکار رہی ہوں مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے، وہ ناراض ہو گئے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں انھیں کیسے مناؤں؟ جب تک وہ مجھ سے رابطہ قائم نہیں کریں گے اس وقت تک میں انھیں سمجھا نہیں سکوں گی کہ میں نے کس طرح مجبور ہو کر ان کی جدائی برداشت کی ہے۔"
"سامی!" میں نے اسے مخاطب کیا "تم اپنی مجبوریاں کیا سمجھاؤ گی، میں خوب سمجھتا ہوں کہ تم اپنے شاہکار جسم کی پوجا کرتی ہو۔ اس جسم کی خاطر تم اپنے ڈیڈی کے ساتھ نہیں گئیں، پھپا کا پیچھا کرتی رہیں۔ اس جسم کی خاطر تم نے میرے پیار کو بھی اہمیت نہیں دی اور مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو۔"
"نہیں فرہاد! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہارا پیار میری زندگی ہے میں دھرتی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاؤں، تب بھی مجھے تمہارے جیسا جیون ساتھی نہیں ملے گا۔ تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میں صرف تمہارے لیے اپنے جسم کی حفاظت کر رہی ہوں۔ جس حسن و شباب کو لوگ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں، اسے میں تمہارے لیے سنبھال کر رکھا ہے۔ میرا یہ جسم تمہاری امانت ہے۔"
اس کے اس اعتراف سے میں پگھل گیا لیکن دوسرے لمحے میں نے خود سے سوال کیا۔ کیا میں سامی کے محض جسم سے محبت کرتا ہوں؟ اگر وہ موجودہ جسم نہ ہو کوئی دوسرا جسم ہو تو کیا محبت ختم ہو جائے گی؟
میں نے سامی سے یہی سوال دوسرے انداز میں کیا "سامی! اگر میں اپنے موجودہ جسم میں نہ رہوں اور کسی دوسرے جسم میں تمہارے پاس آؤں تو کیا اس دوسرے جسم سے تم محبت کرو گی؟"
"کیوں نہیں؟ ضرور محبت کروں گی۔ میرے دیوتا کسی روپ میں آئیں میں ان سے اسی طرح دل وجان سے محبت کروں گی۔"
"یہی تو میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں کہ تم بھی اپنے موجودہ جسم کا لالچ نہ دو۔ تم کسی بھی روپ میں آؤ گی تو میں دل وجان سے تمہیں قبول کروں گا۔"
"تم کیسی باتیں کر رہے ہو فرہاد! میں بچپن سے اپنے اس جسم میں پروان چڑھتی آئی ہوں۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، تب سے ورزش کے ذریعے اور اچھی خوراک کے ذریعے اس جسم کو بنایا ہے اور سنوارا ہے۔ میری روح اور میرے جسم کی رفاقت میں برسوں کی ہے۔ میں اتنی پرانی رفاقت کو کیسے بھول سکتی ہوں؟"
میں نے جواب دیا "لڑکیاں جوان ہو کر اپنے میکے کے ہر فرد کی رفاقت کو بھول جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ جان نچھاور کرنے والے والدین کو بھی چھوڑ کر سسرال چلی جاتی ہیں اور یہ سب کچھ وہ ایک مرد کی خاطر کرتی ہیں لیکن تم نے میری خاطر اپنے جسم کو چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔ سنو سامی! تم بچپن سے اپنے جسم میں پروان چڑھتی آئی ہو اور میں بچپن سے اپنے وطن کی آغوش میں پروان چڑھ رہا ہوں۔ جس طرح تمہیں اپنے جسم سے محبت ہے اسی طرح مجھے اپنے وطن سے پیار ہے۔ اگر مجھے اپنے وطن کی خاطر تمہارے دیس کی طرف جانا پڑا تو وہاں ہماری ملاقات ہو جائے گی ورنہ میں اپنی پاک زمین کو چھوڑ کر ایسی محبت کے لیے بھٹکنا گوارا نہیں کروں گا، جو صرف جسم کے لیے ہوتی ہے، روح سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"

"ایسی دل توڑنے والی باتیں نہ کرو فرہاد!"

"یہ کھوکھلی باتیں نہیں ہیں، ایک اٹل فیصلہ ہے۔ تمھیں تمھارا جسم مبارک ہو، مجھے اپنا وطن عزیز ہے۔ خدا حافظ!"

"ٹھہرو فرہاد! مجھ سے یوں ناتا نہ توڑو۔ ہم ایک اچھے دوست کی طرح جُدا ہوئے ہیں اور بہت جلد ایک اچھے دوست کی طرح ملیں گے۔"

"ہاں۔ اگر تقدیر نے ملایا تو ضرور ملیں گے۔ اس وقت تک کے لیے خدا حافظ!"

یہ کہہ کر میں نے ایک نامعلوم مدت کے لیے اس سے رابطہ ختم کر دیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ اب بھی مجھے خیالوں میں پکار رہی ہوگی لیکن میں نے دل پر جبر کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے اپنی بھرپور محبت کا یقین دلانے کی کوشش کرے گی مگر میں لگاوٹ کی باتیں نہیں سُننا چاہتا تھا۔ زبان سے تو سب ہی لڑکیاں محبت کا دعوے کرتی ہیں۔ اگر سامی کو واقعی محبت ہوگی تو وہ اپنے چہیتے جسم کو بھی داؤ پر لگا کر میرے پاس آئے گی بس اب میں اسی طرح اس کی محبت کا یقین کر سکتا تھا۔

ہم جنگل کی پگڈنڈیوں سے گزرتے ہوئے پختہ سڑک پر آئے۔ انٹیلی جنس والوں کی تینوں گاڑیاں واپسی کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ کار کی پچھلی سیٹ پر انسپکٹر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے زخمی ہاتھ کی مرہم پٹی ہو چکی تھی۔ مجھے دو مسلح جوانوں کے درمیان بٹھایا گیا۔ انھیں اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں میں فرار نہ ہو جاؤں۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ مجھ پر اعتماد نہیں کر رہے ہیں۔

میں چپ چاپ ان کے درمیان بیٹھا رہا۔ میں انسپکٹر وغیرہ کے خیالات پڑھ کر یہ معلوم کر سکتا تھا کہ وہ میرے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں لیکن میرا دل خیال خوانی کی طرف مائل نہ ہوا۔ میں بہت تھکن محسوس کر رہا تھا۔ سامی کی جدائی نے اور اس کی بے رخی نے دل برداشتہ کر دیا تھا۔ میں نے اس کے خیال کو بھی دماغ سے جھٹک کر آنکھیں بند کر لیں۔

ایک گھنٹے کے بعد ہم آئی بی کی عمارت میں پہنچے۔ مجھے توقع تھی کہ وہاں مجھ سے طرح طرح کے سوالات ڈانٹ ڈپٹ کر کیے جائیں گے لیکن کسی نے مجھ سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ تین مسلح جوان میرے دائیں بائیں اور پیچھے چلتے رہے اور مجھے ایک کمرے میں لے جا کر بند کر دیا۔ میں نے بھی فریاد نہیں کی۔ بڑے آرام سے ایک ایزی چیئر پر نیم دراز ہو گیا۔ جو مجرم ہوتے ہیں وہ سزا کے خوف سے سہمے رہتے ہیں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا اس لیے ٹھاٹ سے تمام رات سوتا رہا۔

دوسری صبح آٹھ بجے کمرے کا دروازہ کھلا۔ مسلح جوان مجھے لے کر ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں آئے۔ وہاں صوفہ پر چند آفیسر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ انسپکٹر بھی تھا جس کا ہاتھ زخمی ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

"فرہاد! کل رات تم نے صحیح رہنمائی کی تھی۔ ہم دشمنوں تک پہنچ گئے تھے لیکن ہم یہ کیوں نہ سوچیں کہ تم نے ڈبل گیم کھیلا۔ ایک طرف ہماری رہنمائی کرتے رہے، دوسری طرف اپنی محبوبہ کو سرحد پار [illegible]"

میں نے جواب دیا "آپ اپنے طور پر بہت کچھ سوچ سکتے [illegible] میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اپنے ملک سے زیادہ [illegible] ہے۔ میں اپنے وطن کی خاطر اپنی محبوبہ سے بھی منہ موڑ سکتا ہوں [illegible] ان کا ساتھی ہوتا تو اس وقت بلا روک ٹوک ہیلی کوپٹر کے ذریعے [illegible] ساتھ چلا جاتا۔"

انسپکٹر نے کہا "میرے آدمیوں کی رپورٹ کے مطابق تم [illegible] پہلے ہی ہیلی کوپٹر کے قریب پہنچ گئے تھے۔ اگر تم ان کے ساتھ نہیں [illegible] کے ساتھ تم نے جانا گوارا نہیں کیا تھا تو پھر سامی کو کیسے [illegible]"

"میں نے چھوٹ نہیں دی۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی [illegible] میری پہنچ سے بلند ہو گیا تھا۔ میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔"

ایک آفیسر نے طنزیہ انداز میں کہا "حالانکہ تم ان کا بگاڑ [illegible] تھے۔ تمھارے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ تم فائرنگ کر سکتے تھے مگر تم نے [illegible] بھی نہیں کیا۔ کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ تم نے انھیں نہایت آسا[نی سے] فرار ہونے کا موقع دیا ہے؟"

"میں نے انھیں فرار ہونے کا موقع نہیں دیا تھا۔ بات صر[ف یہ] ہے کہ میں سامی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ اگر میری فائرنگ [سے ہیلی کوپٹر] گر جاتا تو سامی مجھے زندہ سلامت نہ ملتی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے سامی کی خاطر ان پر فائرنگ [نہیں کی۔] ابھی تم نے کہا تھا کہ اپنے ملک کی خاطر اپنی محبوبہ سے بھی منہ موڑ سکتے [ہو۔ تم] محبِ وطن ہو، ایک محبوبہ کو زندہ سلامت رکھنے کے لیے تم [نے] دشمنوں کو یہاں سے نکل جانے کا موقع دیا۔ کیا اس طرح تم خود اپنے [جرم کا] اعتراف نہیں کر رہے ہو؟"

میرا سر ندامت سے جُھک گیا۔ انٹیلی جنس کے آفیسر نے [بڑی چالاکی سے] انھوں نے گھما پھرا کر مجھ سے میرے جرم کا اعتراف کرا لیا تھا۔ خدا گواہ [ہے] اس وقت میرے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ میں سامی کو زندہ سلامت رکھنے کی خاطر ملک کے دشمنوں کو بھاگنے کا موقع دے رہا ہوں۔

اب مجھے احساس ہوا کہ ایک لڑکی کے عشق میں، میں نے کیسی [غلطی] کی ہے۔ میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس ہیلی کوپٹر میں بھوانی شنکر [بھی] ہے اور اس کے ساتھ میرے ملک کے چند اہم راز بھی ہو سکتے ہیں۔ مجھ سے کتنی بڑی حماقت ہوئی تھی۔ میں نے ندامت سے کہا۔

"واقعی مجھ سے نادانستگی میں بہت بڑا جرم سرزد ہوا [ہے۔ میں نے] سامی کو بچانے کی خاطر اس پہلو پر توجہ نہیں دی تھی کہ دشمنوں کو [فرار کا] موقع مل جائے گا۔ جرم دانستہ کیا گیا ہو یا نادانستگی میں ہوا ہو، [بہر حال] میں مجرم کہلاؤں گا۔ آپ جو چاہیں سزا دیں مگر خدا کے لیے مجھے اپنا [دشمن نہ] سمجھیں۔ یہ میرے لیے ایک گالی ہے۔ میں سزا برداشت کر سکتا ہوں [لیکن یہ] گالی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"جرم کیا ہے تو سب کچھ برداشت کرنا ہوگا۔" ایک آفیسر نے [جواب] میں کہا۔ "اگر تم خود کو ایسے مقام تک لے آؤ جہاں صرف گالیاں سُنی پڑتی ہیں تو یہ تمھاری اپنی ہی غلطی ہوگی۔"

میں نے کہا "لیکن غلطی کی تلافی بھی ہو سکتی ہے۔ اگر آپ مجھے اتنا موقع دیں کہ میں دشمنوں کا پیچھا کر سکوں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ انھیں پکڑ کر واپس لے آؤں گا یا پھر انھیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں گا لیکن میں جانتا ہوں کہ مجھے موقع نہیں دیا جائے گا، اس لیے کہ میں آپ لوگوں کی نظروں میں قابلِ اعتماد نہیں ہوں۔"

"ہاں۔ یہ درست ہے، تم قابلِ اعتماد نہیں ہو لیکن ہم تمھاری اُس سونگھنے والی صلاحیت کا تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ انسپکٹر راشد نے بتایا ہے کہ تم نے سامی کی بُو کو سونگھتے ہوئے دشمنوں کے اڈے تک رہنمائی کی تھی۔ اگر میں یہاں سے باہر جاؤں تو کیا تم بتا سکو گے کہ میں باہر جا کر کہاں وقت گزار رہا ہوں؟"

جی ہاں۔ میں بتا سکتا ہوں لیکن اس سے پہلے میں آپ کے قریب آ کر آپ کو سونگھنا چاہتا ہوں۔"

وہ آفیسر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں اس کے قریب پہنچ کر اس کے چاروں طرف یوں گھومنے لگا جیسے اس کی بُو سونگھ رہا ہوں۔ حالانکہ بُو سونگھ کر میرے فرشتے بھی یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ وہ آفیسر باہر جا کر کہاں وقت گزارے گا۔ یہ سب کچھ میں آفیسر کے خیالات پڑھ کر معلوم کر سکتا تھا۔ لیکن میں ان پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں ٹیلی پیتھی کے علم سے بخوبی واقف ہوں۔

وہ آفیسر ایک اور آفیسر کے ساتھ باہر چلا گیا۔ کسی نے مجھے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا۔ میں نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور بلند آواز سے کہنے لگا۔

"دو آفیسر اس کمرے سے نکل کر ایک جگہ ٹھہر گئے ہیں۔ وہ دروازے سے باہر چند قدم کے فاصلے پر ہیں۔ جب وہ آگے بڑھیں گے تو میں بتاؤں گا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا اور باہر کھڑے ہوئے آفیسر کے خیالات پڑھتا رہا۔ اس کے خیال سے مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ کہیں نہیں جائے گا۔ کاریڈور میں کھڑا رہے گا۔ وہ اپنے ساتھی افسر سے کہہ رہا تھا۔

"فرہاد کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا اس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟"

دوسرے افسر کا جواب سنائی دیا "بظاہر تو وہ شریف آدمی [معلوم ہوتا] ہے لیکن موجودہ حالات کے پیشِ نظر اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ بُو سونگھ کر کسی کا پیچھا کرنے والی صلاحیت ایسی ہے کہ یہ شخص ہمارے بہت کام آ سکتا ہے۔"

"میں اسی پوائنٹ پر سوچ رہا ہوں۔ کیا ہم کسی طرح اس کی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے؟"

"ہاں۔ اس طرح کہ وہ ہمارے آدمیوں کی کڑی نگرانی میں رہے اور ہمارے کام آتا رہے۔"

"بالکل ٹھیک۔ وہ ہماری کڑی نگرانی میں رہے گا۔ اگر آئندہ اس نے وفاداری کا ثبوت دیا تو ہم اسے باقاعدہ ٹریننگ دیں گے۔ ہمیں اسے آزمانا چاہیے۔"

"ہوں۔ ہم پہلے ہی یہ طے کر چکے ہیں کہ محمود حسن کو جیل سے فرار ہونے کا موقع دیا جائے گا۔ اگر فرہاد اس کی مہک سے آشنا ہو جائے تو پھر ہم اس کی رہنمائی میں بڑی آسانی سے محمود حسن کا پیچھا کر سکیں گے۔"

"آپ اب بھی اسے محمود حسن کہہ رہے ہیں؟ حالانکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں، وہ یقیناً کسی ملک کا سیکرٹ ایجنٹ ہے۔ جب تک ہم اسے فرار ہونے کا موقع نہیں دیں گے، اس کی اصلیت کا علم نہیں ہوگا۔"

"اچھی بات ہے۔ آئیے، ہم اس طرح فرہاد کو بھی آزمائیں گے کہ وہ دیانتداری سے ہمارے کام آ سکتا ہے یا نہیں . . . ."

وہ دونوں واپس آنے لگے۔ میں نے آنکھیں کھول کر کہا۔

"وہ دونوں آفیسر واپس آ رہے ہیں۔"

میری بات ختم ہوتے ہی دروازہ کھلا اور وہ دونوں اندر آ گئے۔ دوسرے تمام آفیسر مجھے حیرانی سے دیکھنے لگے۔ ان دونوں نے میری اس بات کی تصدیق کر دی کہ وہ اس کمرے سے نکل کر کہیں دُور نہیں گئے تھے۔ دروازے سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے۔

ایک آفیسر نے مجھ سے کہا "فرہاد! ہم اس تذبذب میں ہیں کہ تم پر اعتماد کریں یا نہ کریں۔ اس تذبذب سے نکلنے کا ایک یہی راستہ ہے کہ ہم تمھیں اپنی وفاداری ثابت کرنے کا ایک موقع دیں۔"

"میں نے خوشی کا اظہار کیا "یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ مجھے ایک موقع دے رہے ہیں۔"

"آفیسر نے کہا "ابھی تمھیں ایک قیدی سے ملایا جائے گا۔ تم اپنی عادت کے مطابق اس کے جسم کی بُو سے آشنا ہو جاؤ۔ آج رات ہم اسے فرار ہونے کا موقع دیں گے اور تمھاری رہنمائی میں اس کا پیچھا کریں گے۔ اگر اس بار تم نے صحیح رہنمائی کی تو ہم تمھاری پچھلی غلطی معاف کر دیں گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی صحیح رہنمائی کروں گا۔ اس سلسلے میں میری ایک درخواست ہے کہ مجھے اس قیدی سے کھل کر باتیں کرنے کا موقع دیا جائے۔"

"وہ باتیں نہیں کرے گا۔ اس نے خاموشی اختیار کر لی ہے۔ تم جتنی دیر چاہو، خاموشی سے اس کا مشاہدہ کر سکتے ہو۔"

یہ کہہ کر آفیسر نے دو مسلح جوانوں کو حکم دیا کہ وہ مجھے قیدی کے پاس لیجائیں۔ وہ میرے دائیں بائیں آکر کھڑے ہو گئے اور مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں ان کے ساتھ کمرے سے باہر آگیا۔ عمارت کے پچھلے حصے میں چند کوٹھریاں تھیں جنھیں حوالات کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ وہیں ایک کوٹھری میں وہ قیدی سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔

کوٹھری کے سامنے کھڑے ہوئے ایک سپاہی نے آہنی دروازے کا تالا کھول دیا۔ میرے اندر جانے کے بعد دروازے کو دوبارہ بند کر دیا گیا۔ سپاہی اور دو مسلح جوان وہاں سے چلے گئے۔

اس دوران قیدی نے سر اٹھا کر ایک بار مجھے دیکھا تھا۔ پھر سر جھکا کر یوں بیٹھ گیا تھا جیسے وہاں کسی کے آنے کی اسے پرواہ نہ ہو۔ میں اس کے سامنے آہنی دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا رہا اور اس کے خیال کو پڑھنے لگا۔

وہ سوچ رہا تھا۔ "اونہہ! نہ جانے کتنے لوگ پوچھ گچھ کے لیے آتے رہیں گے مگر میری زبان نہیں کھلے گی۔ میں جانتا ہوں کہ ابھی یہ لوگ نرمی سے کام لے رہے ہیں، اس کے بعد یہ مجھے طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں گے، لیکن میرا نام بھی بھوانی شنکر ہے۔ میں انھیں اپنی اصلیت تک نہیں پہنچنے دوں گا.....!"

بھوانی شنکر کا نام سنتے ہی میں چونک گیا اور حیرانی سے اس قیدی کو دیکھنے لگا۔ حیرانی اس بات کی تھی کہ جس بھوانی شنکر سے میں اپنے ملک کے راز چھین کر لانا چاہتا تھا وہ میرے سامنے قیدی کی حیثیت سے بیٹھا ہوا تھا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اچانک آپ ہی آپ میرے سامنے آجائے گا۔

اب یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ اس کے تمام ساتھی فرار ہو گئے تھے اور وہ مجھ سے ٹکرانے کے لیے اس کوٹھری میں رہ گیا تھا۔ میرے جی میں آیا کہ میں اسی وقت اس کی اصلیت ظاہر کر دوں اور اس کا اصلی نام لے کر اسے مخاطب کروں۔ وہ حیرت سے اچھل پڑے گا۔ دیدے پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھے گا کہ میں کس طرح اس کے اندر چھپے ہوئے بھوانی شنکر تک پہنچ گیا ہوں۔

لیکن میں اچانک ہی اس کی اصلیت ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح میں خود انٹیلی جنس والوں کی نظروں میں مشکوک ہو جاتا۔ وہ مجھ سے سوال کرتے کہ میں بھوانی شنکر کو کیسے جانتا ہوں اور اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ ہوتا، کیونکہ اب سے چند دن پہلے میں خود بھوانی شنکر کو اس کے چہرے سے نہیں پہچانتا تھا۔ یہ خیال خوانی کا کمال تھا کہ میں نے اسے پہچان لیا تھا لیکن میں کسی پر اپنی خیال خوانی کی صلاحیتیں ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس وقت میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے صبر و ضبط سے کام لینا چاہیے اور یہ معلوم کرنا چاہیے کہ میرے ملک کے اہم راز ابھی بھوانی شنکر کے پاس ہیں یا اس کے ساتھی سرحد پار لے گئے ہیں۔ چھمیا اور سامی نے بتایا تھا کہ بھوانی شنکر ان کا لیڈر تھا! اس لحاظ سے وہ اہم راز ایک لیڈر تک محدود رہنے چاہئیں تھے۔ میں چپ چاپ اس کے خیالات کو پڑھنے لگا۔

وہ اپنے ساتھیوں کے متعلق سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں وہ سب کہاں ہیں؟ میں نے اس کی سوچ میں کہا۔

"وہ لوگ جہاں بھی ہوں گے، اپنی حفاظت آپ کریں گے۔ صرف ان تمام رازوں کے متعلق سوچنا چاہیے، جو میں ایک بار ... سے حاصل کر چکا ہوں۔"

"بلی۔ آہ! نہ جانے وہ سامی کہاں چلی گئی ہے.....!"

میں چاہتا تھا کہ وہ میرے مطلب کے مطابق سوچے لیکن بلی کی گمشدگی پر افسوس کر رہا تھا۔ میں نے پھر اس کے خیال کو اپنی طرف موڑ دیا۔

"بلی تو بھاگ گئی ہے! اس کے متعلق سوچتے رہنے سے وہ واپس نہیں آجائے گی۔ مجھے صرف اپنے مقصد پر نظر رکھنی چاہیے۔ وہ تمام راز۔"

"راز کی ایسی کی تیسی۔" وہ جھلا کر سوچنے لگا۔ "نہ جانے میں یہ راز والی باتیں کیوں کلبلا رہی ہیں۔ وہ تمام راز تو ایک ٹکڑے کی صورت میں محفوظ ہیں۔ یہ مائیکرو فلم ایک انچ کے ایک پلاسٹک کے ... میں ہے۔ انٹیلی جنس کے خرانٹ جاسوس بھی یہ نہیں جان سکتے کہ زبان کے نیچے جبڑے کے پاس ایک مصنوعی جھلی ہے! اس جھلی کے اندر کیپسول رکھا ہوا ہے! اس کی وجہ سے باتوں کے دوران ہلکی سی لکنت ہے۔ سننے والے یہی سمجھتے ہیں کہ میں اسی طرح بولنے کا عادی ہوں۔"

میں حیرانی سے اس کی ٹھوڑی کی طرف جبڑے کے نیچے دیکھنے لگا۔ بھوانی شنکر صحت مند تھا! اس کے بدن میں گوشت تھا۔ ٹھوڑی کے نیچے بھی گوشت اور چربی تھی اس لیے کوئی یہ نہیں جان سکتا تھا کہ وہاں ایک مصنوعی جھلی ہوگی اور اس جھلی میں ایک کیپسول چھپا کر رکھا گیا ہوگا۔

میں چاہتا تھا کہ وہ کچھ بولے تاکہ میں یہ دیکھ سکوں کہ وہ میری موجودگی میں کس طرح بولتا ہے۔ میں نے بات چھیڑی۔

"تم بہت دیر سے خاموش ہو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم کسی سے ... کرنا گوارا نہیں کرتے ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟"

وہ اپنی خاموشی سے یہ ثابت کرنے لگا کہ یہ سچ ہے۔ وہ کبھی بھی باتیں نہیں کرے گا۔ میں اس کے بالکل قریب جا کر یوں سانسیں کھینچنے لگا جیسے اسے سونگھ رہا ہوں۔ اس نے مضحکہ خیز انداز میں مجھے دیکھا، پھر اپنے سر کو جھکا لیا۔

اتنے میں سپاہی اور دو مسلح جوان آگئے۔ میں ان جوانوں کے ساتھ پھر اس ہال نما بڑے سے کمرے میں آگیا، جہاں وہ تمام افسران تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ایک نے پوچھا۔

"کیا تم نے اسے اچھی طرح دیکھ لیا ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی ہاں!"

"کیا تم اس کی بو سونگھ کر اس کا بھید پا کر سکو گے؟"

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں اس سلسلے میں ایک اہم بات کہنا چاہتا ہوں۔ اس کے جسم کی بو کے ساتھ ایک اور مستقل بو گڈ مڈ ہو گئی ہے۔"

"وہ کیسی بو ہے؟" ایک افسر نے پوچھا۔

"میں نے اس بو کا تجزیہ کیا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ فلم نیگیٹو یا پازیٹو کی بو ہے اور برابر اس کے جسم سے خارج ہو رہی ہے۔"

تمام افسران چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ایک افسر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مضطربانہ انداز میں کہا۔

"تم۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا۔ کیا وہ قیدی۔ کوئی فلم۔ فلم نگل کر بیٹھا ہوا ہے؟"

میں نے کہا۔ "اگر وہ کوئی فلم نگل جاتا تو وہ پیٹ میں پہنچ جاتی لیکن اس کے جبڑے کے قریب فلم کی مہک خارج ہو رہی ہے۔"

دو گھنٹے بعد مجھے پھر طلب کیا گیا۔ اس بار افسروں کا رویہ بدل گیا تھا! انھوں نے مجھے اپنے برابر صوفہ پر بٹھایا۔ ایک ملازم نے ناشتے کی ٹرالی لا کر میرے سامنے کھڑی کر دی۔ اس وقت مجھے یاد آیا کہ میں صبح سے بھوکا ہوں۔ یعنی مجھے دشمن سمجھ کر بھوکا رکھا گیا تھا اور اب دوست سمجھ کر خاطر مدارات کی جا رہی تھی۔ ناشتے کے دوران انھوں نے مجھے بتایا کہ جبڑے کے نیچے کا۔ بھوانی شنکر کا ایکسرے فوٹو لیا گیا تھا جس سے پتہ چلا کہ اس نے اپنے جبڑے کے پاس ایک انچ لانبی کوئی چیز چھپا رکھی ہے۔ پہلے تو اسے سمجھایا گیا کہ وہ چیز نکال کر ان کے حوالے کر دے مگر وہ انکار کرتا رہا۔ آخر اسے انجکشن کے ذریعے بے ہوش کر کے آپریشن تھیٹر پہنچا دیا گیا۔ پھر آپریشن کے ذریعے وہ مائیکرو فلم والا کیپسول برآمد کر لیا گیا۔ یہ سب کچھ بتانے کے بعد ایک افسر نے کہا۔

"تم حیرت انگیز صلاحیت کے مالک ہو۔ انسانوں کی مختلف بو کو پہچانتے ہو اور جسم کے اندر چھپی ہوئی کسی چیز کی مہک کو بھی پہچان لیتے ہو۔ کیا تم بو کا تجزیہ کرنے کی مشق کرتے رہتے ہو؟"

"جی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ میری پیدائشی عادت ہے۔ خواہ کسی بھی قسم کی خوشبو اور بدبو آپس میں گڈ مڈ ہو جائے، میں انھیں الگ الگ پہچان لیتا ہوں۔"

پھر وہ مجھ سے میری پچھلی زندگی اور موجودہ مصروفیات کے متعلق بات کرتے رہے اور میں انھیں اطمینان بخش جواب دیتا رہا۔ اس دوران رسمیات کافی حد تک بے تکلفی ہو گئی۔ ایک افسر تو دوست کی حد تک بے تکلف ہو گیا۔ وہ میرے ساتھ شبانہ ہوٹل میں آیا۔ ہوٹل کے احاطے میں پچھلی رات سے میری کار کھڑی ہوئی تھی! اس کار میں میں سامی کے ساتھ ڈنر کے لیے آیا تھا! اسے دیکھتے ہی سامی کی یاد بری طرح ستانے لگی۔ اس افسر نے جس کا نام شہباز خان تھا، مجھے غور سے دیکھ کر پوچھا۔

"تمہارا منہ کیوں لٹک گیا ہے؟"

میں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "سامی یاد آرہی ہے۔"

"کیا وہی لڑکی جو پچھلی رات ہیلی کوپٹر کے ذریعے فرار ہو گئی ہے؟"

"وہ فرار نہیں ہوئی، دشمن اسے جبراً لے گئے ہیں۔"

بات ایک ہی ہے۔ یعنی وہ جا چکی ہے۔ جو چھوکری ہاتھ سے نکل گئی ہے، اس کا افسوس نہ کرو۔ سامی سے آگے چھوکریاں اور بھی ہیں۔ بولو کتنی چھوکریوں کی ضرورت ہے۔ میری جان آج تم نے وہ کارنامہ دکھایا ہے کہ کرائم برانچ کے کسی ریکارڈ میں ایسے کارنامے کی مثال نہیں ملتی۔ کمال ہے تم سونگھنے کی عادت سے ایکسرے مشین کی طرح انسان کے جسم کے اندر پہنچ جاتے ہو۔ اب میں تمھیں آوارہ بھٹکنے نہیں دوں گا۔ تمھیں کام کا آدمی بناؤں گا۔ تمھیں بتاؤں گا کہ تم اس صلاحیت سے خود کو اور اپنے ملک کو کس طرح فائدہ پہنچا سکتے ہو۔ کیا تم ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنا پسند کرو گے؟"

میں نے جواب دیا۔ "کام کرنے کے دو مقاصد ہوتے ہیں۔ ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ کام کا اچھا خاصا معاوضہ حاصل کیا جائے لیکن خدا کے فضل و کرم سے میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں معاوضے کے لالچ میں کہیں کام نہیں کروں گا۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ ملک کی تعمیر و ترقی اور تحفظ کے لیے کام کیا جائے! اس سلسلے میں بھی میں مستقل ملازمت نہیں کروں گا۔ جب بھی آپ کو میری ضرورت ہوگی، میں آپ کے کام آتا رہوں گا۔"

"یہ تم مجھے آپ کیوں کہتے ہو۔ بھئی یہ تکلف ختم کرو۔ ہم آپس میں دوست ہیں۔"

میں نے بے تکلفی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اچھی بات ہے، آج سے ہم بے تکلف دوست ہیں۔ اب بتاؤ کہ پھر کب ملاقات ہوگی؟"

"آج رات کو اسی ہوٹل میں ٹھیک آٹھ بجے۔ ڈنر میری طرف سے.....!"

"او کے!" میں نے اس سے مصافحہ کیا اور کار کا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہاں بیٹھتے ہی عقب نما آئینے میں ایک حسینہ نظر آئی۔ وہ ہوٹل کے برآمدے میں کھڑی ہوئی کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے شہباز خان سے کہا۔

"شہباز! ذرا اس آئینے میں دیکھو۔ تمھاری آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔"

شہباز نے یوں دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھا جیسے واقعی آنکھیں روشن ہو رہی ہوں۔ اس نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"غضب کی چھوکری ہے۔ اسے میں کئی بار اس ہوٹل میں دیکھ چکا ہوں۔ یہ جتنی حسین ہے اتنی مغرور بھی ہے۔ اسے دیکھنا فضول ہے دوست! یہ تمھارے آگے گھاس نہیں ڈالے گی۔"

"اچھا!" میں نے مسکرا کر پوچھا "کیا تم مجھے چیلنج کر رہے ہو؟"

"ہاں۔ اس لیے چیلنج کر رہا ہوں کہ یہاں تمھارے سونگھنے کی صلاحیت کام نہیں آئے گی۔"

"یہ درست ہے کہ میری صلاحیت کام نہیں آئے گی لیکن اپنی شخصیت بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"کیا تم خود کو گلفام سمجھتے ہو؟"

"میں گلفام تو نہیں ہوں لیکن ایسا گیا گذرا بھی نہیں ہوں۔ تم شام تک موقعہ دو آج رات یہ ڈنر ٹیبل پر ہمارے ساتھ ہوگی۔"

میں کار کو بیک کر کے پارکنگ ایریئے سے نکالنے لگا۔ اسی وقت وہ تیزی سے چلتی ہوئی میری طرف آنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ لفٹ لینا چاہتی ہے۔ مجھے اتنی جلدی کامیابی کی توقع نہیں تھی۔ میں نے کار روک دی اور مسکرا کر شہباز کو دیکھنے لگا۔ شہباز نے فوراً ہی قریب آکر پوچھا۔

"فرہاد! معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پرانی جان پہچان ہے۔ مجھے بے وقوف بنا رہے تھے۔"

مجھے جواب دینے کا موقعہ نہیں ملا۔ وہ حسینہ بالکل قریب آکر کہہ رہی تھی۔

"میری گاڑی اچانک خراب ہو گئی ہے۔ کیا آپ مجھے لفٹ دے سکتے ہیں؟"

"ضرور۔" میں نے کہا "آپ کہاں جائیں گی؟"

"سمن آباد!" یہ کہہ کر وہ کار کی پچھلی طرف سے گھومتی ہوئی اگلی سیٹ کے دروازے پر آگئی۔ میں نے اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ شہباز کو یقین ہو گیا کہ وہ حسینہ میرے لیے قطعی اجنبی تھی، صرف مجبوری کے تحت لفٹ مانگنے آئی تھی۔ اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

"اچھا فرہاد! وِش یو گڈ لک۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کار کو پارکنگ ایریئے سے نکالا اور ڈرائیو کرتا ہوا ہوٹل کے کمپاؤنڈ سے باہر آگیا۔ اس حسینہ نے مجھ سے لفٹ لی تھی۔ اب اس سے لفٹ لینے کے لیے ضروری تھا کہ میں اس کی سوچ کے ذریعے اس کے مزاج کو اور اس کے کردار کو سمجھتا۔ یہ سمجھنے کے بعد ہی مجھے پتہ چلتا کہ وہ آج شام کی دعوت قبول کرے گی یا نہیں؟

وہ حسینہ خاموش بیٹھی ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی "مردوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ لڑکی کو تنہا پا کر عشق کرنے لگتے ہیں اس لیے مجھے ذرا انتظار کرنا چاہیے۔ یہ شخص خود ہی کوئی بات چھیڑ کر مجھ سے لفٹ لینے کی کوشش کرے گا۔"

میں نے کن انکھیوں سے اس پر ایک نظر ڈالی۔ ایک تو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اتنی حسین لڑکی مجھ سے کیا چاہتی ہے ... دیکھنے سے نیت خراب ہو جاتی تھی۔ اس کا مکھن سے تراشا ہوا ... غرور کی طرح اٹھی ہوئی ستواں ناک ... لب، ٹھوڑی میں خفیف سا گڑھا جیسے وہ تیز و تند مزاج ... کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اس لیے میں ان آنکھوں کو نہیں دیکھ سکا ...

مجھے کچھ دال میں کالا نظر آیا۔ وجہ یہی تھی کہ ایک مغرور لڑکی لفٹ دینے کے لیے تیار بیٹھی تھی اور کسی مقصد کے بغیر یہ حسینہ ... نہیں ہو سکتی تھی۔ میں اس کے خیال کو پڑھنے لگا۔

وہ سوچ رہی تھی "اوہ بہت دیر ہو گئی، یہ شخص میری طرف مائل نہیں ہو رہا ہے۔ مجھے اپنی کوٹھی تک پہنچنے سے پہلے اسے ... مائل کرنا چاہیے۔"

یہ سوچ کر وہ اپنی سیٹ پر ذرا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی ... نے پوچھا۔

"کیا یہ آپ کی کار ہے؟"

"جی ہاں!" میں نے جواب دیا۔

وہ مسکرا کر بولی "آپ کے حلیے سے پتہ نہیں چلتا ہے کہ آپ کار کے مالک ہیں۔ آپ برا نہ مانیے گا، جو بات میرے دل میں آئی میں نے کہہ دی۔"

"برا ماننے کی کیا بات ہے۔ واقعی میرا حلیہ ایسا ہے۔ پچھلی رات سے میں ایک پریشانی میں مبتلا تھا، اسی لیے نہ شیو کرنے کی فرصت ملی نہ ہی لباس تبدیل کر سکا۔"

"ہوں ...!" وہ سوچنے لگی "معلوم ہوتا ہے کہ انٹیلی جنس والوں نے پچھلی رات اس کی ایسی حجامت کی ہے کہ حلیہ بگاڑ دیا ..."

میں اس کی سوچ کو پڑھ کر چونک گیا۔ وہ حسینہ جانتی تھی کہ میں پچھلی رات سے انٹیلی جنس والوں کے رحم و کرم پر تھا۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ اسے یہ بات کیسے معلوم ہوئی ہے؟ کیا بھوانی شنکر کی ٹیم سے اس کا کوئی تعلق ہے؟

میں اس حسینہ سے یوں محتاط ہو گیا جیسے میرے برابر ناگن کنڈلی مارے بیٹھی ہو اور اب تب میں مجھے ڈسنے ہی والی ہو۔ وہ کہنے لگی "مجھے افسوس ہے کہ آپ پچھلی رات سے پریشان ہیں۔ آپ بلا تکلف بتائیں کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟ ... ہوں کہ سمن آباد تک لفٹ مانگ کر میں نے آپ کو مزید پریشان ..."

"جی نہیں۔" میں نے بے تکلفی سے کہا "آپ جیسی حسین ... کی موجودگی میں پریشانی نہیں ہوتی، بلکہ راحت ملتی ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی "اگر میرے ساتھ رہنے سے آپ کو راحت ملتی ہے تو پھر آپ میری کوٹھی میں چلیں۔ میں تنہا رہتی ہوں۔ وہاں آپ شیو کریں، غسل کریں۔ پھر میں آپ کو گرما گرم کافی پلاؤں گی۔ آپ کی تھکن اور پریشانی دور ہو جائے گی۔"

میں نے شوخی سے کہا "میری تھکن اور پریشانی کافی سے نہیں وہسکی سے دور ہوتی ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ وہسکی بھی آجائے گی۔"

میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے اپنی کوٹھی میں لیجانے کے لیے میری کسی بات سے انکار نہیں کرے گی اس لیے میں نے بیباکی سے کہا "یہ آپ کی عنایت ہے کہ آپ وہسکی کا انتظام کر دیں گی لیکن میں پینے کے بعد بہکتا ہوں۔ ایسی حالت میں مجھے صرف رنگین بانہیں سنبھال سکتی ہیں۔"

وہ شرمانے کی ایکٹنگ کرنے لگی اور خاموشی سے سوچنے لگی۔ "میں تو تمھیں ایسا سنبھالوں گی کہ تم تمام عمر یاد کرو گے۔ کم بخت مجھے کوئی سستی لڑکی سمجھ رہا ہے۔ ویسے مجھے اب محتاط رہنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ کوٹھی کے اندر پہنچتے ہی دست درازی شروع کر دے۔ میں وہاں پہنچتے ہی اس سے کہوں گی کہ وہ باتھ روم میں جا کر شیو بنائے۔ جب وہ باتھ روم میں جائے گا تو میں ڈرائنگ روم میں آکر ٹونی اور ادریس کو فون پر کال کروں گی کہ ایک کام کا آدمی ہاتھ آیا ہے۔ وہ دونوں یہاں آکر اسے سنبھالیں۔ میرا خیال ہے کہ میری کال سنتے ہی وہ آدھ گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔ اتنی دیر تک میں اسے باتوں سے بہلاتی رہوں گی۔"

اس کے خیالات پڑھ کر یہ معلوم ہو گیا کہ واقعی وہ اپنی کوٹھی میں تنہا رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ابھی کوٹھی کے اندر جانے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں خطرے سے پہلے ہی اس سے نمٹ لوں گا۔

سمن آباد پہنچ کر وہ مجھے بتانے لگی کہ کن راستوں سے گذرنا ہے۔ پھر ایک چھوٹی سی خوبصورت سی کوٹھی کے سامنے اس نے کار رکوا دی۔ میں کار سے اتر کر کوٹھی کے نمبر کو ذہن نشین کرتا ہوا اس کے ساتھ لان میں آیا۔ وہاں چاروں طرف دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔

"ہمارے ملک کی لڑکیاں ایسی شاندار کوٹھیوں میں تنہا نہیں رہتی ہیں۔ ان کا کوئی سرپرست یا نگراں ضرور ہوتا ہے۔"

"جی ہاں۔ میرے بڑے بھائی میرے سرپرست ہیں۔ وہ پنڈی میں رہتے ہیں۔ میں یہاں کالج میں پڑھتی ہوں ..."

وہ خاموش ہو کر اپنے بھائی کے متعلق سوچنے لگی "آہ! بھائی جان نے ہمارے لیے ملک سے غداری کی۔ اتنی دولت بھی جمع کی اور اب نہ جانے کس مجبوری اور بے بسی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ جب تک وہ کم بخت بھوانی شنکر آزاد نہیں ہوگا اس وقت تک اس کے آدمی بھائی جان کو قیدی بنا کر رکھیں گے۔"

اس کی سوچ پڑھ کر میرا دماغ الجھ گیا۔ اس وقت وہ اور اس کا بھائی مظلوم نظر آ رہے تھے۔ بھائی بھوانی شنکر کے آدمیوں کی قید میں تھا ... پر ناچ رہی تھی۔ مجھے قربانی کا بکرا بنا رہی تھی ...

مجھے زیادہ سوچنے کا موقعہ نہیں ملا۔ ایک بیڈ روم میں پہنچ کر اس حسینہ نے اپنے منصوبے کے مطابق کہا۔

"یہ باتھ روم ہے۔ یہاں شیو کرنے اور غسل کرنے کا سامان موجود ہے۔ آپ اندر جائیں۔ میں اتنی دیر میں آپ کے لیے وہسکی کا بندوبست کرتی ہوں۔"

"خواتین کی موجودگی میں ... وہسکی پی نہیں ہو سکتا۔ اب باہر کہاں جاؤ گی ... میں ... روم کے دروازے کو بند کر دیتا ہوں۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں اتنی سستی لڑکی نہیں ہوں جتنا کہ آپ سمجھ رہے ہیں۔"

"تم سستی ہو یا مہنگی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں مہنگی چیز ... خرید لیتا ہوں لیکن میں کسی لڑکی کی مجبوریوں سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ اس وقت تم ایک مجبور لڑکی ہو۔ اپنے بھائی کو بھوانی شنکر کے آدمیوں سے چھڑانے کے لیے مجھے ایک نئی مصیبت میں گرفتار کرانے یہاں لائی ہو۔"

وہ شدید حیرانی سے میرا منہ تکنے لگی اور یہ سوچ کر گھبرانے لگی کہ میں اس کے معاملات سے واقف ہو گیا ہوں۔ وہ ہکلا کر کہنے لگی۔

"تت ... تم میرے بھائی کو جانتے ہو؟ بھوانی شنکر کو جانتے ہو؟"

"ہاں کل رات تم انٹیلی جنس والوں کی قید میں تھے۔ بھوانی شنکر بھی وہاں قید ہے۔ تم اس سے ضرور ملے ہو گے۔ بتاؤ خدا کے لیے بتاؤ۔ اسے کہاں قیدی بنا کر رکھا گیا ہے؟ وہاں کتنے پہرے دار ہیں؟ ان کی ڈیوٹی کے اوقات کیا ہیں؟ کیا تم اسے وہاں سے نکال کر لا سکتے ہو؟"

"ہاں۔ لا سکتا ہوں اور تمھارے بھائی جان کو بھی بھوانی شنکر کے آدمیوں سے نجات دلا سکتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟" اس نے خوش ہو کر اپنے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دیے۔ اس طرح وہ میرے بہت قریب آگئی۔ میں نے بھی مزید قریب ہو کر اس سے جھوٹ کہا۔

"میں نے بھوانی شنکر کی زبان سے سنا تھا کہ ایک شخص کو اس کے آدمیوں نے یرغمال کے طور پر قید کیا ہے اور اس کی بہن کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ بھوانی شنکر کو آزاد کرانے کے سلسلے میں ایک جاسوسہ کے فرائض انجام دے۔"

وہ جلدی سے بولی "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں وہی ہوں۔ مجھ سے

مخبری کے کام لیے جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے بھائی جان کی غلطی کے باعث بھوانی شنکر گرفتار ہوا ہے۔“

”تمھارے بھائی جان کا نام کیا ہے؟“

”احمد شیخ! وہ پنڈی میں رہتے تھے اور سیکرٹریٹ میں ایک بہت بڑے عہدے پر کام کرتے تھے۔“

احمد شیخ کا نام سنتے ہی میرے تیور بدل گئے۔ وہ تو میرے ملک کا سب سے بڑا غدار تھا۔ اسی نے بھوانی شنکر وغیرہ کو پناہ دی تھی۔ میں نے اپنے غصّے کو ضبط کرتے ہوئے ذرا خوش ہو کر کہا۔

”اچھا تو تم احمد شیخ کی بہن ہو۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ احمد شیخ اپنا کوئی راز مجھ سے نہیں چھپاتا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ دشمن ملک کے ایجنٹوں کو اپنے ہاں پناہ دیتا ہے اور انھیں تخریبی کارروائیوں کے لیے ہر طرح کی سہولتیں پہنچاتا ہے۔ اکثر معاملات میں میں بھی احمد شیخ کا ساتھ دیتا ہوں۔ ادھر پچھلے پندرہ دنوں سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اب تم سے پتہ چل رہا ہے کہ وہ تمھارا بھائی ہے اور اس وقت ان ہی لوگوں کی قید میں ہے جنھیں پناہ دیا کرتا تھا۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟“

”بھوانی شنکر غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے بھائی نے جان بوجھ کر ایسی غلطی کی ہے جس کی وجہ سے وہ گرفتار ہو گیا ہے۔ اس غلطی کی تلافی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ میں ان کی آلۂ کار بن جاؤں۔ اسی سلسلے میں میں تمھیں یہاں پھانس کر لائی ہوں۔“

”تم نے کیسے سمجھ لیا تھا کہ میں تمھارے کام کا آدمی ہوں؟“

”پچھلی رات تم سلمیٰ قادر (سامی) کے ساتھ شبانہ ہوٹل میں آئے تھے۔ میں بھوانی شنکر کے آدمیوں کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ میں نے تمھیں دیکھا تھا۔ تمھیں انٹیلی جنس کا ایک آدمی منیجر کے کمرے میں لے گیا تھا۔ ادھر بھوانی شنکر کے دو آدمی مین سوئچ آف کر کے سلمیٰ قادر کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے شبانہ ہوٹل کے پارکنگ ایریے میں تمھیں دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا۔ وہاں میرے ساتھ ٹونی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ تم پچھلی رات انٹیلی جنس والوں کی حراست میں تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے بھوانی شنکر کی اصلیت جاننے کے لیے تمھیں اس سے ملایا ہو۔ یہی معلومات حاصل کرنے میں تمھیں یہاں لائی ہوں۔ ٹونی نے کہا تھا کہ یہاں پہنچ کر میں فون پر اسے اطلاع دوں۔ وہ ادریس کے ساتھ یہاں آئے گا اور تم سے پچھلی رات کی تمام باتیں اگلوائے گا لیکن تم نے تو خود ہی تمام باتیں اُگل دی ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ بھوانی شنکر کی غلط فہمی کیسے دُور کرو گے؟ اس کی غلط فہمی دُور ہو گی تب ہی بھائی جان کو رہائی نصیب ہو گی۔“

”تمھارے بھائی جان وہاں سے رہا ہو کر بھی آزادی کی سانس نہیں لے سکیں گے کیونکہ انٹیلی جنس والے انھیں بھی تلاش کر رہے ہوں گے۔“

”یہ میں جانتی ہوں۔ بھائی جان اب اس ملک میں نہیں رہیں گے بھوانی شنکر کو جب بھی فرار ہونے کا موقع ملے گا، وہ بھائی جان کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔“

”اور تم یہاں تنہا رہو گی؟“

”نہیں۔ میں تمام جائداد فروخت کرنے کے بعد چلی جاؤں گی۔“

میں نے کہا: ”غداروں کے لیے ہر جگہ زمین تنگ ہو جاتی ہے۔ تم لوگ جہاں بھی جاؤ گے! اس ملک کے جاسوس تم لوگوں کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ بھوانی شنکر اور احمد شیخ تو اسی ملک میں کتّے کی موت مارے جائیں گے۔ اب تم بتاؤ کہ تم کہاں مرنا پسند کرو گی؟“

وہ تعجب سے بولی: ”یہ ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے آپ کے بدلے ہوئے تیور سے ڈر لگ رہا ہے۔“

”تم میری طرف دیکھو۔۔۔۔“

آخری فقرہ میں نے ایسے تحکمانہ انداز میں ادا کیا کہ اس کا سر جھٹکے سے اٹھ گیا۔ اس نے مجھے دیکھا۔ اس وقت میری آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں اور اس کی نگاہوں کو اپنی گرفت میں لے رہی تھیں۔ وہ بالکل ساکت ہو گئی۔ سحر زدہ سی ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں اس کے دماغ میں جھانک کر دیکھا۔ اب وہ صرف میری شخصیت کے متعلق سوچ رہی تھی۔

”اس کی نظریں کتنی ظالم ہیں۔ تیز خنجر کی طرح دل میں اُتر رہی ہیں۔ ہائے اس کی نظریں کتنی مہربان ہیں۔ میرے سوچنے کا انداز یہی ہے۔ اب میں اس کے متعلق نہ سوچوں تو اور کس کے متعلق سوچوں۔ اب تو ہر طرف صرف یہی نظر آ رہا ہے۔“

یہ درست ہے، میری آنکھوں کی گرفت میں آنے کے بعد میں ہی اسے نظر آ رہا تھا۔ میں نے بھاری بھر کم سی آواز میں کہا۔

”تمھارے سامنے اس دنیا کا کوئی نظارہ نہیں ہے، صرف تمھاری نگاہوں میں ہوں۔“

”ہاں۔ صرف تم میری نگاہوں میں ہو۔“

”تمھارے دماغ سے تمام سوچیں مٹتی جا رہی ہیں۔ صرف میری سوچ ہے۔“

”ہاں۔ صرف تمھاری سوچ ہے۔“

”تمھارے کان اس دنیا کی کوئی آواز نہیں سُن رہے ہیں، صرف میری آواز سُن رہے ہیں۔“

”ہاں۔ صرف تمھاری آواز سُن رہے ہیں۔“

”اب تم میری محکوم ہو۔ میرے حکم کی تعمیل کرتی رہو گی۔“

”میں تمھارے حکم کی تعمیل کرتی رہوں گی۔“

”میں چاہتا ہوں کہ تمھارا غدار بھائی ان دشمنوں کے ہاتھوں مارا جائے جنھیں وہ پناہ دیتا رہا ہے۔ تم کیا چاہتی ہو؟“

”میں وہی چاہتی ہوں جو تم چاہتے ہو۔“

”اچھی بات ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ بھوانی شنکر کی ٹیم میں ٹونی کیا رول ادا کر رہا ہے؟“

”وہ درمیان کا آدمی ہے۔ میرا پیغام بھائی جان تک پہنچاتا ہے اور بھائی جان کا پیغام میرے پاس لاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھوانی شنکر کو آزاد کرانے کی کوششیں کرتا رہتا ہے۔“

”اچھا۔ اب ٹیلیفون کے پاس چلو اور ٹونی کو کال کرو۔“

وہ سحر زدہ سی ہو کر ڈرائنگ روم کی طرف جانے لگی۔ میں اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ وہ پلکیں نہیں جھپک رہی تھی۔ یک ٹک سامنے دیکھتی ہوئی چل رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

”ٹونی سے رابطہ قائم ہونے کے بعد جو باتیں تمھارے دماغ میں آتی رہیں، وہی کہتی جانا۔ کیا تمھیں ٹونی کا فون نمبر یاد ہے؟“

”نہیں۔ ابھی میرے دماغ سے سب کچھ مٹ گیا ہے۔“

”میں حکم دیتا ہوں کہ صوفہ پر بیٹھ جاؤ اور ٹونی کا فون نمبر یاد کرو۔ اب سے تقریباً آدھ گھنٹہ پہلے اس نے تمھیں کس نمبر پر کال کرنے کے لیے کہا تھا؟“

وہ ٹیلیفون کے قریب صوفہ پر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں تک سوچتی رہی، پھر ریسیور اٹھا کر ٹونی سے رابطہ قائم کرنے لگی۔

اب میں اس کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کی سوچ میں بولتا رہوں اور وہی باتیں وہ ٹونی سے فون پر بولتی رہے۔ اسی لیے میں نے اس سے کہا تھا کہ جو باتیں تمھارے دماغ میں آتی رہیں، وہی بولتی چلی جاؤ۔

رابطہ قائم ہو گیا۔ دوسری طرف سے ٹونی کی آواز سُنائی دی: ”ہیلو!“

جواب میں وہ بولی: ”ہیلو۔ میں روزینہ بول رہی ہوں۔ تم ٹونی ہو نا؟“

”ہاں۔ میں ٹونی ہوں۔ کیا اُس آدمی کو کوٹھی میں لے آئی ہو؟“

میں نے روزینہ کی سوچ میں کہا: ”ہاں۔ وہ شخص میرے بیڈ روم میں ہے لیکن تم ادریس کے ساتھ یہاں نہ آنا۔ میں اپنے طور پر ایک گیم کھیل رہی ہوں۔“

”کیسا گیم؟“ ٹونی نے پوچھا۔

روزینہ پھر میری سوچ کے مطابق کہنے لگی: ”یہ شخص جو میرے بیڈ روم میں ہے، میرے بہت کام کا آدمی ہے۔ اُس نے مجھے بتایا ہے کہ بھوانی شنکر اس وقت کہاں ہے۔“

”کہاں ہے؟“ ٹونی کی جوشیلی اور جذباتی آواز سُنائی دی: ”روزینہ بتاؤ ہمارا لیڈر کہاں ہے۔ زیادہ تفصیل میں نہ جاؤ۔ وقت برباد نہ کرو۔ فوراً بتاؤ۔“

”سوری۔ میں فوراً ہی نہیں بتا سکتی۔ پہلے میری ایک شرط سُن لو۔ میں اپنے بھائی احمد شیخ کو تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ ہوش میں تو ہو؟ تم اب تک اپنے بھائی جان کی خاطر جان دینے کے لیے تیار تھیں۔ ان کے لیے تم ہمارے ہر حکم پر عمل کر رہی تھیں۔ اب اچانک ہی تم بھائی کے خلاف کیسے ہو گئیں؟ ایسی کیا بات ہے کہ تم اس کی دشمن بن گئی ہو؟“

”پہلے میں نادان تھی۔ میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ بھائی جان مر جائیں گے تو ان کی تمام جائداد میرے حصّے میں آ جائے گی۔ اب مجھے عقل آ گئی ہے۔“

”تمھیں عقل نہیں آئی ہے، بلکہ تمھاری کھوپڑی اُلٹ گئی ہے۔ ہم نے مصلحتاً احمد شیخ کو قیدی بنا کر رکھا ہے لیکن ہم اس کی جان کے دشمن نہیں ہیں۔ وہ ہمارے بہت کام کا آدمی ہے۔ تم یہ خیال دل سے نکال دو کہ ہم کسی مجبوری کے تحت اس کی جان لے سکتے ہیں۔ یہ کتنے شرم کی بات ہے کہ تم اپنے بھائی سے غداری کر رہی ہو۔“

”جب بھائی جان کو اپنے ملک سے غداری کرتے شرم نہیں آئی تو مجھے ان سے غداری کرتے ہوئے کیوں شرم آئے گی؟ تم فضول باتوں میں خود ہی وقت ضائع کر رہے ہو، کام کی بات کرو۔ بھوانی شنکر تک پہنچنا چاہتے ہو تو بھائی جان کو میری کوٹھی میں لے آؤ اور یہاں میری نگاہوں کے سامنے انھیں اذیتیں دے کر مار دو۔ تم اچھی طرح سوچ لو کہ تم لوگوں کی نظروں میں بھوانی شنکر کی زندگی زیادہ اہم ہے یا احمد شیخ کی؟“

ٹونی نے جواب دیا: ”اپنے فرائض کے پیشِ نظر ہمارے لیڈر کی زندگی اہم ہے۔ تم جانتی ہو کہ اس ملک کے کتنے اہم راز لیڈر کے پاس محفوظ ہیں۔ ہم ہر حال میں یہی چاہیں گے کہ لیڈر ان رازوں کے ساتھ صحیح سلامت یہاں سے نکل جائے۔“

ٹونی وغیرہ کو پتہ نہیں تھا کہ ان کے لیڈر کا آپریشن کر کے وہ تمام راز نکال لیے گئے ہیں۔ میں نے مسکرا کر روزینہ کی سوچ میں کہا۔

”تو پھر تمھیں یہی فیصلہ کرنا چاہیے کہ بھائی جان مر جائیں اور بھوانی شنکر صحیح سلامت یہاں سے چلا جائے۔“

”ہوں۔“ ٹونی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: ”ہم کیسے یقین کریں کہ احمد شیخ کے مرنے کے بعد تم بھوانی شنکر تک ہماری صحیح رہنمائی

کردگی؟"

"یہ تو میں ابھی تمھیں بتلائے دیتی ہوں۔ بھوانی شنکر اس وقت پولیس ہسپتال کے اسپیشل وارڈ کے کمرہ نمبر دس میں ہے۔ تم میری اس اطلاع کی تصدیق کرلو۔ ویسے وہاں سخت پہرہ ہے وہاں سنبھل کر جانا۔"

"تم میری فکر نہ کرو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے مجھ پر کیسے بھروسہ کرلیا؟ اگر میں بھوانی شنکر تک پہنچنے کے بعد تمھارے بھائی کو ہمیشہ کے لیے ختم نہ کروں تو تم میرا کیا بگاڑلوگی؟"

"ٹونی! میں نے بھوانی شنکر کے متعلق صرف اتنا بتایا ہے کہ وہ ہسپتال میں ہے لیکن میں نے وہاں پہرہ دینے والوں کی ایک زبردست کمزوری نہیں بتائی ہے۔ اگر وہ کمزوری میں تمھیں بتادوں تو تم بڑی آسانی سے اپنے لیڈر کو وہاں سے نکال لاؤ گے۔"

"کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"ہسپتال جاؤ، میری سچائی کا ثبوت مل جائے گا۔"

"اچھی بات ہے۔ ابھی میں دوبارہ تمھیں فون کروں گا۔"

دوسری طرف اس نے ریسیور رکھ دیا۔ میں نے روزینہ سے کہا کہ جب تک میں اسے مخاطب نہ کروں، وہ خاموش بیٹھی رہے۔ وہ چپ چاپ بیٹھی سامنے دیوار کی طرف دیکھتی رہی۔ میں ایک صوفہ پر آرام سے بیٹھ کر ٹونی کے خیالات پڑھنے لگا۔

وہ سوچ رہا تھا "روزینہ کے بیڈ روم میں جو شخص ہے اسی نے روزینہ کو بھوانی شنکر کے متعلق بتایا ہے لیکن اسے کیسے معلوم ہوا کہ ہمارا لیڈر ہسپتال میں ہے۔ ہاں اسے معلوم ہو سکتا ہے کیونکہ وہ بھی انٹیلی جنس والوں کی قید میں تھا۔ شاید ہمارا لیڈر ریلا ہے۔ اس نے اس بیمار کو دیکھا ہوگا۔ شاید اس کے سامنے اسے ہسپتال لے گئے ہوں گے اور اس شخص نے پہرہ دینے والوں کی کسی خاص کمزوری کو خاص طور سے نوٹ کیا ہوگا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو، روزینہ اور اس اجنبی پر بھروسہ کرنا ہوگا اور ان پر کڑی نظر رکھنا ہوگی۔ اگر انھوں نے دھوکا دیا تو میں روزینہ کے بیڈ روم کو ٹائم بم سے اڑا دوں گا۔ وہ اپنے عاشق کے ساتھ اس خوابگاہ میں ہمیشہ کی نیند سو جائے گی۔"

یہ سوچ کر اس نے آواز دی "یوسف! یہاں آؤ۔"

چند لمحے بعد یوسف کی آواز سنائی دی۔ ٹونی اسے ہدایات دینے لگا کہ وہ ایک ٹائم بم لیکر روزینہ کی کوٹھی میں جائے اور اس ٹائم بم کو کوٹھی میں کام کرنے والی ملازمہ کے حوالے کردے۔ ملازمہ کسی کام کے بہانے جائے گی اور روزینہ کے پلنگ کے نیچے چھپا دے گی لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب اس کوٹھی میں یا کوٹھی کے آس پاس روزینہ اور اس اجنبی کے علاوہ کوئی تیسرا شخص یا کوئی پولیس کا آدمی پایا جائے گا یعنی ٹونی کا منصوبہ یہ تھا کہ اگر میں اس کوٹھی میں روزینہ کے ساتھ تنہا رہوں گا تو ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ وہ اور ادریس مجھ سے نمٹ لیں گے۔ اگر کوئی پولیس کا آدمی ہو اور ان کے لیے کوئی لمبا جال پھیلایا گیا ہو تو وہ ٹائم بم کے ذریعے مجھے

اور روزینہ کو ختم کردیں گے اور اگر میری طرف سے کوئی دھوکا نہ ہوا تو روزینہ کی شرط کے مطابق احمد شیخ کو مار ڈالیں گے اور آئندہ مجھ سے دوستی قائم رکھیں گے۔

میں ٹونی کی تمام پلاننگ کو اچھی طرح پڑھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مجھے کس طرح اپنا بچاؤ کرنا چاہیے۔ آدھ گھنٹے بعد ٹونی کا ایک آدمی ہسپتال سے واپس ٹونی کے پاس پہنچا اور اس اطلاع کی تصدیق کردی کہ انٹیلی جنس والوں کا ایک قیدی کمرہ نمبر دس میں ہے اور اس کا نام محمود حسن ہے۔

ٹونی کو یقین ہو گیا، کیونکہ بھوانی شنکر نے اس ملک میں آکر اپنا نام محمود حسن رکھ لیا تھا۔ یہ نام سنتے ہی وہ سمجھ گیا کہ اس کا لیڈر ہسپتال کے کمرہ نمبر دس میں ہے۔ اب وہ بے چینی سے سوچ رہا تھا کہ وہ کس طرح جلد سے جلد اپنے لیڈر کو ہسپتال سے نکال کر لاسکتا ہے۔ یوسف نام کے جس آدمی کو اس نے ٹائم بم دے کر اس کوٹھی میں بھیجا تھا، اس نے ٹائم بم سرونٹ کوارٹر میں جاکر ملازمہ کو دے دیا تھا اور ٹونی کو جاکر رپورٹ دی تھی کہ کوٹھی کے آس پاس کوئی پولیس کا آدمی نہیں ہے۔ ملازمہ بھی ایک کوٹھی کے اندر آکر یہ دیکھ چکی تھی کہ وہاں صرف اس کی مالکن ایک اجنبی کے ساتھ صوفے پر بیٹھی ہوئی ہے اور کوئی تیسرا شخص وہاں موجود نہیں ہے۔ اب ٹونی ہر طرح سے مطمئن ہو کر ہماری طرف آرہا تھا۔ میں نے روزینہ سے کہا۔

"تم پلکیں نہیں جھپک رہی ہو۔ تمھیں پلکیں جھپکنا چاہیے۔"

وہ مسلسل پلکیں جھپکنے لگی۔ میں نے کہا۔

"اس طرح نہیں ٹھہر ٹھہر کر۔ عام حالات میں جس طرح وقفے وقفے سے پلکیں جھپکائی جاتی ہیں، اسی طرح وقفے کا خیال رکھو تاکہ کوئی یہ نہ سمجھ سکے کہ تم سحر زدہ ہو یا تم پر تنویمی عمل کیا گیا ہے۔"

وہ نہایت اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر پلکیں جھپکانے لگی۔ میں نے کہا۔

"میں جو کچھ پوچھوں گا، تم صحیح جواب دو گی۔"

"میں صحیح جواب دوں گی۔"

"اب سے پہلے تمھاری زندگی میں کتنے مرد آچکے ہیں؟"

"ایک بھی نہیں۔ میں کسی مرد سے شکست نہیں کھانا چاہتی۔ یہ سوچ کر میرے غرور کو ٹھیس پہنچتی ہے کہ کوئی مجھے زیر کرے گا۔"

وہ درست کہہ رہی تھی۔ معمول بن کر مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔ محض اپنے غرور کی خاطر وہ اب تک بال بال کنواری تھی۔

میں نے ایک انگلی سے ٹھوڑی کو چھو کر اس کے ... تھا، بری محکوم تھی۔ میری شخصیت کے سامنے اپنے غرور کو بھول گئی تھی۔ ... نے کہا۔

"اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دو اور آزادی سے سوچو کہ تم کیا محسوس کررہی ہو؟"

وہ میرے حکم کے مطابق عمل کرتی ہوئی سوچ رہی تھی۔

"آہ! میں نہیں چاہتی کہ یہ آہنی بازو مجھے اپنی گرفت میں لے کر بے بس کردیں مگر پتہ نہیں کیوں میرا دل نہیں چاہتا کہ میں ان بازوؤں کی گرفت سے نکلنے کی جدوجہد کروں۔ اُف! میں کیا کروں میں نہیں چاہتی کہ ایک مرد اس طرح مجھ پر حاوی ہو جانے ہائے میرا غرور کیا ہوا؟ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جس بات کا تجربہ نہ ہوا اس کے لیے خواہ مخواہ غرور نہیں کرنا چاہیے۔ جیسے میں نہیں جانتی تھی ... یوں سانسوں کی آندھیاں چلتی ہیں اور بدن کی حرارت انگڑائیاں لیتی ہے۔ نگاہوں کے سامنے سے دنیا مٹ جاتی ہے تو میری آنکھوں میں جو تم ہے، میں تیری آنکھوں میں ہوتی ہوں اور ریشمی دروازے کھولتی چلی جاتی ہوں۔ .."

وہ سوچ رہی تھی۔ اگرچہ اپنے لباس میں ایک بند کلی کی طرح تھی ... خیالوں کے طلسم کدے میں اپنے وجود کے کتنے ہی دروازے کھول رہی تھی۔ میں اس سے آگے نہ بڑھ سکا کیونکہ اسی وقت کوٹھی کے باہر ایک کار کے رکنے کی آواز سنائی دی تھی۔ میں نے کہا۔

"شاید ٹونی آگیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ تم خیالوں کے طلسم کدے میں زیادہ دیر نہ رہ سکیں۔ کوئی بات نہیں۔ ان لوگوں سے نمٹ کر میں تمھیں پھر اسی جہان کی سیر کراؤں گا۔"

میری بات ختم ہوتے ہی دو شخص ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے میں نے سوچ کے ذریعے روزینہ کو حکم دیا "آنے والوں سے میرا تعارف کراؤ۔"

روزینہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور میری طرف اشارہ کرتی ہوئی ٹونی سے بولی۔

"ٹونی! یہ میرے فرینڈ ہیں۔ ان کا نام...."

میں نے سوچ کے ذریعے بتایا کہ میرا نام فرہاد ہے۔ وہ کہنے لگی۔

"ان کا نام فرہاد ہے اور فرہاد یہ ٹونی ہے اور یہ ادریس ہے۔"

ان دونوں نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ ٹونی نے کہا۔

"مسٹر فرہاد! تم پر اعتماد کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم اس کوٹھی کی تلاشی لیں۔"

"بے شک مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

میرا جواب سن کر وہ دونوں مختلف کمروں میں یہ دیکھنے چلے گئے کہ شاید وہاں کوئی میرا مددگار چھپا ہوا ہو۔ واپس آکر ٹونی نے حیرت سے کہا۔

"تعجب ہے، تم یہاں بالکل تنہا ہو۔ کیا تمھیں اس بات کا اندیشہ نہیں تھا کہ ہم تمھیں تنہا پاکر اپنی طاقت سے یا ریوالور وغیرہ کے ذریعے تمھیں بے بس کرسکتے ہیں۔"

میں نے جواب دیا "میرے پاس اتنی بڑی طاقت ہے کہ اس کے آگے تم سب بے بس ہو اور وہ طاقت ہے میری معلومات۔ میں اپنی معلومات کے ذریعے تمھارے لیڈر کو ہسپتال سے نکال کر لاسکتا ہوں۔"

"تم اسے کب تک وہاں سے لاسکتے ہو؟"

میں نے کہا "ابھی وہ سخت بیمار اور زخمی ہے۔ اگر تم لوگ کسی آرام دہ گاڑی کا انتظام کروگے تو آج رات ہی ہم اسے لے آئیں گے۔"

"ہم انتظام کرلیں گے مگر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم ہمیں دھوکا نہیں دوگے؟"

"میں اپنی سچائی کا یقین نہیں دلا سکتا، اس لیے میں یہی کہوں گا کہ فی الحال مجھ پر اندھا اعتماد نہ کرو، دور ہی دور سے تماشہ دیکھو کہ میں کس طرح تمھارے لیڈر کو ہسپتال سے لیکر آؤں گا۔ میرے ساتھ تمھارا صرف ایک ڈرائیور رہے گا۔ تم جہاں کہو گے میں تمھارے لیڈر کو پہنچادوں گا مگر میری ایک شرط ہے۔ میں بھی تمھارے لیڈر کے ساتھ سرحد پار کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم سرحد پار کیوں جانا چاہتے ہو؟"

"اس ملک کو چھوڑنے کی کچھ ایسی وجوہات ہیں۔ میں ابھی نہیں بتا سکتا اور تم پوچھ کر کیا کروگے۔ تم صرف اپنے مقصد پر نظر رکھو۔"

"اچھی بات ہے۔ تمھاری شرط پوری کردی جائے گی۔"

"تم محض وعدہ کرتے ہو۔ ابھی تم نے روزینہ سے وعدہ کیا تھا کہ احمد شیخ کو یہاں لاؤ گے اور اسے تڑپا تڑپا کر مارو گے۔"

"ہم ابھی اپنا وعدہ پورا کرسکتے ہیں لیکن احمد شیخ کو یہاں اذیتیں دی جائیں گی تو وہ چیخے گا، چلائے گا۔ اس کی چیخ و پکار سن کر محلے والے جمع ہو جائیں گے اور اس طرح ہم قانونی گرفت میں آجائیں گے۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ میں سوچنے لگا۔ اس نے کہا۔

"ہم نے احمد شیخ کو جہاں قید کیا ہے، وہیں اسے ہلاک کرسکتے ہیں۔"

"ہم کیسے یقین کریں کہ تم سچ مچ اسے ہلاک کروگے۔ پھر یہ کہ روزینہ اپنے بھائی کو اذیتیں برداشت کرتے اور تڑپتے دیکھنا چاہتی ہے یا سننا چاہتی ہے۔ ہاں ایک تدبیر ہے۔ تم جہاں اسے ہلاک کرنا چاہتے ہو، کیا وہاں ٹیلیفون ہے؟"

"ہاں ٹیلیفون ہے مگر اس سے کیا ہوگا؟"

میں نے جواب دیا "اس ٹیلیفون کے ذریعے روزینہ اپنے بھائی کی چیخیں سن سکتی ہے۔ تم وہاں پہنچ کر اس فون نمبر پر رنگ کرو۔ یہاں روزینہ ریسیور اٹھائے گی۔ اسی وقت تم احمد شیخ کی حجامت شروع کردینا۔"

ٹونی نے کچھ حیرانی اور کچھ بے زاری سے پوچھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ روزینہ ایسا کیوں چاہتی ہے؟ کیوں روزینہ تم خاموش کیوں ہو؟"

میں فوراً ہی روزینہ کے دماغ میں بولنے لگا۔ وہ زبان سے وہ باتیں کہنے لگی۔

"بھائی جان کو تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھ کر مجھے سکون ملے گا۔ اگر

یہ نظارہ نہ دیکھ سکی تو کوئی بات نہیں۔ کم از کم ان کی آخری چیخیں تو سُن سکوں گی۔ ویسے تم اس سلسلے میں بحث کیوں کرتے ہو، فرہاد کے مشورے کے مطابق تمھیں صرف اپنے مقصد پر نظر رکھنی چاہیے۔"

"اچھی بات ہے۔" ٹونی نے ادریس کے ساتھ باہر جاتے ہوئے کہا۔" میں ابھی تمھارے بھائی کے پاس پہنچ کر تمھیں کال کروں گا۔"

وہ دونوں باہر چلے گئے۔ میں نے کہا۔" آؤ، اب ہم خواب گاہ میں چلیں۔"

میں نے ایک ہاتھ میں ٹیلیفون اٹھالیا۔ پھر ہم جوانی کے نشے میں ڈگمگاتے ہوئے خواب گاہ میں آگئے۔

وہ بستر کے سرے پر بیٹھ گئی۔ میں ٹیلیفون کو سرہانے کی میز پر رکھ کر لیٹ گیا! اس کے بعد ٹونی کے خیالات پڑھنے لگا۔ روزینہ سے پہلے ضروری تھا کہ میں دشمنوں کی بھی خبر رکھتا اور ان کی حرکتوں کو سمجھتا رہتا۔ پھر یہ بھی ضروری تھا کہ میں اس اڈے سے واقف ہو جاتا، جہاں احمد شیخ کو چھپا کر رکھا گیا تھا۔

اس وقت ٹونی، ادریس سے کہہ رہا تھا۔" تمھارا کیا خیال ہے، کیا ہم فرہاد پر بھروسہ کرسکتے ہیں؟"

ادریس نے جواب دیا۔" فرہاد نے ہسپتال تک صحیح رہنمائی کی ہے اس لیے میں سوچتا ہوں کہ کسی حد تک اس پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ لیڈر کو ہسپتال سے لاتے وقت ہم فرہاد کے ساتھ نہیں رہیں گے۔ اس سے کہا جائے گا کہ وہ فلاں جگہ لیڈر کو پہنچادے! اس وقت تک ہم اس کی نگرانی کرتے رہیں گے۔ جب یقین ہو جائے گا کہ وہ بالکل تنہا ہے، پولیس والے اس کے ساتھ نہیں ہیں اور وہ ہمیں دھوکا نہیں دے رہا ہے تو پھر ہم اسے سرحد پار کرنے کے صحیح مقام تک لے جائیں گے۔"

"ہوں۔ یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔ اب احمد شیخ کا مسئلہ رہ گیا ہے۔ ہم لیڈر کی اجازت کے بغیر احمد شیخ کو ہلاک نہیں کرسکیں گے۔ میں جانتا ہوں، احمد شیخ اتنے کام کا آدمی ہے کہ لیڈر اس سے ناراض ہونے کے باوجود اسے ہلاک کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔"

"پھر کیا ہوگا؟ روزینہ کی شرط کیسے پوری ہوگی؟"

"نہایت آسانی سے۔ ہم احمد شیخ کو تمام حالات سے باخبر کردیں گے اور اس سے کہیں گے کہ وہ فون کے ریسیور کے سامنے بیٹھ کر اتنے درد و کرب سے چیختا رہے جیسے سچ مچ اس کی جان نکل رہی ہو۔ آج شام تک روزینہ اور فرہاد کو کسی طرح بہلا کر رکھنا ہوگا اور یہ یقین دلانا ہوگا کہ احمد شیخ مارا جاچکا ہے۔ ہم کسی شخص کو ہلاک کرکے اس کا چہرہ بگاڑ دیں گے۔ اسے احمد شیخ کے کپڑے پہنا دیں گے اور اس لاش کو روزینہ تک پہنچا دیں گے۔"

میں خاموشی سے بستر پر لیٹا ہوا ان کے منصوبوں کو پڑھ رہا تھا۔ میرے بستر پر ایک نوخیز کلی کھلنے کے لیے بے تاب بیٹھی تھی مگر اسے چھونے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ روزینہ تفریح کا سامان بن کر آئی تھی، ساتھ میں ہنگامہ لائی تھی، لہٰذا پہلے ہنگاموں سے نمٹنا ضروری تھا۔

ان کی دھاندلی اور دھوکے بازی کا علم ہوتے ہی میں اد[illegible] ذہن کو پڑھنے لگا، کیونکہ اس وقت وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا ٹونی کو اسی ا[illegible] طرف لیے جارہا تھا، جہاں احمد شیخ کو چھپایا گیا تھا۔ اب میں اس جگہ کا [illegible] معلوم کرنا چاہتا تھا۔

میری خیال خوانی کے علم کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان[i] کے اُن حصوں کو سمجھا جائے جنھیں شعور، لاشعور اور تحت الشعور کہتے [ہیں]۔ جب ہم پیدل چلتے ہیں یا کار ڈرائیو کرتے ہیں تو اس وقت کچھ بھی شعوری [یا] لاشعوری طور پر ہماری رفتار یا ڈرائیونگ دماغ کے کنٹرول میں ہوتی ہے۔ اپنے ہم سفر سے باتیں کرتے رہتے ہیں لیکن دماغ چپکے چپکے کہتا [رہتا] ہے کہ [ہم] روڈ سے گزر رہے ہیں۔ اب ملتان روڈ پر مڑ رہے ہیں۔ آگے جاکر [illegible] طرف گھوم جانا ہے۔ مختصر یہ کہ دماغ رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح ا[illegible] دماغ کہہ رہا تھا کہ وہ کن راستوں سے گزرتا ہوا شاہدرہ کی طرف جارہا [ہے]۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ایک ویران سے مکان کے سامنے [کار روک] دی۔ میں نے اس کی سوچ کے ذریعے اس مکان کا مکمل پتہ معلوم کرلیا! بعد میں نے شہباز خان سے سوچ کا رابطہ قائم کیا! اس وقت وہ دفتر میں بیٹھا ہوا میرے ہی متعلق ایک افسر سے گفتگو کررہا تھا اور میری تعریف [میں] زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔

میں نے فون کا ریسیور اٹھا کر اس کے فون کے نمبر ڈائل کیے [رابطہ] قائم ہوتے ہی میں نے کہا۔

"ہیلو شہباز! میری آواز پہچانو۔"

اس نے خوش ہوکر چیختے ہوئے کہا۔" ارے فرہاد! میں تو نقارخانے میں بھی تمھاری آواز پہچان سکتا ہوں۔ تم اس وقت کہاں ہو؟"

"میں سمن آباد میں ہوں۔ میرے پہلو میں وہی حسینہ ہے جس کے لیے تم نے مجھے چیلنج کیا تھا۔"

"کیا واقعی؟" اُس نے حیرانی سے پوچھا۔" یار! تم اتنی جلدی کامیاب کیسے ہوگئے؟ کوئی طلسمی جڑی بوٹی سونگھا دی ہے کیا؟"

"ہاں۔ کچھ ایسی ہی بات ہے مگر اب تم کام کی بات سنو۔ تمھارے پاس وطن دشمنوں کی جو فہرست ہے کیا اُس میں احمد شیخ کا نام ہے؟"

"ہاں۔ وہ تو سرِفہرست ہے۔ وہ پنڈی کا رہنے والا ہے۔ [کچھ] دنوں پہلے سیکریٹریٹ میں ایک اعلیٰ عہدے پر تھا مگر اب قانون سے [چھپتا] پھر رہا ہے۔ کیا تم اس کے متعلق کچھ جانتے ہو؟"

"ہاں میں جانتا ہوں کہ اس وقت وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ دشمن ملک کے چند جاسوس بھی ہیں۔"

شہباز کی بے چینی بڑھ گئی۔ وہ فرض شناس افسر تمام روداد [سننے کے] لیے ایک دم بےچین ہو گیا! اس نے کہا۔" فرہاد! وقت ضائع نہ کرو۔ جلدی بتاؤ، وہ تمام دشمن کہاں چھپے ہوئے ہیں؟"

میں اسے اُس مکان کا مکمل پتہ بتانے لگا۔ اسے یہ بھی بتادیا کہ بہت محتاط ہوکر اس مکان کا محاصرہ کیا جائے کیونکہ وہ لوگ بھی مسلح ہوں گے ممکن ہے کہ وہ مقابلے پر اتر آئیں۔

میری باتیں سُننے کے بعد شہباز نے اس فون کا نمبر مجھ سے لیا، جو اس وقت روزینہ کے بیڈ روم میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ اس مکان پر چھاپہ مارنے کے بعد وہ مجھ سے دوبارہ رابطہ قائم کرے گا۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اب مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ شہباز سے باتیں کرنے کے دوران ٹونی نے مجھے فون پر کال کیا تھا یا نہیں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے میں ٹونی کے دماغ میں جھانکنے لگا۔

اس وقت وہ احمد شیخ سے کہہ رہا تھا۔" شیخ! اچھی طرح سمجھ لو۔ تمھیں اس طرح چیخنا چلانا ہوگا جیسے تمھیں ذبح کیا جارہا ہو۔ فرہاد اور روزینہ کو اس بات کا شبہ نہ ہو کہ تم ایکٹنگ کررہے ہو۔"

احمد شیخ کا جواب ٹونی کے دماغ سے نشر ہونے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"تم فکر نہ کرو ٹونی۔ میری ایکٹنگ پر انھیں شبہ نہیں ہوگا۔ ویسے مجھے اب یقین نہیں آرہا ہے کہ میری بہن میری جان کی دشمن بن گئی ہے۔"

ٹونی نے کہا۔" دولت اور جائداد کے لیے بیٹا باپ کا گلا کاٹتا ہے اور بھائی بھائی کا خون کرتا ہے۔ تمھاری لاڈلی بہن بھی یہی کررہی ہے۔ یقین کرنا چاہتے ہو تو ریسیور اٹھا کر اسے کال کرو، ابھی پتہ چل جائے گا۔ یوں بھی میں ابھی اسے کال کرنے والا ہوں۔ تم اس سے باتیں کرو۔ جب وہ کہے گی کہ واقعی تمھیں تڑپتے اور مرتے دیکھنا چاہتی ہے تو اسی وقت ہم ڈرامہ شروع کردیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

میں نے اپنے قریب رکھے ہوئے فون کی جانب دیکھا چند لمحے بعد فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے روزینہ سے کہا۔

"تمھارے بھائی کا فون ہے، ریسیور اٹھا کر ہیلو کہو۔"

اس نے ریسیور اٹھا کر "ہیلو" کہا۔ دوسری طرف سے احمد شیخ کی آواز آئی۔ وہ روزینہ کو لاڈلی بہن کہہ کر مخاطب کررہا تھا۔ میں نے روزینہ کی سوچ میں کہا۔

"خبردار! مجھے بہن نہ کہنا۔ میرے وطن کا دشمن میرا بھائی نہیں ہوسکتا۔ میں تم پر تھوکتی ہوں۔ آخ تھو۔۔۔!"

روزینہ میری سوچ کے مطابق کہتی جارہی تھی۔ میری سوچ کے مطابق ہی اس نے تھوک دیا تھا! اس پر احمد شیخ جھلا کر گالیاں دینے لگا۔ میں نے خیال کی اسکرین پر دیکھا۔ ٹونی نے احمد شیخ سے ریسیور چھین لیا تھا وہ کہہ رہا تھا۔

"روزینہ! میں تمھارے بھائی کو ان گالیوں کا مزہ چکھاتا ہوں۔ اب تم اپنے ریسیور سے اس کی چیخ و پکار سنتی رہو۔"

یہ کہتے ہی ایک چٹاخ کی آواز سُنائی دی جیسے ٹونی نے طمانچہ مارا ہو۔ احمد شیخ چیخنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ طمانچہ نہیں تھا۔ دو ہاتھ سے اس طرح تالی بجائی گئی تھی کہ فون پر طمانچے کی آواز معلوم ہو۔

میں نے روزینہ کے ہاتھ سے ریسیور لے کر میز پر رکھ دیا ریسیور سے احمد شیخ چیخ رہا تھا۔" ہائے، میں مرگیا۔۔۔۔"

اُس کی غیرت مرچکی تھی۔ پہلی بار اس کی غیرت اُس وقت مرگئی تھی جب وہ غدار بن کر اپنے ملک کے اہم راز بیچ رہا تھا۔ دوسری بار اس کی غیرت یوں مری تھی کہ اس کی بہن اپنے جسم کو سستا کررہی تھی۔ میں نے بہن کا لفظ غلط استعمال کیا کیونکہ ماں، بہن، بیٹی سب ہی کی ہوتی ہیں۔ امیر ہو یا غریب، دوست ہو یا دشمن، سب ہی کی عزت ہوتی ہے لیکن روزینہ کسی کی بہن نہیں ہوسکتی تھی۔ کوئی محبِ وطن ایسی عورت کو بہن نہیں کہے گا جو اپنے بھائی کے شانہ بشانہ اپنے وطن سے دشمنی کررہی ہو اس لیے میں اس سے دشمنی کررہا تھا۔

اسی وقت میز پر رکھے ہوئے ریسیور سے فائرنگ کی آواز سُنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ شہباز خان نے ریڈ کیا ہے۔ شاید کسی کو گولی لگی تھی۔ ریسیور کے قریب ہی کسی کی چیخ سنائی دی۔ روزینہ کے حلق سے بھی ایک چیخ نکلی پے در پے فائرنگ سے ہماری خوابگاہ یوں گونج رہی تھی جیسے اسی خوابگاہ میں فائرنگ ہورہی ہو۔ روزینہ پر کسی نے فائرنگ نہیں کی تھی۔ کسی نے اسے ذبح نہیں کیا تھا مگر اس نے نظریں جھکالیں۔

ایک مغرور لڑکی نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

میں نے کہا۔ "تم آنکھیں بند کرو آدھ گھنٹے کے بعد بیدار ہو جانا!"

اس نے حکم کے مطابق آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت ریسیور سے بھی فائرنگ کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ میں نے ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔ پھر اپنے کپڑے اٹھا کر باتھ روم میں چلا گیا

آدھ گھنٹے بعد میں شیو کر کے اور غسل کر کے تازہ دم ہو گیا۔ باتھ روم سے نکل کر بیڈ روم میں آیا۔ روزینہ بیدار ہو گئی تھی اور ملازمہ کو بلا کر پوچھ رہی تھی کہ میں کہاں چلا گیا ہوں۔ میں نے کمرے میں آ کر کہا۔ "میں یہاں ہوں۔"

میری آواز سنتے ہی اس نے جلدی سے چادر کو اٹھا کر اپنے جسم کو ڈھانپ لیا۔ اس وقت وہ دوسرے مزاج کی لڑکی تھی۔ تنویمی عمل کے دوران اس پر جو کچھ گذری تھی، وہ اسے یاد تھا اور ان رنگین یادوں سے محظوظ ہو رہی تھی مگر تنویمی عمل سے آزاد ہو کر پھر اس کا غرور مجبور کر رہا تھا کہ اسے کسی مرد سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔

وہ کش مکش میں مبتلا تھی۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور ملازمہ کو گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے یاد آ گیا تھا کہ اس کے پاس ایک عدد ٹائم بم ہے۔ ہو سکتا تھا کہ اس وقت وہ بستر کے نیچے وہی ٹائم بم رکھنے آئی ہو۔ اس نے جھکی جھکی نظروں سے محسوس کر لیا کہ میں اُسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ گھوم کر خوابگاہ سے باہر جانے لگی۔

میں نے روزینہ کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا غرور ٹوٹ چکا ہے۔ اب تم لباس پہنو یا نہ پہنو، چادر میں خود کو چھپاؤ یا نہ چھپاؤ، تم ننگی ہو اور ننگی رہو گی۔ میں تم پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا۔"

وہ اپنی توہین کے احساس سے سُرخ ہو گئی۔ میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ اس سے منہ پھیر کر بیڈ روم کے باہر آ گیا۔ ملازمہ کوٹھی کے باہر جا رہی تھی۔ میں اس کے پیچھے جاتے ہوئے اس کی سوچ کو پڑھنے لگا۔

وہ یوسف کے متعلق سوچ رہی تھی۔ وہی یوسف جو ٹونی کا آلۂ کار تھا اور ملازمہ کے پاس ٹائم بم لے کر آیا تھا۔ ملازمہ کی سوچ کے مطابق یوسف کوٹھی کے باہر اس کا انتظار کر رہا تھا اور وہ بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔

میں نے باہر آ کر دیکھا۔ یوسف میری کار کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ ملازمہ اس کے قریب پہنچ رہی تھی۔ یوسف مجھے دیکھتے ہی پلٹ کر جانے لگا۔ میں نے اسے آواز دی۔

"یوسف! رُک جاؤ۔ بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔"

میرے للکارتے ہی وہ بھاگنے لگا۔ میں نے اس کی سوچ میں کہا۔ "بہت تیزی کی۔ میرے پاؤں کانپ رہے ہیں۔ دائیں سے بائیں لڑکھڑا رہے ہیں۔"

وہ دوڑتے وقت اپنے دماغ کے تابع تھا اس لیے جب دماغ نے کہا کہ وہ لڑکھڑا رہا ہے تو وہ فوراً ہی لڑکھڑا کر گر پڑا۔ میں نے دوڑ کر اس کی گردن پکڑ لی اور کہا۔

"اٹھو۔ کوٹھی میں واپس چلو۔"

وہ گھبرا کر بولا۔ "نن۔ نہیں۔ میں کوٹھی کے اندر نہیں جاؤں گا۔"

میں نے کہا۔ "کیسے نہیں جاؤ گے۔ تمہارا باپ بھی جائے گا۔"

میں اسے کھینچ کر لے جانے لگا۔ ملازمہ نے میرے راستے میں آ کر کہا۔

"چھوڑ دے بابو۔ یہ میرا مرد ہے۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ بم میں ابھی بستر کے نیچے رکھ کر آئی ہوں، تو مجھے پکڑے۔"

میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس وقت مجھ سے سخت بھول ہوئی تھی۔ اگر میں بیڈ روم میں ملازمہ کے خیال کو پڑھ لیتا تو وہیں پتہ چل جاتا۔ روزینہ اس وقت موت کے بستر پر بیٹھی ہے۔ میرے سوچنے کی دیر تھی کہ اندر یکبارگی زبردست دھماکہ ہوا۔ پتہ نہیں روزینہ کو تڑپنے کا موقع ملا تھا یا نہیں۔ دھماکے کی آواز سے میرے ذہن کو بھی جھٹکا پہنچا تھا۔ آس پاس کی کوٹھیوں سے بھی عورتوں کے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ گھبرا کر چیختی ہوئی کوٹھیوں سے باہر آ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ مرد بھی تھے۔ ملازمہ نے یوسف کو کھینچتے ہوئے کہا۔

"اگر تم چاہتے ہو کہ لوگوں سے جوتے نہ کھاؤ تو پھر یہاں سے چلو۔ میرے ساتھ کار میں بیٹھو۔ چلو جلدی کرو۔"

میرا دوستانہ رویہ دیکھ کر وہ ملازمہ کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے لگا۔ میں نے اسے کھینچ کر اگلی سیٹ پر بٹھایا۔ پھر جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر کار اسٹارٹ کی اور تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔

لوگ دھماکے سے اس قدر خوفزدہ ہوئے تھے کہ کوئی اس کوٹھی کے قریب نہیں آیا تھا۔ شاید انھیں اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ دھماکہ پھر ہو سکتا ہے۔ ان کے قریب نہ آنے سے مجھے اتنا موقع مل گیا کہ میں نے پولیس والوں کے سوالوں، ان کے لاتوں اور جوتوں سے خود کو بچا لیا۔

اُس علاقے سے دُور ہونے کے بعد جب ذرا اطمینان ہوا تو سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ میں ننگے پاؤں بھاگ کر چلا آیا تھا۔ جوتے پلنگ کے پاس رکھے ہوئے تھے۔ وہ بھی بستر کے ساتھ اُڑ گئے ہوں گے اور اس بستر پر روزینہ بھی بیٹھی ہوئی تھی۔

آہ! زندگی کتنی ناپائیدار ہے۔ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے وہ پارے کی طرح مچل رہی تھی۔ اس کی ہر ادا بتا رہی تھی کہ اس کے اندر زندگی کی حرارت ہے۔ وہ آئندہ بھی زندہ رہنا چاہتی ہے اور اپنی جوانی کی آگ سے مجھ جیسوں کو بھی زندہ اور تازہ دم دیکھنا چاہتی ہے۔

انسان اپنی آئندہ زندگی کے متعلق بہت دُور تک سوچتا ہے مگر اگلے پل کی خبر نہیں ہوتی۔ ایک ٹھوکر لگتی ہے یا دھماکہ ہوتا ہے اور زندگی شیش محل ایک چھناکے سے ٹوٹ جاتا ہے اور جوانی کی سیج پر پھولوں کی پتیاں بکھر جاتی ہیں۔

مجھے یہ سوچ کر عجیب سا لگ رہا تھا کہ جو حسینہ ثابت و سالم ابھی میرے ہاتھوں میں کھیل رہی تھی، اب اس کے بدن کے چیتھڑے اُڑ گئے ہیں۔ بعض سچائیوں کو آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ میں اسی کے متعلق سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ یوسف نے پوچھا۔

"آپ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟"

اسے جواب دینے سے پہلے ہی منزل آ گئی۔ آئی بی ڈیپارٹمنٹ والوں کی عمارت کو دیکھتے ہی اس نے سہم کر کہا۔

"آ۔ آپ ہمیں کس جہنم میں لے آئے ہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "تم نے جنت میں جانے کا کوئی کام نہیں کیا تھا اس لیے تمہیں جہنم میں لے آیا ہوں۔"

کار عمارت کے سامنے رُک گئی۔ وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑنے اور پاؤں پڑنے لگا۔ ملازمہ بھی منتیں کرنے لگی کہ انھیں قانون کے حوالے نہ کیا جائے۔ میں نے یوسف کے سر پر ایک چپت جما کر کہا۔

"چپ چاپ میرے ساتھ چلو۔ نہ تمہیں معافی ملے گی، نہ بھاگنے کا موقع ملے گا۔"

میں کار سے اُتر کر اسے کھینچتا ہوا سب انسپکٹر کے کمرے میں لے آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ یوسف اور ملازمہ کو حراست میں رکھے اور مجھے اپنے کسی افسر سے ملائے۔ میں جانتا تھا کہ شہباز خان اپنے مشن سے ابھی واپس نہیں آیا ہو گا۔ اگر وہ موجود ہوتا تو میرا نام سنتے ہی بھاگا چلا آتا۔ ویسے بھی میری توقع سے زیادہ وہاں میرا نام تمام افسران کی زبان پر تھا، کیونکہ میری آمد کی اطلاع ملتے ہی ایک افسر فوراً ہی چلا آیا۔ اس نے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"مسٹر فرہاد! آپ کی اطلاع بالکل درست تھی۔ احمد شیخ اور دوسرے مجرم گرفتار ہو گئے ہیں۔ شہباز خان نے بڑی کامیابی سے محاصرہ کر کے انھیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ اب انھیں لے کر یہاں پہنچنے ہی والا ہے۔"

میں نے کہا۔ "چلو اچھا ہے۔ شہباز سے یہیں ملاقات ہو جائے گی۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے اس ہال نما کمرے میں پہنچے، جہاں پہلے میں مجرم کی حیثیت سے لایا گیا تھا۔ وہاں دوسرے افسران جمع ہو رہے تھے۔ کیونکہ شہباز مجرموں کو لے کر وہاں آنے ہی والا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ڈائریکٹر جنرل نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ پھر اپنے قریب ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"فرہاد! تمہیں احمد شیخ اور اس کے ساتھیوں کے خفیہ اڈے کا علم کیسے ہو گیا؟"

میں نے قریب جھک کر آہستگی سے کہا۔ "میرے پاس معلومات کا ذریعہ ہے۔ اس کے متعلق میں صرف آپ کو اور شہباز کو تنہائی میں بتاؤں گا۔"

میں نے یہ بات اس لیے آہستگی سے کہی کہ دوسرے افسروں کو بُرا نہ لگے۔ تھوڑی دیر بعد شہباز مجرموں کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ ٹونی اور ادریس مجھے افسروں کے درمیان بیٹھے دیکھ کر یہ خیال قائم کرنے لگے کہ میں بھی انٹیلی جنس کا ایک افسر ہوں جو ایک لمبا جال پھیلا کر انھیں یہاں تک لے آیا ہے۔ وہ مجھے گھور گھور کر کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

میں نے احمد شیخ کو پہلی بار دیکھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا خبیث تھا۔ اسے دیکھ کر اس کی بہن یاد آ گئی۔ اگرچہ وہ بھی دشمن تھی مگر مجھے اس کی موت کا افسوس ہوا۔ بے چاری نے جاتے جاتے تھوڑی دیر کے لیے اپنی جوانی کا قیمتی سرمایہ میرے حوالے کیا تھا۔ خدا اسے کروٹ کروٹ دوزخ نصیب کرے۔ آمین!

ڈائریکٹر جنرل نے حکم دیا کہ مجرموں کو فی الحال حوالات میں رکھا جائے۔ فرہاد سے ضروری گفتگو کرنے کے بعد ان مجرموں کو دوبارہ طلب کیا جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ مجھے اور شہباز کو اپنے ساتھ اپنے ایک پرائیویٹ ساؤنڈ پروف کمرے میں لے گیا۔

ڈائریکٹر جنرل نے ایک بڑی سی میز کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"فرہاد! پہلے ہمیں تم پر اعتماد نہیں تھا لیکن جس طرح تم نے محمود حسن کے جبڑوں کے قریب فلم کی بُو سونگھ لی تھی اور وہاں تک ہماری رہنمائی کی تھی، اس سے تم پر اعتماد قائم ہو گیا۔ تم نہیں جانتے کہ تم نے کتنے اہم رازوں کو دشمنوں تک جانے سے بچا لیا ہے۔ پھر احمد شیخ اور دوسرے مجرم بھی تم نے ہی گرفتار کرائے ہیں۔ ہم تمہارے ان کارناموں کو بھلا نہیں سکتے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ آئندہ کسی مرحلے پر ہمارے دل میں تمہاری طرف سے کوئی بدگمانی پیدا ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کے سامنے پوری سچائی سے آئیں اور کوئی جھوٹ ایسا نہ بولیں جو بعد میں تلخیاں پیدا کرے۔"

میں نے ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اب ہمارے درمیان کوئی پردہ نہ رہے۔ پہلے میں نے یہ ظاہر کیا تھا کہ مجھ میں سونگھنے کی صلاحیت ہے اس صلاحیت کی بدولت میں نے سامی کو لے جانے والے دشمنوں کا پیچھا کیا اور محمود حسن قیدی کے جبڑے کے پاس چھپی ہوئی مائکرو فلم کا پتہ چلا لیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس سونگھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔"

"تو پھر؟" ڈائریکٹر جنرل اور شہباز دونوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن صاحب میرے منہ کو تکتے ہوئے سوچنے لگے۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔ اگر اس کے پاس سونگھنے کی صلاحیت نہیں ہے تو پھر یہ جبڑے کے پاس چھپی ہوئی مائکرو فلم تک کیسے پہنچ گیا؟"

میں نے شبیر حسن صاحب سے مسکرا کر کہا۔

"جناب! اس وقت ابھی آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے اگر میرے پاس سونگھنے کی صلاحیت نہیں ہے تو میں جبڑے کے پاس

چھپی ہوئی مائکروفلم تک کیسے پہنچ گیا؟"

شبیر حسن نے پھر ایک بار چونک کر کہا۔

"ارے واقعی میں ابھی یہی سوچ رہا تھا۔"

شہباز سوچنے لگا "کمال ہے میرا یار تو عجیب عجیب صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہا ہے۔"

میں نے شہباز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اور تم اس وقت یہ سوچ رہے ہو کہ تمھارا یار تو عجیب عجیب صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہا ہے۔"

شہباز اپنی کرسی سے اچھل پڑا اور حیرانی سے بولا "خدا کی قسم میں یہی سوچ رہا تھا۔ ارے تم کیا جادو جانتے ہو؟ جادو نہیں سوری ——— یہ تو ٹیلی پیتھی ہے۔"

ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن نے تعجب سے پوچھا "کیا تم ٹیلی پیتھی جانتے ہو؟ خیالات کو پڑھ لیتے ہو؟"

"جی ہاں" میں نے کہا "آپ کی اس میز پر چند کونفیڈنشل فائلیں رکھی ہوئی ہیں۔ ان فائلوں میں کیا ہے؟ یہ شاید آپ کے سوا کوئی نہیں جانتا لیکن میں بتا سکتا ہوں۔"

شبیر حسن اور شہباز دونوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی میں خیال خوانی جانتا ہوں۔ حالانکہ ابھی میں خیال خوانی کا مظاہرہ کر چکا تھا۔

شبیر حسن نے ایک فائل اٹھا کر کہا "اچھا بتاؤ، اس کے پہلے صفحے پر کیا لکھا ہوا ہے؟"

میں نے کہا "میں اس طرح نہیں بتا سکوں گا۔ ٹیلی پیتھی کا علم جاننے والے صرف خیال پڑھ سکتے ہیں۔ آپ اس فائل کو کھول کر دل ہی دل میں اس کا پہلا صفحہ پڑھیں، پھر دیکھیے کہ میں کس طرح آپ کے خیال کے ذریعے اس فائل کا راز چرا لیتا ہوں۔"

شبیر حسن نے پھر ایک بار بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے سوچا۔ "کیا واقعی یہ ہمارے فائلوں میں چھپے ہوئے راز تک پہنچ جائے گا؟ اس کی صلاحیتیں تو یہی بتا رہی ہیں۔"

میں نے ان سے کہا "جناب! جو کچھ آپ سوچ رہے ہیں، میں اسے پڑھ رہا ہوں۔ میں یقیناً فائلوں میں چھپی ہوئی تحریروں تک پہنچ سکتا ہوں۔ آپ پڑھیے تو سہی۔ . . ."

وہ فائل کھول کر پڑھنے لگے۔ وہ خاموش تھے، صرف ان کا دماغ فائل کے پہلے صفحے کی تحریر پڑھ رہا تھا۔ تحریر کے پہلے حصے میں ایسی کوئی بات نہ تھی جس سے راز فاش ہونے کا خدشہ ہوتا اس لیے وہ اطمینان سے پڑھ رہے تھے۔ جب ان کا دماغ ایک سطر پڑھ لیتا تو میں اسی وقت اس سطر کو زبان سے دُہرا دیتا۔ دو چار سطروں کے بعد ہی انھوں نے فائل بند کر کے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"خدا کی قسم فرہاد! تم بہت خطرناک ہو۔ یعنی دشمنی کے دوران خطرناک ہو اور دوستی کے دوران رحمت کے فرشتے ہو۔"

شہباز نے پوچھا "تم نے اس صلاحیت کو ہم سے کیوں [illegible]"

میں نے جواب دیا "پہلے مجھے مجرم سمجھا جا رہا تھا۔ آپ [illegible] یہ معلوم ہو جاتا کہ میں ٹیلی پیتھی جانتا ہوں تو پھر آپ لوگ بھی [illegible] کرتے۔ میری طرف سے ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا کہ میں آپ [illegible] تک پہنچ رہا ہوں اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ [illegible] صلاحیت پیش کروں۔ یہ قدرتی صلاحیتیں ہیں اور [illegible] ذریعے دوسرے تمام رازوں تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ [illegible] جلد ہی میری طرف سے مطمئن ہو گئے۔ اس دوران میں نے [illegible] پڑھے۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ شہباز مجھ پر اعتماد [illegible] دل سے اپنا دوست سمجھ رہا ہے تو میں نے فیصلہ کر لیا [illegible] کام آؤں گا اور اسے بتا دوں گا کہ میں خیال خوانی کے ذریعے [illegible] سوچ کو پڑھ لیا کرتا ہوں۔"

ڈائریکٹر جنرل نے کہا "فرہاد! تم حیرت انگیز صلاحیتوں کے [illegible] ہو۔ یہ صلاحیتیں تمھیں غلط راستوں پر بھی لے جا سکتی ہیں اور صحیح [illegible] بھی۔ تم نے صبح سے اب تک ہمارے کام آ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ [illegible] محب وطن ہو اور ان دنوں صحیح راستے پر چل رہے ہو۔ میں چاہتا ہوں [illegible] بھی تم اسی راستے پر چلتے رہو۔ کیا تم میرے محکمے میں کام کرنا پسند کرو گے؟"

میں نے جواب دیا "ایک بار شہباز نے بھی یہی سوال کیا تھا [illegible] کہا تھا کہ میں وطن کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہوں لیکن [illegible] مستقل نہیں کروں گا۔ شہباز کو جب بھی میری ضرورت ہوگی میں اس کے [illegible] آیا کروں گا۔"

"تمھیں باقاعدہ ملازمت کرنے میں اعتراض کیوں ہے؟ [illegible] سمجھنے کی کوشش کرو۔ جن محکموں میں بہت زیادہ رازداری برتی جاتی [illegible] وہاں محکمے کے تمام افراد پر بھی مکمل اعتماد نہیں کیا جاتا، کجا یہ کہ تم محکمے [illegible] کوئی تعلق ہی نہیں رکھنا چاہتے ہو۔ صرف قانون اور دفتری امور [illegible] کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ لہٰذا میں تمھیں بہترین مشورہ دیتا ہوں [illegible] یہاں باقاعدہ ملازمت کرو اور ٹریننگ حاصل کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں [illegible] تم پر زیادہ پابندیاں نہیں ہوں گی۔ تم یہاں اپنی مرضی سے آیا کرو گے [illegible] معاملات میں تمھیں صرف مشورے دیا کروں گا۔"

شہباز نے کہا "ٹھیک ہے فرہاد، تم ہاں کہہ دو۔ اگر تم دفتر [illegible] گے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم تم سے رابطہ قائم کر لیا کریں [illegible] یہاں صرف تمھارا نام ملازم کی حیثیت سے درج ہونا چاہیے۔ باقی [illegible] ہو گا اسے تم اپنی ذہانت اور صلاحیتوں سے کرتے رہو گے اور میں [illegible] تمھارے ساتھ رہا کروں گا۔"

میں نے ڈائریکٹر جنرل سے کہا "مجھے آپ کی پیشکش منظور [illegible]

آپ ایک بات کی وضاحت کر دیں۔ کیا مجھے کچھ عرصے کے لیے اس ملک سے باہر جانے کی اجازت مل سکے گی؟"

"تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"وہاں، جہاں وہ لوگ میری سامی کو لے گئے ہیں۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کے بُرے وقت میں کام آیا کروں گا اور اس وقت وہ دشمنوں میں گھری ہوئی ہے۔"

"کسی عورت کے عشق میں گرفتار ہو کر اپنے ملک کو چھوڑنا دانشمندی نہیں ہے۔ اس طرح تمھاری صلاحیتوں کو زنگ لگ جائے گا۔"

"اگر عشق سے نقصان نہ پہنچے، فائدہ پہنچے، مثلاً کوئی عاشق اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کی خاطر کُدال چلا کر دودھ کی نہر نکالتا ہے۔ محبوبہ ملے یا نہ ملے مگر بستی والوں کو پینے کے لیے دودھ مل جاتا ہے۔ تو ایسا عشق فائدہ مند ہوتا ہے۔ اگر میں سامی کے عشق میں وہاں جاؤں اور وہاں وہی رول ادا کروں جو اس ملک کے سیکرٹ ایجنٹ یہاں کر رہے ہیں تو کیا اس سے ہمارے ملک کو فائدہ نہیں پہنچے گا۔ کم از کم اتنا فائدہ تو پہنچے گا کہ وہاں دشمن ہمارے ملک کے خلاف جو منصوبے بنائیں گے میں ان سے واقف ہو جایا کروں گا اور وہیں بیٹھے بیٹھے ان منصوبوں کا خاتمہ کر دوں گا۔"

ڈائریکٹر جنرل نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "اچھا میں تمھاری تجویز پر غور کروں گا۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم احمد شیخ سے کچھ اہم باتیں اگلوا سکیں۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "جناب! مجرموں سے جبراً کوئی بات اگلوانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا آپ اتنی جلدی میری صلاحیتوں کو بھول گئے ہیں۔ میں تو یہاں بیٹھے بیٹھے احمد شیخ کے خیال سے اہم باتیں چُرا کر آپ کے سامنے پیش کر سکتا ہوں۔"

"اوہ ہاں۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ کیا تم ابھی اس کے خیالات پڑھ سکتے ہو؟"

"جی ہاں" میں نے خاموش ہو کر احمد شیخ سے ذہنی رابطہ قائم کیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے ڈائریکٹر جنرل سے کہا "احمد شیخ اور ٹونی آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ احمد شیخ کہہ رہا ہے کہ ٹونی نے فرہاد پر بھروسہ کر کے انھیں مصیبت میں گرفتار کرایا ہے اور ٹونی کہہ رہا ہے کہ احمد شیخ کی بہن نے فرہاد سے یاری کر کے انھیں اس انجام تک پہنچایا ہے۔

ایسی صورت میں وہ خاموش نہیں رہیں گے اور احمد شیخ کو اپنے مقصد کی طرف موڑنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ تنہا اور خاموش رہے۔ آپ ان دونوں کو الگ الگ کمروں میں قید کرا دیں۔ اس کے بعد میں احمد شیخ سے تمام ڈھکی چھپی باتیں اگلوا لوں گا۔"

ڈائریکٹر جنرل نے اسی وقت انٹرکام کے ذریعے حکم دیا کہ احمد شیخ اور ٹونی کو علیحدہ علیحدہ کمروں میں بند کیا جائے۔ اس کے بعد انھوں نے پوچھا۔

"یہ احمد شیخ کی بہن کا کیا قصہ ہے؟ کیا ٹونی دُرست کہہ رہا ہے [illegible] کی بہن نے تم سے یاری کی ہے؟"

[illegible] کی بہن تھی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ . . ."

میں مختصر طور سے بتانے لگا کہ کس طرح میں اس کے ذریعے ٹونی اور احمد شیخ تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے ان رنگین لمحات کا ذکر نہیں کیا جو روزینہ کے ساتھ گزارے تھے مگر شہباز زیرِ لب مسکراتے ہوئے مجھے دیکھنے لگا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ میں فون پر کیسی کیسی جذباتی آوازیں اسے سنا رہا تھا اور اپنے یار کو چھیڑ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اطلاع ملی کہ احمد شیخ اور ٹونی کو علیحدہ کمروں میں بند کر دیا گیا ہے۔ میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور احمد شیخ کے دماغ میں جھانکنے لگا۔

اس وقت وہ جھلایا ہوا تھا اور زیرِ لب ٹونی کو گالیاں دے رہا تھا۔ میں نے اس کی سوچ میں سمجھایا

"اب جھنجلانے سے کیا فائدہ۔ غیر آخر غیر ہوتے ہیں ——— میں غیروں کے لیے اپنے ملک سے دشمنی کرتا رہا۔ اس کا نتیجہ کیا ملا؟ جھولی شنکر مجھے الزام دے رہا ہے کہ وہ میری غلطیوں کے باعث گرفتار ہوا ہے۔ اب یہ ٹونی بھی الزام لگا رہا ہے کہ میری بہن روزینہ نے فرہاد سے آشنائی کی اور سب کو گرفتار کرا دیا۔ میں برسوں سے ان کے کام آ رہا ہوں۔ اس کا صلہ مجھے یہ مل رہا ہے۔ میں اپنوں میں ہوں نہ بیگانوں میں۔ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ اب تو میں بُری طرح پھنس گیا ہوں مگر اب ٹونی وغیرہ کو بھی نکلنے نہیں دوں گا۔ بلکہ ان دشمنوں کو بھی گرفتار کراؤں گا جو میرے ملک کے خلاف تخریبی کارروائیوں میں مصروف ہیں۔ مجھے ایک ایک کر کے ان کے نام اور ٹھکانوں کے متعلق سوچنا چاہیے . . . ."

اس کے دماغ میں اتنا سوچنے کے بعد میں خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے طور پر سوچنے لگا

"نہیں۔ اب کون ایسا تخریب کار رہ گیا ہے جسے میں گرفتار کراؤں۔ میرے علم میں کوئی ایسا نہیں ہے۔ جو لوگ تھے ان میں سے کچھ فرار ہو گئے ہیں۔ ٹونی بتا رہا تھا کہ وہ سلمٰی قادر (سامی) کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ باقی جو بچے تھے وہ گرفتار ہو کر یہاں آ گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ٹونی کچھ تخریب کاروں کو جانتا ہو۔ وہ جھولی شنکر کا دست راست ہے۔ اسے ضرور علم ہونا چاہیے۔"

میں نے احمد شیخ سے خیال کا رابطہ ختم کر دیا۔ پھر ڈائریکٹر جنرل سے وہ تمام باتیں بتائیں جو احمد شیخ کے دماغ سے نکلتی رہی تھیں۔ اس کے بعد [illegible] نے ٹونی سے رابطہ قائم کیا۔ وہاں بھی وہ جھنجلایا ہوا تھا اور احمد شیخ کو گالیاں دے رہا تھا۔ میں نے اس کی سوچ میں کہا۔

"خواہ مخواہ جھنجلانے سے کیا فائدہ؟ ابھی مجھے احمد شیخ کی بہن روزینہ کے متعلق سوچنا چاہیے۔ پتہ نہیں وہ ٹائم بم کا شکار ہو چکی ہے یا

نہیں۔ یوسف سے بھی رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو پھر فرہاد سے یاری کرے گی۔ اگر اس دوران شیتل ہمارے لیڈر کو آزاد کرانے کے لیے میری طرح غلطی نہ کرے یعنی روزینہ سے رابطہ قائم نہ کرے تو وہ بچ سکے گا ورنہ وہ بھی فرہاد کی نظروں میں آجائے گا۔

"شیتل"، ٹونی کی سوچ کے ذریعے ایک اور مجرم کا نام معلوم ہوا۔ میں نے اس کی سوچ میں پوچھا۔

"یہ شیتل نہ جانے اس وقت کہاں ہو گا؟"

ٹونی کی سوچ نے کہا "اس کے متعلق کون جان سکتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ وہ تو اندھیرے کا نیب ہے۔ نہ جانے اندھیرے آتا ہے اور پھر کس اندھیرے میں جا کر چھپ جاتا ہے۔ اسے سب ہی بلیک گائیڈ کہتے ہیں۔ بھوانی شنکر بھی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے، کس طرح ان کے حالات سے باخبر رہتا ہے اور کس طرح اچانک ہی آڑے وقت پر ان کی مدد کے لیے پہنچ جاتا ہے؟ بہرحال اب وہی ہماری آخری امید ہے۔ اس مشن میں بھوانی شنکر، احمد شیخ بہت اہم ہیں۔ تیسری اہم شخصیت میری ہے۔ بلیک گائیڈ شیتل خاموشی سے تماشا نہیں دیکھتا ہو گا۔ وہ ہم تینوں کو آزاد کرانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔

میں بہت دیر تک ٹونی کے خیالات پڑھتا رہا۔ اس کے خیالات صرف یہ بتا رہے تھے کہ شیتل بہت ہی خطرناک اور اتنا پُراسرار ہے کہ اس مشن کا لیڈر بھوانی شنکر بھی اس کی رہائش اور مصروفیات کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتا ہے۔

میں نے ڈائریکٹر جنرل کو ٹونی کی سوچ کے متعلق بتایا۔ شیتل کے بارے میں ادھوری معلومات تھیں۔ خود اس کے آدمی یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ بلیک گائیڈ کہاں پایا جاتا ہے اس لیے میں کسی سوچ کے ذریعے شیتل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن نے کہا "پھر تو مجبوری ہے۔ ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا پڑے گا جب تک کہ بلیک گائیڈ اپنے اہم آدمیوں کی آزادی کے لیے ادھر کا رُخ نہیں کرے گا۔"

شہباز نے کہا "بلیک گائیڈ کتنا ہی چالاک اور خطرناک کیوں نہ ہو، وہ اس عمارت کے اندر نہیں پہنچ سکے گا۔"

"ہمیں خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔" میں نے کہا "جس طرح دشمن یہ نہیں جانتے کہ ان سے نمٹنے کے لیے میرے پاس خیال خوانی کی صلاحیتیں ہیں، اسی طرح ہم یہ نہیں جانتے کہ شیتل اپنے آدمیوں کو یہاں سے نکال لے جانے کے لیے کون سا حیرت انگیز حربہ استعمال کرے گا۔"

شبیر حسن نے سر ہلا کر تائید کی "درست ہے۔ ہمیں دشمن کو مزدو یا احمق نہیں سمجھنا چاہیے۔ فی الحال ہم اس کے متعلق کوئی بات یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ بہتر ہے کہ دو چار روز اس بلیک گائیڈ کا انتظار کریں۔

شہباز! اس وقت تک جو مجرم حراست میں ہیں، ان کے خلاف رسمی کارروائیاں کرو۔ ان سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے ایک افسر مقرر کر دو۔ اس طرح دوسروں کو یہ علم نہیں ہو گا کہ ہم فرہاد کی خیال خوانی کے ذریعے پہلے ہی تمام معلومات حاصل کر چکے ہیں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آئے۔ انھوں نے میرے شانے کو تھپک کر کہا۔

"تمھیں پا کر مجھے اپنے اندر ایک ناقابل بیان قوت کا احساس ہو رہا ہے۔ تم میری ہدایات پر عمل کرتے رہو گے تو کوئی دشمن ہماری پاک زمین پر قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ کسی بھی ملک کا جاسوس ہو، وہ ہماری انٹیلی جنس کا نام سن کر تھرّائے گا۔ میں تمھاری صلاحیتوں کے صلے میں کوئی تمغہ تو نہیں دے سکتا۔ ہاں ایک بزرگ کی حیثیت سے تمھیں دعائیں دیتا ہوں کہ خدا تمھاری عمر دراز کرے اور تمھیں ہر آزمائشی مرحلے پر کامیابی عطا کرتا رہے۔"

"آپ کی دعائیں میرے لیے بہت بڑا انعام ہیں۔ انشاء اللہ میری طرف سے آپ کو مایوسی نہیں ہو گی۔"

ہم ایک دوسرے سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔ میں نے شہباز سے دوسرے دن ملنے کا وعدہ کیا اور اپنے گھر واپس چلا آیا۔ پھوپھی اور زرینہ شاہ کوٹ سے واپس آ گئی تھیں۔ وہ میری غیر حاضری سے پریشان تھیں اور میرے ہی متعلق گفتگو کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے ناراضگی سے کہا۔

"تم کہاں غائب ہو جاتے ہو؟ اپنی خیر خیریت کی اطلاع تو دیتے رہا کرو۔"

"پھوپھی جان! آپ نہیں جانتیں، باہر اتنے سارے ہنگامے میرا انتظار کرتے رہتے ہیں کہ آپ تک اپنی خیریت کی اطلاع پہنچانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ میں پہلے بھی آپ کو سمجھا چکا ہوں کہ میری عدم موجودگی سے آپ پریشان نہ ہوا کریں۔ کچھ دنوں بعد میں ایک طویل عرصے کے لیے اس ملک سے باہر جانے والا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میں اچانک ہی چلا جاؤں اور آپ سے ملاقات نہ ہو سکے۔ لہٰذا آپ میری غیر حاضری کی فکر نہ کیا کریں۔"

"پتہ نہیں بیٹا، تم کیا کرتے رہتے ہو۔ یہ کتنا اچھا ہوتا کہ تم کہیں جانے سے پہلے زرینہ کے ہاتھ پیلے کر دیتے۔ تمھارا مشورہ مان کر میں نے اپنی بیٹی کو ظہیر سے منسوب کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ زرینہ جلد ہی دلہن بن کر چلی جائے گی مگر تمھارے چچا کے ہاں تو آئے دن کوئی نہ کوئی ماتم والی بات ہو جاتی ہے۔ پہلے تو تمھاری چچی زہر پی کر مر گئیں۔ اب نئی بات سننے میں آئی ہے کہ کل سے غزالہ غائب ہے۔ غائب کیا ہونا ہے، اپنے کسی عاشق کے ساتھ بھاگ ہو گی۔"

"اسے بھاگنے دیجیے۔ زرینہ کی شادی تو ظہیر سے ہو گی۔ چچی کے مرنے یا غزالہ کے بھاگنے سے کیا اثر پڑے گا؟"

"بہت زیادہ اثر پڑ رہا ہے۔ تم دیکھتے نہیں شادی کا مسئلہ

کھٹائی میں پڑتا جا رہا ہے۔ ان کے ہاں ماتم ہوتا رہتا ہے۔ ان حالات میں میں تمھارے چچا سے یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ وہ میری بیٹی کو بہو بنا کر لے جائیں۔ تم ہی بتاؤ، میں کب تک جوان بیٹی کو گھر میں بٹھائے رکھوں گی؟"

"پھوپھی جان! ان کے ساتھ بھی مجبوری ہے۔ پھر بھی موقع دیکھ کر چچا جان کو قائل کروں گا کہ ان کا گھر ویران ہوتا جا رہا ہے، وہ زرینہ کو اپنے گھر کی رونق بنا کر لے جائیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔"

"بیٹا اطمینان ہی تو نہیں ہے۔ مجھے یہ بات کھٹک رہی ہے کہ تمھارے چچا بالکل کنگال ہو گئے ہیں۔ صرف ظہیر کے نام سے کچھ جائداد رہ گئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ جائداد بھی کسی نئے کاروبار میں لگا کر کنگال ہو جائیں۔ بیٹا اب تو ہماری حیثیت بن گئی ہے۔ زرینہ کے لیے بڑے بڑے گھرانوں سے رشتے آ رہے ہیں۔ ایک لڑکا تو مجھے بہت ہی پسند ہے۔ مجھے کیا زرینہ کو بھی بے حد پسند ہے۔ وہ کہتی ہے ظہیر جیسے مردوں سے شادی نہیں کرے گی۔"

میں سمجھ گیا کہ کوئی بہت ہی دولت مند لڑکا دیکھ کر زرینہ کی نیت بدل گئی ہے اور پھوپھی بھی یہی چاہتی ہیں کہ ظہیر سے رشتہ توڑ دیا جائے۔ مجھے اتنی فرصت کہاں تھی کہ میں رشتے توڑنے اور جوڑنے میں اپنا وقت ضائع کرتا۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ جو ان کے جی میں آئے وہ کریں۔ میں اگر یہاں رہا تو زرینہ کی شادی میں شریک ہو جاؤں گا۔

یہ کہہ کر میں غسل کرنے چلا گیا۔ غسل سے فارغ ہو کر میں نے روٹیاں کھائیں، پھر اپنی خوابگاہ میں آکر آرام سے لیٹ گیا۔

میں تھکن سے چور تھا۔ لیٹتے ہی مجھے سو جانا چاہیے تھا مگر سامی یاد آگئی۔ اسی خوابگاہ میں، میں نے اس کے ہاتھ کا بوسہ لیا تھا۔ اب وہ نرم و نازک سا ہاتھ مجھ سے سینکڑوں میل دور چلا گیا تھا۔

میں کروٹ بدل کر اس کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ رات کا وقت تھا۔ خاموشی تھی، تنہائی تھی۔ سامی کے اطراف بھی خاموشی اور تنہائی تھی۔ میری سوچ کی لہروں نے اسے پکارا۔

"سامی! میں ہوں فرہاد!"

اس کے دماغ نے بتایا کہ وہ یکبارگی اچھل کر بیٹھ گئی ہے۔ پھر وہ بے اختیار مجھے پکارنے لگی۔

"فرہاد۔۔۔ فرہاد! تم کتنے کٹھور ہو، کتنے سنگدل ہو۔ میں اب تک تمھیں ہزاروں بار سوچ کی نگری میں پکار چکی ہوں مگر تم نے پانچ منٹ کے لیے بھی مجھ سے رابطہ قائم کرنا گوارا نہیں کیا۔"

"میں مجبور تھا۔ تمھارے جانے کے بعد یہاں انٹیلی جنس والوں نے مجھے اس الزام میں گرفتار کر لیا تھا کہ میں نے تمھیں سرحد پار بھگا دیا ہے۔ اب تک میں ذہنی طور پر اس طرح الجھا رہا کہ تم سے رابطہ قائم نہ کر سکا۔ اب میں الزامات سے بری ہو گیا ہوں۔ تم بتاؤ، کس حال میں ہو؟"

اس کا جواب سنائی دیا "ابھی تک خیریت ہے۔ مجھے اسی کمرے میں قید کیا گیا ہے جہاں پہلے چھپا کر رکھا گیا تھا۔ یہ لوگ بھی مجھے چھپا عرف سلمیٰ قادر سمجھ رہے ہیں اور اس بلی کے متعلق پوچھ رہے ہیں جو سگنلنگ جانتی تھی۔ میں اب تک ایک ہی جواب پر اڑی ہوئی ہوں کہ بلی بھوانی شنکر کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ بنڈی میں بھوانی شنکر کا ساتھ چھوڑتے وقت میں نے بلی کا بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اب یہ لوگ بھوانی شنکر کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ یہاں آئے گا تب انھیں حقیقت کا علم ہو گا۔ پتہ نہیں وہ کم بخت کہاں مر گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ یہاں نہ آئے۔"

"اس کے نہ آنے سے تمھیں کیا فائدہ پہنچے گا؟"

"فائدہ یہ ہو گا کہ اپنی جو کہانی میں نے یہاں سنائی ہے اسے جھٹلانے والا کوئی نہ ہو گا۔ میں نے ان لوگوں سے کہا ہے کہ ہم سب تمھارے ملک کی انٹیلی جنس کی نظروں میں آگئے تھے۔ ایک بار ان سے زبردست ٹکراؤ ہوا جس کے نتیجے میں ہم سب منتشر ہو گئے۔ جسے جو راستہ بھاگنے کو ملا وہ اسی راستے پر نکل گیا۔ میں بھی وہاں سے بھاگ کر تنہا لاہور چلی گئی تھی اور وہاں ایک نوجوان سے دوستی کر لی تھی۔

میری اس داستان پر ابھی تک کسی آفیسر نے تنقید نہیں کی ہے۔ مجھے یہاں تک لانے والا ایک پائلٹ ہے اور ایک گونگا ہے۔ یہ دونوں نہیں جانتے ہیں کہ پنڈی میں ہم پر کیا گذری تھی اس لیے اب بھوانی شنکر کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ احمد شیخ اور دوسرے سیکرٹ سروس کے ایجنٹ آج رات تک بھوانی شنکر کے ساتھ یہاں پہنچ جائیں گے۔ ان کی آمد تک مجھے اس کمرے میں قید کر دیا گیا ہے۔"

میں نے کہا "تم بے فکر رہو۔ بھوانی شنکر، احمد شیخ اور دوسرے مجرم آج رات وہاں نہیں پہنچ سکیں گے۔ وہ سب یہاں کی انٹیلی جنس والوں کی حراست میں ہیں۔ وہ یہاں سے آزاد ہو کر سرحد پار نہیں کر سکیں گے۔ تم بتاؤ کتنے لوگ تمھاری داستان کی نفی کر سکتے ہیں۔ میں یہیں ان کا قصہ تمام کر دوں گا۔"

اس نے جواب دیا "بھوانی شنکر، احمد شیخ، ٹونی اور ادریس میری اس داستان کو جھٹلا سکتے ہیں۔ کیا تم انھیں وہاں روک سکتے ہو؟"

"وہ سب حراست میں ہیں اور میری نظروں میں ہیں۔ تم ان کی طرف سے مطمئن رہو اور بتاؤ تمھیں کوئی اور خطرہ تو نہیں ہے؟"

"ہاں۔ میرا یہ جسم خطرے میں ہے۔ یہاں کا ایک آفیسر مجھے۔۔۔"

یہ سوچتے سوچتے وہ اچانک سہم کر رُک گئی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے سامی! تم خاموش کیوں ہو گئی ہو؟ کیا کوئی خطرہ پیش آ رہا ہے؟"

"ہاں!" اس کی سوچ نے کہا "یہاں فوج کا ایک کرنل دروازہ کھول کر میرے کمرے میں آگیا ہے۔ پہلے بھی یہ کئی بار مجھے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ چکا ہے۔ یوں تو سب ہی یہاں ہوس بھری نظروں سے دیکھتے ہیں

مگر کرنل کو دلچسپی لیتے دیکھ کر کوئی دوسرا آفیسر مجھے چھیڑنے کی ہمت نہیں کرتا ہے۔ اب یہ میری تنہائی سے فائدہ اٹھانے آیا ہے۔ فرہاد! یہ جسم تمھاری امانت ہے۔ بتاؤ میں اس امانت کو کیسے اس درندے سے بچاؤں؟"

"تم فکر نہ کرو۔ اس سے باتیں کرو۔ میں اس کے لہجے اور گفتگو کے انداز کو سمجھنا چاہتا ہوں۔"

وہ سہمے ہوئے انداز میں کرنل سے کہنے لگی "آپ۔ آپ اتنی رات کو میرے کمرے میں کیوں آئے ہیں؟"

کرنل کے ہنسنے کی آواز سنائی دی "تم اتنی بھولی نہیں ہو کہ میرے آنے کا مقصد نہ سمجھ سکو۔"

"ہوں۔ میں سمجھ گئی۔ تمھارے من میں پاپ ہے۔ تم میری عزت کے دشمن بن کر آئے ہو۔ یہ کتنے شرم کی بات ہے۔ تم نے ماتھے پر تلک لگا رکھا ہے۔ ہاں یاد آیا۔ آج گنیش پوجا ہے۔ تم ابھی پوجا کر کے سیدھے پاپ کرنے چلے آئے ہو۔ چھی چھی۔۔۔۔"

"بکواس مت کرو" کرنل نے جھینپ کر کہا۔ میں اسی وقت اس کے دماغ تک پہنچ گیا۔ واقعی وہ اس بات پر جھینپ گیا تھا کہ پوجا سے فارغ ہوتے ہی پاپ کے خیال سے سامی کے کمرے میں آگیا تھا۔ انسان کے دماغ میں پاپ کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ سامی جیسی حسین اور جوان لڑکی نگاہوں کو للچا رہی ہو، ایسے وقت انسان کے اندر کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ کبھی ضمیر کی آواز سنتا ہے اور کبھی شیطان کی ــــ اور اس وقت اس کے اندر شیطان کہہ رہا تھا۔

"پوجا اپنی جگہ ہے اور پاپ اپنی جگہ۔ جس جگہ گنیش کے آگے سر جھکانا تھا، وہاں سر جھکا لیا۔ یہ جگہ پاپ کے لیے ہے اس لیے یہاں پاپ ہی کرنا چاہیے۔"

یہ کہہ کر وہ سامی کی طرف بڑھنے لگا۔ سامی نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"خبردار! مجھے ہاتھ نہ لگانا، نہیں تو میں اپنی جان دے دوں گی۔۔۔"

میں جانتا تھا کہ سامی کا آخری حربہ یہی ہے۔ کرنل اپنے ارادے سے باز نہیں آئے گا تو وہ بھی اپنے جسم کو بے آبرو نہیں ہونے دے گی، فوراً ہی اپنا جسم چھوڑ کر اسے مُردہ بنا دے گی۔ پھر وہ شیطان اس کی لاش کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔

"رُک جا!" میں نے اس کے ضمیر کی آواز میں کہا "ارے مُورکھ! اگر تُو نے پاپ کیا تو تیری پوجا پھل نہیں ہوگی۔"

"سب کہنے کی باتیں ہیں۔ بند کمرے میں بھگوان بھی دیکھنے نہیں آتے کہ کون کس چھوکری کے ساتھ اپنا منہ کالا کر رہا ہے۔"

اس کے دماغ میں گناہ کی خواہش حاوی ہو رہی تھی۔ اب اس نے سامی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کم بخت پر میرے حربے بھی ناکام ہو رہے تھے۔

میں نے پھر ایک بار کوشش کی اور ذرا بھاری بھرکم سوچ میں کہا۔

"ہے شیو شنکر۔ ہے بھوبے ناتھ۔ ہے پاروتی تیرے لاڈلے گنیش کا ایک سیوک ماپ کے پاتال میں گرتا جا رہا ہے۔ اسے مورکھ کو بچا لے۔۔۔۔"

کرنل ٹھٹھک کر رُک گیا۔ سامی کا ہاتھ چھوڑ کر اس نے اپنے سر کو تھام لیا اور سوچنے لگا "یہ کیسی آواز تھی؟ کیا میرے من کے اندر کوئی بول رہا تھا؟"

"ہاں!" میں نے کہا "تیرے اندر تیرے اچھے کرم بول رہے ہیں۔ اگر تو اب بھی باز نہ آیا تو یہ چھوکری ابھی مر جائے گی۔ تو اس کے شریر سے اپنی پیاس نہیں بجھا سکے گا۔"

وہ کسی حد تک قائل ہو گیا مگر سامی کی طرآر جوانی کی طرف دیکھ کر پھر بہک گیا اور اسے اپنے بازوؤں میں لینے کے لیے آگے بڑھنے لگا۔

میں نے سامی کی سوچ میں کہا "اب یہ ہاتھ پکڑے تو تم تھوڑی دیر کے لیے مُردہ بن جانا۔ تم یہ بتاؤ کہ تمھاری روح تمھارے جسم سے کتنی دیر تک الگ رہ سکتی ہے؟"

"یہ میری قوتِ برداشت پر ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک منٹ تک اپنے جسم سے علیحدہ رہ سکوں گی۔"

"اچھی بات ہے" میں نے کہا "تمھارے مُردہ بن جانے کے بعد جب وہ رام نام جپنے لگے تو اس کے چند سیکنڈ بعد تم اپنے جسم میں آکر آنکھیں کھول دینا۔"

اس دوران کرنل نے سامی کو پکڑ لیا تھا۔ وہ میرے مشورے کے مطابق وقتی طور پر مر گئی۔ اس کے بازوؤں کی گرفت سے پھسلتی ہوئی زمین پر گرنے لگی۔ کرنل نے اسے سنبھال کر فرش پر لٹاتے ہوئے سوچا "ارے، کیا یہ سچ مچ مر گئی ہے؟"

میں نے اسی بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

"ہاں۔ ابھی میں نے تجھے سمجھایا تھا کہ تو باز نہ آیا تو یہ مر جائے گی۔ دیکھ اچھی طرح آنکھوں سے دیکھ۔ اب تو اس کے شریر سے پیاس نہیں بجھا سکے گا۔"

وہ سامی کی نبض اور سانسیں دیکھنے لگا۔ وقت گذرتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی رسٹ واچ میں دیکھا، تیس سیکنڈ گذر گئے تھے۔ اب اس شیطان کو ایمان دھرم کی طرف موڑنا تھا۔ میں نے کہا۔

"اگر تو ایمان دھرم کی سچائی کو آزمانا چاہتا ہے تو رام نام جپنا شروع کر دے، یہ ابھی زندہ ہو جائے گی۔ چل دیر نہ کر۔ جلدی سے رام کا نام لے۔۔۔۔"

وہ سامی کے مُردہ جسم کے سامنے بیٹھ کر بلند آواز سے کہنے لگا ــ

"ہرے رام ہرے کرشنا۔ کرشنا کرشنا ہرے ہرے۔ ہرے رام۔۔۔۔"

چند سیکنڈ کے بعد ہی سامی نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے آنکھ کھولتے دیکھ کر کرنل کا دھرم ایک دم سے زندہ ہو گیا۔ اس نے سمجھا کہ یہ سب رام نام کی لیلا ہے۔ نام جپتے ہی وہ زندہ ہو گئی ہے۔ یہ سمجھتے ہی وہ لہک لہک کر ہرے رام اور ہرے کرشنا کا ورد کرنے لگا۔

سامی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ کرنل اسے دیکھ رہا تھا اور رام نام جپ رہا تھا اور ساتھ ہی سامی کے حسین چہرے اور بھرپور جوانی کے متعلق سوچتا جا رہا تھا۔ ہر مذہب کے اور ہر دھرم کے اکثر لوگوں کی یہ فطرت ہوتی ہے۔ زبان پر اللہ کا نام ہوتا ہے یا رام کا نام ہوتا ہے اور ٹھیک اسی وقت دماغ کی اسکرین پر بلیو فلم چلتی رہتی ہے۔ سچائی بہت کڑوی ہوتی ہے مگر میں کیا کروں۔ میں سوچ نگر کا شہزادہ ہوں۔ ہر انسان کو اس کے اندر سے دیکھتا ہوں اور ان کی اچھی اور بُری سوچوں کا تماشہ دیکھتا ہوں۔

میں اس کی دوغلی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ رام نام جپتے وقت اس کے اندر کے شیطان نے کہا "مجھے کیا ہو گیا ہے! اتنی سُندر چھوکری جوانی کا بازار سجائے بیٹھی ہے اور میں پنڈت بن کر سمے برباد کر رہا ہوں۔ مجھے ذرا عقل سے کام لینا چاہیے۔ یہ ابھی مری نہیں تھی۔ شاید گھبرا کے گر گئی تھی ویسے نبض تو نہیں مل رہی تھی۔ مُردہ ہی نظر آتی تھی۔ پھر بھی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک چھوکری پٹ سے مرے اور پٹ سے زندہ ہو جائے۔ نہیں، جو کچھ بھی ہوا، وہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں اسے پھر پیار کرنے کی کوشش کروں گا۔ اب یہ کوئی کھیل تماشہ تو نہیں ہے کہ میں اسے بار بار ہاتھ لگاؤں گا تو یہ بار بار مرتی رہے گی۔ مجھے پھر ایک بار کوشش کرنا چاہیے۔"

یہ سوچتے ہی وہ رام نام بھول کر سامی کی طرف لپکنے لگا۔ میں نے سامی سے کہا "تم ایک بار پھر مُردہ بن جاؤ۔ اب کی بار اس کا ایمان پختہ ہو جائے گا۔"

سامی نے میرے مشورے پر عمل کیا۔ وہ بیٹھے بیٹھے مُردہ ہو گئی۔ کرنل نے پھر بوکھلا کر اسے دیکھا۔ اسے فرش پر لٹایا۔ ایک بار پھر اس کی نبض اور دل کی دھڑکنوں کو دیکھا۔ سامی کے جسم کا ہر حصہ بے حس و حرکت تھا۔ دل چپ تھا۔ نبض ٹھہر گئی تھی اور دیدے پھیل گئے تھے۔

اس بار کرنل کو نصیحت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ پھر اپنی جگہ بیٹھ کر زور زور سے رام نام جپنے لگا۔ سامی نے دوبارہ آنکھ کھولی تو وہ اور لہک لہک کر پڑھنے لگا۔

میں نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

"مورکھ! تیرا دھرم کمزور ہے۔ تو نے رام نام پر بھروسہ نہیں کیا۔ تو نے اس کنواری کنیا کو ہاتھ لگایا ہے۔ تجھے اس پاپ کا پراشچت کرنا ہوگا۔ نہیں تو اب کی بار تو مر جائے گا۔"

"ن۔ نہیں" اس نے گھبرا کر کہا "میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں اس پاپ کا پراشچت کروں گا۔"

میں نے کہا "اچھا تو پھر اٹھ جا اور کمرے کے باہر جا کر دروازے کے سامنے پلتھی مار کر بیٹھ جا۔ تجھے صبح تک رام نام جپتے رہنا ہوگا اور اس بات کو دھیان میں رکھنا کہ اب تو یا تیرا کوئی ماتحت اس کنیا کو ہاتھ نہ لگائے۔ جا پراشچت کر۔۔۔۔"

ذرا دیر بعد کمرے کے باہر جا کر وہ پراشچت کرنے لگا۔ میں نے سامی کو بتایا کہ میں نے اس کرنل کی کھوپڑی کس طرح الٹ دی ہے۔ اب وہ یا اس کا کوئی ماتحت اس کے جسم کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔

سامی نے خوش ہو کر کہا "تم کتنے اچھے اور کتنے ذہین ہو فرہاد! اگر میں تنہا ہوتی اور یہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آتا تو میں کسی لیڈی انسپکٹر کے روپ میں آکر اسے ہلاک کر دیتی مگر تم نے ایسا کام کیا کہ سانپ بھی نہیں مرا اور مجھے بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ یہ کرنل کے لیے بھی بہتر ہوا۔ وہ صبح تک رام نام جپتے جپتے اپنے لیے سورگ میں جگہ بنا رہا ہے گا۔"

میں نے کہا "سامی! اب بہت رات ہو چکی ہے سو جاؤ۔"

اس نے پوچھا "کیا تم مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو؟"

"یہ بات نہیں ہے سامی! میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ صبح اٹھتے ہی تم سے رابطہ قائم۔۔۔۔"

میں سامی سے کہتے کہتے رُک گیا۔ اسی وقت مجھے کاریڈور سے پھوپھی جان کی چیخ سنائی دی تھی۔ پھر کچھ چیزیں گرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں میری سوچ کی لہروں کے ذریعے سامی تک پہنچ گئیں۔ اس نے پوچھا۔

"فرہاد! یہ کیسی آوازیں ہیں؟"

"سامی! کوئی خطرہ ہے۔ صبح ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ!"

سامی سے رابطہ ختم ہوتے ہی میں نے دروازے کی جانب دیکھا۔ باہر سے کوئی دھکے مار مار کر اسے توڑ رہا تھا۔ دروازہ اندر سے لاکڈ تھا اور ساگوان کی مضبوط لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ اسے توڑنا آسان نہ تھا لیکن دوسرے ہی لمحے پتہ چلا کہ توڑنے والا صرف طاقتور ہی نہیں بلکہ چالاک بھی ہے کیونکہ وہ دروازے کے اس حصے پر دھکے مار رہا تھا جہاں قبضے لگے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھی آہنی دروازے کو توڑ سکے یا نہ توڑ سکے لیکن اس کے قبضوں کو ان کی جگہ سے اکھاڑ سکتا ہے۔

"کون ہے؟" میں نے چیخ کر للکارا۔

جواب میں دروازہ اچانک ہی قبضوں کی طرف سے کھُل گیا اور ایک دیو ہیکل آدمی اچھل کر کمرے میں آگیا۔ وہ سر سے پاؤں تک سیاہ لباس میں تھا۔ تمام چہرہ بھی نقاب میں چھُپا ہوا تھا۔ میں بوکھلا کر اسے تکنے لگا کیونکہ میں فوراً ہی اس کے خیالات پڑھ کر اس کی شخصیت اور اس کے ارادے کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ یہ ارادہ تو صاف ظاہر تھا کہ وہ دشمن بن کر آیا ہے اور مجھے نقصان پہنچانا چاہتا ہے لیکن میں یہ معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مجھے کیوں نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔

میں اس کی سوچ اس لیے نہیں پڑھ سکتا تھا کہ وہ خاموش تھا۔ اس کا چہرہ اور اس کی آنکھیں نقاب میں چھپی ہوئی تھیں۔ لہٰذا اس کی سوچ کی عکاسی نہیں کر سکتی تھیں۔ اس وقت میری خیال خوانی کی صلاحیتیں بیکار ہو گئی تھیں۔

وہ جو کوئی بھی تھا، بہت چالاک تھا، بہت ذہین تھا۔ بڑا زبردست منصوبے باز تھا۔ میرے سامنے آنے سے پہلے اس نے میری صلاحیتوں کو بیکار کر دیا تھا اور اب دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اپنے پہاڑ جیسے قد سے للکار رہا تھا کہ آؤ اور دو دو ہاتھ کر لو۔

وہ کتنا طاقتور ہے، یہ ٹوٹا ہوا دروازہ بتا رہا تھا۔ وہ کون ہو سکتا ہے؟ اس کے سیاہ لباس کو دیکھ کر میرے دماغ میں فوراً ہی ایک دلیر، چالاک اور پُراسرار مجرم کا نام آیا۔

"روشیتل ـــــ دی بلیک گائیڈ۔۔۔۔۔!"

اُس کا سراپا بلیک گائیڈ کی تفسیر پیش کر رہا تھا میں نے محض اندازہ کیا تھا کہ وہ شیتل یعنی بلیک گائیڈ ہی ہو سکتا ہے، میرا اندازہ بعد میں درست ثابت ہوا۔

کاش کہ میں اس کے خیالات پڑھ سکتا۔ نقاب میں آنکھوں کی جگہ دو مدوّر گول سوراخ تھے۔ باقی چہرہ اس نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ میں کسی صورت سے اس کے خیالات نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اب ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ میں اسے بولنے پر مجبور کرتا اور اس کے لہجے اور گفتگو کے انداز سے اس کے سوچنے کے انداز تک پہنچ سکتا۔

میں نے اسے للکار کر پوچھا: "کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟"

اس نے زبان سے کچھ کہنے کی بجائے ہاتھ سے جواب دیا۔ اچانک ہی ایک گھونسہ میری ٹھوڑی پر پڑا۔ میں دور تک لڑکھڑاتا چلا گیا پھر ایک صوفے سے ٹکرا کر گر پڑا۔ وہ ایسا زبردست گھونسہ تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میری ٹھوڑی اور جبڑے دُکھنے لگے، میں فوراً ہی نہ اٹھ سکا۔ اس کے بھاری بھرکم ہاتھوں نے مجھے پیچھے سے پکڑ کر اٹھا لیا میں کوئی ہلکا پھلکا سا کھلونا نہیں تھا۔ ایک اچھا صحت مند نوجوان تھا۔ میرا وزن دو من پندرہ سیر تھا۔ اس نے مجھ جیسے وزنی آدمی کو اٹھا کر آہنی الماری کی طرف پھینک دیا۔ الماری میں قدِ آدم آئینہ لگا ہوا تھا۔ میں جا کر ٹکرایا تو آئینہ چھنا چھن ٹوٹتا چلا گیا۔ شیشے کے ٹکڑوں نے میری پیٹھ اور سر پر زخم لگا دیئے۔ پہلے گھونسے کے نتیجے میں میری باچھوں سے خون رس رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے،

وہ دو زبردست حملے کر چکا تھا اور خود اتنا پھرتیلا تھا کہ مجھے حملہ کرنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔

میں ٹوٹے ہوئے شیشوں کے درمیان فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس بار وہ جیسے ہی میری طرف آیا، میں نے اس کے سینے پر زور کی لات ماری۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے کسی ٹھوس مضبوط دیوار پر لات چلائی ہو۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے میری ٹانگ پکڑ کر مجھے ایک طرف اچھال دیا۔ میں جیسے ہوا میں اڑتا ہوا پلنگ کے ملائم گدے پر آیا پھر وہاں سے لڑھکتا ہوا فرش پر گر پڑا۔

مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ وہ گوشت پوست کا انسان نہیں ہے بلکہ کوئی مشین ہے جو مجھے اِدھر سے اُدھر اچھال کر پھینک رہی ہے۔ اس بار میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن کھڑے ہوتے ہی ڈگمگانے لگا۔ کیونکہ مجھے سخت چوٹیں آئی تھیں اور سر چکرا رہا تھا۔ میں نے اپنی قوتِ ارادی سے کام لے کر اپنے دماغ کو بوکھلاہٹ اور سراسیمگی سے پاک کیا اور شعلہ بار نظروں سے نقاب کے اُن دو سوراخوں کو دیکھنے لگا، جہاں اس کی آنکھیں تھیں۔

وہ حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا لیکن میری نگاہوں کی آتش فشانی سے بوکھلا کر ٹھٹھک گیا۔ میں نے گونجتی گرجتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کون ہو تم؟ فوراً جواب دو۔"

میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب وہ جواب دینے کی بجائے اچھل کر میرے قریب آ گیا۔ اتنا تو سمجھ میں آ گیا کہ وہ زبردست قوتِ ارادی کا مالک ہے میری آنکھیں اسے بیناٹائز نہ کر سکیں، حیرانی اس بات کی تھی کہ میرے بار بار للکارنے کے باوجود وہ خاموشی اختیار کئے ہوئے تھا۔

کیا وہ جانتا تھا کہ میں خیال خوانی جانتا ہوں اور اسے میرے سامنے خاموش رہنا چاہیئے اور اپنا چہرہ اور اپنی آنکھیں چھپا کر مقابلے پر آنا چاہئے؟ کیا وہ میری صلاحیتوں سے واقف ہے؟

مجھے مزید سوچنے کا موقع نہیں ملا، کیونکہ اس نے پھر حملہ کر دیا تھا میرے سر پر کھڑے ہاتھ کی ضرب لگانی چاہی تھی، میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کے ایک ہاتھ کے حملے کو روک لیا مگر وہ ہاتھ اتنا وزنی تھا کہ میں اس کے وزنی جھٹکے سے پیچھے چلا گیا۔ پیچھے جاتے ہی میں یکبارگی جھک کر آگے آیا تاکہ اس کے پیٹ میں اپنے سر سے زور کی ٹکر ماروں، لیکن اس کے پھرتیلے پن کی داد دینی چاہئے، وہ بجلی کی سی پھرتی سے اچھل کر ایک طرف ہو گیا میں سر مارنے کے زور میں آگے بڑھتا ہوا ٹوٹے ہوئے دروازے سے نکل کر ہوا دہلیز پر آ گرا، میرا آدھا دھڑ کمرے کے اندر تھا اور آدھا دھڑ دہلیز کے باہر تھا۔ میں کراہتے ہوئے اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ پیچھے سے اس کے ایک آہنی پنجے نے میری گردن دبوچ لی، میں ایک جھٹکے سے گردن چھڑا لینا چاہتا تھا لیکن اس نے چوکھٹ اور دروازے کے درمیان میری گردن پھنسا دی میں تڑپنے لگا، اس نے ایک ہاتھ سے اپنے سارے جسم کا بوجھ مجھ پر ڈال رکھا تھا۔ اس کے وزن سے ہی جیسے میرا کچومر نکل رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ دروازے اور چوکھٹ کے درمیان میری گردن کو دبا رہا تھا۔

میں پوری قوت سے تڑپنے اور مچلنے کے باوجود اس شکنجے سے آزاد نہ ہو سکا، یہ تو میں ہی جانتا تھا کہ اس وقت میرے مقابلے پر کوئی دیو نما انسان تھا وہ انسان سے زیادہ جناتی قوتوں کا مالک تھا۔ میں نے تسلیم کر لیا کہ صرف اپنی جسمانی قوت کے بھروسے پر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اسے شکست دینے کے لئے دماغی صلاحیتوں کی ضرورت تھی اور وہ مجھے ذہنی طور پر بھی مفلوج کر رہا تھا۔

میں اندر سے ٹوٹنے لگا، اب بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی موت سامنے کھڑی تھی۔ میں نے دیکھا۔۔۔۔ اور دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا وہ سامنے نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

میں نے آنکھیں میچ کر دیکھا تو دھندلاہٹ ختم ہو گئی۔ سامنے زرینہ دونوں ہاتھوں سے ریوالور تھامے کھڑی تھی۔ پریشانی، خوف اور دہشت کے باعث اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ایسی حالت میں وہ صحیح نشانہ نہیں لے سکتی تھی۔ اس کی فائرنگ سے گولی میری طرف بھی آ سکتی تھی۔

میں دو طرفہ مصیبتوں میں گرفتار ہو گیا۔ پیچھے اس سیاہ نقاب پوش نے مجھے جکڑ رکھا تھا، میری جان نکلی جا رہی تھی۔ آگے وہ تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے ریوالور لئے کھڑی تھی، صاف پتہ چل رہا تھا کہ دشمن کی بجائے میں ہی گولی کی زد میں آ سکتا ہوں۔

میں نے چیخ کر اسے سمجھانا چاہا، مگر آواز نہیں نکل سکی۔ میری گردن پھنسی ہوئی تھی، پھر مجھے اپنی بوکھلاہٹ پر غصہ آیا۔ میں وقتی طور پر بھول گیا تھا کہ زرینہ کے ہاتھوں کو سوچ کی لہروں کے ذریعہ کنٹرول کر سکتا ہوں۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ زرینہ میرے دشمن پر فائر کرے، کیونکہ میں دشمن کے قریب ہی تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ کبھی صحیح نشانہ نہیں باندھ سکے گی۔

میں نے سوچ کے ذریعہ اسے حکم دیا: "چھت کی طرف فائر کرو"۔۔

میرا حکم سنتے ہی اس نے ہوائی فائر کیا۔ نقاب پوش بوکھلا کر مجھ سے الگ ہو گیا۔ شاید وہ ہوائی فائر کو خاطر میں نہ لاتا، لیکن بھلا ہو زرینہ کا۔ وہ ریوالور کو پوری طرح چھت کی جانب نہ اٹھا سکی۔ گھبراہٹ میں ذرا سا ریوالور گرا کر فائر کر دیا۔ گولی نقاب پوش کے قریب دروازے پر آ کر لگی اور دروازے میں سوراخ کرتی ہوئی گذر گئی۔ دشمن کی سمجھ میں یہی آیا کہ وہ صحیح نشانہ لگانا جانتی ہے، بس ذرا چوک گئی، لیکن اس کا دوسرا نشانہ صحیح بیٹھے گا۔

دروازے کے شکنجے سے اچانک ہی نجات ملی تو میں سنبھل نہ سکا دہلیز پر لڑھک گیا۔ پھر جب سنبھلنے کی کوشش کی تو اس سے پہلے ہی نقاب پوش نے اپنی مشینی عادت کے مطابق مجھے اٹھا کر زرینہ پر پھینک دیا۔ میں سیدھا جا کر اس سے ٹکرایا۔ وہ چیختی ہوئی گر پڑی۔ وہ نیچے تھی اور میں اوپر، ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ میں نے زرینہ کے اوپر سے کروٹ بدل کر فوراً ہی ریوالور کو اٹھا لیا۔ نقاب پوش دوڑتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور آتے ہی وہ چند ساعت کیلئے ٹھٹھک گیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے ایک غوطہ خور کی طرح فضا میں بلند ہوا۔ اور میرے پیچھے کھڑکی کے آر پار غوطہ لگاتا ہوا پائیں باغ کی طرف چلا گیا۔

میں نے عین وقت پر فائر کیا تھا، لیکن نقاب پوش کی قسمت اچھی تھی کیونکہ مجھے زبردست چوٹیں آئی تھیں، اس وجہ سے فائر کرتے وقت میرا ہاتھ بھی کانپ گیا تھا۔

اب جتنی پھرتی سے اٹھ کر اس کا پیچھا کرنا چاہیئے تھا، اتنی پھرتی سے میں اٹھ نہ سکا، کیونکہ اس مشینی انسان کے حملوں نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہی میرا سر چکرا گیا، میں نے لڑکھڑا کر کھڑکی کا سہارا لیا اور باہر کی طرف جھانک کر دیکھا۔ دور دور تک اس کا پتہ نہ تھا وہ آندھی کی طرح آیا تھا اور طوفان کی طرح گذر گیا تھا۔

مجھے تو یوں لگا جیسے یہ قہرِ الٰہی تھا میرے کسی گناہ کی سزا تھی ورنہ اب سے پہلے میں کسی دشمن کے سامنے اتنا بے بس اور مجبور نہیں ہوا تھا۔ اس ناگہانی مصیبت کے دور ہوتے ہی میں نڈھال ہو کر کھڑکی کے قریب ہی گر پڑا۔ زرینہ فرش پر سے اٹھ کر دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی میں نے اسے شہباز خان کا فون نمبر بتاتے ہوئے کہا کہ وہ فوراً شہباز کو صورتحال سے آگاہ کرے۔

وہ دوڑتی ہوئی وہاں سے باہر کسی کوٹھی میں چلی گئی تاکہ شہباز کو فون کر سکے۔ فائرنگ کی آواز سن کر آس پاس کی کوٹھیوں سے شور بلند ہونے لگا۔ اس شور اور ہنگامے سے مجھے یہ تقویت پہنچی کہ دشمن اب یہاں حملے کی جرأت نہیں کرے گا، وہ یہاں سے جا چکا ہے، اس اطمینان کے بعد میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اب نڈھال ہو کر گر جاؤں۔ آنکھیں بند کر کے آرام سے سو جاؤں یا بیہوش ہو جاؤں۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ خیال تھا کہ میں تھکن دور کرنے کے لئے سو جاؤں گا، لیکن میں بے ہوش ہو گیا تھا، کیونکہ جب مجھے ہوش آیا تو میں ہسپتال کے ایک کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ اس مشینی انسان نے مجھے اس طرح اٹھا کر پھینکا تھا کہ میری ہڈیوں میں چوٹیں آئی تھیں۔ ڈاکٹر میرے جسم کے مختلف حصوں کے ایکسرے فوٹو لینے کی باتیں کر رہا تھا۔ میرے بستر کے آس پاس ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن، شہباز خان اور دوسرے آفیسر کھڑے ہوئے تھے۔

مجھے آنکھ کھولتے دیکھ کر ڈائریکٹر جنرل نے میرے شانے پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، تم پولیس ہسپتال میں ہو، یہاں اس کمرے کے آس پاس اتنا سخت پہرہ ہے کہ تمہاری اجازت کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا، کیا تم خود کو بیان دینے کے قابل سمجھتے ہو؟"

میں نے نقاہت سے کہا: "میں بالکل ٹھیک ہوں، ابھی آپ کو تمام واقعہ سنا سکتا ہوں۔"

ڈاکٹر نے ہاتھ اٹھا کر کہا: "ابھی نہیں۔ آپ انہیں کچھ دیر اور آرام

کرنے دیں، شام کو آپ اطمینان سے باتیں کریں:
ڈاکٹر نے شام تک کے لئے بات ٹال دی۔ مجھے آرام کرنے کے لئے کہا گیا تو میں نے اسی وقت آنکھیں بند کر لیں۔ مجھ پر اس طرح تھکن غالب آگئی تھی کہ میں آنکھ بند کرتے ہی سو گیا۔

رات کے آٹھ بجے اچانک ہی آنکھ کھل گئی پتہ نہیں یہ حسنِ تقدیر ہے یا حسنِ اتفاق کہ جہاں حسین اور خطرناک عورتیں ہوتی ہیں، وہاں میری چھٹی حس مجھے چونکا دیتی ہے۔ میری کھلی آنکھوں کے سامنے دودھیا لباس میں دودھیا رنگ کی خوبصورت نرس کھڑی ہوئی تھی۔ معلوم نہیں وہ واقعی اتنی حسین تھی، یا مجھے دکھ بیماری کی حالت میں ضرورت سے زیادہ حسین لگ رہی تھی کیونکہ تپتی ہوئی دھوپ میں، چلتے ہوئے صحرا سے گذر کر کہیں کھجور کا سایہ مل جائے تو وہ سایہ خیالی جنت سے زیادہ دلکش اور آرام دہ ہوتا ہے، بالکل اسی طرح بیماری اور سہارے کی محتاجی کے دوران سفید لباس میں گوری چٹی نرس بہت ہی زیادہ حسین اور مہربان نظر آتی تھی۔

میرے آنکھ کھولتے ہی وہ دیکھ کر مسکرانے لگی، نرس کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ مریضوں کے سامنے ہمیشہ مسکراتی رہے، مگر میں نے محسوس کیا کہ مسکراہٹ کے پیچھے وہ خود بیمار ہے، پریشان ہے اور کچھ سہمی ہوئی ہے۔

ہم چند لمحوں تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں اترتے رہے پھر اس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

" خدا کا شکر ہے کہ آپ ہوش میں آگئے، میں ڈاکٹر کو انفارم کرتی ہوں۔ . . "

یہ کہہ کر وہ جانے لگی، میں نے اسے جانے سے نہیں روکا۔ روکنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جو باتیں میں اس کے روبرو کر سکتا تھا۔ وہ باتیں اس کی عدم موجودگی میں اس کی سوچ کے ذریعہ بھی ہو سکتی تھیں لہٰذا میں خاموشی سے اس کے خیالات پڑھنے لگا۔

وہ سوچ رہی تھی: یا اللہ! میں کیا کروں، میرے بچے کی سلامتی تیرے رحم و کرم پر ہے۔ تو چاہے تو اسے سلامت رکھ سکتا ہے اور تو چاہے تو اسے مار . . . وہ سوچتے سوچتے اندر ہی اندر لرز گئی۔

میں حیرانی سے سوچنے لگا، کیا وہ ایک بچے کی ماں ہے؟ بظاہر تو وہ بالکل کنواری نظر آتی تھی۔ اگر کنواری نہ ہو، تب بھی یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے، کجا یہ کہ وہ ایک بچے کی ماں تھی۔ بعض عورتیں ایسی ٹھوس اور گدرائے ہوئے جسم کی مالک ہوتی ہیں کہ ان پر ایک شادی، یا ایک خاوند اور دو چار بچے اثر انداز نہیں ہوتے، ان کے حصے میں سدا بہار جوانی آتی ہے، وہ نرس بھی سدا بہار تھی۔

وہ اپنے بچے کی موت کے تصور سے لرز رہی تھی اور اس کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگ رہی تھی، شاید اس کا بچہ بیمار تھا۔ لیکن نہیں۔ اس کی اگلی سوچ سے پتہ چلا کہ وہ بیمار نہیں ہے بلکہ اس سے بچھڑ گیا ہے۔

" میرا پپو کہاں ہوگا؟ کس حال میں ہوگا؟ وہ سوچ رہی تھی، ... والوں کی جدائی سے صبر آجاتا ہے، مگر جیتے جی بچھڑ جانے والوں کے لئے دن رات دل تڑپتا رہتا ہے، صبر نام کی کوئی چیز کام نہیں آتی ہے
وہ سوچتے سوچتے رک گئی۔ ڈاکٹر کو مخاطب کر کے اطلاع دینے ... کہ کمرہ نمبر دس کا مریض ہوش میں آگیا ہے، اس کے جواب میں جو کچھ ڈاکٹر نے کہا، اسے نرس کے دماغ نے میرے دماغ تک نشر کیا۔ اس نے کہا،
دس نمبر کا مریض بے ہوش نہیں تھا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ یہ بات تمہیں بتائی جا چکی ہے، مگر تمہاری یادداشت کچھ کمزور ہو گئی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم کچھ پریشان سی رہتی ہو"
جی - جی نہیں۔ مجھے بھلا کیا پریشانی ہو سکتی ہے، میں تو بالکل ٹھیک ہوں"
اچھا تو پھر دھیان سے کام کرو، دس نمبر میں جاؤ، میں ابھی آ رہا ہوں" یہ کہہ کر اس نے ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن کو اطلاع دینے کے متعلق سوچا اور ان کا رہائشی فون نمبر ڈائل کرنے لگا۔
میں نے نرس کے دماغ میں جھانک کر دیکھا، مجھے امید تھی کہ میں اس کے بچے کے متعلق مزید معلومات فراہم کر سکوں گا لیکن وہ اس کی سلامتی کے سوا کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔
میں نے اس کی سوچ میں سوال کیا: "اس وقت میرا بچہ کہاں ہوگا؟" اس کی اپنی سوچ نے کہا: "پتہ نہیں کہاں ہوگا۔ کاش مجھے معلوم ہو تو میں فوراً ہی وہاں پہنچ جاتی"
اس کے جواب سے کچھ پتہ نہ چلا۔ میں نے دوبارہ پوچھا: "اس وقت میرا بچہ کس کی سرپرستی میں ہے؟ وہ سرپرست اپنے ہیں یا بیگانے؟"
" سب - دشمن کبھی اپنے نہیں ہوتے، اگر وہ اپنوں میں ہوتا تو یہ پریشانی نہ ہوتی۔ خدا اسے غارت کرے، میری گود اجاڑ کر گیا ہے، اللہ نے چاہا تو وہ کبھی سکون سے نہیں رہے گا"
وہ سوچتی ہوئی میرے کمرے میں آگئی۔ اس کے دل کا بھید معلوم کرنے کے بعد مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔
میں نے بڑی نرمی سے پوچھا: "تمہارا نام کیا ہے؟"
" سسٹر" اس نے جواب دیا
" یہ نام تو نہیں ہے، پیشے کے اعتبار سے تمہیں سسٹر کہا جاتا ہے"
" اگر میں نام بتا دوں تب بھی آپ کا فرض ہوگا کہ آپ مجھے سسٹر کہہ کر مخاطب کریں، بہتر یہی ہے کہ میں بے نام رہوں"
" ہاں - تم کچھ ایسی ہی ویران ویران سی نظر آتی ہو جیسے بے نام کے ہوتے ہیں۔ ایسی ویرانی ہے جیسے سہاگ اجڑ گیا ہو یا گود ویران ہو گئی ہو"
میرا آخری فقرہ سن کر وہ چونک گئی، میں نے اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھی تھی، وہ مجھے حیرانی سے دیکھ رہی تھی اور یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی

میں اس صدمے کو سمجھ چکا ہوں جسے اس نے دل میں چھپا رکھا ہے
وہ ہچکچاتی ہوئی بولی: "آ - آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں نہیں سمجھی"
" کیا اپنی پریشانیوں کو نہیں سمجھتی ہو؟"
" کیسی پریشانیاں؟"
" یہ تو میں تمہارا ہاتھ دیکھ کر ہی بتا سکتا ہوں۔ ہاتھ کی لکیریں ماضی، حال اور مستقبل کی باتیں بتاتی ہیں، میں ان لکیروں کو دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ تم نے زندگی میں کیا پایا ہے اور کیا کھویا ہے۔ میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ اگر تم نے کچھ کھویا ہے تو اسے دوبارہ کیسے پا سکتی ہو؟"
اچانک ہی وہ مجھے بڑی دلچسپی اور عقیدت سے دیکھنے لگی۔ ہر کھونے والا پانے کے راستے تلاش کرتا رہتا ہے، کبھی عمل سے تلاش کرتا ہے، کبھی خیال ہی خیال میں ڈھونڈتا رہتا ہے اور جب وہ چیز نہیں ملتی تو تھک ہار کر اسے ہاتھ کی لکیروں میں پانے کی کوشش کرتا ہے۔
اب اس نرس کے سامنے بھی یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ کوئی نجومی یا غیب کی باتیں بتانے والا اس کے بچے کا پتہ بتا دے، اس نے کچھ یقین کرنے اور نہ کرنے کی کش مکش میں پوچھا
" کیا واقعی آپ ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر سب کچھ بتا سکتے ہیں؟"
میں نے اس کی جانب ہاتھ بڑھا کر کہا: "آزمائش شرط ہے، لاؤ اپنا ہاتھ . . ."
وہ میرے قریب آنے لگی لیکن قریب آکر اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں میں نہ دے سکی کیونکہ ڈاکٹر کمرے میں آچکا تھا۔ اس نے بتایا کہ ڈائریکٹر جنرل کو اطلاع دی جا چکی ہے، وہ آنے ہی والے ہیں ڈاکٹر نے باتیں کرنے کے دوران اپنی نگرانی میں نرس کے ہاتھوں سے مجھے دوا کھلائی۔ انجکشن لگوایا اس کے بعد واپس چلا گیا
اس کے جاتے ہی نرس نے کہا: "اگر آپ سکون محسوس کر رہے ہیں تو میرا ہاتھ دیکھ لیں" اس نے دونوں ہاتھ میری جانب بڑھا کر کہا: "آپ کونسا ہاتھ دیکھنا پسند کریں گے؟"
وہ گورے گورے، گلابی گلابی ہاتھ عین نگاہوں کے سامنے تھے وہ پوچھ رہی تھی کہ میں کونسا ہاتھ پسند کروں گا مجھے تو دونوں ہی ہاتھ پسند تھے اس ہاتھوں سے بہت دور تک مجھے پسند تھی۔ جی چاہتا تھا دونوں کو قبول کروں، ایک ہاتھ کی لکیریں دیکھوں اور دوسرے ہاتھ کو دھڑکتے ہوئے سینے پر رکھ لوں۔
میں جانتا ہوں کہ مجھے ایک غیر عورت کے متعلق ایسا نہیں سوچنا چاہئے مگر یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ غیر عورت کے متعلق زیادہ سوچتا ہے اپنی عورت گھر کی مرغی دال برابر نظر آتی ہے، جس چیز کو حاصل کرنے میں ذرا دماغ لڑانا پڑتا ہے اور چور دروازوں سے گذرنا پڑتا ہے اس میں بے حد کشش پیدا ہو جاتی ہے۔
یہ بھی درست ہے کہ ایسی عورت کے متعلق للچائے ہوئے انداز میں سوچنا ذلالت ہے جو اپنے بچے کے لئے پریشان ہے مگر سچائی ذرا کڑوی ہوتی ہے، ازل سے اس دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے۔ کسی کی بہن کی مجبوری سے اور کسی کی ماں کی ممتا سے لوگ فوری طور پر فائدے حاصل کرتے رہے ہیں۔ میں نے خیال خوانی کے ذریعے لوگوں کے دماغ میں بیٹھ کر ایسے ایسے شرمناک خیالات پڑھے ہیں کہ اگر انہیں آشکارا کیا جائے تو انسان کا سر شرم سے جھک جائے گا۔ میں نے ایسے کالے چہرے بھی دیکھے ہیں جو اپنے دوست کی بیٹی کو صدق دل سے بیٹی کہتے ہیں لیکن ذہن کے چور دریچے سے جھانک کر اس بیٹی کی جوانی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔
میں نے ہر انسان کی سوچ میں جھانک کر دیکھا اور اب تک یہی سمجھا ہے کہ ہر انسان اپنے ایک چہرے کے پیچھے دوسرا چہرہ چھپا کر رکھتا ہے۔ میرے چہرے کے پیچھے بھی ایک چہرہ چھپا ہوا ہے جسے میں زیادہ نہیں چھپاتا، کسی جوان اور حسین عورت کو دیکھتے ہی اپنے چہرے کو بے نقاب کر دیتا ہوں، اس وقت بھی نرس کے سفید لباس میں کھلتی ہوئی جوانی کو دیکھ کر میں نے عام انسانوں کی طرح دو طرح کے خیالات قائم کئے، پہلا خیال تو یہ تھا کہ وہ ایک مجبور عورت ہے، اپنے بچے کے لئے پریشان ہے، میں اس کی ہر ممکن مدد کروں گا۔ دوسرا خیال یہ تھا کہ وہ حسین ہے نوجوان ہے کسی طور سے وہ ماں بہن یا بیٹی نظر نہیں آتی صرف ایک عورت نظر آتی ہے اور عورت کو صرف عورت ہی نظر آنا چاہئے، کسی سے سنجیدگی کے ساتھ رشتہ قائم کیا جاتا ہے، باقی دوسرے تعلقات آنی جانی ہوتے ہیں
میں نے اس کے بائیں ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دیکھا اس کی گلابی ہتھیلی شفاف کنول کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ چند آڑی ترچھی لکیریں اس کی قسمت کا حال بتا رہی تھیں۔ میں لکیروں کی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے اس کی ہتھیلی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا
" تم کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"
" آپ یہ بتائیں کہ ایسی کونسی چیز ہے جو مجھ سے چھین لی گئی ہے؟"
" میرے ہاتھ دیکھنے کا طریقہ دوسرے نجومیوں سے مختلف ہے، تم جو کچھ پوچھنا چاہتی ہو، اس کا جواب اپنے دل میں سوچتی جاؤ، مثلاً تم نے پوچھا ہے تم سے کونسی چیز چھین لی گئی ہے تو اس کے جواب میں تم اس چیز کا نام سوچ لو، تمہاری ہتھیلی کی یہ درمیانی لکیر مجھے اس چیز کا نام بتا دے گی"
اس نے بے یقینی سے پوچھا: "یہ کیسے ممکن ہے میری سوچ سے ان لکیروں کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"
" بہت گہرا تعلق ہے، انسان سوچ کر ارادہ کرتا ہے اور ارادے کی قوت سے اپنی تقدیر بدلتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ سوچ کا تعلق تقدیر سے ہے اور تقدیر ہاتھ کی لکیروں میں یا انسان کی مٹھی میں ہوتی ہے"
وہ میری باتوں سے قائل ہو گئی، اس نے میرے مشورے کے مطابق اپنے بیٹے پپو کا نام سوچا، میں نے اس کی ہتھیلی کی درمیانی لکیر پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا:

"تمہاری یہ لکیر بتا رہی ہے کہ تمہارا بیٹا پپو تم سے چھین لیا گیا ہے۔"

وہ شدید حیرانی سے میرا منہ تکنے لگی پھر وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے ہاتھ تھام کر بولی۔ "تمہارا علم سچا ہے، اب مجھے بھی یقین آگیا ہے کہ ہاتھ کی لکیریں سچ بولتی ہیں، خدا کے لئے ان لکیروں کو دیکھ کر بتائیے کہ میرا بیٹا مجھے کب ملے گا اور کیسے ملے گا؟"

میں نے دوبارہ اس کا ہاتھ تھام کر کہا: "کوئی سی بھی بات ہو اپنی ایک خاص ترتیب سے اچھی لگتی ہے، میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہارا بیٹا کب اور کیسے ملے گا لیکن اس سے پہلے تمہیں اپنے بیٹے کے بارے میں بتانا ہوگا۔ تم اپنے بیٹے کے متعلق اس وقت سے اب تک کی تمام باتیں ترتیب وار سوچو جس وقت کہ تمہارا بیٹا تم سے بچھڑ گیا تھا، کیونکہ اسی ترتیب سے یہ لکیر تمہیں تمہارے پپو تک لے جائے گی۔"

میری ہدایت کے مطابق وہ ترتیب وار سوچنے لگی۔ "میرا بیٹا چار برس کا ہے میں نے اس کی محبت میں ساری دنیا کو بھلا دیا تھا۔ اس کے باپ کے مرنے کے بعد میں نے دوسری شادی نہیں کی کیونکہ میری جوانی کے طلبگار بہت تھے۔ لیکن اسے باپ کی محبت دینے والا کوئی نہ تھا۔ اس کی خاطر میں یہ ملازمت کر رہی ہوں، میری اس ممتا کو مجھ سے زیادہ کوئی نہیں سمجھتا۔ پھر اسے ایک دشمن کی نظر لگ گئی۔ پرسوں رات وہ چور دروازے کی طرح میرے گھر میں داخل ہوا پپو سو رہا تھا، میں اسے دیکھ کر چیخنا چاہتی تھی لیکن اس نے چیخنے کی مہلت نہیں دی۔ پپو کے سینے پر ریوالور رکھ کر کہا۔

• اگر تم اپنے بیٹے کی سلامتی چاہتی ہو تو میرے حکم کی تعمیل کرو۔" اتنا سوچنے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا: "میں جو کچھ سوچ رہی ہوں، کیا اب بھی لکیریں وہی بتا رہی ہیں؟"

میں نے جواب دیا: "ہاں۔ تمہارے گھر میں ایک بدمعاش گھس آیا تھا، تم اس کا حلیہ بتاؤ۔"

• وہ سانولے رنگ کا ایک دبلا پتلا سا آدمی تھا، اس کی ناک لمبی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی سی تھیں اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ پیشانی آگے کو اس طرح ابھری ہوئی تھی جیسے چوٹ کھا کر ورم آگیا ہو، وہ اپنی ابھری ہوئی پیشانی کے باعث ہزاروں میں پہچانا جا سکتا ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا: کمرہ نمبر دو میں جو مریض ہے، اس کے متعلق بتاؤ کہ اسے کیا بیماری ہے؟"

کمرہ نمبر دو میں جو مریض تھا اس کا نام بھوانی شنکر تھا۔ نرس کو اس کی اصلیت نہیں معلوم تھی، وہ اسے محمود حسن کے نام سے جانتی تھی اور اس بدمعاش نے جو معلومات حاصل کی تھیں، اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس کا بھوانی شنکر سے گہرا تعلق ہے۔

نرس نے کہا: "میں جانتی ہوں کہ اس ہسپتال میں اکثر مجرم علاج کے لئے لائے جاتے ہیں۔ دو نمبر کا مریض بھی کوئی زبردست مجرم ہے۔ اسی لئے اس کے کمرے کے اطراف سخت پہرہ ہے۔ ہسپتال کے ملازموں کو اور خصوصاً ہم نرسوں کو تاکید کی گئی ہے کہ ہم ہسپتال سے باہر جا کر کسی مریض کا ذکر نہ کریں، مگر وہ بدمعاش دو نمبر کے مریض کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ میں نہ بتاتی تو وہ میرے بچے کو مار ڈالتا۔ مجھے مجبوراً بتانا پڑا کہ پرسوں اس مریض کو ہسپتال لایا گیا تھا۔ اس کے جبڑے کے پاس تھوڑی سی سوجن تھی۔ ایکسرے کرنے کے بعد ہم انٹیلی جنس والوں کی نگرانی میں اسے آپریشن تھیٹر لے گئے اور آپریشن کے ذریعہ پلاسٹک کا ایک کیپسول اس جگہ سے نکالا۔ میں نہ بتا سکی کہ اس کیپسول میں کیا تھا۔ ڈائریکٹر جنرل نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔

پھر اس بدمعاش نے سوال کیا کہ اس مریض کی ٹھوڑی کے نیچے کا جو زخم ہے، وہ زخم کب تک بھرے گا۔ میں نے جواب دیا کہ معمولی زخم آیا ہے، دو چار روز میں زخم بھر جائے گا۔

تب اس بدمعاش نے کہا کہ جب تک دو نمبر کا مریض صحت یاب نہیں ہوگا، اس وقت تک وہ میرے پپو کو اپنے پاس رکھے گا اور اپنی مرضی کے مطابق کام کرائے گا۔ مثلاً وہ دو نمبر کے مریض کے پاس تحریری پیغام بھیجتا ہے، وہ تحریر کوڈ ورڈز میں ہوتی ہے، میری سمجھ میں نہیں آتی۔ مجھے تاکید کی گئی ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ اس مریض کی خدمت کروں تاکہ وہ جلد سے جلد صحت یاب ہو جائے، اس طرح جلد ہی پپو بھی مجھے واپس مل جائے گا۔ میں اپنے بیٹے کی خاطر مجبوراً اس کا ہر کام کرتی ہوں جو سب قانون کے خلاف ہے، پتہ نہیں یہ لوگ کس قسم کے مجرم ہیں؟ ان سے نمٹنے کا کوئی راستہ نہیں ملا تو یہ میری ممتا سے فائدہ اٹھا کر اپنا کام کر رہے ہیں۔ میں جانتی ہوں آپ انٹیلی جنس کے کوئی افسر ہیں۔ ڈائریکٹر جنرل آپ کا خاص خیال رکھتے ہیں، آپ مجھے مجرموں کی آلہ کار بننے کی سزا دلا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود میں نے اپنی ہتھیلی کھول کر آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔ مجھے سزا کا خوف نہیں ہے، میں صرف آپ کے علم سے متاثر ہوں، دل چاہتا ہے کہ آپ اس علم سے میرے بچے کو واپس لے آئیں گے یا کسی طرح اس کی حفاظت کر سکیں گے۔ میں صرف اپنے بچے کا تحفظ چاہتی ہوں، بتائیے کہ میرا بچہ کب ملے گا؟ کیسے ملے گا؟ کیا آپ اپنے علم سے اس کی حفاظت کر سکیں گے؟"

میں نے جواب دیا: "ہاں، کیا تمہارے پاس پپو کی تصویر ہے؟"

"جی ہاں۔ پچھلے ماہ میں نے اس کی ایک تصویر اتروائی تھی، میرے گھر میں رکھی ہوئی ہے۔"

• "کیا پپو اچھی طرح باتیں کر لیتا ہے؟"

میں یہ سوالات اس لئے کر رہا تھا کہ پپو کی تصویر کے ذریعہ اس کے خیال تک پہنچ جاتا، اور اس معصوم بچے کی معصوم سی سوچ کے ذریعہ ان کی بھی سوچ تک پہنچ جاتا جو اس بچے کے آس پاس موجود ہوتے۔ کہ نرس نے پوچھا۔

"کیا آپ اخبارات میں میرے بیٹے کی تصویر شائع کرائیں گے؟ اس طرح تو وہ میرے بچے کو مار ڈالیں گے۔"

میں نے اسے تسلی دی: "تمہارے بچے کی تصویر شائع نہیں کی جائے گی۔ بس ایک نظر دیکھ کر تمہیں واپس کر دوں گا، پھر میں اپنے علم سے معلوم کروں گا کہ پپو جیسے معصوم اور معصوم آنکھوں والا بچہ کہاں چھپا کر رکھا گیا ہے۔"

میری باتوں سے قائل ہو کر وہ بولی: "ابھی دس بجے میری ڈیوٹی ختم ہو جائے گی، میں ہسپتال کے پیچھے ایک کوارٹر میں رہتی ہوں، میں فوراً ہی پپو کی تصویر لے آؤں گی مگر... مگر وہ بدمعاش میری ڈیوٹی کے اوقات جانتا ہے۔ ٹھیک ساڑھے دس گیارہ بجے کوارٹر میں چلا آتا ہے۔ دو نمبر کا مریض جو پیغام دیتا ہے وہ پیغام اس کے حوالے کر دیتی ہوں۔ آج بھی وہ ضرور آئے گا۔"

اس کی باتوں سے پتہ چل رہا تھا کہ ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ بدمعاش کوارٹر میں آئے گا تو بڑی آسانی سے گرفتار کر لیا جائے گا لیکن اس طرح پپو کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ ایک ماں سے اس کا بیٹا ہمیشہ کے لئے چھن جاتا۔ یہ درست ہے کہ میں نے اس نرس کے حسن و شباب کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا، لیکن اس نرس کی زندگی کا ایک دوسرا مقدس پہلو تھا، ایک بیٹے کی ماں کا رشتہ تھا، اور میری نظروں میں یہ رشتہ سب سے زیادہ اہم تھا۔ اس رشتے کی خاطر میں اس مجرم کو فوراً ہی گرفتار نہیں کرانا چاہتا تھا۔ دانشمندی بھی یہی تھی کہ ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھایا جائے، کیونکہ ابھی مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس ایک بدمعاش کے پیچھے اور کتنے مجرم کام کر رہے ہیں۔

میں نے اس سے کہا: "اچھی بات ہے، جب وہ بدمعاش تمہارے کوارٹر سے واپس جائے تو تم پپو کی تصویر لے آنا۔"

وہ ہاتھوں کی لکیریں دکھانے اور باتیں کرنے کے دوران میرے قریب بستر کے سرے پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا گلابی ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھا۔ دور سے دیکھنے والوں کے لئے ہمارا انداز محبوبانہ تھا۔

ڈائریکٹر جنرل، شبیر حسن اور شہباز خان نے کمرے میں داخل ہوتے ہی یہی سمجھا تھا کہ میں نے اس حسین نرس کو پھانس لیا ہے، نرس انہیں دیکھتے ہی بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ ہاتھ کی لکیروں کا بھید معلوم کرنے کے دوران میرے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی اور ایک لمبی مدت سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے رکھا تھا۔ یہ احساس ہوتے ہی وہ ایک دم سرخ ہو گئی۔ پھر نظریں جھکا کر شرماتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

ڈائریکٹر جنرل نے میرے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا: "میں سوچ رہا تھا کہ تم اپنی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور پسلیوں کا ماتم کر رہے ہوگے مگر یہاں تو نقشہ ہی کچھ اور ہے، تم نے تو باقاعدہ عشق شروع کر دیا ہے۔"

شہباز نے بھی مسکرا کر کہا: "اپنا یار اس میدان کا پکا کھلاڑی ہے۔ بڑی خوبصورتی سے شکار کھیلتا ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا: "آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں عاشق بن کر نہیں بلکہ ایک نجومی بن کر اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھنے کے بعد میں نے ایک اور مجرم کا سراغ لگایا ہے۔"

• "کیا واقعی؟" وہ دونوں چونک کر مجھے دیکھنے لگے، میں نے انہیں بتایا کہ میں کس طرح نرس کا ہاتھ دیکھنے کے بہانے اس کی سوچ کو پڑھتا رہا اور اس کی زبان سے بھی ضروری باتیں اگلواتا رہا۔ آخر میں میں نے نرس کی حمایت کی۔ "وہ مجبور تھی، قانون کے خلاف کوئی کام نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن ممتا اس کی کمزوری بن گئی۔" ڈائریکٹر جنرل نے کہا۔

"قانون کے خلاف کام کرنے کے باوجود وہ مجرم کی نشاندہی کر رہی ہے، لہٰذا وہ قابل معافی ہے، ابھی تو ہمیں اس بدمعاش کو اپنی نظروں میں رکھنا ہوگا جو نرس کے کوارٹر میں آنے والا ہے، پتہ نہیں دو نمبر کے مریض سے کیسے کیسے پیغامات کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے، ہم ان کے کوڈ ورڈز بھی نہیں جانتے ہیں۔"

میں نے کہا: "میں جانتا ہوں۔"

"تم ان کے کوڈ ورڈز کیسے جانتے ہو؟" انہوں نے حیرانی سے پوچھا

میں نے جواب دیا: "ابھی تو میں نہیں جانتا ہوں۔ لیکن پیغام پڑھنے والے کسی بھی مجرم کی سوچ بتا دے گی کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے اور اس پیغام میں کس مقصد کے لئے کونسا کوڈ ورڈ استعمال کیا گیا ہے۔"

شبیر حسن خوشی سے اچھل پڑے: "کمال ہے فرہاد! تم نے تو کمال کا علم حاصل کیا ہے، واقعی ہم بھی جب کوڈ ورڈز میں باتیں کرتے ہیں تو ان کا سیدھا سا مفہوم ہمارے ذہن میں واضح ہوتا رہتا ہے، تم یہاں لیٹے ہی لیٹے بڑی آسانی سے ان کے خفیہ پیغامات پڑھ سکتے ہو۔ بھئی یہ تو اتنا حیرت انگیز علم ہے کہ تم اس وقت ہمیں سپرمین نظر آ رہے ہو۔"

میں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا: "کاش میں سپرمین ہوتا۔ سپرمین تو وہ سیاہ نقاب پوش تھا جس نے مجھے ہسپتال پہنچا دیا ہے۔"

شبیر حسن نے کہا: "ہاں۔ تمہاری خوابگاہ کا دروازہ جس انداز میں ٹوٹا ہوا پایا گیا ہے، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حیاتی قوتوں کا مالک ہے۔"

شہباز خان نے کہا: "جسمانی لحاظ سے خواہ وہ کتنا ہی طاقتور ہو، اگر ہم لڑنے کے فن سے واقف ہیں تو اس کے مقابلے میں دیر تک ٹھہر سکتے ہیں، اسے کچھ نقصان پہنچائیں یا نہ پہنچائیں لیکن خود کو اس کے حملوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ فرہاد میں اسی ایک بات کی کمی ہے۔ اس نے لڑنے کی باقاعدہ ٹریننگ حاصل نہیں کی ہے۔"

شبیر حسن نے کہا: "ہاں فرہاد تمہارے اندر یہ کمی نہیں ہونی چاہیئے ہمارے محکمے میں ایک شعبہ ایسا ہے جہاں لڑنے کے جدید داؤ پیچ سکھائے جاتے ہیں اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ مدمقابل اگر بہت زیادہ طاقتور ہو اور ہر طرح کے داؤ پیچ جانتا ہو تو اسے کس طرح نفسیاتی حربوں سے شکست دینا چاہیئے۔ تمہیں یہ سب کچھ ضرور سیکھنا چاہیئے۔"

• "اچھی بات ہے، میں ضرور سیکھوں گا اور جلد ہی سیکھوں گا۔ فی الحال

میرے متعلق ڈاکٹروں کی کیا رپورٹ ہے؟

"ان کی رپورٹ کے مطابق تم ٹھیک ہو، تمہاری ہڈی پسلیاں سلامت ہیں۔ دو چار روز تک جم کر تمہاری مالش کی جائے گی تو تم دوڑنے بھاگنے کے قابل ہو جاؤ گے، لیکن اب میں تمہیں اس وقت تک میدان عمل میں نہیں آنے دوں گا جب تک کہ تم ایک اچھے فائٹر نہیں بن جاؤ گے۔"

"ہاں فرہاد، تمہیں کسی مجرم کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ تم اطمینان سے ائرکنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر مجرموں کی سوچ کا پیچھا کرو اور سوچ کے ذریعہ میری راہنمائی کرتے رہو اور دیکھتے رہو کہ میں ان بدمعاشوں کو کس طرح چھٹی کا دودھ یاد دلاتا ہوں۔"

میں نے کہا: "اچھا اب کچھ عرصہ تک ایسا ہی ہوگا۔ میں بیمار رہوں گا اور تم دوڑتے رہو گے، مگر میری ایک بات یاد رکھو، اگر تم اس نقاب پوش سے ٹکراؤ گے تو تمہیں بھی چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔"

"مجھے غصہ نہ دلاؤ۔" شہباز خان نے مٹھیاں بھینچ کر کہا: "کبھی اس سے سامنا ہونے دو، میں اس کا سر توڑ دوں گا۔ ہاں، میں تو یہ پوچھنا ہی بھول گیا تھا کہ تم نے سوچ کے ذریعہ اس نقاب پوش کو مات کیوں نہیں دی؟"

میں اس کی سوچ تک نہ پہنچ سکا کیونکہ اس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا پھر یہ کہ وہ زبان سے کچھ نہیں بول رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ گونگا ہے۔

"کیا تم کسی گونگے کے خیال کو نہیں پڑھ سکتے؟ آخر گونگے آدمیوں کا دماغ بھی تو سوچتا ہے۔"

"میں کسی گونگے کے خیالات بھی پڑھ سکتا ہوں، بشرطیکہ اس کا چہرہ نظر آئے۔ انسان کی آنکھیں اس کے خیالات کی چغلی کھاتی ہیں، میں آنکھوں کے ذریعہ گونگے کے خیال تک پہنچ سکتا ہوں۔"

ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"فرہاد! ابھی پورے دس بجے ہیں، اب وہ نرس ڈیوٹی ختم کرکے اپنے کوارٹر میں جا رہی ہوگی، تم اس سے دماغی رابطہ قائم کرو۔"

ان کی ہدایت کے مطابق ہم سب خاموش ہو گئے، میں نرس کے دماغ میں جھانکنے لگا۔ وہ ہسپتال کی عمارت سے باہر نکل کر اپنے کوارٹر کی طرف جا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اگر وہ بدمعاش نہ آیا تو وہ فوراً ہی اپنے بچے کی تصویر لے کر دس نمبر کے مریض کے پاس (یعنی میرے پاس) چلی آئے گی۔

لیکن کوارٹر کے دروازے پر پہنچتے ہی وہ ٹھٹھک گئی، دروازے پر تالا نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ بدمعاش اپنی عادت کے مطابق کسی کنجی یا کیل سے تالا کھول کر اندر آگیا ہے، اس کی آمد سے نرس کا دل گھبراتا تھا، اس کے باوجود وہ اس بدمعاش کا انتظار اس لئے کرتی تھی کہ اسی ذریعہ سے اپنے بچے کی خیریت معلوم ہوتی رہتی تھی

وہ دروازہ کھول کر اندر آئی پھر اس نے اس بدمعاش کو دیکھتے ہی پوچھا: "میرا بچہ تو کیسا ہے، میں تمام دن اسی انتظار میں گزار دیتی ہوں کہ رات آئے گی تو مجھے میرے بیٹے کی خیریت معلوم ہوگی، جلد بتاؤ میرا بیٹا کیسا ہے؟"

"آہستہ بولو۔" اس بدمعاش کی دبی ہوئی سرگوشی سنائی دی: "تم مجھے دیکھتے ہی پہلے اپنے بیٹے کے متعلق پوچھتی ہو، میں تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ پہلے میرے کام کی بات کیا کرو، لاؤ نکالو، دو نمبر والے کا کیا پیغام لائی ہو؟"

نرس نے اپنے گریبان کے اندر ہاتھ ڈال کر چولی کے اندر سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور اس کے حوالے کر دیا، وہ اسے کھول کر پڑھنے لگا۔

وہ جو کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہ کوڈ ورڈز میں تھا لیکن پڑھنے کے دوران اس کی سوچ کے ذریعہ کوڈ ورڈز کی وضاحت ہوتی جا رہی تھی۔ بھوانی شنکر نے اسے لکھا تھا کہ آپریشن کا زخم بھرنے میں کئی دن لگ جائیں گے، بلیک گائیڈ کو کم از کم ایک ہفتہ انتظار کرنا ہوگا۔

وہ پیغام پڑھنے والا ذرا پریشان ہو کر سوچنے لگا کہ ایک ہفتہ تک انتظار نہیں ہو سکے گا، ہیڈ کوارٹر سے برابر کالیں آرہی ہیں کہ انہیں ذرا واپس آجانا چاہیئے۔

ذرا دیر سوچنے کے بعد اس نے بھوانی شنکر کے نام کوڈ ورڈز میں ایک پیغام تحریر کیا۔ پیغام یہ تھا: "تمہاری صحت یابی کا انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں سے فرار ہوتے وقت تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی شیتل تمہیں آرام سے اٹھا کر لے جائے گا، میں کسی وقت بھی موقعہ پا کر شیتل کے ساتھ آؤں گا اور تمہیں لے جاؤں گا۔"

اس نے یہ پیغام نرس کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "اسے ابھی پہنچا دو، کیا تم کسی بہانے دو نمبر کے کمرے میں جا سکتی ہو؟"

نرس نے کہا: "میری ڈیوٹی کا وقت ختم ہو چکا ہے، دو نمبر اور دس نمبر کے کمروں کے اطراف سخت پہرہ ہے، میں کوئی معقول وجہ بتائے بغیر دو نمبر کے کمرے میں نہیں جا سکتی، انٹیلیجنس والے میری تلاشی لیں گے، پھر یہ کاغذ کا ٹکڑا ان کے ہاتھ لگ جائے گا۔"

نرس نے معقول بات کہی تھی، لہٰذا اس نے تسلیم کرتے ہوئے کہا: "ٹھیک بات ہے، کل ڈیوٹی کے وقت اسے پہنچا دینا۔ اب میں جاتا ہوں۔ کل رات کے ایک بجے تمہارا بیٹا تمہیں واپس مل جائے گا۔"

"سچ؟" وہ خوش ہو کر بولی: "کیا تم سچ کہہ رہے ہو، کل تم میرے بچے کو یہاں لے آؤ گے؟ ہاں ضرور لے آنا، میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔"

وہ کوئی جواب دیئے بغیر کوارٹر سے باہر آگیا اور ہسپتال کے کمپاؤنڈ سے باہر جانے لگا، اب میں نے نرس کو نظر انداز کر دیا تھا اور اس شخص کے ذہن میں جھانک رہا تھا جو ہم سب کے لئے اجنبی تھا میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر وہ کون ہے اور ان مجرموں کے گروپ میں اس کی کیا حیثیت ہے، اس نے بھوانی شنکر کو جو پیغام دیا تھا۔ اس میں شیتل کا ذکر کچھ یوں تھا کہ شیتل بھوانی شنکر کو آرام سے اٹھا کر ہسپتال سے باہر لے آئے گا۔

میں نے اس اجنبی کی سوچ میں ہڑبڑا کر کہا: "ارے باپ رے، میں لڑکھڑا رہا ہوں؟" اس کے لڑکھڑا کر گرتے ہی میں نے اس کی سوچ میں سوالات کی بوچھار کر دی: "یہ کیا ہو گیا؟ میں اچانک کیسے گر پڑا، میرے پاؤں کیسے لڑکھڑا گئے؟ کیا میرا دماغ چل گیا ہے؟ مجھے فوراً ہی اپنے آپ کو پہچاننا چاہیئے، میں کون ہوں، میرا نام کیا ہے؟"

وہ بوکھلا کر چاروں طرف دیکھنے لگا پھر جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اس کے بعد دل ہی دل میں کہنے لگا: "یہ اچانک مجھے کیا ہو گیا تھا، میری ذہنی حالت بالکل درست ہے، میں مضبوط اعصاب اور مستحکم قوت ارادی کا مالک ہوں، اسی لئے بلیک گائیڈ کے اہم فرائض انجام دے رہا ہوں، پتہ نہیں دماغ کے اندر یہ اچانک گڑبڑ کیسے ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔"

وہ سوچتے سوچتے اپنی کار کے قریب پہنچ گیا اور دروازہ کھول کر بیٹھنے لگا۔ میں تعجب سے سوچ رہا تھا۔ کیا نرس کے پاس آنے والا اجنبی بلیک گائیڈ تھا۔ میری خواب گاہ میں جو نقاب پوش آیا تھا۔ وہ دیو قامت اور سیاہی جیسی کی طرح ناقابل شکست تھا اور نرس سے ملاقات کرکے جو شخص اس وقت کار میں بیٹھ کر جا رہا تھا۔ وہ نرس کے بیان کے مطابق دبلا پتلا سا آدمی تھا اور وہ خود کو بلیک گائیڈ کہہ رہا تھا۔ یعنی وہ دبلا پتلا سا آدمی اتنا پُراسرار تھا کہ احمد شیخ۔ ٹونی اور بھوانی شنکر بھی اس کی اصل شخصیت کو اور اس کی سرگرمیوں اور منصوبوں کو نہیں جانتے تھے۔

بلیک گائیڈ اس وقت کار ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے منصوبوں پر غور کر رہا تھا۔ اس کی سوچ سے پتہ چلا کہ شیتل وہی سیاہ نقاب پوش ہے جو میری خواب گاہ میں آیا تھا اور جس نے مجھے مار ڈالنے کی پوری کوشش کی تھی۔ وہ مجھے اس لئے مار ڈالنا چاہتا تھا کہ احمد شیخ اور ٹونی وغیرہ میری وجہ سے گرفتار ہوئے تھے۔

میں نے بلیک گائیڈ کی سوچ میں مختلف سوالات کئے اس نے جو جوابات دیئے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔

سیکرٹ سروس کے صرف چند بڑے افسر بلیک گائیڈ کو جانتے ہیں۔ ان کے علاوہ آج تک کسی نے اس کا اصل چہرہ نہیں دیکھا ہے۔ بھوانی شنکر اور ٹونی وغیرہ دوسرے ملکوں میں جا کر جب تخریبی کارروائیاں کرتے ہیں تو ان کے دلوں میں یہ اعتماد اور حوصلہ ہوتا ہے کہ ان کی پشت پر ہمیشہ بلیک گائیڈ موجود رہتا ہے اور انہیں تمام خطرات سے نکال لے جاتا ہے۔

بلیک گائیڈ کی سوچ سے یہ بھی پتہ چلا کہ وہ جسمانی لحاظ سے کمزور ہے لیکن استاد ذہن، چالاک اور زبردست منصوبے باز ہے کہ اس کا کوئی منصوبہ اور کوئی چال ناکام نہیں ہوتی، اس کے صرف دو گونگے ماتحت ہیں جو اس کے منصوبوں پر عمل کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام شیتل ہے اور دوسرے کا نام چیتل۔ (چیتل وہی گونگا تھا جو ساجی کو اٹھا کر جیلی کوپٹر کی طرف لے گیا تھا) شیتل اور چیتل جڑواں بھائی تھے۔ دونوں ہمشکل تھے۔

ایک جیسے قد آور اور زور آور تھے۔ دونوں ہی مشین کی طرح لڑتے تھے اور ایک دیو کی طرح اپنے مقابل کو اٹھا کر پھینک دیتے تھے۔ انہیں باقاعدہ لڑنے اور اپنا بچاؤ کرنے کی ٹریننگ دی گئی تھی۔ ٹریننگ کے ذریعہ وہ اتنے تیز اور پھرتیلے ہو گئے تھے ورنہ عام حالات میں کند ذہن تھے۔ نہ بولتے تھے، نہ سنتے تھے اور نہ ہی بلیک گائیڈ کے کسی منصوبے کو سمجھتے تھے، بلیک گائیڈ انہیں جو حکم دیتا تھا، وہ دونوں سوچے سمجھے بغیر اس پر عمل کرتے تھے۔ یعنی بلیک گائیڈ ان کا حاکم تھا، آقا تھا اور وہ دونوں اس کے بندہ بے دام تھے، یا وہ ایسے بندر تھے جو ایک مداری کے اشارے پر ناچتے رہتے تھے۔

بندر تو کسی کے بھی اشارے پر ناچ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ نچانا جانتا ہو۔ اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کس طرح گونگے شیتل کو اپنے کنٹرول میں رکھتا ہے اور اس سے اپنا کام نکالتا ہے، یہ معلومات اس لئے ضروری تھیں کہ آئندہ شیتل سے مقابلہ کرنے سے پہلے بلیک گائیڈ کے طریقہ کار کو سمجھنا لازمی تھا۔ اب تو یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ کند ذہن شیتل تنہا میری کوٹھی میں نہیں آیا تھا، وہاں تک بلیک گائیڈ نے اس کی رہنمائی کی تھی۔ اس حقیقت کے پیش نظر اگر میں بلیک گائیڈ کے دماغ کو اپنے کنٹرول میں رکھوں تو وہ شیتل کو ہمارے مقابلے پر نہیں لا سکے گا۔ یہی باتیں سوچ کر میں زیادہ سے زیادہ اس سے خیال کا رابطہ قائم رکھنا چاہتا تھا۔

اس وقت وہ سوچ رہا تھا: "میں نے جو پیغام نرس کو دیا ہے وہ اسے کل سے پہلے بھوانی شنکر تک نہیں پہنچا سکے گی لہٰذا کل رات کو ہی کوشش کی جائے گی کہ اسے ہسپتال سے نکال کر لے جائیں، میں ابھی گھر پہنچ کر کل کے لئے ایک مکمل منصوبہ بناؤں گا۔"

میں نے اس سے خیال کا رابطہ تھوڑی دیر کے لئے ختم کر دیا۔ ڈائریکٹر جنرل اور شہباز خان خاموش بیٹھے تھے اور مجھے دیکھ رہے تھے، وہ اس انتظار میں تھے کہ میں انہیں نرس اور بلیک گائیڈ کے متعلق تفصیل سے بہت کچھ بتاؤں گا

جب میں نے انہیں بتایا کہ نرس کے کوارٹر میں آنے والا شخص بلیک گائیڈ ہے ڈائریکٹر جنرل نے فوراً ہی کہا۔

"اتنا اہم شخص ہماری نظروں میں ہے، ہمیں فوراً ہی اسے حراست میں لے لینا چاہیئے۔"

میں نے کہا: "اب جبکہ وہ ہماری نظروں میں آگیا ہے تو آئندہ ہم سے چھپ نہیں سکے گا، وہ جہاں بھی جائے گا میں سوچ کے ذریعہ اس کی جائے پناہ معلوم کروں گا، میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے ذرا ڈھیل دیں۔"

"ڈھیل دینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"جناب! میں پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ پپو کو کہاں رکھا گیا ہے اگر اس سے پہلے بلیک گائیڈ کو گھیرا گیا تو وہ بچہ زندہ سلامت واپس نہیں ملے گا

ڈائریکٹر جنرل نے بظاہر میری بات پر اعتراض نہیں کیا لیکن دل ہی دل میں کہنے لگے

"فرہاد ابھی نوجوان ہے۔ جذباتی ہے، اسے بچے سے زیادہ بچے کی ماں سے ہمدردی ہے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ جوان عورت کے آنسو دیکھے نہیں جاتے۔ اسی لیے یہ جوان مرد آگے بڑھ کر آنسو پونچھنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اب میں اس نوجوان کو کیسے سمجھاؤں کہ محض ایک بچے کی زندگی بچانے کے لیے دشمن ملک کے اتنے اہم شخص کو ڈھیل نہیں دینی چاہیئے"۔۔

یہ سوچتے وقت ڈائریکٹر جنرل کے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی کہ میں ہر انسان کے دماغ سے اس کے چھپے ہوئے خیالات چرالیتا ہوں۔ میں نے انہیں مسکرا کر دیکھا تو انہیں فوراً ہی یاد آگیا۔ وہ جھینپ کر کہنے لگے۔

"تم بہت بڑے چور ہو۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم خیالات چرالیتے ہو۔ بہر حال تمہیں پتہ چل گیا ہے کہ میں ایک بچے کی خاطر بلیک گائیڈ کو ڈھیل نہیں دینا چاہتا۔ تم خود سوچو کہ ہمارا وقت کتنا قیمتی ہے، ہمیں چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے"۔

میں نے جواباً کہا: "آپ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے اور میں آپ کے کسی قیمتی جاسوس کو ضائع نہیں کرنا چاہتا، آپ شاید بھول گئے ہیں کہ وہ سیاہ نقاب پوش جس کا نام شیل ہے، آپ کے آدمیوں کو بلیک گائیڈ تک نہیں پہنچنے دے گا، اگر وہ مقابلہ میں ناکام رہا تب بھی مرتے مرتے آپ کے دو چار آدمیوں کا صفایا کر جائے گا، کیا آپ چاہتے ہیں کہ خواہ مخواہ مقابلہ ہو اور ہمارے اچھے اور قابل لوگ مارے جائیں"۔

انہوں نے کہا: "کسی بھی مجرم کو گھیرتے وقت یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مقابلہ ضرور ہوتا ہے، صرف تم اتنا بتاؤ کہ بلیک گائیڈ کہاں جارہا ہے اور کہاں پہنچ کر قیام کرتا ہے، اس کے بعد تم یہاں بیٹھے ہی بیٹھے دیکھو کہ شہباز خان اس پر کس طرح جال پھینک کر اس آخری اور اہم شخص کو گرفتار کرلے گا"۔

شہباز خان بھی جوش میں آگیا، اس نے ڈائریکٹر جنرل کی تائید کی: "ہاں فرہاد! تم تو دیکھ ہی چکے ہو کہ کل میں نے کتنی کامیابی سے احمد شیخ اور ٹونی وغیرہ کی پناہ گاہ پر چھاپہ مارا تھا۔ وہ بلیک گائیڈ بھی مجھ سے بچ کر نہیں جائے گا۔ رہ گیا وہ شیل — تو میں اس سے خوفزدہ نہیں ہوں پھر یہ کہ میرے پاس ریوالور ہوگا، تمہارے ساتھ جو مقابلہ ہوا تھا، اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ ریوالور دیکھتے ہی بھاگ جاتا ہے"۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی ڈائریکٹر جنرل نے کہا: "ہمارے پاس کسی ہتھیار کی کمی نہیں ہے اور ہمارے سب سے بڑے ہتھیار تم ہو، تم یہاں سے بیٹھے ہی بیٹھے شہباز کی مدد کر سکتے ہو، اسے ہر خطرہ سے آگاہ بھی کر سکتے ہو"۔

وہ دونوں یکے بعد دیگرے بولتے جارہے تھے، مجھے ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ فوراً ہی بلیک گائیڈ کو گرفتار کر لینا دانشمندی ہے، میں نے مجبور ہو کر کہا۔

"جناب! میں آپ کے حکم سے انکار نہیں کر سکتا، آپ جو مناسب سمجھتے ہیں، وہ کریں، میں ابھی بلیک گائیڈ کی سوچ پڑھ کر بتا دیتا ہوں کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟"

یہ کہہ کر میں خاموشی سے بلیک گائیڈ کی سوچ پڑھنے لگا، وہ ابھی تک کار ڈرائیو کرتا ہوا شہر کے باہر جارہا تھا، اس کا دماغ اسے گائیڈ کر رہا تھا کہ اسے کن راستوں پر چلنا چاہیئے اور اسی دماغ سے میں اس کی منزل کا پتہ معلوم کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے ڈائریکٹر جنرل کو بتا دیا کہ بلیک گائیڈ شہری آبادی کے آخری سرے پر ایک مکان میں داخل ہوا ہے اور وہی مکان اس کی رہائش گاہ ہے۔

یہ سنتے ہی ڈائریکٹر جنرل نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں شہباز کو چند مسلح جوانوں کے ساتھ ابھی وہاں روانہ کرتا ہوں۔ اس دوران اگر کوئی اہم اطلاع ہو تو تم فوراً ہی شہباز سے دماغی رابطہ قائم کر لینا۔ اچھا خدا حافظ"۔

وہ پلٹ کر چلے گئے، شہباز خان نے بھی جاتے وقت مجھ سے مصافحہ کیا، میں نے کہا۔

"تمہارے جانے کے بعد میں تنہا رہ جاؤں گا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم اس نرس کو یہاں بھیج دیتے، وہ یہاں رہے گی تو میں جاگتا رہوں گا اور سوچ کے ذریعہ تمہیں گائیڈ کرتا رہوں گا"۔

اس نے معنی خیز انداز میں کہا: "ایسا نہ ہو کہ یہاں بند کمرے میں تم دونوں ایک دوسرے کو گائیڈ کرتے رہو اور میں وہاں مشن پر تمہاری مدد کا محتاج بنا رہوں"۔

"ایسا نہیں ہوگا شہباز، وہاں تمہارا ٹکراؤ شیل سے ہو سکتا ہے میں تم سے غافل نہیں رہوں گا، تم خدا پر بھروسہ کر کے جاؤ"۔

وہ چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں پھر بلیک گائیڈ کے دماغ میں جھانکنے لگا، اس بار وہ زبان سے گونگا بن گیا تھا۔ "ہوں ہوں، ہاں ہاں" کہتا ہوا ہاتھ کے اشاروں سے باتیں کر رہا تھا لیکن اس کی سوچ گونگی نہیں ہو سکتی تھی۔ جو کچھ وہ اپنے سامنے گونگے شیل کو اشاروں سے سمجھا رہا تھا۔ اس کی وضاحت اس کی سوچ کے ذریعہ ہو رہی تھی۔

وہ گونگے سے کہہ رہا تھا: "اس بچے کو لے کر کوٹھی میں واپس چلے جاؤ کوٹھی کا نمبر یاد ہے نا؟ ایکس تھرٹی — یہ دیکھو میں لکھ کر بتا رہا ہوں۔ اسے ذہن نشین کر لو، ایکس تھرٹی — وہاں ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہے، یہ بچہ اسے دے دینا۔ یہ کسی وقت یہاں روتا ہے تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ کوئی راہگیر یا گشتی پولیس کی جماعت اس کی آواز سن کر یہاں آجائے گی، یہاں صرف ہم دو مرد ہیں، کوئی عورت نہیں ہے اور عورت کے بغیر یہ بچہ پولیس والوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرے گا، وہاں کوٹھی نمبر ایکس تھرٹی میں اس عورت کے ساتھ

رہے گا تو کسی کو شبہ نہیں ہوگا۔ یہ ابھی سو رہا ہے، راستے میں شور نہیں مچائے گا، اسے پچھلی سیٹ پر سلا کر لے جاؤ۔ اگر یہ جاگ جائے اور تمہارے لیے مصیبت بن جائے تو فوراً ہی اس کا گلا دبا دینا، اب جاؤ یہاں سے اور اسے پہنچا کر فوراً واپس آؤ"۔

یہ کہہ کر وہ گونگے کی باتیں سننے لگا اور اس کے اشاروں کو اپنے دماغ سے سمجھنے لگا۔ وہ بلیک گائیڈ سے پوچھ رہا تھا کہ اسے سیاہ نقاب پہن کر جانا چاہیئے یا نہیں؟

بلیک گائیڈ نے بیزار ہو کر: "تمہارے دماغ میں بھوسہ بھرا ہوا ہے، بھلا اس وقت نقاب کی کیا ضرورت ہے، تم کسی مشن پر تو نہیں جارہے ہو۔ میں بھی کس احمق کو سمجھا رہا ہوں، یہ تو مشن کے معنی بھی نہیں جانتا ہے۔ یہ تو سدھایا ہوا جانور ہے، جتنا سمجھاؤ اتنا ہی سمجھتا ہے اور جتنا سمجھتا ہے اتنا ہی کام کرتا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ اے بابا نقاب کی ضرورت نہیں ہے، تم ایک معزز شہری بن کر جاؤ، دیر نہ کرو"۔

اس کی سوچ کے ذریعہ کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ پھر وہ آواز دور ہوتی چلی گئی، بلیک گائیڈ مکان کے اندر جانے لگا۔ میں اسے چھیڑ کر اس کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اسی وقت نرس پتو کی تصویر لے کر کمرے میں آگئی۔

اس نے آتے ہی کہا: "میں فوراً ہی یہ تصویر لے کر نہ آسکی وہ بدمعاش میرے کوارٹر میں آکر بیٹھا ہوا تھا، اس کے جانے کے بعد یہاں آئی تو کمرے کے باہر پہرے داروں نے مجھے روک لیا۔ میں مایوس ہو کر واپس چلی گئی تھی۔ پھر ابھی مجھے یہ کہہ کر بلایا گیا ہے کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں"۔

میں نے اس کے ہاتھ سے تصویر لے کر کہا: "ہاں۔ میں تمہارے بیٹے کی تصویر دیکھنا چاہتا تھا"۔

میں پتو کی تصویر دیکھنے لگا، تصویر بتا رہی تھی کہ وہ بلاشبہ خوبصورت اور پیارا پیارا بچہ ہے۔ اپنی ماں کی تمام خوبصورتی لے کر اس دنیا میں آیا ہے، میں ماں کے سامنے اس کے بیٹے کی تعریفیں کرنے لگا، وہ فخر سے مسکرا رہی تھی اور مجھے بتا رہی تھی کہ وہ بدمعاش کل رات کے ایک بجے میرے بچے کو واپس لے آئے گا۔

میں تصویر پر اس طرح نظریں جمائے ہوئے تھا جیسے کسی عمل میں ڈوب رہا ہوں، وہ باتیں کرتے کرتے رک گئی۔ مجھے غور سے دیکھنے لگی میں دراصل ڈائریکٹر جنرل سے خیال کا رابطہ قائم کر رہا تھا۔ اس وقت وہ ایک دوسرے کے خاص کمرے میں تنہا بیٹھے ٹرانسمیٹر کے ذریعہ شہباز سے گفتگو کر رہے تھے اور شہباز چند مسلح جوانوں کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھا بلیک گائیڈ کی قیام گاہ کی طرف جارہا تھا۔

میں نے ڈائریکٹر جنرل کی سوچ میں کہا: "جناب! میں فرہاد ہوں اور سوچ کے ذریعہ آپ سے مخاطب ہوں"۔

وہ حیرانی سے سوچنے لگے: "کیا واقعی میرے ذہن میں فرہاد بول رہا ہے، فرہاد! کیا سچ مچ تم مخاطب ہو؟"

"جی ہاں، پہلی بار آپ کی سوچ میں بول رہا ہوں، شاید آپ کو یقین نہیں آرہا ہے"۔

انہوں نے کہا: "اچھا ٹھہرو، میں تمہارے کمرے میں آکر اس بات کی تصدیق کرتا ہوں"۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میری طرف آنے لگے، میں بدستور پتو کی تصویر پر نظریں جمائے بیٹھا ہوا تھا۔ ڈائریکٹر جنرل سے رابطہ ٹوٹتے ہی میں نے سر اٹھا کر سوچ میں ڈوبی ہوئی نظروں سے نرس کو دیکھا، وہ میری نظروں کا مفہوم نہ سمجھ سکی، اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"کیا بات ہے، آپ کا علم کیا کہتا ہے؟ میرا بچہ خیریت سے تو ہے نا کل رات تک مجھے مل جائے گا نا؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا: "کل رات بہت دور ہے۔ تمہارا بیٹا ابھی تمہیں مل جائے گا"۔

وہ مارے خوشی کے میرے بستر پر بیٹھ گئی، میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بے اختیار اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر مسرت سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی:

"ابھی مل جائے گا؟ کیا میرا لعل مجھے ابھی مل جائے گا؟ کہاں ہے وہ، کیسے ملے گا؟"

یہ کہتے ہی وہ اچانک رک کر بے یقینی سے سوچنے لگی: "یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس وقت آتی رات کو مل جائے۔ یہ مریض مجھے بہلا رہا ہے، مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے"۔

میں نے فوراً ہی اپنی سچائی کا یقین دلانا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی وقت ڈائریکٹر جنرل میرے کمرے میں آگئے، وہ تصدیق کرنا چاہتے تھے کہ میں نے سوچ کے ذریعہ ان سے رابطہ قائم کیا تھا یا نہیں؟ لیکن وہ نرس کے سامنے ٹیلی پیتھی کے متعلق کوئی سوال نہیں کر سکتے تھے، میں نے مسکرا کر کہا۔

"آپ جس بات کی تصدیق کرنے آئے ہیں وہ درست ہے۔ ابھی میں نے آپ سے رابطہ قائم کیا تھا، آپ شہباز کو بتا دیں کہ بلیک گائیڈ اس مکان میں بالکل تنہا ہے۔ شیل کم از کم ایک گھنٹے کے بعد وہاں پہنچے گا"۔

"اچھی بات ہے، میں ابھی اسے انفارم کرتا ہوں"۔

"میرا ایک کام ہے جناب! وہ یہ کہ آپ اپنے دو چار مسلح جوانوں کو نرس کے ہمراہ کوٹھی نمبر ایکس تھرٹی میں بھیج دیں۔ وہاں وہ لڑکا پتو ایک عورت کی نگرانی میں ہے، ان جوانوں سے کہہ دیں کہ پتو کو ان کے حوالے کر دیں اور اس عورت کو حراست میں لے لیں"۔

میں نے انہیں اس کوٹھی کا مکمل پتہ بتا دیا۔ نرس حیرانی سے آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہی تھی، میں نے مسکرا کر کہا۔

"میں نے تمہارے بیٹے کی تصویر دیکھ کر اپنے علم سے معلوم کیا ہے کہ یہ تصویر میں مسکرانے والا بچہ کوٹھی نمبر ایکس تھرٹی میں ہے، تم ان کے ساتھ جاؤ۔

تمہارا بیٹا ابھی تمہیں مل جائے گا۔"

وہ مجھے احسانمندی سے دیکھتی ہوئی ڈائریکٹر جنرل کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی کمرہ ویران ہو گیا اور میں تنہا رہ گیا، اکثر میرے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ میں زندگی کے ہنگاموں سے گزرتے گزرتے اچانک ہی تنہا رہ جاتا ہوں۔ ایسے وقت سوچتا ہوں کہ اتنی بڑی دنیا میں کوئی میرا اپنا نہیں ہے۔ نہ ماں باپ ہیں، نہ بھائی بہن ہیں۔ جو بھی ہیں وہ دور کے رشتہ دار ہیں، کوئی ایسا نہیں ہے جسے گہرے رشتے کی بنا پر تنہائی میں یاد کروں۔ سامی سے دل کا رشتہ تھا لیکن وہ اپنے جسم کی حفاظت اور سلامتی کے لئے دل کے رشتے کو ترجیح نہیں دیتی تھی، اسے اپنا شاہکار جسم اتنا عزیز تھا کہ وہ جان بوجھ کر مجھ سے دور سرحد پار چلی گئی تھی۔ لہٰذا میں مکمل یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زندگی کی آخری سانس تک میرا ساتھ دے سکے گی یا نہیں؟

میں اب بھی اس سے محبت کرتا تھا لیکن اس پر فخر نہیں کرتا تھا۔ اپنا فرض سمجھ کر اس کی خیریت معلوم کرتا رہتا تھا اور اس کے کام آتا تھا۔ میں نے اس وقت ابھی چپکے سے اس کے ذہن میں جھانک کر دیکھا۔

وہ سو رہی تھی اور ایک سندر سپنا دیکھ رہی تھی، جس میں اس کے چنے کا شہزادہ تھا یعنی سپنے میں بھی کسی ایرے غیرے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہاں بھی اس کی بند آنکھوں کے پیچھے میں نظر آ رہا تھا۔

میں نے اس کے خواب میں مداخلت نہیں کی، اس کے ذہن پر دستک نہیں دی، اسے چپ چاپ سوتا چھوڑ کر خواب کی دنیا سے ہسپتال کے ماحول میں واپس آ گیا، اگر میں اسے نیند سے بیدار کرتا اور پیار و محبت کی پونجیاں مجھے بہا کر لے جاتیں تو میں شہباز، نرس اور پپو کے متعلق تازہ ترین اطلاعات سے محروم رہ جاتا۔

لہٰذا میں نے سب سے پہلے شہباز کی طرف توجہ دی۔ وہ بلیک گائیڈ کے مکان کا محاصرہ کر چکا تھا اور اسے للکار کر باہر آنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ لیکن وہ باہر نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی اس کی کسی بات کا جواب دے رہا تھا۔

شہباز سوچنے لگا: کہیں میں نے کسی غلط مکان کا محاصرہ تو نہیں کیا ہے۔ اندر سے کسی کی آواز نہیں آ رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکان بالکل خالی ہے۔

شہباز کی سوچ پڑھ کر مجھے بھی شبہ ہوا کہ کہیں وہ کوئی اور مکان نہ ہو۔ اس خیال سے میں بلیک گائیڈ کے خیالات پڑھنے لگا۔

وہ حیرانی سے سوچ رہا تھا۔ پتہ نہیں، یہ پولیس والے میرے پیچھے کیسے پڑ گئے ہیں۔ وہ کیا جانتے ہیں کہ میں کون ہوں، جبکہ میرے اپنے آدمی مجھے نہیں پہچانتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ اس ملک کی پولیس اتنی برق رفتار کیسے ہو گئی ہے۔ ان لوگوں نے چار دن پہلے بھوانی شنکر کو گرفتار کیا۔ تب مجھے وِلی احمد شیخ اور گونی وغیرہ تک پہنچ گئے۔ اب میرے مکان کا بھی محاصرہ کر لیا ہے۔

اچھی بات ہے، یہ لوگ مجھے باہر سے للکارتے رہیں۔ میں اس چھوٹے سے مکان کو ٹائم بم سے اڑا دوں گا۔ یہ لوگ مجھے بھوانی شنکر اور ٹولی کی طرح بڑی آسانی سے گرفتار کرنے آ گئے ہیں، ابھی انہیں پتہ چل جائے گا کہ میں کتنا خطرناک ہوں۔ یہ اتنی قوت کا بم ہے کہ مکان کی دیواریں بھی دھجیوں کی طرح اڑ کر محاصرہ کرنے والوں کو اپنے ملبے میں دفن کر دیں گی۔

یہ سوچ کر وہ بم کی بلاسٹنگ کے لئے دس منٹ کا وقت مقرر کرنے لگا۔ میں حیرانی سے سوچ رہا تھا، کیا اس مکان کے ساتھ وہ خود بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا، کیونکہ وہ مکان سے باہر نکلنے کے متعلق نہیں سوچ رہا تھا، حالانکہ اسے سب سے پہلے اپنی حفاظت کے لئے سوچنا چاہئے۔

لیکن اس کے اطمینان سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ خطرات سے وہ گھبرانے اور حوصلہ ہارنے کی بجائے پرسکون رہنے کا عادی تھا۔ میں نے فوراً ہی شہباز کے دماغ پر دستک دی۔

"شہباز! محاصرہ تنگ نہ کرو، اپنے آدمیوں کے ساتھ مکان سے دور ہو جاؤ، ابھی وہ مکان بارود کے دھماکے سے برباد ہو جائے گا۔ میں فرہاد بول رہا ہوں، تم فوراً میری ہدایت پر عمل کرو۔"

شہباز اپنا سر تھام کر سوچنے لگا، کیا واقعی فرہاد مجھ سے سوچ کے ذریعہ رابطہ قائم کر رہا ہے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسے یقین دلانے میں کافی وقت صرف ہو جاتا۔ بلیک گائیڈ نے صرف دس منٹ کا وقت ٹائم بم میں سیٹ کیا تھا اور اب تک چار منٹ گزر گئے تھے، وہ ٹائم بم کو کمرے میں رکھنے کے بعد بڑی تیزی سے آتش دان کی طرف جا رہا تھا تب اس کی سوچ سے پتہ چلا کہ آتش دان کے اندر سے ایک چور زینہ تہہ خانے میں گیا ہے پھر تہہ خانے سے ایک سرنگ بہت دور جا کر ایک جنگل میں جھاڑیوں کے درمیان ابھرتی ہے۔

اس کے خیالات پڑھ کر معلومات حاصل کرنے میں کئی منٹ ضائع ہو گئے۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا، بم پھٹنے میں۔۔۔ صرف دو منٹ رہ گئے تھے۔ ادھر شہباز کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کی سوچ میں آ کر اسے ایک زبردست خطرے سے آگاہ کر رہا ہوں۔

میں نے سوچ کے ذریعہ ڈائریکٹر جنرل کو مخاطب کیا اور ان سے کہا کہ وہ فوراً شہباز اور اس کے دوسرے آدمیوں کو مکان سے دور جانے کا حکم دیں ایک منٹ کے بعد اس مکان کے اندر زبردست دھماکہ ہونے والا ہے اور بلیک گائیڈ چور راستے سے فرار ہو گیا ہے۔

انہوں نے ٹرانسمیٹر کے ذریعہ شہباز کو حکم دیا کہ وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ فوراً ہی مکان سے بہت دور چلا جائے، ابھی آدھے منٹ میں دھماکہ ہونے والا ہے، یہ اطلاع فرہاد سے ملی ہے۔

جواب میں شہباز نے کہا: "جناب! فرہاد کی اطلاع غلط ہے، ابھی مکان کے اندر سے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی ہیں، جب لوگ اندر موجود ہیں تو پھر دھماکہ کیسے ہو سکتا ہے، میں ابھی فائرنگ۔۔۔"

وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکا، اچانک ہی ایک زبردست دھماکہ ہوا۔

شہباز نے مجھ پر یقین نہیں کیا تھا اور باتوں میں وقت ضائع کیا تھا۔ یہ تو میں بھی نہیں جانتا تھا کہ مکان کے اندر سے دو آدمیوں کی گفتگو کیسے سنائی دے رہی تھی، جبکہ وہاں کوئی نہ تھا۔ بعد میں یہی سمجھ میں آیا کہ بلیک گائیڈ نے فرار ہونے سے پہلے ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا تھا، اس ٹیپ میں دو آدمیوں کی گفتگو ریکارڈ کی ہوئی تھی، اور اس گفتگو سے شہباز دھوکہ کھا گیا تھا۔

میں نے شہباز سے دماغی رابطہ قائم کرنا چاہا، لیکن اس کی سوچوں کو گرفت میں نہ لے سکا، کیونکہ اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا تھا۔ کیا وہ مر گیا ہے؟ اس خیال سے ہی میرے دل کو صدمہ پہنچا، وہ میرا ایک اچھا دوست تھا۔ میں نے خود کو تسلی دی کہ شاید وہ بیہوش ہو گیا ہے۔

میں نے اسی وقت ڈائریکٹر جنرل کو اطلاع دی کہ دھماکہ ہو چکا ہے۔ شہباز سے دماغی رابطہ قائم نہیں ہو رہا ہے، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ بیہوش ہو گیا ہے۔ ڈائریکٹر جنرل ضمیر حسن فوراً ہی ایک امدادی پارٹی روانہ کرنے کے انتظامات میں مصروف ہو گئے۔

ادھر سے فراغت پا کر میں نے نرس کے دماغ میں جھانک کر دیکھا، اس وقت وہ ایک جیپ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھی اپنے بچے کو سینے سے لگا کر پیار کر رہی تھی، اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ کامیاب ہو کر واپس آ رہی ہے۔

مجھے اس بات کا اندیشہ تھا کہ شبیل ان کی راہ میں دیوار بن جائے گا۔ لیکن ایسی کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ میں نے مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے نرس کے ذہن کو کریدنا شروع کیا، اب وہ بار بار میرے متعلق سوچ رہی تھی۔

"وہ مریض نہیں ہے، کوئی فرشتہ ہے، غیب کی باتیں جانتا ہے۔ میں اس کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔"

میں نے اس کی سوچ میں کہا: "صرف احسان یاد رکھوں گی یا اس انسان کو بھی یاد رکھوں گی؟"

"میں انہیں بھی یاد رکھوں گی، یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں انہیں بھول جاؤں۔"

میں نے پھر اس کی سوچ میں کہا: "یہ تو درست ہے کہ تم بھول نہیں سکتی لیکن انہیں کس انداز میں یاد رکھو گی؟"

کس انداز میں یاد رکھنے سے پہلے وہ چشم تصور میں مجھے دیکھنے لگی۔ اس وقت میرے دونوں ہاتھوں کے چوڑے پنجے اور مضبوط انگلیاں اس کی نگاہوں میں تھی۔ سب سے پہلے میرے ان ہاتھوں کا خیال اس لئے آیا کہ اس نے ہاتھ کی لکیریں دکھانے کے لئے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ جب کی بات اور تھی، وہ ممتا کے جوش میں تھی، یہ نہ سوچ سکی تھی کہ اپنا ہاتھ ایک جوان مرد کے ہاتھوں میں دے رہی تھی۔ اب کی بات کچھ اور ہو گئی۔ میرے مضبوط ہاتھوں کا تصور کرتے ہی شرما گئی، اور شرماتی ہوئی وہ سوچنے لگی۔

"مجھے کیا ہو گیا تھا؟ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ ہاتھ دکھاتے وقت میں ان کے بالکل قریب بیٹھ گئی تھی، وہ تو اس وقت ہوش آیا جب پولیس کے دو آفیسر کمرے میں آ گئے تھے۔ نہ جانے ان لوگوں نے کیا سوچا ہو گا؟ یہی سوچا ہو گا کہ میں نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں محبت سے دیا ہے، وہ محبت کا ہی انداز تھا۔"

محبت کا انداز یاد آیا تو وہ تصور میں میرے چہرے اور شخصیت کا جائزہ لینے لگی۔ وہ میری شخصیت کے متعلق جتنا سوچ رہی تھی، اتنا ہی مجھ سے متاثر ہوتی جا رہی تھی اور یہ سوچ رہی تھی: "میں اتنی بار ان کے قریب گئی لیکن اب سے پہلے ان سے متاثر کیوں نہ ہوئی؟ شاید اس لئے کہ اب تک میرے دل و دماغ پر پپو کی جدائی کا گہرا اثر تھا، مجھے اس کے سوا دنیا میں کوئی دوسرا نظر نہیں آتا تھا، میں دنیا کے تمام رشتوں اور محبتوں کو بھول گئی تھی۔

اب میرا بچہ میرے سینے سے لگا ہوا ہے، اب خیال آ رہا ہے کہ یہاں زندہ رہنے کے لئے بہت سے رشتوں اور جذبوں کا احترام کرنا پڑتا ہے اور کچھ جذبات ایسے ہوتے ہیں جن سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا۔ دل بار بار کہتا ہے، کوئی تو ہو جو مجھے اپنے مضبوط بازوؤں میں چھپا لے۔

اور اُن کے تو بازو بھی مضبوط ہیں اور ان کی ذہنی صلاحیتیں بھی حیرت انگیز ہیں، غیب کی باتیں بتا دیتے ہیں۔ ان سے ملاقات نہ ہوتی تو میرا بچہ اتنی آسانی سے نہ ملتا۔ جی چاہتا ہے کہ ان کے قدموں پر سر رکھ کر ان کے اس عظیم احسان کا اعتراف کروں۔"

میں نے اس کی سوچ میں کہا: "کیا میں قدموں میں سر رکھنے کی بجائے ان کے گلے لگ کر شکریہ ادا نہیں کر سکتی؟"

"اُس!" وہ چونک کر سوچنے لگی: "یہ میں کیسی باتیں سوچ رہی ہوں؟ کسی نے میرے خیال کو سمجھ لیا تو بے شرم کہلاؤں گی مگر خیالوں میں کون جھانکنے آتا ہے؟ نہ جانے میں کتنی دیر سے ان کے متعلق سوچ رہی ہوں۔ میں زبان سے کچھ نہ کہوں، یہ اور بات ہے، مگر دل ہی دل میں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ میں بے اختیار ان کی طرف کھنچتی جا رہی ہوں، میں کئی بار کوشش کر چکی ہوں کہ ان کے متعلق زیادہ نہ سوچوں، مگر تعجب ہے کہ سوچتی ہی چلی جا رہی ہوں کیا اسے دل لگاؤ نہیں کہتے ہیں؟"

وہ جیپ کار میں بیٹھی ہوئی تھی اور اب ہسپتال کے کمپاؤنڈ تک پہنچ گئی تھی، اس نے سوچا: "پپو سو گیا ہے، میں اسے کوارٹر میں سلا کر دس نمبر کے کمرے میں جاؤں گی لیکن نہیں، میں اپنے بیٹے کو تنہا نہیں چھوڑوں گی، ایسا نہ ہو کہ وہ بدمعاش پھر اسے اٹھا کر لے جائے۔ ٹھیک ہے، اب میں ان کے پاس پپو کو لے کر جاؤں گی، وہی بتائیں گے کہ اس ننھی سی جان کو دشمنوں سے کس طرح محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔"

یہ سوچ کر وہ پولیس کے مسلح جوانوں کے ساتھ ہسپتال کی عمارت میں داخل ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک آفیسر ڈائریکٹر جنرل کو رپورٹ دے رہا تھا اور میں ڈائریکٹر جنرل کی سوچ کے ذریعہ اس رپورٹ کو سن رہا تھا۔

رپورٹ یہ تھی کہ جس کوٹھی سے پپو کو حاصل کیا گیا تھا وہاں ایک ادھیڑ عمر کی عورت کے سوا کوئی نہ تھا، اس عورت کو حراست میں لے لیا گیا تھا

اور اس کوٹھی میں ایک سپاہی کو پہریدار کے طور پر رکھ دیا گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ اس کوٹھی میں شیتل انٹیلی جنس والوں سے ٹکرائے گا لیکن ان کی رپورٹ سن کر اب یہی سوچا جا سکتا تھا کہ انٹیلی جنس والوں کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی شیتل واپس چلا گیا تھا، وہ یقیناً اس مکان کی طرف گیا ہوگا جو اب کھنڈر بن چکا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ میں اس گوتگے شیتل کی سوچ کو نہیں پکڑ سکتا تھا، کیونکہ میں اس کے چہرے سے واقف نہیں تھا، اس کی آنکھوں کے ذریعہ اس کی سوچ تک نہیں پہنچ سکتا تھا، اس وقت شیتل جہاں بھی تھا، نقاب میں نہیں تھا، کاش کہ مجھ سے سامنا ہو جاتا اور میں اس کا چہرہ ایک بار دیکھ لیتا، ایک وہی تھا جو میرے کنٹرول میں نہیں تھا

ایسے وقت یہی سمجھ میں آیا کہ میں بلیک گائیڈ سے رابطہ رکھوں اور یہ معلوم کرتا رہوں کہ وہ شیتل سے کہاں ملے گا؟ کیسے ملے گا؟ اور اس سے کس طرح رابطہ قائم کرے گا؟

اسی وقت نرس اور ڈائریکٹر جنرل کمرے میں آئے، انھوں نے مجھے وہی رپورٹ سنائی جو میں پہلے سن چکا تھا، میں نے ان سے کہا۔

"میں ابھی شیتل کو تلاش کر رہا ہوں، اس کے لیے ضروری ہے کہ میں بلیک گائیڈ سے رابطہ رکھوں، آپ یہ بتائیں شہباز کی کوئی خبر آئی؟"

انھوں نے کہا "میں نے جو امدادی جماعت روانہ کی تھی ان کی گاڑی راستے میں پنکچر ہو گئی ہے۔ میں نے دوسری گاڑی بھیجی ہے۔ ابھی پندرہ بیس منٹ کے بعد وہاں کی رپورٹ بھی مل جائے گی۔"

یہ کہہ کر انھوں نے کن انکھیوں سے نرس کی جانب دیکھا، پھر مجھے معنی خیز انداز میں دیکھ کر مسکرائے اور وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی نرس نے سر جھکا کر کہا۔

"میرا بچہ مجھے مل گیا ہے۔ میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ آپ نے اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں؟"

میں نے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا کر کہا "اگر تمھارا دل کہتا ہے کہ آگے بڑھ کر شکریہ ادا کرو تو پھر آگے بڑھو اور اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔"

وہ جھجکنے لگی، سوچنے لگی "یہ ہاتھ میری جانب اٹھا ہوا ہے میں اسے ٹھکرا نہیں سکتی۔ اگر میں ان کا ہاتھ تھام لوں اور ذرا قریب ہو جاؤں تو یہ کوئی غلط حرکت نہیں کریں گے کیونکہ یہ بیمار ہیں۔"

یہ سوچتے ہی وہ مطمئن ہو کر آگے بڑھ گئی۔ ہولے ہولے جھجکتے ہوئے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے اس کے نرم و نازک ہاتھ کو تھام کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ شکریہ ادا کرنے کا سب سے خوبصورت انداز ہے۔"

وہ شرمانے لگی۔ میں نے اس کے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دیا یعنی قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ بے اختیار کھنچی چلی آئی حالانکہ ابھی اس کے اندر قریب آنے اور دور رہنے کی کشمکش جاری تھی۔ میں نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے پپّو کی بات چھیڑ دی۔

"تمھارا بیٹا کہاں ہے؟"

بیٹے کے ذکر پر وہ خوشی سے کھل گئی۔ اس کے اندر کی کشمکش یکلخت ختم ہو گئی۔ اسے یوں لگا جیسے میں اس کا اپنا ہوں۔ ہمارے کوئی غیریت ہی نہیں ہے اور میں اس کے اور پپّو کے دکھ سکھ میں شریک رہا ہوں۔

اس نے جواب دیا "میں نے اسے ایک نرس کے کمرے [illegible] ہے۔ اب میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں [illegible] پھر نہ آ جائے۔"

"ہاں۔ ابھی تک وہ گرفتار نہیں ہو سکا۔ وہ کسی وقت بھی دوبارہ آ سکتا ہے تمھیں محتاط رہنا چاہیے۔"

وہ سہم کر بولی "مجھے جانا چاہیے۔ میرا بچہ اکیلا [illegible] نرس وہاں موجود ہے یا نہیں؟"

وہ میرے پاس سے اٹھنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے تسلی [illegible] تک میں یہاں موجود ہوں تمھارے بیٹے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا [illegible]

اس کی آنکھوں سے اطمینان جھلکنے لگا۔ وہ مسکرا کر بولی [illegible] دیر کے لیے بھول گئی تھی کہ آپ یہاں موجود ہیں۔ واقعی آپ کی [illegible] مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے لیکن ایسا کب تک ہوگا آپ یہاں [illegible] نہیں رہیں گے۔ آپ کی عدم موجودگی میں اگر وہ بدمعاش آ [illegible] اپنے بچے کی حفاظت کیسے کروں گی؟"

"تم فکر نہ کرو۔ وہ بدمعاش جلد ہی گرفتار ہو جائے گا [illegible] تک وہ گرفتار نہیں ہوگا، اس وقت تک میں اسے تمھارے بیٹے کے قریب نہیں آنے دوں گا۔"

"آپ کتنے اچھے ہیں۔ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ [illegible]"

"میں نے کہا "پہلی بار تم نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں میں [illegible] شکریہ ادا کیا۔ دوسری بار اپنے آپ کو میرے ہاتھوں میں دے [illegible] ادا کر سکتی ہو۔"

یکبارگی اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، میرے ہاتھوں کے تصور سے وہ مارے شرم کے لال لال ہو گئی۔ وہ حیات ایسے [illegible] تھی جیسے اب تب میں گر پڑے گی۔ وہ جذبات کی شدت سے کانپنے لگی۔ فطری شرم و حیا کے تحت اس نے مجھ سے پرے ہٹنے کی ایک ناکام سی جدوجہد کی۔ پھر ایسے شانت ہو گئی جیسے کسی تناور [illegible] سائے میں آ کر زندگی کی دھوپ سے محفوظ ہو گئی ہو۔

ہم تھوڑی دیر تک اسی طرح خاموش رہے۔ اس [illegible] میرے دل سے لگا دھڑک رہا تھا اور میں چپ چاپ اس [illegible] پڑھ رہا تھا

وہ سوچ رہی تھی "آج پورے چار سال کے بعد مجھے [illegible] نصیب ہوا ہے۔ یوں تو میں جب چاہتی مجھے کوئی نہ کوئی مل ہی جاتا [illegible] کیوں میرے جذبات مر گئے تھے۔ پپّو کے پیدا ہوتے ہی اس کا باپ [illegible] وہ بے چارہ بہت اچھا تھا۔ میں نے جوانی کی بہت کم راتیں اس [illegible] گذاری ہیں کیونکہ وہ ملازمت کے سلسلے میں شہر سے باہر رہا کرتا تھا۔ [illegible] دس ماہ بعد ہی وہ مر گیا۔ یعنی میں دس ماہ کے لیے سہاگن بنی [illegible] اس کی قربت میں گذاریں۔ اس کے بعد پھر اس دنیا میں تنہا رہ گئی۔ [illegible] معنوں میں نہیں جانتی کہ مرد کا پیار کیا ہوتا ہے۔ میں اب تک ڈرتی تھی [illegible] سہم جاتی تھی کہ کسی مرد کو پیار کا موقع دوں گی تو وہ ہمیشہ کے لیے میرے [illegible] کا مالک بن جائے گا۔ میرا حاکم بن کر میرے پپّو کو مجھ سے جدا کر دے [illegible] مگر اب نہ جانے کیسے اس مرد کی آغوش میں آ گئی ہوں۔

میں نہیں جانتی کہ یہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کہاں [illegible] جائے گا؟ لیکن میں نے اس پر بھروسہ کر لیا۔ شاید اس لیے کہ یہ بہت بڑا [illegible] ہے۔ غیب کی باتیں جانتا ہے۔ میں اس کی صلاحیتوں سے متاثر [illegible] گئی ہوں۔

ہاں ٹھیک تو ہے۔ عورت کو کسی ایسے ہی مرد کی آغوش میں جانا چاہیے [illegible] زندگی بھر فخر کرتی ہے۔ مجھے بھی فخر ہے کہ میں نے اپنے حسن و شباب کو [illegible] شخص کے حوالے نہیں کیا ہے۔

لیکن ایک بات سے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں یہ اپنے علم سے مجھ پر اس [illegible] حاوی نہ ہو جائے کہ میں اپنے بچے کو بھول جاؤں۔ نہیں۔ نہیں پہلے [illegible] اس کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ میں نے تو پوچھا ہی نہیں کہ [illegible] ہے۔ ہسپتال کے کاغذات میں اس کا نام لکھا ہوا ہے مگر میں نے [illegible] توجہ نہیں دی۔ مجھے اس سے پوچھنا چاہیے۔"

اس نے مجھ سے پوچھا "آپ کا نام کیا ہے؟"

"میں نے بھی تمھارا نام پوچھا تھا لیکن تم سسٹر کہہ کر ٹال گئی تھیں۔"

"میرا نام فرزانہ ہے۔"

"میرا نام فرہاد ہے۔ میں اس دنیا میں تنہا ہوں۔ خانہ بدوشی کی [illegible] گذار رہا ہوں۔ آج یہاں کل وہاں۔ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔"

"آپ شادی کر کے ایک گھر کیوں نہیں بسا لیتے؟"

"شادی کرنے کے بعد عورت پر حکومت کرنے اور اس پر ظلم کرنے کو [illegible] چاہتا ہے۔ میں حاکم اور ظالم نہیں بننا چاہتا۔ عورت سے اس کی کوئی چیز [illegible] چھیننا چاہتا۔ اسی لیے شادی سے پرہیز کرتا ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ [illegible] سے شادی کروں اور خاوند بن کر حکم دوں کہ تم مجھ سے زیادہ محبت کرو [illegible] کو بھول جاؤ تو کیا تم میرا یہ ظلم برداشت کرو گی؟"

[illegible] میں نے اس کے مزاج کے مطابق ایسی باتیں کہہ دیں۔ اس سے [illegible]

[illegible] ن۔ نہیں۔ آپ ایسی۔ ایسی نہ کریں۔ م۔ میں خود بھی کسی سے شادی [illegible] نہیں کرنا چاہتی۔ م۔ میں آپ سے دوستی کر سکتی ہوں مگر آپ کو پپّو کا سوتیلا باپ نہیں بنا سکتی . . . . ."

وہ ہچکچاتے ہوئے اپنے دل کی بات کہہ گئی۔ میں نے اس کی تائید میں کہا۔

"یہ تمھارا دانشمندانہ فیصلہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تمھارا کوئی ہونے والا شوہر شادی سے پہلے تمھارے پپّو سے جتنی محبت کرے گا، اتنی ہی نفرت وہ سوتیلا باپ بن کر کرے گا۔ میں پپّو کا صرف ہمدرد اور مددگار بن کر رہوں گا اور تمھارا صرف دوست!"

یہ کہہ کر میں نے اس کے جھجکتے ہوئے چہرے کو اپنی طرف کیا اور دوستی کی ابتدا کر دی۔ بس وہ ابتدا ہی تھی۔ میں اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا کیونکہ دن میں دو وقت میرے بدن کی مالش کی جاتی تھی اور تاکید کی جاتی تھی کہ میں چپ چاپ پڑا رہوں۔ کمرے میں چلنے پھرنے کی خواہش نہ کروں۔ جب اتنے سے کمرے میں چلنے پھرنے کی ممانعت تھی تو پھر جذبات کے طویل سفر کی اجازت کیسے مل سکتی تھی۔

اس نے ایک نرس کی حیثیت سے اپنا فرض انجام دیا اور مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

دروازے پر دستک سنتے ہی وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن نے دروازے پر دستک دے کر عقلمندی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ سر جھکائے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے تعجب سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟"

انھوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "بہت بری خبر ہے۔ شہباز خان اس مکان کی دیوار کے نیچے دب کر مر گیا۔ اس کے ساتھیوں کا بھی برا حال ہے۔ ان میں سے دو ایسے ہیں جو ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی مر گئے ہیں۔ باقی چار کی حالت بہت نازک ہے۔"

شہباز کی موت کی خبر سن کر میرا سر جھک گیا مجھے اس قدر صدمہ پہنچا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے سوچا، میں کیا کر سکتا تھا؟ میری صلاحیتیں بھی کام نہیں آ سکی تھیں۔ میں نے ڈائریکٹر جنرل کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ جلد بازی سے کام نہ لیں مجرم ہاتھ سے نکل جائے گا۔

اور وہ ہاتھ سے نکل گیا تھا اور ایک دلیر اور باصلاحیت افسر مارا گیا تھا اور یہ سب عجلت کا نتیجہ تھا۔ میں اس لیے اس مشن کے خلاف تھا کہ ہم بلیک گائیڈ کے طریقہ کار سے واقف نہیں تھے۔ دشمن کو اچھی طرح سمجھے بغیر اس پر حملہ کرنا دانشمندی نہیں ہوتی۔ پھر یہ کہ میں نے شہباز سے کبھی سوچ کے ذریعے گفتگو نہیں کی تھی۔ ہمارے درمیان یہ طے نہیں پایا تھا کہ میں سوچ کے ذریعے اسے کس طرح گائیڈ کروں گا۔ شہباز اسی وجہ سے مارا

گیا تھا کہ اس نے مجھ پر یقین نہیں کیا تھا۔ میدانِ عمل میں وہ صرف خود کو مردِ میدان سمجھتا رہا تھا۔

اس مشن کی ناکامی میں ڈائریکٹر جنرل کے اندھے فیصلے کا بھی دخل تھا۔ انھوں نے سمجھا تھا کہ جس طرح احمد شیخ اور ٹولی وغیرہ آسانی سے ایک مکان میں گھیر لیے گئے تھے اسی طرح بلیک گائیڈ بھی آسانی سے ہاتھ آجائے گا۔

دراصل انھیں میری صلاحیتوں پر بھروسہ نہیں تھا۔ انھیں سمجھنا چاہیے تھا کہ بلیک گائیڈ کہیں بھی بھاگ کر جائے گا تو میری سوچ کی لہریں اسے گرفت میں لے لیں گی۔ اب ناکام ہونے کے بعد انھوں نے کہا۔

"میں اس بلیک گائیڈ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تم فوراً پتہ چلاؤ کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟ میرے آدمی ابھی اس کا پیچھا کریں گے۔"

"جناب ابھی پیچھا کر کے پھر وہی غلطی کریں گے۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ ابھی بلیک گائیڈ کو گرفتار کرنے کے لیے کوئی قدم نہ اٹھایا جائے — لیکن آپ نے میرے مشورے کو تسلیم نہیں کیا۔"

شبیر حسن نے پہلی بار مجھے ناگواری سے دیکھا۔ وہ بہت بڑے افسر تھے۔ آج تک کسی نے ان پر تنقید نہیں کی تھی اور میں انھیں اس مشن کی ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرا رہا تھا۔ وہ ناگواری سے سوچ رہے تھے۔

"کل کا چھوکرا مجھے اپنے مشورے پر چلانا چاہتا ہے۔ یہ کیا جانتا ہے۔ ہم نے مجرموں سے دو دو ہاتھ کرتے ہوئے ایک عمر گذار دی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کس وقت کون سا قدم اٹھانا چاہیے۔ یہ ٹیلی پیتھی کیا جانتا ہے کہ اپنے آپ کو . . ."

وہ سوچتے سوچتے رک گئے۔ اچانک ہی انھیں عقل آگئی کہ میں ان کے خیالات پڑھ رہا ہوں۔ انھوں نے پریشان ہو کر مجھے دیکھا تو میں نے مسکرا کر کہا۔

"واقعی آپ نے مجرموں سے دو دو ہاتھ کرتے ہوئے ایک عمر گذار دی ہے۔ میں آپ کے سامنے بچہ ہوں۔ آپ جو حکم دیں گے میں اس پر عمل کروں گا۔ ابھی پندرہ منٹ کے بعد آپ تشریف لائیں میں بتا دوں گا کہ بلیک گائیڈ کہاں ہے؟"

میں نے انھیں سوچتے ہوئے سن لیا تھا اور وہ میرے خلاف سوچ رہے تھے اس لیے اب انھیں غصہ آرہا تھا کہ میں نے ان کے خیالات کیوں پڑھ لیے۔ وہ جھلا کر وہاں سے چلے گئے۔ کمرے سے باہر جا کر بھی انھوں نے میرے متعلق سوچا۔

"یہ بڑی مشکل ہے۔ فرہاد میرے خیالات بھی پڑھ لیتا ہے۔ شاید اب بھی پڑھ رہا ہوگا۔ نہیں ... وہ، تو ان نرس اس کے پاس موجود ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ میرے باہر آنے پر جذبات میں بہہ گیا ہو اور میرے خیالات نہ پڑھ رہا ہو۔ پھر بھی مجھے محتاط رہنا چاہیے۔ اس کے خلاف نہیں سوچنا چاہیے۔ مگر کچھ باتیں ایسی ہیں جنھیں میں اس کی لاعلمی میں سوچنا چاہتا ہوں۔ اسے علم نہیں ہونا چاہیے کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔

ہاں ایک ترکیب ہے۔ جب وہ گہری نیند میں ڈوب جائے گا تو

ہی میں آزادی سے سوچ سکوں گا . . ."

یہ سوچتے سوچتے وہ ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئے۔ انھوں نے ڈاکٹر سے پوچھا "اتنی رات گذر گئی ہے، فرہاد کو نیند کیوں نہیں آرہی ہے۔ کیا آپ اسے نیند کا انجکشن نہیں دے سکتے؟"

"جی ہاں! میں ابھی نرس کو بھیجتا ہوں، وہ انجکشن لگا دے گی۔"

"ابھی نہیں۔ آدھ گھنٹے کے بعد اسے نیند کا انجکشن دیجیے۔"

وہ سوچنے لگے "اگر فرہاد میری سوچ پڑھ رہا ہوگا تو نیند کا انجکشن نہیں لگوائے گا۔ اگر اس نے انجکشن لگوا لیا تو پھر مجھے آزادی سے سوچنے کا موقع مل جائے گا۔"

میں شبیر حسن کی سوچ کو پڑھ رہا تھا۔ فرزانہ نے مجھے حیرانی سے دیکھ کر پوچھا۔

"آپ کس سوچ میں ڈوب گئے ہیں؟"

"میں اپنے علم سے ایک ایسی مصیبت کو دیکھ رہا ہوں جو ابھی آنے والی ہے۔ اس مصیبت سے تم ہی مجھے بچا سکتی ہو۔"

"کیا واقعی میں آپ کو کسی مصیبت سے بچا سکتی ہوں؟" فرزانہ یہ سوچ کر حیران بھی تھی اور مسرور بھی کہ وہ میرے کام آسکتی ہے۔ وہ پھر میرے قریب آکر مٹکتی ہوئی بولی "آپ کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔ بتائیے میں آپ کو کس طرح کسی مصیبت سے بچا سکتی ہوں؟"

میں نے کہا "ابھی جو نرس ڈیوٹی پر ہے، وہ آدھ گھنٹے بعد مجھے نیند کا انجکشن لگانے آئے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ انجکشن مجھے نہ لگایا جائے۔ میں ابھی سونا نہیں چاہتا۔"

"کیوں نہیں سونا چاہتے؟ نیند آپ کے لیے بہتر ہے۔ آپ کو ضرور سونا چاہیے۔"

"ابھی میں تم سے بحث نہیں کر سکتا۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وہ انجکشن بدل دو۔ نرس جو ٹرے لے کر آئے گی، اس میں کوئی ایسا انجکشن رکھ دو، جس سے مجھے کوئی نقصان نہ پہنچے۔"

فرزانہ نے کہا "انجکشن بدل دینا کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن نرس یہاں آکر جب دوا کو سرنج میں منتقل کرے گی تو اسے پتہ چل جائے گا کہ ٹرے میں غلط انجکشن آگیا ہے۔ وہ واپس جا کر دوبارہ نیند کا انجکشن لے آئے گی۔"

میں نے پوچھا "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہیں سے دوا سرنج میں بھر کر لائی جائے؟"

"ہاں۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ نرس کو باتوں میں لگا کر میں خود ہی سرنج میں دوا بھر کر بھیج دوں۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو پھر کیا ہوگا؟"

"تم یہ نہ سوچو کہ کیا ہوگا۔ بس تم اپنے طور پر پوری کوشش کرو۔ ناکامی ہو تو کوئی پرواہ نہ کرو۔ میں حالات سے نمٹنا جانتا ہوں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی "آپ نے پہلی بار مجھے ایک ذمہ داری سونپی ہے۔ میں اس ذمہ داری کو ہر حال میں نبھاؤں گی۔"

یہ کہہ کر وہ جانے لگی۔ وہ جا رہی تھی اور ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن تشریف لا رہے تھے۔ انھوں نے آتے ہی پوچھا۔

"کیا تم نے بلیک گائیڈ کا نیا پتہ اور ٹھکانہ معلوم کر لیا ہے؟"

"جی نہیں۔ میں ابھی ان سے رابطہ قائم کروں گا۔"

"اتنی دیر سے کیا کر رہے تھے؟ کیا تمھیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہے۔ شہباز کے ساتھ تین نوجوان مر چکے ہیں۔ چار بُری طرح زخمی ہو گئے ہیں۔ بلیک گائیڈ اور شیتل نہ جانے ہماری پہنچ سے کتنی دُور جا چکے ہیں اور تم یہاں ایک نرس کے ساتھ عشق کرنے میں اپنا اور ہمارا وقت ضائع کر رہے ہو۔ میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ فوراً بلیک گائیڈ کی پناہ گاہ کا پتہ معلوم کرو۔"

انھوں نے اس طرح تحکمانہ انداز میں کہا جیسے میں ان کا کوئی ادنیٰ ملازم ہوں۔ میں انھیں غور سے دیکھنے لگا۔ وہ اپنی ناکامی پر جھلائے ہوئے تھے۔ وہ بلیک گائیڈ کو جلد از جلد حراست میں لے کر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ انھوں نے شہباز جیسے قابلِ قدر افسر کی قربانی دے کر بلیک گائیڈ اور شیتل جیسے خطرناک مجرموں کو گرفتار کیا ہے۔

وہ پہلے کی طرح بزرگانہ انداز میں میری پیٹھ سہلا کر بڑی سہولت سے کام نکال سکتے تھے لیکن وہ مصلحت اندیشی بھول گئے تھے کیونکہ میں نے پہلے مشن میں ان کے منصوبوں کی مخالفت کر کے انھیں احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا تھا اور وہ میری برتری تسلیم نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے خود برتر بن کر حکم دے رہے تھے اور یہ بھول گئے تھے کہ نہ تو میں ان کا ملازم ہوں اور نہ ان کے محکمے سے باقاعدہ میرا تعلق ہے۔

اس وقت میرے جی میں آیا کہ میں بھی ضد میں آجاؤں اور ان کے حکم سے انکار کر دوں۔ پھر میں نے سوچا کہ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں کرنا چاہیے۔ دانشمندی یہ ہوگی کہ اس محکمے کو میری صلاحیتوں سے جو فائدہ پہنچنا چاہیے وہ پہنچا دوں۔ مجرموں کو قانون کے حوالے کر دوں۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لیے میں اس محکمے سے الگ ہو جاؤں گا۔ یہ سوچ کر میں نے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ میں ابھی بلیک گائیڈ کو تلاش کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر میری سوچ کی لہریں بلیک گائیڈ کی سوچ کی لہروں کو ڈھونڈنے لگیں۔ چند ساعت کے بعد ہی میں اس کی سوچ تک پہنچ گیا۔

اس وقت وہ گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رات کے ڈھائی بجے تھے۔ سناٹے میں گھڑی کی ٹِک ٹِک اس کے دماغ تک پہنچ رہی تھی اور وہاں سے منتشر ہو کر میری ذہنی سماعت تک آرہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔

"اتنی رات ہو گئی، شیتل ابھی تک نہیں آیا۔ وہ پیچھے کو کوٹھی نمبر ایکس فور میں پہنچ کر واپس آیا ہوگا تو اس نے مکان کی تباہی سے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ مکان پولیس والوں کی نظروں میں آگیا ہے اور بلیک گائیڈ نے پناہ گاہ بدل دی ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انٹیلی جنس والوں کو میری پناہ گاہوں کا علم کیسے ہو جاتا ہے۔ میں اس مکان کو ٹائم بم سے اُڑانے کے بعد کوٹھی نمبر ایکس تھری کی طرف گیا تھا مگر وہاں دُور سے ہی میں نے خطرے کو بھانپ لیا۔ انٹیلی جنس والے وہاں بھی پہنچ گئے تھے۔

شیتل بھی دوبارہ اس کوٹھی کی طرف جائے گا اور وہاں سے ناکام ہو کر دوسری پناہ گاہوں کی طرف مجھے تلاش کرنے آئے گا۔ اب تو دو ہی پناہ گاہیں رہ گئی ہیں۔ ایک یہ ہے اور دوسری گلبرگ میں ہے۔"

میں نے اس کی سوچ میں کہا "یہ پناہ گاہ جہاں میں بیٹھا ہوا ہوں، اس کا محلِ وقوع کیا ہے۔ کیا اتنی رات کو وہ گونگا یہاں تک پہنچ سکے گا؟"

بلیک گائیڈ نے اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے کہا "یہ میرے دماغ میں کیسے فضول سے خیالات آنے لگے ہیں۔ شیتل تمام پناہ گاہوں کو اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ یہاں آسانی سے پہنچ جائے گا۔"

بلیک گائیڈ مستحکم ارادوں اور ٹھوس خیالات کا حامل تھا۔ غیر ضروری باتیں سوچنے کا عادی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی پناہ گاہ کے متعلق اس لیے نہیں سوچا تھا کہ وہ خود جانتا تھا کہ کہاں بیٹھا ہوا ہے۔ پھر اس جگہ کے متعلق سوچنا بالکل ہی غیر ضروری تھا۔

میں ذرا دیر کے لیے اُلجھ گیا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی پناہ گاہ کا پتہ کیسے معلوم کروں۔ اس وقت وہ سگار سلگا کر اس کا کش لگا رہا تھا اور شیتل کے متعلق سوچ رہا تھا۔ مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے اس کی سوچ میں کہا۔

"بیٹھے بیٹھے سگار پینے سے کام نہیں چلے گا، مجھے ذرا ٹہلنا چاہیے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ انتظار کی طوالت سے پریشان ہو رہا تھا۔ میں نے پھر اس کی سوچ میں مشورہ دیا۔

"مجھے کھڑکی یا دروازے سے باہر جھانک کر دیکھنا چاہیے۔ شاید وہ آرہا ہو۔"

مشورہ معقول تھا۔ وہ کھڑکی سے باہر نیچے کی جانب دیکھنے لگا۔ آنکھیں جو دیکھتی ہیں، وہ دماغ کو بتاتی ہیں۔ ایک ہی چیز کو ہزار بار دیکھتی ہیں اور ہزار بار لاشعور میں کہتی ہیں کہ سامنے کیا ہے؟ سامنے پولیس ہسپتال ہے۔"

میں چونک کر سوچنے لگا۔ کیا وہ اسی ہسپتال کے قریب، اس عمارت کے سامنے والی کسی عمارت میں ہے؟

اس وقت بلیک گائیڈ نے کھڑکی کے نیچے دُور تک پھیلے ہوئے راستے کو دیکھا تھا۔ چونکہ اسے شیتل نظر نہیں آیا تھا اس لیے اب وہ اس ہسپتال کو دیکھ کر طنزیہ انداز میں سوچ رہا تھا۔

"قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنا نہایت آسان ہے، اگر مجرم ذہین ہو۔ اب یہ انٹیلی جنس والے کبھی خواب میں بھی یہ نہیں دیکھ سکتے اور سمجھ سکتے کہ جسے وہ تلاش کر رہے ہیں، وہ اسی ہسپتال کے سامنے ایک شاندار ہوٹل کی تیسری منزل کے تیسرے کمرے میں موجود ہے۔ دُور تک دماغ لڑانے والے پولیس افسر یہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ مجرم ان کی بغل میں ہے۔

ہوٹل کا یہ کمرہ ہمیشہ میرے ایک فرضی نام سے ریزرو رہتا ہے ٹھیک ہے اب میں شیتل کے ساتھ کل تک یہیں رہوں گا۔ کل تک کسی طرح بھوانی شنکر کو یہاں سے نکال کرلے جانا ہی ہو گا۔ اس کے بعد احمد شیخ اور ٹونی کی فکر کرنی ہو گی۔۔۔۔"

یہاں تک میں نے بلیک گائیڈ کی سوچ پڑھ کر اس سے رابطہ ختم کر دیا۔ پھر ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن کی سوچ کو پڑھنے لگا۔ وہ میرے سامنے کھڑے ہوئے انتظار کر رہے تھے کہ میں کب آنکھیں کھولوں گا اور انھیں بلیک گائیڈ کا پتہ بتاؤں گا۔ وہ انتظار کے دوران جھنجلا رہے تھے۔ جھنجلاہٹ کی وجہ یہ تھی کہ میں آرام سے آنکھیں بند کیے آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا اور وہ رات کے تیسرے پہر میرے سامنے ایک معمولی آدمی کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ ناگواری سے بولے "کیا تم سو گئے تھے؟"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا "میں سوتے سوتے اس دنیا کے آخری سرے میں بسنے والے انسان کی سوچ تک پہنچ جاتا ہوں لیکن آپ کا مجرم اتنی دُور نہیں ہے۔ آپ کے قریب ہی ہے۔ اس ہسپتال کے سامنے والے ہوٹل کی تیسری منزل کے تیسرے کمرے میں۔۔۔۔"

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ حیرت سے اچھل کر بولے۔ "سامنے والے ہوٹل میں؟ تعجب ہے وہ ہمارے بالکل سامنے ہے۔ یعنی کہ اتنا دلیر ہے کہ ہمارے قریب بیٹھا ہوا ہے۔"

"دلیر نہیں، چالاک ہے۔ وہ جانتا ہے کہ آپ لوگ اسے دُور دُور تک تلاش کریں گے اور کبھی یہ نہیں سوچیں گے کہ وہ آپ کے قریب ہی ایک شاندار ہوٹل میں آرام کر رہا ہے۔"

"میں ابھی اس کی چالاکی بُھلا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر جانے لگے۔

اس بار انھوں نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ کس طرح بلیک گائیڈ کو گھیریں گے اور اس مقصد کے لیے کتنے مسلح جوان وہاں جائیں گے اور کس کی رہنمائی میں یہ کام انجام پائے گا۔

انھوں نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا کہ اس سلسلے میں مجھ سے مشورہ لیتے اور کوئی لائن آف ایکشن بنا کر آگے بڑھتے۔ وہ تو ایسے چلے گئے تھے جیسے سامنے ہی پکا پکایا کھانا رکھا ہوا ہے اور وہ وہاں پہنچتے ہی اسے ایک لقمے میں چبا کر ہضم کر لیں گے۔ میں نے بھی اس سلسلے میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ وہ میرا کوئی اچھا مشورہ تسلیم کرنے میں اپنی توہین سمجھتے تھے لہٰذا میں ان کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ان کے جاتے ہی میں نے فرزانہ کے ذہن میں جھانک کر اس کے خیالات سُنے۔ اس وقت وہ خاموش تھی اور نرس کی باتیں سُن رہی تھی۔ وہ باتیں میری دماغی سماعت تک بھی پہنچ رہی تھیں۔

نرس کہہ رہی تھی "فرزانہ! کیا بات ہے تم جب سے آئی ہو دس نمبر کے مریض کے متعلق ہی گفتگو کیے جا رہی ہو۔ کیا بہت پسند آ گیا ہے؟"

جواب میں ذرا دیر کے لیے خاموشی رہی۔ پھر اسی نرس نے کہا "ہائے ہائے تم تو شرم سے گلنار ہو رہی ہو۔ کیا ہونٹوں کو دبا لینے سے مسکراہٹ چھپ جائے گی؟ ہائے فرزانہ! تم اس حالت میں کتنی حسین نظر آ رہی ہو۔ دیکھو اتنے عرصے کے بعد کسی سے دل لگا ہی لیا ہے تو اب پیچھے نہ ہٹنا۔ وہ ایک قدم تمھاری طرف بڑھے تو تم چار قدم اس کی جانب کھنچی چلی جانا۔ وہ تو بڑا ہینڈسم ہے۔ تمھاری بڑی لکی ہو۔ بس یہ موقعہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا، اتنی دیر سے میں ہی بولے جا رہی ہوں، تم بھی کچھ بولو نا؟"

فرزانہ شرماتی ہوئی بولی "مجھے شرم آتی ہے۔ میں کیا بولوں؟ ابھی وہ مجھے اپنے پاس بیٹھنے کے لیے کہہ رہے تھے۔"

"تو پھر جاؤ۔ یہاں کیوں بیٹھی ہو؟"

"میں جا کر کیا کروں گی؟ ابھی تم انھیں نیند کا انجکشن لگانے جاؤ گی۔"

"ہاں۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگانے کے لیے کہا ہے۔"

فرزانہ نے ہچکچاتے ہوئے نرس کو مخاطب کیا "روبی! ایک بات کہوں، اگر تم مان لو گی تو مجھے کافی دیر تک ان سے باتیں کرنے کا موقعہ مل جائے گا۔ ابھی تم نے ہی کہا ہے کہ موقعہ ہاتھ سے جانے نہ پائے۔"

"ہاں۔ میں نے دُرست کہا ہے ویسے تم مجھ سے کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"میں کیا کہوں؟ تم خود سمجھدار ہو۔ اگر تم انھیں نیند کا انجکشن لگاؤ گی تو وہ سو جائیں گے، پھر میں کس سے باتیں کروں گی؟"

"ہوں۔ تو تم یہ چاہتی ہو کہ میں انھیں نہ سُلاؤں۔ یہ کوئی مشکل کام تو نہیں ہے۔ ڈائریکٹر جنرل حکم دے گئے ہیں کہ ابھی دس نمبر کے مریض کو نیند کا انجکشن لگنا چاہیے۔ میں ان کے حکم کے مطابق انجکشن لے کر دس نمبر کے کمرے میں جاؤں گی مگر انجکشن نہیں لگاؤں گی۔ تم اپنے بیمار کو سمجھا دینا کہ وہ تمھارے جانے کے بعد انجکشن کے بغیر ہی گہری نیند سو جائے ورنہ میری شامت آ جائے گی۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں انھیں سُلا دوں گی۔"

"ہاں۔ تم جیسا سُلاؤ گی، وہ تو میں جانتی ہوں۔ ہائے کتنی بے شرمی سے سونے کی بات کہہ رہی ہو۔"

وہ جھینپ کر بولی "مار دوں گی ہاں۔ مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ میں جا رہی ہوں۔ تم تو بس ایسے ہی چھیڑتی رہو گی۔"

"ٹھہرو۔ میں بھی انجکشن لے کر چلتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ٹرے میں انجکشن اور سرنج وغیرہ رکھنے لگی۔ پھر وہ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے میرے کمرے کی طرف آنے لگیں لیکن دروازے پر دو سپاہیوں نے فرزانہ کو اندر آنے سے روک دیا۔ فرزانہ نے اندر آنے کی درخواست کی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہ آ چکی تھی۔ روبی نے بھی اس کی حمایت کی لیکن سپاہیوں نے یہ کہہ کر اندر جانے کی اجازت نہیں دی کہ ڈائریکٹر جنرل صاحب نے حکم دیا ہے کہ مریض کو انجکشن لگنے کے بعد کسی کو کمرے میں جانے کی اجازت نہ دی جائے ورنہ مریض کی نیند میں خلل پڑے گا۔

فرزانہ بڑے ارمانوں سے میرے پاس آ رہی تھی مگر اس کے تمام ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ اگر وہ ڈیوٹی پر ہوتی تو روبی کی بجائے خود میرے پاس چلی آتی لیکن اس کی ڈیوٹی صبح دس بجے سے تھی۔ وہ مایوس ہو کر واپس جانے لگی۔

روبی نے کمرے میں آ کر تمام باتیں مجھے بتائیں۔ میں بھی مجبور تھا۔ اس وقت میں ڈائریکٹر جنرل کا محکوم تھا۔ ان کے حکم کے خلاف فرزانہ کو نہیں بلا سکتا تھا۔ میں نے روبی سے کہا۔

"میں ابھی سونا نہیں چاہتا، اپنی فرزانہ کو یاد کرنا چاہتا ہوں۔ تم مجھ پر مہربانی کرو اور مجھے انجکشن نہ لگاؤ۔"

روبی نے کہا "فرزانہ بھی یہی کہہ رہی تھی مگر اب تو تم دونوں ایک دوسرے سے دُور ہو۔ ایسی صورت میں تمھارا سو جانا ہی بہتر ہے۔"

"نہیں سسٹر! میں جاگنا چاہتا ہوں اور جاگتی آنکھوں سے اپنی فرزانہ کے خواب دیکھنا چاہتا ہوں۔ پلیز مجھے جاگنے دو۔ اگر ڈاکٹر وغیرہ پوچھیں گے تو میں کہہ دوں گا کہ تم نے انجکشن لگایا تھا۔"

اس نے میری بات مان لی۔ انجکشن کی شیشی ٹرے سے اٹھا کر اپنے بلاؤز کے اندر چھپالی۔ پھر مسکراتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی میں نے ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن کی سوچ کو پڑھنا شروع کیا۔ اس وقت وہ بڑی احتیاط اور رازداری سے اس ہوٹل کا محاصرہ کر رہے تھے۔ ان کے مسلح جوان عام شہری لباس میں تھے اس لیے کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ کسی مجرم کی ناکہ بندی کے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔

یہ سب کچھ ڈائریکٹر جنرل کی رہنمائی میں ہو رہا تھا۔ اس بار وہ عجلت سے کام نہیں لے رہے تھے۔ پچھلی غلطی نے انھیں محتاط کر دیا تھا اس لیے وہ بڑی سہولت سے ہوٹل کے باہر ناکہ بندی کرنے کے بعد اب تیسری منزل کے تمام راستوں کو بند کر رہے تھے۔

میں نے تیسری منزل کے تیسرے کمرے کے اندر بلیک گائیڈ کے دماغ میں جھانک کر دیکھا۔ اس کی سوچ بتا رہی تھی کہ گونگا شیتل آ گیا ہے اور وہ ہاتھ کے اشاروں سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دونوں چوہے دان میں پھنس گئے تھے۔ ڈائریکٹر جنرل کسی وقت بھی وہاں اپنے مسلح جوانوں کے ساتھ پہنچنے والے تھے۔

اتنے میں بلیک گائیڈ چونک کر بڑبڑانے لگا "ارے یہ سُرخ بلب اسپارک کر رہا ہے۔ شیتل یہاں آؤ۔۔۔۔"

وہ تیزی سے شیتل کے ساتھ باتھ روم میں آیا۔ وہاں واش بیسن کے ایک نلکے سے ٹرانسمیٹر منسلک تھا۔ اس ٹرانسمیٹر کے ذریعے ہوٹل کے منیجر نے اسے اطلاع دی کہ وہ چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر جنرل ہوٹل کے رجسٹر میں اس کا نام اور پتہ پڑھ کر متاثر ہو رہا تھا کیونکہ وہاں بلیک گائیڈ کا نام ڈاکٹر سعید شیرازی تھا۔ وہ دو دن پہلے ایران سے آیا تھا اور دو دن بعد برما کی طرف جانے والا تھا۔

دروازے پر دستک سُن کر بلیک گائیڈ باتھ روم سے باہر آ گیا۔ اس وقت اس کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا اور اتنے اعتماد سے سوچ رہا تھا کہ ڈائریکٹر جنرل نے خود یہاں آ کر اس کی مشکل آسان کر دی ہے۔ اب وہ صرف بچاؤ نہیں کرے گا بلکہ ابھی صبح ہونے سے پہلے بھوانی شنکر کو بھی ہسپتال سے نکال کرلے جائے گا۔

اس نے کمرے میں آ کر باہر کا دروازہ کھول دیا۔ باہر دو نوجوان ریوالور لیے کھڑے تھے۔ ریوالوروں کا رُخ بلیک گائیڈ کی جانب تھا۔ ان کے پیچھے ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن کھڑے ہوئے تھے۔ پھر ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر بلیک گائیڈ کی تلاشی لی۔ اس کے پاس سے کوئی ہتھیار برآمد نہ ہوا۔ شبیر حسن نے کمرے میں آ کر اس سے پاسپورٹ وغیرہ طلب کیا۔ بلیک گائیڈ کے پاس تمام ایسے کاغذات موجود تھے جو اس بات کی تصدیق کرتے تھے کہ وہ ڈاکٹر سعید شیرازی ہے اور گلے کی بیماریوں کا مشہور معالج ہے۔

شبیر حسن الجھن میں پڑ گئے۔ وہ ایک معزز اور معروف ڈاکٹر تھا کسی کل سے بھی مجرم نظر نہیں آتا تھا۔ ڈاکٹر سعید شیرازی کی شخصیت ایسی تھی کہ اس کے خلاف کوئی ثبوت حاصل کیے بغیر اسے حراست میں نہیں لیا جا سکتا تھا۔

اب میرا فرض تھا کہ میں ان کی رہنمائی کرتا۔ میں انھیں بتانا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر شیرازی کا پاسپورٹ اور دوسرے تمام کاغذات جعلی ہیں لیکن اسی وقت بلیک گائیڈ نے شبیر حسن کو مخاطب کیا۔ میں نے سوچا کہ پہلے ان دونوں کی باتیں ہو جائیں، پھر میں انھیں گائیڈ کروں گا۔ ان سے سوچ کے ذریعے کہوں گا کہ گونگا شیتل باتھ روم میں چھپا ہوا ہے اور وہاں واش بیسن کے ایک نلکے سے ٹرانسمیٹر منسلک ہے۔

لیکن بلیک گائیڈ نے کچھ ایسی چال چلی کہ مجھے شبیر حسن کی سوچ تک پہنچنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ اس نے شبیر حسن سے پوچھا۔

"جناب! آپ اس حد تک چھان بین کر چکے ہیں۔ اب مجھے بھی حق پہنچتا ہے کہ میں آپ کی تعریف معلوم کروں؟"

شبیر حسن نے فخر سے کہا "میں یہاں کی انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر جنرل ہوں۔۔۔۔"

"اوہ!" بلیک گائیڈ نے یوں حیرانی اور خوشی کا اظہار کیا جیسے ایک عظیم ہستی سے خلافِ توقع ملاقات ہو گئی ہو۔ اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "آپ سے مل کر میں فخر محسوس کر رہا ہوں۔"

شبیر حسن نے مسکرا کر مصافحہ کیا۔ دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے مل گئے۔ میں اس وقت شبیر حسن کی سوچ پڑھ رہا تھا۔ ان کی سوچ نے بتایا کہ ہاتھ ملاتے وقت بلیک گائیڈ کی انگوٹھی ہولے سے شبیر حسن کی ایک انگلی میں چبھ گئی ہے۔ اس کے بعد ہی ان کی سوچ میں گڑبڑ سی ہونے لگی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ان کے دماغ کے سارے دروازے آہستہ آہستہ بند ہو رہے ہیں۔ میں نے فوراً ہی انھیں مخاطب کیا۔

"جناب! میں فرہاد آپ سے مخاطب ہوں۔ مجھے فوراً جواب دیجیے کہ آپ کی سوچ سُست کیوں پڑتی جا رہی ہے؟"

"آں!" انھوں نے اونچی آواز میں بلیک گائیڈ سے پوچھا "یہ میرے دماغ کے اندر کون بول رہا ہے؟"

"بھلا آپ کے اندر اور کون بولے گا۔ ابھی تو آپ ہی بول رہے ہیں۔

شاید آپ کی طبیعت کچھ خراب ہے۔"

بلیک گائیڈ جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ شبیر حسن کے دماغ سے مجھ تک پہنچ رہا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ وہ مجھے نہیں پہچان رہے تھے۔ میں نے پھر انھیں مخاطب کیا۔

"جناب شبیر حسن صاحب! میں فرہاد بول رہا ہوں۔ مجھے پہچانیے۔ آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں سوچ کے ذریعے گفتگو کرتا ہوں۔"

"آہ!" انھوں نے پھر دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کر کہا۔ "سنو۔ سنو وہ پھر میرے اندر بول رہا ہے۔ کہتا ہے میں فرہاد بول رہا ہوں۔ میں سوچ کے ذریعے گفتگو کرتا ہوں۔"

ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن کی باتیں سن کر میں بوکھلا گیا۔ وہ مجھے نہیں پہچان رہے تھے اور نہ ہی میری سوچ کے رابطے کو سمجھ رہے تھے۔ وہ بلیک گائیڈ سے یہ راز کی باتیں کہہ رہے تھے کہ ان کے اندر کوئی فرہاد بول رہا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ ویسے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ بلیک گائیڈ نے مصافحہ کرتے وقت اپنی انگوٹھی کے ذریعے شبیر حسن کے جسم میں کوئی ایسی دوا انجکٹ کر دی ہے، جو ان کے دماغ پر اثر انداز ہو رہی ہے۔

اب دانش مندی یہی تھی کہ میں ان کی سوچ کو ٹٹولنے میں وقت نہ ضائع کروں، بلکہ بلیک گائیڈ کی سوچ کے ذریعے ان کی پلاننگ کو سمجھتا رہوں۔ میں نے جلدی سے اس کے دماغ میں جھانک کر دیکھا۔ وہ اس وقت ان دو مسلح نوجوانوں کی باتیں سن رہا تھا جو شبیر حسن کے ساتھ کمرے میں آئے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان شبیر حسن سے پوچھ رہا تھا کہ ان کی طبیعت کیسی ہے؟ دوسرا نوجوان بلیک گائیڈ کی جانب ریوالور کا رخ کیے کہہ رہا تھا۔

"ڈاکٹر شیرازی! آپ نے مصافحہ کرتے وقت کچھ گڑبڑ کی ہے بتلایئے اس انگوٹھی میں کیا ہے؟ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

بلیک گائیڈ عرف ڈاکٹر شیرازی انگوٹھی اتارنے میں جان بوجھ کر دیر کر رہا تھا اور شیتل کو دیکھ رہا تھا جو باتھ روم سے نکل کر دبے قدموں چلتا ہوا ریوالور والے جوان کی طرف بڑھتا آ رہا تھا۔ میں نے اس نوجوان کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے اس کی سوچ میں کہا۔

"مجھے پیچھے بھی دیکھتے رہنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ڈاکٹر شیرازی کا کوئی آدمی اچانک ہی پیچھے سے حملہ کر دے۔"

میرے اس مشورے پر اس نے فوراً ہی پلٹ کر پیچھے دیکھا لیکن شیتل بلا کا پھرتیلا تھا۔ اس نے اچانک ہی اس پر چھلانگ لگائی اور اس نوجوان کے ساتھ دوسرے نوجوان کو بھی رگیدتا ہوا اس طرح فرش پر آیا کہ دونوں نیچے دب گئے اور وہ ان پر چھا گیا۔

یہ سب تماشے بلیک گائیڈ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور میں اس کے دماغ سے کنٹری سن رہا تھا کہ وہاں کس انداز میں جنگ ہو رہی ہے۔ وہ دونوں جوان اچھے فائٹر تھے اور اچھے صحت مند تھے لیکن شیتل کے سامنے چیونٹی کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ایک پہاڑ کی طرح ان پر چھا گیا تھا۔ وہ دونوں اس کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کی گردنیں اس کے فولادی بازوؤں میں پھنسی ہوئی تھیں اور اس طرح ان کی سانسیں رکتی جا رہی تھیں۔

میں سمجھ گیا کہ وہ مشینی انسان انھیں مار ڈالے گا۔ انھیں اس لیے زندہ نہیں چھوڑے گا کہ ان کے سامنے ہی ڈائریکٹر جنرل کو دماغی لحاظ سے بے کار بنا دیا تھا۔ میں نے پھر ایک بار ان سے دماغی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔

"جناب شبیر حسن صاحب! اپنے دماغ کو کنٹرول میں رکھیے۔ مجھے پہچانیے میں فرہاد آپ سے مخاطب ہوں۔"

ان کی بہکی ہوئی سوچ نے کہا "میں کیسے پہچانوں؟ مجھے کوئی فرہاد نظر نہیں آ رہا ہے۔ مجھے تو صرف یہ ڈاکٹر شیرازی نظر آ رہا ہے۔ یہ کتنا اچھا ہے، کتنی پرکشش شخصیت کا مالک ہے۔ میں اس کی جانب کھنچا جا رہا ہوں۔"

میں نے کہا "ہوش کی دوا کریں۔ آپ کے دو ماتحت موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ شیتل انھیں زندہ نہیں چھوڑے گا مگر آپ ہیں کہ ڈاکٹر شیرازی کی شخصیت سے متاثر ہو رہے ہیں۔ وہ ڈاکٹر شیرازی نہیں بلکہ بلیک گائیڈ ہے۔ ہمارے ملک کا دشمن ہے۔"

اس بار ڈائریکٹر جنرل نے بلیک گائیڈ کی جانب دیکھ کر کہا۔

"نہیں، یہ بلیک گائیڈ نہیں ہے، ڈاکٹر شیرازی ہے۔"

بلیک گائیڈ چونک کر انھیں دیکھنے لگا۔ میں نے فوراً ہی اس سے دماغی رابطہ قائم کیا۔ وہ حیرانی سے سوچ رہا تھا "یہ شخص کیسے جانتا ہے، میرا خفیہ نام بلیک گائیڈ ہے؟"

اس نے شبیر حسن سے پوچھا "کیا آپ مجھے بلیک گائیڈ سمجھ کر گرفتار کرنے آئے ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں آپ جیسے معزز انسان کو بلیک کیسے کہہ سکتا ہوں۔ میں نے ابھی بتایا نا، کہ میرے دماغ میں کوئی فرہاد بول رہا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں اس فرہاد کو جانتا ہوں مگر مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا ہے کہ میں نے اسے کبھی دیکھا بھی ہے یا نہیں۔ ابھی اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ سوچ کے ذریعے گفتگو کرتا ہے۔"

شبیر حسن میرا بھید کھول رہے تھے۔ بلیک گائیڈ گہری سنجیدگی سے سوچ رہا تھا "یہ انٹیلی جنس کا افسر پہلے بھی یہ کہہ چکا ہے کہ کوئی فرہاد سوچ کے ذریعے گفتگو کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ٹیلی پیتھی جانتا ہے۔ واقعی یہی بات ہے۔ اسی ٹیلی پیتھی جاننے والے نے اس افسر کو میرا خفیہ نام بلیک گائیڈ بتایا ہے ورنہ یہ انٹیلی جنس والے سات جنم میں بھی میرا اصلی نام معلوم نہیں کر سکتے تھے۔

ہاں۔ اب پتہ چل گیا کہ یہ انٹیلی جنس والے میری خفیہ پناہ گاہ تک کیسے پہنچ گئے تھے۔ میں اس مکان کو تباہ کر کے اس ہوٹل میں آیا تو اسی ٹیلی پیتھی جاننے والے نے انٹیلی جنس کے آدمیوں کو یہاں بھیج دیا۔ اس نے نادانستگی میں کتنا نقصان اٹھا رہا تھا۔ اب مجھے سب سے پہلے اسی خطرناک دشمن سے نمٹنا چاہیے۔ یہ افسر کیا نام بتا رہا تھا اس کا؟ ہاں۔ یاد آیا، فرہاد۔ دماغ کی تجوری سے خفیہ منصوبوں کو چرانے والا چور فرہاد۔ میں دیکھوں گا کہ اب وہ مجھے کس طرح نقصان پہنچاتا ہے۔

وہ ٹیلی پیتھی جانتا ہے، میں ہپناٹائز کرنا جانتا ہوں۔ انٹیلی جنس کا یہ افسر دماغی طور سے کمزور ہو گیا ہے۔ میں بڑی آسانی سے اسے ہپناٹائز کر کے فرہاد کے متعلق معلومات حاصل کر سکتا ہوں۔"

یہ سوچ کر وہ شیتل کی جانب دیکھنے لگا۔ اس وقت شیتل ان دو جوانوں کو اپنی دونوں بغلوں میں دبا کر باتھ روم کی طرف سے جا رہا تھا۔ وہ دونوں اس کے بازوؤں میں لاشوں کی طرح جھول رہے تھے۔ وہ شاید ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے تھے یا وقتی طور پر بے ہوش ہو گئے تھے۔

بلیک گائیڈ نے ان کی طرف سے مطمئن ہو کر ڈائریکٹر جنرل کو تحکمانہ انداز میں مخاطب کیا "میری آنکھوں میں دیکھو۔"

انھوں نے حکم کی تعمیل کی۔ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔ میں اس ہپناٹائز کرنے والے بلیک گائیڈ کے خیالات کے ذریعے معلوم کر رہا تھا کہ وہ کس طرح شبیر حسن کو ٹرانس میں لا رہا ہے۔ وہ دماغی طور پر کمزور ہو گئے تھے اس لیے جلد ہی ٹرانس میں آ گئے۔

بلیک گائیڈ نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

"میں عامل ہوں اور تم میرے معمول ہو۔ تم میری ہر بات کا جواب دو گے۔"

شبیر حسن کی خوابیدہ آواز سنائی دی "میں ہر بات کا جواب دوں گا۔"

ان کے معمول بنتے ہی میرے سر پر خطرہ منڈلانے لگا کیونکہ اب میں صرف ان کی سوچ کو پڑھ سکتا تھا لیکن اپنی سوچ کو ان پر حاوی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بلیک گائیڈ کے زیر عمل آ گئے تھے۔ صرف بلیک گائیڈ کی باتیں ان کے دماغ تک پہنچ سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ دنیا کی کوئی آواز یا کسی بھی انسان کی سوچ کی لہریں ان کے دماغ کو چھو بھی نہیں سکتی تھیں۔

میں نے آزمائش کے طور پر اپنی سوچ کی لہریں ان کے دماغ تک پہنچانی چاہیں "جناب! آپ اپنے عامل کی کسی بات کا جواب نہ دیں۔"

اسی وقت بلیک گائیڈ نے بھی شبیر حسن سے سوال کیا "فرہاد کون ہے؟"

میری سوچ ان کے دماغ تک نہیں پہنچی تھی مگر بلیک گائیڈ کا سوال انھوں نے ایک معمول کی حیثیت سے قبول کر لیا اور اس کا جواب دیا۔

"فرہاد ایک نوجوان ہے۔ اس ملک کا شہری ہے۔ وہ ٹیلی پیتھی جانتا ہے۔ اس کی رہنمائی میں ہم نے احمد شیخ اور ٹونی کو گرفتار کیا ہے۔ اسی نے ٹیلی پیتھی کے ذریعے ہمیں بتایا ہے کہ ہسپتال کے دو نمبر کے کمرے میں جو مریض ہے اس کا نام محمود حسن نہیں، بلکہ بھوانی شنکر ہے اور اس نے ایک مائیکرو فلم اپنے جبڑے کے قریب زبان کے نیچے چھپا رکھی ہے۔ ہم نے بھوانی شنکر کا آپریشن کر کے وہ مائیکرو فلم برآمد کر لی ہے۔"

بلیک گائیڈ نے سوال کیا "وہ مائیکرو فلم کہاں ہے؟"

"وہ وزارت خارجہ کے سیکرٹری کے پاس بھیج دی گئی ہے۔"

"فرہاد کہاں ہے؟"

"وہ اس وقت ہسپتال کے دس نمبر کے کمرے میں ہے۔"

"کیا وہ بیمار ہے؟"

"ہاں۔ ایک فولادی انسان دروازہ توڑ کر اس کے بیڈ روم میں آیا تھا۔ وہ فرہاد کو مار ڈالنا چاہتا تھا مگر اس کی ایک کزن نے گولی چلا دی۔ وہ فولادی انسان اسے ادھ مرا چھوڑ کر چلا گیا...."

"اوہ!" بلیک گائیڈ کے بڑبڑانے کی آواز آئی "اچھا تو یہ وہی شخص ہے جس پر شیتل نے حملہ کیا تھا۔ واقعی اس کی تقدیر اچھی تھی ورنہ شیتل کے شکنجے چڑھنے والا آج تک زندہ بچ کر نہ جا سکا مگر اب اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔"

پھر اس نے ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن کو مخاطب کیا۔

"تم میرے معمول ہو، میرے ہر حکم پر عمل کرو گے۔"

"میں تمھارے ہر حکم پر عمل کروں گا۔"

"ہم تمھارے ساتھ ابھی ہسپتال جائیں گے۔ تمھارے دو ماتحت جو اس کمرے میں آ کر ہمیشہ کی نیند سو چکے ہیں، ان کی لاشیں باتھ روم میں پڑی رہیں گی۔ اس کمرے کے باہر جو ماتحت ہیں، تم انھیں ساتھ لے کر ہسپتال چلو گے۔ وہاں تم حکم دو گے کہ دو نمبر اور دس نمبر کے مریضوں کو ایک ایمبولنس میں پہنچایا جائے۔ اس ایمبولنس کو تمھارا ایک ماتحت ڈرائیو کرے گا، دوسرا ماتحت اور شیتل ایمبولنس کے پچھلے حصے میں مریضوں کے پاس رہیں گے اور تم میرے ساتھ ایک جیپ کار میں رہو گے۔ ہماری منزل کہاں ہے، یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ چلو اب اٹھو!"

شبیر حسن حکم کے مطابق اٹھ کر چلنے لگے۔ بلیک گائیڈ اس وقت سوچ رہا تھا "فرہاد کی وجہ سے مائیکرو فلم چھین لی گئی۔ بھوانی شنکر کا مشن ناکام ہو گیا۔ اس کی رپورٹ پر بھوانی شنکر کی زبان کے نیچے جبڑے کے پاس آپریشن کیا گیا۔ میں فرہاد کے دماغ کا آپریشن کر کے اس کی کھوپڑی سے ٹیلی پیتھی کے علم کو ہمیشہ کے لیے دھو ڈالوں گا...."

بلیک گائیڈ

جیسے جانی دشمن کو یہ راز معلوم ہو گیا تھا کہ میں خیال خوانی جانتا ہوں اور یہ میرے حق میں بہت برا ہوا تھا۔ اس وقت میں دو خطرناک دشمنوں کے شکنجے میں جانے والا تھا۔ ایک تو وہ گونگا شیتل تھا جو انسان سے زیادہ ایک آہنی مشین تھا۔ اس سے ایک بار ٹکرانے کے بعد میں ہسپتال پہنچ گیا تھا۔

دوسرا بلیک گائیڈ تھا جو جسمانی لحاظ سے کمزور تھا لیکن ذہانت میں بے مثال تھا اور وہ نیتہ کر چکا تھا کہ مجھے ہسپتال سے نکال کر کہیں لے جانے

کے بعد میرے دماغ کا آپریشن کرے گا اور میری کھوپڑی سے ٹیلی پیتھی کی تمام صلاحیتوں کو دھو ڈالے گا۔

میں ہسپتال کے ایک کمرے میں ایک مریض کی طرح پڑا ہوا تھا۔ اگرچہ میرا علاج خاصی توجہ سے کیا جا رہا تھا اور اب میں بستر پر اٹھ کر بیٹھنے لگا تھا تاہم بھاگ دوڑ کے قابل نہیں تھا اور وہ جو دشمن میری طرف آنے والے ہی تھے میں ان سے بچنے کے لیے اس کمرے سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ انٹیلی جنس کے آدمی جو کمرے کے باہر پہرہ دے رہے تھے، ان سے میں یہ کہتا کہ تمھاری انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر جنرل مجرموں کے اشاروں پر ناچ رہا ہے اور وہ مجھے اور بھوانی شنکر کو مجرموں کے حوالے کرنے آ رہا ہے تو کوئی میری بات کا یقین نہیں کرتا۔ سب یہی کہتے کہ ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن محبِ وطن ہے، وہ اپنے ملک کے مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر ہی ہم دو مریضوں کو ہسپتال سے لیجائے گا۔ ویسے بھی وہ کسی مقصد کے لیے ہمیں کہیں لیجائے، کس کی مجال تھی کہ ڈائریکٹر جنرل کے اقدامات پر نکتہ چینی کرتا۔ اس ہسپتال میں سب اس کے حکم کے بندے تھے۔

ہسپتال کے سامنے ایک شاندار ہوٹل کی تیسری منزل کے تیسرے کمرے میں مجرموں کی وہی پوزیشن تھی۔ بلیک گائیڈ ڈاکٹر شیرازی کے روپ میں تھا اور اس نے ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن کو عملِ تنویم کے ذریعے اپنا معمول بنایا ہوا تھا۔ گونگا شیتل ان کے قریب موجود تھا۔ ہوٹل کے اس کمرے کو چھوڑنے سے پہلے بلیک گائیڈ عرف ڈاکٹر شیرازی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو۔ میں ہسپتال کی باؤنڈری میں داخل ہونے سے پہلے ہر طرف سے اپنا اطمینان کر لینا چاہتا ہوں۔ تم ایک بار پھر بولو کہ تم میرے معمول ہو۔"

شبیر حسن نے کہا۔ "میں تمھارا معمول ہوں۔"

بلیک گائیڈ نے کہا۔ "اگر فرہاد سے سامنا ہو تو تم اس کی کوئی بات تسلیم نہیں کرو گے۔ اس کے ہر مشورے کو ٹھکرا دو گے۔"

اس نے ایک معمول کی حیثیت سے کہا۔ "میں فرہاد کی کوئی بات تسلیم نہیں کروں گا۔ اس کے ہر مشورے کو ٹھکرا دوں گا۔"

"ابھی تم نے کہا تھا کہ فرہاد تمھاری سوچ میں بول رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم یہاں جو باتیں کر رہے ہیں، فرہاد انھیں سن رہا ہے؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ سن رہا ہے یا نہیں۔ میں نے ڈاکٹر سے کہہ دیا تھا کہ اسے نیند کا انجکشن لگا دیں تاکہ وہ جاگتا نہ رہے اور نہ ہی میری سوچ کو پڑھ سکے۔"

"مگر وہ پڑھ رہا ہے۔ یقیناً ڈاکٹر نے اسے انجکشن نہیں لگایا ہے۔ وہ پولیس ہسپتال میں ہے۔ وہاں تمھارے جیسے اتنے بڑے افسر کے حکم کی فوراً تعمیل ہونی چاہیے تھی۔ اب بتاؤ کیا کیا جا سکتا ہے۔ وہ شیطان ہماری گفتگو سن رہا ہوگا۔"

"ہاں۔ سن رہا ہوگا۔"

"میں جو کہتا ہوں وہی تم کہتے ہو۔ معمول بننے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اپنے طور سے سوچ کر جواب نہ دو۔ اپنے ذہن کو کھلا چھوڑ دو اور اچھی طرح سوچ کر بتاؤ، جب تم فرہاد اور بھوانی شنکر کو ہسپتال سے لیجانا چاہو گے تو فرہاد کس طرح رکاوٹیں پیدا کرے گا؟"

شبیر حسن نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ صرف ہسپتال سے باہر جانے سے انکار کرے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہتا رہے گا کہ میں اسے تمھارے حوالے کر رہا ہوں، اس لیے کہ میں تمھارا معمول بن گیا ہوں۔"

"ہوں۔" بلیک گائیڈ نے کہا۔ "اگر وہ تمھارے معمول بننے کی بات کہے گا تو دوسرے ڈاکٹر وغیرہ کسی حد تک شبہ کرنے لگیں گے۔ اگرچہ ان کا شبہ یقین میں نہیں بدل سکتا کیونکہ تم بالکل نارمل حالت میں ہو۔ اس کے باوجود محتاط رہنا ضروری ہے۔ نہ جانے وہ دشمن وہاں کس قسم کا ہنگامہ کھڑا کرے گا۔ میرے ساتھ شیتل بھی اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس جائے گا۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہ عجیب و غریب اور خطرناک دشمن ہے۔ ہمارا دماغ اِدھر پلاننگ کرتا ہے، اُدھر وہ سن لیتا ہے۔ ایسے دشمن سے ٹکرانا اپنی موت کو دعوت دینا ہے لیکن مجھے بھی اپنی ذہانت پر بھروسہ ہے۔ اب میں کسی پلاننگ کے متعلق گفتگو نہیں کروں گا۔ اچانک ہی بغیر سوچے سمجھے اس پر حملہ کروں گا۔ ٹھہرو، میرے دماغ کو ذرا پُرسکون ہونے دو۔ اس کم بخت نے مجھے الجھا کر رکھ دیا ہے۔"

وہ اپنے دماغ کو ہر طرح کی سوچ بچار سے خالی کرنے لگا۔ میں نے سوچا کہ اب مجھے عملی طور سے قدم اٹھانا ہوگا۔ اگر میں مریض بن کر یہاں پڑا رہا تو اس کی کسی غیر متوقع سازش کا شکار ہو جاؤں گا۔

یہ سوچ کر میں بستر پر بیٹھ گیا۔ مجھے کسی طرح کی تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ روزانہ دو وقت میرے بدن کی مالش کی جاتی تھی، جس کے باعث ہڈیوں تک پہنچنے والا درد اور ٹیسیں زائل ہو گئی تھیں۔ میں بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ اس وقت مجھے جسم کے کسی حصے میں تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ میں خطرے میں گھرا ہوا تھا اور جب جان پر بنی ہو تو انسان تمام دکھ درد بھول جاتا ہے۔ صرف جان بچانے کا عزم رہ جاتا ہے۔

ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہسپتال کے ماحول میں بیماروں کے درمیان رہ کر اور زیادہ بیماری کا احساس ہوتا ہے۔ اب جو میں نے اٹھ کر چلنے کا حوصلہ کیا تو پتہ چلا کہ میں اتنا بیمار اور کمزور نہیں تھا جتنا کہ اپنے آپ کو سمجھ رکھا تھا۔

میں نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ باہر دو مسلح جوان اپنی ڈیوٹی پر تھے۔ اس وقت شاید رات کے دو یا تین بج رہے ہوں گے۔ ایک نوجوان تھکن اتارنے کے لیے ہسپتال کے بنچ پر سو گیا تھا۔ دوسرا ایک اسٹول پر بیٹھا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ انٹیلی جنس کے تمام افسران میری کتنی عزت کرتے ہیں، لہٰذا اس نے بھی بڑے ادب سے پوچھا۔

"کیا بات ہے مسٹر فرہاد! آپ بستر سے اٹھ کر کیوں آ گئے ہیں؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر اس کی سوچ میں کہا۔

"ارے باپ رے! میری کھوپڑی اُلٹ رہی ہے۔۔۔" اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی میں نے کہا۔ "ارے میں تو آگے کی طرف جھکا جا رہا ہوں۔۔۔" وہ آگے کی طرف بے اختیار جھکنے لگا۔ میں نے کہا۔ "آہ! میرے گھٹنے کانپ رہے ہیں مجھے فوراً ہی بیٹھ جانا چاہیے ورنہ میں گر پڑوں گا۔۔۔" وہ فوراً ہی بیٹھنے لگا۔

انسان اپنے دماغ کا تابع فرمان ہے۔ دماغ کی قوت سے پیروں پر کھڑا ہوتا ہے، دماغ کی کمزوری سے گرتا ہے اور وہی دماغ اسے حوصلہ دے تو گرتے گرتے سنبھل جاتا ہے۔

انسانی دماغ کی ان کارفرمائیوں کے پیشِ نظر اس مسلح جوان کی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جب وہ بیٹھنے لگا تو میں نے کہا۔ "نہیں، مجھے بیٹھنا نہیں چاہیے، سنبھلنا چاہیے۔ میں اس قابل ہوں کہ اپنے پیروں پر کھڑا رہ سکتا ہوں۔"

وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں کے لیے میں نے اس کے دماغ کو آزاد چھوڑ دیا۔ وہ سوچنے لگا۔ "یا اللہ! یہ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ یوں لگتا ہے جیسے میرا دماغی توازن گڑبڑا گیا تھا۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ یہ۔ یہ مسٹر فرہاد کی آنکھوں میں کچھ ہے۔ جیسے ہی میں نے آنکھوں کی طرف دیکھا تھا ویسے ہی میرا دماغی توازن گڑبڑا گیا تھا۔"

میں نے اس کی منفی سوچ میں کہا۔ "نہیں، اس کی آنکھوں میں کچھ نہیں ہے۔ یہ میرا وہم ہے۔ بہرحال مجھے ایک بار آزمائشی طور پر اس کی آنکھوں میں دیکھنا چاہیے۔"

یہ سوچ کر اس نے جیسے ہی میری آنکھوں کی طرف دیکھا میں نے اس کی آنکھوں کے ذریعے اس کے دماغ تک پہنچ کر کہا۔

"اُف! یہ فرہاد کی آنکھوں سے کیسی چنگاریاں پھوٹ رہی ہیں۔ یہ آنکھیں کتنی عجیب اور پُرکشش ہیں۔ میں ان آنکھوں کی جانب کھنچا جا رہا ہوں۔ میں اس کی آنکھوں سے اپنی نگاہیں ہٹانا چاہوں تب بھی نہیں ہٹا سکتا۔ اس کی آنکھوں نے مجھے جکڑ لیا ہے۔"

واقعی وہ ایک جگہ ساکت کھڑا ہوا میری آنکھوں میں دیکھے جا رہا تھا۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جو دماغی طور سے صحت مند اور مضبوط ہوتے ہیں انھیں کوئی بھی عامل ہپناٹائز نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جسے ہم اپنا معمول بنانا چاہتے ہیں پہلے اس کے ذہن کو کمزور بنا دیں۔ جیسے بلیک گائیڈ نے ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن کو دماغی طور پر کمزور کرنے کے لیے اس سے مصافحہ کرتے وقت اپنی انگوٹھی کے ذریعے کوئی ایسی دوا انجکٹ کر دی تھی جو فوراً ہی دماغ پر اثر انداز ہوتی تھی۔ شبیر حسن ذہنی طور پر مفلوج ہو گیا۔ تب بلیک گائیڈ نے اس پر تنویمی عمل کیا۔ اس طرح میں نے بھی اس مسلح جوان کو پہلے ٹیلی پیتھی کے ذریعے دماغی طور پر کمزور بنا دیا اور اب اسے تنویمی عمل سے اپنا تابع فرمان بنا رہا تھا۔

"یہ آنکھیں تمھیں حکم دیتی ہیں کہ اپنی جگہ اسٹول پر جا کر بیٹھ جاؤ۔"

وہ چُپ چاپ اسی اسٹول پر بیٹھ گیا، جہاں پہلے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

"دروازے کی طرف دیکھتے رہو۔ یہ دروازہ بند ہے اور تم یہ سوچتے سمجھتے رہو گے کہ مسٹر فرہاد اس کمرے کے اندر اپنے بیڈ پر سو رہے ہیں۔ باہر سے کوئی آ کر پوچھے تو تم کیا جواب دو گے؟"

اس نے جیسے نیند کی حالت میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"میں جواب دوں گا کہ مسٹر فرہاد کمرے کے اندر اپنے بیڈ پر سو رہے ہیں۔"

"شاباش! اس دروازے کی جانب دیکھتے رہو اور وہاں سے نظریں نہ ہٹاؤ۔"

وہ میرے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ میں آگے بڑھ کر کاریڈور سے گزرتے ہوئے لفٹ کے پاس آ گیا۔ دوسرے وارڈ کے مریض سو رہے تھے یا ان کا مرض انھیں جگا رہا تھا۔ وارڈ کے وسط میں نرس روبی ایک کرسی پر بیٹھی، میز پر جھکی کچھ لکھ رہی تھی۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ میں لفٹ کے ذریعے نیچے آ گیا اور نرسوں کے کوارٹرز کی طرف جانے لگا۔

میں فرزانہ کی طرف جا رہا تھا۔ اس وقت وہ حسین نرس ایسی تھی جو میری حفاظت کے لیے اپنی جان بھی دے سکتی تھی۔ کوارٹروں کے قریب پہنچ کر میں الجھ گیا کہ پتہ نہیں وہ کس نمبر کے کوارٹر میں رہتی ہے۔ وہاں گہری رات کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جو نرسیں ڈیوٹی پر نہیں تھیں وہ اپنے کوارٹروں کی بتیاں بجھا کر آرام سے سو رہی تھیں۔ تمام کھڑکیاں اور دروازے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یہ مناسب نہیں تھا کہ میں کسی دروازے پر دستک دے کر کسی کی نیند خراب کرتا اور اس سے فرزانہ کے کوارٹر کا نمبر پوچھتا۔ ہسپتال سے نکلتے وقت میں یہ بھول گیا تھا کہ مجھے یہ مسئلہ پیش آئے گا۔

میں تھک کر گھاس کے فرش پر بیٹھ گیا۔ یہ تھکن بتا رہی تھی کہ ابھی میرے اندر کمزوری باقی ہے اور مجھے کچھ روز اور آرام کرنے کی ضرورت ہے۔ شبنم آلود گھاس پر بیٹھ کر کچھ سکون نصیب ہوا تو پہلے دشمنوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا خیال آیا۔ بلیک گائیڈ نے شبیر حسن کے دماغ پر تنویمی عمل کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ میں اس سے سوچ کا رابطہ قائم نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں بلیک گائیڈ کے دماغ میں جھانکنے لگا۔

اُس وقت بلیک گائیڈ خوش ہو کر چٹکی بجاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"یہ ہوئی کام کی بات۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ یہ فرہاد کی

کمزوری ہے۔ اب میں دیکھوں گا کہ وہ مجھ سے بچ کر کہاں جائے گا، یا کس طرح اپنے بچاؤ کی پلاننگ کرے گا۔"

میں بوکھلا کر سوچنے لگا کہ بلیک گائیڈ کو میری کون سی کمزوری معلوم ہوگئی ہے مگر افسوس! انسان کو سب کچھ معلوم ہوجاتا ہے۔ صرف اپنی کمزوری معلوم نہیں ہوتی۔ حالانکہ وہ اپنی اس کمزوری سے گذر چکا ہوتا ہے پھر بھی اسے یاد نہیں رکھتا۔ یہی حال میرا تھا۔ میں تیزی سے اپنی اچھی اور بُری عادتوں کو ٹٹولنے لگا لیکن کوئی ایسی کمزوری یاد نہ آئی جو دشمن کے کام آنے والی تھی۔

بلیک ... بھی بہت زیادہ محتاط ہوگیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب میری کمزور... نہیں سوچے گا ورنہ میں ٹیلی پیتھی کے ذریعے معلوم کروں گا۔ وہ سوچنے کے بجائے ایک دم سے عمل قدم اٹھانے کے لیے ہسپتال کی طرف آرہا تھا۔ اس کے ساتھ شبیر حسن اور شیتل تھے۔ ان کے علاوہ انٹیلی جنس کے دو نوجوان شبیر حسن کے باڈی گارڈ کے طور پر ساتھ آرہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں ہر لمحہ میری موت قریب آتی جارہی تھی۔ میں ہسپتال سے نکل تو آیا تھا لیکن ہسپتال سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ بلیک گائیڈ مجھے وہاں نہ پاکر فرزانہ کے پاس آسکتا تھا کیونکہ میں نے ہی ٹیلی پیتھی کے ذریعے معلوم کیا تھا کہ فرزانہ کے لختِ جگر پتو کو گلبرگ کی کس کوٹھی میں چھپایا گیا ہے۔ انٹیلی جنس کے آدمی میری معلومات سے فائدہ اٹھاکر پتو کو وہاں سے لے آئے تھے۔ لہٰذا فرزانہ کے پاس ٹھہرنا بھی میرے لیے مناسب نہیں تھا اور فرزانہ اور پتو کو میں بلیک گائیڈ کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں نے اس کے اہم آلہ کاروں کو یا تو مار ڈالا تھا یا انھیں لاک اپ میں بھجوا دیا تھا۔ ان کے مشن کا سب سے اہم شخص بھوانی شنکر کا آپریشن میری ہی رپورٹ پر کیا گیا تھا۔ ان باتوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بلیک گائیڈ مجھ پر کس قدر جھنجلایا ہوا تھا۔ وہ مجھے نہ پاکر فرزانہ اور پتو کو قتل کرسکتا تھا۔

لیکن فرزانہ کا کوارٹر کون سا ہے۔ میں نے اپنے سامنے تمام کوارٹروں پر نظر دوڑائی۔ پھر آنکھیں بند کرکے فرزانہ کا تصور کیا اور اس کے ذہن میں جھانکنے لگا۔

میرا خیال تھا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہوگی۔ رات کا تیسرا پہر تھا۔ ایسے وقت سب ہی نیند میں مست ہوتے ہیں لیکن وہ بستر پر پتو کو سینے سے لگائے بیٹھی ہوئی تھی اور میرے احساسات کے متعلق اور میری صلاحیتوں کے متعلق سوچ رہی تھی کہ کس طرح میں نے اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر گمشدہ پتو کو چند گھنٹوں میں حاصل کرلیا تھا۔ کچھ میری صلاحیتیں تھیں اور کچھ میری شخصیت کا اثر تھا کہ میرے بارے میں سوچتے وقت اس کا دل پیار سے دھڑک رہا تھا۔

میں نے اس کی سوچ میں کہا "یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ میں ڈیوٹی کے اوقات کے بعد فرہاد سے نہیں مل سکتی۔ اگر سپرنٹنڈنٹ اجازت دیتے تو میں ابھی ان کے کمرے میں پہنچ جاتی اور تمام رات ان کی خدمت ... رہتی۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ میرے پاس آجائیں؟"

اس کی سوچ نے کہا "میں کیسی نادانی کی بات سوچ رہی ... وہ بیمار ہیں۔ بھلا میرے کوارٹر میں کیسے آسکتے ہیں؟"

میری سوچ نے جواباً کہا "جذبۂ عشق سلامت ہے تو انشاء ... کچے دھاگے سے بندھے آئیں گے سرکار میرے۔ کیا اس شعر میں ... صداقت نہ ہوگی؟ فرہاد کے دل میں محبت جوش مارے گی تو کیا وہ ... نہیں آسکے گا؟"

"نہیں، یہ سب شاعرانہ باتیں ہیں۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"یہ شاعری ہو یا حقیقت، اسے آزمانے میں کیا حرج ہے۔ ... ذرا دروازہ کھول کر دیکھوں گی کہ وہ محبت کے کچے دھاگے سے بندھے ... آئے ہیں یا نہیں؟"

اس کی سوچ نے کہا "یا اللہ! میرے دماغ میں آپ ہی آپ ... خیال کیوں پیدا ہورہا ہے کہ وہ میرے دروازے پر آسکتے ہیں۔ اگر اس ... جذبۂ عشق کہتے ہیں تو مجھے بستر سے اٹھ کر، چند قدم چل کر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟"

خود اس کا دل مجھ سے ملنے اور مجھے دیکھنے کے لیے بہت ... سے مچل رہا تھا اس لیے وہ فوراً بستر سے اٹھ گئی۔ ادھر میں بھی گھاس کے فرش سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور تاریکی میں گھور گھور کر دیکھنے لگا کہ کوارٹر کا دروازہ کھلے گا۔

وہ دروازے تک سوچتی آرہی تھی کہ اگر واقعی میں اسے اتنی رات ... کوارٹر کے سامنے نظر آؤں گا تو وہ محبت کے جذبات اور اس کی صداقت ... پر ایمان لے آئے گی اور یہ تسلیم کرے گی کہ محبت کے معاملے میں دل ... ہے، وہ سچ نکلتا ہے۔

دروازہ کھولتے ہی وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگی۔ دل کی بات ... نکلی تھی۔ یکبارگی اس کے دل میں محبت کی آندھی سی چلنے لگی۔ وہ ... آندھی میں دوڑتی ہوئی، ایک تنکے کی طرح اُڑتی ہوئی میرے پاس آ... مجھ سے لپٹ گئی۔

"میں مان گئی کہ پیار کرنے والے کیسے ایک دوسرے کی جانب ... کھنچے چلے آتے ہیں۔ ابھی میرا دل کہہ رہا تھا کہ آپ آئے ہیں۔ آپ ... آج مجھے پتہ چلا کہ محبت سچی ہو تو دروازے پر دستک دینے کی ضرورت ... پڑتی۔ دل پر خود بخود دستک سنائی دیتی ہے۔"

وہ میری گردن میں اپنی گداز بانہیں ڈال کر جوشِ محبت میں ... تھی۔ میں نے اس کے اطراف اپنے بازوؤں کا حلقہ باندھ دیا تھا اور ... حلقے سے باہر موت میری تلاش میں بھٹک رہی تھی۔

وہ گردن اٹھاکر بول رہی تھی اور بے اختیار اپنی محبت کا اظہار ... رہی تھی۔ اس طرح اُس کی گرم سلگتی ہوئی سانسوں کے جھونکے میرے چہرے ... رہے تھے۔

میں نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا اور اس سے کہا۔ "فرزانہ! اس وقت ہم خطرے میں ہیں۔ جو دشمن پتو کو یہاں سے ... گیا تھا، وہ ایک بار پھر پوری تیاریوں کے ساتھ ادھر آرہا ہے۔"

وہ ایک دم سے گھبرا کر الگ ہوگئی۔ ایک جوان عورت کے سارے ... جذبات سرد پڑگئے اور ممتا جاگ گئی۔ اس کا بچہ ... رے میں تھا۔ وہ تیزی سے ... پلٹ کر بھاگتی ہوئی اپنے کوارٹر کے اندر چلی گئی۔ میں بھی تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا اس کے دروازے پر پہنچا۔ اندر زیرو پاور کا ایک سبز بلب روشن تھا۔ ... بستر پر پہنچ کر اور اپنے دونوں بازو پھیلا کر پتو پر چھا گئی تھی۔ اس معصوم ... کو پیش آنے والے خطرے سے چھپا رہی تھی۔

میں نے کہا "جب چیل سر پر منڈلاتی ہے تو مرغی اسی طرح ... پر پھیلا کر اپنے چوزوں کو اسی طرح چھپا لیتی ہے لیکن پتو کے سر پر ایک ... اٹھانے والا گدھ منڈلا رہا ہے۔ وہ تمھاری لاش پر سے گذر کر بچے تک پہنچ جائے گا۔ حفاظت کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ اپنے دل و دماغ ... قابو میں رکھو گی تو ہم سب اس خطرے سے دُور نکل جائیں گے۔"

وہ سر اٹھا کر میری طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"پتو پر کوئی آفت آتی ہے تو میرا دماغ بالکل کام نہیں کرتا۔ مجھے ... خدا کے بعد صرف آپ پر بھروسہ ہے۔ آپ جلدی بتائیں میں کیا کروں؟"

میں نے کہا "ہم اس کوارٹر میں پناہ نہیں لے سکتے۔ وہ لوگ مجھے ... ہسپتال میں نہ پاکر سیدھے یہاں آئیں گے۔ کیا آس پاس کے کوارٹروں میں ... کوئی ایسی نہیں ہے جو خطرہ ٹلنے تک ہمیں چھپالے؟"

وہ جلدی سے پتو کو اٹھاتی ہوئی بولی "ہاں مجھے یاد آگیا۔ روبی کے ... کوارٹر کی چابی میرے پاس ہے۔ آیئے میرے ساتھ۔۔۔" میں اس کے ... ساتھ چلنے لگا۔ وہ کہتی جارہی تھی "میں بھی جب ڈیوٹی پر جاتی ہوں تو اپنے ... کوارٹر کی چابی اسے دے دیتی ہوں۔ گھبراہٹ میں مجھے یہ بات یاد نہیں ... رہی تھی۔ آپ نے ٹھیک ہی کہا کہ دل و دماغ کو قابو میں رکھنے سے خطرات ... ٹل جاتے ہیں۔"

روبی کے کوارٹر کے سامنے پہنچ کر اس نے چابی مجھے دی۔ میں نے ... دروازے پر پڑا ہوا تالا کھول دیا اور اس سے کہا کہ وہ اندر جاکر کھڑکی ... کھول دے۔ اس نے میری ہدایت کے مطابق کھڑکی کھول دی۔ میں نے دروازے کو باہر سے بند کرکے دوبارہ اس پر تالا ڈال دیا۔ پھر کھڑکی کے راستے اندر آکر اسے اندر سے بند کردیا۔ فرزانہ نے کہا۔

"واقعی آپ مشکلات کے وقت بھی حاضر دماغ رہتے ہیں۔ اوّل تو دشمن روبی کے اس کوارٹر تک نہیں آئیں گے اور اگر آئیں گے بھی تو دروازے پر تالا دیکھ کر واپس چلے جائیں گے۔"

کمرے میں اندھیرا تھا۔ لائٹ آن کرنا دانش مندی نہیں تھی۔ فرزانہ اچھی طرح جانتی تھی کہ روبی کے کمرے میں کون سی چیز کہاں رکھی ہوئی ہے۔ وہ اندھیرے میں چلتی ہوئی پلنگ کے پاس گئی اور وہاں پتو کو لٹا دیا۔ کھڑکی پر پردہ پڑا ہوا تھا اور میں پردے کو ذرا سا ہٹاکر باہر شیشوں کے پار دیکھ رہا تھا۔ اس وقت میں بلیک گائیڈ کے دماغ میں جھانک کر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ مجھ تک پہنچنے کے لیے میری کون سی کمزوری سے کھیل رہا ہے لیکن فوراً ہی مجھے اس کا موقعہ نہیں ملا۔ فرزانہ پتو کو سُلا کر میرے پاس آگئی تھی۔ اس نے دبی زبان سے پوچھا۔

"کیا وہ لوگ نظر آرہے ہیں؟"

"نہیں۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"فرہاد صاحب! میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ پتو کو بچانے کی وجہ سے وہ لوگ آپ کی جان کے بھی دشمن بن گئے ہیں۔"

میں نے کہا "ان سے دشمنی کی وجہ پتو نہیں ہے۔ یہ لوگ ہمارے ملک کے دشمن ہیں۔ ان سے تو ایک دن ٹکرانا ہی تھا لیکن بدقسمتی سے ایسے وقت ٹکراؤ ہورہا ہے جبکہ میں پوری طرح صحت یاب نہیں ہوں۔ اگر کچھ روز کی مہلت مل جاتی تو میں چھپنے کی بجائے ان کے مقابل آکر ان سے دو دو ہاتھ کرتا۔ اگر یہ خطرہ ابھی ٹل جائے تو ہم کسی ایسی جگہ پناہ لیں گے، جہاں ان کا خیال بھی ہم تک نہیں پہنچے گا۔"

وہ دعائیہ انداز میں بولی "اللہ کرے کہ خطرہ ٹل جائے۔ میں ایسے وقت آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔ آپ کی ایسی خدمت کروں گی کہ آپ جلد ہی مکمل طور سے صحت یاب ہوجائیں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ تاریکی۔ تنہائی اور ایک جوان عورت۔ بہکنے کے تمام لوازمات موجود تھے لیکن موت کا سامان بھی ہورہا تھا۔ دانش مندی یہ تھی کہ پہلے میں دشمنوں کے متعلق معلومات حاصل کرتا۔ میں نے کہا۔

"فرزانہ! جی چاہتا ہے تمھیں اسی طرح سینے سے لگائے زندگی گذار دوں مگر میں ان رنگین لمحات کے دوسری طرف بھی دیکھتا ہوں۔ فرض کرو کہ اس وقت دشمن اچانک ہی اس طرف سے گذرنے لگیں اور ایسے وقت پتو نیند سے بیدار ہوکر تمھیں آواز دے تو وہ گذرنے والے ٹھٹک کر سوچنے پر مجبور ہوجائیں گے کہ بند کوارٹر کے اندر سے بچے کی آواز کیسے آرہی ہے؟"

فرزانہ تڑپ کر مجھ سے الگ ہوگئی۔ "آپ درست کہتے ہیں۔ پتو کی یہ عادت ہے کہ رات کو آنکھ کھلتی ہے تو مجھے اپنے پاس دیکھ کر خاموشی سے

پھر سو جاتا ہے۔ اگر میں پاس نہ رہوں تو مجھے آواز دیتا ہے۔ واقعی آپ
ذہین ہیں۔ ایسی الجھن کے وقت بچوں کی عادات کو بھی خوب یاد رکھتے ہیں۔
مجھے اس کے پاس جا کر لیٹنا چاہیے۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ میں اتنی حسین عورت سے پیچھا نہیں چھڑانا چاہتا تھا لیکن اس وقت تنہائی بے حد ضروری تھی۔ لہٰذا تنہائی نصیب ہوتے ہی میں نے بلیک گائیڈ سے دماغی رابطہ قائم کیا۔

وہ ایک کار سے ٹیک لگائے کہیں تنہا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے سوچا۔" پندرہ منٹ ہو چکے ہیں شیتل شبیر حسن کے ساتھ فرہاد کے کمرے میں پہنچ گیا ہوگا اور اس کا گلا گھونٹ رہا ہوگا۔ شبیر حسن نے بہت دیر سے مجھے بتایا کہ فرہاد ٹیلی پیتھی کے ذریعے گونگے شیتل کے دماغ تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اس کی یہ کمزوری پہلے ہی معلوم ہو جاتی تو اتنا وقت ضائع نہ ہوتا۔ بہر حال اب بھی اس کی یہ کمزوری میرے کام آرہی ہے! اسی لیے میں نے شیتل کو شبیر حسن کے ساتھ بھیجا ہے۔ شبیر حسن کے دماغ پر میرے تنویمی عمل کا اثر ہے۔ لہٰذا فرہاد شبیر حسن کے دماغ تک بھی نہیں پہنچ سکا ہوگا۔ اسے پتہ نہیں چلا ہوگا کہ دو ایسے دشمن اس کے پاس آرہے ہیں جو اس کی خیال خوانی سے متاثر نہیں ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ وہ ہسپتال کے بیڈ پر پڑا ہوا ہے۔ شیتل اس کمزور اور بیمار دشمن کو چند ہی منٹوں میں گلا گھونٹ کر مار دے گا۔ پھر وہ دروازے کو پہلے کی طرح بند کر کے بھوانی شنکر کے کمرے میں جائے گا اور شبیر حسن کی مدد سے اسے کمرے سے اٹھا کر ایمبولنس تک پہنچا دے گا۔ یہ کام اب تک ہو جانا چاہیے۔ میرا خیال ہے اب وہ ایمبولنس لے کر ہسپتال کے کمپاؤنڈ سے باہر نکلنے ہی والے ہوں گے....."

وہ سوچ رہا تھا اور اس ایمبولنس کا انتظار کر رہا تھا، جس میں شیتل، شبیر حسن اور بھوانی شنکر پہنچنے والے تھے۔ اتنی دیر کے بعد اس کی سوچ نے بتایا تھا کہ میری کون سی کمزوری اس کے ہاتھ آگئی ہے۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں کسی کی آنکھوں کے ذریعے اس کے دماغ تک پہنچ سکتا ہوں یا کسی کی گفتگو کے لہجے سے اس کی سوچ کے لہجے کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہوں۔ شیتل گونگا تھا لہٰذا اس کے گفتگو کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اب تک ایک ہی بار مجھ سے ٹکرایا تھا اس وقت وہ نقاب میں تھا۔ رات کی نیم تاریکی تھی اس لیے اس کی آنکھیں واضح طور سے نظر نہیں آئیں۔ پھر وہ تو کوئی مشینی انسان تھا۔ اتنا پھرتیلا اور طاقتور تھا، جتنا کہ ایک آہنی بلڈوزر ہو سکتا ہے۔ اپنے سامنے والی ہر چیز کو کچل دیتا تھا یا توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا تھا۔ اگر اس وقت میں ہسپتال کے کمرے میں ہوتا تو بلیک گائیڈ کے خاموش منصوبے کے مطابق وہ آہنی انسان مجھے پیس کر رکھ دیتا۔

میں نے سوچ لیا کہ اب کہیں مجھے آرام کرنے کی مہلت [illegible] سب سے پہلے میں شیتل جیسی فولادی دیوار کو توڑنے کی تدبیر [illegible] گا۔ اسی کم بخت نے مجھے توڑ پھوڑ کر ہسپتال پہنچایا تھا۔ اب [illegible] کہ جلد از جلد میں اسے توڑ پھوڑ کر جہنم میں پہنچا دوں۔ اس [illegible] بلیک گائیڈ خود بخود ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جائے گا۔

میں دوسروں کی سوچ پڑھتے پڑھتے خود اپنی ہی سوچ [illegible] بھٹک جاتا ہوں۔ ایسے وقت پتہ نہیں چلتا کہ کتنا وقت گزر [illegible] میں نے دوبارہ بلیک گائیڈ سے دماغی رابطہ قائم کیا۔ اس [illegible] شبیر حسن اور شیتل ایک ایمبولنس میں وہاں پہنچ گئے تھے۔ [illegible] کے پچھلے حصے میں بھوانی شنکر لیٹا ہوا تھا۔ بلیک گائیڈ نے پچھلا دروازہ کھول کر دیکھنے کے بعد شبیر حسن سے پوچھا۔

"فرہاد کا کیا بنا؟"

"وہ ہسپتال کے بیڈ پر نہیں تھا۔"

"پھر کہاں تھا؟"

"پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ تم نے کہا تھا کہ ہم ہسپتال [illegible] وقت برباد نہ کریں، فرہاد کا کام تمام کریں اور بھوانی شنکر کو [illegible] جب فرہاد نہیں ملا تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ پہلی فرصت میں [illegible] کو نکال کر لے آؤں۔"

بلیک گائیڈ نے کہا۔" یہ تم نے اچھا کیا لیکن فرہاد کہاں [illegible] وہ میرے لیے ایک مستقل خطرہ بن گیا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ میں اس [illegible] چھڑانے کے لیے ابھی بارڈر کراس نہیں کر سکتا۔ اس وقت چار بجے [illegible] سرحد تک پہنچنے سے پہلے ہی صبح ہو جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ ہم [illegible] فوجیوں کی نظر میں آجائیں۔"

شبیر حسن کے ساتھ انٹیلی جنس کے دو مسلح جوان تھے۔ بلیک [illegible] کی باتیں سن کر ایک جوان نے چونک کر پوچھا۔

"کیا آپ لوگ غیر قانونی طریقہ سے سرحد پار کرنا چاہتے [illegible]

بلیک گائیڈ نے جواب دیا۔" ہاں۔ سرحد پار کرنے کے [illegible] لوگوں کا وجود ضروری نہیں ہے۔" اس نے گونگے شیتل کو اشارہ [illegible] کہا کہ ان مسلح جوانوں کا کام تمام کر دے۔ اس کا حکم پاتے ہی شیتل [illegible] پر چھلانگ لگا دی۔ وہ دو صحت مند اور تربیت یافتہ فائٹر [illegible] کے حملوں کے آگے ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ ان کے تمام جوابی حملوں [illegible] فولادی انسان پر اثر نہیں ہوتا تھا اور وہ ایک ایک ہاتھ میں [illegible] زمین دکھا دیتا تھا۔ اس کا بھاری بھرکم ہاتھ کس طرح ہڈی پسلی [illegible] دیتا تھا۔ اس کا مجھے ذاتی تجربہ ہو چکا تھا۔ اب بھی اس کی [illegible] کے متعلق سوچتا ہوں تو دل ہی دل میں اسے داد دیتا ہوں۔ [illegible] ایسا ہو کہ مقابلہ کرتے وقت پسینہ چھوٹ جائے اور اپنا [illegible]

[illegible] یہ ہو کہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک ایسے ناقابلِ شکست [illegible] کو شکست دینے کا عزم تازہ رہے۔

شیتل نے ذرا سی دیر میں دونوں کی گردنوں کو اپنی دونوں بغلوں [illegible] لیا۔ یہ سب کچھ بلیک گائیڈ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں [illegible] کے تعاون سے دیکھتی ہیں اور دماغ آنکھوں کے تعاون سے سوچتا [illegible] لہٰذا میں اس کی سوچ کی کھڑکی سے تصور کی اسکرین پر انھیں لڑتے [illegible]

[illegible] شیتل نے دونوں کی گردنیں دبوچ کر انھیں مار ڈالا تھا۔ اس [illegible] شبیر حسن التجا کرتا رہا کہ اس کے ماتحتوں کو نہ مارا جائے لیکن وہ [illegible] ختم کر دیے گئے۔ ان کے مرنے کے بعد بلیک گائیڈ نے کہا۔

[illegible] "شبیر حسن! یوں تو اب تمھیں بھی مر جانا چاہیے لیکن فرہاد کہیں [illegible] میں بیٹھا ہے۔ نہ جانے کب انٹیلی جنس والوں کو میرے پیچھے [illegible] اس کے پاس ٹیلی پیتھی کا علم ایسا ہے کہ میں جہاں بھی پناہ لوں گا، [illegible] کے ذریعے اس جگہ کا پتہ معلوم کرے گا اور پولیس والوں کے [illegible] وہاں پہنچ جائے گا۔ فی الحال اپنی اور شیتل کی سلامتی کے لیے [illegible] کے طور پر رکھنا ضروری ہے، جب تک تم ہماری قید میں [illegible] پولیس والے ہمیں نقصان پہنچانے سے پرہیز کرتے رہیں گے۔"

اس نے اپنی نکٹائی کھول کر شیتل کو دیتے ہوئے اشارے سے سمجھایا [illegible] سے شبیر حسن کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر باندھ دے۔ [illegible] اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ بلیک گائیڈ بڑی تیزی سے سوچ [illegible] کس طرح کسی ایسے مقام تک پہنچ سکتا ہے، جہاں تک میرا علم نہ [illegible] حالانکہ میرے علم کو محدود کرنا بظاہر ناممکن تھا لیکن انسان [illegible] کام لے تو جو بات ناممکن ہے، وہ ممکن ہو جاتی ہے۔

پھر میں بلیک گائیڈ کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ اس نے مجھے [illegible] رکھنے کے لیے ایک بہت ہی عمدہ تدبیر سوچ لی۔ اس نے [illegible] دل میں سمجھایا۔ وہ اشاروں کو سمجھتا رہا۔ پھر ان کے مطابق [illegible] لگا۔

اس نے بلیک گائیڈ اور شبیر حسن کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور [illegible] پچھلی سیٹ پر بیٹھنے میں مدد دی۔ وہاں بیمار بھوانی شنکر کو پہلے [illegible] تھا۔ مقصد یہ تھا کہ گونگا شیتل کار ڈرائیو کر کے انھیں جس [illegible] جائے گا، اس کا راستہ شبیر حسن اور بلیک گائیڈ اپنی آنکھوں [illegible] نہیں گے۔ اگر دیکھیں گے تو ان کا دماغ ان راستوں کے [illegible] گا اور میں ان کے دماغ سے ان کی منزل کا پتہ معلوم [illegible] سکا گا۔

بلیک گائیڈ نے واقعی ذہانت کا ثبوت دیا تھا اور شیتل کو یہ سمجھا دیا [illegible] مرضی سے کسی ایک پناہ گاہ کی طرف انھیں لیجائے اور جہاں [illegible] اس کے متعلق اپنے باس (بلیک گائیڈ) کو بھی نہ بتلائے۔ [illegible] یہ صورتِ حال تھی کہ وہ دونوں آنکھیں بند کیے پچھلی
سیٹ پر اندھوں کی طرح بیٹھے ہوئے تھے اور ایک گونگا کار ڈرائیو کرتا ہوا انجانی منزل کی طرف انھیں لیجا رہا تھا۔ میں گونگے کے ذہن کو نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس وقت بلیک گائیڈ اور شبیر حسن کی طرح میری آنکھوں پر بھی لاعلمی کی پٹی بندھ گئی تھی۔

میں کچھ دیر تک کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح بلیک گائیڈ کی سوچ سے یہ اگلواؤں کہ اس کی کتنی خفیہ پناہ گاہیں ہیں لیکن وہ بہت ہی مستقل مزاج تھا۔ وہ برابر اپنی پناہ گاہوں کے متعلق سوچنے سے سختی سے انکار کرتا رہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اس کے دماغ میں جھانک رہا ہوں۔ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"بیٹے فرہاد! میں تمھاری چالاکیوں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ انسان کا چھوٹا سا دماغ ایسا ہے جس میں سارے جہان کی وسعتیں سما جاتی ہیں۔ میں نے ذہن کی گیرائی اور گہرائی کا انتھک مطالعہ کیا ہے۔ یہ ایک عام سا مطالعہ ہے کہ ہمارے دماغ میں دو طرح کی سوچیں ہوتی ہیں۔ ایک مثبت دوسری منفی یعنی ایک سوچ کہتی ہے کہ یہ کام کرو اور دوسری سوچ کہتی ہے کہ اس کام کو نہ کرو۔ بعض اوقات انسان کسی فیصلے کی اہم گھڑیوں میں انہی دو سوچوں کے درمیان اُلجھ جاتا ہے۔

تم بھی مجھے اسی طرح الجھانے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں اپنی منفی سوچ میں اپنی خفیہ پناہ گاہوں کے متعلق سوچنے سے انکار کر رہا ہوں اور تم میری مثبت سوچ بن کر مجھے ان جگہوں کے متعلق سوچنے پر مجبور کر رہے ہو لیکن میں نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے اور اپنی قوتِ ارادی سے اپنی سوچ کو دوسری طرف بھٹکا رہا ہوں تاکہ تمھارے بہلاوے میں نہ آسکوں۔"

میں نے اس کی مثبت سوچ میں کہا۔" ہاں، یہی مناسب ہے۔ مجھے اپنی سوچ کو دوسری طرف بھٹکانا چاہیے۔ یہ تو میں خود نہیں جانتا کہ شیتل مجھے کس پناہ گاہ کی طرف لیجائے گا۔ لہٰذا مجھے یہ سوچنا چاہیے کہ کس مقام سے سرحد پار کرنا مناسب ہوگا۔ میں موقعہ پا کر شیتل کو اشاروں میں سمجھا دوں گا کہ ہمیں رن کچھ کے میدان سے سرحد کو عبور کرنا ہے۔"

"نہیں۔" اس کی منفی سوچ نے کہا۔" اتنی دور رن کچھ کی طرف جانا مناسب نہیں ہے۔ یہاں کا سب سے قریبی بارڈر واہگہ ہے لیکن نہیں ابھی مجھے کسی ایسے مقام کے متعلق نہیں سوچنا چاہیے جہاں سے مجھے گذرنا ہے، ہو سکتا ہے کہ فرہاد میرے خیالات کو پڑھ رہا ہو۔ اوہ مائی گاڈ! سوچنے کی دُھن میں یہ بھول گیا تھا کہ وہ کم بخت میرے دماغ میں جھانک رہا ہوگا۔ کیا مصیبت ہے؟ میں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے خطرناک دشمنوں کو زیر کیا ہے لیکن یہ تو عجیب و غریب قسم کا دشمن ہے۔ ہر لمحہ میرے دماغ میں آسن جما کر بیٹھ جاتا ہے میں گہری نیند سو رہا ہوں گا تب بھی یہ میرے خوابوں کو پڑھتا رہے گا کیونکہ خوابوں

کا تعلق بھی دماغ سے ہوتا ہے۔ اُف! پتہ نہیں آسیب کی طرح دل و دماغ پر چھا جانے والے اس دشمن سے کب اور کیسے نجات ملے گی؟"

وہ خائف تھا اور ہر لمحہ میری خیال خوانی کی صلاحیتوں سے سہما ہوا تھا۔ کوئی اور دشمن ہوتا تو گھبرا کر اب تک میرے سامنے گھٹنے ٹیک چکا ہوتا مگر وہ ضدی تھا۔ شکست کے آخری لمحے تک پہنچنے سے پہلے مجھے شکست دینے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف تھا۔

میں نے اُس وقت اس کا پیچھا چھوڑ دیا اور اپنے ماحول میں واپس آگیا۔ میری زندگی بھی عجیب ہے۔ میں خیالی راستوں کا مسافر ہوں۔ منٹوں میں صدیوں کا فاصلہ طے کر جاتا ہوں۔ ابھی میں بہت دور بلیک گائیڈ کی بھاگتی ہوئی کار میں اس کے دماغ سے چپکا ہوا تھا اور ابھی روبی کے کمرے میں واپس آگیا۔ کمرے میں بدستور اندھیرا تھا۔ روبی کے بیڈ پر فرزانہ پپّو کے پاس لیٹی ہوئی مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جب میں نے کھڑکی کی طرف سے پلٹ کر اسے دیکھا تو اس نے پوچھا۔

"کیا ہوا؟ کیا دشمن چلے گئے؟"

"ہاں۔" میں جواب دیتا ہوا اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ "تمہارے بیٹے پر سے خطرہ ٹل گیا ہے۔ وہ دشمن اب ادھر نہیں آئے گا۔"

"خدا کا شکر ہے۔" وہ اطمینان کا سانس لے کر بولی "چلیے اب ہم اپنے کوارٹر میں چلیں۔"

میں نے کہا "تم جا کر آرام کرو۔ ابھی میری قسمت میں آرام نہیں لکھا ہے۔ مجرم ہسپتال سے عبوانی شنکر اور شبیر حسن کو ساتھ لے گیا ہے۔ میں بھی ہسپتال سے چلا آیا ہوں۔ ایسی صورت میں پولیس والے میرے پیچھے پڑ جائیں گے اور گم ہونے والوں کے متعلق مجھ سے طرح طرح کے سوالات کریں گے۔ اگر میں نے انہیں اطمینان دلا دیا، تب بھی انٹیلی جنس والے مجھے مجبور کریں گے کہ میں اپنی صلاحیتوں سے شبیر حسن کو تلاش کروں۔ دوسری طرف بلیک گائیڈ کو اگر یہ پتہ چل گیا کہ میں دوبارہ انٹیلی جنس والوں سے منسلک ہو گیا ہوں تو وہ میرا پتہ ٹھکانہ معلوم کرے گا اور کسی وقت بھی شیتل کو اچانک ہی مجھ پر حملہ کرنے کے لیے بھیج دے گا۔ فرزانہ! میں تمہیں ساری تفصیل نہیں بتا سکتا کہ میں کس طرح دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں۔ مجھے یہاں سے جلد از جلد چلے جانا چاہیے۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"نہیں، میرے ساتھ ساتھ ہمیشہ موت چلتی ہے۔ تم ساتھ رہو گی تو میری وجہ سے پپّو کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"آپ پپّو کی محبت کا واسطہ دے کر مجھے خوفزدہ نہ کریں۔ اتنا تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ پپّو آپ کے سائے میں رہے گا تو اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ کیا آپ مجھے اتنی بے حس اور بے مروت سمجھتے ہیں کہ میں آپ کی بیماری اور مصیبت کے وقت آپ کا ساتھ چھوڑ دوں گی؟"

"میں جانتا ہوں کہ تم مجھے دل و جان سے چاہتی ہو۔ تم میرا ساتھ نہیں چھوڑو گی مگر میں کس دن، کس لمحے تمہارا ساتھ چھوڑ جاؤں گا، یہ میں خود نہیں جانتا کیونکہ دشمن سرحد پار کرنے والے ہیں۔ میں ان کے دیس تک اُن کا پیچھا کروں گا اور اُن کے گھروں میں گھس کر عبرتناک سزا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے، آپ جہاں جائیں گے، میں آپ کے راستے کی دیوار نہیں بنوں گی لیکن میرے کہنے سے آپ کو دو چار روز تک دشمنوں کا خیال چھوڑنا ہو گا۔ آپ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ آپ خطرناک دشمنوں کے پیچھے ایک طویل سفر کر سکیں۔ میں آپ کی ضرورت کی دوائیں مہیا کروں گی۔ صبح و شام آپ کے بدن کی مالش کروں گی۔ جب آپ پوری طرح صحت یاب ہو جائیں گے تو پھر میں آپ کے راستے سے ہٹ جاؤں گی۔"

میں اس کی محبت اور خدمت کے جذبوں سے متاثر ہوا۔ بھلا ایسی وفادار حسین عورت کا دل کون توڑ سکتا ہے؟ میں نے اس کے مشورے کو تسلیم کر لیا۔

وہ پپّو کو گود میں لے کر باہر آگئی۔ میں نے پہلے کی طرح روبی کے کمرے کو لاک کر دیا اور فرزانہ کے ساتھ اس کے کوارٹر میں آگیا۔ اس دوران میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کہاں پناہ لینا چاہیے؟ میں اپنی کوٹھی میں واپس نہیں جا سکتا تھا۔ وہاں انٹیلی جنس والے پہنچ جاتے۔ اب میں ان لوگوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ شبیر حسن، شیتل اور بلیک گائیڈ کی منزل کا پتہ چلے گا تو میں ٹیلیفون کے ذریعے انٹیلی جنس کے کسی افسر کو اطلاع دے دوں گا۔ میں ان سے دُور رہ کر بھی اپنا فرض پورا کر سکتا تھا۔

فرزانہ نے ایک سوٹ کیس میں اپنے کپڑے رکھتے ہوئے کہا۔

"ہم اپنے ساتھ سوٹ کیس اور ضرورت کا دوسرا سامان لے جائیں گے اور کسی محلے میں کرائے کا مکان لے کر رہیں گے۔"

میں نے کہا "یہ اچھا مشورہ ہے لیکن کرائے کا مکان تلاش کرنا ہو گا۔ پتہ نہیں کتنے دنوں کی تلاش کے بعد مکان ملے۔ ابھی تو ہمیں فوراً ہی سر چھپانے کی جگہ چاہیے۔ بہتر ہے کہ ہم کسی اچھے سے ہوٹل میں جا کر رہیں۔ وہاں میں تمام دن کمرے میں رہوں گا۔ کوئی مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔ تمہارے لیے یہ مناسب ہو گا کہ اپنا سامان اسی کوارٹر میں رہنے دو۔ صرف پہننے کے لیے چند جوڑے رکھ لو۔ میرے لیے یہ مشکل ہے کہ بس یہی ایک جوڑا کپڑے میرے بدن پر ہیں۔ اگر ایک جوڑا کہیں سے مجھے پہننے کو مل جاتا تو ......"

فرزانہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "میرے پاس پپّو کے ابّا کے چند جوڑے رکھے ہوئے ہیں۔ اُن کی بھی جسامت آپ ہی کی طرح تھی۔ آپ ان لباسوں کو پہن کر دیکھیں، شاید آپ کے کام آجائیں۔"

وہ الماری کے پاس گئی، اسے کھول کر کپڑے نکالے، پھر انہیں میرے سامنے بستر پر رکھتی ہوئی بولی "اگر آپ کو پسند آجائیں تو یہ آپ کے لیے ہیں۔"

میں ایک پتلون اور شرٹ اٹھا کر غسل خانے میں لباس بدلنے چلا گیا۔ وہ باتھ روم کے بند دروازے کو دیکھ رہی تھی اور میرے ہی متعلق سوچ رہی تھی۔ جب میں لباس بدل کر باہر آیا تو وہ مجھے ایسے دیکھنے لگی جیسے اس کا برسوں کا بچھڑا ہوا خاوند دوبارہ زندہ ہو کر چلا آیا ہو۔

وہ لباس میرے بدن پر پورا اترا تھا اور میں فرزانہ کے حسنِ معیار پر پورا اتر رہا تھا۔ وہ بے اختیار میری جانب کھنچی چلی آئی۔ پہلے تو وہ میرے جسم پر سجے ہوئے اپنے خاوند کے لباس کو ہتھیلیوں سے سہلا کر دیکھتی رہی، ان مسرور کن لمحات کو یاد کرتی رہی جو اس گزر جانے والے کے ساتھ گزر چکے تھے۔ پھر اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ اس کے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر آگئے۔ اس کے بعد وہ دھڑکتے دل سے سوچنے لگی۔

"یہ جو میرے سامنے ہے اور جس کے چٹانی سینے پر میرا سر رکھا ہوا ہے یہی میرے سپنوں کا شہزادہ ہے۔ میں کیا کروں؟ اس کے قریب آتی ہوں تو سنبھل نہیں پاتی، اس کے بازوؤں میں آکر اک دم سے ٹوٹ جانے کو دل چاہتا ہے۔"

وہ سوچ رہی تھی میں سُن رہا تھا اور اپنے سینے پر اس کے دل کی دھڑکنوں کو محسوس کر رہا تھا۔ ایسے وقت سچ مچ سنبھلنے کو جی نہیں چاہتا، بہکنے میں جو لطف آتا ہے اسے صرف بہکنے والے ہی جانتے ہیں۔

لیکن میری بیماری اور کمزوری آڑے آگئی۔ میں نے سوچا اگر میں ان رنگین لمحات میں گم ہو گیا تو دشمن مجھے تلاش کر لیں گے۔ دانشمندی یہی تھی کہ میں جلد سے جلد ہسپتال کے احاطے سے نکل کر کہیں دُور چلا جاؤں۔

اسی وقت اذان کی آواز سُنائی دی۔ عورت خواہ کتنی ہی جذبات میں بہک جائے لیکن اس میں اتنی مشرقیت ہوتی ہے کہ فوراً ہی سنبھل کر آنچل سر پر رکھ لیتی ہے۔ فرزانہ بھی چونک کر مجھ سے یوں الگ ہو گئی جیسے اک دم سے اندھیرے سے اُجالے میں آگئی ہو۔ اس نے سر پر آنچل رکھا تو میں بھی سنبھل گیا۔

میں نے کہا "صبح ہو رہی ہے، ہمیں وقت برباد نہیں کرنا چاہیے۔ سناٹا اندھیرے ہی یہاں سے نکل چلو۔ ہمیں یہاں سے جاتے ہوئے کوئی دیکھ نہیں سکے گا۔"

میری بات سُن کر اس نے پپّو کو گود میں اٹھا لیا۔ میں نے سوٹ کیس کو سنبھالا۔ پھر ہم دونوں کوارٹر کو لاک کر کے تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہسپتال کی عمارت سے باہر آگئے۔ خوش قسمتی سے ہمیں فوراً ہی ایک ٹیکسی مل گئی۔ ہم اس میں بیٹھ کر ہوٹل انٹرنیشنل تک پہنچ گئے۔ میرے پاس کیش نہیں تھا لیکن فرزانہ اپنی تمام نقدی اور زیورات لے آئی تھی۔ اس نے ٹیکسی کا بل ادا کیا اور اسی نے ہوٹل کا کمرہ کرائے پر لیا۔ یہ بات میرے مزاج کے خلاف تھی کہ کوئی عورت میرے اخراجات برداشت کرے۔ بحالتِ مجبوری وقتی طور پر میں نے اسے برداشت کر لیا لیکن یہ سوچ لیا کہ فوراً ہی اپنے پیسوں کا انتظام کرنا چاہیے۔ اس کے لیے مجھے تنہائی کی ضرورت تھی تاکہ میں اپنے علم کے ذریعے اپنی ضرورت کے مطابق ایک معقول رقم طلب کر سکوں۔

مگر مجھے فوراً ہی تنہائی نصیب نہ ہوئی کیونکہ پپّو نیند سے بیدار ہو گیا تھا۔ پھر یہ کہ میں فرزانہ پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں خیال خوانی کے علم سے واقف ہوں۔ میں تھوڑی دیر تک پپّو سے باتیں کرتا رہا پھر میں نے فرزانہ سے کہا۔

"ہم دونوں تمام رات جاگتے رہے ہیں ہمیں کچھ دیر کے لیے سونا چاہیے لیکن اگر ہم سو جائیں گے تو پپّو تنہا اس کمرے میں کیسے وقت گزارے گا؟"

فرزانہ نے جواب دیا۔

"جب میں صبح ڈیوٹی پر جاتی ہوں تو ہسپتال کی دوسری نرسیں پپّو کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ آج میں ڈیوٹی پر نہیں جاؤں گی، ایک ہفتے کی چھٹی کی درخواست دے کر آجاؤں گی اور پپّو کو ساتھ لیجا کر روبی کے پاس چھوڑ آؤں گی کیونکہ میں بھی تھوڑی دیر کے لیے سونا چاہتی ہوں۔"

میں نے دل میں سوچا یہ اچھی بات ہے فرزانہ تھوڑی دیر کے لیے پپّو کو لیکر یہاں سے چلی جائے گی تو مجھے تنہائی مل جائے گی۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم پپّو کو ساتھ لیجاؤ اور دروازے کو باہر سے لاک کرتی جاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری واپسی تک مجھے نیند آجائے۔"

وہ پپّو کو لیکر جلد ہی واپس آنے کا وعدہ کرتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ باہر سے دروازہ لاک ہونے کی آواز آئی تو میں نے اطمینان کی سانس لی پھر فوم کے ملائم بستر پر شمال کی جانب رُخ کر کے پلتھی مار کر بیٹھ گیا اور مراقبے میں چلا گیا۔

میں نے مراقبے میں سب سے پہلے بلیک گائیڈ کی سوچ سے رابطہ قائم کیا۔ وہ شبیر حسن کے ساتھ کسی کمرے کے آرام دہ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت شبیر حسن، بلیک گائیڈ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی باتیں بلیک گائیڈ کا ذہن قبول کر رہا تھا اور میں بلیک گائیڈ کے ذہن سے ان باتوں کو سُن رہا تھا۔

شبیر حسن کہہ رہا تھا "میں کب تک آنکھوں پر پٹی باندھے بیٹھا رہوں گا۔ اب تو خدا کے لیے یہ پٹی کھول دو۔"

بلیک گائیڈ نے جواب دیا "پٹی میری آنکھوں پر بھی بندھی ہوئی ہے۔ اگر ہم دونوں کی آنکھوں سے یہ پٹی کھل جائے تو پھر ہم کھلی ہوئی آنکھوں سے اس کمرے کے ماحول کو دیکھیں گے۔ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھوں کے ذریعے ہمارا ذہن ہمیں سمجھاتا ہے کہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں۔ ہم ذہن کو اس سوچ سے نہیں روک سکیں گے کہ یہ بلور رنگ کے صوفے ہیں، کھڑکیوں پر آسمانی رنگ کے پردے ہیں اور کھڑکی کے سامنے سے فلاں شاہراہ گزرتی ہوئی فلاں جگہ جاتی ہے۔ جب ہم یہ سوچیں گے تو دُور انجانی جگہ پر بیٹھا ہوا ہمارا دشمن فرہاد ہماری سوچ کو پڑھ لے گا اور فلاں شاہراہ تک پہنچ جائے گا۔ ان کھڑکیوں کو تلاش کرے گا جن پر آسمانی

رنگ کے پردے پڑے ہیں۔ اس طرح وہ اس کمرے میں آکر ہماری شہ رگ تک پہنچ جائے گا۔ بائی گاڈ! میں نے اتنا خطرناک دشمن نہ دیکھا نہ سُنا جو ہمارے دماغ کے اندر گھس کر ہمیں تلاش کر لیتا ہے لہٰذا دانش مندی یہی ہے کہ ہماری آنکھوں پر پٹی بندھی رہے۔ یہ درست ہے کہ میں وقتی طور پر اندھا ہو چکا ہوں مگر یہ اندھا پن مجھے اس خطرناک دشمن سے محفوظ رکھے گا۔"

بلیک گائیڈ کی باتیں سُن کر یہ بات سمجھ میں آگئی کہ وہ اب بہت زیادہ محتاط ہو گیا ہے اور شیتل جب تک اسے سرحد پار نہیں لے جائے وہ اپنی آنکھوں سے پٹی نہیں ہٹائے گا۔

مجھے اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹانے کے لیے اس کے دماغ میں ہلچل مچانے کی ضرورت تھی لیکن اس سلسلے میں، میں نے جلد بازی نہیں کی کیونکہ شام تک کا وقت تھا جب تک کہ اندھیرا نہ پھیلتا وہ اپنی خفیہ پناہ گاہ سے باہر نہ نکلتے۔ فی الحال میں نے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا اور اپنی پھوپھی کے ذہن میں جھانکنے لگا۔

اس وقت پھوپھی کچن میں ناشتہ تیار کر رہی تھیں اور میرے ہی متعلق سوچ رہی تھیں کیونکہ میں کئی دن سے غیر حاضر تھا۔ انھوں نے ہسپتال آکر مجھ سے ملنے کی کوشش کی تھی لیکن انھیں انٹیلی جنس والوں سے اجازت نہیں ملی تھی۔ اب تو میں ہسپتال سے بھی نکل آیا تھا۔ میں نے ان کے ذہن پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

"پھوپھی جان! میں ہوں فرہاد......!"

وہ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ میری سوچ نے کہا۔

"کیا آپ بھول گئیں کہ میں خیال خوانی جانتا ہوں۔ ایک بار میں نے سوچ کے ذریعے آپ سے رابطہ قائم کیا تھا، اس وقت بھی میں آپ سے مخاطب ہوں۔"

پھوپھی نے سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں۔ ہاں بیٹے میں سب جانتی ہوں۔ پتہ نہیں تم کیسی اُلٹی سیدھی مشقیں کرتے رہتے ہو مگر خدا کا شکر ہے کہ اس علم کے ذریعے تم سے رابطہ تو قائم ہوا۔ میں تمھارے لیے بہت پریشان ہوں، بتاؤ میں تم سے کیسے مل سکتی ہوں؟"

میں نے جواب دیا "میں بھی اس اُلجھن میں مبتلا ہوں کہ آپ سے کیسے ملاقات کروں کیونکہ پولیس والوں سے اور دوسرے دشمنوں سے بچنے کے لیے ایک ہوٹل کے کمرے میں چھُپا ہوا ہوں۔ اس کمرے تک آپ کا آنا مناسب نہیں ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ پولیس کا کوئی آدمی آپ کی نگرانی کر رہا ہو اس طرح وہ آپ کے ذریعے مجھ تک پہنچ جائے گا۔"

"بیٹے! یہ تم کیا کرتے رہتے ہو خواہ مخواہ لوگوں کو اپنا دشمن کیوں بنا رہے ہو؟ کیا دوسروں کی طرح ایک پُرسکون گھریلو زندگی نہیں گذار سکتے ہو؟"

"پھوپھی جان! میرے پاؤں میں چکر ہے۔ میں ایک جگہ ٹھہر نہیں سکتا۔ خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ وقت کی طرح بہتا چلا جاؤں اس طرح نت نئی مصیبتوں کا سامنا ضرور ہوتا ہے لیکن یہی ہنگامی زندگی مجھے پسند ہے۔ آپ نہیں جانتیں کہ اس طرح میں اپنے ملک اور قوم کی خدمت کر رہا ہوں اور کتنے ہی مجبوروں اور بیکسوں کے کام آتا رہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی اسی جدوجہد میں گذر جائے۔ اس وقت میں نے آپ سے اس لیے رابطہ قائم کیا ہے کہ مجھے دس ہزار روپوں کی ضرورت ہے۔ آپ ابھی دس ہزار لے کر فوراً ہی ہسپتال پہنچ جائیں، وہاں فرزانہ نام کی ایک نرس سے ملاقات ہو گی، اسے وہ روپے دے کر صرف اتنا کہہ دیں کہ یہ فرہاد علی کی امانت ہیں، پھر وہ روپے مجھے مل جائیں گے۔ آپ اس سلسلے میں دیر نہ کریں ورنہ فرزانہ ہسپتال سے نکل جائے گی۔"

پھوپھی نے مجھے یقین دلایا کہ ابھی وہ میری مطلوبہ رقم لے کر ہسپتال جا رہی ہیں۔ میں نے مطمئن ہو کر مراقبہ توڑ دیا پھر آرام سے بستر پر لیٹ کر ہاتھ پاؤں سیدھے کیے، اس کے بعد آنکھیں بند کر کے اپنے لاشعور کو تاکید کی کہ ٹھیک بارہ بجے میری آنکھ کھُل جائے۔

اس کے بعد میں گہری نیند سوتا رہا۔ مجھے پتہ نہیں کہ فرزانہ کب واپس آئی، مجھے گہری نیند سوتے دیکھ کر وہ بھی بستر پر آکر سو گئی۔

میرے دماغ نے ٹھیک بارہ بجے مجھے بیدار کر دیا۔ میں نے کروٹ بدل کر دیکھا، وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کا دوپٹہ سرہانے رکھا ہوا تھا۔ وہ سیدھی لیٹی ہوئی سو رہی تھی اور اس کے بدن کے نشیب و فراز جاگ رہے تھے۔ اس کے جسم کو اب تک میں نے جاگتی ہوئی حالت میں دیکھا تھا لیکن خوابیدہ حُسن نے اسے اور پُرکشش بنا دیا تھا۔ دل بے اختیار اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر تک سر سے پاؤں تک نگاہوں کی انگلیوں سے اسے ٹٹولتا رہا

اس نے درست کہا تھا کہ اس نے اپنے خاوند کے ساتھ سہاگ کی صرف چند گھڑیاں گذاری تھیں، اس کے بعد وہ ان رنگین لمحات سے ایک طویل عرصے تک محروم رہی تھی۔

وہ پھُول کی طرح کھلی ضرور تھی مگر ادھ کھلی تھی۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ اگر تشنگی باقی رہے اور اپنے من کے مطابق اور اپنی آرزوؤں کے مطابق جذبات کی تکمیل نہ ہو تو عورت کی عمر ایک جگہ ٹھہر جاتی ہے۔

میں نے اس ٹھہرے ہوئے پانی کی سطح پر ہلچل مچا دی۔ میری سانسوں کی تپش نے اسے بیدار کر دیا۔ چونکہ وہ نیند سے بیدار ہوئی تھی اس لیے فوراً ہی سمجھ نہ سکی کہ کہاں ہے؟ اور کس حال میں ہے؟ اس کی کٹوراسی آنکھیں کچھ سمجھنے اور نہ سمجھنے کے دوران پھیلی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں اتنی کشش تھی کہ میں بے اختیار ہو گیا ۔۔۔ تب اسے ہوش آگیا ذرا دیر کے لیے وہ بھُول گئی تھی کہ ابھی میں ہسپتال سے آیا ہوں اور مجھے پوری طرح صحت یاب

ہونے کی ضرورت ہے۔ وہ بے خودی میں بھکتی رہی اور مجھے بہکاتی رہی۔ جب میں نے مزید آگے بڑھنا چاہا تو اچانک ہی اس کے اندر کی نرس بیدار ہو گئی۔

اس نے جلدی سے کروٹ بدل کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں فرہاد! بس آگے نہ بڑھو، میں تمھاری ہوں کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی ہوں۔ پہلے میں تمھارے لیے صرف ایک نرس بن کر رہوں گی، اس کے بعد تمھاری محبوبہ بنوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ بستر سے اٹھی پھر تیزی سے باتھ روم میں جا کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد شاور سے پانی گرنے کی آواز سُنائی دی وہ آگ کو پانی سے بجھا رہی تھی۔

ایک گھنٹے کے بعد میں بھی غسل سے فارغ ہو کر اس کے ساتھ ناشتہ کر رہا تھا۔ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ میری پھوپھی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ دس ہزار روپے لے کر آئی ہے اور میری ضرورت کی تمام دوائیں بھی خرید کر لائی ہے۔ ہلکا سا ناشتہ کرنے کے بعد میں قمیض اتار کر پھر بستر پر لیٹ گیا۔ اور وہ دوا نکال کر میرے بدن پر مالش کرنے لگی! اس طرح اس نے صبح شام میرے بدن کی مالش کی۔ ایسے وقت ہم دونوں ہی سخت آزمائشوں سے گذرتے رہے لیکن وہ بہت سمجھدار تھی، اس نے صرف میری صحت یابی کو اپنا مقصد بنا رکھا تھا اس لیے وہ بہکتے بہکتے بھی سنبھل جاتی تھی اور مجھے بھی سنبھلنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

شام ہونے لگی تو میں نے اپنی ضرورت کا کچھ سامان لانے کے لیے اسے باہر بھیج دیا۔ جب وہ شاپنگ کے لیے چلی گئی تو تنہائی ملتے ہی میں نے پھر مراقبہ کیا۔

میرا رابطہ بلیک گائیڈ سے تھا۔ اس وقت بلیک گائیڈ شیتل کا انتظار کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔

"پتہ نہیں کم بخت کہاں چلا گیا؟ اتنا تو مجھے یقین ہے کہ وہ یہاں سے نکلنے کے انتظامات میں مصروف ہے۔ اب وہ آئے گا تو میرے ہاتھ کی انگلیوں پر اپنے ہاتھوں کی انگلیاں رکھ کر انگلیوں کی اشاراتی زبان میں بتائے گا کہ ہمیں کب اور کس طرح سرحد پار کرنا ہے۔ اس کی اشاراتی زبان کو میرا ذہن سمجھتا ہے گا اور اس طرح وہ کم بخت فرہاد میرے فرار کے تمام منصوبوں تک پہنچ جائے گا۔ نہیں، مجھے اس سلسلے میں بھی بہت زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔ جب شیتل آئے گا تو میں انگلیوں کے اشارے سے اسے سمجھا دوں گا کہ وہ فرار ہونے کا کوئی بھی منصوبہ میرے علم میں نہ لائے۔ مجھے جہاں لیجانا چاہتا ہے، جس راستے سے لیجانا چاہتا ہے، چُپ چاپ لیجائے۔ کیا مصیبت ہے میری زندگی کا ایک لمحہ بھی سکون سے نہیں گذر رہا ہے۔ میں کوئی خاص بات سوچنا چاہوں تو نہیں سوچ سکتا مگر ایسا ممکن تو نہیں ہے کہ فرہاد چوبیس گھنٹے میرے ذہن میں جھانکتا رہتا ہو۔ کبھی تو وہ سوتا ہو گا کبھی کھانے پینے کے دوران یا دوسروں سے گفتگو کرتے وقت میری طرف سے اس کی سوچ کا رابطہ ٹوٹ جاتا ہو گا۔ کاش کہ مجھے معلوم ہوتا کہ کس وقت وہ اپنی سوچ سے میرا رابطہ ختم کر دیتا ہے لیکن میں کیسے معلوم کر سکتا ہوں؟"

وہ میرے متعلق معلومات حاصل کرنے کے سلسلے میں سوچنے لگا۔ اس نے شبیر حسن سے پوچھا۔

"کیا آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ فرہاد ہسپتال سے فرار ہونے کے بعد کہاں جا سکتا ہے؟"

شبیر حسن نے جواب دیا۔

"گلبرگ کی جس کوٹھی میں وہ رہتا تھا وہاں تمھارے شیتل نے ایک بار اس پر حملہ کیا تھا وہ اتنا چالاک ہے کہ دوبارہ اس کوٹھی کی طرف نہیں جائیگا۔"

بلیک گائیڈ نے کہا۔

"تم کہتے ہو کہ وہ اچھی طرح چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا، اسے مزید تیمارداری کی ضرورت تھی، کیا وہ کسی کی مدد کے بغیر اس کمرے سے نکل سکتا تھا؟ اگر نہیں تو سوچ کر بتاؤ کہ ہسپتال میں کون ایسا ہے جو اس کا ساتھ دے سکتا ہے؟"

"ہاں، مجھے یاد آیا ہسپتال میں ایک نرس ہے جس کے بچے کو تم اٹھا کر لے آئے تھے، وہ فرہاد کی احسان مند ہے کیونکہ اسی نے اس بچے کو تم سے چھین کر اس کی گود تک پہنچایا، وہی اس کی مدد کر سکتی ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی بلیک گائیڈ کے خیال سے پتہ چلا کہ شیتل وہاں آگیا ہے۔ بلیک گائیڈ انگلیوں کے اشاروں سے اسے سمجھانے لگا۔

"دیکھو شیتل تم نے فرار کا جو بھی منصوبہ بنایا ہے، اسے میرے علم میں نہ لاؤ۔ میں تمھیں سمجھا چکا ہوں کہ ہمارا دشمن بہت ہی خطرناک ہے۔ وہ ہمارے تمام منصوبوں تک پہنچ جاتا ہے۔ صرف تم ہی ایسے ہو کہ وہ تمھارے خیال تک نہیں پہنچ سکتا۔ تم مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ آج کی رات ہم فرار ہونے میں کامیاب ہو سکتے ہیں یا نہیں ہے؟"

اس کے جواب میں شیتل نے اشاروں سے بتایا کہ آج رات سرحد پار کرنا ناممکن ہے، اس کی وجہ میں نہیں بتا سکتا۔ بتاؤں گا تو تمھارے کہنے کے مطابق فرہاد میری لائن آف ایکشن کو سمجھ جائے گا۔

بلیک گائیڈ نے خوش ہو کر کہا۔

"شاباش! تم بہت سمجھدار ہو، اسی طرح محتاط ہو کر کام کرو۔ اب میں تمھیں فرہاد تک پہنچنے کا طریقہ بتاتا ہوں، اسے پوری توجہ سے ذہن نشین کرو۔ تمھیں وہ بچہ یاد ہو گا جسے میں ہسپتال کے ایک کوارٹر سے اٹھا کر لایا تھا۔ تم نے اس بچے کو بھی دیکھا ہے اور اس نرس کو بھی پہچانتے ہو۔ تم ابھی اپنے دو خاص آدمیوں کو لے کر جاؤ۔ تم نہیں بول سکتے مگر تمھارے آدمی بولیں گے اور ہسپتال پہنچ کر اس نرس کے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔ وہ یا اس کا بچہ جہاں بھی ملے ان سے فرہاد کا پتہ معلوم کرو۔ اگر وہ نرس بتانے سے انکار کرے تو اسے یرغمال کے طور پر ساتھ لے آؤ۔ جاؤ ابھی جاؤ، میں دیکھوں گا کہ فرہاد کتنے پانی میں چھپا ہوا ہے۔"

اتنا سمجھا کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی سوچ نے بتایا کہ شیتل وہاں سے جا چکا ہے۔ میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اب ایک ایسا شخص میری تلاش میں نکلا تھا جس کے خیالات کو میں نہیں پڑھ سکتا تھا۔ میں بالکل اندھیرے میں تھا۔ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ اپنے کن ساتھیوں کو لے کر فرزانہ اور پتو کو تلاش کرے گا۔ وہ گونگا اپنے ساتھیوں سے گونگے اشاروں میں بات کرے گا۔ چونکہ اس کے ساتھی زبان سے گفتگو نہیں کریں گے اس لیے میں ان کی گفتگو کے لہجے تک نہیں پہنچ سکوں گا۔ اس وقت وہ تینوں میرے لیے اندھیرے کے تیر تھے۔ کہیں سے بھی سنسناتے ہوئے آسکتے تھے۔

مجھ پر ایک اضطراری سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اگر یہ یقین ہو جائے کہ موت آرہی ہے لیکن یہ پتہ نہ چلے کہ کس سمت سے آرہی ہے تو ایسی صورت میں بوکھلاہٹ میں مبتلا ہو جانا لازمی ہے میں بستر سے اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ غلطی یہ تھی کہ میں پریشانی میں اُلجھ کر ذہنی یکسوئی سے کام لینا بھول گیا تھا۔ میں فوراً ہی بستر پر آکر پلتھی مار کر بیٹھ گیا، پھر میں نے ایک گہری سانس کھینچ کر ان سانسوں کو اپنے سینے میں جمع کر لیا اور آنکھیں بند کر کے مراقبے میں چلا گیا۔ اب میرے آس پاس خیالات کا انتشار نہیں تھا۔ میری پوری توجہ صرف ایک خیال پر مرکوز ہو گئی کہ دشمن کسے چارہ بنا کر مجھ تک پہنچنا چاہتا ہے؟

وہ فرزانہ ہی تھی جسے وہ مہرے کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے لہٰذا میں نے فرزانہ سے دماغی رابطہ قائم کیا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ابھی وہ کہاں ہے؟ اور کیا کر رہی ہے؟

وہ ہسپتال کی طرف جا رہی تھی اور سوچتی جا رہی تھی کہ اس نے میرے سائز کے مطابق ایک سوٹ اور جوتے خرید لیے ہیں، اب وہ ہسپتال پتو کو لینے جا رہی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اب ہسپتال کی طرف جائے اور شیتل کی نظروں میں آئے۔ لہٰذا میں نے اس کی منفی سوچ میں کہا۔

"میں ہسپتال نہیں جاؤں گی۔"

اس کی مثبت سوچ نے کہا "واہ کیوں نہیں جاؤں گی۔ صبح سے پتو وہاں ہے شام کو تو اسے لے آنا چاہیے۔"

میں نے اس کی منفی سوچ میں کہا "اگر پتو آج رات بھی کسی نرس کے پاس رہ جائے تو کیا حرج ہے۔ ہوٹل کے کمرے میں صرف میں رہوں گی اور وہ رہیں گے۔ ایسی رات میری زندگی میں مدتوں سے نہیں آئی کیا مجھے اس موقعے سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے؟ ایک رات کی تو بات ہے، پتو مجھے چھوڑ کر اپنی کسی بھی نرس آنٹی کے پاس رہنے کا عادی ہے اس کی مجھے فکر نہیں کرنی چاہیے۔"

میں نے منفی سوچ کے ذریعے اسے بہکا دیا۔ وہ جوان تھی، اپنے سینے میں جذبات کا سمندر چھپائے اوپر سے شانت رہتی تھی۔ میں نے اس سمندر میں طوفان اٹھا دیا لیکن بہکنے کے باوجود اس کی سوچ نے کہا۔

"اچھی بات ہے میں پتو کو آج رات کسی نرس کے پاس چھوڑ دوں گی لیکن اس کے لیے بھی مجھے ہسپتال جانا ہوگا۔ جس نرس کی ڈیوٹی نہیں ہوگی اس سے کہنا ہوگا کہ وہ آج رات پتو کو اپنے پاس رکھ لے۔"

یہ سوچتے ہی وہ ہسپتال کی طرف بڑھتی گئی۔ میں پھر اُلجھ کر رہ گیا۔ اس نے معقول بات کہی تھی کہ پتو یہاں نہ آئے تب بھی اس کے رات گذارنے کا انتظام کرنے کے لیے ہسپتال جانا ضروری ہے۔ میرے جی میں آیا کہ میں براہِ راست سوچ کے ذریعے اسے مخاطب کروں لیکن مشکل یہ تھی کہ میں نے اب تک اس کے سامنے اپنی خیال خوانی کی صلاحیتوں کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اگر میں اسے مخاطب کرتا تو وہ بوکھلا کر رہ جاتی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ بھلا سوچ کے ذریعے میں اسے کیسے مخاطب کر سکتا ہوں؟

میں تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر مجھے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ فرزانہ کو اگر میں کسی طرح ہسپتال جانے سے روک بھی دوں تو پتو کو بھی وہاں نہیں رہنا چاہیے کیونکہ شیتل پتو کو بھی اچھی طرح پہچانتا ہے۔

اب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ مجھے فرزانہ کو نہیں بہکانا چاہیے تھا کہ وہ پتو کو وہاں چھوڑ کر میرے پاس رات گذارنے چلی آئے۔ میں نے پھر اس کے خیالات کو بدلنے کی کوشش کی۔ اب میں نے اس کی مثبت سوچ میں کہا۔

"پتو کو ہسپتال میں چھوڑنا مناسب نہیں ہوگا۔ میں تو یہ بھول ہی گئی تھی کہ فرہاد کے دشمن اسے ہسپتال کے آس پاس تلاش کر رہے ہوں گے۔ وہ دشمن پتو کو بھی پہچانتے ہیں۔ نہیں میں پتو کو وہاں نہیں چھوڑوں گی اپنے ساتھ لے آؤں گی۔"

وہ میرے مثبت خیال سے قائل ہو گئی۔ میں جو اسے ہسپتال کی طرف جانے سے روک رہا تھا اب نہیں روک سکتا تھا۔ پتو کو وہاں سے لانا بہت ضروری تھا۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں؟ دشمنوں سے اس کا سامنا ہونے والا تھا اور وہ ایسے دشمن تھے جن کے دماغ کی تہہ تک میں نہیں پہنچ سکتا تھا! اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں کس طرح لاعلمی کے اندھیرے میں بند ہو گیا ہوں؟

اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور وقت کا انتظار کرنے لگا کہ دیکھیں دشمن فرزانہ سے کس طرح رابطہ قائم کرتے ہیں۔ جب وہ فرزانہ کے سامنے آئیں گے تو میں فرزانہ کی سوچ کے ذریعے ان کے دماغ تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔

میں خاموشی سے وقت کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت میری یہ حالت تھی کہ میں اپنے ماحول کا جائزہ بھی لیتا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد فرزانہ کے دماغ میں بھی جھانک کر دیکھتا تھا۔ میں ہوٹل کے اس کمرے کے دروازے اور کھڑکیوں کو دیکھ رہا تھا۔ کھڑکیوں میں جالیاں لگی تھیں۔ ایک عام آدمی انھیں توڑ کر اندر نہیں آسکتا تھا لیکن شیتل کے جسم میں تو شیطانی قوتیں بھری ہوئی تھیں بظاہر گوشت پوست کا انسان تھا لیکن اس کے حملوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ فولاد کا بنا ہوا ہے۔ ایک بار وہ میری خوابگاہ کے مقفل دروازے توڑ کر اندر چلا آیا تھا۔ وہ اس کمرے کے دروازے کو بھی توڑ سکتا تھا اور جالیوں کو کھڑکیوں سے نوچ کر پھینک سکتا تھا۔ میں نے سوچا کیا میں اس فولادی انسان سے مقابلہ کرنے کے قابل ہو گیا ہوں؟

میں تنہائی میں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی قوتوں کو آزمانے لگا۔ میں نے یوگا کی ایک مشق کے مطابق سانسیں کھینچ کھینچ کر اپنے سینے میں جمع کر لیں اور پھر سانسیں لینا بند کر دیں۔ پھر اپنی مٹھیوں کو سختی سے بھینچنے اور کھولنے لگا۔ اپنے جسم کو کتنے ہی زاویوں سے توڑنے اور موڑنے لگا۔ اپنے ہاتھوں کو شانے کی بلندی کی سیدھ میں لا کر اور ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر دوسرے پاؤں کو شانے کی بلندی تک کِک مارنے کے انداز میں اُچھالنے لگا۔

میں مکمل ایک منٹ تک سانس روکے مختلف مشقوں سے گذرتا رہا پھر میری قوتِ برداشت جواب دے گئی اس لیے میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اپنی بیماری کے بعد میں پہلی بار ان مشقوں سے گذرا تھا اس لیے بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ تھکن بھی محسوس ہو رہی تھی جی چاہتا تھا بستر پر گر پڑوں۔ لیکن وہ گرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں اپنے پاؤں پر کھڑا رہا۔ اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہا پھر میری سانسیں اعتدال پر آگئیں۔

جب میں تازہ دم ہو گیا تو پھر دوبارہ سانسیں روک کر مختلف مشقوں سے گذرنے لگا۔ اس بار میں نے بستر سے تکیہ اٹھا کر اپنے سامنے سے پشت کی جانب اُچھالا۔ تکیہ چھت کی طرف گیا اور واپس میری پشت کی طرف آنے لگا۔ میں نے بائیں ٹانگ اٹھا کر پشت کی جانب تکیے کو ایک کِک ماری۔ تکیہ پھر اچھل کر اوپر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ نیچے آتا میں نے پھرتی سے گھوم کر دوسری لات چلائی۔ یہ فٹ بال کی طرح کی ٹھوکر نہیں تھی بلکہ کنگ فو کے اصول کے مطابق اپنی ٹانگوں کو اپنے شانوں کی بلندی تک اٹھانا لازمی ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد پھر میری سانس ٹوٹ گئی اور میں تھک کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ ان مشقوں سے اندازہ ہو گیا کہ میں اندر سے کمزور نہیں ہوں۔ چونکہ بیماری سے اٹھا ہوں اس لیے ہانپ جاتا ہوں اور ایک منٹ سے زیادہ سانسیں نہیں روک سکتا۔

مجھے اسی بات کا دُکھ تھا کہ اب میری سانسیں رُکنے کی مدت کم ہو گئی تھی اب سے پہلے میں تین یا چار منٹ تک سانسیں روک کر مشق کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ میں نے ضد پکڑ لی کہ ایک دو روز میں ہی صبح شام مشقیں کروں گا اور اپنے سابقہ ریکارڈ سے آگے نکل جاؤں گا۔

جب میری سانسیں اعتدال پر آگئیں تو پھر میں پلنگ پر آکر پلتھی مار کر بیٹھ گیا آنکھیں بند کیں اور مراقبے میں چلا گیا۔ میں نے دیکھا اس وقت فرزانہ نرسوں کے کوارٹر میں بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ پتو بھی تھا اسی وقت اس کی سہیلی روبی کمرے میں آئی اور فرزانہ کو دیکھ کر کہا۔

"تم یہاں بیٹھی ہو۔ وہاں ہسپتال کے باہر برآمدے میں کوئی شخص تمہارے فرہاد کو پوچھ رہا ہے۔ جب میں نے بتایا کہ ہمارا وہ مریض پچھلی رات سے لاپتہ ہے تو وہ تمھیں پوچھنے لگا۔ اسی لیے میں تمھیں تلاش کرتی یہاں تک آئی ہوں۔ تم جا کر اس سے ملاقات کرو، ہو سکتا ہے کہ وہ فرہاد کا کوئی بہت ہی قریبی عزیز ہو۔"

فرزانہ سوچنے لگی "وہ کون ہو سکتا ہے؟ اسے میرے کسی عزیز سے ملنا چاہیے یا نہیں؟" میں نے اس کی منفی سوچ میں کہا۔

"مجھے اس سے نہیں ملنا چاہیے۔"

اس کی مثبت سوچ نے کہا "کیوں نہیں ملنا چاہیے آخر نقصان ہی کیا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ کوئی فائدہ پہنچ جائے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی فرہاد کی پھوپھی کی طرح کوئی بڑی رقم لایا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو وہ رقم فرہاد کے ہی کام آئے گی مجھے ضرور جانا چاہیے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور روبی کے ساتھ ہسپتال کے برآمدے کی طرف جانے لگی۔ اس دوران میں نے اس کی منفی سوچ کے ذریعے کئی بار اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ یہ نہ سوچ سکی کہ واقعی میرے کسی دشمن کی طرف جا رہی ہے۔

وہ ہسپتال کے برآمدے تک پہنچ گئی۔ روبی کسی اجنبی سے کہہ رہی تھی "یہی فرزانہ ہے آپ فرہاد کو جو پیغام دینا چاہتے ہیں وہ پیغام اسے دے دیں۔" یہ کہہ کر روبی چلی گئی۔ تب میں نے اس اجنبی کی آواز سُنی۔ وہ فرزانہ سے مخاطب تھا۔ جب بھی ہم سے کوئی مخاطب ہوتا ہے تو اس کی آواز ہمارے دماغ کو چھوتی ہے اور ہمیں سمجھاتی ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ جب اس کی آواز فرزانہ کے دماغ تک پہنچی تو وہ آواز فرزانہ کے دماغ سے نشر ہو کر مجھ تک پہنچنے لگی۔

وہ اجنبی کہہ رہا تھا۔

"فرہاد کی پھوپھی نے مجھے یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا ہے کہ وہ ہسپتال واپس آگیا ہے یا نہیں۔ اس کی پھوپھی اچانک ہی بیمار پڑ گئی ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ اگر فرہاد سے ملاقات نہ ہو تو فرزانہ نام کی ایک نرس کو میرے پاس لے آنا۔ وہ فرہاد کے متعلق کوئی بہت ہی ضروری بات تم سے کہنا چاہتی ہیں۔"

فرزانہ سوچنے لگی کہ اسے اس اجنبی کے ساتھ جانا چاہیے یا نہیں، اب میں اسے اس اجنبی کے ساتھ جانے سے نہیں روکنا چاہتا تھا کیونکہ میں اس اجنبی کی آواز اور اس کے لہجے کے ذریعے اس کے دماغ میں بھی جھانکنے کے قابل ہو گیا تھا۔ میں نے فرزانہ کی سوچ میں کہا۔

"مجھے فرہاد کی پھوپھی کے پاس جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ فرہاد کے فائدے کی کوئی بات معلوم ہو جائے۔"

وہ اجنبی کے ساتھ ہسپتال کے کمپاؤنڈ سے باہر جانے لگی۔ اب میں نے فرزانہ کو چھوڑ دیا اور اس اجنبی کے دماغ میں جھانکنے لگا۔ وہ فرزانہ کو کنکھیوں سے دیکھتا جا رہا تھا اور سوچتا جا رہا تھا۔

"یہ تو ماہا حسین ہے۔ جوانی کیسی پھوٹی پڑ رہی ہے۔ اس بار اچھا مال

ہاتھ آیا ہے۔ اگر اس نے ہمارے سوالوں کا جواب دینے سے انکار کیا تو میں اسے اذیتیں دینے سے پہلے اس کی جوانی سے خوب فائدہ اٹھاؤں گا۔"

انسان کی سوچ اس کی کمزوری کو ظاہر کر دیتی ہے۔ اس کی کمزوری مجھے معلوم ہوگئی کہ وہ فرزانہ جیسی حسین اور جوان عورتوں کا رسیا ہے۔ وہ دونوں ایک کار کے پاس آئے۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک اور شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں کار کا دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ جب گاڑی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھنے لگی تو فرزانہ نے پوچھا۔

"ہمیں کتنی دور جانا ہے؟"

اجنبی نے جواب دیا۔ "زیادہ دور نہیں، گلبرگ کے آخری سرے میں فرہاد کی ایک کوٹھی ہے فرہاد کی پھوپھی وہاں رہتی ہے۔"

اس کے بعد کار میں خاموشی چھا گئی۔ اجنبی سوچ رہا تھا۔

"اگر اس لڑکی نے اس گونگے کے سوالوں کا معقول جواب نہ دیا تو وہ گونگا اسے اٹھا کر کہیں دوسری جگہ لیجائے گا! ایسی صورت میں، میں اس خوبصورت بلا سے محروم ہو جاؤں گا۔ مجھے کوئی ایسی چال چلنی چاہیے جس سے یہ حسینہ کم از کم ایک دن میرے پاس تنہا رہ جائے اور وہ گونگا بھی اعتراض نہ کرے۔ اس گونگے کو الٹی سیدھی طرح کچھ سمجھا کر فی الحال ٹالنا مناسب ہوگا۔"

میں اس کی سوچ کو پڑھ رہا تھا۔ وہ میری مرضی کے مطابق سوچ رہا تھا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ گونگا تھوڑی دیر کے لیے ٹل جائے اور میں اس اجنبی تک پہنچ جاؤں۔ ابھی وہ گلبرگ کے آخری سرے تک جا رہے تھے۔ اس دوران میں جلدی سے لباس تبدیل کر کے باہر نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

ہوٹل کا کمرہ لاک کرنے کے بعد میں باہر آگیا۔ لان میں پہنچ کر وہاں ایک کرسی پر بیٹھتے ہی میں نے اس اجنبی سے پھر ذہنی رابطہ قائم کیا۔ اس وقت فرزانہ کار سے اتر کر سی کوٹھی کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی سوچ میں کہا۔

"مجھے اس کوٹھی کا نمبر معلوم کرنا چاہیے۔"

یہ سوچتے ہی وہ کوٹھی کے گیٹ پر لکھا ہوا نمبر پڑھنے لگی۔ میں نے اس نمبر کو ذہن نشین کر لیا۔ اسی وقت ایک ٹیکسی ہوٹل کے احاطے میں آکر رکی۔ اس میں سے ایک شخص باہر آکر بل ادا کرنے لگا۔ میں نے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے گلبرگ لے چلو۔"

میں نے اسے کوٹھی کا نمبر بھی بتا دیا اس کے بعد خاموش بیٹھ کر کبھی فرزانہ کی سوچ کو اور کبھی اس اجنبی کی سوچ کو پڑھنے لگا۔

فرزانہ کوٹھی کے اندر داخل ہو کر چاروں طرف دیکھتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"فرہاد کی پھوپھی کہاں ہیں؟ یہاں تو کوئی نظر نہیں آ رہا ہے؟"

اجنبی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہاں ہم ہیں۔ کیا ہم تمھیں نظر نہیں آ رہے ہیں؟ تمھاری جیسی جوان عورت کو کسی بوڑھی پھوپھی کی نہیں، ہماری ضرورت ہے۔"

فرزانہ نے بگڑ کر کہا۔

"بکواس مت کرو۔ کیا تم مجھے یہاں دھوکے سے لائے ہو؟"

اجنبی نے جیب سے چاقو نکال کر کھولتے ہوئے کہا۔

"تم بہت دیر سے سمجھتی ہو لیکن یہ بات میں فوراً ہی سمجھا ہوں کہ اگر تم نے چیخنے چلانے کی کوشش کی تو اس چاقو سے تمھاری گردن پر چاقو پھیر دوں گا۔"

وہ سہم کر چاقو کی طرف دیکھنے لگی۔ اجنبی نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں بیٹھ جاؤ اور جو کچھ ہم تم سے پوچھیں اس کا صحیح جواب دو۔" وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اجنبی نے اس کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"فرہاد کہاں ہے؟"

اس نے جواب دیا۔

"میں کسی فرہاد کو نہیں جانتی۔"

اس اجنبی نے کہا۔

"تم سمجھتی ہو کہ ہم تمھیں قتل کرنے کے بعد خاموش بیٹھ جائیں گے؟ نہیں میری جان، تمھارے بعد تمھارے پتو کی باری آئے گی۔"

پتو کے نام پر اس کی ممتا بیدار ہو گئی۔ وہ سوچنے لگی کیا میں بیٹے کو بچانے کی خاطر اپنے محبوب کو دشمنوں کے حوالے کر سکتی ہوں؟ خدایا تو نے مجھے کس آزمائش میں مبتلا کر دیا؟ میں نے اس کی سوچ میں کہا۔ "مجھے ذرا حوصلے سے کام لینا چاہیے۔ یہ شخص مجھے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے مجھے اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ فی الحال میں جواب دینے کے لیے اس سے کچھ مہلت مانگوں گی۔ اگر یہ راضی ہو گیا تو مجھے کچھ اور باتیں سوچنے کا موقع مل جائے گا۔"

یہ سوچ کر وہ ایسی نظروں سے اجنبی کو دیکھنے لگی جیسے اپنی نگاہوں سے قتل کر رہی ہو۔ اجنبی نے چاقو کے تیز پھل کو چومتے ہوئے کہا۔

"جانِ من! میں تو چاقو سے ہلاک کرتا ہوں مگر تم تو ایک ہی نگاہ سے قتل کر دیتی ہو۔"

فرزانہ نے شرمانے کی ادائیں دکھائیں پھر ذرا اٹھلا کر بولی۔

"آپ اپنے ساتھی کے سامنے ایسی باتیں کر رہے ہیں کچھ تو خیال کیجیے۔"

اجنبی نے کہا۔

"واقعی میں احمق ہوں۔ میں نے یہ نہیں سوچا کہ عورت دوسروں کی موجودگی میں شرما جاتی ہے۔"

اس نے اپنے ساتھی سے کہا کہ وہ کمرے سے باہر چلا جائے۔

وہ باہر چلا گیا تو اس اجنبی نے پوچھا۔

"کیا فرہاد تمھارا یار ہے؟ تمھارے انکار سے تو پتہ چلتا ہے کہ تم اسے بچانے کی خاطر موت سے بھی نہیں ڈرتی ہو۔"

فرزانہ نے جواب دیا۔

"اس سے میری یاری نہیں ہے۔ وہ صرف میرا محسن ہے۔ اس نے میرے بیٹے کی جان بچائی تھی، کیا کسی کا احسان ماننا اچھی بات نہیں ہے؟"

اجنبی نے سر ہلا کر کہا۔

"اچھی بات ہے۔ میں بھی تم پر کوئی احسان کر کے تمھارا دل جیت لوں گا کیونکہ عورت راضی خوشی آغوش میں آئے تو جوانی کا کھیل کچھ زیادہ ہی لذیذ ہو جاتا ہے۔"

فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

"اگر تم مجھ پر ایک احسان کرو گے تو میں ہزار بار راضی خوشی تمھاری بانہوں میں آتی رہوں گی۔ کیا تم میری ایک بات مانو گے؟"

"ہاں بتاؤ کیا چاہتی ہو؟"

"میں چاہتی ہوں کہ تم کوئی ایسا قدم نہ اٹھاؤ جس سے میرے محسن کو نقصان پہنچے۔"

"یعنی تم فرہاد کو بچانا چاہتی ہو، یہ ذرا مشکل ہے اس لیے کہ میں ایک معاوضے پر فرہاد کے دشمنوں کے لیے کام کر رہا ہوں۔"

فرزانہ نے پوچھا۔

"تمھیں کتنا معاوضہ ملے گا؟"

اس نے جواب دیا۔

"فرہاد تک پہنچنے کا معاوضہ دس ہزار روپے ہے۔"

فرزانہ نے کہا۔

"فرہاد اپنے دشمن تک پہنچنے کے لیے تمھیں پندرہ ہزار دے گا۔"

اجنبی نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ پندرہ ہزار قبول کرے یا نہ کرے۔ وہ سوچنے کے دوران فرزانہ کو بھی دیکھے جا رہا تھا۔ فرزانہ کو ایسا لگا کہ وہ بدمعاش پندرہ ہزار سے زیادہ اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ فرزانہ نے پوچھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟ کیا تم فرہاد کے دشمنوں سے ڈرتے ہو؟"

اس نے جواب دیا۔

"مجھے ڈرانے اور دھمکانے والا ابھی اس دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ پندرہ ہزار کوئی معمولی رقم نہیں ہے، کیا تمھارا فرہاد اتنی رقم ادا کر سکتا ہے؟"

"میں تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ وہ بہت دولت مند ہے۔ وہ تمھیں یکمشت تمھیں پندرہ ہزار روپے ادا کر دے گا۔"

"صرف یقین دلانے سے کام نہیں چلے گا۔ جب تک مجھے رقم نہیں ملے گی تم ضمانت کے طور پر میرے پاس رہو گی اور میرا دل خوش کرو گی۔ فرہاد کو بچانے کے لیے مجھے اس دیو ہیکل گونگے سے ٹکرانا ہوگا۔ اسے ہلاک کرنے کے لیے کسی ویران علاقے میں لیجانا ہوگا۔ وہاں ہم دونوں کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہوگا۔ اگر میں جیت گیا تو انعام میں تمھاری جوانی ملے گی اور پندرہ ہزار کی رقم ہاتھ آئے گی۔ اس وقت تک تم میرے ایک آدمی کی نگرانی میں یہاں قید رہو گی۔"

فرزانہ نے کہا۔

"مجھے منظور ہے۔ اگر اس کوٹھی میں ٹیلیفون ہے تو مجھے فرہاد سے باتیں کرنے کی اجازت دو۔ میں اس سے کہوں گی کہ وہ پندرہ ہزار کی رقم تمھارے لیے محفوظ رکھے۔"

اجنبی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہاں ٹیلیفون نہیں ہے۔ اگر ہوتا تب بھی میں تمھیں اس سے بات کرنے کی اجازت نہ دیتا۔ میں اس گونگے کو ختم کرنے کے بعد خود ہی فرہاد سے سودا کروں گا کہ وہ ایک ہاتھ سے رقم دے اور دوسرے ہاتھ سے تمھیں لے جائے۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کوٹھی کے دوسرے کمرے میں شیتل بیٹھا ہوا تھا۔ اس اجنبی بدمعاش کی سوچ سے پتہ چلا کہ شیتل جس کمرے میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے دروازے اور کھڑکیاں بند ہیں کمرے میں نیم تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ جس کے باعث وہ واضح طور سے نظر نہیں آ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک لگا رکھی ہے۔

میں سمجھ گیا کہ یہ احتیاط کیوں برتی گئی ہے۔ اگر کمرے میں روشنی ہوتی اور شیتل کی آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک نہ ہوتی تو میں اس اجنبی بدمعاش کی سوچ کے ذریعے شیتل کی آنکھوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا اور ان آنکھوں سے مجھے اس کے سوچنے کے انداز کا پتہ چل جاتا تو میں اس گونگے کے دماغ میں بھی میں جھانکنے لگتا لیکن وہ بہت چالاک تھا یا پھر بلیک گائیڈ نے اسے سمجھا دیا تھا۔ اس لیے اس نے وہ تمام راستے مسدود کر دیئے تھے جہاں سے ہو کر میں اس کی گونگی سوچ کو پڑھ سکتا تھا۔

اس اجنبی بدمعاش نے شیتل کے کمرے میں پہنچ کر اشاروں کی زبان میں کہا۔

"وہ لڑکی فرہاد کا پتہ بتانے پر راضی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ فرہاد یہاں سے بہت دور چھانگا مانگا کے جنگل میں چھپا ہوا ہے۔ اگر اس کے بچے کو نقصان نہ پہنچایا گیا تو وہ ہمیں اس مقام تک لے جائے گی۔"

شیتل نے جواباً اشاروں سے کہا۔

"ٹھیک ہے تم اس لڑکی کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر آگے بڑھو میں تمھارے پیچھے پیچھے آؤں گا۔"

اس بدمعاش نے کہا۔

"یہاں سے ہم پندرہ بیس منٹ کے بعد نکلیں گے۔ کیوں کہ وہ لڑکی باتھ روم میں گئی ہوئی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ شیتل کے کمرے سے باہر آگیا۔ باہر اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"اس گونگے کو ٹھکانے لگانا ہے۔ لیکن اس کا قد اور جسامت دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک دو کے بس کا آدمی نہیں ہے۔ تم ابھی یہاں سے اڈے کی طرف جاؤ اور وہاں سے راشد، بالم، گوگا، جابر اور قاسم کو اپنے ساتھ لے آؤ یہ سب اچھے فائٹر ہیں اس گونگے کا کچومر نکال کر رکھ دیں گے۔ اگر تمہیں پندرہ منٹ سے زیادہ دیر ہو جاتی تو تم انہیں وہیں سے لے کر چھانگا مانگا کے راستہ پر نکل جانا۔ میں سست رفتاری سے ڈرائیو کروں گا۔ اس راستے میں میری اور شیتل کی گاڑی تمہیں نظر آ جائے گی۔ تم خاموشی سے ہمارا تعاقب کرتے رہنا جہاں پہنچ کر ہم رک جائیں وہاں پہنچ کر تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس گونگے کو گھیر لینا۔"

اس کا ساتھی یہ تمام ہدایات سن کر وہاں سے چلا گیا۔ اور وہ بدمعاش دوبارہ اس کمرے میں چلا آیا جہاں فرزانہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے کہا "ابھی ہم بیس منٹ کے بعد چھانگا مانگا کی طرف جائیں گے۔ وہ گونگا جو فرہاد کا دشمن ہے۔ اسے میں جھانسا دے کر ادھر لے جا رہا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ فرہاد اسی جنگل کے کسی حصے میں چھپا ہوا ہے تم بھی اس مقام تک پہنچانے کے لئے ہمارے ساتھ جاؤ گی۔ جب وہ وہاں پہنچ جائے گا تو میرے آدمی اسے گھیر کر مار ڈالیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ فرزانہ کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا پھر اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"اب تو تمہیں یقین آ گیا کہ میں تمہارے فرہاد کو بچانے کے لئے اس گونگے شیطان سے ٹکرانے جا رہا ہوں؟"

فرزانہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں! مجھے یقین آ گیا مگر ــــــ ابھی یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ میں ذہنی طور پر پریشان ہوں۔ تمہیں کوئی خوشی نہ دے سکوں گی۔"

میں ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ فرزانہ کی عزت خطرے میں تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ وہاں تک ایک بدمعاش پہنچنا چاہتا تھا اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے فوراً ہی اس بدمعاش کی سوچ میں پہنچتے ہوئے کہا۔ "ہائے میں مر گیا۔"

یہ سوچ اس بدمعاش کے دماغ میں اچانک ہی ابھری وہ ایک دم سے بوکھلا گیا اور فرزانہ سے الگ ہو کر اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر سوچنے لگا۔

"ابھی مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میرے دماغ کے اندر یہ کیسی آواز گونج رہی تھی ــــــ؟"

میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اس کی سوچ میں کہا

"میں پاگل ہوں خواہ مخواہ سوچ رہا تھا کہ ہائے میں مر گیا۔ ہاں شاید میں ہوں میرے دماغ کے اندر کچھ عجیب قسم کی سنسناہٹ ہو رہی لگی ہے۔"

اتنا کہہ کر میں اس کی سوچ میں سنسنانے والی آواز پیدا کرنے لگا۔ پھر وہ آواز اس طرح بڑھنے لگی جیسے تیز ہوا کے جھونکے چل رہے ہوں۔ اس کی کیفیت کو سمجھنے کے لئے اس طوفانی ہوا کو مثال کے طور پر سوچا جا سکتا ہے۔ جو عجیب سی آواز پیدا کرتی ہوئی کانوں کے قریب سے گزرتی ہے۔ وہی آواز اس کے دماغ میں گونج رہی تھی۔ میں سوچ کے ذریعے مسلسل وہ آوازیں پیدا کرتا جا رہا تھا۔ اس کی حالت یہ تھی کہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کھڑا ہو گیا تھا اور آگے پیچھے ایسے جھوم رہا تھا جیسے اب تب میں گرنے ہی والا ہو۔

پھر وہ صوفے پر گر پڑا میں نے آوازوں کا سلسلہ بند کر دیا۔ وہ بڑی دیر تک چپ چاپ صوفے پر پڑا رہا۔ پھر آنکھیں کھول کر چاروں طرف دہشت زدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ابھی اس کے دماغ میں کیسی ہلچل سی مچ گئی تھی۔ پھر وہ خالی خالی نظروں سے فرزانہ کو تکنے لگا۔

فرزانہ دور کھڑی سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اور ابھی یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اچانک اس بدمعاش کو کیا ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ خدا کو اس کی عزت کی سلامتی منظور تھی۔ ٹھیک ایسے وقت پر جب کہ اسے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ اسے غیب سے یہ مدد پہنچ گئی۔ وہ خوش ہو کر اسی وقت سجدے میں گر پڑی۔ سجدے میں وہ خوشی سے روتی جا رہی تھی اور خدا کا شکر ادا کرتی جا رہی تھی۔

وہ بدمعاش صوفے پر بیٹھا ہوا۔ وہ باتیں سن رہا تھا جو وہ خدا سے کر رہی تھی اگرچہ وہ بدمعاش تھا لیکن بدمعاشوں کے دل میں بھی خدا کا خوف ہوتا ہے کبھی کوئی معجزہ رونما ہو جائے تو ایسے وقت اچھے اچھے راہ راست پر آ جاتے ہیں۔ اور اپنی بدمعاشیوں اور شیطانی عادتوں کو بھول جاتے ہیں وہ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ وقتی طور پر اس کا جو دماغ خراب ہو گیا تھا وہ اللہ تعالیٰ کی رضا سے ہوا تھا۔ وہ ایک پاکباز عورت ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی پاکبازی کو سلامت رکھنا چاہتا ہے۔

یہ سوچتے ہی اس کا سر عقیدت سے جھک گیا جب فرزانہ سجدے سے اٹھی تو اس نے ندامت سے کہا۔

"میں غلطی پر تھا ہر عورت کو ایک کھلونا سمجھتا تھا آج مجھے پتہ چلا کہ ایسی ایمان والیاں بھی ہیں کہ جن کو بری نیت سے ہاتھ لگانے والوں پر خدا کا قہر نازل ہوتا ہے۔ میں اتنے مضبوط اعصاب کا مالک ہوں کبھی اس طرح ذہنی طور پر پریشان نہیں ہوا۔ میرے دماغ میں کبھی ایسی ہلچل نہیں ہوئی۔ یہ تجربہ ابھی ابھی مجھے ہوا ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری رضامندی کے بغیر تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ چونکہ تم بہت نیک

باعصمت ہو اور تمہارے اندر سچائی ہے۔ اس لئے تمہیں اپنے وعدے کا بھی پاس رکھنا چاہیئے۔

تم اتنی حسین ہو کہ میں تمہارا خیال نہیں چھوڑ سکتا میں شرافت کے دائرے میں رہ کر تمہارا انتظار کروں گا۔ بولو کیا تم اپنا وعدہ نبھاؤ گی؟"

میں نے فوراً ہی فرزانہ کی سوچ میں کہا کہ مجھے فی الحال اس سے وعدہ کر لینا چاہیئے۔ اگر ابھی میں وعدے سے مکر گئی تو ہو سکتا ہے یہ پھر شیطان بن جائے اس طرح یہ فرہاد کی حمایت میں اس کے دشمنوں سے ٹکرائے گا۔"

فرزانہ نے مسکراتے ہوئے وعدہ کر لیا کہ وہ اپنا وعدہ ضرور نبھائے گی

اس وقت میری ٹیکسی اس کوٹھی کے نزدیک پہنچ گئی تھی میں نے اس کوٹھی سے ذرا دور ٹیکسی والے کو رکنے کے لئے کہا اور اسے بل ادا کر کے ٹیکسی سے باہر آ گیا۔ جب ٹیکسی چلی گئی تو میں ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو کر اس کوٹھی کی جانب دیکھنے اور سوچنے لگا۔ کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے میں دشمنوں کے پروگرام سے واقف ہو چکا تھا اور جانتا تھا کہ سب چھانگا مانگا کی طرف جانے والے ہیں۔ فرزانہ کی طرف سے بھی اب کوئی پریشانی نہیں تھی اس بدمعاش نے اس وقت تک کے لئے توبہ کر لی تھی۔ جب تک فرزانہ خود نہ آتی۔ موجودہ حالات کے پیش نظر مجھے بھی چھانگا مانگا کی طرف جانا چاہیئے تھا۔ لیکن میں نے ٹیکسی والے کو رخصت کر دیا تھا۔ بعض اوقات وقت گزر جانے کے بعد اپنی حماقت کا احساس ہوتا ہے۔

میں درخت کی آڑ سے نکل کر پھر کسی ٹیکسی کی تلاش میں چل پڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ لوگ کوٹھی سے کس وقت روانہ ہوں گے۔ دس منٹ کے بعد ہی مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ میں اس میں بیٹھ کر اپنی کوٹھی تک پہنچ گیا۔ مجھے اس بات کا اندیشہ تھا کہ انٹیلیجنس والے میری تلاش میں وہاں آئے ہوں گے لیکن میں پھر بھی میں نے خطرہ مول لیا۔ اس لئے کہ چھانگا مانگا تک جانے کے لئے مجھے ذاتی کار کی ضرورت تھی۔

پھوپھی جان مجھے دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ میں رہنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ دشمن میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ مجھے یہاں سے دور جانے کے لئے اپنی کار کی ضرورت ہے۔ پھوپھی جان نے وقت ضائع نہیں کیا۔ انہوں نے فوراً ہی کار کی چابی دے دی۔ میں تنہا کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوا تو کافی وقت گزر چکا تھا میرے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ میں باقاعدہ دشمنوں کا تعاقب کرتا۔ میں اس اجنبی بدمعاش کے ذہن کو پڑھ رہا تھا اور اس کے ذریعہ سمجھ رہا تھا کہ وہ کن راستوں سے گزر رہا ہے۔

اس وقت وہ کار ڈرائیو کر رہا تھا اس کے ساتھ والی سیٹ پر فرزانہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بار بار عقب نما آئینے میں دیکھتا تھا۔ اس آئینے میں پیچھے آنے والی شیتل کی گاڑی نظر آ رہی تھی وہ جس مقام سے گزرتا تھا اور مجھے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ وہ فلاں وقت فلاں مقام سے گزر رہے ہیں۔ میں نے احتیاطاً ان سے ایک میل کا فاصلہ قائم رکھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک جیپ کار مجھے کراس کرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اس جیپ میں پانچ چھ ہٹے کٹے نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اپنے حلیے سے بدمعاش نظر آ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سب اس اجنبی بدمعاش کے ساتھی ہیں۔

میں نے اپنی کار کی رفتار اور دھیمی کر لی۔ تاکہ وہ لوگ اور آگے نکل جائیں اس طرح ہم گھنٹوں آگے پیچھے دوڑتے رہے۔

چھانگا مانگا کے علاقے میں پہنچ کر اس بدمعاش نے اپنی کار کو مین روڈ سے اتار دیا۔ اور جنگل کے اونچے نیچے راستوں سے ڈرائیو کرتے ہوئے گزرنے لگا۔ بہت دور گھنے درختوں کے درمیان جہاں کسی آدم زاد کے گزرنے کی توقع نہ تھی۔ وہاں اس نے اپنی کار روک دی۔ شیتل کی کار بھی رک گئی۔ وہ سب اپنی اپنی کاروں سے باہر آ گئے۔

اس بدمعاش نے شیتل سے اشاروں میں کہا۔

"ہمیں کچھ دیر یہاں انتظار کرنا ہو گا میرے کچھ آدمی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ اس کے بعد ہم یہاں سے پیدل آگے بڑھیں گے اور جہاں فرہاد چھپا ہوا ہے وہاں اسے چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔"

شیتل نے اشاروں سے کہا

"میں فرہاد جیسے دس آدمیوں کے لئے اکیلا کافی ہوں۔ مجھے تمہارے ساتھیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اس لڑکی کو لے کر فوراً آگے بڑھو۔"

اس بدمعاش نے کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے میرے ساتھی یہاں پہنچنے ہی والے ہیں۔ وہ مجھے یہاں آ کر تلاش کریں گے۔ میں انہیں بھٹکنے کے لئے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

شیتل نے غراتے ہوئے اشارے سے کہا۔

"میں جو کہتا ہوں اس پر عمل کرو۔ یا پھر اپنے ساتھیوں کا انتظار کرو۔ میں اس لڑکی کو لے کر تنہا فرہاد کے پاس جاؤں گا۔"

شیتل فرزانہ کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ بدمعاش اس کے راستے میں ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اور شیتل کو للکارتے ہوئے بولا۔

"تم اس لڑکی کو ہاتھ نہیں لگا سکتے ......"

اس کی بات پوری ہوتے ہی شیتل کا ایک گھونسہ اس کے منہ پر پڑا۔ وہ الٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اسے ایسے زبردست گھونسے کی توقع نہیں تھی۔ ایک ہی ہاتھ نے اسے سمجھا دیا تھا کہ شیتل کسی جناتی قوت

کا مالک ہے۔ وہ سنبھل کر زمین پر سے اُٹھا۔ پھر یک بیک اس پر چھلانگ لگائی۔ شیتل ایک طرف ہٹ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھلانگ لگانے کی جھونک میں وہ دور جا گرا۔ پھر زمین پر گر پڑا۔ پھر وہاں سے اٹھنے سے پہلے ہی اس کے منہ پر ایک زور کی ٹھوکر پڑی۔ وہ الٹ کر تکلیف کی شدت سے چیختے ہوئے زمین پر تڑپنے لگا۔ اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے تھے اور باچھوں سے خون بہنے لگا تھا۔ ایسے ہی وقت اس کے تمام ساتھی اس کی مدد کے لئے پہنچ گئے۔ انہوں نے چاروں طرف سے شیتل کو گھیر لیا۔ کسی کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا۔ کسی کے ہاتھ میں ہاکی اور کوئی چاقو کھولے کھڑا تھا۔ وہ بدمعاش زخمی پڑا ہوا شیتل کو دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی سوچ سے پتہ چل رہا تھا کہ شیتل چاروں طرف پینترے بدلتے ہوئے اپنے دشمنوں کو کڑی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک نے آگے بڑھ کر ہاکی سے حملہ کیا۔ شیتل آگے دیکھ رہا تھا اور حملہ پیچھے سے ہوا تھا لیکن ہاکی اس کے سر پر پڑتے ہی ٹوٹ گئی۔ وہ غرا کر پلٹا اور حملہ کرنے والے کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ گرفت میں آنے والے نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن شیتل نے اُسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے سر سے بلند کیا اور اس کے ساتھیوں پر اُچھال دیا۔ چند ساتھی اسے لئے لئے گر پڑے۔ لیکن پیچھے سے ایک چاقو والے نے شیتل کی پشت میں چاقو کا پھل گھونپنے کی کوشش کی۔

اُسی وقت شیتل تیزی سے پلٹ گیا۔ اس لئے چاقو اس کی پشت کے ایک حصے کو کاٹتا ہوا گزر گیا۔ اس کی کٹی ہوئی قمیض کا حصہ خون سے بھیگنے لگا۔ اس نے چاقو والے کی گردن دبوچ لی۔ وہ اس قدر غصے میں بھرا ہوا تھا کہ اس کی گرفت سے چھوٹنا محال تھا۔ اس دوران دوسرے ساتھیوں نے اس پر کئی حملے کئے۔ لیکن وہ سب خوفزدہ تھے اس لئے دور سے حملہ کرتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ شیتل چاقو کے کئی زخم کھا چکا تھا لیکن اُس نے ایک دشمن کی گردن اُسی وقت چھوڑی جب اس کی سانس اکھڑ گئی۔ پھر وہ دوسرے چاقو والے کی طرف لپکا۔ چاقو والے نے بچ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن شیتل اپنے شکار پر جھپٹنے کا طریقہ جانتا تھا۔ اُس نے چھلانگ لگا کر چاقو والے کو دبوچ لیا۔ وہ دونوں زمین پر گرے۔ اُسی وقت اس کا چاقو شیتل کے ایک بازو کے آر پار ہو گیا۔ اس کے باوجود شیتل نے اُسے نہیں چھوڑا۔ دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔ اوپر سے اس کے سر پر ایک ڈنڈے سے ضربیں پڑتی رہیں لیکن وہ دوسرے کو بھی ہمیشہ کے لئے ختم کر کے ہی اُٹھا۔ اب اس کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی پہلے اُس نے اپنے بازو میں گھسے ہوئے چاقو کو نکالا۔ پھر ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے دوسرے دشمنوں کی طرف بڑھا۔ وہ سب اس سے بچ کر حملہ کرنے کی کوشش میں تھے اور وہ زخموں سے چُور ایک مست ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا۔

اُسی وقت میں ان کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لمحے کے لئے وہ سب ٹھٹھک گئے۔ انہوں نے مجھے کار سے اترتے ہوئے دیکھا۔ شیتل نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ میں اس کا شکار تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی غراتے ہوئے میری طرف لپکا۔ لیکن ایک بدمعاش نے ایک ٹانگ اس کی ٹانگوں میں پھنسا دی۔ وہ ایک بھاری شہتیر کی طرح زمین پر آ گرا۔

میں فوراً ہی کار میں بیٹھ گیا۔ دروازہ بند کر کے میں نے کار اسٹارٹ کی۔ پھر اس سے پہلے کہ شیتل زمین پر سے اٹھتا۔ میں نے کار کو تیزی سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس پر سے گزار دیا۔ شیتل کی ہیبت ناک چیخ جنگل کے ویرانے میں گونجنے لگی۔ میری کار کے رُخ پر تھوڑی دور کے فاصلے پر دو بدمعاش اور کھڑے ہوتے تھے۔ شاید انہوں نے سوچا تھا کہ میں صرف شیتل کو کچل رہا ہوں۔ لیکن میں انہیں بھی کار کی زد میں لے آیا۔ ہم سب ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ میری اصلیت معلوم ہونے پر وہ بدمعاش مجھ سے ہمدردی نہ کرتے۔ وہ مجھ سے پندرہ ہزار بھی مانگتے اور فرزانہ کا بھی مطالبہ کرتے۔ اس لئے مجھے ایک ہی وقت میں سب کو نشانہ بنانا تھا۔

اس وقت تک یہ پوزیشن تھی کہ شیتل نے دو بدمعاشوں کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔ دو کو میں نے کار تلے کچل دیا تھا۔ وہ اجنبی بدمعاش جو فرزانہ کو لے کر آیا تھا وہ بھی زخمی حالت میں پڑا ہوا تھا صرف ایک بدمعاش صحیح اور سالم اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تھا۔

میں نے شیتل کی جانب دیکھا اس کے جسم پر چاقو کے کئی زخم آئے تھے۔ سر پر کئی بار ڈنڈے کی ضربیں پڑی تھیں۔ وہ لہو میں نہا رہا تھا۔ میں نے اُسے کار تلے بھی کچل دیا تھا۔ اس کے باوجود اب تک اس میں جان باقی تھی۔ ایسا سخت جان اور فولادی انسان میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ویسے اب مجھے اس کی طرف سے اطمینان تھا۔ وہ اس قدر ٹوٹ چکا تھا کہ اب مجھ پر حملہ کرنے کے قابل نہیں رہا تھا اس لئے میں کار سے اتر کر اس بدمعاش کی طرف بڑھا جسے اب تک کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

اُس نے پینترا بدلتے ہوئے اور ڈنڈے کو اپنے ہاتھ میں تولتے ہوئے مجھ سے کہا

"تم کون ہو ــــ؟ اس گونگے کے بھی دشمن ہو اور ہم سے بھی دشمنی کر رہے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔

"میں صرف اس لڑکی کا محافظ ہوں اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو اپنے زخمی ساتھیوں کو جیپ میں لاد کر یہاں سے چلے جاؤ۔"

وہ پینترے بدلتے بدلتے ایک جگہ رک کر سوچنے لگا۔ پھر اس نے اس اجنبی بدمعاش کی جانب دیکھا جو ان کا لیڈر تھا۔ اور زخمی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے ان کے زخمی لیڈر سے کہا "میں وہی فرہاد ہوں جس

سے پندرہ ہزار وصول کرنا چاہتے ہو اور اس لڑکی کو بھی طلب کر رہے ہو۔ اب تم میرے رحم و کرم پر ہو۔ تمہارا ابھی ایک ساتھی سلامت رہ گیا ہے۔ اگر کہو تو اسے بھی تمہارے برابر سُلا دوں۔ لیکن اس کے بعد پھر کوئی تمہیں اُٹھا کر لے جانے والا نہ رہے گا۔ بولو کیا یہاں تڑپ تڑپ کر مرنا چاہتے ہو؟"

اس نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"نہیں، میں اور جھگڑا بڑھانا نہیں چاہتا۔ مجھے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت ہے۔ ہم یہاں سے چپ چاپ چلے جائیں گے۔"

میں بھی یہی چاہتا تھا کہ دنگے فساد کے بغیر کام نکل جائے اور یہ سارے دشمن یہاں سے ٹل جائیں۔ میرے حسب منشاء وہ سب یہاں سے ٹل گئے۔ وہ بدمعاش جو صحیح و سالم تھا۔ اس نے اپنے زخمی ساتھیوں کو سہارا دے کر جیپ میں بیٹھا دیا۔ دو ساتھی جو مُردہ تھے انہیں وہیں چھوڑ دیا۔ پھر جیپ اسٹارٹ کر کے وہاں سے چلا گیا۔

جب وہ لوگ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں شیتل کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ وہ زمین پر سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ اس نے فوراً ہی آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے دماغ تک پہنچنے کے دروازے بند کر دیئے۔ میں نے اس کی ناک پر ایک زور کا گھونسہ رسید کیا۔ وہ اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ اب میرا گھونسہ اس کے لئے ہتھوڑے کے برابر تھا اس نے تکلیف سے بلبلا کر آنکھیں کھول دیں میں اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ وہ چند لمحوں تک کراہتا رہا۔ پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے پھر ایک گھونسہ اس کی ناک پر رسید کیا۔ وہ زمین پر چاروں شانے چت ہو گیا۔ میں نے اس کے سینے پر سوار ہو کر اس کے سر کے بالوں کو اپنی مٹھیوں میں جکڑ لیا۔ اس کا سر پہلے ہی ڈنڈے کی ضربوں سے کچے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا میرے بال پکڑ کر کھینچتے ہی تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ جسمانی لحاظ سے بالکل ہی ٹوٹ چکا تھا۔ قوتِ مدافعت ختم ہو چکی تھی۔ زندگی اور موت کے درمیان اس کا ذہن بھی مفلوج ہو رہا تھا۔ جب ذہن اس قدر کمزور ہو جائے تو ایسے شخص پر تنویمی عمل کا اثر ہوتا ہے۔

میں اس کی آنکھوں میں جھانک کر اسے ٹرانس میں لانے لگا۔ میری آنکھوں کی مقناطیسی قوت اس کے دل و دماغ کو میری طرف کھینچ رہی تھی میں نے اپنی سوچ کے ذریعے کہا "تم میرے معمول ہو محکوم ہو۔ جو کچھ میں کہتا ہوں اُسے دہراتے جاؤ۔"

ذرا سی دیر میں وہ ذہنی طور پر میرا محکوم بن گیا اور میری باتوں کو اپنی سوچ میں دہرانے لگا۔

"میں تمہارا معمول ہوں۔ میں تمہارا محکوم ہوں۔"

میں نے اس سے سوال کیا۔

"بلیک گائیڈ کہاں ہے ــــ؟"

اس کی سوچ نے بتایا کہ بلیک گائیڈ راوی روڈ کی ایک سبز کوٹھی میں ہے۔

پھر میں نے اپنی سوچ کے ذریعے پوچھا۔

"تم یہاں سے فرار ہونے کے لئے کیسے انتظامات کر رہے ہو؟"

اس کی سوچ نے جواب دیا "قصور کی سرحد پر ہمارے لئے ایک ہیلی کاپٹر آنے والا ہے۔ کل میں اُدھر گیا تو مجھے سرحد پار سے سگنل ملا کہ مزید دو دن تک ہیلی کاپٹر نہیں آ سکے گا۔ آج دوسرا دن ہے کل رات تم یہاں سے نکل جانے کی توقع کر رہے تھے۔"

پھر میں نے سوال کیا۔

"اس ملک میں بلیک گائیڈ نے کہاں کہاں خفیہ پناہ گاہیں بنا رکھی ہیں؟"

وہ جواباً مجھے بتلانے لگا میں اس کی بتائی ہوئی پناہ گاہوں کے پتے ذہن نشین کرتا رہا۔ اس کے بعد میں نے پوچھا۔

"کیا بلیک گائیڈ کے پاس ایسے اہم کاغذات ہیں جو اس بات کا ٹھوس ثبوت پیش کر سکیں کہ تم اور بلیک گائیڈ اس ملک میں تخریبی کارروائیاں کرتے رہے ہو؟"

اُس نے اشاراتی زبان میں بتایا "بہت سے کاغذات سبز کوٹھی میں ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کتنی اہمیت کے حامل ہیں۔"

میں اس سے سوالات کرتا جا رہا تھا اور وہ میرے حسب منشا جواب دیتا جا رہا تھا اس دوران فرزانہ ہمارے قریب آ گئی تھی اور چپ چاپ کھڑی ہوئی ہمیں ہاتھ کے اشاروں سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ جب میں مطمئن ہو کر شیتل کے سینے سے اُتر آیا تو فرزانہ میری آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ پھر اُس نے حیرانی سے کہا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے تم اس گونگے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے تو تمہاری آنکھیں کتنی خوفناک ہو گئی تھیں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ سچ بتاؤ کیا تم کوئی عمل جانتے ہو؟"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں کوئی عامل یا جادوگر نہیں ہوں۔ ذرا ہپناٹزم کے علم سے شوق ہے۔ اس لئے کبھی کبھی اس کی عملی مشقیں کرتا رہتا ہوں۔ یہ تو بیچارہ گونگا ذہنی طور سے بالکل ہی مفلوج ہو گیا ہے۔ اسی لئے میں اسے ٹرانس میں لا کر اہم معلومات حاصل کر رہا تھا۔"

وہ مطمئن ہو کر بولی۔

"تم بہت ہی باصلاحیت اور عجیب و غریب قسم کے انسان ہو۔ ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر بھی غیب کی باتیں معلوم کر لیتے ہو۔"

میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا اور گونگے پر دوبارہ جھک کر ہاتھ کے اشارے سے کہا "تم بدستور میرے معمول ہو۔ تمہارے جسم پر جو زخم آئے ہیں تم ان کی تکلیف کو شدت سے محسوس نہیں کر رہے ہو۔ اس کے برعکس تم اپنے اندر کسی حد تک توانائی محسوس کر رہے ہو۔"

اُس نے اشارے سے کہا۔

"ہاں اس وقت مجھے یاد نہیں آرہا ہے کہ میرے جسم پر کہیں زخم آئے ہیں۔ میں اپنے اندر ایک نئی توانائی محسوس کر رہا ہوں۔ میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ تم بہت اچھے آدمی ہو مجھے کسی طرح موت کے منہ سے بچا لو میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا تم میرے وفادار بن کر رہو گے؟"

اُس نے اقرار میں سر ہلا دیا میں نے پھر اس سے پوچھا۔

"کیا تم بلیک گائیڈ کو اپنا دشمن سمجھو گے ـــــ؟"

اُس نے پھر اقرار میں سر ہلا دیا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں مکمل توجہ سے اس کا علاج کراؤں گا۔ اسے قانون کے حوالے نہیں کروں گا۔ اگر وہ وفادار ثابت ہوا تو میں اس کے لئے وہ تمام آرام اور آسائشیں مہیا کروں گا۔ جو اب تک بلیک گائیڈ کرتا رہا ہے۔

اس کے بعد میں اسے سہارا دے کر اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر لے آیا وہاں وہ آرام سے لیٹ گیا۔ فرزانہ میرے پاس اگلی سیٹ پر آگئی۔ پھر ہم وہاں سے شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں میں نے فرزانہ سے پوچھا۔

"کیا تم اس زخمی گونگے کا علاج کر سکتی ہو ـــــ؟ میں اسے کسی ہسپتال میں لے جاؤں گا تو یہ قانون کی گرفت میں آجائے گا۔"

فرزانہ نے جواب دیا۔

"ہاں اپنے تجربات کی بنا پر کسی حد تک اس کا علاج کر سکتی ہوں لیکن مکمل علاج کا وعدہ نہیں کر سکتی۔"

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس کے زخم بھر جائیں۔ باقی علاج میں تنویمی عمل کے ذریعے کر دوں گا۔"

"ہاں میں نے سنا ہے کہ ہپناٹزم کے ذریعے بھی مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ میں دیکھوں گی کہ تم کس طرح علاج کرتے ہو۔ یہ میرے لئے ایک نیا تجربہ ہو گا۔"

یہ کہہ کر وہ میرے قریب آگئی اور اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا وہ بڑی عقیدت سے اور بڑی محبت سے سوچ رہی تھی کہ اسے دنیا سے نرالا محبوب ملا ہے۔ جو اپنی نت نئی صلاحیتوں سے اسے متاثر کرتا رہتا ہے۔

پھر وہ چونک کر مجھ سے علیحدہ ہو گئی اور حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا یہ پوچھنا تو میں بھول ہی گئی کہ تم اس جنگل میں کیسے چلے آئے۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ بدمعاش مجھے یہاں لے آیا ہے؟"

اس سوال نے مجھے چکرا دیا میں اس سے اپنی خیال خوانی کی صلاحیتوں کو چھپانا چاہتا تھا۔ یہ بات مناسب نہیں تھی کہ جو بھی عورت میرے قریب آتی میں اسے اپنا راز بتاتا جاتا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے سنبھل کر کہا

"تمہیں یاد ہے میں نے ہسپتال میں تم سے پوتر کی تصویر مانگی تھی تاکہ تمہارے ہاتھ کی لکیریں اور پوتر کا چہرہ دیکھ کر یہ معلوم کر سکوں کہ اسے کہاں چھپایا گیا ہے۔ جس کا تعلق بھی تمہاری ہاتھ کی لکیروں سے تھا میں ان لکیروں سے اُسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ آج اس گونگے کا وجود بھی تمہاری ہاتھ کی لکیروں سے پیدا ہو گیا تھا۔ تم نہیں جانتیں ہاتھ کی لکیریں کیسے کیسے گل کھلاتی ہیں۔ یہی دیکھ لو کہ تمہارے اس ہاتھ کے ذریعے میں اس گونگے تک پہنچ گیا۔"

یہ کہہ کر میں نے اس کے ملائم ہاتھ کو ایک ہاتھ سے تھام کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور اس ہاتھ کی تعریف میں جو کچھ کہہ سکتا تھا، کہتا گیا۔ اکثر عورتوں کی کمزوری یہی ہے کہ اپنی تعریفیں سن کر اصل موضوع سے ہٹ جاتی ہیں۔ ایک تو وہ دست شناسی کے علم سے واقف نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ میرے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھتے ہی وہ ساری دنیا کو بھول گئی تھی۔ سارا راستہ پیار بھری باتوں میں گزرتا رہا۔ میں شیتل کو لے کر اپنی کوٹھی میں آیا۔ اسے سہارا دے کر اپنے بیڈ روم میں لا کر بستر پر لٹا دیا۔ پھر اسے اشاروں میں سمجھایا۔

"تم آرام سے یہاں لیٹے رہو۔ یہاں تمہارا باقاعدہ علاج ہو گا۔ اگر تم میری اجازت کے بغیر باہر نکلو گے تو قانون کی گرفت میں آجاؤ گے۔ کیوں کہ ابھی میں بلیک گائیڈ کو قانون کے حوالے کرنے جا رہا ہوں۔ اس کی گرفتاری کے بعد پولیس والے تمہیں بھی تلاش کریں گے۔ لہذا تمہارا یہاں چھپ کر رہنا ضروری ہے۔"

میری باتیں اس کی سمجھ میں آگئیں۔ اُس نے وعدہ کیا کہ وہ میرے حکم کے بغیر اس بستر پر کروٹ بھی نہیں بدلے گا۔ اس بات کا مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے متاثر اور مرعوب بھی ہے اور میرے موجودہ احسانات کے آگے بھی جھک رہا ہے۔

میں اسے خوابگاہ میں چھوڑ کر پھوپھی جان کے پاس آیا اور انہیں ساری روئیداد سنائی اور انہیں سمجھایا کہ وہ اس گونگے کا خاص خیال رکھیں۔ اس کے بعد میں فرزانہ کے ساتھ پھر کار میں آکر بیٹھ گیا۔ مال روڈ کی طرف جاتے ہوئے میں نے فرزانہ سے کہا۔

"تم پہلے ہسپتال جاؤ وہاں سے پوتر کو لے کر اور شیتل کے لئے دوائیں خرید کر کوٹھی میں چلی جاؤ۔ میری واپسی کا کوئی ٹھیک نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں صبح تک نہ آسکوں۔" میں نے اسے ہسپتال کے قریب چھوڑ دیا اور سادی روڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس راستے پر وہ سبز کوٹھی نمایاں تھی اس لئے وہاں تک پہنچنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ میں نے کوٹھی کے سامنے کار روک دی۔ کوٹھی کی چابیاں میں شیتل سے لے آیا تھا۔ جب دروازے کے لاک میں چابی گھومنے کی آواز ابھری تو اس کے ساتھ ہی بلیک گائیڈ کی آواز سنائی دی۔ وہ شبیر حسن سے کہہ رہا تھا۔

"خاموش رہو! شیتل آ رہا ہے۔ پتہ نہیں کیا خبر لایا ہے۔؟"

میں نے دروازے کو اندر سے لاک کر دیا پھر ایک کمرے سے گزر کر دوسرے کمرے میں پہنچا تو بلیک گائیڈ اور شبیر حسن صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں پر بدستور پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ اندھوں

کی طرح بیٹھے ہوئے شیتل کی آہٹ سننے کے منتظر تھے میں نے شیتل کے انداز میں اپنے منہ سے سانس کے جھٹکے چھوڑتے ہوئے "ہوں۔ ہاں" کی آواز نکالی بلیک گائیڈ نے سر اُٹھا کر کہا۔

"شیتل تم آگئے ـــــ؟"

یہ کہہ کر اُس نے دونوں ہاتھ کے اشاروں سے کہا۔ میں اس کے قریب آؤں اور انگلیوں کے اشارے سے اپنی رپورٹ پیش کروں

میں اس کے قریب پہنچا۔ لیکن انگلیوں سے اشارہ کرنے کی بجائے میں نے اس کے سر پر ایک چپت رسید کی۔ اُس نے بوکھلا کر کہا۔

"ارے یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

میں نے اس کی سوچ میں کہا۔

"پتہ نہیں شیتل کو کیا ہو گیا ہے ـــــ؟ اس نے ایسی گستاخی پہلے کبھی نہیں کی۔ اب اگر میں آنکھوں سے پٹی ہٹا کر اسے دیکھوں گا تو پھر یہ ماحول بھی مجھے نظر آئے گا۔ اور جو کچھ نظر آئے گا۔ اُسے فرہاد میری سوچ کے ذریعہ پڑھ لے گا۔ نہیں مجھے اپنی آنکھوں سے پٹی نہیں ہٹانی چاہیئے۔"

یہ فیصلہ کرنے کے بعد اُس نے پھر اشاروں سے کہا۔

"شیتل میرے قریب آؤ اور جو کچھ میں کہتا ہوں اس پر عمل کرو۔"

میں پھر اس کے قریب گیا۔ اس بار میں نے اپنی دو انگلیوں سے اس کی ناک کو پکڑ کر مروڑ دیا۔ وہ تکلیف سے بلبلا اُٹھا۔ اس کی آواز سن کر شبیر حسن نے پوچھا۔

"کیا بات ہے تم کراہ کیوں کر رہے ہو؟"

اس بار بلیک گائیڈ نے جھلا کر اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹا دی۔ پھر مجھے دیکھتے ہی وہ چند لمحوں تک سکتے میں رہ گیا۔ وہ مجھے چہرے سے نہیں پہچانتا تھا۔ اُس نے حیرانی سے پوچھا۔

"کون ہو تم ـــــ؟"

"میں ہوں تمہاری کھوپڑی میں گھس کر رہنے والا فرہاد . . . ."

یہ کہہ کر میں نے زور کا اُلٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ میرا نام سنتے ہی شبیر حسن نے اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹا دی۔ پھر مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "ہاں یہ فرہاد ہے۔"

میں نے کہا۔

"ڈائرکٹر جنرل صاحب آپ کیسے محب وطن ہیں۔ کل سے آپ ایک دشمن کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوتے ہیں۔ کیا اس وقت بھی آپ پر تنویمی عمل کا اثر ہے؟"

شبیر حسن نے بلیک گائیڈ کی جانب دیکھا۔ بلیک گائیڈ نے انہیں گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم میرے حکم کے بغیر اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دو گے۔"

میں نے بلیک گائیڈ کے منہ پر ایک گھونسہ رسید کیا وہ چیختا ہوا صوفہ سمیت پیچھے الٹ گیا۔ وہ جسمانی اعتبار سے ایک دبلا پتلا سا آدمی تھا۔ میرا ایک گھونسہ کھاتے ہی خون تھوکنے لگا۔ میں نے ایک رسی لے کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔ اس کے بعد دوسرے کمرے میں گیا۔ وہاں بھوانی شنکر ایک بستر پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔

"بھوانی شنکر تم لوگوں کا آخری وقت آگیا ہے۔ اپنی آنکھوں سے اپنے جھوٹے غرور کی پٹی ہٹا دو۔"

بھوانی شنکر نے ہڑبڑا کر اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹا دی۔ اب سے پہلے انٹیلیجنس والوں کی حوالات میں ہم دونوں کا سامنا ہو چکا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی پریشان ہو کر کہا۔

"تم وہی ہو جس نے میرے جبڑے میں چھپی ہوئی قلم کی بو کو سونگھ لیا تھا تمہاری وجہ سے میں اس حال کو پہنچا ہوں کاش کہ اس وقت میں بیمار نہ ہوتا۔"

"تمہاری بیماری سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم لوگوں کو اس گونگے شیتل پر ناز تھا کہ وہ ناقابل تسخیر ہے۔ کہاں ہے وہ؟ کیا تم اپنی جان بچانے کے لئے اُسے بلا سکتے ہو؟"

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کے سر کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ پھر اسے ایک جھٹکے سے اُٹھا کر بٹھا دیا۔ اُس نے نقاہت کے باوجود مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ اُسی وقت دروازے پر شبیر حسن کی آواز سنائی دی۔

"خبردار! ایک طرف ہٹ جاؤ۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ہاتھ میں ریوالور لئے کھڑے تھے۔ میں نے جھلا کر کہا۔

"یہ کیا حماقت ہے۔ آپ دشمنوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اور مجھے گولی کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔"

پھر میری سمجھ میں آگیا کہ وہ ٹرانس میں ہیں میری باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ اور وہ بلیک گائیڈ کے حکم کی تعمیل کرتے رہیں گے۔ یہ بات سمجھ میں آتے ہی میں نے بڑی پھرتی سے بھوانی شنکر کو اپنی طرف کھینچ کر ان کی جانب دھکیل دیا۔ اُسی وقت انہوں نے فائر کیا۔ مگر میری تیزی کام آگئی تھی۔ ریوالور کی گولی بھوانی شنکر کے آر پار ہو گئی۔ وہ لڑکھڑا کر ان پر گرا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ان پر چھلانگ لگا دی۔ انہیں دوسری بار فائر کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ان کے ریوالور والے ہاتھ کو پکڑ کر ایک طرف کر دیا پھر پے در پے ان کے منہ پر گھونسے برسانے لگا۔ حتیٰ کہ ریوالور ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ میں ریوالور اٹھا کر ان سے الگ ہو گیا۔ بلیک گائیڈ رسی کی بندشوں سے آزاد ہونے کی جدوجہد کر رہا تھا میں نے اُسے ایک زور کی ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

"تم شبیر حسن کو معمول بنا کر نجات حاصل نہ کر سکو گے۔ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ چپ چاپ پڑے رہو۔"

یہ کہہ کر میں ٹیلیفون کے پاس آیا اور ریسیور اُٹھا کر انٹیلیجنس کے دفتر کے منبر ڈائل کرنے لگا۔ بلیک گائیڈ میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اُس نے یک بیک دوستانہ لہجے میں کہا۔

" فرہاد میں جانتا ہوں تم انٹیلیجنس کے آدمی نہیں ہو۔ اگر تم چاہو تو ہم سے دوستی کا معاہدہ ہو سکتا ہے۔ میری دوستی تمہارے مستقبل کو اتنا شاندار بنا دے گی کہ تم نے ایسی شاندار زندگی کے متعلق کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔ بیرُونی ممالک کے بنکوں میں تمہارے نام سے لاکھوں کی رقم جمع ہو گی۔ تمہارے پسند کے ممالک میں تمہارے لئے ایک کوٹھی اور ایک کار مخصوص رہا کرے گی۔ دنیا کی بہترین شراب اور حسین ترین عورتیں تمہارے لئے مہیا کی جائیں گی۔ یہ ملک تمہاری صلاحیتوں کی قدر نہیں کرے گا۔ میں تمہیں زمین کی پستیوں سے اُٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دوں گا۔"

میں نے جواب دیا۔

"میں سمجھتا تھا کہ تم بہت ذہین ہو۔ مگر تم اول درجے کے احمق ہو۔ کیا یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی کہ میں جہاں جاؤں گا، ٹیلی پیتھی کے ذریعے دنیا کی ہر خوشی خرید لوں گا۔ خیال خوانی ایک ایسا سکہ رائج الوقت ہے جو ہر مُلک میں بغیر کسی عذر کے کیش ہو جاتا ہے۔ تم مجھے کیا خریدو گے۔ میں تمہارے جیسے ہزاروں بلیک گائیڈ کو اپنے علم کے بارود سے اڑا سکتا ہوں۔"

اسی وقت فون پر انٹیلیجنس والوں سے رابطہ قائم ہو گیا۔ میں نے ایک آفیسر سے کہا کہ وہ فوراً ہی مسلح نوجوانوں کو لے کر راوی روڈ کے کنارے سبز کوٹھی میں آجائیں۔ یہاں ان کے ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن دوسرے مجرموں کے ساتھ موجود ہیں۔"

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"تم کون ہو ۔۔۔ ؟ اگر ڈائریکٹر جنرل وہاں موجود ہیں تو انہیں فون پر بات کرنے کے لئے کہو۔"

میں نے جواباً کہا۔

" ڈائریکٹر جنرل اس وقت مجرموں کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوتے ہیں۔ میں نے ان مجرموں کو قابو میں کر رکھا ہے۔ اس کے باوجود ڈائریکٹر جنرل میرے اقدامات کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس وقت میری پوزیشن بہت ہی نازک ہے۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔

"تم عجیب قسم کی باتیں کر رہے ہو۔ ہم ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن کو تم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ وہ محب وطن ہیں مجرموں کا ساتھ کبھی نہیں دے سکتے۔ اگر وہ واقعی وہاں موجود ہیں تو ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ انہیں فون پر بھیجو۔"

میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"آپ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے۔ ایک مجرم نے ہپناٹزم کے ذریعے انہیں اپنا معمول بنا لیا ہے۔ وہ فون پر جو کچھ بھی کہیں گے۔ مجرموں کی حمایت میں اور میری مخالفت میں کہیں گے۔"

دوسری طرف سے جواب ملا۔

"تم کس حد تک سچ کہہ رہے ہو۔ اس کو سمجھنا ہمارا کام ہے۔ فی الحال تم اپنی سچائی ثابت کرنے کے لئے ریسیور ڈائریکٹر جنرل کو دیدو۔"

میں نے مجبور ہو کر شبیر حسن کی جانب دیکھا۔ وہ دیوار سے لگے کھڑے تھے اور مجھے طنزیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے خاموشی سے ریسیور ان کی طرف بڑھا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے قریب آئے اور ریسیور ہاتھ میں لے کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"ہیلو ۔۔۔۔ میں شبیر حسن بول رہا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ پرسوں رات فرہاد اچانک ہی ہسپتال سے غائب ہو گیا تھا۔ میں فون پر تفصیل بیان نہیں کر سکتا۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ فرہاد میرے لئے مصیبت بنا ہوا ہے۔ تم فوراً مسلح جوانوں کو لے کر راوی روڈ کے کنارے سبز کوٹھی میں پہنچو۔ یہاں تمہیں ساری باتیں معلوم ہو جائیں گی۔"

یہ کہہ کر انہوں نے دوسری طرف سے کچھ باتیں سنیں۔ پھر ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔ بلیک گائیڈ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"فرہاد تمہاری حب الوطنی تمہیں لے ڈوبے گی۔ جب تک شبیر حسن ہمارا حامی ہے۔ تم ہمیں مجرم ثابت نہیں کر سکو گے۔ عدالت میں تمہارے خلاف بیان دیا جائے گا کہ تم اپنے نامعلوم ساتھیوں کی مدد سے مجھے، شبیر حسن کو اور بھوانی شنکر کو یہاں لے آئے تھے۔ یہاں ابھی تم نے بھوانی شنکر کو ریوالور سے ہلاک کر دیا۔ بھوانی شنکر بیشک مُجرم تھا لیکن میں مجرم نہیں ہوں بلکہ انٹیلیجنس کے ڈائریکٹر جنرل کا قابل اعتماد دوست ہوں۔ فرہاد عقل کے ناخن لو ذرا شبیر حسن کو دیکھو کیا انہیں دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ ان پر تنویمی عمل کا اثر ہے؟"

میں نے شبیر حسن کی جانب دیکھا۔ واقعی وہ بالکل نارمل تھے۔ انٹیلیجنس کے آفیسر اس بات کا کبھی یقین نہ کرتے کہ بلیک گائیڈ نے ہپناٹزم کے ذریعہ انہیں اپنا تابع فرمان بنا رکھا ہے۔

میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ اس وقت میری پوزیشن کتنی خراب ہے۔ ڈائریکٹر جنرل میرے مخالف ہیں۔ وہ میرے خلاف اپنے ماتحتوں سے جو کچھ بھی کہتے اس پر سبھی یقین کر لیتے۔ بلیک گائیڈ ان کا عزیز بن کر خود کو قانون کی گرفت سے بچا لیتا۔ لیکن نہیں مجھے اچانک ہی خیال آیا کہ اس عمارت میں ایسے کاغذات ہیں جو بلیک گائیڈ کی تخریبی کارروائیوں کو بے نقاب کر سکتے ہیں۔

اب مجھے معلوم کرنا تھا کہ وہ کاغذات کہاں چھپا کر رکھے گئے ہیں۔ بلیک گائیڈ سے پوچھنے پر وہ کبھی نہ بتاتا۔ اس لئے میں نے بظاہر پریشانی کا اظہار کیا اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر یوں بیٹھ گیا۔ جیسے میں اس کے جال میں پھنس چکا ہوں۔

میں اس وقت خاموشی سے بلیک گائیڈ کی سوچ کو پڑھ رہا تھا۔ وہ میرے متعلق سوچ رہا تھا۔

اب اسے عقل آئی ہے۔ اب یہ اچھی طرح سمجھ گیا ہے کہ میرے خلاف ثبوت فراہم نہیں کر سکے گا۔ اس پر ترپ چال یہ کہ انٹیلیجنس کا ڈائریکٹر

جنرل میرا حمایتی ہے۔"

میں نے اس کی سوچ میں کہا۔

"یہاں تک سب کچھ ٹھیک ہے۔ سب کچھ میری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ لیکن اپنی کمزوریوں کو بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انٹیلیجنس کا [illegible] اس مکان کی تلاشی لے۔ اور وہ کاغذات اس کے ہاتھ لگ جائیں۔"

بلیک گائیڈ کی سوچ نے کہا۔

"ان کے فرشتے بھی ان کاغذات تک نہیں پہنچ سکتے۔ میں نے ان کاغذات کو . . . . .:"

یہ سوچتے سوچتے وہ ایک دم چونک گیا۔ اور میری جانب حیرانی سے دیکھنے لگا۔ یک بیک اُسے یاد آگیا تھا کہ میں اس کی سوچ کو پڑھ لیتا ہوں وہ جھلا کر بولا۔

"تم بہت بڑے شیطان ہو۔ کیا تم میری سوچ کو نہیں پڑھ رہے ہو؟"

میں ایک گہری سانس لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اب اس کی سوچ کو پڑھنا فضول تھا۔ اب وہ میری ہزار کوششوں کے باوجود کاغذات کے متعلق کبھی نہ سوچتا۔ اور نہ ہی مجھے وہاں تک پہنچنے کا راستہ بتلاتا۔

میں صوفے سے اُٹھ کر بلیک گائیڈ کے پاس آیا۔ اس کی جیبوں کی تلاشی لے کر چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور مختلف کمروں میں جا کر مختلف الماریوں اور میز کی درازوں کو کھول کر دیکھنے لگا۔ الماریوں میں صرف کپڑے تھے اور وہاں ایک ہی میز تھی۔ جس کی درازوں میں اسٹیشنری کا سامان رکھا ہوا تھا۔ میرے کام کا ایک بھی کاغذ ہاتھ نہ آیا۔ تلاشی کے دوران میں نے یہ نہیں سوچا کہ وقت ضائع کر رہا ہوں کیوں کہ بلیک گائیڈ کی سوچ نے کہا تھا کہ فرشتے بھی ان کاغذات تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کاغذات اسی عمارت میں کچھ ایسے انداز میں چھپا کر رکھے گئے ہیں کہ وہاں تک پہنچنے کا کوئی سائنٹیفک طریقہ صرف بلیک گائیڈ ہی جانتا تھا۔

اتنے میں باہر ایک گاڑی رُکنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ انٹیلیجنس کا ایک آفیسر تین مُسلح نوجوانوں کے ساتھ ایک جیپ کار سے اُتر رہا تھا۔ اپنے ڈائریکٹر جنرل سے فون پر بات کرنے کے بعد اس آفیسر نے یہی سوچا ہوگا کہ مجرم صرف ایک ہی ہے اور وہ فرہاد ہے۔ اس اکیلے کو حراست میں لینے کے لئے دو مسلح نوجوان کافی ہیں تیسرے نوجوان کو وہ گاڑی کے پاس چھوڑ کر عمارت کے اندر آگیا۔ جب وہ اس کمرے میں پہنچا جہاں بلیک گائیڈ بندھا پڑا تھا۔ تو میں بھی آفیسر کے سامنے حاضر ہو گیا۔ میرے ہاتھ میں شبیر حسن سے چھینا ہوا ریوالور تھا۔ اسے دیکھتے ہی آفیسر نے کہا۔ "فرہاد وہ ریوالور میرے حوالے کر دو۔ جب تک تمہاری بے گناہی کا ثبوت نہیں ملے گا۔ اُس وقت تک تم حراست میں رہو گے۔"

اس کے دونوں ماتحت میری طرف ریوالور تانے کھڑے تھے یوں بھی میں قانون سے ٹکرانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے اپنا ریوالور آفیسر کے قریب صوفے پر پھینک دیا۔

شبیر حسن نے اُس ریوالور کو اُٹھا کر ایک رومال میں لپیٹتے ہوئے کہا۔

" اس پر فرہاد کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔ اس نے اسی ریوالور سے اس مجرم کو ہلاک کیا ہے جو ہسپتال میں زیر علاج تھا۔ اور یہ اسی مجرم کی لاش ہے۔"

میں نے آفیسر سے کہا۔

"میں نے اسے قتل نہیں کیا ہے۔ ڈائریکٹر جنرل اپنے ہوش میں نہیں ہیں میری درخواست ہے کہ سب سے پہلے ان کا طبی معائنہ کرایا جائے۔ طبی معائنے سے شاید اس بات کا ثبوت مِل جائے کہ یہ تنویمی عمل کے زیر اثر ہیں۔"

آفیسر نے غور سے اپنے ڈائریکٹر جنرل کو دیکھا پھر بے یقینی سے بولا "یہ تو بالکل نارمل ہیں۔ میں یہ کیسے یقین کر لوں کہ انہیں ہپناٹائز کیا گیا ہے؟"

شبیر حسن نے غصے سے کہا۔

"یہ بکواس کرتا ہے۔ قانون سے بچنے کے لئے میرے متعلق اُلٹی سیدھی باتیں کر رہا ہے۔ اسے ہتھکڑی پہنا دو میں عدالت میں اس سے [illegible] لوں گا۔"

آفیسر نے ایک نوجوان کو اشارہ کیا کہ وہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دے۔ میں نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"ٹھہریئے، پہلے یہاں کی کارروائی پوری کر لیجئے۔ یہ شخص جو بندھا ہوا پڑا ہے یہ غیر ملکی ایجنٹوں کا سرغنہ ہے۔ آفیسر آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اس مقتول کے جبڑے سے ایک مائیکرو فلم برآمد کرائی تھی۔ اس سے ثابت ہو گیا تھا کہ یہ مقتول ایک غیر ملکی ایجنٹ ہے۔ اگر آپ مجھے موقع دیں۔ تو میں یہ بھی ثابت کر دوں گا کہ یہ بندھا ہوا شخص جو اپنے لوگوں میں بلیک گائیڈ کہلاتا ہے۔ یہاں اب تک تخریبی کارروائیاں کرتا رہا ہے۔ یہاں کچھ ایسے اہم کاغذات چھپا کر رکھے گئے ہیں۔ جو اس کی مجرمانہ کارروائیوں کو بے نقاب کر سکتے ہیں۔ میں ابھی انہی کاغذات کو تلاش کر رہا تھا۔ لیکن اپنی ناکامی کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس نے ان کاغذات کو اسی عمارت میں کسی سائنٹیفک طریقے سے چھپا رکھا ہے۔"

میری باتیں سُن کر آفیسر نے شبیر حسن سے کہا۔

"سر! اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فرہاد پچھلے دنوں ہمارے کام آتا رہا ہے۔ ہم نے اسی کی مدد سے مائیکرو فلم برآمد کی تھی۔ اس کی صلاحیتوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ چھپی ہوئی چیزوں کا سُراغ لگا لیتا ہے۔"

آفیسر نے میری حمایت میں یہ بات کہی تو میرا حوصلہ [illegible] ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ اب ہر ممکن طریقے سے اس آفیسر کو پوری طرح اپنے اعتماد میں لینا چاہیئے ورنہ میں مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی ایک قتل کے جُرم میں ملوث ہو جاؤں گا۔ ثبوت کے طور پر میری انگلیوں کے نشانات ریوالور پر موجود ہیں اور انٹیلیجنس

کا ڈائریکٹر جنرل میرے خلاف ایک چشم دید گواہ تھا۔ میں نے آفیسر سے کہا۔
"میں تنہائی میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"
ڈائریکٹر جنرل نے فوراً ہی اعتراض کیا۔
"نہیں تم میرے ماتحت کو تنہائی میں ... کا ... چاہتے ہو"
آفیسر نے کہا۔
"... کیا حرج ہے اگر فرہاد کے کہنے کے مطابق اس عمارت کی تلاشی لی جائے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ کتنا ہی بڑا فراڈ ہو۔ مجھے نہیں بہکا سکے گا۔"
بلیک گائیڈ نے کہا۔
"شبیر حسن اگر تمہارا آفیسر تنہائی میں فرہاد سے باتیں کرنا چاہتا ہے تو اسے اجازت دیدو۔ اگر یہ بہک گیا تو تمہارے دوسرے ماتحت یہاں موجود ہیں۔ اس وقت بہکنے والا آفیسر بھی مجرم سمجھا جائے گا۔ اپنے آفیسر سے کہو کہ یہ اپنا ریوالور تمہارے حوالے کر دے۔ اس کے بعد فرہاد سے تنہائی میں باتیں کرنے جائے۔"
آفیسر کو یہ بات ناگوار گزری کہ اس پر اعتماد نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس نے ڈائریکٹر جنرل کی طرف دیکھا تو اسے مایوسی ہوئی۔ کیونکہ ڈائریکٹر جنرل بلیک گائیڈ کے مشورے پر عمل درآمد کر رہا تھا اور بڑی خاموشی سے ہاتھ بڑھا کر اس سے ریوالور طلب کر رہا تھا۔ وہ ڈائریکٹر جنرل کے حکم سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر ان کے حوالے کیا۔ پھر میرے ساتھ دوسرے کمرے میں آگیا۔ میں نے اس سے کہا۔
"آفیسر آپ نے دیکھ لیا ہے کہ ڈائریکٹر جنرل کس طرح بلیک گائیڈ کے اشاروں پر چل رہے ہیں۔ انہیں کم از کم آپ پر اعتماد کرنا چاہئے تھا۔ بہرحال آپ سمجھدار ہیں۔ اس چھوٹے سے تجربے سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ بلیک گائیڈ تنویمی عمل کے زیر اثر انہیں اپنے اشاروں پر نچا رہا ہے۔"
میری باتیں سن کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر کہا "میں آپ سے بہت ہی ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ٹھنڈی دیر کے لئے مجھ پر اعتماد کریں اور دروازے کو اندر سے بند کر دیں۔"
اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ اور وہاں سے پلٹ کر بولا۔
"کہو اب کیا کہنا چاہتے ہو ——؟"
میں نے کہا۔
"پچھلے دنوں آپ کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ مجھ میں سونگھنے کی صلاحیت ہیں۔ میں ایک بار کسی انسان کی بو سونگھ کر یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ کس وقت کس جگہ پر ہوگا اور کیا کر رہا ہوگا۔ یہ تجربہ آپ کے سامنے ہو چکا ہے۔"
اس نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔
"ہاں! تم نے اس مجرم کے جبڑے میں چھپی ہوئی اس مائیکرو فلم کی بو کو سونگھ لیا تھا۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔
"ہاں! یہ درست ہے۔ لیکن آپ کو یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ یہ سب کچھ سونگھنے کی صلاحیتوں سے نہیں معلوم کیا تھا۔ دراصل میں ٹیلی پیتھی کے علم سے واقف ہوں اور ہر انسان کی سوچ کو پڑھ لیتا ہوں۔"
وہ حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔
"کیا میں اس کی بات کا یقین کر لوں۔ کبھی یہ کہتا ہے کہ ڈائریکٹر جنرل کو ہپناٹائز کیا گیا ہے۔ کبھی یہ کہتا ہے کہ یہ ٹیلی پیتھی جانتا ہے۔ ان علوم کے بارے میں اب تک میں نے قصے کہانیوں میں پڑھا ہے یا معلوماتی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن آج تک عملی تجربے کی صورت میں اسے نہیں دیکھا۔"
میں مسکراتے ہوتے اس کی سوچ کو دہرانے لگا۔
"آفیسر آپ اس وقت سوچ رہے ہیں کہ ہپناٹزم اور ٹیلی پیتھی قصہ کہانیوں کی باتیں ہیں۔"
میں نے حرف بہ حرف اس کی سوچ کو دہرا دیا۔ وہ چونک پڑا اور شدید حیرانی سے میرا منہ تکنے لگا۔ میں نے پھر اس کی سوچ کو پڑھنے کے بعد کہا۔
"اس وقت آپ سوچ رہے ہیں کمال ہے یہ شخص تو واقعی میری سوچ کو پڑھ رہا ہے۔"
وہ ایک دم سے متاثر ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے دونوں بازوؤں کو تھام کر جوشیلے انداز میں کہا۔
"خدا کی قسم تم لاجواب ہو۔ اب میں سمجھ گیا کہ تم نے اس مجرم کی سوچ کو پڑھ کر اس مائیکرو فلم کا پتہ چلایا تھا۔ اس فلم کی بو نہیں سونگھی تھی۔"
میں نے پوچھا۔
"کیا اب آپ میری باتوں کا یقین کریں گے؟"
اس نے کہا۔
"ہاں اس ٹیلی پیتھی کی صلاحیت سے تم ایک خطرناک مجرم بن سکتے ہو۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ پچھلے دنوں بھی تم نے ہمارا ساتھ دیا تھا اور اب بھی قانون کا ساتھ دے رہے ہو۔ کیا تم اس علم کے ذریعے معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ اہم کاغذات کہاں چھپا کر رکھے گئے ہیں؟"
میں نے جواب دیا۔
"بلیک گائیڈ میرے اس راز سے واقف ہے کہ میں خیال خوانی کا علم جانتا ہوں۔ اسے یہ بات آپ کے ڈائریکٹر جنرل نے بتائی ہے اسی لئے بلیک گائیڈ بہت زیادہ محتاط ہے۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ اسے اہم کاغذات کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دوں۔ لیکن وہ ہر بار میری مرضی کے مطابق سوچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اتنا مجھے یقین ہے کہ میں ان اہم کاغذات کو اس کے ذہن سے اگلوا لوں گا۔ لیکن اس میں کچھ وقت لگے گا۔ پہلے میں سوچ کے ذریعے اس کے دماغ میں ہلچل مچاؤں گا۔ اسے ذہنی طور پر مفلوج بنا دوں گا۔ پھر وہ کاغذات کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جائے گا۔ یہ کام میں بہت پہلے کر چکا

"آپ کے ڈائریکٹر جنرل مجھے اس کا موقع نہیں دے رہے ہیں۔"
آفیسر نے میرے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔
"میں تمہیں اس کا موقع دوں گا میرے ساتھ آؤ۔"
وہ میرا بازو پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے رکتے ہوئے کہا "ٹھہریئے۔ اچھی طرح سوچ لیجئے۔ کیا آپ اپنے ڈائریکٹر جنرل کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکیں گے؟"
اُس نے جواب دیا۔
"وہ اسی وقت تک ڈائریکٹر جنرل ہیں۔ جب تک کہ قانون کا احترام کرتے ہیں۔ اگر انہوں نے مجھے قانونی کارروائیوں سے روکا تو میں ان کی ذرا بھی پرواہ نہیں کروں گا۔"
میں مطمئن ہو کر اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ پھر ہمارے قدم آگے نہ بڑھ سکے ہم ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ ڈائریکٹر جنرل اور وہ دونوں مسلح نوجوان ہماری طرف ریوالور تانے کھڑے تھے۔ ڈائریکٹر جنرل نے تحکمانہ انداز میں آفیسر سے پوچھا۔
"بتاؤ تمہارے متعلق کیا فیصلہ کیا جائے۔ تم فرہاد کی باتوں میں آ گئے اور میرے حکم پر عمل کرو گے؟"
آفیسر نے جواب دیا۔
"میں وہی کروں گا جو قانون کا تقاضہ ہے۔ میں فرہاد کو موقع دوں گا اور اس بندھے ہوئے آدمی کو مجرم ثابت کرے۔"
بلیک گائیڈ نے چیخ کر کہا۔
"میں پہلے ہی سمجھتا تھا کہ یہ آفیسر اس کی باتوں میں آجائے گا۔ شبیر حسن میں حکم دیتا ہوں۔ فائر کر دو۔"
اس کے حکم کے مطابق شبیر حسن نے فائر کیا۔ اس کے ساتھ ہی آفیسر کی چیخ ابھری گولی اس کے سینے سے آر پار ہو گئی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ دوسرا فائر مجھ پر ہوتا۔ میں چھلانگ لگا کر واپس کمرے میں آیا اور فرش پر گر پڑا۔ میں بُری طرح حالات کے شکنجے میں آگیا تھا۔ بلیک گائیڈ جیسا مجرم اور شبیر حسن جیسا قانون کا محافظ دونوں ہی پوری طرح میری موت کا سامان کر چکے تھے۔

میں بال بال بچا تھا اگر کمرے کا دروازہ بند کرتے ہی میں زمین پر گر نہ پڑتا تو انٹیلی جنس کے آفیسر کی طرح گولیوں کا نشانہ بن چکا ہوتا۔ میرے زمین پر گرتے ہی کئی فائر ہوئے۔ گولیاں دروازے میں دو سوراخ پیدا کرتی ہوئی کہیں سے نکل گئیں۔ میں چند لمحوں تک سانس روکے چپ چاپ پڑا رہا۔
میرے خیال کے مطابق معاملات سنگین ہو چکے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ بلیک گائیڈ ایک بیرونی ملک کا ایجنٹ تو میرا دشمن تھا ہی اس کے ساتھ اپنے ملک کے انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر بھی میری دشمنی کر رہا تھا۔ ایسی صورت میں میں اپنے ملک کے قانون کی پناہ میں بھی نہیں جا سکتا تھا حتیٰ کہ فریاد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کمرے سے نکلنے ہونے

... کے لئے ایک دروازہ تھا اور ایک کھڑکی تھی۔ دروازے پر ڈائریکٹر جنرل ڈٹا کھڑا تھا۔ میں ... کھڑکی کے پاس آیا۔ وہاں سے جھانک کر دیکھا تو باہر انٹیلی جنس والے ... کھڑکی کے قریب وہاں کھڑا ہوا ایک مسلح نوجوان نگرانی کر رہا تھا۔ ... ہوئی سے ... کی جانب کھلتا تھا۔ کھڑکی میں آہنی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں بری طرح اس کمرے میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی وقت بلیک گائیڈ نے چیخ کر مجھے مخاطب کیا۔
"فرہاد اب تمہاری جان نہیں بچے گی۔ تم اپنے سارے ہتھکنڈے آزما لو تب بھی تمہیں خود کو قانون کے حوالے کرنا ہوگا۔ بہتر ہے کہ دروازہ کھول کر چپ چاپ باہر آجاؤ۔"
میں دیوار سے لگا لگا دروازے کے قریب آیا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آرہی تھی کہ فی الحال خود کو دشمنوں کے حوالے کرنا ہی ہوگا۔ اس کے سوا کوئی دوسری صورت نظر نہیں آرہی تھی لیکن میں آخر وقت تک یہی کوشش کرنا چاہتا تھا کہ کسی طرح ان کے گھیرے سے نکل جاؤں۔
لیکن مزید کچھ کوشش کرنے سے پہلے اچانک ہی بازی پلٹ گئی۔ کمرے کے باہر ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن کے ساتھ جو دو مسلح نوجوان کھڑے ہوئے تھے ان میں سے ایک نوجوان کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے ڈائریکٹر جنرل سے کہہ رہا تھا۔
"گستاخی معاف کیجئے گا میرے ریوالور کی نال آپ کی گردن پر ہے۔ اگر آپ نے ذرا بھی حرکت کی تو میں آپ کو شوٹ کر دوں گا۔ آپ چپ چاپ اپنا ریوالور میرے حوالے کر دیں۔"
ڈائریکٹر جنرل نے جھنجھلا کر کہا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے میں تمہارا ڈائریکٹر جنرل ہوں کیا تم میرا ساتھ چھوڑ کر فرہاد جیسے مجرم کا ساتھ دینا چاہتے ہو۔"
"فرہاد مجرم ہے یا نہیں اس کا فیصلہ عدالت میں ہوگا فی الحال ہماری نظروں میں آپ مجرم ہیں۔ آپ کو جواب دینا ہوگا کہ آپ نے اپنے ایک افسر کو کس جرم کی بنا پر گولی ماری ہے؟"
اس فرض شناس نوجوان کی باتیں سن کر میرا حوصلہ بلند ہو گیا وہ بڑے موقع سے اپنے ڈائریکٹر جنرل کو مجرم ثابت کر رہا تھا۔ ڈائریکٹر جنرل اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔
"ہمارا یہ افسر فرہاد کا ساتھ دے کر قانون شکنی کر رہا تھا۔"
"ایسی قانون شکنی کی سزا موت نہیں ہوتی۔ پھر یہ کہ آپ قانون سے زیادہ اس بلیک گائیڈ کے فرمانبردار ہیں۔ ابھی اس نے آپ کو حکم دیا تھا کہ شبیر حسن فائر کرو۔ اور آپ نے ایک قابل اور فرض شناس افسر پر گولی چلادی۔"
دوسرے نوجوان کی آواز سنائی دی۔ "ہاں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ واقعی اس مجرم بلیک گائیڈ نے آپ کو ہپناٹائز کیا ہے آپ اس کے ہر حکم پر عمل کرتے ہیں اور اس وقت بھی آپ نے اس کے حکم پر گولی چلائی ہے۔ آپ خود کو زیر حراست سمجھیں میں ابھی فون کر کے دوسرے افسر کو طلب کرتا ہوں وہ یہاں آکر اس کیس کو ہینڈل کریں گے۔"
اس کے بعد چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی۔ شاید وہ نوجوان

ٹیلی فون کی طرف گیا تھا تھوڑی دیر بعد دوسرے نوجوان نے بلند آواز سے مجھے مخاطب کیا۔

"مسٹر فرہاد! ہم نے ڈائریکٹر جنرل سے ریوالور لے لیا ہے آپ باہر آ کر خود کو قانون کے حوالے کر دیں ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔"

میں نے باہر آنے سے پہلے اس نوجوان کی سوچ کو پڑھنا شروع کیا۔ میں یقین کرنا چاہتا تھا کہ واقعی ڈائریکٹر جنرل کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا گیا ہے یا مجھے کمرے سے باہر نکالنے کے لئے محض ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔ میں نے اس نوجوان کی سوچ میں کہا۔

"میں قانون کا محافظ ہوں کیا مجھے قانونی طور سے فرہاد کی حمایت کرنی چاہیئے؟"

اس نوجوان کی مثبت سوچ نے کہا۔

"ہاں ابھی تک تو وہ بے قصور ہی نظر آ رہا ہے۔ ہمارا یہ افسر بھی اس کی حمایت کر رہا تھا۔ لیکن یہ حمایت اسے بڑی مہنگی پڑتی کچھ بھی ہو ڈائریکٹر جنرل کو اس جرم کی سزا ضرور ملے گی۔"

اس نوجوان کی سوچ سے میں نے سمجھ لیا کہ واقعی وہ دونوں ڈائریکٹر جنرل کے خلاف ہیں اور اسے حراست میں لے چکے ہیں۔ میں مطمئن ہو کر دروازہ کھولتے ہوئے باہر آ گیا۔ دوسرے کمرے میں ڈائریکٹر جنرل ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور ایک نوجوان اپنے ریوالور کا رخ اس کی طرف کئے کھڑا ہوا تھا۔ اس نوجوان نے مجھ سے کہا۔

"مسٹر فرہاد آپ بھی ڈائریکٹر جنرل کے پاس آ کر بیٹھ جائیں اور ہماری اجازت کے بغیر کوئی حرکت نہ کریں ہمارے ایک افسر یہاں پہنچنے ہی والے ہیں اس وقت تک ہم کوئی ہنگامہ پسند نہیں کریں گے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی دوسرا نوجوان ہمارے قریب آیا۔ اور اس نے ایک ہتھکڑی میرے اور شبیر حسن کے ایک ایک ہاتھ میں پہنا دی۔ میں ان الجھنوں سے بچنا چاہتا تھا اور یہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ قانونی فیصلہ ہونے تک میرا کتنا قیمتی وقت برباد ہو گا۔ یہ کوئی معمولی کیس نہیں تھا۔ اس کا فیصلہ ہونے تک نہ جانے کتنے ماہ اور کتنے سال گذر جاتے؟

اب قانون کی گرفت میں آنے کے بعد میں یہ سوچ رہا تھا کہ کتنی جلدی ان قانونی کارروائیوں سے نجات حاصل ہو سکے گی؟ ایک گھنٹے کے بعد انٹیلیجنس کی عمارت میں مجھے شبیر حسن کو اور بلیک گائیڈ کو الگ الگ لاک اپ میں رکھا گیا تھا۔ ڈائریکٹر جنرل کے ساتھ رعایت نہیں برتی گئی تھی کیونکہ اس نے اپنے ہی انٹیلیجنس کے ایک افسر کو قتل کیا تھا، جس ریوالور سے اس نے قتل کیا تھا وہ ریوالور انگلیوں کے نشانات کی تشخیص کے لئے بھیج دیا گیا تھا۔

بلیک گائیڈ سے جبراً یہ اگلوایا گیا کہ اس نے شبیر حسن کو ہپناٹائز کیا ہے پہلے تو انکار کرتا رہا۔ آخر ایک افسر نے اسے دو چار ہاتھ جما کر کہا۔

"دیکھو ہمارے ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن ایک مجرم کی طرح کھڑے ہوئے ہیں۔ مجرم کو صوفے یا کرسی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جاتی اس لئے ہم انہیں بیٹھنے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں لیکن تم ایک عامل کی طرح انہیں حکم دو کہ یہ صوفے پر بیٹھ جائیں۔"

بلیک گائیڈ نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں۔ بھلا میں کون ہوتا ہوں حکم دینے والا میں بھی ایک مجرم کی حیثیت سے یہاں لایا گیا ہوں میں انہیں حکم نہیں دے سکتا۔"

اس کی بات سن کر افسر نے اچھی طرح اس کی پٹائی شروع کر دی کافی لات جوتے کھانے کے بعد اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"مجھے نہ مارو آپ جو کہیں گے میں وہ کروں گا۔"

افسر نے کہا۔

"تو پھر شبیر حسن سے تحکمانہ انداز میں کہو کہ وہ صوفے پر بیٹھ جائیں اس سے پہلے ہم شبیر حسن کو حکم دیتے ہیں کہ وہ کسی کے حکم پر صوفے پر نہ بیٹھیں۔"

اس کے بعد بلیک گائیڈ نے جھجکتے ہوئے حکم دیا۔

"شبیر حسن میں حکم دیتا ہوں صوفے پر بیٹھ جاؤ۔"

اس کا حکم سنتے ہی شبیر حسن فوراً ہی صوفے پر بیٹھ گئے ان کی اس حرکت پر بے اختیار مجھے ہنسی آ گئی۔ اس وقت میں لاک اپ میں تنہا بیٹھا ہوا تھا اور وہاں سے دور عمارت کے ایک کمرے میں شبیر حسن اور بلیک گائیڈ کے ساتھ جو کارروائیاں کی جا رہی تھیں انہیں میں ان کی سوچ کے ذریعہ سن رہا تھا اور چشم تصور میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں مسلح نوجوانوں میں سے ایک نوجوان نے اپنے افسر سے کہا۔

"سر اس مجرم بلیک گائیڈ نے سبز کوٹھی میں بھی اسی طرح ڈائریکٹر جنرل کو حکم دیا تھا کہ یہ فائر کرے اور اس کمبخت کے حکم پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے اپنے ہی افسر کو گولی مار دی۔"

اس کی باتیں سن کر وہ افسر پھر بلیک گائیڈ کی پٹائی کرنے لگے جب وہ ہاتھ جوڑنے اور پاؤں پڑنے لگا تو ایک افسر نے کہا۔

"اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو شبیر حسن کو فوراً اپنے تنویمی عمل سے آزاد کرو۔"

بلیک گائیڈ نے اس کے حکم کے مطابق شبیر حسن کو حکم دیا کہ وہ فرش پر لیٹ جائیں۔ شبیر حسن اس کے حکم کے مطابق صوفے سے اٹھ کر فرش پر لیٹ گیا۔ بلیک گائیڈ ... ان کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔

"شبیر حسن میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ آدھ گھنٹے کے لئے گہری نیند سو جاؤ اس نیند کے بعد تم میرے معمول اور محکوم نہیں ہو گے۔"

شبیر حسن نے اس کی بات دہرائی۔ "میں گہری نیند سو جاؤں گا اور آدھ گھنٹے کی نیند کے بعد آپ کا معمول اور محکوم نہیں رہوں گا۔"

بلیک گائیڈ نے بدستور ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری آنکھیں بند ہو رہی ہیں تمہیں نیند آ رہی ہے اور تم گہری نیند میں ڈوبتے جا رہے ہو۔" اس کے کہتے کہتے شبیر حسن کی آنکھیں بند ہو گئیں اور تھوڑی دیر میں وہ گہری نیند سو گیا۔ بلیک گائیڈ سر جھکائے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ قانون کی گرفت میں آنے کے بعد ہر طرف سے مایوس ہو کر وہ بار بار شٹیل کے متعلق سوچ رہا تھا کہ وہ کمبخت کہاں مر گیا ہے؟ اسے اس کی مدد کے لئے سبز کوٹھی پہنچنا چاہیئے تھا لیکن وہ سبز کوٹھی میں پلٹ کر نہیں آیا تھا اس کی طرف سے کوئی خبر نہیں مل رہی تھی بلیک گائیڈ یہی سوچ رہا تھا کہ وہ بھی کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے یا پھر موقع کی تاک میں ہے اس کا داؤ چلتے ہی وہ اس عمارت سے نکال کر لے جائے گا۔ میں اس کی خوش فہمی پر مسکرانے لگا۔ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ شٹیل جیسا خطرناک انسان میرا غلام بے دام بنا ہوا ہے جس طرح اس نے شبیر حسن کو ہپناٹائز کر کے اپنا آلۂ کار بنایا تھا اسی طرح اس کا شٹیل میرا آلۂ کار بنا ہوا تھا۔

اس دوران مجھے بھی اس کمرے میں طلب کیا گیا وہاں مجھ سے کئی طرح کے سوالات کئے گئے۔ میں اپنے طور پر مناسب اور معقول جواب دیتا رہا۔ انٹیلیجنس کے افسر میری بے گناہی کو سمجھ رہے تھے لیکن عدالتی فیصلے سے پہلے مجھے آزاد نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے وقتی طور پر رہا کرنے کے لئے بھی کسی بہت بڑی سفارش یا ضمانت کی ضرورت تھی۔

تقدیر میرا ساتھ دے رہی تھی۔ آدھ گھنٹے بعد ہی ضمانت کا انتظام ہونے لگا شبیر حسن کی آنکھ کھلنے لگی۔ وہ چند لمحوں تک کمرے کے فرش پر پڑے رہے اور آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوچتے رہے کہ وہ اس وقت کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور اپنے ماتحت افسروں کو حیرانی سے تکنے لگے۔

"کیا بات ہے مجھے اس فرش پر کیوں سلایا گیا ہے میں تو ہوٹل دلکشا کے کمرہ نمبر تین میں تھا۔"

ایک افسر نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

"سر آپ ہوٹل دلکشا کے کمرہ نمبر تین میں کیوں گئے تھے؟"

شبیر حسن نے فرش پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں ایک بہت بڑے مجرم کو گرفتار کرنے گیا تھا۔ فرہاد نے مجھے آگاہ کیا تھا کہ وہ مجرم اس کمرے میں آرام سے بیٹھا ہوا قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی فرہاد نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں ابھی اس مجرم کو گرفتار نہ کروں لیکن میں نے اس کے مشورے کو تسلیم نہیں کیا۔ اب میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے دو بار فرہاد کے اہم مشوروں کو ٹھکرایا اور دونوں بار مجھے بہت نقصان اٹھانا پڑا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے میری جانب دیکھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو میرے قریب فرش پر بیٹھے ہوئے بلیک گائیڈ کو بھی انہوں نے دیکھ لیا۔ پھر وہ بلیک گائیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"ارے یہ تو وہی ہے جب میں ہوٹل دلکشا کے کمرہ نمبر ۳ میں بلیک گائیڈ کو گرفتار کرنے گیا تو وہاں یہی شخص موجود تھا۔ اس نے اپنا نام ڈاکٹر شیرازی بتایا تھا۔ میں نے اس سے پاسپورٹ طلب کیا اور اسے بتایا کہ میں پولیس کا بہت بڑا افسر ہوں تو اس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے اس سے مصافحہ کیا تھا۔ اس کے بعد کے واقعات مجھے یاد نہیں آ رہے ہیں۔ یہ آپ ہی لوگ بتا سکتے ہیں کہ میں دلکشا ہوٹل سے یہاں کیسے پہنچ گیا؟"

میں نے ان سے کہا۔ "آپ پچھلی رات دلکشا ہوٹل گئے تھے وہاں اس ڈاکٹر شیرازی نے جو دراصل بلیک گائیڈ ہے آپ سے مصافحہ کیا تھا۔ مصافحہ کے دوران اس نے اپنی انگوٹھی کے ذریعہ آپ کی ہتھیلی میں ایک ایسی دوا انجیکٹ کی تھی جس سے آپ فوراً ہی ذہنی طور پر مفلوج ہو گئے تھے۔ آپ کے ذہن کو کمزور بنانے کے بعد اس نے ہپناٹزم کے ذریعہ آپ کو اپنا معمول بنا لیا۔ اس وقت سے اب تک آپ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے رہے تھے۔ اس نے تنویمی عمل کے ذریعہ اپنا معمول بنا کر آپ کو قاتل بھی بنا دیا ہے۔ آپ نے دو قتل کئے ہیں۔"

شبیر حسن نے چونک کر سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

"نہیں میں نے کوئی قتل نہیں کیا۔ فرہاد یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں قانون کا احترام کرتے کرتے بوڑھا ہو گیا ہوں کیا اس عمر میں ... قانون شکنی کروں گا؟"

"آپ نے دانستہ ایسا نہیں کیا ہے۔ لیکن ہپناٹزم کا علم ہی ایسا ہے جہاں اس علم کے بہت سے افادی پہلو ہیں وہاں اس کے ذریعہ بہت سی تخریبی کارروائیاں بھی کی جاتی ہیں۔ عامل بڑی آسانی سے کسی کو بھی اپنا معمول بنا کر اس سے ہر اچھے برے کام لے سکتا ہے۔ بلیک گائیڈ نے بھی یہی کیا۔ اس کے حکم سے آپ نے پہلے بھوانی شنکر کو شوٹ کیا۔ رہی بھوانی شنکر جس کے جبڑے سے مائکرو فلم نکالی گئی تھی اس کے بعد آپ نے اپنے ہی انٹیلیجنس کے ایک قابل افسر کو قتل کیا تھا۔"

وہ میری باتیں سن رہے تھے اور مجھے بے یقینی سے دیکھ رہے تھے۔ اتنا تو وہ جانتے تھے کہ ہپناٹزم کے ذریعہ بڑے بڑے جرم کئے جا سکتے ہیں لیکن وہ یہ یقین نہیں کرنا چاہتے تھے کہ وہ خود کسی کے معمول بن گئے تھے۔ اور اس کے زیر اثر انہوں نے دو قتل کئے ہیں۔ مگر وہاں کھڑے ہوئے تمام افسروں نے میری تائید کی اور انہیں ایک کمرے میں لے جا کر بھوانی شنکر اور اس افسر کی لاشیں دکھائیں۔ جب وہ اس کمرے سے واپس آئے تو پسینہ پسینہ ہو رہے تھے ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ کھڑے نہ رہ سکے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"یہ مجھ سے کیا ہو گیا؟ یہ درست ہے کہ اس کمبخت نے مجھے ہپناٹائز کر لیا۔ میں نے نادانستگی میں دو قتل کئے ہیں۔ میں قاتل بھی ہوں اور معصوم اور مظلوم بھی۔ جب تک میری معصومیت ثابت نہ ہو اس وقت تک میں مجرم ہوں بحیثیت مجرم مجھے اس صوفے پر نہیں بیٹھنا چاہیئے لیکن آپ لوگوں سے درخواست ہے کہ مجھے تھوڑی دیر یہاں بیٹھنے کی اجازت دیں۔ میرے پاؤں کانپ رہے ہیں اور قدموں تلے سے زمین نکلی جا رہی ہے۔"

ایک سینئر افسر نے آگے بڑھ کر مؤدبانہ انداز میں کہا۔

"سر آنشر آل آپ ہمارے ڈائریکٹر جنرل ہیں اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بلیک گائیڈ نے تنویمی عمل کے ذریعہ آپ کو اپنا معمول بنایا تھا ایسی حالت میں ہر شخص مجبور و محکوم بن کر رہ جاتا ہے ہم عدالت میں آپ کی بے گناہی ثابت کریں گے عدالت کے فیصلے تک اگرچہ آپ ہمارے ڈائریکٹر جنرل نہیں رہیں گے اس کے باوجود آپ کا احترام لازمی ہے آپ جہاں بیٹھ سکتے ہیں۔ عدالت کے فیصلے تک آپ کے ساتھ اسپیشل ٹریٹمنٹ ہوگا۔"

میں نے سینئر افسر سے کہا۔

"جناب میری التجا ہے کہ میرے ساتھ بھی کچھ رعایت برتی جائے۔ میں نے قانون کا ساتھ دینے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔"

سینئر افسر نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

"ہاں جناب شبیر حسن صاحب کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ تم بے قصور ہو۔ اس کے علاوہ ہمارا اب تک کا مشاہدہ یہی ہے کہ تم نے مجرموں کے خلاف اب تک قانون کا ساتھ دیا ہے۔"

میں نے کہا: "میں اب بھی آپ کے کام آ سکتا ہوں اور اس بلیک گائیڈ کے متعلق بہت سی اہم معلومات فراہم کر سکتا ہوں۔"

بلیک گائیڈ نے چونک کر مجھے دیکھا اور سوچنے لگا: "یہ کمبخت میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ خیال کا رابطہ قائم کر کے ہمیشہ مجھے پریشان کرتا رہے گا۔ لیکن میں پوری قوتِ ارادی سے کام لوں گا کبھی ایسی باتیں نہیں سوچوں گا جو اس کے لئے معلومات کا ذریعہ بن جائیں۔"

میں اسے مسکرا کر دیکھنے لگا تو وہ ٹپٹا کر رہ گیا۔ اس بات کو سمجھ گیا کہ اس وقت بھی میں اس کی سوچ کو پڑھ رہا ہوں۔ سینئر افسر نے مجھ سے پوچھا۔

"فرہاد اگر تم اس کے متعلق اہم معلومات فراہم کر سکتے ہو تو ہمیں فوراً بتاؤ ہم ابھی اس کے جرائم کی فہرست مرتب کریں گے"۔

میں نے کہا: "آپ پہلے اسے لاک اپ میں بھجوا دیں اس کی عدم موجودگی میں، میں آپ سے ضروری باتیں کروں گا۔"

میری درخواست کے مطابق اسے لاک اپ میں بھیج دیا گیا اس کے جانے کے بعد میں نے سینئر افسر سے کہا۔

"اب میں تنہائی میں آپ سے کچھ باتیں کروں گا اگر آپ مناسب سمجھیں تو میری یہ خواہش بھی پوری کر دیں۔"

سینئر افسر نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے پیچھے چلتا ہوا اس کمرے میں آ گیا جو کبھی ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن کے لئے مخصوص تھا۔ اس کمرے میں میں پہلے بھی آ چکا تھا۔ وہاں بیٹھ کر میں نے پہلی بار شبیر حسن کو بتایا تھا کہ میں خیال خوانی کے علم سے واقف ہوں۔ اس وقت بھی مجھے اس سینئر افسر کے سامنے اپنے اس راز کو اگلنا پڑا۔ میں مجبور تھا۔ اگر اسے یہ نہ بتاتا کہ میں لوگوں کے خیالات پڑھ لیتا ہوں تو پھر وہ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرتا کہ میں نے بلیک گائیڈ کے متعلق کہاں سے معلومات فراہم کی ہیں اور اس کی خفیہ پناہ گاہیں کب سے میری نگاہوں میں ہیں ان سوالات کا میرے پاس کوئی معقول جواب نہ ہوتا۔ اس سینئر افسر کو بتانا ہی [پڑا] کہ میں نے اپنے علم کے ذریعہ یہ معلومات حاصل کی ہیں۔

جب اس سینئر افسر کو میری خیال خوانی کا علم ہوا تو وہ حیرانی سے ... لگا میں اس کی حیرانی دور کرنے کے لئے اس کے خیالات کو پڑھتا گیا اور اسے بتا ... کہ اس وقت وہ میرے متعلق کیا سوچ رہا ہے۔ تب اسے یقین آ گیا کہ میں کیا ... رہا ہوں۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ میرا یہ علم انٹیلی جنس والوں کو کس قدر ... پہنچا سکتا ہے۔ اس نے خوش ہو کر مجھے کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا ... اور اک کے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"شبیر حسن صاحب جانتے ہیں کہ میں ٹیلی پیتھی کے علم سے واقف ... انہوں نے معمول بننے کے دوران میرا یہ راز بلیک گائیڈ کو بھی بتا دیا ... وقت سے وہ بہت زیادہ محتاط ہو گیا ہے کوئی ایسی بات نہیں سوچتا ... اس کے خلاف میری معلومات کا ذریعہ بن جائیں۔ میں نے کئی بار اسے ... مجبور کیا لیکن وہ بہت ہی مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہے اسے ... اور ذہنی اذیتیں دی جائیں جب بھی وہ اپنے راز نہیں اگلے گا۔"

سینئر افسر نے مایوسی سے پوچھا۔

"کیا اس سلسلے میں تمہارا علم بھی کام نہیں آئے گا؟"

"آئے گا۔ اس کے دماغ سے کچھ اگلوانے کے لئے دوسری چال ... ہو گی۔ اسے کھانے پینے کی چیزوں میں کچھ ایسی دوائیں ملا کر دینی ہوں گی ... استعمال سے آہستہ آہستہ اس کے اعصاب کمزور پڑتے جائیں۔ اعصاب[ی] کمزوری سے قوتِ ارادی کمزور پڑ جاتی ہے۔ ایسی حالت میں انسان ... صحیح فیصلہ کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنے کسی ایک خیال پر قائم رہ سکتا ہے۔ ا ... وقت جب اس کا ذہن کمزور پڑ جائے گا تو میں اسے اپنی مرضی کے مطابق ... پر مجبور کر دوں گا۔"

سینئر افسر نے کہا: "ہاں یہ اچھی ترکیب ہے میں ابھی ڈاکٹر سے ... کرتا ہوں کہ اس کے اعصاب کو کمزور بنانے کے لئے کون سا طریقہ ... کیا جا سکتا ہے؟"

میں نے پوچھا: "فی الحال میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"تم قانون کا ساتھ دیتے رہے ہو اس لئے تم زیرِ حراست نہیں ... میں تمہیں جانے کی اجازت دیتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تم روز صبح ... آؤ گے اور مجھ سے ملاقات کرو گے۔ بلیک گائیڈ کے متعلق اگر کوئی اہم ... ہوئی تو میں تمہیں بلوایا کروں گا۔"

میں نے خوش ہو کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ مجھ سے اتنا متاثر ... عمارت سے باہر تک چھوڑنے آیا اور اپنے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ مجھے ... پہنچا دے۔ میں نے اس سے رخصتی مصافحہ کیا اور کار کی پچھلی سیٹ پر ... تمام راستے میں خدا کا شکر ادا کرتا رہا۔ بڑی آسانی سے جان ... تھی۔ اگر میں سینئر افسر کو ٹیلی پیتھی کے متعلق نہ بتلاتا وہ اپنے اعتما[د] ... تو وہ مجھ پر اس طرح اندھا اعتماد نہ کرتا ایک تو میرا ریکارڈ اچھا تھا ... کئی بار ان کے کام آ چکا تھا پھر یہ کہ میری صلاحیتوں نے انہیں ...

اتنا کچھ ہونے کے باوجود میں ایک طرح سے قانون کو دھوکہ دے رہا تھا۔ [انٹ]یلی جنس والوں کے ساتھ ہر طرح سے تعاون کرنے کے باوجود میں نے یہ بات چھپالی [تھ]ی کہ شیتل میری پناہ میں ہے مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن میں شیتل کو [قا]نون سے بچانا چاہتا تھا کیونکہ وہ بلیک گائیڈ کا محض آلۂ کار تھا۔ اب وہ میرا [م]عمول بن کر مثبت انداز میں قانون کا ساتھ دینے کو تیار تھا وہ ایک بے لگام [گھ]وڑے کی طرح تھا جو اسے اپنے لگام کے سائے میں لے آتا وہ اسی کے اشارے پر [دو]ڑتا اور اب وہ میرے اشاروں پر دوڑنے والا تھا۔

جب میں اپنی کوٹھی میں پہنچا تو فرزانہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی، [مجھ]ے دیکھتے ہی اس کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ اس نے قریب آ کر میرا بازو تھامتے [ہوئ]ے کہا۔

"میں تمام رات سو نہ سکی میرے دل میں طرح طرح کے اندیشے جاگ رہے ... خدا کا شکر ہے کہ تم بخیریت واپس آ گئے۔"

میں اس کا ہاتھ تھام کر اپنے بیڈروم میں آیا شیتل میرے بستر پر چادر ... نے چت پڑا ہوا تھا۔ وہ ایسا لمبا تڑنگا اور تنومند تھا کہ میرے پورے بستر [پر] چھا گیا تھا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ فرزانہ نے اچھی طرح ... کی تیمارداری کی تھی۔ وہ زخموں سے چور تھکا ہارا گہری نیند سو رہا تھا۔

میں فرزانہ کے ساتھ پھوپھی جان کے کمرے میں آیا وہ ابھی سو کر اٹھی ... اور کچن کی طرف جا رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ آج تم صبح ہی صبح گھر میں نظر آ رہے ہو۔ بیٹا یہ تم کن ... ں میں پڑ گئے ہو، زرینہ کہہ رہی تھی کہ تمہارے بیڈروم میں سونے والا ... کاری دشمن ہو سکتا ہے جس نے ایک بار اسی کمرے میں تم پر حملہ کیا تھا۔ اگر ... نہ کرتی تو وہ تمہیں جان سے مار کر ہی دم لیتا۔"

میں نے کہا: "زرینہ کا خیال درست ہے۔ یہ وہی دشمن ہے لیکن اب ... ت بن گیا ہے۔"

"بیٹا ایسی نادانی نہ کرو تم اس کی مرہم پٹی کروا رہے ہو، اسے اچھے ... کھلا پلا رہے ہو۔ سانپ کو دودھ پلانا عقلمندی نہیں ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا: "پھوپھی جان میں اتنا نادان نہیں ہوں۔ ... نے سانپ کو دودھ پلانے سے پہلے اس کا زہر نکال لیا ہے اب یہ مجھے نہیں ڈسے گا۔"

"بیٹے میرے پاس اتنا دماغ نہیں ہے کہ میں تمہیں اپنی باتوں سے قائل [ک]ر سکوں۔"

اتنے میں زرینہ وہاں آ گئی اس نے فرزانہ کو میرے ساتھ دیکھ کر ذرا ناگواری [سے] منہ بنایا۔ اسے ایک عرصہ سے شکایت تھی کہ اب میں اس کی طرف پلٹ کر بھی نہیں [دی]کھتا اور دوسری عورتوں کو اس پر ترجیح دے رہا ہوں۔ میں نے پھوپھی جان ... پہلے آپ نے زرینہ کی شادی کے لئے چچا جان سے دوبارہ بات چھیڑی تھی؟"

پھوپھی جان کے جواب دینے سے پہلے ہی زرینہ نے تڑ سے جواب دیا۔

"آپ میری شادی کی فکر نہ کریں میں نے امی سے کہہ دیا ہے کہ میں ظہیر سے شادی نہیں کروں گی۔"

میں نے پوچھا: "پہلے تو تمہیں اس رشتے سے انکار نہیں تھا؟"

پھوپھی جان نے فوراً ہی اپنی بیٹی کی حمایت میں کہا۔

"بیٹے پہلے کی بات اور تھی اب تو ان کا سارا کاروبار چوپٹ ہو گیا۔ وہ کتنوں کے قرضدار بن گئے ہیں، ایک وقت تھا کہ میں پیسے پیسے کی محتاج تھی۔ ان لوگوں نے کبھی جھوٹے منہ ہماری خیریت نہیں پوچھی تھی وہ مجھ جیسی غریب بیوہ کی بیٹی کو اپنی بہو نہیں بنا سکتے تھے۔ اب میں ان کے غریب بیٹے کو داماد کیوں بناؤں؟"

"پھوپھی جان انہیں تو میں نے ہی کنگال بنایا ہے۔ پھر جو کچھ ان کے پاس تھا وہ میں نے ان سے چھین لیا اب اگر ظہیر کے پاس دولت نہیں ہے تو کیا ہوا زرینہ تو دولتمند ہے آپ چاہیں تو اسے گھر داماد بنا کر رکھ سکتی ہیں۔ مائیں تو جلد سے جلد بیٹیوں کو سہاگن بنانے کی کوشش کرتی ہیں تعجب ہے کہ آپ لگے لگائے رشتے کو توڑنا چاہتی ہیں۔"

"رشتہ ٹوٹنے کی فکر غریب ماؤں کو ہوتی ہے۔ جہاں مٹھاس زیادہ ہو وہاں چیونٹے خود بخود قطار بنا کر چلے آتے ہیں۔ اب ہمارے پاس دولت دیکھ کر کتنے ہی گھرانوں سے رشتے آ رہے ہیں۔ میں نے شاید پہلے بھی تم سے کہا تھا کہ زرینہ نے ایک لڑکے کو پسند کیا ہے اور یہ اسی سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

"میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی والی بات ہے اگر زرینہ کی پسند ہے تو بھلا میں اعتراض کرنے والا کون ہوتا ہوں بہرحال کہیں بھی ہو اس کی شادی جلدی کر دیجئے۔"

وہ مجھے غصے سے گھورتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ میں نے فرزانہ کے ساتھ اس کے کمرے میں پہنچ کر کہا۔

"زرینہ میرے بیڈروم میں وہ زخمی گونگا سو رہا ہے میں رات بھر کا جاگا ہوا ہوں اس لئے تم اپنا بیڈروم خالی کر دو جب تک وہ گونگا یہاں ہے تم اپنی امی کے کمرے میں رہا کرو گی۔"

یہ کہہ کر میں بستر پر بیٹھ گیا۔ اس وقت اسے فرزانہ پر غصہ آ رہا تھا کیونکہ وہ میرے ساتھ بیڈروم میں آئی تھی۔ وہ اسے ناگواری سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے فرزانہ سے کہا۔

"دروازہ بند کر دو میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ اپنی نازک انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کرو۔ مجھے جلدی نیند آ جائے گی۔"

میں بستر پر لیٹ گیا۔ وہ دروازہ بند کرنے کے بعد میرے پاس بستر پر آ کر بیٹھ گئی پھر مجھ پر جھک کر بڑی محبت سے میرے بالوں کو سہلانے لگی اور آہستہ آہستہ ان میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

بہت دیر کے بعد میری آنکھوں میں پھر نیند بھرنے لگی۔ اس نے میرا سر سہلاتے ہوئے مجھے سلا دیا۔ وہ بھی پچھلی رات کی جاگی ہوئی تھی۔ تمام دن سوتی رہی۔ شام کو میں نے شنیل کی خبر لی۔ فرزانہ میرے سامنے پھر اس کی مرہم پٹی کرنے لگی۔ اس دوران میں اشاروں ہی اشاروں میں اس سے باتیں کرتا رہا اور اس کی خیریت پوچھتا رہا۔ اس نے میرا احسان مانتے ہوئے کہا کہ وہ آرام سے ہے اگر اسی طرح توجہ سے اس کا علاج کیا گیا تو وہ جلد ہی صحتیاب ہو جائے گا۔ میں نے اسے بلیک گائیڈ کے متعلق تمام باتیں بتائیں کہ وہ کس طرح قانون کی گرفت میں آگیا ہے اور اب وہ یہاں سے نکل کر اپنے ملک واپس نہیں جا سکے گا۔ شنیل نے گونگے اشاروں میں پوچھا: "اب میرا کیا ہوگا۔۔؟"

میں نے جواب دیا: "تمہارے ملک کے جتنے لوگ یہاں تخریبی کارروائیاں کر رہے ہیں اگر تم انہیں گرفتار کرانے میں میری مدد کرو گے، اور جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ میں نے دشمن ملک کے جاسوسوں کو اس پاک زمین سے ہمیشہ کے لئے اکھاڑ پھینکا ہے تو پھر میں تمہاری مرضی کے مطابق تمہیں آزاد کر دوں گا۔ تم چاہو گے تو اپنے ملک واپس جا سکو گے ورنہ چاہو تو میرے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی گزارو گے۔"

اس کی اشارتی زبان نے کہا۔

"میں نے جس دیس میں جنم لیا ہے اس دیس سے غداری کر چکا ہوں، اب میں وہاں واپس نہیں جاؤں گا اور نہ ہی اس ملک میں رہوں گا میں پوری طرح تمہارے کام آنے کے بعد صرف اتنا چاہوں گا کہ تم مجھے اس ملک کی سرحد پار کرا دو میں مغربی ممالک کی طرف چلا جاؤں گا۔"

میں نے اس سے وعدہ کیا کہ ایسا ہی ہوگا۔ وہ تمام دن اور تمام رات میں نے اپنی کوٹھی میں ہی گزاری۔ بہت عرصے کے بعد مجھے گھر میں سکون مل رہا تھا۔ ایک تو مسلسل بھاگ دوڑ سے تھک گیا تھا دوسرے یہ کہ فرزانہ کی قربت میں ایسی دلچسپیاں تھیں کہ مجھے پہلی بار گھریلو زندگی کا لطف حاصل ہو رہا تھا۔ دوسری صبح میں انٹیلیجنس والوں کے دفتر میں گیا اور سینئر افسر سے ملاقات کی۔ اب اس افسر نے ڈائریکٹر جنرل کا عہدہ سنبھال لیا تھا۔ سابقہ ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن کو ان کی کوٹھی میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ موجودہ ڈائریکٹر جنرل کا نام سعید احمد تھا انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا میں نے ڈاکٹر سے مشورہ کیا ہے ڈاکٹر نے کہا ہے کہ بلیک گائیڈ نے جس طرح شبیر حسن کے دماغ کو مفلوج کر دیا تھا اسی طرح ایک انجکشن کے ذریعہ بلیک گائیڈ کے ذہن کو بھی کمزور بنایا جا سکتا ہے میں ڈاکٹر کو کال کرتا ہوں یہ کام ابھی ہو جانا چاہیے۔"

ڈائریکٹر جنرل سعید احمد ریسیور اٹھا کر کسی ڈاکٹر کے نمبر ڈائل کرنے لگے۔ میں خاموش بیٹھا فون پر ان کی باتیں سنتا رہا۔ انہوں نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر مرتضیٰ آرہے ہیں۔ آپ نے ہمیں یہ نہیں بتایا ہے کہ کس مقصد کے لئے بلیک گائیڈ کے دماغ کو کمزور بنایا جا رہا ہے ڈاکٹر نے خود اپنے طور پر سوچا ہے کہ ہم اس کی کمزور دماغی سے فائدہ اٹھا کر اس سے اسی کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں"۔

میں نے کہا: "یہ اچھی بات ہے آپ ڈاکٹر مرتضیٰ کو چند مسلح نوجوانوں کے ساتھ لاک اپ میں بھیج دیں۔ وہ نوجوان بلیک گائیڈ کو اپنے قابو میں کریں گے اور ڈاکٹر جبراً اسے انجکشن لگائے گا۔ ہمارا وہاں جانا ضروری نہیں ہے میں یہاں بیٹھے ہی بیٹھے بلیک گائیڈ کی سوچ سے رابطہ قائم کر لوں گا پھر جو کچھ معلوم ہوگا وہ میں آپ کو بتاتا جاؤں گا۔"

سعید احمد نے میرے مشورے کو مان لیا۔ اس نے اپنے ایک ماتحت کو بلا کر کہا کہ ڈاکٹر مرتضیٰ آئیں تو وہ انہیں لاک اپ میں بلیک گائیڈ کے پاس لے جائے اسے جبراً انجکشن دینے کے لئے چند نوجوانوں کا ساتھ ہونا لازمی ہے۔

اس کے جانے کے بعد ڈائریکٹر جنرل سعید احمد مجھ سے ٹیلی پیتھی کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ میں اس علم کے سلسلے میں اپنے دلچسپ تجربات انہیں سناتا رہا۔ وہ میری زندگی کا ایک ایک واقعہ سن کر مجھ سے متاثر ہوتے رہے آدھ گھنٹے کے بعد اطلاع ملی کہ بلیک گائیڈ کو انجکشن لگا دیا گیا ہے اور اب وہ لاک اپ میں ایک جگہ گم صم بیٹھا ہے۔

جب اطلاع دینے والا واپس چلا گیا تو میں نے ڈائریکٹر جنرل سعید احمد سے کہا۔

"اب میں بلیک گائیڈ سے خیالی رابطہ قائم کروں گا جب تک میں خاموش رہوں اس وقت تک آپ اس بات کا خیال رکھیں کہ کوئی اس کمرے میں آکر مداخلت نہ کرے۔"

"تم اطمینان رکھو کوئی تمہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔"

سعید احمد یہ کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھے پھر انہوں نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ میں نے کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے آنکھیں بند کیں اور وہاں سے بلیک گائیڈ کے دماغ میں جھانکنے لگا۔ اس کے دماغ کی دنیا میں عجیب سی ویرانی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے لاک اپ کے آہنی دروازے کے باہر دیکھ رہا تھا اور اپنے ذہن کو اپنے قابو میں رکھنے کے لئے سوچ رہا تھا۔

"میں تو بالکل ٹھیک ہوں جو دیکھ رہا ہوں اسے سمجھ رہا ہوں یہ جو سامنے دروازہ ہے یہ لوہے کی سلاخوں سے بنا ہوا ہے اس کے باہر ایک سنتری (اٹلانٹک) کھڑا ہے کیا یہ سنتری ہے؟ ہاں ہمارے دیس میں پہرہ دینے والے کو سنتری کہتے ہیں۔ یہ سب کچھ تو میری سمجھ میں آرہا ہے مگر میرا سر اتنا ہلکا کیوں لگ رہا ہے؟ ایسا لگتا ہے کہ میں گردن تک ہوں گردن سے اوپر کچھ نہیں ہے۔"

میں نے اس کی سوچ میں کہا: "میں تو بالکل نارمل پوزیشن میں ہوں اگر میں خود کو سمجھ لیتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ذہنی اعتبار سے بالکل درست ہوں سب سے پہلے اپنے متعلق مجھے یہ سوچنا چاہیے کہ میرا نام کیا ہے؟"

وہ سوچنے لگا: "ہاں! میرا نام کیا ہے! میرا نام — ہاں میرا نام دھرم دیو ہے"

میں نے اس کی سوچ میں کہا: "میں اپنے آپ کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں جب مجھے یاد آگیا ہے کہ میرا نام دھرم دیو ہے تو اب مجھے یہ سوچنا چاہیے کہ میں کیا ہوں! کاروبار کرتا ہوں یا ملازمت کرتا ہوں!"

"ہاں مجھے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ میں کیا کرتا ہوں مجھے یوں لگتا ہے کہ میں بہت بڑا آدمی ہوں میری شخصیت بہت اہم ہے لیکن کس طرح اہم ہے؟ کس وجہ سے اہم ہے۔۔؟ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے میری یادداشت میرا ساتھ کیوں نہیں دے رہی ہے؟ اُف کیا میرا حافظہ اتنا کمزور ہے؟"

میں دل ہی دل میں کہا: یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی اس انجکشن کے ذریعہ اس کمبخت کا حافظہ ہی بگڑ گیا جب یہ اپنے آپ کو اچھی طرح نہیں سمجھ رہا ہے تو پھر میری بات کیا خاک کرے گا اس طرح تو میں اس کے خفیہ اہم کاغذات تک بھی نہیں پہنچ سکوں گا۔

میں نے آنکھیں کھول کر ڈائریکٹر جنرل سعید احمد کو دیکھا میری آنکھ کھلتے ہی انہوں نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

"کچھ معلوم ہوا؟"

میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا: "گڑبڑ ہو گئی ہے۔ وہ انجکشن بری طرح اس کے دماغ پر اثر انداز ہوا ہے۔ اس کا حافظہ اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ وہ خود کو اچھی طرح نہیں پہچان رہا ہے، پلیز آپ ڈاکٹر مرتضیٰ سے پوچھیں کہ انجکشن کا اثر کب تک زائل ہوگا"

سعید احمد نے کہا۔

"جب اس کا اثر زائل ہوگا تو اس کمبخت کی قوت ارادی بحال ہو جائے گی پھر وہ ہمیں کچھ نہیں بتائے گا۔"

"میں دوسرا طریقہ اختیار کروں گا۔ آپ فی الحال ڈاکٹر سے معلوم کریں کہ وہ کب تک نارمل پوزیشن میں آئے گا؟"

انہوں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تم میرے ساتھ آؤ، ہم ابھی ڈاکٹر سے پوچھتے ہیں۔"

میں ڈائریکٹر جنرل کے ساتھ کمرے سے باہر آگیا۔ دوسرے کمرے میں ڈاکٹر مرتضیٰ دوسرے ماتحت افسروں کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے ڈائریکٹر جنرل نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"جو انجکشن آپ نے اسے لگایا ہے کیا وہ انسانی حافظے کو بالکل ختم کر دیتا ہے؟"

"ہاں انجکشن کا فوری اثر یہی ہوتا ہے ابھی اس قیدی کا حافظہ بہت کام ہوگا پھر رفتہ رفتہ اسے بہت کچھ یاد آتا جائے گا۔"

میں نے پوچھا: "اس کی یادداشت کب تک اعتدال پر آئے گی؟"

"کم از کم چار گھنٹے بعد۔ اگر آپ اس سے کچھ پوچھنا چاہیں تو دو گھنٹے بعد پوچھیں اس وقت وہ دماغی کمزوری اور توانائی کے درمیان کشمکش میں مبتلا ہوگا ایسے وقت وہ اپنی قوتِ ارادی کو کام میں نہیں لاسکے گا۔"

ہم دو گھنٹے گزارنے کے لئے وہیں ڈاکٹر کے پاس بیٹھے رہے اور دماغی قوت ارادی کے موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ دو گھنٹے بعد ڈائریکٹر جنرل نے میرے کہنے کے مطابق اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ بلیک گائیڈ کو آپریشن روم میں لے جائیں۔ آپریشن روم سے مراد وہ کمرہ ہے جہاں ضدی مجرموں کو اذیتیں دے کر ان سے حقیقت اگلوائی جاتی ہے۔

میں نے ڈائریکٹر جنرل کے ساتھ آپریشن روم میں آکر کہا۔

"آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن ماتحتوں کے جانے کے بعد آپ کاغذ قلم لے کر بیٹھ جائیں۔ بلیک گائیڈ جو کچھ اگلتا جائے گا آپ اسے نوٹ کرتے جائیں۔ اس کام کے لئے اگر آپ اپنے کسی ماتحت کو بلائیں گے تو وہ میری ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم کی صلاحیتوں سے واقف ہو جائے گا اور میں اپنا یہ راز دوسروں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔"

ڈائریکٹر جنرل نے کہا۔

"میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ دوسروں پر تمہاری صلاحیتیں ظاہر نہ ہوں لکھنے کا کام میں خود کروں گا۔"

تھوڑی دیر بعد چند نوجوان بلیک گائیڈ کو لے کر اس کمرے میں آگئے اور اسے ایک بیڈ پر بٹھا دیا۔ ان کے واپس جانے کے بعد کمرے میں سعید احمد اور بلیک گائیڈ کمرے میں رہ گئے تو میں نے بلیک گائیڈ کے دونوں بازوؤں کو تھام کر اسے بیڈ پر لٹا دیا وہ چپ چاپ لیٹ کر مجھے تکنے لگا۔ میں بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔ ٹیلی پیتھی کی مشقوں کے دوران شمع کی جو لویں میری آنکھوں میں جلتی تھیں ان کی تیزی اور تپش میری آنکھوں سے خارج ہو کر بلیک گائیڈ کی نگاہوں کو اپنی گرفت میں لینے لگیں وہ ذہنی طور پر کمزور ہو گیا تھا اس لئے میری نگاہوں کے زیر اثر آنے لگا۔ میں نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

"تم میری طرف دیکھ رہے ہو اور میری طرف دیکھتے ہوئے تمہارا دل اور تمہارا دماغ میری مٹھی میں ہے بولو کیا تم میرے ہر حکم کی تعمیل کرو گے؟"

اس کی آواز جیسے کسی اندھے کنوئیں سے آنے لگی۔

"میں تمہارے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔"

میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا: "یاد کرو دو گھنٹے پہلے ایک ڈاکٹر نے تمہارے بازو پر انجکشن لگایا تھا، کیا تمہیں یاد ہے؟"

"ہاں مجھے یاد ہے۔"

"تم بتاؤ کہ انجکشن کا ردِ عمل کیا ہوا تھا؟"

"میں نے محسوس کیا کہ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب رہا ہے اور میری یادداشت گم ہوتی جا رہی ہے۔"

"اب تمہاری یادداشت کا کیا عالم ہے؟"

"میں کسی حد تک بھولی ہوئی باتوں کو یاد کر رہا ہوں۔"

"میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تاریکی سے نکل آؤ۔ اپنی قوتِ ارادی سے کام لو۔ دیکھو، محسوس کرو، انجکشن کا باقی ماندہ اثر زائل ہو رہا ہے۔۔۔"

"میں محسوس کر رہا ہوں۔۔۔ میں محسوس کر رہا ہوں، تاریکیاں چھٹ رہی ہیں میرے سامنے دو گھورتی ہوئی آنکھیں ہیں ان سے روشنیاں پھوٹ رہی ہیں اور وہ روشنیاں میرے دماغ تک پہنچ رہی ہیں، یہ آنکھیں جو کچھ کہتی ہیں اسے میرا دماغ سمجھتا ہے۔"

"تم صرف ان آنکھوں کی باتیں سمجھو گے تمہارے کان صرف ان آنکھوں کی خاموش آواز سنیں گے۔ یہ آنکھیں تم سے پوچھ رہی ہیں تم کس کوٹھی میں گرفتار کیے گئے تھے؟"

"میں راوی روڈ کے کنارے سبز کوٹھی میں گرفتار کیا گیا تھا۔"

"تم نے اپنے تمام اہم کاغذات سبز کوٹھی میں کہاں چھپا رکھے ہیں؟"

"سبز کوٹھی کے بیڈ روم میں ایک آہنی الماری ہے اس الماری کا ایک دراز مخصوص نمبروں سے کھولا جاتا ہے اس دراز میں وہ اہم کاغذات نہیں ہیں ٹھیک اس الماری کے اوپر چھت میں ایک خفیہ خانہ ہے دراز کے مخصوص نمبروں میں اگر سات نمبر کا اضافہ کر دیا جائے تو چھت کا وہ مخصوص خانہ کھل جاتا ہے کیونکہ چھت کا وہ خفیہ خانہ دراز کے نمبروں سے منسلک ہے۔"

میں نے پوچھا "وہاں کس قسم کے کاغذات ہیں؟"

"اس ملک کی سیکرٹ سروس کے جو راز ہم تک پہنچے ہیں ان کی نقلیں وہاں ہیں۔"

میں نے پوچھا "یہ کاغذات تم نے اتنی حفاظت سے چھپا کر کیوں رکھے ہیں تم چاہتے تو بہت پہلے ہی ان کاغذات کو اپنے دیس کی سیکرٹ سروس تک پہنچا سکتے تھے۔"

"ہاں مجھے پہلی ہی فرصت میں ان کاغذات کو سرحد پار بھیج دینا چاہیے تھا لیکن اسی دوران ایک مغربی ملک کے ایجنٹ سے میرا رابطہ قائم ہو گیا۔ وہ ان کاغذات کی بڑی سے بڑی بولی دے رہا ہے میں اس سے سودا کر لینا چاہتا تھا لیکن فرہاد نے مجھے الجھا کر رکھ دیا پرسوں رات جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ ٹیلی پیتھی جانتا ہے تو میں نے اس ایجنٹ سے گفت و شنید بند کر دی۔ ان اہم کاغذات کی سودے بازی کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ کیونکہ وہ کمبخت ہر انسان کی سوچ تک پہنچ جاتا ہے۔"

میں نے پھر سوال کیا "وہ ایجنٹ کس ملک سے تعلق رکھتا ہے؟"

جواب میں وہ اس غیر ملکی ایجنٹ کا نام پتہ اور اس کے ملک کا نام بتانے لگا۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ بلیک گائیڈ نے کہاں کہاں اپنی خفیہ پناہ گاہیں بنا رکھی ہیں یہ سب کچھ مجھے شتیل سے معلوم ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود میں نے ڈائریکٹر جنرل سعید احمد کے سامنے ان خفیہ پناہ گاہوں کے متعلق پوچھا بلیک گائیڈ ان خفیہ پناہ گاہوں کے متعلق بتاتا رہا اس کے دماغ سے تمام راز دل کو کرید لینے کے بعد میں نے اس سے کہا۔

"اب تمہیں سو جانا چاہیے۔ تمہاری آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی ہیں تمہیں نیند آ رہی ہے اب تم ایک پرسکون نیند کے بعد خود بخود بیدار ہو جاؤ گے اور اس وقت بھی تم میرے معمول اور محکوم رہو گے۔"

اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی گئیں وہ پرسکون ہو گیا اور گہری نیند میں ڈوب گیا۔ میں نے اپنی صلاحیتوں سے ایسی معلومات فراہم کی تھیں کہ شاید فرشتے بھی ان معلومات تک نہ پہنچ سکتے۔ ڈائریکٹر جنرل سعید احمد خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے انہوں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا

"فرہاد، تمہارا جواب نہیں ہے تم ایسی صلاحیتوں کے مالک ہو جو انسان کی سوچ سے اور ان کی کوششوں سے اور ان کی توقعات سے بہت بلند ہیں اب تمہیں ہمیشہ اس ادارے سے منسلک رہنا ہو گا میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا چلو آؤ ہم سب سے پہلے سبز کوٹھی چلیں اور ان کاغذات کو حاصل کریں"

وہ یہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آپریشن روم سے باہر آئے ان کے تمام ماتحت میرے ساتھ ان کی یہ بے تکلفی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ سعید احمد نے اپنے ماتحت افسر سے کہا۔

"وہ مجرم آپریشن روم میں گہری نیند سو رہا ہے اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے ہم ابھی واپس آتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ عمارت سے باہر آئے انہوں نے اپنی کار میں مجھے اپنے برابر بٹھایا پھر سبز کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئے۔ سعید احمد سابقہ ڈائریکٹر جنرل کی طرح بوڑھے نہیں تھے ان کی ابھی خاصی عمر ہو گی لیکن وہ جوان نظر آتے تھے اور اب میری صلاحیتوں پر ایمان لا کر مجھ سے دوستانہ گفتگو کر رہے تھے۔ تمام راستے وہ میری ایسی تعریفیں کرتے رہے جیسے میں انسان نہیں فرشتہ ہوں۔ ان کی یہ بات سن کر مجھے سائی یاد آ گئی ان کے دھرم میں فرشتے کو دیوتا کہا جاتا ہے وہ بھی میری صلاحیتوں سے متاثر ہو کر مجھے دیوتا کہا کرتی تھی۔ میں نے دیوتا کی اس حسین پجارن کو بالکل ہی بھلا دیا تھا۔ نہ جانے اب وہ کہاں ہو گی۔ بہر حال اتنا یقین تھا کہ وہ جہاں بھی ہو گی بخیریت ہو گی کیونکہ اسے اپنی حفاظت آپ کرنے کے گر آتے تھے۔

ہم نے سبز کوٹھی پہنچ کر بلیک گائیڈ کے بتائے ہوئے نمبروں کے مطابق آہنی الماری کے دراز کے نمبروں میں سات نمبر کا اضافہ کیا۔ نمبر مکمل طور سے سیٹ ہوتے ہی چھت کا ایک مختصر سا چوکور حصہ روشندان کی طرح کھل گیا میں نے آہنی الماری پر چڑھ کر اس روشندان میں ہاتھ ڈالا تو بہت سے کاغذات ایک فائل کی صورت میں ہاتھ آئے۔ میں نے انہیں سعید احمد کے حوالے کر دیا۔ وہ وہیں بیڈ پر بیٹھ کر ان کاغذات کا مطالعہ کرنے لگے۔ مطالعہ کے دوران ان کا چہرا خوشی سے کھلا جا رہا تھا، پھر انہوں نے فائل کو بند کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"فرہاد تم نے اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے کہ اس کے لیے تمہیں جو بھی معاوضہ دیا جائے جو بھی انعام دیا جائے وہ کم ہے۔ تمہاری تعریف کرنے کے لیے بھی میرے پاس الفاظ نہیں ہیں حالانکہ تم یہ کارنامے انجام دے رہے ہو لیکن ان کا کریڈٹ مجھے ملے گا۔ کیونکہ تم اپنی ٹیلی پیتھی کی صلاحیتوں کو ظاہر نہیں کرنا چاہتے، میں اعلیٰ حکام کے سامنے صرف تمہاری ذہانت کی تعریف کر سکتا ہوں، لیکن میرے ڈائریکٹر جنرل بنتے ہی اتنی بڑی سازش کو بے نقاب کرنے کا سہرا میرے سر بندھے گا۔"

میں نے کہا "آپ کو کریڈٹ ملے گا اور آپ کی ترقی ہو گی تو مجھے زیادہ خوشی ہو گی مجھے کسی قسم کی ترقی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے میں ایک بہترین دوست بن کر آپ کے کام آتا رہوں گا۔"

سعید احمد نے بڑی گرمجوشی سے میرے بازوؤں کو تھام کر کہا۔

"تمہارے جیسا بے لوث دوستی نبھانے والا کہاں ملے گا؟ آج سے ہم

دونوں بے تکلف دوست بن کر رہیں گے۔ اگر میں تمہارے کسی کام آ سکتا ہوں تو مجھ سے پوری بے تکلفی سے کہہ دیا کرو مجھے ایک بہت بڑا افسر سمجھ کر مجھ سے دل کی بات نہ چھپایا کرو، میں صدق دل سے تمہارے کام آنا چاہتا ہوں۔"

سعید احمد کی باتیں سن کر میں نے شتیل کے متعلق سوچا۔ پوری طرح قانون کا ساتھ دینے کے باوجود میں شتیل کو پناہ دے کر ایک جرم کر رہا تھا۔ جب سعید احمد نے پورے خلوص کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو میں نے کہا۔

"مسٹر سعید قانون کا ساتھ دینے کے باوجود میں ایک چھوٹا سا جرم کر رہا ہوں۔"

سعید احمد نے انگلی اٹھا کر کہا "دیکھو مجھے مسٹر نہ کہو یہ تکلف والی باتیں ہیں سیدھی طرح سعید کہہ کر مخاطب کرو اور اب بتاؤ کہ وہ چھوٹا سا جرم کیا ہے؟"

میں نے کہا "بلیک گائیڈ کے ساتھ شتیل نامی ایک باڈی گارڈ بھی تھا وہ اس وقت میری پناہ میں ہے۔ وہ جسمانی قوت کے لحاظ سے ایک غیر معمولی انسان ہے میرا اس کا ایک بار مقابلہ ہو چکا ہے میں سمجھتا ہوں کہ وہ فولاد کا بنا ہوا ہے۔ اسی مقابلے کے نتیجے میں وہ زخمی حالت میں اسپتال لایا گیا تھا۔"

سعید احمد نے سر ہلا کر کہا "ہاں اس کیس کی پوری رپورٹ میں نے پڑھی لیکن تم نے اپنے دشمن کو پناہ کیوں دی ہے؟"

"وہ کام کا آدمی ہے اگرچہ وہ ان اہم کاغذات کے متعلق نہیں جانتا تھا کہ یہ کہاں چھپا کر رکھے گئے تھے اس کے باوجود وہ بلیک گائیڈ کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے۔ بلیک گائیڈ نے تنویمی عمل کے زیر اثر جتنی خفیہ پناہ گاہوں کے پتے بتائے ہیں، شتیل ان کے متعلق جانتا ہے اور ان لوگوں کو بھی جانتا ہے جو اب تک بلیک گائیڈ سے رابطہ قائم کرتے رہے ہیں۔"

"پھر تو واقعی شتیل کام کا آدمی ہے لیکن وہ تو تمہارا جانی دشمن تھا، تم نے اسے دوست کیسے بنا لیا۔؟"

"اپنی صلاحیتوں سے۔"

"واقعی تم اپنی صلاحیتوں سے بڑی بڑی حکومتوں کو جھکا سکتے ہو۔ تمہارے آگے شتیل کیا چیز ہے۔"

میں سعید احمد کو بتانے لگا کہ کس طرح شتیل حیا نسکا میں غنڈوں سے مقابلہ کرتے ہوئے بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ اس نے دو کو جان سے مار ڈالا تھا باقی بھی اس کے ہاتھوں موت کے منہ میں جانے والے تھے لیکن میں نے شتیل کو اپنی پناہ میں لے لیا جس کی وجہ سے وہ بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا۔ اس کے جسم پر کئی چاقو کے زخم بھی آئے ہیں وہ بہت بری حالت میں میرے یہاں زیر علاج ہے۔ لہٰذا سعید احمد سے کہا کہ وہ کسی طرح اسے قانون کی گرفت سے بچائے اور کسی اچھے اسپتال میں باقاعدہ اس کا علاج کرائے۔ سعید احمد نے کہا۔

"اچھا ہوا کہ شتیل کے متعلق تم نے مجھے بتا دیا ہم اسے سلطانی گواہ بنا کر رکھیں گے پولیس گے۔ میں ابھی دفتر پہنچ کر شتیل کے لیے ایمبولینس بھیجتا ہوں پولیس اسپتال میں اس کا باقاعدہ علاج ہوتا رہے گا۔"

میرے دل سے ایک بوجھ اتر گیا کہ اب میں شتیل کو چھپا کر کوئی جرم نہیں کر رہا ہوں۔ اب وہ قانون کے سائے میں رہے گا اور میرے کام بھی آتا رہے گا۔ وہ تمام دن بڑی مصروفیت میں گزر گیا۔ دفتری کارروائیاں بھی ہوتی رہیں شتیل کو اسپتال بھی پہنچا دیا گیا۔ نرس نیرا اپنی ڈیوٹی پر واپس آ گئی۔ شام کو میں نے اسپتال جا کر اس سے ملاقات کی پھر سعید احمد کے ساتھ اسپیشل وارڈ میں آیا جہاں شتیل زیر علاج تھا۔ وہاں میں نے شتیل سے اشاروں کی زبان میں پوچھا۔

"اس غیر ملکی ایجنٹ کے متعلق بتاؤ جس سے بلیک گائیڈ اہم کاغذات کا سودا کر رہا تھا؟"

شتیل نے بتایا کہ وہ ایک انگریز ہے اور ان دنوں کراچی میں ہے۔ میں ایک بار بلیک گائیڈ کے ساتھ وہاں گیا تھا میں اس جگہ کا نام اور پتہ نہیں بتا سکتا اس لیے کہ مجھے یاد نہیں ہے اگر مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ گے تو میں تمہیں وہاں تک پہنچا دوں گا۔ دور ہی سے اس کی کوٹھی دکھا دوں گا لیکن اس کوٹھی میں نہیں جاؤں گا۔"

"تم کوٹھی میں کیوں نہیں جاؤ گے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

اس نے جواب دیا "اس کوٹھی میں اس انگریز کی ایک نوجوان لڑکی ہے مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھتے ہوئے پوچھا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو تم اپنے جیسے ڈیل ڈول والے دس آدمیوں پر بھاری ہو، اور ایک نوجوان لڑکی سے ڈرتے ہو؟"

"میں دراصل اس سے نہیں آگ سے ڈرتا ہوں۔"

"آگ سے اس لڑکی کا کیا تعلق ہے؟"

"وہ آگ سے کھیلتی ہے۔ آگ کے شعلوں پر رقص کرتی ہے اور کھیلتے ہی کھیلتے اپنے دشمنوں کو اس آگ میں جھونک دیتی ہے۔"

اس کی باتیں میرے پلے نہیں پڑ رہی تھیں۔ ایک لڑکی جو آگ کے شعلوں میں رقص کرتی ہو، کیا وہ خود نہیں جلتی ہو گی۔ میں نے شتیل سے یہی سوال کیا۔ اس نے جواب دیا۔

"ہاں آگ اس پر اثر نہیں کرتی، اسی لیے میں اس سے ڈرتا ہوں میرا ایک جڑواں بھائی چیتل ہے وہ بھی میری طرح گونگا ہے، میری طرح بہترین فائٹر ہے ہم دونوں بھائی ناقابل شکست ہیں ہم دنیا کی کسی چیز سے نہیں ڈرتے۔ صرف آگ سے ڈرتے ہیں۔ بلیک گائیڈ نے مجھے بہت سمجھایا کہ اس لڑکی سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ لیکن سمجھانے سے کیا ہوتا ہے میں آگ سے کیسے کھیل سکتا ہوں۔؟ بلیک گائیڈ مجبور ہو کر مجھے کراچی سے یہاں لے آیا۔ یہاں تم ہی میرا پہلا شکار تھے لیکن تقدیر سے بچ گئے۔ اور اب تم نے بڑی چالاکی سے مجھے زیر کیا ہے دراصل ہم دونوں بھائیوں کے پاس صرف جسمانی قوت ہے، دماغ نہیں ہے بلیک گائیڈ اپنی دماغی قوت سے ہمیں اپنا محکوم بنائے ہوئے تھا۔ اب میں تمہاری دماغی قوتوں کے زیر اثر ہوں۔"

سعید احمد نے مجھ سے پوچھا کہ یہ گونگا کیا کہہ رہا ہے؟ شتیل نے مجھے جو کچھ بتایا تھا میں وہ سعید احمد کو بتانے لگا۔ تمام باتیں سننے کے بعد سعید احمد نے کہا

"مجھے تو یہ بات کچھ اس لگتی ہے کہ ایک لڑکی بے خوف و خطر آگ سے کھیلتی ہو اور آگ سے اپنے دشمنوں کو زیر کرتی ہو۔ اس سائنسی دور میں یہ تسلیم نہیں کروں گا کہ وہ کسی جادوئی عمل کے ذریعہ ایسا کرتی ہے۔ میڈیکل سائنس میں ایسی جڑی بوٹیاں بھی دریافت کی گئی ہیں جن کے عرق سے ایک مخصوص قسم کا روغن تیار کیا جاتا ہے۔ اگر اسے ہاتھوں پر مل کر ہتھیلی پر آگ رکھی جائے تو ہتھیلی اس آگ سے متاثر نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا: "بہرحال میڈیکل سائنس کے ذریعہ اگر وہ لڑکی فائر پروف بن گئی ہے تو اس کے خطرناک ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ یہ غیر ملکی جاسوس یا خطرناک قسم کے مجرم ہمیشہ اپنے ساتھ شتیل جیسے ناقابل شکست باڈی گارڈ رکھتے ہیں یا اس لڑکی جیسے عجیب و غریب انسانوں کو اپنے بہترین حربوں کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں سب سے پہلے اس لڑکی کو حراست میں لینا ہوگا۔"

میں نے کہا: "ہاں بشرطیکہ وہ ہمارے قابو میں آجائے۔ جو مجرم اپنی حفاظت کے لئے عجیب و غریب حربے استعمال کرتے ہیں وہ تر نوالے کی طرح حلق سے نہیں اتر جاتے۔ ہمیں دشمنوں کو کمزور سمجھ کر ان کی طرف پیش قدمی نہیں کرنی چاہیے۔"

سعید احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ شتیل کی طرح تم بھی اس لڑکی سے خوفزدہ ہو گئے ہو۔ بھئی سیدھی سی بات ہے شتیل ہمیں دور سے وہ کوٹھی دکھائے گا ہم اپنے طور پر یہ معلوم کریں گے کہ اس کوٹھی میں وہ انگریز اور اس کی بیٹی موجود ہیں یا نہیں؟ اگر موجود ہوئے تو ہمارے مسلح نوجوان اس کوٹھی کو چاروں طرف سے گھیر لیں گے اور فرار کے تمام راستے مسدود کر دینگے۔"

میں نے سعید احمد کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "دوست! سابقہ ڈائریکٹر جنرل شبیر حسن نے بھی یہی کیا تھا۔ میں نے دو بار انہیں روکنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے میرے مشوروں کے خلاف دو بار مجرموں کے گرد گھیرا ڈالا اور دونوں دفعہ انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ بلکہ دوسری بار وہ خود ایک مجرم کے آلۂ کار بن گئے۔ ہم اور آپ مجرموں کو گرفت میں لینے کی جو پلاننگ کرتے ہیں بعض اوقات مجرم ہماری ٹھوس پلاننگ کے باوجود حیرت انگیز طور پر بچ کر نکل جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس اپنے داؤ پیچ بھی ہوتے ہیں۔"

سعید احمد نے تائید میں سر ہلا کر کہا: "میں تمہاری ان باتوں کو تسلیم کرتا ہوں۔ شبیر حسن صاحب کی ناکامیاں میرے سامنے ہیں۔ میں اپنے تجربے پر فخر نہیں کروں گا۔ تمہارے تجربات سے فائدہ اٹھاؤں گا۔"

"مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ واقعی آپ ایک افسر کی بجائے ایک دوست بن کر میرے مشوروں کی قدر کر رہے ہیں۔"

"تم ہمیشہ مجھے اپنا دوست ہی پاؤ گے۔ اب یہ بتاؤ کہ ہمیں پہلے کس طرح قدم اٹھانا چاہیے؟"

میں نے کہا: "فی الحال ہم کراچی نہیں جا سکتے اس لئے کہ شتیل سفر کے قابل نہیں ہے اس کے صحت یاب ہونے تک آپ لاہور اور پنڈی کی پناہ گاہوں پر چھاپے ماریں جن کے پتے آپ نوٹ کر چکے ہیں۔ میرا خیال ہے اس سلسلے میں میری کوئی خاص ضرورت نہیں ہوگی۔ میں کچھ روز اپنے گھر میں سکون سے رہنا چاہتا ہوں۔"

سعید احمد نے مجھے بخوشی اجازت دیدی کہ میں کچھ عرصے گھر پر سکون سے گذاروں۔ ایک طویل عرصے کے بعد مجھے سکون اور اطمینان حاصل ہو گیا۔ چند روز میں نے فرزانہ کے ساتھ اتنی اچھی طرح گذارے کہ ان دنوں کی یادیں آج تک میرے حافظے میں موجود ہیں۔

اس دوران مجھے اطلاع ملتی رہی کہ خفیہ پناہ گاہوں پر کس طرح چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ اور بلیک گائیڈ کے آلۂ کار مجرموں کو گرفتار کیا جا رہا ہے۔ سعید احمد نے یہ عقلمندی کی تھی کہ تمام پناہ گاہوں پر بیک وقت ریڈ کیا تھا۔ اگر وہ باری باری ایسا کرتے تو دوسرے محتاط ہو کر فرار ہو جاتے۔ لیکن سعید احمد نے ان کے فرار ہونے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے ڈائریکٹر جنرل کا عہدہ سنبھالتے ہی ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے تھے کہ اعلیٰ حکام کی طرف سے برابر مبارکباد کے پیغام مل رہے تھے۔

ایک ہفتے بعد شتیل چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ اب وہ روزانہ صبح ہلکی پھلکی ورزش کیا کرتا تھا اور اپنی جسمانی پھرتی اور قوت کو بحال کر رہا تھا۔ میں اس کی صحت یابی کا منتظر تھا۔ جب وہ اچھلنے کودنے کے قابل ہو گیا تو میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے اپنے لڑنے کے داؤ پیچ سکھائے۔ وہ میرا فرمانبردار بن چکا تھا۔ دن میں کئی کئی گھنٹے وہ مجھے لڑنے کی ٹریننگ دیتا تھا۔ سیکھنے کے دوران میں نے اس سے اتنی مار کھائی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ بہرحال میں نے اپنی ہڈی پسلی تڑوا کر اس سے اتنا کچھ سیکھ لیا کہ اب اس کے مقابلے پر ڈٹ جاتا تھا۔ وہ جتنی پھرتی سے مجھ پر حملے کرتا تھا میں اپنے بچاؤ کے لئے اس سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ گھنٹوں وقفے وقفے سے لڑنے کے بعد وہ یہ تسلیم کر لیتا تھا کہ اب مجھے زیر نہیں کر سکتا۔ ایسے وقت میں نے اس کی سوچ کو ٹٹولا کہ کہیں اس نے کوئی داؤ پیچ خاص اپنے لئے بچا کر نہ رکھا ہو۔ کیونکہ استادوں کا یہ دستور ہوتا ہے کہ وہ اپنی برتری کے لئے اپنے شاگردوں سے ایک آدھ داؤ پیچ بچا کر رکھتے ہیں لیکن اس کی سوچ سے پتہ چلا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے بڑی ایمانداری سے مجھے سب کچھ سکھا دیا تھا۔ اس دوران سعید احمد اصرار کرتے رہے کہ ہمیں جلد کراچی چلنا چاہیے۔ ان کے اصرار پر ہم ایک فلائٹ سے کراچی روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر ہم نے انٹر کان میں قیام کیا۔ وہاں کے انٹیلیجنس والوں کی طرف سے ہمارے لئے دو کاریں مہیا کر دی گئی تھیں۔ کچھ لوگ سادہ لباس میں سعید احمد کی حفاظت اور اس کے حکم کی تعمیل کے لئے ہر وقت ہر جگہ تھوڑے سے فاصلے پر موجود رہتے تھے۔ میں ایسی احتیاطی تدابیر کو پسند نہیں کرتا تھا اس طرح دشمن محتاط ہو جاتے ہیں۔ میں خاموش رہا کہ کبھی ان کی وجہ سے کوئی کام بگڑے گا تو میں اس گڑبڑی کو

سنبھال لوں گا۔ لیکن اس طرح سعید احمد کو عملی طور پر تلخ تجربہ ہو جائے گا۔ پھر وہ میرے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کریں گے۔

دوسرے دن ہم کاروں میں بیٹھ کر شتیل کی رہنمائی میں ہل پارک کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک کار سعید احمد کے لئے اور دوسری کار میرے لئے مخصوص تھی۔ شتیل میرے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہل پارک کے ایک نشیبی علاقے میں گاڑی رکوا کر پھر دور انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ جہاں ہم کھڑے ہیں وہاں سے تیسری کوٹھی میں وہ انگریز اپنی بیٹی کے ساتھ رہتا ہے۔" شتیل نے کہا۔

"اب میں آگے نہیں جاؤں گا کہ دونوں باپ بیٹی مجھے پہچانتے ہیں۔"

میں نے اشاروں کی زبان میں اس سے کہا: "ٹھیک ہے تمہارا جانا مناسب نہیں ہے تم یہ گاڑی لے کر واپس چلے جاؤ۔"

میں نے اسے اپنی گاڑی دیدی۔ سعید احمد اپنی کار سے اتر رہے تھے۔ میں نے ان کے پاس آکر بتایا کہ مجرم کس کوٹھی میں رہتے ہیں۔ ان سے باتیں کرتے ہوئے میں نے آس پاس نظریں دوڑائیں۔ ہمارے پیچھے بہت دور ایک جیپ میں چار آدمی بیٹھے ہوئے۔ میں نے سعید احمد سے پوچھا۔ "شاید یہ آپ کے آدمی ہیں؟"

"ہاں اپنے ہی لوگ ہیں یہ ہم سے اسی طرح دور رہیں گے کسی کو شبہ نہیں ہوگا۔"

"ہاں عام آدمیوں کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو مجرم ہوتے ہیں اور عقابی نظریں رکھتے ہیں وہ ضرور تاڑ لیں گے کہ ہم پوری فورس کے ساتھ محاصرہ کرنے آئے ہیں۔"

سعید احمد نے کہا: "میں نہیں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنی جیپ میں رہیں ... اور ایک دوسرے سے دور دور رہیں جب تک میرا اشارہ نہ ہو اس وقت تک وہ ایک جگہ جمع نہیں ہوں گے اور نہ ہی ہمارے قریب آئیں گے۔"

"اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو ایسا کریں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ابھی انکی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ابھی ہم دونوں اس کوٹھی سے ذرا فاصلے پر رہ کر کسی طرح ان باپ بیٹی کو ایک نظر دیکھ لیں ان میں سے کسی ایک کو دیکھ لینے کے بعد ہی میں ان کی سوچ تک پہنچ سکتا ہوں۔"

سعید احمد نے کہا: "اچھی بات ہے میں اپنے آدمیوں کو واپس بھجوا رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ جیپ کی طرف چلے گئے۔ میں انہیں خاموشی سے دیکھتا رہا۔ وہ جیپ کے قریب پہنچ کر اپنے آدمیوں سے تھوڑی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ میں یہاں کھڑا ہوا ان کی سوچ کے ذریعہ ان کی باتیں سن سکتا تھا۔ لیکن ہر وقت کی خیال خوانی مجھے اچھی نہیں لگتی۔ پھر چونکہ میں جانتا تھا کہ جو باتیں بھی ہوں گی وہ آکر مجھے بتا دینگے۔ اگر ان میں سے کسی پر شبہ ہوتا تو خیال خوانی کی ضرورت پیش آتی۔

تھوڑی دیر بعد سعید احمد اپنے ایک آدمی کے ساتھ واپس آگئے۔ انہوں نے اس آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ان باپ بیٹی کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے اس سے تمہیں کافی معلومات حاصل ہو جائیں گی۔"

وہ شخص کہنے لگا: "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ لوگ اس کوٹھی کی طرف آنا چاہتے ہیں تو میں ہوٹل میں ہی ان باپ بیٹی کے متعلق بہت کچھ بتلا دیتا۔ وہاں جو انگریز رہتا ہے اس کا نام اسٹوفر گریس ہے اور اس کی بیٹی کا نام انجلا ہے۔ وہ خود کو استنبول کا باشندہ کہتے ہیں اور ترکی کے پاسپورٹ پر آئے ہیں۔ اسٹوفر ماہر نجوم اور دست شناس ہے اونچے طبقے کی لڑکیاں اور کروڑپتی عورتیں مستقبل کا حال معلوم کرنے اس کے پاس جاتی ہیں۔ منچلے نوجوان اور دل پھینک قسم کے بڈھے انجلا کو دیکھنے جاتے ہیں۔ اسٹوفر اپنی بیٹی انجلا کو اپنا معمول بناتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اسے ہپناٹائز کرتا ہے لیکن اپنے دولتمند گاہکوں کے سامنے الٹے سیدھے منتر پڑھتا ہے۔ ان کے سامنے ایک اسٹیج پر آگ دہکتی رہتی ہے اور شعلے بھڑکتے رہتے ہیں۔ انجلا اس کے حکم پر بے لباس ہو کر ان شعلوں کے درمیان چلی جاتی ہے۔ پھر آگ میں جلنے کے دوران وہ لوگوں کو ماضی حال اور مستقبل کی باتیں بتاتی ہے۔ میرا خیال ہے وہ باتیں کم سنتے ہیں اور اسے دیکھتے زیادہ ہیں کیونکہ وہ بیحد حسین ہے اور نگاہوں کو للچانے والا بیحد خطرناک جسم رکھتی ہے۔ اس پر غضب یہ کہ اس کے بدن پر لباس نہیں ہوتا۔ بھڑکتے ہوئے شعلے لباس کے چیتھڑوں کی طرح اسے ادھر ادھر سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جلتی آگ میں جلتا اور تپتے ہوئے بدن کا منظر بڑا ہی ہیجان انگیز ہوتا ہے۔

اس کوٹھی میں داخلے کی فیس فی کس پانچ سو روپیہ ہے۔ اس کے علاوہ وہ مسائل حل کرنے کا معاوضہ ہزار، پانچ ہزار اور دس ہزار تک لیتا ہے۔ اس علاقے میں لوگوں کے پاس بے حساب دولت ہے وہ اسے منہ مانگا معاوضہ دیتے ہیں۔ بظاہر تو وہ ایک ماہر نجوم ہے لیکن جس انداز میں وہ ماضی حال اور مستقبل کی باتیں بتاتا ہے اور لوگوں کے مسائل حل کرتا ہے۔ باطن میں اس کا یہ انداز کیبرے ٹرانس کا ہے۔ بلکہ وہاں کا ماحول کیبرے سے زیادہ ہیجان انگیز ہوتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم اس کی ان حرکات کو غیر قانونی نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہمارے ملک کے بیشتر شہروں میں ایسے طلسم کدے ہیں جہاں عامل حضرات اپنے علم کے ذریعہ روحوں کو طلب کرتے ہیں۔ یہاں صرف فرق اتنا ہے کہ اسٹوفر کے بنائے ہوئے اسٹیج پر کوئی روح نہیں آتی۔ انجلا کا جیتا جاگتا قیامت خیز بدن آتا ہے اور وہ بدن آگ کے شعلوں سے کھیل کر یہ ثابت کرتا ہے کہ انجلا ایک ٹھوس جسم رکھنے کے باوجود ایک ایسی روح ہے یا ایسا آتشی پیکر ہے جس پر آگ اثر نہیں کرتی۔ وہاں جانے والے اس منظر سے بہت متاثر ہوتے ہیں اور دونوں باپ بیٹی کے عقیدت مند بن کر رہ جاتے ہیں۔"

میں نے پوچھا: "کیا وہاں جانے کا کوئی وقت مقرر ہے؟"

اس نے جواب دیا: "جی ہاں ضرورتمند صبح نو بجے سے بارہ بجے تک وہاں جا کر اسٹوفر سے ملاقات کرتے ہیں۔ اور اسے اپنی پریشانیاں بتاتے ہیں۔ اس وقت انجلا کسی کے سامنے نہیں آتی۔ اسٹوفر صبح آنے والوں کو شام کا وقت دیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ اس کی بیٹی انجلا ٹھیک سات بجے آگ کے شعلوں میں نہائے گی اور انہیں ان کی پریشانیوں کا سبب بتائے گی اور ان کا حل پیش کرے گی۔ یہ تماشہ صرف آدھ گھنٹے کے لئے ہوتا ہے اس کے بعد ضرورتمند تماشائی رخصت ہو جاتے ہیں۔ آٹھ بجے کے بعد اس کوٹھی میں سناٹا چھا جاتا ہے۔"

دیں کیونکہ واجد کے ذریعہ اسے ہمارے نام اور آپ کے عہدے کا پتہ چل چکا ہے یہ آپ نے اچھا ہی کیا کہ واجد کو اسٹوفر کی کوٹھی سے سیدھا دفتر جانے کے لئے کہہ دیا اگر وہ وہاں سے ہمارے پاس آتا اور ہم سے گفتگو کرتا تو مجرم بھی میری طرح وہی چال چلتا یعنی واجد کی سوچ کے ذریعہ ہماری گفتگو اور لہجے کی ٹوہ کرتا کر ہمارے دماغ تک پہنچ جاتا۔"

"واقعی ہم نے یہ دانشمندی کی ہے کہ واجد کو اپنے سے دور رکھا لیکن جب بھی میں دفتر جاؤں گا تو واجد سے سامنا ہوگا اور اسٹوفر اس تاک میں بیٹھا ہوگا کہ وہ اس کے ذریعہ ہماری اصلیت تک پہنچے۔"

"سعید صاحب بڑی احتیاط کی ضرورت ہے میرا مشورہ ہے کہ اب آپ دفتر ہی نہ جائیں یا پھر یوں کریں کہ واجد سے پہلے آپ دفتر پہنچیں اور یہاں کے سینئر افسر کو مشورہ دیں کہ وہ واجد کو ایک ماہ کے لئے عارضی طور پر ملازمت سے برخاست کردے اس کے لئے واجد کی کوئی غلطی تلاش کی جائے تاکہ خیال پڑھنے والے اسٹوفر کو اس کا یقین ہو جائے کہ اسے کسی احتیاطی تدبیر کے باعث ملازمت سے الگ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اسے کسی غلطی کی سزا دی جارہی ہے اس طرح اسے اس بات کا علم نہیں ہوگا کہ ہم اس کی ٹیلی پیتھی کی صلاحیتوں سے واقف ہو گئے ہیں۔"

سعید احمد نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔

"ٹھیک ہے میں ابھی دفتر جاتا ہوں اور وہاں کے سینئر افسر سے ملاقات کر کے واجد کو عارضی طور پر اس طرح ملازمت سے برخاست کراؤں گا اور یہ بھی کہوں گا کہ ایک ماہ تک اسے انٹیلیجنس کی عمارت میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جائے۔"

"اس کے علاوہ اور بھی احتیاطی قدم اٹھانا ہے مثلاً یہ کہ واجد کو ہماری رہائش کا علم ہے ہمیں فوراً ہی وہ ہوٹل چھوڑ کر کہیں دوسری جگہ منتقل ہونا پڑیگا. جو سرکاری گاڑیاں ہمارے استعمال میں ہیں ان کے نمبروں سے بھی واجد واقف ہے. وہ بیچارہ ہمارا دشمن نہیں ہے لیکن نادانستگی میں اسٹوفر کا آلۂ کار بنتا رہے گا اور اسکے لئے معلومات فراہم کرتا رہے گا. لہٰذا ہمیں گاڑیاں بھی بدل دینی چاہئیں. اب آپ یہ بتلائیں کہ ہم ہوٹل چھوڑ کر فوراً ہی کہاں منتقل ہو سکیں گے ؟"

سعید احمد نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"یہاں ڈلس بیچ کے ساحل پر میرے ایک دوست کا کاٹیج ہے، ہم فی الحال وہاں چلے جائیں گے میں ان کاموں سے تقریباً دو تین گھنٹے میں فارغ ہو جاؤں گا یعنی ایک بجے میں شیتل کے ساتھ میٹرو پول میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

میں نے کہا: "ٹھیک ہے آپ یہ گاڑی لے جائیں۔"

یہ پروگرام طے کرنے کے بعد وہ گاڑی لے کر چلے گئے ان کے جانے کے بعد میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا پارک کے اس سرے پر آ گیا جہاں سے رہائشی حصے میں اسٹوفر کی کوٹھی نظر آ رہی تھی میں ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا چند لمحوں تک اس کوٹھی کو دیکھتے رہنے کے بعد میں نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر سے واجد کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ ریسپشن روم میں اس کے سوا جو ضرورت مند بیٹھے ہوئے تھے وہ اسٹوفر سے ملاقات کرنے کے بعد رخصت ہو گئے تھے۔ اب واجد کی باری تھی۔

لیڈی سیکریٹری اسٹوفر کے کمرے تک اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔

اسٹوفر نے اپنے کمرے کو خالص مشرقی انداز میں سجا رکھا تھا اور قالین وغیرہ نہیں تھے۔ کمرے کے ایک حصے میں چاندنی بچھی ہوئی تھی بڑے گاؤ تکئے رکھے ہوئے تھے۔ جن کے غلافوں پر ریشمی سنہری دھاگوں بنا ہوا تھا۔ ایک اونچے سے لوبان سوز میں انگارے دہک رہے تھے خوشبودار دھواں اٹھتا ہوا کمرے کی محدود فضا میں پھیل رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ادھر میں اس سے بہت دور ایک درخت کے سائے میں کھڑا ہوا اس کے دماغ میں جھانک کر وہاں کا نظارہ ٹیلی پیتھی کا علم ایسا ہی ہے میں ہزاروں میل دور بیٹھ کر بھی سات پردوں کے پیچھے جھانک کر نت نئے تماشے دیکھتا رہتا ہوں۔ میرے سامنے ذہن کی پر فلم سی چلتی رہتی ہے اور آہنی دیواروں کے پیچھے چھپی ہوئی باتیں اور کردار میرے سامنے متحرک ہو جاتے ہیں۔

اسٹوفر ایک سنہری لبادے میں ملبوس، گاؤ تکیوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر ایک بڑی سی پگڑی تھی۔ اس کے سفید و سرخ سرخی مائل داڑھی بہت سج رہی تھی۔ جب اس نے آنکھیں کھول کر واجد ایک دم سے لرز گیا۔ واجد کی سوچ مجھے بتا رہی تھی کہ اسٹوفر کی آنکھوں جگہ دو دہکتے ہوئے انگارے میں دو انگارہ آنکھیں واجد کے دماغ تھیں اور وہ بے اختیار ان آنکھوں کے سامنے جھکتا جا رہا تھا۔ اس کے کانپ رہے تھے اور اب وہ چکنے فرش پر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

تب ایک بھاری بھرکم گونجتی ہوئی سی آواز واجد کے دماغ

اسٹوفر حاکمانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"واجد جھوٹ انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے ہمارے کاغذ رکھا ہوا ہے اس میں تم نے لکھا ہے کہ تم ایک بزنس مین ہو۔ کیا یہ نہیں ہے ؟"

واجد کی سوچ نے مجھے اس کی آنکھوں کے متعلق جو کچھ بتایا اور بھاری بھرکم آواز سنی اس سے پتہ چل گیا کہ اسٹوفر صحیح معنوں میں ہپناٹزم ہے اس نے اپنی آنکھوں کو اس حد تک پرکشش بنا لیا تھا کہ واجد جیسا کا ضدی اور کھلنڈری طبیعت کا نوجوان اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ ہپناٹزم کے عمل میں آواز کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اور اسٹوفر کو بھاری بھرکم آواز اور حاکمانہ لہجے پر پوری قدرت حاصل تھی۔ نے بتایا کہ اس کی ایک آواز گویا ہی نوکیلے نشتروں کی طرح اس کے دماغ چبھ رہی تھی اور وہ اس کی کسی بات سے انکار کرنے کی جرأت نہیں

واجد نے لرزتی ہوئی آواز میں اپنے جھوٹ کا اعتراف کیا۔

"جی ہاں میں بزنس مین نہیں ہوں ایک ملازم ہوں"۔

کمرے کی محدود فضا میں پھر اسٹوفر کی آواز گونجنے لگی۔

"ہاں تم ملازم ہو۔ پرائے گھروں کے بھیدی ہو۔ ایسے جاسوس کہا جاتا ہے"۔

واجد نے عقیدت سے سر جھکا کر کہا۔

"آپ واقعی عالم ہیں آپ سے کوئی بات چھپی نہیں ہے۔ مجھ سے بڑی ہوئی۔ میں آئندہ کوئی بات آپ سے نہیں چھپاؤں گا۔"

"تم یہاں صرف جاسوسی کے لئے نہیں آئے ہو تمہارے دل میں ایک مچل رہی ہے اسے ہم سے نہ چھپاؤ صاف صاف بیان کرو۔"

واجد بوکھلا گیا۔ اس کے دل میں اس عالم کی بیٹی کی آرزو مچل رہی تھی اب کہ وہ انجلا کے بے لباس بدن کا نظارہ کرنے آیا ہے؟

اتنی دیر میں، میں اسٹوفر کی آواز کو اور اس کی گفتگو کے لہجے کو اچھی چکا تھا اور اب اس کے دماغ میں جھانکنے کے قابل ہو گیا تھا مجھے چپ چاپ سوچ کو پڑھنا تھا اور اس بات کا خاص خیال رکھنا تھا کہ میری کوئی سوچ دماغ تک نہ پہنچے یہ اسی وقت ہوتا جب میں اس کے دماغ پر دستک نے سوچ رکھا تھا کہ جہاں تک ممکن ہوگا میں خود کو اس سے چھپاؤں گا چپ چاپ اس کی سوچ کا مطالعہ کرتا رہوں گا۔ لہٰذا اس وقت بھی میں واجد کو اسٹوفر کے دماغ کو پڑھنے لگا۔

اس وقت واجد اس کشمکش میں مبتلا تھا کہ وہ کس طرح اسٹوفر کو کہ وہ اس کی بیٹی کے لئے آیا ہے، واجد سوچ رہا تھا اور اسٹوفر اس کی تھا اور میں اسٹوفر کی سوچ کو پڑھ رہا تھا۔

اسٹوفر واجد کو گہری نظروں سے دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا۔

"انسان کتنا کمینہ اور بزدل ہوتا ہے کسی کی بیٹی کو بے لباس دیکھنے کے ہے لیکن بیٹی کے باپ کو دیکھ کر سارا عشق دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔ انسان خواہش کیوں کرتا ہے جس کا اظہار وہ پوری دلیری سے دوسروں کے سامنے یہ بیوقوف جو میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے یہ میرا بہترین آلۂ کار بن سکتا ہے انٹیلیجنس کے بہت سے راز ہم تک پہنچائے گا اور یہ کام انجلا گی۔ یہ سوچ کر اس نے پھر اپنی گونجتی ہوئی آواز میں کہا۔

"واجد تم کس کشمکش میں مبتلا ہو تم لاکھ چھپانا چاہو پھر بھی تمہارا تمہارے دل کی بات بتائے گا۔ ہم تمہارے چہرے پر ایک حسین دوشیزہ کی جھلکیاں دیکھ رہے ہیں وہ دوشیزہ تمہیں نہیں جانتی ہے لیکن تمہیں دیکھ لیا تو تمہیں دیکھتے ہی ہزار جان سے عاشق ہو جائے گی اس کی زندگی کا نقشہ بدل دے گی تم ایک معمولی ملازم نہیں رہو گے اس دولت تمہیں ایک بہت بڑا بزنس مین بنا دے گی۔ تمہارے پاس کوٹھی ہوگی، لاکھوں کا بینک بیلنس ہوگا۔ آج تم جن افسروں کے سامنے کل وہ تمہارے سامنے سر جھکا کر باتیں کریں گے"۔

اسٹوفر کہہ رہا تھا اور واجد خوابوں کے رنگین کھلونے میں اڑا جا رہا تھا اس کے ساتھ حسین انجلا بھی تھی۔ اس نے فوراً ہی آگے بڑھ کر گھٹنوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

"آپ واقعی پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ آپ دلوں کا حال معلوم کر لیتے ہیں۔ سب کچھ جانتے ہیں تو مجھے یہ بتا دیں کہ وہ دوشیزہ کون ہے؟ وہ مجھے کب ملے گی؟ اور کہاں ملے گی؟"

"وہ تمہیں ابھی ملے گی اور یہیں ملے گی"۔

واجد مارے خوشی کے اپنی جسامت سے زیادہ پھیل گیا اسٹوفر خاموش ہو گیا تھا لیکن اس کی آواز چاروں طرف گونجتی ہوئی لگ رہی تھی: "ابھی ملے گی اور یہاں ملے گی"۔ لوبان سوز کا دھواں انجلا کے لچکیلے جسم کی طرح بل کھا رہا تھا اور اپنی زبان اور بے زبانی سے کہہ رہا تھا: "میں ابھی ملوں گی اور یہیں ملوں گی"۔ ہر لمحہ انجلا کی چاہت میں اور اس کی طلب میں اضافہ کر رہا تھا۔

اسٹوفر اس کے چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت کو پڑھتا جا رہا تھا اس نے پھر تحکمانہ انداز میں کہا۔

"اس دوشیزہ تک پہنچنے کے لئے لازمی ہے کہ پہلے تم جھوٹ سے توبہ کرو اور یہ یقین دلاؤ کہ ہمیشہ سچ بولو گے"۔

واجد نے اپنے گالوں پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا: "میں جھوٹ سے توبہ کرتا ہوں اگر ایک دوشیزہ کو حاصل کرنے اور ایک خوشحال مستقبل کے لئے سچ بولنا پڑے تو اس سے اچھی کیا بات ہوگی؟"

"تو پھر سچ بتاؤ تم خود یہاں آئے ہو یا بھیجے گئے ہو؟"

"میں خود یہاں آنا چاہتا تھا لیکن میری آمدنی اتنی نہیں ہے کہ میں آپ کی فیس ادا کر سکتا آج اتفاق سے دفتری کام نکل آیا اور جس سلسلے میں میرے افسر نے مجھے یہاں بھیجا ہے وہ باتیں آپ سے پوشیدہ نہیں ہیں"۔

"ہاں ہم سب کچھ جانتے ہیں لیکن تمہاری سچائی کو آزمانا چاہتے ہیں بولو تم کس حد تک سچ بول سکتے ہو ہم سننا چاہتے ہیں"۔

واجد سوچنے لگا: "کیا میں بتا دوں کہ میں یہاں ڈائریکٹر جنرل کے ساتھ آیا ہوں"۔

اسٹوفر نے کہا: "تم پھر اس کشمکش میں مبتلا ہو کہ تمہیں سچ بولنا چاہیئے یا نہیں۔ کیا اس طرح تم اس دوشیزہ تک پہنچ سکو گے؟ یا ہم بتا دیں کہ تم اس کوٹھی کے باہر اپنے ڈائریکٹر جنرل کے ساتھ آئے تھے؟"

واجد چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ ہر لمحہ یہ سوچ کر متاثر ہو رہا تھا کہ اسکے سامنے جو عالم بیٹھا ہوا ہے وہ غیب کی باتیں جانتا ہے اور اس سے کچھ چھپایا نہیں جا سکتا۔

اسٹوفر نے کہا: "میں پھر تمہاری سچائی کو آزماتا ہوں اب بتاؤ کہ ڈائریکٹر جنرل کے ساتھ وہ دوسرا آدمی کون تھا؟"

واجد نے سوچا فرہاد صاحب کا تعلق ہمارے محکمے سے نہیں ہے وہ صرف ڈائریکٹر جنرل کے دوست ہیں ان کے متعلق کہہ دینے میں حرج نہیں ہے یہ سوچ کر وہ کہنے لگا۔

"وہ دوسرا شخص ہمارے ڈائریکٹر جنرل کا دوست ہے اس کا نام فرہاد ہے ان کے درمیان اتنی گہری دوستی ہے کہ ڈائریکٹر جنرل اہم معاملات میں اس سے مشورہ لیتے ہیں"۔

اسٹوفر نے کہا: "ہوں تو تمہیں یہاں بھیجنے کا مشورہ بھی اسی فرہاد نے

دیا تھا؟"

"جی ہاں فرہاد نے ڈائریکٹر جنرل کو الگ لے جا کر کچھ کہا تھا۔ ڈائریکٹر جنرل نے اس کی باتیں سننے کے بعد مجھ سے کہا کہ میں یہاں آ کر آپ کے متعلق معلومات حاصل کروں۔"

"وہ میرے متعلق کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"

"وہ آپ کے خلاف ٹھوس ثبوت حاصل کرنا چاہتے ہیں"

"کس بات کا ثبوت؟"

"اس بات کا ثبوت کہ آپ دشمن ملک کے ایجنٹ ہیں۔"

"انہیں اس بات کا شبہ کیسے ہوا کہ میں کسی ملک کیلئے کام کر رہا ہوں؟"

واجد نے جواب دیا۔ "وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ آپ کسی سے اہم کاغذات کا سودا کر رہے ہیں۔"

اسٹوفر ایک دم سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اب تک وہ بڑے اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا لیکن اہم کاغذات کی بات آتے ہی وہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے اس کے چاروں طرف خطرات منڈلا رہے ہوں۔ اس نے واجد سے پوچھا۔

"کیا تم نے خود ان کی باتیں سنی تھیں؟"

"جی ہاں آپ کی کوٹھی کے باہر وہ یہی باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے باتوں کے دوران یہ بھی کہا تھا کہ آپ کسی شخص سے اہم کاغذات کا سودا کر رہے ہیں۔"

میں اسٹوفر اور واجد سے دور درخت سے ٹیک لگائے ان کی باتیں سن رہا تھا مجھے یاد آیا کہ میں نے تھوڑی دیر پہلے واجد کے ساتھ سے گفتگو کرتے وقت ان اہم کاغذات کا ذکر کیا تھا اور دوسرے باتوں کے سلسلے میں بلیک گائیڈ کا نام بھی لیا تھا یہ نام واجد کے ذہن سے نکل گیا تھا۔ جب اسٹوفر نے یہ پوچھا کہ کس شخص سے کاغذات کا سودا ہو رہا ہے تو اسے بلیک گائیڈ کا نام یاد نہیں آیا۔ وہ اسٹوفر کے سامنے ندامت سے بولا۔

"مجھے افسوس ہے کہ کوشش کے باوجود اس شخص کا نام مجھے یاد نہیں آ رہا ہے"

اس دوران اسٹوفر واجد کی سوچ کو پڑھتا رہا اور اس کی سوچ کے ذریعہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ واقعی وہ بہت دیر سے نام یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے مگر اسے یاد نہیں آ رہا ہے۔ اس نے کہا۔

"تمہیں نادم ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں تمہارے سچ اور جھوٹ کو اچھی طرح سمجھتا ہوں تم نے اس شخص کا نام یاد کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ نام تمہارے ذہن سے مٹ گیا ہے۔ کوئی بات نہیں ویسے کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ جس شخص سے کاغذات کا سودا ہو رہا ہے وہ کس ملک سے تعلق رکھتا ہے؟ دوران دوتوں اس ملک کے کس شہر میں اس کا قیام ہے؟"

"میں اس سلسلے میں بھی کچھ نہیں جانتا۔"

"اچھی بات ہے میں خود اپنے علم سے معلوم کر لوں گا تم ڈائریکٹر جنرل اور فرہاد کی قیام گاہ کا پتہ بتاؤ۔"

"وہ دونوں ناز ہوٹل کے کمرہ نمبر سات میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

اسٹوفر نے چونک کر پوچھا۔

"وہ ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہوئے ہیں کیا وہ دونوں کہیں باہر سے آئے ہیں؟"

"جی ہاں وہ دونوں لاہور سے آئے ہیں۔"

"لاہور سے۔۔۔؟" اسٹوفر سوچنے لگا "لاہور میں دھرم ویر (بلیک گائیڈ) رہتا ہے میں اسی سے اہم کاغذات کا سودا کر رہا تھا۔ دھرم ویر نے مجھ سے کہا تھا وہ ایک ہفتے بعد کراچی آئے گا اور یہاں آ کر سودا پکا کرے گا۔ میں یہاں اس کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انٹیلیجنس والوں کی گرفت میں آ گیا ہے۔ ڈائریکٹر جنرل اور فرہاد کو ان اہم کاغذات کا پتہ چل گیا اسی لئے وہ میرے سر پر آ پہنچے ہیں۔ اونہہ مجھے ان کی پرواہ نہیں ہے میں پولیس افسروں اور فرہاد جیسے مچھروں کو اپنی انگلیوں پر نچاتا ہوں میں ان کے دماغ تک پہنچ کر ان کی کھوپڑیاں الٹ کر رکھ دوں گا مگر مجھے ذرا سہولت سے کام کرنا ہوگا۔ ابھی میں کھل کر پولیس والوں سے نہیں ٹکراؤں گا کیونکہ ایک دوسرے ملک کے ایجنٹ سے بھی ایک اہم مائیکرو فلم کا سودا ہونے والا ہے۔ فی الحال دھرم ویر (بلیک گائیڈ) کی طرف سے مجھے ہوشیار رہنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے اہم کاغذات پولیس والوں کے ہاتھ لگ گئے ہوں۔ یہ معلوم کرنا کوئی بڑی بات تو نہیں ہے۔ ابھی میں واجد کو انجلا کے پاس بھیجتا ہوں وہاں انجلا اس سے لگاوٹ کی باتیں کر کے اسے بیوقوف بناتی رہے گی اور میں یہاں تنہائی میں بیٹھ کر دھرم ویر کے دماغ میں جھانکوں گا اس طرح مجھے تمام حالات کا علم ہو جائے گا کہ وہ کس طرح قانون کی گرفت میں آیا ہے اور وہ اہم کاغذات کہاں ہیں؟"

اسٹوفر کی سوچ کو پڑھتے ہی میں نے ذرا دیر کے لئے آنکھیں موند لیں۔ اس وقت بڑی ہی مشکل سچویشن تھی۔ اسٹوفر اگر بلیک گائیڈ کے ذہن تک پہنچ جاتا تو اس کی سوچ کے ذریعہ اس کی گرفتاری کے تمام حالات سے واقف ہو جاتا۔ بلیک گائیڈ اس کے اشارے پر ناراضگی میں سب سوچتا رہتا یعنی یہ بھی سوچتا کہ اسے گرفتار کرانے والا فرہاد ہے اور وہ فرہاد کہ فرہاد ٹیلی پیتھی کا ماہر ہے اس طرح اسٹوفر کے علم میں یہ بات آ جاتی کہ بلیک گائیڈ کی طرف سے فرہاد نامی جو شخص اس سے ٹکرانے آیا ہے وہ بھی ٹیلی پیتھی کا ماسٹر ہے۔ یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد اسٹوفر بہت زیادہ ہوشیار ہو جاتا جس طرح میں چھپ چھپا کر اس تک پہنچنا چاہتا ہوں اسی طرح وہ مختلف تدابیر سے مجھے اندھیرے میں رکھ کر میری موت کا سامان کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔

اس وقت اسٹوفر اپنی لیڈی سیکرٹری کو بلا کر اس سے کہہ رہا تھا کہ واجد کو انجلا کے پاس لے جائے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں بھی واجد کے ساتھ سفر کرتا ہوا انجلا تک پہنچ جاتا اور واجد کی نگاہوں سے اس حسینہ کا نظارہ کرتا لیکن اس وقت جان پر بنی ہوئی تھی۔ اور اس دنیا کا تمام

آ رہا تھا۔ لہٰذا واجد کو میں نے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اسٹوفر سے بدستور ذہنی رابطہ قائم رکھا۔

واجد کے جانے کے بعد جب اسٹوفر تنہا رہ گیا تو پہلے اس نے اطمینان سے اپنی پگڑی اتار کر ایک طرف رکھ دی پھر پلتھی مار کر یوگا کی مشق کرتے ہوئے اس نے اپنی تمام سانسیں سینے پر روک لیں اور مراقبے میں چلا گیا ویسے ٹیلی پیتھی جاننے والا شخص چلتے پھرتے بھی کسی کے ذہن میں جھانک سکتا ہے لیکن سانس روک کر اور مراقبے میں جا کر اس علم کی قوت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ خیال پڑھنے والا پوری محویت اور توجہ کی مکمل مرکزیت کے ساتھ کسی کے دماغ تک پہنچتا ہے اور ایسے استحکام سے اس کی سوچ کو اپنی گرفت میں لیتا ہے کہ پھر اس بیچارے کی سوچ ادھر ادھر بھٹکنے نہیں پاتی اور نہ ہی کوئی دوسرا اس کی سوچ کو بھٹکا سکتا ہے۔ لیکن اب وہ دوسرا شخص میں تھا جو بلیک گائیڈ کی سوچ کو اسٹوفر کے علم کی گرفت سے بھٹکانا چاہتا تھا۔

میں نے اپنے آس پاس دیکھا اس وقت چاروں طرف سناٹا تھا، کوئی مداخلت کرنے والا نظر نہیں آیا۔ میں بھی درخت کے سائے میں پلتھی مار کر بیٹھ گیا اور مراقبے میں چلا گیا۔

اس کے بعد میں سینکڑوں میل دور لاک اپ میں بیٹھے ہوئے بلیک گائیڈ کی سوچ کو پڑھنے لگا اس وقت وہ اپنے سب سے قابل اعتماد باڈی گارڈ شیتل کے متعلق سوچ رہا تھا اسے اس بات کی پریشانی تھی کہ آخر وہ گونگا کہاں غائب ہو گیا ہے، بلیک گائیڈ کے ذہن میں جھانکتے وقت میں یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے دماغ در یچے سے دیکھنے والا میں تنہا نہیں ہوں، اسٹوفر بھی یقیناً اس کی سوچ کو اسی وقت پڑھ رہا ہوگا۔

تھوڑی دیر بعد میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ بلیک گائیڈ کے دماغ میں ایک سوالیہ سوچ ابھری۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اسٹوفر بلیک گائیڈ کی سوچ میں پوچھ رہا تھا "اس وقت میں کہاں بیٹھا ہوا ہوں؟"

بلیک گائیڈ نے سمجھا کہ یہ اس کی اپنی سوچ ہے اس نے جواباً کہا۔

"آہ! اور کہاں بیٹھوں گا۔ میں پنجرے میں اس طرح بند ہوں کہ پرندے کی طرح پھڑ پھڑا بھی نہیں سکتا۔ میرے پر کاٹ دیئے گئے ہیں، میری پرواز کی قوت کا نام شیتل ہے اور وہی مجھ سے بچھڑ گیا ہے ان حالات میں اس کی مدد کے بغیر میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

اسٹوفر کی سوچ نے کہا "میرا باڈی گارڈ شیتل میری مدد کے لئے ضرور آئے گا۔ مجھے اس پر بھروسہ کرنا چاہیے اور ابھی ان اہم کاغذات کے متعلق سوچنا چاہیے جنہیں میں نے بڑی حفاظت سے چھپا رکھا ہے۔"

"میں ان کاغذات کے متعلق کیا سوچوں؟ جو چیز میرے قبضے سے نکل چکی ہے اس کے متعلق سوچ کر وقت کیوں ضائع کروں؟"

اسٹوفر کی سوچ نے کہا "ہوں یہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ تو مجھے سوچنا چاہیے کہ میری گرفتاری سے میرے اپنے لوگوں کو نقصان پہنچا ہے؟"

"بہت نقصان پہنچا ہے۔ میری جان چلی جاتی تب بھی میں اپنے آگ کا پتہ نہ بتاتا لیکن وہ کمبخت فرہاد۔۔۔۔"

میں نے فوراً مداخلت کی۔ کیونکہ بلیک گائیڈ یہ کہنے جا رہا تھا کہ فرہاد ہپناٹزم اور ٹیلی پیتھی کے ذریعہ اس سے سب کچھ اگلوا چکا ہے اسی لئے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کی سوچ میں کہا۔

"رام رام گڑبڑ ہو گئی۔ گڑبڑم۔ فرہادم گڑبڑم۔ ہرے راما۔ ہرے کرشنا تراشیدم، پرستیدم، شکستم، فرہادم گڑبڑم۔۔۔۔"

اس بکواس کے ساتھ ہی میں اسٹوفر کی سوچ کو پڑھنے لگا۔ وہ حیرانی سے سوچ رہا تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی یہ تو کچھ الٹی سیدھی سی باتیں کر رہا ہے۔ اس بکواس میں جو فارسی الفاظ ہیں انہیں تو میں سمجھتا ہوں اس لئے کہ میں فارسی زبان جانتا ہوں۔ لیکن یہ گڑبڑم اور فرہادم شاید سنسکرت زبان ہے۔"

یہ سوچنے کے بعد اسٹوفر نے پھر بلیک گائیڈ کی سوچ میں کہا۔

"میں کیسی بکواس کر رہا ہوں میں شاید فرہاد کے متعلق کچھ کہتے کہتے بکواس کرنے لگا تھا مجھے ابھی فرہاد کے متعلق سوچنا چاہیے۔"

بلیک گائیڈ نے پریشان ہو کر ایک ہاتھ سے اپنی پیشانی کو رگڑتے ہوئے کہا "واقعی ابھی مجھے کیا ہو گیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرہاد کہیں بیٹھا ہوا میرے ذہن میں۔۔۔۔؟"

میں نے پھر بلیک گائیڈ کے دماغ میں ہلچل مچائی۔

"گڑبڑم فرہادم نے میرے ذہن میں کانٹے بھر دیئے ہیں۔ اس نے مجھے ایسی ذہنی اذیتیں پہنچائی ہیں کہ میں اکثر سوچتے سوچتے گڑبڑا جاتا ہوں۔ گڑبڑم فرہادم، میرا دماغ گڑبڑا گیا ہے میں گڑبڑا گیا ہوں نہ جانے میرا کیا ہونے والا ہے؟"

اس کی سوچ پڑھ کر اسٹوفر سوچ میں پڑ گیا کہ آخر بلیک گائیڈ جیسے ذہین آدمی کو کیا ہو گیا ہے وہ بلیک گائیڈ سے مل چکا تھا اور اس کی ذہانت سے بے حد متاثر ہوا تھا اب اس کی الٹی سیدھی سوچیں پڑھ کر یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ اس ملک کے انٹیلیجنس والے بہت چالاک ہیں۔ انہوں نے بلیک گائیڈ جیسے ذہین مجرم کو جسمانی اذیتیں دینے کے بجائے اسے ذہنی اذیتیں پہنچائی ہیں اور شاید یہ اذیتیں پہنچانے والا وہی فرہاد ہے۔ جب بھی فرہاد کا نام آتا ہے اس کی سوچ میں کھلبلی سی مچ جاتی ہے اور وہ سہمے ہوئے انداز میں کبھی فارسی اور کبھی سنسکرت میں بکواس کرتا ہے۔ اس بکواس کے دوران بھی وہ فرہادم کہتا ہے۔ یعنی وہ اذیتیں دینے والا فرہاد اتنا خطرناک اور ظالم ہے کہ اس کے نام سے مجرم کانپ جاتے ہیں۔

یہ سوچنے کے بعد اس نے آزمائشی طور پر پھر دو تین بار بلیک گائیڈ کو سوچ کے ذریعہ اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔ میں محتاط بیٹھا ہوا تھا جب بھی بلیک گائیڈ کی سوچ میں میرا نام آتا، میں فوراً ہی اس کی سوچ میں انتشار پیدا کر دیتا۔ آخر اسٹوفر نے تھک ہار کر یہ سمجھ لیا کہ وہ بلیک گائیڈ کے پراگندہ ذہن سے اہم معلومات حاصل نہیں کر سکے گا۔ لہٰذا اس نے بلیک گائیڈ سے دماغی رابطہ توڑ دیا میں نے بھی اطمینان کی سانس لی بلیک گائیڈ کو چھوڑ کر پھر اسٹوفر کے ذہن میں بھٹکنے لگا۔

اسٹوفر گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اس وقت اس کی سوچ کا ہیرو میں تھا۔ کچھ تو واحد نے یہ کہہ کر میری اہمیت جتائی تھی کہ ڈائریکٹر جنرل فرہاد کے مشورے پر چلتے ہیں، اس کے بعد بلیک گائیڈ کے دماغی کھنڈر میں جھانکنے کے بعد اس حیثیت سے میری اہمیت بڑھ گئی تھی کہ میں ظالم بھی ہوں اور خطرناک بھی اور بلیک گائیڈ جیسے ذہین مجرموں کو ذہنی اذیتیں دینے کے طریقے جانتا ہوں۔

اب وہ میرے ہی متعلق سوچ رہا تھا اتنا تو اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میں اسی شہر میں آ گیا ہوں بلکہ اس کی کوٹھی کے قریب آ گیا ہوں۔ اس نے میری اس حرکت سے بھی یہ نتیجہ نکالا کہ میں اس کی کوٹھی کے قریب آ کر بھی اس کے سامنے نہیں آیا۔ اور واحد کو آلۂ کار بنا کر بھیج دیا۔ پھر اس نے سوچا کہ فرہاد آخر کب تک محتاط رہے گا۔ ایک بار میں اسے دیکھ لوں تو ٹیلی پیتھی کے ذریعہ اس کے دماغ کو اپنے کنٹرول میں کر لوں گا۔ اب مجھے سب سے پہلے یہی کوشش کرنی چاہیے کہ میں کس طرح فرہاد کو ایک نظر دیکھ سکتا ہوں۔

تھوڑی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد اسے شتیل کی یاد آئی۔ اس نے سوچا کہ بلیک گائیڈ کا باڈی گارڈ شتیل یقیناً فرہاد کو جانتا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے ذریعہ کچھ معلومات حاصل ہو جائیں۔ یہ سوچتے ہی وہ پھر مراقبے میں گیا اور شتیل سے ذہنی رابطہ قائم کرنے لگا۔

میں اس سے پیچھے کیسے رہ سکتا تھا اس کے ساتھ ہی میں بھی شتیل کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ وہاں بھی تھوڑی دیر تک اسٹوفر اس گونگے کی سوچ کو کھنگالتا رہا لیکن میں نے شتیل کی اپنی سوچ کو یہ موقع نہیں دیا کہ وہ اسٹوفر کے لئے معلومات فراہم کر سکے میں نے شتیل کی سوچ میں ہر بار اسے یہی جواب دیا کہ وہ فرہاد کے متعلق کچھ نہیں جانتا ہے۔

اسٹوفر شتیل سے بھی مایوس ہو کر اب واحد کے متعلق سوچنے لگا کیونکہ واحد ہی ایسا تھا جس کے ذریعہ وہ مجھ تک پہنچ سکتا تھا اس بار اسٹوفر نے اپنی بیٹی انجلا سے دماغی رابطہ قائم کیا انجلا اس وقت اپنے بیڈ روم میں بیٹھی واحد کے ساتھ بڑے ہی محبانہ انداز میں باتیں کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"واحد تم ایک معمولی صورت شکل کے آدمی ہو۔ تمہاری کوئی خاص پرسنلٹی بھی نہیں ہے، اس کے باوجود نہ جانے کیوں میرا دل تمہاری طرف کھنچا جا رہا ہے۔ پتہ نہیں تمہارے اندر کیا بات ہے تم ہی بتاؤ کہ میری یہ آنکھیں تمہیں بار بار کیوں دیکھنا چاہتی ہیں؟"

واحد کی آواز سنائی دی: "محبت اسی کو کہتے ہیں، عشق ہو جائے تو صورت شکل نہیں دیکھی جاتی۔ صرف دل کی دھڑکنیں گنی جاتی ہیں۔ اب تم سے جدا ہو کر میں تمہارے گیت گایا کروں گا۔"

وہ بکواس کر رہا تھا اس دوران اسٹوفر نے اپنی بیٹی کے دماغ پر دستک دی۔ بیٹی فوراً ہی سمجھ گئی کہ باپ سوچ کے ذریعہ اس سے مخاطب ہے۔ وہ اپنی سوچ میں بولی۔

"یس ڈیڈی۔۔!"

اس کے ڈیڈی کی سوچ نے کہا۔

"انجلا ایک بہت ہی ضروری ہدایت ہے۔ واحد کو بڑی محبت سے مجبور کر دو کہ ابھی وہ تمہارے پاس سے اٹھ کر جائے اور اپنے ڈائریکٹر جنرل کے دوست فرہاد سے ملاقات کرے۔ اگر وہ یہ کہے کہ وہ اپنے افسر سے یا افسر کے کسی دوست سے ان کی اجازت کے بغیر نہیں مل سکتا تو تم اسے شہ دو۔ اسے سمجھاؤ کہ وہ بڑے آدمیوں سے بلا جھجک نہیں ملے گا تو خود بڑا آدمی کیسے بنے گا؟ تم اسے سہارا دو کہ اگر فرہاد سے ملنے کی کوشش میں اس کی ملازمت چلی گئی تو وہ کوئی غم نہ کرے تم اس کے ساتھ مستقبل کے محبت بھرے منصوبے بناؤ گی اور اسے ایک بہت بڑے کاروبار کے لئے ایک بہت بڑی رقم دو گی۔"

بیٹی کی سوچ نے کہا: "ڈیڈی آپ فکر نہ کریں یہ الو کا پٹھا بُری طرح پھنسا ہے میں جیسے چاہوں گی اسے ناچ نچاؤں گی میں ابھی اسے فرہاد کے پاس بھیج رہی ہوں۔"

اس وقت انجلا آنکھیں بند کئے ہوئے اور ایک ہاتھ سے سر کو تھامے ہوئے باپ سے گفتگو کر رہی تھی۔ واحد نے اس سے پوچھا۔

"تم اس طرح کیوں بیٹھ گئی ہو کیا سر میں درد ہو رہا ہے؟"

اس نے جواب دیا: "ہاں کبھی کبھی اچانک ہی سر دکھنے لگتا ہے۔ میں چاہتی تھی کہ ابھی تمہارے ساتھ مستقبل کے منصوبے بناؤں لیکن اس سے پہلے میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم کتنے حوصلے کے آدمی ہو کیا تم بڑے لوگوں سے بلا جھجک گفتگو کر سکتے ہو؟"

"ہاں کیوں نہیں یہ کونسی بڑی بات ہے؟"

"اچھا تو میں تمہیں آزماتی ہوں تم ابھی یہاں سے جاؤ اور اپنے ڈائریکٹر جنرل اور اس کے دوست سے ملاقات کرو۔"

واحد نے جھجکتے ہوئے کہا: "ڈائریکٹر جنرل نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس کوٹھی سے نکل کر سیدھا دفتر چلا جاؤں، وہ لوگ تو شاید ہوٹل کے کمرے میں آرام کرنے چلے گئے ہوں گے ان کی اجازت کے بغیر میں وہاں جا کر ان سے ملاقات نہیں کر سکتا۔"

انجلا نے کہا: "اسی کو چھوٹا پن کہتے ہیں۔ تم اس لئے احساس کمتری میں مبتلا ہو کہ تم ان کے ملازم ہو۔ لیکن میری محبت کی ایک شرط یہ ہے کہ تم خود کو کسی کا ملازم نہ سمجھو۔ آج سے تم کہیں ملازمت نہیں کرو گے، میں تمہیں اتنی بڑی رقم دوں گی کہ تم اپنی تمام مجبوریوں اور محتاجیوں کو بھول جاؤ گے۔ لیکن اس کے لئے بھی ایک شرط ہے کہ پہلے تم بڑے لوگوں کے سامنے سر اٹھا کر بات کرنا سیکھو، اسی لئے میں تمہیں آزمائش کے طور پر کہہ رہی ہوں کہ اب تک تم جن لوگوں کو بڑا سمجھتے رہے ہو پہلے انہی کے پاس جا کر خاص طور پر ڈائریکٹر جنرل اور فرہاد کے سامنے یہ کہہ کر ان کے منہ پر کہو کہ تم یہ حقیر سی ملازمت نہیں کرو گے۔"

واحد سوچنے لگا: "انجلا پہلی ہی ملاقات میں میری ہو گئی ہے اور مجھے اپنے ساتھ ایک شاندار زندگی گزارنے کے مشورے دے رہی ہے۔ آج سے میری زندگی کا رخ بدل رہا ہے۔ اور جبکہ مجھے ملازمت چھوڑنی ہی ہے تو پھر ڈائریکٹر جنرل اور فرہاد کے سامنے جھجکنا کیسا؟ میں ابھی ان کے سامنے جاؤں گا اور"

مرا ٹھا کر ان سے باتیں کروں گا۔"

وہ وہاں سے جانے کے لئے اٹھ گیا، انجلا نے انگلی اٹھا کر کہا۔

"دیکھو میں سچائی کو پسند کرتی ہوں اور اپنے ڈیڈی کی طرح جھوٹ سے نفرت کرتی ہوں۔ اگر تم نے ڈائریکٹر جنرل اور فرہاد سے ملاقات نہیں کی اور یہاں آ کر جھوٹ بات بنائی تو تم دیکھ چکے ہو کہ ڈیڈی جھوٹ کے پیچھے چھپی ہوئی سچائی تک پہنچ جاتے ہیں۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو جو میں نے کہا ہے اس پر اسی طرح عمل کرو۔"

واحد نے سینے پر ہاتھ رکھ کر محبت کی قسم کھائی اور پیار کا وعدہ نبھانے کے لئے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میں نے بھی اسٹوفر سے ذہنی رابطہ ختم کر دیا۔ اس بات کا اندیشہ تھا کہ واحد کوٹھی سے نکل کر پہلے پل پارک کے آس پاس ہمیں تلاش کرے گا صرف یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہم ابھی تک وہاں موجود ہیں یا ہوٹل پہنچ گئے ہیں۔ میں وہاں سے اٹھ کر پل پارک کے پارکنگ ایریئے میں آیا پھر وہاں سے ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل میٹروپول کی طرف روانہ ہو گیا میری رسٹ واچ بتا رہی تھی کہ سعید احمد کو گئے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ اس دوران انہوں نے اٹر کان کا کمرہ خالی کر دیا ہوگا اور شتیل کو اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔

میٹروپول پہنچنے کے بعد میرا خیال درست نکلا۔ سعید احمد ٹھیک وقت پر اپنے تمام کاموں سے فارغ ہو کر وہاں شتیل کے ساتھ پہنچ گئے تھے میٹروپول کے باہر ہمارے لئے دو کاریں کھڑی ہوئی تھیں، پچھلی دو کاریں انٹیلیجنس والوں کو واپس کر دی گئی تھیں۔ ہم نئی گاڑیوں میں بیٹھ کر ہاکس بے کی طرف روانہ ہو گئے۔

تمام راستے میں انہیں بتاتا رہا کہ اسٹوفر نے بلیک گائیڈ اور شتیل سے کس طرح دماغی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور کس طرح میں اس کی معلومات میں رکاوٹ بنتا رہا اور اب اس کی بیٹی انجلا نے واحد کو ہوٹل کی طرف بھیجا ہے تاکہ ایک بار واحد میرے سامنے آ کر مجھ سے مخاطب ہو۔ اگر میں اس سے ایک بار بھی گفتگو کروں گا تو اسٹوفر اس گفتگو کے ذریعہ میرے دماغ تک پہنچ جائے گا۔ بہر حال ہم نے وہ ہوٹل تو چھوڑ دیا ہے واحد ہماری تلاش میں بھٹکتا رہے گا۔ اب اسٹوفر جب تک گرفت میں نہیں آئے گا اس وقت تک میری یہی کوشش ہو گی کہ میرا واحد سے سامنا نہ ہو۔

سعید احمد نے بتایا کہ انہوں نے بھی دفتری کارروائی کی ہے واحد کو ایک ماہ کے لئے عارضی طور پر برخاست کر دیا گیا ہے اسے اس بات کی اجازت نہیں ہو گی کہ وہ انٹیلیجنس کی عمارت میں داخل ہو یا ہمارے کسی آدمی سے ملاقات کرے۔ فی الحال ہم واحد سے بہت دور چلے آئے ہیں۔

ہاکس بے کا ساحل ویران تھا دور دور تک جو کاٹیج نظر آ رہے تھے وہ سب خالی پڑے ہوئے تھے۔ سعید احمد نے بتایا کہ یہاں صرف چھٹی کے دن چہل پہل ہوتی ہے۔ تمام کاٹیج آباد ہو جاتے ہیں۔ ساحل کے اس سرے سے اس سرے تک نوجوان عورتوں اور ہر عمر کے مردوں کا میلہ سا لگ جاتا ہے۔ پر سوں

ہے یہاں ایسی بھیڑ ہو گی جیسے سارا شہر امڈ آیا ہو۔

ہاکس بے پر یہاں سے وہاں تک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں ننگے پاؤں ریت پر بہت دیر تک ٹہلتا رہا اور سمندر کی لہروں سے کھیلتا رہا شتیل کاٹیج میں تمام سامان درست کر رہا تھا سعید احمد کاٹیج کے برآمدے میں ایک ایزی چیئر پر نیم دراز تھے۔ میں لامتناہی سمندر کے آگے ریت پر پالتھی مار کر بیٹھ گیا اور اسٹوفر کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ اسٹوفر اس وقت اپنی بیٹی انجلا سے باتیں کر رہا تھا۔ آج صبح جتنے ضرورت مند اس کوٹھی میں آئے تھے ان میں سے ایک واحد ایسا تھا جسے اس کے شاندار مستقبل کی خوشخبری سنا دی گئی تھی۔ اسٹوفر نے جس طرح واحد کی سوچ کو پڑھا تھا اسی طرح وہ دوسرے ضرورت مندوں کی سوچیں بھی پڑھ لیا کرتا تھا۔ خیال خوانی کے ذریعہ ان کے ماضی اور حال کو بے نقاب کرتا تھا اور یہ باتیں وہ انجلا کو بتا دیتا تھا۔ شام کے سات بجے جب انجلا آگ کے شعلوں میں آ کر کھڑی ہو جاتی اور جب اس آگ میں سلگتے ہوئے، وہی ماضی اور حال کی باتیں انہیں بتانے لگتی تو لوگ اسے روحانی یا طلسمی عمل سمجھ کر متاثر ہو جاتے تھے ان کے ڈھکے چھپے ماضی تک جہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا، وہاں اسٹوفر پہنچ جاتا تھا۔ اور انجلا آگ سے کھیلتی ہوئی ان کے حالاتِ زندگی بے نقاب کرتی تھی اسی لئے سب ہی اسے روحانی عمل سمجھتے تھے اور معاوضے کے طور پر بڑی سے بڑی رقم اس کے آگے رکھ کر چلے آتے تھے۔

اس وقت بھی اسٹوفر نے جتنے ضرورت مندوں کی سوچیں پڑھی تھیں انہیں وہ انجلا کے سامنے بیان کر رہا تھا۔ انجلا ان ضرورت مندوں کے نام اور ان کے ماضی و حال کے اہم واقعات کو ذہن نشین کر رہی تھی۔ میں ان باپ بیٹی کی مکاریوں کو سمجھ رہا تھا اور چپ چاپ ان کی باتیں سن رہا تھا کاروباری باتیں کرنے کے بعد ان کے درمیان دوسری اہم باتیں شروع ہو گئیں۔ وہ اہم باتیں یہ تھیں کہ انجلا کے عاشقوں کی فہرست میں کتنے خاص آدمیوں کے نام شامل ہیں ایسے خاص آدمی جو بے انتہا دولتمند ہوں اور انجلا کی مسکراہٹ پر ہیرے جواہرات پیش کر دیں یا ایسے اہم آدمی جو وزارتِ خارجہ کے بہت بڑے عہدیدار ہوں اور انجلا کی آغوش میں اس ملک کے اہم راز فاش کر دیں۔

عاشقوں کی اس فہرست میں انہوں نے صمد بخاری کو ترجیح دی تھی۔ صمد بخاری سکریٹریٹ میں ہیڈ کلرک تھا۔ تمام اہم فائلیں اس کی نظروں سے گزرتی رہتی تھیں۔ انجلا اس پر دل و جان سے عاشق ہو گئی تھی اور آج رات دس بجے ہوٹل سویٹ ڈریم میں اس نے صمد بخاری کو ڈنر کے لئے بلایا تھا۔ وہاں ڈنر پارٹی بھی تھی اور کیبرے ڈانس بھی تھا، شراب کی بوتلیں بھی کھلنے والی تھیں اور انجلا شباب کی مستی بھی چھلکانے والی تھی، اس رنگارنگی میں صمد بخاری سے بہت سی اہم باتیں اگلوانی تھیں۔

اس پروگرام کے متعلق گفتگو کرنے کے بعد اسٹوفر واحد سے دماغی رابطہ قائم کرنے لگا۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ واحد مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں؟ اس سے دماغی رابطہ قائم کرنے کے بعد اسٹوفر کو پتہ چلا کہ وہ میری تلاش میں فضول بھٹک رہا ہے، واحد کی سوچ نے بتایا کہ ڈائریکٹر جنرل اور فرہاد

ہوٹل اشرکان چھوڑ کر چلے گئے ہیں، وہ معلومات حاصل کرنے کے لیے انٹیلیجنس کے دفتر گیا تھا لیکن وہاں معلوم ہوا کہ اسے ایک پچھلی غلطی کی بنا پر ایک ماہ کے لیے ملازمت سے برخاست کر دیا گیا ہے۔ جب تک اس کی ملازمت بحال نہیں ہوگی اس وقت تک اسے دفتر میں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دفتر جاکر بھی ڈائرکٹر جنرل اور فرہاد کے متعلق معلومات حاصل نہیں کر سکا تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں؟ اسی شہر میں ہیں یا لاہور واپس چلے گئے؟

اسٹوفر نے اس کی طرف سے مایوس ہو کر انجلا سے کہا۔

"فرہاد کا اچانک غائب ہو جانا کیا عجیب سی بات نہیں ہے؟ صبح وہ ہماری کوٹھی تک آیا تھا اور ہمارے اطراف جال بچھا رہا تھا لیکن واجد کے یہاں سے واپس جانے تک اس نے اچانک ہی میرے خلاف ساری سرگرمیاں ختم کر دیں۔ میں یہ یقین نہیں کروں گا کہ وہ میرا خیال چھوڑ کر یہاں سے واپس چلا گیا ہے۔ وہ بہت زیادہ محتاط اور چالاک معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات بھی عجیب سی لگتی ہے کہ آج ہی واجد کو اس کی کسی پچھلی غلطی کی سزا دینے کے لیے ملازمت سے برخاست کر دیا گیا ہے"۔

انجلا نے کہا: "ڈیڈی فرہاد جس طرح احتیاط سے کام کر رہا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ فرہاد کسی طرح ہمارے منصوبوں سے واقف ہو گیا ہے اچانک ہوٹل چھوڑ دینا۔ واجد سے قطع تعلق کر لینا اس بات کی دلیل ہے کہ اسے واجد پر یہ شبہ ہو گیا ہے کہ واجد ہمارا آلۂ کار بن چکا ہے"۔

"یہی میں بھی سوچ رہا تھا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے یہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ ہم واجد کو اپنا آلۂ کار بنا رہے ہیں؟"

"ڈیڈی مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے وہ بھی خیالوں کو پڑھنا جانتا ہے"۔

"کیسی احمقانہ باتیں کرتی ہو، ایسے پسماندہ ملک میں جہاں تعلیم اور سوجھ بوجھ کی کمی ہو وہاں یہ سوچا ہی نہیں جا سکتا کہ کوئی ٹیلی پیتھی کے علم میں میرا ہم پلہ ہوگا۔ یہاں کے بک اسٹالوں میں ٹیلی پیتھی کے متعلق ابتدائی کتابیں نظر آتی ہیں، ان کتابوں سے علم کی گہرائی تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ پھر یہ کہ اس علم کو سیکھنے کے دوران ننانوے فیصد لوگ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس علم کو حاصل کرنے کی کوششیں احمقانہ نظر آتی ہیں یا پھر وہ ذہنی انتشار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں اس علم کو جاننے والے صرف دو چار ہی ہو سکتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ ان دو چار میں فرہاد کا نام بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی معلومات کے ذرائع کچھ اور ہیں۔ اگر ایک بار مجھے اس کے دماغ میں جھانکنے کا موقع مل جاتا تو پھر میں اس کی رگ رگ کو سمجھ لیتا۔ بہرحال وہ مجھ سے کب تک بھاگے گا میں جلد ہی اسے گھیر لوں گا"۔

انجلا نے کہا: "واجد ناکام ہونے کے بعد یہاں آ رہا ہوگا۔ آپ بتائیں کہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے؟"

"ابھی تو اس سے محبت سے ہی پیش آنا چاہیے اور اسے فرہاد کی تلاش میں لگائے رکھنا چاہیے ہو سکتا ہے کہ اتفاقیہ کبھی فرہاد سے سامنا ہو جائے وہ آئے تو اسے صبح تک کے لیے ٹال دینا۔ رات نو بجے کے بعد اس سے ملاقات کرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ دس بجے کے بعد تم صمد بخاری سے عشق کرو گی"۔

وہ بہت دیر تک اپنے مطلب کی باتیں کرتے رہے۔ میں رات پر سے اٹھ کر کاٹیج کے برآمدے میں آیا۔ سعید احمد سمجھ رہے تھے کہ میں خیال خوانی میں مصروف تھا۔ میرے قریب آتے ہی انہوں نے پوچھا۔

"کہو کیا خبر ہے؟"

میں نے ان کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہاں کی سکریٹریٹ میں ایک ہیڈ کلرک ہے اس کا نام صمد بخاری ہے وہ انجلا کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے اور وہ تیز طرار حسینہ اسے بیوقوف بنا رہی ہے آج رات ہوٹل سویٹ ڈریم میں اس نے صمد بخاری کو ڈنر کے لئے مدعو کیا ہے۔ صمد بخاری کی نظروں سے سکریٹریٹ کی اہم فائلیں گذرتی رہتی ہیں۔ انجلا ان فائلوں کے متعلق معلومات حاصل کرے گی"۔

سعید احمد نے کہا: "اچھا ہوا کہ ہمیں یہ بات پہلے ہی معلوم ہو گئی۔ ہم صمد بخاری کو وہاں جانے سے روک دیں گے"۔

میں نے کہا: "اس سے کیا فائدہ حاصل ہوگا۔ ہمارے ہوٹل چھوڑنے اور واجد سے قطع تعلق کرنے کے باعث اسٹوفر حیران ہے کہ ہم ایسی احتیاط کیسے برت رہے ہیں؟ اور یہ کہ ہمیں ان کے منصوبے کا علم کیسے ہو جاتا ہے؟ انجلا شبہ ظاہر کر چکی ہے کہ شاید میں بھی ٹیلی پیتھی جانتا ہوں لیکن اسٹوفر کو اس بات کا یقین نہیں ہے اب اگر صمد بخاری کو وہاں جانے سے روک دیا گیا تو ان کا شبہ یقین میں بدل جائے گا۔ وہ باپ بیٹی جو کرنا چاہتے ہیں انہیں کرنے دیں کر اپنے منصوبے کے متعلق کام کرنے دیجئے۔ ہم بھی آج رات دس بجے وہاں جائیں گے لیکن آج کے بعد ہمارا نام فرہاد اور سعید احمد نہیں ہوگا۔ میں اپنے آپ کو شہزاد کہوں گا آپ اپنا نام بتائیں؟"

سعید احمد نے سوچتے ہوئے کہا: "میرا نام۔ میرا نام مراد علی ہوگا"۔

"ٹھیک ہے۔ اب ہم ایک دوسرے کو اسی نام سے مخاطب کیا کریں گے حتیٰ کہ ہم اپنی تنہائی میں بھی جب اپنے متعلق سوچیں گے تو میں خود کو شہزاد انور کے طور پر سوچوں گا آپ بھی ہر حال میں سوتے جاگتے خود کو مراد علی کے نام سے یاد کریں گے۔ اگر آپ نے سوچنے کے دوران بھول سے بھی خود کو سعید احمد یا ڈائرکٹر جنرل کہا تو اسٹوفر ہماری اصلیت تک پہنچ جائے گا۔ کیونکہ ہم یہ نہیں جانتے ہیں کہ وہ کس وقت اچانک ہی ہمارے دماغ میں جھانکنے لگے گا ہوٹل سویٹ ڈریم میں واجد سے سامنا ہونے کا اندیشہ نہیں ہے اس لیے انجلا اور اسٹوفر سے ہمارا سامنا ہوگا تو اسٹوفر اس وقت تک ہماری اصلیت کو نہیں پہنچ سکے گا جب تک کہ ہم اپنے دماغ میں چپ چاپ اپنی اصلیت کے متعلق نہ سوچیں"۔

سعید احمد نے کہا: "فرہاد سوچ پر کنٹرول کرنا بہت مشکل ہے انسان اکثر خیالات کی دھن میں بے اختیار نہ جانے کیا کیا سوچتا چلا جاتا ہے۔ سوچا یک ایسا نشہ ہے کہ انسان بیداری کے عالم میں بھی ہوش سے بیگانہ ہو جاتا ہے جب وہ خیالات سے چونکتا ہے تو وہ خود یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ چند منٹ پہلے

سوچ رہا تھا۔ انسان لاکھوں روپے انگلیوں پر گن سکتا ہے لیکن اپنی سوچ کے ایک ایک پوائنٹ کو یاد نہیں کر سکتا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنے آپ پر بھروسہ نہیں ہے پتہ نہیں اسٹوفر کیسے کیسے ہتھکنڈوں سے میری مثبت یا منفی سوچ جو کہ میرے ذہن کو کھنگالنے کی کوشش کرے گا، تم سوچ بچار کے ماہر ہو اور ذہنی قلابازیوں کو اچھی طرح سمجھتے ہو، اس کا علم تم پر اثر انداز نہ ہو سکے گا لیکن کسی نہ کسی طرح مجھے متاثر کر دے گا اس لئے میں انکا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ تم تنہا وہاں جاؤ میں تمہاری حفاظت کے لئے تم سے دور رہوں گا"۔

میں نے کہا: "حفاظت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ وہاں نہ تو کوئی جھگڑا ہوگا اور نہ ہی میں انہیں اپنی اصلیت تک پہنچنے کا موقع دوں گا۔ میں تو وہاں ایک اجنبی کی حیثیت سے جاؤں گا اور انجلا سے دلچسپی لیکر ایک عاشق کا رول ادا کروں گا۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ میں خود انہیں موقع دے رہا ہوں کہ وہ مجھے شکار کریں۔ میں ایک ایسے چور اور لاک بریکر کے روپ میں جاؤں گا جو بڑی بڑی آہنی تجوریوں کے ناقابل فہم تالے کھول دیتا ہے اور باہر سوسائٹی میں ایک رئیس اعظم بن کر رہتا ہے۔ اسٹوفر جیسے مجرم کو مجھ جیسے شخص کی یقیناً ضرورت ہوگی۔ وہ ہپناٹزم یا ٹیلی پیتھی کے ذریعہ مجھے ضرور قابو میں کرنے اور آلۂ کار بنانے کی کوشش کرے گا۔ آپ نے صحیح فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو وہاں نہیں جانا چاہیے۔ آپ یہاں آرام کریں۔ میں تنہا ان سے نمٹ لوں گا۔ دوسری بات یہ کہ شکیل کی موجودگی یہاں غیر ضروری ہے۔ اگر کبھی اتفاق سے اسٹوفر اور اس کا سامنا ہو گیا تو وہ شکیل کے ذریعہ بھی ہماری اصلیت تک پہنچ جائے گا"۔

سعید احمد نے سر ہلا کر کہا۔

"ٹھیک ہے میں آج رات کی فلائٹ سے شکیل کو واپس بھیج دوں گا"۔

"میں چاہتا تھا کہ شکیل لاہور جاکر میرے یہاں قیام کرے۔ اس لئے میں نے پھوپھی جان کو ایک خط لکھا کہ شکیل وہاں پہنچے تو وہ بیٹے کی طرح اسکا خیال رکھیں۔ دوسرا خط میں نے فرزانہ کو لکھا میں نے اسے بھی مجبور کیا تھا کہ وہ شکیل کو یہاں رکھے گی وہاں اس کے اوپر کے تمام اخراجات پورے ہوا کریں گے پھوپھی جان ہر ماہ اسے ایک ہزار روپے الگ سے دیا کریں گی اور میں نے فرزانہ کو لکھ دیا تھا کہ اگر اس نے کبھی فرزانہ سے ٹیڑھے منہ بات کی یا اس سے ناراضگی کا اظہار کیا تو میں اسے کوٹھی سے نکال دوں گا۔ فرزانہ کو میں نے بہترین پیار بھرا خط لکھا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ ساری عمر میرے انتظار میں نہ بیٹھی رہے ہو سکے تو کسی اچھے شخص سے شادی کر کے ازدواجی زندگی گذارے۔ میں اس کی شادی کے بعد اس کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے بڑی سے بڑی رقم خرچ کرنے کے لئے تیار ہوں۔

جب شکیل وہاں سے روانہ ہوا تو میں نے دونوں خط اسے دیدیئے۔ وہ ہوٹل چھوڑنے کے لئے ایئرپورٹ چلے گئے اور میں ٹھیک ساڑھے نو بجے کار میں بیٹھ کر ہوٹل سویٹ ڈریم کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہوٹل سویٹ ڈریم کے بڑے ہال میں دور تک میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ نوجوان لڑکیاں ویٹرس کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ وہاں نوجوانوں سے زیادہ بڈھے دولتمند نظر آ رہے تھے۔ وہ بوڑھے بڑی بے چینی سے بار بار اسٹیج کی جانب دیکھ رہے تھے جہاں ایک مصری رقاصہ رقص کرنے والی تھی اور رقص کے دوران آہستہ آہستہ اپنا لباس للچانے کے انداز میں اتارنے والی تھی۔ وہاں بوڑھوں کی تعداد اس لئے زیادہ تھی کہ ان کی جوانی رخصت ہو چکی تھی صرف ہوس باقی رہ گئی تھی ایسے وقت جبکہ بوڑھے جسم ہوس کی تکمیل کے قابل نہیں رہتے تو وہ صرف نگاہوں سے اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کرتے ہیں اسی لئے وہ بار بار للچائی ہوئی نظروں سے اسٹیج کی جانب دیکھ رہے تھے۔

ٹھیک دس بجے ایک نہایت ہی حسین عورت اس ہال میں داخل ہوئی اس کا حسن اور اس کا لباس ایسا تھا کہ تمام لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف اٹھی رہ گئیں۔ اس ماڈرن سوسائٹی میں جہاں عورتیں کم سے کم لباس پہن کر اپنے جسم کی نمائش کرتی ہیں وہاں وہ حسینہ چوڑی دار پائجامہ اور گھیر دار پشواز پہن کر آئی تھی کلائیوں میں چوڑیاں کھنک رہی تھیں اور بدن پر چاندی کے زیورات چمک رہے تھے۔ اس کا حسن اور چہرے کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ ایک انگریز عورت ہے اس مغربی تن پر مشرقی لباس ایسا سج رہا تھا کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں اس کے سر سے پاؤں تک بھٹک رہی تھیں۔ میں بھی اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ انجلا ہے کیونکہ اس کے ساتھ جو دیسی آدمی تھا وہ اپنے حلیے سے ہی ہیڈ کلرک نظر آتا تھا۔ لنڈے بازار کا سوٹ پہن کر اس حسینہ کے ساتھ فخریہ انداز میں چلنے کی کوشش کر رہا تھا اس کے متعلق میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ صمد بخاری ہے پھر اچانک ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا مجھے اپنی سوچ کی دنیا میں بھی انجلا اور صمد بخاری کو نہیں پہچاننا چاہیے تھا کیونکہ میں وہاں اجنبی بن کر گیا تھا، اس وقت نہ جانے اسٹوفر کہاں بیٹھا ہوا تھا وہ جہاں کہیں بھی ہو وہ انجلا کے ذہن سے جھانک کر اس ہوٹل کے تمام لوگوں کو دیکھ سکتا تھا اگر مجھ پر شبہ ہوتا تو وہ انجلا کے ذریعہ میری سوچ کو پڑھ سکتا تھا۔ انجلا کی نظر ابھی مجھ پر نہیں پڑی تھی براہ راست ہمارا سامنا ہوتا تب ہی اسٹوفر میرے ذہن تک پہنچ سکتا تھا۔ اس سے پہلے ہی میں محتاط ہو گیا اب انجلا اور صمد بخاری کو ان کے ناموں سے نہیں پہچانوں گا، میں ان کے لئے اجنبی ہوں میرا نام شہزاد انور ہے اور میں اسی حیثیت سے ہر حال میں سوچتا رہوں گا۔

تب میں نے عام نوجوانوں کی طرح اس حسینہ میں دلچسپی لی۔ اسے دیکھتے ہوئے اپنی سوچ میں اس کی تمنا کرنے لگا۔ وہ مغرور حسینہ کسی پر ایک نظر ڈالے بغیر اپنے ساتھی مرد کے ساتھ مسکراتی ہوئی اور باتیں کرتی ہوئی بالکونی کی ایک میز پر آکر بیٹھ گئی۔ میں سوچ رہا کہ اس سے کیسے لفٹ حاصل کرنی چاہیے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہال کی تیز روشنیاں بجھنے لگیں۔ صرف مدھم مدھم سی خوابناک روشنی رہ گئی۔ اناؤنسر نے اعلان کیا تھا کہ مصری رقاصہ اسٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے آ رہی ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی آرکسٹرا کی آواز گونجنے لگی بوڑھوں کے دل دھڑکنے لگے۔ نوجوان ویٹرس آس پاس گھوم رہی تھیں

اس کے باوجود سب کی نگاہیں مصری رقاصہ کو دیکھنے کے لئے اسٹیج پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک ہی پورے ہال میں تاریکی چھا گئی۔ پھر آرکسٹرا کی ایک بینگ کے ساتھ اسٹیج کی ایک اسپاٹ لائٹ میں وہ مصری رقاصہ نظر آئی۔ میری نظریں اس حسینہ پر جمی ہوئی تھیں جو مغربی اور مشرقی تہذیب کا کاک ٹیل نظر آ رہی تھی یعنی وہ انجلا تھی لیکن اسے میں انجلا کے نام سے نہیں سوچ رہا تھا اسے ایک اجنبی دوشیزہ سمجھ کر اس سے لطف حاصل کرنے کا کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا۔ وہ میز پر جھکی ہوئی اپنے ساتھی صمد بخاری کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ بہت سے لوگ جو دور کی نشستوں پر تھے وہ گردن اٹھائے اسٹیج کی جانب دیکھ رہے تھے انہیں مصری رقاصہ پوری طرح نظر نہیں آ رہی تھی۔ کچھ لوگ موزوں جگہ کی تلاش میں اپنی جگہ چھوڑ کر ادھر ادھر بھٹک رہے تھے۔ میں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور اس حسینہ کی میز کے آس پاس بھٹکنے لگا۔ دوسرے بھٹکنے والے تو قریب سے گزر جاتے تھے لیکن میں ایک پروانے کی طرح اس کا طواف کر رہا تھا۔ بار بار اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے پہلی ہونے کے بعد پہلی بار کسی حسین عورت کو دیکھ رہا ہوں اس کے ساتھی مرد نے ایک بار میری جانب ناگواری سے دیکھا اس کے ساتھ اس حسینہ کی نگاہیں میری جانب اٹھ گئیں نگاہیں ٹکراتے ہی میں نے سوچا۔

ہائے کیسی قاتل نگاہیں ہیں۔ آج پتہ چلا کہ ایسی نگاہوں کو قاتل کیوں کہتے ہیں۔ اف یہ نگاہیں تو مجھے مارے ڈالتی ہیں کاش کہ میں کسی طرح اس کی قربت حاصل کر سکتا۔

میں جان بوجھ کر عاشقانہ انداز میں ایسی باتیں سوچ رہا تھا مجھے یقین تھا کہ اس وقت اسٹوفر اپنی بیٹی کی سوچ کو پڑھ رہا ہے اور وہ باتیں سن رہا ہے جو صمد بخاری اس سے کر رہا تھا۔ اب چونکہ انجلا کی نگاہیں مجھ سے ٹکرا رہی تھیں اور وہ یک ٹک میری آنکھوں میں دیکھے جا رہی تھی تو میں یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اب اسٹوفر میری سوچ کو پڑھ رہا ہے میں ٹیلی پیتھی جانتا ہوں اگر میں اسٹوفر کی جگہ ہوتا تو میں بھی یہی کرتا اسی لئے اسٹوفر کی چال کو سمجھنا میرے لئے بہت آسان ہو گیا تھا اور میں اسی کے مطابق عمل کر رہا تھا۔

میرا خیال غلط نہیں تھا کیونکہ انجلا کی نگاہوں سے نگاہیں ملاتے ہی میں بھی اس کی سوچ کو پڑھنے لگا تھا اور مجھے اس کی سوچ میں اسٹوفر کا سوال سنائی دے رہا تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔

"یہ کون ہے انجلا؟ تم نے جیسے ہی اس کی جانب دیکھا میں اس کی سوچ کو پڑھنے لگا تھا۔ اس کی سوچ بتا رہی تھی کہ وہ تمہارے حسن سے متاثر ہو کر تمہاری قربت حاصل کرنے کی تمنا کر رہا ہے . . . ."

اتنے میں صمد بخاری نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"مسٹر آپ یہاں آ کر کیوں کھڑے ہو گئے ہیں کہیں بیٹھ جائیے۔"

میں بڑی بے شرمی سے شکریہ ادا کرتے ہوئے انجلا کے قریب ہی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ صمد بخاری نے جھلا کر کہا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

میں نے کہا۔ "اس میں بدتمیزی کی کیا بات ہے۔ آپ نے ہی تو فرمایا تھا کہ کہیں بیٹھ جائیے۔ لہٰذا یہاں جگہ خالی دیکھ کر بیٹھ گیا ہوں۔"

"میں کہتا ہوں آپ یہاں سے چلے جائیں ورنہ بہت برا ہوگا۔"

یہ کہہ کر اس نے انجلا کی جانب دیکھا تاکہ وہ بھی میرے مخالف ہو۔ اسے انجلا نے میری ڈھٹائی پر مسکراتے ہوئے کہا۔

"مسٹر کسی سے لطف لینے کا یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرا نام مسٹر نہیں ہے شہزاد انور ہے۔ میں بہت ... سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ میری عادت ہے کہ جو چیز مجھے پسند آ جاتی ہے میں اس کی قربت ضرور حاصل کرتا ہوں پہلے تو اسے محبت سے اپنانے کی کوشش کرتا ہوں، محبت سے نہ ملے تو خریدنا چاہتا ہوں اگر خریدنے میں بھی ناکام رہا تو جبراً چھین لیتا ہوں میں تم سے صرف یہی کہنے آیا تھا۔ یاد رکھنا جلد ہی ہماری ملاقات ہوگی۔ اچھا بائے . . ."

میں وہاں سے اٹھ کر پھر اپنی میز کی طرف جانے لگا۔ اپنی جگہ بیٹھتے وقت میں سوچ رہا تھا۔

"وہ حسینہ بھی کیا یاد کرے گی۔ میں نے اچھی دھونس جمائی ہے میرا نام بھی شہزاد انور ہے۔ میں تو بڑی بڑی تجوریوں کے آہنی تالے کھول کر ان میں چھپائی ہوئی دولت حاصل کر لیتا ہوں اور یہ دوشیزہ تو ایک کھلی ہوئی تجوری کی طرح میرے سامنے رکھی ہے۔ میں چپ چاپ اسے حاصل کر سکتا ہوں لیکن ابھی یہی کوشش کرنی چاہئے کہ یہ محبت سے حاصل ہو جائے۔ عورت رومینٹک موڈ میں اپنے آپ کو ہمارے حوالے کرے تو اس کا لطف اور اس کی لذت ہی کچھ اور ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ وہ بیوقوف سا آدمی کون ہے نہ صورت شکل ہے نہ کوئی پرسنلٹی ہے پھر بھی یہ دوشیزہ اس سے ... باتیں کئے جا رہی ہے مجھے تو کچھ دال میں کالا نظر آ رہا ہے۔ میں خود ہیرا پھیری کی زندگی گزارتا ہوں اس لئے ہیرا پھیری کرنے والوں کو اچھی طرح پہچانتا ہوں شاید وہ بیوقوف سا آدمی کسی خاص اہمیت کا حامل ہے یا تو وہ بہت زیادہ دولت مند ہے یا پھر کسی دوسرے لحاظ سے اہم ہے اور یہ دوشیزہ ... مجرمانہ زندگی گزار رہی ہوگی۔ اور اس اہم شخص سے کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتی ہوگی۔ اگر واقعی ایسی بات ہے تو یہ خوامخواہ ایسا ڈرامہ کھیل رہی ہے ایک بار میری آغوش میں آ کر یہ اپنی آرزو بیان کرے تو میں اس شخص کو اس کی ساری اہمیتوں کے ساتھ اٹھا کر اس کے گھر پہنچا دوں گا۔"

میں اس وقت ایک چور اور ایک لاک بریکر شہزاد انور بن کر سوچ رہا تھا اور فرہاد علی تیمور کی شخصیت کو بالکل ہی بھلا دیا تھا۔ ایسے وقت جبکہ شہزاد انور بنا سوچ رہا تھا تو اچانک ہی میں نے اپنے دماغ میں ایک کھٹکا محسوس کیا میرے اندر ایک سوچ مجھ سے پوچھ رہی تھی

"اگر اس دوشیزہ کی کوئی خطرناک آرزو ہو تو کیا ... کر سکتا ہوں؟"

میں سمجھ گیا کہ اسٹوفر میری سوچ میں مجھ سے پوچھ رہا ہے اور میرے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے کہ واقعی میں اس کا آلۂ کار بن سکتا ہوں یا نہیں؟

میں آلۂ کار بننے کے لئے ہوٹل سویٹ ڈریم کے سویٹ ماحول میں آیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ٹیلی پیتھی جاننے والا مجھے پھانسنے کے لئے وہی حربے استعمال کرے گا جو میں دوسروں پر آزماتا رہا ہوں اور اب میرے خیال کے مطابق وہ میری ہی سوچ میں پوچھ رہا تھا کہ اس دوشیزہ کی کوئی خطرناک آرزو ہو تو کیا میں اسے پورا کر سکتا ہوں؟

میں نے اپنی دوسری سوچ میں جواب دینے سے پہلے حسین انجلا کی جانب دیکھا۔ میں اس کے نام سے واقف ہوتے ہوئے بھی اس کے لئے انجان بنا ہوا تھا۔ کیونکہ میں نے ٹیلی پیتھی جاننے والے فرہاد علی کی شخصیت کو جان بوجھ کر فراموش کر دیا تھا اور شہزاد انور کے روپ میں انجلا کو ایک اجنبی دوشیزہ کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے جواب دیا۔ "میں اپنے سے زیادہ خطرناک کسی کو نہیں سمجھتا۔ پھر ایک حسینہ کی آرزو کیا خطرناک ہوگی؟"

میرے اس جواب پر خاموشی چھا گئی۔ میں بڑی خاموشی سے اس کی سوچ کو پڑھ رہا تھا۔ میری داستانِ حیات پڑھنے والوں کو یہ سمجھنا چاہئے کہ ٹیلی پیتھی کی دنیا میں کسی کی سوچ کو پڑھنے میں اور کسی کی سوچ میں مداخلت کرنے میں بڑا فرق ہے۔ اس کے لئے یوں مثال دی جا سکتی ہے کہ ایک شخص کمرے میں بیٹھا بلند آواز سے باتیں کر رہا ہے کمرے میں اتنی گہری تاریکی ہے کہ اسے دوسرا شخص نظر نہیں آتا۔ دوسرا شخص بھی اندھیرے میں باتوں کرنے والے کو اندھیرے کے باعث چہرے سے نہیں پہچانتا ہے لیکن اس کی باتوں کے ذریعے اسے سمجھ رہا ہے اور خود کو اس پر ظاہر نہیں کر رہا ہے۔

ٹھیک اسی طرح میں دماغ کے اندھیرے میں اسٹوفر کی سوچ پڑھ رہا تھا اور خود کو اس پر ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ اسٹوفر چونکہ میری سوچ کے ذریعے مجھے احمق بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لئے میں نے اس کی چال کو سمجھ لیا اور وہ نہ سمجھ سکا کہ بہروپیا فرہاد، شہزاد انور بنا خاموشی سے اس کی سوچ کو پڑھ رہا ہے۔

اس وقت اسٹوفر کی سوچ کے ذریعے مجھے معلوم ہوا کہ وہ کوٹھی کے بیڈ روم میں بیٹھا ہوا ہے اور وہاں سے بیٹھے ہی بیٹھے میری سوچ کو پڑھ رہا تھا اور کبھی اپنی بیٹی انجلا کو سوچ کے ذریعے ... دے رہا تھا۔ اور اس فکر میں تھا کہ کسی طرح میری صلاحیتوں کو ... جب تک میں اس کے لئے کام کا آدمی ثابت نہ ہوتا اس ... وہ مجھے اپنی بیٹی کے قریب جانے کا موقع نہ دیتا۔

ویسے میں اپنے طور پر بڑی بڑی ڈینگیں مار چکا تھا اور شہزاد انور کے روپ میں خود کو ایک تجربے کار لاک بریکر ظاہر کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی حسین بیٹی سے کہہ چکا تھا کہ جو چیز مجھے پسند آ جاتی ہے میں اس کی قربت ضرور حاصل کرتا ہوں۔ انجلا کو بھی اگر میں محبت یا دولت سے حاصل نہ کر سکا تو اسے جبراً اپنے قریب لے آؤں گا۔

میں نے ایک ایسی لڑکی کے لئے چیلنج کیا تھا جو آگ کے شعلوں میں غسل کرتی ہے۔ میں جان بوجھ کر اس حقیقت کو فراموش کر رہا تھا کہ انجلا چاہے تو کبھی نہ کبھی مجھے آگ کے شعلوں میں گھیر سکتی ہے۔ میرا یہ چیلنج اسٹوفر کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اس بات کی اہمیت تھی کہ میں بڑے سے بڑے ناقابلِ فہم تالے کھول لیتا ہوں۔

اسٹوفر میری اسی صلاحیت کو آزمانا چاہتا تھا لیکن آزمانے کے لئے ضروری تھا کہ وہ مجھ سے ملاقات کرتا۔ ملاقات کرنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ میرے سامنے اپنی بیٹی کی جوانی کا چارہ ڈالتا۔ کیونکہ میں خود کو انجلا کا عاشق ظاہر کر رہا تھا اور اسے حاصل کرنے کی تدبیر سوچ رہا تھا۔

یہ ظاہر تھا کہ وہ میری سوچ کو پڑھ رہا ہوگا۔ لہٰذا میں پلاننگ کر رہا تھا۔ "پہلے تو مجھے اس حسینہ کی رہائش گاہ کا پتہ معلوم کرنا ہوگا لیکن وہ دولتمند ہے یہاں سے اپنی کار میں واپس جائے گی اور میرے پاس اپنی کار نہیں ہے ... اس شہر میں آیا ہوں۔ کل تک کسی کی تجوری کھولوں گا تو اپنے لئے ایک گاڑی خرید لوں گا۔ گاڑی ہو تو لڑکیاں آسانی سے پھنس جاتی ہیں۔ مگر یہ تو آئندہ کی باتیں ہیں، ابھی تو مجھے اس کا پیچھا کرنے کے لئے فوراً ہی کوئی ٹیکسی انگیج کرنی چاہئے۔ ہاں، یہی مناسب ہے، اب مجھے یہاں سے اٹھنا چاہئے اور باہر جا کر کسی ٹیکسی والے سے رات بھر کے لئے معاملہ طے کرنا چاہئے۔"

یہ سوچتے ہی میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اسٹیج پر مصری رقاصہ اپنے عروجِ فن کے انتہائی کلائمکس تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن میرے لئے اس میں کوئی کشش نہیں تھی۔ میں انجلا پر ایک نظر ڈالتے ہوئے باہر آ گیا۔

باہر آنے کے دوران میں پھر چپکے سے اسٹوفر کے خیالات کو پڑھنے لگا تھا۔ وہ شاید اس بات سے مطمئن ہو گیا تھا کہ میں اس کی بیٹی کے حسن و شباب سے اتنا متاثر ہو گیا ہوں کہ اب اس کا پیچھا کرنے کے لئے ایک ٹیکسی انگیج کرنے جا رہا ہوں۔ اس لئے اب وہ میری سوچ میں مداخلت نہیں کر رہا تھا اور اپنی بیٹی سے سوچ کا رابطہ قائم کر چکا تھا اور اس سے کہہ رہا تھا۔

"جب تم پروگرام کے اختتام پر یہاں سے اٹھ کر جاؤ گی تو شہزاد تمہارا پیچھا کرے گا۔ اس مقصد کے لئے وہ باہر ٹیکسی انگیج کرنے گیا ہے۔ تم صمد بخاری کو اس کے مکان کے پاس ڈراپ کر کے آگے بڑھ جانا۔ کچھ دور جانے کے بعد اپنی کار روک کر کھڑکا ... بونٹ

اُٹھا کر اس طرح معائنہ کرنا جیسے کوئی خرابی ہوگئی ہو۔ شہزاد ٹیکسی سے اُتر کر یقیناً تمہاری مدد کے لئے آئے گا۔ اس کے بعد اسے پھانسنے کا کام تمہارا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے کوٹھی میں لے آؤ۔ تمہارے لئے یہ کام مشکل نہیں ہوگا۔"

"یس ڈیڈی! ایسے نوجوانوں کو بیوقوف بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ وہ مجھے دیکھتے ہی حماقت میں یعنی محبت میں مبتلا ہوگئے ہوں۔"

اسٹوفر نے پوچھا۔ "اب یہ بتاؤ صمد بخاری کیا کہتا ہے؟"

"صمد بخاری مایوس کررہا ہے۔ یہ کہہ رہا ہے کہ جس فائل کی میں نقل چاہتی ہوں، وہ یہاں سے اسلام آباد جاچکی ہے۔"

"نانسینس، اگر فائل اسلام آباد جاچکی ہے تو یہ صمد بخاری اب راستے کا پتھر ہے۔ اسے ٹھوکر مار دو۔ اب اس کے ساتھ اپنا وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو اب اس کے ساتھ اُٹھ جاؤ اور اسے گھر تک پہنچا کر اسے بھول جاؤ۔ تمہارا دوسرا عاشق تمہارے پیچھے آرہا ہے۔"

میں ہوٹل کے باہر برآمدے میں کھڑا ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ ٹیکسی کو رات بھر کے لئے انگیج کروں گا لیکن مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ مجھے راستے ہی میں انجلا سے لفٹ مل جائے گی۔ لہٰذا ایک ٹیکسی ڈرائیور کے پاس آکر میں نے پوچھا۔

"ٹیکسی خالی ہے؟"

"جی ہاں صاحب! کہاں جانا ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "یہ تو میں بھی نہیں جانتا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ تمہاری ٹیکسی میں ایسے لوگ بھی بیٹھتے ہوں گے جو کسی حسین لڑکی کا پیچھا کرتے ہوں گے اور انہیں اپنی منزل کا پتہ نہیں ہوتا ہوگا۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے مسکرا کر کہا۔ "اچھا صاحب! سمجھ گیا۔ آپ بھی سمجھتے ہوں گے کہ ایسے سفر کا کرایہ دوگنا ہوتا ہے۔"

"منظور ہے۔" یہ کہہ کر میں ٹیکسی میں اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور نے پوچھا۔ "چھوکری کہاں ہے؟"

"بس اب باہر آتی ہی ہوگی۔"

ڈرائیور نے ایک آنکھ دبا کر پوچھا۔ "پٹ گئی ہے یا پٹنے والی ہے؟"

"اگر پٹنے والی نہ ہوتی تو میں پٹنے والا نہیں ہوں کہ خواہ مخواہ اس کا پیچھا کرتا۔"

"او جیو بادشاہو! پرانے کھلاڑی معلوم ہوتے ہو۔"

میں نے مسکرا کر برآمدے کی طرف دیکھا۔ انجلا صمد بخاری کے ساتھ پارکنگ ایریا کی طرف جارہی تھی۔ میں نے ڈرائیور کو اشارے سے بتایا۔ "وہ جو انگریز لڑکی مشرقی لباس میں ہے اور ایک چغد کے ساتھ جارہی ہے۔ اسے دیکھو، وہ کس کار میں بیٹھے گی۔ بس اسی کار کا پیچھا کرنا۔"

ڈرائیور نے اس پر نظریں جمادیں۔ جب انجلا اپنی کار [illegible] پارکنگ ایریا سے نکلی تو ہماری ٹیکسی اس کا پیچھا کرنے لگی۔ [illegible] گزرچکی تھی۔ ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے [illegible] ڈرائیور نے کہا۔

"یہ انگریز عورتیں بڑی چالاک ہوتی ہیں۔ وہ سمجھ رہی [illegible] ٹیکسی اس کا پیچھا کررہی ہے۔"

"پروا نہ کرو، وہ مجھے جانتی ہے، اپنے ساتھی کی وجہ سے [illegible] بنی ہوئی ہے۔ جب اس ساتھی سے پیچھا چھوٹ جائے گا تو [illegible] طرف پھسل جائے گی۔"

"یہ عورتیں ایک رات میں کتنے مردوں کی طرف پھسلتی ہیں [illegible]"

"جتنے مرد ان کی طرف پھسلتے ہیں۔ یہ لین دین کا سودا [illegible] ہوتا ہے۔"

پندرہ منٹ بعد انجلا نے صمد بخاری کو ایک مکان کے [illegible] اتار دیا اور اسے گڈ بائی کہہ کر گاڑی آگے بڑھائے گئی۔ وہ [illegible] کے مطابق عمل کررہی تھی۔ کچھ دُور جاکر اس نے گاڑی روک دی [illegible] پروگرام کے مطابق اس کی گاڑی میں خرابی پیدا ہوگئی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور [illegible] گاڑی کو روکتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ دونوں نے اسی طرح ملنے کا پروگرام بنایا تھا۔"

"نہیں، یہ محض اتفاق ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی گاڑی میں خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ وہ کار کا بونٹ اُٹھا رہی ہے۔ تم گاڑی [illegible] قریب لے جاکر روک دو۔"

ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی۔ اس کی کار سے ذرا فاصلے پر [illegible] روک دی۔ میں ٹیکسی سے اُتر کر اس کے قریب آیا۔

"کیا میں آپ کی کچھ مدد کرسکتا ہوں؟"

اُس نے کار کا بونٹ گراتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "نہیں۔ [illegible] تمہاری مدد کرنے کے لئے رُک گئی ہوں۔ تم نے سوئٹ ڈریم [illegible] کیا تھا کہ اگر میں محبت سے یا دولت سے حاصل نہ ہوئی تو تم [illegible] حاصل کرو گے۔ تمہاری اس دلیری نے مجھے بہت متاثر کیا [illegible] ملک کے لوگ بڑے بزدل ہوتے ہیں۔ عورتوں سے باتیں کر[illegible] یا تو شرماتے ہیں یا پھر دنیا والوں سے ڈرتے ہیں۔ دراصل تمہاری [illegible] تہذیب عورتوں کے معاملے میں تم لوگوں کو بزدل بنادیتی ہے۔ [illegible] میں دولت کی بھوکی نہیں ہوں، محبت کی جستجو میں ہوں اور یہ محبت تم [illegible] ملے گی۔ میری گاڑی میں آجاؤ۔"

"خدا کا شکر ہے کہ مغربی تہذیب نے تمہاری جیسی [illegible] بنادیا ہے ورنہ میں مشرقی شرافت کو گلے لگائے [illegible]

[illegible] تک تمہارا پیچھا کرتا رہتا۔ تم لوگ منٹوں میں چاند تک ہی نہیں، مرد [کی] آغوش تک بھی پہنچ جاتی ہو۔ میں ابھی ٹیکسی والے کو رخصت کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں ٹیکسی کے پاس آیا اور جیب سے دس دس کے تین [illegible] نکال کر ڈرائیور کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ دوگنے سے بھی دگنا [illegible]یہ ہے، اب جاؤ یہاں سے۔"

میں ڈرائیور کا جواب سُنے بغیر انجلا کی طرف آیا اور اس کے ساتھ [illegible] کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ انجلا کار اسٹارٹ کرکے سوسائٹی کی طرف [illegible]نے لگی۔

میں نے اس سے کہا۔ "میں تمہیں بھگا کر لے جانا چاہتا تھا مگر [illegible] قسمت ہے تم مجھے بھگا کر لے جارہی ہو۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم [مج]ھے کہاں لے جارہی ہو؟"

"جہاں میں رہتی ہوں۔ تم فکر نہ کرو میرے ڈیڈی دقیانوسی خیال کے آدمی نہیں ہیں۔ تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر بُرا نہیں مانیں گے۔"

"اللہ ہر نوجوان لڑکی کو تمہارے جیسا ڈیڈی عطا کرے۔"

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "تم بہت زندہ دل ہو۔ ڈیڈی تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"یہ ڈیڈی کب تک ہمارے درمیان رہیں گے؟"

"جب تک کہ وہ تم سے مطمئن نہ ہوجائیں۔"

"کیا مطلب؟ کیا وہ میرا طبی معائنہ کریں گے؟"

"شریر کہیں کے۔" وہ جھینپ کر بولی۔ "یہ بات نہیں ہے میرے ڈیڈی بہت بڑے عالم ہیں۔ وہ انسان کا چہرہ دیکھ کر اس کے دل کا حال معلوم کرلیتے ہیں۔ اگر انہیں اطمینان ہوگیا کہ تم سچے دل سے مجھے چاہتے ہو تو پھر ہماری دوستی پکی ہوجائے گی۔"

"پھر تو مجھے ابھی سے اپنے چہرے پر شرافت طاری کرلینی چاہیئے اور دل ہی دل میں دُعا مانگتے رہنا چاہیئے کہ بیٹی سے پہلے بیٹی کا باپ مجھے پسند کرلے۔"

میری اس بات پر وہ دل کھول کر قہقہے لگانے لگی۔ اس دوران مجھے اس بات کا علم تھا کہ اس کا عالم باپ اپنے بیڈروم میں بیٹھا ہماری گفتگو پڑھ رہا ہوگا اور میں گفتگو کے دوران انجلا کی سوچ کو پڑھ رہا تھا۔ وہ میری باتوں کی وجہ سے واقعی مجھ میں گہری دلچسپی لے رہی تھی۔

پھر میں انجلا کے ساتھ اسی کوٹھی میں پہنچ گیا جو میری شکارگاہ تھی۔ یہ اور بات تھی کہ میں خود شکار ہوکر آیا تھا۔ بعض اوقات اپنا داؤ آزمانے کے لئے دوسروں کے داؤ میں آنا پڑتا ہے۔ اور میں کوٹھی کے اندر آگیا۔ اس کوٹھی کے ریسپشن روم وغیرہ کو میں واجد کی سوچ کے ذریعے دیکھ چکا تھا۔ وہ ماحول میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ جب ہم ایک کوریڈور سے گزرنے لگے تو بیڈروم سے اسٹوفر کی آواز آئی۔

"انجلا! تم نے واپسی میں بڑی دیر کردی۔"

انجلا نے کہا۔ "جی ہاں ڈیڈی! سوئٹ ڈریم کا پروگرام بہت دلچسپ تھا اور اس سے زیادہ دلچسپ مسٹر شہزاد ہیں۔ یہ میرے ساتھ آئے ہیں۔ کیا آپ ان سے ملنا پسند کریں گے؟"

"تمہاری پسند میری پسند ہے۔ میں ضرور ملوں گا۔"

ہم دونوں کوریڈور میں ایک دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ انجلا نے دروازہ کھولتے ہوئے مجھے اندر آنے کے لئے کہا جیسا کہ میں واجد کی سوچ کے ذریعے دیکھ چکا تھا، ٹھیک اسی طرح کمرے میں چاندنی بچھی ہوئی تھی اور اس پر گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان اسٹوفر ایک لمبا سا جُبّہ پہنے پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر ایک بڑی سی پگڑی تھی۔ اس نے اپنی مختصر سی داڑھی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"مسٹر شہزاد! مجھے آپ سے مل کر خوشی ہورہی ہے۔"

اس نے رسمی طور پر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا پھر اس کے سامنے دوزانو ہوکر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ کے حُلیے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ بہت بڑے عالم ہیں۔ اتنی بڑی پگڑی میں نے کبھی نہیں دیکھی، اسے پگڑ کہنے کو دل چاہتا ہے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم واقعی زندہ دل اور دلچسپ ہو۔ انجلا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ لیکن وہ دل کے بھید نہیں جانتی۔ میں تمہارا چہرہ دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ تم اوپر سے جتنے زندہ دل ہو، اندر سے اتنے ہی خطرناک ہو۔"

"جی ۔۔۔ یہ آپ ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں یوں گھبرانے کی ایکٹنگ کرنے لگا جیسے واقعی اس نے میری اصلیت کو جان لیا ہو۔

اسٹوفر نے میری گھبراہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ "تم کیا کرتے ہو؟"

میں نے جواب دینے سے پہلے سوچا کہ مجھے اپنی اصلیت نہیں بتانا چاہیئے کہ میں ایک بہت بڑا لاک بریکر ہوں۔ مجھے یہ کہنا چاہیئے کہ میں ایک خاندانی رئیس ہوں۔ یہ سب کچھ سوچتے وقت میں سمجھ رہا تھا کہ اسٹوفر میری سوچ کو پڑھ رہا ہے لہٰذا میں نے جو سوچا تھا وہی کہہ دیا۔

"میرا نام شہزاد ہے اور میں شہزادے کی طرح رہتا ہوں۔ کوئی کام کرنا اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ میں خاندانی رئیس ہوں۔"

میری بات سنتے ہی اسٹوفر نے ایک گہری سانس کھینچ کر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ مجھ پر ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ مراقبے میں ہے اور اپنے علم کے ذریعے کچھ معلومات حاصل کررہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ "مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔ کسی جھوٹے کو میں اپنی بیٹی کے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتا۔ تم خاندانی رئیس نہیں ہو۔ جھوٹ نہ بولو۔ جو تمہاری اصلیت ہے، وہ ظاہر کردو۔"

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں کھول دیں اور مجھے گھور کر دیکھنے لگا۔ میں نے فوراً ہی یوں نظریں جھکالیں جیسے اس کی سُرخ مقناطیسی آنکھیں مجھے

متاثر کر رہی ہوں۔ اُس نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔ "ایسے چور جو سوسائٹی میں شریفوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں، وہ کبھی دوسروں کے سامنے اعتراف نہیں کرتے کہ چوری ان کا پیشہ ہے۔ تم میں جو بُرائی ہے اگر اس بُرائی کو سچائی سے ظاہر کر دو گے تو میں تمہاری بُرائی سے نفرت نہیں کروں گا بلکہ تمہاری سچائی کی قدر کروں گا۔"

میں نے عقیدت سے سر جھکا کر کہا۔ "انجلا نے درست کہا تھا واقعی آپ بہت بڑے عالم ہیں۔ لیکن سچ کہنے سے پہلے میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں انجلا کو چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے میرے پیشے سے نفرت کی اور انجلا کو مجھ سے دُور کرنا چاہا تو میں بہت ضدی ہوں۔ اپنی ناکامی کبھی برداشت نہیں کرتا۔ اپنی پسند کی چیز چھین کر لے جاتا ہوں۔ آپ کا یہ علم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ بڑے بڑے خطرناک مجرم میرا نام سُن کر سہم جاتے ہیں۔"

اسٹوفر نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے رُکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم بہت زیادہ بولتے ہو۔ کچھ کرنے والے کرتے زیادہ ہیں، بولتے کم ہیں۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ تم صرف ڈینگیں مارنا جانتے ہو؟"

میں نے جوشیلے انداز میں اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔ میں جو کہتا ہوں، وہ کر دکھاتا ہوں۔ آپ نے مجھ سے میرا پیشہ پوچھا ہے تو سُنیے! میں ایک لاک بریکر ہوں۔ اس دنیا کا کوئی ناقابلِ فہم تالا ہو، میں اسے کھول کر دکھا دوں گا۔ اس دنیا کی ہر تجوری میری انگلی کے ایک اشارے سے کُھل جاتی ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو میں ابھی یہ تماشا دکھا سکتا ہوں۔ کیا آپ کے یہاں کوئی آئرن سیف ہے؟"

اسٹوفر نے سر ہلا کر کہا۔ "انجلا کی خواب گاہ میں ایک آئرن سیف ہے۔ وہ سیف خاص نمبروں کی ترتیب سے کُھلتا ہے۔ میں ابھی جا کر ان نمبروں کی ترتیب بدلتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ نمبر تمہیں کسی طرح معلوم ہو گئے ہوں۔ اس لئے میں نئی ترکیب سے اسے لاک کروں گا۔ تم یہاں بیٹھو میں وہاں جاتا ہوں۔ جب میں تمہیں بلاؤں تو وہاں آنا اور اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کرنا۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ گیا اور انجلا کو لے کر اس کی خوابگاہ میں چلا گیا۔ میں نے اسی وقت سے اُس کی سوچ کو پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ کمرے سے باہر جا کر انجلا کی خوابگاہ کی طرف بڑھتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔

"تالے توڑنا اور بات ہے لیکن نمبروں کے سسٹم کو سمجھنا محال ہے۔ جو نمبروں میں ترتیب دوں گا بھلا اسی ترکیب سے وہ کس طرح سیف کھولے گا؟ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا لیکن چور بدمعاش اپنے فن میں حیرت انگیز مہارت رکھتے ہیں اور جو مہارت وہ حاصل کرتے ہیں وہاں تک ہمارا دماغ نہیں پہنچتا۔ بہرحال ابھی پتہ چل جائے گا کہ یہ کہاں تک سچ بول رہا ہے۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا اپنی بیٹی کے ساتھ اس کی خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ بیٹی نے اپنے نمبروں کی ترتیب سے اس سیف کو کھولا، پھر ایک طرف ہٹ گئی۔ اس کے بعد اسٹوفر اسے بند کر کے نئے نمبروں کی ترتیب سے اسے لاک کرنے لگا۔ جو نمبر وہ ترتیب دے رہا تھا وہ دماغ سے سوچ کر ہی ترتیب دے رہا تھا اور میں اس کی سوچ کے ذریعے ان نمبروں کو پڑھ رہا تھا۔

"ٹو۔ ون۔ نائن۔ تھری۔ تھری۔" وہ سوچ سوچ کر نمبر ترتیب دے رہا تھا اور میں اس کی سوچ کے ساتھ ان نمبروں کو اپنی یادداشت میں محفوظ کر رہا تھا۔

ترتیب مکمل کرنے کے بعد اُس نے انجلا سے کہا۔ "یہ ناممکن ہے اس ترتیب کے بغیر وہ سیف نہیں کھول سکے گا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ وہ قوی ہیکل ہے، شاید اچھا فائٹر بھی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ناکام ہونے کے بعد وہ بدمعاشی پر اُتر آئے۔"

انجلا نے کہا۔ "ڈیڈی! آپ کے ٹیلی پیتھی کے علم کے سامنے کسی کی جسمانی طاقت کیا اہمیت رکھتی ہے۔ آپ تو پلک جھپکتے ہی اس کے دماغ میں ہلچل مچا دیں گے۔"

"ہاں۔ اگر میں سوچ کے ذریعے دماغی توازن کو ڈگمگا دوں گا تو وہ اپنی جسمانی طاقت استعمال نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ جسم دماغ کا تابع فرمان ہوتا ہے۔ جاؤ اُس کو بُلا لاؤ۔ اگر اُس نے بدمعاشی کی تو پھر میں اس کی کھوپڑی اُلٹا دوں گا۔"

انجلا میری طرف آنے لگی۔ اسٹوفر وہاں تنہا رہ گیا تھا اس لئے میں سمجھ رہا تھا کہ تنہائی کے بیکار لمحات میں وہ میری سوچ کو پڑھے گا لہٰذا میں خالص جذباتی انداز میں انجلا کی جوانی کے متعلق سوچنے لگا۔ انجلا مجھے بلانے کے لئے کمرے میں آئی تو اسے دیکھتے ہی میں نے کہا۔

"میں تمہارے ہی متعلق سوچ رہا تھا، تم اسی طرح اپنے ڈیڈی کے پیچھے جایا کرو گی تو اس دیوانے کا کیا ہو گا؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "میں ایک حسین انعام ہوں۔ ڈیڈی کی آزمائش میں کامیاب ہو جاؤ تو یہ انعام تمہیں مل جائے گا۔"

میں نے سرد آہ بھرتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کہا۔ "اس انعام کو تم نے اتنی گھیردار پشواز میں چھپا رکھا ہے کہ اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ایسا ہی پردہ کرنا تھا تو بُرقع اوڑھ لیتیں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "ہاں میں نے اس ملک کی بہت سی عورتوں کو دیکھا ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک اس طرح بُرقع میں چھپی ہوتی ہیں کہ انہیں ڈھونڈنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ پردہ اچھی چیز ہے، مرد کے دماغ میں تجسس پیدا کر دیتا ہے کہ کس معیار کا حُسن چھپا کر رکھا گیا ہے۔ مجھ لوگ میں نے اپنے حُسن کو معیاری بنانے کے لئے یہ پشواز پہن رکھی ہے۔ اب تم صبر کرو اور یہاں سے چلو، ڈیڈی تمہیں بلا رہے ہیں۔"

میں اس کے ساتھ اس کی خوابگاہ میں جانے لگا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بھی میں اس کے بدن کے نشیب و فراز کو کن انکھیوں سے دیکھتا جا رہا تھا تاکہ میرے دیکھنے اور سوچنے سے اسٹوفر کو یقین ہو جائے کہ میں عام نوجوانوں کی طرح ایک منچلا عاشق ہوں۔

ہم خوابگاہ میں پہنچے تو اسٹوفر نے سیف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آؤ اور اپنی حیرت انگیز صلاحیت کا مظاہرہ کرو۔"

میں آگے بڑھ کر ٹھیک سیف کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اسٹوفر سے کہا۔ "آپ ایک کاغذ اور پنسل لے کر کھڑے ہو جائیں اور جو کچھ میں کہوں اسے لکھتے جائیں۔"

انجلا نے اپنے باپ کے لئے کاغذ اور پنسل مہیا کر دی۔ میرے دائیں ہاتھ کی ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی۔ میں اس انگوٹھی پر نظریں جمائے اُلٹے سیدھے منتر پڑھنے لگا۔ دونوں باپ بیٹی گہری توجہ سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ انگوٹھی بھی ان کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ پھر میں نے ذرا اونچی آواز میں کہا۔

"اے بابا کمبل شاہ! تیری دی ہوئی اس طلسمی انگوٹھی سے میں نے کتنی ہی تجوریاں کھولی ہیں، اب تُو اپنی کرامات سے اس تجوری کے نمبر بھی بتا دے۔" یہ کہہ کر میں نے انگوٹھی کو سیف کے ہینڈل پر جما دیا پھر بظاہر خاموش ہو کر اپنی دماغی سماعت سے غیبی آوازوں کو سُننے لگا۔

بھلا غیبی آوازیں کہاں سے آتیں؟ چونکہ اسٹوفر میری سوچ کو پڑھ رہا تھا اس لئے میں طلسم کا ڈھونگ رچا رہا تھا اور اپنے دماغ میں اس طرح آوازیں پیدا کر رہا تھا۔

"غوں غوں غوں نمبر دو......"

میری سوچ میں نمبر ۲ آتے ہی میں نے اسٹوفر سے کہا آپ نمبر لکھیے۔ اس نے فوراً ہی کاغذ پر لکھا۔ میں اسی طرح باری باری غوں غوں کی آوازیں پیدا کرتا ہوا ایک ایک نمبر اپنی زبان کی گنتی میں بتا رہا تھا اور اسے انگریزی گنتی میں بتاتا تھا۔ ہر نمبر پر اسٹوفر کا مُنہ حیرت سے کُھل جاتا تھا۔ آخری نمبر تک میری انگوٹھی سیف کے ہینڈل سے چپکی رہی۔ جب ترتیب مکمل ہو گئی تو میں نے انگوٹھی والا ہاتھ ہٹا لیا پھر اسٹوفر کے ہاتھ سے کاغذ لے کر انجلا کو دیتے ہوئے کہا۔

"یہ لو نمبر کی اس ترتیب سے تمہارا سیف کُھل جائے گا۔"

انجلا نے سوالیہ نظروں سے باپ کی طرف دیکھا تو باپ نے پریشانی سے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں۔ میں نے نمبروں کی یہی ترتیب رکھی تھی۔ سیف کُھل جائے گا مگر یہ تو جادوئی چکر ہے۔ میں جادو پر اتنا یقین نہیں رکھتا تھا لیکن یہ مانتا ہوں کہ جادو بھی ایک کالا علم ہے۔ شہزاد! کیا تم اپنی انگوٹھی مجھے دکھا سکتے ہو؟"

میں نے بڑے مہذب انداز میں انکار کرتے ہوئے کہا۔ "دیری سوری! یہ انگوٹھی میرے مرنے کے بعد ہی میری انگلی سے اُترے گی۔ بابا کمبل شاہ نے تاکید کی ہے کہ اپنے سائے پر بھی بھروسہ نہ کرنا۔ اگر تمہارا سایہ بھی ہاتھ پھیلائے تو اس کے ہاتھ پر بھی یہ انگوٹھی اُتار کر نہ رکھنا۔ اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو اسی طرح چھو کر دیکھ لیجئے۔"

یہ کہہ کر میں نے اس کی طرف اپنا انگوٹھی والا ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ قریب ہو کر اپنی انگلیوں سے انگوٹھی کو چھو کر دیکھنے لگا۔ وہ دراصل دیکھ نہیں رہا تھا بلکہ میرے دماغ کو ٹٹول رہا تھا کہ میں نے کہاں تک سچ کہا ہے اور میں اس کی تسلی کے لئے سوچ رہا تھا۔

"طلسم کیا ہے، یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ جب تک یہ انگوٹھی نہیں ملی تھی اس وقت تک میں بھی جادو کو قصہ کہانیوں کی باتیں سمجھتا تھا لیکن اس انگوٹھی نے میرے نظریات بدل دیئے ہیں۔ اس نے میرے لئے اتنی تجوریوں کے مُنہ کھولے ہیں کہ میں ایک مفلس سے شہزادہ بن گیا ہوں۔ میں بابا کے اس احسان کو زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

میں سوچتا جا رہا تھا، وہ اپنی دماغی سماعت سے سُنتا جا رہا تھا۔ چونکہ میں بڑی معصومیت سے اس طلسمی انگوٹھی کے متعلق سوچ رہا تھا اس لئے اسے یقین ہو گیا کہ میں فراڈ نہیں ہوں اور نہ ہی اس سے فراڈ کر رہا ہوں۔ اس نے میرا انگوٹھی والا ہاتھ چھوڑ کر کہا۔

"میں نے بڑی دنیا دیکھی ہے لیکن جادوئی کرشمہ پہلی بار دیکھا ہے۔ سچ پوچھو تو آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا ہے۔ میں پھر ایک بار تمہیں آزمانا چاہتا ہوں۔ مگر یہ آزمائش ذرا لمبی ہو گی۔ آج رات تم ہمارے مہمان ہو۔ میں صبح تمہیں بتاؤں گا کہ تمہیں کون سا سیف کھولنا ہے۔ یہ ساتھ والا بیڈ روم تمہارے لئے ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

میں اس کے ساتھ انجلا کی خوابگاہ سے باہر آیا۔ اس کے ساتھ والے کمرے میں داخل ہو کر میں نے دیکھا کہ میرے اور انجلا کے کمرے کے درمیان جو دیوار تھی اس میں ایک بڑے اسکرین کی طرح کھڑکی بنی ہوئی تھی جس کے پٹ نہیں تھے۔ کھڑکی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک شیشہ لگا ہوا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیئے کہ وہ شیشے کی ایک چھوٹی سی دیوار تھی جس کے دوسری طرف انجلا کی خوابگاہ کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا۔ اسٹوفر نے مجھ سے کہا۔

"تم یہاں آرام کرو۔ صبح ہماری ملاقات ہو گی۔"

میں نے کہا۔ "جس سیف کو کھولنے کے لئے آپ مجھے دوبارہ آزمانا چاہتے ہیں، اس کے متعلق آپ مجھے ابھی کیوں نہیں بتا رہے ہیں؟ صبح کیوں بتانا چاہتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "صبح تک میں یہ فیصلہ کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے تم پر بھروسہ کرنا چاہیئے یا نہیں؟"

"بے یقینی کی وجہ کیا ہے؟"

"تمہاری اس طلسمی انگوٹھی نے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ تم سائنٹفک طریقوں سے تجوریاں کھولتے ہو لیکن تمہارا طریقہ تو ایسا ہے کہ آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آتا۔"

”آپ کو یقین کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آیئے! ہم آپس میں سودا کرلیں۔ آپ کی بتائی ہوئی جس تجوری کو میں کھولوں گا اس کا آدھا مال میرا ہوگا اور آدھا آپ کا ہوگا۔ آپ کو مال کھانے سے مطلب رہنا چاہیئے میں تجوریاں کیسے کھولتا ہوں' یہ سوچ کر آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں؟“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے صرف اپنے مقصد کو دیکھنا چاہیے یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ میرا وہ مقصد تم کس طرح پورا کرو گے۔ لیکن بات کچھ اور ہے جس تجوری تک میں تمہیں پہنچنے کے لئے کہوں گا اس میں سے تمہیں دولت نہیں ملے گی۔“

”پھر اس میں سے کیا ملے گا؟ تجوری کے اندر تو خزانہ ہی ہوا کرتا ہے۔“

”ہاں۔ اس میں بھی ایک ننھا سا خزانہ ہے۔ لیکن اس سے تمہیں نہیں' مجھے فائدہ پہنچے گا۔“

”میں ایسی تجوری نہیں کھولتا' جس سے مجھے فائدہ حاصل نہ ہو لیکن انجلا کی خاطر میں آپ کا یہ کام کردوں گا۔ مجھے بتایئے وہ سیف کہاں ہے؟“

”ابھی نہیں' میں نے کہا نا کہ صبح تک مجھے یہ فیصلہ کرنے دو۔ دراصل میں تمہیں اپنا رازدار بنانا چاہتا ہوں اس لئے مجھے سوچنے کا موقع دو۔ اچھا گڈ نائٹ!“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے جانے لگا۔ میں سمجھتا تھا کہ میری طرف سے پلٹتے ہی وہ میری سوچ کو پڑھنا شروع کردے گا کیونکہ یہی ہتھکنڈے میں دوسروں پر آزماتا رہا ہوں۔ اس لئے خیال پڑھنے والوں کی تکنیک سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ جو صبح تک فیصلہ کرنا چاہتا تھا وہ دراصل میری سوچ کو پڑھ پڑھ کر مطمئن ہونا چاہتا تھا۔ میں بھی اس کے اطمینان کے لئے صرف انجلا کے متعلق سوچ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میرے دماغ میں ایک منفی سوچ اُبھری۔ مجھے پتہ چل گیا کہ وہ مجھے کُرید رہا ہے۔ وہ میری ہی سوچ میں مجھ سے پوچھ رہا تھا "کیا مجھے بھی انجلا کے ڈیڈی پر بھروسہ کرنا چاہیئے؟ کہیں وہ مجھے کسی ایسے سیف کا پتہ تو نہیں بتائے گا جہاں میں پہنچتے ہی کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں؟"

میں نے مثبت سوچ میں کہا "نہیں' انجلا کا باپ ایسا تو نظر نہیں آتا۔ وہ جیسی پیاری پیاری سی ہے' اس کا باپ بھی کچھ کم پیارا نہیں ہے۔ میں نے اس کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا ہے کہ صحیح نمبر کی ترتیب بتانے کے بعد وہ مجھ سے بہت زیادہ متاثر ہوگیا ہے اور مجھ سے کوئی اہم کام لینا چاہتا ہے۔ کام کتنا اہم ہے مجھے اس کی پروا نہیں ہے بس یہ آرزو ہے کہ اس کام کے صلے میں انجلا مل جائے۔"

یہ سوچ کر میں خاموش ہوگیا۔ اس کے بعد میرے دماغ میں کوئی منفی سوچ نہیں اُبھری۔ میں نے سمجھ لیا کہ اب وہ خاموشی سے میرے متعلق سوچ رہا ہے۔ لہٰذا میں فوراً ہی اس کے خیالات کو پڑھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

”یہ کمبخت تو گھوم پھر کر انجلا پر آجاتا ہے۔ فی الحال یہ انجلا پر دنیا کی کسی دولت کو ترجیح نہیں دے رہا ہے۔ ایسے ہی مناسب ہے کہ انجلا اسے دور ہی دور سے تڑپاتی رہے اور اس کی طلب میں شدت پیدا کرتی رہے۔ اس پر جتنی دیوانگی طاری ہوگی وہ اتنی ہی توجہ سے جلد جلد میری دوسری آزمائش سے گزر جائے گا۔ اب مجھے اس سلسلے میں انجلا کو ضروری ہدایات دینی چاہئیں۔ وہ تمام رات اسے اپنی اداؤں سے دیوانہ بناتی رہے گی۔“

یہ سوچ کر اس نے انجلا کو آواز دی۔ جب انجلا اس کے پاس آئی تو اس نے کہا۔ ”یہاں میرے پاس آکر بیٹھو۔ وہ نوجوان ہمارے بہت کام کا آدمی ہے۔ میں نے اسی لئے اسے یہ کمرہ دیا ہے تاکہ شیشے کی دیوار کے دوسری طرف اپنی خوابگاہ میں رہ کر اسے پاگل بناتی رہو۔“

وہ مجھے پاگل بنانے کے طریقوں پر بحث کرتے رہے۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ اس بحث کے دوران اسٹوفر میرے خیالات نہیں پڑھے گا تو میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر ڈائرکٹر جنرل سعید احمد سے دماغی رابطہ قائم کیا۔ وہ ہانس بے کے ایک کاٹیج میں میرا انتظار کرتے کرتے بیزار ہوگئے تھے اور یہ سوچ کر کہ شاید میں آج رات واپس نہیں آسکوں گا وہ خود سونے کے لئے بستر پر لیٹ گئے تھے۔ میں نے اسی وقت ان کے ذہن پر دستک دی۔

وہ چونک کر بستر پر اُٹھ بیٹھے' پھر چاروں طرف حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”فرہاد؟ کیا یہ تم ہو؟ ابھی میرے دماغ میں ایک سوچ اُبھری ہے۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر ہماری ملاقات نہ ہوسکی تو تم دماغی رابطہ قائم کرو گے۔ کیا واقعی تم مجھ سے مخاطب ہو؟“

”جی ہاں۔ میں آپ سے مخاطب ہوں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اسٹوفر کسی وقت بھی میرے ذہن میں جھانک سکتا ہے لہٰذا مختصر طور پر سُن لیجئے کہ اسٹوفر اور اس کی بیٹی انجلا سے میری دوستی پکی ہوچکی ہے میں آج مہمان کے طور پر ان کے ساتھ رہوں گا کل صبح اسٹوفر مجھے کسی ایسے سیف کا پتہ بتائے گا جس میں کوئی اہم چیز رکھی ہوئی ہے۔ صبح وہ مجھے اپنا رازدار بنانے والا ہے۔ اب میں آپ سے رُوبرو ملاقات نہیں کرسکوں گا۔ جب بھی مجھے موقع ملے گا میں سوچ کے ذریعے آپ کو ساری باتیں بتا دیا کروں گا۔“

”فرہاد! نہ جانے کتنے دنوں میں تمہیں کامیابی حاصل ہو' میں کب تک اس کاٹیج میں تمہارا انتظار کرتا رہوں گا؟“

”آپ وہاں میرا انتظار نہ کریں۔ آپ اگر مناسب سمجھیں تو لاہور واپس چلے جائیں۔ بظاہر ہمارے درمیان سینکڑوں میل کا فاصلہ ہوگا لیکن میں خیال خوانی کے ذریعے ہزاروں میل کے فاصلوں کو سمیٹ کر آپ کے قریب لے آتا ہوں۔ آپ ہمیشہ مجھے اپنے دماغ کے اندر پائیں گے۔ اچھا خدا حافظ“

مجھے افسوس ہے کہ میں آپ سے زیادہ باتیں نہیں کرسکتا۔“

یہ کہہ کر میں نے سعید احمد سے دماغی رابطہ توڑ دیا اور فوراً ہی اسٹوفر کے ذہن میں جھانکنے لگا کہ کہیں اس نے میری چوری تو نہیں پکڑ لی۔ عین وقت پر میں نے اسٹوفر کی سوچ کو پڑھا تھا کیونکہ ٹھیک اسی وقت اس نے انجلا سے گفتگو ختم کی تھی۔ انجلا اس سے رخصت ہوکر اپنی خوابگاہ کی طرف آرہی تھی۔

میں نے اپنے کمرے کی تمام لائٹیں آف کردیں اور اپنے بستر پر آکر لیٹ گیا۔ انجلا نے اپنی خوابگاہ میں داخل ہوکر شیشے کی دیوار کی جانب دیکھا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ میں اپنے کمرے میں کیا کررہا ہوں۔ اس کی خوابگاہ کی روشنی شیشے کے آرپار میرے بستر تک پہنچ رہی تھی۔ میں سگریٹ کے کش لگاتا ہوا اسے نظر آیا۔ وہ مطمئن ہوکر سوئچ بورڈ کے پاس آئی۔ اس نے لائٹ آف کرکے ایک نیلا بلب روشن کیا۔ وہ زیرو پاور کا بلب نہیں تھا۔ تیز نیلی روشنی تھی۔ انجلا کے سُرخ چہرے پر نیلی روشنی کا امتزاج ایسا تھا جیسے زہر کی نیلاہٹ لئے کوئی ناگن کھڑی ہو۔ اس نے دوپٹے کو ایک طرف پھینک دیا اور پشواز کے بٹن کھولنے لگی۔

میں نے چند ساعت کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ میں اسٹوفر پر یہ ثابت کررہا تھا کہ وہ نظارہ مجھ پر جذباتی کیکپاہٹ پیدا کررہا ہے۔ حقیقتاً بھی ایسا ہی تھا لیکن آنکھیں بند کرکے میں یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔

جب میں نے آنکھیں کھولیں تو پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا کیونکہ اس نے یوگا کی مشق شروع کردی تھی۔

یوگا جاننے والے سمجھتے ہیں کہ ان مشقوں سے گزرنے والی عورت بے شمار زاویوں سے اپنے بدن کو توڑتی ہے' موڑتی ہے' کبھی بدن کی قوس قزح بناتی ہے' کبھی کہکشاں کی طرح سیج پر بچھتی چلی جاتی ہے۔ انجلا بھی ایسے ایسے زاویے پیش کررہی تھی کہ اس وقت اس کے لئے [illegible] ہوگی لیکن میرے لئے آزمائش تھی۔ ہوٹل سویٹ ڈریم کے اسٹیج پر مصری رقاصہ نے لباس اُتار کر وہ کمالات نہیں دکھلائے تھے جو انجلا دکھا رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کیبرے ڈانس دیکھ رہا ہوں۔ مسلسل مشقوں کے باعث اس کے گلابی بدن پر پسینے کی بوندیں موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں کھلا ہوا گلاب شبنم کی بوندوں سے نہا رہا تھا پھر وہ تولیہ لے کر پسینہ خشک کرنے لگی۔ میں نے فوراً ہی آنکھیں بند کرلیں۔ کیونکہ بدن خشک کرتے وقت تولیہ جہاں جہاں پھسل رہا تھا میں وہاں تک پھسلنا نہیں چاہتا تھا۔

میرا دل واقعی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ آخر میں جوان تھا ایک ایسا بھوکا تھا جس کے سامنے دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ بدن کے اس دسترخوان سے مختلف لذتوں کی خوشبوئیں اُٹھ رہی تھیں میں دیکھ سکتا تھا' سونگھ سکتا تھا مگر شیشے کے آرپار اسے چھو نہیں سکتا تھا اسی لئے میں نے آنکھیں بند کرلی تھیں اور آنکھیں بند کئے دل ہی دل میں عہد کررہا تھا اور اسٹوفر کو سُنانے کے لئے قسمیں کھا رہا تھا کہ اس پارے کی طرح مچلتے ہوئے بدن کو ہر قیمت پر حاصل کروں گا اس کے لئے اس کا باپ مجھے آگ میں جلنے یا کھائی میں کودنے کے لئے کہے گا تب بھی انکار نہیں کروں گا۔ اسٹوفر جو چاہتا تھا میں اسی انداز میں سوچ رہا تھا اور اضطراب کی حالت میں کباب سیخ کی مانند کروٹیں بدل رہا تھا۔

کچھ تو سچ مچ کا اضطراب تھا اور کچھ دکھاوا بھی تھا تھوڑی دیر بعد میں نے اسٹوفر کو سُنانے کے لئے سوچا۔

”رات زیادہ ہوگئی ہے۔ اگر میں اسی طرح تڑپتا رہا اور جاگتا رہا تو صبح دیر تک سوتا رہوں گا۔ صبح انجلا کا باپ مجھے اپنا رازدار بنانا چاہتا ہے۔ نہ جانے کتنی اہم تجوری کا پتہ مجھے بتائے گا۔ مجھے اب سونے کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ صبح تازہ دم رہوں۔ اب میں آنکھیں کھول کر انجلا کی خوابگاہ کی طرف نہیں دیکھوں گا بلکہ اسی طرح آنکھیں بند کئے لاحول پڑھتا رہوں گا۔ ہمارے عقیدے کے مطابق لاحول پڑھنے سے شیطان اور چڑیلیں بھاگتی ہیں' دماغ کو سکون حاصل ہوتا ہے اور اس طرح نیند آجاتی ہے۔“

یہ سوچ کر میں بار بار لاحول پڑھنے لگا۔ اتنی دیر تک پڑھتا رہا کہ اسٹوفر بیزار ہوجائے اور اُکتا کر میرے ذہن میں جھانکنا چھوڑ دے۔

بہت دیر بعد میں خاموش ہوگیا۔ خاموشی میں بھی انسان کچھ نہ کچھ سوچتا ضرور ہے' لہٰذا میں بابا کمبل شاہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرے سوچنے کا انداز ایسا تھا کہ اسٹوفر کو اس سے دلچسپی نہ ہوتی۔ اس کے بعد میں نے چپکے سے اس کے ذہن میں جھانک کر دیکھا۔ اس وقت وہ سوچ کے

ذریعے انجلا سے گفتگو کر رہا تھا اور اس سے کہہ رہا تھا۔

"میں بہت دیر تک اس کے ذہن میں جھانکتا رہا۔ لومڑی کو انگور نہ ملے تو وہ اسے کھٹے کہتی ہے چونکہ تم ابھی اسے نہیں مل سکتی ہو اس لئے وہ تمہیں چڑیل کہہ کر عربی زبان میں کچھ پڑھ رہا ہے۔ کمبخت رُکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ نہ جانے کیا پڑھے جا رہا ہے۔ میں تھوڑی دیر بعد پھر اس کے ذہن میں جھانک کر دیکھوں گا فی الحال ہمیں کل کا پروگرام مرتب کرنا چاہیئے۔"

وہ انجلا سے محوِ گفتگو تھا۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر میں بستر پر سیدھا لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور اپنے دماغ کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

"میں ہر طرح کی سوچ سے خالی ہو رہا ہوں اور مسلسل دو گھنٹے تک سکون سے سوتا رہوں گا۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد میری آنکھ کھل جائے گی۔"

میں ہمیشہ سوتے وقت یہی عمل کرتا تھا اور سونے سے پہلے اپنے جاگنے کا جو وقت مقرر کرتا تھا' اسی مقررہ وقت پر بیدار ہو جاتا تھا۔ اس عمل کے مطابق میں ٹھیک دو گھنٹے بعد بیدار ہو گیا۔

آنکھ کھلتے ہی میں چند لمحوں تک چُپ چاپ پڑا رہا پھر میں نے اپنی رسٹ واچ دیکھی' اس وقت تین بجنے والے تھے۔ پھر میں نے چپکے سے اسٹوفر کے ذہن میں جھانک کر دیکھا۔ اس کا دماغ پُرسکون تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ سو رہا ہے۔ اس کے بعد میں نے انجلا کے دماغ کو ٹٹولا۔ وہ شیشے کے اُس پار بستر پر آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی تھی۔ اتنی دُور سے دیکھ کر یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے۔ اسی لئے میں نے اس کی سوچ کو پڑھا' وہ کوئی اُلٹے سیدھے خواب دیکھ رہی تھی۔ بہر حال جب مجھے یقین ہو گیا کہ دونوں باپ بیٹی گہری نیند سو رہے ہیں' تب میں نے عملی قدم اُٹھایا۔

میں بستر پر پلتھی مار کر بیٹھ گیا۔ پھر میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنی تمام سانسوں کو سینے میں سمیٹ لیا' اس کے بعد آنکھیں بند کیں اور مراقبے میں چلا گیا۔ اس وقت میری توجہ صرف اسٹوفر پر تھی۔ سوتے وقت دماغ اس حد تک کمزور اور بے قابو ہوتا ہے کہ سونے والا کسی قوتِ ارادی سے کام نہیں لے سکتا۔ اسٹوفر مضبوط قوتِ ارادی کا مالک تھا لیکن اس وقت خوابوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے والا دماغ بے قابو تھا اور میرے شکنجے میں آ سکتا تھا۔

میں نے ہولے سے اس کے ذہن پر دستک دی۔

"اسٹوفر! تم خواب دیکھ رہے ہو اور تم خواب دیکھتے رہو گے۔ تمہاری آنکھیں بند ہیں اور اسی طرح بند رہیں گی۔ دیکھو' ذرا سوچو! تم کیا دیکھ رہے ہو؟"

تحکمانہ انداز میں ایسا سوچتے وقت میں نے اسے ذہنی طور پر کسمساتے ہوئے محسوس کیا۔ شاید وہ نیند سے چونکنے والا تھا۔ میں نے پھر تحکمانہ انداز میں کہا۔ "خاموش پڑے رہو' کسمسانے کی ضرورت نہیں ہے۔ خواب دیکھو' کوئی اندیشہ نہ کرو۔ تم ٹیلی پیتھی جانتے ہو اور ٹیلی پیتھی جاننے والا انسانی نفسیات سے واقف ہوتا ہے۔ تم اپنی اس نفسیات کو سمجھو' اس وقت خواب کی حالت میں تم جو آوازیں سُن رہے ہو' وہ تمہارے عمل کا ردِعمل ہے۔ تم جس انداز میں دوسروں کو ٹرانس میں لاتے ہو' یہ ویسا ہی تحکمانہ انداز ہے جو خواب کی صورت میں تمہارے سامنے ہے۔ لہٰذا کوئی اندیشہ نہ کرو اور پُرسکون ہو کر سوتے رہو۔ تم سو رہے ہو' تمہارے آس پاس جو خواب کی دنیا ہے' وہ دُھندلا رہی ہے۔ اس دھندلکے میں ایک اجنبی شخص تمہیں نظر آ رہا ہے وہ بھی دُھندلایا ہوا ہے مگر غور سے دیکھو! تمہیں صرف اس کی آنکھیں نظر آئیں گی۔ ان آنکھوں کو دیکھو! تم ان آنکھوں کو پہلے بھی دیکھ چکے ہو لیکن پھر یہ ہے کہ تم ان آنکھوں کو نہیں پہچانو گے' صرف ان کی انگارے برساتی ہوئی تاثیر کو یاد رکھو گے۔ اپنی سوچ کے ذریعے جواب دو' کیا تم ان آنکھوں کو دیکھ رہے ہو؟"

یہ کہہ کر میں نے آنکھیں کھول دیں اور گھور کر خلا میں دیکھنے لگا۔ اس وقت اسٹوفر کے دماغ سے اس کی سوچ اُبھری۔

"ہاں۔ میں ان آنکھوں کو دیکھ رہا ہوں۔ اُف' یہ کس طرح انگارے برسا رہی ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ میری ہی آنکھیں بہت خطرناک ہیں' دوسروں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ لیکن میں ان آنکھوں کی طرف کھنچا جا رہا ہوں' یہ کیا ہو رہا ہے؟ میری قوتِ ارادی کمزور کیوں پڑ گئی ہے؟ میں ان آنکھوں کو نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں ان آنکھوں کو نہیں دیکھوں گا۔ نہیں دیکھوں گا.....!"

اسے ٹرانس میں لانا اور محکوم بنانا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ وہ میری ٹکر کا آدمی تھا۔ میری طرح ہپناٹزم اور ٹیلی پیتھی دونوں ہی علوم سے واقف تھا بلکہ اپنی عمر کے لحاظ سے زیادہ ہی تجربے کار تھا۔ لیکن یہ تو موقع کی بات ہوتی ہے' جسے موقع مل جاتا ہے اس کا داؤ چل جاتا ہے۔ کچھ دیر پہلے اس کے لئے بھی موقع تھا جب میں سو رہا تھا۔ اس وقت وہ مجھے ٹرانس میں لا کر میری اصلیت معلوم کر سکتا تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ سونے سے پہلے میں اپنے دماغ کو کنٹرول میں رکھتا ہوں۔ اپنے مقرر کردہ وقت کے مطابق سوتا اور جاگتا ہوں۔ اس دوران بڑے سے بڑا عامل میرے دماغ پر دستک دے تو اُسے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اگر اسٹوفر نے بھی دستک دی ہو گی تو وہ میرے دماغ کے اطراف آہنی حصار سے ٹکرا کر واپس چلا گیا ہو گا۔

بہر حال میں نے بڑی کوششوں کے بعد اسے خوابیدہ حالت میں اپنا محکوم بنا لیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "اپنی سوچ کے ذریعے جواب دو' تم کون ہو؟ اور کس مقصد کے لئے اس ملک میں آئے ہو؟"

وہ اپنی سوچ میں جواب دینے لگا۔ "میرا نام اسٹوفر گریس ہے' میں برطانیہ کا باشندہ ہوں۔ مجھے بچپن سے حیرت انگیز علوم سیکھنے کا خبط تھا' جوان ہو کر جب میں ہپناٹزم اور ٹیلی پیتھی کے علوم میں ماہر ہو گیا تو دولت سمیٹنے کے لئے اور عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کے لئے جرائم کے راستوں پر چل پڑا۔ میرے پاس ایسے علوم ہیں کہ جن کے ذریعے میں بڑے بڑے مجرموں کو اپنا مطیع اور فرماں بردار بنا لیتا ہوں۔ لیکن اس دنیا میں سیر پر سوا سیر بھی ہوتے ہیں۔ جب میں مختلف ممالک کی سیر کرتا ہوا استنبول پہنچا تو وہاں ماسٹر لوشے سے میرا سامنا ہوا۔ وہ ٹیلی پیتھی کے اتنی گہرائی میں ڈوبا ہوا تھا کہ اس گہرائی تک پہنچنے کے لئے برسوں تک ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ کتنی ہی صبر آزما مشقوں سے گزرنا پڑتا ہے ماسٹر لوشے کی آنکھوں میں اتنی قوت ہے کہ وہ کئی منٹ تک جلتے ہوئے سورج سے آنکھیں ملاتا ہے۔ میں اس کے سامنے طفلِ مکتب تھا۔ اُس نے مجھے اپنا محکوم بنا لیا اور مجھے ایسے گروہ میں لے گیا جس کا ہر فرد کسی نہ کسی علم اور فن کا استاد تھا۔ اسی گروہ میں انجلا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا انجلا تمہاری بیٹی نہیں ہے؟"

"نہیں۔ اُس سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

"انجلا کے متعلق بتاؤ؟"

"انجلا کا باپ آگ کا دیوتا کہلاتا ہے۔ وہ آگ کے شعلوں میں ایسے ایسے تماشے دکھاتا ہے کہ اس کے سامنے آگ پانی ہو جاتی ہے۔ اس نے ایک قسم کا اینٹی فائر لوشن تیار کیا ہے۔ اپنے تمام جسم پر وہ اس لوشن کی مالش کرتا ہے اس کے بعد آگ اس پر اثر نہیں کرتی۔ اس لوشن کا فارمولا صرف اس کی بیٹی انجلا جانتی ہے لیکن ٹیلی پیتھی کے ذریعے میں نے اور ماسٹر لوشے نے انجلا سے وہ فارمولا معلوم کر لیا ہے۔"

میں نے اس سے سوال کیا۔ "کیا وہ لوشن انجلا کے پاس موجود ہے؟"

"ہاں۔ وہ اس کے سیف میں موجود ہے۔"

میں نے پھر سوال کیا۔ "اس گروہ کے بارے میں بتاؤ جس کے لئے تم کام کرتے ہو؟"

"اس گروہ کے چار بڑے ماسٹر ہیں۔ اُن میں سے میں ماسٹر لوشے کو اور انجلا کے باپ ماسٹر دانیال کو پہچانتا ہوں جو آگ کا دیوتا کہلاتا ہے باقی دو ماسٹر کبھی میرے سامنے نہیں آئے۔ یہ تمام لوگ سیاسی مجرم ہیں' تمام ملکوں کے اہم رازوں تک پہنچتے ہیں۔ کوئی ملک نہ ان کا دوست ہے نہ دشمن ہے۔ یہ ایک ملک کے راز دوسرے ملک کے ہاتھوں فروخت کرتے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹے راز کے لاکھوں ڈالر وصول کرتے ہیں۔ اس گروہ کا نام انٹرنیشنل ماسٹرز گروپ ہے۔ اس کا مخفف آئی ایم جی ہے۔"

"آئی۔ ایم۔ جی کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے؟"

"زنجیبار میں ہے۔"

میں نے ایک اہم سوال کیا۔ "جب تم پر کوئی مشکل آن پڑتی ہے' کوئی مشکل جسے تم اپنے علوم سے آسان نہیں کر سکتے تو ایسی صورت میں کس سے مدد حاصل کرتے ہو؟"

"ماسٹر لوشے میری مدد کرتے ہیں۔"

"اس وقت خواب کی حالت میں جس طرح تم محکوم بنائے گئے ہو اور جس غائبانہ سوچ کے لہجے کو سمجھ رہے ہو' کیا وہاں تک ماسٹر لوشے پہنچ سکتا ہے؟"

"ہاں۔ پہنچ سکتا ہے۔"

"کس طرح؟ وضاحت کرو۔"

اسٹوفر کی سوچ کہنے لگی۔ "جب میں صبح اُٹھوں گا تو مجھے یہ خواب یاد آئے گا۔ پھر میں سوچوں گا کہ کس اجنبی شخص نے خواب میں مجھے اپنا محکوم بنایا تھا؟ جب میری سمجھ میں نہیں آئے گا تو میں ماسٹر لوشے سے دماغی رابطہ قائم کروں گا۔"

"میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ صبح آنکھ کھلنے کے بعد تم اس خواب کو بھول جاؤ گے۔"

"میں اس خواب کو بھول جاؤں گا۔"

"اب تم شہزاد کے متعلق بتاؤ؟"

"شہزاد میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن اس کی طلسمی انگوٹھی نے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ میں اب تک فیصلہ نہیں کر سکا کہ اس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ پھر اس کے سونے کا انداز مجھے کھٹک رہا ہے۔ میں اس کی نیند سے فائدہ اُٹھا کر اُسے ٹرانس میں لانا چاہتا تھا اور اس طلسمی انگوٹھی کا راز معلوم کرنا چاہتا تھا کیونکہ بیداری کی حالت میں وہ بہت ہی مستقل مزاج اور ایک مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہوتا ہے۔ میں نیند کی حالت میں ہی اس سے سب کچھ اُگلوا سکتا تھا لیکن مجھے حیرانی ہوئی کہ میں اس کے دماغ تک نہیں پہنچ سکا۔ کئی بار میں نے اپنی سوچ کے ذریعے اُسے پکارا مگر میری سوچ کا کوئی جواب نہ ملا۔ میں کیسے یقین کر دوں کہ وہ اس قدر گہری نیند سوتا ہے۔ یعنی دماغی طور پر بھی وہ اتنی گہری نیند میں ڈوب جاتا ہے کہ میری سوچ کی لہریں بھی وہاں تک نہیں پہنچتیں۔"

"شہزاد کی گہری نیند سے تم نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں نے جادو ٹونے کے بارے میں بہت کچھ سُنا ہے اور آج یہ تماشا بھی دیکھ لیا ہے کہ وہ کس طرح طلسمی انگوٹھی کے ذریعے خفیہ نمبروں کی ترتیب تک پہنچ جاتا ہے۔ یقیناً اس کی گہری نیند میں بھی وہی طلسمی انگوٹھی کام کر رہی ہے۔"

"تم صبح تک شہزاد کے متعلق کیا فیصلہ کرو گے؟"

"میں نے اسے صبح کا وقت اس لئے دیا ہے کہ میں ہر صبح آنکھ کھلتے ہی بستر پر بیٹھ جاتا ہوں اور سب سے پہلے ماسٹر لوشے سے رابطہ قائم کرتا ہوں۔ یہ میری روز کی ڈیوٹی ہے۔ میں کل صبح اُٹھتے ہی ماسٹر لوشے سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے شہزاد کی طلسمی انگوٹھی کا راز بتائیں۔"

"ماسٹر لوشے کے لئے شہزاد بالکل اجنبی ہے' وہ شہزاد کے دماغ تک کس طرح پہنچے گا؟"

"ماسٹر لوشے میری سوچ کو پڑھیں گے اور میں شہزاد کے خیالات کو پڑھوں گا۔ اس طرح وہ شہزاد تک پہنچ جائیں گے۔"

یہ سُنتے ہی مجھے احساس ہوا کہ میں بہت بڑے خطرے سے

دوچار ہو رہا ہوں۔ اب تک اسٹوفر ہی میرے لئے کچھ کم خطرناک نہ تھا اب تو چار ایسے ماسٹر تھے جو اپنے فن میں یکتائے زمانہ تھے اور مجھے کٹھ پتلی کی طرح اپنے اشاروں پر نچا سکتے تھے۔ کیا اس وقت میں اس قابل تھا کہ ایسے خطرناک اُستادوں سے سامنا کر سکوں؟

یہ فیصلہ کرنے کے لئے بڑے سوچ وبچار کی ضرورت تھی۔ میں کسی ضدی بچے کی طرح یا ایک مغرور انسان کی طرح اپنے علم اور اپنے تجربات پر فخر کرتے ہوئے بغیر سوچے سمجھے پہاڑوں سے نہیں ٹکرا سکتا تھا۔ فی الحال مجھے چار ماسٹروں کے متعلق سوچنے سے پہلے اُن کے شاگرد اسٹوفر سے نمٹنا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ صبح اُٹھ کر ماسٹر لوشے سے مجھے متعارف کرا دے۔

ماسٹر لوشے ۔۔۔ ا

ماسٹر لوشے کس طرح مجھ تک پہنچ سکتا ہے؟ فی الحال مجھ تک پہنچنے کے دو ذرائع تھے، ایک اسٹوفر اور دوسری انجلا' وہ دونوں آئی۔ ایم۔ جی کی خُفیہ تنظیم کے ممبر تھے۔ ان دونوں کی زندگی میرے لئے خطرناک تھی۔ میں نے پہلی فرصت میں یہ فیصلہ کیا کہ آج رات ان دونوں کو ختم ہو جانا چاہیئے۔ ان کے لئے آج رات کی صبح نہیں ہونی چاہیئے لیکن اسٹوفر کو ختم کرنے سے پہلے کچھ اور اہم معلومات درکار تھیں۔ میں نے پوچھا۔

"تم نے یہاں آکر اپنی تنظیم کے لئے اب تک کیا کام کیا ہے؟"

"یہاں آکر میں نے دو غیر ملکی جاسوسوں سے اہم سودے کئے ہیں۔ ایک دھرم ویر (بلیک گائیڈ) ہے۔ اس سے میں اہم کاغذات حاصل نہیں کر سکا۔ اس سے پہلے ہی وہ قانون کی گرفت میں آگیا ہے۔ دوسرا ایک فری لانسر ایجنٹ ہے۔ اس کا نام بیل منڈو ہے۔ بیل منڈو کا طریقہ کار بھی یہی ہے کہ کوئی اہم راز اس کے ہاتھ لگ جاتا ہے تو وہ کسی بھی ملک کے ہاتھوں اچھی خاصی رقم لے کر فروخت کر دیتا ہے۔ ابھی میں اس سے سودا کر رہا ہوں۔ اس کے پاس ایک ملک کے فوجی اڈوں کی مائیکرو فلم ہے۔ وہ اس فلم کے پچیس لاکھ ڈالر مانگتا ہے جو بہت زیادہ ہیں۔ اس کے لئے میں صرف دس لاکھ تک دے سکتا ہوں۔ جب اُس نے اس سودے سے انکار کیا تو میں نے اس کی سوچ کے ذریعے اس مائیکرو فلم تک پہنچنے کی کوشش کی تھی۔

بیل منڈو کی سوچ پڑھنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ اس کے چہرے پر پلاسٹک کی ناک ہے۔ کسی حادثے میں اس کی ناک کٹ گئی تھی اس لئے اُس نے پلاسٹک کی ناک لگا رکھی ہے۔ اسی ناک کے ایک نتھنے میں وہ فلم کو چھپا کر رکھتا ہے۔

اس فلم کو حاصل کرنے کے لئے میں نے یہاں کے نامور غنڈوں کی خدمات حاصل کیں۔ لیکن وہ لڑنے مرنے والے پانچ دس غنڈوں کے بس کا نہیں ہے جتنے خطرناک لڑنے والے گئے' وہ یا تو بُری طرح زخمی ہو کر واپس آئے یا پھر موت کے مُنہ میں چلے گئے۔ بیل منڈو ایک بلیک بیلٹ ونر ہے یعنی اتنا خطرناک فائٹر ہے کہ اس نے کنگ فو کے آرٹ میں کالا بیلٹ حاصل کیا ہے۔"

میں نے اسٹوفر سے سوال کیا "تم نے یہ کیسے سمجھ لیا تھا کہ شہزاد اتنے خطرناک فائٹر کی ناک سے وہ فلم نکال کر لے آئے گا؟ وہ تو محض تجوریاں کھول سکتا ہے' کسی درندے کی ناک میں انگلیاں نہیں ڈال سکتا۔"

"ہاں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شہزاد تنہا اس درندے کا مقابلہ نہیں کر سکتا میں اس سے تجوری ہی کھولنے کا کام لینا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ جب بیل منڈو اپنی کوٹھی میں موجود ہوتا ہے' یا رات کو اپنی خوابگاہ میں سوتا ہے تو وہ مائیکرو فلم اپنے نتھنے سے نکال کر سیف میں رکھ دیتا ہے۔ وہ سیف اس کی خوابگاہ میں ہے لیکن اس کی خوابگاہ تک پہنچنا بھی دل گُردے کا کام ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک بار شہزاد کسی طرح وہاں پہنچ جائے تو وہ آسانی سے سیف کھول کر اسے نکال لائے گا۔"

میں نے پوچھا "بیل منڈو کہاں رہتا ہے؟"

اُس نے جواب دیا "شہر سے دُور' سمندر کے کنارے ایک اُونچے سے ٹیلے پر ایک سبز رنگ کی کوٹھی ہے۔ کوٹھی کے آس پاس ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ اس بستی میں جو لوگ مچھیروں کی زندگی گزار رہے ہیں' وہ سب بیل منڈو کے خاص آدمی ہیں۔ وہ راتوں کو مچھلیاں پکڑنے کے بہانے سمندر میں جاتے ہیں تو اپنے ساتھ سونے اور چرس کا ذخیرہ لے جاتے ہیں۔ یہ سب بیل منڈو کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کوئی بھی اجنبی شخص جاتا ہے' تو فوراً ہی پہچان لیا جاتا ہے۔ بیل منڈو تک پہنچنے سے پہلے ہی اس بستی کا کوئی نہ کوئی آدمی اس اجنبی کو ختم کر دیتا ہے۔"

اسٹوفر اپنی سوچ کے ذریعے کہہ رہا تھا اور میں سُن رہا تھا جب بیل منڈو کے متعلق تمام معلومات فراہم ہو گئیں تو میں نے اس سے پوچھا۔

"زندگی ہر انسان کو عزیز ہوتی ہے۔ تمہیں بھی اپنی زندگی سے پیار ہو گا۔ ایسی صورت میں کیا تم مرنا پسند کرو گے؟"

"نہیں' میں مرنا نہیں چاہتا۔"

"آج تک تم نے جتنوں کو مارا ہے' وہ بھی مرنا نہیں چاہتے ہوں گے' کیا تم نے ان کی زندہ رہنے کی خواہش پوری کی تھی؟"

"نہیں۔ اپنی حفاظت اور اپنی بقا کے لئے مجبوراً دوسروں کو مارنا ہی پڑتا ہے۔"

"تم درست کہتے ہو' میں بھی اپنی حفاظت اور سلامتی کے لئے تمہیں اس دنیا کی پریشانیوں سے آزاد کرنا چاہتا ہوں۔ بولو! کہ تم مرنا پسند کرتے ہو۔"

"میں مرنا پسند کرتا ہوں۔"

"تم میرے معمول اور محکوم ہو' تم میرے ہر حکم کی تعمیل کرو گے۔"

"میں تمہارے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔"

"تمہارے پاس ایک ریوالور تو ضرور ہو گا' اپنے بستر سے اُٹھو اور ریوالور کو نکالو۔"

میں نے اس کی سوچ کے ذریعے معلوم کیا کہ وہ بستر سے اُٹھ رہا ہے اور الماری کی طرف جا رہا ہے۔ ایک منٹ کے اندر اُس نے ری کھول کر ایک دراز سے ریوالور نکال لیا۔ میں نے اُسے حکم دیا۔

"ریوالور میں سائیلنسر لگاؤ۔"

"میرے پاس سائیلنسر نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ریوالور واپس رکھ دو۔ کیا تمہارے پاس چاقو ہے؟"

"ہاں۔ میرے پاس چاقو ہے۔"

"چاقو نکالو اور اسے کھول کر بستر پر آجاؤ۔"

اُس نے میرے حکم کے مطابق چاقو نکالا اور اسے کھولتے ہوئے بستر پر آکر بیٹھ گیا۔ میں نے پھر حکم دیا "بستر پر آرام سے چاروں شانے چت لیٹ جاؤ۔"

اُس نے حکم کی تعمیل کی اور چت لیٹ گیا۔ میں نے کہا۔

"چاقو کے دستے کو دونوں مٹھیوں میں مضبوطی سے جکڑ لو پھر اسے سینے کے اوپر بلند کرو' اس کے بعد پوری قوت سے چاقو کے پھل کو اپنے سینے میں اُتار لو۔"

وہ میرا معمول تھا' محکوم تھا۔ میرے حکم سے وہ زہر کا پیالہ اُٹھا کر پی سکتا تھا۔ میرے ہی حکم سے اُس نے چاقو کو فضا میں بلند کیا اور اس کے بعد تیزی سے جھکتے ہوئے پھل کو اپنے سینے میں گھونپ لیا۔

خس کم جہاں پاک۔ وہ تھوڑی دیر تک تڑپتا رہا۔ خنجر ٹھیک دل پر لگا تھا اس لئے وہ چیخ نہ سکا' ذرا دیر تک کراہتا رہا اور تڑپتا رہا پھر ٹھنڈا پڑ گیا۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ اپنی زندگی کے کتنے ہی موڑ پر میں نے قتل کئے ہیں لیکن بہت مجبور ہو کر ایسا کیا ہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو دوسری صورت میں ماسٹر لوشے کا شکار ہو جاتا۔ اتنا مجھے یقین ہے کہ ماسٹر لوشے میری جان کا دشمن نہیں بنے گا لیکن میری صلاحیتوں سے کام لینے کے لئے جس طرح اسٹوفر کو اپنا آلۂ کار بنایا تھا اسی طرح مجھے بھی اپنے اشاروں پر نچانے گا۔ ٹیلی پیتھی کی انتہا کو پہنچنے والا ماسٹر لوشے کتنے طریقوں سے میرے دماغی توازن کو بگاڑ سکتا ہے' یہ مجھ جیسا ٹیلی پیتھی جاننے والا ہی سمجھ سکتا ہے۔ میں ماسٹر لوشے کا آلۂ کار نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ وہ مجھ تک نہ پہنچے اور اس کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ اسٹوفر اپنے سینے میں خنجر اُتار لے۔

اس کے بعد میں نے انجلا کی طرف دیکھا۔ وہ باریک سا ریشمی لباس پہنے اپنے بستر پر سو رہی تھی۔ میں نے اس کی خوابیدہ حالت میں اس پر تنویمی عمل کیا جب وہ ٹرانس میں آگئی تو میں نے اس سے پوچھا۔

"شہزاد کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

اُس نے جواب دیا "وہ ہینڈسم ہے' اسمارٹ ہے' میرا دل اس کی طرف مائل ہوتا ہے لیکن میں اپنی خفیہ تنظیم کے اصولوں کے مطابق اپنے دل کی باتوں پر عمل نہیں کر سکتی۔ جسے اپنا آلۂ کار بنانا ہوتا ہے اسے دُور ہی دُور سے تڑپا کر اپنا کام نکالنا پڑتا ہے۔ یہ ہمارے چار بڑے ماسٹروں کا حکم ہے اور ان کے حکم سے کوئی بھی انکار کرنے کی جُرأت نہیں کر سکتا۔"

میں نے پوچھا "اگر شہزاد کسی کام نہ آسکے اور تمہارا آلۂ کار نہ بن سکے' وہ صرف تمہیں حاصل کرنے کے تمہارے پاس آجائے تو کیا تم اپنی حفاظت کے لئے اپنے ماسٹروں سے مدد طلب کرو گی؟"

"نہیں" اُس نے جواب دیا "شہزاد جیسے نوجوانوں کے لئے میں تنہا کافی ہوں۔ اگر وہ جبراً میرے قریب آئے گا تو میں اسے جلا کر راکھ کر دوں گی۔"

میں نے مُسکرا کر شیشے کے پار اُس سوئی ہوئی قیامت کو دیکھا پھر اسے حکم دیا کہ وہ بستر سے اُٹھ جائے اور اپنے بیڈروم کا دروازہ کھول دے۔ وہ چُپ چاپ بستر سے اُٹھی' آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے تک گئی اور اسے کھول دیا۔ پھر میں نے اسے حکم دیا کہ وہ واپس آکر بستر پر لیٹ جائے۔

جب وہ بستر پر آکر لیٹ گئی تو میں نے اسے حکم دیا کہ وہ سو جائے۔ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد جب اس کی آنکھ کھُلے گی تو وہ میرے تنویمی عمل سے آزاد ہو گی۔ وہ میرے حکم کے مطابق سو گئی۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر اس کی خوابگاہ میں آگیا۔ وہاں پہنچ کر سب سے پہلے میں نے اس کے سیف کو کھولا پھر اس میں سے انٹی فائر لوشن نکالا۔ اسے حاصل کرنے کے بعد میں نے اپنے تمام کپڑے اُتارے اور اپنے بدن پر اس لوشن کی مالش کرنے لگا۔ سر کے بالوں سے پاؤں کے تلوؤں تک ایک ایک حصے پر لوشن ملنے کے بعد میں تھوڑی دیر تک ہاتھ پاؤں پھیلائے کھڑا رہا۔ پہلے پہل اس لوشن سے ایک عجیب سی مہک اُٹھ رہی تھی پھر جیسے جیسے وہ میرے بدن پر سوکھنے لگا اس کی مہک ختم ہوتی گئی۔ اس کے بعد میں نے اپنے کپڑے پہن لئے۔

اس عمل میں بارہ منٹ گزر گئے۔ مجھے مزید تین منٹ تک انتظار کرنا پڑا۔ ٹھیک تین منٹ گزرنے کے بعد انجلا کی آنکھ کھُل گئی۔ میں کھُلے ہوئے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی ہڑبڑا کر اُٹھی پھر اس نے پوچھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ ڈیڈی نے اگر دیکھ لیا تو وہ ناراض ہو جائیں گے۔"

"میں تمہیں یہ افسوسناک خبر سُنانے آیا ہوں کہ تمہارے ڈیڈی ناراض

ہونے کے لئے اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔"
"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ڈیڈی زندہ نہیں ہیں؟"
"ہاں۔ میں یہی کہہ رہا ہوں۔ وہ اپنے بستر پر ایک خنجر کو سینے سے لگائے ابدی نیند سو رہے ہیں۔ تم چل کر دیکھ لو۔"
وہ میرے کہنے کے دوران ہی تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی اسٹوفر کی خوابگاہ کی طرف جانے لگی۔ میں اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ خوابگاہ میں پہنچ کر وہ اسٹوفر کو دیکھتے ہی ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اسٹوفر اپنے بستر پر مُردہ پڑا ہوا تھا۔ انجلا نے قریب جا کر خون آلود چاقو اُٹھاتے ہوئے کہا۔
"اسے تم نے قتل کیا ہے؟"
"نہیں انجلا! میں کیسے قتل کر سکتا ہوں؟ تمہارا یہ بناسپتی باپ ٹیلی پیتھی جانتا تھا۔ اگر میں اسے قتل کرنے آتا تو اس سے پہلے ہی وہ میرے خیالات کو پڑھ کر محتاط ہو جاتا۔ اس نے اپنی مرضی سے خودکشی کی ہے۔"
"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس نے خودکشی کی ہے؟"
"میرے سامنے کی بات ہے، میں یہاں موجود تھا۔ تمہارے باپ نے اپنے ہاتھ میں خنجر لیکر مجھ سے کہا کہ وہ اس زندگی سے بیزار ہو گیا ہے۔ شہزاد! میں اس دنیا سے جا رہا ہوں۔ میرے بعد تم میری بیٹی کی خوابگاہ میں جاؤ اور عیش کرو۔ آؤ میری جان! اب ہم مرنے والے کی وصیت کے مطابق عیش کریں گے۔"
اتنا سُنتے ہی اُس نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح مجھ پر حملہ کیا۔ اگر میں ذرا بھی چوک جاتا تو وہ چاقو میرے سینے میں بھی اُتر جاتا۔ میرے پینترا بدلتے ہی وہ حملہ کرنے کی جھونک میں سامنے والی دیوار سے جا کر ٹکرا گئی۔ میں نے اس کی کلائی کو پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا اور اسے اپنے کندھے پر لاد کر اس کی خوابگاہ کی طرف جانے لگا۔ وہ میرے کندھے پر تڑپتی رہی، مچلتی رہی، خود کو میری گرفت سے چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہی۔ لیکن میں نے اسے اس کی خوابگاہ میں لے جا کر بستر پر پھینک دیا۔ وہ بستر پر گرتے ہی اک دم سے ساکت ہو گئی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔
وہ مجھے دیکھ رہی تھی اور میں اس کی سوچ کو پڑھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔
"یہ اچانک بازی کیسے پلٹ گئی؟ اسٹوفر تو ناقابلِ شکست تھا۔ پھر وہ کیسے شہزاد کے ہاتھوں مارا گیا؟ میں کیا کروں؟ اس قاتل کے ہاتھوں سے کس طرح بچ کر نکلوں۔ مجھے اپنے ماسٹروں تک اس واقعے کی رپورٹ پہنچانی ہے۔ کل صبح معمول کے مطابق جب ماسٹر لوپشے کو اسٹوفر کی طرف سے کوئی رپورٹ نہیں ملے گی تو پھر ماسٹر لوپشے خود ہی ہزاروں میل دُور بیٹھ کر سوچ کا سفر طے کرے گا اور سوچ کے ذریعے اسٹوفر کو تلاش کرے گا۔ لیکن جب اس کے مُردہ دماغ سے کوئی جواب نہیں ملے گا تو ماسٹر لوپشے

مجھ سے دماغی رابطہ قائم کرے گا۔ تب میں بتاؤں گی کہ یہ شہزاد کس بلا کتنا خطرناک ہے۔ اس نے ہماری تنظیم کے ایک ایسے قابل شخص کو قتل کیا ہے جس کی جگہ کوئی پُر نہیں کر سکتا۔
لیکن یہ صبح کی بات ہے۔ یہ شہزاد صبح تک مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اپنی ہوس پوری کرے گا اور مجھے مار ڈالے گا۔ اب صرف ایک ہی راہ ہے کہ میں اپنی تکنیک کے مطابق اسے جلا کر راکھ کر دوں۔"
وہ سوچنے لگی کہ کس انداز میں مجھے جلائے گی۔ اس کے دماغ نے اسے سمجھایا کہ وہ غصہ تھوک دے اور شہزاد کو بڑی لگن سے دیکھے۔ اس کی خواہش پوری کرنے کے لئے اس کی آغوش میں چلی جائے لیکن اس سے پہلے وہ سیف کے پاس جائے گی۔ اسے کھول کر انٹی فائر لوشن نکالے گی اور اسے چھپا کر باتھ روم میں چلی جائے گی۔ وہاں جا کر وہ اپنے بدن پر اس لوشن کی مالش کرے گی۔ پھر باتھ روم سے برہنہ نکل آئے گی۔ شہزاد اسے بے لباس دیکھتے ہی دیوانہ ہو جائے گا اور اسے آغوش میں لے کر کھیلنے لگے گا۔ اسی وقت وہ ایک سگریٹ طلب کرے گی۔ پھر ایک سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر اُسے سلگانے کے لئے کہے گی۔ جیسے ہی وہ سگریٹ سُلگانے کے لئے میرے قریب ماچس کی تیلی جلائے گا، میرے بدن کا لوشن فوراً ہی آگ پکڑ لے گا۔ اچانک ہی شعلے بھڑک جائیں گے۔ میں اس سے اس طرح لپٹ جاؤں گی کہ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرے گا تب بھی چھڑا نہ سکے گا۔
میں اس کی سوچ کے ذریعے اس کی مکاریوں کو سمجھ رہا تھا۔ اسی وقت مجھے خیال آیا کہ میں ایک اہم بات بھول رہا ہوں اور وہ یہ کہ میں نے اب تک انٹی فائر لوشن کا فارمولا اس سے نہیں پوچھا ہے۔ جو لوگ دانشمند ہوتے ہیں وہ اسی لئے عورت کی خواہش کو کچل دیتے ہیں اور اس کی تمنا اس لئے نہیں کرتے کہ ایک خوبصورت بدن حاصل کرنے کی دھن میں کام کی باتیں رہ جاتی ہیں۔ جسمانی خواہش تو پوری ہو جاتی ہے لیکن بعد میں پچھتانا پڑتا ہے۔ میں اپنے آپ پر لعن طعن کرنے لگا۔ ایسی بھی کیا دیوانگی تھی کہ انجلا کے گورے اور چکنے ہوئے بدن کو دیکھتے ہی وہ باتیں بھول گیا تھا جو آئندہ فائدہ پہنچا سکتی تھیں۔
اس وقت انجلا کا مزاج بدل گیا تھا۔ وہ مجھے اتنے پیار سے دیکھ رہی تھی جیسے نگاہوں سے قتل کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔
"بس تم اسی طرح میری آنکھوں میں دیکھتی رہو۔"
وہ اک دم سے گڑبڑا گئی۔ میری سُلگتی ہوئی آنکھوں پر سے نظر ہٹانے کی کوشش کی۔ لیکن میری مقناطیسی آنکھوں نے اس کی نظروں کو جکڑ لیا تھا۔ اس کا بدن کسمسایا لیکن نظریں ذرا بھی اِدھر سے اُدھر نہ ہو سکیں۔ میں نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔
"تم ان آنکھوں میں دیکھ رہی ہو اور اسی طرح ان آنکھوں میں دیکھتی رہو گی۔"

اُس نے زبان سے کچھ نہیں کہا مگر اس کی سوچ کہہ رہی تھی۔
"ہاں۔ میں ان آنکھوں کی گہرائی میں ڈوب رہی ہوں۔ اُف، یہ آنکھیں پہلے تو ایسی نہیں تھیں، یک بیک ان آنکھوں کا مزاج کیسے بدل گیا ہے؟ مائی گاڈ! کیا یہ بھی ہپناٹزم جانتا ہے؟ ہاں ایسی ہی بات ہے۔ میرا دل آپ ہی آپ ڈوبتا جا رہا ہے۔ یہ آنکھیں میرے دماغ کو جیسے جلا رہی ہیں۔ آہ میں اپنی قوتِ ارادی سے کام لینا چاہتی ہوں مگر نہیں چلتی......"
میں نے حکم دیا۔ "اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دو۔ تم اپنے طور پر کچھ نہیں کرو گی۔ کچھ نہیں سوچو گی اور خود کو بھول جاؤ گی۔ تم خود کو بھول رہی ہو۔ تمہارے آس پاس کی دنیا تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہے۔ تمہیں ان آنکھوں کے سوا اس دنیا کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی ہے۔"
میں کہتا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ ٹرانس میں آ گئی۔ جب وہ مکمل طور پر میری معمول بن گئی تو میں نے اسے حکم دیا۔
"چلو اٹھو اور میز کے پاس جا کر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔"
وہ اپنی جگہ سے اُٹھ گئی اور آہستہ آہستہ یوں چلنے لگی جیسے پانی کی سطح پر ناؤ ڈول رہی ہو۔ وہ میرے حکم کے مطابق میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس سے کاغذ اور قلم نکالنے کے لئے کہا۔ جب وہ کاغذ کا ایک پیڈ سامنے رکھ کر اور قلم کھول کر بیٹھ گئی تو میں نے اس سے کہا۔
"اب پوری تفصیل سے انٹی فائر لوشن کا فارمولا لکھو۔"
وہ حکم کی بندی بلا چوں و چرا کاغذ پر لکھنے لگی۔ میں کبھی اسے دیکھتا اور کبھی کاغذ پر اس کی صاف ستھری تحریر کو پڑھتا رہا۔ فارمولے کی پوری تفصیل لکھنے کے بعد اس کا قلم رُک گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔
"کیا فارمولا مکمل ہو گیا؟"
"ہاں۔ مکمل ہو گیا ہے۔"
میں نے اس کاغذ کو پیڈ میں سے نکال کر تہہ کیا اور اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد اُسے حکم دیا کہ وہ دوبارہ بستر پر جا کر لیٹ جائے۔ وہ پھر پانی کی سطح پر ڈولتی ہوئی ناؤ کی طرح اپنے بستر تک گئی اور اس پر لیٹ گئی۔ میں نے اس سے کہا۔
"آنکھیں بند کر لو اور سو جاؤ۔ پندرہ منٹ کے بعد پھر بیدار ہو جانا۔ اس وقت تم تنویمی عمل سے آزاد رہو گی۔"
وہ آنکھیں بند کر کے سو گئی۔ میں اس کے سیف کے پاس گیا اور اس کی تمام چیزیں نکال کر دیکھنے لگا کہ شاید کوئی کام کی چیز ہاتھ لگ جائے۔ لیکن کوئی کام کی چیز نظر نہیں آئی۔ مشرقی عورت کا بہروپ بھرنے کے لئے اس میں کچھ سونے اور چاندی کے زیورات رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی بھی تھی۔ مالِ غنیمت کے طور پر میں نے وہ انگوٹھی رکھ لی۔

پندرہ منٹ بعد وہ بیدار ہو گئی۔ چند لمحوں تک وہ چُپ چاپ پڑی سوچتی رہی پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے وحشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم ــــ تم نے مجھے ہپناٹائز کیا تھا ــــ؟"
"ہاں۔ اب تم اس عمل سے آزاد ہو۔ دراصل میں تمہارے سیف کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔ لیکن یہاں ایک ہیرے کی انگوٹھی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ میں لاک بریکر ہوں۔ مجھے سیف کھولنے کا کچھ تو معاوضہ ملنا چاہیئے۔ لہٰذا میں نے وہ انگوٹھی رکھ لی ہے۔ اور ہاں تمہارے سیف میں یہ ایک شیشی بھی رکھی تھی۔ پتہ نہیں اس شیشی میں کس طرح کا سیّال ہے؟"
وہ انٹی فائر لوشن تھا۔ میں نے انجان بن کر پوچھا تھا۔ اس نے شیشی کو دیکھتے ہی میرے ہاتھوں سے جھپٹ لیا پھر جلدی سے بولی۔
"یہ ــــ یہ تمہارے کام کی چیز نہیں ہے، اسے صرف عورتیں استعمال کرتی ہیں۔ اسے میں بدن پر لگاؤں گی تو میرے بدن سے جذبات انگیز خوشبو اُٹھے گی۔ اس سے تمہاری مسرتوں میں اضافہ ہو گا۔ اگر کہو تو ابھی میں باتھ روم میں جاتی ہوں۔ جب واپس آؤں گی تو تمہیں ایسی لذتوں سے آشنا کروں گی، جن سے تم اب تک محروم رہے ہو گے۔"
میں نے بڑی خوشی سے اسے باتھ روم میں جانے کی اجازت دے دی۔ جب وہ چلی گئی تو میں آرام سے بستر پر لیٹ گیا
باتھ روم کے بند دروازے کے پیچھے وہ بھی سوچتی جا رہی تھی کہ وہ بستر پر آ کر مجھ سے محبت نہیں کرے گی۔ کمرے کے ننگے فرش پر ہو گی۔ تاکہ جب اس کے جسم سے شعلے اٹھیں تو بستر تک یا کمرے کی کسی ایسی چیز تک نہ پہنچیں جس سے آگ لگنے کا اندیشہ ہو۔
وہ پوری طرح مطمئن ہو کر باتھ روم سے باہر آئی۔ وہ ایسی لگ رہی تھی جیسے اُس نے ابھی ابھی جنم لیا ہو۔ کیونکہ جنم لیتے وقت انسان کے بدن پر کپڑے نہیں ہوتے۔

وہ ننگے

فرش پر کھڑی بڑی سخاوت سے مجھے اپنی طرف بلا رہی تھی۔
میں بستر سے اُٹھ کر یوں اس کی طرف بڑھتا چلا گیا جیسے یہ سب کچھ خواب ہو اور میں خواب میں چل رہا ہوں۔ اس کے بدن پر لوشن کی ہلکی ہلکی مہک رہ گئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔
"واقعی تم نے کچھ عجیب سا لوشن لگایا ہے۔ کچھ عجیب سی مہک اُٹھ رہی ہے اور مجھ پر بھی کچھ عجیب سی دیوانگی طاری ہو رہی ہے۔"
میری قربت سے وہ ہزار ضبط کے باوجود تڑپ گئی اور فوراً ہی مجھ سے دُور ہو گئی۔ وہ بہکنا نہیں چاہتی تھی۔ دُنیا جہاں کا تجربہ اس کے

پاس تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ اس کھیل کے بعد میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اسٹوفر کا قاتل تھا اور کوئی قاتل اپنے پیچھے چشم دید گواہ چھوڑ کر نہیں جاتا خواہ وہ گواہ حسین عورت کے روپ میں کیوں نہ ہو۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "تم مجھ سے دور کیوں چلی گئی ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "میری عادت ہے' ایسے وقت میں سگریٹ کے کش لگاتی ہوں۔ پلیز مجھے ایک سگریٹ دو۔"

میں بستر کے پاس گیا۔ وہاں اپنی پتلون کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ پھر ایک سگریٹ اور ماچس لے کر اس کے پاس آگیا۔ اس نے سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبالیا پھر اپنی دونوں بانہیں میری کمر کے گرد حمائل کر کے مجھے مضبوطی سے جکڑ لیا تاکہ میں بھاگ نہ سکوں' پھر اس نے کہا۔ "سگریٹ سلگاؤ۔ میں تمہارے لئے جذبات کے شعلے بھڑکاؤں گی۔"

"ہاں! میں تمہارے بدن کی آگ میں جلنے ہی آیا ہوں۔"

یہ کہتے ہی میں نے ماچس کی تیلی جلائی جیسے ہی تیلی نے آگ پکڑی ہمارے بدن سے بھی اچانک ہی شعلے بھڑک گئے۔ شعلے بھڑکتے ہی انجلا نے فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے مجھے اور مضبوطی سے جکڑ لیا۔ میرے اطراف اپنی بانہوں کا پھندا بنا کر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں انگلیاں پھنسالی تھیں۔ میں نے گھبرا کر کہا۔

"یہ — یہ آگ کیسی ہے؟ مجھے چھوڑ دو — مجھے چھوڑ دو نہیں تو میں جل جاؤں گا۔"

وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتی ہوئی بولی۔ "جب میں انگلیوں کی قینچیاں بنا کر پھندہ ڈالتی ہوں تو بڑے سے بڑے شہ زور اس پھندے میں جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ ہاہاہا… میں آگ کے دیوتا ماسٹر دانیال کی بیٹی ہوں۔ میں آگ کے شعلوں پر سوتی ہوں میں خود نہیں جلتی' دوسروں کو جلاتی ہوں تمہاری طرح ایک اور احمق میرے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس احمق نوجوان کی ماں نے مجھے گالیاں دی تھیں کہ میں حرافہ ہوں۔ میں نے گالی کے جواب میں اس کے سامنے اس کے بیٹے کو اسی طرح جلایا تھا۔ وہ بہت طاقتور تھا لیکن ایک تو میرے بازوؤں کا پھندا مضبوط ہوتا ہے' دوسرے مرد کی طاقت اس لئے کام نہیں آتی کہ اچانک بھڑکنے والے شعلے اسے حواس باختہ کر دیتے ہیں اور اس کی مدافعت کو کمزور بنا دیتے ہیں۔ ہاہا… ہاہا… تم بھی کمزور پڑتے جا رہے ہو……"

"بس کرو میری جان! کب تک قہقہے لگاتی رہو گی۔"

اس کے قہقہے گھٹ گئے۔ تب اسے ہوش آیا کہ شعلے مجھے نہیں جلا رہے ہیں۔ شعلے چونکہ ہمارے بدن کے چاروں طرف بھڑک رہے تھے اس لئے وہ فوراً ہی سمجھ نہ سکی تھی کہ اس کے بدن کی طرح میرا جسم بھی شعلوں کو بخوشی قبول کر رہا ہے۔

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور بازوؤں کا پھندا کمزور پڑ گیا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ "لگ… کیا تم نے بھی اس لوشن کو استعمال کیا ہے؟"

"تم کس لوشن کی بات کر رہی ہو' میں نہیں جانتا۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ میں ایک مرد ہوں اور عورت کا زرخیز بدن ہر مرد کو جلاتا ہے۔ عورت سراپا آگ ہے' وہ آج تک مردوں کو جلاتی آئی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ آگ نظر نہیں آتی اور یہ شعلے نظر آ رہے ہیں۔ آؤ' ہم اس دنیا کے پہلے آدم اور حوا ہیں' جو شعلوں کی سیج پر جوانی کا سفر طے کریں گے۔"

جہاں جہاں سے ہمارے جسم ٹکراتے تھے' وہاں شعلے دب جاتے تھے جسم کا جو حصہ ٹکراؤ سے آزاد ہو جاتا' وہاں پھر آگ پکڑ لیتی اور شعلے بھڑکنے لگتے۔ آگ کہیں سے جل رہی تھی کہیں سے بجھ رہی تھی۔ ہم کہیں سے ابھر رہے تھے اور کہیں سے ڈوب رہے تھے اس کی مدافعت کی قوت ختم ہو چکی تھی۔

بہت دیر بعد جب آگ بجھ گئی تو میں نے اس سے کہا کہ وہ غسل کر لے۔ کیونکہ غسل کرنے کے بعد مکمل طور پر لوشن کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے۔ وہ میرے کہنے کے مطابق باتھ روم میں چلی گئی۔ جب میں باتھ روم میں داخل ہوا تو وہ باتھنگ ٹب میں پانی بھر چکی تھی اور اس میں بیٹھنے جا رہی تھی میں نے اسے سہارا دے کر بٹھایا۔ جب وہ باتھنگ ٹب میں سینے تک ڈوب گئی تو میں نے اس کی گردن کو ایک ہاتھ کے شکنجے میں لے کر کہا۔

"تم اتنی رحم دل ہو کہ تم نے ایک ماں کے سامنے اس کے جوان بیٹے کو جلا ڈالا تھا۔ تمہیں نہ تو اس کی جوانی پر ترس آیا تھا اور نہ تم نے ایک عورت ہو کر ماں کی ممتا کو سمجھا تھا۔ اگر میں نے بھی تمہیں زندہ چھوڑ دیا تو تم اپنے چار ماسٹروں کو شکاری کتوں کی طرح میرے پیچھے لگا دو گی۔ اس لئے اے آگ سے کھیلنے والی! آگ کے دیوتا کی بیٹی! اپنا تجھے ہمیشہ کے لئے پانی میں بجھا رہا ہوں……"

یہ کہہ کر میں نے اس کی گردن کو دبوچتے ہوئے پانی میں ڈبو دیا۔ وہ گھبرا کر پھڑ پھڑانے لگی۔ وہ ہاتھ پاؤں پھینک رہی تھی اور پانی کے چھینٹے مجھ پر اڑ رہے تھے۔ لیکن میں نے اسے پانی سے ابھرنے نہیں دیا۔ اسے بجھا دینے کے لئے چند سیکنڈ کافی تھے مگر میں نے احتیاطاً اسے ایک منٹ تک ڈبوئے رکھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے زندگی کی آگ سے خالی ہو گئی۔

میں نے اسے چھوڑ کر باتھ روم کا جائزہ لیا۔ واش بیسن پر لوشن کی شیشی رکھی ہوئی تھی۔ میں اسے جیب میں ڈال کر خوابگاہ میں آیا۔ کوریڈور سے گزرتے ہوئے میں نے ایک نظر اسٹوفر کی خوابگاہ پر ڈالی دونوں نقلی باپ بیٹی اس دنیا میں شیلی پیتھی اور آگ کا تماشا دکھانے

شاہن گئے تھے اور دنیا والوں کے لئے اس آخری تماشے کا انجام چھوڑ گئے تھے۔ میں وہاں سے انجلا کی کار میں بیٹھ کر ہاکس بے روانہ ہو گیا۔

جب میں ہاکس بے پہنچا تو صبح ہونے والی تھی۔ میں نے کاٹیج کے پاس گاڑی روک دی۔ صبح کے وقت سمندر کے ساحل پر بڑا سکون تھا۔ میں نے جوتے اتار دیئے اور ننگے پاؤں ریت پر چلنے لگا۔ میں ابھی شاطر کو سعید احمد کو نیند سے بیدار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں ابھی ہنگاموں سے نکل کر آیا تھا۔ اس پرسکون ماحول میں کسی کی مداخلت نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت اتنی بڑی دنیا میں' میں تنہا تھا' میرے سامنے بیکراں سمندر تھا اور سر پر بے کنار آسمان پھیلا ہوا تھا اور پاؤں کے نیچے ٹھنڈی ٹھنڈی ریت تھی میں پاؤں پھیلا کر قدرت کی گود میں بیٹھ گیا۔ ایسا سکون نصیب والوں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ بہت عرصے بعد میرے یہ نصیب جاگے تھے۔ میں بالکل خالی الذہن ہونا چاہتا تھا اس لئے میں نے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔ اپنی دانست میں میرا ذہن بالکل خالی ہو گیا۔

سمندر — اے عظیم سمندر! تو بہت گہرا ہے مگر تجھ میں انسانی ذہن سے زیادہ گہرائی نہیں ہے۔

آسمان — اے بلند و بالا آسمان! تو انسانی ذہن کی پرواز سے بلند نہیں ہے یہ جو ہمارا دماغ ہے' یہ ایسے ایسے حیرت انگیز کاوش کرتا ہے اور ایسی ایسی ناقابل یقین مہمات سے گزر جاتا ہے کہ ایسا دماغ رکھنے والا انسان خود اپنی عقل پر حیران رہ جاتا ہے۔

دماغ کی وسعت اور بلندی کا خیال آیا تو مجھے یہ بات بھی یاد آئی کہ تیلی پیتھی کی دنیا میں ماسٹر لیوشے کی پرواز کتنی بلند ہے۔ میں نے سوچا' میں بھی اس کی طرح انسان ہوں۔ کیا میں اس سے زیادہ بلندی پر پرواز نہیں کر سکتا؟ میں مزید کر سکتا ہوں۔ انسان کچھ کرنے پر آجائے تو اس کی زندگی کی لغت سے ناممکن کا لفظ مٹ جاتا ہے۔ میں منصوبے بنانے لگا کہ مجھے اس علم کی گہرائی میں اور ڈوبنا ہوگا' اتنا ڈوبنا ہوگا کہ سمندر اپنی گہرائی سے اور آسمان اپنی بلندی سے شرما جائے۔

میں سمجھتا تھا کہ آج نہیں تو کل ماسٹر لیوشے جیسی ہستیوں سے مزید مقابلہ ہوگا۔ میں سمندر کے ساحل پر مطمئن بیٹھا ہوا تھا۔ ایسا اطمینان اس وقت محسوس ہوتا ہے۔ جب یہ سوچ لیتے ہیں کہ دشمن کے ذرائع محدود ہیں' وہ ہم تک نہیں پہنچ سکے گا۔ لیکن میں اس وقت سنبھل رہا تھا اور اس بار میں چار بڑے ماسٹروں کے متعلق سوچ رہا تھا کہ نہ جانے وہ کیسے حیرت انگیز علوم سے واقف ہیں اور کس طرح مجھ تک پہنچ کر پریشان کر سکتے ہیں بلکہ مجھے تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔

یہ سب کچھ سوچنے کے بعد میں پلتھی مار کر ریت پر بیٹھ گیا میرے سامنے بہت دور آسمان کا کنارہ سمندر میں ڈوب رہا تھا۔ جہاں وہ ڈوب رہا تھا' وہاں سے آفتاب بلند ہو رہا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس کھینچی' پھر تمام سانسوں کو سینے میں روک کر ابھرتے ہوئے آفتاب کی پہلی ٹھنڈی کرنوں سے آنکھیں ملانے لگا۔

ایک منٹ تک سانسیں روکے رہنے کے بعد میں آہستہ آہستہ سانس چھوڑنے لگا۔ تھوڑی دیر تک گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ اس کے بعد میں نے پھر وہی عمل کیا یعنی دوبارہ سانس روک کر آسمان کے اس کنارے پر نظریں جما دیں جو دم بدم روشن ہوتا جا رہا تھا اور روشنی کی حرارت بڑھتی جا رہی تھی۔ جب آفتاب کی روشنی اتنی تیز ہو گئی کہ میں اس سے آنکھیں نہ ملا سکا تو میں نے یہ عمل ختم کر دیا۔ مجھے روزانہ اسی طرح مشق جاری رکھنی تھی۔ اسی طرح آفتاب کی حرارت کو میری آنکھیں اور میرا دماغ قبول کر سکتا تھا لیکن اس کے لئے ایک دو دن کی نہیں بلکہ برسوں کی ریاضت درکار تھی میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے اس عمل میں کامیاب ہونے کے لئے کتنے ماہ یا کتنے سال لگ جائیں گے لیکن میں مستقل مزاج ہے۔ جس کام کے لئے بیڑہ اٹھاتا ہوں' اسے ختم کر کے ہی دم لیتا ہوں اور اس دن سے میں ٹیلی پیتھی کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہا تھا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کاٹیج کی طرف جانے کے لئے پلٹا تو دور انجلا کی کار کے پاس سعید احمد کھڑے نظر آئے۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی دور سے کہا۔

"فرہاد! میں بہت دیر سے تمہیں دیکھ رہا ہوں لیکن یہ سوچ کر خاموش رہا کہ شاید تم مراقبے میں ہو۔"

میں نے قریب آتے ہوئے کہا۔ "آپ نے ٹھیک ہی سوچا تھا میں جب یہاں آیا تو آپ سو رہے تھے' اس لئے میں بھولی ہوئی مشقوں کو دہرانے میں مشغول ہو گیا تھا۔"

"مگر فرہاد! تم نے تو کہا تھا کہ اب روبرو ہماری ملاقات نہیں ہو سکتی۔ تمہیں موقع ملے گا تو تم سوچ کے ذریعے رابطہ قائم کرو گے پھر یہ اچانک پروگرام کیسے بدل گیا؟"

"حالات بدل گئے' اس لئے پروگرام بدل گیا۔ وہ دونوں باپ بیٹی جن کا نام اسٹوفر اور انجلا تھا' اب وہ فرشتوں کو ہپناٹائز کرنے گئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" سعید احمد نے حیرانی سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ وہ دونوں ہم دونوں کے لئے بہت زیادہ خطرناک بن گئے تھے' اس لئے میں نے انہیں ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔"

وہ تھوڑی دیر تک مجھے حیرانی اور پریشانی سے دیکھتے رہے پھر انہوں نے آہستگی سے کہا۔ "مجرموں کی زندگی سے کھیلنے کے بجائے انہیں ہر ممکن طریقے سے قانون کے حوالے کرنا چاہیئے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم نے بہت مجبور ہو کر انہیں ختم کیا ہوگا۔ لیکن مجھے بتاؤ کہ تم نے کن حالات میں ایسا کیا ہے تاکہ میں تمہیں قانون کی زد سے بچا سکوں۔"

میں انہیں تمام واقعات تفصیل سے سنانے لگا۔ وہ توجہ سے سُنتے رہے اور کبھی کبھی مجھے ٹوک کر اپنے طور پر مجھ سے سوالات کرتے رہے۔ جب میرے تمام حالات ان کے سامنے آ گئے تو انہوں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"ہاں۔ ایسی صورت میں انہیں مر جانا چاہیئے تھا۔ اگر وہ اپنی خفیہ تنظیم کے ماسٹروں سے رابطہ قائم کر لیتے تو ہم دونوں کی شامت آ جاتی مجھے تو وہ مار ہی ڈالتے کیونکہ میں تمہاری طرح حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک نہیں ہوں مگر وہ تمہیں اپنا آلۂ کار بنا لیتے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ ٹیلی پیتھی کے کمالات بس یہی ہیں۔ جن کا مظاہرہ تم کرتے رہتے ہو۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ علم کوئی سا بھی ہو اس کی گہرائی کو ناپنا محال ہے پتہ نہیں وہ چاروں ماسٹر اپنے مختلف علوم کے ذریعے کیسے کیسے خطرناک رُوپ میں تمہارے سامنے آتے۔ تم نے اچھا ہی کیا کہ ان کے یہاں تک پہنچنے کے ذرائع ختم کر دیئے۔"

"میں بھی یہی سمجھ رہا ہوں لیکن سعید صاحب! دشمن کے خطرات محدود نہیں ہوتے۔ میں مطمئن نہیں ہوں، یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ اسٹوفر اور انجلا کے قاتل تک پہنچنے کے لئے نہ جانے اپنے علوم سے کس طرح فائدہ اٹھائیں گے لہٰذا آئندہ میں بہت محتاط ہو کر قدم اٹھانا چاہتا ہوں۔"

"بے شک محتاط رہنا ضروری ہے۔ یہ تو تم ہی بہتر طور پر سمجھ سکتے ہو کہ ہم ایسے خطرناک دشمنوں سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں۔ فی الحال ہمیں بیل منڈو کے متعلق گفتگو کرنا چاہیئے۔ دیکھو! ہم لاہور سے اس مقصد کے لئے آئے ہیں کہ غیر ملکی جاسوسوں کو بے نقاب کریں اور ان کے پاس جو اہم راز اور خفیہ معلومات ہیں، وہ ہم ان سے حاصل کر سکیں۔ تم نے ٹیلی پیتھی کے ذریعے یہ معلوم کر لیا ہے کہ اسٹوفر کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی بلکہ وہ دوسروں سے ایسی چیزوں کا سودا کر رہا تھا۔ ان سوداگروں میں سے بلیک گائیڈ ہماری گرفت میں آ گیا ہے۔ دوسرا بیل منڈو رہ گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی گرفتاری میں مشکلات پیش نہیں آئیں گی۔ میں پولیس کی ایک بھاری جمعیت لے کر اس کی کوٹھی پر چھاپہ ماروں گا۔ اس سلسلے میں تمہیں تنہا کچھ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

"سعید صاحب! اس بستی پر ریڈ کرنے سے پہلے یہ اچھی طرح سوچ لینا چاہیئے کہ وہاں کا ہر فرد بیل منڈو کا خاص آدمی ہے۔ وہ بظاہر ماہی گیر ہیں لیکن کہیں نہ کہیں آتشیں اسلحہ چھپا کر رکھتے ہوں گے۔ بیل منڈو تک پہنچنے سے پہلے ان سے مقابلہ کرنا ہو گا۔ اتنی دیر میں بیل منڈو کو فرار ہونے کا موقع مل جائے گا۔"

"وہ کس راستے سے فرار ہو گا؟ ہم سمندری راستوں کی بھی ناکہ بندی کر دیں گے۔"

"چلئے میں مان لیتا ہوں کہ آپ اچھی طرح جال بچھا کر اسے گرفتار کر لیں گے۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہے گا کہ ہم ہزار تلاشی کے باوجود اس کی نقلی ناک کے نتھنے میں چھپی ہوئی مائیکروفلم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ اسے گرفتار کرنے کے بعد ہم اس کی خوش فہمی سے اُٹھا کر مائیکروفلم حاصل کر لیں گے۔"

"ہاں۔ تو پھر تم میری اس پلاننگ سے متفق ہو؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا۔

میرا جواب سُن کر انہوں نے حیرانی سے پوچھا "اب اس کی کون سی بات رہ گئی ہے؟"

"سعید صاحب! آپ نے دوسرے پہلو پر غور نہیں کیا ہے۔ میں آپ کو یہ بتا چکا ہوں کہ ماسٹر یوشنے اور اسٹوفر کے درمیان دماغی قائم رہتا تھا۔ اس رابطے کے ذریعے ماسٹر یوشنے نے کبھی بیل منڈو کے دماغ میں بھی جھانک کر دیکھا ہو گا تاکہ اگر مائیکروفلم کا سودا نہ ہو سکے تو دماغی توازن بگاڑ دیا جائے۔

اب آپ یہ سوچیں کہ جب ماسٹر یوشنے کو اسٹوفر اور انجلا کی نہیں ملے گی تو وہ بیل منڈو کو اپنا آلۂ کار بنائے گا اور اس کے دماغ کو کنٹرول میں لیکر اس سے یہ معلومات فراہم کرے گا کہ اسٹوفر اور انجلا ہیں اور کس حال میں ہیں۔ اگر اسے پتہ چل گیا کہ وہ دونوں قتل کر دیئے گئے ہیں تو پھر وہ قاتل کی تلاش میں رہے گا۔ جب آپ بیل منڈو کو گرفتار کرنے کے بعد اس کی ناک سے مائیکروفلم برآمد کریں گے تو ماسٹر یوشنے گا کہ آپ بیل منڈو کے اس گہرے راز تک کیسے پہنچ گئے کہ اس اپنے نتھنے میں مائیکروفلم چھپا رکھی ہے۔ تب وہ آپ کے دماغ میں لے گا۔ آپ ہزار مستقل مزاجی سے کام لیں گے لیکن وہ آپ دماغ کی تہہ میں پہنچ کر فرہاد علی تیمور کی اصلیت کو ڈھونڈ نکالے گا طرح وہ مجھ تک پہنچ جائے گا۔"

سعید احمد میری باتوں کو سُنتے رہے اور حیرانی سے میرا منہ رہے۔ پھر انہوں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "میں ایسی دماغی میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ دماغ کے اندر کتنی وسیع دنیا ہے اور اس میں قدم قدم پر کیسی بھول بھلیاں ہیں، یہ تمہارے جیسے دماغی جنگ میں مصروف رہنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ میں تمہارے لئے کوئی خطرہ کرنا چاہتا لیکن بیل منڈو کو آزاد چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔ وہ اتنی اہم چھپائے بیٹھا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ وہ فلم کیسے حاصل کی جا سکتی ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ آپ پولیس جمعیت لیکر اس کی طرف نہ جائیں۔ میں تنہا وہ فلم حاصل کر لوں گا۔"

"مگر کیسے؟ تم وہاں جاؤ گے تو کیا ماسٹر یوشنے بیل منڈو تمہارے دماغ تک نہیں پہنچے گا؟"

"نہیں۔ اوّل تو میں بدستور شہزاد انور کے رُوپ میں رہوں گا اپنے دماغ سے فرہاد علی تیمور کی شخصیت کو وقتی طور پر بھلا دوں گا

کنٹرول کرنے کی مشق جانتا ہوں۔ اسٹوفر کے کیس میں آپ کو اس ثبوت مل چکا ہے۔ اتنی صلاحیتوں کے باوجود میں دوسری چال گا۔"

"وہ کیا؟" انہوں نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔ "اگر میں خود ہی بیل منڈو کی طرف بڑھوں گا تو شنے اس تاک میں بیٹھا ہو گا کہ کون اس مائیکروفلم تک پہنچتا ہے؟ تک پہنچنے والا ہی اسٹوفر اور انجلا کا قاتل ہو سکتا ہے۔ اس لئے کی طرف نہیں بڑھوں گا۔ کوئی ایسا طریقہ اختیار کروں گا کہ بیل منڈو خود دلچسپی لے۔ اس کے بعد بھی اگر مجھے اُس کے نتھنے سے وہ فلم کا موقع ملا تب بھی میں اسے نہیں نکالوں گا۔ جب وہ رات کو اُسے سیف میں رکھ کر سوئے گا تو میں شہزاد انور لاک بریکر کی حیثیت سے سیف کو کھولوں گا۔ میرا مقصد محض ڈاکہ ڈالنا ہو گا۔ سیف کے اندر کی دولت سمیٹتے وقت مائیکروفلم بھی دولت کے ساتھ میرے بیگ آ جائے گی۔ آپ اس کاٹیج کو میرے لئے مخصوص کر دیں۔ میں چوری یہاں لے آؤں گا اور بیگ کو اُلٹ کر اپنے مطلب کی چیزیں اٹھا لوں مائیکروفلم کو ایک بیکار سی چیز سمجھ کر کونے میں پھینک دوں گا۔ میرے اس پروگرام سے واقف رہیں گے کہ میں کس دن چوری کا کر آ رہا ہوں۔ آپ اسی کے مطابق پولیس کی ایک جماعت لیکر کرتے ہوئے یہاں تک آئیں گے اور میں اپنی جان بچانے کے چوری کا بہت سا مال یہاں چھوڑ کر فرار ہو جاؤں گا۔ پھر آپ بغیر کے اس کاٹیج سے مائیکروفلم حاصل کر لیں گے۔"

میرا اتنا لمبا پروگرام سُن کر انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا تھام لیا پھر تعریفی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "فرہاد! تمہارے کو عجائب گھر میں رکھنا چاہیئے۔ خدا کی قسم! اگر تمہاری یہ پلاننگ ب ہو گئی تو ماسٹر یوشنے کے فرشتے بھی فرہاد علی تیمور کی اصلیت تک نہ پہنچ سکیں گے۔"

وہ بہت دیر تک میری تعریفیں کرتے رہے۔ میں نے اپنی جگہ سے ہوئے کہا۔ "پچھلی رات میں نے پلک تک نہیں جھپکائی ہے۔ آپ کی اجازت دیں اور برائے مہربانی انجلا کی کار کو کہیں دُور چھوڑ کہ ان دونوں کے قتل سے ہمارا کوئی تعلق ظاہر نہ ہو۔"

"تم فکر نہ کرو، ان کے قتل کا تعلق تم سے ہے۔ لیکن میں ایسی رپورٹ تمہارا قتل کرنا قانون کے لئے مفید ثابت ہو گا۔"

"یہ تو میں جانتا ہوں کہ آپ مجھ پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ تفتیش کے دوران ماسٹر یوشنے ہزاروں میل ھا ہوا بیل منڈو کی سوچ کے ذریعے ایک ایک تفتیش کرنے والے پہنچے گا۔ پھر اسے بہت سی باتوں کے ساتھ یہ بات بھی معلوم ہو گی لا کی کار کہاں پائی گئی تھی۔ اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ یہ کار کسی ویرانے میں پائی جائے اور اس گاڑی کا ہم سے کوئی تعلق ظاہر نہ ہو۔"

سعید احمد نے سر ہلا کر کہا۔ "نیند سے تمہاری آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہو رہے ہیں۔ اس کے باوجود تمہارا دماغ کتنی دُور تک سوچ رہا ہے۔ جاؤ اب سو جاؤ۔ تم نے جو کچھ کہا ہے میں اس پر عمل کروں گا۔"

میں کاٹیج کے ایک کمرے میں آکر آرام سے ایک بستر پر لیٹ گیا۔ پھر اپنی عادت کے مطابق تنویمی مشق کے ذریعے اپنے دماغ کو کنٹرول کیا اور اسے ہدایت کی کہ ٹھیک ایک بجے میری آنکھ کھل جائے۔ اس کے بعد میں سو گیا۔

خوب اچھی طرح گہری نیند سونے کے بعد جب ایک بجے میری آنکھ کھلی تو دماغ بہت ہی ہلکا پھلکا سا تھا۔ میں بہت سکون محسوس کر رہا تھا تھوڑی دیر تک میں بستر پر لیٹا سمندر کی لہروں کا مترنم شور سُنتا رہا۔ شور میں ترنم نہیں ہوتا لیکن دل میں سکون ہو اور دماغ میں کسی طرح کی فکر نہ ہو تو شور و غل میں بھی ایک طرح کا ترنم اور ترتیب پیدا ہو جاتی ہے۔ میں نے بستر سے اُٹھ کر کپڑے اُتارے۔ اور ایک انڈرویر پہن کر سمندر کی لہروں سے کھیلنے چلا گیا۔

بہت دیر تک غسل کرنے کے بعد جب کاٹیج کی طرف آیا تو سعید احمد آ چکے تھے۔ وہ میرے لئے کھانا اور بہت سا پھل فروٹ لے کر آئے تھے۔ میں تازہ دم ہو کر کھانے بیٹھ گیا۔ وہ اپنی کارکردگی کی رپورٹ سنانے لگے۔ انہوں نے وہاں سے کئی میل دُور انجلا کی کار ایک ویران سڑک کے کنارے چھوڑ دی تھی۔ صبح دس بجے سوسائٹی کے تھانے میں کسی نے فون کیا تھا کہ مشہور عالم اور پامسٹ اسٹوفر گریس اور اس کی بیٹی کو ان کی کوٹھی میں کسی نے قتل کر دیا ہے۔ سعید احمد نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے اسٹوفر کے کسی خاص گاہک نے فون کے ذریعے اطلاع دی ہے۔ صبح دس بجے اس کے کتنے ہی معتقد اس سے ملنے کے لئے کوٹھی میں جایا کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی نے یہ اطلاع پہنچائی ہو گی۔"

میں نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "ہاں۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ماسٹر یوشنے نے وہاں تک اطلاع پہنچائی ہو۔"

سعید احمد نے کہا۔ "تم چونکانے والی باتیں کرتے ہو۔ لیکن اب میں حیرانی ظاہر نہیں کروں گا کیونکہ میں سمجھ گیا ہوں کہ تم بہت دُور تک سوچنے کے بعد ہی کوئی بات مُنہ سے نکالتے ہو۔ ٹھہرو! میں تمہاری باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جیسا کہ تمام حالات میرے بھی پیشِ نظر ہیں۔ انہیں سامنے رکھ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اسٹوفر نے معمول کے مطابق آج صبح ماسٹر یوشنے سے دماغی رابطہ قائم نہیں کیا ہے۔ ماسٹر یوشنے کو اس کی اور انجلا کی فکر ہو گئی ہو گی۔ تمہارے خیال کے مطابق اُس نے بیل منڈو سے سوچ کے ذریعے معلوم کرنے کی کوشش کی ہو گی کیونکہ وہ دس لاکھ میں مائیکروفلم بیچنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کے اور اسٹوفر

کے درمیان ٹھن گئی تھی۔ پہلے تو ماسٹر یوشے نے یہ سوچا ہو گا کہ بیل منڈ نے ہی اسٹوفر کو قتل کیا ہے۔ لیکن اس کی سوچ پڑھنے کے بعد اُسے اطمینان ہو گیا ہو گا۔

چونکہ اس ملک میں صرف ایک بیل منڈ ہی ایسا آدمی ہے جس کی سوچ کے ذریعے ماسٹر یوشے اصل قاتل تک پہنچ سکتا ہے اس لئے اُس نے بیل منڈ کے دماغ میں ہلچل مچا کر اسے اپنا آلۂ کار بننے پر مجبور کیا ہو گا۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ بیل منڈ جیسا خطرناک فائٹر اور ضدی انسان کس طرح اس کے قابو میں آیا ہو گا۔ یہ تم جیسے ٹیلی پیتھی جاننے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ میری سوچ بس یہیں تک ہے کہ وہ کسی بھی طرح بیل منڈ سے اپنا کام نکالے گا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے تائید کی۔ "جی ہاں۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ ماسٹر یوشے اور اس تنظیم کے دوسرے ماسٹر بہت زیادہ پریشان ہوں گے کیونکہ ان کے دو اہم ممبر بیک وقت قتل کر دیئے گئے ہیں اور وہ یہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ اُن کے قتل میں کسی معمولی قاتل کا ہاتھ نہیں ہے۔ کوئی ایسا شخص وہاں تک پہنچا ہے جو اسٹوفر کی طرح جوڑ توڑ کا ماہر ہو گا۔ بہرحال اب ہمیں اس پہلو پر گفتگو کرنا چاہیئے کہ میں بیل منڈ تک کیسے پہنچ سکتا ہوں یا وہ میری طرف کیسے آ سکتا ہے؟"

سعید احمد دلچسپی لینے کے لئے اپنی کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ میں نے اُن سے پوچھا۔ "سب سے پہلے آپ یہ بتائیں کہ اس بستی کا نام کیا ہے جہاں بیل منڈ اور اس کے آدمی رہتے ہیں؟"

"اس بستی کا نام مونگری ہے۔ وہ بہت ہی مختصر سی ایک ساحلی آبادی ہے۔ ہم قانون کے محافظ اب تک یہی دھوکا کھاتے رہے کہ وہاں صرف غریب مچھیرے آباد ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا وہاں تحقیقات کے لئے پولیس کے آدمی نہیں جاتے ہیں۔ کیا یہ کبھی نہیں سوچا گیا کہ ان مچھیروں کے درمیان بیل منڈ نامی ایک دولتمند ایک شاندار کوٹھی بنا کر کیوں رہتا ہے؟"

سعید احمد نے افسوسناک لہجے میں کہا۔ "ہمارے ملک میں ہر جگہ رشوت کی لعنت پھیلی ہوئی ہے۔ پولیس کا محکمہ بھی اس لعنت سے پاک نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سبھی ایسے ہیں۔ اگر سبھی ایسے ہوتے تو میں بھی رشوت خور ہوتا۔ کیونکہ میں بھی پولیس کا آدمی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ پولیس کے جو بددیانت افسر وہاں گشت کے لئے جاتے ہیں، بیل منڈ سے اچھی خاصی رقم لے کر چپ چاپ چلے آتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ سالی کی رشوت خوری ختم ہو جائے گی۔ اب آپ ایسا کریں کہ اُس پولیس افسر کا پتہ چلائیں جو آجکل وہاں ڈیوٹی پر جاتا ہے۔ آپ مجھے اُس کا نام اور پتہ اور ہو سکے تو اُس کی مصروفیات کے متعلق بتائیں۔ یہ معلوم کرنے کے بعد میں اُس افسر کا سامنا کروں گا، اس سے گفتگو نہیں کروں گا۔ صرف اس کے دماغ تک پہنچوں گا۔ میں اچھی طرح گہری نیند سونے کے بعد تازہ دم ہو چکا ہوں۔ کیا آپ ابھی میرے ساتھ چل کر معلومات حاصل کر سکتے ہیں؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ یہ تو میرا فرض بھی ہے اور تمہاری ملاقات کی وجہ سے اس فرض میں دلچسپی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ میں تمہارے ساتھ وقت مصروف رہنا چاہتا ہوں ـــ چلو اٹھو۔"

ہم دونوں کاٹیج سے باہر آ گئے۔ باہر محکمے کی دو کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں نے ایک ایک کار سنبھال لی اور وہاں سے شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ سعید احمد کی کار آگے تھی اور میں ان کے پیچھے کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس وقت ہم دونوں زبان سے گفتگو نہیں کر سکتے تھے لہٰذا میں نے سوچ کے ذریعے کہا۔

"سعید صاحب! میں آپ سے مخاطب ہوں۔"

انہوں نے خوش ہو کر کہا۔ "ہاں کہو فرہاد! یہ کتنا عجیب سا لگتا ہے کہ ہم دُور ہوتے ہوئے بھی اس طرح گفتگو کرتے ہیں جیسے ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوں۔ کاش! کہ میں بھی یہ علم حاصل کر سکتا۔ لیکن اب میری عمر نہیں ہے کہ میں اتنی کڑی ریاضتوں سے گزر سکوں ـــ ہاں، تو تم کیا کہہ رہے تھے ـــ؟"

"سعید صاحب! میں یہ سوچ رہا ہوں کہ محکمے کی یہ گاڑی میرے پاس نہیں ہونی چاہیئے۔ آپ بھی محکمے کے بہت بڑے افسر ہیں۔ آپ کو بھی میرے ساتھ نہیں رہنا چاہیئے۔ کیا آپ میرے اس خیال سے متفق ہوں گے؟"

"ہاں میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ یہاں محکمے کی جانب سے میری رہائش کا بندوبست ہو جائے گا، تم ہاکس بے کے اس کاٹیج میں رہو گے۔ وہاں تمہیں کوئی روکنے ٹوکنے نہیں آئے گا۔ اب میں تمہارے پلان آف ایکشن کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ اسٹوفر اور انجیلا کے قتل کے سلسلے میں جو تفتیش ہو گی میں اس میں حصہ نہیں لوں گا۔ اس طرح میں بھی ماسٹر یوشے کی خیال خوانی سے محفوظ رہوں گا۔ تمہاری جب مرضی ہو گی مجھ سے رابطہ قائم کر لینا ـــ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک۔ میں ہاکس بے تک آنے جانے کے لئے کرائے پر کسی کار ہی کا انتظام کر لوں گا۔ جب تک وہ مائیکرو فلم آپ کے پاس نہیں آئے گی، اُس وقت تک ہم ایک دوسرے سے لاتعلق رہیں گے۔"

سعید احمد نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "آہ فرہاد! مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں تم سے عشق کرنے لگا ہوں۔ ہائے جُدائی کی یہ گھڑیاں کیسے گزاروں گا، ہجر کی تڑپ کیسے برداشت کروں گا؟"

میں ان کی زندہ دلی پر قہقہے لگانے لگا۔ محکمے کی عمارت کے سامنے پہنچ کر ہم نے گاڑیاں روک دیں۔ پھر گاڑی سے اُتر کر میں نے ان سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"اب میں جا رہا ہوں۔ مونگری بستی میں جس پولیس افسر کی ڈیوٹی ہے، اس سے آپ بہت مختصر گفتگو کریں۔ بیل منڈ اور مونگری بستی کو گفتگو کا موضوع نہ بنائیں۔ بس اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہیں۔ میں آپ کی سوچ کے ذریعے اُس پولیس افسر کے دماغ تک پہنچ جاؤں گا اور خود ہی تمام معلومات حاصل کر لوں گا۔"

انہوں نے مجھے بڑی محبت اور عقیدت سے دیکھا۔ محبت کی شدت سے اُن کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ پھر وہ پلٹ کر عمارت کی طرف چلے گئے۔ میں وہاں سے پیدل چلتا ہوا کوئی ایسی جگہ تلاش کرتا رہا جہاں اطمینان سے بیٹھ کر ڈائریکٹر جنرل سعید احمد کے ذہن میں جھانکتا رہوں۔ کچھ دور جا کر مجھے ایک پارک نظر آیا۔ میں وہاں جا کر سیمنٹ کی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ وہ پارک کبھی بہت خوبصورت رہا ہو گا لیکن اب وہ اُجڑا سا گیا تھا۔ پارک کے مختلف گوشوں اور درختوں کے سائے میں کتنے ہی لوگ بیٹھے نہاری کھا رہے تھے اور چرس کا دم لگا رہے تھے۔ یعنی وہ پارک چرسیوں کا اڈہ بن چکا تھا۔ یہ اچھا ہی ہوا، سب اپنے نشے میں مست تھے۔ کوئی میری طرف دھیان دینے والا نہ تھا۔

میں سر جھکا کر سعید احمد کے دماغ میں جھانکنے لگا۔ اس وقت وہ اپنے کسی جونیئر افسر سے گفتگو کر رہے تھے اور اس سے کہہ رہے تھے۔

"میں لاہور سے یہاں دھرم دیر (بلیک گائیڈ) کے کیس کے سلسلے میں آیا تھا۔ چونکہ اب اسٹوفر قتل ہو چکا ہے اور مجھے مزید معلومات حاصل نہیں ہو سکتیں لہٰذا اس سلسلے میں آپ لوگ اپنے طور پر تفتیش کریں۔ میں ایک ماہ کی چھٹی لے کر اسی شہر میں قیام کرنا چاہتا ہوں۔ آپ میری رہائش کا بندوبست کر دیں۔ اگر میری رہائش کا بندوبست کسی ساحلی علاقے میں ہو تو بہتر ہو گا۔"

جونیئر افسر نے انہیں یقین دلایا کہ وہ کسی ساحلی علاقے میں ان کی رہائش کا انتظام کر دے گا۔ اسی سلسلے میں ساحلی علاقوں کا تذکرہ چھڑ گیا۔ پھر یہ تذکرہ مونگری کی بستی تک پہنچ گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ سعید احمد کتنی ذہانت سے میری مطلوبہ معلومات تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آدھ گھنٹے کی گفتگو میں انہوں نے معلوم کر لیا کہ ان دنوں مونگری کی بستی میں جس پولیس افسر کی ڈیوٹی ہے اُس کا نام نعیم مرزا ہے۔ وہ ہاکس بے تھانے کا انچارج ہے۔ چھوٹے سے تھانے کا انچارج ہونے کے باوجود بہت زیادہ دولتمند ہے۔ ہمارے یہاں اس بات کی تفتیش نہیں کی جاتی کہ ایک معمولی افسر کے پاس کاریں اور کوٹھیاں کہاں سے آ جاتی ہیں۔ وہ اپنی ایک شاندار کوٹھی میں رہتا ہے، اپنی قیمتی کار میں بیٹھ کر دن میں ایک بار تھانے میں جاتا ہے اور فرض خانہ پری کر کے واپس چلا آتا ہے۔ اکثر شام کو شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں اور کلبوں میں نظر آتا ہے۔

سعید احمد جب اپنے جونیئر افسر سے گفتگو کرنے کے بعد وہاں سے اُٹھ کر جانے لگے تو میں نے انہیں سوچ کے ذریعے مخاطب کیا۔

"سعید صاحب! تمام معلومات مجھ تک پہنچ گئی ہیں۔ اب آپ اطمینان رکھیں اور ایک ماہ کی چھٹی لے کر آرام کریں۔ میں ضرورت کے وقت آپ سے رابطہ قائم کر لوں گا۔"

اس کے بعد تھوڑی دیر تک ان سے رسمی گفتگو ہوتی رہی پھر میں نے سوچ کا رابطہ ختم کر دیا۔ جب میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو میرے سامنے وہی اُجڑا ہوا پارک تھا اور وہ لوگ تھے جو اس پارک کی طرح اپنی زندگیوں کو اُجاڑ رہے تھے۔ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ میرے ملک میں نشے کا زہر کس تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے تو لاکھ ذہانت کے باوجود یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس زہر کا توڑ کیسے کیا جائے؟ حکومت کے جتنے ذمے دار محکمے ہیں، باری باری ان محکموں کے افسروں کی اصلاح کی جائے۔ تبھی شاید یہ لعنت ختم ہو گی کیونکہ کوئی زہریلا نشہ ہو یا زہریلی تہذیب ہو، وہ سب اونچے طبقے سے آتی ہیں۔ غریب طبقہ تو صرف اپنی غربت سے مجبور ہو کر معاوضے کے لالچ میں اس زہر کو پھیلانے کے لئے ان کا آلۂ کار بنتا ہے۔ انہیں ایک وقت کی روٹی اور ایک وقت کا نشہ مل جائے تو وہ نشے کی دُھن میں ایک وقت کھا کر دو وقت فاقوں میں گزار دیتے ہیں اور اندر سے کھوکھلے ہوتے رہتے ہیں۔

میں یہ سوچ رہا تھا کہ اسی وقت ایک نوجوان میلے کپڑے پہنے میرے قریب بنچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ کبھی کبھی کن انکھیوں سے میری طرف یوں دیکھتا تھا جیسے کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہا ہو۔ مجھ سے کسی کے دماغ کی بات کیسے چھپی رہ سکتی ہے۔ میں نے معلوم کیا کہ وہ ایک بہت اچھا موٹر مکینک ہے مگر نشہ کرتے کرتے سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا ہے۔ اب وہ موٹر کے کل پُرزوں کو ہاتھ لگاتا ہے تو نقاہت سے اس کے ہاتھ کانپنے لگتے ہیں اور دماغ اس لئے کام نہیں کرتا کہ ہمیشہ نشے کی طلب رہتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ ذرا نشہ مل جائے تو کام کرنے کے قابل ہو جائے گا اور نشہ مل جاتا ہے تو ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ پھر کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا تاکہ وہ دل کی بات کہنے کے لئے کچھ حوصلہ پیدا کرے۔ واقعی میری مسکراہٹ نے اس کے اندر حوصلہ پیدا کیا۔ وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

"میں کام کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ فاقے کرتے کرتے میری یہ حالت ہو گئی ہے۔ گھر میں ایک بوڑھی ماں ہے اور جوان بہن ہے۔ میں نے بیروزگاری کے ہاتھوں تنگ آ کر اپنے متعلق سوچنا چھوڑ دیا ہے مگر جوان بہن کے بارے میں کیسے نہ سوچوں؟ اگر میں نے عزت و آبرو سے اُسے دُلہن بنا کے رخصت نہ کیا تو نہ جانے کیا ہو گا۔ میں غریب ہوں اور بہت سے غریبوں کے گھروں میں جھانک کر دیکھ چکا ہوں۔ جو لڑکیاں بڑی عمر تک بیاہی نہیں جاتیں پہلے اُن کی آنکھوں سے حیا مرتی ہے پھر خاندان کی عزت کا خیال ذہن سے نکل جاتا ہے۔ وہ خود کو بے مصرف سمجھتی ہیں اور کوڑے کرکٹ کی طرح گھر کے دروازے سے باہر آ جاتی ہیں۔ پھر راستے پر ہوس کی جھاڑو لگانے والے انہیں بٹور کر لے جاتے ہیں۔ میں ڈرتا ہوں

کہ کہیں میرے گھر کا دہ گھر ابھی سڑک پر نہ آجائے۔"

میں نے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا: "نشے کی ایک خوبی یہ ہے کہ انسان ترنگ میں آکر بڑے دارباتیں کرتا ہے۔ جیساکہ تم کر رہے ہو۔ تم نوجوان ہو اگر واقعی غیرت مند ہوتے تو اپنے ہنر کو چمکانے کی کوشش کرتے۔ میں نے بہت عرصہ پہلے تمہیں اسی شہر میں ایک موٹر مکینک کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ کیا یہ غلط ہے کہ تم اپنی ضرورت سے زیادہ کما لیا کرتے تھے؟"

یہ بات سنتے ہی اس نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ میں نے اس سے جھوٹ کہا تھا کہ میں اسے ایک موٹر مکینک کی حیثیت سے بہت پہلے دیکھ چکا ہوں، یہ سب تو میں نے اس کی سوچ کے ذریعے معلوم کیا تھا۔ اس نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

"آپ مجھے بے غیرت نہ سمجھیں، میری بیماری نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا ہے کہ اب میں کوئی کام کر سکوں۔"

"تمہاری بیماری نے نہیں، تمہارے نشے نے تمہیں تباہ کیا ہے۔ تم شاید مجھ سے کسی قسم کی مدد طلب کرنے آئے ہو مگر دو غلے بن کر آئے ہو۔ اس وقت تمہارے دماغ میں نشے کی طلب ہے اور زبان سے اپنی بہن کی جوانی کا المیہ پیش کر کے مجھے متاثر کرنا چاہتے ہو۔ کیا یہ شرم کی بات نہیں ہے کہ ایک بہن جو اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہے، کئی وقت کے فاقوں کے باوجود گھر کی چاردیواری میں بیٹھی ہے، تم سربراہ اس کا تذکرہ ایسے کرتے ہو جیسے اسے چارہ بنا کر اپنے نشے کی طلب پوری کرنا چاہتے ہو؟"

میری بات سنتے ہی وہ شرمندگی سے پہلو بدلنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ "میں کیا کروں؟ میں بے غیرت نہیں ہوں۔ لیکن یہ آدمی احساس دلا رہا ہے کہ میں نشے کی طلب میں بے غیرت بن رہا ہوں۔ مگر کیا کروں؟ صبح سے ایک کش لگانے کے لئے اپنے اندر کئی بار مر چکا ہوں۔ اگر جلد ہی مجھے ایک پڑیا نہ ملی یا چرس کا ایک سگریٹ نہ ملا تو میں سچ مچ مر جاؤں گا۔ کیا میں مر جاؤں؟ لیکن مرنے کے بعد یہ زندگی نہیں ملے گی، پھر یہ نشے کی جنت آباد نہیں ہوگی۔ ہائے کیسا سُرور آتا ہے، ایک کش لگاتے ہی مُردہ جسم میں جان آجاتی ہے۔ میں اس جسم کو مار دوں یا غیرت کو مار دوں؟ میرا پڑوسی دینو اپنی غیرت کو مار چکا ہے۔ وہ اپنی جوان بیٹی کو کہیں لے جاتا ہے اور بڑی بے فکری سے تین وقت کی روٹیاں کھاتا ہے۔ اس کی جیب میں ہر وقت چرس کے سگریٹ ہوتے ہیں۔ وہ تو مجھے بھی یہی مشورہ دیتا ہے۔ جب میری جیب میں پیسے ہوتے ہیں یا چرس کا ایک سگریٹ کہیں سے مل جاتا ہے تو مجھے دینو کے اس مشورے پر بڑا غصہ آتا ہے۔ کمینہ میری بہن کے بارے میں ایسی باتیں کرتا ہے۔ لیکن جب صبح سے شام تک نشے کے لئے میرا بدن ٹوٹنے لگتا ہے اور میں مرنے لگتا ہوں تو دینو مجھے فرشتہ نظر آتا ہے اور بہن گھر میں پڑا ہوا کباڑ نظر آتی ہے جسے کسی کباڑی کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے تو چرس کے کتنے ہی سگریٹ اور کتنے وقت کی روٹیاں نصیب ہو جائیں گی۔ اس طرح ماں بھی بڑھاپے میں فاقے نہیں کرے گی۔ بڑھیا ماں پہلے مجھے گالیاں دے گی پھر پیٹ بھرے گا تو دعائیں دے گی۔ بُرے ہوئے حالات کے تحت انسان کی دوغلی زبان سے اسی طرح باری باری گالیاں اور دعائیں نکلتی ہیں۔"

وہ سوچ رہا تھا اور میں سُن رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "فرہاد علی تیمور! تم جو انسانی دماغ کی دنیا کو کھنگالتے ہو، کبھی کبھی دنیا میں بھی قدم رکھو جہاں غربت اور بھوک ایک بھائی کو اپنی بہن کا دلال بنا دیتی ہے۔ ٹیلی پیتھی صرف ہنگاموں کا نام نہیں ہے۔ یہ ایسا علم ہے جس کے ذریعے زنگ آلود دماغوں کو مانجھ کر چمکایا جا سکتا ہے۔ کیا تم اصلاحی کاموں کے لئے قدم نہیں اٹھا سکتے؟"

یہ خیالات میرے دماغ میں آئے تو میں سوچنے لگا کہ کس طرح اس نوجوان کو نشے کی لت سے بچایا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ میں اس کے دماغ میں جھانک کر دیکھوں کہ نشے کی طلب اسے کس طرح پریشان کرتی ہے اور میں رہ رہ کر اس کے دماغ کو پڑھ رہا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس کے جسم کو جو تکلیف پہنچتی ہے، اسے اس کا دماغ محسوس کرتا ہے اور اسے یہ سمجھاتا ہے کہ اگر چرس مل جائے تو اس کا کش لگاتے ہی یہ تکلیف دُور ہو جائے گی یعنی اس مریض کا معالج خود اس کا دماغ ہے جو اس کے لئے دوا تجویز کرتا ہے۔ اگر یہ معالج کوئی دوسری دوا تجویز کرے اور اسے اطمینان دلائے کہ وہ شفا پا رہا ہے اور اس کے جسم میں جو درد اور اینٹھن ہے، وہ رفتہ رفتہ دوسری دوا کے استعمال سے ختم ہوتی جا رہی ہے تو شاید یہ نوجوان اس طرح راہِ راست پر آجائے گا۔ اگر نشے کی طلب میں ذرا بھی کمی ہوئی تو اس کی غیرت مُردہ نہیں ہو پائے گی۔ یہ سوچ کر میں نے اس سے کہا۔

"اس دنیا میں ہر مرض کا علاج ہو جاتا ہے۔ تم بھی نشے کے مریض ہو۔ کیا تم نے کبھی اس مرض کو دُور کرنے کی کوشش کی ہے؟"

"ہاں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں۔ لیکن نشے کی طلب اتنی شدید ہوتی ہے کہ علاج کرنا حماقت نظر آتا ہے۔"

"یہ بُری بات ہے۔ انسان کو مثبت پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے۔ اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو تو میں تمہاری ضرورتیں بھی پوری کروں گا اور تمہاری نشے کی لعنت کو بھی ختم کر دوں گا۔"

اس نے احسان مندی سے کہا: "اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ میری ضرورتیں بھی پوری ہو جائیں گی اور نشے کی طلب سے بھی نجات مل جائے گی۔ آپ کا احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

میں نے اپنی جیب سے سو سو کے پانچ نوٹ نکالے۔ پانچ سو روپے دیکھ کر اس کا منہ اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ للچائی نظروں سے ان نوٹوں کو دیکھنے لگا اور سوچنے لگا۔

"یا خدایا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ پیسے ملتے ہی میں چرس کے سگریٹوں کا پورا پیکٹ خریدوں گا۔ پھر اپنی بہن کے جوڑے کے لئے نیا کپڑا خریدوں گا۔ ماں جی کتنے دنوں سے بیمار ہیں، کسی اچھے ڈاکٹر سے ان کا علاج کراؤں گا۔ گھر والے تین وقت کی روٹیاں کھائیں گے اور میں کئی دنوں تک بے فکری سے سگریٹ کے کش لگاتا رہوں گا۔"

میں نے مسکرا کر بڑے بڑے نوٹ اسے دکھاتے ہوئے کہا: "میں ایک شرط پر تمہیں یہ روپے دوں گا۔"

وہ دونوں ہاتھوں کو اس طرح ملنے لگا جیسے نوٹوں کو جھپٹنے کے لئے بے چین ہو۔ اس نے جلدی سے کہا: "مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔ میں آپ کا خادم ہوں۔ آپ جو کہیں گے وہ کروں گا۔"

"تم میرے خادم نہیں، میرے بھائی ہو اور تمہاری بہن میری اپنی بہن ہے۔ اگر تم میری ایک بات مان جاؤ گے تو بڑی دھوم دھام سے بہن کی شادی کر سکو گے، تمہاری جسمانی قوت بھی بحال ہو جائے گی اور دوبارہ موٹر مکینک کی حیثیت سے ایک خوشگوار زندگی گزار سکو گے۔"

"مجھے منظور ہے، بتائیے آپ کی شرط کیا ہے؟"

"شرط یہ ہے کہ کل صبح تک تم چرس کو ہاتھ نہ لگانا۔ میں صرف سولہ گھنٹے تک تمہیں روک رہا ہوں۔ کیا یہ پانچ سو روپے لے کر تم صرف سولہ گھنٹے تک نشے کی کمی برداشت نہیں کر سکتے؟"

اس نے [illegible] ہے۔ کبھی کبھی مجبوری کی حالت میں میں نے تمام دن نشے کے بغیر گزار دیا ہے۔ میں آپ سے وعدہ نبھاؤں گا اور سولہ گھنٹے تک صبر کروں گا۔"

میں نے پانچ سو روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اس نے روپے لے کر میرے گھٹنوں کو پکڑ لیا اور بولا: "میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ خدا کی قسم! میں صبح تک چرس کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"محمد اسلم۔"

"اچھا محمد اسلم! اب تم یہاں سے جاؤ۔ سب سے پہلے اپنے لئے اور اپنی بہن کے لئے کپڑے خریدو، گھر کے لئے راشن لو اور کل صبح تک اپنے دماغ میں نشے کے خلاف لڑتے رہو۔ خدا تم پر رحم کرنے والا ہے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بڑے ادب سے مجھے سلام کرتے ہوئے رخصت ہو گیا۔ میں پارک سے نکل کر سڑک پر آیا اور وہاں سے ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اس کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاں طبیبی تھانے کا انچارج نعیم مرزا رہتا تھا۔ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آرام سے بیٹھنے کے بعد میں اسلم چرسی کے دماغ کو پڑھنے لگا۔ وہ شہر کے کسی فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ چلتے وقت اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے کیونکہ اس کا دماغ ڈگمگا رہا تھا۔ کبھی نشے کی طرف اور کبھی راشن کپڑے کی طرف — اس کی ایک سوچ کہہ رہی تھی کہ اپنے محسن کے ساتھ کیا ہوا وعدہ نبھانا چاہیے۔ سب سے پہلے کپڑا اور راشن خرید کر گھر پہنچنا چاہیے اور اس کی منفی سوچ کہہ رہی تھی۔

"وہ پانچ سو روپے دینے والا کوئی احمق تھا۔ اس نے اتنی بڑی رقم دے کر میرا پتہ بھی نہیں پوچھا۔ اب اگر میں چرس خرید لوں تو کیا وہ مجھے دیکھنے یا پکڑنے آئے گا؟"

یہ سوچتے ہی اس کے قدم رُک گئے۔ اس کے دائیں طرف جو ایک گلی جاتی تھی، اس کے آخری سرے پر بسم اللہ پان شاپ تھی۔ نام اللہ کا تھا اور اس عظیم نام کے سائن بورڈ کے پیچھے چور دروازے سے چرس کے سگریٹ ملتے تھے۔ وہ گلی کی طرف مُڑ گیا۔ جب وہ گلی میں داخل ہوا تب میں نے اس کی مثبت سوچ میں کہا۔

"میں کہاں جا رہا ہوں۔ مجھے یہ سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنی رحمتیں نازل کرتا ہے تو وسیلے کے طور پر کسی انسان کو فرشتہ بنا کر بھیجتا ہے۔ شاید اسی لئے اس فرشتے نے میرا پتہ بھی نہیں پوچھا۔ چپ چاپ اللہ کے دیئے ہوئے پانچ سو روپے مجھے دے کر چلا گیا۔ اگر میں صرف سولہ گھنٹے صبر کر لوں تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی؟"

یہ سوچتے ہی اس کے قدم رُک گئے۔ اسی وقت اس کی منفی سوچ نے کہا: "بیوقوف! میخانے کے دَر پر آکر توبہ توڑتا ہے۔ جب آ ہی گیا ہے تو سگریٹ خرید لے۔ ٹھیک ہے سولہ گھنٹے تک کش مت لگانا۔ لوگ بینکوں میں آئندہ ضرورت کے لئے پیسے جمع کرتے ہیں تو جیب کے لاکر میں صبح کے لئے سگریٹ محفوظ کر لے۔ تیرا وعدہ بھی رہے گا اور سگریٹ بھی تیری تسلی کے لئے موجود رہیں گے۔"

وہ پھر بسم اللہ پان شاپ کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے اس کی مثبت سوچ میں کہا: "اگر اللہ تعالیٰ میری مدد کرنا ہی چاہتا ہے تو وہی مجھے بسم اللہ پان شاپ تک جانے سے روکے گا۔"

میں نے اس کی مثبت سوچ میں یہ کہتے ہی اچانک ایک جھٹکے سے پھر کہا: "ارے باپ رے، میرے گھٹنے کانپ رہے ہیں، میں گر رہا ہوں......"

میری سوچ نے اتنی قوت سے کہا کہ اچانک ہی اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ سوچ کی قوت یا دماغ کی قوت [illegible] قدم نہیں چل سکتا۔ پھر وہ سوچ کے خلاف کیسے چل سکتا تھا۔ اسی لئے بدحواس ہو کر گر پڑا۔ اس وقت اس کی حالت عجیب سی تھی۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا کیونکہ گرنے سے پہلے اسے وارننگ مل چکی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ کو اسے راہِ راست پر لانا مقصود ہے تو وہ چرس کے اڈے تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اور وہ نہ پہنچ سکا، لڑکھڑا کر گر پڑا۔ ایسی صورت میں اس

کے دل پر دہشت کیسے طاری نہ ہوتی ؟ اس کے دل میں ایمان کیسے روشن نہ ہوتا ؟ وہ توبہ توبہ کرتے ہوئے اُٹھ گیا۔ پھر تیز قدموں سے چلتا ہوا اس گلی سے باہر آگیا۔ اب وہ مستقل مزاجی سے سوچ رہا تھا کہ ان پانچ سو روپوؤں سے صرف وہی چیزیں خریدے گا جو زندگی کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ چرس زندگی کے لئے نہیں' موت کے لئے ضروری ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔

"اس اجنبی فرشتے نے مجھے صرف صبح تک صبر کرنے کے لئے کہا ہے۔ لیکن اس غائبانہ ٹھوکر سے مجھے عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ میں کوشش کروں گا کہ نشے کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاؤں۔ اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہے اسی لئے میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوجاؤں گا۔"

وہ بڑی مستقل مزاجی سے سوچ رہا تھا۔ لہٰذا میں کچھ دیر کے لئے اس کی طرف سے مطمئن ہوگیا کہ وہ میرے پانچ سو روپے ضائع نہیں کرے گا۔ ٹیکسی تیز رفتاری سے چلتی ہوئی منزلِ مقصود تک پہنچ گئی۔ میں ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر باہر آیا' بل ادا کیا پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کوٹھی کی طرف جانے لگا جہاں انسپکٹر نعیم مرزا رہتا تھا۔ میں کوٹھی کے سامنے پہنچ گیا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ نعیم مرزا موجود ہے یا نہیں ؟ چونکہ وہ میرے لئے مکمل اجنبی تھا اس لئے یہ ضروری تھا کہ اس سے دماغی رابطہ قائم کرنے کے لئے اس سے براہِ راست ملاقات کرتا یا کسی دوسرے شخص کو واسطہ بنا کر اس کے دماغ تک پہنچتا۔ اس کے لئے مجھے بہت دیر تک کوٹھی کے سامنے وقت ضائع کرنا پڑا۔ قریب ہی ایک پٹھان کا ہوٹل تھا۔ میں وہاں بیٹھ کر چائے پیتا رہا اور سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔

شام ہو رہی تھی۔ رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ پاؤں پھیلا رہا تھا۔ اسی وقت میں نے دیکھا' کوٹھی سے ایک موٹی سی اور بھدی سی عورت باہر آرہی تھی۔ میں ہوٹل سے نکل کر فٹ پاتھ پر آگیا۔ اس موٹی عورت کا رُخ مارکیٹ کی طرف تھا۔ میں بھی آہستہ آہستہ اسی طرف جانے لگا۔

وہ چھوٹی سی مارکیٹ تھی۔ لیکن وہاں بڑے لوگوں کے لئے بڑی مہنگی چیزیں فروخت ہوتی تھیں۔ وہ موٹی سی عورت ایک دکان پر پہنچ کر میک اپ کا سامان خریدنے لگی۔ وہ اتنی موٹی اور بھدی تھی کہ اس پر میک اپ کی تہہ چڑھنے کے بعد کچھ اور موٹی ہوجاتی۔ وہ اپنی جوانی میں خوبصورت رہی ہوگی۔ لیکن دولت کی افراط نے اسے عجیب ٹیڑھے میڑھے انداز میں پھیلا دیا تھا۔ وہ سامان خریدتے وقت بار بار آئینے میں دیکھتی تھی اور اپنے حُسنِ جہاں سوز کو دیکھ کر مُسکرانے لگتی تھی۔ پھر اسی آئینے میں اُس نے مجھے دیکھا۔ ہم دونوں کی نظریں ٹکرائیں تو اس کی نظریں مجھ پر جم کر رہ گئیں کیونکہ میں فوراً ہی اس کی سوچ میں کہہ رہا تھا۔

"ہائے کتنا خوبرو نوجوان ہے۔ مجھ میں اب بھی اتنی کشش ہے کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ کاش کہ میں پچاس برس کی نہ ہوتی۔"

اس کے دماغ میں یہ سوچ پیدا ہوتے ہی وہ جھلا کر اپنے [illegible] سوچنے لگی "میں پچاس برس کی تو نہیں ہوں۔ میں اپنی عمر کا غلط حساب کیسے لگا رہی ہوں۔ ابھی تو میں پینتالیس برس کی ہوں اور پچھلے [illegible] نے اپنی بیسویں سالگرہ منائی ہے۔ مجھ سے ملنے والے خود [illegible] کہ بے فکری اور خوشحالی نے مجھے ایسا صحتمند بنا دیا ہے [illegible] سے بھی کم لگتی ہوں۔ لوگوں کو اس لئے بھی میری کم عمری کا یقین [illegible] ہے کہ میرا شوہر نعیم مرزا مجھ سے دس برس چھوٹا ہے۔ کیونکہ شادی سے پہلے میں نے اسے اپنی عمر چودہ برس بتائی تھی۔ جب شوہر کم عمر ہو تو لوگ خود ہی حساب لگا لیتے ہیں کہ بیوی کی عمر کتنی کم ہوگی۔"

وہ کبھی لپ اسٹک کے شیڈ پسند کرتی رہی اور کبھی آئینے میں اپنا [illegible] دیکھ کر اپنی عمر کے متعلق سوچتی رہی۔ مجھے بھلا اس کی عمر سے کیا لینا تھا [illegible] دکان سے باہر آگیا۔ ایسی عورت سے عشق کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو[تا] تھا جو مشرق مغرب شمال جنوب کی طرف یکساں پھیلی ہو۔ میرا مقصد حل ہوچکا تھا۔ نعیم مرزا سے دماغی رابطہ قائم کرنے کے لئے میں نے اس کی [بیوی] ٹرک نما بیوی کو واسطہ بنا لیا تھا۔ وہاں سے میں پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر دلشاد میں آیا اور وہاں ایک کمرہ کرائے پر اپنے لئے حاصل کرلیا۔

میں ہاکس بے کی طرف واپس نہیں جانا چاہتا تھا' اس نے کمرے میں آکر میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر بستر پر آرام سے لیٹ کر اس موٹی عورت کی سوچ کو پڑھنے لگا۔ وہ شاپنگ کے بعد [اپنی] کوٹھی میں آگئی تھی اور اپنے کمرے میں پہنچ کر اپنے جسم کی چربی پگھلانے کے لئے ورزش کر رہی تھی۔ نعیم مرزا موجود نہیں تھا اس لئے میں نے اس کی سوچ سے رابطہ ختم کر دیا اور دماغ کی اسکرین پر اسلم کو دیکھنے لگا۔ وہ بہت سارے کپڑے خرید کر اپنے گھر پہنچ گیا تھا اور اپنی ماں کو بتا رہا تھا کہ کس طرح ایک فرشتے سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی ماں مجھے [نہیں] جانتی تھی لیکن مجھے دُعائیں دے رہی تھی۔ اس کی بہن نئے کپڑے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی اور اسلم بار بار عہد کر رہا تھا کہ اب وہ نشے کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ آج سے پہلے ان کے گھر میں ایسی عید کبھی نہیں آئی تھی۔

میں سوچنے لگا کہ اس دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں ہے [illegible] اگر مستقل مزاجی سے کوشش کرے تو اپنے ذہن اور اپنی سوچ کو بھی بدل سکتا ہے۔ وہ میرے لئے بھی عید کا موقع تھا کیونکہ میں نے اپنی [illegible] کے ذریعے ایک خاندان کو تباہ ہونے سے بچا لیا تھا۔

ایک گھنٹے بعد جب میں نے اس موٹی عورت کے ذہن میں جھانک کر دیکھا تو وہ نعیم مرزا سے گفتگو کر رہی تھی بلکہ اس سے جھگڑا کر رہی تھی۔ اس بات کی شکایت تھی کہ نعیم مرزا پولیس انسپکٹر ہونے کے باوجود بھی لمبے ہاتھ کیوں نہیں مارتا۔ آمدنی نہیں بڑھے گی تو نئے ماڈل کی کار کہاں سے آئے گی۔ نعیم مرزا نے اسے جواب دیا۔

"نوشابہ! تم ہمیشہ یہی جھگڑا لے کر بیٹھ جاتی ہو۔ ہمیں مونگری کی بستی سے اتنی رقم ملتی ہے کہ کہیں اور ہاتھ مارنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ دانشمندی یہی ہے کہ ایک جگہ سے بڑا ہاتھ مارا جائے اور باقی دوسری جگہوں پر ایمانداری سے کام کیا جائے۔ مجھے اپنے سروس ریکارڈ کا بھی تو خیال کرنا پڑتا ہے۔"

"تم قانون کے محافظ ہو۔ مگر کبھی قانون کی گرفت میں آؤ گے تو یہ پولیس کی ملازمت تمہارے کسی کام نہیں آئے گی۔ یہ جو تمہاری اوپری آمدنی ہے یہی ہمارے کام آئے گی۔ ریٹائر ہونے کے بعد حکومت تمہیں کوئی خزانہ تو نہیں دے دے گی۔ بیل منڈو کا احسان مانو کہ اس نے ہماری کایا پلٹ دی ہے۔"

"نوشابہ! تم نہیں سمجھتی ہو کہ حالات کس طرح بدل جاتے ہیں۔ ہماری کایا پلٹنے والا بیل منڈو آج خود ہی اُلٹ پلٹ کر رہ گیا ہے۔ آج صبح آٹھ بجے سے اس کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے۔"

"کیا واقعی ؟" نوشابہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں۔ آج صبح اچانک ہی وہ پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگا۔ اس کے باڈی گارڈ نے مجھے بتایا کہ وہ پہلے بڑی خاموشی سے اپنے سر کو جھٹکتا رہا۔ باڈی گارڈ نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو وہ پریشان ہوکر کہنے لگا۔

"پتہ نہیں میرے دماغ میں کیسی کیسی باتیں آرہی ہیں۔ میں ان باتوں کو دماغ سے جھٹکنا چاہتا ہوں۔ لیکن میرے مزاج اور میری مرضی کے خلاف عجیب سی سوچیں اُبھر رہی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ بہت دیر تک اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا اور اپنے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر چیختا رہا کہ اس کے دماغ میں یہ کیسی گڑبڑ ہو رہی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی حالت بگڑنے لگی۔ وہ کمرے کی چیزیں اُٹھا کر اِدھر اُدھر پھینکنے لگا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا۔

"میں کبھی یہ یقین نہیں کرسکتا کہ مجھ پر جنات کا سایہ پڑ گیا ہے۔ میں اپنے دماغ کا مالک ہوں مگر نہ جانے کیسے اس دماغ کی چولیں ہل رہی ہیں۔"

وہ برابر جھنجلا کر کمرے کی چیزوں کو توڑتا پھوڑتا رہا۔ اس کے باڈی گارڈ نے اسے روکنے کی کوشش کی تو بیل منڈو نے اسے اُٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دیا۔ اس کے بعد اس نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ دو گھنٹے بعد جب میں وہاں پہنچا تو اس کے کمرے میں خاموشی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو اُس نے غرّا کر کہا۔

"چلے جاؤ یہاں سے۔ مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔"

میں نے دوبارہ دستک دیتے ہوئے کہا۔ "دروازہ کھولو۔ میں انسپکٹر نعیم مرزا ہوں۔"

میرا نام سُنتے ہی اُس نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے کمرے میں پہنچ کر دیکھا' اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور کپڑے پھٹے ہوئے تھے' آنکھیں وحشت زدہ تھیں۔ اُس نے دروازہ بند کرکے ایک ایزی چیئر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مسٹر نعیم! میں بہت پریشان ہوں۔"

"میں سُن چکا ہوں اور اسی لئے خیریت دریافت کرنے آیا ہوں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "مجھے خود پر بڑا ناز ہے۔ میں اپنے مقابل آنے والی بڑی سے بڑی قوت کو کچل کر رکھ سکتا ہوں لیکن اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ کوئی اَن دیکھی قوت میری صلاحیتوں کا مذاق اُڑا رہی ہے اور مجھے اپنا محکوم بنانا چاہتی ہے۔ بیل منڈو حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ فخر حاصل رہا ہے کہ میں نے کبھی کسی کی برتری تسلیم نہیں کی۔ لیکن آج زندگی میں پہلی بار میں کسی کے سامنے جُھک گیا ہوں۔ جھکنے کے باوجود میں اس کی برتری تسلیم نہیں کرسکتا۔ کیونکہ وہ بُزدل ہے۔ مرد کی طرح سامنے آکر مقابلہ نہیں کرتا' دماغ کے بے شمار پردوں میں چھپ کر عورتوں کی طرح مجھے پریشان کر رہا ہے۔ یہ کوئی مردانگی تو نہیں ہے۔ جو لوگ چھپ کر حملہ کرتے ہیں' ان کے سامنے وقتی طور پر مجبور ہونا پڑتا ہے لہٰذا میں نے اس اَن دیکھی قوت سے کہہ دیا ہے کہ ابھی مجھے ذہنی سکون کی ضرورت ہے' اس لئے میں اس کی بات مان لیتا ہوں۔"

"کیا وہ اپنی کوئی بات منوا رہا ہے ؟"

"ہاں۔ اسٹوفر نامی ایک شخص سے ایک اہم سودا ہو رہا تھا۔ وہ اور اس کی بیٹی سوسائٹی کے علاقے میں رہتے ہیں۔ آج صبح آٹھ بجے سے کوئی میرے دماغ میں بیٹھا کہہ رہا ہے کہ میں ان کی خیریت معلوم کروں۔ میں نے اس کے حکم سے انکار کیا تو وہ میرے دماغ میں ہلچل پیدا کرنے لگا۔ میں بیان نہیں کرسکتا کہ میری کیا حالت ہوگئی تھی۔ کاش کہ وہ ہلچل مچانے والا اُلو کا پٹھا میرے سامنے ہوتا۔ لیکن میرا غصہ اور میری جھنجلاہٹ کام نہ آئی۔ تب میں نے مجبور ہوکر سوچا کہ فی الحال مجھے اس کی بات مان لینی چاہیئے۔ جب میرا دماغ پُرسکون ہوگا تب پھر میں اس اَن دیکھے شیطان سے نمٹنے کا راستہ تلاش کروں گا۔ میں مر سکتا ہوں لیکن کسی کے سامنے ہمیشہ کے لئے جُھک نہیں سکتا۔"

"تو پھر آپ نے ان دونوں کی خیریت معلوم کی ہے ؟"

"ہاں ـــــ سوسائٹی میں جو میرے آدمی ہیں' ان میں سے ایک نے اس کوٹھی میں جاکر معلوم کیا ہے۔ وہ دونوں باپ بیٹی مُردہ پڑے ہیں۔ مسٹر نعیم! میں جس اَن دیکھے شیطان کا ذکر کر رہا ہوں' وہ ٹیلی پیتھی کا ماہر ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ دماغوں پر حکومت کرتا ہے۔ اس نے میری سوچ کے ذریعے معلوم کرلیا ہے کہ اسٹوفر اور اس کی بیٹی کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔"

میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "کیا قاتل کا پتہ چل گیا ہے ؟"

"نہیں۔ وہ نادیدہ شیطان اب مجھے حکم دے رہا ہے کہ میں قاتل کا پتہ چلاؤں۔ میں نے دوسری بار اس کے حکم سے انکار کیا تو وہ پھر میرے

دماغ میں کھلبلی پیدا کرنے لگا۔ میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ چھپ کر حملہ کرنے والا مجھے اعصابی طور پر کمزور بنا دے گا۔ فی الحال مجھے اس کی بات ماننی ہی پڑے گی۔ اس سلسلے میں آپ ہی میرے کام آ سکتے ہیں......"

"جی ہاں۔ میں سمجھ گیا۔ اس قتل کے سلسلے میں جو تفتیش ہوتی رہے گی میں اس کی رپورٹ پڑھتا رہوں گا۔ قاتل کا سراغ ملتے ہی میں آپ کو اطلاع دوں گا۔"

بیل منڈو نے اٹھ کر اپنا سیف کھولا اور اس میں سے پانچ ہزار روپے نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ اس کام کا معاوضہ ہے کہ آپ جلد از جلد اس قاتل تک پہنچنے کی کوشش کریں اور مجھے اس نادیدہ شیطان سے نجات دلائیں۔"

انسپکٹر نعیم مرزا یہ تمام باتیں اپنی بیگم نوشابہ کو سنا رہا تھا۔ نوشابہ نے خوش ہو کر کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ آج ہمیں پھر پانچ ہزار کی آمدنی ہوئی ہے۔ نکالئے پانچ ہزار، میں انہیں صبح ہی بینک میں جمع کر دوں گی۔"

نعیم مرزا نے اپنے بریف کیس سے رقم نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

"تمہیں تو صرف بینک بیلنس بڑھانے کی فکر ہوتی ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہمارے گھر کی عورتیں اگر رشوت کی رقم قبول نہ کریں تو مرد کبھی اس لعنت میں گرفتار نہ ہوں۔ ہم ڈیوٹی پر جا کر یہی سوچتے ہیں کہ ہم اپنی عورت کو خوش نہ کریں اور اس کی تمام جائز ضرورتوں کو پورا نہ کریں تو ہمارے لئے وہ ہمارے گھر کو جنت نہیں بنا سکے گی۔ وہ ... اپنی تنگدستی اور مفلسی کا رونا روتے ہوئے ہمیشہ لڑتی جھگڑتی رہے گی اور گھر کی جنت کو جہنم بنا کر رکھ دے گی، جیسا کہ تم کرتی ہو۔"

نوشابہ کے ہاتھوں میں پانچ ہزار روپے تھے جب ہاتھوں میں اچھی خاصی رقم ہو تو عورت اپنے شوہر کے طعنے اور گالیاں برداشت کر لیتی ہے۔ وہ مسکرا کر بولی۔

"آپ فضول باتیں نہ کریں۔ میں آپ کے ہی بچوں کے مستقبل کے لئے ایسا کرتی ہوں۔"

"لیکن نوشابہ، میرا مستقبل تباہ ہو رہا ہے۔ میں ایک دیانت دار پولیس افسر نہیں رہا۔ اگر کسی روز قانون کے ہتھے چڑھ گیا تو بیل منڈو مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دے گا۔ اب یہی دیکھو کہ خواہ مخواہ ایک باپ بیٹی کے قتل کے سلسلے میں مجھے دلچسپی لینی ہوگی جبکہ یہ میرے علاقے کا کیس نہیں ہے۔ اس طرح دوسرے آفیسر شبہ کرنے لگتے ہیں کہ کسی دوسرے تھانے کا انچارج ان معاملات میں کیوں دلچسپی لے رہا ہے۔ بہرحال رقم تو لے ہی چکا ہوں۔ مجھے کسی نہ کسی طرح اس قاتل تک پہنچنا ہی ہوگا۔"

یہ کہہ کر وہ لباس بدلنے کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں اس سے بہت دور ہوٹل دلشاد کے ایک کمرے میں آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ اور یہ سوچ رہا تھا کہ قاتل میں ہوں۔ وہ مجھ تک پہنچنے کے لئے ابھی کئی راتیں جاگتا رہے گا اور پریشانیوں میں مبتلا رہے گا۔ رشوت کے وہ پانچ ہزار روپے پانچ ہزار کانٹوں کی طرح اسے چبھتے رہیں گے۔

میں تھوڑی دیر تک اپنے بستر پر خاموشی سے لیٹا رہا اور اپنے حالات زندگی پر غور کرتا رہا۔ کیسی ہنگاموں سے بھرپور زندگی ہے۔ میں ہمیشہ اس کا خواہشمند تھا اور یہ خواہش پوری ہو رہی تھی۔ میں ایسی زندگی سے مطمئن تھا لیکن کوئی نہ کوئی خطرہ میرے آس پاس منڈلاتا رہتا تھا۔ ان دنوں ماسٹر لوشے ایک آسیب کی طرح میرے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ آپ یقین کریں کہ آپ ٹی وی اور سینما کے اسکرین پر اتنی دلچسپ فلمیں نہیں دیکھتے ہوں گے جتنی کہ میں زندگی کی سچی اور جھوٹی، کھوٹی اور کھری تصویریں دیکھتا ہوں۔ ان دلچسپیوں کے باوجود موت ہمیشہ میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ ماسٹر لوشے مجھ تک پہنچنے کے لئے اور کیسے کیسے ذرائع استعمال کر سکتا ہے۔ یہ بات تو میرے علم میں آ گئی تھی کہ خفیہ تنظیم کے چار ماسٹروں میں سے ایک ماسٹر میری تلاش میں نکل پڑا ہے۔ اور کسی بھی لمحے میں اس سے ٹکرا سکتا ہوں اور نئی مصیبتوں کو دعوت دے سکتا ہوں۔

میری سمجھ میں یہی آیا کہ اسٹوفر کو پامسٹ سمجھ کر جتنے گاہک اس کے پاس آتے تھے ماسٹر لوشے ان کے دماغوں کو بھی کھنگالے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسٹوفر کے تمام گاہکوں کے ذہنوں کو پڑھ چکا ہو گا یا کم از کم ان لوگوں کو اپنی نظروں میں رکھا ہو گا جو کسی نہ کسی حیثیت سے اسٹوفر کے لئے اہمیت رکھتے ہوں گے لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں صرف صمد بخاری کو جانتا تھا جو اسٹوفر کے لئے اہمیت رکھتا تھا۔

رات کے دس بج چکے تھے۔ میں نے سونے سے پہلے اسلم کے ذہن میں جھانک کر دیکھا، بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس لئے میں نے سوچا اسلم شاید نشے کی طلب سے مجبور ہو کر پھر بہکے گا لیکن ایسی بات نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر میں بیٹھا کسی شخص سے باتیں کر رہا تھا۔ وہاں اس کی بوڑھی ماں بھی موجود تھی۔ میرے اطمینان کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ اسلم شریف آدمیوں کی طرح رات کے وقت گھر میں موجود ہے۔ میں مطمئن ہو کر اس سے دماغی رابطہ ختم کرنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ہی مجھے اس شخص کی گفتگو سے دلچسپی پیدا ہو گئی جو ماں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بڑی ندامت سے کہہ رہا تھا:

"ماں جی۔ میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں نے آپ کی بیٹی کے رشتے کو ٹھکرا دیا تھا۔ شبو کو میں بچپن سے چاہتا ہوں لیکن جوان ہو کر مجھ پر دولتمند بننے کی دھن سوار ہو گئی۔ اس کے لئے میں نے انٹیلی جنس کی ملازمت کی۔ میرا خیال تھا کہ کوئی بہت بڑا مجرم ہاتھ آئے گا تو میں اس سے بہت بڑی رقم ہتھیا لوں گا۔ پھر شبو کو بیاہنے کے لئے دھوم دھام سے بارات لے کر یہاں آؤں گا لیکن دولتمند بننے کے چکر میں، میں ایک انگریز عورت کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ اس عورت نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں اس کی مرضی پر چلتا رہوں اور اس کے کام آتا رہوں تو وہ مجھے بے انتہا دولت مند بنا دے گی۔ اس کے عشق میں گرفتار ہوتے وقت میں یہ بھول گیا تھا کہ معصوم شبو کو دھوکا دے رہا ہوں اور مجھے اس فریب کی بہت بڑی سزا ملے گی۔ مجھے سزا یہ ملی کہ میں ایک ماہ کے لئے ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

دوسری سزا یہ ملی کہ وہ انگریز عورت آج صبح اپنے باپ کے ساتھ اپنی کوٹھی میں مردہ پائی گئی۔ کسی نے دونوں باپ بیٹی کو قتل کر دیا ہے۔ میری ملازمت بھی گئی اور اس انگریز عورت سے ملنے والی دولت بھی گئی۔ میں پہلے جہاں تھا، پھر اسی مقام پر لوٹ آیا ہوں۔ ماں جی میری غلطیوں کو معاف کر دیجئے میں آئندہ کبھی شبو کا دل نہیں دکھاؤں گا۔"

ماں جی نے کہا۔ "صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو وہ بھولا نہیں کہلاتا۔ آج ہمارے لئے واقعی عید کا دن ہے۔ اسلم نے نشے سے توبہ کر لی ہے اور تم گمراہی سے نکل آئے ہو۔ فکر نہ کرو بیٹا، اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو معاف کر دیتا ہے۔ ایک ماہ بعد جب تمہاری ملازمت بحال ہو جائے تو تم کسی دن بھی چار شریف آدمیوں کو ساتھ لے آنا۔ میں شبو سے تمہارا نکاح پڑھا دوں گی۔"

"ماں جی۔ شاید ایک ماہ بعد بھی مجھے یہ ملازمت نہ مل سکے۔ میں آپ کو کیا بتاؤں۔ شاید آپ یقین نہ کریں۔ میں کسی آسیبی چکر میں پڑ گیا ہوں۔"

ماں جی نے پریشان ہو کر کہا۔

"اللہ رحم کرے۔ تمہیں ہر بلا سے بچائے۔ کس قسم کا آسیب ہے مجھے بتاؤ۔ میں کسی عامل سے مل کر بات کروں گی۔"

آسیبی چکر کی بات سنتے ہی میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور یہ سمجھ گیا تھا کہ جو شخص وہاں بیٹھا ہوا ہے وہ واجد ہے۔ وہی واجد جسے میں نے سب سے پہلے اسٹوفر کے پاس بھیجا تھا تاکہ وہ اسٹوفر اور انجلا کے متعلق معلومات حاصل کرے۔ وہاں پہنچتے ہی وہ انجلا کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا اور اس کے ذریعے دولتمند بننے کی خاطر انٹیلی جنس کی ملازمت چھوڑنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ دونوں باپ بیٹی نے اس سے کہا تھا کہ وہ کسی طرح فرہاد سے ملاقات کرے اور پرسوں سے وہ میری تلاش میں بھٹک رہا تھا۔

میں پوری توجہ سے واجد کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ وہ ماں جی سے کہہ رہا تھا۔

"ماں جی! جس عورت کا میں ذکر کر رہا ہوں، وہ اور اس کا باپ کسی طرح کا روحانی عمل کرتے تھے اور وہ عورت آگ کے شعلوں میں کھڑی ہو کر لوگوں کو ان کے دلوں کا حال بتاتی تھی اور مستقبل کی پیش گوئیاں کرتی تھی۔ اب قتل ہونے کے بعد اس کی روح بھٹک رہی ہے اور وہ اب میرے دماغ کو پریشان کر رہی ہے۔ پہلے تو اس نے مجھ سے کہا "میں تمہاری انجلا ہوں۔ میں جسمانی طور پر مرتے ہی اپنے آپ کو بھول گئی ہوں۔ بہت سی باتیں مجھے یاد نہیں رہیں۔ تم اس لئے یاد ہو کہ میں تم سے سچی محبت کرتی ہوں۔ اگر تمہارے دل میں اب بھی میری محبت ہے تو مجھے بتاؤ کہ میری زندگی میں کس شخص کو مجھ سے دشمنی تھی۔"

ماں جی یہ آوازیں بار بار میرے ذہن میں آنے لگیں تو مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی انجلا کی روح مجھ سے مخاطب ہے لیکن اب مجھے انجلا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ میں جانتا ہوں کہ ڈائرکٹر جنرل سعید احمد اور ان کے ایک گہرے دوست فرہاد علی دونوں باپ بیٹی کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ اور انہیں مجرم ثابت کرنا چاہتے تھے۔ فرہاد کے متعلق میں زیادہ نہیں جانتا۔ لیکن ایک بار میں نے فرہاد اور سعید احمد کی گفتگو سنی ہے۔ سعید احمد کی باتوں سے اتنا معلوم ہوا کہ فرہاد بہت خطرناک آدمی ہے۔ کسی مجرم کے پیچھے پڑ جاتا ہے تو اسے جہنم میں پہنچا کر چھوڑتا ہے۔ شاید اسی نے دونوں باپ بیٹی کو جہنم میں پہنچایا ہے۔ اس کی حرکتوں سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کیونکہ مجھے اسٹوفر کے پاس بھیجنے کے بعد وہ سعید احمد کے ساتھ غائب ہو گیا تھا۔ میں انجلا کی خواہش کے مطابق اسے تلاش نہ کر سکا۔ شاید وہ اسی وقت سے دونوں باپ بیٹی کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

میں یہ تمام باتیں انجلا کی روح کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ میں صرف سوچ رہا تھا۔ اتنے میں انجلا کی روحانی آواز نے مجھ سے کہا:

"روحیں دماغ کو پڑھ لیتی ہیں۔ تمہاری سوچ کے ذریعے مجھے پتہ چل گیا ہے کہ فرہاد ہی میرا قاتل ہو سکتا ہے۔ اب میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ اسے فوراً تلاش کرو۔"

میں نے اس کے حکم سے انکار کیا تو اچانک ...... میری کھوپڑی کے اندر جیسے زلزلہ آ گیا۔ کبھی گرتا تھا کبھی سنبھلتا تھا کبھی سارا دماغ۔ مجھے دیوار سے سر ٹکرانے کے لئے کہتا تھا اور میں بے اختیار دیوار سے ٹکرا جاتا تھا۔ ذرا سی دیر میں مجھ پر ایسی دہشت سوار ہوئی کہ میں چیخ چیخ کر اس کے حکم کی تعمیل کے لئے تیار ہو گیا اور سوچنے لگا کہ میں کس طرح فرہاد کو تلاش کر سکتا ہوں۔ صرف ایک ہی راستہ تھا کہ میں انٹیلی جنس کے دفتر میں جا کر کسی طرح ڈائرکٹر جنرل سعید احمد سے ملنے کی کوشش کروں لیکن دفتر میں میرا داخلہ بند تھا۔

میری سوچ کو پڑھتے ہی انجلا کی روح نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ صبح دفتر کے باہر جا کر کھڑے ہو جاؤ۔ دفتر کا کوئی نہ کوئی افسر باہر آتا جاتا ہو گا۔ جب کوئی افسر باہر آئے تو تم اسے مخاطب کر کے صرف سلام کرنا۔ جیسے ہی وہ تمہیں دیکھ کر سلام کا جواب دے گا میری روح اس افسر کے دماغ میں گھس جائے گی پھر میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گی اور اس افسر کے ذریعے ڈائرکٹر جنرل سعید احمد تک پہنچ جاؤں گی۔"

"مجھے یقین ہے ماں جی کل صبح جب میں اس روح کے حکم کے مطابق انٹیلی جنس کے کسی افسر کو سلام کروں گا تو انجلا کی روح ہمیشہ کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دے گی۔"

واجد کی یہ سوچ پڑھتے ہی میں الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ اس وقت میں

ہوٹل کے کمرے میں تنہا تھا اور میں بند کمرے میں اپنے طور پر محفوظ تھا لیکن یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ ماسٹر پوشے کیسے کیسے روپ بدل کر مجھ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے پہلے وہ ہیل منڈد کے لئے نادیدہ شیطان بنا پھر واجد کے دماغ میں انجلا کی روح کا ڈرامہ کھیلنے لگا۔ دوسری صبح اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہونے والا تھا۔ سعید احمد تک پہنچنے کے بعد وہ میری شہ رگ تک بھی پہنچ جاتا۔ میں نے فوراً ہی سعید احمد سے دماغی رابطہ قائم کیا اور ان سے کہا۔

"سعید صاحب۔ ماسٹر پوشے بڑی تیزی سے میری طرف بڑھ رہا ہے وہ کل صبح واجد کے ذریعے آپ تک پہنچ جائے گا۔ اس کے باوجود میں موم کا بنا ہوا نہیں ہوں جب تک آپ تک پہنچے گا تو میں ہمیشہ کے لئے آپ سے دماغی رابطہ ختم کر دوں گا نہ کبھی آپ سے ملاقات کروں گا اور نہ کبھی آپ کو سوچ کے ذریعے مخاطب کروں گا۔ اس طرح وہ نادیدہ شیطان آپ کے دماغ سے چھلانگ لگا کر میرے پاس نہیں آسکے گا لیکن آپ مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ وہ شیطان آپ کے دماغی توازن کو بگاڑتا رہے گا۔ لہٰذا آپ میرے مشورے پر فوراً عمل کریں۔ آپ ایک ماہ کی چھٹی لے ہی چکے ہیں۔ اس لئے آپ کسی کو بتائے بغیر کہیں روپوش ہو جائیں آپ اس وقت جہاں ہیں وہاں سے فوراً نکل جائیں تاکہ آپ کا کوئی رشتے دار یا دفتر کا کوئی شخص آپ تک نہ پہنچ جائے میں جب دیکھوں گا کہ آپ پوری طرح محفوظ ہیں تو پھر آپ جہاں بھی چھپے ہوں گے میں وہاں چلا آؤں گا۔ میرے مشورے پر عمل کریں گے۔ میرے پاس تفصیلی گفتگو کے لئے وقت نہیں ہے۔ خدا حافظ"

ان سے رابطہ ختم کرنے کے بعد میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور اس کے کش لگاتا ہوا بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے بند کمرے کے چاروں طرف ماسٹر پوشے ہزاروں وجود میں تقسیم ہو کر میری تاک میں کھڑا ہے جونہی دروازہ کھلے گا وہ میرے دماغ پر حکومت کرنے کے لئے آبیٹھے گا۔ میں ان تمام لوگوں کو فرداً فرداً ٹٹول رہا تھا جنہیں ماسٹر پوشے اپنا آلۂ کار بناتا جا رہا تھا۔ میں ایسے تمام لوگوں کو یاد کرنے لگا تو میرا خیال صمد بخاری کی طرف گیا وہ بھی اسٹوفر کے لئے اہم تھا لہٰذا ماسٹر پوشے نے اسے بھی نہیں چھوڑا ہوگا۔

یہ سوچتے ہی میں نے صمد بخاری کا دھیان کیا اور اس کے دماغ تک جا پہنچا میرا خیال درست نکلا۔ اس وقت صمد بخاری ذہنی اذیتوں میں مبتلا تھا۔ انجلا کی زندگی میں اس نے چھپ کر اس سے ملاقاتیں کی تھیں۔ وہ کسی سے ان ملاقاتوں کا ذکر نہیں کر سکتا تھا۔ جب میں اس کے دماغ تک پہنچا تو اس وقت ایک پولیس آفیسر اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور اس سے کہہ رہا تھا۔

"مسٹر صمد بخاری آپ لاکھ انکار کریں لیکن مقتولہ کی ڈائری میں آپ سے ملاقات کا وقت لکھا ہوا ہے۔ دو دن پہلے اس نے یہ وقت نوٹ کیا تھا۔ اس کے مطابق کل رات آپ نے ہوٹل سوئیٹ ڈریم میں اس سے ملاقات کی ہے۔"

صمد بخاری نے جواب دیا۔

"بے شک دو دن پہلے انجلا مجھے مجبور کر رہی تھی کہ میں ہوٹل سوئیٹ ڈریم میں اس سے ملاقات کروں میں بار بار انکار کرتا رہا۔ کیونکہ میں ایک ایسے عہدے پر ہوں جہاں رہ کر مجھے غیر ملکی جاسوسوں سے محتاط رہنا پڑتا ہے اسی لئے اس کے اصرار کرنے پر میں نے اس سے ملاقات کرنے کا اقرار کر لیا۔ لیکن وعدے کے مطابق سوئیٹ ڈریم میں اس سے ملاقات نہیں کی۔ انجلا کی ڈائری میں جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہے اور میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بھی غلط نہیں ہے۔"

صمد بخاری نے اپنی باتوں سے پولیس آفیسر کو کسی حد تک قائل کر دیا کہ انجلا اس سے لطف لینا چاہتی تھی لیکن اس نے خوبصورتی سے اسے ٹال دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پولیس آفیسر اس سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی صمد بخاری ذہنی اذیتوں میں مبتلا ہو گیا۔ ماسٹر پوشے اس کے دماغ میں کہہ رہا تھا۔

"مسٹر صمد بخاری یہ پولیس آفیسر تفتیش کے سلسلے میں جہاں جہاں پہنچ رہا ہے میں بھی وہاں پہنچ جاتا ہوں، تم مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتے... مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے کیونکہ میں اسٹوفر ہوں قتل ہونے کے بعد بھی میری روح تم سے پوچھ رہی ہے بتاؤ تم انجلا کے عشق میں گرفتار نہیں تھے؟"

جواب میں اس نے انکار کیا تو اس کی بھی وہی حالت ہوئی جو ہیل منڈد اور واجد کی ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ بوکھلاہٹ میں مبتلا رہا پھر اس نے اعتراف کر لیا کہ وہ انجلا سے محبت کرنے لگا تھا کل رات وہ اس کے ساتھ سوئیٹ ڈریم میں گیا تھا لیکن وہاں ایک اجنبی نوجوان اس کا رقیب بن کر آ گیا اس نے اس کے سامنے انجلا کو چیلنج کیا کہ اگر وہ محبت یا دولت سے حاصل نہ ہوئی تو وہ اسے جبراً حاصل کرے گا میں نے محسوس کیا کہ انجلا اس اجنبی سے بہت زیادہ متاثر ہو گئی ہے وہ پروگرام سے پہلے ہی مجھے لے کر سوئیٹ ڈریم سے باہر آ گئی میں سمجھ گیا کہ اس اجنبی سے کچھ اشارہ بازی ہوئی اور اب وہ مجھے چھوڑ کر اس کی آغوش میں جانا چاہتی ہے... وہ مجھے میرے گھر کے پاس چھوڑ کر آگے بڑھ گئی میں دیکھ چکا تھا کہ ایک ٹیکسی ہماری کار کے پیچھے آ رہی تھی وہ ٹیکسی میرے قریب سے گزری تو میں نے اس اجنبی نوجوان کو اس میں بیٹھے دیکھا۔ غصے سے میرا خون کھولنے لگا۔ یہ انگریز عورتیں تو بے وفا اور بے حیا ہوتی ہی ہیں۔ مجھے انجلا سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ لیکن اس اجنبی نوجوان پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ جو ایک حسین عورت کو مجھ سے چھین کر لے جانا چاہتا تھا میں نے دل ہی دل میں کہا کبھی تو اس اجنبی سے ملاقات ہوگی۔ میں اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے حوالات میں بند کرا دوں گا۔ آج شام کو وہ اچانک ہی مجھے ہوٹل دلشاد کے پاس نظر آیا میں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ اس ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر حاصل کر رہا تھا میں سمجھ گیا کہ وہ آج رات اسی ہوٹل میں رہے گا۔ ایک

پولیس انسپکٹر میرا دوست ہے میں نے سوچا کہ اپنے گھر آئے ہوئے مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد اپنے دوست انسپکٹر کے پاس جاؤں گا۔ اور اس سے کہوں گا کہ وہ ہوٹل دلشاد کے کمرہ نمبر آٹھ میں رہنے والے اجنبی پر کوئی الٹا سیدھا الزام لگا کر کچھ دنوں کے لئے اسے حوالات میں بند کرا دے۔ پھر میں انجلا کو جا کر بتاؤں گا کہ جسے اس نے لفٹ دی ہے وہ ایک معمولی چور اچکا ہے۔ لیکن مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد یہ پولیس آفیسر پہنچ گیا۔ اس سے پتہ چلا کہ انجلا قتل کر دی گئی ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انجلا کو اسی اجنبی نوجوان نے قتل کیا ہے۔ میں نے پولیس آفیسر سے اس اجنبی نوجوان کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ گواہ کے طور پر مجھے بار بار تھانے کچہری کا چکر لگانا ہوگا۔"

"مسٹر صمد بخاری بس اتنی ہی معلومات کافی ہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ اسٹوفر کی روح تمہارا پیچھا چھوڑ دے تو چلو اٹھو ہوٹل دلشاد کی طرف بڑھو۔ کمرہ نمبر آٹھ کے دروازے پر دستک دو جب وہ اجنبی نوجوان باہر آئے تو اس سے دوستانہ انداز میں مصافحہ کر کے مختصر سی رسمی گفتگو کرو۔ اس کے بعد اسٹوفر کی روح تمہیں کبھی پریشان نہیں کرے گی۔"

ہوٹل دلشاد کے بند کمرے میں میرے لئے جیسے ایک دھماکہ ہوا۔ سگریٹ ہاتھ سے چھوٹ گیا میرا سارا اطمینان اور ساری پیش بندیاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ میں نے فوراً ایک کرسی پر بیٹھ کر اپنے جوتے پہنے اور وہ کمرہ جو تھوڑی دیر میں میرا مقبرہ بننے والا تھا وہاں سے باہر آ گیا۔ اب زندگی کی وہ دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ جو موت کے آگے آگے...

بھاگتی ہے میں تیزی سے بھاگنے لگا میں نہیں جانتا تھا کہ میرے فرار کے راستے کے کس موڑ پر ہیل منڈد سے، واجد سے، اور صمد بخاری سے سامنا ہو جائے گا ان کے علاوہ اور جانے کتنے تھے جن کے دماغوں کی لگام تھامے وہ نادیدہ شیطان شاہانہ انداز میں سوچ کے رتھ پر سوار میری طرف چلا آ رہا تھا۔

میں تیزی سے چلتا ہوا ہوٹل دلشاد سے باہر آیا۔ ماسٹر پوشے بڑی کامیابی سے صمد بخاری کے دماغی رتھ پر سوار ہو کر میری طرف چلا آ رہا تھا میں نے سامنے سے گزرتی ہوئی ٹیکسی کو روک کر کالج چلنے اور وہاں سے واپس آنے کا کرایہ طے کیا۔ پھر اس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ٹیکسی چل پڑی۔ اس کے ساتھ ہی میرے خیالات دوڑنے لگے۔ یہ میں شروع ہی سے سمجھتا تھا کہ دشمن کے ذرائع محدود نہیں ہوتے اور پھر ماسٹر پوشے جیسا دشمن جس کے سامنے مجھ جیسا ٹیلی پیتھی جاننے والا محض ایک طفلِ مکتب تھا۔ اس کے باوجود میں اپنی پوری ذہانت سے کام لے رہا تھا۔ میں اس وقت یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ہاکس بے کی طرف جانا بھی مناسب نہیں ہے۔

کیا پتہ وہ کسی ذریعے سے اپنے کسی آلۂ کار کو ہاکس بے تک پہنچا دے۔ لیکن میں بہت مجبوری کی حالت میں اُدھر جا رہا تھا۔ وہاں میرا سوٹ کیس رکھا ہوا تھا اور اس سوٹ کیس میں اینٹی فائر لوشن کا فارمولا محفوظ تھا۔ مجھے اتنا موقع نہیں ملا تھا کہ اس فارمولے کو زبانی یاد کر لیتا۔ بہرحال میں خطرے کے باوجود ہاکس بے پہنچ گیا۔

کالج سے کچھ دُور میں نے ٹیکسی رکوا دی اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ میرا انتظار کرے۔ میں ریت پر بے آواز قدموں سے چلتا ہوا اندھیرے کالج کی طرف محتاط نظروں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ بظاہر تو ایسے ہی آثار تھے جیسے کالج ویران ہو۔ پہلے میں نے ایک کھڑکی کی طرف آکر دیکھا۔ کھڑکی کے پٹ لگے ہوئے تھے لیکن اندر سے بند نہیں تھے۔ میں نے سوچا کہ یہاں سے روانہ ہوتے وقت شاید سعید احمد کھڑکی بند کرنا بھول گئے تھے کیونکہ انہوں نے ہی کھڑکیاں، دروازے بند کئے تھے۔ میں نے دروازے پر آکر دیکھا۔ وہاں بدستور تالا لگا ہوا تھا۔ مجھے ذرا اطمینان ہو گیا۔ میں نے جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا تو اچانک ہی میری چھٹی حس نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کمرہ خالی نہیں ہے۔ سمندر کے شور کے باوجود میں نے ہلکی سی آہٹ سُنی تھی۔ کالج کا فرش لکڑی کے تختوں کا بنایا گیا تھا، چلتے وقت لکڑی کے تختوں سے آواز پیدا ہوتی تھی۔ تالا کھولتے وقت اندر کسی نے بہت سنبھل کر پوزیشن بدلی تھی۔ اسی وقت مجھے آہٹ سُنائی دی تھی۔ میں چند لمحوں تک دروازے پر سانس روکے ساکت کھڑا رہا۔ پھر اچانک ہی دروازے کو ایک جھٹکے کے ساتھ اس طرح کھولا کہ دروازے کے پیچھے چھپا ہوا اجنبی دیوار اور دروازے کے درمیان پھنس کر رہ گیا۔ اس کی ہلکی سی کراہ سُنائی دی۔ اسی وقت کھلے ہوئے دروازے کے سامنے کالج کے [illegible] کسی نے لائٹر آن کیا میں فوراً ہی پلٹ کر ایک ڈبنگی لِک ماری۔ لائٹر اس کے ہاتھوں سے نکل کر دُور جا گرا۔ کمرے میں پھر اندھیرا چھا گیا۔ ذرا دیر کی روشنی میں بھی میں نے ان لوگوں کو اپنا چہرہ دیکھنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ لائٹر کو بجھانے کے لئے فوراً ہی پلٹ کر لِک ماری تھی۔ اس وقت میرے ذہن پر صرف ماسٹر پوشے چھایا ہوا تھا۔ اب جو بھی میرے مقابل آتا میں یہی سوچتا کہ وہ اُس کا آلۂ کار ہے۔ ان سے مقابلہ کرنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ میرا چہرہ نہ دیکھیں، میری آنکھوں میں نہ جھانکیں اور میری آواز نہ سُنیں۔ ورنہ ماسٹر پوشے اُن کے ذریعے میرے دماغ تک پہنچ جاتا۔ اسی لئے میں نے لائٹر کو بجھا دیا تھا۔

اب وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں گونگا بن گیا تھا وہ میری آواز نہیں سُن سکتے تھے۔ وہ دو تھے اور میں تنہا تھا پھر اندھیرے میں اچھی خاصی جنگ شروع ہو گئی۔ اس وقت گونگے شیشل سے حاصل کی ہوئی ٹریننگ کام آ رہی تھی۔ وہ تنہا دس آدمیوں کا بھرتہ بنا دیتا تھا۔ لڑنے کا وہی انداز میں نے بھی سیکھا تھا پھر وہ دو اجنبی بدمعاش میرے سامنے [illegible] تک ٹھہر سکتے تھے۔ وہ میرے ہاتھوں بُری طرح پٹ رہے تھے۔

اس دوران میں نے محسوس کیا کہ وہ بھاگنا چاہتے ہیں لیکن بھاگتے بھاگتے رُک جاتے ہیں۔ کوئی اَن دیکھی طاقت انہیں روکتی ہے اور وہ پلٹ کر مجھ سے اُلجھنے کے بجائے اندھیرے میں لائٹر تلاش کرتے ہیں۔

جب بھی وہ لائٹر تلاش کرنے کے لئے فرش کی طرف جُھکتے تھے۔ میں انہیں ٹھوکروں میں اُڑا دیتا۔ آخر ایک نے مجبور ہو کر گھگھیاتے ہوئے کہا۔

”ہمیں نہ مارو، ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہمیں اپنا لائٹر تلاش کر لینے دو۔“

دوسرے نے کہا۔ ”تمہارے پاس ماچس ہو تو اسے جلاؤ۔ ہم اپنا لائٹر اُٹھا کر چلے جائیں گے۔“

اب میں ایسا نادان تو نہیں تھا کہ ان کے کہنے پر ماچس کی تیلی روشن کر دیتا۔ مجھے خاموش دیکھ کر پھر ان میں سے ایک نے کہا۔ ”تم خاموش کیوں ہو؟ خدا کے لئے تھوڑی سی بات کر لو، ہمیں بہت بڑی مصیبت سے نجات مل جائے گی۔ خدا کی قسم! ہم اپنی مرضی سے یہاں نہیں آئے۔ کوئی شیطان ہمارے دماغ میں گھس گیا ہے، وہ ہمیں پریشان کر رہا ہے کہ ہم روشنی میں تمہارا چہرہ دیکھیں یا تمہیں باتیں کرنے پر مجبور کریں۔ مگر تم بھی کسی شیطان سے کم نہیں ہو۔ مار مار کر ہماری ہڈی پسلی ایک کر دی ہے۔ خدا کے لئے ہم پر رحم کرو۔“

کالج کے اندر اندھیرے میں ہم ایک دوسرے کو نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں دروازے کے پاس تن کر کھڑا ہوا تھا تاکہ وہ بھاگ نہ سکیں بھاگنا بھی چاہتے تو ماسٹر لوشے ان کی کھوپڑی اُلٹ دیتا۔ اندھیرے میں کئی بار وہ مجھ پر حملہ کر چکے تھے۔ لیکن میرے جوابی حملوں نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ میں تاریکی میں بھی انہیں دیکھ لیتا ہوں۔ حالانکہ ایسی بات نہیں تھی۔ ان کے آگے بڑھنے سے لکڑی کے تختوں کا فرش جب آواز پیدا کرتا یا ان کے ہانپنے کی آواز آتی تو میں یہ معلوم کر لیتا تھا کہ دشمن کس سمت سے آ رہے ہیں۔ اس لئے اب وہ تھک ہار کر بیٹھ گئے تھے اور مجھ سے التجائیں کر رہے تھے کہ میں اپنا جلوہ دکھا دوں۔

میں چُپ چاپ کھڑا ہوا ان کے دماغ میں جھانکنے لگا۔ ان کے دماغ میں مجھے ماسٹر لوشے کی تحکمانہ آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ ان سے کہہ رہا تھا۔

”بس اسی طرح فرش پر بیٹھے رہو اور چُپ چاپ اِدھر اُدھر کھسکتے ہوئے لائٹر تلاش کرتے رہو۔۔۔ یاد رکھو اگر تم نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا یا اسے بولنے پر مجبور نہ کیا تو میں تمہیں پاگل بنا کر چھوڑ دوں گا اور اگر تم کامیاب ہو گئے تو تمہیں ایسے خزانے کا پتہ بتاؤں گا کہ ساری زندگی عیش کرو گے۔ دیکھو، وہ تمہارے سامنے جو گونگا کھڑا ہوا ہے، وہ بڑی مشکلوں سے ہاتھ آیا ہے۔ اگر یہ ہاتھ سے نکل گیا تو پھر گرفت میں نہیں آئے گا۔ اگر یہ دشمنی سے قابو میں نہیں آ رہا ہے تو اس سے دوستی کرو۔“

ماسٹر لوشے انہیں سمجھا رہا تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ دماغ کے اندھیرے میں مَیں بھی اس کے قریب کھڑا ہوا اس کی سوچ کو پڑھ رہا ہوں۔ اگر اس اندھیرے میں میری سوچ مداخلت کرتی تو وہ فوراً ہی مجھ تک پہنچ جاتا۔ اس وقت میں بتا نہیں سکتا کہ میں کتنے خطرناک شیطان کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ میری ذرا سی بھول مجھے اُس کے ہاتھوں میں کھلونا بنا سکتی تھی۔

اس کا حکم سنتے ہی ایک اجنبی بدمعاش نے مجھ سے کہا۔ ”اے بھائی! تم کون ہو؟ کچھ تو مُنہ سے پھُوٹو۔ ہم لڑنے مرنے کے معاملے میں آج تک اُستاد سمجھے جاتے رہے ہیں۔ مگر تم تو ہمارے بھی اُستاد نکلے۔ ہم تمہارے دوست بننا چاہتے ہیں۔ جو کچھ ہوا، اسے بھُول جاؤ۔ آؤ ہم دوستوں کی طرح گلے لگ جائیں۔“

وہ دونوں اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اندھیرے میں ان کا سیاہ خاکہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے بھی دوست بن کر گلے لگنے کے لئے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ اس کے ساتھ ہی میں ان کے ذہن کو پڑھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے۔

”یہ گونگا اجنبی ناقابلِ شکست ہے۔ ہم دونوں اس سے بیک وقت لپٹ کر بھی اُسے بے بس نہیں کر سکتے۔ یہی بہتر ہے کہ ہم سچ مچ اس سے دوستی کریں، پھر اس کے ساتھ دوستانہ ماحول میں بیٹھ کر باتیں کریں۔ مگر نہیں، یہ تو واقعی گونگا معلوم ہوتا ہے، کیا خاک باتیں کرے گا۔ ہم دوستی کرتے ہی اسے سگریٹ آفر کریں گے۔ ایسی صورت میں وہ ماچس کی تیلی ضرور روشن کرے گا، پھر ہمارا کام بن جائے گا۔ ہم اس کا چہرہ دیکھ لیں گے۔ اس کے بعد اس شیطان سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی جو ہمارے دماغ میں گھُسا ہوا ہے۔۔۔۔۔“

یہ سوچتے ہوئے وہ میرے قریب آئے۔ ایک دائیں طرف سے آیا، دوسرا بائیں طرف سے۔۔۔ میں نے بڑے پیار سے ان دونوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اس طرح سمیٹا کہ دونوں کی گردنیں میرے دونوں بازوؤں میں پھنس گئیں۔ پہلے تو انہوں نے سمجھا کہ میں گرم جوشی کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔ لیکن جب ان کی سانسیں رُکنے لگیں تو وہ پوری قوت سے تڑپ کر میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔

لیکن میں نے انہیں نکلنے کا موقع نہیں دیا، اپنی گرفت کو مضبوط کرتا گیا۔ ان میں سے ایک قدرے کمزور تھا۔ وہ چند ہی سیکنڈ بعد ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر فرش پر گر پڑا۔ دوسرے کے دماغ میں ماسٹر لوشے جم کر بیٹھا ہوا تھا اور بار بار اسے للکار کر اس کی قوتِ ارادی کو مضبوط کر رہا تھا۔ جس طرح کسی کو ٹرانس میں لایا جاتا ہے، اسی انداز میں ماسٹر لوشے کہہ رہا تھا۔

”میری گردن فولادی بازو کے شکنجے میں پھنسی ہوئی ہے۔ لیکن میں کمزور نہیں ہوں۔ اس کے شکنجے کو توڑ سکتا ہوں۔ میرا دَم نہیں گھٹ رہا ہے، میرے سینے میں ابھی سانسوں کا ذخیرہ ہے، مجھے پورے ہوش و حواس سے کام لینا چاہیئے۔ میرا دایاں ہاتھ آزاد ہے، اس ہاتھ کے گھونسے سے مجھے اس کے پیٹ میں پنچ کرنا چاہیئے۔“

ماسٹر لوشے کی طرف سے یہ ہدایت ملتے ہی اُس نے دائیں ہاتھ سے پنچ کیا۔ میں تو اس کے عمل سے واقف تھا اس لئے وہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ سے اس کے دائیں ہاتھ کی کلائی کو پکڑ لیا۔

اگر قوتِ ارادی مضبوط ہو تو دَم توڑنے والا انسان بھی صرف اپنی دماغی قوت سے کچھ عرصے کے لئے زندہ رہ سکتا ہے۔ اس بدمعاش کو بھی ماسٹر لوشے کی دماغی قوت نے سنبھال رکھا تھا۔ لیکن اس کا جوابی حملہ اس لئے کامیاب نہیں ہو سکا تھا کہ میں چوری چھُپے ماسٹر لوشے کی ہدایت کو پڑھتا جا رہا تھا۔ آخر اس بدمعاش کی قوتِ مدافعت جواب دے گئی۔ اس کے بھی ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ میں نے اُسے فرش پر چھوڑ دیا۔ وہ دونوں بے ہوش ہو گئے تھے پھر بھی میں تھوڑی دیر تک کھڑا اُن کے دماغ میں جھانکتا رہا۔ ان کے دماغ تاریکی میں ڈوب گئے تھے۔ اس تاریکی میں صرف ماسٹر لوشے کی دستک سُنائی دے رہی تھی۔

”ہیلو ہیلو۔۔۔ تمہارا دماغ سوچنے سے معذور کیوں ہو گیا ہے؟ اوہ، میں سمجھ گیا یہ کمبخت بھی بے ہوش ہو گیا ہے۔ افسوس! ہاتھ آیا ہوا شکار ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ وہ بہت ہی چالاک، پھرتیلا اور بے حد خطرناک ہے۔ لیکن میں بھی شکار کو پکڑ کر چھوڑتا ہوں، پھر پنجے مار کر پکڑ لیتا ہوں۔ یہ مجھ سے بچ کر کہاں جائے گا۔ ابھی اس کی گردن تک پہنچنے کے لئے میرے پاس بہت سے ذرائع ہیں۔۔۔۔۔“

میں اس کی بڑبڑاتی ہوئی سوچ کو سُنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد خاموشی چھا گئی۔ جب مجھے پوری طرح یقین ہو گیا کہ فی الحال میرے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے تو میں نے ماچس کی تیلی روشن کی اور اپنے سوٹ کیس کے پاس آ کر اسے کھول کر دیکھنے لگا کہ کہیں کوئی چیز غائب تو نہیں ہو گئی ہے۔ سوٹ کیس میں میرا تمام سامان موجود تھا، صرف اینٹی فائر لوشن کا فارمولا غائب ہو گیا تھا۔ چوری کرنے والے ابھی فرش پر بے ہوش پڑے تھے۔ میں نے فوراً ہی دونوں کی تلاشی لی۔ وہ فارمولا پھر میرے ہاتھ آ گیا۔ میں نے اسے سوٹ کیس میں رکھنے کی بجائے اپنی جیب میں رکھ لیا تاکہ مجھے جب بھی موقع ملے، میں اسے اپنی یادداشت میں محفوظ کر سکوں۔

اسی وقت دُور سے ٹیکسی کا ہارن سنائی دیا۔ مجھے احساس ہوا کہ بہت دیر ہو گئی ہے، ڈرائیور میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں نے سوٹ کیس کو بند کیا اور اسے لے کر کالج سے باہر آ گیا۔ ٹیکسی کی طرف بڑھتے وقت میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کہاں جانا چاہیئے؟ اس شہر میں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یہاں ماسٹر لوشے کے بہت سے ذرائع تھے۔ جب ان ذرائع سے وہ ہاکس بے کے ویران علاقے میں پہنچ سکتا تھا تو شہر کی شاہراہوں پر بھی مجھے آسانی سے گھیر سکتا تھا۔ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھنے تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے پناہ کے لئے کہاں جانا چاہیئے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔

”اب کہاں جانا ہے صاحب؟“

میرے دماغ نے فوراً ہی مجھے سمجھایا کہ لاری اڈّے کی طرف چلنا چاہیئے۔ میں نے ڈرائیور کو اسی طرف چلنے کے لئے کہا۔ جب ٹیکسی چل پڑی تو میں اپنے اس فیصلے پر غور کرنے لگا۔ میرا دماغ اکثر میری صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ میں اس شہر سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کے لئے میں ریلوے اسٹیشن یا ایئرپورٹ کا رُخ کرتا۔ اس دوران ماسٹر لوشے میری حیثیت کو بھی سمجھ چکا ہو گا کہ میں معمولی حیثیت کا آدمی نہیں ہوں۔ اگر شہر چھوڑنا چاہوں گا تو ایئرپورٹ کا رُخ کروں گا یا ایئرکنڈیشنڈ کوچ میں سفر کرنے کے لئے ریلوے اسٹیشن جاؤں گا۔ وہ دونوں اڈّوں پر اپنے آلۂ کاروں کو پھیلا دیتا اور اس کے آلۂ کار ہر مسافر کو سُونگھتے پھرتے۔ لہٰذا یہی مناسب تھا کہ میں ایک معمولی آدمی کی طرح بس میں سفر کرتا۔

لاری اڈّے پہنچ کر میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو پچاس روپے دے کر اُسے خوش کر دیا۔ پھر وہاں سے ایک بس میں بیٹھ کر حیدر آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس دوران میں نے صرف ایک بار ٹیکسی ڈرائیور سے بات کی تھی یعنی اُسے لاری اڈّے کی طرف چلنے کے لئے کہا تھا۔ اس کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے گونگا بن کر رہنا چاہیئے۔ نہ جانے کہاں اور کس وقت ماسٹر لوشے کے کسی آدمی سے سامنا ہو جائے۔ کچھ عرصے تک گونگا بنے رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ سُنا ہے کہ خاموشی بہت سے جھگڑوں کا تصفیہ کر دیتی ہے۔ میں اس کہاوت کو عملی طور پر آزمانے لگا۔ اس طرح یہ فائدہ ہوا کہ مجھے گونگا سمجھ کر کسی نے مجھ سے بات کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور میں آرام سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر، اس کے بعد اپنی جیب سے اینٹی فائر لوشن کا فارمولا نکال کر اُسے سبق کی طرح یاد کرنے لگا۔

میں فارمولا یاد کر رہا تھا اور میری نگاہوں کے سامنے کاغذ کی چکنی سطح پر انجلا کی چکنی تحریر پھیلی ہوئی تھی۔ میں یاد کرتے کرتے اس کے وجود کی چکناہٹ کی طرف پھسلتا جاتا تھا۔ اب تک جتنی لڑکیوں کے ساتھ میں نے وقت گزارا، وہ سب کسی نہ کسی طرح میری دوست بن کر رہیں۔ لیکن انجلا دوست بھی تھی اور دشمن بھی، اور آخری وقت تو بالکل دشمن ہی بن کر رہی۔ اُس نے خود کو میرے حوالے بھی کیا تو انگاروں کی سیج پر۔۔۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انگاروں کی سیج پر جوانی کا ایسا خوبصورت سفر کسی نے طے نہیں کیا ہو گا۔

میں بہت دیر تک اس کی لذتوں کو یاد کرتا رہا۔ ساتھ ہی فارمولا بھی یاد ہوتا رہا۔ حیدر آباد پہنچنے تک کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جس کا میں ذکر کر سکوں۔ وہاں ریلوے اسٹیشن پہنچ کر میں نے پنڈی کے لئے ایک ایئر کنڈیشنڈ کوچ میں اپنے لئے برتھ ریزرو کرا لی اور شام تک ٹرین کا انتظار کرنے کے لئے ویٹنگ روم میں ٹھہر گیا۔ میں اپنے گونگے پن پر خوش تھا کیونکہ خاموشی کے باعث مجھے فارمولا یاد کرنے کا زیادہ موقع مِل رہا تھا۔ زبان والے میرے قریب آ کر مجھ سے دُور ہو جاتے تھے لیکن ویٹنگ روم میں بدقسمتی سے ایک گونگے سے سابقہ پڑ گیا۔ جس طرح بائی جی ہاتھ سے، انگلیوں سے اور ابروؤں سے گیت کے بول کی وضاحت کرتی ہے اور

بھاؤ بتاتی ہے، اسی طرح وہ گونگا اشاروں سے بھاؤ بتانے لگا۔ مجھے گونگے رشیتل کے ساتھ رہ کر یہ معلوم ہوگیا تھا کہ گونگوں کے مخصوص اشارات کیا ہوتے ہیں اور وہ کس طرح اپنا مطلب بیان کرتے ہیں۔ اس لئے میں ایک کامیاب گونگے کی طرح اس سے باتیں کرتا رہا مگر بور ہوتا رہا۔ شام تک اس باتونی گونگے کی صحبت میں رہ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں سچ مچ قوتِ گویائی سے محروم ہوگیا ہوں۔ میں نے بارہا اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر اس خدا کے بندے کو اتنی بڑی دنیا میں اپنے جیسا ایک بندہ مل گیا تھا اس لئے وہ میرا ساتھ چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ آخر میں نے جھلا کر زبان کھولی۔

"خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میں تمہاری طرح گونگا نہیں ہوں، زبان رکھتا ہوں۔ اب جاؤ یہاں سے ......"

وہ مجھے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ پھر وہ ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر غصّے سے کوسنے لگا کہ میں گونگا بن کر اس کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ بہر حال اُس نے میرا پیچھا چھوڑ دیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے افسوس ہوا کیونکہ اُس کے ساتھ میرا اچھا وقت گزر گیا تھا۔

شام کو ٹرین میں سوار ہوا تو اس وقت مجھے تنہائی کا افسوس نہیں تھا۔ کیونکہ اتنے ہنگاموں سے گزرنے کے بعد میں خود ہی تنہا رہ کر یہ سوچ رہا تھا کہ پچھلے ہنگاموں میں مَیں نے کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے؟ اپنے کوچ کی ایک برتھ پر آرام سے لیٹ کر جب میں نے پچھلی جدوجہد کا حساب کیا تو بہت سی کامیابیاں اور ناکامیاں سامنے آئیں۔ کامیابی میں یہ بات شامل نہیں تھی کہ میں نے انجلا جیسی حسینہ کو حاصل کیا تھا۔ کیونکہ ایسی عورتیں تو مجھے حاصل ہوتی ہی رہتی تھیں۔ میری سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ میں نے اب تک ماسٹر لوشے جیسے خطرناک دشمن سے خود کو بچا رکھا تھا اور اس کی گرفت میں آتے آتے نکل گیا تھا۔ دوسری بڑی کامیابی یہ تھی کہ میں نے اینٹی فائرلوشن کا فارمولا حاصل کر لیا تھا اور اسے اپنی یادداشت میں محفوظ بھی کر لیا تھا۔ میری یادداشت بہت مضبوط ہے، ایک بار جسے دیکھ لیتا ہوں یا پڑھ لیتا ہوں اسے کبھی نہیں بھولتا۔ اینٹی فائرلوشن کی شیشی بھی میرے پاس محفوظ تھی۔ اس لئے میں نے اس کاغذی فارمولے کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ اس کے بعد ایک ناکامی یاد آئی اور وہ یہ کہ بیل منڈو سے مائیکرو فلم حاصل نہیں کر سکا تھا۔

میں ناکامی کو اپنی توہین سمجھتا ہوں لیکن ایسا ضدی اور احمق بھی نہیں ہوں کہ جان بوجھ کر کسی گہری کھائی میں چھلانگ لگا دوں۔ ماسٹر لوشے کا دماغ ایک گہری کھائی کی طرح تھا جس میں گرنے کے بعد میں دوبارہ وہاں سے نہیں نکل سکتا تھا۔ لہٰذا اس خطرناک کھائی سے دُور بھاگنے کے لئے ضروری تھا کہ میں بیل منڈو کے قریب نہ جاتا۔ اس سے دُور بھاگنے کے باوجود اس کی مصنوعی ناک اور ناک کے نتھنے میں چھپی ہوئی مائیکرو فلم یاد آتی رہتی تھی لیکن اب میں اسے حاصل کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کر سکتا تھا۔

ڈنر کے وقت بوفے کار میں جانے کے لئے میں نے لباس تبدیل کیا۔ نیوی بلو سوٹ اور نکٹائی پہننے کے بعد میں نے تاریک شیشوں کی عینک آنکھوں پر لگائی تاکہ اچانک کسی دشمن کا سامنا ہو تو وہ فوراً ہی میری آنکھوں تک نہ پہنچ سکے۔ پوری طرح تیار ہونے کے بعد جب میں آئینے کے سامنے آیا تو سب سے پہلے اپنی خوبروئی پر عاشق ہوگیا۔ اس کے بعد مکمل سکون سے میں نے احتیاطی تدابیر پر غور کیا۔ میں گونگا تھا، ماسٹر لوشے میرے لہجے اور سوچ کے انداز کو نہیں پکڑ سکتا تھا۔ میری آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا اس لئے کوئی آلۂ کار میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ماسٹر لوشے کے لئے میرے دماغ تک پہنچنے کا راستہ نہیں بنا سکتا تھا۔ میں نے اپنے دماغ کے چاروں طرف مکمل تدابیر کی آہنی فصیل کھڑی کر دی تھی۔ اس فصیل کو توڑنے کے لئے دشمنوں کو پسینہ آجاتا۔ مجھے یقین تھا کہ ماسٹر لوشے میرے دماغ کے بند دروازے سے ٹکرا ٹکرا کر واپس چلا جائے گا۔

میں مطمئن ہو کر اپنے کیبن سے باہر آگیا۔ باہر آتے ہی کوچ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک حسینوں کا میلا نظر آیا۔ لڑکیاں رنگ برنگے لباس میں رنگین تتلیوں کی طرح اِدھر سے اُدھر جا رہی تھیں۔ ان میں کچھ بوڑھیاں بھی تھیں۔ جوان مرد اور بوڑھے بھی تھے۔ شاید وہ سب ایک ہی خاندان کے افراد تھے۔ اتنے بڑے خاندان کے لئے انہوں نے تین یا چار کیبن ریزرو کرائے تھے۔ میرے کیبن کے قریب دو لڑکیاں ہنستے ہنستے ٹھٹھک کر مجھے دیکھنے لگیں۔ ان کے ساتھ دو نوجوان بھی تھے۔ انہوں نے مجھے ناگواری سے دیکھا۔ کیونکہ میں ان کے ہنسنے بولنے کے دوران کباب میں ہڈی بن گیا تھا اور لڑکیاں چند لمحوں کے لئے میری طرف متوجہ ہوگئی تھیں۔ پھر فوراً ہی انہیں احساس ہوگیا کہ وہ بے اختیار مجھے دیکھے جا رہی ہیں۔ وہ فوراً ہی منہ پھیر کر اپنے کزن یا بوائے فرینڈز سے بہت دھیمی آواز میں گفتگو کرنے لگیں۔ ان کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی لیکن خیالات تو پہنچ سکتے تھے اور خیالات پہنچ رہے تھے۔ ایک لڑکی نے مجھے دیکھتے ہی سوچا تھا۔

"مائی گڈنس کتنا اسمارٹ ہے .... !"

لیکن اسی لڑکی نے منہ پھیر کر اپنے نوجوان ساتھی سے دھیمی آواز میں کہا۔ "اُونہہ۔۔۔ پتہ نہیں، کون ہے۔ رات کے وقت سیاہ چشمہ لگا کر خود کو ہیرو سمجھ رہا ہے۔ ڈیر! تمہارے سامنے تو وہ بندر نظر آتا ہے۔"

نوجوان نے خوش ہو کر ہنستے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے، اس کی آنکھوں میں کوئی عیب ہے۔ اپنا عیب چھپانے کے لئے سیاہ چشمہ پہن رکھا ہے۔"

دوسری لڑکی نے کہا۔ "شاید کانا ہوگا۔"

اس بات پر بھی قہقہے لگانے لگے۔ میں مسکراتا ہوا ان سے دُور دروازے کی طرف چلا گیا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رُکنے والی تھی۔ دروازے کے پاس ایک اور نوجوان لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اُس کے سامنے پہنچتے ہی آنکھوں سے چشمہ اُتار کر ایک آنکھ دبا دی۔ وہ اِک دم سے سُرخ ہوگئی اور مُٹھیاں بھینچ کر بولی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

"آں ۔۔۔" میں نے گونگے اشارے میں اُسے سمجھایا کہ میں کانا ہوں۔

اُس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ اب اُس کا غصّہ ختم ہو چکا تھا وہ ہمدردی سے سوچ رہی تھی کہ میرے جیسا خوبرو نوجوان گونگا بھی ہے اور کانا بھی ہے۔ جب ٹرین رُک گئی اور میں دروازہ کھول کر باہر جانے لگا تو وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے ساتھیوں کی طرف جانے لگی۔ میں بوفے کار کی طرف جاتے ہوئے اُس کے دماغ میں جھانک رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ کر اُسی لڑکی سے مخاطب ہوئی جس نے مجھے کانا کہا تھا۔

"شبانہ! تم نے اُس نوجوان کو دیکھا جو ابھی یہاں سے گیا ہے، وہ بے چارہ کانا ہے۔"

"اچھا!" شہانہ نے خوش ہو کر کہا۔ "میرا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ کانا ہے۔ شبانہ! اس نے تو چشمہ لگا رکھا ہے تم نے کیسے دیکھ لیا؟"

شبانہ نے جواب دیا۔ "اُس نے میرے قریب آکر چشمہ اُتارا تھا، پہلے تو میں نے یہ سمجھا کہ مجھے آنکھ مار رہا ہے۔ میرے غصّہ کرنے پر اُس نے اشاروں میں سمجھایا کہ اس کی ایک دُکان بند ہے ۔۔۔ افسوس! بے چارہ گونگا بھی ہے۔"

ایک نوجوان نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یک نہ شُد دو شُد۔ کانا اور گونگا ہو کر اپنے عیبوں کو چھپائے ہیرو بن رہا ہے۔"

شہانہ نے کہا۔ "مرد ہزار عیبوں کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ لڑکیاں ان پر عاشق ہو جائیں گی ۔۔۔ نرگس! تمہارا کیا خیال ہے؟"

وہ تیسری لڑکی، جو سب سے پہلے مجھ سے متاثر ہوئی تھی۔ لیکن اپنے نوجوان ساتھی کے مقابلے میں مجھے بندر کہہ رہی تھی، اُس کا نام نرگس تھا، اُس نے کہا۔ "خیال نیک ہے، ہمارا سفر لمبا ہے، اس گونگے اور کانے کو اپنی تفریح کا مرکز بنا لیا جائے تو یہ ایک یادگار سفر بن جائے گا ۔۔۔ فیروز! تمہارا کیا خیال ہے؟"

اس کے جوان ساتھی فیروز نے جواب دیا۔ "ہاں، واقعی اس احمق کو احمق بنانے میں بڑا مزہ آئے گا۔ لیکن جمشید اس سلسلے میں چُپ کیوں ہے؟"

دوسرے نوجوان جمشید نے کہا۔ "میں چُپ نہیں ہوں بلکہ شبانہ کے چہرے کو پڑھ رہا ہوں۔ یہ تو کسی تفریح میں حصّہ نہیں لیتی۔ معلوم ہوتا ہے دُنیا سے اس کا دل اُکتا گیا ہے۔"

شبانہ نے کہا۔ "یہ دُنیا جینے کے قابل نہ ہو تو دل اُکتا ہی جاتا ہے۔ پھر کسی کا مذاق اُڑا کر کیا فائدہ؟ قدرت اسے گونگا اور کانا بنا کر پہلے ہی مذاق کر چکی ہے۔ خدا نہ کرے کہ ہم میں سے کوئی اندھا، لنگڑا، لُولا یا کانا ہو جائے اور کوئی ہمارا مذاق اُڑائے تو ہمارے دل پر کیا گزرے گی؟"

یہ کہہ کر وہ دوسرے کیبن کی طرف جانے لگی۔ اس وقت تک میں بوفے کار میں آگیا تھا اور ایک میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر شبانہ کے ذہن میں بدستور جھانکنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کی باتوں نے مجھے متاثر کیا تھا انسان کی ذہانت اور اس کے سوچنے سمجھنے کا سلیقہ اس کی باتوں سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ مختصر سی گفتگو میں یہ ثابت ہوگیا تھا کہ شبانہ اپنی ساتھی لڑکیوں کی طرح مغرور نہیں ہے۔ لیکن مجھے اس کے ذہن میں جھانکنے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ نرگس، شہانہ، فیروز اور جمشید بوفے کار کی طرف چلے آرہے تھے اور ایک بیرا میرے پاس آرڈر لینے کے لئے آگیا تھا۔ میں نے اشارے سے کھانا طلب کیا۔ بیرے نے مسکرا کر دل ہی دل میں کہا۔

"کمبخت گونگا ہے، اسے کل کا باسی سالن دیا جائے تو یہ شکایت نہیں کر سکے گا۔"

وہ کھانا لانے کے لئے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی نرگس اپنی ٹیم کے ساتھ میرے قریب چلی آئی۔ دوسری میزیں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ سب کرسیاں کھینچ کر میرے اطراف بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے فیروز نے میری طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"سُنا ہے آپ کی ایک دُکان بند ہے؟"

میں نے دانت نکال کر احمقوں کی طرح سر ہلاتے ہوئے اور اس سے مصافحہ کرتے ہوئے اشاروں میں سمجھایا کہ مجھے اس سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ میرے اس جواب پر وہ سب کھِلکھلا کر ہنسنے لگے۔

جمشید نے کہا۔ "شبانہ نے درُست کہا تھا یہ واقعی گونگا اور بہرہ ہے۔"

شہانہ نے کہا۔ "اور یقیناً کانا بھی ہوگا۔ کسی طرح اس کا چشمہ اُتروانا چاہیئے۔"

یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی اور اشاروں کی زبان میں میرا چشمہ مجھ سے مانگنے لگی۔ اُس نے چشمے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور چشمہ اُتارنے سے انکار کرنے لگا۔ میری اس حرکت سے وہ پھر قہقہے لگانے لگی۔ شہانہ شرارت پر تُلی ہوئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی تاکہ میرے قریب آکر زبردستی چشمہ اُتار لے۔ اسی وقت میں نے اُس کی سوچ میں کہا۔

"یہ فیروز کیسا گدھے کی طرح ہنس رہا ہے۔ جی چاہتا ہے ایک ہاتھ اس کے منہ پر رسید کر دوں اور مجھے ایسا کرنا چاہیئے۔ یہ ۔۔۔ یہ میرا ہاتھ گھوم رہا ہے ......"

جسم کا ہر عضو دماغ کا تابع فرمان ہوتا ہے۔ اس کے دماغ نے جیسے ہی حکم دیا، اس کا بایاں ہاتھ تیزی سے گھوم گیا۔ تڑاخ کی آواز کے ساتھ فیروز کے منہ پر ایک زور کا طمانچہ پڑا۔ وہ بوکھلا کر کھڑا ہوگیا۔ تمام لوگوں کے قہقہے ایک ساتھ گھٹ کر رہ گئے۔ بوفے کار میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی شہانہ اور فیروز کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ چند لمحوں تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ہوا کیا ہے؟ پھر نرگس غصّے سے اُچھل کر کھڑی ہوگئی کیونکہ فیروز اس کا بوائے فرینڈ تھا اور وہ اپنے بوائے فرینڈ کی توہین کیسے برداشت کر سکتی تھی۔

"شہانہ! تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی؟ کیا سوچ کر تم نے فیروز پر ہاتھ اٹھایا ہے؟"

میں نے فوراً شہانہ کے دماغ میں کہا اور شہانہ نے اسے زبان سے دہرایا۔ "یہ گدھے کی طرح ہنس رہا تھا۔"

یہ کہتے ہی شہانہ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ کیونکہ میں نے اس کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ سوچ رہی تھی۔

"یہ اچانک مجھے کیا ہو گیا تھا' میں نے فیروز کو طمانچہ کیوں مار دیا؟ یہ درست ہے کہ مجھے اس سے نفرت ہے۔ یہ ہمیشہ میرے جمشید کی برائی کرتا رہتا ہے۔ لیکن اس وقت طمانچہ مارنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی پھر میرا ہاتھ کیسے چل گیا؟"

وہ بہت پریشان تھی اور نرگس غصے سے کہہ رہی تھی۔ "تم فیروز کو گدھا کہہ رہی ہو۔ تم خود گدھی ہو' تمہارا جمشید گدھا ہے۔"

جمشید نے کہا۔ "نرگس! اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ تم خواہ مخواہ مجھے گالی دے رہی ہو۔"

فیروز نے اپنی جگہ سے اٹھ کر جمشید سے کہا۔ "تم کیا اندھے بہرے ہو؟ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ شہانہ نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟"

"ٹھیک کیا ہے۔" جمشید نے کہا۔ "میں سب جانتا ہوں تم میرے پیٹھ پیچھے شہانہ کے سامنے میری برائیاں کرتے ہو۔ میں نے ہی اسے سمجھا بجھا کر روک رکھا تھا۔ ورنہ یہ تو تمہیں جوتے سے مارنا چاہتی تھی۔"

"یہ کیا مارے گی' ذرا تم ہی دیکھ لو کہ میرا ہاتھ کیسا دزنی ہے؟"

یہ کہہ کر اس نے جمشید کے منہ پر ایک گھونسا جڑ دیا پھر تو بوفے کار میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ میزیں اور کرسیاں الٹنے لگیں۔ عورتیں سہم کر چیختی ہوئی ایک طرف بھاگنے لگیں۔ فیروز اور جمشید دونوں ہی پاگل ہاتھی کی طرح ٹکرا رہے تھے۔ جو بیچ بچاؤ کے لئے آگے بڑھتا تھا' وہ مار کھا کر پلٹ جاتا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس گوشے میں آ گیا جہاں نرگس کھڑی ہوئی وحشت زدہ نظروں سے انہیں لڑتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔

"یہ کیا ہو گیا؟ ہم تو اس گونگے کو تماشہ بنا کر تفریح کرنے آئے تھے' اب یہاں خود تماشہ بن رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اس حرام زادی شہانہ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میں بھی اس کے منہ پر طمانچہ رسید کر دوں۔"

میں نے نرگس کی سوچ میں کہا۔ "میں شہانہ سے کمزور تو نہیں ہوں۔ یہ دبلی پتلی ہڈی سی ہے۔ اگر میں نے اپنی توہین کا بدلہ نہ لیا تو ہمیشہ دل ہی دل میں کڑھتی رہوں گی — حرام زادی — کمینی — میں تجھے نہیں چھوڑوں گی۔"

وہ غراتی ہوئی اور گالیاں دیتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھی اور شہانہ کو تڑاتڑ مارنے لگی۔ جواب میں شہانہ بھی اس سے لپٹ گئی۔ ہنگامہ سرد ہونے کے بجائے اور گرم ہو گیا۔ میں اطمینان سے چلتا ہوا دروازے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور تماشہ بنانے والوں کو تماشہ بنتے ہوئے دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو میں وہاں سے نکل کر ایئر کنڈیشنڈ کوچ میں واپس آ گیا۔ وہاں شبانہ دروازے کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اندر آ کر اپنی آنکھوں سے چشمہ اتارا اور کانا بننے کے لئے جو آنکھ دبائی تھی' اسے رومال سے صاف کرنے کے بعد کھول دیا۔ شبانہ نے میری دونوں آنکھوں کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم کانے نہیں ہو؟"

میں نے اشارے سے کہا کہ میں اس کی بات نہیں سمجھتا ہوں تب اسے یاد آیا کہ میں گونگا ہوں۔ اس نے اشارے سے اپنی آنکھ دبا کر وہی سوال کیا۔ لیکن آنکھ دباتے وقت اسے فوراً احساس ہو گیا کہ اس عمل کو صرف آنکھ دبانا ہی نہیں بلکہ آنکھ مارنا بھی کہتے ہیں۔ وہ اک دم سے جھینپ کر نظریں چرانے لگی۔

میں نے گونگے پن سے اس کے شانے کو تھپک کر اپنی طرف مخاطب کیا اور اسے سمجھایا کہ میری آنکھ میں تنکا پڑ گیا تھا' اس لئے میں نے ایک آنکھ بند کی ہوئی تھی۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اب وہ مجھ جیسے اجنبی کے سامنے ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے اس کی سوچ میں کہا

"یہ بے چارہ گونگا اور بے ضرر انسان ہے۔ فیروز اور جمشید کی طرح یہ گندی نیت کا نہیں معلوم ہوتا۔ مجھے اس کے قریب رہتے ہوئے نہیں ہچکچانا چاہیئے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر کھڑکی کے باہر گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھتی ہوئی سوچنے لگی۔ "ہاں' ٹھیک ہی تو ہے' بیچارے گونگے لوگ ہمدردی اور توجہ کے محتاج رہتے ہیں۔ زبان رکھنے والوں نے کبھی میرے دکھ درد کو نہیں سمجھا۔ یہ زبان والا نہیں ہے اس لئے میری حقیقت کو سمجھ کر کبھی نفرت کا اظہار نہیں کر سکے گا۔"

وہ سوچ رہی تھی اور میرے دل میں اس کے لئے بے پناہ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ اس ایئر کنڈیشنڈ کوچ میں اتنے دولتمند لوگوں کے درمیان رہنے والی وہ لڑکی اندر سے اتنی دکھی ہو گی' یہ حقیقت باہر سے سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ میں نے اس کی سوچ میں کہا۔

"میں تو بظاہر خوشحال نظر آتی ہوں پھر وہ کون سا دکھ ہے جو اندر ہی اندر مجھے کھائے جا رہا ہے۔ اگرچہ میں اپنے دکھوں کو اچھی طرح پہچانتی ہوں پھر بھی تنہائی میں ان کی یاد تازہ کرتے وقت ایک دکھ بھرا سکون محسوس ہوتا ہے۔ پرانی یادوں کی البم نہ ہو تو ماضی سے رشتہ کٹ جاتا ہے' اور ماضی سے کٹ کر زندہ رہنا بہت مشکل ہے۔"

میں اس کی سوچ کے ذریعے اسے اکسا رہا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی کتاب میرے سامنے کھول دے لیکن بعض لڑکیاں اپنی زندگی کے کسی اہم

راز کو دل کے تہہ خانے میں اس طرح چھپا دیتی ہیں کہ دماغ کے اندر خیالوں کی سرنگ بچھانے والا فرہاد علی بھی اس تہہ خانے تک نہیں پہنچ سکتا۔

میں نے بہت کوشش کی کہ وہ میری مرضی کے مطابق سوچے۔ لیکن اس کے ذہن کے اندر اچھی خاصی خیالی جنگ ہوتی رہی اور وہ اپنے ماضی کے متعلق سوچنے سے انکار کرتی رہی۔ جب اسے احساس ہوا کہ میں اس کے چہرے کو مسلسل تک رہا ہوں اور ذہنی کرب میں مبتلا ہونے کے باعث اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی ہے تو وہ جلدی سے سر جھکا کر وہاں سے چلی گئی۔

میں اس کے خیالات پڑھتا ہوا اپنے کیبن میں آ گیا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے دوران بھی میں اس کے ذہن میں جھانکتا رہا۔ وہ اپنے کیبن میں پہنچنے کے بعد اپنی ماں سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئی تھی اور چھوٹے بھائی کو گود میں لے کر اسے کھلا رہی تھی۔ باتوں کے دوران اس نے ماں کو سمجھایا۔

"امی! آپ اس قدر اداس کیوں رہتی ہیں۔ ہمیں جو نقصان اٹھانا تھا اٹھا چکے ہیں۔ خدا کا شکر ہے آپ کے نام جو جائیداد رہ گئی ہے' اس کے سہارے ہم عزت و آبرو سے زندگی گزار لیں گے۔"

شبانہ کی سوچ کے ذریعے اس کی ماں کی باتیں سنائی دیں' وہ کہہ رہی تھی۔ "بیٹی — اللہ تعالٰی کھانے کے لئے سوکھی روٹیاں بھی دے تو ہم اس کا شکر ادا کریں گے۔ لیکن جب کوئی قیمتی چیز گم ہو جاتی ہے یا چھین لی جاتی ہے تو اس کا افسوس ضرور ہوتا ہے۔ ہم کروڑوں روپے کی جائیداد کی مالک تھیں لیکن تمہارے چچا رفاقت علی نے بڑی چالبازی سے سب کچھ چھین لیا۔ ستم یہ کہ وہ تمہیں اب اپنی بہو بھی نہیں بنانا چاہتے۔ کیا اس ظلم پر ماں کا دل نہیں کڑھے گا۔ میں بتا نہیں سکتی کہ یہ سب کچھ سوچتے وقت میرا کلیجہ کس طرح پھٹنے لگتا ہے۔"

اس بات پر شبانہ اپنی ماں کو تسلیاں دینے لگی۔ اس کی تسلیاں اور اس کی باتیں میری رہنمائی نہ کر سکیں کہ اس کا چچا رفاقت علی کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟ کروڑوں کی جائیداد نکل جانے کا افسوس شبانہ کو اتنا نہیں تھا جتنا کہ اس کی ماں کو تھا۔ پھر بھی اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ دکھوں کا بوجھ اٹھائے زندگی گزار رہی ہے اور اپنے چہرے پر مسکراہٹ لا کر ماں کو تسلیاں دے رہی ہے کہ وہ غم نہ کرے۔

میں نے شبانہ کو سوچ کے ذریعے مجبور نہیں کیا کہ وہ میرے لئے رفاقت علی کے متعلق معلومات فراہم کرے۔ میں نے سوچا کہ سفر بہت لمبا ہے۔ اپنی منزل پر پہنچنے تک میں رفتہ رفتہ معلومات حاصل کروں گا۔ اگر شبانہ کا سفر مختصر ہوا تو میں بھی اپنا پروگرام تبدیل کر دوں گا۔ میں تو محض کچھ عرصے کے لئے ماسٹر لوشے سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ اس کے لئے میں کہیں بھی وقت گزار سکتا تھا۔ اگر شبانہ' اس کی ماں اور اس کے چھوٹے بھائی کے کام آ کر وقت گزر جاتا تو اس سے اچھی اور کیا بات ہوتی؟

میں برتھ پر آ کر لیٹ گیا۔ میں نے اندر سے دروازہ بند نہیں کیا تھا مجھے بیرے کا انتظار تھا کہ وہ آئے گا تو میں اپنے لئے کھانا منگواؤں گا۔ دو گھنٹے بعد ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی تو وہی بیرا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ جسے میں نے بوفے کار میں کھانے کا آرڈر دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی' اس نے مجھے دیکھتے ہی ہاتھ نچا کر کہا۔

"واہ گونگے میاں! لڑائی جھگڑے سے ڈر کر یہاں آ کر چھپ گئے ہو۔ یہ کھانا کیا تمہارا باپ کھائے گا؟"

مجھے یہ بات سن کر بہت غصہ آیا لیکن اپنے گونگے پن سے مجبور تھا۔ اگر زبان کھولتا تو تمام ایئر کنڈیشنڈ کوچ میں یہ خبر پھیل جاتی۔ بوفے کار میں بھی بیرا اپنی حیرانی کا اظہار کرتا کہ ایک شخص نہ جانے کیوں خواہ مخواہ گونگا بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی یہ بات کسی دشمن کے کانوں تک پہنچتی تو میرا یہ سکون برباد ہو جاتا۔ اس لئے میں نے اپنے غصے کو برداشت کر لیا۔ بیرا برتھ کی سائیڈ میز پر کھانے کی ٹرے رکھ رہا تھا۔ میں نے سالن کی پلیٹ اٹھا کر اسے سونگھتے ہوئے اشاروں میں کہا کہ یہ سالن ٹھیک نہیں ہے۔

بیرے نے کہا۔ "واہ' گونگوں کے سونگھنے کی حس بڑی تیز ہوتی ہے۔ برخوردار! یہ فسٹ کلاس سالن ہے۔ جو مسافر اپنی پلیٹوں میں ایک آدھ بوٹی چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم انہیں کچن میں واپس لے جا کر ایک ہانڈی میں جمع کرتے ہیں۔ اس طرح ہم جھوٹے سالن کی ایک ہانڈی تیار کر لیتے ہیں۔ اس ہانڈی سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ بیرے اور باورچی کی جیب میں جاتی ہے۔"

یہ باتیں وہ اس انداز سے ہاتھ نچا کر کہہ رہا تھا۔ جیسے سالن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا ہو۔ میں نے جھنجلا کر گونگے اشارے میں کہا۔

"اسے واپس لے جاؤ۔ میں نہیں کھاؤں گا۔"

میرا اشارہ سمجھ کر وہ الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا۔ وہ زبردستی مجھے کھانے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا' اس لئے کھانے کی ٹرے اٹھانے لگا۔ اسی وقت میں نے اس کی سوچ میں کہا۔

"مجھے کھانے کی یہ ٹرے اس گونگے پر الٹ دینی چاہیئے۔ بعد میں، میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔"

یہ سوچتے ہی اس نے ٹرے کو اپنے سر سے بلند کیا۔ اسی وقت میں نے اس کی سوچ میں گھبرا کر کہا۔ "ارے ارے' ٹرے مجھ پر الٹ رہی ہے' میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔"

یہ سوچ اس کے دماغ کے کنٹرول میں نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ کانپے اور ٹرے میں رکھی ہوئی دال اور سالن اس پر الٹ گیا۔ اس کا سر' چہرہ اور کپڑے سب کے سب دال اور شوربے سے بھیگ رہے تھے۔ اور مرغی کی ایک ٹانگ اس کے گریبان میں یوں پھنس گئی تھی جیسے اس نے نکٹائی لگا رکھی ہو۔ اسی وقت میں نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر ٹپ کے

طور پر پیش کیا۔ اُس نے جھلا کر ایک ر دیے کو گالی دی۔ کانچ کی پلیٹیں ٹوٹ گئی تھیں۔ وہ خالی ٹرے لیکر گالیاں بکتا ہوا کیبن سے باہر جانے لگا۔ اس کا جھلایا ہوا ذہن اس سے کہہ رہا تھا کہ دروازے کو زور سے بند کرنا چاہیئے۔

باہر جاکر جب اُس نے دروازے کو بند کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میں نے اس کی سوچ میں کہا۔ "مجھے دروازہ بند کرتے وقت اس گونگے کو گھونسہ دکھانا چاہیئے۔"

وہ دروازہ بند کر ہی رہا تھا کہ میری سوچ کے مطابق اس نے بایاں ہاتھ بڑھا کر گھونسہ دکھایا۔ اسی وقت دروازہ ایک جھٹکے سے بند ہو گیا۔ اس کے چیخنے کی آواز ایئر کنڈیشنڈ کوچ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گونجتی چلی گئی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازے کو کھولا۔ دروازے اور چوکھٹ کے بیچ اس کی کلائی بُری طرح پھنس گئی تھی۔ جب وہ کلائی آزاد ہوئی تو اس کی آستین خون سے بھیگ رہی تھی۔ بہت سے لوگ دوڑتے آ رہے تھے۔ میں نے فوراً ہی چشمہ پہن لیا تھا۔ وہ بیرا سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور اب مثبت انداز میں سوچ رہا تھا۔

"میں نے اس گونگے کو گالیاں دی تھیں۔ گونگوں کی معصومیت رنگ لاتی ہے۔ خدا نے مجھے یہ سزا دی ہے۔ یہ کتنی عجیب سی بات ہے کہ میں نے خود اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے کو زخمی کیا ہے۔ ایسے وقت میں اپنے آپ میں نہیں تھا۔ مجھ پر سچ مچ خدا کا قہر نازل ہوا ہے ۔۔۔۔۔۔"

دوسرے کیبنوں سے نکل کر آنے والے اس سے چیخنے کی وجہ پوچھ رہے تھے اور کبھی مجھے اور کبھی اس کی خون آلود آستین کو دیکھ رہے تھے۔ بیرے نے کہا۔

"یہ سب کچھ میری غلطی سے ہوا ہے۔ دروازہ بند کرتے وقت میرا ہاتھ دب گیا تھا۔"

ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے بیرے کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے کپڑوں پر سالن گرا ہوا ہے اور تم نے اپنا ہاتھ خود دروازے میں پھنسا لیا۔ کیا ان باتوں سے ظاہر نہیں ہوتا کہ تم نشہ کرتے ہو ۔۔۔ میاں! شرم کرو اور اس واقعے سے عبرت حاصل کرو۔ اگر نشے کی حالت میں چلتی ٹرین سے گر گئے تو جان سے جاؤ گے۔ چلو جاؤ یہاں سے ۔۔۔ خبردار! یہاں نشے کی حالت میں نہ آنا۔"

وہ سر جُھکا کر وہاں سے جانے لگا۔ اس ادھیڑ عمر کے آدمی کے ساتھ کھڑے ہوئے ایک بوڑھے شخص نے اپنے کیبن کی طرف مُڑتے ہوئے کہا۔

"چلو رفاقت علی! اس کمبخت نے شطرنج کا مزا خراب کر دیا۔"

رفاقت علی کا نام سُن کر میں چونک گیا۔ شاید یہ وہی رفاقت علی ہو جس نے شبانہ سے اس کی کروڑوں کی جائیداد چھین لی تھی۔ رفاقت علی نے میرے کیبن کے اندر دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"تم تنہا سفر کر رہے ہو؟"

میں نے اشارے سے بتایا کہ میں گونگا ہوں اور اس کی باتیں سمجھنے کے قابل نہیں ہوں۔ رفاقت علی نے اشاروں میں اپنا سوال دُہرایا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہاں میں تنہا سفر کر رہا ہوں۔ اس کے بوڑھے ساتھی نے کہا۔ "کیا بات ہے رفاقت! تمہیں اس کی تنہائی سے کیا دلچسپی ہے؟"

رفاقت علی نے جواب دیا۔ "میں اس گونگے کے متعلق بہت کچھ سوچ رہا ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس نے ڈبل کرایہ دے کر پورا کیبن اپنے لئے ریزرو کرایا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے ساتھ جوان لڑکیاں ہیں۔ یہ گونگے اندر سے بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ ہمیں اس پر کڑی نظر رکھنی چاہیئے۔ تیسری بات یہ کہ اس کے کیبن میں تنہائی ہے۔ اگر ہم اس کے ساتھ دوستی کر لیں تو ہم یہاں بڑے سکون سے شطرنج کھیل سکتے ہیں۔ وہاں کیبن میں ہماری بیگمات بکواس کرتی رہتی ہیں اور اپنی بکواس کے ذریعے ہماری چالیں بدلتی رہتی ہیں۔ یہاں کھیلنے میں لُطف آئے گا۔"

بوڑھے نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "تم واقعی ذہین ہو۔ وقت اور حالات کے مطابق مکمل منصوبہ بنا لیتے ہو۔ یہاں ہمارا کھیل بھی ہو گا اور ہم اس نوجوان پر نظر بھی رکھیں گے۔"

جب وہ دونوں اپنے اس فیصلے پر متفق ہو گئے تو رفاقت علی نے دوستانہ انداز میں مصافحے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھایا اور مجھے اشاروں میں سمجھایا کہ وہ اس کیبن میں آکر تھوڑا وقت گزارنا چاہتے ہیں۔ میں نے خوشی سے اجازت دے دی۔ وہ دونوں شطرنج کی بساط لانے کے لئے اپنے کیبن کی طرف چلے گئے۔ میں اپنے کیبن میں آیا اور برتھ پر بیٹھ کر رفاقت علی کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ وہ اپنے کیبن میں پہنچ کر کہہ رہا تھا۔

"بیگم! میں یہاں شیخ صاحب کے ساتھ کھیلتا رہوں گا تو تم لائٹ بجھا کر سو نہیں سکو گی۔ یہاں ایک کیبن میں ایک گونگا سفر کر رہا ہے۔ اجازت ہو تو میں وہاں جاکر شطرنج کی بازی جماؤں۔"

اس کی بیگم پٹاخے کی طرح بولنے لگیں۔ "آپ کس گونگے سے دوستی کر آئے ہیں؟ میں آپ کی چالبازیوں کو خوب سمجھتی ہوں۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ شبانہ کی ماں پر نیت خراب ہے۔ کان کھول کر سُن لیجئے میں آپ کو رات بھر کے لئے شطرنج کھیلنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ چُپ چاپ بتی بجھایئے اور یہاں سو جایئے ۔۔۔ اور شیخ صاحب! آپ تو شطرنج کے دیوانے ہیں۔ اس عمر میں بھی راتوں کو جاگتے ہیں۔ خدا کے لئے میرے میاں کا پیچھا چھوڑ دیجئے۔ صبح ہو گی تو شطرنج کی بساط جما لیجئے گا۔"

رفاقت علی اپنی بیوی کے آگے بھیگی بلی بن گیا تھا۔ وہ دوبارہ اپنے کیبن سے باہر نہیں آسکا۔ بیگم نے شیخ صاحب کو رخصت کر کے کیبن کو اندر سے بند کر دیا تھا اور بتی بُجھا دی تھی۔

میں تھوڑی دیر کے لئے مایوس ہو گیا۔ رفاقت علی یہاں شطرنج کھیلنے کے لئے آتا تو میں یقیناً اس کے ذہن سے بہت سی باتیں اُگلوا لیتا۔ مگر رات بھر کے لئے بیگم پہریدار بن گئی تھیں۔ جو عورت اپنے شوہر پر اس قدر حاوی ہو وہ یقیناً اس کی سازشوں میں شریک رہتی ہو گی۔ عورت دماغی طور پر

تیز ہوتی ہے۔ مرد جو بات دیر سے اُگلتا ہے اُسے عورت فوراً ہی اُگل دیتی ہے۔ یہ سوچ کر میں بیگم کے ذہن میں جھانکنے لگا۔

بیگم بتی بجھانے کے بعد رفاقت علی کے بستر پر آکر بیٹھ گئی تھیں اور دبی آواز میں کہہ رہی تھیں۔ "آپ میرے سر کی قسم کھایئے۔ کیا آپ ابھی مجھ سے جھوٹ بول کر زلیخا کے پاس جانا نہیں چاہتے تھے؟"

رفاقت علی نے کہا۔ "بیگم! شبانہ کی ماں کو اس طرح بدنام نہ کرو۔ جو اس کے پاس تھا وہ سب کچھ ہم نے چھین لیا۔ اب اُسے عزت سے جینے دو۔ اسے بدنام کر کے ہمیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔"

بیگم نے کہا۔ "آپ جھوٹی پارسائی جتا رہے ہیں۔ میں نے آپ کو نیند کی حالت میں کئی بار زلیخا کا نام بڑبڑاتے سُنا ہے۔"

"مجھے تو یقین نہیں ہے کہ میں نیند میں بڑبڑاتا ہوں۔ بفرضِ محال میں نے نیند میں اس کا نام لیا بھی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دوسرے پہلو سے میرے ذہن پر حاوی رہتی ہے۔"

"وہ دوسرا پہلو کیا ہے؟ ذرا میں بھی تو سُنوں۔"

"میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اسلام آباد کے راستے میں جو زلیخا کے نام شاندار کوٹھی ہے اسے میں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مگر تمہارے بیٹے فیروز نے میرے اس منصوبے کو خاک میں ملا دیا ہے۔ پہلے وہ شبانہ سے عشق کرتا تھا جب شادی کی بات آئی تو وہ نرگس سے محبت کرنے لگا۔ تم ماں ہو کر اپنے بیٹے کو نہیں سمجھا سکتیں کہ وہ شبانہ سے شادی کرے تو اس شاندار کوٹھی کے ساتھ زلیخا کی تمام جائیداد شبانہ کے جہیز میں آئے گی۔"

"ہمارے پاس دولت کی کیا کمی ہے کہ میرا بیٹا ایک کوٹھی اور تھوڑی سی جائیداد کے لئے شبانہ جیسی بدکار لڑکی کو اپنی شریکِ حیات بنائے۔"

"بیگم! یہ تو سوچو کہ شبانہ کو بدکار بنانے والا تمہارا ہی بیٹا ہے۔"

وہ غصے سے بولی۔ "بس اپنی زبان بند رکھیں۔ باپ ہو کر بیٹے کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ آپ یہ نہیں سوچتے کہ زلیخا اپنی جائیداد شبانہ کے جہیز میں نہیں دے گی۔ وہ اپنی جائیداد اپنے چھوٹے بیٹے عامر کے لئے رکھے گی۔"

"دولت اور جائیداد کے لئے بیٹا باپ کو اور بھائی بھائی کو قتل کرتا ہے اور عامر تو میرا بھتیجا ہے۔ اسے راستے سے ہٹا دینا کون سا مشکل کام ہے۔ تمہارا بیٹا اگر چاہے تو میرے منصوبے کو کامیاب بنا سکتا ہے۔"

"کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ وہ شبانہ سے شادی کر لے؟"

"ہاں۔ میں یہی چاہتا ہوں۔"

"آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جو لڑکی شادی سے پہلے ایک ناجائز بچے کو جنم دے چکی ہے۔ کیا میں اسے اپنی بہو بنا دوں گی؟"

"وہ مُردہ بچہ تمہارے بیٹے کا ہی تھا۔ اس حقیقت سے انکار کیوں کرتی ہو؟"

"خاندان میں ناک اونچی رکھنے کے لئے بہت سی حقیقتوں سے انکار کرنا پڑتا ہے۔ اب میں سمجھ گئی کہ آپ شبانہ کو کیوں ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ وہ پھر اپنی اداؤں سے میرے بیٹے کو دیوانہ بنا لے۔ مگر آپ کے چاہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ نرگس میری بھانجی ہے میں اسے اپنی بہو بناؤں گی۔"

رفاقت علی نے بیزار ہو کر کہا۔ "تمہارے جو جی میں آتا ہے کرو۔ ہمارے جیسے مرد ہر میدان میں جیت جاتے ہیں لیکن بستر پر آکر ہار جاتے ہیں۔ چلو آؤ اب سو جاؤ۔"

میں نے بیگم سے دماغی رابطہ ختم کر دیا اور اپنے طور پر سوچنے لگا۔ شبانہ کے تمام حالات میرے سامنے چلے آئے تھے۔ اسے اندر ہی اندر کون سا دُکھ کھائے جا رہا تھا۔ یہ مجھے معلوم تھا وہ سچ مچ ستم رسیدہ تھی۔ رفاقت علی نے اس کی جائیداد ہتھیالی تھی اور اس کے بیٹے فیروز نے اس کی عزت لُوٹ لی تھی۔ اب اس لڑکی کی زندگی میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جس پر وہ فخر کر سکتی۔ اب میرا فرض تھا کہ میں اس کے کام آتا۔ ایسے ہی وقت میری صلاحیتیں نیک اور تعمیری مقاصد کے لئے کام آتی ہیں۔ میں شبانہ کے خیالات معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ اپنی تباہیوں پر کس انداز سے سوچ رہی ہے اور اب فیروز کے لئے اُس کے کیا جذبات ہیں؟

یہ معلومات حاصل کرنے کے لئے میں شبانہ کے ذہن میں جھانکنا چاہتا تھا لیکن اسی وقت کیبن کے باہر بہت سے قدموں کی آواز سُنائی دی۔ پھر میرے کیبن کا دروازہ کُھل گیا۔ دروازے پر فیروز اور جمشید کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے شہانہ اور نرگس تھیں۔ وہ سب مجھے گھُور کر دیکھ رہے تھے۔ فیروز نے کہا۔

"یہ کمبخت ہمیں آپس میں لڑا کر یہاں آرام سے لیٹا ہوا ہے۔ جی چاہتا ہے اسے اُٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دوں۔"

شہانہ نے کہا۔ "جانے دو فیروز! غصہ تھوک دو۔ اس بیچارے گونگے نے ہمیں لڑنے کے لئے نہیں کہا تھا۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ میں نے تم پر ہاتھ اُٹھا دیا۔ میں تم سے معافی مانگ چکی ہوں۔ اس قصے کو ختم کرو۔"

جمشید نے کہا۔ "ہمیں تو اس بات پر غصہ آ رہا ہے کہ اسے تماشہ بنانے کے بجائے ہم تماشہ بن گئے۔ ریفرشمنٹ کار میں پلیٹوں اور کرسیوں کا جو نقصان ہوا ہمیں اس کی قیمت ادا کرنا پڑی۔"

ان کی باتوں کے دوران نرگس نے حیرانی سے چیخ کر کہا۔ "ارے یہ تو کانا نہیں ہے۔ شبانہ نے جھوٹ کہا تھا۔"

نرگس کی بات پر وہ سبھی چونک کر میری آنکھوں کی طرف [illegible] اس وقت میں نے چشمہ اُتار دیا تھا۔ فیروز نے آگے بڑھ کر ایک [illegible] ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"تم کانے نہیں تھے۔ پھر کیا اُس لڑکی کو آنکھ مار رہے تھے؟"

میں نے اشاروں میں انہیں سمجھایا کہ میری آنکھ میں تنکا پڑ گیا تھا اس لئے میں نے اپنی ایک آنکھ بند رکھی تھی۔ میرے جواب پر وہ بجید مایوس ہوئے کیونکہ ان کی توقعات کے مطابق مجھ میں کوئی عیب نہیں تھا۔ جمشید نے حقارت سے کہا۔

"اونہہ، اگر کانا نہیں ہے تو کیا ہوا، گونگا تو ہے۔ کون اس کے ساتھ اپنا دماغ خراب کرے گا۔ چلو یہاں سے ......"

وہ سب وہاں سے جانے لگے۔ میرے کیبن میں فیروز سب سے آگے تھا۔ جانے کے لئے پیچھے مڑتے وقت وہ سب سے پیچھے ہو گیا۔ نرگس اس کے ساتھ چلنے کے لئے دروازے سے لگی کھڑی تھی اور بے اختیار اُسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس وقت اگر میں اس کے خیالات کو پڑھتا تو اس کے بہت سے چور جذبے مجھ پر عیاں ہو جاتے۔ لیکن میں اس کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ کیونکہ میں شبانہ کی خاطر سب سے پہلے فیروز سے نمٹنا چاہتا تھا اس لئے میں اس کے ذہن میں جھانک رہا تھا۔

وہ واپس مڑتے وقت میرے کیبن سے باہر جانے کے دوران کن انکھیوں سے نرگس کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

"یہ بظاہر میرے ساتھ چلنے کے لئے دروازے پر کھڑی رہ گئی ہے مگر بے اختیار اس گونگے کو دیکھے جا رہی ہے۔ میں نے یونی کار میں بھی کئی بار یہ بات نوٹ کی ہے۔ بلاشبہ اس گونگے کی شخصیت میں ایسا مردانہ حُسن اور کشش ہے کہ ہر عورت اسے دیکھنے پر مجبور ہو جائے گی اور ہر مرد اسے دیکھ کر ایک رقیب کی طرح کُڑھتا رہے گا۔"

اس نے دروازے پر پہنچ کر بظاہر مسکراتے ہوئے نرگس کا ہاتھ تھام لیا پھر اس کے ساتھ چلتے ہوئے سوچنے لگا۔

"لیکن مجھے نرگس سے ایسی توقع نہیں تھی۔ میں نے اس کے لئے شبانہ جیسی وفادار لڑکی کو چھوڑ دیا اور یہ ہے کہ گونگے کی طرف اندر ہی اندر کروٹ بدلتی جا رہی ہے۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ عورت ذات پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔"

میں نے اسی وقت اس کی مثبت سوچ میں کہا۔ "یہی بات شبانہ میرے متعلق سوچ رہی ہو گی کہ مرد ذات پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ جب کسی کی بے وفائی چرکہ لگاتی ہے تو دوسرے کی وفا یاد آتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ شبانہ آج بھی میری آس لگائے جی رہی ہے۔ مجھے اسے اس طرح نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے۔"

اس کی منفی سوچ نے کہا۔ "یہ میں اچانک ہی شبانہ کے متعلق کیوں سوچ رہا ہوں؟"

میں نے اس کی مثبت سوچ میں کہا۔ "شاید اس لئے کہ وہ سوچنے سمجھنے کی چیز ہے۔ ایسے وقت جبکہ میں نرگس کی بہکتی ہوئی نظروں کو سمجھ رہا ہوں تو شبانہ ضرور یاد آئے گی کہ اس کی آنکھوں میں کتنی حیا ہے۔"

وہ پریشان ہو کر اپنی پیشانی کو سہلانے لگا۔ نرگس نے ایک جگہ رُک کر پوچھا۔ "کیا بات ہے تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟"

"آں ..... ہاں جمشید سے خواہ مخواہ جھگڑا ہو گیا تھا۔ میرا سر ابھی تک دُکھ رہا ہے۔ اب میں جا کر ذرا آرام کروں گا۔"

نرگس سوچنے لگی۔ "اسے چلا جانا چاہیئے۔ لیکن رسمی طور پر روکنا بھی ضروری ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ سچ مچ رُک جائے۔ پتہ نہیں کیوں صرف اس گونگے کے متعلق سوچنے کو دل چاہتا ہے مگر رسماً تو کچھ کہنا ہی ہو گا۔" وہ کہنے لگی۔

"تم اتنی جلدی چلے جاؤ گے تو میں بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے تمہارے ہی بارے میں سوچتی رہوں گی۔ مگر اس وقت تمہارا بدن دُکھ رہا ہے تمہیں واقعی آرام کرنے کی ضرورت ہے۔ تم جاؤ آرام کرو۔ اب صبح ملاقات ہو گی۔"

وہ گڈ نائٹ کہہ کر اپنے کیبن کی طرف چلا گیا۔ نرگس اپنے کیبن کے دروازے پر کھڑی اسے دُور تک جاتے دیکھتی رہی۔ جیسے اس جانے والے کے لئے اس کی نگاہیں ترس رہی ہوں۔ لیکن جیسے ہی وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر اپنے کیبن کے اندر گیا، وہ فوراً ہی پلٹ کر میرے کیبن کی طرف دیکھنے لگی۔

ٹیلی پیتھی کا علم میرے لئے باعث رحمت بن گیا ہے۔ اس کے ذریعے میں لوگوں کی دوہری شخصیتوں کو کُھلی کتاب کی طرح پڑھ لیتا ہوں۔ ہر تجربے کار انسان اس حقیقت کو سمجھتا ہے کہ انسان کے اندر دو متضاد خیالات اور دو متضاد شخصیتیں ہوتی ہیں۔ وہ اوپر سے جو کچھ نظر آتا ہے اندر سے اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ اس کے ہونٹ بظاہر جس کے لئے مُسکراتے ہیں، اس کا دل باطن میں نہیں مسکراتا بلکہ گالیاں دیتا ہے۔

یہی حال نرگس کا تھا۔ اس کی نرگسی آنکھیں فیروز کے کیبن کی طرف تھیں کہ کہیں وہ آ نہ جائے۔ اس کا نرگسی دل میرے کیبن کے دروازے پر لگا ہوا تھا اور دھڑکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ہم لڑکیاں جس طرح کا آئیڈیل اپنے دماغ میں تراشتی ہیں وہ حقیقی دنیا میں نہیں ملتا۔ ملتا بھی ہے تو گونگا ہوتا ہے یا کسی طرح کا عیب ہوتا ہے مجبور ہو کر دولت کی خاطر فیروز جیسے نوجوانوں کو گلے لگانا پڑتا ہے۔ فیروز کو کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ چونکہ وہ گونگا مجسم میرے آئیڈیل کے روپ میں آ گیا ہے، اس لئے فیروز پھیکا پڑ گیا ہے ..... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟ دانشمندی تو یہی ہے کہ اپنے آئیڈیل کو نظرانداز کر دوں۔ پنڈی پہنچتے ہی میں فیروز سے منسوب ہونے والی ہوں۔"

وہ اپنے کیبن میں داخل ہوتے ہوئے سوچتی رہی۔ "ہاں ٹھیک ہی تو ہے۔ صرف اس ٹرین میں اس گونگے کا ساتھ ہے پھر وہ کہاں ہو گا اور میں کہاں رہوں گی۔ چوبیس گھنٹے کے لئے مجھے ایسے آئیڈیل پر لعنت بھیج کر صبر کرنا چاہیئے۔ اُونہہ، بندر کہیں کا ......"

ایک بار پہلے بھی اُس نے مجھے بندر کہا تھا۔ وہ بھی صرف فیروز کو

سُنانے کے لئے۔ لیکن میں خیالات کی تہہ میں پہنچنے والا یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی زبان جو کہتی ہے وہ دل نہیں کہتا اور دل جو کہتا ہے اسے زبان کہتے ہوئے ڈرتی ہے۔

وہ بہت حسین تھی اور اس کے بدن کے خطوط اتنے دلنشیں تھے کہ مجھے پہلی فرصت میں ہی اس کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے تھا لیکن میں تعمیری مقصد کے سامنے تخریب کی باتیں نہیں سوچتا۔ اس وقت میرا مقصد شبانہ کی بگڑی بنانا تھا جبکہ خداوند کریم نے مجھے اتنی صلاحیتیں دی تھیں اور وہ اب بے نیاز مجھے وسیلہ بنا کر ایک ستم رسیدہ لڑکی کی تقدیر سنوارنا چاہتا تھا پھر میں اس نیک کام میں کوتاہی کیسے کر سکتا تھا۔ میں نے نرگس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور شبانہ کی دلی کیفیات کا جائزہ لینے لگا۔

شبانہ اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ کبھی وہ کروٹ بدل کر دوسری طرف پر لیٹی ہوئی اپنی والدہ کو دیکھتی تھی۔ اس کی والدہ کی بند آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ بڑی دیر تک آنسوؤں سے بھیگنے کے بعد گہری نیند سو رہی ہیں۔ جب وہ کروٹ بدلتی تو اپنے پہلو میں اسے تین برس کا عامر نظر آتا جو اس دنیا والوں کی سازشوں سے بے خبر اپنے معصوم سپنوں میں کھویا ہوا تھا پھر وہ سیدھی لیٹ جاتی۔ اس وقت فیروز کا چہرہ اس کے سامنے آ جاتا۔ وہ سرد آہ بھر کر سوچتی۔

"خدا رُوٹھ جائے تو اس کی خدائی سے انکار نہیں کیا جاتا۔ محبوب رُوٹھ جائے تو اس کی محبت سے انکار کیسے ہو سکتا ہے؟ محبوب کے بدل لینے کا یہ مطلب تو نہیں کہ عورت کی محبت بھی بدل جاتی ہے۔ وہ سامنے نہیں ہوتا تو کیا ہوا ستانے اور رُلانے کے لئے اس کی یادیں تو ہوتی ہیں۔ محبت کسی نہ کسی طرح دائم و قائم رہتی ہے۔ مسکراہٹ کی صورت میں نہ سہی آنسوؤں کی صورت میں سہی۔ میرے آنسوؤں کا کوئی نہ کوئی قطرہ کبھی نہ کبھی اس کے دل پر ٹپکے گا۔ تب وہ اپنی بے وفائیوں کا حساب کرے گا۔ ہر انسان کی زندگی میں یوم حساب آتا ہے۔ وہ دن اس کی زندگی میں ضرور آئے گا، یہی میرا ایمان ہے یہی میرا انتظار ہے ......"

اس کی سوچ میں کتنا کرب تھا۔ یہ میں دل کی گہرائیوں سے سمجھ رہا تھا مجھے فیروز پر غصہ آ رہا تھا۔ میں اس کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی اس لئے نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس جیم جبلی کا محبوب تھا۔

میں نے فیروز کی طرف توجہ دی۔ وہ کمبخت اپنے بستر پر لیٹا نرگس کی حرکتوں پر کُڑھ رہا تھا۔ مرد کی فطرت بھی عجیب ہوتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایک عورت اسے محبت کا فریب دے کر چوری چھپے دوسرے کو ترجیح دے رہی ہے پھر بھی اس بے وفا کے لئے کُڑھتا ہے اور یا وفا کے لئے نہیں سوچتا۔ دراصل اس کی مردانگی کو ٹھیس پہنچتی ہے کہ اس کے مقابل دوسرے کو ترجیح کیوں دی گئی۔ پھر انتقاماً عملی طور پر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ جسے وہ ترجیح دے رہی ہے، اسے وہ چٹکیوں میں مسل سکتا ہے۔

وہ احمق مجھے مسلنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے اس کی مثبت سوچ میں کہا۔

"ٹھنڈے دل سے جل بھن کر سوچنا دانشمندی نہیں ہے۔ وہ گونگا دیکھنے میں چھوٹا ہے اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا۔ اگر وہ کمزور ہوتا تب بھی اسے راستے سے ہٹا کر کوئی فائدہ حاصل نہ ہوتا کیونکہ نرگس اپنی چور عادتوں کے مطابق ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے کی طرف پھسلتی جائے گی۔ میں کب تک ایک بے حیا لڑکی کے لئے دوسروں کو اپنا دشمن بناتا پھروں گا۔ میں اُس کے متعلق کیوں نہیں سوچتا جو باحیا اور باوفا ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے اس کے دماغ کو آزاد چھوڑ دیا۔ اب وہ سوچ رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟ آج شبانہ بار بار میرے ذہن میں چلی آ رہی ہے۔ کسی عاقل نے سچ کہا ہے کہ ایک چیز کو سمجھنے کے لئے اس کی ضد کو سمجھنا ضروری ہے۔ پھولوں کو سمجھنے کے لئے کانٹوں کو، خوبصورتی کو سمجھنے کے لئے بدصورتی کو اور وفاشعار عورت کو سمجھنے کے لئے بے وفا عورت کا مشاہدہ کرنا لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نرگس کی بیوفائی مجھے بار بار شبانہ کے حسنِ وفا کو یاد دلا رہی ہے ..... یہ ٹھیک ہے میں تسلیم کرتا ہوں کہ شبانہ ہر لحاظ سے ایک مکمل شریکِ حیات بن سکتی ہے لیکن ٹھوک کر چاٹنا مَرد کی شان نہیں ہے۔"

میں نے اس کی سوچ میں کہا۔ "مَرد کی شان یہ بھی نہیں ہے کہ وہ ایک معصوم کلی کو پھول بنائے۔ اُسے اپنے مُردہ بچے کی ماں بنا کر سارے جہاں میں بدنام کرے۔ کیا میں اسے مَردانگی کہہ سکتا ہوں؟ مَرد تو اُسے کہتے ہیں جو اپنی غلطی کا دل سے اعتراف کرے اور مَردانہ وار اس کی تلافی کرے۔ میرے ڈیڈی آج بھی یہی چاہتے ہیں کہ میں شبانہ سے شادی کر لوں صرف امی مخالفت کر رہی ہیں۔ امی عورت ہیں، ڈیڈی مَرد ہیں اور مجھے ڈیڈی کے انداز میں ایک مرد کی طرح سوچنا چاہیئے اور اس پر عمل کرنا چاہیئے۔"

وہ گھبرا کر بستر پر اُٹھ بیٹھا۔ جو بات بھی اس کے دماغ میں آ رہی تھی وہ شبانہ کی حمایت میں تھی اور ٹھوس دلائل کے ساتھ اسے متاثر کر رہی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بڑی سنجیدگی سے شبانہ کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات کو یاد کرنے لگا۔ بچپن کی باتیں، جوانی کی باتیں، چوری چوری کی ملاقاتوں کی دلچسپیاں، اس کی دل لبھانے والی ایسی ادائیں جو بازاری نہیں ہوتیں جو صرف اپنے ایک محبوب کے لئے وقف ہوتی ہیں اور نرگس کی نرگسی آنکھوں کی طرح اِس کیبن سے اُس کیبن تک نہیں بھٹکتیں۔

وہ جیسے جیسے شبانہ کے متعلق پچھلی یادوں کو تازہ کر رہا تھا، اس کے دل کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا مگر اب بھی دماغ میں دوہری سوچ کا سایہ تھا۔ وہ اس بات سے ہچکچا رہا تھا کہ مرد ہو کر اب شبانہ کی طرف بڑھے گا تو اس کے غرور کو ٹھیس پہنچے گی۔

اگرچہ وہ ہچکچا رہا تھا لیکن یہ میری کامیابی تھی کہ اب وہ سنجیدگی سے شبانہ کے متعلق اچھے انداز میں سوچ رہا تھا۔ نرگس کی بے وفائی نے اس کے دل میں شبانہ کی قدر بڑھا دی تھی۔ اب ایسی صورت میں اگر شبانہ

[illegible] چلی آتی تو وہ یقیناً اس کی طرف مائل ہو جاتا۔
[illegible] دوسری طرف شبانہ کروٹیں بدلتے بدلتے بے خوابی سے گھبرا کر [illegible] میں نے اس کی سوچ میں کہا۔

"اس کیبن میں دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے تازہ ہوا کے لئے ذرا [illegible] جانا چاہیئے۔"

وہ اپنے حالات سے اور اس گھٹے ہوئے ماحول سے پریشان تھی اس لئے آہستگی سے اپنے کیبن کا دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ باہر آتے ہی اس کی نگاہیں بے اختیار اس کیبن کی طرف اٹھ گئیں جہاں اس کا بے وفا محبوب تھا۔ اس لڑکی میں بھی خودداری تھی۔ وہ فیروز کے سامنے جھک کر خود کو اور زیادہ گرانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اس کی سوچ کے خلاف اس کی نگاہیں فیروز کے کیبن کی طرف یا اس کی کسی بھی چیز کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ میں نے اس کی سوچ میں کہا۔

"محبت میں کسی کو جھکانے کے لئے پہلے خود جھکنا پڑتا ہے محبوب سے ایسی بے اعتنائی اور ایسی بے نیازی اچھی نہیں۔ یہ درست ہے کہ میں اس کے آگے گڑگڑانا نہیں چاہتی۔ لیکن محبت کے بھی کچھ فرائض ہوتے ہیں۔ مجھے محبت کے ناطے سے یہ تو دیکھنا چاہیئے کہ وہ آرام سے سو رہا ہے یا بے چینی سے کروٹیں بدل رہا ہے۔ تنہائی میں میرے ساتھ گزرا ہوا کوئی لمحہ تو اُسے یاد آتا ہوگا۔ اگر یاد نہیں آتا تو یہ میرے وجود کی اور محبت کی توہین ہے۔ مجھے کبھی تو اپنی محبت کو آزمانا چاہیئے۔"

یہ سوچتے ہی اس کے قدم فیروز کے کیبن کی طرف اٹھ گئے۔

کیبن کے اندر فیروز اسی طرح مضطرب اور پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی سوچ میں کہا۔

"کیا شبانہ میری طرف کھنچی چلی آئے گی؟ کیا جذبۂ عشق ابھی تک اسی طرح سلامت ہے کہ آج بھی وہ میری بے خوابی کا خیال رکھتی ہوگی اور میرے لئے پریشان رہتی ہوگی؟ ہاں اس کا بجھا بجھا سا چہرہ اور تھکی تھکی سی نظریں یہ بتاتی ہیں کہ آج بھی وہ میرے [illegible] راتوں کو جاگتی ہے۔ [illegible] شدت سے میرے [illegible] دماغ پر چھائی جا رہی ہے۔ تو مجھے بھی آزمانا چاہیئے کہ اس کے دل میں بھی میری اہمیت باقی ہے یا نہیں؟"

یہ سوچتے ہی وہ اپنے بستر سے اٹھ گیا۔ اس نے ایک نظر سامنے سوئے ہوئے جمشید پر ڈالی۔ پھر باہر جانے کے لئے بڑی آہستگی سے کیبن کا دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی یک بیک دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں کیونکہ وہ ٹھیک دروازے کے سامنے راہداری کی کھڑکی سے لگی کھڑی تھی۔ اس کے دل نے کہا کہ فیروز اب بھی اس کے لئے راتوں کو جاگتا ہے ——— فیروز کے دل نے کہا کہ وہ آج بھی ایک بے چین روح کی طرح رات کی خاموشی میں اس کے لئے بھٹکتی ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے، دونوں ایک دوسرے کو آزما چکے تھے۔ ان کی خاموشی کے درمیان ٹرین کی آواز کھٹ کھٹا کھٹ کی تال کے ساتھ دل کی دھک دھکا دھک سے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔ ویران راہداری میں بلب روشن تھے۔ ان سے زیادہ شبانہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کے چراغ روشن تھے۔

فیروز ان آنسوؤں کو نہ دیکھ سکا۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔ شبانہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکی۔ کیونکہ آنسو جتنی دور تک کہہ جاتے ہیں اتنی دور تک زبان تھک جاتی ہے۔ آنسوؤں سے زیادہ پُراثر فریاد اور کوئی نہیں ہوتی۔

فیروز سوچ رہا تھا کہ کیا کہے؟ کچھ کہے گا تو وہ بات ندامت سے خالی نہیں ہوگی اور وہ سر جھکا کر نادم ہونے کے باوجود زبان سے ندامت کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آخر انانیت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔

میں نے ان دونوں کے دماغوں کو آنا جانا چھوڑ دیا تھا اور انہیں اپنے طور پر سوچنے سمجھنے کا موقع دے رہا تھا۔ ایک دوسرے کے روبرو آنے کے بعد بات یقیناً کچھ آگے بڑھتی۔ لیکن اسی وقت جمشید نیند میں بڑبڑانے لگا فیروز نے یوں گھبرا کر دروازے کو بند کر دیا جیسے اس کی چوری پکڑی جا رہی ہو۔ وہ شبانہ کی طرف بڑھنے کے باوجود یہ نہیں چاہتا تھا کہ دنیا والوں کے سامنے وہ اپنی غلطی کی تلافی کرتا ہوا پایا جائے۔ دوسری طرف دروازہ بند ہوتے ہی شبانہ کو مایوس ہو جانا چاہیئے تھا کیونکہ اس کا محبوب اس کی طرف بڑھتے بڑھتے پھر واپس چلا گیا تھا۔ لیکن وہ آنسو بھری آنکھوں سے مسکرا رہی تھی۔ خوشی سے اس کا انگ انگ جھوم رہا تھا۔ ایک عرصے کے بعد اس نے اپنے سنگدل محبوب کو ندامت سے سر جھکاتے دیکھا تھا۔ عورت کے لئے بس اتنا ہی کافی ہے، وہ اتنا ہی چاہتی ہے کہ ظالم ہزار برس تک ظلم کرنے کے بعد صرف ایک لمحے کے لئے پچھتائے۔ وہ لمحہ اس کی زندگی کا حاصل ہوتا ہے اور مستقبل کی امید......

میں نے اُن دونوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا۔ مجھے فیروز کی طرف سے اطمینان ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا اگر وہ صبح تک پھر بہکے گا تو میں اُسے پھر راستے پر لے آؤں گا۔ میں نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ آدھی رات کو یا تو اُلو جاگتے ہیں یا چور بدمعاش یا پھر ان کی طرف سے محتاط رہنے والا فرہاد علی تیمور ——— اس مناسبت سے اب میں ماسٹر لوشے کی خبر لینا چاہتا تھا۔ میں اپنے دماغ کے ساتھ وقت کی طرح چلتا اور دریا کی طرح بہتا رہتا ہوں۔ مجھے ایک پل سکون نہیں ہے۔ سکون کی تلاش میں نکلتا ہوں اور مجرموں کو پیچھے چھوڑتا ہوں تو آگے ہر قدم پر کتنے ہی شبانہ، نرگس، فیروز اور جمشید اپنے حالات کا بوجھ اٹھائے مجھے اپنی طرف پکارتے رہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ بس تھوڑی دیر تک ماسٹر لوشے کی مصروفیات کو سمجھنے کی کوشش کروں گا اس کے بعد آرام سے سو جاؤں گا۔ (اگر نصیب میں آرام لکھا ہوگا)۔

ماسٹر لوشے کی مصروفیات سمجھنے کے لئے اس کے آلۂ کاروں کے ذہنوں میں جھانکنا ضروری تھا۔ بیل منڈو، واجد اور صمد بخاری اس کے آلۂ کار کے طور پر میری نظروں میں تھے۔ بیل منڈو سے کبھی براہ راست میرا خیالی رابطہ قائم نہیں ہوا تھا اور ابھی میں اس سے دور ہی رہنا چاہتا تھا۔ اس لئے پہلے میں بستر پر پالتی مار کر بیٹھ گیا پھر مراقبے میں جا کر صمد بخاری کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اور اپنے حالات پر غور کر رہا تھا کہ ایک انجلا سے عشق کرنے کی اسے کتنی بڑی سزا مل رہی ہے۔ پچھلے ہی دن اُس کے باپ اسٹوفر کی روح اس کے دماغ میں گھس آئی تھی اور شہزاد کو تلاش کرنے کے لئے مجبور کر رہی تھی۔ وہ شہزاد سے ملنے دلشاد ہوٹل کی طرف گیا تھا لیکن شہزاد بھی اس کے لئے کوئی بد روح تھا۔ اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ چلا گیا تھا۔ وہ پریشان تھا کہ کس طرح اسے تلاش کرے۔ اگر تلاش نہیں کرے گا تو اسٹوفر کی روح اس کے دماغ میں گھسی رہے گی اور پریشان کرتی رہے گی۔ تب اس کے دماغ میں اسی شیطان نے کہا۔

"شہزاد اب تمہارے بس میں نہیں ہے، اب میں اسے تلاش کر لوں گا۔ جاؤ میں نے تمہیں آزاد کیا۔"

اس کے بعد سے اسٹوفر کی روح نے اسے پریشان نہیں کیا۔ اس وقت بھی وہ سگریٹ کے کش لگاتا ہوا یہ سوچ کر گھبرا رہا تھا کہ کہیں پھر وہ شیطان اس کے دماغ میں نہ گھس آئے۔

میں نے صمد بخاری سے رابطہ توڑ دیا کیونکہ اب وہ ماسٹر لوشے کا آلۂ کار نہیں رہا تھا۔ اس کے بعد میں واجد کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ اتنی رات کو وہ سکون سے سو رہا تھا۔ اسے پُرسکون پا کر مجھے خیال آیا کہ ماسٹر لوشے نے اسے اس شرط پر آزاد کرنے کا وعدہ کیا تھا کہ وہ ملازمت سے برخاست ہونے کے باوجود انٹیلی جنس کے کسی آفیسر کے سامنے جائے اور اسے سلام کرے۔ آفیسر اس کے سلام کا جواب دے گا تو واجد کو بھی شیطانی روح سے آزادی مل جائے گی۔

میرا خیال تھا کہ واجد اپنا کام کر چکا ہے اور انٹیلی جنس کے کسی آفیسر سے اپنے سلام کا جواب لے چکا ہے۔ ماسٹر لوشے نے اس سلام کے جواب کو وسیلہ بنا کر ڈائریکٹر جنرل سعید احمد تک پہنچنے کی کوشش کی ہوگی۔ مجھے یقین تھا کہ سعید احمد میرے مشورے کے مطابق وہ شہر چھوڑ چکے ہوں گے پھر بھی میں نے اپنے اطمینان کے لئے سعید احمد کو تلاش کیا۔ میری سوچ کی لہریں اُن کے خوابیدہ دماغ تک پہنچیں۔ وہ گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے انہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ ابھی ان سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

میں نے بالیچی کے تھانیدار نعیم مرزا کے ذہن میں جھانکنا شروع کیا۔ یہ وہی نعیم مرزا تھا جو بیل منڈو سے بڑی بڑی رقمیں لے کر اس کے جرائم پر پردہ ڈالتا تھا۔ میں نے اسی کے ذریعے بیل منڈو کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اتفاق سے وہ بیل منڈو کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اتنی رات کو اس لئے اس کے پاس موجود تھا کہ بیل منڈو ابھی تک دماغی طور پر نارمل نہیں ہوا تھا۔ وہ اب بھی جھنجھلا کر یہ کہہ رہا تھا۔

"میں جن بھوت اور کسی طرح کے آسیب کا قائل نہیں ہوں۔ اس زمین پر مجھ سے بڑا شیطان کوئی نہیں ہے۔ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا میرے دماغ میں ہلچل مچاتا رہتا ہے۔"

نعیم مرزا نے حیرانی کا اظہار کیا۔ "تعجب ہے کسی ٹیلی پیتھی جاننے والے کو آپ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

بیل منڈو نے کہا۔ "انسپکٹر! میں شاید تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اسٹوفر جو قتل ہو چکا ہے اس سے میرا ایک اہم سودا ہو رہا تھا۔ جس چیز کا سودا ہو رہا تھا، وہ چیز میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ اس لئے کہ یہ میرا کاروباری راز ہے لیکن اس شیطان سے پیچھا چھڑانے کے لئے میں وہ چیز اُسے مفت دے سکتا ہوں۔ اُس نے میرا کھانا پینا اور سونا حرام کر دیا ہے۔ ہر وقت یہی کہتا ہے کہ اسٹوفر اور انجلا کے قاتل کو تلاش کرو۔"

نعیم مرزا نے پوچھا۔ "کیا وہ ٹیلی پیتھی جاننے والا اس وقت بھی تمہارے ذہن میں ہے؟"

"پتہ نہیں ہے یا نہیں۔ میرا خیال ہے وہ اس وقت بھی چپ چاپ میرے خیالات کو پڑھ رہا ہوگا اور اس وقت تک میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا جب تک میں قاتل کو تلاش نہ کر لوں ——— مگر میں کہاں تلاش کروں؟ ابے او قاتل کے بچے! تو کہاں ہے؟ ایک بار تو میرے سامنے آجا، میں تجھے چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا۔"

بیل منڈو کی جھنجھلاہٹ پر مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "بیٹے! گھبراؤ نہیں۔ ایک نہ ایک دن تم سے سامنا ہوگا۔ لوگ کان پکڑ کر سزا دیتے ہیں۔ میں تمہاری ناک مروڑ کر مائیکرو فلم نکال لوں گا۔ ابھی تم ماسٹر لوشے کے عذاب میں مبتلا رہو۔"

میں نے ان سے رابطہ ختم کر دیا۔ پھر ایک طویل انگڑائی لے کر بستر پر لیٹے ہی لیٹے اپنے بدن کو توڑنے موڑنے لگا۔ اب میں صبح تک آرام و سکون سے سونا چاہ رہا تھا۔ میں دشمنوں سے بہت دور جا رہا تھا۔ اب حقائق کی دنیا سے دور خود کو خوابوں کی دنیا میں لے جانا چاہتا تھا مگر اسی وقت دروازہ بڑی آہستگی سے اور بڑی رازداری سے کھلا۔ اس کے ساتھ ہی شنیل فائیو کی خوشبو کا خوشگوار جھونکا میرے کیبن میں چلا آیا۔ میں نے بستر پر لیٹے ہی لیٹے نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ وہ دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔

میری آنکھیں آدھی کھلی تھیں، آدھی بند تھیں۔ بعض لوگ اسی حالت میں سوتے ہیں۔ گہری نیند کے وقت بھی ان کی آنکھیں ادھ کھلی رہتی ہیں۔ وہ دروازے پر کھڑی یہی سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں سو رہا ہوں، یا جاگ رہا ہوں۔ میں بے حس و حرکت پڑا ہوا اس کی سوچ کو پڑھ رہا تھا۔

"میں بہت ساری بدنامیوں کا خطرہ مول لے کر یہاں تک آئی ہوں۔ ڈر لگتا ہے کہ کہیں فیروز دیکھ نہ لے۔ مگر یہ کمبخت گونگا بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس وقت چپ چاپ پڑا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے سو رہا ہے۔ اگر جاگ رہا

ہوتا تو مجھے اتنی رات گئے یہاں دیکھ کر حیرانی کا اظہار ضرور کرتا۔ بستر سے اُٹھ کر یہ ضرور پوچھتا کہ میں یہاں کیوں آئی ہوں مگر یہ لاش کی طرح پڑا ہوا ہے۔ اس کا سانس لیتا ہوا چٹانی سینہ صرف اس بات کا غماز ہے کہ آج اس کی تہہ میں جو دل ہے' وہ صرف میرے لئے دھڑکے گا۔ میرے آئیڈیل ــــ میرے محبوب! میں تیرے لئے اپنے ہونے والے دولتمند منگیتر کو فریب دے کر آئی ہوں۔"

یہ کہہ کر اُس نے دروازے کو بند کر دیا اور میری آنکھوں پر نظریں جمائے بہت آہستہ آہستہ میرے قریب آنے لگی۔

چونکہ وہ بڑھتی آ رہی تھی اس لئے مجھے پیش قدمی کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اپنی جگہ خاموشی سے جم گیا تھا۔ انسان کے ہر عمل اور ردِ عمل میں اس کے پانچوں حواسِ خمسہ اپنے اپنے طور پر کام کرتے رہتے ہیں۔ دیکھنا' سُننا' سُونگھنا' چکھنا اور چھُونا ــــ ابھی میں اسے چھُو نہیں سکتا تھا۔ ابھی دیکھنے کی صرف ایک حس کام کر رہی تھی۔ جب گلاب ہاتھوں کی پہنچ سے دُور ہوتا ہے تو اس کو دیکھ کر بھی اس کے حُسن سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے میں اس گلابی بدن کی کھلتی ہوئی پنکھڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ پتہ نہیں اس کا شبابی بدن کتنوں کو ترساتا اور للچاتا ہوگا۔ جب یہ شاہراہوں سے گزرتی ہوگی اور محفلوں میں جاتی ہوگی' اس وقت بے شمار لوگ اسے حاصل کرنے کی تمنّا کرتے ہوں گے اور مایوسی کی حالت میں صرف دیکھنے کی حس سے دل کو بہلا لیتے ہوں گے۔ دراصل نگاہوں کی انگلیاں بھی حسنِ بے نیاز کو بڑی خاموشی سے ایسی ایسی جگہ ٹٹولتی رہتی ہیں کہ کسی دوسرے کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔ نرگس کو بھی اس بات کی خبر نہیں تھی کہ میری نیم وا آنکھیں کہاں کہاں بھٹک رہی ہیں۔

وہ قریب آئی تو میرے سونگھنے کی حس کو ذرا تسکین ہونے لگی کیونکہ شنیل فائیو کی خوشبو کے علاوہ اس کی انقلابی عمر کی بھی خوشبو تھی اور اس کے انقلاب جگانے والے بدن کی بھی ایک خوشبو تھی اور وہ جو چور جذبے ہوتے ہیں' وہ بھی سہم سہم کر اور پسینہ پسینہ ہو کر مہکتے ہیں۔ کتنی ہی خوشبوئیں گڈمڈ ہوگئی تھیں۔ اور وہ خوشبوؤں کا کاک ٹیل بن کر بتا رہی تھی کہ میرے سامنے شباب کی بھری ہوئی بوتل میں کتنا نشہ ہے؟

پھر وہ ہولے ہولے بولنے لگی۔

"گونگے ــــ کیا تم سو رہے ہو؟ دیکھو میں ساری دنیا کو سُلا کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ حالانکہ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ میرے حصّے میں فیروز جیسا نوجوان اور اس کی دولت آ رہی ہے۔ مگر عورت بعض حالات میں صرف دولت اور مرد کی جوانی نہیں چاہتی۔ وہ جو شروع جوانی سے اپنے ایک محبوب کا خاکہ بُنتی آتی ہے اور اپنی آرزوؤں سے اپنے جذبوں سے اور اپنی چاہتوں سے اپنے مزاج کے مطابق اس کی ایک خیالی تصویر مکمل کرتی ہے۔ وہی اس کے مَن مندر کا دیوتا ہوتا ہے' جسے وہ دُنیا والوں سے چھُپ کر پُوجتی ہے۔ تمہیں پہلی بار دیکھا تو میں مسرّتوں کے ہجوم میں گھبرا گئی کہ تم میرے دل کے مندر سے باہر کیسے آ گئے؟"

وہ بول رہی تھی اور اس کی مترنّم آواز میرے سُننے کی حس کو تسکین پہنچا رہی تھی۔ پہلے دیکھا' پھر سُونگھا اور اب سُن رہا تھا۔ وہ جو میرے سامنے تھی' وہ سُریلی آوازوں کا سرچشمہ تھی۔ اس کے شبابی وجود کے اندر سے کتنی ہی سُریلی آوازوں کے سوتے پھُوٹ رہے تھے۔ جب عورت کو صرف کانوں سے سنو تو وہ سات سُروں کے سنگم سے دل کی دھڑکنوں کو اور زیادہ تیز کرتی ہے اور ہماری طلب میں مزید اضافہ کرتی جاتی ہے۔

"میرے گونگے محبوب! پہلے میں نے سوچا تھا کہ میں تمہارے قریب نہیں آؤں گی۔ تمہیں اپنی زبان سے بندر کہہ کر دل کو سمجھاؤں گی کہ تم میرے قابل نہیں ہو۔ لیکن میں رات کی اس خاموشی میں تڑپ تڑپ کر یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ اگر میں تمہارے پاس نہ آئی تو یہ خیال ہمیشہ ستاتا رہے گا کہ میں نے جو آئیڈیل بنایا تھا میں خود اس آئیڈیل کے قابل نہیں تھی جسے میں برسوں اپنے دل کی دھڑکنوں سے سنوارتی رہی' اسے ایک لمحے میں بندر کہہ کر اپنے آئیڈیل کی صورت نہیں بگاڑ سکتی۔ عورت اپنی تخلیق کو کبھی نہیں مٹاتی۔ وہ تخلیق اس کا بچّہ ہو یا اس بچّے کا ہونے والا باپ ہو۔ اسی لئے میں بے انتہا دولت کو اور ایک شاندار مستقبل کو خطرے میں ڈال کر آئی ہوں۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکنوں سے لگا لو۔ وقت بہت کم ہے۔ مِلن کی رات ایک لمحہ سے زیادہ مختصر ہوتی ہے۔ اسے بڑی خاموشی سے گزار کر میں پھر فیروز کی دُنیا میں چلی جاؤں گی۔ یہ خلش تو نہیں رہے گی کہ میں نے اپنے آئیڈیل کو نہیں پایا"

یہ کہہ کر وہ مجھ پر جُھک گئی۔ پہلے اُس نے اپنی مخروطی انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کی۔ پھر اُس کی ہتھیلی کے کنول میرے چہرے پر آ گئے۔ وہ میرے چہرے کو چھُو رہی تھی۔ دوسرے لفظوں میں میرا چہرہ اس کے ہاتھوں کو چھُو رہا تھا۔ ان حالات میں تمام حواس کے مقابلے میں چھُونے کی حس اتنی تیز اور شدید ہوتی ہے کہ اس کے بعد آگے اور آگے چھُونے کے لئے دل مچلتا رہتا ہے۔ میں مچل کر اسے چھُونے پر مجبور ہوگیا۔ میری بے حسی ختم ہوگئی۔

مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ رات کیسے گزر رہی ہے۔ جب میں نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھا تو اس وقت چار بجنے والے تھے۔ اس دوران بار بار جذباتی لمحات سے گزرنے کے باوجود میں نے اُس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اپنے منصوبے کے مطابق گونگا بنا رہا۔

اسے رخصت کرنے کے لئے میں دروازے تک آیا تو اس نے کہا "میرے گونگے محبوب! تمہیں چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ تم نے مجھے ایسی مسرّتوں سے آشنا کیا ہے جس کے متعلق میں نے صرف پڑھا تھا یا سُنا تھا۔ تم نے مجھے ایسے پڑھایا ہے کہ میں اس پہلے سبق کو کبھی نہ بھُول سکوں گی ــــ کاش کہ ایک خوشگوار مستقبل کے لئے دولت لازمی نہ ہوتی۔ صرف تیرے فولادی بازوؤں میں یہ زندگی ہنستے کھیلتے بسر ہو جاتی۔ ایسی صورت میں میں فیروز کو ٹھکرا دیتی اور اس کیبن سے کبھی باہر نہ جاتی۔ لیکن افسوس یہ ہماری پہلی اور آخری ملاقات ہے' اب میں جا رہی ہوں۔"

دروازہ کھولتے ہی اس کے حلق سے ایک سہمی ہوئی چیخ نکلی۔ سامنے ٹھیک سامنے' فیروز راہداری کی کھڑکی سے ٹیک لگائے ایک سگریٹ سُلگا رہا تھا۔ لائٹر کے ننھے شعلے کے پیچھے اس کی گھُورتی ہوئی اور مسکراتی ہوئی طنزیہ نگاہیں نرگس پر جمی ہوئی تھیں۔

نرگس پہلے چند لمحوں تک سنبھل نہ سکی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ فیروز پہرے دار کی طرح دروازے پر کھڑا ہوگا۔ اس وقت اُس کا شاندار مستقبل تاریک ہو رہا تھا اور وہ اپنی زندگی کی اتنی بڑی بازی ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جلد ہی سنبھل کر مُسکراتی ہوئی بولی۔

"ڈیر ــــ خیریت تو ہے' تم مجھے اس طرح گھُور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ یہ گونگا بالکل بندر ہے۔ میں یہاں سے گزر رہی تھی تو یہ دروازہ کھُلا ہوا تھا اور یہ کیبن کے اندر کسی بندر کی طرح عجیب عجیب سے تماشے کر رہا تھا۔ میری دلچسپی بڑھی تو کیبن کے اندر چلی گئی۔ پھر اس کے تماشے میں ایسی محو ہوگئی کہ مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا۔"

فیروز نے غرّا کر کہا۔ "کیا تم مجھے احمق سمجھتی ہو؟ میں اس دروازے کے سامنے ساڑھے بارہ بجے سے کھڑا ہوا ہوں۔ اس وقت چار بجے ہیں۔ اس بندر نے بند دروازے کے پیچھے کیسے کیسے کرتب دکھائے ہوں گے یہ تمہارے حُلیے سے ظاہر ہے۔"

نرگس نے ناراضی سے کہا۔ "فیروز! یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ تم اپنی نرگس کے کیریکٹر پر شبہ کر رہے ہو۔ کیا تم مجھے ایسی گری پڑی سمجھتے ہو کہ میں اس بندر سے......"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی فیروز نے اس کے مُنہ پر ایک زور کا طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا۔ "یہ گونگا بندر نہیں ہے بلکہ تم مداری ہو۔ تم دولت کے لالچ میں مجھے محبت کے نام پر نچا رہی ہو۔ ایک چالاک اور مکّار عورت کی نظروں میں اس کی ضرورت کے تمام مَرد بندر ہوتے ہیں جنہیں وہ حسبِ موقع اسی طرح باری باری نچاتی رہتی ہے۔"

نرگس طمانچہ کھا کر اپنی توہین برداشت نہ کر سکی۔ وہ اپنے خاندان کی سب سے حسین اور مغرور لڑکی تھی۔ پھر یہ کہ اسے فیروز کی والدہ کی حمایت حاصل تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اتنے بڑے خاندان میں اُن ہی بیگم صاحبہ کا سکہ چلتا ہے۔ اس بات پر وہ مغرور لڑکی توہین کے احساس سے تلملا کر چیخنے لگی۔

"تم نے کیا سمجھ کر مجھ پر ہاتھ اُٹھایا ہے۔ کیا تم نے مجھے شبانہ جیسی بدچلن لڑکی سمجھا ہے؟ تم نے میری کون سی بُرائی دیکھی ــــ بتاؤ؟ میں ابھی خالہ جان سے جا کر تمہاری شکایت کروں گی......"

وہ غصّے سے جلتی ہوئی اور پاؤں پٹختی ہوئی بیگم رفاقت علی کے کیبن کی طرف جانے لگی۔ اس کی چیخ و پکار سے دوسرے تمام کیبنوں کے دروازے یکے بعد دیگرے کھُلتے جا رہے تھے اور خاندان کے تمام افراد مُرغے مُرغیوں کی طرح کُڑکُڑاتے ہوئے اپنے اپنے ڈربوں سے نکلتے آ رہے تھے۔ پھر وہ ایئرکنڈیشنڈ کوچ شور اور ہنگامے کے باعث اچھا خاصا مچھلی بازار بن گیا۔ سب لوگ اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ نرگس کے ماں باپ چیخ چیخ کر احتجاج کر رہے تھے کہ فیروز نے اُن کی جوان بیٹی پر ہاتھ کیوں اُٹھایا ہے؟ رفاقت علی کی بیگم بھی اپنی بھانجی نرگس کی حمایت میں فیروز کو ڈانٹ رہی تھیں۔ رفاقت علی شبانہ کو اپنی بہو بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اور اپنے بیٹے کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

"اس طرح شور مچانے سے کسی کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئے گی۔ میرا بیٹا جاہل گنوار نہیں ہے۔ پہلے اُسے صفائی پیش کرنے کا موقع دو کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟"

فیروز نے ہاتھ اُٹھا کر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "نرگس ساڑھے بارہ بجے اس گونگے کے کیبن میں گئی تھی۔ اتفاق سے اسی وقت میں اپنے کیبن سے باہر نکل رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھ لیا۔ اس وقت سے چار بجے تک کیبن کے دروازے پر کھڑا رہا۔ اب آپ لوگ اس سے پوچھیں کہ یہ اب تک اس بند کیبن میں کیا کر رہی تھی؟"

تمام لوگوں کی سوالیہ نگاہیں نرگس کی طرف اُٹھ گئیں۔ نرگس نے ایک نادان بچی کی سی معصومیت سے کہا۔

"ممی ــــ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں اس گونگے کے پاس نیک نیتی سے جاؤں گی تو بدنیت کہلاؤں گی۔ وہ گونگا مسخرہ ہے' بندروں کی طرح تماشے کرتا ہے۔ اس کے مسخرے پن سے میری دلچسپی اتنی بڑھ گئی کہ مجھے وقت کا احساس ہی نہ رہا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ فیروز مجھے اس طرح بدنام کریں گے۔ میں یہ توہین برداشت نہیں کر سکتی۔ فیروز کو مجھ سے معافی مانگنی ہوگی۔"

یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی کیبن کے اندر چلی گئی۔ نرگس کا باپ فیروز کو سمجھانے لگا کہ اسے بغیر سوچے سمجھے اس کی جوان بیٹی پر اتنا بڑا الزام نہیں لگانا چاہیئے۔ بیگم رفاقت علی نے میری طرف گھُور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"سارا قصور اس گونگے کا ہے۔ اس نے اپنے مسخرے پن سے میری معصوم بھانجی کو بہلا پھُسلا کر اپنے کیبن میں روک لیا تھا۔ ہم سب بچپن سے نرگس کو جانتے ہیں کہ وہ کتنی معصوم اور نادان ہے۔ یہاں اتنے نوجوان مرد ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ اس گونگے کو پکڑ کر ماریں تاکہ یہ آئندہ کسی شریف زادی کو اس طرح بیوقوف نہ بنائے۔"

رفاقت علی نے کہا۔ "بیگم! ہوش کی باتیں کرو۔ یہ گونگا نرگس کے

پاس نہیں آیا تھا، نرگس اس کے کیبن میں گئی تھی۔ ہم اسے ڈانٹ ڈپٹ کر سمجھا سکتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کس جرم پر اسے ڈانٹا جائے؟ ایسے کچھ کہنے کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نرگس کے جرم کو تسلیم کر رہے ہیں۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ دوسرے کا گریبان پکڑ کر بدنامی کو ہوا دینا دانش مندی نہیں ہے۔"

فیروز غصے سے چلتا ہوا اپنے کیبن کے دروازے کی طرف گیا۔ وہاں شبانہ خاموشی سے کھڑی ہوئی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اُس نے شبانہ پر ایک نظر ڈالی۔ پھر اپنے بزرگوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ لوگ نرگس کی بے حیائی کو تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن آج میری آنکھیں کُھل گئی ہیں۔ یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے کہ شبانہ جیسی خاموشی سے ظُلم سہنے والی اور وفاداری کی لاج رکھنے والی لڑکیاں صرف نصیب والوں کے حصے میں آتی ہیں۔ اب اگر میں شادی کروں گا تو شبانہ سے ورنہ نہیں......"

یہ کہہ کر اُس نے شبانہ کا ہاتھ تھام لیا۔ شبانہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ وہ مارے خوشی کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فیروز نے اسے سہارا دیا اور اسے اس کے کیبن تک لے گیا پھر اس کے کیبن میں اسے چھوڑ کر واپس اپنے کیبن کے دروازے پر آیا میں اُس سے دُور اپنے کیبن کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے مُٹھی باندھ کر مجھے انگوٹھا دکھاتے ہوئے کہا۔

"برلوو ــــ مسٹر گونگے! میں تمہارا شکر گزار ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے کیبن کے اندر چلا گیا۔ فیروز کا یہ فیصلہ سُن کر بزرگوں کے درمیان ہلچل سی مچ گئی تھی۔ سب کے سب رفاقت علی کے پیچھے پڑ گئے تھے کہ وہ اپنے بیٹے کو یہ فیصلہ بدلنے پر مجبور کردیں۔ ورنہ نرگس بدنام ہو جائے گی۔

رفاقت علی نے کہا۔ "بیگم! تمہیں اپنی بھانجی کی بدنامی کا بڑا خیال ہے لیکن جب میری بھتیجی بدنام ہوتی رہی تو تم نے مجھے یہ طعنہ دے کر خاموش کر دیا کہ میرے بھائی کی بیٹی بدچلن ہے۔ میرے خاندان کی لڑکیاں قابل اعتماد نہیں ہیں۔ اب تم اپنے خاندان کی لڑکیوں کی بدچلنی پر ماتم کرو۔ میرے بیٹے کا فیصلہ میرا فیصلہ ہے۔"

یہ کہہ کر وہ جواب سُنے بغیر اپنے کیبن میں چلا گیا۔ میں نے بھی اپنے ۔ ۔ کا دروازہ بند کر لیا اور آرام سے آکر بستر پر لیٹ گیا۔ میں شبانہ کی تقدیر بدلنا چاہتا تھا لیکن اس سلسلے میں نرگس کو بدنام نہیں کرنا چاہتا تھا۔

خود اس کی بیباکی

نے اُسے بدنام کر دیا تھا اور حالات نے اس کے نصیب بگاڑ کر شبانہ کے نصیب سنوار دیئے تھے۔

بس بہت ہو چکا۔ اب میں اپنی زندگی میں اتنے ہنگاموں کا بھی خواہشمند نہیں تھا کہ مجھے سونے کا بھی موقع نہ ملے۔ صبح کی دھیمی دھیمی روشنی کھڑکی کے باہر نظر آرہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے دماغ کو ہدایت کی کہ دن کے گیارہ بجے میری آنکھ کُھل جائے۔ اس کے بعد میں نیند کے اندھیروں میں گُم ہو گیا۔

حسب ہدایت ٹھیک گیارہ بجے میری آنکھ کُھل گئی بستر سے اُٹھ کر ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد میں نے یوگا کی مشقیں شروع کیں اس کے بعد میں لباس پہن کر باہر نکلنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ باہر نکلنے سے پہلے دوستوں اور دشمنوں کے دماغ میں جھانکنا ضروری تھا تاکہ اُن کی مصروفیات کا علم ہوتا رہے۔ میں نے آرام سے برتھ پر بیٹھ کر سب سے پہلے بیل منڈو کی طرف توجّہ دی۔ کیونکہ ماسٹر پوشنے میرے سلسلے میں سب سے زیادہ اُسے پریشان کر رہا تھا۔

اس وقت بیل منڈو سمندر کے ساحل پر تنہا کھڑا ہوا تھا اور اپنے آئندہ پروگرام کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس کے آئندہ پروگرام کا تعلق بھی مجھ سے ہی تھا۔ اس وقت وہ سوچ رہا تھا۔

"خدا کا شکر ہے کہ آخر قاتل کا نام اور پتہ معلوم ہو ہی گیا۔ میں دوپہر کی فلائیٹ سے لاہور جاؤں گا اور شام تک اس قاتل کے رشتے داروں تک پہنچ جاؤں گا ـــ واقعی یہ ٹیلی پیتھی جاننے والے شیطان سے کم نہیں ہوتے۔ پاتال میں چھُپنے والے مجرموں تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ ٹیلی پیتھی جاننے والا کہاں ہے۔ اسی شہر میں ہے یا مجھ سے ہزاروں میل دُور ہے لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ سوچ کا سفر طے کرتے ہوئے لاہور اس کے رشتے داروں تک پہنچ گیا ہے۔"

بیل منڈو کی سوچ پڑھتے ہی میرا سارا سکون درہم برہم ہو گیا میری نگاہوں کے سامنے میری پھوپھی اور زرینہ کا چہرہ گھُوم گیا۔ ان کے ساتھ فرزانہ اور پپّو بھی تھے اور گونگا شیتل بھی تھا۔ آج شام تک ان سب پر بیل منڈو کا عتاب نازل ہونے والا تھا۔ وہ ان لوگوں سے میرا پتہ معلوم کرنے کے لئے اور میرے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے ان پر ظلم کرسکتا تھا اور ناکامی کی صورت میں انہیں اذیتیں پہنچا کر مار بھی سکتا تھا۔ اسے ناکامی اس لئے ہوتی کہ پھوپھی اور فرزانہ میرے متعلق کچھ نہیں جانتی تھیں اور نہ ہی اُسے بتاسکتی تھیں کہ میں کہاں پایا جاسکتا ہوں۔

مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ ماسٹر پوشنے میرے لاہور کے پتے سے کس طرح واقف ہو گیا؟ اس مقصد کے لئے مجھے بیل منڈو کے دماغ سے چپکے رہنے کی ضرورت تھی۔ مگر اس سے پہلے مجھے اپنے عزیزوں کی حفاظت بھی کرنا تھی۔ یہ سوچ کر میں نے پھوپھی سے دماغی رابطہ قائم کیا۔ اس وقت پھوپھی لاہور چھوڑ کر شاہ کوٹ جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ میں نے ان کے دماغ پر دستک دی تو وہ خوشی سے کھِل گئیں۔ انہوں نے ممتا بھرے انداز میں سوچا۔

"بیٹے! آج اتنے دنوں کے بعد پھوپھی کی یاد آئی ہے؟"

میں نے سوچ کے ذریعے کہا۔ "پھوپھی جان! آپ جانتی ہیں کہ میں مصروف زندگی گزارتا ہوں۔ جب تک آپ لوگوں کی طرف سے اطمینان ہے اس وقت تک میں بے فکری سے اپنی جدّوجہد میں مصروف رہتا ہوں۔ ابھی اس لئے یاد کیا ہے کہ میرا ایک خطرناک دشمن شام تک وہاں پہنچنے والا ہے۔ وہ مجھے تلاش کر رہا ہے۔ فی الحال میں اس کے سامنے نہیں آنا چاہتا، اس لئے وہ آپ لوگوں کو پریشان کر کے مجھے سامنے آنے پر مجبور کرے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ اسی وقت وہ شہر چھوڑ کر کہیں دُور چلے جائیں۔ شاہ کوٹ جانا مناسب نہیں ہے جو دشمن آپ لوگوں تک پہنچ سکتا ہے وہ یہ بھی معلوم کرسکتا ہے کہ شاہ کوٹ میں میری زمینیں ہیں۔ وہ وہاں بھی پہنچ جائے گا۔"

پھوپھی نے گھبرا کر کہا۔ "بیٹا! تم خواہ مخواہ کیوں لوگوں کو دشمن بناتے رہتے ہو۔ اب تک یہ دشمنی تمہاری ذات تک محدُود تھی، اب یہ بڑھتے بڑھتے ہم تک پہنچ رہی ہے۔ مجھے اپنی جان کا ڈر نہیں ہے۔ تم خود سوچو، میرے ساتھ میری جوان بیٹی ہے اور تم نے مجھے فرزانہ جیسی جوان عورت کی سرپرست بھی بنا دیا ہے۔ اُس کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ بھی ہے۔ میں تنہا ان سب کو کیسے سنبھالوں گی؟ شیتل گونگا ہے، اس سے تو بات کرتے ہوئے وحشت سی ہوتی ہے۔ ہم بڑی دیر میں ایک دوسرے کی باتیں سمجھتے ہیں۔ وہ گونگا ہماری کیا مدد کرے گا؟"

"پھوپھی جان! وہ بڑے کام کا آدمی ہے۔ پھر آپ خود کو تنہا کیوں سمجھتی ہیں۔ آپ یہ تو سوچئے میں بُرے وقت میں فوراً ہی سوچ کے ذریعے آپ کے قریب آجاتا ہوں۔ آپ کسی بات کی فکر نہ کریں۔ ان سب کو ساتھ لے کر اسی وقت بذریعہ کار مری چلی جائیں۔ میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں۔ بہت جلد ہماری ملاقات ہو گی۔ ملاقات ہونے پر تفصیلی گفتگو ہو گی۔ اس وقت مجھے اجازت دیں اور میرے مشورے پر فوراً عمل کریں ـــ خدا حافظ۔"

میں نے سوچ کے ذریعے گفتگو ختم کر دی مگر چُپ چاپ اُن کی سوچ کو پڑھتا رہا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ فوری طور پر میرے مشورے پر عمل کرتی ہیں یا نہیں؟ وہ عمل کر رہی تھیں کیونکہ انہیں اپنی جوان بیٹی کی بڑی فکر تھی۔ ان کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے اُن سے دماغی رابطہ بالکل ختم کر دیا۔ تھوڑی دیر تک میں پُرسکون بیٹھا رہا۔ پھر میں نے دوبارہ بیل منڈو کے دماغ میں جھانکنا شروع کیا۔ سمندر کے ساحل پر اس کا کوئی ماتحت اس کے قریب آتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"جناب! آپ کے سفر کا سامان باندھ دیا ہے۔ فلائیٹ کا وقت دو بجکر پچپن منٹ ہے۔"

بیل منڈو نے اس سے کہا کہ اس کے لئے کھانا لگایا جائے۔ وہ کھانے کے بعد وہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ وہ یہ کہتا ہوا اپنی کوٹھی کی طرف جانے لگا۔ کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوا تو ایک سُریلی سی آواز اس کے دماغ سے ٹکرائی۔ اس کی سوچ کے ذریعے وہ سُریلی باتیں مجھ تک بھی پہنچنے لگیں۔

"انکل! میں بھی آپ کے ساتھ چل رہی ہوں نا؟ آپ مجھے بہلا تو نہیں رہے ہیں؟"

"نہیں بیٹے؟" بیل منڈو نے جواب دیا۔ "ہم ابھی لاہور جا رہے ہیں۔ میں تمہیں اس تاریخی شہر کی سیر کراؤں گا۔ وہاں میرا ایک بہت پرانا دوست فرہاد علی تیمور رہتا ہے۔ وہ بہت عرصے سے لاپتہ ہے۔ میں تمہارے ذریعے اُسے تلاش کرنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ انکل! میں اُسے کیسے تلاش کرسکتی ہوں جبکہ اُسے کبھی دیکھا نہیں ہے۔"

"رُوما ڈارلنگ! تم جانتی ہو کہ اس ملک کی عورتیں پردہ نشین ہوتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ فرہاد کے گھر کی عورتیں مجھ سے پردہ کریں۔ تم اس گھر میں جاؤ گی تو کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ میں وہاں پہنچ کر تمہیں بتاؤں گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"

"نہیں انکل! ابھی بتایئے۔ آپ میری عادت جانتے ہیں اگر کوئی بات ادھُوری رہ جائے تو تجسّس کے مارے نہ مجھ سے کھایا جاتا ہے نہ مجھے نیند آتی ہے۔ آپ ابھی بتایئے؟"

بیل منڈو کے ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ اپنی بھتیجی کو چھیڑ رہا تھا "میں اپنی بیٹی کو ابھی نہیں بتاؤں گا۔ اگر تجسس پیدا ہو رہا ہے تو تم خود ہی سوچو۔ وہاں پہنچ کر اس گھر کی عورتوں سے میرے دوست فرہاد کے متعلق کیا بات کرو گی؟"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل کے اطراف آ کر بیٹھ گئے۔ رُوما نے کہا۔

"اگر میں سوچنے بیٹھ گئی تو کھانے میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گی۔"

"نہیں بے بی! کھاتی بھی جاؤ اور سوچتی بھی جاؤ۔ ایک وقت میں جب دو کام کر سکتی ہو تو بیک وقت دو کام کرنے کی عادت ڈالنی چاہیئے۔"

وہ بیک وقت کھانے اور سوچنے لگی۔ پھر کہنے لگی "انکل! اس ملک کی عورتیں بڑی بیک ورڈ ہیں۔ میں تو بہت ہی کم باتیں کروں گی۔ میں اُن سے کہوں گی کہ فرہاد صاحب میرے انکل کے بہت اچھے دوست ہیں۔ مجھے بتایا جائے کہ ان دنوں وہ کہاں ہیں؟ میرے انکل سے وہ کیوں نہیں ملتے؟"

بیل منڈو نے پوچھا "اگر فرہاد اُسی گھر میں کہیں چھپا ہو اور وہ تمہیں نہ بتائیں تو؟"

رُوما نے حیرانی سے پوچھا "انکل! جب وہ آپ کا دوست ہے تو وہ آپ سے اور مجھ سے کیوں چھپے گا؟"

"رُوما! تمہیں میرے کاروبار کے متعلق کسی حد تک علم ہے۔ تم یہ بھی جانتی ہو کہ دوستوں سے میرا خُفیہ لین دین ہوتا رہتا ہے۔ اسی لین دین کے سلسلے میں فرہاد نے میرے پچاس ہزار روپے رکھ لئے ہیں اور مجھ سے چھپتا پھر رہا ہے۔"

"اوہ انکل! تب تو آپ ضرور کوئی ہنگامہ کریں گے۔ آپ کاروبار میں بے ایمانی کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتے ہیں۔ اگر وہاں بہت زیادہ گڑبڑ ہوگی تو میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

"بے بی! بیل منڈو ایک آہنی قلعہ ہے۔ جب تک تم اس قلعے میں پناہ لے رہی ہو، کوئی تمہیں آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ سیکڑوں مرد اور عورتیں میرے ماتحت کام کرتے ہیں۔ میں ان میں سے کسی کو بھی اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ تمہیں اس لئے لے جا رہا ہوں کہ تم ایک عرصے سے لاہور، پنڈی، اسلام آباد اور مری کی سیر کرنے کی ضد کر رہی ہو۔ تمہاری یہ ضد بھی پوری ہو جائے گی، میرا کام بھی بن جائے گا۔ کام بہت معمولی سا ہے۔ تمہیں فرہاد کے گھر میں پہنچ کر فرہاد کے متعلق گفتگو کرتے وقت یہ خواہش ظاہر کرنی ہے کہ تم ان کی کوٹھی کو اندر سے دیکھنا چاہتی ہو۔ جب تمہیں دیکھنے کا موقع ملے تو تم وہاں کے ایک ایک کمرے اور کوریڈور کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا کہ کون سا راستہ کس کمرے کی طرف جاتا ہے اور کھڑکی دروازے کس طرف کھلتے ہیں۔ تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے۔ جب تم مجھے تمام تفصیلات بتا دو گی تو پھر میں اپنی تدبیر سے فرہاد تک پہنچ جاؤں گا۔ دوسرے دن میرے ماتحت بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔ میرا ایک باڈی گارڈ تمہیں وہاں کی سیر کرائے گا اور میں اپنا کام کرتا رہوں گا۔"

وہ دونوں کھانے کے دوران گفتگو کرتے رہے۔ مجھے اس کی پروا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ میں نے اپنے گھر والوں کو پہلے ہی وہاں سے ہٹا دیا تھا۔ میں مسلسل اس کے ذہن میں جھانک کر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ماسٹر یوشے کو میرا نام اور لاہور کا پتہ کیسے معلوم ہوا۔ بیل منڈو سے رابطہ قائم رکھنے کی خاطر میں اپنے کیبن سے باہر نہیں نکل سکا۔ دو گھنٹے پچپن منٹ کے بعد جب وہ لاہور جانے والے طیارے میں پہنچ کر اپنی سیٹ پر آرام سے بیٹھ گئے تو ماسٹر یوشے نے اس کے دماغ پر دستک دی۔

"ہیلو بیل منڈو! اس وقت تم کہاں ہو اور کیا کر رہے ہو؟"

بیل منڈو کی سوچ نے کہا "اس وقت میں طیارے میں بیٹھا ہوں اور تمہارے شیطانی حکم کی تعمیل کے لئے لاہور جا رہا ہوں۔ میری رُوما میرے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے۔ میں ایک بار پھر تم سے کہتا ہوں کہ تم سے سخت نفرت ہے۔ اگر زندگی کے کسی موڑ پر تم میرے ہتھے چڑھ گئے تو میں تمہیں ایسی اذیتیں دے کر ماروں گا کہ دیکھنے والے لرز جائیں۔"

ماسٹر یوشے کے ہنسنے کی آواز سُنائی دی۔ "بیل منڈو! میں جسے اپنا غلام بناتا ہوں، وہ پہلے اسی طرح جھنجھلا کر چیلنج کرتے ہیں۔ فرہاد کی ذہانت اور چالاکیاں بتا رہی ہیں کہ وہ بھی تمہاری طرح ایک انمول ہے۔ ایک دن وہ بھی تمہاری طرح میرا آلۂ کار بن جائے گا۔"

اس کی باتیں سُن کر میں نے سوچا کہ بیل منڈو کی سوچ کے ذریعے میں یہ معلوم کروں کہ ماسٹر یوشے کو میرا نام و پتہ کیسے معلوم ہو گیا؟ لیکن جلد بازی میرے لئے مصیبتیں کھڑی کر سکتی تھی۔ مجھے بیل منڈو کی سوچ کے ذریعے بھی کچھ نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ ورنہ وہ نادیدہ شیطان اپنی کسی ٹیلی پیتھی کے ذریعے مجھ تک پہنچ جاتا۔

میں بڑے صبر سے اُن کی باتیں سُنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اتفاق سے بیل منڈو نے وہی سوال کیا جو میرے ذہن میں تھا۔ کیونکہ اس کے ذہن میں بھی تجسس تھا کہ ٹیلی پیتھی جاننے والے کن ذرائع سے مجرموں تک پہنچتے ہیں؟

ماسٹر یوشے نے اس سے کہا "تم یہ پوچھ کر کیا کرو گے؟ معلومات کے ذرائع انوکھے ہوتے ہیں۔"

بیل منڈو نے جواب دیا "میں اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا تو سنو! واجد نامی ایک شخص انٹیلی جنس میں ملازمت کرتا تھا۔ ملازمت سے برخاست کر دیئے جانے کے بعد اُس نے میرے مشورے کے مطابق انٹیلی جنس کے ایک آفیسر کے سامنے جا کر اسے سلام کیا۔ جواباً ہی اُس آفیسر نے سلام کا جواب دیا۔ میں اس کے لہجے کے ذریعے اُس کی سوچ کے لہجے تک پہنچ گیا۔ ٹیلی پیتھی جاننے والے کس طرح دوسروں کے دماغ تک پہنچتے ہیں، میں تم جیسے اناڑیوں کو نہیں بتا سکتا۔ بس اتنا سمجھ لو کہ میں نے اس آفیسر کو اپنا آلۂ کار بنا لیا۔ میں نے تمہاری طرح اسے بھی

اپنا بنا لیا۔ پھر وہ چپ چاپ اس کی سوچ کے ذریعے معلومات حاصل کرتا رہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ لاہور کے انٹیلی جنس کا ایک ڈائریکٹر جنرل سعید احمد اپنے دوست فرہاد علی کے ساتھ کراچی آیا ہوا ہے۔ وہاں انٹیلی جنس کے ایک نے یہ رپورٹ پیش کی کہ لاہور میں ایک غیر ملکی ایجنٹ دھرم دیر (بلیک کیٹ) ہے۔ وہ اسٹوفر نامی شخص سے چند اہم کاغذات کا سودا کر رہا تھا ــــ جنرل نے فرہاد علی کی مدد سے وہ اہم کاغذات حاصل کر لئے ہیں۔ دھرم دیر گرفتار ہونے کے بعد جو بیان دے چکا تھا اس کے مطابق اسٹوفر ایک غیر ملکی جاسوس سمجھا گیا۔ ڈائریکٹر جنرل اور فرہاد علی، اسٹوفر کے جال میں پھنسنے کے لئے کراچی پہنچ گئے ہیں۔ میں نے اس آفیسر کی سوچ کے ذریعے اُسے اس بات پر راضی کیا کہ وہ ڈائریکٹر جنرل سعید احمد سے ملاقات کرے۔ وہ ملاقات کے لئے گیا تو پتہ چلا کہ سعید احمد کسی کو کچھ بتائے بغیر اچانک ہی لاپتہ ہو گیا ہے۔ اس کی گمشدگی سے انٹیلی جنس والے بھی پریشان ہو گئے۔ اسے تلاش کرنے کے لئے انہوں نے لاہور کے انٹیلی جنس والوں سے رابطہ قائم کیا۔ میں بھی اس رابطے سے منسلک تھا۔ اس ذریعے میں لاہور کے انٹیلی جنس کے ایک آفیسر کے دماغ تک پہنچ گیا۔ اس آفیسر کے ذریعے بڑی آسانی سے یہ معلوم ہو گیا کہ وہاں سعید احمد اور فرہاد علی کی رہائش کہاں ہے۔ سعید احمد کو تو انٹیلی جنس والے تلاش کر رہے ہیں۔ جب بھی وہ ملے گا میں اس کے دوسرے آفیسروں کے ذریعے اس کے ذہن تک پہنچ جاؤں گا۔ لیکن اس تمام ہنگامے میں فرہاد علی کی شخصیت بہت اہم اور خطرناک ہے۔ سمندر کے کنارے ایک کاٹیج میں اس نے میرے بھیجے ہوئے دو آدمیوں کا جو حشر کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر چالاک اور خطرناک ہے۔ اس کے متعلق ایک بات اور معلوم ہوئی کہ وہ گونگا ہے۔"

بیل منڈو کی سوچ نے کہا "یہ مجھے آج معلوم ہوا کہ گونگے اتنے خطرناک ہوتے ہیں اور تمہارے جیسے ٹیلی پیتھی جاننے والے شیطان کو اپنی انگلیوں پر الو بناتے رہتے ہیں۔"

ماسٹر یوشے کی ہنستی ہوئی سوچ نے کہا "غصے میں تمہاری گالیاں ہماری لگتی ہیں ــــ بیٹے! جلنا کڑھنا چھوڑ دو اور نہایت شرافت سے ایک غلام کی طرح میرے کام آتے رہو۔ ورنہ اسی طیارے میں کھوپڑی اُلٹا کر رکھ دوں گا۔"

بیل منڈو کی سوچ نے کہا "سُور کے بچے! تم مجھے پریشان نہ کرو کیونکہ میں تمہارے مشن پر جا رہا ہوں۔ اگر تم نے ذرا بھی پریشان کیا تو تمہارے ہی کام میں رکاوٹیں پیدا ہوں گی۔"

بیل منڈو کی سوچ کے ذریعے ماسٹر یوشے کا ایک طویل قہقہہ سنائی دیا۔ وہ کہہ رہا تھا ــــ "میں اپنے غلاموں سے کام نکالنے کے طریقے خوب جانتا ہوں۔ بیوقوف! تم یہ سمجھتے ہو کہ تم اپنی بھتیجی رُوما کی ضد پوری کرنے کے لئے اپنی مرضی سے ساتھ لے جا رہے ہو۔ نہیں ــــ اصل بات یہ ہے کہ میں تمہاری سوچ کے ذریعے کل سے تمہیں قائل کر رہا ہوں کہ اس مشن میں رُوما کو بھی ساتھ لے جانا چاہیئے۔ تم اس کی سیر و تفریح کے لئے اور اس مشن میں اس سے معمولی سا کام لینے کے لئے جو کچھ بھی سوچ رہے تھے۔ وہ دراصل میری سوچ تھی۔ میں چاہتا تھا کہ تمہارے جیسے ضدی اور پاگل کے ساتھ تمہاری ایک کمزوری بھی ہونی چاہیئے۔ تم رُوما کو اپنی بیٹی کی طرح عزیز رکھتے ہو۔ اب اس مشن کے دوران تم نے ذرا بھی اکڑنے کی کوشش کی تو میں تمہارے سامنے تمہاری حسین بھتیجی کو ننگی ہو کر اپنی بوٹیاں نوچنے پر مجبور کر دوں گا۔"

یہ سُنتے ہی بیل منڈو شدید غصے میں آپے سے باہر ہو گیا اور چیخ چیخ کر ماسٹر یوشے کو گالیاں دینے لگا۔ طیارے کے تمام مسافر چونک کر حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔ رُوما پریشان ہو کر اسے جھنجوڑنے لگی۔

"انکل ــــ انکل! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ ہوش میں آیئے ...؟"

اس کے سمجھانے کے دوران ایئر ہوسٹس اور اسٹیوارڈ اس کے قریب آ گئے۔ اس وقت تک بیل منڈو ہوش میں آ گیا تھا کہ وہ ماسٹر یوشے کے سامنے نہیں، طیارے میں بیٹھا ہوا ہے۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ رُوما معذرت چاہتے ہوئے ایئر ہوسٹس سے کہہ رہی تھی کہ اس کے انکل کو کبھی کبھی ایسا دورہ پڑتا ہے لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ اب یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ ایئر ہوسٹس وغیرہ بیل منڈو سے پوچھنے لگیں کہ اُسے پُرسکون رہنے کے لئے کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ طلب کرے۔

میں نے اُس سے ذہنی رابطہ ختم کر دیا۔ تمام معلومات مجھے حاصل ہو چکی تھیں۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ ماسٹر یوشے کس طرح بیل منڈو جیسے ضدی اور خطرناک انسان کو کٹھ پتلی کی طرح نچا رہا ہے۔ اس کا حشر دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ اگر کبھی میں ماسٹر یوشے کے ہتھے چڑھ گیا تو میری کیا حالت ہو گی۔ میں اس قدر باصلاحیت ہونے کے باوجود اسی طرح اُس کا آلۂ کار بن جاؤں گا۔ اب میرے لئے دانشمندی یہی تھی کہ اس سے ہر ممکن طریقے سے دُور رہوں۔ اس کے جتنے آلۂ کار اس ملک میں ہیں، ان کے سامنے کبھی نہ جاؤں۔ اگر کبھی سامنا ہو جائے تو انہیں ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں۔

ماسٹر یوشے اور بیل منڈو کا طریقۂ کار معلوم ہونے کے بعد میں کیبن سے باہر آ گیا۔ مجھے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ باہر آنے کے بعد ایئر کنڈیشنڈ کوچ کی راہداری کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک وہی چہل پہل نظر آئی۔ ریشمی آنچل لہرا رہے تھے۔ شہانہ، جمشید اور فیروز کے قہقہے کبھی کبھی سنائی دے رہے تھے۔ شبانہ اُن کے ساتھ تھی۔ مگر خوش ہونے کے باوجود زیادہ ہنس بول نہیں رہی تھی۔ کیونکہ فیروز کی امی، نرگس اور اُس کے والدین آتے جاتے اُسے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ جب میں کیبن سے باہر آیا تو فیروز نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ لیکن دوستانہ انداز میں مخاطب

نہیں کیا۔ میں نے اُس پر احسان کیا تھا۔ لیکن اس کے خاندان کی ایک لڑکی کے ساتھ رات بھی گزاری تھی۔ میں اُس کے بزرگوں کے سامنے گنہگار تھا۔ اس لئے وہ مجھ سے بات نہیں کرسکتا تھا۔ ٹرین رُکنے کے بعد میں بوفے کار میں چلا گیا۔ وہاں میں اطمینان سے کھاتا رہا اور سوچتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد نرگس کا باپ وہاں پہنچ گیا۔ اُس نے میرے قریب ایک کُرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"تم کہاں جارہے ہو؟"

میں خالی خالی نظروں سے اسے تکنے لگا۔ تب اسے یاد آگیا کہ میں گونگا ہوں۔ اُس نے اشارے سے اپنا سوال دُہرایا۔ میں نے ریل کا ٹکٹ نکال کر اُسے دِکھا دیا۔ وہ ٹکٹ پڑھنے کے بعد غصّے سے اُسے میری طرف پھینکتے ہوئے سوچنے لگا۔

"یہ کمبخت تو ہمارے ساتھ پنڈی تک جائے گا۔ میں تو اسے بھلانے آیا تھا کہ ہمارا پیچھا چھوڑ دے۔ اس کی موجودگی میری بیٹی کی بدنامی کے داغ کو اور گہرا کررہی ہے۔ کسی طرح یہ نظروں سے دُور ہوجاتا تو میں فیروز کو تنہائی میں اچھی طرح سمجھا دیتا کہ یہ گونگا ایک بے ضرر انسان تھا۔ میری بیٹی اس کے پاس جانے کے باوجود پاکباز اور معصوم ہے۔ مگر یہ کمبخت سر پر مسلط ہوگیا ہے۔ دراصل میں اس بات سے ڈر رہا ہوں کہ اس کی موجودگی میں نرگس پھر نہ بہک جائے۔ وہ نادان لڑکی ہے۔ جب وہ دیکھے گی کہ وہ واقعی فیروز کو ہار چکی ہے تو وہ اپنے اس مَن پسند گونگے کو اپنانے کی ضد کرے گی۔ وہ اتنی لاڈلی اور ضدی ہے کہ اس کی ہر ضد پر آخرکار ہمیں جُھکنا ہی پڑتا ہے۔ خدا کرے کہ یہ گونگا چلتی ٹرین سے گِر کر مَر جائے.....!"

وہ میرے خلاف سوچتا رہا اور میں اطمینان سے لقمے چباتا رہا۔ وہ گونگے اشاروں میں بات نہیں کرسکتا تھا اور اپنے دل کی بات مجھے سمجھا نہیں سکتا تھا اس لئے جھنجھلا کر وہاں سے چلا گیا۔ میں کھانے کے بعد سگریٹ سُلگا کر اس کے کش لگانے لگا۔ میرے دماغ میں اچانک ہی یہ بات آئی کہ مجھے رفاقت علی کے ذہن میں جھانک کر شبانہ کے مستقبل کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہیئے۔ کھانے کے بعد بیرے نے چائے لاکر رکھ دی۔ میں گرما گرم چائے کے گھونٹ لیکر رفاقت علی کی سوچ کو پڑھنے لگا۔

وہ اپنے کیبن کے اندر بیٹھا ہوا تھا...... اور اُس کی بیگم عادت کے مطابق اُس سے اُلجھ رہی تھی اور اُسے قائل کرنے کی کوشش کررہی تھی کہ نرگس پاکباز ہے اور اس سے اچھی بہو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔ رفاقت علی نے بیزار ہوکر کہا۔

"بیگم! اگر تم نرگس کو بہو بنانا ہی چاہتی ہو تو اُس کے ماں باپ سے کہو کہ ابھی وہ سال دو سال تک انتظار کریں۔ ابھی میں شبانہ کو ہی بہو بناؤں گا۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے پنڈی والی کوٹھی اور زلیخا کی جائیداد حاصل کرنی ہے۔ جب یہ سب کچھ ہمیں مِل جائے گا اور فیروز دوسری شادی کرنے کے لئے راضی ہوجائے گا تو تم نرگس کو اپنی بہو بنا لینا۔"

بیگم نے چڑ کر کہا۔ "میری بھانجی کسی سوکن پر نہیں جائے گی۔ پھر میں نہیں آتا کہ آپ کتنی دولت جمع کرنا چاہتے ہیں۔ زلیخا بہت چالاک ہے۔ وہ اپنی جائیداد اپنے بیٹے عامر کے نام کرے گی۔"

"اگر عامر اس دُنیا میں نہیں رہے گا تو کیا وہ جائیداد شبانہ کو نہیں ملے گی؟"

بیگم نے حیرانی سے پوچھا۔ "آخر آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟"

"ابھی خود میری سمجھ میں نہیں آیا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ مگر یہ سوچ رکھا ہے کہ اس دُنیا میں عامر صرف تھوڑے دنوں کے لئے رہے گا۔"

رفاقت علی کی باتیں سُن کر مجھے یاد آیا کہ وہ پہلے بھی عامر کے خلاف ایسی بات کہہ چکا ہے۔ وہ اس بچّے کو کسی نہ کسی طرح اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ میں فوراً ہی اُس کے ذہن کو کُریدنے لگا کہ آخر وہ کس طریقے سے عامر کو ختم کرنا چاہتا ہے؟ بہت دیر تک اس کے ذہن میں جھانکنے کے باوجود مجھے معلوم نہ ہوسکا کیونکہ خود اُس نے کوئی تدبیر ابھی تک نہیں سوچی تھی۔

پچھلی رات میں حالات کو شبانہ کے موافق دیکھ کر مطمئن ہوگیا تھا کہ اب اس کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں آئیں گے کیونکہ اُس نے بچھڑے ہوئے محبوب کو پالیا تھا۔ لیکن اب پھر مجھے شبانہ کی آنکھیں روتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ایک مُردہ بچّے کو جنم دینے کے بعد جب عورت کی گود خالی ہوجاتی ہے تو وہ کسی دوسرے بچّے کو گود لے کر اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ پھر عامر تو اس کا سگا بھائی تھا۔ وہ اُسے بیک وقت بھی اور ماں کی طرح چاہتی تھی۔ میں سمجھا تھا کہ یہاں میرا کام ختم ہوچکا ہے۔ میں پنڈی پہنچتے ہی مَری کی طرف چلا جاؤں گا۔ لیکن اب ننھے عامر کو خطرے میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔

میں نے فیروز کے ذہن کو کُرید کر دیکھا کہ وہ پوری صداقت سے شبانہ کو پیار کرتا ہے یا نہیں؟ وہ اپنے کیبن میں تنہا بیٹھا ہوا شبانہ کے متعلق ہی سوچ رہا تھا اور بڑے محبت بھرے انداز میں اُسے یاد کررہا تھا۔ میں نے اُس کی سوچ میں پوچھا۔

"کیا واقعی میں دِل و جان سے دوبارہ شبانہ کو چاہنے لگا ہوں؟"

اُس کی مثبت سوچ نے کہا۔ "ہاں۔ میں اُسے دل و جان سے چاہتا ہوں۔ پچھلے دنوں جو ظلم میں نے اُس پر کئے ہیں ان کی تلافی کرتے ہوئے محبت اور شدید ہوتی جارہی ہے۔"

میں نے اس کی منفی سوچ میں کہا۔ "مگر وہ تو پُرانی ہوچکی ہے۔ میں اُس کی جوانی سے بارہا کھیل چکا ہوں۔ اب اس میں کیا جاذبیت رہ گئی ہے؟ مجھے شبانہ سے اچھی کنواری اور اچھوتی لڑکیاں مِل جائیں گی۔"

"میں کنواری اور اچھوتی لڑکیوں کو دُور سے سلام کرتا ہوں۔ اگر کل رات ...کی چوری نہ پکڑ لیتا تو ہمیشہ اسے کنواری اور اچھوتی سمجھ کر فریب کھاتا رہتا۔ ہم اس ماڈرن زمانے میں یہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ جو نگینہ ہمارے ہاتھ آیا ہے وہ پہلے کسی دوسرے کی انگوٹھی میں نہیں سجا تھا۔ یا تو ہمیں اپنی عورتوں کے ...گناہ ماضی کا حساب نہیں کرنا چاہیئے۔ صرف اس کے حال اور مستقبل کی وفاداری ...دیکھنا چاہیئے یا پھر ایسی عورت کا انتخاب کرنا چاہیئے جس کی معصومیت ...اور پارسائی کو اس کے بچپن سے اور اس کی شروع جوانی سے دیکھتے اور ...سمجھتے رہے ہوں ــــ ایسی شبانہ ہے جس کے متعلق میں یقین سے کہہ ...سکتا ہوں کہ یہ نگینہ صرف میری انگوٹھی میں سجا ہے اور آئندہ بھی وہ میرے ...کسی دوسرے کا مُنہ نہیں دیکھے گی۔ اب میں کبھی شبانہ کے متعلق غلط ...انداز میں نہیں سوچوں گا۔"

میں نے اُس کی سوچ میں کہا۔ "مگر میرے ڈیڈی پورے خلوص سے ...بانہ کو اپنی بہو نہیں بنانا چاہتے۔ اُن کی نظر صرف اپنی بیوہ بھابھی کی جائداد ...پر ہے۔"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں کہ ڈیڈی کتنے لالچی ہیں مگر میں تو نہیں ہوں۔ ...اُن کے لالچ نے مجھے شبانہ کو دوبارہ حاصل کرنے کا موقع دیا ہے۔"

"مگر ـــ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اپنی بیوہ بھابھی کی جائیداد حاصل ...کرنے کے لئے ننھے عامر کو ہمیشہ کے لئے اپنے راستے سے ہٹا دیں؟"

وہ پریشان ہوکر بولا۔ "نان سنس۔ یہ کیسی باتیں میرے دماغ میں ...آرہی ہیں۔ میں اپنے ڈیڈی کے متعلق کیسی گری ہوئی باتیں سوچ رہا ہوں۔ ...وہ اتنے لالچی نہیں ہیں کہ دولت کی خاطر ایک بچّے کی جان کے دشمن بن ...جائیں۔ مجھے ایسی بات سوچنا بھی نہیں چاہیئے۔"

فیروز کے خیالات پڑھ کر مجھے دو باتوں کا علم ہوا۔ ایک تو یہ کہ ...وہ شبانہ کو صدقِ دل سے چاہنے لگا ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ اپنے ...باپ کو کسی قدر لالچی سمجھتا ہے لیکن اُس کے متعلق اتنی دُور تک نہیں سوچتا ...کہ وہ دولت کے لالچ میں ایک بچّے کا قاتل بھی بن سکتا ہے۔"

میں فیروز پر اس کے باپ کی اصلیت اس وقت تک ثابت نہیں ...کرسکتا تھا جب تک کہ اس کے خلاف کوئی عملی ثبوت نہ پیش کروں۔ اس ...مقصد کے لئے میں نے دوبارہ رفاقت علی سے سوچ کا رابطہ قائم کیا۔ ...اس وقت بیگم صاحبہ موجود نہیں تھیں۔ وہ تنہا بیٹھا منصوبے بنا رہا تھا۔ مگر ...کوئی منصوبہ اُسے قابلِ عمل نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے اُس کی سوچ میں کہا۔

"میں تنہا کچھ نہیں کرسکوں گا۔ اس سلسلے میں مجھے اپنے بیٹے کو اپنا ...رازدار بنانا چاہیئے۔"

اس کی منفی سوچ نے کہا۔ "نہیں نہیں ـــ یہ تو اور بھی احمقانہ ...خیال ہے۔ اوّل تو مجھے بیگم کو ہی اپنا رازدار نہیں بنانا چاہیئے تھا۔ میں ...اُس کے سامنے دو تین بار عامر کو راستے سے ہٹانے کی بات کرچکا ہوں۔ ...عورت ہے پیٹ کی ہلکی ہے۔ اگر میں نے نرگس کو اپنی بہو نہیں بنایا تو پتہ نہیں وہ کب اور کہاں اُلٹی سیدھی بکواس شروع کردے گی۔ اسی لئے میں اُسے جھوٹی تسلیاں دے رہا ہوں کہ شبانہ کو اپنی بہو بنا کر اُس کی ماں کی تمام جائیداد حاصل کرنے کے بعد ہم نرگس کو اپنی بہو بنائیں گے۔ بیگم کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کے لئے معلوم نہیں اور کتنے اُلٹے سیدھے وعدے کرنے ہوں گے۔ اب میں فیروز کو اپنا رازدار بنا کر مزید حماقت نہیں کرنا چاہتا۔ وہ ایک جذباتی نوجوان ہے۔ نرگس کی بے حیائی نے اس کے ذہن میں شبانہ کی محبت کا سکّہ دوبارہ جما دیا ہے۔ ابھی شبانہ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ وہ عامر کے خلاف نہ تو کوئی قدم اُٹھائے گا اور نہ ہی مجھے اُٹھانے دے گا۔ یہ آجکل کے لڑکے کسی لڑکی کے دیوانے بن کر اس پہلو پر ذرا غور نہیں کرتے کہ عورت سے زیادہ دولت اہم ہوتی ہے۔ کیونکہ دولت ہو تو کتنی ہی عورتوں کو خرچ کیا جاسکتا ہے لیکن ایک عورت ہو تو کتنی ہی دولت کو خرچ کرکے بیٹھ جاتی ہے ـــ نہیں میں اس جذباتی لڑکے کو اپنا رازدار نہیں بناؤں گا۔"

رفاقت علی کے خیالات پڑھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو رازدار بنائے۔ اس طرح فیروز کو اپنے باپ کی اصلیت معلوم ہوجاتی۔ لیکن وہ بوڑھا بہت چالاک تھا۔ اپنے بیٹے پر بھروسہ نہیں کررہا تھا۔ اب میرے پاس یہی ایک راستہ رہ گیا کہ میں وقتاً فوقتاً اس بوڑھے مکّار کے خیالات کو پڑھتا رہوں۔ جب بھی وہ کوئی مکمّل منصوبہ بنائے گا تو میں اُس کے منصوبے پر پانی پھیر دوں گا۔ اس وقت میں خاموش ہوکر بیٹھ گیا۔

رات کو پنڈی پہنچنے کے بعد ان لوگوں کا ساتھ مجھ سے چھُوٹ گیا۔ مجھے کسی اچھے ہوٹل کا کمرہ کرائے پر حاصل کرنا تھا۔ میں ان سے الگ ہوکر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ایک ہوٹل کی طرف جارہا تھا اور خیالی رابطے کے ذریعے یہ معلوم کررہا تھا کہ رفاقت علی اپنے قافلے کے ساتھ کہاں جارہا ہے؟

وہ پورا خاندان زلیخا کی کوٹھی میں پہنچا تھا۔ مجھے اس کوٹھی کا پتہ معلوم ہوگیا تھا۔ میں اطمینان سے ایک ہوٹل میں پہنچا اور وہاں رات گزارنے لگا۔ میرے دن اور رات سکون سے نہیں گزرتے۔ مجھے توقع تھی کہ اس رات بھی میں کسی ناگہانی ہنگامے میں اُلجھ جاؤں گا۔ مگر تقدیر مجھے آرام سے سونے کا موقع دے رہی تھی اس لئے میں دروازے کو اندر سے بند کرکے اطمینان سے سوگیا۔

دوسرے دن میں ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر زلیخا کی کوٹھی کے سامنے سے گزرتا ہوا مَری کی طرف روانہ ہوگیا۔ رفاقت علی کے خیالات پڑھنے کے بعد پتہ چلا کہ اس کوٹھی میں صرف خاندانی جھگڑے ہیں جو ٹرین میں میری وجہ سے شروع ہوئے تھے۔ باقی عامر اور شبانہ ابھی خیریت سے تھے۔ رفاقت علی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ننھے عامر کے خلاف ایسا کون سا قدم اُٹھائے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یعنی ان پر کوئی الزام

نہ آئے۔ چونکہ رفاقت علی کے ذہن میں کوئی منصوبہ مکمل نہیں ہوا تھا اس لئے میں چند گھنٹوں کے لئے عامر کی طرف سے مطمئن ہو گیا۔ میں نے سوچا تھا کہ مری پہنچ کر فرزانہ سے ملاقات کروں گا اور جلد ہی واپس چلا آؤں گا تاکہ عامر کی حفاظت کے لئے اس کے قریب رہ سکوں۔

میں نے خیالی رابطے سے معلوم کر لیا تھا کہ پھوپھی پورے خاندان کے ساتھ مال روڈ کے قریب ایک کاٹج میں ٹھہری ہوئی ہیں۔ ان کا پتہ معلوم کرنے کے بعد میں فرزانہ کے متعلق سوچنے لگا۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے دن رات مجھے شدت سے یاد آ رہے تھے۔ میں اُس کے ذہن میں جھانک کر یہ معلوم کرنے لگا کہ وہ مجھے کس طرح یاد کرتی ہے۔

اس کی یادوں اور سوچوں کا مرکز اس کا بیٹا پپّو تھا۔ وہی اس کی دُنیا اور وہی اس کی زندگی تھا۔ میں نے اُس کے بیٹے کو خطرناک دشمنوں سے بچایا تھا اسی لئے وہ متاثر ہو کر میری تنہائیوں کی شریک بن گئی تھی۔ پھر کراچی پہنچ کر میں نے خط کے ذریعے اُسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اتنی لمبی عمر تنہا نہ گزارے۔ کم از کم پپّو کی خاطر کسی شریف آدمی سے شادی کر لے۔ اُس وقت وہ اسی بنیاد پر سوچ رہی تھی۔

"میں جذبات میں اندھی ہو گئی تھی۔ مجھ سے بڑی بھول ہوئی کہ میں نے فرہاد کو اپنی تمام عمر کا ساتھی سمجھ لیا۔ اُس کی پھوپھی اور زرینہ سے بھی مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ وقت کی طرح کہیں نہیں ٹھہرتا۔ میں ٹھہرا ہوا تالاب ہوں اور وہ بہتا ہوا دریا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اتنی لمبی عمر میں تنہا نہیں گزار سکوں گی۔ اگر پپّو نہ ہوتا تو شاید گزار بھی لیتی۔ بار بار یہی خیال آتا ہے کہ مجھے اپنے بیٹے کی خاطر کسی معقول آدمی سے شادی کر لینی چاہیئے۔ مگر وہ آدمی فرہاد کی طرح بے باک اور دلیر ہو، اور اتنا فراخدل ہو کہ میرے بیٹے کو سوتیلا نہ سمجھے۔ مگر ایسا آدمی کہاں ملے گا؟"

اُس نے خود ہی سوال کیا اور خود ہی جواب دینے لگی۔

"ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ اب تک کتنے ہی لوگ مجھے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھ چکے ہیں۔ دراصل میں نے ہی توجہ نہیں دی اور ایک معقول انسان کو پرکھنے کی کوشش نہیں کی۔ پرکھنے اور سمجھنے سے کوئی نہ کوئی میرے اور میرے بیٹے کا محافظ مل ہی جائے گا۔"

میں کاٹج کے قریب پہنچنے ہی والا تھا۔ اس کے خیالات پڑھتے ہی میں نے فوراً ٹیکسی رُکوا دی اور ڈرائیور سے کہا کہ پنڈی واپس چلو۔ ڈرائیور پلٹ کر حیرانی سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے بہانہ کیا کہ میں اپنا ایک چھوٹا سا بیگ ہوٹل میں بھول آیا ہوں۔ ڈرائیور کو جلد ہی واپسی کی سواری مل گئی تھی اس لئے وہ پنڈی کی طرف مڑ گیا۔

میں نے فرزانہ سے ملاقات کئے بغیر واپس جانے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ حالات کے عین مطابق تھا کیونکہ وہ از سرِ نو کسی معقول شخص کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کے متعلق سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔ اگر میں اچانک اس کے سامنے پہنچ جاتا تو اُس کی یہ سنجیدگی برقرار نہ رہتی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مجھے پانے کی تمنا کرتی۔ اُس کی اور پپّو کی بہتری کے لئے فی الحال اس سے دُور رہنا ہی مناسب تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اُس کے دماغ میں ایک نئی زندگی گزارنے کا خیال پکتا رہے اور وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو جائے۔ اُس کی بھلائی کی خاطر میں نے پھوپھی اور شکیل سے بھی ملاقات نہیں کی تھی۔

واپسی میں مَیں پھر زلیخا کی کوٹھی کے سامنے سے گزرا اور وہاں سے رفاقت علی کے خیال کو پڑھتا چلا گیا۔ وہ شیخ صاحب کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا اور شیخ صاحب کے ایک مُہرے کو پیٹنے کے متعلق یوں سوچ رہا تھا جیسے اس مُہرے کی جگہ ننھا عامر کھڑا ہو۔ مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ شیخ صاحب کی چال نے اس کے منصوبے کو بدل دیا۔ میں نے اُسی ہوٹل میں پہنچ کر ٹیکسی ڈرائیور کو رخصت کر دیا اور وہاں پھر ایک کمرہ کرائے پر لے کر شام کی تفریح کا پروگرام بنانے لگا۔

دوپہر کو کھانے کا وقت ہوا تو ڈائننگ ہال میں جانے سے پہلے میں نے پھر ایک بار رفاقت علی کی سوچ کو پڑھا۔ اور پڑھتے ہی اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دماغ میں منصوبہ مکمل ہو گیا تھا اور وہ اس پر عمل کر رہا تھا۔ اس وقت کوٹھی کے بیشتر افراد شاپنگ کے لئے گئے ہوئے تھے۔ فیروز بھی شبانہ کو اپنے ساتھ کہیں لے گیا تھا۔ وہاں صرف زلیخا اپنے بیٹے کے ساتھ رہ گئی تھی۔ رفاقت علی سب کی موجودگی میں باہر گیا تھا۔ لیکن واپسی پر تنہا پٹرول سے بھرا ٹین خرید کر لا رہا تھا تاکہ کوٹھی میں آگ لگا دے۔ اور اس طرح آگ لگائے کہ زلیخا کو عامر کے ساتھ وہاں سے نکلنے کا موقع نہ ملے۔

میں تیزی سے چلتا ہوا ہوٹل سے باہر جانے لگا تاکہ فوراً ہی کسی ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں پہنچ سکوں لیکن باہر پہنچا تو ایک بھی رکشہ یا ٹیکسی نظر نہیں آئی اور رفاقت علی کی سوچ بتا رہی تھی کہ وہ پٹرول کا ٹین لئے کوٹھی کے نزدیک پہنچ چکا ہے۔ وہ کوٹھی وہاں سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھی۔ میں پاگلوں کی طرح دوڑ لگاتا تب بھی وقت پر پہنچ کر عامر اور زلیخا کو نہیں بچا سکتا تھا۔

اچانک ہی مجھے ہوش آیا کہ میں بدحواسی میں ایک اہم چیز کو بھول رہا ہوں۔ میں فوراً ہی دوڑتا ہوا واپس ہوٹل کے کمرے میں گیا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور تمام کپڑے اُتار دیئے۔ پھر سوٹ کیس کھول کر اینٹی فائر لوشن کی شیشی نکالی اور اپنے بدن پر اس لوشن کی مالش کرنے لگا۔ بڑی تیزی سے یہ کام کرنے کے بعد میں نے دوبارہ کپڑے پہنے، شیشی کو جیب میں رکھا اور کمرے سے نکل کر دوڑتا ہوا ہوٹل سے باہر آ گیا۔ ارادے نیک ہوں تو خدا مددگار بن جاتا ہے۔ اتفاق سے اسی وقت ایک ٹیکسی ہوٹل کے سامنے آ کر رُکی۔ میں ٹیکسی کا اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے کہا۔

"نہیں صاحب! ابھی ہم کہیں نہیں جائے گا۔"

میں نے فوراً ہی جیب سے پچاس کا نوٹ نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔

"ہاں صاحب! ضرور جائے گا۔"

اُس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ میں نے اُسے کوٹھی کا پتہ نہیں بتایا۔ صرف اسلام آباد چلنے کے لئے کہا۔ وہ کوٹھی راستے میں ہی پڑتی تھی۔ جب میں کوٹھی کے قریب پہنچا تو اُس کے چاروں طرف آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ لوگ اُس کوٹھی کی طرف بھاگتے ہوئے جا رہے تھے اور آگ بجھانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اُس وقت تک نرگس، شبانہ اور فیروز وغیرہ وہاں پہنچ گئے تھے۔ یہ سب کچھ مجھے رفاقت علی کے دماغی رابطے سے معلوم ہو رہا تھا۔ وہ خود کو الزام سے بچانے کے لئے زلیخا کو اُس وقت زبردستی کھینچ کر باہر لے آیا تھا جب آگ پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔ زلیخا عامر سے دُور کچن میں تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے لئے چیختی ہی رہ گئی۔ رفاقت علی نے اُسے کھینچ کر باہر لاتے وقت تسلی دی تھی کہ وہ عامر کو بھی آگ کے شعلوں سے بچا کر لے آئے گا۔ لیکن جب وہ باہر آئی تو آگ بہت بڑھ چکی تھی۔ رفاقت علی نے دکھاوے کے لئے اندر جانا چاہا مگر لوگوں نے اُسے پکڑ لیا۔ اب شبانہ اور زلیخا اپنی چھاتیاں پیٹ پیٹ کر عامر کے لئے رو رہی تھیں۔ لیکن کسی میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ آگ کے شعلوں میں سے گزرتا چلا جاتا۔

اسی وقت میں ٹیکسی سے اُتر کر دوڑتا ہوا اور لوگوں کو دھکے دے کر اپنے لئے راستہ بناتا ہوا کوٹھی کے دروازے کی طرف آیا۔ آگے نے والے آدمیوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن میں خود کو اُن سے چھڑاتا ہوا آگ کے شعلوں میں کود گیا۔

چاروں طرف سے حیرت کی کتنی ہی چیخیں سی بلند ہوئیں۔ کسی نے کہا "کوئی پاگل ہے۔ جان بوجھ کر موت کے منہ میں گیا ہے۔" مجھے پہچاننے والے پہچان کر چیخنے لگے۔

"ارے، یہ تو وہی گونگا ہے۔ یہ کہاں سے آ گیا؟"

میں نے نرگس کے باپ کی آواز بھی سُنی۔ "اچھا ہوا مرنے کے لئے آ گیا۔ اب اس کمبخت سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی۔"

ان کی آوازیں ڈوبتی چلی گئیں اور میں کوٹھی کے دُور اُفتادہ حصے میں دوڑتا چلا گیا۔ کوٹھی کے اس حصے میں جہاں عامر تھا، وہاں ابھی آگ نہیں پہنچی تھی۔ مگر جلد ہی پہنچنے والی تھی۔ وہ بچہ بڑھتے ہوئے دھوئیں سے گھبرا رہا تھا اور چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ دُور کھڑکی کے باہر اُسے شعلے نظر آ رہے تھے۔

میں نے کمرے میں پہنچتے ہی اُسے گود میں اُٹھایا۔ اُسے پیار کرتے ہوئے تسلیاں دیں۔ پھر اُس کے کپڑے اُتار کر اینٹی فائر لوشن کی شیشی نکالی۔ میں نے اس کے جسم کے ایک ایک حصے پر اس لوشن کی مالش کی۔ اُس کے بالوں میں بھی اس لوشن کو لگایا۔ پھر اُسے گود میں اُٹھا کر اس شیشی کو دیکھا۔ اس میں لوشن کی تھوڑی سی مقدار رہ گئی تھی۔ میں نے اُسے زمین پر گرا کر ضائع کر دیا تاکہ اس لوشن کے راز کو کوئی نہ سمجھ سکے۔ پھر شیشی کو ایک طرف پھینک کر کمرے سے نکل گیا۔

آگ کے شعلے کوٹھی کے اندر پہنچ گئے تھے اور اب ہمارے بدن سے بھی لپٹ رہے تھے۔ میں نے عامر کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا تاکہ وہ اپنے جسم سے اُٹھتے ہوئے شعلوں کو دیکھ کر پھر چیخنا نہ شروع کر دے۔ میں آگ کے شعلوں پر آرام سے چہل قدمی کرتا ہوا بیرونی دروازے تک آیا۔ دروازہ جل کر اس طرح گر پڑا تھا کہ باہر نکلنے کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ باہر قیامت کا شور بلند تھا۔ فائر بریگیڈ والے آ گئے تھے اور اب دروازے کھڑکیوں کی طرف پانی پھینک رہے تھے۔ میں کھڑکی کی طرف آیا تو باہر کھڑے ہوئے لوگوں نے مجھے دیکھ لیا۔ میرے اور عامر کے جسم سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اس کے باوجود میں انہیں زندہ اور متحرک نظر آ رہا تھا۔ مارے حیرت کے سب لوگ سکتے میں آ گئے۔ میں کھڑکی کی آہنی جالی کو لات مار کر توڑ رہا تھا۔ کھڑکی کی چوکھٹ آگ سے جل کر کمزور ہو چکی تھی۔ چند ٹھوکروں میں جالی دوسری طرف جا گری۔ میں عامر کو گود میں لئے اُچھل کر کھڑکی پر آیا۔ پھر چھلانگ لگا کر دہکتے ہوئے شعلوں سے باہر نکل گیا۔

میرے باہر آتے ہی لوگ گھبرا کر دُور بھاگنے لگے کیونکہ میں اور عامر ابھی تک شعلوں میں گھرے ہوئے تھے۔ فائر بریگیڈ والوں نے فوراً ہی پانی کا رُخ ہماری طرف کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے بدن کے شعلے بجھ گئے۔ لیکن کتنی ہی عورتوں نے چیخ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کیونکہ آگ کے شعلوں میں میرا لباس جل کر راکھ ہو گیا تھا اور میں لباسِ آدم میں کھڑا تھا۔

ایک پنجابی بوڑھے نے سر سے پگڑی اُتار کر مجھ پر ڈال دی اور عامر کو میری گود سے لے لیا۔ جب میں نے پگڑی کو کھول کر تہمد کی طرح باندھ لیا تو سب سے پہلے زلیخا اور شبانہ دوڑتی ہوئی میری طرف آئیں۔ زلیخا بچے کو لے کر اور اُسے سینے سے بھینچ بھینچ کر مجھے دُعائیں دینے لگی۔ شبانہ میرے سامنے کھڑی سر اُٹھائے بڑی عقیدت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ پہلے تو اُس نے بے اختیار کہا۔

"میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں ___ کس طرح آپ کے احسان کا بدلہ چکاؤں؟"

پھر اُسے خیال آ گیا کہ میں گونگا ہوں۔ یہ خیال آتے ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کیسی مجبوری تھی کہ وہ زبان سے شکریہ بھی نہیں ادا کر سکتی تھی۔ اُس کے خیال میں مَیں اُس کی زبان نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس لئے وہ احسانمندی کا اظہار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ میں اُس کے دل کی زبان سُن رہا ہوں۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"میرے گونگے فرشتے! تم نے مجھ پر بڑے احسانات کئے ہیں۔ پہلے تو تم نے نرگس کی جھوٹی محبت کے طلسم کو توڑ دیا۔ تمہاری وجہ سے میرا محبوب مجھے واپس مل گیا۔ دوسرا احسان یہ ہے کہ تم نے میرے بھائی کو

آگ کے شعلوں میں کُود کر بچا لیا۔ کیا تم واقعی فرشتہ ہو؟ آگ تم سے لپٹ گئی مگر تم جلنے سے محفوظ رہے۔ تمہاری گود میں ننھا عامر بھی محفوظ رہا۔ تم کون ہو میرے خاموش فرشتے؟"

وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ میں ابھی شبانہ کے ساتھ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایسے موقع پر مجرم کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سر کو یُوں تھام لیا جیسے آگ اور دھوئیں میں اتنی دیر رہنے کے باعث میرا سر چکرا رہا ہو۔ فیروز اور جمشید نے لوگوں کو ہٹا کر مجھے لان کی گھاس پر بٹھا دیا۔ کوئی میرے لیے پانی لانے چلا گیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ میں سر جھکا کر گھاس پر بیٹھتے ہی رفاقت علی کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ وہ حیران پریشان تھا۔ دُور لوگوں کی بھیڑ میں کھڑا ہوا بار بار مجھے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں مجھے گالیاں دیتا ہوا سوچ رہا تھا۔

"پتہ نہیں یہ کمبخت کہاں سے مرنے آ گیا۔ میں نے کتنی مکمل پلاننگ کی تھی۔ آگ بھی لگائی تھی اور خود کو الزام سے بچانے کے لیے زلیخا کو آگ سے بھی نکال دیا تھا۔ اس طرح مجھ پر کوئی آنچ نہ آتی اور عامر جل کر مر جاتا۔ مگر تعجب ہے کہ یہ گونگا ہے کون ——؟ آگ نے اس پر اثر کیوں نہیں کیا ——؟"

میں نے اُس کی سوچ میں کہا "اس لئے کہ سچائی نمرود کی آگ میں بھی نہ جل سکی۔ خدا جب سچائی کا محافظ بن جاتا ہے تو ننھے عامر کے لئے بھی آگ کو گلزار بنا دیتا ہے۔"

اُس کی سوچ نے جھنجلا کر کہا۔ "نہیں نہیں —— اس سائنسی دور میں معجزے نہیں ہوتے ......"

"تو پھر یہ کیا ہے جو آنکھوں کے سامنے نظر آیا ہے؟ پتہ نہیں آجکل کا پٹرول کیسا ہے؟ پٹرول آگ بھڑکاتا ہے مگر جلاتا نہیں ہے۔ میں وہ پٹرول کا ٹین کہاں سے خرید کر لایا تھا؟"

"زیرو پوائنٹ کے پٹرول پمپ سے۔" اُس نے بے اختیار سوچ کے ذریعے کہا پھر سنبھل کر سوچنے لگا۔ "مگر میں کہیں سے بھی خرید کر لاتا۔ میں یہ سب کچھ کیوں سوچ رہا ہوں؟"

"اس لئے سوچ رہا ہوں کہ اب مجھے اپنے جرم کا اعتراف کر لینا چاہیئے ......"

"نہیں۔ میں پاگل نہیں ہوں کہ اعتراف کروں۔"

"ہاں میں پاگل ہوں۔ مجھے اعتراف کرنا پڑے گا —— میں پاگل ہوں ہاہاہا —— ہاہاہا ...."

میں نے اس کی سوچ میں قہقہہ لگا کر اُسے ہنسنے پر مجبور کیا۔ وہ بے اختیار ہنسنا چاہتا تھا پھر جلد ہی سنبھل گیا۔ مگر کب تک سنبھل سکتا تھا۔ میں اس کی سوچ میں مسلسل قہقہے لگانے لگا۔ میرے قہقہے اُس کی کھوپڑی کے اندر گونج رہے تھے اور اس کے دماغ سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کر رہے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بالوں کو نوچتا ہوا اس مجمع سے دُور جانا چاہتا تھا۔ میں نے فوراً ہی اُس کی سوچ میں کہا۔

"اُف میرے دماغ کی طرح میرے پاؤں بھی لڑکھڑا رہے ہیں۔ ہائے باپ رے میرے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی ہے۔"

اس سوچ کے ساتھ ہی وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اُس کے دماغ میں اب تک میرے خیالی قہقہے گونج رہے تھے۔ زمین پر گرتے ہی وہ آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا اور پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔ سب لوگ اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ فیروز دوڑتا ہوا اپنے باپ کے پاس پہنچ گیا اور اُسے جھنجوڑ کر پُوچھنے لگا۔

"ڈیڈی! یہ اچانک آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ اس طرح قہقہے کیوں لگا رہے ہیں؟"

لیکن وہ جواب دینے کے قابل نہیں تھا۔ میرے مسلسل قہقہے اُسے جواب دینے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اسی طرح ہنستے ہنستے ذہنی طور پر بالکل کمزور ہو جائے۔ کیونکہ اب بھی وہ قہقہوں کے درمیان سنبھلنے کی ناکام سی کوشش کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ بالکل ہی نڈھال ہو گیا اور پوری طرح میری سوچ کی گرفت میں آ گیا تب میں نے اُس کی سوچ میں کہا۔

"میں مجرم ہوں —— میں مجرم ہوں —— میں نے عامر کو جلا کر مار ڈالنے کی کوشش کی تھی۔"

خاندان کے تمام افراد اس کے اطراف جمع ہو گئے تھے۔ اُن کے علاوہ سارا مجمع اس کی زبان سے وہ باتیں سُن رہا تھا جو میں اس کی سوچ میں کہہ رہا تھا۔ اُس کی بیگم جانتی تھیں کہ اس کا لالچی شوہر عامر کو ختم کر دینا چاہتا ہے لیکن اُس کی زبان سے جرم کا اعتراف سُن کر وہ بوکھلا گئی تھیں اور اسے جھنجوڑ کر کہہ رہی تھیں۔

"یہ آپ کیسی پاگلوں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ تو عامر کو بیٹے کی طرح چاہتے ہیں۔ شبانہ کو بہو بنا رہے ہیں۔ زلیخا کو آپ نے آگ سے بچایا ہے۔ آپ ایک ننھی سی جان کے دشمن نہیں بن سکتے۔ ہوش میں آیئے۔"

میں نے رفاقت علی کی سوچ میں کہا کہ میرے سامنے جو عورت بکواس کر رہی ہے اسے ایک ہاتھ جما کر دُور کر دینا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی رفاقت علی کا ہاتھ گھوم گیا۔ بیگم کے مُنہ پر ایک اُلٹا ہاتھ پڑا تھا اور وہ دوسری طرف گھوم گئیں۔ پھر وہ میری سوچ کے مطابق چیخنے لگا۔

"ہاں۔ میں اس ننھی سی جان کا دشمن ہوں۔ تم مجھے میرے جرم کا اعتراف کرنے سے روک رہی ہو۔ میں نے تمہارے سامنے کئی بار اس بچے کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ میں اس طرح اسے مارنا چاہتا تھا کہ ہم پر کوئی الزام نہ آئے۔ آج مجھے موقع مل گیا تھا کہ اسے اس کوٹھی میں زندہ جلا کر مار ڈالوں۔ جب تم سب لوگ شاپنگ وغیرہ کے لئے چلے گئے تو میں بھی اسلام آباد جانے کا بہانہ کر کے نکلا تھا۔ مگر جلد ہی واپس آ کر

میں نے کوٹھی کے چاروں طرف پٹرول چھڑک دیا۔ ہاہاہا... میرا منصوبہ بالکل مکمل تھا۔ میں آگ لگاتے ہی کوٹھی کے اندر گیا اور زلیخا کو نکال کر لے آیا تاکہ لوگ میری اس دلیری کے پیشِ نظر یہ سوچ بھی نہ سکیں کہ آگ لگانے والا میں ہی ہوں —— مگر نہ جانے وہ گونگا فرشتہ کہاں سے آ پہنچا۔ میں جس بچے کو مار کر اس کی جائیداد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اس بچے کو بچا لیا —— ہاہاہا میں مجرم ہوں۔ مجھ پر قدرت کا یہ راز کُھل گیا ہے کہ جسے اللہ رکھے اُسے کوئی نہ چکھے۔ میں مجرم ہوں، مجھے مارو۔ مجھے پھانسی پر چڑھا دو ......"

فیروز حیرانی اور پریشانی سے اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے شبانہ کے سامنے نادم ہو کر کہا۔

"ڈیڈی! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ دولت کی خاطر ایک معصوم بچے کے قاتل بھی بن سکتے ہیں۔"

بیگم نے چیخ کر کہا۔ "نہیں۔ تمہارے ڈیڈی قاتل نہیں ہیں۔"

رفاقت علی نے جواباً چیخ کر کہا۔ "ہاں میں قاتل نہیں ہوں مگر ایک بچے کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ یقین نہ ہو تو زیرو پوائنٹ کے پٹرول پمپ پر جا کر دریافت کر لو۔ میں نے آگ لگانے کے لئے وہاں سے پٹرول کا ٹین خریدا تھا۔"

وہ خود ہی اپنے مجرم ہونے کا ثبوت پیش کر رہا تھا، فائر بریگیڈ کے ایک افسر نے کہا۔ "اسے پکڑ کر پولیس اسٹیشن لے چلو۔ وہاں اس سے تحریری بیان لیا جائے گا۔"

بیگم چیخ چیخ کر اعتراض کرنے لگیں کہ اس کے شوہر کو مجرم نہ سمجھا جائے۔ انہوں نے فیروز سے کہا کہ وہ اپنے باپ کو اس مصیبت سے بچائے مگر وہ دُور ہٹ کر بولا۔

"باپ ہو یا خون کا کوئی اور رشتہ، انصاف سے ہر ایک کے جرم کا حساب ہونا چاہیئے۔ یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ پہلے ہم سب نے مل کر شبانہ پر ظلم کیا اور اب ڈیڈی ایک معصوم بچے کے دشمن بن گئے ہیں۔ امی —— میں شبانہ کی طرف سے ڈیڈی کے خلاف مقدمہ لڑوں گا۔"

وہ شبانہ کا ہاتھ پکڑ کر زلیخا کے پاس آ گیا۔ لوگ رفاقت علی کو پکڑ کر لے جانے لگے۔ اس دوران بہت سے لوگ میرے پاس آ کر پوچھ رہے تھے کہ آگ کے شعلوں نے مجھ پر اثر کیوں نہیں کیا؟ انہیں سمجھانے کے لئے میرے پاس ایک ہی بات رہ گئی تھی۔ میں نے اپنی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی انہیں دکھاتے ہوئے اشاروں میں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ بہت کرامات والی انگوٹھی ہے۔ یہ مجھے بڑی بڑی مصیبتوں سے بچاتی ہے۔ اس وقت تک آگ مکمل طور سے بجھ چکی تھی۔ کوٹھی کے افراد اندر جا کر اپنے نقصانات کا اندازہ لگا رہے تھے۔ کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا۔ کوٹھی کا اندرونی حصہ اور وہاں کا تمام سامان محفوظ تھا۔ فیروز بڑی عزت سے مجھے اندر لے گیا۔ زلیخا کئی بار میری بلائیں لے چکی تھی اور میری طویل عمر کی دُعائیں مانگتی جا رہی تھی۔ میں شام تک ان کے ساتھ رہا پھر دوسرے دن ملاقات کا وعدہ کر کے اپنے ہوٹل میں واپس آ گیا۔

فیروز، شبانہ اور زلیخا وغیرہ کی دانست میں مَیں نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ میں بھی ایسی مشکل سچویشن میں ہیرو بن کر خوش ہو گیا تھا۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ یہ ہیرو بننا بہت مہنگا پڑے گا۔ ہوا یہ کہ میرے اس کارنامے کی خبر دوسرے دن اخبار میں چھپ گئی۔ اس واقعے کی تفصیلی رپورٹ کے لئے کتنے ہی اخباری رپورٹر اور فوٹو گرافر پہلے زلیخا کی کوٹھی میں پہنچے۔ وہاں فیروز نے انہیں میرے ہوٹل کا پتہ بتایا تو وہ ہوٹل میں آ دھمکے۔ مجھے جیسے ہی اُن کے آنے کی خبر ملی میں نے اپنا سُوٹ کیس سنبھالا اور کیمروں کی زد میں آئے بغیر ہوٹل کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اخبار میں میری تصویر شائع ہو کر کسی وقت میرے دشمنوں کے کام آئے۔ میں وہاں سے نکل کر سیدھا زلیخا کی کوٹھی کی طرف گیا تاکہ فیروز کو سمجھا دوں کہ میں کبھی اپنی تصویر نہیں اتروا تا ہوں۔ وہ رپورٹروں اور فوٹو گرافروں کو آئندہ میرے پیچھے نہ لگائے۔ کوٹھی کے قریب پہنچ کر میں رُک گیا۔ دُور اس کوٹھی کے احاطے میں ایک کار آ کر رُکی تھی اور اُس میں سے ایک قوی ہیکل شخص عمدہ سُوٹ پہنے باہر آ رہا تھا۔ اس کا سر مُنڈا ہوا تھا۔ اس مُنڈے ہوئے سر کو دیکھتے ہی نہ جانے کیسے میرے دماغ میں بیل مُنڈو کا نام لہرایا۔ بغیر سوچے سمجھے اس کوٹھی میں جانا اور کسی اجنبی سے سامنا کرنا مناسب نہیں تھا۔

میں نے بیل مُنڈو کے دماغ میں احتیاطاً جھانک کر دیکھا۔ میں اُس کی سوچ کے ذریعے معلوم کر سکتا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟ اور میرے لئے کیا کر رہا ہے؟ پھر میری احتیاط کام آ گئی۔ بیل مُنڈو کی سوچ بتا رہی تھی کہ وہ اپنی کار سے اُتر کر اس کوٹھی کے دروازے کی طرف جا رہا ہے۔ جہاں پچھلے دن آگ لگی تھی —— یعنی دُور نگاہوں کے سامنے وہ جو مُنڈے ہوئے سر کا آدمی نظر آ رہا تھا، وہی بیل مُنڈو تھا۔

یک بیک میرے اعصاب میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ ایک خطرناک دشمن میرے سر پر آ پہنچا تھا۔ وہ کیسے یہاں تک پہنچ گیا؟

وہ پہنچ گیا تھا یا وہ نادیدہ شیطان ماسٹر لوشے میری طرح سوچ کا سفر طے کرتے ہوئے میرے سامنے آ گیا تھا ——؟ چشمِ زدن میں یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ ماسٹر لوشے اینٹی فائر لوشن کے متعلق جانتا تھا۔ میرے آگ سے گزرنے والا کارنامہ اور اخباروں میں شائع ہونے والی خبروں نے اُسے بتا دیا کہ میں کہاں پایا جا سکتا ہوں؟

اور میں جہاں پایا جا سکتا تھا، وہاں اُس شیطان نے بیل مُنڈو کو پہنچا دیا تھا۔

میں اپنی اٹیچی اٹھا کر زلیخا کی کوٹھی سے دور ہوتا چلا گیا۔ اس کوٹھی کے احاطے میں بیل منڈو کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ میں چلتے چلتے بیل منڈو کے دماغ میں جھانک رہا تھا۔ اس وقت وہ فیروز سے باتیں کر رہا تھا۔ اور اس سے کہہ رہا تھا۔

"میں اٹلی کا باشندہ ہوں۔ یہاں آپ کے ملک کی سیر کرنے آیا ہوں۔ میں نے اخبار میں ایک حیرت انگیز خبر پڑھی ہے۔ اس خبر میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کوٹھی میں آگ لگ گئی تھی۔ کسی گونگے آدمی نے آگ کے شعلوں میں کود کر ایک بچے کی جان بچائی ہے۔ میں یہ پڑھ کر بہت حیران ہوا کہ ایک انسان فائر پروف کیسے ہو سکتا ہے۔ یہاں آکر میں نے دوسرے لوگوں سے بھی بات چیت کی۔ لوگ یہی کہتے ہیں کہ اس گونگے کے بدن سے شعلے اٹھ رہے تھے لیکن وہ آگ کی جلن سے محفوظ تھا۔ میں ایسے عجیب انسان سے ملنے آیا ہوں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی اگر آپ اس سے میری ملاقات کرا دیں۔"

فیروز نے جواب دیا۔ "وہ گونگا واقعی ایک عجیب انسان ہے مگر افسوس کہ ابھی یہاں موجود نہیں ہے۔ اس کی رہائش دلکشا ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۳ میں ہے اگر آپ وہاں جائیں تو اس سے ملاقات ہو جائے گی۔"

بیل منڈو نے شکریہ ادا کرتے ہوئے فیروز سے مصافحہ کیا اور وہاں سے جانے لگا۔ میں اتنی دور نکل آیا تھا کہ اب وہ کوٹھی اور بیل منڈو کی کار نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں ایک جگہ رک کر سوچنے لگا کہ اب مجھے کہاں جانا چاہئیے اور کیا کرنا چاہئیے۔ ایک بچے کو آگ سے بچانے کے بعد میرے سامنے بہت سی مصیبتیں کھڑی ہو گئی تھیں۔ ماسٹر یوشے سمجھ گیا تھا کہ میں نے آگ کے شعلوں میں جو کمال دکھایا ہے وہ دراصل اینٹی فائر لوشن کا کمال ہے جس کا فارمولا صرف انجلا کے پاس تھا۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد ماسٹر یوشے نے زلیخا کی کوٹھی تک بیل منڈو کی رہنمائی کی تھی۔ اب وہ بیل منڈو شکاری کتے کی طرح پورے شہر میں مجھے سونگھتا پھر رہا۔ میں اس تنہا دشمن کی نظروں سے بچ سکتا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس علاقے کے بے شمار لوگوں نے آگ سے مجھے کھیلتے دیکھا تھا۔ ان میں سے کوئی مجھے کہیں بھی دیکھتا تو پہچان لیتا۔ ہٰذا میرا وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ بیل منڈو کسی بھی شخص کے سہارے وہاں پہنچ سکتا تھا۔ اب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو رہا تھا۔ مجھے فیروز کے باپ کو اتنی مہلت ہی نہیں دینا چاہیئے تھی کہ وہ کوٹھی میں آگ لگا سکتا۔ میں دلکشا ہوٹل کے کمرے میں بیٹھ کر ہی اس آگ لگانے والے کے دماغ کو کنٹرول کر سکتا تھا۔ مگر بدحواسی میں انسان اپنی ان صلاحیتوں کو بھی بھول جاتا ہے جن پر اسے بڑا ناز ہوتا ہے۔ مجھے بھی اس وقت خیال خوانی کے بجائے صرف اینٹی فائر لوشن ہی یاد آیا تھا۔ اب میں اپنی پناہ گاہ سے باہر آکر سوچ رہا تھا کہ کہاں جاؤں——؟ آخر میں اپنے دشمنوں سے کب تک بھاگتا پھروں گا——؟ مجھ پر کسی قدر جھلاہٹ طاری ہو گئی۔ جھلاہٹ کے دوران عقل کام نہیں کرتی۔ اس وقت میں نے سوچا فی الحال مجھے ایسی جگہ پناہ لینی چاہئے جہاں میں سکون سے بیٹھ کر موجودہ مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیریں کر سکوں۔

میں سوچنے کے دوران کسی ٹیکسی کا انتظا[illegible] ہا تھا۔ کہیں نہ کہیں تو مجھے جانا تھا۔ پندرہ منٹ بعد مجھے ایک ٹیکسی ملی تو میں نے ڈرائیور کو مری کی طرف چلنے کے لئے کہا۔ یہ تو میں بہت پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ فرزانہ سے ملاقات نہیں کروں گا۔ کیونکہ اس کے خیالات میں تبدیلی آ رہی تھی۔ وہ اپنے بیٹے پپو کی خاطر دوسری شادی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ ایسی صورت میں میں اس کے سامنے جاتا تو وہ بہک سکتی تھی۔ اسی لئے میں اس کی وجہ سے پھوپھی سے بھی ملاقات نہیں کر رہا تھا۔

ٹیکسی پہاڑی راستے سے گزر رہی تھی اور میں کھڑکیوں کے پار دیکھتا جا رہا تھا۔ آدھ گھنٹے بعد میں نے ایک جگہ ٹیکسی رکوا دی۔ ڈرائیور کو کرایہ دے کر رخصت کر دیا۔ میں جس جگہ کھڑا ہوا تھا وہاں سے دور سیکڑوں فٹ کی گہرائی میں ایک چھوٹی سی بستی نظر آ رہی تھی۔ میں راستہ چھوڑ کر نشیب میں اترنے لگا۔ میں ایسی ہی پرسکون جگہ کی تلاش میں تھا جو اسی دنیا میں ہو مگر اس دنیا سے الگ تھلگ ہو۔ جہاں شہروں کے رہنے والے مہذب بدمعاش نہ پہنچ سکیں اور میرا خیال تھا کہ ان کا خیال اس چھوٹی سی بستی تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

میں نشیب میں اترتے وقت کئی بار گرتے گرتے بچا۔ ایسی جگہ شہر کی سپاٹ اور چکنی سڑکوں پر چلنے والوں کے لئے اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے۔ انسان کو ایسے علاقوں میں بھی رہنا چاہیئے جہاں چلتے پھرتے انہیں اپنے جسم کا وزن معلوم ہوتا رہے اور اپنا توازن قائم رکھنے کی مشق ہوتی رہے۔ پہاڑوں کے نشیب و فراز میں زندگی گزارنے والے چھوٹے چھوٹے بچے مجھ سے زیادہ چاق و چوبند اور پھرتیلے نظر آ رہے تھے۔ وہ خطرناک ڈھلان پر اس طرح دوڑتے پھر رہے تھے جیسے سطح میدان میں کھیل رہے ہوں۔ ایک لڑکی بھیڑ اور بکریوں کو ہانکتی ہوئی بستی کی طرف جا رہی تھی۔ پہاڑیوں میں اترنے والے بادل اناج منش کی طرح اپنے سفید پنکھ پھیلائے اس لڑکی کے وجود کو چھوتے ہوئے گزر رہے تھے وہ مجھ سے بہت دور تھی۔ واضح طور پر نظر نہیں آ رہی تھی لیکن وہ حسین منظر اس لڑکی کی موجودگی سے مکمل ہو گیا تھا۔ میں اس کی سمت بڑھتا چلا گیا۔ بستی کے قریب پہنچ کر ہمارا درمیانی فاصلہ کم ہو گیا۔ میں نے اسے آواز دی۔ "اے لڑکی سنو!"

وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا تو میں ٹھٹھک کر چند لمحوں کے لئے اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ اس کی کٹورہ جیسی سیاہ آنکھوں کو دیکھتے ہی مجھے یوں لگا جیسے وہ ہپناٹائز کرنا جانتی ہو۔ اس کے دیکھنے کے انداز میں اتنی کشش تھی کہ میں کشاں کشاں اس کے قریب پہنچ گیا۔

وہ پہاڑی آنکھیں تھیں۔ شہری زندگی کی غلاظت اور مکاریوں سے پاک تھیں۔ وہ آنکھیں شبنم سے دھلی تھیں۔ مناظر فطرت سے معصومیت کا درس لیتی تھیں اور سُبک رو بادلوں کی طرح دل کو چھوتی ہوئی نکل جاتی تھیں۔ ہپناٹزم کا مطلب اگر سحرزدہ کرنا ہے تو وہ آنکھیں علم تنویم سے ناآشنا ہونے کے باوجود سحرزدہ کر دیتی تھیں۔ اس کے بدن کی اجلی رنگت میں ہلکے ہلکے گلابی رنگ کی آمیزش تھی۔ مجھ جیسے اجنبی کو قریب دیکھتے ہی رخساروں کے گلاب قدرے سرخ ہو گئے۔ وہ جنگل کی ہرنی کی طرح بے زبان ہو گئی اور سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔

"میں ایک مسافر ہوں۔ کیا اس بستی میں کہیں ڈاک بنگلہ ہے؟"

اس نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا اور پلٹ کر بستی کی طرف بھاگنے

لگی۔ اس کے بھاگنے پر بھیڑ بکریاں ادھر ادھر منتشر ہونے لگیں۔ بھاگتے وقت اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں جو خیالات کی ڈور تھام کر دل کی دھڑکنوں تک پہنچ جاتا ہوں اس وقت اس کے دل کی دھڑکنوں کا مطلب وضاحت سے نہ سمجھ سکا۔ ایک شکاری کو دیکھ کر ہرنی بھڑکتی ہے۔ کسی ایسے شخص کو جو اس کے ماحول سے مختلف تھا دیکھ کر وہ بھڑک گئی۔ نشیب میں اترنے کے دوران میں دو مکانوں سے گزرنے کے بعد تیسرے مکان کے پچھواڑے رک گیا۔ ایک بوڑھا آدمی اس لڑکی کے ساتھ اس مکان سے باہر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی سلام کیا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"اگر یہاں ڈاک بنگلہ ہے تو مجھے وہاں لے چلو۔"

بوڑھے نے کہا۔ "میں ڈاک بنگلے کا چوکیدار ہوں۔ اگر آپ کچھ خیال نہ کریں تو مجھے اپنے دفتر کا کارڈ بتا دیں۔ وہ ڈاک بنگلہ صرف فارسٹ آفیسروں کیلئے ہے۔"

"میں فارسٹ آفیسر نہیں ہوں۔ صرف ایک مسافر ہوں۔ شہری ہنگاموں سے گھبرا کر یہاں آیا ہوں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی اگر آپ میری رہائش کا یہاں انتظام کر دیں۔"

اس نے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔ "صاحب! میں مجبور ہوں۔ مجھے سختی سے یہ ہدایت کی گئی ہے کہ میں عام مسافروں کو وہاں رہنے کی جگہ نہ دوں۔"

میں پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ دراصل میں بڑی خاموشی سے اس پر اپنی پریشانی ظاہر کر رہا تھا تاکہ وہ میرے چہرے کو پڑھتا رہے اور اس دوران میں اسے پڑھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

"افسروں کے حکم پر کون عمل کرتا ہے۔ دور دور کی پہاڑیوں میں جتنے ڈاک بنگلے ہیں۔ ان سب کے چوکیدار دوسرے مسافروں کو ٹھہرا کر ان سے کرایہ وصول کرتے ہیں۔ ایسا نہ کریں تو پچاس روپے ماہوار پر گزارہ کہاں ہوتا ہے؟"

اوپری آمدنی کے لیے رشوت لینے اور اپنے افسروں کو فریب دینے کے طریقے معصوم دیہاتیوں کو بھی آ گئے ہیں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ فریب اور مکاریاں صرف شہر تک ہیں مگر یہ زہر بہت دور جنگلوں تک پہنچ چکا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جہاں انسان کے قدم پہنچتے ہیں وہاں بے شمار ضرورتیں بھی پہنچ جاتی ہیں اور ضرورتیں انہیں سکھا دیتی ہیں کہ پیٹ کے لئے روٹی، تن کے لئے کپڑا اور جوان بیٹی کے جہیز کے لئے اوپری آمدنی نہایت ضروری ہوتی ہے۔ میں نے اوپری جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر کہا۔

"میں صرف دو دن یہاں رہنا چاہتا ہوں۔ اگر زیادہ دنوں تک یہاں رہا تو اور زیادہ پیسے دوں گا۔"

سو روپے کا نوٹ دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ اتنی رقم کو ٹھکرا نہیں سکتا تھا۔ اس نوٹ کو دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔

"یہاں مہینوں گزر جاتے ہیں کوئی افسر نہیں آتا اور اب تو سردیاں شروع ہو رہی ہیں۔ یہاں کسی افسر کے پہنچنے کا اندیشہ بھی نہیں ہے اور یہ تو صرف دو دن رہے گا۔ پھر یہاں سے چلا جائے گا۔ اتنی بڑی رقم تو آج تک کسی مسافر نے نہیں دی۔"

یہ سوچنے کے باوجود اس نے رسمی طور پر انکار کیا۔ "نہیں صاحب—— پیسے کی ضرورت تو ہر انسان کو ہوتی ہے مگر میں ڈرتا ہوں کوئی آفیسر یہاں آ پہنچا تو میری نوکری چلی جائے گی۔"

"تمہاری نوکری نہیں جائے گی۔ اگر کوئی افسر آئے گا تو میں اسے سمجھا لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

یہ کہہ کر میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اور دعائیں دیتے ہوئے اس نوٹ کو قبول کر لیا۔ پھر میرے ساتھ ڈاک بنگلے کی طرف چلنے لگا۔ میں نے ذرا دور جا کر پلٹ کر دیکھا تو وہ لڑکی ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی وہ پھر ہرنی کی طرح بدک کر بھاگتی ہوئی اپنی جھونپڑی کے اندر چلی گئی۔ اب بھی اس کا دل دھڑک رہا تھا مگر اس کے دل میں بھٹکنے والے جذبات نہیں تھے۔ وہ جوان تھی مگر ایک ننھی سی بچی کی طرح سوچ رہی تھی کہ بابا کو اتنا بڑا نوٹ ملا ہے۔ آج تو میں بابا سے ضرور ضد کروں گی کہ میرے لئے ریشم کا سرخ جوڑا بنائے۔ آخر میں کب تک پرانے کپڑے پہنتی رہوں گی! توبہ توبہ! یہ کپڑے کتنے میلے ہو گئے ہیں۔ اس شہر والے بابو نے مجھے دیکھ کر سوچا ہو گا کہ میں کتنی گندی لڑکی ہوں۔

میں نے اس لڑکی کی سوچ پڑھ کر اسے اپنے دماغ سے نکال دیا۔ وہ مجھے بہت اچھی لگ رہی تھی مگر میں اس اچھائی کو میلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں سوچتے سوچتے ڈاک بنگلے کے سامنے پہنچ کر ٹھٹھک گیا۔ وہاں مجھ سے پہلے ہی ایک جوڑا آ کر آباد ہو گیا تھا۔ میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ اس چھوٹی سی بستی کا ڈاک بنگلہ ویران پڑا ہو گا اور میں یہاں تنہائی میں بیٹھ کر دشمنوں سے نمٹنے کا منصوبہ بناؤں گا۔ میں نے بوڑھے بابا سے پوچھا۔

"کیا یہاں تمہارا کوئی آفیسر آیا ہوا ہے؟"

"نہیں صاحب۔ فلم والے آئے ہوئے ہیں۔"

"تم آفیسروں سے ڈرتے ہو اور دوسروں کو رہنے کی جگہ بھی دیتے ہو؟"

"مجبوری ہے صاحب۔ آپ نے میری جوان لڑکی کو دیکھا ہے۔ مجھے اس کی شادی کی فکر ہے۔ اگر میں اس طرح چار پیسے نہیں جوڑوں گا تو اسے کیسے دلہن بنا کر رخصت کروں گا۔"

مجھے اس ڈاک بنگلے میں نہیں جانا چاہیئے تھا کیونکہ میں نے دنیا والوں کے سامنے خود کو گونگا بنا کر رکھا تھا۔ اس بستی میں پہنچ کر اس لئے زبان کھولی تھی کہ وہاں شہر والوں سے سامنا ہونے کی توقع نہیں تھی۔ اب جو لوگ ڈاک بنگلے میں تھے میں ان کے سامنے گونگا بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ برآمدے میں ایک ایزی چیئر پر ایک نوجوان عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی خوبصورتی اور اس کے لباس سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ فلم کی ہیروئن ہے۔ مجھ سے نظریں ملتے ہی وہ بڑی لاپرواہی سے سگریٹ کا کش لیتی ہوئی دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اسے اس بات پر ناز تھا کہ اسے ساری دنیا دیکھتی ہے۔ لیکن میں نے پھر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کے قریب ایک شخص ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ مجھے دیکھنے کے بعد بوڑھے چوکیدار کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اسے اس بات پر اعتراض تھا کہ بوڑھا ایک اجنبی کو وہاں کیوں لے آیا ہے۔
بوڑھے بابا نے میرے لئے ڈاک بنگلے کا ایک کمرہ کھول دیا۔ میں کمرے کے اندر چلا گیا۔ اٹیچی ایک جگہ رکھنے کے بعد آرام سے ایک کرسی پر بیٹھ کر میں باہر ہونے والی باتیں سننے لگا۔ اتنی دور سے باتیں سنائی نہیں دے سکتی تھیں مگر میں دماغی سماعت سے سن رہا تھا۔ ہیروئن کے پاس کھڑے ہونے والا شخص چوکیدار سے کہہ رہا تھا۔

"میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ آج رات ہماری پوری یونٹ یہاں پہنچنے والی ہے۔ ہمیں پورے ڈاک بنگلے کی ضرورت ہے۔ پھر تم اس مسافر کو یہاں کیوں لائے ہو؟"

بوڑھے چوکیدار نے جواب دیا۔ "ڈاک بنگلے میں چار کمرے ہیں۔ تین کمرے آپ لوگوں کے لئے ہیں۔ ایک کمرہ میں نے احتیاطاً اپنے کسی آفیسر کے لئے خالی رکھا تھا۔ یہ شخص جو ابھی یہاں آیا ہے میرے آفیسر کا رشتے دار ہے۔ اگر آپ لوگ اس پر اعتراض کریں گے تو یہ آپ لوگوں کو بھی یہاں سے نکلوا دے گا اور میری ملازمت بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

اس کا جواب سن کر اس شخص نے ہیروئن کی جانب دیکھا۔ ہیروئن نے حقارت سے کہا۔

"اونہہ۔ رہنے دو اسے۔ پتہ نہیں کم بخت کہاں سے آمرا ہے۔ ہمارے لئے ہماری شہرت بھی مصیبت بن جاتی ہے۔ کہیں آزادی سے گھومنے پھرنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ تم جاؤ یہاں سے ۔ ۔ ۔ ۔"

اس نے چوکیدار سے جانے کے لئے کہا تو وہ چلا گیا۔ اس شخص نے کہا "میری جان ایک اجنبی کی موجودگی سے تمہاری آزادی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ تم اتنی حسین ہو کہ اس کی نگاہوں سے میلی نہ ہو سکو گی۔"

وہ اپنے حسن کی تعریف سن کر دل ہی دل میں خوش ہوئی تھی مگر بظاہر ناگواری سے کہنے لگی۔ "تم نے مجھے میری جان کیوں کہا؟ ہزار بار میں نے تمہیں سمجھایا ہے کہ تنہائی میں بھی مجھے اس انداز میں مخاطب نہ کیا کرو۔"

اس شخص نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "مگر جانی! ایک شوہر ہونے کے ناطے مجھے تنہائی میں یہ حق حاصل ہونا چاہئیے۔"

وہ دبی ہوئی تیز سرگوشی میں غصے سے بولی۔ "احمق نہ بنو، پاس والے کمرے میں کوئی اجنبی آیا ہوا ہے۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ میں تمہاری بیوی ہوں تو یہ بات فلمی اخباروں تک پہنچے گی۔ اس طرح میری شہرت کو دھکا پہنچے گا۔ دنیا والوں کی نظروں میں تم میرے بھائی ہو۔ بھائی کی طرح گفتگو کرو۔"

میں ان کی باتیں سن کر مسکراتے ہوئے سگریٹ سلگانے لگا۔ فلمی شہرت کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہیروئن کم عمر ہو اور کم عمری ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ غیر شادی شدہ ہو۔ اگر شادی شدہ ہو تب بھی رشتے بدل کر اپنی شہرت کو قائم رکھنے کے لئے دنیا والوں سے جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ میں نے ان لوگوں پر لعنت بھیجی۔ دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ میں تھوڑی دیر تک خاموشی سے لیٹا رہا۔ اس کے بعد چپکے چپکے بیل منڈو کے دماغ میں جھانکنے لگا

وہ اب تک مجھے تلاش کر رہا تھا۔ فیروز کے بتائے ہوئے پتے پر وہ ہوٹل بھی گیا تھا۔ وہاں جا کر اسے پتہ چلا کہ اخباروں کے رپورٹر اور فوٹو گرافر بھی اس گونگے کو تلاش کر رہے ہیں۔ ہوٹل کے بیرے نے انہیں بتایا کہ وہ گونگا صبح اپنے کمرے میں موجود تھا لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ بہت سے لوگ اس سے ملنا چاہتے تو پتہ نہیں کیوں وہ گھبرا سا گیا اور کسی وقت ہوٹل کے پچھلے دروازے سے نکل کر چلا گیا۔ بیل منڈو وہاں سے مایوس ہو کر پھر زلیخا کی کوٹھی کی طرف گیا تھا۔ وہاں بھی اسے مایوسی ہوئی۔ اب وہ ایسے آدمی کو بے کرکار میں گھوم رہا تھا جس نے مجھے جلتی ہوئی کوٹھی میں جاتے دیکھا تھا۔ ابھی اس کی تلاش جاری تھی۔ شاید ماسٹر یوشے بھی اسکے دماغ میں جھانکتے ہوئے اس کی مصروفیات کو سمجھ رہا تھا اس لئے وہ بھی اسے مخاطب نہیں کر رہا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر کے لئے بیل منڈو کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور پھوپھی سے رابطہ قائم کیا۔ وہ مری کی سڑکوں پر زرینہ اور فرزانہ کے ساتھ سیر کر رہی تھیں۔ میں تھوڑی دیر تک ان کی باتیں سنتا رہا۔ ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ وہ سب مطمئن ہیں اور کسی قسم کا خطرہ ان کے قریب نہیں منڈلا رہا ہے۔

ان کی طرف سے اطمینان ہوا تو میں نے سعید احمد کی خبر لی۔ اتفاق کہ وہ بھی چھپنے کے لئے مری پہنچے ہوئے تھے۔ میں نے ان کے دماغ پر دستک دی تو وہ چونک گئے پھر فوراً ہی شکایت کرنے لگے۔ "فرہاد تم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ مجھے کچھ معلوم تو ہونا چاہئیے کہ تم کیا کر رہے ہو؟"

میں ان کے اطمینان کے لئے تمام واقعات سنانے لگا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں کس قدر مصروف اور دشمن کس طرح میرے پیچھے سائے کی طرح لگے ہوئے ہیں تو وہ پریشان ہو کر بولے۔ "یہ ماسٹر یوشے واقعی شیطان ہے آخر اس سے کب پیچھا چھوٹے گا؟"

میں نے جواب دیا۔ "پہلے میں نے سوچا تھا کہ اس شیطان سے دور بھاگ کر پیچھا چھڑا سکتا ہوں مگر وہ اپنے آلہ کاروں کے ذریعے میرے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کے سب سے خطرناک آلہ کار بیل منڈو سے ٹکرا جاؤں۔ جب تک میں اسے ختم نہیں کروں گا اس وقت تک وہ شیطان میرا پیچھا کرتا ہی رہے گا۔ اس کے دوسرے آلہ کار آپ کے انٹیلیجنس کے چند افسر ہیں۔ وہ لوگ آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔ آپ چند روز تک ان سے دور رہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جلد ہی وہ مائیکرو فلم آپ تک پہنچا دوں گا۔ اس کے بعد میں ہمیشہ کے لئے آپ سے دماغی رابطہ ختم کر دوں گا۔"

"ایسا نہ کہو فرہاد! مجھے تمہاری دوستی عزیز ہے۔"

"مجھے مجبوراً ایسا کرنا پڑے گا۔ جب آپ مائیکرو فلم حاصل کرنے کے بعد اپنے دفتر میں جائیں گے تو ماسٹر یوشے وہاں کے [illegible] آفیسروں کے ذریعے آپ [illegible] تک پہنچے گا۔ اور آپ سے میرا پتہ معلوم کرنے کی ہر ممکن کوشش [illegible] سے دماغی رابطہ نہیں رکھوں گا تو آپ میرے متعلق کچھ نہیں [illegible] میں کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔ آپ کی یہ سوچ ماسٹر یوشے [illegible] [illegible] اس شیطان کو یقین ہو جائے گا کہ میں [illegible]

۔ آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ آپ ایک نامعلوم مدت کے لئے مجھ سے [illegible] ہو جائیں۔ خدا کو منظور ہوا تو پھر ملیں گے۔"

سعید احمد نے بے بسی سے کہا۔ "میں اپنی اور تمہاری مجبوریوں کو سمجھ [illegible] ہوں۔ مگر جب تک مائیکرو فلم حاصل نہیں ہوتی اس وقت تک مجھ سے رابطہ [illegible] رکھو۔"

میں نے آئندہ بھی ان سے گفتگو کرنے کا وعدہ کیا اور رابطہ ختم کر دیا۔

[illegible] مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے کمرے سے نکل کر دروازے کو [illegible] کیا اور چوکیدار کے گھر کی طرف جانے لگا۔ وہ ہیروئن اور اس کا نام نہاد بھائی یا [illegible] اس وقت برآمدے میں نہیں تھے۔ ان کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا [illegible] کمرے میں وہ دوغلے شاید رشتے کا تجزیہ کر رہے تھے۔ میں نے جھونپڑی کے دروازے [illegible] پہنچ کر بوڑھے بابا کو آواز دی تو وہ لڑکی باہر آئی۔ میں نے اس سے مذاقاً کہا۔

"میں نے بابا کو آواز دی تھی۔ تمہارا نام بابا تو نہیں ہے؟"

اس نے جواب دیا۔

"بابا گھر میں نہیں ہے۔ اس لئے تمہاری آواز سن کر میں چلی آئی۔"

میں نے معصومیت سے پوچھا۔

"اچھا تو بابا جس وقت گھر پر نہیں ہوتا اس وقت تمہارا نام بابا ہوتا ہے؟"

"نہیں تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ لڑکی کا نام بابا نہیں ہوتا۔ میرا نام تو شاداں ہے شاداں۔ بابا کہتا ہے میرا نام بہت خوبصورت ہے۔ ہے نا؟"

"تم بھی خوب صورت ہو۔ تمہارا نام بھی خوب صورت ہے۔"

وہ دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھ کر بولی۔

"مجھے خوبصورت نہ کہو ورنہ میں غصہ کرنے لگوں گی۔ بابا کہتا ہے شہر سے آنے والے لوگ لڑکیوں کو بہلانے پھسلانے کے لئے انہیں خوبصورت کہتے ہیں۔ ان کی خوب تعریفیں کرتے ہیں پھر انہیں برباد کر کے چلے جاتے ہیں۔ اے بابو تجھے معلوم ہے کہ برباد کیسے کرتے ہیں؟"

مجھے اس کی معصومیت پر بڑا پیار آیا۔ میں نے کہا۔

"تمہارے بابا ٹھیک کہتے ہیں۔ شہر سے آنے والے لوگ اچھے نہیں ہوتے [illegible] اچھے بھی ہوتے ہیں۔ ویسے تم اپنی تعریف سن کر غصہ کیوں ہوتی ہو؟ تم تو واقعی [illegible] حسین ہو کہ شہر کی لڑکیاں میک اپ کرنے کے بعد بھی تمہارے سامنے ماند [illegible] پڑ جائیں گی۔"

[illegible] بابا کہتا ہے کہ تعریف سن کر خوش نہیں ہونا چاہئے۔ میں غصہ دکھاؤں گی [illegible] تو تعریف کرنے والا اپنا سا منہ لے کر چلا جائے گا۔ اب تم جاتے ہو یا دکھاؤں غصہ؟"

[illegible] نہیں تم ایک ہی ٹھیک ہو۔ غصے میں اور زیادہ حسین نظر آؤ گی۔ میں تو صرف [illegible] پوچھنے آیا ہوں کہ یہاں میرے کھانے پینے کا انتظام ہو سکتا ہے یا نہیں؟"

[illegible] نے جواب دیا۔

"وہ فلم والے آئے ہیں وہ لوگ [illegible] کے بڑے بڑے ہوٹلوں سے کھانا [illegible] منگواتے ہیں۔ تیرے پاس بھی بڑے بڑے نوٹ [illegible]

کھانا منگوانے سے [illegible]

توکیا تیرا بابا کھانا لے آئے گا؟"

"ضرور لائے گا۔ نکال پیسے ۔ ۔ ۔ ۔؟"

میں نے جیب سے پھر سو کا ایک نوٹ نکالا۔ اس نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

"کیا تیرے پاس اس سے چھوٹا روپیہ نہیں ہے؟"

"نہیں۔ میرے پاس بڑے بڑے نوٹ ہیں۔"

شاداں نے محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا، پھر ذرا قریب آ کر بڑی رازداری سے بولی۔

"بابو ایک بات بتائے گا؟"

ایک نوجوان لڑکی ذرا قریب آ کر رازدارانہ انداز میں کچھ پوچھے تو اچانک ہی دل دھڑکنے لگتا ہے۔ میرے سینے میں بھی دھڑکنوں کی دھمک ہونے لگی۔ میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں، ہاں۔ پوچھو، کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"

اس نے تجسس کے مارے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "تو اتنے بڑے بڑے نوٹ کہاں سے چرا کر لاتا ہے۔ مانگنے سے تو کوئی نہیں دیتا۔"

میرے دل کی دھڑکنیں اعتدال پر آ گئیں۔ دل کا کوئی معاملہ ہی نہیں تھا۔ اب میں اسے کیا سمجھاتا کہ دولت کہاں سے حاصل ہوتی ہے۔ میں نے بھی بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "یہ بہت راز کی بات ہے۔ اگر میں تجھے بتاؤں گا تو پھر یہ راز نہیں رہے گا۔ تو دوسروں کو بھی بتا دے گی۔"

"نہیں اللہ قسم نہیں بتاؤں گی۔ تو مجھے بتا دے۔ دیکھ بابو، میں دن رات یہی سوچتی رہتی ہوں کہ ہم پیسے پیسے کے لئے ترستے ہیں اور تم لوگ پیسے کو کچھ سمجھتے ہی نہیں ہو۔ بڑے بڑے نوٹ ایسے نکال کر دے دیتے ہو جیسے کاغذ کا ٹکڑا دے رہے ہو۔ مجھے یہ بتا دے بابو کہ یہ بڑے بڑے نوٹ کہاں سے آتے ہیں۔ میں بیلا کی قسم کھا کے کہتی ہوں کہ کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

"یہ بیلا کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بیلا میری پیاری پیاری سی بھیڑ ہے۔ ساری بستی والے جانتے ہیں کہ میں اس سے کتنا پیار کرتی ہوں۔ کبھی اس کی جھوٹی قسم نہیں کھائی۔"

"پھر تو مجھے یقین آ گیا کہ تو سچی قسم کھا رہی ہے۔ اب میں تجھے بتاؤں کہ بہت سے لوگ بڑے بڑے کارخانے چلاتے ہیں۔ بہت سے لوگ مشینیں اور موٹر کاریں بناتے ہیں۔ دنیا میں دولت کمانے کے بہت سے ذرائع ہیں مگر میرے پاس بہت پُراسرار طریقے سے بڑے بڑے نوٹ آتے ہیں۔"

"اچھا —— ؟"

اس کی ہرنی جیسی آنکھیں میرے اسرار کو سمجھنے کے لئے اک دم سے پھیل گئیں۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ ان خوبصورت آنکھوں میں سارے جہاں کا حسن کس طرح سمٹ آیا تھا۔ میں [illegible] [illegible] آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا ہوں [illegible] اس کا معمول بنا [illegible] رنگی

بات بتا رہا ہوں۔ کسی کو بتائے گی تو نہیں ؟"

"نہیں بتاؤں گی۔ تو جلدی بول نا۔"

"اپنے بابا کو بھی نہیں بتائے گی۔"

"اپنے بابا کو بھی نہیں بتاؤں گی۔ اللہ! میرا دل الٹ پلٹ ہو رہا ہے۔ جلدی بولتا کیوں نہیں ؟"

میں نے ذرا قریب آکر بڑی راز داری سے کہا۔ "روز صبح میں سو کر اٹھتا ہوں تو میرے تکیئے کے نیچے سے سو روپے کا ایک نوٹ نکل آتا ہے۔"

شاداں نے بڑی حسرت بھری سانس لے کر اپنے ہاتھ کو اپنے سینے کی بلندیوں پر رکھ لیا۔ میں اس کے نازک ہاتھوں کی لرزش سے سمجھ رہا تھا کہ اسکے کنوارے سینے کی دھڑکنیں کتنی تیز ہو گئی ہوں گی۔ پھر وہ بڑے یقین کے ساتھ بولی "بچپن میں میری ماں نے مجھے ایک کہانی سنائی تھی اور مجھ سے کہا تھا کہ ہُما ایک پرندہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی اسے پکڑ کر اسے ذبح کر کے اس کی کلیجی بھون کر کھالے تو کھانے والے کے سرہانے سے روز صبح روپے نکلتے ہیں۔"

میں نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی۔ ایسی کہانیاں عام ہیں۔ بچے اپنی ماؤں، نانیوں اور دادیوں سے ایسی کہانیاں اکثر سنا کرتے ہیں۔ میں نے کہا۔ "تمہاری ماں نے ٹھیک کہا تھا۔ میں نے بھی ہُما کی کلیجی ڈالڈا میں تل کر کھائی ہے۔ لیکن ہُما نے اپنی کلیجی کھلانے سے پہلے تاکید کر دی تھی کہ میں یہ راز کسی کو نہ بتاؤں اگر بتاؤں گا تو پھر میرے سرہانے سے روپے نہیں نکلیں گے۔ تم اپنی بیلا کی قسم کھا چکی ہو۔ اس لئے میں نے تمہیں اپنا راز دار بنا لیا ہے۔ اب اگر تم بابا سے بھی یہ بات کہو گی تو پھر میرے تکیہ کے نیچے سے روپے نہیں نکلیں گے۔ کیا تم مجھے کنگال بنانا پسند کرو گی ؟"

"نہیں، نہیں۔ تم بہت اچھے ہو۔ تم نے مجھ پر بھروسہ کیا ہے۔ میں یہ بات کسی سے نہیں کہوں گی مگر ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا ——؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھو بابو! میں تمہاری راز دار ہوں۔ اس لئے یہاں جب تک تیرے سرہانے سے روپے نکلتے رہیں گے تو روز صبح کو مجھے ایک روپیہ دے دیا کرنا۔ میں بابا سے نئے کپڑے بنانے کے لئے کہتی ہوں تو وہ ٹال دیتا ہے۔ اب میں خود اپنے پیسوں سے کپڑے بنواؤں گی۔"

"اگر بابا نے پوچھا کہ تجھے کپڑے بنانے کے لئے پیسے کہاں سے مل گئے تو کیا جواب دے گی ؟"

وہ اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر سوچتی ہوئی بولی "ہاں، میں تو یہ بھول ہی گئی تھی جواب کیا دوں گی۔ بابا کو تیرا راز بتا نہیں سکتی۔ مجھے اتنی چالاکی بھی نہیں آتی کہ جھوٹ بول سکوں۔ بابا بڑا چالاک ہے بیلا کی قسم کھلا کر سچ اگلوا لیتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "پھر تو بڑی مشکل ہے۔ مجھے پیسے دینے میں انکار نہیں مگر تو اپنا برا بھلا سوچ لے۔ بابا آئے تو میرے لئے کھانا بھیج دینا۔ میں جا رہا ہوں۔"

میں نے اُسے سوچتا چھوڑ کر ڈاک بنگلے کا رُخ کیا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ سورج کی کرنیں شفق رنگ ہو کر پہاڑ کی چوٹیوں پر اتر رہی تھیں۔ بادل اور گہرے پ... میں گڈ مڈ ہو کر وادیوں میں تیر رہے تھے۔ میں ڈاک بنگلے میں جانے کی بجائے دوسری طرف نکل گیا۔ قدرت کا ایسا حُسن بار بار دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس لئے حسین نظاروں سے لطف اٹھاتا ہوا ڈاک بنگلے سے دور نکل گیا۔ بہت دور ایک چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھ کر میں نشیب کی طرف دیکھنے لگا۔ دور بستیوں میں بڑے بڑے مکانات چھوٹے چھوٹے کھلونوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ چھت کی چمنیوں سے دھواں نکلتا ہوا اُفق میں جذب ہو رہا تھا۔ کچھ دیر پر سکون رہنے کے بعد میں بیل منڈو کے دماغ میں جھانکا۔ میں نے مناسب وقت پر اس کے دماغ کو پڑھنا شروع کیا تھا کیوں کہ اس وقت وہ سوچ کے ذریعہ ماسٹر یوشے سے گفتگو کر رہا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ اس کے کچھ آدمی لاہور میں ہیں اور فرہاد کی کوٹھی کی نگرانی کر رہے ہیں جیسے ہی اس کی کوٹھی کا کوئی فرد نظر آئے گا ویسے ہی اس سے فرہاد کے متعلق معلومات حاصل کی جائیں گی اور وہ اپنے کچھ آدمیوں کے ساتھ اس وقت پنڈی میں ہے۔ اس کا ایک آدمی زلیخا کی کوٹھی کی نگرانی کر رہا ہے لیکن توقع ہے کہ ہوٹل سے فرار ہونے والا فرہاد اب زلیخا کی کوٹھی کا رُخ کرے گا۔

اس کے جواب میں ماسٹر یوشے کی سوچ سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا "یہ فرہاد علی ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ کیا ایک عام شخص اتنا چالاک ہو سکتا ہے کہ وہ مجھ جیسے ٹیلی پیتھی جاننے والے سے بھی بچ کر نکل جائے۔ یہ بات بھی معلوم ہو چکی ہے کہ وہ گونگا نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے خود کو گونگا کیوں بنائے رکھا ہے ؟ اس سوال کا یہی جواب سمجھ میں آتا ہے کہ وہ کسی طرح میری شخصیت سے واقف ہو گیا ہے۔ شاید اسٹوفر یا انجلا سے اُسے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ مجھ جیسے ٹیلی پیتھی جاننے والے کے ماتحت رہ کر کام کر رہے تھے۔ ہاں یہی بات ہے۔ سمندر کے ایک ساحلی کاٹج میں میرے دو آدمیوں سے اس کا سامنا ہوا تھا۔ وہاں اس نے میرے آدمیوں کو لائیٹر جلانے کی بھی مُہلت نہیں دی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میرا کوئی آلہ کار اس کی آنکھوں میں جھانکے یا اس کی آواز سنے کیونکہ میں ان ہی دو ذرائع سے اس کے دماغ تک پہنچ سکتا تھا۔ اس طرح وہ محتاط ہو کر میرے لئے بہت پُر اسرار بن گیا ہے۔ ہر لمحہ میری دل چسپی اس سے بڑھتی جا رہی ہے۔ بیل منڈو تم خود کو ناقابل شکست کہتے ہو۔ تمہیں اپنے مارشل آرٹ اور جسمانی قوت پر بڑا ناز ہے۔ مگر فرہاد کی ذہانت کے آگے یہ سب ہیچ ہیں۔

بیل منڈو کے دماغ سے پتہ چلا کہ وہ اس بات پر غرّا رہا ہے۔ اس کی جھلائی ہوئی سوچ نے کہا۔ "تم اور فرہاد دونوں ہی بزدل ہو۔ اگر میری صلاحیتوں کو آزمانا چاہتے ہو تو ایک بار میرے سامنے آکر دیکھو۔"

ماسٹر یوشے کی سوچ نے کہا۔ "اپنی صلاحیتوں کے بَل پر دوسروں کو بزدل سمجھنا نادانی ہے۔ تم اب تک جنہیں شکست دیتے آئے ہو وہ تمہارے مقابلے میں کم صلاحیتیں رکھتے تھے۔ کوئی جسمانی طور پر ناقابل شکست ہوتا ہے کوئی ذہنی طور برتری حاصل کرتا ہے۔ جنگل کے شیر سے کوئی لڑنے نہیں جاتا۔ اسے اپنی ذہانت سے گھیر کر شکار کیا جاتا ہے۔ اس خطرناک کھیل کے دوران ہم میں سے کوئی بزدل نہیں ہے۔ ہم سب اپنی اپنی صلاحیتوں کو آزما رہے ہیں جو کامیاب ہو گا اسے ہی برتری حاصل ہو گی۔ میرا مشورہ ہے کہ فرہاد تک پہنچنے کے لئے شیر کی قوت سے نہیں انسان ...

...ت سے کام لو۔ فرہاد جس شہر سے غائب ہوا ہے تم اس شہر سے باہر جانے ... تمام راستوں کو اپنے ذہن میں رکھو۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ دماغی صلاحیتیں ... تم سے زیادہ دور نہیں جائے گا۔ تم بہت دور تک سوچو گے اور وہ تمہارے ... قریب رہ کر تمہیں چکر دیتا رہے گا۔ تم ابھی جہاں ہو وہاں جم کر بیٹھ جاؤ اور صرف ... دوسروں سے کام لیتے رہو۔ میرا خیال ہے کہ اس نے تمہیں دیکھ لیا ہے تمہیں ... شکل سے اچھی طرح پہچان لیا ہے۔ اس لئے تمہیں جہاں بھی دیکھے گا ... سے فرار ہو جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ تم ایک جگہ خاموشی سے بیٹھ کر کام کرو۔"

ماسٹر یوشے اسے مشورے دے رہا تھا اور میں ان مشوروں کو سنتا جا ... رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ماسٹر یوشے نے اس سے سوچ کا رابطہ ختم کیا تو میں بھی پہاڑوں کے پُر کیف ماحول میں واپس آگیا۔ مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ بیل منڈو اب کچھ دنوں ... پنڈی میں جما رہے گا۔ لیکن میں تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح ایک جگہ جم کر نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے اس سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن کس تدبیر سے اس کا سامنا کرنا ہو گا وہ تدبیر ابھی میرے دماغ میں نہیں آئی تھی۔ مجھے بہت سوچ سمجھ کر ماسٹر یوشے کے اس اہم آلہ کار کو بے کار بنانا تھا۔ کیونکہ جب بھی میں بیل منڈو کے سامنے جاتا۔ اس سے آنکھیں ملاتا یا اس سے باتیں کرتا تو ماسٹر یوشے اس کے ذریعے میرے دماغ تک پہنچ جاتا۔ اب میں بیل منڈو کے سامنے گونگا بن کر بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ میں گونگا نہیں ہوں پتہ نہیں اس نے کتنے ... لوگوں کی ڈیوٹی لگائی ہو گی تاکہ ان کی زبان کھلوا کر ان کے پیچھے چھپے ہوئے فرہاد کو ... پکڑ سکے۔ بہرحال نہ تو اب میں اس کے سامنے گونگا بن سکتا تھا نہ ہی تاریک شیشوں کی ... عینک لگا کر اپنی آنکھیں چھپا سکتا تھا۔ ایسی صورت میں اس کا سامنا کرنا گویا ... خطرے کو دعوت دینا تھا۔ مگر اب میں دشمن کے آگے بھاگتے بھاگتے ... تھک گیا تھا۔ وہ مجھے بزدل سمجھ رہا تھا اور میں اسے بزدلی اور دلیری کا فرق سمجھانا ... چاہتا تھا۔

میں ٹیلے پر سے اٹھ کر ڈاک بنگلے کی طرف جانے لگا۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ فضا نمی سے بوجھل ہو چکی تھی۔ دور مکانات سے ہلکی ہلکی روشنیاں جھانک رہی تھیں۔ چند قدم آگے جا کر میں رُک گیا۔ مجھے شاداں کی آواز سنائی دی اندھیرے کے باعث وہ دور سے نظر نہیں آئی تھی۔ قریب آنے پر میں نے اُسے دیکھا۔ اس نے بھی مجھے پہچانتے ہی کہا۔ "اے بابو تو یہاں ہے۔ میں تیرے لئے ... ڈاک بنگلے گئی تھی۔"

میں نے پوچھا "کیا تیرا بابا آگیا ہے ؟"

"نہیں، وہ تو ابھی تک نہیں آیا۔ میں نے تیرے لئے کھانا بھی نہیں منگوایا۔ میرے ... میں ایک تدبیر آئی ہے۔ میں اپنے ہاتھ کی پکائی ہوئی روٹیاں تجھے کھلا دیا ... ہوٹل کے کھانے میں جو پیسے خرچ ہوتے ہیں وہ میں رکھ لوں گی۔ اس ... بابا کو بتا سکوں گی کہ میں نے نئے کپڑوں کے لئے کس طرح پیسے جمع کئے ... ہیں۔"

میں نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "ہاں یہ اچھی تدبیر ہے۔ اگر ہوٹل سے کھانا ... آتو پندرہ بیس روپے خرچ ہو جاتے۔ تو دن میں تین بار اپنے ہاتھوں کی روٹی کھلانا اور بیس روپے کے حساب سے ان کی قیمت لے لیا کرنا۔"

وہ خوش ہو کر بولی "بابو اس طرح تو مجھے دن میں تین بار روپے مل جائیں گے۔ کیا تو چار بار نہیں کھا سکتا ؟"

اس کی بات سن کر میں بے اختیار ہنسنے لگا۔ اپنا بچپن گزرے ایک زمانہ بیت گیا۔ ایک زمانے کے بعد ایسی بچوں کی سی معصوم باتیں سن کر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے شاداں کے سامنے میں خود بچہ بن گیا ہوں۔ ایسی ہی معصومیت اور ایسی ہی باتیں ہوتی ہیں جن سے زندگی کی سچی مسرتیں حاصل ہوتی ہیں۔ بے انتہا دولت سے ایسی مسرتیں نہیں خریدی جا سکتیں۔ بلکہ ہم مسرتوں کے فریب میں مصیبتیں خریدتے ہیں۔

میں اس کے ساتھ چلتے ہوئے نشیب میں اترنے لگا۔ ہمارے چاروں طرف ہریالی تھی، پہاڑوں کی بلندیاں تھیں۔ کوئی فریب نہیں تھا، کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ فضا ہر آلودگی سے پاک تھی۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہم اس دنیا کے پہلے آدم و حوا کی طرح ایک خاموش اور پر سکون دنیا کی دھرتی پر اتر رہے ہیں۔

اندھیرے میں اونچا نیچا راستہ صاف طور سے نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک جگہ میں لڑکھڑایا تو وہ بے اختیار سہارے کے لئے میری طرف گھوم گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ پھول کی پتی کی طرح ملائم بھی تھا اور اس میں پہاڑ کے پتھریلے تیوروں کی طرح سختی بھی تھی۔ وہ ایک محنت کش پہاڑی دوشیزہ کے ہاتھ تھے۔ جو پھول اور کانٹوں کے مزاج کو بیک وقت سمجھتے تھے۔ جب وہ ہاتھ میرے سخت پنجے کی گرفت میں آیا تو ہولے سے یوں کانپ گیا جیسے کوئی ننھی سی چڑیا پہلی بار صیاد کے ہاتھوں میں آکر لرز رہی ہو۔ اس ہاتھ کو کبھی اس کے بوڑھے باپ نے بھی تھاما ہو گا کبھی وہ سکھیوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ان پہاڑوں میں دوڑتی پھری ہو گی مگر وہ ہاتھ جو بالکل اجنبی ہوتا ہے اور اپنے سپنوں کے پرائے دیس سے آتا ہے وہ اگر پہلی بار آگے بڑھ کر چھولے تو کنواری دھڑکنوں کا مزاج بدل جاتا ہے۔ اچانک ہی سوچنے کا انداز بھی بدل جاتا ہے اور جس راستے سے وہ گذر چکی ہے وہ راستہ بھی بدل جاتا ہے۔ جن قدموں کے سہارے گذرتی ہے وہ قدم بھی ذرا ذرا ڈگمگانے لگتے ہیں۔ وہ یک بیک اپنا ہاتھ چھڑا کر بولی "بابو یہ تیرے ہاتھ کیسے ہیں ؟ میرے تو پاؤں کانپ رہے ہیں۔ پتہ نہیں دل کیوں آپ ہی آپ دھڑک رہا ہے۔ نہیں، میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

یہ کہتے ہی وہ مجھ سے آگے بھاگتی چلی گئی۔ میں نے اسے آواز دی۔ میرے ساتھ پہاڑیوں کی بازگشت پکارنے لگی۔

"شاداں —— شاداں —— داں —— داں ...."

وہ ایسی البیلی دوشیزہ تھی جسے میرے ساتھ ساتھ قدرت کے نظارے بھی آواز دے رہے تھے مگر وہ اندھیروں میں گم ہو گئی۔ میں اندھیرے میں گرتا، سنبھلتا اور لڑکھڑاتا ہوا اس کی جھونپڑی کی طرف جانے لگا تاکہ اس کی پکائی ہوئی روٹیاں کھانے کے لئے ڈاک بنگلے لے جا سکوں۔ اس لمحے لڑکھڑاتے ہوئے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے پہلی بار شراب پی ہے۔ ایسا حسن بھی ہوتا ہے جو ہونٹوں تک نہیں پہنچتا صرف اپنی اداؤں کی شراب پلا کر مدہوش کر دیتا ہے۔ میری زندگی میں ایک سے ایک حسین مجسمے آئے تھے جن کے بدن میں جذبات کے پارے مچلتے تھے جنہیں میں نے چھو لیا، چکھ لیا، پی لیا پھر بھی نشے سے خالی رہا۔ شاداں مجھے سکھا گئی کہ نشہ

صرف حسنِ فطرت میں ہوتا ہے۔

جب میں جھونپڑے کے قریب پہنچا تو وہ اپنے مکان کے پچھواڑے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا ہاتھ اپنے سینے پر چلا گیا۔ وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو سمجھنے اور سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔ "شاداں تو مجھے راستے میں کیوں چھوڑ کر آگئی؟"

وہ خاموش رہی۔ مکان کی کھلی کھڑکی سے لالٹین کی روشنی جھانک رہی تھی اس دھیمی دھیمی سی روشنی میں وہ دہشت زدہ ہرنی کی طرح مجھے خاموشی سے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی مگر نہ تو میں اس کی سمجھ میں آ رہا تھا اور نہ ہی اس کے دل کی دھڑکنیں اس کی سمجھ میں آ رہی تھیں۔ یہ کیسا پُراسرار لمحہ ہوتا ہے اور نازک سی عمر کا کیسا نازک سا موڑ ہوتا ہے کہ کچی کلی جیسی لڑکیوں کو اپنے ہی سوچ اور اپنے ہی جذبے سمجھ میں نہیں آتے۔ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے اپنے نازک سے کانپتے ہوئے ہاتھ کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"بابو تُو نے اسے لیسے پکڑا تھا..."

میں نے اس کے سوالی ہاتھوں کو تھام لیا۔ میرے ہاتھوں کی گرفت جوابی تھی۔ اس جواب کو وہ اپنے ہاتھوں کی لرزش سے سمجھ رہی تھی۔ کچھ جھجک رہی تھی کچھ سہم رہی تھی۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر بولی۔

"ارے یہ ہاتھ تو میرے ہیں پرائے کیوں ہو جاتے ہیں؟ دل کہتا ہے اسے تجھے دے دوں۔ مگر کیوں دوں گی نہیں دوں گی۔ خبردار اب میرا ہاتھ نہ پکڑنا.....؟"

یہ کہہ کر وہ بھاگتی ہوئی جھونپڑی کے اگلے سرے تک گئی۔ وہاں وہ ایک سائے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ سایہ رُک گیا تھا۔ چند لمحوں کے لئے تھم گیا تھا۔ نئے جذبوں کی آگہی نے قدم روک لئے تھے۔ وہ چند لمحوں کی بات تھی پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میں چاہتا تھا کہ آگے بڑھوں۔ اس کے دروازے پر جاؤں اور اس کے ہاتھوں کی پکائی ہوئی روٹیاں طلب کروں۔ مگر دور پہاڑی کی بلندی پر جس راستے سے میں ٹیکسی میں آیا تھا' وہاں چار گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں ان کی روشنی میں کچھ لوگ سامان اٹھائے پہاڑی سے اترتے ہوئے اسی بستی کی طرف آ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ فلم یونٹ کے لوگ ہیں۔ ان سے مجھے کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان میں سے کوئی میرے لئے خطرے کا باعث بنے گا۔

شاداں جیسی الہڑ دوشیزہ کے جذبوں کو سمجھنے میں کتنا لُطف محسوس ہو رہا تھا۔ میں ایک ایسی دنیا میں پہنچ گیا تھا۔ جہاں صرف محبت ہوتی ہے اور جہاں ایک ستھری ستھری اور ان چھوئی دوشیزہ کو منہ زور جذبوں کی ہلچل میں گرفتار دیکھ کر ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ کوئی ہمارے لئے گرفتار ہو اور کوئی ہمارے لئے انجانی آرزوؤں سے آشنا ہوتی رہی ہو تو یقیناً خوشی ہوتی ہے۔ لیکن خیالی خوشیوں کے جنگل میں دوڑتے دوڑتے اچانک ہی دشمن کانٹوں کی طرح چبھنے لگتے ہیں۔ اس وقت بھی شاداں کے متعلق سوچتے سوچتے یہ بھی سوچنا پڑا کہ شہر سے ان آنے والے لوگوں میں کوئی میرا دشمن نہ ہو۔ مجھے سب سے پہلے ڈاک بنگلے پہنچ کر آنے والوں کو دیکھنا اور سمجھنا ضروری تھا۔ میں تیزی سے چلتا ہوا جھونپڑی کے دروازے پر آیا۔ پھر دستک دیتے ہوئے شاداں کو مخاطب کیا۔

"شاداں تم کہتی ہو تو اب میں تمہارا ہاتھ نہیں پکڑوں گا۔ مجھے روٹی تو کھلا دو۔"

اسے میری بھوک کا احساس تھا وہ پہلے ہی ایک چھابے میں روٹیاں اور ایک تام چینی کی پلیٹ میں بینگن کا بھرتہ لئے دروازے کے پیچھے کھڑی تھی۔ میری آواز پر اس نے دروازے کو ذرا سا کھول کر اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ دروازے کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ صرف اس کا گلابی گلابی سا ہاتھ نظر آ رہا تھا۔ میں نے روٹی کے چھابے کو پکڑتے ہوئے کہا۔

"تو خود کو چھپا رہی ہے مگر جس ہاتھ کے پرائے ہونے کا ڈر تھا اُسے بڑھا رہی ہے۔ کیا اسے پکڑ لوں؟"

اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ بدستور دروازے کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ مگر میں سوچ کے ذریعہ اس کے چھپے ہوئے وجود کی ایک ایک کیفیت کو پڑھ سکتا تھا۔ اس کا دل اب بھی بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔ اور وہ اس ڈر سے کانپ رہی تھی کہ وہ خود اپنے لئے پرائی ہوتی جا رہی ہے۔

"ہائے میں اب تک کسی سے نہیں چھپی تھی۔ اس بابو سے کیوں چھپ رہی ہوں میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ تو دل اس کی طرف کھنچا جا رہا ہے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ پہلے تو دل کی دھڑکنیں اس طرح پاگل نہیں ہوئیں۔ میں یہاں چھپی کھڑی ہوں۔ مگر یوں لگتا ہے جیسے اس کی طرف بہتی جا رہی ہوں۔ میرے ہاتھ میں میٹھا میٹھا سا درد ہو رہا ہے۔ اس درد کا علاج یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے پھر سے پکڑ لے۔ مگر میں اسے پکڑنے نہیں دوں گی۔"

وہ اپنے ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے دابنے اور مسلنے لگی۔ اس میٹھے سے درد کو دور کرنے کی ناکام سی کوشش کرنے لگی۔ میں اس کی نادانی پر مسکراتا ہوا ڈاک بنگلے کی طرف جانے لگا۔ ڈاک بنگلے میں فلم یونٹ کے کچھ لوگ آگئے تھے اور کچھ لوگ آ رہے تھے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھ کر کھانا کھانے کے دوران ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے لگا۔ فلم کی ہیروئن اور اس کے نام نہاد بھائی کی سوچ تک میں پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ اب ان سے جو لوگ باتیں کر رہے تھے ان کے ذہن کو بھی میں پڑھتا جا رہا تھا۔ اس وقت ڈائریکٹر اور پروڈیوسر ہیروئن کے ساتھ بند کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پروڈیوسر اس سے کہہ رہا تھا۔

یہاں سے پانچ میل دور ایک جنگل میں ہم نے شوٹنگ کے لئے لوکیشن کا انتخاب کیا ہے۔ اتنی دور جانے کے لئے ہمیں صبح چار بجے ہی یہاں سے روانہ ہونا پڑے گا۔ اگر تم صبح چار بجے اٹھ سکتی ہو تو بہتر ہے ورنہ ہم ابھی کھانے کے بعد یہاں سے لوکیشن کی طرف روانہ ہو جائیں گے....."

ہیروئن نے کہا۔ "کیا آپ چاہتے ہیں کہ اتنی رات کو میں پانچ میل تک پیدل چلتی رہوں گی؟ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

پروڈیوسر نے اسے سمجھایا۔

"یہاں سے صرف آدھ میل تک ایسا راستہ ہے کہ گاڑیاں نہیں جا سکتیں۔ اس کے بعد فارسٹ آفیسر کی جیپ تمہیں لوکیشن تک لے جائے گی۔ وہاں فارسٹ آفیسر کا ایک چھوٹا سا کاٹیج ہے۔ تم وہاں صبح آٹھ بجے تک سوتی رہو گی۔ تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس وقت تک ہم شوٹنگ کی تیاریاں کرتے رہیں گے۔ اگر تم اس طرح تعاون نہیں کرو گی تو ہماری پکچر لیٹ ہو جائے گی۔"

ہیروئن نے موقع سے فائدہ اٹھا کر کہا۔

"آپ لوگوں کو بھی مجھ سے تعاون کرنا چاہیئے۔ ابھی مجھے بیس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ آپ ابھی رقم دے دیجئے میں کھانے کے بعد لوکیشن کی طرف جاؤں گی۔"

پروڈیوسر بے چینی سے اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے سوچنے لگا.....

"سالی پکی حرافہ ہے۔ وہ دن بھول گئی جب چھوٹا چھوٹا سا رول حاصل کرنے کے لئے پروڈیوسروں کی آغوش گرم کیا کرتی تھی۔ اب تو اس کے نام سے پکچر اونچے داموں بکتی ہے۔ اگر میں نے اسے بیس ہزار روپے نہیں دیئے تو کل تک یہ بیماری کا بہانہ کر کے شوٹنگ کینسل کرا دے گی۔"

اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے میں ابھی بیس ہزار کا چیک دیتا ہوں تم اپنے بھائی کو شہر بھیج کر کیش کرا لینا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ ڈائریکٹر نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔

"پروڈیوسروں کو آپ خوب نچاتی ہیں۔ میں کئی دن سے ایک ہزار روپے مانگ رہا ہوں مگر یہ نہیں دیتا۔ یہ جانتا ہے کہ یہ میری پہلی پکچر ہے۔ میں اپنا نام پیدا کرنے کے لئے اس کے آگے آگے کتے کی طرح دم ہلاتا رہوں گا اور یہ اپنی پکچر مکمل کرنے کے لئے آپ کے سامنے دم ہلاتا پھر رہا ہے۔ میں چھوٹا کتا ہوں۔ وہ بڑا کتا ہے۔ پتہ نہیں انسان زندہ رہنے کے لئے اور دولت کمانے کے لئے کب تک کتوں کے نقشِ قدم پر چلتا رہے گا۔ بہرحال ان باتوں کو چھوڑیئے میں آپ کو کل کا سین سمجھانے آیا ہوں۔"

وہ اس کے سامنے کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ ہیروئن نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"وہی سین ہے نا، میں دشمنوں سے جان بچانے کے لئے بھاگتی ہوئی جنگل میں پہنچ جاتی ہوں۔ فلم کا ہیرو اس جنگل کا فارسٹ آفیسر ہے۔ وہ مجھے پناہ دیتا ہے۔"

ڈائریکٹر نے کہا۔

"نہیں کل کی شوٹنگ میں ہیرو سے ملاقات نہیں ہوگی۔ کل کی شوٹنگ یوں ہوگی کہ آپ جنگل میں پہنچ کر بھٹک رہی ہیں۔ جھاڑیوں کے درمیان سے گزرنے کے دوران آپ کا لباس تار تار ہونے لگتا ہے۔ مختلف شاٹس میں آپ کا لباس ایسی ایسی جگہ سے پھاڑا جائے گا کہ آپ بہت زیادہ سیکسی نظر آنے لگیں گی۔"

ہیروئن نے کہا۔ "میرے بازو بہت سڈول ہیں۔ بازو اور پشت پر سے لباس پھاڑ دینا کافی ہوگا۔"

ڈائریکٹر نے کہا۔ "ہاں ابتدا میں یہی ہوگا مگر تماشائی آگے بھی کچھ دیکھنا چاہتے ہیں۔ سامنے سینے پر بھی لباس میں خراشیں آتی جائیں گی۔ سینہ چھپنے کے باوجود ادھر سے اُدھر جھلکتا رہے۔ آپ سوچئے کہ فلم میں یہ سین کتنا ہیجان خیز ہوگا۔ آپ جانتی ہیں کہ فلمی اخبار والے آپ کو سیکس کا ایٹم کہتے ہیں۔ تماشائی بھی آپ کو اسی انداز میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ جب آپ طویل جھاڑیوں سے نکل کر باہر آئیں گی تو لباس بالکل تار تار ہو چکا ہوگا یعنی لباس ہوتے ہوئے بھی آپ بے لباس ہوں گی۔ میں نے اس قدر سوچ سمجھ کر یہ سین لکھوایا ہے کہ سنسر والے اعتراض نہیں کر سکیں گے کیونکہ لباس تار تار ہونے کی ٹھوس وجوہات پیش کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ جنگل میں ہیں۔ جنگل میں آپ کو دوسرا لباس نہیں مل سکتا۔ اس لئے....."

"اس لئے میں ننگی رہوں گی... آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا؟" وہ بے حیائی سے بولی۔

"آں۔ ہاں۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے بدن پر لباس تو نہیں ہوگا مگر میں درختوں اور بڑے بڑے پتوں کی آڑ سے ایسے شاٹس لوں گا کہ بدن کا قابلِ اعتراض حصہ چھپ جائے گا۔ ہم سنسر والوں کے اعتراض کا جواب دے سکتے ہیں کہ جنگل میں دوسرا لباس نہیں مل رہا تھا اس لئے آپ کو پتوں سے چھپایا گیا ہے۔ آخر آدم اور حوا نے بھی اپنا بدن پتوں سے چھپایا تھا۔ یہ تو ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس حقیقت پر سنسر کی قینچی نہیں چل سکے گی۔"

ہیروئن نے کہا۔ "مگر شوٹنگ کے دوران تم لوگوں کی نگاہوں کی کتنی ہی قینچیاں مجھ پر چلتی رہیں گی۔ دیکھو میں صاف بات کہتی ہوں اپنے پروڈیوسر سے جا کر کہہ دو کہ کپڑے اتارنے کے میں بیس ہزار الگ سے لوں گی۔"

ڈائریکٹر نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"دیکھئے اگر آپ نے بیس ہزار کا مطالبہ کیا تو شوٹنگ رک جائے گی۔"

"شوٹنگ کیوں رکے گی سین بدل دو۔ میرے بدن پر لباس رہنے دو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں پہلی بار انڈسٹری میں آئی تھی تو ایک میں دینے کا چھوٹا وعدہ کر کے میرا لباس اتار دیا جاتا تھا۔ آج بھی میں ان کی مرضی سے لباس اتاروں گی مگر صرف ایک بے لباس سین کے بیس ہزار لوں گی۔ جاؤ اگر پروڈیوسر منظور...

کرتے تو سین بدل دینا میرے پاس فضول باتوں کے لئے وقت نہیں ہے۔"

میں روٹی کھا رہا تھا اور فلم انڈسٹری کے عجوبوں کو دیکھ رہا تھا مجھے اس رنگا رنگ زندگی میں بیس ہزار کی دولت اور لذیذ کھانوں سے زیادہ سوکھی روٹی اور بینگن کے بھرتے میں مزہ آرہا تھا۔ پیٹ بھر کر کھانے کے بعد میں آرام سے بستر پر لیٹ گیا۔ سردی بڑھتی جارہی تھی۔ بستر پر دو کمبل رکھے ہوئے تھے لیکن کمبل اوڑھ کر لیٹنے کے لئے جوتے اتارنے ضروری تھے۔ لیکن میں اس وقت تک ہر طرح سے مستعد رہنا چاہتا تھا جب تک کہ وہ فلم والے وہاں سے نہ ٹل جائیں۔ پوری طرح سے تنہائی نصیب ہونے کے بعد ہی سونا مناسب تھا۔

دو گھنٹے بعد باہر سے ایسی آواز آنے لگی جیسے وہ سب وہاں سے جارہے تھے۔ میں انہیں نظر انداز کر کے بیل منڈو کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ اس وقت وہ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے ایک کمرے میں بیٹھ کر وہسکی سے شغل کر رہا تھا... اس کی بھتیجی رُوما اس کے پاس آگئی تھی۔ بیل منڈو اپنی بھتیجی کو بیٹی کی طرح دل و جان سے چاہتا تھا اور اسے بہت عزیز رکھتا تھا۔ ماسٹر [illegible] اس کی اس کمزوری کو جانتا تھا۔ اس لئے وہ بیل منڈو کو دھمکی دے چکا تھا کہ اگر اس نے کسی [illegible] کی تو وہ اس کی حسین بھتیجی کو پاگل بنا دے گا۔ بیل منڈو اسی لئے رُوما کو اپنے ساتھ رکھتا تھا کہ وہ شیطان اس سے کوئی شیطانی حرکتیں نہ کرے۔ اس وقت رُوما اور بیل منڈو کے درمیان ایسی باتیں ہو رہی تھیں جن کا تعلق مجھ سے نہیں تھا۔ اس لئے میں نے اس سے رابطہ ختم کر دیا

ڈاک بنگلے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شاید وہ سب جاچکے تھے میں بستر سے اٹھ کر کمرے سے باہر آیا۔ برآمدے میں پہنچ کر پتہ چلا کہ ابھی یونٹ کے کچھ لوگ باقی ہیں۔ وہ صبح چار بجے جائیں گے۔ ہیروئن اور پروڈیوسر اپنا اپنا کمرہ لاک کر کے لوکیشن کی طرف جاچکے تھے۔ صرف ایک کمرہ رہ گیا تھا جس میں ساؤنڈ اور لائیٹ کے شعبوں سے تعلق رکھنے والے مزدور سونے کے لئے اپنے اپنے بستر بچھا رہے تھے۔ وہ کمرہ ان کے لئے کافی نہیں تھا۔ اس لئے وہ آپس میں جھگڑا بھی کر رہے تھے۔ ایک بوڑھا آدمی کمبل لپیٹے باہر برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"بیٹا کیا تم اس کمرے میں اکیلے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں بابا۔ کیا بات ہے۔؟"

"بیٹے میں سردی سے ٹھٹھر رہا ہوں۔ اگر تم اپنے کمرے میں سونے کی جگہ دے دو تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

مجھے اس کے بڑھاپے اور اس کی حالت پر بڑا ترس آیا۔ میں نے کہا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بابا۔ اپنا سامان لے آؤ۔"

وہ مجھے دعائیں دیتا ہوا اپنی اٹیچی اور اپنا بستر اٹھانے لگا میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے بستر لیا تو اس کے دل سے اور دعائیں نکلنے لگیں میں نے اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"بابا تم کیا کام کرتے ہو؟"

"میں میک اپ مین ہوں۔"

"پھر تو بڑی آمدنی ہوگی؟"

"بیٹا یہی سوچ کر میں تیس برس پہلے انڈسٹری میں آیا تھا مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ میک اپ مین اور لائٹ مین سب چراغ کے تیل کی طرح جلتے ہیں۔ انڈسٹری کو روشن کرتے ہیں اور خود مفلسی میں جل جل کر ختم ہو جاتے ہیں میں بہت تجربے کار میک اپ مین ہوں۔ مجھے ایک فلم کے پانچ ہزار ملتے ہیں لیکن یہ روپے کبھی یکمشت نہیں ملتے۔ مہینوں اور سالوں تک پروڈیوسر کے پیچھے ہاتھ پھیلاتے پھیلاتے ہم کبھی سو اور کبھی پچاس لے لے کر اپنی رقم وصول کرتے ہیں۔ فلم فلاپ ہو جاتی ہے تو ہمارے پیسے بھی ڈوب جاتے ہیں۔ اس ہنر کے سوا کوئی دوسرا ہنر نہیں آتا۔ اس لئے کسی نہ کسی طرح یہ زندگی گزار رہا ہوں۔"

وہ فرش پر اپنا بستر بچھانے لگا میں نے کہا۔

"بابا تم پلنگ پر آجاؤ میں جوان آدمی ہوں میں نیچے سو جاؤں گا۔ مجھے سردی نہیں لگے گی۔"

"نہیں بیٹا مجھے تو صرف تین بجے تک رات گزارنی ہے......

......تین بجے کے بعد ہم سب یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"تین بجنے میں ابھی بہت دیر ہے۔ آپ یہاں میرے بستر پر آرام کریں۔"

میں نے جبراً بوڑھے میک اپ مین کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور اسے اپنے بستر پر پہنچا دیا۔ جہاں نیکی کرنے اور کسی کے کام آنے کا موقع ملے تو ضرور ایسا کرنا چاہیئے کیونکہ فاضل وقت میں کسی سے نیکی کرنے میں ہمارا ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوتا۔ بابا بستر پر بیٹھ کر اپنی اٹیچی کھولنے لگا۔ اس کی اٹیچی میں میک اپ کا بہت سا سامان تھا۔ فیس پاؤڈر، لپ اسٹک، کاجل، مسکارا، [illegible] آئی شیڈو، مصنوعی پلکیں اور داڑھی مونچھوں کے بال کتنی ہی ایسی چیزیں تھیں جنہیں وہ اٹیچی سے نکال کر دیکھ رہا تھا۔ اور بالوں کو برش کے ذریعہ سلجھا کر انہیں دوبارہ اٹیچی میں رکھ رہا تھا۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ میں میک اپ کے ذریعہ اپنا حلیہ بدل سکتا ہوں۔ اس بوڑھے کو تیس برس کا تجربہ ہے۔ یہ چاہے تو مجھے میک اپ کا بہترین طریقہ سکھا سکتا ہے۔

میں اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ اور بڑی دلچسپی سے میک اپ کا ایک ایک سامان اٹھا کر ان کے متعلق اس سے پوچھنے لگا۔ وہ میرے لئے بڑی تفصیل سے معلومات فراہم کر رہا تھا میں نے اس سے پوچھا۔

"بابا کیا تم مجھے میک اپ کرنا سکھا سکتے ہو میں تمہیں اس کام کا منہ مانگا معاوضہ دوں گا میں پروڈیوسروں کی طرح پیسوں کے لئے تمہیں نہیں دوڑاؤں گا بلکہ اسی وقت تمہارا معاوضہ ادا کر دوں گا۔"

اس نے کہا "بیٹا تم اتنے اچھے ہو کہ میں تمہیں مفت میں میک اپ کرنا سکھا سکتا ہوں مگر ضرورت انسان کو کسی قدر خود غرض بنا دیتی ہے میری گھر والی بہت بیمار ہے۔ میں اسے بیماری کی حالت میں چھوڑ کر نہیں آنا چاہتا تھا، پروڈیوسر نے مجھے سو روپے دے کر وعدہ کیا تھا کہ شوٹنگ کے دوران ... اور دے گا مگر ابھی تک ایک پیسہ نہیں دیا۔ میں دو سو کی امید میں کام کئے جا رہا ہوں۔ بیٹا میں لالچی نہیں ہوں مگر تم سے کم از کم سو روپے مانگنے پر

مجبور ہوں۔"

مجھے اس کی باتیں سن کر فلم کی ہیروئن یاد آگئی۔ یہ کیسے لوگ ہیں کہ بوڑھی بیمار عورت کو دوا کے لئے ...... دو سو نہیں دے سکتے۔ دو روپے بھی نہیں دے سکتے۔ لیکن جوان عورت کے بدن سے لباس اتارنے کے لئے بیس ہزار دے دیتے ہیں۔ میں نے جیب سے سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر کہا۔

"تم نے میری توقع سے بہت کم مانگا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس گڈی میں کتنے روپے ہیں۔ یہ جتنے بھی ہیں۔ تمہارے ہیں۔ اسے رکھ لو۔"

بوڑھے کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ کبھی مجھے اور کبھی نوٹوں کی گڈی کو بے یقینی سے دیکھنے لگا میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نوٹوں کی گڈی اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ اس کے بوڑھے ہاتھ کانپنے لگے۔ ایسی بات نہیں تھی کہ اس نے اتنے روپے کبھی زندگی میں دیکھے نہ ہوں۔ لیکن وہ روپے اس کے دکھوں کا علاج بن کر اس کی ہتھیلی پر آئے تھے۔ اس لئے وہ خوشی سے کانپ رہا تھا۔ اس نے احسانمندی سے میرے ہاتھ کو تھام کر چوم لیا اور اس پر اپنی بوڑھی بھیگی ہوئی آنکھیں رکھ دیں۔ پھر اس نے کہا۔

"میں تمہیں میک اپ کے ذریعہ چہرے بدلنے کا ایسا ہنر سکھاؤں گا کہ تم خود اپنے بدلے ہوئے چہروں کو دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے۔ میرے پاس چہرہ بدلنے کا ایک ماسک ہے۔ ایسے ماسک باہر کے ملکوں سے آتے ہیں۔ ہمارے ہاں بڑی مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔ تم دولتمند ہو ایسے کتنے ہی مختلف قسم کے ماسک باہر سے منگوا سکتے ہو۔"

وہ اٹیچی سے ایک ماسک نکال کر مجھے دکھانے لگا۔ پھر اس نے بتایا کہ یہ ماسک کس طرح چہرے پر چڑھایا جاسکتا ہے اور اپنی جلد کی رنگت کے مطابق اس ماسک پر میک اپ کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس ماسک کو میرے چہرے پر چڑھا کر عملی طور پر وہ ہنر سکھا رہا تھا میں ایک ہاتھ سے آئینے کو تھام کر اس میں اپنے آپ کو دیکھتا جارہا تھا میرا چہرہ بدل رہا تھا اس چہرے کے پیچھے فرہاد علی کا چہرہ چھپ گیا تھا میں صرف اپنی آنکھوں سے خود کو پہچان رہا تھا میں نے پوچھا۔

"بابا کیا ایسا میک اپ نہیں ہوتا کہ آنکھیں بھی بدل جائیں۔"

میری بات سن کر اس نے ایک چھوٹا سا گتے کا ڈبہ نکالا جس پر مخمل کا کپڑا منڈھا ہوا تھا۔ اس ڈبے میں آئی لینز رکھے ہوئے تھے۔ بوڑھے نے ایک آئی لینز اٹھا کر کہا۔

"اپنی ایک آنکھ کو کھلی رکھنے کی کوشش کرو۔ تمہیں تکلیف تو ہوگی۔ مگر تھوڑی دیر میں تمہاری آنکھیں بدل جائیں گی۔"

میں نے اس کی ہدایت کے مطابق آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کی۔ وہ عینک لگائے میری بائیں آنکھ میں اس لینس کو جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے واقعی تکلیف ہو رہی تھی۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا مگر کچھ سیکھنے کے لئے اور کسی قابل بننے کے لئے تکلیفیں برداشت کرنا [illegible] تی ہیں۔

جب میری دونوں آنکھوں میں دو آئی لینز اچھی طرح بٹھا دیئے گئے تو میں نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ میں نے آئینے میں ایک اجنبی کو دیکھا۔ آئینے کے ادھر میں تھا۔ میں خود کو [illegible] آئینے کے ادھر بھی میں تھا مگر خود کو نہیں پہچان رہا تھا۔ میں نے بابا کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"بابا۔ واقعی تم نے کمال کر دیا۔ یہ آئی لینز مجھے دے دو۔ بولو اس کی کیا قیمت ہے؟"

بوڑھے نے کہا "تم نے تو مجھے اتنے روپے دیئے ہیں جو اس آئی لینز کی قیمت سے بھی زیادہ ہیں۔ اگر میں اسے دے کر تمہارے احسان کا کچھ بدلہ چکا سکتا ہوں تو اسے رکھ لو۔"

میں اس کی باتیں سنتا ہوا بار بار خود کو آئینے میں دیکھ رہا تھا اور اپنے آپ کو پہچاننے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ بوڑھے نے ایسے سلیقے سے میک اپ کیا تھا کہ چہرے کے کسی حصے سے بناوٹ کا شبہ نہیں ہوتا تھا۔ بوڑھا اس وقت آئی لینز کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس کی سوچ سے پتہ چلا کہ وہ تمام آئی لینز اس کی ملکیت نہیں ہیں۔ وہ فلم کے پروڈیوسر نے باہر سے منگوائے تھے اور شوٹنگ کے دوران میک اپ مین کو امانت کے طور پر رکھنے کو دیئے تھے۔ وہ آئی لینز کا ایک جوڑا مجھے دے کر امانت میں خیانت کر رہا تھا اور یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے رہا تھا کہ یہ شخص میرے آڑے وقت میں کام آرہا ہے۔ اس نے بن مانگے مجھے اتنی بڑی رقم دی ہے کہ پروڈیوسر کبھی نشے کی حالت میں بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اس آئی لینز کی قیمت تقریباً ڈھائی ہزار روپے ہوگی۔ یا پھر پروڈیوسر نے بڑھا چڑھا کر اس کی قیمت بتائی ہوگی تاکہ میں بڑی احتیاط سے ان کی حفاظت کرتا رہوں۔ بہر حال جتنی بھی قیمت ہو، میں کہہ دوں گا کہ آئی لینز کا ایک جوڑا مجھ سے گم ہو گیا ہے۔ وہ میرے معاوضے کی رقم میں سے پیسے کاٹ لے۔

وہ بوڑھا میک اپ مین میرے لئے امانت میں خیانت کر رہا تھا اور خیانت کی سزا بھگتنے کے لئے اپنے ڈھائی ہزار روپے کا نقصان کرنے کے لئے تیار تھا میری دی ہوئی رقم اتنی نہیں تھی کہ وہ اپنا نقصان پورا کر سکتا اور میں اسے نقصان پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔

میں وہاں سے اٹھ کر میز کی طرف گیا۔ وہاں میری اٹیچی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے کھول کر کپڑوں کے نیچے سے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں۔ اور حساب کرنے لگا کہ میں نے بوڑھے میک اپ مین کو کتنے روپے دیئے ہیں۔ میری اٹیچی میں ساڑھے سات ہزار روپے تھے [illegible] میں ڈیڑھ ہزار روپے تھے۔ اس میں سے میں نے تین سو خرچ کئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے بوڑھے میک اپ مین کو صرف بارہ سو روپے [illegible] ہیں۔ میں نے اس سے کہا۔

"بابا۔ میں نے سنا ہے کہ آئی لینز بہت قیمتی ہوتے ہیں۔ اتنی قیمتی

چیزیں تمہاری اپنی نہیں ہوسکتیں۔ مجھے سچ سچ بتاؤ کہ یہ آئی لینز کس کے ہیں اور ان کی کیا قیمت ہوسکتی ہے؟"

بوڑھا پہلے تو سچ بولنے سے ہچکچاتا رہا۔ پھر اس نے سب کچھ اگل دیا۔ میں نے اسے مزید دو ہزار روپے دیتے ہوئے کہا۔

"یہ روپے رکھ لو۔ یہ وڈیو سرکو تمہارے معاہدے سے لینس کی قیمت کاٹ لینے دو۔ یہ سمجھ لو کہ معاہدے کی رقم تمہیں اسی وقت میرے ہاتھوں سے مل گئی ہے۔"

بوڑھا وہ روپے لے کر ایسی عقیدت اور احسان مندی سے مجھے دیکھنے لگا جیسے اس کے نقصانات کو سمجھنے اور ان کی تلافی کرنے والا کوئی فرشتہ اس کے سامنے کھڑا ہو۔ میں فرشتہ نہیں تھا۔ اسی دنیا کا انسان تھا اور انسان اپنے بڑے بڑے فائدے کے لئے چھوٹی چھوٹی بے ایمانیاں ضرور کرتا ہے۔ مجھے فیس ماسک اور آئی لینس سے بہت بڑا فائدہ تھا۔ لہٰذا یہ چیزیں حاصل کرنے کے لئے اس بوڑھے کو امانت میں خیانت کرنے کا انعام دے رہا تھا کیا کیا جائے، بل منڈو سے ٹکرانے کے لئے میں ایسا کرنے پر مجبور تھا۔

میں نے پھر آئینے میں اپنی بدلی ہوئی صورت کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ وہ جن آدمیوں کو میری شناخت کے لئے ساتھ لئے گھوم رہا تھا وہ مجھے نہیں پہچان سکتے تھے۔ میری آنکھوں پر آئی لینس کا پردہ پڑ گیا تھا۔ بل منڈو ہزار بار میری آنکھوں میں دیکھتا۔ اس کے باوجود ماسٹر پلوٹے اس کے ذریعے میری آنکھوں تک اور پھر میرے ذہن تک پہنچنے میں ناکام رہتا۔ اب وہ صرف میری گفتگو کے سہارے مجھ تک پہنچ سکتا تھا۔ لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ میں پھر گونگا بن جاؤں گا۔ بل منڈو سے سامنا ہونے کے بعد وہ میری زبان کھلوانے کے لئے ... انتہائی کوششیں کرے گا۔ اس وقت میں اس سے نمٹ لوں گا۔

میں یہ تمام باتیں سوچ رہا تھا اور دل ہی دل میں آئندہ کے پروگرام مرتب کر رہا تھا۔ اس دوران بوڑھا میک اپ مین مجھے آئی لینس کو استعمال کرنے کے عملی طریقے سکھا رہا تھا۔ یہ طریقے سیکھنے کے لئے کئی بار وہ آئی لینس میری آنکھوں سے نکالے گئے اور پھر اسی طرح آنکھوں میں جمائے گئے۔ یہ عمل گھنٹے آدھ گھنٹے کے وقفے سے ہوتا رہا تاکہ اس وقفے سے میری آنکھوں کو بھی آرام پہنچتا رہے۔

ہم دونوں تین بجے رات تک سو نہیں سکے۔ وہ مجھے سکھاتا رہا اور بہت کچھ سیکھتا رہا جب تین بجنے لگے تو اس نے میک اپ کا تھوڑا سا سامان مجھے دیا اور ان کی فہرست تیار کر دی تاکہ میں انہیں خرید سکوں۔ [illegible] بعد وہ جانے [illegible] بستر لپیٹنے لگا۔ [illegible]

اپنا [illegible] [illegible]

[illegible] آ گئے۔ تم [illegible]

[illegible] آج تم [illegible]

اس نے کہا "میرا بس چلے تو میں اپنے بڑھاپے کی تمام راتیں جاگ جاگ کر تمہارے کام آتا رہوں۔ اگر مجھے دن کے وقت سونے کا موقع مل گیا تو کل رات میں تمہیں اور بہت کچھ سکھاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ جب بھی وہ یہاں آئے گا، اسے بوڑھے چوکیدار سے اس کمرے کی چابی مل جائے گی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پھر جوتے اتارے۔ لباس تبدیل کیا اور بستر پر آ کر کمبل میں دبک گیا۔ تھوڑی دیر تک میرے کمرے کے باہر لوگوں کی آمد و رفت رہی۔ پھر وہ لوکیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے جاتے ہی چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ رات بڑی خاموش اور پُر اسرار تھی۔ نہ جانے رات کی تاریکی میں کتنے اسرار چھپے ہوتے ہیں۔ رات کے اس جذبات پرور اندھیرے میں کتنے ہی جوان دلوں کی دھڑکنیں بھی چھپی ہوتی ہیں۔ ایسی ہی باتیں سوچتے ہوئے مجھے شاداں یاد آ گئی۔ بہت دیر تک چشم تصور میں اس کی اداؤں کے پھول کھلتے رہے۔ میں نے اس کی جاگتی ہوئی اداؤں کو دیکھا تھا۔ میرے دل نے پوچھا ہوتے میں اس کی سوچ کی ادائیں کیا ہوں گی۔ کیا میں اس کے سپنوں کی رہگذر کا ... مسافر ہوں؟

میں اس راہ گزر تک پہنچنے کے لئے اس کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ آنکھیں بند کئے اپنے سپنوں کی محفل سجا رہی ہوگی۔ میں وہاں تک پہنچا تو معلوم ہوا وہ جاگ رہی ہے اور بے چینی سے کروٹیں بدل رہی ہے۔ وہ اپنی ہر کروٹ پر کبھی اس ہاتھ کو دیکھ رہی تھی، جسے میں نے پکڑا تھا، کبھی اس درد کو سمجھ رہی تھی جو میں نے نہیں دیا تھا مگر اسے مل گیا تھا۔ وہ ایک کروٹ کے بعد دوسری کروٹ ایسے بدل رہی تھی جیسے مجھ سے بچنے کے لئے منہ پھیر رہی ہو۔ مگر میری سوچ بھی اس کے ساتھ کروٹ بدلتی تھی اور انداز بدل بدل کر اس کے دماغ کو ڈاک بنگلے کی طرف لے جاتی تھی۔ اس نے جھنجھلا کر تکیے کو اپنے سرہانے سے کھینچ لیا۔ پھر اسے اپنی دونوں باہنوں میں لے کر اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ اب وہ دل کی باغی دھڑکنوں کو دبانا چاہتی تھی۔ اسی وقت اپنے تکیے کو دیکھ کر اسے خیال آیا کہ اس بابو کے تکیے کے نیچے سے روپے نکلتے ہیں۔ وہ سوچنے لگی:

"ہائے اللہ! تکیے کے نیچے آپ ہی آپ کس طرح روپے آ جاتے ہوں گے۔ ڈاک بنگلے کے اس تکیے پر تو کتنے ہی مسافر سر رکھ کر سوتے ہوں گے مگر اس بابو کی کھوپڑی [illegible] سب سے الگ [illegible] [illegible] دیکھ سکتی کہ اس کی کھوپڑی کے نیچے جو تکیہ ہوتا ہے [illegible] کے نیچے سے کیسے روپے نکلتے ہیں؟

[illegible] کیسے دیکھ سکتی ہوں [illegible] دیکھنے کے لئے [illegible] اس کے [illegible] مجھے [illegible]

[illegible] بات سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ جانے میں کیوں اتنی کمزور ہو گئی ہوں۔ خواہ مخواہ اتنے اچھے آدمی سے ڈرنے لگی ہوں۔ یہ لو میں پھر اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ میں تو تکیے کے نیچے سے نکلنے والے روپے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ میں کوئی سی بھی بات سوچتی ہوں، گھوم پھر کر پھر اسی بابو تک پہنچ جاتی ہوں۔ ہاں، شاید اسی لئے ڈر لگتا ہے کہ میں سوچتے سوچتے اپنے [illegible] بن جاتی ہوں۔ میری تو سوچیں بھی پرائی ہو گئیں۔ نہیں، اب [illegible] کے متعلق نہیں سوچوں گی، صرف اپنی بیلا کے متعلق سوچوں گی۔

میری بیلا بہت اچھی ہے۔ میں اس سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ [illegible] کی قسم کھاتی ہوں۔ بابو کو یقین ہو گیا ہے کہ میں بیلا کی جھوٹی قسم [illegible] اپنی بیلا کے بارے میں سوچو تب بھی بابو آ جاتا [illegible] سے بیلا کی آواز آ رہی ہے۔ اس کا مطلب ہے [illegible] بیلا اسی وقت مجھے آوازیں دے [illegible]

[illegible] وقت تکیہ اس کی گود میں آ گیا۔ اس تکیے نے پھر [illegible] ہیں۔

[illegible]

[illegible] گے [illegible]

[illegible]

وہ [illegible] کھلے ہوئے دروازے کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔

وہ سوچنے لگی "کیا بابو ابھی تک جاگ رہا ہے؟" اندر [illegible] کی آنکھیں بند نظر آ رہی ہیں۔ شاید سونے سے پہلے دروازہ بند کرنا [illegible] مجھے ڈرنا نہیں چاہیے۔ میں چوری کرنے تو نہیں آئی ہوں۔ بس [illegible] اٹھا کر دیکھوں گی۔ اگر وہاں سے روپیہ نکلے گا تو اسے ہاتھ نہیں [illegible] کسی کے پیسے کو ہاتھ لگانا بھی چوری کے برابر ہوتا ہے۔"

وہ سوچتی ہوئی دبے قدموں سے کمرے کے اندر آ گئی۔ میری [illegible] نہیں مگر میں اس کے دماغ کے ذریعہ اس کی ایک ایک حرکت [illegible] قریب آ کر میرے چہرے پر جھک گئی تھی اور یہ یقین کرنے کی کوشش [illegible] میں سو رہا ہوں۔ میری طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ سرہانے [illegible] فرش پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔ اپنا ہاتھ تکیے کی طرف بڑھاتے [illegible] بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پھر وہ بڑی آہستگی سے [illegible] سرے کو پکڑ کر اسے اوپر اٹھانے لگی۔ لالٹین کی روشنی دھیمی [illegible] تھی اور نیم تاریکی میں روپیہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹٹول کر دیکھنے کے لئے اس کا [illegible] ہاتھ تکیے کے نیچے رینگنے لگا۔ میں نے [illegible] جیسے کروٹ بدل [illegible]

[illegible] ہی میرا سر تکیے پر آیا اور اس کا ہاتھ تکیے کے نیچے دب گیا۔ ایک ساعت کے [illegible] اس کی سانس یوں رک گئی [illegible] چوری پکڑی گئی ہو۔ لیکن میری آنکھیں [illegible] بند تھیں۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ [illegible] سو رہا ہوں۔ وہ [illegible] تکیے کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔ [illegible] وقت میں [illegible] [illegible] شاداں [illegible] میں نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے اس نام کو یوں ادا کیا [illegible] وہ ایک آہ کے ساتھ میرے دل سے نکل رہا ہو۔ اس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں [illegible] اس کے دماغ میں خیالات کی جیسے محفل سج گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی [illegible]

[illegible] چھپا ہے [illegible] کہ سوتے وقت بھی بابو کی زبان پر میرا نام آتا ہے۔ کسی کی یادوں میں رہ کر خوش رہنے اور غرور کرنے کی کوئی محدود عمر نہیں ہوتی [illegible] لڑکیاں بھی یہی چاہتی ہیں کہ انہیں دیکھنے والے انہیں یاد رکھیں۔ دنیا والوں سے [illegible] بہت سی خوشیاں مانگی جاتی ہیں ان میں سے ایک اہم خوشی یہ بھی ہوتا ہے [illegible] [illegible] ان کے نام کی اہمیت کی ہو۔

میں نے نیند میں کسمانے کی اداکاری کی۔ پھر اپنا ہاتھ بڑھا کر [illegible] [illegible] دیا تو تکیے سے نکلنے والا [illegible] میرے ہاتھ کے سائے میں آ [illegible] [illegible] میٹھا سا درد لہرانے لگا۔ درد کی لہروں میں اس کی [illegible] [illegible] رہی تھی۔

میں پھر بڑبڑانے لگا "شاداں — تم نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا [illegible] [illegible] خوب صورت سے انداز سے ہاتھ کو تھام لیا ہے۔"

وہ [illegible] کسمسا رہی تھی۔ بابو سپنا نہیں ہے۔ میرا [illegible] [illegible] تو ہاتھ پکڑتا ہے تو جی یہی چاہتا ہے کہ درد بڑھتا رہے [illegible] [illegible] اور کبھی الگ نہ ہو ..."

[illegible] سوچ رہی تھی [illegible] ان نہیں کھول رہی تھی۔ لڑکیاں طوفی [illegible]

کے بعد بھی دل کے بھید زبان پر نہیں لاتیں۔ وہ یہی سمجھتی ہیں کہ ان سے پیار کرنے والا مرد دل پڑھنا جانتا ہے اور سمجھائے بغیر ان کے جذبوں کو سمجھ جاتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ دوسرے کیسے سمجھتے ہوں گے لیکن میں تو اس کے دل کی دھڑکنوں میں بیٹھ کر اس کی ایک ایک سوچ اور ایک ایک جذبے کو سمجھ رہا تھا۔ میرے سامنے عورت کا پُرغرور ٹوٹ جاتا تھا کہ اسے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

اس کی کلائی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا مگر ہاتھ کی زبان سے اسے بہت کچھ سمجھانا بھی چاہتا تھا۔ میں نے صرف انگوٹھا بڑھا کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ پھر اس انگوٹھے سے ہتھیلی کے کنول کو ہولے ہولے سہلانے لگا۔ اس نے ایک ایسی ہلکی سی گدگدی محسوس کی جو رگوں تک پہنچ کر ہنستی اور مچلتی ہے اور سارے بدن میں سرسراہٹ سی پیدا کرتی ہے۔

میں پھر بڑبڑانے لگا۔ "شاداں ــــ میں دولت نہیں چاہتا۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس تکیے کے نیچے سے تیرا ہاتھ نکلتا رہے اور دل تک پہنچتا رہے۔ تیرے ہاتھ سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں ہے۔"

پچھلی شام سے وہ اپنے اس ہاتھ کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ سمجھا دیا کہ ایک مرد کے لئے وہ ہاتھ کتنا اہم اور خوب صورت ہے۔ وہ اپنے بستر پر سوتی ہے مگر وہ ہاتھ دوسرے کے بستر پر اور دوسرے کے سپنوں میں آجاتا ہے۔

اس نے ہار مان کر اپنے ہاتھ کو ڈھیلا چھوڑ دیا پھر بڑی دیر کے بعد بولی "بابو اس ہاتھ نے مجھے ساری رات جگایا ہے۔ اب میری سمجھ میں آگیا کہ میں اسے تجھ سے چھڑاؤں گی تو کل رات بھی سو نہیں سکوں گی۔ تو یہ ہاتھ لے لے اور میری نیند مجھے واپس کر دے۔"

اس کی باتیں سن کر میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھ کو تھام لیا اور آنکھیں کھول کر کہا۔ "اچھی بات ہے۔ اب یہ ہاتھ میرا ہے۔"

میری آنکھ کھلتے ہی وہ چونک گئی۔ پھر اپنا ہاتھ چھڑانے کے لئے کسمسانے لگی۔ میں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر اب ہاتھ چھڑا کر بھاگے گی تو پھر کبھی تجھے نیند نہیں آئے گی۔ تیری بھوک پیاس بھی اڑ جائے گی۔"

وہ حیرانی سے پلکیں جھپکاتی ہوئی بولی۔ "میں تو بالکل ہی بھول گئی تھی پچھلی شام سے میں نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ مجھے کیا ہو گیا ہے بابو؟ روٹی کے بغیر انسان زندہ نہیں رہتا۔ اور میں روٹی کو بھی بھول گئی ہوں۔"

"میں تجھے بتاتا ہوں کہ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ یہاں آ کر بیٹھ . . . ." میں نے اسے بستر پر بیٹھنے کے لئے کہا۔

وہ انکار میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔ "نہیں۔ بابا کہتا ہے مجھے دوسروں کے پاس نہیں بیٹھنا چاہئیے۔"

"مگر تجھے تو وہاں بیٹھنا ہوگا جہاں تیرا ہاتھ ہوگا۔ تیرا ہاتھ میرے پاس ہے۔ اس ہاتھ کو چھوڑ کر تو دور کیسے جا سکتی ہے؟"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔

میں نے کہا۔ "جب آدمی بیمار ہو جاتا ہے تو اپنا علاج کراتا ہے۔ تجھے اپنے درد کا علاج معلوم نہیں ہوگا۔ تجھے بھوک نہیں لگے گی۔ تجھے نیند نہیں آئے گی۔ تو کیسے زندہ رہے گی؟ ایسے تو تُو مر جائے گی۔"

"بابو مرنے کی بات نہ کر۔ مجھے موت سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ مجھے بتا دے کہ مجھے بھوک کیسے لگے گی، نیند کیسے آئے گی؟"

"یہاں آ کر نہیں بیٹھے گی، میری بات نہیں سنے گی تو تیری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔"

یہ کہہ کر میں نے اس کے ہاتھ کو یوں ہولے سے کھینچا جیسے پتنگ کی ڈور کو ٹھمکا دیا جاتا ہے۔ اس جھٹکے سے پتنگ اوپر کو اٹھی پھر ڈولتی اور ڈگمگاتی ہوئی میرے بستر پر آ گئی۔

میں نے پوچھا۔ "جب میں تیرا ہاتھ پکڑتا ہوں تو کیا تیرا دل زور زور سے نہیں دھڑکتا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا تو نہیں چاہتی کہ جس طرح ہاتھ پکڑنے سے درد کم ہو جاتا ہے اسی طرح کوئی دل کو پکڑ کر دھڑکنوں کو پُرسکون بنا دے؟"

اس نے حیرانی سے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔ "کیا تو ہاتھ کی طرح دل بھی پکڑ سکتا ہے؟"

"ہاں!"

وہ بڑی خاموشی سے سمجھ رہی تھی کہ وہ اب تک کیا چاہتی تھی۔ میں نے اس کے کان کے پاس سرگوشی کی۔

"شاداں! ــــ میری شاداں . . . . !"

"آں ــــ" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی سانسوں میں طوفان سما رہا تھا اس کی "آں" اتنی ہلکی اور اتنی نازک سی تھی جیسے کلی چٹک رہی ہو، جیسے شبنم پھول کی پتی پر گر کر "آں" کی بجائے آہ کر رہی ہو۔ اس کے اندر سے ہر جذبہ ایک آہ کی طرح اٹھ رہا تھا۔

پہاڑوں کی مغرور بلندیاں ہمیشہ ڈراتی ہیں کہ نیچے گر پڑو گے مگر بھی کبھی بچوں کی طرح سرسبز ڈھلان میں لڑھکتے ہوئے مزہ آتا ہے۔ مجھے گرنے ہی میں عافیت نظر آئی۔

کسی دم صبح ہونے والی تھی۔ کہاسے میں لپٹے ہوئے بادل وادی کے نشیب و فراز میں بھٹک رہے تھے۔ کنواری شب کی آغوش سے صبح کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ اجالا پھیلتے ہی وہ میرے پاس سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں گہری نیند سو گیا۔ دن کے ایک بجے بوڑھے چوکیدار نے دروازے پر دستک دی تو میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اس کے ہاتھ میں ردیوں کا چھابہ تھا۔ وہ کمرے میں آتے ہوئے بولا۔

"شاداں کہہ رہی تھی کہ تمہیں ہمارے یہاں کی سوکھی روٹیاں پسند میں دہ پگلی ہے۔ تم سے سوکھی روٹیوں کے بدلے میں روپے لینا چاہتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ قیمت سوکھی روٹیوں کی نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے بدلے مجھے کتنی خوشیاں مل رہی ہیں۔ اگر ہم ایک دوسرے کی ضرورت کو سمجھ کر قیمت ادا کیا کریں تو پھر ضرورتیں ہمیں کبھی پریشان نہیں کیا کریں گی۔ شاداں کہہ رہی تھی کہ دو

وقت کے کھانے کے بیس روپے سے کر اپنے لئے نئے کپڑے لے گی۔ اگر اس طرح اس کی ضرورت پوری ہو جائے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔"

وہ میری سخاوت دیکھ کر مجھے دعائیں دینے لگا۔ میں نے غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر کھانا کھانے کے بعد اپنی اٹیچی سنبھالی۔ پھر اس کمرے کو لاک کرنے کے بعد بوڑھے چوکیدار کو اس کی چابی دیتے ہوئے کہا۔

"میں رات کو کسی وقت آؤں گا۔ فلم یونٹ کا ایک بوڑھا میک اپ مین تم سے یہ چابی مانگے تو اُسے دے دینا اور کسی کو اس کمرے میں رہنے کی اجازت نہ دینا۔"

پھر میں نے جیب سے ساٹھ روپے نکال کر شاداں کے لئے دیئے۔ یہ تین وقت کے کھانے کی قیمت تھی۔ مگر میں سمجھتا تھا کہ جو کچھ اُس نے مجھے کھلایا ہے اس لحاظ سے معاوضہ کم ہے۔ اس کے بعد میں چوکیدار سے رخصت ہو کر دُور پہاڑیوں کی طرف نکل گیا۔

بہت دُور چلتے رہنے کے بعد میں ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں بالکل تنہائی تھی۔ دُور دُور تک کوئی انسان یا جانور نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک طرف پہاڑ کی بلندی تھی اور دوسری طرف گھنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ میں درختوں کے سائے میں پہنچ کر بیٹھ گیا۔ وہاں اپنی اٹیچی کھول کر میک اپ کا سامان نکالا۔ پھر آئینے کو سامنے رکھ کر اپنے چہرے پر ماسک چڑھانے لگا۔ میری یادداشت اتنی اچھی ہے کہ ایک بار کوئی سبق سیکھنے کے بعد اسے کبھی نہیں بھولتا اور بوڑھے میک اپ مین نے تورات کے تین بجے تک بار بار ماسک اور آئی لینس کو استعمال کرنے کا طریقہ سکھایا تھا۔ ایک گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد میں نے بڑی کامیابی سے اپنی آنکھوں اور اپنے چہرے کو بدل لیا۔ پھر میں نے اٹیچی سے ایک بہترین سُوٹ نکال کر پہنا۔ اپنے جوتوں کو اچھی طرح صاف کیا اور اٹیچی اٹھا کر چل پڑا۔

یہ تو میں سمجھتا ہی تھا کہ بیل منڈو اور اس کے آدمی میری تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہوں گے۔ اب میں اپنی بدلی ہوئی شخصیت کے ساتھ ان کی تلاش کا سلسلہ ختم کرنے جا رہا تھا۔ ماسٹر یوشے کسی مقام پر مجھ سے ٹکرا سکتا تھا۔ مگر میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی زبان نہیں کھولوں گا۔ گونگا بن کر رہوں گا اور وہ میرے دماغ کی گونگی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر ناکامی سے جھنجھلاتا رہے گا۔ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ بیل منڈو جسمانی طور پر کتنا خطرناک ہے۔ اگر میں اس کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ میری زبان کھلوانے کے لئے مجھے ناقابلِ برداشت اذیتیں پہنچائے گا۔

بہت دیر تک پہاڑیاں چڑھتے رہنے کے بعد میں مری سے پنڈی کی جانے والی سڑک پر پہنچ گیا اور کسی ٹیکسی کے انتظار میں آگے بڑھنے لگا۔ کوئی ٹیکسی تو نہیں ملی ایک بس گزر رہی تھی۔ اس پر بیٹھ کر میں اسلام آباد پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر میں ایک ہوٹل میں چائے پینے کے لئے چلا گیا۔ چائے کا آرڈر دینے کے بعد میں سوچنے لگا کہ اب دشمنوں کو کس طرح چھیڑنا چاہئیے۔ اس مقصد کے لئے میں بیل منڈو کے دماغ میں جھانکنے لگا تاکہ کوئی تدبیر سمجھ میں آئے۔ اس وقت شام کے چار بجے تھے۔ بیل منڈو اپنی بھتیجی رُوما کا انتظار کر رہا تھا جو مری کی سیر کے لئے گئی تھی۔ تب مجھے یاد آیا کہ وہ خطرناک انسان اپنی بھتیجی کو کتنا چاہتا ہے۔ اسے ماسٹر یوشے جیسے شیطان سے بچا کر رکھنے کے لئے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہے لہٰذا اُسے چھیڑنے کے لئے کیوں نہ اس کی بھتیجی کو چھیڑا جائے۔

چائے کی پیالی میرے سامنے رکھی ہوئی تھی۔ میں گرما گرم چائے کی چسکی لیتے ہوئے رُوما کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ اس وقت وہ ایک کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی مری سے پنڈی کی طرف آرہی تھی۔ کار کی اگلی سیٹ پر اس کے دو باڈی گارڈز بیٹھے ہوئے تھے۔ رُوما کی سوچ یہ سب کچھ بتا رہی تھی۔ اس کا ایک باڈی گارڈ کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں رُوما کی سوچ کے ذریعے باڈی گارڈ کی سوچ تک پہنچنا چاہ رہا تھا۔ پہلے میں نے یہ اطمینان کر لیا کہ ماسٹر یوشے رُوما کے ذہن میں نہیں جھانک رہا ہے۔ اس کے بعد میں نے اُس کی سوچ میں کہا۔

"پتہ نہیں میں پنڈی کب پہنچوں گی۔ انکل انتظار کر رہے ہوں گے۔"

رُوما نے یہی بات ڈرائیور سے کہی۔ اس کے باڈی گارڈ نے جواب دیا کہ وہ پانچ بجے تک پہنچ جائے گی۔ باڈی گارڈ کی زبان کھلتے ہی میں اس کے دماغ تک پہنچ گیا۔ اس وقت وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا سامنے سے گزرنے والے مناظر کو دیکھ رہا تھا اور ان مناظر کے حُسن سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"کتنی خوبصورت جگہ ہے" وہ سوچ رہا تھا۔ "پہاڑیں روئی کے گالوں کی طرح اُڑتے ہوئے بادل ہیں جو سرسبز وادیوں میں اُتر رہے ہیں خوشبو بکھیرتے پھول ہیں۔ یہاں کے ہرے بھرے ماحول کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے جنت زمین پر اُتر آئی ہو۔ ایسی جگہ بیٹھ کر وہسکی پینے میں بڑا لطف آئے گا۔" میں نے اُس کی سوچ میں کہا۔

"صرف وہسکی سے کیا ہوتا ہے۔ صرف شراب ہو شباب نہ ہو تو زمین کی جنت مکمل نہیں ہوتی۔"

"اونہہ، شباب تو دُور کی چیز ہے۔ ہم تو اُس وقت تک شراب کو بھی ہاتھ نہیں لگا سکتے جب تک رُوما کے باڈی گارڈ بنے رہتے ہیں۔ باس کو اگر پتہ چل جائے کہ ہم نشے کی حالت میں اُس کی بھتیجی کی حفاظت کر رہے تھے تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

میں نے اُس کی سوچ میں کہا۔ "اب ایسی بھی کیا بزدلی کہ باس کی عدم موجودگی میں بھی ہم اس کے خوف سے کانپتے رہیں۔ کیا مجھ میں دلیری اور مردانگی نہیں ہے؟"

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ "ارے ارے یہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ میں اور باس کے مقابلے میں دلیری دکھاؤں؟ ہم میں سے کوئی ہزاروں میل دُور جا کر بھی اتنے خطرناک آدمی کو چیلنج نہیں کر سکتا۔ اس کا نام بیل منڈو ہے۔ اس کے کراٹے کا ایک ہاتھ پڑتا ہے تو مضبوط دیواریں بھی تڑخ

جاتی ہیں۔"

میں بہت دیر تک اس باڈی گارڈ کے ذہن کو کریدتا رہا مگر پتہ چلا کہ وہ سب بیل منڈو سے بہت زیادہ خوفزدہ رہتے ہیں۔ میں کسی طرح بھی اس کار ڈرائیو کرنے والے باڈی گارڈ کو اپنا آلۂ کار نہیں بنا سکتا تھا۔ میں اس سے مایوس ہو کر پھر رُوما کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ اس وقت رُوما کار کے سامنے نصب عقب نما آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ آئینے میں اُسے دُوسرا باڈی گارڈ نظر آ رہا تھا۔ وہ باڈی گارڈ بھی آئینے میں رُوما کو دیکھ رہا تھا۔ جب برابر اُن کی نگاہیں لڑتی ہیں تو یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ رُوما اس نوجوان باڈی گارڈ سے متاثر ہے۔ وہ کبھی کبھی کار ڈرائیو کرنے والے باڈی گارڈ کو یُوں دیکھتی تھی جیسے وہ ان کے درمیان دیوار بنا بیٹھا ہو۔ میں نے رُوما کی سوچ میں کہا۔

"کیا میں اس دیوار کو تھوڑی دیر کے لیے ہٹا نہیں سکتی؟"

اُس کی سوچ نے کہا۔ "ہاں میں وسیم کو دُور ہی دُور سے دیکھتی ہوں۔ اس سے بات کرنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ مگر انکل کہتے ہیں کہ ملازموں سے غیر ضروری باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ پھر میں بات کس سے کروں گی؟ انکل کی نظروں میں تو سب ہی حقیر ہوتے ہیں۔ میں ایسی پابندی میں رہ کر بیزار ہو گئی ہوں۔ میرا بہت جی چاہتا ہے کہ کسی سے کھل کر باتیں کروں اور کسی کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر دُور سبزہ زاروں میں دوڑتی پھروں۔"

میں نے اُس کی سوچ میں کہا۔ "یہاں آس پاس کتنے خوبصورت مناظر ہیں۔ سپنوں میں ایسے ہی مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ ایسی ہی جگہ کوئی شہزادہ آتا ہے اور بڑی محبت سے میرے اس ہاتھ کو تھام لیتا ہے جسے تھامنے کا تصور کوئی نوجوان نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے ہی وہ انکل کے خوف سے تھر تھر کانپنے لگتا ہے۔ مجھے یُوں لگتا ہے وسیم میرے خوابوں کا شہزادہ ہے۔ مجھے ڈرائیور سے کہنا چاہیئے کہ گاڑی یہاں روک دے۔ میں وسیم کے ساتھ ذرا دُور تک سرپلی میں پیدل چلوں گی۔ آخر یہ میرا ڈرائیور ہے میرا باڈی گارڈ ہے میرا ملازم ہے۔ میری بات کیوں نہیں مانے گا؟"

میرے اشتعال دلاتے ہی رُوما نے اُسے گاڑی روکنے کے لئے کہا۔ اُس نے سڑک کے کنارے گاڑی روکتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے بے بی؟"

رُوما نے جواب دیا۔ "مجھے یہ منظر بہت اچھا لگ رہا ہے۔ میں نیچے ذرا ڈھلان میں اتر کر جاؤں گی ـــ وسیم! میرے ساتھ آؤ۔"

یہ کہتے ہی وہ کار کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ ڈرائیور نے بھی کار سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"بے بی! ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ باس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں پانچ بجے سے پہلے تمہیں واپس لے آؤں۔"

"میں انکل سے کہہ دوں گی کہ تم میری وجہ سے وقت پر نہ پہنچ سکے ـــ وسیم! میرے ساتھ آؤ۔ مجھے نیچے اُترتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

رُوما نے اپنا ہاتھ وسیم کی طرف بڑھا دیا۔ وسیم نے جھجکتے ہوئے دوسرے باڈی گارڈ کی جانب دیکھا۔ باڈی گارڈ اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ خاموش نگاہوں سے اسے سمجھا رہا تھا کہ اسے باس کی لاڈلی بھتیجی کے اتنے قریب نہیں جانا چاہیئے۔ دوسری طرف رُوما کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو قبول نہ کرنے سے بھی اس پر مصیبت آ جاتی۔ وہ اپنی توہین برداشت نہ کر سکتی۔ اگر وہ یہاں سے اُداس ہو کر جاتی تو بیل منڈو اس کی مرمت کر دیتا۔ اس کے لئے دونوں ہی طرف سے مصیبت تھی لیکن رُوما کی طرف سے جو مصیبت تھی اس میں جذباتی دلچسپیاں تھیں۔ اس لئے وہ رُوما کا ہاتھ تھام کر آہستہ آہستہ نشیب کی طرف جانے لگا۔

میں نے چائے کی پیالی خالی کی۔ اس کے پیسے ادا کئے پھر تیزی سے چلتا ہوا ہوٹل سے باہر آیا۔ وہ تینوں جس مقام پر پہنچتے ہیں وہاں جلد سے جلد پہنچنا چاہتا تھا۔ قریب ہی پٹرول پمپ پر ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ کار کا مالک پٹرول کے پیسے ادا کر رہا تھا۔ میں نے اس کے خیالات سے پتہ چلایا کہ وہ مری کی طرف جا رہا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے بعد میں نے اس سے لفٹ مانگی۔ پہلے تو اُس نے لفٹ دینے سے انکار کیا لیکن وہ میری صلاحیتوں کے سامنے اپنے انکار پر قائم نہ رہ سکا۔ میں نے سوچ کے ذریعے اُسے قائل کر دیا کہ مجھے لفٹ ملنی چاہیئے۔

میں اس کی کار میں بیٹھ کر مری کی اسی سڑک پر واپس جانے لگا۔ جہاں ان تینوں سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ راستے میں میں پھر دماغ کی اسکرین پر انہیں دیکھ رہا تھا۔ رُوما وسیم کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیئے بہت دُور نشیب میں اُترتی جا رہی تھی۔ باڈی گارڈ ڈرائیور ان سے کچھ پیچھے فاصلے سے چلا آ رہا تھا۔ رُوما نے پلٹ کر کہا۔

"تم ہمارے پیچھے کیوں آ رہے ہو؟ جاؤ وہاں کار کے پاس ہمارا انتظار کرو۔ ہم تھوڑی دیر میں واپس آ جائیں گے۔"

"سوری بے بی! میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔"

وہ جھلا کر بولی۔ "میں تنہا نہیں ہوں۔ وسیم میرے ساتھ ہے کیا یہ میرا باڈی گارڈ نہیں ہے؟"

"یہ باڈی گارڈ ہے۔ مگر باس کی نظروں میں مَیں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہوں۔"

وسیم نے کہا۔ "ٹونی! کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں قابلِ اعتماد نہیں ہوں۔ کیا میں بے بی کو یہاں سے بھگا کر لے جاؤں گا؟"

ٹونی نے حقارت سے کہا۔ "بے بی کو بھگا کر لے جانے کے لئے بڑے دل گُردے کی ضرورت ہے۔ اگر آئندہ تمہارے مُنہ سے ایسی بات نکلی تو میں تمہارا مُنہ توڑ دوں گا۔"

میں نے وسیم کی سوچ میں کہا۔ "میں اس ملک کا باشندہ ہوں اور ٹونی باس کا ہموطن ہے۔ یہ متعصب لوگ مجھے صرف ایک معمولی ملازم اور ایک کمزور انسان سمجھتے ہیں۔ یہ میرا مُنہ توڑنا چاہتا ہے میں چاہوں تو اس کا مُنہ توڑ سکتا ہوں۔ مگر اس طرح کام بگڑ جائے گا۔ بیل منڈو میرا دشمن بن جائے گا اور رُوما بھی مجھ سے دُور ہو جائے گی۔"

رُوما نے بگڑ کر ٹونی سے کہا۔ "ٹونی! میں وسیم پر بھروسہ کر رہی ہوں اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہو؟"

ٹونی نے کہا۔ "میں اپنا فرض پورا کر رہا ہوں۔ تم نہیں جانتیں بے بی! ہم اس ملک کے بدمعاشوں کو ملازم تو رکھ لیتے ہیں مگر اُن پر اندھا اعتماد نہیں کرتے۔ ہم انہیں صرف دُم ہلانے والے کُتے سمجھتے ہیں۔"

اس کی بات پوری ہوتے ہی وسیم نے ایک گھونسہ اس کے مُنہ پر جڑ دیا۔

"اس ملک کے بدمعاش کُتے ہیں یا شیر؟ یہ میں ابھی تمہیں بتاتا ہوں۔"

یہ کہتے ہی اُس نے ٹونی پر چھلانگ لگا دی۔ اس کی سوچ سے پتہ چلا کہ ٹونی کا ایک ہاتھ پڑتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے تھے۔ اسی وقت ہماری کار اُس مقام سے گزرنے لگی جہاں سڑک کے کنارے رُوما کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ ذرا آگے بڑھ کر میں نے لفٹ دینے والے کا شکریہ ادا کیا اور اس کار سے اُتر گیا۔ رُوما کی کار کے قریب آ کر میں نے دُور نشیب کی طرف دیکھا۔ گھنے درختوں کی وجہ سے وہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ اسی طرف گئے ہیں۔ میں بھی اسی طرف چل پڑا۔

وہ مجھ سے بہت دُور تھے نظر بھی نہیں آ رہے تھے۔ میں نشیب میں اُترتے وقت کبھی کبھی دماغ کی اسکرین پر اُنہیں لڑتے دیکھ لیتا تھا۔ ٹونی بیل منڈو کا دستِ راست تھا اور لڑنے کے فن سے خوب اچھی طرح واقف تھا۔ مجھے افسوس تھا کہ میں وقت پر وسیم کی مدد کو نہ پہنچ سکا۔ اس سے پہلے ہی ٹونی نے لڑنے کے دوران اس کی گردن توڑ دی۔ رُوما کی عجیب حالت تھی۔ اُسے وسیم کی موت کا افسوس بھی ہو رہا تھا اور وہ مطمئن نظر آ رہی تھی۔ اس لڑکی کی پرورش خطرناک اور ناقابلِ شکست فائیٹروں کے درمیان ہوئی تھی۔ وہ شکست کھا کر مرنے والے محبوب کا ماتم نہیں کر سکتی تھی۔

ٹونی نے وسیم کو زندگی سے ناک آؤٹ کرنے کے بعد رُوما سے کہا۔

"بے بی! میں تمہارا ادنیٰ خادم ہوں۔ تمہارے پاؤں بہت نازک ہیں۔ تمہارے راستے سے کانٹوں کو صاف کرنا میرا فرض ہے۔ میں نے یہ فرض ادا کر دیا ہے۔ کیا آپ ایک بُزدل کی موت پر افسوس کریں گی؟"

وہ جواب دینے کے بجائے خاموشی سے مُڑ کر چلنے لگی لیکن چند قدم چلنے کے بعد ہی ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کی سوچ بتا رہی تھی کہ اُس کے سامنے ایک قد آور ضخیم آدمی کھڑا ہے اور وہ شعلہ بار نگاہوں سے ٹونی کو گھور رہا ہے۔ میں فوراً ہی ٹونی کے ذہن میں جھانکنے لگا تاکہ اس کے ذریعے اس دیو ہیکل اجنبی کو سمجھ سکوں۔ اس وقت وہ اجنبی اشاروں کی زبان میں ٹونی سے پوچھ رہا تھا کہ تم نے اس آدمی کی گردن کیوں توڑ دی ہے؟

اسے اشاروں سے بات کرتے دیکھ کر ٹونی چونک گیا۔ اس کے دماغ نے کہا۔

"یہ تو گونگا معلوم ہوتا ہے۔ کہیں یہ فرہاد تو نہیں ہے؟ جسے باس تلاش کر رہا ہے۔ مجھے اس سے باتیں کر کے اصلیت معلوم کرنی چاہیئے۔"

ٹونی نے یہ سوچ کر اس دیو ہیکل اجنبی سے پوچھا۔ "تم کون ہو اور ہمارے معاملات میں دخل کیوں دے رہے ہو؟"

وہ دیو ہیکل اجنبی اسے سوالیہ نظروں سے یُوں دیکھنے لگا، جیسے اُس کی بات سمجھ میں نہ آئی ہو۔ پھر اُس نے اشارے سے بتایا کہ وہ گونگا اور بہرہ ہے۔

اس کا اشارہ سمجھتے ہی ٹونی کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "بیٹے فرہاد! تم گونگے نہیں ہو۔ مگر گونگے بن رہے ہو۔ باس کو تمہاری تلاش ہے۔ تم سیدھی طرح میرے ساتھ چلو' ورنہ میں ٹھوکریں مارتا ہوا تمہیں وہاں تک لے جاؤں گا۔ میں اپنے باس کا ملازم بھی ہوں اور مارشل آرٹ میں اس کا شاگرد بھی ـــ یہ دیکھو!"

اُس نے اپنی جیکٹ اُٹھا کر اپنی کمر سے بندھا ہوا بیلٹ دکھایا۔ اس کی کمر سے یلو بیلٹ بندھا ہوا تھا۔ میں درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھتا ہوا اس اجنبی کے متعلق سوچ رہا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آ ٹپکا ہے۔ ٹونی اس کی آنکھوں میں کئی بار دیکھ چکا تھا اور میں اس کے ذریعے اس گونگے کی گونگی سوچ تک پہنچ چکا تھا۔ لیکن مجھے اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ یلو بیلٹ دیکھنے کے بعد اس گونگے کی سوچ نے کہا تھا کہ یہ شخص مارشل آرٹ میں حاصل کیا ہوا بیلٹ دکھا کر مجھے چیلنج کر رہا ہے۔ مجھے اس چیلنج کا جواب دینا چاہیئے۔

یہ سوچتے ہی اس نے گھوم کر ٹونی کو ایک ڈبل کِک لگائی۔ ٹونی کے جبڑے ہل کر رہ گئے۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ پھر سنبھل کر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ وہ پینترے بدل کر کراٹے کے ہاتھ جمانا چاہتا تھا۔ گونگا اطمینان سے کھڑا ہوا صرف آنکھیں گھما کر اسے یُوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بچہ اسے مارنے کی دھمکی دے رہا ہو۔ ٹونی نے آگے بڑھ کر کراٹے کے دو چار زبردست ہاتھ جمائے۔ گونگا جُوں کا تُوں کھڑا رہا۔ اسے یُوں اطمینان سے مار کھاتے دیکھ کر مجھے شیتل یاد آ گیا۔ وہ بھی ایسا ہی ناقابلِ شکست پہاڑ تھا۔ جب پہلی بار وہ مجھ سے دشمن کی طرح ٹکرایا تھا تو میں نے اپنی پوری قوت سے اس پر کئی بار حملے کئے تھے لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میرے دماغ میں بات آئی کہ کہیں یہ شیتل تو نہیں ہے۔ مگر نہیں، شیتل کی سوچ کا لہجہ کچھ اور تھا۔ وہ گونگا کوئی دوسرا ہی شخص تھا۔

یہ سوچنے کے دوران میں درختوں کے جھنڈ میں پہنچ گیا۔ وہ لوگ مجھے نظر آ رہے تھے۔ میں نے ایک درخت کے پیچھے سے دیکھا تو وہاں ٹونی کے مقابلے پر واقعی شیتل نظر آ رہا تھا۔ میں حیرانی سے سوچنے لگا کہ میں سوچ کے ذریعے آخر شیتل کو سمجھ کیوں نہیں سکا۔ اب سے پہلے

کئی بار میں سوچ کے ذریعے اس سے گفتگو کر چکا تھا۔ اس وقت وہ بڑے اطمینان سے ایک جگہ کھڑا ہوا ٹونی کو حملے کرنے کا موقع دے رہا تھا۔ اگر میں اُس کی سوچ پر دستک دیتا تو لڑنے کے دوران اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ لہٰذا میں نے سوچ کے ذریعے مخصوص لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ سوچ کا رابطہ قائم ہوتے ہی وہ گونگا چونک گیا۔ مگر شیتل کی طرح اس مخصوص لہجے کو سمجھ نہ سکا۔ میرے سوچ کے ذریعے مداخلت کرنے کے باعث وہ گڑبڑا گیا۔ جب ٹونی اس پر حملہ کرنے کے لئے پھر آگے بڑھا تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر انگلیوں میں انگلیاں پھنسائیں اور ایک جھٹکے سے اس کی چاروں انگلیاں توڑ دیں۔ ٹونی کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور وہ اپنا ہاتھ تھام کر زمین پر گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی گونگے نے اس کے مُنہ پر ایک ٹھوکر ماری۔ وہ ٹھوکر ایسی تھی کہ ٹونی کو تڑپنے کی مُہلت بھی نہ ملی۔ وہ ایک دم سے ٹھنڈا پڑ گیا۔

رُوما اپنے دونوں باڈی گارڈز سے محروم ہو کر گھبرا رہی تھی اور سہمی ہوئی نظروں سے گونگے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے حسین چہرے سے پریشانی مترشح تھی۔ وہ گونگا رُوما کو اشاروں سے سمجھا رہا تھا۔

"میں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اب تمہارا یہ آدمی کبھی زمین پر سے اُٹھ نہیں سکے گا۔"

رُوما پہلے تو ذرا جھجکتی رہی۔ وہ اب بھی یہی سمجھ رہی تھی کہ اس گونگے کے پیچھے فرہاد چھپا ہوا ہے۔ وہ اپنے دشمن کی بھتیجی کو اتنی آسانی سے نہیں چھوڑے گا۔ گونگے نے پھر ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

"جاؤ بھاگ جاؤ یہاں سے۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔"

وہ تیزی سے پلٹ کر جانے لگی۔ اسی وقت میں درخت کے پیچھے سے نکل آیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ گونگا میری طرف بڑھنے لگا۔ میں نے اس کی سوچ میں کہا۔

"یہ اجنبی جس کا چہرہ بدلا ہوا ہے یہ میرا باس فرہاد علی ہے۔"

گونگا آگے بڑھتے بڑھتے رُک گیا اور حیرانی سے سوچنے لگا۔

"کون فرہاد علی؟ میں نے تو آج تک یہ نام نہیں سُنا۔ میرا باس تو بلیک گائیڈ ہے۔ میں بلیک گائیڈ اور اپنے بھائی شیتل کو تلاش کرنے اس ملک میں آیا ہوں۔"

اس کی سوچ پڑھتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ میرے سامنے جو گونگا کھڑا ہے وہ شیتل کا جڑواں بھائی چیتل ہے جو ساقی کو ہیلی کاپٹر میں بٹھا کر لے گیا تھا۔ چیتل نے آگے بڑھ کر تحکمانہ اشارے میں کہا۔

"اس لڑکی کا راستہ نہ روکو۔ اسے جانے دو۔"

میں نے بھی اشارے میں جواب دیا کہ مجھے اس لڑکی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ یہاں سے جا سکتی ہے۔ مگر رُوما آگے بڑھنے کے بجائے مجھے دیکھتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی۔

"کیا اس ملک میں گونگوں کی آبادی زیادہ ہے؟ یہ آنے والا اجنبی بھی گونگے اشاروں میں بات کر رہا ہے۔ یہی فرہاد تو نہیں ہے۔"

یہ سوچ کر اُس نے مجھ سے سوال کیا۔ "تم کون ہو؟"

میں نے چیتل کو مخاطب کرتے ہوئے اشارہ کیا۔ "اس لڑکی سے کہو یہ مجھ سے باتیں نہ کرے۔ چُپ چاپ یہاں سے چلی جائے۔"

چیتل نے اشارے سے مجھے سمجھایا۔ "یہ عورت ہے۔ ہر عورت کی عزت کرنا ہمارا فرض ہے۔ اگر یہ کچھ پوچھتی ہے تو تمہیں جواب دینا چاہئے۔"

رُوما اس کے اشارے کو سمجھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی

"اگر یہ آنے والا دوسرا گونگا فرہاد ہے تو مجھے پہلے گونگے کو اپنی طرف مائل کرنا چاہیئے۔ میں اس کے ذریعے فرہاد کو پکڑ کر انکل کے پاس لے جاؤں گی۔ انکل کی ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔"

میں چیتل سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی رُوما نے اُسے اشاروں میں سمجھایا۔

"یہ جو اٹیچی پکڑے یہاں آیا ہے، یہ گونگا نہیں ہے، زبان رکھتا ہے۔ یہ میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا ہے۔ اگر تم اسے پکڑ کر میرے ساتھ لے چلو گے تو تمہاری بڑی مہربانی ہو گی۔"

چیتل نے اشارے سے جواب دیا۔ "میں اسے پکڑ کر تمہارے ساتھ کہیں نہیں جا سکتا۔ البتہ میں اسے یہاں روک لوں گا۔ یہ تمہارا پیچھا نہیں کرے گا۔ تم یہاں سے چلی جاؤ۔"

رُوما مایوس ہو کر جانے لگی۔ میں چیتل کو اشاروں میں سمجھانے لگا کہ وہ لڑکی جھوٹ بول رہی تھی۔ میں اس کا دشمن نہیں ہوں۔ چیتل نے مجھ سے سوال کیا۔

"اگر تم اس کے دشمن نہیں ہو تو اس جنگل میں کیا کرنے آئے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "تمہیں یہ سُن کر حیرانی ہو گی کہ میں تمہارے ہی ایک ہمشکل سے ملنے جا رہا ہوں۔ وہ لڑکی ان دو نوجوانوں کے ساتھ اس جنگل میں آ رہی تھی تو مجھے ان پر شُبہ ہوا۔ میں یہ دیکھنے یہاں چلا آیا کہ یہ لوگ یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔"

چیتل یہ سُن کر چونک گیا کہ میں اس کے ایک ہمشکل سے ملنے جا رہا ہوں۔ اُس نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"کیا واقعی وہ بالکل میری طرح ہے؟"

میں نے اس کے قد و قامت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ تمہارے ہی جیسا قد ہے، ڈیل ڈول ہے، صورت شکل میں تم سے ذرا بھی مختلف نہیں ہے اور وہ تمہاری طرح گونگا بھی ہے۔"

وہ میرے بازو کو پکڑ کر خوشی سے جھنجوڑتے ہوئے بولا۔ "مجھے اس کے پاس لے چلو۔ اگر وہ مجھے مل گیا تو انعام کے طور پر میں تمہیں بہت بڑی رقم دوں گا۔"

میں نے اپنی اٹیچی اُٹھا کر کہا۔ "میرے ساتھ چلو۔ ابھی اس سے ملاقات ہو جائے گی۔"

ہم دونوں اُدھر جانے لگے جدھر رُوما گئی تھی۔ اس وقت چیتل سوچ رہا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے میرا بھائی انٹیلیجنس والوں کی گرفت میں نہیں آیا ہے۔ میں یہ سوچ کر جنگلوں میں چھپا پھر رہا ہوں کہ میں اپنے بھائی کا ہمشکل ہوں۔ کہیں پولیس والے مجھے بھی پکڑ کر نہ لے جائیں۔ مگر یہ شخص کون ہے؟ میرے بھائی کو کیسے جانتا ہے؟"

اس نے مجھ سے سوال کیا۔ "تم کون ہو اور میرے بھائی کو کیسے جانتے ہو؟"

میں اسے سمجھانے لگا کہ "میں ایک مُجرم ہوں اور قانون کی نظروں سے چھپتا پھر رہا ہوں۔ میں نے تمہارے ہمشکل کو اپنے یہاں پناہ دی ہے۔"

میرے اس جواب سے وہ مطمئن ہو گیا کہ میں بھی اس کی طرح ایک مجرمانہ زندگی گزار رہا ہوں اور ایک مُجرم ہونے کے ناطے اُسے قانون کے حوالے نہیں کروں گا۔ بلندی پر چڑھتے وقت میں نے دیکھا، رُوما اپنی کار میں بیٹھ کر پنڈی کی طرف جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم سڑک پر پہنچ گئے اور مری کی طرف جانے لگے۔ راستے میں میں نے شیتل سے دماغی رابطہ قائم کیا۔ اس وقت وہ پھوپھی وغیرہ کے ساتھ بیٹھا ہوا شام کی چائے پی رہا تھا۔ میں نے اُس کی سوچ کے مخصوص لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ وہ سوچنے لگا۔

"میں اس وقت اپنے دماغ میں اپنے باس کو محسوس کر رہا ہوں یقیناً یہ میرا باس ہے ـــ باس! اگر تم مجھ سے مخاطب ہو تو یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اتنے دنوں بعد بھی تم نے مجھے یاد رکھا۔"

"ہاں شیتل!" میں نے کہا۔ "اس وقت مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تم کار میں بیٹھ کر فوراً پنڈی جانے والے راستے پر چل پڑو اور اپنے بائیں طرف دیکھتے چلو۔ راستے میں تمہارا بھائی چیتل تمہیں نظر آئے گا۔ اس وقت وہ ایک اجنبی کے ساتھ ہے۔"

اپنے بھائی کا ذکر سُنتے ہی وہ خوش ہو گیا۔ اس نے پھوپھی سے اجازت لی کہ وہ کار لے کر جا رہا ہے، ابھی تھوڑی دیر میں واپس آ جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کار میں بیٹھ کر ہماری طرف آ رہا تھا۔ راستے میں اُس نے سوچ کے ذریعے پوچھا۔

"باس! میرے بھائی چیتل کے ساتھ وہ اجنبی کون ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "وہ اجنبی میں ہوں۔ میں نے میک اَپ کے ذریعے اپنا چہرہ اور آنکھیں بدل لی ہیں۔ اس میک اَپ میں تم مجھے پہچان نہیں سکو گے۔ تم یہاں آ جاؤ، اس کے بعد کہیں تنہائی میں جا کر اپنا میک اَپ اُتار دوں گا۔"

میں چیتل کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ شیتل تیزی سے کار میں آ رہا تھا۔ دس منٹ کے بعد ہی وہ کار ہمارے قریب آ کر رُک گئی۔ چیتل کو دیکھتے ہی خوشی سے شیتل کی باچھیں کھل گئیں۔ چیتل کے چہرے سے بھی خوشی کا بے پناہ اظہار ہو رہا تھا۔ وہ بچھڑے ہوئے بھائی ایک مدت کے بعد مل کر بے حد خوش تھے اور میں سوچ رہا تھا، خون کا رشتہ دُنیا کا سب سے طاقتور رشتہ ہے جسے کبھی موت نہیں آتی۔

میں نے اشاروں میں شیتل سے کہا کہ تم دونوں پیچھے بیٹھ جاؤ۔ گاڑی میں چلاؤں گا۔ تم دونوں ایک عرصے سے ایک دوسرے سے بچھڑے ہوئے ہو۔ یقیناً ایک دوسرے سے باتیں کرنے اور ایک دوسرے کے حالات جاننے کے لئے بے چین ہو گے۔ گاڑی چلاتے ہوئے تم اشاروں میں آسانی سے چیتل کے ساتھ باتیں نہ کر سکو گے۔ میری بات سمجھ کر شیتل کے چہرے پر تشکر اور ممنونیت کا احساس چھا گیا اور وہ چیتل کا ہاتھ تھام کر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ رہا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ ڈال کر گاڑی مری جانے والے راستے پر ڈال دی۔

گاڑی ڈرائیو کرنے کے ساتھ ساتھ میں چیتل اور شیتل کے ذہنوں میں بھی جھانک رہا تھا۔ دونوں اشاروں میں ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کر رہے تھے۔ چیتل سوچ رہا تھا، خدا کا شکر ہے میرا بھائی انٹیلیجنس والوں کے ہتھے نہیں چڑھا ورنہ زندگی میں اس سے ملاقات ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھی۔ چند رسمی باتیں کرنے اور ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنے کے بعد چیتل نے اشارے کی زبان میں شیتل سے پوچھا۔

"یہ اجنبی کون ہے اور آجکل تمہارا قیام کہاں ہے؟"

شیتل نے اشارے کی زبان میں اس سے کہا۔ "یہ میرا باس ہے اور اس کے خاندان کے ساتھ ہی میں رہتا ہوں۔"

شیتل کے مُنہ سے باس کا نام سُن کر چیتل چونکا اور شکایتی نظروں سے شیتل کو دیکھتے ہوئے اشاروں میں کہنے لگا۔ "یہ تم نے کسے اپنا باس بنا لیا ہے۔ ہمارا باس تو بلیک گائیڈ ہے۔"

"نہیں۔ اب میرا باس بلیک گائیڈ نہیں بلکہ یہ شخص ہے جو کار چلا رہا ہے اور جس کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔"

چیتل کی سوچ سے پتہ چل رہا تھا کہ اسے شیتل کی یہ بات قطعی پسند نہیں آئی ہے۔ وہ ایک عرصے تک بلیک گائیڈ کے لئے کام کرتا رہا تھا جو انہیں خرچ کے لئے بہت معقول رقم دیتا تھا اور اسی کی وجہ سے وہ اب تک عیش و عشرت کی زندگی گزارتے آئے تھے۔ اُس کے کرخت چہرے پر خفگی اور ناگواری کے احساسات اُبھر آئے۔ اُس نے جھنجلا کر اشاروں میں شیتل سے پوچھا۔

"آخر ایسی کون سی وجوہات تھیں جن کی بنا پر تم نے بلیک گائیڈ کو چھوڑ کر اس شخص کو اپنا باس بنا لیا؟ یہ تو بلیک گائیڈ سے سراسر بے وفائی ہے۔ تم پر اس شخص کے کیا احسانات ہیں؟"

"میں ایک مُہم میں بہت زخمی ہو گیا تھا۔ اتنا کہ موت کے بھیانک پنجوں میں جانے والا تھا۔ ایسے میں اس شخص نے میری جان بچائی، میرا علاج کیا اور اپنے یہاں خفیہ طور پر پناہ دے کر مجھے انٹیلیجنس والوں کی گرفت سے بھی بچایا ہے۔ جس شخص نے میری جان بچائی ہے

اس کے احسانوں کا بدلہ میں اسی طرح چکا سکتا ہوں کہ اس کے ساتھ رہ کر اس کے لئے کام کروں۔"

چیتل کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ میں عقب نما آئینے میں ان دونوں کے چہرے دیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی ان کے ذہنوں میں بھی جھانک رہا تھا۔ چیتل اس بات پر بہت برہم تھا کہ شیتل نے بلیک گائیڈ کا ساتھ کیوں چھوڑا۔ اُس نے جھنجلا کر اشاروں میں پوچھا۔

"یہ شخص آخر ہے کون؟"

"یہ بھی ہماری طرح ایک مجرم ہے اور ہم جیسے مجرموں کو پناہ بھی دیتا ہے۔ جن سے قوم و ملک کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ میں اس کے یہاں بڑے عیش و آرام سے رہتا ہوں۔"

"کیا بلیک گائیڈ ہمیں عیش و آرام سے نہیں رکھتا تھا جو تم اُسے چھوڑ کر اس شخص کے لئے کام کرنے لگے۔ بلیک گائیڈ ہمیں تھوڑے سے کام کے عوض بھی کتنا بھاری معاوضہ دیتا ہے۔"

"یہ شخص بلیک گائیڈ سے بھی زیادہ بھاری معاوضہ دیتا ہے اور مجھے دوستوں کی طرح رکھتا ہے۔ اس کا رویّہ میرے ساتھ حاکمانہ نہیں بلکہ دوستانہ ہے۔ بلیک گائیڈ بیشک ہمیں دولت دیتا تھا، عیش کے ساتھ زندگی گزارنے کی سہولتیں فراہم کرتا تھا اور ہمیں اسی چیز سے غرض ہے۔ یہ نیا باس بھی مجھے وہی کچھ دیتا ہے جس سے میں بڑے عیش و آرام کی زندگی گزار رہا ہوں اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہاں مجھے ذہنی سکون میسّر ہے۔ جبکہ بلیک گائیڈ کے ساتھ کام کرتے ہوئے ہر دم پکڑے جانے کا خوف طاری رہتا تھا۔ ساتھ ہی جان کا خطرہ بھی رہتا تھا۔ میری مانو تو تم بھی بلیک گائیڈ کو چھوڑ کر اس نئے باس کے پاس آجاؤ۔"

"اس شخص کی ماتحتی میں مجھے کیا فائدہ مل جائے گا؟" چیتل کے چہرے پر اب تک خفگی کے آثار تھے۔ اُسے اپنے بھائی کا یہ اقدام قطعی پسند نہیں آیا تھا۔

"وہی فائدہ جو ہمیں بلیک گائیڈ کے ماتحت رہ کر کام کرنے میں ملتا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ ـــ یہ اپنا باس بڑا مَن موجی آدمی ہے۔ اس کے ساتھ رہ کر ہمیں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ بلیک گائیڈ ہمیں پیسہ ہی تو دیتا تھا، وہ تمہیں اس سے بھی مل جائیں گے۔ دولت کے سوا تحفظ بھی۔ یہ بلیک گائیڈ کی طرح اتنا کمینہ نہیں ہے کہ اپنے فائدے کے لئے ہماری جانیں بھی داؤ پر لگا دے۔ مجھے اس کا بہت تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ اگر میرا باس میری جان نہ بچاتا تو آج تم اپنے بھائی کو زندہ نہ پاتے۔ جب تمہیں سب کچھ اس باس کے ساتھ کام کر کے مل سکتا ہے تو پھر تمہیں اس کے پاس آنے میں کیا اعتراض ہے؟"

شیتل کی بات سن کر چیتل سوچ میں پڑ گیا۔ میں گاڑی چلاتے ہوئے چیتل کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ وہ بھائی کی باتوں سے قائل ہو گیا تھا اور اس پیشکش میں اُسے زیادہ فائدے نظر آرہے تھے۔ اُس نے اچھی طرح اس پیشکش پر غور کرنے کے بعد اشاروں میں شیتل کو اپنی رضامندی دے دی۔ دونوں کے سیاہ چہروں پر آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی اور میں گنگنانے لگا۔

"دُنیا مطلب دی او یار۔"

کار تیزی سے پنڈی کی طرف بھاگی جا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا۔ ان دو مضبوط پہاڑوں کے تعاون سے میں بیل منڈو سے نمٹ سکتا ہوں۔ لیکن چیتل اور شیتل کو ساتھ لے کر بیل منڈو سے ٹکرانے میں یہ خطرہ تھا کہ ماسٹر یوشنے، بیل منڈو کی سوچ کے ذریعے چیتل اور شیتل کے ذہنوں تک بھی پہنچ جاتا۔ اس لئے کہ کسی کے ذہن تک پہنچنے کے لئے زبان اور آنکھیں ہی سب سے بڑا واسطہ ہوتی ہیں۔ اس کے لئے میرے ذہن میں فوراً ہی یہ خیال آیا کہ میں اپنی طرح چیتل اور شیتل کی آنکھوں میں لینس لگا دوں گا۔ آواز کے ذریعے ان تک پہنچنا ناممکن تھا، اس لئے کہ دونوں ہی گونگے تھے۔

میری گاڑی جس وقت مقررہ مقام پر پہنچی تو شام کے سُرمئی اندھیرے دھیرے دھیرے پہاڑ کی چوٹیوں سے نیچے اُتر رہے تھے اور شفق کی سُرخی آسمان پر پھیلی پڑی تھی۔ اب کار کو کسی محفوظ جگہ پر کھڑی کرنے کا مسئلہ تھا۔ ڈاک بنگلہ بہت نشیب میں تھا۔ کسی گاڑی کا وہاں جانا ناممکن تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ اسی لمحے میں نے دیکھا ایک مقامی دیہاتی پیٹھ پر لکڑیاں لادے اسی طرف آرہا تھا۔ وہ قریب آیا تو میں نے آواز دے کر اُسے اپنے پاس بلایا۔ وہ میری آواز سن کر تیز تیز قدم اُٹھاتا کار کے پاس آگیا۔ اُس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"بابا! کوئی ایسی محفوظ جگہ ہے جہاں میں اپنی کار کھڑی کر سکوں؟"

"ہاں صاحب! ہے۔ ذرا آگے جا کر اُلٹے ہاتھ کو مُڑ جائے گا۔ تھوڑی دُور پر آپ کو ایک گیراج نظر آئے گا۔ یہ گیراج آپ ہی جیسے سیر کو آنے والے لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے۔ اُدھر فلم کے لوگ بھی آئے ہوئے ہیں، اُن کی گاڑیاں بھی وہیں کھڑی ہیں۔ گیراج کا چوکیدار سب گاڑیوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔"

میں نے جیب سے دس کا ایک نوٹ نکال کر دیہاتی کو دیا اور اُس کے بتائے ہوئے راستے پر گاڑی چلانے لگا۔ چند ہی منٹ بعد گیراج نظر آگیا۔ وہاں اور بھی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں فلم یونٹ والوں کی گاڑی بھی کھڑی تھی۔ جسے دیکھ کر میں جان گیا کہ وہ لوگ شوٹنگ سے واپس آگئے ہیں۔ میں نے سوچا موقع ملتے ہی میں میک اَپ مَین سے آئی لینس کی بات کروں گا۔ چیتل اور شیتل کی آنکھوں کے لئے دو جوڑے آئی لینس درکار تھے جس کے لئے مجھے یقین تھا کہ میک اَپ مَین کو بھاری رقم ادا کر کے مل جائیں گے۔ مگر گاڑی گیراج میں کھڑی کر کے میں چیتل اور شیتل کو ہمراہ لئے نشیب میں جانے لگا تو بہت دُور ڈاک بنگلے کے قریب میں نے دیکھا کہ بوڑھا پروڈیوسر، میک اَپ مَین کو کسی بات پر ڈانٹ رہا ہے۔ میں ٹھٹک کر اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اِک دَم مجھے آئی لینس کا خیال آیا۔ میں حقیقت معلوم کرنے کے لئے پروڈیوسر کے ذہن میں جھانکنے

لگا۔ میرا خیال درست ثابت ہوا۔ پروڈیوسر میک اَپ مین کو ڈانٹتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تمہاری لاپرواہی کی وجہ سے اتنا قیمتی آئی لینس غائب ہو گیا۔ میں اس کی قیمت تمہاری تنخواہ سے کاٹوں گا۔ یہی تمہاری سزا ہے۔"

میک اَپ مَین نے سر جھکا کر کہا۔ "آئندہ احتیاط رکھوں گا صاحب۔"

"نہیں۔ اب میں تم پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ اگر بقیہ آئی لینس بھی غائب ہو گئے تو ہم شوٹنگ کس طرح کر سکیں گے؟ لاؤ آئی لینس کا ڈبّہ نکال کر مجھے دو۔ تم جیسے غیر ذمے دار شخص کے پاس اتنی قیمتی اور اہم چیز چھوڑنا سراسر بے وقوفی ہے، گدھے کہیں کے....."

میک اَپ مَین نے آئی لینس کا ڈبّہ اٹیچی سے نکال کر پروڈیوسر کے حوالے کر دیا۔ وہ بکتا جھکتا گالیاں دیتا ڈاک بنگلے کے اندر جانے لگا۔

میں نشیب کی طرف جاتے ہوئے فکرمندی سے سوچنے لگا کہ آئی لینس میرے لئے بہت اہم چیز ہے۔ اس کے بغیر میں چیتل اور شیتل کو لے کر بیل منڈو کے مقابل نہیں جا سکتا۔ اتنا بڑا خطرہ میں کسی صورت میں بھی مول لینے کو تیار نہ تھا۔ چلنے کے ساتھ ساتھ میں اس پہلو پر بھی غور کرتا جا رہا تھا کہ ایسی کیا صورت ہو سکتی ہے جس سے مجھے دو جوڑے آئی لینس مل جائیں۔ ان کے بغیر گویا میرے ہاتھ پیر کٹ گئے تھے۔ اسی مسئلے میں اُلجھا میں اُس درخت کے پاس پہنچ گیا جہاں میں نے دوپہر کو اطمینان سے بیٹھ کر میک اَپ کیا تھا۔ چیتل اور شیتل وہیں قریبی پتھروں پر بیٹھ گئے اور میں میک اَپ اُتارنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچتا رہا کہ آئی لینس حاصل کرنے کے لئے کیا ترکیب کرنی چاہیئے۔ پروڈیوسر سے انہیں خریدنے کی بات کرنا فضول سی چیز تھی۔ اُس کی فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی جس کے لئے آئی لینس ضروری آئیٹم میں شامل تھا۔ میں کتنے ہی بھاری معاوضے کی پیشکش کرتا، وہ راضی نہ ہوتا۔ کیونکہ فلمبندی کے دوران آئی لینس استعمال ہونے تھے۔ بغیر اس کے شوٹنگ نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ہی وہ بروقت دوسرے آئی لینسز کا انتظام کر سکتا تھا۔ اس پہلو پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد میں نے سوچا چیتل اور شیتل کی مدد سے انہیں چوری کروا لوں۔

گو کہ یہ ایک غیر اخلاقی فعل ہے۔ مگر حالات کبھی کبھی انسان کو ایسے کام بھی کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں جن کے لئے خود اس کا ضمیر بھی گوارا نہیں کرتا۔ مگر مجبوری تھی اس کے سوا چارہ بھی تو نہ تھا۔ چوری کا منصوبہ بنانے کے بعد میں اطمینان سے بیٹھ کر میک اَپ اُتارنے لگا۔ پھر اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ شیتل پھوپھی جان سے کہہ کر آیا تھا کہ وہ تھوڑی دیر میں واپس آجائے گا اور آئی لینسز چوری کروانے کے لئے اسے رات بھر روکنا ضروری تھا۔ ایسی صورت میں پھوپھی جان بہت پریشان ہو جاتیں۔ چنانچہ یہ بتانے کے لئے کہ شیتل میرے پاس ہے، میں نے پھوپھی جان کے دماغ پر دستک دی۔ اس وقت وہ باورچی خانے میں رات کا کھانا تیار کر رہی تھیں۔ میری مخصوص دستک پر وہ چونک گئیں۔ پھر خوش ہو کر کہنے لگیں۔

"فرہاد! میرے بیٹے تم ہو؟"

"ہاں پھوپھی جان! آپ کا نالائق بیٹا آپ سے مخاطب ہے۔ آپ لوگ خیریت سے تو ہیں نا؟"

"اللہ کا شکر ہے بیٹے! تم تو ٹھیک ہو؟"

"آپ کی دُعا ہے پھوپھی جان! میں نے یہ بتلانے کے لئے آپ سے رابطہ قائم کیا ہے کہ شیتل میرے پاس ہے، رات کو میرے ساتھ ہی رہے گا۔ میں نے سوچا آپ کو بتا دوں ورنہ اس کی غیر حاضری سے آپ پریشان ہوں گی۔"

"یہ تو اچھا کیا کہ بتا دیا مگر تم ہو کہاں اور شیتل کو کیوں بلایا ہے؟"

"میں آپ لوگوں سے زیادہ دُور نہیں ہوں اور شیتل کو میں نے ایک ضروری کام سے روک لیا ہے۔"

"تمہارے یہ ضروری کام تو ایک دن تمہیں لے ڈوبیں گے۔ کن بکھیڑوں میں پڑ گئے ہو۔ بیٹا ـــ میں تو کہتی ہوں سارے اُوٹ پٹانگ دھندے چھوڑ کر گھر بسانے کی فکر کرو۔"

"اتنی جلدی کیا ہے پھوپھی جان!" میں نے انہیں چھیڑا اور وہ بھڑک اٹھیں۔

"اے بیٹا! اسے تم جلدی کہتے ہو۔ تمہاری عمر کے لڑکے تو اب تین تین چار چار بچّوں کے باپ ہیں۔ تم بھی اگر میرے کہنے سے شادی کر لیتے تو خیر سے آج کو دو بچّوں کے باپ تو ضرور......"

وہ غصّے سے بڑبڑاتی رہیں اور میں نے ہنستے ہوئے ان سے رابطہ ختم کر دیا۔ میں میک اَپ اُتار چکا تھا۔ تمام سامان میں نے اٹیچی میں رکھا اور اشارے سے شیتل اور چیتل کو قریب بلایا۔ شیتل مجھے اصلی رُوپ میں دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ کا جواب میں نے بھی مسکراہٹ سے دیا۔ پھر انہیں اشاروں کی زبان میں سمجھانے لگا کہ ایک آدمی کے پاس سے آئی لینسز چوری کرنے ہیں۔ وہ آئی لینسز اُس آدمی کے پاس ہیں جو میری طرح ڈاک بنگلے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ چوری ڈھائی بجے رات کو کرنا تاکہ اس وقت تک سب گہری نیند سو رہے ہوں اور اپنے چہروں پر رُومال کا نقاب ڈال لینا۔

انہیں سارا منصوبہ اچھی طرح سمجھانے کے بعد میں اٹیچی اُٹھا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ چیتل اور شیتل دوبارہ اپنی جگہ پہ چلے گئے اور اپنی مادری زبان یعنی اشاروں میں باتیں کرنے لگے۔ یہ دُنیا کی سب سے نرالی مادری زبان ہے، یہ سوچ کر میں مسکرا دیا اور اٹیچی تھامے وہاں سے چل پڑا۔ سلونی شام کا نکھرا ہوا حُسن چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ میں قدم روک کر اپنے اِردگرد کے خوبصورت مناظر کو دیکھنے لگا۔ ہر طرف رعنائی تھی، حُسن تھا، خاموشی تھی، نکھار تھا اور ایسے سمے دُنیا بیحد حسین نظر آرہی تھی۔ اُونچے اُونچے بلند و بالا پہاڑ، بڑے بڑے سبز پتوں والے تناور درخت،

رنگ برنگے جنگلی پھول، اپنے اپنے بسیروں کی جانب پرواز کرتے پنکھ پکھیرو، یہ سب بجید سحر انگیز چیزیں تھیں جو دل میں طمانیت پیدا کر رہی تھیں۔ ایک مقدس اور الوہی خوشبو میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور میں جو ہر وقت ہنگاموں میں گھرا رہتا تھا، دیر تک ایک جگہ کھڑا فطرت کی رعنائی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اچانک ہی میری نظر شاداں پر پڑی جو اپنی بھیڑ کو پتلی سی چھڑی سے ہانکتی اپنی جھونپڑی کی طرف جا رہی تھی۔ نہ جانے کس جذبے کے تحت بے اختیار ہو کر میں نے اُسے آواز دی۔

"شاداں......"

وہ میری آواز سُن کر چونک کر پلٹی اور اونچے نیچے پتھروں پر بھاگتی آئی اور بے اختیار میرے کشادہ سینے سے لگ گئی۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب سی ہو گئیں۔ رگوں میں دوڑتا خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔

"شاداں..." میں نے جھک کر مدھم سی سرگوشی کی۔ اُس نے میرے سینے سے ... میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ خوشی کا پرتو اُس کے گلابی چہرے سے جھلک رہا تھا اور مدھم سے اندھیرے میں وہ پلکیں جھپکاتی ہوئی مجھے بیحد پیاری لگی۔ وہ میرے گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شکوہ کرنے لگی۔

"تم کہاں چلے گئے تھے بابو؟ میں تمام دن تمہیں ڈھونڈتی رہی۔"

"پر کیوں ڈھونڈ رہی تھیں؟"

"پتہ نہیں۔" وہ شرگیں لہجے میں بولی اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ دیر تک اس کی ہنسی کا جلترنگ پہاڑوں میں گونجتا رہا۔ کلی سے پھول بن رہی ... تھی۔

"شاداں! تُو بڑی اچھی ہے۔" میں نے خمار آلود لہجے میں سرگوشی کی۔ میری آواز فرطِ جذبات سے لرزاں اور سرشار تھی۔ اس کی آنکھوں سے شرم کا گلابی پن جھلکنے لگا۔

وہ اُلجھی اُلجھی سانسوں کے درمیان کانپتی آواز میں دھیرے سے بولی۔

"ایسا نہ کر بابو! مجھے پتہ نہیں کیا ہونے لگتا ہے۔"

"کیا ہونے لگتا ہے؟" میں شرارت سے مسکرایا۔

"پتہ نہیں......"

"یہ سب کیا تجھے اچھا نہیں لگتا؟"

"ناں۔" وہ ہنستی ہوئی خود کو چھڑا کر دُور جا کھڑی ہوئی۔ اس کا یہ انداز کتنا دلکش تھا۔ اس انکار میں اقرار کے کتنے پہلو روشن تھے۔ میرے دل میں شمعیں سی جل اُٹھیں۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"کل صبح تکیے کے نیچے روپے دیکھنے آئے گی نا؟"

میری بات کی تہہ تک پہنچ کر شرم سے اس کے گلابی گال تمتما اُٹھے۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ اثبات میں سر ہلا کر ہنستی ہوئی شرما کر بھاگ گئی۔ اس کی ہنسی کا ترنم دیر تک فضا میں گونجتا رہا اور میں خوشی کے سرمدی جذبے سے سرشار دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ڈاک بنگلے کی طرف جانے لگا۔

میں ڈاک بنگلے میں پہنچا تو میرے بستر پر بوڑھا میک اپ مین پچھلی رات کی نیند پوری کر رہا تھا۔ میں نے اپنچی میز پر رکھ دی اور ایزی چیئر پر بیٹھ کر سگریٹ سُلگانے لگا۔ سگریٹ سُلگانے کے بعد میں رُوما کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ وہ ہوٹل انٹرکان کے اُس کمرے میں پہنچ گئی تھی جہاں بیل منڈو کا قیام تھا۔ اس وقت اُس کا انکل کمرے میں نہیں تھا اور وہ بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس نے دو ایک ایسے فون نمبر پر اُسے کال کیا جہاں اُس کے ملنے کا امکان تھا لیکن وہ ان نمبروں پر بھی نہیں ملا۔ وہ جھنجلا کر اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگی۔ وہ اپنے انکل کو یہ بتانے کے لئے بے چین تھی کہ اس کا سامنا ایک کے بجائے دو گونگوں سے ہوا تھا اور ان میں سے ایک یقینی طور پر فرہاد تھا۔

وہ ٹہلنے کے دوران سگریٹ کے کش لگاتی جا رہی تھی۔ اسی وقت مجھے اُس کے ذہن میں ماسٹر یوشے کی سوچ کا لہجہ سُنائی دیا۔ اُس نے رُوما کے ذہن پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

"ہیلو بے بی! میں نے تمہاری پریشانیوں کو سمجھ لیا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ ان دو گونگوں سے کہاں ملاقات ہوئی تھی؟"

رُوما چند لمحوں تک ساکت کھڑی رہی۔ اپنے ذہن میں اُبھرنے والی سوچ کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پھر اس نے پوچھا۔

"کیا تم وہی شیطان ہو جو میرے انکل کو پریشان کرتا رہتا ہے؟"

"ہاں میں وہی ہوں مگر شیطان نہیں ہوں مجھے ماسٹر کہو تم جانتی ہو ماسٹر آقا کو کہتے ہیں۔ میں آقا ہوں اور تم سب میرے غلام اور کنیزیں ہو میرے حکم سے انکار کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے یہ تم دیکھ چکی ہو۔ میں تمہارے انکل کی طرح تمہیں بھی ذہنی اذیتوں میں مبتلا کر سکتا ہوں۔ تم حسین ہو کم سن ہو تمہاری طرح میری بھی ایک بیٹی ہے۔ اس لئے میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ تم ایک اچھی بچی کی طرح میری باتوں کا جواب دیتی رہو۔"

رُوما بارہا اپنے انکل کو پاگل ہوتے دیکھ چکی تھی اور خود پاگل نہیں بننا چاہتی تھی۔ وہ خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور سوچ کے ذریعے اُسے بتانے لگی کہ کس طرح مری سے واپسی پر اس کے دونوں باڈی گارڈ آپس میں لڑ پڑے تھے۔ ایک باڈی گارڈ نے دوسرے کو ختم کر دیا پھر ایک گونگے نے وہاں پہنچ کر دوسرے باڈی گارڈ کو ختم کر دیا اس کے بعد پھر ایک گونگا کہیں سے آ پہنچا۔ رُوما نے خیال ظاہر کیا کہ بعد میں آنے والا گونگا فرہاد ہو گا یہ پوری رپورٹ سننے کے بعد ماسٹر یوشے نے کہا۔

"بے بی تم بہت اچھی ہو۔ اس واقعہ سے میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی ہے کہ فرہاد علی تم لوگوں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہیں آس پاس کے قریبی علاقے میں کہیں چھپا ہوا ہے اب تم آرام کرو میں تمہارے انکل سے رابطہ قائم کرتا ہوں۔"

ماسٹر یوشے نے اس سے رابطہ ختم کر دیا لیکن میں اس شیطان کی سوچ سے چپکا ہوا تھا۔ اگر میں اس کی سوچ میں مداخلت کرتا تو پکڑا جاتا لیکن میں اس کے دماغ کے اندھیرے میں چپ چاپ کھڑا ہوا تھا اِس اندھیرے میں ایک ٹیلی پیتھی جاننے والا دوسرے ٹیلی پیتھی جاننے والے کو پکڑ نہیں سکتا یہی وجہ ہے کہ وہ اب تک میری اصلیت کو نہیں سمجھ سکا تھا

ماسٹر یوشے اس وقت تک بیل منڈو کے ذہن تک پہنچ چکا تھا اور اسے تمام واقعات بتا رہا تھا کہ کس طرح دو گونگے رُوما کے سامنے آ چکے ہیں اور اس کے دو باڈی گارڈ کسی ویرانے میں مردہ پڑے ہیں یہ سنتے ہی بیل منڈو بُری طرح جھنجلا گیا اور ماسٹر یوشے کو بُرا بھلا کہنے لگا کہ اس کی وجہ سے اس کے آدمی بھی مارے جا رہے ہیں اور اس کے اسمگلنگ کے کاروبار کو نقصان پہنچ رہا ہے ماسٹر یوشے نے کہا۔

"یہ سب میری وجہ سے نہیں ہو رہا ہے یہ تمہاری نالائقی ہے فرہاد تمہارے بالکل قریب ہے اور تم اسے پکڑنے میں ناکام ہوتے جا رہے ہو اب تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ رُوما کو جہاں دو گونگے نظر آئے تھے وہاں صرف ایک ہی پہاڑی راستہ ہے اس راستے کے اطراف جتنی چھوٹی بڑی آبادیاں ہیں وہاں اپنے تمام آدمی پھیلا دو۔ بولتی ہوئی آبادی میں بے زبان گونگے جلد ہی نظر آ جائیں گے۔ تم خوامخواہ جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو کر وقت ضائع نہ کرو اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ تم جلد ہی اس کے گریبان تک پہنچ جاؤ گے۔"

بیل منڈو اس کی ہدایت کے مطابق اپنے ماتحتوں کو کال کرنے لگا تاکہ ان کے ساتھ خود بھی میری تلاش میں روانہ ہو جائے میں بدستور ماسٹر یوشے کے ذہن سے چپکا ہوا تھا یہ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ وہ میری وجہ سے بہت زیادہ پریشان ہے وہ میرے ہی متعلق سوچ رہا تھا کہ آخر میں کس قسم کا انسان ہوں اور انسان ہوں یا اس کی طرح شیطان ہوں۔ یقیناً وہ مجھے شیطان ہی سمجھ رہا تھا جو کئی دن سے اس نادیدہ شیطان کو حیرت میں ڈالے ہوئے تھا تھوڑی دیر بعد مجھے اس کے ذہن میں دوسری آواز سنائی دی۔ کوئی شخص کے سامنے آ کر اسے مخاطب کر رہا تھا۔

"ماسٹر یوشے۔ فرہاد کا کچھ پتہ چلا میں آخر کب تک انتظار کرتا رہوں گا؟"

ماسٹر یوشے کا جواب سنائی دیا۔

"ماسٹر دانیال۔ آپ آج رات تک اور صبر کر لیں مجھے یقین ہے صبح ہونے سے پہلے فرہاد کی کھوپڑی میری گرفت میں آ جائے گی۔"

"تم روز یہی تسلی دیتے ہو۔ میرے دن رات کا سکون برباد ہو چکا ہے میری جوان بیٹی کا قاتل آسانی سے گھوم رہا ہے۔ تم اس حقیقت کا اعتراف کیوں نہیں کرتے کہ ایک معمولی قاتل کے سامنے تمہاری ٹیلی پیتھی کی صلاحیتیں زنگ آلود ہو چکی ہیں۔"

"ماسٹر دانیال اس ... میں جو سب سے بلند چیز ہے۔ وہ انسانی دماغ ہے اور میں ایسا آدمی ہوں کہ دنیا کے تمام دماغوں سے کھلونوں کی طرح کھیلتا ہوں اور جو دماغ مجھے اتنے دنوں سے چکر دے رہا ہے اسے معمولی قاتل کہتے ہو۔ تم نہیں سمجھ سکتے کہ اس بہروپئے فرہاد سے اُلجھتے ہوئے مجھے کتنا مزہ آ رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ ابھی اس کا پلہ بھاری ہے۔ مگر کب تک؟ آج میں بیل منڈو کو آخری موقع دے رہا ہوں۔ اگر وہ ناکام ہو گیا تو میں خود میدانِ عمل میں آؤں گا۔ مجھے ہیڈ کوارٹر چھوڑ کر کچھ دنوں کے لئے اس کے ملک میں جانا ہو گا یہ بات میری سمجھ میں آ رہی ہے کہ وہ میرے کسی آلۂ کار کے ذریعے قابو نہیں آئے گا۔"

اس نے انجلا کے باپ ماسٹر دانیال کو مطمئن کر دیا کہ وہ اس کی بیٹی کے قاتل کو ضرور گرفتار کرے گا۔ میرے لئے ایک مصیبت کی پیشگوئی ہو چکی تھی کہ بیل منڈو کی ناکامی کے بعد وہ خود میدانِ عمل میں آئے گا۔ یعنی میری یہ خوش فہمی ختم ہو چکی تھی کہ اس کمبخت خطرناک آلۂ کار بیل منڈو کو ختم کرنے کے بعد کچھ عرصہ کے لئے پُرسکون زندگی نصیب ہو گی فی الحال مجھے بیل منڈو اور اس کے آدمیوں سے نمٹنا تھا وہ مری اور پنڈی کے درمیان تمام علاقوں میں شکاری کتوں کی طرح مجھے سونگھتے پھر رہے تھے اور آج رات یا کل صبح تک کسی وقت بھی وہ یہاں پہنچ سکتے تھے۔ مجھے جلد از جلد شیتل اور چیتل کو ان کے مقابلے کے لئے تیار کرنا تھا۔ اس وقت ڈاک بنگلے میں خاصی چہل پہل تھی۔ فلم یونٹ کے لوگ رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ ڈائریکٹر اور پروڈیوسر ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے شراب پی رہے تھے ان کے ساتھ ہیروئن کا نام نہاد بھائی بھی پینے میں مصروف تھا۔

میں ان کی سوچ کے ذریعے یہ کوشش کرنے لگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ پیتے رہیں اور نشے میں بالکل مدہوش ہو جائیں اس وقت بوڑھا چوکیدار میرے لئے کھانا لے آیا تھا۔ میں کھانا کھانے کے دوران سوچنے لگا کہ اب شاداں سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ اسے چھوڑ کر چلا جاؤں ابھی جب وہ مجھ سے رخصت ہو کر گئی تھی تو اس کی آنکھوں سے پیاسی آرزوؤں کے کتنے رنگ جھلک رہے تھے اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

"تم کہاں چلے گئے تھے میں پیاسی چڑیا کی طرح اپنے آشیانے سے تمہارے ڈاک بنگلے تک بھٹکتی پھر رہی تھی صدیوں سے کہر آلود بادل ان پہاڑوں کے اندر سلگنے والی آگ کو نہ بجھا سکے تم ایک رات میں کیسے بجھا سکتے ہو۔ رک جاؤ میرے مسافر۔ نہ جاؤ، نہ جاؤ......"

میں اس کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا اسے چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا میں نے دل کو سمجھایا۔ پہلے کام پھر آرام بیل منڈو سے نمٹنے کے بعد میں پھر شاداں سے ملوں گا۔ میں نے کھانا کھانے کے بعد بوڑھے چوکیدار سے کہا۔

"بابا۔ میرا کوئی ٹھیک نہیں ہے کہ میں کس وقت یہاں سے چلا جاؤں

میں پھر واپس آسکتا ہوں لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ واپسی کب تک ہوگی۔ اگر جانے سے پہلے میں تمہارے کچھ کام آنا چاہوں تو کیا تم انکار کرو گے۔؟"

"بابو آپ نے یہاں رہنے اور کھانے کے اتنے پیسے دیئے ہیں کہ آج تک کسی نے نہیں دیئے۔ آپ اس سے زیادہ اور کیا کام آسکتے ہیں میں شرمندہ ہوں کہ میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکا۔"

میں نے کہا "تمہاری ایک جوان بیٹی ہے تمہیں یقیناً اس کی شادی کی فکر ہوگی۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں کتنا دولت مند ہوں۔ اگر میں دو چار ہزار تمہاری بیٹی کی شادی کے لئے دے دوں تب بھی میرے خزانے میں ایک پیسے کی کمی نہیں آئے گی۔"

یہ کہہ کر میں نے اٹیچی کھولی اور اس میں سے تین ہزار روپے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے اتنے روپے دیکھ کر وہ خوشی سے کانپنے لگا۔

"بابو میں نے آج تک ایسا ایک آدمی بھی نہیں دیکھا جو بغیر کسی غرض یا مطلب کے اتنی بڑی رقم دے دے۔ آپ انسان نہیں فرشتہ ہیں۔"

اس کی زبان سے یہ باتیں سن کر مجھے ندامت سی محسوس ہوئی میں اس بوڑھے کو کیسے سمجھاتا کہ بغیر مطلب کے اس دنیا میں کوئی کسی کے کام نہیں آتا اس دنیا میں طرح طرح کے انسان اور رنگا رنگ جذبوں کا میلہ لگا ہوا ہے۔ اس میلے میں ایک جوانی دوسری جوانی سے کیسے ٹکرا جاتی ہے۔ تہذیب کے خلاف منہ زور جذبے کس طرح بہا کرلے جاتے ہیں۔ میں ان باتوں کی تشریح نہیں کر سکتا۔ انسان زندگی کے راستوں پر تمام پابندیوں کو توڑتا ہوا اس دنیا سے گذر جاتا ہے۔ میں بھی اپنی زندگی کے ایک ایک موڑ سے اسی طرح گذرتا جا رہا تھا۔

بوڑھا چوکیدار روپے لے کر بہت دیر تک مجھے دعائیں دیتا رہا۔ اس کے بعد چلا گیا میں پھر ایک سگریٹ سلگا کر ایزی چیئر پر بیٹھ گیا اور اس وقت کا انتظار کرنے لگا جب فلم یونٹ کے تمام لوگ سو جاتے اور آئی لینز حاصل کرنے کے لئے میں اپنا کام دکھا سکتا۔ میں آدھی رات تک شیتل اور جیتل کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ کمرے کے باہر ابھرنے والی قدموں کی چاپ سے میں نے اندازہ لگایا۔ ابھی کچھ لوگ جاگ رہے تھے مجھے ان کے سو جانے کا انتظار تھا۔ میں نے وقت گذاری کے لئے سگریٹ سلگایا اور ایزی چیئر سے ٹیک کر آنکھیں موند لیں اور ان فتنہ خیز لمحات کے تصور میں ہی لطف اندوز ہونے لگا جو میں نے شاداں کے سنگ گذارے تھے۔ پربتوں کی اس بیٹی نے مجھے نئی لذتوں سے آشنا کیا تھا میری زندگی میں کتنی ہی لڑکیاں آئی تھیں مگر شاداں ان سب سے بالکل مختلف تھی بہت معصوم سادہ اور پرخلوص اس غرض کی ماری دنیا میں اس نے مجھے ہر غرض سے ماورا ہو کر چاہا تھا۔ اس کے ساتھ گذارے ہوئے چند لمحات صدیوں کی رفاقت کا احساس دلانے پر تل گئے مگر میری زندگی ہنگاموں سے بھرپور تھی میں اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتا تھا۔ ایسے ہنگاموں سے پُر زندگی میں بھلا میں کس طرح شاداں کو شامل کر لیتا۔ اسے چھوڑ کر جانے کے خیال سے مجھے بے حد دکھ ہو رہا تھا۔ مگر میں کتنا مجبور تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور شاداں کے ذہن میں جھانکنے لگا۔

وہ میرے ہی متعلق سوچ رہی تھی اس کا بابا خوشی سے لرزتی آواز میں اس سے کہہ رہا تھا۔

"شاداں بابو بڑا اچھا آدمی ہے اس نے مجھے ڈھیر سارے روپے دیئے ہیں تاکہ میں خوب دھوم دھام سے تیری شادی کر سکوں۔ وہ رات کو کسی وقت چلا جائے گا۔"

یہ سن کر شاداں کے دل پر بجلی سی گر پڑی اس کا معصوم چہرہ مایوسیت کی تاریکی میں ڈوب گیا اس کا بابا جانے کیا کچھ کہتا رہا۔ مگر اس نے کچھ نہ سنا اس کے ذہن میں سوچوں کے جھکڑ سے چل رہے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بستر پر جا کر گر گئی اس کا بابا میرے دیئے ہوئے روپوں کو ایک میلی سی تھیلی میں رکھ کر اسے چوری کے خطرے سے گھاس پھوس کی بنی چھت میں چھپا کر رکھ رہا تھا اور شاداں اپنے بستر پر لیٹی بازوؤں میں منہ چھپائے سسک رہی تھی۔ بابا روپے چھپا کر اس کی طرف مڑا اسے بستر پر لیٹا دیکھ کر کہنے لگا۔

"شاداں کیوں لیٹ گئی روٹی نہیں کھائے گی کیا۔؟"

شاداں کی آنسوؤں میں بھیگی آواز سنائی دی۔

"بابا میرا جی اچھا نہیں۔۔۔۔"

"شادی کا سن کر شرما گئی بابو نے اتنے ڈھیر سارے پیسے دیئے ہیں میں تیری شادی اتنی دھوم سے کروں گا کہ بستی میں آج تک کسی لڑکی کی شادی اتنی دھوم سے نہ ہوئی ہوگی۔ میں تیری شادی میں باجے والوں کو بھی بلواؤں گا۔"

"چپ کر جا بابا میں شادی نہیں کروں گی۔"

یہ سن کر اس کا بابا ہنس پڑا اور اٹھ کر اس کے بستر پر آگیا۔

"یہ سب لڑکیاں شرما کر یہی کہتی ہیں۔ پر بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ ایک نہ ایک دن انہیں بابل کا دوار چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔ بیٹی کسی غریب کی ہو یا کسی راجہ کی سب ہی ایک دن بیاہ کر پرائے دیس چلی جاتی ہیں۔"

شاداں کی سسکیوں کی آواز سن کر وہ پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"پگلی رو رہی ہے ارے ابھی سے ہی کاہے کا رونا دھونا تیرا بیاہ کوئی آج تھوڑا ہی ہو رہا ہے کیوں رو رو کر اپنی جان ہلکان کرتی ہے چل سو جا۔"

اس نے بستر کے کنارے پر رکھا کمبل اٹھا کر اس پر ڈال دیا اور چولہے کے پاس بیٹھ کر روٹی کھانے لگا۔ شاداں چپکے چپکے سسک رہی تھی اس کا ۔۔ روٹی کھا کر اپنے بستر پر لیٹ رہا شاداں اپنی سوچ میں مجھ سے گلہ

رہی تھی۔

"بابو تو بھی سارے شہری بابوؤں کی طرح ہرجائی نکلا بس تیرے اندر ۔۔کا اتنا ہی حوصلہ تھا تم شہری لوگ جب پیار نبھا نہیں سکتے تو پیار ۔۔نے کیوں ہو؟ بابو شاداں تو تیرے پیار میں ڈوب کر اتنا فاصلہ طے ۔۔ی ہے کہ واپس لوٹنا اس کے بس میں نہیں رہ گیا ہے۔ مجھے بیچ راہ ۔۔ا چھوڑ کر نہ جا بابو میرے پیار کی لاج رکھ لے۔ میں نے تو اپنا تن من ۔۔ب کچھ تجھ پر لٹا دیا ہے سب کچھ لٹا کر اب میں کیسے جیوں بابو۔؟"

وہ رو رہی تھی اور میرا دل مسلا جا رہا تھا میرے سینے پر دکھ کی ۔۔اری سل آ گری۔ شاداں سے جدائی کا تصور میرے لئے بھی بڑا روح فرسا ۔۔کاش ہنگامے مجھے اتنی مہلت دے دیتے کہ میں شاداں کو اپنی زندگی ۔۔ں شامل کر سکتا۔ لیکن اگر انسان کی ساری خواہشیں پوری ہونے لگیں تو وہ ۔۔شکوہ گذار کیوں کہلائے۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر گھڑی دیکھی بارہ ۔۔بج کر ۲۵ منٹ ہو چکے تھے۔ خیالات میں کھو کر مجھے احساس ہی نہ ہوا کہ ۔۔نا وقت بیت گیا۔

اب میرے کام کا وقت آگیا تھا۔ میں نے احتیاط کے طور پر بوڑھے ۔۔پروڈیوسر کے ذہن میں جھانکا وہ شراب کے نشے میں مست گہری نیند ۔۔سو رہا تھا میں نے اطمینان کا سانس لیا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر دبے ۔۔پاؤں پروڈیوسر کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ دروازے کے پٹ بند ۔۔تھے مگر دروازہ لاک نہیں تھا۔ میں بہت آہستگی سے اندر چلا گیا۔ کمرے میں ۔۔لالٹین روشن تھی۔ اس کی ہلکی سی روشنی میں میں نے کمرے کا جائزہ لیا شراب ۔۔کی بوتلیں میز پر خالی پڑی تھیں مختلف پلیٹوں میں بھنے ہوئے گوشت ۔۔کباب اور تلی ہوئی مچھلی کے بچے کھچے ٹکڑے پڑے تھے اور پروڈیوسر کے ۔۔ہلکے خراٹے کمرے کی خاموش فضا میں مدھم سا ارتعاش پیدا کر رہے تھے ۔۔خراٹوں کی آواز نے مجھے مزید مطمئن کر دیا میں نے پروڈیوسر کے کرتے کی ۔۔جیب میں ہاتھ ڈال کر چابی کا گچھا نکال لیا اور کونے میں رکھی ہوئی اٹیچی ۔۔کا تالا کھولنے لگا ذرا ہی دیر بعد تالا کھل گیا۔ میں نے اٹیچی کا ڈھکنا اٹھایا اور ۔۔ت سے سامان میں سے آئی لینز کا ڈبہ ڈھونڈنے لگا تھوڑی سی تلاش ۔۔کے بعد مجھے ڈبہ مل گیا میں نے اس میں سے آئی لینز کے دو جوڑے نکال کر ۔۔اپنی جیب میں رکھے اور ڈبے کو دوبارہ اٹیچی میں رکھ کر اسے لاک کر دیا ۔۔چابیوں کا گچھا واپس بوڑھے پروڈیوسر کی جیب میں رکھا اور آہستہ سے جیب ۔۔تھپتھپاتا خاموش قدموں سے اپنے کمرے میں آگیا۔

کمرے میں آکر میں نے آئی لینز احتیاط سے اٹیچی میں رکھے میز پر ۔۔سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اٹھایا اور اٹیچی لے کر کمرے سے باہر آگیا ۔۔ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وادی کا ہر باسی نیند کے خمار میں ڈوبا ۔۔ہوا تھا اور ہر طرف سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے ڈاک بنگلے کے اپنے ۔۔کمرے میں رکھی ہوئی لالٹین اٹھائی ۔۔ ۔۔۔ اور نشیب میں آتر نے لگا ۔۔اس وقت شاداں مجھے شدت سے یاد آ رہی تھی اور میری خواہش تھی کہ جاتے جاتے اس سے مل جاؤں چنانچہ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آیا وہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے میں اس کے ذہن میں جھانکنے لگا اور یہ جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ وہ خود بھی مجھ سے ملنا چاہتی تھی اور باہر آنے کے لئے اپنے بابا سے بہانہ کر رہی تھی کہ اسے نیند نہیں آ رہی ہے وہ اپنی سکھی ریشماں کے پاس باتیں کرنے جا رہی ہے جلدی لوٹ آنے کی تاکید کر کے اس کے بابا نے اسے جانے کی اجازت دے دی وہ جھونپڑی سے نکل کر ڈاک بنگلے کی طرف آنے لگی میرے قدموں میں تیزی آگئی وہ ادھر ہی آ رہی تھی میرے ہاتھ میں لالٹین تھی جس کی روشنی دیکھ کر وہ ٹھٹک کر اپنی جگہ کھڑی ہو گئی میں نے لالٹین اونچی کی اور اپنے چہرے کے قریب کر لی روشنی میں میرا چہرہ اجاگر ہوا تو وہ مجھے پہچان کر دیوانہ وار بھاگتی ہوئی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی سسکیاں لیتے ہوئے شکوہ کرنے لگی۔

"بابو تو اپنی شاداں کو چھوڑ کر کیوں جا رہا ہے؟ وہ تیرے بنا مر جائے گی بابو مجھے چھوڑ کر نہ جا۔۔۔"

اس کی آواز میں سینکڑوں آنسوؤں کی نمی تھی اور اس کا گداز بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا میں اسے کسی عزیز متاع کی طرح اپنے بازوؤں میں سنبھالے ایک بڑے سے ہرے بھرے ٹیلے کی اوٹ میں آگیا میں سبزے کے فرش پر بیٹھ رہا اور اس کا سر پیار سے اپنے زانو پر رکھ لیا چاند کی سنہری کرنوں میں میں نے اس کے چہرے کو دیکھا جس پہ دکھ کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھی اور آنسوؤں کی ایک جھالر سی دراز پلکوں پر لرز رہی تھی۔ اس ایٹمی دور میں انسان کے دل سے محبت، خلوص اور سچائی کی قدریں مٹ گئی ہیں مگر یہ معصوم سی دیہاتی لڑکی کا پیار کتنا بے غرض اور پوتر ہے یہ سوچ کر مجھے اس پر ٹوٹ کر پیار آیا آنسوؤں کی لڑیاں اس کے رخساروں پر بہہ رہی تھیں۔ میں نے ان آنسوؤں کو اپنے ہونٹوں میں جذب کرتے ہوئے مدھم سی سرگوشی کی۔

"شاداں نہ رو تیرا بابو تیرے آنسو نہیں دیکھ سکتا۔"

اس نے چھلکتی آنکھیں اٹھا کر کانپتی آواز میں کہا۔

"تو بڑا ظالم ہے بابو اپنی شاداں کو چھوڑ کر جا رہا ہے۔"

"کیا کرو شاداں میرا دل تو نہیں چاہتا کہ تجھے چھوڑ کر جاؤں مگر یہاں میری جان کو خطرہ ہے اگر میں یہاں رہا تو شاید دشمن مجھے مار ڈالیں کیا تو یہ چاہے گی کہ کوئی تیرے بابو کو جان سے مار۔۔۔۔"

اس نے تڑپ کر میرے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"شاداں میرا انتظار کرنا میں ایک نہ ایک دن ضرور لوٹ آؤں گا اور شاداں اگر میرے آنے میں بہت دیر ہو جائے اور تیرا کوئی اچھا رشتہ آئے تو تو شادی کر لینا۔"

"میں جندگی بھر تیرا انتظار کروں گی بابو۔"

"نہیں شاداں زندگی اتنی سستی نہیں ہوتی کہ اسے انتظار کی بھینٹ

چڑھا دیا جائے میں نہ جانے کب لوٹ کر آؤں کہیں ایسا نہ ہو کر تیری جوانی انتظار کی نذر ہو جائے صرف تو ہی مجھے نہیں چاہتی شاداں میں بھی تجھ سے محبت کرنے لگا ہوں محبت جو ازلی اور ابدی جذبہ ہے جو پہلی اور آخری سچائی ہے میں اسی جذبے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ زندگی رہی تو کبھی نہ کبھی ضرور لوٹ کر تیرے پاس آؤں گا۔"

اسے تسلی دیتے ہوئے مجھے اپنے لہجے کے کھوکھلے پن کا شدید احساس ہوا ایک طرف زندگی اور اس کے فطری تقاضوں سے بھرپور حساس دل تھا اور دوسری طرف ہنگامے اور خطرات تھے جو اجازت نہ دیتے تھے کہ میں ان فطری تقاضوں کو پورا کر سکوں اس وقت مجھے اپنی بے بسی کا شدت سے احساس ہوا میرا دل چاہا سارے ہنگامے سارے خطرات دور بھاگ جائیں اور میں شاداں کی ریشمی زلفوں کی چھاؤں میں زندگی بتا دوں مگر حقیقتیں منہ پھاڑے مجھے نگلنے کو تیار بیٹھی تھیں۔

"بابو میں تجھے بہت یاد کروں گی۔"

اس کی آواز بہت مدھم تھی اور اس آواز میں عجیب سی اداسی دکھ اور اضطراب چھپا تھا

"میں بھی جہاں رہوں گا تجھے یاد کرتا رہوں گا شاداں وقت بہت تھوڑا ہے آ ان لمحات کو امر بنا لیں۔"

کچھ دیر بعد میں اٹیچی اور لالٹین اٹھا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اسی درخت کی طرف چل پڑا جہاں کل میں نے اپنا میک اپ کیا تھا اور پھر اتارا تھا وہاں پہنچ کر میں نے شیتل اور چیتل کو کال کیا۔ چند لمحے بعد وہ میرے سامنے تھے۔ میں نے انہیں اشاروں میں سمجھایا کہ میں آئی لینز لینے آیا ہوں اور اسے تم دونوں کی آنکھوں میں لگانا ہے میرا مطلب سمجھ کر دونوں میرے سامنے بیٹھ گئے میں نے اٹیچی کھولی اس میں سے آئی لینز نکالا اور ذرا سی کوشش کے بعد ان دونوں کی آنکھوں میں بڑی مہارت سے آئی لینز فٹ کر دیئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے لالٹین کی روشنی میں اپنا میک اپ کرنا شروع کیا پہلے چہرے پر ماسک چڑھایا پھر بوڑھے میک اپ مین کی دی ہوئی میک اپ کی چیزیں لگائیں اور اپنی آنکھوں پر بھی آئی لینز لگا لیے اب میرا باپ بھی مجھے دیکھتا تو نہ پہچان پاتا۔ شیتل اور چیتل یہ ساری کارگزاریاں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر تنقیدی نظروں سے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر تمام چیزیں دوبارہ اٹیچی میں رکھ کر تالا لگایا اور اٹیچی شیتل کو پکڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

لالٹین کی مدھم سی روشنی میں ہم تینوں بہت سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہے تھے ہماری ذرا سی غلطی ہمیں ہزاروں فٹ گہری کھائی میں دھکیل سکتی تھی۔ میں چلتا ہوا اس جگہ پر آیا جہاں چند منٹ پہلے شاداں سے [illegible] تھا تو اس خالی جگہ کو دیکھ کر مسکراہٹ خود بخود میرے لبوں پر آ گئی۔ شاداں کے تاثرات معلوم کرنے کے لئے اس کے ذہن میں جھانکا وہ بستر پر چت لیٹی سوچ رہی تھی۔

"بابو نے مجھے کس انوکھی لذت سے آشنا کیا ہے۔ میرے راستے قریب آیا اور اب چھوڑ کر جا رہا ہے یہ بیگانے بھی اپنا بن کر کتنا دکھ دیتے ہیں۔"

اور پھر اس کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ نکلی۔ ایک آہ نے میرے لبوں کو چھو لیا اور میں نے قدم تیز کر دیئے میں میک اپ میں تھا اس لئے میں نے لالٹین چوکیدار کے ہاتھ میں دینے کی بجائے ڈاک بنگلے کے برآمدے میں رکھ دینا زیادہ مناسب سمجھا چنانچہ میں نے لالٹین برآمدے میں رکھی اور اس طرف جانے لگا جہاں کار کھڑی تھی کچھ دور جا کر جھاڑیوں کے پیچھے سے مجھے کچھ دبی دبی سی آوازیں سنائی دیں، مگر الفاظ سمجھ میں نہ آئے کیونکہ جھاڑیاں خاصے فاصلے پر تھیں مجھے خطرے کا احساس ہوا اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ کون لوگ ہیں میں نے شبہ کے طور پر دشمن کے ذہن میں جھانکا میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہاں بیل منڈو اور کچھ اس کے ماتحت تھے۔ بیل منڈو کی سوچ سے پتہ چلا کہ اسے میرے یہاں ہونے کا کسی حد تک پتہ چل گیا ہے اور وہ اپنے ماتحتوں کو لے کر میری تلاش میں یہاں آ پہنچا ہے۔ ایک لمحے کی دیر کئے بغیر میں چیتل اور شیتل کے ساتھ ایک ٹیلے کے پیچھے آ گیا۔ وہاں چاندنی میں ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ میں ہاتھ کے اشاروں سے ان دونوں کو سمجھانے لگا کہ ہمیں وہاں سے منتشر ہو کر کس طرح فرداً فرداً دشمنوں سے نمٹنا ہے۔ اس کے بعد ایک ایسے شخص کو گھیرنا ہے جس کا سر مونڈا ہوا ہے۔ اس سر منڈے نے ان کی طرح مارشل آرٹ میں بلیک بیلٹ حاصل کیا ہے لہٰذا اس سے محتاط ہو کر مقابلہ کرنا ہوگا۔ تمام باتیں سمجھا کر میں ان سے الگ ہو گیا اور ٹیلے کے پیچھے سے گھٹنوں کے بل چلتا ہوا ادھر جانے لگا۔ جدھر بیل منڈو کی سوچ میری راہنمائی کر رہی تھی۔

رات کی اندھی آغوش میں بڑی دیر تک پراسرار خاموشی چھائی رہی۔ پھر اچانک ہی فائر کی آواز گونجی یہ سوچ کر میرا دل دھک سے رہ گیا کہ کہیں شیتل یا چیتل فائرنگ کی زد میں نہ آ گئے ہوں۔ میں نے فوراً ہی ان کے ذہن میں باری باری جھانک کر دیکھا۔ دونوں بخیریت تھے۔ اور اپنی اپنی جگہ ثابت قدمی سے دشمنوں کا کباڑا کر رہے تھے۔ پھر دوسری بار فائرنگ کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی بلندی سے چیختا ہوا اور نشیب کی طرف لڑھکتا ہوا میرے قریب سے گزر کر دور پستی میں چلا گیا۔ بہت دیر تک میرے دل میں یہ حسرت ہی رہ گئی کہ کوئی مجھ سے بھی آ کر ٹکراتا مگر دونوں گونگے بھائیوں نے کسی کو میرے قریب آنے کا موقعہ نہیں دیا۔ وہ ناگہانی مصیبتوں کی طرح ان کے سروں پر پہنچتے تھے۔ جوڈو اور کراٹے کا ہاتھ دکھاتے تھے۔ پھر دوسرے شکار کی تلاش میں دوسری طرف پلٹ جاتے تھے۔

[illegible] خاموشی اور [illegible] چھا گیا میں بیل منڈو کو اس کے دماغ سے سمجھ رہا تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟ وہ نشیب میں اترا ہوا اور اپنے ماتحتوں کو تلاش کرتا ہوا درختوں کے جھنڈ کی طرف جا رہا تھا۔ شیتل اور چیتل شکاری کتوں کی طرح اپنے شکار کو سونگھ لیتے تھے یا پھر انہوں نے چاندنی میں بیل منڈو کی مونڈی ہوئی چکنی کھوپڑی دیکھ لی تھی اسے دیکھتے ہی وہ دو مخالف سمتوں سے چھپتے چھپاتے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں بھی ادھر ہی جانے لگا۔

بیل منڈو ایک مقام پر پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ اس کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر اچانک ہی شیتل آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے لڑنے کے مختلف زاویے پیش کرتے ہوئے منہ سے کرخت آواز نکالی۔

"اوں۔ آں۔ آں۔ اوں اواں۔۔۔"

بیل منڈو نے فوراً ہی پینترا بدلتے ہوئے سوچا۔ "اچھا تو یہی فرہاد ہے۔ میرے سامنے گونگا بن کر آیا ہے۔"

ماسٹر لوشے کی سوچ نے اسے حکم دیا۔ "فوراً ٹارچ روشن کرو اور اس کی آنکھوں میں دیکھو۔ میں ابھی اس کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لوں گا۔"

بیل منڈو ٹارچ نکالنے کے لئے اپنا ہاتھ جیب کی طرف لے گیا۔ اسی وقت پیچھے سے چیتل کی گونگی للکار سنائی دی۔ وہ بھی ہاتھوں سے لڑنے کے زاویے بناتے ہوئے منہ سے آواز نکال رہا تھا۔ "ایں۔ آں آں ایں۔ آیاں۔۔۔"

بیل منڈو نے تیزی سے پلٹ کر سوچا۔ "ارے یہ دوسرا گونگا ہے ان دونوں میں سے فرہاد کون ہو سکتا ہے۔"

ماسٹر لوشے کی سوچ نے کہا۔ "تم سوچنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ فوراً ٹارچ روشن کرو۔ میں فرہاد تک پہنچ جاؤں گا۔"

اس نے جیب سے ٹارچ نکال لی۔ اتنے میں میں ایک ٹیلے پر سے لڑھک کر دھپ سے اس کے سامنے پہنچ گیا۔ پھر میں نے بھی اپنے ہاتھوں سے لڑنے کے زاویے بناتے ہوئے گونگی آواز میں کہا۔ "آں اوں۔ اوں اوں آں۔۔۔"

"تیسرا گونگا۔" ماسٹر لوشے چند ساعت کے لئے چکرا گیا۔ "یہ اتنے سارے گونگے کہاں سے پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔"

بیل منڈو بھی چکرانے کے انداز میں چاروں طرف گھوم رہا تھا اور باری باری تینوں گونگوں کی آنکھوں پر ٹارچ کی روشنی پھینک رہا تھا تینوں کی آنکھیں سپاٹ تھیں۔ آئی لینز کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ ان آنکھوں سے صرف ٹارچ کی روشنی منعکس ہو رہی تھی۔ اور ماسٹر لوشے کی ٹیلی پیتھی کی صلاحیتیں ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے گونگے کی طرف بھٹک رہی تھیں میں نے دل ہی دل میں کہا۔

"ماسٹر لوشے۔ نادیدہ شیطان! سنبھال اپنے سب سے خطرناک ہتھیار کو اب فرہاد کی باری ہے۔۔۔"

بوکھلا کر باری باری تینوں کی آنکھوں پر ٹارچ کی روشنی پھینکنے لگا۔ ٹارچ کی روشنی کی زد میں آ کر تینوں کی آنکھیں جنگلی بلیوں کی آنکھوں کی طرح چمکتی تھیں۔ ماسٹر لوشے بیل منڈو کی آنکھوں کے ذریعے ہم تینوں گونگوں کی آنکھوں اور مزاج کو سمجھنا چاہتا تھا مگر ہماری آنکھیں پالش کئے ہوئے پلاسٹک کے لینز کی تھیں۔ ہم اس پردے کے پیچھے سے ساری دنیا کو دیکھ سکتے تھے مگر کوئی دوسرا ہماری آنکھوں کے اس پار نہیں جھانک سکتا تھا اور نہ ہی ہماری آنکھوں کے بدلتے ہوئے مزاج کو سمجھ سکتا تھا کیونکہ وہ آئی لینز ہر جذبے سے خالی اور سپاٹ تھے۔

کچھ دیر تک ٹارچ کی روشنی ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے گونگے تک چکراتی رہی۔ ساتھ ہی ماسٹر لوشے کی سوچ بھی چکراتی رہی۔ اس جہاندیدہ شیطان کو زمانے بھر کا تجربہ تھا اس نے فوراً ہی سمجھ لیا کہ ہم تینوں گونگے آئی لینز کے پردوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ احتیاطی تدابیر کے لئے اور ماسٹر آف ٹیلی پیتھی کی شیطانی چالوں سے بچنے کے لئے میرا ذہن اتنی دور تک سوچے گا اور میں اس کی سوچ کی لہروں کو ہمارے دماغ تک پہنچنے سے پہلے ہی آئی لینز کی دیواروں سے روک دوں گا۔ میری ذہانت سے متاثر ہو کر بے اختیار اس کی سوچ نے کہا۔

"براوو فرہاد! میں تمہارے جیسے چالاک شیطان کی قدر کرتا ہوں۔ کاش کہ ایک بار تم سے رابطہ قائم ہو جاتا تو میں پوری دیانت داری سے تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا۔ دیکھو بیل منڈو۔۔۔ ذہانت اسے کہتے ہیں۔ تم اپنے فائٹر نوجوانوں کی فوج لے کر آئے تھے اور تنہا رہ گئے ہو اور جس انداز سے تمہیں گھیرا گیا ہے اس منصوبے کے پیچھے کس کا ذہن کام کر رہا ہے؟ یہ سوچو اور قائل ہو جاؤ کہ ذہانت کے آگے جسمانی قوت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس وقت میں اگر کسی ایک گونگے کے ذہن میں بھی جھانک سکتا تو اس کے ذریعے باقی دونوں گونگوں کو کنٹرول کر لیتا۔ مگر فرہاد نے مجھے بے بس کر دیا ہے۔ اب تم مجھ سے کسی قسم کی توقع رکھے بغیر ان سے نمٹ سکتے ہو یا پھر اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگ سکتے ہو۔"

بیل منڈو نے جھلا کر کہا۔ "میں بزدل نہیں ہوں۔ میں ان تینوں گونگوں کی ہڈیوں کا سرمہ بنا کر رکھ دوں گا۔"

یہ کہتے ہی وہ اچانک اچھل کر فضا میں بلند ہوا پھر فلائنگ کک کے لئے اس کی لات شیتل کے سینے کی طرف آئی۔ شیتل بھی لڑنے کے لئے آیا تھا سونے کے لئے نہیں کہ غفلت میں مارا جاتا۔ وہ فوراً ہی اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ بیل منڈو فضا میں اڑتا ہوا دور جا کر گرا۔ پتھریلی زمین پر گرنے کے بعد یقیناً اسے چوٹیں آئی ہوں گی۔ مگر وہ فولادی انسان فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پلٹ کر سیدھا شیتل کی طرف آیا۔ پھر اس نے

کراٹے کے لئے پینترا بدلتے ہوئے اس پر حملہ کیا۔ بڑا زبردست حملہ تھا۔ شیشل دونوں ہاتھوں سے اسے روک رہا تھا مگر ایک کرارا ہاتھ اس کے مُنہ پر پڑ ہی گیا۔ شیشل لڑکھا کر یوں جُھکا جیسے گرنے ہی والا ہو۔ مگر اُس نے جُھکتے ہی بیل مُنڈو کے سینے پر ایک ترچھی ہتھیلی جمائی۔ وہ غراتا ہوا پیچھے چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی شیشل نے گھُوم گھُوم کر اُسے دو لاتیں جمائیں۔ وہ ایک دَم سے پلٹ کر میری طرف آیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا میری طرف آیا تھا۔ میں نے سمجھا کہ وہ مار کھا کر ڈگمگا رہا ہے مگر اچانک ہی اس کے کراٹے کا زبردست ہاتھ میرے شانے پر پڑا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا اس کا دوسرا ہاتھ میرے مُنہ پر پڑا۔ اس سے یہ تجربہ ہوا کہ آئی لینز کے پیچھے بھی رنگ برنگے ستارے ناچنے لگتے ہیں اور یہ سبق بھی حاصل ہوا کہ بیل مُنڈو شیشل سے جتنی مار کھا چکا تھا' ایسی مار اور ایسی چوٹیں مارشل آرٹ کے کھلاڑیوں کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ وہ زبردست چوٹیں کھانے کے باوجود پھر دونوں پاؤں پر کھڑے ہو کر مقابلے کے لئے ڈٹ گیا تھا۔

اپنے باس پر حملہ ہوتے دیکھ کر شیشل اور چیتل نے ایک ساتھ بیل مُنڈو پر چھلانگ لگائی۔ پھر اُسے لاتوں اور آڑھی ترچھی ہتھیلیوں پر رکھتے ہوئے مجھ سے دُور لے گئے۔ اسے دُور لے جا کر چیتل الگ ہو گیا۔ کیونکہ وہ تینوں بلیک بیلٹر تھے اور ایک اکیلے پر وہ دونوں مل کر حملہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ اصول کے خلاف تھا' لہٰذا اصُول کے مطابق شیشل اس سے تنہا لڑنے لگا۔ شیشل کے متعلق میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ وہ کیسا فولادی انسان تھا۔ مگر پہلی بار اس فولاد سے فولاد ٹکرایا تھا۔ دو نہتوں کی ایسی دل ہلا دینے والی لڑائی میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو مار رہے تھے اور مار کھا رہے تھے۔ زخمی ہو رہے تھے مگر پھر بھی ثابت قدمی سے میدان میں ڈٹے ہوئے تھے۔ میرے دل میں اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر لڑائی تھوڑی دیر اور جاری رہی تو شیشل گر پڑے گا۔

میں نے فوراً ہی شیشل کے ذہن میں جھانک کر دیکھا کہ اس کی قوتِ ارادی کا کیا حال ہے؟ اس کے دماغ میں ضد اور جھلاہٹ کی آندھی سی چل رہی تھی۔ وہ اس وقت تک زمین پر گرنا اپنی توہین سمجھتا تھا' جب تک کہ وہ مر نہ جائے۔ اس کے بعد میں نے بیل مُنڈو کے ذہن میں جھانک کر دیکھا۔ اُس کا بھی یہی حال تھا۔ اس نے بھی ضد کر لی تھی کہ اپنے مقابل آنے والے گونگے کو مار ڈالے گا یا خود مر جائے گا۔ مگر میدان نہیں چھوڑے گا۔ اس کی ضد کے باوجود ماسٹر یوشے اس کی سوچ میں برابر کہہ رہا تھا۔

"بیل مُنڈو! میری بات مانو — لڑائی ختم کرو — مصلحت سے کام لو۔ تم اپنی ضد اور غصے میں یہ بات بھُول رہے ہو کہ ابھی ایک ہی گونگے سے لڑنے کے دوران تم اندر سے ٹوٹ رہے ہو' بظاہر ثابت قدمی سے جمے ہوئے ہو۔ تمہاری سوچ بتا رہی ہے کہ وہ تینوں دیانت داری سے لڑنے کے اصُولوں پر عمل کر رہے ہیں اور بیک وقت تم پر حملہ نہیں کر رہے ہیں۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ وہ تینوں بلیک بیلٹر ہیں — نہیں تینوں نہیں' ان میں سے ایک گونگا جو تم سے مار کھا گیا تھا۔ وہ تمہاری سوچ کے مطابق مار کھا کر چکرا گیا تھا' تم پر پلٹ کر حملہ نہیں کر سکا تھا' مارشل آرٹ سے واقف ہونے والے اتنے سرد نہیں ہوتے کہ پلٹ کر حملہ نہ کریں۔ میرا خیال ہے کہ وہی فرہاد ہے اور اُس نے تمہارے مقابلے کے لئے دو مارشل آرٹ جاننے والوں کو کرائے پر حاصل کیا ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم صرف اسی گونگے پر حملہ کرو جس کے گونگے وجود کے پیچھے فرہاد چھُپا ہوا ہے۔ وہ تمہارے دو چار زبردست حملوں کی تاب نہ لا کر کراہنے گا' چیخے گا' اس طرح اس کی زبان کھُلے گی اور میں اُس کے دماغ میں پہنچ جاؤں گا — مصلحت سے کام لو' لڑائی کے اصُولوں کو بالائے طاق رکھو اور گونگے فرہاد پر حملہ کرو۔"

بیل مُنڈو لڑتے لڑتے شیشل سے ذرا دُور ہو کر چیخنے لگا۔

"شیطان کی اولاد! میں بُزدل اور بے ایمان نہیں ہوں۔ میں بھی اصُولوں کے مطابق لڑوں گا۔ یہ تینوں میرے دُشمن ہیں۔ مگر میں ان کی قدر کرتا ہوں کہ یہ اصُولوں پر چل رہے ہیں۔ میں بھی آخری دم تک قاعدے اور قوانین کے مطابق ان سے لڑوں گا۔"

ماسٹر یوشے جھنجلا کر بیل مُنڈو کو گالیاں دینے لگا۔ سوچ کے ذریعے رابطہ قائم کرنے کے باعث ذرا دیر کے لئے لڑائی رُک گئی تھی۔ اسے خاموش کھڑے دیکھ کر شیشل نے اس پر حملہ کرنا چاہا لیکن میں نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ کیونکہ میں بھی بیل مُنڈو کی دیانت داری کی قدر کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اُسے ماسٹر یوشے سے باتیں کرنے اور پھر اپنے طور پر فیصلہ کرنے کی مُہلت دے رہا تھا۔

اب ماسٹر یوشے بیل مُنڈو کو دھمکیاں دے رہا تھا۔

"دیکھو بیل مُنڈو! میں حکم عدُولی پسند نہیں کرتا۔ اگر تم میری بات نہیں مانو گے تو میں تمہارے دماغ میں ہلچل مچاؤں گا اور ابھی تمہیں پاگل بنا دوں گا۔"

بیل مُنڈو نے کہا۔ "اگر تم نے مجھے پاگل بنا دیا تو مجھے یہ اطمینان رہے گا کہ میں نے ایک بُزدل کی طرح میدان نہیں چھوڑا ہے' تیری شیطانی صلاحیتوں نے مجھے مجبور کیا ہے۔ مگر یاد رکھ میرے پاگل بن جانے سے تیرا بھلا نہیں ہو گا۔ ان تینوں گونگوں میں سے جو بھی فرہاد ہے' وہ ہاتھ آ کر نکل جائے گا۔ اگر تُو مجھ سے کام لینا چاہتا ہے تو مجھے اپنے طور پر کام کرنے دے۔ مجھے لڑنے کا موقع دے' میں ان تینوں کو باری باری مار گراؤں گا۔"

اس کی ضد نے ماسٹر یوشے کو اُلجھا کر رکھ دیا۔ وہ حقیقتاً یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ بیل مُنڈو کو پاگل بنا دے اور اس طرح مجھے نکل جانے کا موقع دے۔ اس نے یہی فیصلہ کیا کہ بیل مُنڈو کی بات مان لے۔ لیکن اس طرح کہ ایک گونگے کو شکست دینے کے بعد کہیں وہ دوسرے گونگے سے

شکست نہ کھا جائے۔ اس بات کے پیشِ نظر اُس نے بیل مُنڈو کو مشورہ دیا۔

"اچھی بات ہے' میں تمہیں لڑنے کا موقع دیتا ہوں لیکن اس سے پہلے تم ان تینوں گونگوں سے لڑنے کے ایسے اوقات مقرر کرو کہ تمہیں اچھی طرح سستانے اور آرام کرنے کا موقع مل جائے۔ ایک ہی رات میں تینوں سے یکے بعد دیگرے لڑنا دانشمندی نہیں ہے۔ تمہارے بدن کی جو ٹوٹ پھُوٹ ہو گی' اس کا علاج بھی لازمی ہے۔ لہٰذا عقل سے کام لو اور ان سے باری باری مقابلے کے لئے ایک پروگرام مرتب کرو۔ اس طرح وہ دیانتداری سے لڑنے والے اس پروگرام کے مطابق تم سے لڑتے رہیں گے۔ دوسرے لفظوں میں ان گونگوں کے پیچھے چھُپا ہوا فرہاد تمہاری نظروں کے سامنے آتا رہے گا۔ اپنی طاقت کو استعمال کرنے کے لئے میری عقل کو بھی استعمال کرو اور فوراً ان کے سامنے اپنا پروگرام پیش کرو۔"

اس کی ہدایت کے مطابق بیل مُنڈو نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر ہم تینوں گونگوں کو مخاطب کیا اور اشاروں کی زبان سے کہنے لگا کہ وہ ہم تینوں سے لڑنے کے لئے کئی دن کا وقفہ رکھنا چاہتا ہے۔

اس کی اشاراتی زبان کو سمجھ کر شیشل اور چیتل مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں نے ہاتھ کے اشاروں سے انہیں سمجھایا کہ وہ اس کی بات منظور کریں۔ پھر میں نے بیل مُنڈو سے گونگے اشاروں میں کہا کہ آج اگر وہ شیشل سے لڑنے کے بعد زندہ بچا تو ایک ہفتے بعد دوسرا گونگا اس کا مقابلہ کرے گا۔ اگر اُس کی تقدیر مہربان رہی اور وہ زندہ بچ گیا تو پھر ایک ہفتے بعد اسی جگہ تیسرے گونگے سے مقابلہ ہو گا۔

یہ فیصلہ سُنتے ہی شیشل اور چیتل آپس میں بحث کرنے لگے۔ چیتل ضد کر رہا تھا کہ پہلے وہ مقابلہ کرے گا اور شیشل اُسے سمجھا رہا تھا کہ مقابلہ شروع ہو چکا ہے۔ وہ بہت دیر تک اس مُنڈے ہوئے سر والے آدمی سے لڑتا رہا ہے' لہٰذا اب اسے ہی لڑنا چاہیئے۔ اس نے گونگے اشاروں میں چیتل سے کہا۔

"اگر میں اس مقابلے میں مارا گیا تو تم میرے باس سے وفاداری نبھانا اور کبھی اپنے سے پہلے باس کو لڑنے کا موقع نہ دینا۔ یہ سرمُنڈا بہت ہی خطرناک ہے اور ہمارا باس مارشل آرٹ سے پوری طرح واقف نہیں ہے۔"

چیتل نے انکار میں سر ہلا کر شیشل کو سمجھایا۔

"میں نے آج ہی تمہارے باس کا وفادار رہنے کا ارادہ کیا ہے' صرف ارادہ کیا ہے' قسم نہیں کھائی ہے۔ تم میرے بھائی ہو' تمہاری سلامتی کے لئے میں جس جذبے سے اس دشمن کا مقابلہ کروں گا۔ جذبے کی وہ شدت تمہارے باس کے لئے نہیں ہو گی۔ بہتر ہے کہ اپنی خاطر پہلے مجھے لڑنے کا موقع دو۔"

شیشل بُزدل نہیں تھا کہ اپنی خاطر پہلے اپنے بھائی کو لڑنے مرنے کا موقع دیتا۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ شیشل کو میرے لئے اس وقت تک ٹوٹ پھُوٹ سے محفوظ رہ کر مستعد رہنا چاہیئے۔ یہ چیتل پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے فیصلہ سُنایا کہ پہلے چیتل لڑے گا۔ چونکہ اب تک بیل مُنڈو کافی حد تک زخمی ہو چکا ہے اس لئے آج یہ لڑائی ملتوی کی جاتی ہے۔

بیل مُنڈو نے میرے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا۔ اس نے اشاروں میں اپنا پروگرام بتایا کہ پرسوں رات وہ اسی جگہ آ کر چیتل سے مقابلہ کرے گا۔ اس سلسلے میں کوئی بے ایمانی نہیں ہونی چاہیئے۔ مقابلے کے وقت اس جگہ نہ چیتل کا کوئی آدمی آئے گا اور نہ ہی بیل مُنڈو اپنے ساتھ کسی کو لائے گا۔

ہم نے اس کی بات مان لی۔ ایک فیصلے پر متفق ہونے کے بعد بیل مُنڈو وہاں سے جانے لگا۔ میں چُپ چاپ کھڑا اس کے دماغ میں جھانک رہا تھا۔ اس وقت ماسٹر یوشے اس سے کہہ رہا تھا:

"دیکھو بیل مُنڈو! عقل سے کام لینے سے کیسے بگڑی ہوئی بات بن جاتی ہے۔ ابھی تم کافی زخمی ہو چکے ہو' اب دو دنوں تک تمہیں تازہ دَم ہونے کا موقع مل جائے گا۔ پھر ان تینوں نے جو فیصلہ کیا ہے' اس فیصلے کے دوران یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ان میں سے دو گونگے تیسرے گونگے کے ماتحت ہیں اور اس کے ہر فیصلے کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہی تیسرا گونگا فرہاد ہے۔"

بیل مُنڈو کی سوچ نے کہا۔

"ہاں' میں بھی یہی سمجھ رہا ہوں۔ وہ گونگا جو باتیں کہتا ہے دوسرے انہیں بے چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں۔ میں نے اس گونگے کو اس کے چہرے سے اچھی طرح پہچان لیا ہے اور اب پہچاننا یا نہ پہچاننا کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہے کیونکہ پروگرام کے مطابق وہ بہت جلد میرے مقابلے پر آئے گا اور بے موت مارا جائے گا۔"

ماسٹر یوشے نے کہا۔ "تم پھر احمقانہ باتیں کر رہے ہو' میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں فرہاد کا جانی دشمن نہیں ہوں۔ فرہاد جیسے تراشیدہ ہیرے مٹی میں رُلنے کے قابل نہیں ہوتے۔ میں اسے اپنا ایک بہترین آلۂ کار بنانا چاہتا ہوں۔ میری بات اچھی طرح یاد رکھو' جب اس سے مقابلے کا وقت آئے تو اسے زیادہ نقصان نہ پہنچانا' اپنے داؤ پیچ سے صرف یہ کوشش کرنا کہ وہ بے نقاب ہو جائے۔ اس کی آنکھوں سے لینز کا پردہ ہٹ جائے یا کسی طرح اس کی زبان کھُل جائے۔"

بیل مُنڈو نے ناگواری سے کہا۔ "تم اور فرہاد دونوں جہنم میں جاؤ۔ میں اسے زبان کھولنے پر مجبور کروں گا۔ زبان کھُلتے ہی وہ تمہاری گرفت میں آ جائے گا' اس کے بعد تو تم میرا پیچھا چھوڑ دو گے نا؟ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں' مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ تمہارے جیسا ضدی اور بد مزاج شخص میرے کام نہیں آ سکتا۔ مجھے فرہاد چاہیئے' اسے حاصل کرتے

ہی میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔"

"اچھی بات ہے۔ اگرچہ شیطان مجسّم فریب ہوتا ہے۔ اس کے وعدے کا یقین کرنا نادانی ہے۔ مگر میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ میں تمہارے وعدے پر یقین کر دوں۔"

"بیل منڈو! تم ہمیشہ اپنی جیت کا یقین کرتے ہو۔ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ فرہاد بہت چالاک ہے۔ کسی موقع پر وہ تمہیں اپنی چالاکیوں سے زیر کر سکتا ہے۔ ایسے وقت بھی تم اپنے اصولوں کے مطابق دیانت داری سے لڑتے رہے اور میرے بے ایمان مشوروں کو تسلیم نہ کیا تو میں اپنے وعدے سے پھر جاؤں گا۔"

"اگر ایسی بات ہے تو ابھی اس گونگے سے لڑائی کے دوران تم نے میری دیانت داری کو کیوں تسلیم کیا تھا؟ تمہارے کہنے کے مطابق میں نے ان سے باری باری لڑنے کا وقت مقرر کیا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں اپنی زبان پر قائم نہ رہوں؟"

"یہ میں اس وقت چاہوں گا جب تمہاری شکست ہوتی رہے گی۔"

"ہار جیت کسی کی بھی ہو سکتی ہے میں لڑتے لڑتے مر جاؤں گا مگر مقابلہ کرنے والوں کو تمہاری طرح شیطان بن کر دھوکا نہیں دوں گا۔"

"دھوکا تو تمہارا باپ بھی دے گا۔ اس وقت میں مصلحتاً خاموش رہا کیونکہ تم تین گونگوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ اگر تم ان میں سے کسی کے ہاتھوں مر جاتے تو پھر فرہاد میرے ہاتھ نہ آتا۔ میں تمہیں اطمینان سے سمجھانا چاہتا تھا کہ میرے کسی حکم سے انکار کرتے وقت کہیں سکون سے بیٹھ کر ٹھنڈے دماغ سے سوچو کہ میں کس طرح تمہیں ذہنی عذاب میں مبتلا کر سکتا ہوں ــ میں یہ مانتا ہوں کہ تم میرے ہاتھوں پاگل ہو جانا پسند کرو گے لیکن لڑنے کے اصولوں کو بدل کر بزدلی نہیں دکھاؤ گے۔"

"ہاں' یہی بات ہے۔ میں اصولوں کے مطابق لڑتے لڑتے مر جاؤں گا یا ان تینوں کو مار ڈالوں گا یا پھر تمہارے جیسے شیطان کے ہاتھوں پاگل بن جاؤں گا۔ اس طرح میری دلیری اور مردانگی پر حرف نہیں آئے گا۔"

ماسٹر یوشے کا قہقہہ سنائی دیا۔

"بیوقوف! تم اپنی مردانگی دکھانے کے لئے مرنا پسند کرو گے' تمہیں اپنے کسی نقصان کی پرواہ نہیں ہے مگر تم اپنی پیاری پیاری سی بھتیجی رُوما کو بھول جاتے ہو ــ نہیں بیٹے! میں تمہیں پاگل نہیں بناؤں گا' تمہیں مرنے کا موقع بھی نہیں دوں گا' صرف تمہارے سامنے تمہاری بھتیجی کو ذہنی اذیتوں میں مبتلا کرتا رہوں گا۔"

بیل منڈو ایک دم جھلّا گیا اور غصّے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے اسے گندی گندی گالیاں دینے لگا۔ اس کی ہر گالی پر ماسٹر یوشے قہقہے لگا رہا تھا۔ پھر اس شیطان نے قہقہوں کے وقفے میں کہا۔

"اُلو کے پٹھے! میرے سامنے ایمان داری دکھا رہے ہو' وہ شیطان فرہاد ہاتھوں میں آ کر نکلتا جا رہا ہے اور تم ایسے گدھے ہو کہ اپنے اصولوں پر چلنے کے لئے اسے پھر نکل جانے کا موقع دینا چاہتے ہو۔ میں تمہاری طرح احمق نہیں ہوں۔ جہاں مجھے جسمانی قوت کو آزمانا ہوتا ہے وہاں میں تم جیسے کُتوں کو آگے بڑھاتا ہوں۔ جہاں ذہانت یا مکاری کا موقع آتا ہے' وہاں میں جھوٹ اور فریب سے کام لیتا ہوں۔ ابھی مجھے تمہاری جسمانی قوت کی ضرورت نہیں ہے۔ تم مارشل آرٹ کے زعم میں اس حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہو کہ تمہارے مقابلے پر دو گونگے بلیک بیلٹر ہیں اور تیسرا سب سے بڑا مکار فرہاد ہے۔ ایسی صورت میں میں بہتر سمجھتا ہوں کہ فرہاد کو کس طرح قابو میں لانا ہے۔ لہٰذا میں جو کہتا ہوں' اس پر عمل کر دیا پھر ہوٹل پہنچ کر رُوما کے پاگل ہونے کا تماشہ دیکھو۔"

بیل منڈو پہاڑی راستے پر لڑکھڑا کر بیٹھ گیا۔ وہ شیتل کے ہاتھوں اس حد تک زخمی ہو چکا تھا کہ کوئی دوسرا ہوتا تو اپنے پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکتا۔ اس وقت بھی وہ زخموں سے چُور ہو کر نہیں بیٹھا تھا بلکہ ماسٹر یوشے دماغی طور پر اُسے گہرے زخم پہنچا رہا تھا۔ آدمی بدن کی چوٹ تو سہہ لیتا ہے' دماغ میں ہونے والی ہلکی سی چبھن کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ساری قوتِ ارادی خاک میں مل کر رہ جاتی ہے۔ وہ فولادی انسان تھا لیکن اس کے سینے میں ایک ایسا دل تھا جو اپنی بیٹی جیسی بھتیجی کے لئے محبت سے دھڑکتا رہتا تھا۔ وہ اپنی بوٹیاں نوچ کر پھینک سکتا تھا لیکن رُوما پر کسی شیطان کا سایہ بھی پڑتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ محبت کے ان جذبات سے مجبور ہو کر وہ سوچنے لگا۔

"میں کیا کروں؟ کیسے اس شیطان سے اپنا پیچھا چھڑاؤں؟ میں کبھی ایسا بے بس نہیں ہوا تھا۔ مگر اپنی رُوما کے لئے سوچنا پڑتا ہے کہ ہر انسان کو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر محبت کے کسی رشتے سے کمزور ہو جانا پڑتا ہے اور یہ کمزوری سوچنے کا انداز بدل دیتی ہے۔ اب میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ وہ نادیدہ شیطان میری سرکشی کے باعث کیسے کیسے مظالم ڈھائے گا اور میں اس کے تڑپنے کا تماشہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ کیا میں ایمانداری سے لڑنے والے دشمنوں سے بے ایمانی کروں؟ میں خود کو ناقابلِ شکست سمجھتا رہا۔ کیا اب میں بزدلی کا مظاہرہ کروں؟ میں کیا کروں' مجھے تو یہ سب کرنا ہی ہو گا۔"

ماسٹر یوشے کی سوچ سنائی دی۔ "ہاں۔ تمہیں وہی کرنا ہو گا جو میں کہوں گا۔ اچھی طرح سوچ کر دیکھ لو' تمہارے لئے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

اس نے غصّے سے پوچھا۔ "شیطان کے بچے! بولو' تم کیا چاہتے ہو؟ میں خود کو اور اپنی رُوما کو تمہارے شیطانی پنجے سے آزاد کرانے کے لئے تمہاری بات مان لوں گا۔ بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

ماسٹر یوشے کی سوچ نے کہا۔

"پرسوں رات ایک گونگے سے تمہارا مقابلہ ہونے والا ہے۔ اُس وقت تک تم اُن کے دشمن ہو۔ مگر اس وقت تک رُوما کو فرہاد کی دوست بن جانا چاہیئے۔"

بیل منڈو نے جھنجلا کر کہا۔ "کیا بکتے ہو۔ میری رُوما اُس مکار کی دوست کیسے بنے گی؟"

"بڑی آسانی سے ــ تم ابھی ان تینوں گونگوں سے زیادہ دُور نہیں گئے ہو۔ اب جبکہ تم میرے حکم پر عمل کر رہے ہو تو تمہیں ان گونگوں سے دوستانہ ماحول میں ملاقات کرنی چاہیئے۔ دو پہلوان صرف اکھاڑے میں ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ اکھاڑے کے باہر دوستوں کے انداز میں ملاقات کرتے ہیں۔ تم واپس اُن کی طرف جاؤ اور جس گونگے پر فرہاد کا شُبہ ہے اس سے دوبارہ دوستانہ انداز میں ملو اور معلوم کرو کہ وہ ان دنوں کہاں رہتا ہے؟ اُس کی رہائش گاہ کا علم ہونے کے بعد رُوما اس کی طرف بڑھے گی اور اپنے حسن و شباب کا جال بچھائے گی۔"

"یہ نہیں ہو سکتا ــ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا......"

وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ ماسٹر یوشے نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو میں نے پاگل نہیں بنایا ہے اور تم پاگلوں کی طرح چیخنے جا رہے ہو۔"

بیل منڈو نے اُسے گندی گندی گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ "شیطان کے نطفے ــ تُو نے کہا تھا کہ تیری بھی ایک بیٹی ہے۔ کیا تُو ایسے مقاصد کے لئے اپنی بیٹی کو استعمال کر سکتا ہے؟"

"ہاں ــ میں شیطان جو ٹھہرا' اپنے مقاصد کے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں پھر یہ کہ جوانی کے کھیل میں مرد کا کچھ نہیں بگڑتا تو پھر عورت کا کیا بگڑ جاتا ہے؟ تمہاری رُوما فرہاد سے ملنے کے بعد بھی رُوما ہی رہے گی۔ ایک شگفتہ پھول کو ایک آدھ بار سونگھنے سے اس کی خوشبو میں کمی نہیں آ جاتی۔ وہ جیسی ہے ویسی ہی رہے گی اور تم چچا بھتیجی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ تم دونوں کو مجھ سے جلد ہی نجات مل جائے گی۔"

بیل منڈو نے بڑی بے بسی سے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

"اے نادیدہ شیطان! آج میں تجھ سے ہار گیا۔ میں تیرے آگے سر جھکاتا ہوں اور تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ میری رُوما کو آلۂ کار نہ بنا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری حسین بھتیجی پر کسی ایشیائی باشندے کا سایہ بھی پڑے جنہیں میں حقیر سمجھتا ہوں' ان کے آگے میں اپنی رُوما کو چارہ بنا کر نہیں بھیج سکتا۔"

بیل منڈو کی سوچ پڑھ کر مجھے غصّہ آنے لگا۔ اس کمبخت کو میں اب تک مظلوم سمجھ رہا تھا اور اس سے ہمدردی کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کیونکہ وہ ناحق ماسٹر یوشے کی شیطانی چالوں میں آ گیا تھا اور ناقابلِ شکست ہونے کے باوجود دام میں آئے ہوئے پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا مگر اس کے خیالات نے مجھے اُس سے بدظن کر دیا۔ پتہ نہیں یہ گوری چمڑی والے کس فن میں یا زندگی کے کس شعبے میں خود کو ہم سے برتر سمجھتے ہیں؟ صرف محدود تعلیم اور محدود ذرائع نے ہمیں کسی حد تک بعض معاملات میں ان کا محتاج بنا دیا ہے۔ ورنہ ہمارے پاس بھی وہی دل اور دماغ ہے اور ہمارے اندر ایسی چھپی ہوئی صلاحیتیں ہیں کہ انہیں اُجاگر کرنے کا موقع مل جائے تو جھوٹی برتری پر ناز کرنے والی قومیں حیران رہ جائیں۔

ایسے وقت بیل منڈو یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ اسی کی طرح کوئی گوری چمڑی والا اسے کس طرح ٹیلی پیتھی کے ذریعے اپنا غلام بنائے ہوئے ہے لیکن اپنوں کے ہاتھوں جو زخم ملتے ہیں انہیں یہ لوگ بڑی خاموشی سے چھپا لیتے ہیں' بے بسی سے اندر ہی اندر تڑپتے رہتے ہیں۔ اوپر سے غرور سے تنے ہوئے سر کو جھکنے نہیں دیتے۔ میں بھی ایشیائی باشندہ ہوں' میں نے سوچ لیا کہ اس کا غرور میرے ہی ہاتھوں ٹوٹے گا۔

اس وقت ماسٹر یوشے اور بیل منڈو کے درمیان خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں ماسٹر یوشے کے ذہن میں جھانک رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا' بیل منڈو ایک پاگل ہاتھی ہے جو اپنے سامنے والی ہر چیز سے بغیر سوچے سمجھے ٹکرا جاتا ہے۔ اس پاگل کو بہلا پھسلا کر کام نکالنا چاہیئے ورنہ فرہاد ہاتھ سے نکل جائے گا۔ یہ سب کچھ سوچ کر اُس نے بیل منڈو کو مخاطب کیا۔

"سُنو ــ تم میرے سامنے ضدی اور سرکش بننے کی کوشش کرتے ہو اس لئے میں بھی تمہیں پریشان کرتا ہوں۔ ورنہ میں تمہاری رُوما کو اپنی بیٹی کی طرح چاہتا ہوں۔ تم میری بات مانو اور رُوما کو فرہاد کی طرف بڑھنے کا موقع دو۔ جس طرح میں اپنی بیٹی کی حفاظت کرتا ہوں' اسی طرح میں فرہاد سے رُوما کی حفاظت کرتا رہوں گا۔ تم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہو کہ عورت کی مرضی کے بغیر بڑے سے بڑا شہ زور بھی اس پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ تمہیں صرف اسی بات کا اندیشہ ہو گا کہ فرہاد کہیں اپنی چالاکیوں سے رُوما کو اپنی طرف مائل نہ کر لے لیکن تم یہ بھول گئے کہ رُوما کا دماغ ہمیشہ میرے کنٹرول میں رہے گا۔ میں اُسے جہاں موڑوں گا وہ اسی طرف مُڑے گی اور اس بہروپیے کی طرف کبھی مائل نہ ہو گی۔"

"میں تمہاری شیطانی صلاحیتوں کو تسلیم کرتا ہوں۔ تم چاہو تو یقیناً رُوما کو ہماری مرضی کے مطابق کنٹرول کر سکتے ہو۔ میں تمہاری یہ بات بھی مان لیتا ہوں۔ ابھی ہوٹل پہنچ کر میں رُوما کو سمجھاؤں گا کہ اسے کس طرح اپنی معصومیت کو برقرار رکھتے ہوئے فرہاد سے دوستی کرنی ہے۔ لیکن تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ فرہاد جیسا چالاک آدمی حسین لڑکیوں کو دیکھ کر پھسل جاتا ہو گا؟"

ماسٹر یوشے نے جواب دیا۔ "میں انجلا کی موت سے لے کر اب تک فرہاد کے کیریکٹر کی اسٹڈی کرتا آ رہا ہوں۔ میں نے انجلا کے قتل کی تفتیش کرنے والے افسروں کے دماغوں کو بھی پڑھا ہے۔ جب وہ انجلا

کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پڑھ رہے تھے تو اس رپورٹ میں ایک جگہ یہ بھی ... اس سے تعلقات قائم کرنے کے بعد اسے قتل کیا گیا ہے۔ پھر جس کوٹھی میں آگ لگی تھی اور فرہاد نے ایک بچے کی جان بچائی تھی، وہاں جا کر تم نے فیروز نامی ایک نوجوان سے ملاقات کی تھی۔ جب تم فرہاد کے ہوٹل کا پتہ معلوم کر کے رخصت ہو گئے تو میں نے فیروز کی سوچ کے ذریعے فرہاد کے متعلق مزید معلومات حاصل کیں۔ اُس کی سوچ سے پتہ چلا کہ فرہاد حیدر آباد کے اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہوا تھا۔ وہ اتنا ہینڈسم اور اسمارٹ ہے کہ فیروز کی ایک معشوقہ نرگس اس کے مردانہ حسن سے سحر زدہ ہو کر اس کے کیبن میں رات گزارنے چلی گئی تھی۔ کیا اس سے پتہ نہیں چلتا کہ وہ لیڈی کلر ہے اور حسین لڑکیوں کو دیکھ کر خود بھی پھسل جاتا ہے۔ بیل منڈو — میں نے کہا نا کہ تم صرف جسمانی قوت پر ناز کرتے ہو۔ مگر ہم دماغ سے انسانوں کے اندر گھس کر اس کی کمزوریوں کا پتہ چلاتے ہیں۔ تم میری عقل کے مطابق عمل کرو۔ میں بہت جلد فرہاد تک پہنچ جاؤں گا ... تمہیں آزاد کر دوں گا۔"

"میں عمل کروں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ رُوما فرہاد کی زبان کیسے کھلوا سکتی ہے؟"

ماسٹر یوشے نے جواب دیا "اب جبکہ تم اور رُوما میرے ہر حکم کی تعمیل کرو گے تو میں تم لوگوں سے زیادہ پیچیدہ کام نہیں لوں گا۔ میں فرہاد سے نمٹنے کے لئے خود وہاں پہنچ رہا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ میرے پہنچنے تک رُوما اسے اپنی دوستی کے بندھن میں باندھے رکھے۔ وہ بھی مطمئن رہے کہ اس کے گونگے بلیک بیلٹر مقررہ اوقات میں تم سے مقابلہ کرتے رہیں گے اور ایک دن تمہارا خاتمہ کر دیں گے۔ اسے اس خوش فہمی میں مبتلا رہنے دو۔ میں بہت جلد آ رہا ہوں۔"

اس کی باتیں سن کر بیل منڈو اسی جگہ واپس آنے لگا جہاں کچھ دیر پہلے مقابلہ ہوا تھا۔ میں نے شیشتل اور جیسل کو اشاروں میں سمجھایا کہ وہ اب جا کر آرام کریں۔ میں ضرورت کے وقت ان سے رابطہ قائم کروں گا۔ میری ہدایت کے مطابق وہ دونوں رخصت ہو گئے۔ بیل منڈو میری طرف آ رہا تھا۔ میں اپنی اُٹھائے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ خاموشی سے چلنے کے دوران میں ماسٹر یوشے کی سوچ کو پڑھ رہا تھا۔ یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ وہ کب تک یہاں پہنچ رہا ہے؟

میں چاہتا تو ایک بار پھر اس سے دُور بھاگ سکتا تھا مگر اب تک فراریت حاصل کرنے کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ نہ تو ماسٹر یوشے سے پیچھا چھوٹتا تھا اور نہ ہی بیل منڈو سے مائکرو فلم حاصل کر سکا تھا۔ اگر شیشتل سے مقابلے کا کوئی نتیجہ نکلتا اور بیل منڈو مارا جاتا تو میں اس کی مصنوعی ناک اکھاڑ کر مائیکرو فلم حاصل کر لیتا۔ لیکن میں نے یہ سوچ کر صبر کر لیا تھا کہ آئندہ بھی دیانتداری سے مقابلہ ہونے والا ہے اور بیل منڈو ہمیشہ میری نظروں کے سامنے رہے گا۔ میں جب چاہوں گا، اس فلم کو حاصل کروں گا۔

مگر اب دیانتداری کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بیل منڈو بھی بھتیجی رُوما کی خاطر بے ایمانی کے لئے آمادہ ہو گیا تھا پھر میں کیوں پیچھے رہتا۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جتنی جلد ممکن ہو گا، ماسٹر یوشے کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی میں وہ مائیکرو فلم حاصل کر لوں گا۔ اس کے بعد ماسٹر یوشے رہ جائے گا۔ اس سے تو کسی صورت سے نمٹنا ہی ہو گا۔ آخر وہ کب تک میرے پیچھے پیچھے آئے گا اور میں آگے آگے بھاگتا رہوں گا۔ یہی سوچ کر میں اس شیطان کی سوچ کو پڑھ رہا تھا۔

لیکن وہ شیطان، بیل منڈو سے سوچ کا رابطہ ختم کرنے بعد کسی شخص کو وہاں کی مقامی زبان میں مخاطب کر رہا تھا۔ میں وہ زبان نہیں جانتا تھا اس لئے اس کے ارادے کو نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ریسیور اُٹھا کر نمبر ڈائیل کرنے لگا۔ اس کی سوچ سے پتہ چلا کہ وہ ایئرپورٹ انکوائری کے نمبر ڈائیل کر رہا ہے۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ پاکستان جانے والی فلائیٹ میں اُسے کوئی سیٹ مل سکتی ہے یا نہیں؟

انکوائری سے پتہ چلا کہ پرسوں کی فلائیٹ میں دو سیٹیں ہیں۔ اس نے دونوں سیٹیں ریزرو کرا لیں۔ ریسیور رکھنے کے بعد جب وہ سوچنے لگا تو معلوم ہوا کہ کسی شخص سے مقامی زبان میں وہ کیا کہہ رہا تھا۔ کیونکہ اب وہ اپنی مادری زبان انگریزی میں سوچ رہا تھا۔ دوسری صبح ایک اہم میٹنگ اٹینڈ کرنی تھی۔ چار ماسٹروں کی تنظیم کے اصولوں کے مطابق اس میٹنگ میں باقی تین ماسٹروں کو یہ بتانا لازمی تھا کہ وہ ہیڈ کوارٹر چھوڑ کر کہاں جا رہا ہے؟ اور کب جا رہا ہے؟ میٹنگ کل صبح ہونے والی تھی لہٰذا میں نے ماسٹر یوشے سے دماغی رابطہ ختم کر دیا۔

تھوڑی دُور چلنے کے بعد بیل منڈو نظر آیا۔ وہ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر رُک گیا۔ جب میں قریب پہنچا تو اس نے دوستانہ انداز میں مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے بھی بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ مصافحہ کے وقت میں نے محسوس کیا، اس کی ہتھیلی اور انگلیاں فولاد کی طرح سخت ہیں۔ اس نے پوچھا۔

"تمہارے دونوں گونگے ساتھی کہاں ہیں؟"

میں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا جیسے اُس کی بات سمجھ میں نہ آئی ہو۔ دراصل وہ اچانک سوال کر کے سمجھنا چاہتا تھا کہ اگر میں گونگا نہ ہوا تو بے اختیار اس کی بات سمجھ کر اس کا جواب دوں گا۔ لیکن وہ میری اس حرکت سے الجھ گیا کہ پتہ نہیں میں واقعی فرہاد ہوں یا نہیں۔ آخر اس نے وہی سوال اشاروں میں کیا۔ میں نے بھی اشاروں میں جواب دیا کہ وہ دونوں جا چکے ہیں۔ میں جب انہیں بلاؤں گا، وہ حاضر ہو جائیں گے۔ پھر اس نے اشارے سے پوچھا۔

"تم کہاں جاؤ گے؟ میرے پاس کار ہے میں تمہیں تمہاری رہائش گاہ پر پہنچا دوں گا۔"

میں نے جواباً کہا "میری رہائش کی کوئی جگہ مقرر نہیں ہے۔ میں آج یہاں کل وہاں رہنے کی جگہ بدلتا رہتا ہوں۔"

اس نے کہا "اب ہمارے درمیان مقابلے کے لئے مختلف اوقات مقرر ہو چکے ہیں۔ ہم صرف مقابلے کے میدان میں ایک دوسرے کے دشمن رہیں گے۔ مگر اس میدان سے باہر ایک دوسرے کے دوست بن کر رہ سکتے ہیں۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میرے ساتھ چلو میرا قیام ایک ہوٹل میں ہے۔"

میں نے بڑی خوشی سے اس کی بات مان لی۔ وہ بھی خوش ہو گیا کہ میں کسی حیل و حجت کے بغیر اس کے دام میں آ رہا ہوں بلکہ اس کی بھتیجی کی زلفوں میں اُلجھنے جا رہا ہوں۔ پھر ہم ایک دوسرے کے شانہ بشانہ پہاڑی راستے پر چلتے ہوئے اس سمت جانے لگے جہاں بیل منڈو کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ راستے میں وہ میرے متعلق سوچ رہا تھا۔

"میں اس گونگے سے کیا باتیں کروں؟ پتہ نہیں یہ گونگا ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے بھی تو اس کے ساتھ باتیں کرنے کے لئے دونوں ہاتھوں کو نچانا پڑتا ہے۔ لعنت ہے میں کن گونگوں کے درمیان آ کر پھنس گیا ہوں۔ اس وقت یہ بالکل تنہا ہے۔ میں بڑی آسانی سے اسے مار مار کر اس کا گونگا پن دُور کر سکتا ہوں اور ابھی اس کی زبان کھلوا سکتا ہوں۔"

میرے اعصاب میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ میں بہت ہی محتاط انداز میں اس کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ وہ ضدی اور بد دماغ اپنے دماغ سے کام لئے بغیر کسی بھی لمحے مجھ پر حملہ کر سکتا ہے۔ ایسے وقت میں نے فوراً ہی ماسٹر یوشے کے ذہن میں جھانک کر دیکھا تاکہ یہ معلوم کر لوں کہ وہ شیطان اس وقت بیل منڈو کے دماغ میں جھانک رہا ہے یا نہیں؟ اگر وہ اس بد دماغ کے دماغ میں موجود ہوتا تو میں اپنے اس شانہ بشانہ چلنے والے دشمن کو سوچ کے ذریعے کنٹرول نہیں کر سکتا تھا۔ میرے نصیب اچھے تھے کہ اس وقت ماسٹر یوشے ایک وہسکی کی بوتل کھولے بیٹھا تھا اور پہلا جام بناتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ایک پیگ کے بعد وہ رُوما سے دماغی رابطہ قائم کرے گا اور اس کی سوچ میں یہ جذباتی خیال بٹھانے کی کوشش کرے گا کہ پچھلی شام جنگل میں جو بچی والا گونگا ملا تھا، وہ بہت ہینڈسم اور اسمارٹ ہے۔ سوچ کے دھارے کو کسی طرف بھی آہستہ آہستہ موڑو تو سوچنے والی نوعمر لڑکیاں رفتہ رفتہ اسی سمت مڑ جاتی ہیں۔ میں اسے ذہنی طور پر فرہاد کی طرف موڑ دوں گا۔

ماسٹر یوشے کی سوچ پڑھ کر جیسے ہی مجھے اطمینان ہوا کہ ابھی وہ کچھ دیر تک بیل منڈو کی طرف متوجہ نہیں ہو گا تو میں نے فوراً ہی اس بد دماغ کی سوچ میں کہا۔

"مجھے اس گونگے پر حملہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیئے۔ وہ نادیدہ شیطان ٹھیک ہی کہتا ہے کہ بعض اوقات میں دماغ سے کام نہیں لیتا ہوں اور کام بگاڑ دیتا ہوں۔ مجھے ذرا صبر کر کے اس شیطان کا انتظار کر لینا چاہیئے۔ جب وہ میرے دماغ میں آ کر بولے گا تو میں اس سے کہوں گا کہ جس گونگے پر فرہاد ہونے کا شبہ ہے وہ میرے ساتھ ہوٹل انٹر کان کی طرف جا رہا ہے۔ اگر رُوما اس سے دوستی کرنے میں کامیاب ہو گئی تو تمہارے یہاں پہنچنے تک یہ ہماری نظروں کے سامنے رہے گا۔ مگر میں تمہارے یہاں پہنچنے تک اس تنہا اور نہتے آدمی کو اپنے قابو میں کر سکتا ہوں۔ میں ہوٹل پہنچ کر ایک بند کمرے میں اس کی ایسی پٹائی کروں گا اور اسے ایسی اذیتیں پہنچاؤں گا کہ یہ زبان کھولنے پر مجبور ہو جائے گا۔ ہاں، میں ایسا کر سکتا ہوں۔ مگر پتہ نہیں وہ شیطان کہاں چلا گیا۔ اگر وہ اس وقت میرے دماغ میں ہوتا تو میں اس گونگے پر حملہ کرنے کی اجازت مانگتا۔"

میں بیل منڈو کو اس کی سوچ میں سمجھا رہا تھا۔ اس کی سوچ نے کہا۔

"ہاں، مجھے اس شیطان کی اجازت کے بغیر اتنا بڑا قدم نہیں اُٹھانا چاہیئے۔ اگر میرے ساتھ چلنے والا یہ گونگا واقعی فرہاد ہے تو یہ اپنی چالاکیوں سے کسی طرح بچ بھی سکتا ہے اور میرے ہاتھوں سے نکل کر پھر کہیں جا سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ شیطان مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ میرے اور میری رُوما کے دماغ پر ہمیشہ مسلط رہے گا اور ہمیں ناقابلِ برداشت اذیتیں پہنچاتا رہے گا — نہیں، میں اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتا۔ وہ شیطان جو کہتا ہے مجھے اسی پر عمل کرنا چاہیئے۔ وہ خود یہاں پہنچ کر اس سے نمٹ لے گا۔"

بیل منڈو کے سوچنے کا انداز بدل کر مجھے اطمینان ہو گیا۔ ہم دونوں پہاڑی راستہ طے کرنے کے بعد اس کی کار تک پہنچ گئے۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور میں اس کی برابر والی سیٹ پر آ گیا۔ پھر کار اسٹارٹ ہوئی اور پنڈی کی طرف جانے لگی۔ ڈرائیونگ کے دوران وہ ہاتھ کے اشاروں سے باتیں کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ یوں بھی وہ مجھ سے بیزار تھا کیونکہ میری ہی وجہ سے وہ اور اس کی بھتیجی ذہنی عذاب میں مبتلا تھے۔ بظاہر دوستی کرنے کے باوجود وہ میرا جانی دشمن تھا، اسی لئے باتیں کرنے سے کترا رہا تھا۔ میں بھی مطمئن ہو کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر ماسٹر یوشے کو پڑھنے لگا۔ پھر اسے چھوڑ کر رُوما کے دماغ میں جھانکنے لگا کیونکہ ماسٹر یوشے کی سوچ بھی وہیں موجود تھی۔

رُوما اس وقت گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی اور اپنے طور پر ایک دلگداز سپنا دیکھ رہی تھی۔ وہ نوعمر حسینہ اپنی زندگی میں جس پہلے نوجوان سے متاثر ہوئی تھی، وہ اس کا باڈی گارڈ وسیم تھا جو اس کے

دوسرے باڈی گارڈ کے ہاتھوں پچھلے دن مارا گیا تھا۔ اسی واقعہ کی مناسبت سے وہ اپنے خواب میں ایک خوبصورت گڈے کو دیکھ رہی تھی جسے ایک سانپ نے آکر ڈس لیا تھا۔ بچپن اور جوانی کے درمیان جو عمر ہوتی ہے اس میں لڑکیاں اپنے نہ سمجھ میں آنے والے جذبوں کو گڑیا اور گڈے کے رُوپ میں دیکھتی ہیں۔ ہم ٹیلی پیتھی جاننے والے جاگتی ہوئی سوچ سے لیکر خوابیدہ سوچ تک انسانی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اسی نفسیات کے پیشِ نظر ماسٹر یوشئے، رُوما کو اس کے خواب میں ہولے ہولے سمجھا رہا تھا۔

"یہ گڈا نہیں ہے بے بی ـــ اور تم بھی اب بے بی نہیں ہو۔ جوانی کی آنکھ سے دیکھو، یہ وہی ہے جسے تم چاہتی تھیں اور یہ سانپ وہ دوسرا باڈی گارڈ ہے جس نے تمہاری محبت کو ڈس لیا تھا۔"

ماسٹر یُوشئے کے سمجھانے کے مطابق رُوما کے خواب میں آنے والے چہرے بدلنے لگے، وہ گڈے کی جگہ وسیم کو اور سانپ کی جگہ ڈرائیور باڈی گارڈ کو دیکھنے لگی۔ ماسٹر یوشئے کی سوچ نے کہا۔

"کھلونے ٹوٹتے ہی رہتے ہیں، ان کی جگہ دوسرے بہتر کھلونے خرید لئے جاتے ہیں۔ جو محبت کا ایک لفظ ادا کئے بغیر مر جائے اور اتنا کمزور ہو کہ تمہارا تحفظ نہ کر سکے، اس کے لئے افسوس کرنے اور اس کے سپنے دیکھنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ تم اُس کے متعلق سوچو اور اُسے اپنے سپنے میں دیکھو جو گونگا تھا اور بہت ہی ہینڈسم اور اسمارٹ تھا۔"

سپنے کی اسکرین پر گونگا چیتل نظر آیا جو دلیر تھا اور جس نے ڈرائیور باڈی گارڈ کو مار ڈالا تھا۔ ماسٹر یوشئے کی سوچ نے کہا۔

"وہ گونگا دلیر ضرور ہے۔ مگر ایسا اسمارٹ نہیں ہے کہ تمہارے شانہ بشانہ کھڑا ہو سکے۔ اس گونگے کے متعلق سوچو جو اس کے بعد ایک اٹیچی اُٹھائے تمہارے سامنے آیا تھا۔"

ماسٹر یوشئے کی سوچ اس کے سپنے میں آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی اور سپنا دیکھنے کے انداز کو بدل رہی تھی۔ خواب کا تعلق لاشعور سے ہوتا ہے اور لاشعور دماغ کا ایک تاریک حصہ ہے۔ چونکہ اس کا تعلق دماغ سے ہے اور سوچنے کی قوت سے ہے، اسی لئے ٹیلی پیتھی جاننے والے سپنوں کی رہگذر تک پہنچ جاتے ہیں۔ ماسٹر یوشئے نے میرے متعلق تحریک پیدا کی تو وہ سپنے میں مجھے بھی اسی جگہ دیکھنے لگی۔ پچھلے دن وہ اُس جگہ میرے سامنے زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکی تھی۔ لیکن سپنا ایک جگہ ٹھہر گیا تھا اور اُس کی سوچ بھی مجھ پر آکر ٹھہر گئی تھی۔ ماسٹر یوشئے اس کی سوچ میں کہہ رہا تھا۔

"ہاں۔ یہ گونگا واقعی ہینڈسم ہے۔ یہ مجھے اس طرح پہلے کیوں نظر نہیں آیا ہے جس طرح کہ اب نظر آرہا ہے۔ دراصل مجھے وہاں ٹھہرنے کا موقع نہیں ملا تھا اس لئے میں اسے دل بھر کر نہیں دیکھ سکی تھی۔ ہاں یہی تو وہ ہے جس کی ہلکی سی تصویر میں نے وسیم میں دیکھی تھی۔ لیکن وسیم ایسا مکمل نہیں ہو سکا جیسا کہ یہ مکمل آئیڈیل نظر آرہا ہے۔ میں کیسی نادان ہوں کہ اسے دیکھنے کے باوجود بھلا چکی تھی۔ مگر اب اسے نہیں بھلاؤں گی اسے اپنے خوابوں اور خیالوں میں بساؤں گی۔ کہتے ہیں کہ لگن سچی ہو تو خوابوں کا شہزادہ حقیقی زندگی میں چلا آتا ہے۔ میں اپنی لگن کو آزماؤں گی اور دیکھوں گی کہ یہ سچ مچ میری زندگی میں آتا ہے یا نہیں ـــ اب مجھے کروٹ بدلنا چاہیئے۔"

نیند میں کروٹ بدلتے ہی اس کی آنکھ کھُل گئی۔ سپنے ٹوٹ گئے اور وہ کھُلی آنکھوں سے کمرے میں چاروں طرف تکنے لگی۔ ماسٹر یوشئے نے ذرا دیر کے لئے بیل مُنڈو کے دماغ میں جھانک کر دیکھا اور پتہ چلایا کہ وہ میرے ساتھ ہوٹل انٹرکان کے احاطے میں پہنچ چکا ہے، یہ معلوم کرتے ہی وہ پھر رُوما کی طرف پلٹ گیا۔ پھر اُس کی سوچ میں بیتے ہوئے سپنے کی یاد تازہ کرنے لگا۔

"میں خواب میں اس اٹیچی والے گونگے کو کیوں دیکھ رہی تھی؟ انکل تو اس کے دشمن ہیں۔ کیا میں اپنے انکل کے دشمنوں کی تمنا کر سکتی ہوں؟ اگر نہیں کر سکتی تو پھر اُسے سپنے میں کیوں دیکھا؟"

رُوما اپنے طور سے سوچنے لگی۔

"سپنے جھُوٹے بھی ہوتے ہیں۔ بس وہ خواہ مخواہ ہی سپنے میں چلا آیا تھا۔"

ماسٹر یوشئے نے اُس کی سوچ میں کہا۔

"اگر میں نے سپنے میں اُسے خواہ مخواہ دیکھا ہے تو وہ میرے سامنے کبھی نہیں آئے گا اور اگر میرا سپنا سچا ہے تو میں اپنی لگن کو آزماؤں گی اور دیکھوں گی کہ وہ میرے سامنے آتا ہے یا نہیں؟"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونک کر اُس طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اُس کے سوچتے ہی وہ دستک دینے چلا آیا ہو۔ پھر اُسے اپنی احمقانہ سوچ پر ہنسی آگئی۔ وہ سوچنے لگی۔

"میں نیند کی حالت میں کیسی فضول سی باتیں سوچتی جا رہی ہوں۔ بھلا کبھی ایسا ہوا ہے کہ جسے سپنے میں دیکھو، وہ آنکھ کھُلتے ہی سامنے چلا آئے۔"

اُس نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھا، ساڑھے تین بج رہے تھے رات کے پچھلے پہر اُس کے انکل کے سوا کوئی دوسرا اس کے کمرے پر دستک دینے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بستر سے اُٹھ کر دروازے کے پاس آئی اور اُسے کھول دیا۔

کھُلے ہوئے دروازے پر بیل مُنڈو کھڑا ہوا تھا۔ اُس کے ایک جانب اس کا باڈی گارڈ تھا۔ لیکن دوسری جانب دیکھتے ہی وہ حیران رہ گئی۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ جسے ابھی ابھی وہ سپنے میں دیکھ چکی تھی۔ وہ کھُلی آنکھوں کے سامنے نظر آرہا تھا۔ اُس نے اپنا ایک ہاتھ اُٹھا کر اپنے بازو میں چٹکی لی۔ پھر تکلیف سے "سی" کر کے رہ گئی۔ تکلیف کے احساس نے سمجھا دیا تھا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہی ہے۔ بلکہ وہ گونگا سچ مچ اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہے۔

بیل مُنڈو نے رُوما کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے بے بی؟ تم اپنے بازو میں چٹکی کیوں بھر رہی ہو؟"

"انکل! ابھی میں نے جو خواب دیکھا ہے، وہ اتنی جلد حقیقت بن گیا ہے کہ مجھے حیرانی ہو رہی ہے۔ اسی لئے میں چٹکی لے کر یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ کہیں میں ابھی تک خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔"

بیل مُنڈو نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "یُو سلی بے بی ـــ تم نے خواب میں کیا دیکھا اور اب کیا دیکھ رہی ہو؟ ویسے مجھے یقین ہے کہ میری بے بی نے مجھے ہی دیکھا ہے۔"

"نہیں انکل! آپ کو نہیں۔ میں نے اس گونگے کو دیکھا ہے۔ کتنی عجیب سی بات ہے کہ آنکھ کھُلتے ہی آپ اُسے میرے پاس لے آئے ہیں۔"

بیل مُنڈو نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے رُوما سے کہا۔ "اچھا تو تم میرے اس دوست کو دیکھ رہی تھیں؟"

"دوست؟" رُوما نے حیرانی سے پوچھا۔ "مگر آپ تو تمام گونگوں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں پھر یہ ـــ؟"

"وہ میری بھُول تھی۔ یہ میرا دشمن نہیں ہے۔ کیا تم ساری باتیں دروازے پر ہی کرو گی۔ میرے دوست کی خاطر مدارات نہیں کرو گی؟"

رُوما نے جلدی سے کہا۔ "ہاں، کیوں نہیں۔ اندر آجایئے۔"

میں، بیل مُنڈو اور اس کے باڈی گارڈ کے ساتھ رُوما کے کمرے میں آگیا۔ رُوما نے مجھے بیٹھنے کے لئے ایک کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے میں نے دیکھا، بیل مُنڈو کا باڈی گارڈ اپنی جیب سے نسوار کی ڈبیا نکال کر اور اس میں سے ایک چٹکی نسوار لے کر اپنی ناک کے نتھنوں میں رکھ رہا تھا۔ بعض لوگوں کو نسوار ناک میں لیکر سونگھنے کی عادت ہوتی ہے۔ چھینک نہ آئے تو خواہ مخواہ نسوار کے ذریعے چھینک چھینک کر پتہ نہیں دماغ سے کیسا غبار نکالتے رہتے ہیں۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میری توجہ اُس کی نسوار کی ڈبیا پر کیوں مرکوز ہو گئی تھی۔ پھر بیل مُنڈو نے ہی اشاروں سے مجھے متوجہ کیا۔ وہ گونگے اشاروں سے مجھے سمجھا رہا تھا۔

"تم یہاں بیٹھو۔ میرا باڈی گارڈ کافی کا آرڈر دینے جا رہا ہے۔ ہم ابھی آتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ رُوما کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔ باڈی گارڈ رُوما کے بیڈ کے پاس جا کر فون کے ذریعے کافی کا آرڈر دینے لگا۔ میں خاموش بیٹھا ہوا رُوما اور بیل مُنڈو کے درمیان ہونے والی باتیں سننے لگا۔ وہ دونوں اس کمرے سے ذرا دُور کوریڈور میں کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ بیل مُنڈو اُسے سمجھا رہا تھا۔

"بے بی! اس کمبخت گونگے سے میں نے مصلحتاً دوستی کی ہے۔ وہ نادیدہ شیطان جو ہمارے دماغوں میں ہلچل مچاتا رہتا ہے، اُس کا خیال ہے کہ یہی گونگا فرہاد ہے۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ یہ بڑی مشکلوں سے ہاتھ آیا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اپنی جسمانی قوت کو آزماؤں گا تو پھر یہ اپنی چالاکیوں سے نکل بھاگے گا۔ اس طرح ہماری پریشانیاں بڑھ جائیں گی۔"

رُوما نے اپنے انکل کو تکتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔ "انکل! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ کیا آپ کو اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہا؟ اگر وہ فرہاد ہے تو کیسے نکل کر بھاگ سکتا ہے؟ وہ میرے کمرے میں ہے، آپ کمرے کو اندر سے بند کر کے اس کا حُلیہ بگاڑ سکتے ہیں۔"

"میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ اسے ایک چٹکی میں مسل سکتا ہوں۔ لیکن بے بی ـــ یہ ہوٹل ہے۔ یہاں ذرا سی بھی ہنگامے کی آواز ہوگی تو فوراً ہی قانون کے محافظ پہنچ جائیں گے میں اس نادیدہ شیطان کے پنجے سے نکلنے کی خاطر قانون کے پنجے میں پھنس جاؤں گا۔ پھر اس نادیدہ شیطان نے وارننگ دی ہے کہ فرہاد کو اس طرح نقصان نہ پہنچایا جائے کہ وہ کسی کام کا نہ رہے۔ وہ شیطان اسے اپنا آلۂ کار بنانے کے لئے ایک طرح سے اس کا محافظ بھی بن رہا ہے۔"

"واہ، یہ کوئی بات ہوئی۔" رُوما نے غصّے سے کہا۔ "وہ ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتا جا رہا ہے اور آپ اس کی پٹائی بھی نہیں کرتے۔"

"مجبوری ہے۔ وہ جیسا کہے گا ویسا ہی کرنا ہوگا۔ اسی میں ہماری نجات ہے۔"

"مگر نجات کب ہوگی؟"

"بس دو چار روز کی بات ہے۔ وہ شیطان خود ہی فرہاد سے نمٹنے یہاں آرہا ہے۔"

"کیا واقعی؟ وہ کب آرہا ہے؟ اگر وہ میرے سامنے آجائے تو میں اُس کا خون پی لُوں گی، بزدل کہیں کا ـــ چھُپ چھُپ کر ہمیں پریشان کر رہا ہے۔"

"بے بی! وہ اتنا نادان نہیں ہے کہ یہاں پہنچتے ہی تمہاری نگاہوں کے سامنے آجائے گا۔ یہاں بھی وہ ہم سے چھُپ کر رہے گا۔ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کس دن اور کس وقت یہاں پہنچے گا۔"

رُوما مایوس ہو گئی۔ بیل مُنڈو نے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "ڈونٹ وری ـــ اس شیطان کا شکار فرہاد ہے۔ اُس نے وعدہ کیا ہے کہ یہاں پہنچتے ہی ہمیں آزاد کر دے گا اور پھر کبھی ہمیں ٹیلی پیتھی کے ذریعے پریشان نہیں کرے گا۔"

"اگر ایسا ہو جائے انکل ـــ تو میں خدا کا شکر بھی ادا کروں گی اور اس شیطان کا احسان بھی مانوں گی۔ لیکن پھر یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ یہاں کب پہنچے گا؟ کیا آپ اُس وقت تک فرہاد کو یہاں روک سکیں گے؟"

"مجھ سے زیادہ تم اسے روکنے میں کامیاب ہو سکتی ہو۔"

"میں ـــ وہ کیسے ؟"

"ایسے کہ تم اس سے دوستی کرو، اس سے لگاوٹ کی باتیں کرو۔ وہ شیطان فرہاد کی بہت سی کمزوریوں سے واقف ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ صرف رُوما اُسے یہاں روک کر رکھ سکتی ہے۔"

"لیکن میں کیسے روک سکتی ہوں ؟"

اس سوال کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں ماسٹر پوشے کی سوچ اُبھری ـــ "بے بی! میں تمہاری رہنمائی کروں گا۔ اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔"

رُوما نے اپنے انکل سے کہا۔ "انکل! وہ پھر میرے دماغ میں بول رہا ہے۔ مجھ سے کہہ رہا ہے کہ وہ میری رہنمائی کرے گا۔ اب مجھے اپنے کمرے میں جانا چاہیئے ـــ کیا میں جاؤں ؟"

"ہاں بیٹی جاؤ۔ فی الحال تمہیں اسی کا حکم ماننا چاہیئے۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ کہاں تک اپنا وعدہ پورا کرے گا۔"

ماسٹر پوشے کی سوچ نے کہا۔ "میں اپنا وعدہ اسی وقت پورا کروں گا جب رُوما اسے روکنے کے سلسلے میں میرے ہر حکم کی تعمیل کرے گی۔ اب سے ٹھیک پچاس گھنٹے بعد تم دونوں آزاد کر دیئے جاؤ گے۔"

رُوما نے بیل مُنڈو کو بتایا کہ ماسٹر پوشے اس سے کیا کہہ رہا ہے۔ وہ آزادی کی خاطر اس کے احکام کی تعمیل کے لئے جا رہی ہے۔ یہ کہہ کر وہ میری طرف آنے لگی۔ اسی وقت ایک بیرا کافی کی ٹرے لے آیا تھا۔ رُوما اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچی تو ماسٹر پوشے نے اسے روک کر ہدایت دی۔

"سنو ـــ فرہاد کے سامنے ہمیشہ مُسکراتی رہو۔ ایسے مُسکراتی رہو جیسے وہ تمہارا آئیڈیل ہو، جیسے وہ تمہارے برسوں کا خواب ہو اور ان خوابوں کی تعبیر بن کر سامنے آگیا ہو۔"

ماسٹر پوشے کی اس ہدایت کے ساتھ ہی اسے اپنا خواب یاد آگیا۔ میں سچ مچ اس کے خواب میں ایک آئیڈیل کی طرح نظر آیا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لئے اُلجھ گئی۔ میں دشمن بھی تھا اور اس کے سپنوں کا شہزادہ بھی تھا۔ بہرحال میں جو کچھ بھی تھا، اُسے ہر حال میں مُسکرانا پڑتا۔ لہٰذا وہ مُسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہ سامنے آئی تو میں بھی اسے دیکھ کر مُسکرانے لگا۔ وہ میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ کر میرے لئے کافی بنانے لگی۔ ماسٹر پوشے نے پوچھا۔

"فرہاد کے علاوہ کمرے میں اور کون ہے ؟"

رُوما نے سوچ کے ذریعے جواب دیا کہ اس کے انکل کا ایک باڈی گارڈ ہے۔ سوچ کی دُنیا میں باڈی گارڈ کا ذکر ہوا تو پھر مجھے وہ نسوار کی ڈبیا یاد آ گئی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک روشنی سی اُبھری۔ ایک بہت ہی عمدہ سی تدبیر کا ہلکا سا خاکہ ذہن میں آیا۔ میرے دماغ نے مجھے سمجھا دیا کہ وہ نسوار کی ڈبیا میرے کسی کام آسکتی ہے۔ اس وقت ماسٹر پوشے رُوما سے کہہ رہا تھا۔

"اس باڈی گارڈ کو باہر جانے کے لئے کہو اور اپنے کمرے کو اندر سے بند کر لو۔"

رُوما نے باڈی گارڈ کی طرف مُنہ پھیر کر کہا۔ "تم اب جا کر آرام کرو۔ مجھے ضرورت ہو گی تو تمہیں بُلا لوں گی۔"

وہ اس کا حکم سُن کر جانے لگا تو میں نے ہاتھ بڑھا کر رُوما کو اپنی طرف مخاطب کیا اور اشارے سے اُسے سمجھایا کہ مجھے نسوار چاہیئے۔ رُوما نے باڈی گارڈ کو روک کر اس سے نسوار کی ڈبیا طلب کی۔ پھر اُس سے وہ ڈبیا لے کر میری طرف بڑھا دی۔ میں نے وہ ڈبیا لے کر اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ رُوما نے پوچھا۔

"کیا اسے استعمال نہیں کرو گے ؟"

میں نے اشاروں میں جواب دیا۔ "میں سونے سے پہلے اسے تھوڑا سا استعمال کروں گا۔ پھر صبح اُٹھنے کے بعد بھی یہ میرے کام آئے گی۔ اس ڈبیا کو میری جیب میں رہنے دو۔"

میں نے اپنی جیب کو تھپتھپا کر بتایا کہ ڈبیا وہاں رہے گی۔ رُوما نے باڈی گارڈ کو جانے کا اشارہ کیا تو وہ چُپ چاپ چلا گیا۔ نسوار کی ڈبیا کے لین دین کے سلسلے میں وہاں جو کچھ بھی ہو رہا تھا، اسے رُوما کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں اور اس کا دماغ ماسٹر پوشے کو تمام سچویشن سے آگاہ کر رہا تھا۔ اُس نے رُوما سے کہا۔

"ٹھیک ہے، فرہاد کی ہر خواہش پوری کرو۔ آج یہ معلوم ہو گیا کہ وہ نسوار پسند کرتا ہے۔ میں اس کی تمام عادات سے واقف ہونا چاہتا ہوں۔ بے بی ـــ تمہاری سوچ بتا رہی ہے کہ تم ابھی تک اپنی جگہ بیٹھی ہوئی ہو۔ وہاں سے اُٹھ کر دروازے کو اندر سے بند نہیں کیا ہے۔ کیری آن مائی آرڈر۔"

وہ فوراً ہی اُٹھ گئی اور آگے بڑھ کر دروازے کو بند کر دیا۔ جب وہ دروازے کے پاس سے پلٹنے لگی تو ماسٹر پوشے نے اس سے پوچھا۔

"بے بی! اپنے لباس کے متعلق بتاؤ۔ اس وقت تم نے کیا پہن رکھا ہے ؟"

اس نے سوچ کے ذریعے بتایا۔ "میں نے ریشم کی نائٹی پہنی ہوئی ہے۔"

"صرف نائٹی ؟"

رُوما نے جھنجلا کر کہا۔ "یہ پوچھنے والے تم کون ہوتے ہو؟ تم صرف اپنے کام سے مطلب رکھو۔"

"میں اپنے مطلب کی ہی بات کر رہا ہوں۔ یہ میرا حکم ہے کہ تم باتھ روم میں جاؤ اور جب وہاں سے نکلو تو تمہارے بدن پر صرف نائٹی رہے۔ اس دیوانے کو بتاؤ کہ حریری پردوں سے بدن کی چاندنی کیسے چھلکتی ہے ؟"

"میں ایسا نہیں کروں گی۔ تم بہت ہی کمینے شیطان ہو۔"

"شیطان کمینہ ہی ہوتا ہے بے بی! وہ جو بھی کر گزرے کم ہے۔ میں تین تک گن رہا ہوں۔ تین کے بعد تم اپنے انکل کے کمرے میں جا کر اسے دیکھنا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیختا ملے گا۔ فرہاد ابھی ہماری مٹھی میں ہے۔ میں تم لوگوں کی ذرا سی بھی حکم عدولی پسند نہیں کروں گا۔ ایک ـــ دو ......"

"میں باتھ روم میں جا رہی ہوں۔"

وہ گھبرا کر جلدی سے باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ جب باتھ روم کا دروازہ بند ہو گیا تو میں مُسکرا کر کافی کی چُسکیاں لینے لگا۔ ماسٹر پوشے سوچ کے ذریعے اُسے سمجھا رہا تھا کہ اسے کس طرح آہستہ آہستہ اپنے اچھوتے بدن کی نمائش کرنی ہے اور کس طرح اپنی جوانی کا چارہ ڈال کر ایک جانور کو اسی جگہ کھونٹی سے باندھ کر رکھنا ہے۔

رُوما اس سے التجائیں کر رہی تھی کہ وہ مجھے پھانسنے کے لئے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرے اور ماسٹر پوشے اسے سمجھا رہا تھا۔

"بے بی! میں فرہاد کو تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ تم لوگ مجھے شیطان کہتے ہو اور میں کہتا ہوں، وہ مجھ سے بڑا شیطان ہے۔ اس وقت میں اُسے وہاں روکنے کے لئے وہ تمام حربے استعمال کروں گا جو اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال سکتے ہیں۔ اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ تم سب سے خوبصورت زنجیر ہو۔"

رُوما نے عاجزی سے کہا۔ "میں اپنی مرضی کے خلاف خود کو اس کے سامنے کیسے پیش کروں گی ؟ یہ درست ہے کہ وہ بڑے ہی عجیب انداز میں پہلے خواب میں آیا، پھر میرے کمرے میں آیا ہے۔ یہ سوچ کر اس کی ذات سے ایک عجیب سی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ میں ذہنی طور پر اس کی طرف جُھک رہی ہوں۔ مگر معیار بھی تو کوئی چیز ہے۔ میں نے بچپن سے ہی دیکھا ہے کہ یہ ایشیائی لوگ ہم سے کمتر ہوتے ہیں۔ انکل بھی ایسے لوگوں کو صرف ملازم بنا کر خوش ہوتے ہیں۔ پھر میں اپنی سطح سے گر کر خود کو اس کے سامنے کیسے گرا دوں ؟"

"یہ درُست ہے کہ تمہارا وہ سر پھرا انکل ایسے لوگوں کو غلام بنا کر خوش ہوتا ہے۔ مگر یہ نہ بھولو کہ تم دونوں میرے غلام ہو۔ اس غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے کبھی اپنی جان کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ اور کبھی اپنی سطح سے گر کر اپنے بدن کے سرمائے کو بھی لُٹانا پڑتا ہے۔ لہٰذا فوراً فیصلہ کرو کہ آزادی چاہتی ہو یا دائمی غلامی ؟ میں بار بار نہیں سمجھاؤں گا۔ وقت کم ہے اور وہ کمرے میں تنہا بیٹھا بور ہو رہا ہو گا۔ جاؤ اس کی تفریح اور اس کی دلچسپیوں کا خاص خیال رکھو۔ یہی نجات کا راستہ ہے۔"

میں رُوما جیسی نوخیز کلی کو دیکھ کر بڑے موڈ میں تھا لیکن اُس کی باتیں سُن کر میرے دل میں اس کے لئے نفرت پیدا ہو رہی تھی۔ اسے خواہ مخواہ یہ غرور تھا کہ وہ اور اس کی قوم ہم سے برتر ہے۔ میں اس وقت اس کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھا کر اس کے سارے غرور کو خاک میں ملا سکتا تھا۔ میرے سامنے ایک لفافے کی طرح کھُل جانے کے بعد وہ ایک عام بازاری عورت کی سطح پر آ جاتی۔ اپنی راضی خوشی سے آنا اور بات ہے۔ بازار میں آنے والیاں یا تو دولت کے حصول کے لئے آتی ہیں یا کسی مجبوری سے آتی ہیں یا پھر اپنے کسی خاص مقصد کے تحت آتی ہیں۔ رُوما بھی اپنے ایک خاص مقصد کے تحت میرے پاس آنے والی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ وہ ایک شیطان سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ یعنی میرے پاس آنے میں اُس کی ایک غرض تھی۔ محبت اور خوشی نہیں تھی۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو وہ ایک عام بازاری عورت کی سطح پر میری طرف آ رہی تھی۔

دروازہ کھُل گیا۔ وہ ریشم کی نائٹی پہنے باتھ روم کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

احساسات کے ہجوم میں سمجھا جائے تو ایک کچے پھل کی دھیمی دھیمی سی خوشبو محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہ ایک کچے پھل کی طرح تھی جو پکنے پر آ رہی تھی۔ پھل پکنے کے بعد شاخ سے ٹوٹ کر گرتا ہے اور وہ پکنے سے پہلے ہی اپنی بلندی سے ٹوٹ کر آ رہی تھی۔

وہ جبراً مُسکرا رہی تھی۔ اپنی خوشی ہو یا جبری کوشش ہو، ان سب کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے۔ ماسٹر پوشے نے اس کے دماغ کو پڑھتے ہوئے کہا۔

"تم جبراً کیوں مُسکرا رہی ہو ؟ کیا تم یہ بھول جاتی ہو کہ میں تمہارے دماغ میں بیٹھا ہوا ہوں اور تمہارے دل و دماغ کی ایک ایک بات کو پڑھ سکتا ہوں۔ اچھی طرح سُن لو، اگر فرہاد کو لُبھانے اور اسے روکنے کے سلسلے میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو میں تمہیں اور تمہارے انکل کو زندہ رہنے پر مجبور کروں گا اور ہر لمحہ مارتا جاؤں گا۔"

رُوما نے سوچ کے ذریعے کہا۔ "نہیں۔ اب مجھ سے کوتاہی نہیں ہو گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے یہاں آنے تک میں اس شیطان کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گی۔ اگر میری قربانی میرے انکل کے کام آسکتی ہے تو میں اپنا سب کچھ قربان کر دوں گی۔"

میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ ایسی مجبوری کے تحت دی جانے والی قربانی میں قبول نہیں کروں گا۔ وہ جب تک اپنے سامنے والے کو برتر نہیں سمجھے گی، ایک مرد بھی اپنی فطرت کے خلاف اس کے سامنے کمتر بن کر نہیں جھکے گا۔ دونوں ہاتھوں سے تالی بجے تو وہ قدرے سُریلی ہوتی ہے ورنہ بے سُری ہو جاتی ہے۔

اب وہ سنبھل گئی تھی اور بڑے ہی قاتلانہ انداز میں مُسکراتی ہوئی پھولوں بھری شاخ کی طرح لچکتی ہوئی میرے قریب آ رہی تھی۔ میں کُرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور کافی کی خالی پیالی کو میز پر رکھ رہا تھا۔ وہ میرے سامنے

فرش پر دوزانو بیٹھ کر اشاروں سے پوچھنے لگی۔

"اور یہ ہوگئے ؟"

کرسی کے ہتھے پر میرا ہاتھ تھا۔ اُس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ میری طرف اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ کھلے ہوئے گریبان کے پیچھے میری نظریں دُور تک پہنچنے لگیں۔ میں نے ایک احمق کی طرح اس کے گریبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گونگی زبان میں کہا۔

"اِسے درست کرو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔"

وہ حیرانی سے میرا مُنہ تکنے لگی۔ جو کچھ میں نے اس سے کہا تھا اس کا ردِعمل اس کی آنکھوں اور اس کے دماغ تک ہوا تھا۔ ماسٹر لوشے نے بھی حیرانی سے کہا۔

"تعجب ہے، یہ تو بہت ہی پارسا بن رہا ہے۔"

رُوما کی سوچ نے کہا۔ "مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ یہ میری طرف مائل نہیں ہو رہا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" ماسٹر لوشے کی جھلاہٹ سُنائی دی۔ "کیا تمہیں اپنی توہین کا احساس نہیں ہو رہا ہے کہ تمہارے اپنے وجود کی کوئی اہمیت نہیں ہے، کوئی کشش اور جاذبیت نہیں ہے۔ تم کہیں سے ٹوٹی پھوٹی ہو، کہیں سے بگڑی ہوئی ہو۔ کچھ اس طرح کہ سامنے والا تم پر ایک نظر ڈالے اور حقارت سے تمہیں پیچھے ہٹنے کے لئے کہے ....."

"میں ایسی نہیں ہوں۔" وہ بھی جھنجلا کر سوچ کے ذریعے گفتگو کرنے کے بجائے بڑبڑانے لگی۔ "میں اتنی حسین اور اسمارٹ ہوں کہ دیکھنے والے مجھے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ یہ گونگا کیا جانے کہ حُسن کا معیار کیا ہوتا ہے اور کس طرح صنفِ نازک کی قدر کی جاتی ہے۔"

ماسٹر لوشے نے سخت لہجے میں کہا۔ "زیادہ باتیں نہ کرو، وقت کی اہمیت کو سمجھو۔ اگر تم ایک چمکتا ہوا سکہ ہو تو فرہاد جھک کر تمہیں فرش پر سے اُٹھالے گا۔ اپنی چمک کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرو۔"

شیطان کی ایک کنیز کو شیطان کے حکم پر عمل کرنا پڑا۔ وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ پھر میری جانب دیکھ کر مُسکرانے لگی۔ اُس نے اپنے گریبان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کیا تم مجھ سے ڈرتے ہو؟"

میں نے اسے اشاروں میں سمجھایا۔ "میں عورتوں سے نہیں ڈرتا۔ مگر میں تمہیں عورت نہیں سمجھتا۔ میں نے اپنی زندگی میں تم سے بھی زیادہ حسین لڑکیاں دیکھی ہیں اور ان کے ساتھ بہت سا وقت گزارا ہے۔"

اس کے اُجلے شفاف چہرے پر ایک سایہ سا رینگنے لگا۔ وہ اس توہین کے احساس سے ذرا مُرجھا گئی کہ وہ مقابلتاً دوسری عورتوں سے کمتر ہے۔ میرا یہ انداز اس کے دل میں نشتر کی طرح اُتر گیا۔ اس کی عجیب حالت تھی۔ ایک ہی وقت میں غصہ بھی آرہا تھا۔ اسی وقت یہ بھی لازمی ہوگیا تھا کہ وہ اپنی اہمیت کا مجھے احساس دلائے۔ وہ سوچ ہی سوچ میں مجھے گالیاں دے رہی تھی اور یہ طریقہ بھی سوچ رہی تھی کہ کس طرح وہ مجھے اپنی طرف جھکا سکتی ہے اور جب میں مجبور ہو جاؤں گا اور جب میرے جھکنے کا وقت آئے گا تو وہ حقارت کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے کترا جائے گی۔

ماسٹر لوشے اس کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔

"ہاں شاباش! تمہیں اسی انداز میں سوچنا چاہیئے میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ آج ہی تنہائی کا یہ ڈرامہ اپنے اختتام تک نہ پہنچے اسے دوسرے اور تیسرے دن تک للچاتے رہنے کے لئے یا اسے گھائل کرتے رہنے کے لئے تمہیں اپنے اندر شبابی بارُود کا ذخیرہ بچا کر رکھنا چاہیئے۔"

رُوما حالات کے تحت کچھ اور بے باک ہوگئی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر کسی کام کے بہانے کبھی بیڈ کی طرف، کبھی شیشے کی گیلری کی طرف جانے لگی۔ اس دوران چلنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ مقابلہ حُسن میں کامیاب ہونے کے لئے خود کو ہر زاویے سے پوز کر رہی ہو۔ میں اُس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا صرف اس کی سوچ کے ذریعے اس کی اداؤں کو پڑھ رہا تھا۔ پھر میں نے لاپرواہی کا اظہار کرنے کے لئے ایک سگریٹ نکال کر سُلگا لیا اور کرسی کی پُشت سے ٹیک لگا کر اس کے گہرے کش لینے لگا۔

وہ غصے سے پیچ و تاب کھانے لگی کیونکہ مجھے اس سے زیادہ سگریٹ کے دھوئیں سے دلچسپی تھی جو فضا میں جھمک رہا تھا اور بل کھا رہا تھا اور نگاہوں کے سامنے نازک بدن کی طرح لہرا لہرا کر منتشر ہو رہا تھا اور فضا کی آغوش میں گُم ہو رہا تھا۔ رُوما کی جھنجلاہٹ کو ماسٹر لوشے سمجھ رہا تھا اور خود بھی پریشان تھا کہ میں اتنی حسین لڑکی میں دلچسپی کیوں نہیں لے رہا ہوں۔ ساتھ ہی وہ اس بات کا اعتراف کر رہا تھا کہ میں بہت زیادہ محتاط رہنے کا عادی ہوں۔ دشمنوں کے درمیان رہ کر اس دنیا کی تمام دلچسپیوں سے خالی ہو جاتا ہوں۔

رُوما اور ماسٹر لوشے کی جھنجلاہٹ اور ناکامی سے محظوظ ہوتے رہنے کے بعد میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گونگی زبان میں پوچھا۔

"وہ مُنڈے ہوئے سر والا آدمی کہاں ہے؟ میں کب تک یہاں بیٹھا رہوں گا۔ تم بہت واہیات لڑکی ہو، تم جاؤ اور اسے یہاں بھیج دو۔"

وہ غصے کی شدت سے مٹھیاں بھینچ کر میری طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اپنے نازک گھونسوں سے مجھے مار ڈالے گی۔

"رُک جاؤ۔" ماسٹر لوشے نے اسے حکم دیا۔ مگر اس وقت اسے اپنی توہین کا احساس اس شدت سے ہو رہا تھا کہ وہ ماسٹر لوشے کی شیطانیت کو بھی بھول گئی تھی۔ وہ رُکنے کی بجائے سیدھی میرے پاس آئی اور مجھے [illegible] کے لئے مجھ پر [illegible] میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ وہ غصے سے چیختی اور [illegible] اپنے ہاتھوں کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر اسے دونوں بازوؤں [illegible] جکڑ لیا تاکہ وہ

[...]ہ چلا سکے۔ وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی اور خود کو چھڑانے کے لئے اِدھر سے اُدھر مچلنا چاہتی تھی۔ لیکن حلقہ بہت تنگ تھا۔

میں حیران تھا کہ ماسٹر [...]شے اسے کنٹرول کیوں نہیں کر رہا ہے۔ اس کا دماغ اس شیطان سے [...] تھا اور وہ شدید غصے کی حالت میں سوچ رہی تھی کہ مجھے اس گونگے [...] مُنہ پر تھوک دینا چاہیئے۔ وہ اپنی سوچ پر عمل نہ کرسکی۔

وہ ذرا تلملائی۔ پھر اُس کی جدوجہد سُست پڑنے لگی۔ [...]اں سچویشن کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ خیالوں کی دُنیا میں بارہا [...]الیے خیالی آئیڈیل کو دیکھ چکی تھی جو اُس پر اس انداز سے حاوی ہوتا [...]تھا۔ وہ خواب و خیال سے نکل کر حقیقت میں یہ سب دیکھ رہی تھی۔ [...]حقیقتاً اس پر یہ سب کچھ بیت رہا تھا۔ لہٰذا بدلی ہوئی سچویشن کو [...]جھنے کے لئے اُس نے جتنی دیر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اتنی دیر میں [...]جذبات اس پر حاوی ہونے لگے۔

ماسٹر لوشے واقعی شیطان تھا۔ وہ ایسے ہی موقع کے انتظار میں [...]خوشی سے تماشا دیکھ رہا تھا جب رُوما کی ذہنی رو ذرا سا بہکنے پر آمادہ [...]ہوئی تو وہ سوچ کے ذریعے اسے اور شہ دینے لگا۔ وہ اس کی سوچ میں [...]بول رہا تھا۔

"میں خواہ مخواہ ضد کیوں کر رہی ہوں جبکہ اسے خیالوں میں ڈھونڈتی [...]رہی تھی۔ جبکہ اسے خواب میں دیکھا اور آنکھ کھلتے ہی نگاہوں کے سامنے [...]میں نوم کے ملائم بستر پر سوتی رہی کبھی اُوندھے مُنہ لیٹی رہی مگر سینے [...]پہ یہ بوجھ نہیں پڑا جو ناقابلِ برداشت ہونے ہوئے بھی برداشت [...]کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آج مجھے پتہ چلا کہ میں کیا چاہتی تھی میں ضدی اور [...]ہٹ لڑکی ہوں کسی کی محکوم بن کر نہیں رہنا چاہتی تھی۔ مگر اب معلوم [...]ہوا ہے کہ محکوم بننے اور مظلوم بن کر کسی اپنے کا ظلم سہنے سے ایسی [...]لذتوں سے آگاہی ہوتی ہے جن کے متعلق پہلے صرف سُنا تھا۔ مگر ان [...]لذتوں کی حقیقت اور اہمیت سننے سے سمجھ میں نہیں آتی۔ ذاتی طور پر [...]سنگین تجربات سے گزرنے کے بعد وہ خوشیاں ملتی ہیں جنہیں اب [...]سمجھ رہی ہوں۔"

[...]سٹر لوشے اسے سمجھا رہا تھا۔ سمجھنے کے دوران رُوما کے ذہن [...]پیار سُرور چھا رہا تھا جو اس کے لئے انجانا تھا۔ مگر جیسے اب وہ جان [...]رہی تھی۔ اسی وقت دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔ اس [...]دستک نے رُوما کو مدہوش کُن خیالات سے چونکا دیا۔ وہ جانی انجانی مسرتوں [...]کی دُنیا سے پلٹ کر میرا مُنہ تکنے لگی۔ وہ چند لمحوں تک سوچتی رہی کہ وہ [...]ابھی تک کہاں تھی اور کس حال میں تھی۔ پھر اُس نے شکست خوردہ [...]لہجے میں کہا۔

"چھوڑ دو مجھے ....."

وہ اپنے چہرے سے بیزاری ظاہر کر رہی تھی۔ مگر لہجے میں التجا تھی۔ میں یہ بات اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ وہ اسی طرح میری گرفت میں رہی تو ذرا سی دیر میں پگھل جائے گی۔ کیونکہ ماسٹر لوشے بھی اس کے ذہن کو میری طرف مائل کر رہا تھا۔ لیکن میں اسے اس طرح پگھلانا نہیں چاہتا تھا۔ عورت اور مرد کے جذبات ایک سنگم پر آکر کون سا رُخ اختیار کرتے ہیں۔ ان تمام جذبوں کو میں اسے قسطوں میں سمجھانا چاہتا تھا

۔ لہٰذا میں نے اسے سوچنے کے لئے چھوڑ دیا۔

وہ مجھ سے الگ تو ہوگئی مگر چند لمحوں تک سر جھکائے اُدھورے جذبوں سے ہولے ہولے لرزتی رہی۔ ایسے وقت وہ کسی آخری نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے آس پاس کی دُنیا کو بھول گئی تھی۔ اسی وقت ایک بار پھر دستک ہوئی اور وہ اس حقیقی دُنیا میں واپس آگئی۔ پھر بیل مُنڈو کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ دستک دیتے ہوئے اسے مخاطب کر رہا تھا۔

"بے بی! کیا ہوگیا ہے؟ میں نے تمہارے چیخنے اور چلّانے کی آواز سُنی ہے ــــ دروازہ کھولو۔"

ایسے وقت میں نے ماسٹر لوشے کی سوچ پڑھی۔ وہ جھنجلا کر بیل مُنڈو کے متعلق سوچ رہا تھا۔

"یہ کمبخت رنگ میں بھنگ ڈالنے کیوں آگیا۔ اسے فوراً ہی حکم دینا چاہیئے کہ یہ واپس چلا جائے۔"

اس شیطان کی سوچ رُوما کے دماغ سے نکل کر بیل مُنڈو کی طرف ہوئی تاکہ وہ اسے واپس جانے کا حکم دے۔ اتنی دیر میں رُوما اپنے انکل کی آواز سُن کر ہوش میں آگئی تھی اور یہ سمجھ رہی تھی کہ اب تک میں اسے بہکا رہا تھا۔ میں نے اسے طیش دلا کر اسے اپنی آغوش میں آنے پر مجبور کر دیا تھا ورنہ وہ میرے قریب کبھی نہ آتی۔ وہ مجھ سے دُور بھاگنے کے لئے دروازے کی طرف گئی۔ تاکہ بیل مُنڈو کے لئے دروازہ کھول دے۔

اُدھر ماسٹر لوشے بیل مُنڈو کو سمجھا رہا تھا کہ اس کی بھتیجی کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ اپنی نادانی سے چیخ رہی تھی۔ اسے واپس چلا جانا چاہیئے۔ بیل مُنڈو اس کے حکم سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔ اُس نے سوچا کہ رُوما اب نہیں چیخ رہی ہے۔ اس لئے وہ بخیریت ہوگی۔ وہ واپس جانے کے لئے پلٹ رہا تھا کہ اتنے میں رُوما نے دروازہ کھول دیا۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بیل مُنڈو سمجھ گیا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے اور وہ شیطان اسے جھوٹی تسلیاں دے رہا تھا۔ ماسٹر لوشے اس وقت خاصا اُلجھ گیا تھا۔ بیل مُنڈو کو سمجھانے کے لئے اس کے دماغ تک پہنچتا تو رُوما بدک جاتی تھی۔ اگر رُوما کو کنٹرول کرنا چاہتا تو بیل مُنڈو بے لگام ہو جاتا تھا۔ وہ دونوں کے دماغ میں بیک وقت اسی وقت جھانک سکتا تھا بشرطیکہ وہ دونوں [...] کے سامنے ہوں۔

میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں۔ ایک کے دماغ میں جھانکتا ہوں اور اس کی سوچ کے ذریعے دوسرے کی حرکتوں کو بھی سمجھتا رہتا ہوں اور دوسروں کو کنٹرول کرنے کے لئے باری باری ایک دماغ سے دوسرے دماغ تک چھلانگیں لگاتا رہتا ہوں۔ ماسٹر لوشے نے بھی دونوں کو بیک وقت کنٹرول کرنے کے لئے بیل مُنڈو سے کہا۔

"یہ ہوٹل ہے۔ شور نہ مچاؤ۔ کمرے میں جاؤ"

بیل مُنڈو کمرے کے اندر آگیا۔ رُوما نے اس سے کہا۔

"انکل! میں اس گونگے کو برداشت نہیں کرسکتی۔ اس نے میری توہین کی ہے۔ کہتا ہے کہ میں واہیات لڑکی ہوں۔ آپ کے ہوتے ہوئے آج تک کسی نے ایسا کہنے کی جرأت نہیں کی"

یہ سُنتے ہی بیل مُنڈو غصّے سے مجھے دیکھنے لگا۔ ماسٹر لوشے نے اسے سمجھایا۔

"اپنا رویّہ فوراً بدلو۔ تم اسے دوست بنا کر لائے ہو۔ اگر وہ تم سے بدظن ہو کر ہاتھ سے نکل گیا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا"

بیل مُنڈو نے مُٹھیاں بھینچ کر کہا "تمہاری ایسی کی تیسی۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ رُوما کے دل کو کسی طرح کا صدمہ نہیں پہنچے گا۔ اب یہ رو رہی ہے۔ میں ناقابلِ برداشت اذیتیں برداشت کرسکتا ہوں لیکن بے بی کے آنسو نہیں دیکھ سکتا"

ماسٹر لوشے نے پوچھا۔ "کیا تم مجھ سے نجات حاصل کرنا نہیں چاہتے؟ اگر چاہتے ہو تو رُوما کو سمجھاؤ کہ وہ مصلحتاً ذرا سی توہین برداشت کرے۔ دیکھو میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہاں پہنچتے ہی تم دونوں کو آزاد کر دوں گا"

بیل منڈو نے گھوم کر اپنی حسین بھتیجی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نظر آئے تو وہ پھر بھڑک گیا۔ اُس نے سوچ کے ذریعے کہا۔

"سنو شیطان کے بچّے! اس وقت رات کا سناٹا ہے۔ آس پاس کے کمروں میں تمام لوگ سو رہے ہیں۔ میں اس کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے فرہاد کو چٹکی بجاتے ہی ٹھکانے لگا سکتا ہوں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ منٹوں میں اس کی زبان کھلوا دوں گا۔ تمہارے کہنے کے مطابق اس کی آنکھوں پر آئی لینز کا پردہ ہے۔ میں اس پردے کو بھی اُٹھا دوں گا اس کے بعد تم بڑی آسانی سے اس کمبخت کو کنٹرول کرلو گے۔ ہمیں بھی آئے دن کی پریشانیوں سے نجات مل جائے گی"

ماسٹر لوشے نے پوچھا۔

"اگر وہ کسی طرح ہاتھ سے نکل جائے گا تو پھر کیا ہوگا کیا تم اس بات کا اندازہ کرسکتے ہو کہ میں تمہاری ناکامی کی کتنی عبرت ناک سزا دے سکتا ہوں؟"

"مجھے اندازہ ہے۔ میں نے تمام حالات پر غور کرلیا ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہاں زیادہ ہنگامہ نہیں ہوگا۔ میں پہلے ہی حملے میں اسے بے بس کر دوں گا"

"اگر تم بضد ہو تو میں تمہیں اجازت دیتا ہوں۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دو اور اُسے فوراً بے نقاب کرو"

ان کے منصوبے کو سمجھتے ہی میرے اعصاب میں تناؤ پیدا ہوگیا۔ میں ایک دم سے پتھر کی طرح سخت ہوگیا۔ بیل منڈو جیسے ہی دروازہ بند کرنے کے لیے دوسری طرف گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک دم سے رُوما کو گرفت میں لیا پھر جیب سے ایک چاقو نکال کر اُسے ایک کھٹکے سے کھولتے ہوئے اس کی چمکیلی دھار کو اس نازک سی لڑکی کی گردن پر رکھ دیا۔

بیل منڈو دروازہ بند کر کے پلٹا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ ماسٹر لوشے اس کی سوچ سے سمجھ رہا تھا کہ اچانک ہی سچویشن کیسے بدل گئی ہے۔ اس نے جھنجلا کر کہا۔

"کیوں بیل منڈو اب عقل آئی؟ کیا اب اپنی رُوما کو چاقو کی دھار سے بچا سکتے ہو؟ تم اپنی کامیابی کے نشے میں یہ بھول گئے تھے کہ مجھ سے سوچ کے ذریعے گفتگو کرتے وقت وہ تمہارے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے بہت کچھ سمجھ رہا ہوگا اور جب تم دروازہ بند کرنے کے لیے پلٹنے لگے تو وہ خطرے کو بھانپ گیا ہوگا۔ وہ کوئی نادان بچّہ تو نہیں ہے کہ تمہاری حرکتوں کو نہ سمجھ سکے۔ گدھے کے بچّے اب تم اُسے کیسے بے نقاب کرو گے۔؟"

بیل منڈو اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ ایک قدم بھی آگے بڑھاتا تو اس کی سب سے عزیز ہستی کی گردن تن سے جُدا ہو جاتی۔ رُوما کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ دیدے پھیل گئے تھے اور وہ سہمی ہوئی نظروں سے اپنے انکل کو سمجھا رہی تھی کہ کسی طرح مجھے بچاؤ۔

اپنی بھتیجی کی سلامتی کے لیے وہ گہری پستیوں میں گر سکتا تھا۔ ایسے لوگوں کے سامنے جھک سکتا تھا جنہیں صدیوں سے غلام سمجھتا آ رہا تھا۔ وہ اتنی سی دیر میں مختلف داؤ پیچ کے متعلق بھی سوچ چکا تھا مثلاً اگر وہ اپنی جگہ سے اچھل کر چشم زدن میں فلائنگ کک مارنا چاہیے۔ تب بھی اس کی لات رُوما پر پڑے گی کیونکہ وہ میرے لئے ڈھال بن گئی تھی کسی بھی داؤ پیچ کو آزمانا سراسر حماقت تھی۔

یکایک اس نے اپنا رویّہ بدل دیا۔ گونگے اشارے میں مجھے سمجھانے لگا۔ "میں تمہارا دوست ہوں میں نے کسی بُرے ارادے سے دروازہ بند نہیں کیا ہے تم میرے دوست بن کر اس لڑکی سے دوشمنی نہ کرو۔ اسے چھوڑ دو"

میں نے انکار میں سر ہلایا پھر اس سے گونگے اشاروں میں بات کرنے کے لئے ایک ہاتھ سے کام لینے لگا۔ دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چاقو کی دھار بدستور رُوما کی گردن پر تھی۔ پھر میں نے ایک ہاتھ کے اشارے سے اسے سمجھایا۔ "میرے پاس دماغ ہے۔ میں تمہاری چالوں کو سمجھتا ہوں۔ میں تمہاری باتوں میں نہیں آؤں گا۔ اگر اس لڑکی کی سلامتی چاہتے ہو تو اس ہوٹل سے کہیں دور چلو"

وہ خوش ہو کر تیزی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"ہاں میں تمہاری ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔ ہم ابھی اس

ہوٹل سے باہر جائیں گے"

میں نے رُوما پر انگلی رکھتے ہوئے بتایا۔

"یہ لڑکی بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔ پہلے تم یہاں سے باہر جاؤ گے۔ اور اپنی کار میں بیٹھو گے۔ پانچ منٹ کے بعد میں اس لڑکی کے ساتھ وہاں آؤں گا"

وہ راضی ہوگیا۔ میں نے اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

"اگر تمہارے علاوہ کوئی دوسرا ہمارے آس پاس ہوا تو تم اسے زندہ نہیں پاؤ گے"

اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کوئی نہیں ہوگا۔ ہم تینوں کے علاوہ کوئی نہیں ہوگا۔ میں ابھی جا رہا ہوں"

یہ کہہ کر وہ دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ میں چند سیکنڈ تک رُوما کے ساتھ اسی حالت میں کھڑا رہا۔ پھر اسے چاقو کی نوک پر رکھ کر اس کے ساتھ دروازے تک آیا۔ دروازے کو اندر سے بند کیا۔ اور اسے گونگی زبان میں سمجھانے لگا۔

"سُنو۔ اگر زندگی چاہتی ہو تو اپنے منہ سے ایک آواز نہ نکالنا"

وہ سہمے ہوئے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"میں شور نہیں مچاؤں گی۔ مجھے انکل کے پاس لے چلو"

میں نے اپنی جیکٹ اُتار کر اپنے دائیں ہاتھ پر ڈال لی۔ اس طرح چاقو چھپ گیا۔ میں نے اُسے سمجھایا۔

"کمرے سے باہر نکلتے ہی تم میرے شانہ بہ شانہ چلو۔ میرا دایاں ہاتھ تمہاری کمر پر ہوگا۔ ہم اس طرح چلیں گے۔ جیسے دو محبت کے متوالے چلنے کے دوران بھی ایک دوسرے سے جدا ہونا گوارہ نہیں کرتے ہیں"

میں عملی طور پر اسے اپنے دائیں بازو میں لے کر اور چاقو کی نوک اس کے پہلو میں رکھ کر سمجھا رہا تھا۔ جب وہ اچھی طرح سمجھ گئی تو پانچ منٹ کے بعد میں نے دروازے کو کھولا۔ کمرے کے باہر آ کر میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کاریڈور سنسان پڑا ہوا تھا صرف میں تھا اور وہ میرے پہلو میں تھی۔ پھر وہ اسی طرح مجھ سے لگی لگی چلنے لگی۔ ماسٹر لوشے رُوما کے ذریعے میری حرکتوں کو سمجھ رہا تھا اور ہوٹل کے باہر کھڑے ہوئے بیل منڈو کو سمجھا رہا تھا کہ میں کتنی تدابیر پر عمل کرتے ہوئے ہوٹل کے باہر آ رہا ہوں۔ لہٰذا اسے میری ہدایت کے مطابق کار کے اندر جا کر بیٹھ جانا چاہیئے۔

میں رُوما کو ساتھ لے کر ایک لفٹ میں آگیا۔ اور گراؤنڈ فلور کی طرف جانے لگا۔ لفٹ کے اندر تنہائی تھی۔ اس تنہائی میں وہ سر اُٹھا کر میرے چہرے کو تک رہی تھی۔ اس کا سپنا ٹوٹنے کے بعد جب سے میں اس کے سامنے آیا تھا۔ اس وقت سے وہ مجھے دشمن بھی سمجھ رہی تھی اور بار بار حالات سے مجبور ہو کر میری قربت سے بےچینی بھی محسوس کر رہی تھی۔ کبھی یہ خیال بھی ستاتا تھا کہ میں نے اس کی توہین کی ہے

۔ پہلا تاثر کبھی بھلایا نہیں جاتا۔ ہزار اختلافات

کے باوجود یاد رہتا ہے۔ میں جذبات کی پہلی قسط پیش کرنے کے بعد اس سے بے نیاز ہوگیا تھا۔ تاکہ وہ اپنے طور پر سوچتی رہے اور جذبوں کے ہجوم میں اُلجھتی رہے۔

لفٹ سے نکلنے کے بعد ہم لابی میں آگئے۔ پھر وہاں سے گزرتے ہوئے پارکنگ ایریئے میں پہنچ گئے۔ بیل منڈو اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھا ہوا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اس کی سب سے عزیز ترین ہستی میرے قبضے میں تھی اور وہ اس کی سلامتی کے لیے کتنی ہی اُلٹی سیدھی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ ماسٹر لوشے اس کے دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے سمجھا رہا تھا۔

"صبر کرو اور موقع کی تاک میں رہو۔ فرہاد نے صرف اپنی حفاظت کی خاطر رُوما پر قبضہ جما رکھا ہے۔ اس کی چالاکیوں کو سمجھنے کی کوشش کرو شاید وہ ہوٹل میں کوئی ہنگامہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے وہ تمہیں ہوٹل سے دور لے جا رہا ہے۔ وہ کسی ویران علاقے میں پہنچ کر یقیناً تم سے مقابلہ کرے گا۔ یا پھر تمہیں کسی طرح اپنا پابند بنا کر تم سے دور نکل جانے کی کوشش کرے گا"

ماسٹر لوشے اس سے کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن اسی وقت میں رُوما کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر اسٹیئرنگ سیٹ سے اترنا چاہتا تھا۔ میں نے فوراً ہی اپنے ہاتھ سے جیکٹ اٹھا کر چاقو کی طرف اشارہ کیا۔ جس کی نوک رُوما کی پسلی سے لگی ہوئی تھی۔ رُوما کو اس حال میں دیکھ کر وہ اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔ اسے دھمکی دینے کے بعد میں رُوما کو لے کر پچھلی سیٹ پر آگیا۔ پھر اسے اشارے سے کار آگے بڑھانے کے لئے کہا۔

کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھنے لگی ہوٹل کے احاطے سے نکل کر سنسان سڑک پر دوڑنے لگی۔ وہ جو میرے سامنے بیٹھا ڈرائیو کر رہا تھا اب تک یہی ثابت کرتا آ رہا تھا کہ وہ ایک ناقابلِ شکست انسان ہے۔ انسانوں کے جنگل میں ایک خونخوار چیتا ہے جس کا نام سنتے ہی بڑے بڑے شہ زور تھرتھرا جاتے ہیں۔ وہ ایک معمولی زرخرید غلام کی طرح میرے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ وہ اس وقت اتنا مجبور تھا کہ اس نے اپنی بھتیجی کو میرے پہلو میں چھوڑ دیا تھا۔ ایسا نہ کرتا تو اس کی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔

وہ اندر ہی اندر غصّے سے کھول رہا تھا۔ ڈرائیونگ کے دوران عقب نما آئینے میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ اسے اور زیادہ بھڑکانے کے لیے میں رُوما پر جھک گیا۔

اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ بہک گئے۔ اس نے فوراً ہی بریک لگا کر گاڑی روک دی۔ پھر جھلا کر میری طرف پلٹنا چاہا۔ مگر ماسٹر لوشے کی غراتی ہوئی سوچ نے اسے ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے دماغ کو ایک جھٹکا پہنچا تھا وہ جگہ بیٹھا رہ گیا تھا۔ چند لمحوں تک خاموشی رہی وہ اپنے سر کو

تھا مے بڑی بے بسی سے سوچ رہا تھا۔

"یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے ایک شیطان جب چاہتا ہے دماغ میں گھس کر پریشان کرتا رہتا ہے۔ دوسرا شیطان اس وقت حاکم بنا ہوا میرے سر پر سوار ہے۔ میں ان دونوں سے کیسے نجات حاصل کروں۔ ؟"

ماسٹر لوشے نے کہا۔

"تم اپنی حماقتوں سے نئی نئی مصیبتوں کو دعوت دیتے ہو۔ میں ایک نہیں ہزار بار تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ اپنی جسمانی طاقت پر غرور نہ کرو۔ ایک بہت ہی چالاک دشمن سے تمہارا سابقہ پڑا ہے۔ لیکن میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ ابھی رُوما کے کمرے میں وہ تنہا تھا تمہیں پورا یقین تھا کہ تم اسے زیر کر لو گے۔ مگر کہاں گیا تمہارا یقین۔ ؟ بیوقوف گدھے۔ الو کے پٹھے تمہاری حماقتوں سے اب وہ نکلا جا رہا ہے۔ تم دوبارہ اسے کس طرح ڈھونڈ کر نکال سکو گے ؟"

بیل منڈو نے سوچ کے ذریعے کہا۔

"میں فرہاد کے بچے کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گا۔ تم میرے لیے کچھ کرو۔ صرف ایک بار رُوما کسی طرح اس کی گرفت سے نکل کر میرے پاس آجائے تو میں اسے بچ کر جانے نہیں دوں گا۔"

ماسٹر لوشے کی سوچ نے کہا۔

"جب تک فرہاد بے نقاب نہیں ہوگا۔ اس وقت تک میں تمہاری رُوما کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔ ویسے میں بھی موقع کی تاک میں ہوں اگر کچھ کر سکا تو اسے تم سے دور بھاگنے کا موقعہ نہیں دوں گا۔ گاڑی آگے بڑھاؤ دیکھو کہ وہ تمہیں کہاں لے جانا چاہتا ہے۔"

بیل منڈو نے پلٹ کر مجھ سے پوچھا۔

"اور کتنی دور جانا ہے۔ ؟ کہاں جانا ہے۔ ؟ کچھ تو بتاؤ۔ تم کب تک گونگے بنے رہو گے فرہاد ؟ جب ہماری دشمنی ایک دوسرے کے سامنے کھل چکی ہے تو پھر چھپنا کیسا۔ ؟"

میں مسکرا کر اُسے دیکھنے لگا۔ میری خاموش مسکراہٹ اسے بتا رہی تھی کہ میں زبان نہیں کھولوں گا۔ اس نے جھلّا کر پھر پوچھا۔

"کچھ زبان سے بھی بولو۔ کیوں نہیں بتاتے کہ کہاں جانا ہے۔ ؟"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ وہ آگے بڑھتا رہے۔ پیچھے پلٹ نہ دیکھے۔

وہ دل ہی دل میں مجھے گالیاں دینے لگا۔ ماسٹر لوشے نے اسے حکم دیا۔ "وقت ضائع نہ کرو۔ وہ آگے بڑھنے کے لیے کہہ رہا ہے آگے بڑھتے رہو کسی ویران علاقے کی طرف جاؤ۔"

وہ کار اسٹارٹ کر کے پھر تیزی سے ڈرائیو کرتا چلا گیا۔ اس نے سوچ کے ذریعہ ماسٹر لوشے سے کہا۔

"میں اسی علاقے کی طرف جا رہا ہوں۔ جہاں اس کے علاوہ دو گونگوں سے میرا سامنا ہوا تھا۔"

ماسٹر لوشے نے کہا۔

"تقریباً تین گھنٹے پہلے وہاں ان گونگوں سے زبردست مقابلہ ہو چکا ہے۔ تمہارے تمام آدمی مارے گئے ہیں اور کچھ وہاں سے فرار ہو گئے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہاں کسی نے مرنے والوں کی لاشیں دریافت کر لی ہوں۔ اور پولیس والوں تک اس کی خبر پہنچ گئی ہو۔ اس طرف جاؤ گے تو پھر کسی نئی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ ذرا عقل سے کام لو اور راستہ بدل دو۔"

تھوڑی دیر بعد وہ راستہ بدل کر لشاور جانے والی سڑک پر چلنے لگا۔ کار کی محدود فضا میں مکمل خاموشی تھی۔ ماسٹر لوشے نے پوچھا۔

"کیا تم چغد کی طرح صرف سامنے دیکھتے ہوئے ڈرائیو کر رہے ہو؟ پیچھے کی بھی خبر لو کہ وہ کیا کر رہا ہے ؟"

"میں پیچھے نہیں دیکھوں گا یہ شیطان میری غیرت کو للکار رہا ہے۔"

"تنہائی میں بے غیرتی ہو تو غیرت مجروح نہیں ہوتی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ غیرت صرف دوسروں کے سامنے بنا سنوار کر پیش کی جاتی ہے۔ اس خوب صورت لفظ کے پیچھے صرف تمہارے جیسے چور بدمعاش اور اسمگلر چھپے رہتے ہیں۔"

"میں اس حقیقت کو خوب سمجھتا ہوں۔ لیکن رُوما کو ایک شیطان کے پہلو میں نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے مجبور نہ کرو۔"

"تم سچ مچ عقل سے کورے ہو۔ یہ نہیں سمجھتے کہ پیچھے دیکھتے رہنے سے اس کی کوئی کمزوری ہاتھ آسکتی ہے۔"

اس نے غصے سے تلملا کر کہا

"میرا تو جی چاہتا ہے کہ گاڑی کسی درخت سے ٹکرا دوں۔ اگر رُوما کو نہ بچا سکا تو اس کے ساتھ خود بھی مر جاؤں گا۔ میں ایسی ذلت کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔ میں ڈرائیو کرتا جا رہا ہوں۔ ہم کتنے ہی میل کا سفر طے کر چکے ہیں۔ مگر یہ کمبخت رکنے کے لیے نہیں کہہ رہا ہے۔"

"کہیں تو اُسے رکنا پڑے گا۔ وہ نہیں رکے گا تو پٹرول ختم ہوگا۔ گاڑی کہیں نہ کہیں ضرور رُکے گی۔ تم چلتے رہو اب میں رُوما کی خبر لے رہا ہوں۔ اسے بچانے کی شاید کوئی صورت نکل آئے۔"

اس کے بعد اس کی سوچ رُوما کے دماغ میں منتقل ہو گئی۔

"ہیلو بے بی۔ تم گھبراؤ نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے بتاؤ اس وقت کیا پوزیشن ہے۔ ؟"

وہ بتانے لگی۔ "تم نے مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ میں اپنی پوزیشن کیا بتاؤں ؟ اس کا چاقو ابھی تک میری پسلیوں سے لگا ہوا ہے۔ میں سانس بھی سنبھل سنبھل کر لے رہی ہوں۔"

"بے بی۔ کیا ایسی بے بسی کی موت مرنا دانشمندی ہے ؟"

"نہیں۔ موت کیسی بھی ہو مجھے ڈر لگتا ہے۔ ایسے وقت ایمان والے خدا سے پناہ مانگتے ہیں کہ وہ انہیں اپنی امان میں رکھے۔ میں تمہارے جیسے شیطان سے پناہ مانگتی ہوں۔ کسی طرح مجھے بچا لو۔ تم شیطان ہو تم سے کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔"

"میں تمہیں بڑی بڑی مصیبتوں سے بچا سکتا ہوں۔ مگر افسوس کہ تم میرے حکم سے انکار کرتی ہو۔ ہوٹل کے کمرے میں تم نے میرے مشورے کے خلاف قدم اٹھایا۔ ایک ذرا سی توہین مصلحتاً برداشت نہیں کی اور غصہ دکھا کر اس مصیبت میں پھنس گئیں۔ موت تمہاری پسلیوں کے راستے تمہارے اندر سرایت کرنے آ رہی ہے۔ اگر وہ فرہاد تمہارے وجود میں سرایت کر جاتا تو کیا فرق پڑتا ؟"

"ہاں اس طرح میری جان خطرے میں نہ پڑتی۔ مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اب تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کروں گی۔ جو مشورہ دو گے بلا چون وچرا عمل کروں گی۔"

"تو سب سے پہلے اپنا رویّہ بدل دو۔ فرہاد کے گلے کا ہار بن جاؤ۔ اُسے اپنی اداؤں سے یقین دلاؤ کہ تم صرف اس کے لیے پیدا ہوئی ہو اور اسی کے لیے مرو گی۔ وہ چاہے تو خنجر سے ہلاک کر دے یا اپنے دل میں بسا لے۔"

"وہ مجھے خنجر سے ہلاک کر دیگا۔ مجھ سے محبت نہیں کرے گا۔ وہ مجھے واہیات لڑکی سمجھتا ہے۔"

ماسٹر لوشے نے اُسے سمجھایا۔

"تم نادان ہو۔ میں فرہاد کو تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ وہ بہت چالاک ہے۔ دشمنوں کے درمیان رہ کر عورتوں سے دور بھاگتا ہے۔ ورنہ تمہاری جیسی حسین لڑکیاں اس کی کمزوری ہیں۔ بے بی تم نے جوانی میں قدم رکھا ہے تمہیں ایک سمجھدار لڑکی کی طرح اپنے سامنے آنے والے ہر مرد کی گہری اسٹڈی کرنی چاہیئے۔ اگر تم اس کی حرکتوں پر غور کرتیں تو تمہیں یقین ہو جاتا کہ وہ تمہیں اُوپری دل سے واہیات کہہ رہا ہے۔

۔تم مردوں کی فطرت کو نہیں جانتیں بظاہر نفرت کرنے کے باوجود کسی نہ کسی بہلنے کوئی نہ کوئی چیز عورت سے چھین لیتے ہیں وہ تمہیں بہت زیادہ پسند کرتا ہے۔ مگر فی الحال حالات سے مجبور ہے میری بات کا یقین کرو۔"

"اب میں تمہاری ہر بات کا یقین کروں گی۔ اب تمہاری ہر بات میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ بولو میں کیا کروں۔ ؟"

"پہلے اُسے اپنی محبت کا یقین دلاؤ جب وہ تمہاری طرف مائل ہوگا تو اس سے کہنا کہ وہ گاڑی رکوا کر تمہارے انکل کو اس ویرانے میں [illegible] تمہیں اپنے ساتھ جہاں لے جانا چاہتا ہے لے جائے [illegible] سکو گی۔"

[illegible]

چھوڑ دوں۔ ؟"

"تو پھر مر جاؤ۔" ماسٹر لوشے نے غصے سے کہا۔

"نہیں نہیں میں مرنا نہیں چاہتی۔ تمہاری بات ذرا دیر سے سمجھ میں آتی ہے انکل اس ویرانے میں تنہا رہ کر بھی پنڈی واپس پہنچ جائینگے۔ پھر تم انہیں اطلاع دیتے رہو گے کہ میں فرہاد کے ساتھ کہاں بھٹک رہی ہوں۔ یعنی تم میرے ذریعے فرہاد کو بھی نظر میں رکھو گے اور میرے انکل کے لیے بھی اطلاعات فراہم کرتے رہو گے۔"

"گڈ۔ اب تم سمجھدار ہو گئی ہو۔ میرے مشورے پر فوراً عمل کرو۔"

وہ عمل کرنے لگی۔ اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا تو اس کا چہرہ میرے چہرے کے قریب آگیا۔ کار کے اندر مدھم مدھم سی روشنی میں اس کے گلابی رخسار ہولے ہولے آنچ دینے لگے۔ گہری نیلی آنکھیں مجھے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے دیکھتے ہی دیکھتے قربان ہو رہی ہوں۔ پھر اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی فضا میں یوں بلند کی جیسے خنجر تھام رکھا ہو۔ پھر اس خیالی خنجر کو اس نے اپنے سینے میں گھونپتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس طرح مار ڈالو۔ مجھے تمہارے ہاتھوں سے مر کر بڑی خوشی ہوگی۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اس خیالی خنجر کو اس کے سینے سے نکال لیا اور گونگی زبان میں سمجھایا۔

"میں تمہیں نہیں ماروں گا۔ تم بہت حسین ہو۔ وہ ایک رومانی ڈرامے کا کردار ادا کرنے کے لیے میری طرف بڑھ رہی تھی۔ پھر سچ مچ اس کردار میں ڈوب گئی۔ اس کے تڑپنے اور مچلنے میں اداکاری نہیں تھی۔ خود سپردگی کی شدید خواہش تھی۔ میرا چاقو اس کی پسلیوں سے دور ہو گیا۔ جب میں اس کے لیے خنجر بن گیا تھا تو اس کے سینے میں اترنے کے لیے وہ فولادی ہتھیار بیکار ہو چکا تھا۔ ان حالات میں دنیا کی کوئی چیز مرد سے زیادہ فولاد نہیں ہوتی۔

بہت دیر تک وہ جذبوں کی دھند میں ادھر سے اُدھر بھٹکتی رہی اپنے آپ کو بھولتی رہی۔ کسی حد تک مجھے بھی خود کو بھولنے پر مجبور کرتی رہی۔ کار تیز رفتاری سے بھاگتی جا رہی تھی بیل منڈو نے مجبور ہو کر عقب نما آئینے کا رخ پھیر دیا تھا۔ وہ رومانی ڈرامہ میرے لیے بہت سستا اور اس کے لیے بہت مہنگا پڑ رہا تھا۔ وہ اگلی سیٹ پر ڈرائیو کرتا ہوا اور بار بار پہلو بدلتا ہوا تھوڑی دیر تک برداشت کرتا رہا پھر اس نے رُوما کو ڈانٹ کر کہا۔

"بے بی ہوش میں آؤ۔ میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا۔"

رُوما نے مجھ سے ذرا الگ ہو کر ناگواری سے کہا۔

"تم اگر برداشت نہیں کر سکتے تو میں کیا کروں۔ ؟ کیا میں بے موت [illegible] دوں۔ ؟"

[illegible]

پلٹ کر بولا۔
”تم مجھ سے ایسے لہجے میں گفتگو کر رہی ہو کیا تم بھول گئیں کہ میں غصّے کی حالت میں اپنوں کو بھی معاف نہیں کرتا۔“
”میں تو تمہاری بھتیجی ہوں۔ انکل ابھی تو تم فرہاد جیسے دشمن کو بھی معاف کرنے پر مجبور رہو۔ ہر عورت اپنا تحفظ چاہتی ہے۔ اور تم اتنے بزدل اور کمزور ہو گئے ہو کہ اپنی بھتیجی کی بھی حفاظت نہیں کر سکتے۔“
یہ بات سنتے ہی وہ غصّے سے پاگل ہو گیا۔ جس لڑکی کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا وہی اُسے بزدلی کا طعنہ دے رہی تھی۔ وہ غصّے سے تلملاتا ہوا اور بڑبڑاتا ہوا اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔
”میں اس گونگے کے ساتھ تمہیں بھی جہنم میں پہنچا دوں گا۔ میں تو صرف تمہاری جان بچانے کی خاطر اب تک اس گونگے کی بات مانتا آ رہا تھا۔“
یہ کہتے ہی اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھولا۔ میں اس صورتِ حال سے چند لمحوں کے لیے پریشان ہو گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس طرح اچانک ہی اس پاگل ہاتھی سے ٹکرانا ہو گا۔ مگر بھلا ہو اس شیطان کا جو دوست اور دشمن سب کے معاملات میں اپنی ٹانگ اڑا دیتا ہے۔ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھلتے ہی ایک بیک بیل منڈو کے ذہن کو جھٹکا پہنچا۔ اس کے دماغ میں اچانک ہی الٹی سیدھی سی بے معنی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ اس کا دماغ ہر طرح کی سوچ سے خالی ہو گیا تھا کھوپڑی کے گنبد میں ایسی آوازیں چکرا رہی تھیں، گونج رہی تھیں اور اس کے وجود کو جھنجوڑ رہی تھیں کہ وہ ڈگمگاتے ہوئے پیچھے کی طرف گیا۔ اور ایک درخت سے ٹکرا کر گر پڑا۔ ماسٹر لوشے کی آواز اس کے دماغ میں گونج رہی تھی۔
”نجات ہے۔ اس درخت سے ٹکرانے میں میری نجات ہے۔ اس درخت سے اپنا سر ٹکراؤں گا تو مجھے فوراً نجات ملے گی۔ میں ٹکرا رہا ہوں میں اپنا سر ٹکرا رہا ہوں یہی نجات کا راستہ ہے۔“
پھر اس نے دھڑام سے اپنا سر درخت سے ٹکرا دیا۔ وہ پاگل نہیں تھا مگر دماغ جو کہتا ہے۔ انسان وہی کرتا ہے۔ دماغ سے باہر انسان کی اپنی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ ہماری مرضی ہے۔ تو دراصل وہ دماغ کی مرضی ہوتی ہے۔ ہم اپنے دماغ کے اندھے غلام ہیں۔ اور آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اس کے ہر جائز و ناجائز حکم کی تعمیل کرتے ہیں بیل منڈو نے تعمیل کی۔ پھر تکلیف کی شدت سے چیختے ہوئے دوبارہ گر پڑا۔
اس کے تڑپنے کے دوران ماسٹر لوشے نے رُوما سے کہا۔
”بے بی ہری اَپ۔ فرہاد سے کہو کہ وہ فوراً اسٹیئرنگ سیٹ پر پہنچ کر تمہیں وہاں سے دور لے جائے۔ تم اپنے انکل کی فکر نہ کرو۔ میں اس کا علاج کر دوں گا۔ اور بہت جلد اسے تم سے ملاؤں گا۔“
رُوما نے وہی بات مجھے گونگی زبان میں سمجھائی۔ ہم دونوں پچھلی سیٹ سے نکل کر باہر آئے۔ اس وقت تک بیل منڈو پھر سنبھل گیا تھا۔ کیونکہ ماسٹر لوشے رُوما کی طرف متوجہ تھا۔ رُوما کی سوچ سے اُسے پتہ چلا کہ اس کا انکل پھر سنبھل کر آ رہا ہے۔ ماسٹر لوشے پھر اس پر دماغی حملہ کرنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنا سر درخت سے ٹکرا دیا۔ اس وقت تک میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ رُوما میرے پہلو میں آ گئی تھی۔ میں نے کار اسٹارٹ کی۔ گیئر بدلے پھر تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا بیل منڈو سے دور ہوتا چلا گیا۔ رُوما بار بار پلٹ کر پیچھے دیکھ رہی تھی۔ اُسے اپنے انکل کی فکر تھی۔ مگر وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کسی دم صبح ہونے والی تھی مگر ابھی رات کا اندھیرا مسلط تھا۔ میں ہیڈ لائیٹس کی روشنی سے تاریکی کو چیرتا ہوا آندھی طوفان کی طرح بڑھتا جا رہا تھا۔ رُوما کی عجیب حالت تھی۔ میری قربت سے آشنا ہونے کے بعد وہ مجھے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ نئی نویلی آرزوؤں نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا کہ مرد کی قربت صرف اتنی نہیں ہوتی۔ اس کے آگے بھی قربت کا بہت سارا سفر طے ہوتا ہے۔ یہ تجسس اس کے ذہن میں تھا کہ کیسے ہوتا ہے؟
اس کے باوجود اسے اپنے انکل کی فکر تھی۔ وہ ایسے مقام پر تھی۔ جہاں لڑکیاں رشتوں اور جذبوں کے درمیان اُلجھ جاتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کدھر جائیں۔ وہ اُدھر نہ جا سکی۔ اس نے دل کو سمجھا لیا کہ ماسٹر لوشے اس کے انکل کو بحفاظت ہوٹل تک پہنچا دے گا۔ یا پھر ہمارا تعاقب کرنے کیلئے اس کی رہنمائی کرتا رہے گا۔
سچ بات تو یہ ہے کہ رُوما کی خوشبو سے آشنا ہو کر میں بھی اپنی کھوپڑی سے باہر ہو گیا تھا۔ حسین عورت کی قربت مرد کی سنجیدگی کو لے ڈوبتی ہے۔ اور اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو پسِ پشت ڈال دیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جس وقت بیل منڈو ماسٹر لوشے کے ہاتھوں پاگل پن کا شکار ہو رہا تھا۔ اس وقت مجھے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کی ناک سے مائیکرو فلم نکال لینا چاہیئے تھا۔ لیکن میں اس فلم کو بالکل ہی بھول گیا تھا۔ آخر میں انسان ہوں۔ مجھ سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ یہ باتیں میں اب کہہ رہا ہوں۔ اگر اس وقت رُوما کو لے کر فرار ہوتے وقت مجھے مائیکرو فلم یاد آ جاتی تو میں میلوں کا سفر طے کرنے کے بعد بھی بیل منڈو کی طرف واپس لوٹ جاتا۔ مگر رُوما جو پہلو میں تھی سمجھا رہی تھی کہ میری منزل آگے کسی ہوٹل کا کمرہ ہے۔ جہاں میں اس کے ساتھ تنہائی کے رنگین یادگار لمحات گذار سکتا ہوں۔
صبح ہوتے ہی ہم لشپادر پہنچ گئے۔ رُوما پچھلی رات اپنی نیند پوری کر چکی تھی۔ میرے ہوٹل پہنچنے پر بیدار ہوئی تھی۔ اسی لیے وہ تازہ دم تھی۔ اور نیند سے زیادہ میری ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ لیکن میں کچھ تھکن سی محسوس کر رہا تھا۔ اگر رُوما میرے پہلو میں نہ ہوتی تو میں فوراً ہی ہوٹل کا کمرہ کرائے پر لے کر آرام سے سونے کی کوشش کرتا۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ ایک طرف رُوما اور دوسری طرف بیل منڈو اور ماسٹر لوشے مجھے جاگتے رہنے پر مجبور کر رہے تھے۔
ماسٹر لوشے کی حالت بھی بُری تھی۔ وہ وقت پر سونے اور جاگنے کا عادی تھا۔ دشوار مرحلوں سے گذرنے کے دوران بھی وہ اپنے اصولوں کے مطابق کھاتا پیتا اور سوتا جاگتا تھا۔ لیکن پچھلی رات سے میں اُسے جاگنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اور وہ اس بات پر جھنجلا رہا تھا وہ سونے کا پروگرام بناتا تھا۔ مگر پھر کوئی ایسی سچویشن سامنے آ جاتی تھی جس کے پیشِ نظر وہ اندازہ کر لیتا تھا کہ اب میں اس کی گرفت میں آنے والا ہوں اور پھر میں ہاتھ آتے آتے نکل جاتا تھا۔ اب وہ پریشان ہو کر سوچ رہا تھا۔
”بڑی سے بڑی جنگوں کے دوران بھی سنبھلنے اور آرام کرنے کا وقت مقرر کر لیا جاتا ہے۔ مگر ہم اصولوں کے خلاف ایک دوسرے سے اُلجھتے جا رہے ہیں۔ اگر نہانے اور سونے کا وقت مقرر نہیں ہو گا تو بے آرامی اور بے چینی کے باعث ذہنی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اب اس فرہاد کے بچے کو کسی مقام پر ٹھہر جانا چاہیئے۔ میں دیکھوں گا کہ یہ کہاں جا کر رکتا ہے اس کے بعد میں کوئی تدبیر کروں گا۔“
میں نے ہوٹل انٹرکان کے سامنے پہنچ کر کار روک دی۔ میں بھی چاہتا تھا کہ آرام کا موقع ملے۔ لیکن یہ اندیشہ بھی تھا کہ ماسٹر لوشے نے رُوما کے ذریعے اگر مجھے غافل پایا تو آرام کے وقفے کو بھول کر مجھ پر چڑھ دوڑے گا۔ ہوٹل کا ایک کمرہ حاصل کرنے کے بعد جب ہم لفٹ کے ذریعے اوپر جانے لگے تو اس وقت میں دماغ کی اسکرین پر ماسٹر لوشے اور بیل منڈو کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بیل منڈو سے کہہ رہا تھا۔
”تم وہاں کسی گاڑی والے سے لفٹ حاصل کرو اور آگے جس شہر میں ہوٹل انٹرکان ہے۔ وہاں پہنچو۔ وہاں کمرہ نمبر ۷۰۶ میں تمہاری رُوما موجود ہے مگر ابھی تم اس کے آگے نہ جانا.....“
بیل منڈو نے جھلّا کر کہا۔
”یہ تم الٹی سیدھی حرکتیں کیوں کر رہے ہو۔؟ جب مجھے رُوما سے ملانا ہی تھا تو اس سے الگ کیوں کیا۔؟ اب اسکا پتا بتا کر کہہ رہے ہو میں اس کے سامنے نہ جاؤں معلوم ہوتا ہے فرہاد تمہیں بھی پاگل بنا رہا ہے۔ تمہارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم کرتا جا رہا ہے۔“
ماسٹر لوشے نے کہا
”تم اپنے طور پر کچھ بھی سوچ لو فی الحال میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں بھی آرام کرنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ ہوٹل کا ایک کمرہ حاصل کرو اور اطمینان سے سو جاؤ۔ جب تم تازہ دم ہو کر اُٹھو گے تو پھر میں تم سے رابطہ قائم کروں گا۔“
یہ کہہ کر اس نے رابطہ ختم کر دیا اب میں سمجھ رہا تھا کہ وہ رُوما کے دماغ میں موجود ہو گا اور اسے مشورہ دے گا کہ وہ مجھے ہوٹل کے کمرے میں تمام دن بہلاتی رہے لیکن ہوٹل کے کمرے میں پہنچتے ہی ماسٹر لوشے نے اس سے کہا۔
”بے بی بہت زیادہ بھاگ دوڑ ہو چکی ہے۔ اب تمہیں بھی چند گھنٹوں کے لیے آرام سے سو جانا چاہیئے۔“
اس کی بات سُن کر رُوما نے مجھے دیکھا۔ میں اس کی سانسوں کے قریب تھا کمرے میں تنہائی تھی اور جذبوں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ بولی۔
”میں ابھی سونا نہیں چاہتی۔ پہلے تو تم کہہ رہے تھے کہ مجھے اپنی اداؤں سے اسے لبھانا چاہیے۔ اب سونے کے لیے کیوں کہہ رہے ہو؟“
”جس حد تک اسے لبھانا تھا۔ اس حد تک تم نے اُسے اپنا دیوانا بنا لیا ہے۔ تم نے اپنے انکل کو چھوڑ کر اور اس کی تنہائی کی ساتھی بن کر اسے بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ اب وہ ایک پروانے کی طرح تمہارے آس پاس منڈلاتا رہے گا۔ اس لیے ابھی اتنا ہی ساتھ کافی ہے اسے اپنے لیے تڑپنے دو اور یہ کہہ کر سو جاؤ کہ تمہیں زور کی نیند آ رہی ہے۔“
”مگر مجھے نیند نہیں آ رہی ہے اور میں فرہاد کو چھوڑ کر سونا بھی نہیں چاہتی۔“
”تم سو جاؤ گی بے بی۔ کیونکہ چند گھنٹوں کے لیے میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔ اگر اس دوران فرہاد تمہارے ساتھ رہا تو میری عدم موجودگی میں نہ جانے ہمارے لیے اور کتنی پریشانیوں کا سامان کرے گا۔ میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔ ابھی وہ تمہارے جال میں ہے۔ اسے جال میں تڑپتے رہنے دو۔ سو جاؤ۔ سو جاؤ۔ دیکھو تمہارے اندر جو ایک نامعلوم غبار ہے۔ وہ جمائی کی صورت میں باہر نکل رہا ہے۔ کیسی تھکن سی محسوس ہو رہی ہے۔ ایسے وقت میں جی چاہتا ہے کہ فوم کے ملائم بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں.....“
ماسٹر لوشے اس کے جاگتے ہوئے ذہن کو نیند کی طرف مائل کر رہا تھا۔ میں رُوما کی گداز باہوں کو تھام کر اسے جھنجوڑنے لگا اور گونگی زبان میں پوچھنے لگا۔
”کیا تم سونا چاہتی ہو۔؟“
اس نے نیند سے بوجھل پلکیں اٹھا کر مجھے بڑی بے بسی سے دیکھا۔ وہ بہت مجبور تھی۔ اس حقیقت کو سمجھتی تھی کہ اگر سونے سے انکار کرے گی تو وہ شیطان اسے بھی ذہنی اذیتوں میں مبتلا کر دے گا۔
وہ ملائم بستر کے سرے پر بیٹھتی ہوئی بولی۔
”ہاں میں تھوڑی دیر کے لیے سونا چاہتی ہوں تم کچھ خیال نہ کرو میں تو تمہاری ہوں۔ ہمیشہ تمہارے پاس رہوں گی۔ ابھی ذرا سو لینے دو۔“
اس نے بڑی عاجزی سے میرے ہاتھوں کو تھام لیا۔ ماسٹر لوشے واقعی شیطان تھا۔ میرے سامنے شراب کی ایک بھری ہوئی بوتل کھول کر اسے پھر مجھ سے دور لے جا رہا تھا۔ تاکہ میں اس کے ... دن اور اس کے بیدار ہونے اور اسے دوبارہ حاصل کرنے کے

انتظار میں اچھا خاصہ وقت گذار دوں۔

وہ رُوما کو ٹرانس میں لاکر سُلا رہا تھا۔ رُوما میرے سامنے بستر پر لیٹی آہستہ آہستہ آنکھیں بند کر رہی تھی۔ بچھونے کی ملائم سطح پر اس کا زرخیز بدن کہیں دھنس رہا تھا اور کہیں ابھر رہا تھا اور میرے صبر کو آزما رہا تھا۔ اسے نیند کی دنیا سے واپس لانا میرے لیئے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ لیکن وہ شیطان ایک عامل کی حیثیت سے اس پر مسلّط ہو رہا تھا۔ میں مداخلت نہیں کرسکتا تھا۔ مداخلت کرنے کا انجام یہ ہوتا کہ وہ میری ٹیلی پیتھی کی صلاحیتوں سے واقف ہو جاتا لہذا میں نے صبر کر لیا۔

جب وہ سو گئی تو میں ایک چیئر پر آکر بیٹھ گیا۔ اور ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے۔ ماسٹر لوشے کے اقدامات کو سمجھنے لگا۔ وہ رُوما کے سونے کے بعد بھی تھوڑی دیر تک اس کے دماغ میں موجود رہا۔ یہ انتظار کرتا رہا۔ کہ شاید میں اسے جھنجوڑ کر جگاؤں گا۔ لیکن میری طرف سے خاموشی دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ میں صبر کر رہا ہوں۔ اور اس حسینہ کے جاگنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ شیطان میرے سونے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ خود اپنی عادت کے مطابق اپنی نیند پوری کرنے کے لیے اپنے آلہ کاروں کو سُلا رہا تھا اسے اطمینان تھا کہ بیل منڈو اس کے حکم کے خلاف اس کمرے کی طرف نہیں آئے گا۔ اور نہ ہی میں رُوما سے پوری طرح فیضیاب ہونے سے پہلے وہ جگہ چھوڑ کر جاؤں گا۔ لہذا وہ سونے کے لیے اپنے بیڈروم میں آگیا۔ اپنے بستر پر لیٹ کر اس نے گہری نیند سونے کے لیے وہی عمل کیا جو میں کرتا ہوں۔ وہ اپنے دماغ کے چاروں طرف ایک نادیدہ آہنی فصیل کھڑی کر رہا تھا۔ اور اپنے ذہن کو ہدایت دے رہا تھا کہ ٹھیک تین گھنٹے کے بعد اس کی آنکھ کھل جائے۔

چند سیکنڈ کے بعد ہی میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے خیال کی پہنچ سے دور نکل گیا ہے۔ میری سوچ کی لہروں نے بڑی خاموشی سے اسے تلاش کیا مگر وہ نہیں ملا وہ کہاں گیا۔ ؟ ہم صرف مرنے والوں کے دماغ تک نہیں پہنچ سکتے۔ میں یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ بھی مر چکا ہے۔ وہ زندہ تھا اسی دنیا میں تھا لیکن میری سوچ کی گرفت سے باہر ہو گیا تھا۔ میں فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ اچھا موقع تھا۔ میں اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر کسی نہ کسی طرح اس کے دماغ تک پہنچ سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں کمرے سے باہر آگیا۔ رُوما کو تنہا سوتا چھوڑ کر میں پارکنگ ایریئے میں آیا۔ پھر وہاں سے کار ڈرائیو کرتا ہوا کسی ویرانے کی تلاش میں نکل گیا۔

ہم ٹیلی پیتھی جاننے والے ایک دوسرے کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ایک دوسرے کے دماغ میں ہلچل مچا سکتے ہیں اور اپنے علم کی قوت سے اُسے بھی تابع فرمان بنا سکتے ہیں۔ ایک بار میں ایسا کر چکا ہوں۔ انجلا کا باپ اسٹوفر میری طرح ٹیلی پیتھی جانتا تھا۔ جب وہ اپنے نائم ٹیبل کے مطابق سو گیا تھا اور جب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس کی ٹیلی پیتھی کی صلاحیتیں بھی سو رہی ہیں تو میں اسے اپنا معمول بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پھر اسے اپنا معمول بنانے کے بعد اسے ہمیشہ کے لیے سلا دیا تھا۔ اب ایک عرصے کے بعد مجھے ماسٹر لوشے کی غفلت کا علم بھی ہو گیا تھا مجھے اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کا موقع مل رہا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ میں اس کے شیطانی دماغ پر حکومت کر سکتا ہوں یا نہیں۔ ؟

وہاں سے چالیس میل دور پہنچ کر میں نے سوات جانے والی سڑک کو چھوڑ دیا اور ایک کچے راستے پر ڈرائیو کرتا ہوا ایک پہاڑ کے دامن میں آگیا۔ میرے آس پاس اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا میں کار سے اتر کر پیدل ان ٹیلوں کے درمیان سے گذرنے لگا۔ ایک جگہ ایک بڑا سا پتھر نظر آیا۔ میں شمال کی جانب رُخ کر کے اس پر بیٹھ گیا۔ پھر آنکھیں بند کر کے مراقبے میں ڈوب گیا۔

میں چند لمحوں تک اپنی مختلف سوچوں کو کنٹرول کرتا رہا۔ اپنے ذہن کو ایک مرکز پر لاتا رہا۔ وہ مرکز ماسٹر لوشے کا دماغ تھا۔ میری سوچ کی لہریں وہاں تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر پہنچ نہیں پا رہی تھیں۔ پہلے تو میں نے یہ سمجھا کہ میری سوچ ابھی میرے قابو میں نہیں ہے۔ ذرا سی بے لگام ہو کر ادھر اُدھر بھٹک رہی ہے۔ لیکن جب میں نے بہت زیادہ کوشش کی اور سوچ کی لہروں کو اس کے دماغ تک پہنچانا چاہا تو اچانک ہی میرے دماغ میں روشنی کے جھماکے سے ہونے لگے مجھے یوں لگا جیسے میں سورج کی جلتی ہوئی تیز شعاؤں سے ٹکرا رہا ہوں۔ اس کی ناقابلِ برداشت روشنی میری دماغی بصارت کو نقصان پہنچا رہی تھی۔ میں نے ایک دم سے مراقبہ توڑ کر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ میں اپنی صلاحیتوں کے زعم میں یہ بھول گیا تھا کہ وہ شیطان ٹیلی پیتھی کا بہت بڑا عالم ہے جلتے ہوئے سورج سے آنکھیں ملانا ہے۔ اس کا دماغ بھی اسی طرح جلتے ہوئے آگ کا گولہ ہو گا۔ جس طرح سورج کبھی نہیں ڈوبتا۔ ایک جگہ ڈوبنے کے بعد دوسری جگہ ابھرتا ہے۔ اسی طرح اسکا دماغ بیداری کی دنیا سے ڈوب کر نیند کی وادی میں ابھرا ہوا تھا۔ کسی کی بھی خیال خوانی کی صلاحیتیں اس آگ کے گولے تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ میری سوچ کی لہریں بھی وہاں تک پہنچ کر جھلس رہی تھیں۔ اس لیے میں واپس آگیا۔

میں اپنا سر تھامے بہت دیر تک خاموش بیٹھا۔ اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ اس شیطان سے کیسے نجات حاصل ہو گی۔ اگرچہ وہ ابھی تک مجھے محکوم نہیں بنا سکا تھا۔ لیکن اس کی حیرت انگیز صلاحیتوں کو دیکھ کر یہ دھڑکا لگ گیا تھا کہ کسی نہ کسی دن میں اس کے شکنجے میں آجاؤں گا۔

ایسے وقت مجھے اپنی دبی غلطی نظر آئی کہ میں عورت کی قربت میں بالکل ہی ناکارہ بن جاتا ہوں۔ رُوما کو اپنے ساتھ لگا لانے کی کیا ضرورت تھی جس طرح میں بیل منڈو کو پیچھے چھوڑ آیا تھا اسی طرح اس کی بھتیجی کو کہیں اپنے تک نہ آسکتا تھا۔ لیکن دل پھینکنے کی عادت ہو گئی تھی اسی لیے

ہنک کر اسے سینے سے لگا لایا۔ دوسرے لفظوں میں اپنی موجودہ کمزوری کو اور آگے بڑھا دیا۔ ماسٹر لوشے اس لڑکی کے ذریعے مجھے اپنی گرفت میں رکھے ہوئے تھا اگر میں رُوما کو چھوڑ دیتا تو اس شیطان سے پیچھا چھوٹ جاتا۔ وہ رُوما اور بیل منڈو کے ذریعے مجھے تلاش کرتا ہی رہ جاتا اور میں اس کی نظروں سے روپوش ہو جاتا۔

اب بھی موقع تھا رُوما اور ماسٹر لوشے سو رہے تھے۔ اور بیل منڈو نہیں جانتا تھا کہ اس وقت میں کہاں ہوں؟ اور کیا کر رہا ہوں؟ ماسٹر تین گھنٹے کے لیے نیند کی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ ایک گھنٹہ گذر چکا تھا اور اپنی حفاظت کے لیے ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ میں ان سے دور جا سکتا تھا مگر اس سے پہلے مجھے ایک اہم فرض ادا کرنا تھا۔ بیل منڈو سے مائیکرو فلم حاصل کرنا لازمی تھا۔

ڈائریکٹر جنرل سعید احمد صاحب اس فلم کے انتظار میں اپنے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے میری خاطر روپوشی اختیار کی ہوئی تھی۔ بہانہ کرتے تو ماسٹر لوشے انٹیلی جنس کے دوسرے آفیسروں کی طرح ان کو بھی اپنے کنٹرول میں کر لیتا اور ان کے ذریعے مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔ اب میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد اُس مائیکرو فلم کا قصہ ختم کر دوں۔ سعید احمد کے حوالے کر کے ان سے بھی ایک نامعلوم مدت کے لیے ترک کر دوں۔ کیونکہ جب مائیکرو فلم انٹیلی جنس والوں کے ہاتھ لگے گی تو ماسٹر لوشے یہ معلومات حاصل کرے گا کہ اس فلم کو محکمے تک پہنچانے والا سعید احمد کون ہے۔ ظاہر ہے سعید احمد اپنے کسی آفیسر سے ملیں گے اور ماسٹر لوشے مخاطب ہونے والے آفیسر کے دماغ سے سعید احمد کے دماغ تک پہنچ جائے گا۔ پھر معلومات حاصل کرنے کے لیے انہیں اذیتوں میں مبتلا کر دے گا۔

وہ سعید احمد سے یہی پوچھے گا کہ انہوں نے وہ مائیکرو فلم کہاں سے حاصل کی ہے؟

میری ہدایت کے مطابق سعید احمد جواب دیں گے کہ فرہاد نے انہیں فون کیا تھا کہ فلاں جگہ پہنچ جائیں وہاں انہیں ایک بہت اہم مائیکرو فلم ملے گی۔

ماسٹر لوشے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریگا کہ میں کن ذرائع سے ان سے رابطہ قائم کیا کرتا ہوں اس سلسلے میں سعید احمد کا جواب یہ ہوگا کہ میں نے ان سے آخری بار رابطہ قائم کیا تھا اور فیصلہ کن لہجے میں کہا تھا کہ فرہاد روپوش ہو گیا ہے کہ اب نہ کبھی ان کا سامنا کریگا اور نہ ہی کسی ذریعے سے رابطہ قائم کریگا۔

ماسٹر لوشے میری چالاکیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اب تک وہ مجھے ناچ نچاتا رہا اس طرح ناچتے ناچتے وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اپنے مطلب کے لیے اپنے خون کے رشتوں سے بھی ناطہ توڑ لیتا ہوں۔ تو دوسرے تعلقات کیوں نہیں توڑ سکتا۔

وہ سعید احمد کی بات کا یقین کرلیگا۔ پھر انہیں ذہنی اذیتیں نہیں پہنچائے گا۔ البتہ شبہ کے طور پر کبھی کبھی چپ چاپ ان کے ذہن میں جھانکتا رہے گا۔ صرف یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کہیں وہ چوری چھپے مجھ سے ملاقاتیں تو نہیں کرتے ہیں ؟ بہر حال اب وہ مائیکرو فلم میں سعید احمد کے حوالے کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا تھا۔

اس مقصد کے لیے میں نے بیل منڈو کے دماغ میں جھانک کر دیکھا۔ اسے کئی گھنٹوں کے بعد لفٹ ملی تھی۔ وہ ایک ٹرک کی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اس کے دائیں طرف ڈرائیور تھا۔ اور بائیں طرف ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اور اس کی ریوالور کی نال بیل منڈو کی پسلی سے لگی ہوئی تھی۔ وہ لفٹ حاصل کرتے ہی ایک نئی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ اس وقت ماسٹر لوشے گہری نیند سو رہا ہے۔ اگر میں بیل منڈو سے سوچ کے ذریعے گفتگو کروں گا تو ماسٹر لوشے کو اس کی خبر نہیں ہو گی۔ میں نے احتیاطاً اپنی رسٹ واچ کو دیکھا۔ گھڑی بتا رہی تھی کہ ماسٹر لوشے ابھی پونے دو گھنٹے تک گہری نیند سوتا رہے گا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر میں بیل منڈو کے لیے وہی نادیدہ شیطان بن گیا۔ اور اس کے دماغ پر دستک دینے لگا۔

دو ہیلو بیل منڈو۔ تمہاری سوچ سے پتہ چل رہا ہے کہ تم ایک ٹرک کی سیٹ پہ دو آدمیوں کے درمیان بیٹھے ہوئے ہو۔ تمہارے بائیں جانب جو شخص ہے اس نے تمہاری پسلیوں سے ریوالور لگا رکھا ہے۔

یہ سب کیسے ہوا مجھے فوراً بتاؤ۔"

بیل منڈو اپنی رپورٹ پیش کرنے لگا۔ اس نے شیطان کو غصہ دکھاتے ہوئے کہا "شیطان کے بچے میں تمہاری وجہ سے نئی نئی پریشانیوں کا شکار ہو رہا ہوں۔ اگر اس کے ہاتھ میں ریوالور نہیں ہوتا تو بہت پہلے ہی میں اس کا کچومر نکال کر رکھ دیتا۔"

میں نے اسے تسلی دی۔

"پرواہ نہ کرو۔ جو لوگ میری وجہ سے مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں۔ میں ہر حال میں ان کی حفاظت کرتا ہوں۔ کیا تم نے دیکھا نہیں تمہاری رُوما فرہاد کے چاقو کی زد میں تھی۔ اس وقت تمہاری کوئی تدبیر اور جسمانی قوت کام نہیں آسکتی تھی۔ تمہاری بھتیجی کو بچانے کے لیے میں نے چال چلی۔ میں نے تمہیں تھوڑا سا نقصان پہنچایا اور فرہاد کو موقع دیا کہ وہ رُوما کو لے کر نکل جائے۔"

بیل منڈو کی جھنجھلائی ہوئی سوچ نے کہا۔

"میں اس نمک حرام لڑکی کا نام تک نہیں سننا چاہتا۔ میں نے بیٹی بنا کر بچپن سے اس کی پرورش کی۔ میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ چوروں بدمعاشوں کی اس دنیا میں ایک معصوم لڑکی بے غرض ہو کر مجھے دل و جان سے چاہتی ہے۔ لیکن وہ جان بچانے کے لیے فرہاد پر مرمٹی اور مجھے بزدلی کے طعنے دینے لگی۔"

میں نے ماسٹر لیوشے کے انداز میں کہا۔

"تم اوّل درجے کے گدھے ہو۔ بیوقوف تم اتنا نہیں سمجھ سکتے کہ رُوما نے مصلحتاً تم سے گستاخی کی ہے۔ میں نے اسے سکھایا تھا کہ اگر وہ دشمن بن کر تمہیں بزدلی کے طعنے نہیں دے گی تو فرہاد کو اس کی دوستی کا یقین نہیں ہوگا۔ رُوما تمہیں بچپن سے چاہتی ہے اور اب بھی تمہارے لیے پریشان ہے۔"

"کیا واقعی۔؟" بیل منڈو سوچنے لگا۔ "ہاں میری رُوما میرے لیئے جان بھی دے سکتی ہے اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ تمہاری شیطانی تدبیر پر عمل کر رہی تھی۔ میں اس سے کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس وقت غصے میں آگیا تھا۔"

"تمہیں غصہ دکھانے کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ بہرحال اب اپنے بچاؤ کی فکر کرو۔ مجھے بتاؤ کہ وہ ٹرک کس راستے پر چل رہا ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔ میں اس علاقے میں پہلی بار آیا ہوں۔"

"کسی انجانے علاقے میں پہنچ کر تم لوگوں کو اپنا دشمن کیوں بنا لیتے ہو؟"

"میں نے جان بوجھ کر دشمن نہیں بنایا ہے۔"

"تو پھر اس نے تمہیں ریوالور کی زد پر کیوں رکھا ہوا ہے۔؟"

بیل منڈو ایک گہری سانس لے کر سوچ کے ذریعہ کہنے لگا۔

"سڑک کے کنارے جہاں تم نے مجھے پاگل بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہاں فرہاد اور رُوما کے جانے کے بعد میں تنہا رہ گیا تھا۔ اور لفٹ حاصل کرنے کے لیے کسی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک انتظار کرتا رہا گاڑیاں آتی تھیں میں ہاتھ اٹھا کر انہیں رکنے کا سگنل دیتا تھا لیکن وہ قریب آکر تیزی سے گذر جاتی تھیں۔ میری جگہ کوئی حسین لڑکی ہوتی تو اسے لفٹ دینے کے لیے گاڑیاں ایک قطار میں کھڑی ہو جاتیں۔ اپنی ناکامی پر مجھے غصہ آنے لگا۔ آخر کب تک کھڑا رہ سکتا تھا۔ مجبور ہو کر میں نے ایک ٹوٹے ہوئے درخت کی طرف دیکھا درخت چھوٹا سا تھا اسے بڑی محنت سے کھینچتے ہوئے سڑک پر لے آیا اور راستے میں رکاوٹ کھڑی کر دی اس وقت ایک ٹرک دور سے ہارن بجاتا ہوا آنے لگا میں بیچ سڑک پر آگیا اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر چیلنج کے انداز میں کھڑا ہو گیا کہ اب یہاں سے گذر کر دکھاؤ میرا یہ چیلنج مجھے بڑا مہنگا پڑا ٹرک والوں نے سمجھا کہ میں پولیس کا آدمی ہوں ٹرک کی تلاشی لینے کے لیے میں نے راستے میں رکاوٹ کھڑی کر دی ہے پہلے تو وہ اس خیال سے ٹرک سے اتر آئے کہ شاید میرے ساتھ پولیس کے مسلح جوان ہوں گے جو ادھر اُدھر چھپے ہوئے ہوں گے۔ پھر مجھے تنہا دیکھ کر ایک شخص نے ریوالور نکال لیا اور مجھ سے کہا کہ میں درخت کو راستے سے ہٹا دوں ریوالور کو دیکھ کر مجھے مجبوراً اس کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ ڈرائیور نے اس شخص سے کہا۔

"یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے کوئی تنہا شخص اس طرح رکاوٹیں کھڑی نہیں کرتا کیا یہ پولیس کا آدمی نہیں ہو سکتا۔؟"

اس شخص نے تائید میں سر ہلا کر کہا

"ہاں اس آدمی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اسے یہاں چھوڑ کر آگے بڑھیں گے تو یہ اگلے تھانوں میں کسی طرح اطلاع پہنچا دے گا کہ فلاں نمبر کا ٹرک روک لیا جائے اس کے بعد ہمارے اور بھی ٹرک آنے والے ہیں اس ایک ٹرک کی وجہ سے وہ سب بھی پولیس کی نظروں میں آجائیں گے۔" ڈرائیور نے مشورہ دیا "اسے یہیں ختم کر دینا چاہیئے۔"

"اسے ختم کر دینا تو آسان ہے لیکن ہم اس کی لاش کہاں چھپائیں گے بہتر ہے کہ ہم اسے اپنے ساتھ سرحد پار لے جائیں وہاں اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ کیا جائے گا۔"

"انہوں نے آپس میں مشورہ کرنے کے بعد مجھے ٹرک میں بیٹھنے کے لیے کہا اور اب میں ان کے درمیان یہاں بیٹھا ہوں۔ انہوں نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے ذرا بھی شور مچایا تو وہ خود کو خطرے میں ڈالنے سے پہلے مجھے ہلاک کر دیں گے۔ صبح ہوتے ہی ہم پشاور سے گذر چکے ہیں اس وقت میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کس راستے پر چل رہے ہیں۔"

میں نے بیل منڈو کو مشورہ دیا کہ وہ ڈرائیور سے بات کرے۔ بیل منڈو نے ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے ایک سگریٹ کی خواہش ظاہر کی۔ مجھے ڈرائیور کی آواز سنائی دی وہ ڈانٹ کر کہہ رہا تھا۔

"چپ چاپ بیٹھے رہو۔ ابھی تمہاری کوئی خواہش پوری نہیں ہوگی۔ ہاں ذبح کرنے سے پہلے تمہیں اچھی طرح کھلایا پلایا جائے گا۔"

ڈرائیور کے باتیں کرنے کے دوران میں اس کے دماغ تک پہنچ گیا وہ ڈرائیونگ کے دوران ونڈ اسکرین کے باہر دیکھ رہا تھا جو کچھ اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں وہی اس کا دماغ سوچ رہا تھا کہ وہ جس راستے سے گذر رہا ہے وہ راستہ کیسا ہے اور آس پاس جو پہاڑیاں درخت ہیں اور چھوٹی چھوٹی کچی آبادیاں گذرتی جا رہی ہیں وہ کیسی کچی آبادیوں میں سڑک کے کنارے قہوہ خانے ہیں اور جو کچھ بھی ہے اس کی سوچ کو پڑھتے ہی پتہ چل گیا کہ وہ اسی راستے سے گذر رہے ہیں جہاں سے گذر کر میں یہاں تک آیا ہوں۔ میں پتھر سے اتر کر کار کی طرف جانے لگا۔ اور بیل منڈو کو سمجھانے لگا۔

"تم ٹھیک راستے پر جا رہے ہو۔ آگے جا کر ایک مقام پر فرہاد سے تمہاری ملاقات ہوگی۔ میں سڑک کے اسی حصے میں ڈرائیور کو مجبور کروں گا کہ گاڑی روک دے اس دوران ریوالور والے کی توجہ بھٹکتے ہی تم اس سے نمٹ لینا۔"

بیل منڈو محتاط ہو کر بیٹھ گیا میں کار کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور ان کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر دور سڑک کی جانب دیکھا۔ مجھے اس سڑک پر ایک ٹرک گذرتا ہوا دکھائی دیا۔ اب مجھے معلوم کرنا تھا کہ یہ وہی ٹرک ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس میں جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے وہ اتنی دور سے نظر نہیں آسکتے تھے میں اپنے مطلوبہ ٹرک کو صرف دماغی بصارت سے پہچان سکتا تھا۔

میں نے پہچاننے کی خاطر ڈرائیور کے دماغ کو ایک جھٹکا پہنچایا بالک اس کی سوچ میں کہا۔

"ادں ہونہہ۔ میرے پاؤں کانپ رہے ہیں۔ ارے ارے میرا پیر ایکسیلیٹر سے ہٹ رہا ہے۔ میرے ہاتھوں میں اسٹیئرنگ بہک رہا ہے..."

اس کے ساتھ ہی میں نے دور سڑک پر دیکھا وہ ٹرک ڈگمگا رہا تھا پھر وہ اچانک ہی رک گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اس طرح رکا تھا کہ آگے بیٹھنے والے ڈیش بورڈ سے ٹکرا گئے تھے۔ بیل منڈو پہلے ہی محتاط بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے فوراً ہی اس شخص کا ریوالور والا ہاتھ پکڑ کر اوپر کو اٹھا دیا۔ پھر پہلو بدل کر اس کے منہ پر ایک کھڑی ہتھیلی جما دی پہلے وہ شخص ڈیش بورڈ سے ٹکرایا تھا۔ وہاں سے زخمی ہو کر سنبھلنے کی کوشش کی تو بیل منڈو کے ایک ہی ہاتھ نے اس کے ذہن کو اندھیروں میں گم کر دیا۔ ڈرائیور نے اس پر جھپٹنا چاہا تو اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ صرف دس منٹ میں اس نے دونوں کو بے ہوش کر دیا پھر میں نے اسے حکم دیا کہ وہ دونوں کو ٹرک کے پیچھے لے جا کر ڈال دے۔

ٹرک کے پیچھے سامان بھرا ہوا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے جگہ بنا کر ان دونوں کے لیے دروازہ کھول دیا۔ اس نے مجھ پر ایک نظر ڈالی وہ رُوما کے متعلق بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن مصلحتاً خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں کار کو تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا اسی جگہ واپس جانے لگا۔ جہاں بیٹھ کر میں نے مراقبہ کیا تھا۔ اور ماسٹر لیوشے کے ذہن تک پہنچنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ وہ جگہ اس قدر ویران اور سنسان تھی کہ وہاں ہم دونوں کے درمیان کوئی مداخلت کرنے والا نہ ہوتا۔ جب میں کچے راستے پر گاڑی کو موڑنے لگا تو اس نے اشارے سے پوچھا۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔؟ رُوما کہاں ہے۔؟"

میں خاموشی سے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتا رہا لیکن سوچ کے ذریعہ ماسٹر لیوشے بن کر میں نے اس سے کہا۔

"چپ چاپ بیٹھے رہو۔ وہ تمہیں جہاں بھی لے جا رہا ہے۔ وہاں وہ تنہا رہے گا۔ تم اس کی اچھی طرح پٹائی کر کے اپنی حسرت پوری کر لینا۔"

وہ مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے درمیان کار لے جا کر روک دی۔ بیل منڈو کار سے باہر نکل کر اپنے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ میں بڑی خاموشی سے ایک پتھر کی طرف بڑھتے ہوئے سوچ کے ذریعے اس سے کہنے لگا۔

"تم چپ چاپ کھڑے رہ کر فرہاد کو دیکھتے رہو کہ وہ کیا کر رہا ہے۔؟"

میں پہلے جس پتھر پر بیٹھا ہوا تھا وہیں پہنچ کر بیٹھ گیا۔ پھر اپنے چہرے سے ماسک اتارنے لگا۔ بیل منڈو بڑی خاموشی اور دلچسپی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ماسک اتارنے کے بعد میں نے اپنی آنکھوں سے آئی لنس بھی نکال لئے پھر انہیں بڑی احتیاط سے پتھر پر رکھنے کے بعد اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ بیل منڈو نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو یہ تمہارا اصلی چہرہ ہے۔"

میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ہاں! تمہارے سامنے فرہاد کا اصلی چہرہ ہے۔ اپنے اس نادیدہ شیطان سے کہو کہ وہ تمہارے ذریعے میری آنکھوں میں جھانکے اور تمہاری طرح مجھے بھی ذہنی طور پر غلام بنا لے۔"

وہ مجھ سے چار قدم کے فاصلے پر آکر رک گیا۔ پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوچ کے ذریعے ماسٹر لیوشے کو پکارنے لگا۔

"شیطان۔ تم کہاں ہو۔؟ تم نے کہا تھا کہ اگر میں فرہاد کی آنکھوں میں جھانکوں گا اور اسے باتیں کرنے پر مجبور کروں گا تو تم اس کے دماغ کو کنٹرول کر لوگے۔"

سوچ کے ذریعے اتنا کہنے کے بعد وہ ماسٹر لیوشے کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ مگر وہ شیطان تو سو رہا تھا۔ اسے جواب کہاں سے ملتا۔؟

میں نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ہوا بیل منڈو۔ کیا میرے سامنے آتے ہی تمہارا وہ شیطان

بھاگ گیا ہے ؟"

بیل منڈو نے سر ہلا کر کہا

"ہاں میں نے بہت پہلے اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ ایک شیطان کے سامنے دوسرا شیطان نہیں ٹھہرتا۔ میں حیران ہوں کہ وہ میرے دماغ سے کہاں غائب ہو گیا۔ وہ تو تمہیں اپنا غلام بنانے کے لیے دن رات بے چین رہتا ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بیل منڈو اگر تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ تمہارے دماغ میں گھس کر پریشان کرنے والا شیطان میں ہی ہوں تو کیا تمہیں یقین آئے گا۔؟"

"اگر تم وہی شیطان ہو تو اس وقت میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ خوش نصیب سمجھوں گا۔ ویسے بھی مجھے اس سے غرض نہیں ہے کہ تم ہی میرے اور رومل کے دماغ میں گھس کر شیطانی حرکتیں کرتے رہتے تھے یا پھر فرہاد کی حیثیت سے تمہاری الگ شخصیت ہے۔ تم جو کوئی بھی ہو میرے لیے مصیبتوں کا باعث بنتے رہے ہو اب میں تمہیں دکھاؤں گا کہ بیل منڈو کتنا بڑا شیطان ہے میرے سامنے آکر للکارنے والا کبھی اپنے پیروں سے چل کر واپس نہیں گیا۔ آج یہاں سے تمہاری لاش چار کاندھوں پر جائے گی۔"

یہ کہتے ہی وہ تیزی سے پینترا بدل کر میرے سر پر آپہنچا۔ میرا ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا۔ جیب کے اندر ہی میں نے نسوار کی ڈبیا کھول لی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کے کراٹے کے وار کو روکا۔ دوسرے ہاتھ سے اس کے نتھنوں کے قریب ڈبیا سے نسوار اچھال دی۔

"آں چھی۔ آں چھی۔۔۔۔۔"

وہ چھینکتا ہوا دو قدم پیچھے چلا گیا۔ پھر ذرا سنبھل کر آگے بڑھنے کی کوشش کی تو چھینکوں نے اس پر حملہ شروع کر دیا۔ وہ چھینکنے کے دوران ذرا سا جھکا تو میں نے ایک زبردست گھونسہ اس کی ناک پر جڑ دیا۔ اس کی مصنوعی ناک ایک طرف سے اکھڑ کر دوسری طرف چہرے پر لٹک گئی۔ اور مائیکرو فلم وہاں سے گر کر زمین پر لڑھکتی ہوئی میرے قدموں کے پاس آکر رک گئی۔

بیل منڈو کا چہرہ بڑا ہی بھیانک ہو گیا تھا۔ غصے کی حالت میں سرخ دیدے پھیلے ہوئے تھے۔ ناک کی جگہ ایک تاریک گڑھا سا نظر آرہا تھا۔ اس کی مصنوعی ناک ایک طرف چہرے پر لٹک رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ٹوٹی ہوئی کھڑکی پر چپکایا ہوا کاغذ ایک طرف سے اکھڑ گیا ہے اور ہوا کی زد میں ادھر ادھر پھڑپھڑا رہا ہے۔ کمزور دل والوں کے لیے وہ چہرہ بڑا بھیانک ہو گیا تھا مگر مجھ جیسے تماش بین کو وہ بڑا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔

مائیکرو فلم اس کی ناک سے ایک پکے ہوئے پھل کی طرح ٹوٹ کر گر پڑی تھی اور زمین پر لڑھکتی ہوئی میرے قدموں کے پاس آگئی تھی۔ اسے اپنی ناک کے اکھڑنے کا فوراً ہی احساس نہیں ہوا تھا لیکن مائیکرو فلم کو میری طرف لڑھکتے دیکھ کر فوراً ہی اسے احساس ہوا کہ اس کے چہرے پر کوئی چیز لٹک رہی ہے۔ اس نے لٹکی ہوئی ناک کو چھو کر دیکھا پھر تو غصے کی شدت سے اس کی کھوپڑی الٹ گئی۔ اس نے مجھ پر زبردست حملہ کرنے کے لیے پھر ایک بار پینترا بدل کر آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن اسی وقت اسے پھر چھینکیں آنے لگیں۔

"آں چھی" چھینکنے کے دوران پینترا اکھڑ گیا۔ وہ جھک جھک کر چھینکنے لگا۔ اسی وقت میں نے اس کے منہ پر ایک زوردار لات رسید کی۔ وہ بھینس کی طرح ڈکراتا ہوا دوسری طرف الٹ گیا۔ اس کے گرتے ہی میں اس سے تقریباً دس گز کے فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ رفتہ رفتہ چھینکوں کا زور کم ہوتا جائے گا۔ ابھی وہ مجھ سے نہیں بلکہ چھینکوں سے شکست کھا رہا تھا۔ ان سے نجات ملتے ہی وہ میرے لیے موت کا فرشتہ بن جاتا۔ اسی لیے میں نے اس سے ایک طویل فاصلہ قائم کر لیا تھا۔

جب وہ دوبارہ اٹھنے لگا تو میں نے جیب سے چاقو نکال کر کھول لیا۔ اس طرح وہ اندھا دھند مجھ پر حملہ نہیں کر سکتا تھا چاقو دیکھ کر واقعی اسے ذرا عقل آگئی۔ وہ محتاط ہو کر چاقو پر نظر رکھتے ہوئے ذرا ٹھہر ٹھہر کر میری طرف بڑھنے لگا اور کہنے لگا۔

"یہ چاقو تمہارے ہی سینے میں اترے گا تم یہ نہ سوچو کہ اس کھلونے سے مجھے مار ڈالو گے یا اس کے سہارے بچ کر نکل جاؤ گے۔"

میں نے اس سے کہا:

"مجھے بزدلوں کی طرح بھاگنا نہیں آتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم ناقابل شکست ہو مگر آج تمہیں اپنی زندگی کی پہلی اور آخری عبرتناک شکست حاصل ہوگی"

اس نے نکٹی ناک سے غراتے ہوئے کہا:

"تم مجھے شکست دو گے اور اس چاقو سے۔ اونہہ؟"

میں نے چاقو لہراتے ہوئے کہا:

"یہ ہتھیار میں نے اپنے لیے نہیں تمہارے استعمال کے لیے نکالا ہے۔ یہ لو اسے سنبھالو۔"

یہ کہہ کر میں نے چاقو اچھال کر اس کے قدموں کے پاس پھینک دیا۔ وہ حیرانی سے میرا منہ دیکھنے لگا۔ میں نے کہا

"دیکھتے کیا ہو چاقو اٹھا لو۔"

اس نے حقارت سے چاقو کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا:

"چیونٹی کو مارنے کے لیے ہتھیار کی ضرورت نہیں پڑتی میں تمہیں چٹکیوں میں مسل دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے میری طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے بالکل قریب پہنچتا میں نے سوچ کے ذریعے اسے حکم دیا:

"رک جاؤ، ورنہ گر پڑو گے۔۔۔"

دماغ کے بغیر آنکھوں کی بصارت کام نہیں آتی۔ انسان کی عقل تو تنک بھی ڈگمگا جاتی ہیں۔ وہ ڈگمگا کر گرتے گرتے سنبھل گیا۔ جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ میں نے ماسٹر یوشے بن کر پھر سوچ کے ذریعے اسے حکم دیا۔

"احمق نہ بنو۔ جہاں چاقو پڑا ہوا ہے۔ وہاں واپس جاؤ اور اسے اٹھاؤ۔"

"میں نہیں اٹھاؤں گا۔" وہ بری طرح جھنجلا کر کہنے لگا۔ میں اس سے چار قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا اسے پورا یقین تھا کہ وہ مجھے چٹکیوں میں مسل دے گا اسے اپنے مارشل آرٹ پر فخر تھا ہر شخص اپنی صلاحیتوں پر ناز کرتا ہے اور ضرورت کے وقت ان صلاحیتوں کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ مجھے بھی اپنی صلاحیتوں پر ناز تھا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ وہ اپنی جسمانی قوتوں کو آزمانا چاہتا تھا اور میں دماغی قوتوں کو آزما رہا تھا۔

وہ بدستور جھنجلا کر کہہ رہا تھا۔

"شیطان کے بچے، میرا دشمن ابھی میری مٹھی میں ہے۔ تجھے تیری شیطانیت کا واسطہ ابھی میری گردن چھوڑ دے۔ میں اس کی گردن توڑ کر اپنی حسرت پوری کرنا چاہتا ہوں۔"

میں اس کے سامنے مہر بہ لب خاموش کھڑا ہوا تھا اور سوچ کے ذریعے اسے حکم دے رہا تھا:

"میں تم سے بہت پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہر شخص کے پاس اپنی انفرادی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ مدافعت کے دوران کسی کی جان لینے یا اپنی جان بچانے کے لیے ہر شخص اپنی صلاحیتوں کو کام میں لاتا ہے۔ اس وقت بحث نہ کرو واپس جاؤ اور چاقو اٹھالاؤ۔ جاؤ۔"

جاؤ کہہ کر میں نے اس کے ذہن کو زبردست جھٹکا پہنچایا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کر پیچھے کی طرف لڑکھڑایا۔ پھر میں ماسٹر یوشے کے انداز میں اسے ذہنی اذیتوں میں مبتلا کرنے لگا۔ دماغ کے بغیر وہ ایک خالی بوتل کی طرح ادھر ادھر زمین پر لڑھک سا رہا تھا۔ جب وہ چاقو کے پاس پہنچا تو میں نے تھوڑی دیر کے لیے اسے آزاد چھوڑ دیا۔ عین نگاہوں کے سامنے چاقو کو دیکھ کر اس نے سوچا کہ شیطان کی بات مان کر فوراً ہی فرہاد کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔

یہ سوچتے ہی وہ چاقو کے دستے کو مضبوطی سے تھام کر کھڑا ہو گیا اسی وقت میں اس کے ذہن میں ہلچل مچانے لگا۔ اس کی سوچ میں کہنے لگا

"چاقو میری مٹھی میں ہے میں دائیں طرف ڈگمگا رہا ہوں۔ نہیں بائیں طرف ڈگمگا رہا ہوں۔ نہیں نہیں پیچھے کی طرف جھٹکے کھا رہا ہوں اور اب میں آگے کی طرف گرنے والا ہوں۔ میری طرح دنیا کی ہر چیز ڈگمگا رہی ہے اور چکرا رہی ہے۔۔۔"

میں اس کے دماغ میں مسلسل چیخ رہا تھا۔ آندھی کی طرح اس کے سوچنے اور سمجھنے کی قوتوں کو اڑائے لیے جا رہا تھا۔ طوفان کی زد میں تنکے کی طرح اڑتی ہوئی سوچ کے مطابق وہ کبھی دائیں بائیں اور کبھی آگے پیچھے جھوم رہا تھا۔ گرتے گرتے سنبھل رہا تھا اور بری طرح بوکھلا رہا تھا کہ کس طرح اسے قرار آسکتا ہے۔ کس طرح وہ ایک جگہ جم کر کھڑا رہ سکتا ہے؟

میں نے سوچ کے ذریعے کہا:

"ایک کھونٹی اس وقت تک جم کر نہیں رہ سکتی جب تک کہ زمین کی چھاتی میں اتر کر نہ رہ جائے۔ میرے سینے میں بھی یہ چاقو اترے گا تو میں جم کر رہ جاؤں گا۔ چاقو فضا میں بلند ہو چکا ہے۔ میرے ہاتھ نہیں کانپ رہے ہیں یہ چاقو میرے سینے میں اتر کر مجھے ایک جگہ کھڑا کر دے گا میں پورے یقین کے ساتھ اس چاقو کو اپنے سینے میں اتار رہا ہوں۔ اسے اپنے سینے میں چھپا رہا ہوں۔ چھپا رہا ہوں۔۔۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے پوری قوت سے چاقو کے پھل کو دستے تک اپنے سینے میں چھپا لیا۔ اس کے تڑپنے کے دوران میں نے ایک بار پھر وہی عمل کیا۔ پھر ایک بار وہ چاقو اس کے سینے سے نکلا اور خود اس کے ہاتھوں نے اسے دوسری بار دل کی جگہ اتار لیا۔ اب میں اس کے کرب کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ ویران ماحول اس کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اس کا سر موت کے نشے سے چکرا رہا تھا۔ اس کا بھاری بھرکم جسم ماہی بے آب کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ اور نگاہوں کے سامنے اس دنیا کی رونقیں اور رنگینیاں ڈوبتی جا رہی تھیں تھوڑی دیر بعد وہ بالکل ساکت ہو گیا۔

اس دنیا میں کون یہ بات سینہ تان کر کہہ سکتا ہے کہ وہ ناقابل شکست ہے؟ تاریخ کے فرعونوں کی طرح وہ بھی خاک میں ملنے کے لیے خاک پر پڑا ہوا تھا۔ جو لوگ ضدی سرکش اور نشہ زور ہیں اور کبھی کسی سے شکست کھانا گوارا نہیں کرتے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ موت ایک دن انہیں پچھاڑ دیتی ہے بیل منڈو کی بھی قوی برتری اور اس کا حاکمانہ مزاج سب کچھ مٹی میں رل رہا تھا۔ میں نے وہ مائیکرو فلم اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لی۔ اس کے بعد آئی لینس اور ماسک کو ایک رومال میں اچھی طرح لپیٹ کر اسے بھی جیب میں رکھ لیا۔ پھر میں نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھا۔ ماسٹر یوشے کے بیدار ہونے میں صرف بیس منٹ رہ گئے تھے۔ میں تیزی سے بڑھتا ہوا کار تک آیا۔ وہاں سے میں نے بیل منڈو پر ایک الوداعی نظر ڈالی۔ پھر اسٹیرنگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ کرتے وقت میرے دل میں آیا کہ بیچاری روما یتیم ہو گئی ہے۔ یتیم تو وہ پہلے بھی تھی۔ مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس کا باپ مر چکا ہے یا کہیں زندگی گزار رہا تھا۔ بہر حال بیل منڈو باپ بن کر اس کی پرورش کر رہا تھا۔ آج وہ اتنے بڑے سہارے سے محروم ہو گئی تھی۔ میں کار ڈرائیو کرتا ہوا اس کے متعلق سوچتا ہوا پھر پشاور کی طرف جانے لگا۔

پشاور پہنچ کر میں نے دو پیالی کافی پینے میں اپنا وقت ضائع کیا کیونکہ نیند سے اور تھکن سے برا حال تھا۔ آگے بڑھنے کے لیے کافی کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس دوران ماسٹر یوشے بیدار ہو چکا تھا۔ بیدار ہوتے ہی اس

نے سب سے پہلے روما کی خیریت لی تھی۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں اس وقت اس حسینہ کے پاس ہوں یا نہیں؛

روما کے دماغ پر دستک ہوتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اور حیران نگاہوں سے اس اجنبی ماحول کو دیکھنے لگی۔ پھر اُسے یاد آ گیا کہ وہ آج ہی صبح میرے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں آئی تھی اور وہاں پہنچتے ہی ماسٹر یوشے کے حکم کے مطابق سو گئی تھی۔ ماسٹر یوشے اِس دوران کبھی ٹائیلٹ کو جا رہا تھا کبھی شیو بنا رہا تھا، کبھی غسل کر رہا تھا اور روما کے دماغ میں جھانکتا بھی جا رہا تھا۔

روما کی آنکھ کھلتے ہی جب میں یاد آیا تو وہ فوراً ہی بستر سے اٹھ کر پہلے ٹائیلٹ کے دروازے تک گئی۔ دروازے پر اس نے دستک دی کہ اس کا خیال تھا کہ شاید میں ٹائیلٹ میں موجود ہوں۔ جواب نہ پا کر اس نے دروازے کو دھکا دے کر کھولا۔ ٹائیلٹ خالی تھا۔ پھر وہ کمرے کا دروازہ کھول کر کوریڈور میں ایک سِرے سے دوسرے سرے تک نظریں دوڑانے لگی۔ لیکن میں نظر نہیں آیا۔ اس نے کمرے میں واپس آ کر دروازے کو بند کیا پھر جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آئینے کے سامنے آ گئی اور باہر جانے کے لیے اپنے چہرے کی نوک پلک درست کرنے لگی۔ ماسٹر یوشے نے اُس سے پوچھا:

"تمہارے سونے کے بعد کیا فرہاد نے تمہیں جگایا نہیں تھا؟"

روما نے آئینے کے سامنے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

"نہیں جب تم نے مجھے سونے کے لیے کہا تو اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ اب میں بیدار ہو کر دیکھ رہی ہوں تو وہ کمرے میں اور کمرے کے باہر نظر نہیں آ رہا ہے اگر وہ کہیں چلا گیا تو مجھے بیحد افسوس ہوگا۔"

ماسٹر یوشے کی سوچ نے کہا:

"تم سے زیادہ افسوس مجھے ہوگا۔ کیا یہ افسوس کرنے کا طریقہ ہے کہ اسے تلاش کرنے کی بجائے آئینے کے سامنے میک اپ کر رہی ہو۔ تم کسی مقابلۂ حسن میں حصہ لینے کے لیے نہیں جا رہی ہو۔ چلو فوراً کمرے سے نکلو اور ریسپشن روم میں جا کر معلوم کرو کہ تمہارا ساتھی کہاں گیا ہے؟"

وہ کمرے سے نکل کر ریسپشن روم کی طرف جانے لگی۔ وہاں کاؤنٹر کے پیچھے وہ لڑکی نظر نہیں آئی جو گذشتہ فرہاد کو روما کے ساتھی کی حیثیت سے دیکھ چکی تھی۔ اس لڑکی کی ڈیوٹی بدل گئی تھی۔ اِسی لیے روما نے دوسری لڑکی سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ سیدھی پارکنگ ایریا کی طرف گئی۔ وہاں جا کر دیکھا تو اس کے انکل کی کار غائب تھی۔ فی الحال وہ یہی سوچ سکتی تھی کہ فرہاد کسی کام سے کار لے کر گیا ہے۔ شاید واپس آ جائے گا۔

لیکن ماسٹر یوشے ایسا نہیں سوچ سکتا تھا۔ وہ میری عدم موجودگی سے بھانپ گیا تھا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ اس نے فوراً ہی بیل منڈو سے دماغی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔

لیکن بیل منڈو اِس دنیا میں کہاں تھا؛ کسی بھی ٹیلی پیتھی جاننے والے کی سوچ کی لہریں اس کے مردہ دماغ تک نہیں پہنچ سکتی تھیں تھوڑی دیر میں ماسٹر یوشے پریشان ہو گیا کیونکہ اس کی سوچ کی لہریں ناکام لوٹ آ رہی تھیں اور اسے سمجھا رہی تھیں کہ بیل منڈو اب اِس دنیا میں نہیں ہے بیل منڈو سے رابطہ قائم نہ ہونے کی صورت میں صرف یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ مر چکا تھا۔ ورنہ اس کا ذہن جب تک جاگتا رہتا اس وقت تک ماسٹر یوشے کی سوچ کی لہروں سے آزاد نہ رہتا۔

ماسٹر یوشے کا تمام سکون و اطمینان غارت ہو گیا۔ اب وہ یہ معلوم کرنے کے لیے بیتاب ہو گیا کہ بیل منڈو کس انجام کو پہنچا ہے۔ وہ سب سے زیادہ میری وجہ سے پریشان ہو گیا تھا کہ میں پھر ایک بار اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہوں۔ وہ فوراً ہی روما کو ہدایتیں دینے لگا کہ اسے کس طرح کسی قریبی پولیس اسٹیشن میں پہنچ کر اپنے انکل کی گمشدگی کی اطلاع دینی چاہیے۔

میں کافی کی دوسری پیالی ختم کر چکا تھا۔ دو پیالیوں کا بل ادا کرنے کے بعد میں فوراً ہی ہوٹل گرین سے باہر آیا۔ اور بیل منڈو کی کار میں بیٹھ کر پنڈی کی طرف واپس جانے لگا۔ ماسٹر یوشے کی بے چینی دیکھنے کے قابل تھی۔ اگرچہ میں اسے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن سوچ کے ذریعہ چشمِ تصور میں اسے اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے کبھی اٹھتے ہوئے کبھی بیٹھتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ بار بار یہ سوچ کر اس کے دِل کو صدمہ پہنچتا تھا کہ میں اس کے ہاتھ آ کر پھر ایک بار نکل گیا۔ وہ ایک پر کٹے پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اگر اس کے پر ہوتے تو وہ اسی وقت اڑ کر یہاں چلا آتا اور روما کو ساتھ لے کر مجھے تلاش کرتا پھرتا لیکن اِس وقت وہ مجبور تھا۔ یہاں پہنچنے کے لیے اس نے جس فلائٹ سے سیٹیں ریزرو کرائی تھیں وہ فلائٹ کل وہاں سے روانہ ہونے والی تھی اور کل رات کو کسی وقت وہ یہاں پہنچنے والا تھا مگر کل بہت دور تھی اس لیے وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں میں اِس علاقے سے بہت دور نہ چلا جاؤں۔ اِتنی دور کہ اس کا کوئی آلہ کار اس کی رہنمائی نہ کر سکے۔

تھوڑی دیر تک میں اس کے اضطراب کو پڑھتا رہا اور اس کی پریشانی سے محظوظ ہوتا رہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ فی الحال صرف منصوبے بنا سکتا ہے مجھ تک ابھی کسی ذریعے سے پہنچ نہیں سکتا تو میں نے اس کے ذہن میں جھانکنا چھوڑ دیا اور آئندہ کا پروگرام اپنے ذہن میں مرتب کرنے لگا۔ دو پیالی کافی پینے کے باوجود تھکن سے میرا بُرا حال تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ابھی کہیں سے آرام دہ بستر مل جائے تو میں اس پر گر پڑوں اور کچھ دیر کے لیے بیہوشی کی نیند سو جاؤں مگر ابھی آرام میرے نصیب میں نہیں تھا میں نے پنڈی کی طرف بڑھتے ہوئے سعید احمد کے دماغ پر دستک دی۔

سعید احمد صحیح معنوں میں چھٹیوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔ اپنی ایک ماہ کی چھٹی کو رنگین بنانے کے لیے کسی حسینہ سے عشق فرما رہے تھے اتنے سنجیدہ اِنسان کو میں پہلی بار ایک عاشق کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ محبت کی آگ سے پتھر بھی پگھل جاتے ہیں اس وقت وہ لڑکی کو مخاطب کر کے کہہ رہے تھے:

"ثمر؛ یہاں کے مناظر کتنے خوبصورت ہیں۔ یہ دور دور تک پھیلی ہریالی، یہ اونچے اونچے پہاڑ اور پہاڑوں کو چھو کر گذرنے والے سفید سفید بادل کیسے عجیب سے لگتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہم خود بادلوں کے قریب پہنچ گئے ہیں مگر تم تو کچھ چپ سی رہتی ہو۔ کیا تمہیں یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا؟"

مجھے ثمر کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ کسی خیال میں گم تھی۔ یک بیک چونک کر بولی:

"آں ہاں۔ اچھا لگتا ہے۔ جب میں چھوٹی سی بچی تھی تو اِن سفید بادلوں کو دیکھ کر سوچتی تھی۔ کاش میرے پنکھ ہوتے تو میں اِن اڑتے ہوئے بادلوں کو چھو لیتی۔ مگر اب یہاں پہاڑی مقام پر آ کر یہ کوئی بڑی بات نظر نہیں آتی، بادل ہمیں چھوتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ یہاں تو ایسا لگتا ہے جیسے جنت زمین پر اتر آئی ہو۔"

سعید احمد نے اس کی قربت سے بیحد متاثر ہوتے ہوئے کہا؛

"اگر تم میرے پاس نہ ہوتیں تو زمین کی یہ جنت مکمل نہ ہوتی۔ تمہیں پا کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے اب میری زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں رہی مگر میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم میرے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور خیالوں کی دنیا میں بھٹک جاتی ہو۔ کیا بات ہے ثمر؟ کیا میں تمہارا دِل نہیں بہلا سکتا؟ کیا پھر تمہیں اپنے ڈیڈی یاد آ رہے ہیں؟"

ثمر نے نظریں اٹھا کر سعید احمد کو دیکھا پھر ایک سرد آہ بھر کر بولی

"جی ہاں! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ڈیڈی میرے لیے زندہ ہوتے ہوئے بھی زندہ نہیں ہیں یا یوں سمجھ لیں کہ میں ان کے لیے زندہ نہیں ہوں۔"

سعید احمد نے ایک طویل سانس چھوڑتے ہوئے کہا:

"ہاں ثمر! یہ تمہارے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہے کہ تم اپنے باپ کو پہچانتی ہو لیکن تمہارے ڈیڈی تمہیں نہیں پہچانتے۔ یہ قسمت کی ستم ظریفی ہے کہ باپ اور بیٹی ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن گئے ہیں۔ کاش کہ میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا۔"

"آپ کے اختیار میں جو کچھ تھا وہ آپ نے کیا۔ آپ کا یہ احسان کم نہیں ہے کہ آپ مجھے پاگل خانے تک لے گئے اور ڈیڈی سے میری ملاقات کرا دی۔"

سعید احمد نے پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا:

"ہاں میں نے ملاقات کرا دی لیکن کیا حاصل ہوا تمہیں کیا ملا؟ کچھ نہیں، تمہیں یہ دیکھ کر اور زیادہ صدمہ پہنچا کہ وہ باپ ہو کر اپنی بیٹی کو نہیں پہچان سکتے ہیں۔"

یہ بات سعید احمد نے کچھ اِس انداز سے کہی کہ ثمر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ دوسری طرف منہ پھیر کر بولی:

"محبت کرنے والا باپ زندہ ہے اس کے باوجود میں خود کو ایک یتیم لڑکی سمجھ رہی ہوں۔ ایسی بدنصیب کون ہوگی؟"

سعید احمد نے فوراً ہی جیب سے رومال نکال لیا اور سامنے آ کر اس کے آنسو پونچھنے لگے۔ میں خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ لیکن ان کے رومانس میں ایک عجیب سا درد تھا۔ میں نے ثمر کو ابھی تک نہیں دیکھا تھا مگر مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ فی الحال ہمدردی کا وقت نہیں تھا۔ میں نے اُن کے رومانس کو نظر انداز کرتے ہوئے سعید احمد کے دماغ پر دستک دی۔

"ہیلو سعید صاحب! میں فرہاد بول رہا ہوں۔"

جیسے ہی میں نے رابطہ قائم کیا وہ ایک دم سے چونک گئے اور بوکھلا کر یوں چاروں طرف دیکھنے لگے جیسے وہ اپنے آس پاس مجھے محسوس کر رہے ہوں اور یہ سمجھ رہے ہوں کہ میں کہیں چھپ کر انہیں محبت کرتے دیکھ رہا ہوں پھر جلد ہی انہیں اپنی بوکھلاہٹ پر ہنسی آ گئی۔ انہیں یاد آ گیا کہ اِس دنیا میں ان کا ایک دوست بھی ہے جس کا نام فرہاد علی تیمور ہے۔ اور جو سینکڑوں میل دور بیٹھ کر بھی دماغی رابطہ قائم کر لیتا ہے۔ لیکن ایک لڑکی کے عشق نے تھوڑی دیر کے لیے سب کچھ ان کے ذہن سے بھلا دیا تھا۔ انہوں نے جلد ہی سنبھل کر کہا

"ہاں فرہاد تمہاری سوچ مجھ تک پہنچ رہی ہے۔ خدا کی قسم تم بہت اِنتظار کراتے ہو۔ اب مجھ سے اِنتظار نہیں ہوتا۔"

مَیں نے جواب دیا "سعید صاحب! اِنتظار کی گھڑیاں ختم ہو چکی ہیں میں وہ مائیکرو فلم حاصل کر چکا ہوں۔"

انہوں نے خوش ہو کر پوچھا:

"کیا واقعی؛ فرہاد کیا واقعی تم نے وہ مائیکرو فلم حاصل کر لی ہے مجھے یقین نہیں آتا کہ اِتنے بڑے شیطان کا مقابلہ تم نے کس طرح کیا۔ میں تو جب بھی اس کے متعلق سوچتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ہمیشہ یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ وہ نادیدہ شیطان تمہیں غافل پا کر تمہارے ذہن پر اپنا تسلط جما لے گا۔"

"ہاں یہ دھڑکا تو مجھے بھی لگا رہتا ہے۔ میں ابھی تک اس نادیدہ شیطان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ مگر ہاں بیل منڈو اپنے انجام کو پہنچا اور آپ تو جانتے ہی ہیں۔ کسی بھی اِنسان کا انجام کیا ہوتا ہے۔ موت....."

"اچھا تو کیا تم نے اسے مار ڈالا ہے؟"

"ہاں سعید صاحب! مجبوری تھی۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو ماسٹر یوشے بہت جلد میرے دماغ تک پہنچ جاتا۔ مجھے افسوس ہے۔"

"افسوس نہ کرو میرے دوست! تم نے وہ مائیکرو فلم حاصل کر کے اپنے ملک کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ اِس نیک کام کے دوران اگر بیل منڈو جیسے مجرم مر جاتے ہیں یا مار دیے جاتے ہیں تو ان کا افسوس نہیں کرنا چاہیے تم یہ بتاؤ کہ کہاں مل رہے ہو؟"

"میں اِس وقت پشاور سے پنڈی کی طرف جا رہا ہوں۔ پچاس میل کا فاصلہ طے کر چکا ہوں۔ ایک گھنٹے میں پنڈی پہنچ جاؤں گا۔ اگر آپ کے پاس ابھی کوئی کار ہے تو اسے لے کر فوراً پنڈی پوائنٹ پر آ کر ملیں میں وہاں آپ کا اِنتظار کروں گا۔ اگر آپ مجھ سے پہلے پہنچ جائیں تو آپ میرا اِنتظار کریں۔"

"اچھی بات ہے میں ابھی پنڈی کی طرف جا رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ ثمر کو دیکھنے لگے ثمر بھی انہیں خاموشی سے دیکھ رہی تھی

پھر وہ بولی:

"آپ اچانک خاموش کیوں ہو گئے تھے کیا سوچ رہے تھے؟"

"اں کچھ نہیں۔ مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ اسی وقت میرا پنڈی جانا بہت ضروری ہے آؤ چلو ہم اپنے کالج کی طرف چلیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ثمر کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر کالج کی طرف جاتے ہوئے سوچ کے ذریعے انہوں نے مجھ سے پوچھا:

"فرہاد! کیا تم ابھی تک میرے ذہن میں جھانک رہے ہو؟"

میں نے مسکرا کر جواب دیا:

"جی ہاں میں آپ کے ذہن میں موجود ہوں اور اس نازک سے ملائم ہاتھ کو محسوس کر رہا ہوں جسے آپ کا ہاتھ محسوس کر رہا ہے۔"

وہ ذرا جھینپ کر بولے:

"تم بھی کسی شیطان سے کم نہیں ہو۔ اُف خدایا۔ اس طرح تو تم میری تنہائیوں میں پہنچ جایا کرو گے!"

میں نے انہیں یقین دلایا:

"نہیں سید صاحب! میں اتنا گستاخ نہیں ہوں آپ اطمینان رکھیں۔ بس اتفاقاً ایسے وقت میں نے آپ سے رابطہ قائم کر لیا ہے جب آپ دل کے معاملات میں مصروف تھے۔"

انہوں نے مسکرا کر کہا:

"اچھا چھوڑو یہ باتیں۔ یہ بتاؤ میں تمہارے لیے اور کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ سے روبرو ملاقات ہو گی تو میں بتاؤں گا۔ اس وقت مارے تھکن کے بُرا حال ہے۔ میری سب سے پہلی خواہش یہی ہے کہ مائیکرو فلم آپ کے حوالے کرتے ہی چند گھنٹوں کے لیے سو جاؤں۔ مجھے آرام کی سخت ضرورت ہے۔"

سید احمد نے کہا:

"اگر ایسی بات ہے تو تمہیں سیدھے مری آنا چاہیے میں یہاں فوراً ہی تمہارے آرام سے سونے کا انتظام کر دوں گا۔ یہاں تمہیں کسی بات کی تکلیف نہیں ہوگی۔"

میں نے ان سے کہا:

"میں سیدھا آپ کے پاس نہیں آ سکتا کیونکہ بیل منڈو کی کار میرے پاس ہے۔ میں اسی کار میں سفر کر رہا ہوں۔ آپ سے ملاقات ہونے کے بعد میں اسے کسی ایسے مقام پر جا کر چھوڑ دینا چاہتا ہوں جہاں اس کار کو دیکھ کر ماسٹر یوشے یا اس کے آلہ کار میرے فرار ہونے کی سمت کا تعین نہ کر سکیں۔"

سید احمد نے میرے خیال سے متفق ہو کر مجھے یقین دلایا کہ وہ جلد از جلد پنڈی پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد جب میں نے دماغ کی اسکرین پر انہیں ایک کار میں روانہ ہوتے دیکھ لیا تو مطمئن ہو کر ان سے رابطہ ختم کر دیا کیونکہ اب میں پھر ماسٹر یوشے کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

ماسٹر یوشے کی پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ رِدما نے اس کی ہدایت کے مطابق ایک پولیس اسٹیشن میں اپنے انکل کی گمشدگی کی اطلاع دے دی تھی اب پولیس والے بیل منڈو کا حلیہ ذہن نشین کرنے کے بعد اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے اور رِدما ماسٹر یوشے کے پیچھے پڑ گئی تھی کہ وہ کسی طرح بھی اپنی ٹیلی پیتھی کی صلاحیتوں کو کام میں لا کر اس کے انکل کا پتہ چلائے۔

مگر ماسٹر یوشے مجبور تھا۔ اس کی صلاحیتیں کام نہیں آ رہی تھیں اس کی بے چینی بتا رہی تھی جیسے وہ کانٹوں کے بستر پر لوٹ رہا ہے اور جلد از جلد یہاں پہنچنے کی دوسری تدبیریں سوچ رہا ہے مگر کوئی تدبیر سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بار بار بڑبڑاتے ہوئے اعتراف کر رہا تھا کہ فرہاد علی اس صدی کا بہت بڑا شاطر انسان ہے جو اس جیسے دماغ کی بساط پر چال چلنے والے شاطر کو بھی قدم قدم پر مات دیتا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اب اس کے ذہن میں ایک شبہ بار بار سر ابھار رہا تھا۔ ایک سوال اس کے دماغ میں بار بار ابھر رہا تھا۔

"کیا فرہاد علی بھی ٹیلی پیتھی جانتا ہے؟"

میں نے اس کی سوچ کے ذریعے کئی بار اس سوال کو اس کے ذہن میں کلبلاتے ہوئے دیکھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میں نے بیل منڈو جیسے ناقابلِ شکست انسان کو کس طرح شکست دی اور ایسے وقت شکست دی ہے جبکہ اس کی حفاظت کرنے والا تھوڑی دیر کے لیے سو گیا تھا۔ کیا فرہاد علی کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ وہ نادیدہ حفاظت کرنے والا کس وقت جاگتا ہے کس وقت اپنے آلہ کاروں کو شطرنج کے مہروں کی طرح چلاتا ہے اور کس وقت تھوڑی دیر سستانے کے لیے اپنی خواب گاہ میں جا کر سو جاتا ہے کیا فرہاد علی اس کے نائم ٹیبل سے واقف ہے؟

ایسی بہت سی باتیں اس کے دماغ میں چکرا رہی تھیں اور وہ بڑی سنجیدگی سے اسی نکتے پر غور کر رہا تھا۔

"کیا فرہاد علی بھی ٹیلی پیتھی جانتا ہے؟"

ماسٹر یوشے کے دماغ میں جیسے جیسے یہ سوال مستحکم ہو رہا تھا ویسے ... ویسے مجھے پسینہ آ رہا تھا۔ میں نے اب تک ہر ممکن کوشش کی تھی کہ ماسٹر یوشے کو میری خیال خوانی کی صلاحیتوں کا علم نہ ہو۔ اب بھی اسے یقین نہیں تھا۔ صرف وہ شبہ میں مبتلا تھا مگر اس کے شبہ نے ہی میری آنکھوں سے نیند اڑا دی تھی۔ ساری تھکن کافور ہو گئی تھی اور میں پھر ایک بار مستعد ہو کر ڈرائیو کرتا ہوا اس کے دماغ میں مسلسل جھانکتا جا رہا تھا۔

ماسٹر یوشے اب تک میرے متعلق جتنی بھی معلومات حاصل کر چکا تھا اور مجھے جس انداز میں اپنے دشمنوں سے نمٹتے دیکھ چکا تھا۔ ان سب کو پھر ایک بار اپنے ذہن میں تازہ کر رہا تھا اور یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کب اور کس مقام پر میں نے خیال خوانی کی صلاحیتیں استعمال کی ہیں (اگر میں خیال خوانی جانتا ہوں)

میری کوئی کمزوری اس کے ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔ ہانس بے کے کالج میں

جہاں اس کے آدمیوں نے مجھے گھیرنے کی کوشش کی تھی اور مجھ سے مار کھا گئے تھے وہاں بھی میں نے اپنی جسمانی طاقت کو استعمال کیا تھا۔ ٹیلی پیتھی کے ذریعے اس کے آدمیوں کو شکست نہیں دی تھی۔ بیل منڈو کے ساتھ بھی میں نے یہی کیا تھا۔ صرف چند باتیں ایسی تھیں جو اسے سوچنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ وہ یہ کہ کس طرح میں وقت پر میں ہاتھ آتے آتے نکل جاتا ہوں یا تو کوئی غیبی طاقت مجھے خطرے سے آگاہ کر دیتی ہے یا پھر میں بلا کا ذہین ہوں بے حد چالاک ہوں، شاطر اور مکار ہوں کہ عین وقت پر اسے دھوکہ دے کر نکل جاتا ہوں۔

وہ بہت دیر تک میرے متعلق غور کرتا رہا۔ ٹیلی پیتھی کا علم عام نہیں ہے اسے سیکھنے کے لیے اتنے دشوار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے کہ اگر ہر انسان سیکھنا چاہے تو شاید ایک لاکھ آدمیوں میں ایک آدمی اسے کسی حد تک سیکھ سکے گا۔ ماسٹر یوشے یہی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ فرہاد علی بھی ایک لاکھ میں سے ایک آدمی ہے؟

اس کا دل تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ پاکستان جیسے ملک میں جہاں ضروری تعلیم عام نہیں ہے وہاں فرہاد علی ایسا کوئی علم کیسے سیکھ سکتا ہے جو ابھی تجرباتی مراحل سے گزر رہا ہے۔ اس علم کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ ساری دنیا میں صرف دو چار خوش نصیب ہی اس کے جاننے والے ہیں اور ماسٹر یوشے خود کو سب سے بڑا خوش نصیب سمجھتا تھا۔ اسے اس بات پر فخر تھا کہ اس علم کی انتہاء گہرائیوں تک صرف وہی پہنچ سکا ہے۔ کوئی دوسرا اس کا مدِمقابل نہیں ہے۔ یوں بھی ہر پہلوان اکھاڑے میں پہنچ کر صرف اپنے آپ کو ہی شہ زور سمجھتا ہے اور دوسروں کی طاقت کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتا جب تک کہ منہ کی نہیں کھاتا۔ ماسٹر یوشے بھی خود کو اتنا بڑا استاد سمجھ رہا تھا کہ اپنے سامنے مجھے ایک حقیر کیڑے سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ حقیر اس معنی میں کہ میں اس کے خیال میں ٹیلی پیتھی کی ابجد تک بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ورنہ دوسرے پہلوؤں سے وہ مجھے حقیر سمجھنے کی بجائے میری ذہانت یا میری مکاریوں کا اعتراف کرتا جا رہا تھا۔

وہ میرے متعلق اس قدر الجھتا رہا کہ کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ میں اس کی سوچ پڑھتے پڑھتے بیزار ہو گیا۔ آخر میں نے اس پر لعنت بھیج دی اور اس سے تھوڑی دیر کے لیے رابطہ ختم کر دیا۔ کیونکہ میں پنڈی پوائنٹ پہنچ چکا تھا۔ وہاں گاڑی روکنے کے بعد میں دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ قریب کھڑی ہوئی ایک گاڑی سے سید صاحب بھی نکل آئے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ اور فوراً ہی میرے پاس آ کر مجھے گلے سے لگا لیا اور خوشی سے کہنے لگے۔

"فرہاد علی مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں صدیوں کے بعد ایک بچھڑے ہوئے عزیز سے مل رہا ہوں۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ میرے دل میں تمہارے لیے بعض اوقات کتنی شدید محبت پیدا ہو جاتی ہے۔"

میں نے جواب دیا:

"آپ بیان نہ کریں تب بھی میں آپ کی محبت کو سمجھ لوں گا کیونکہ دنیا والے دل میں بیٹھ کر محبت کرتے ہیں اور میں دماغ میں گھس کر محبت کرتا ہوں۔"

میری اس بات پر وہ قہقہہ لگانے لگے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہم دونوں اپنی اپنی کار میں بیٹھ کر لاہور جانے والی سڑک پر چلیں گے۔ پھر آگے کہیں جا کر بیل منڈو کی کار کو چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد میں ان کی کار میں بیٹھ کر واپس مری کی طرف جاؤں گا۔ یہ طے کر کے ہم دونوں اپنی اپنی کار میں آ کر بیٹھ گئے اور ڈرائیو کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔

راستے میں سید احمد کی سوچ کو پڑھتا رہا۔ پتہ چلا کہ وہ مجھ سے باتیں کرنے کے لیے بے چین ہیں۔ میں نے انہیں مخاطب کیا تو وہ شکایت بھرے لہجے میں کہنے لگے۔

"تم اس طرح خاموش چل رہے ہو جیسے ہمارا درمیانی فاصلہ تمہارے لیے کوئی اہمیت رکھتا ہے۔"

"دماغی قوتوں کے سامنے تمام فاصلے مٹ جاتے ہیں۔"

"تو فاصلہ مٹا دو۔ باتیں کرو۔ کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو؟"

"بہت سی سوچیں پیچھا کرتی رہتی ہیں۔ ابھی میں ماسٹر یوشے کی خبر لینا چاہتا ہوں۔ آپ سے تھوڑی دیر بعد گفتگو کروں گا۔"

یہ کہہ کر میں پھر ماسٹر یوشے کی طرف پلٹ گیا۔ اس کا وہی حال تھا کبھی وہ ردما کے ذہن میں جھانک کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ بیل منڈو کا سراغ ملا یا نہیں کبھی وہ میرے متعلق سوچتے سوچتے الجھ جاتا تھا۔ جب میں نے اسے بدستور جھنجلائی ہوئی حالت میں دیکھا تو اس کی طرف سے مطمئن ہو کر پھر سید احمد کی طرف واپس آ گیا اور انہیں مخاطب کیا۔

"سید صاحب! ماسٹر یوشے خیریت سے نہیں ہے۔"

انہوں نے مسکرا کر پوچھا:

"کیا بات ہے۔ بہت زیادہ بیمار ہو گیا ہے؟"

میں نے ہنستے ہوئے کہا:

"ہاں! میرے عشق میں بیمار ہو گیا ہے۔ مجھ سے ملنے کے لیے وہ اس طرح تڑپ رہا ہے کہ آپ کی محبوبہ بھی آپ کے لیے اتنا نہیں تڑپتی ہوگی۔"

وہ جھینپ کر ہنسنے لگے پھر انہوں نے کہا:

"ہاں بھئی چوٹ کر لو۔ اب تو میں کسی کی زلفوں کا اسیر ہو گیا ہوں سنا ہے کہ محبت کی بیماری بھی تماشہ بنا دیتی ہے اور دنیا والے اس دیوانے پر ہنسنے لگتے ہیں۔ اس ہنسی کی ابتداء تم سے ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا "بخدا میں آپ کا مذاق نہیں اڑا رہا ہوں۔ مجھے تو خوشی ہے کہ کسی لڑکی کے دل میں آپ کے لیے چاہت پیدا ہو گئی ہے۔ آپ اس کے متعلق بتائیں اگر اعتراض نہ ہو تو ....."

"کیسی بات کرتے ہو فرہاد۔ بھلا تمہیں بتانے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ پھر تم تو اچھے خاصے شیطان ہو۔ نہیں بتاؤں گا تب بھی میرے راز تک

پہنچ جاؤ گے۔ میری محبوبہ تو کیا اس کے سارے خاندان کو کھنگال ڈالو گے۔ ہاں ویسے میں بہت پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ملاقات ہوتے ہی تم سے ثمر کا ذکر کروں گا۔ اس کے ساتھ جو زیادتی ہو رہی ہے اور جن پریشانیوں میں وہ مبتلا ہے ہو سکتا ہے کہ تم اس کی وہ پریشانیاں دور کر دو۔"

"آپ کی محبوبہ میری ہونے والی بھابی ہے۔ میں غیروں کے کام آتا ہوں تو کیا اپنی بھابی کے کام نہیں آؤں گا۔ آپ مجھے بتائیں کہ پریشانیاں کیا ہیں؟"

سعید احمد بتانے لگے۔

"ثمر میری ایک دور کے رشتے کی عزیزہ ہے۔ تقریباً دس برس بعد اچانک ہی اس سے ملاقات ہو گئی ہے۔ میں پہلی ملاقات میں اسے پہچان نہ سکا۔ کیونکہ جب میں نے اسے دیکھا تو وہ ایک بچی تھی اور میں بھی نوجوان نہیں تھا۔ اب عمر بدل گئی ہے۔ اور نگاہیں بھی بدل گئی ہیں۔ اسے دیکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نگاہوں کی دوری کے باوجود دلوں کی قربت سے اسے پہچانتا ہوں۔ اس کی سوتیلی ماں نے مجھے پہچان لیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی سوتیلی ماں نے کہا:

"تم شاید وکیل احمد کے بیٹے ہو، جو لاہور میں رہا کرتے تھے۔"

یہ کہہ کر وہ میرے والد اور والدہ کے متعلق بہت سی باتیں بتانے لگی۔ میں نے تصدیق کرتے ہوئے کہا:

"جی ہاں، آپ درست فرما رہی ہیں۔ میں ان کا ہی بیٹا ہوں اور میرا نام سعید احمد ہے۔"

پھر باتوں ہی باتوں میں مجھے پتہ چلا کہ ثمر کے والد شیخ برکت علی جو ایک کروڑپتی تاجر ہیں پچھلے ایک سال سے پاگل خانے میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ سنتے ہی ثمر میرے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی سوتیلی ماں نے اسے ناگواری سے دیکھا اور کہا۔

"ایک تمہیں ہی اپنے باپ سے محبت نہیں ہے۔ وہ میرے بھی کچھ لگتے ہیں۔ میرا دل بھی دکھتا ہے مگر میں اپنے آنسو کسے دکھاؤں؟ اب ان کا علاج ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوئی تو وہ ذہنی طور سے صحت یاب ہو کر واپس آجائیں گے۔ تمہارے آنسو انہیں واپس نہیں لا سکتے۔ بس چپ کر جاؤ۔"

ان کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر ثمر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے اتنی سی بات سے اندازہ لگا لیا کہ ثمر کے ساتھ اس کی سوتیلی ماں کا سلوک اچھا نہیں ہے۔ پھر چھٹیوں کے دوران میری ثمر سے بے تکلفی رفتہ رفتہ بڑھنے لگی۔ تب ثمر نے مجھے بتایا کہ اس پر کیسی کیسی مصیبتیں نازل ہوتی رہی ہیں۔ جب سے اس کی سوتیلی ماں آئی ہے ہمیشہ اسی کوشش میں رہتی ہے کہ شیخ برکت علی کی ساری جائداد اس کے نام ہو جائے۔ جب برکت علی اسے بیاہ کر لائے تھے تو اس وقت وہ ایک نوجوان بیوہ تھی اور اپنے ساتھ ایک سات برس کا لڑکا لے کر آئی تھی۔ اب وہ لڑکا جوان ہو گیا ہے۔ اور وہ چاہتی ہے کہ کسی طرح ساری جائداد اس کے نام ہو جائے جو قانونی طور سے ناممکن ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ بار بار شیخ برکت علی سے کہتی رہتی ہے کہ ثمر کی شادی ان کے لڑکے سے کر دی جائے لیکن یہ رشتہ نہ تو ثمر کو پسند ہے اور نہ ہی اس کے والد اس رشتے کو پسند کرتے تھے۔ وہ ہر طرف سے ناکام ہو کر خاموش بیٹھ گئیں۔ ثمر نے شبہ ظاہر کیا کہ وہ بظاہر خاموش تھیں۔ مگر اپنی سوتیلی بیٹی کو برباد کرنے کا انہوں نے بہت ہی خطرناک منصوبہ بنایا تھا۔ جب ثمر سترہ برس کی تھی تو چند بدمعاشوں نے اسے اغوا کر لیا تھا اور ایک ویران سے مکان میں لے جا کر قید کر دیا تھا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ کسی نے اس کی عزت کو کھلونا نہیں بنایا۔ چند ہی گھنٹے بعد پولیس کی ایک جماعت نے اس مکان پر چھاپہ مارا تھا اور اسے وہاں سے برآمد کر لیا تھا۔ بدمعاش وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ پھر پتہ نہ چل سکا کہ وہ کون تھے اور کس مقصد کے لیے اسے اغوا کیا گیا تھا۔ ثمر کہتی ہے کہ اس کے پیچھے اس کی سوتیلی ماں کا ہاتھ تھا لیکن اس کا جرم ثابت کرنے کے لیے ثمر کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ایک سال پہلے اچانک ہی شیخ برکت علی کا دماغ چل گیا۔ وہ اچھے بھلے تھے۔ رات کو سونے سے پہلے اپنی عادت کے مطابق ایک گلاس دودھ پیا پھر بستر پر لیٹنے کے لیے گئے تو اچانک ہی بے چینی سے ادھر سے ادھر بستر پر لوٹنے لگے پھر انہیں پکڑ کر وجہ پوچھی گئی تو وہ الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے جو اُن کے قریب جاتا تھا۔ وہ اسے مارنے کے لیے دوڑتے تھے۔ ثمر کی امی نے ملازموں سے کہا کہ وہ انہیں پکڑ کر رسی وغیرہ سے باندھ کر رکھیں۔ پھر ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ دوسرے دن ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق انہیں پاگل خانے بھیج دیا گیا اور اب تک وہ پاگل خانے میں موجود ہیں۔"

میں نے سعید احمد سے پوچھا:

"ان کے پاگل پن کے سلسلے میں ثمر کیا کہتی ہے؟"

"ثمر اس سلسلے میں بھی اپنی سوتیلی ماں پر شبہ کر رہی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ رات کو سونے سے پہلے انہوں نے جو دودھ پیا تھا اس میں کوئی ایسی ملاوٹ کی گئی ہے جس نے ان کے دماغ کو الٹ دیا ہے۔ وہ دودھ پینے کے بعد ہی پاگل ہو گئے تھے۔"

میں نے پوچھا:

"ثمر کی سوتیلی ماں اپنے شوہر سے کیوں دشمنی کرے گی؟"

سعید احمد نے جواب دیا:

"وہی جائداد کا جھگڑا ہو سکتا ہے۔ دولت حاصل کرنے کے لیے مرد ہو یا عورت سب ہی پستی میں گر جاتے ہیں۔ وہ ثمر کے والد کو پاگل بنا کر شاید کسی اور ہتھکنڈے سے ان کی ساری دولت ہتھیا لینا چاہتی ہے میرا اندازہ یہ ہے کہ وہ کسی وقت بھی ثمر کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ اگر ثمر نہیں رہے گی یعنی مر جائے گی۔ دوسری طرف اس کا باپ پاگل خانے میں رہے گا تو تم سوچو وہ ساری جائداد کس کے حصے میں آئے گی؟"

میں نے تائید میں سر ہلا کر کہا:

"ہاں اس طرح بات کچھ سمجھ میں آتی ہے۔ بہرحال ثمر کی سوتیلی ماں کیا چاہتی ہے۔ یہ میں معلوم کروں گا۔ آپ اطمینان رکھیں جب تک میں آپ کے ساتھ ہوں کوئی مجرم اپنا چہرہ نہیں چھپا سکے گا۔"

سعید احمد نے احسان مندی سے کہا:

"میں جانتا تھا فرہاد تم اس سلسلے میں ضرور ثمر کے کام آؤ گے۔ میں یہ خوشخبری ثمر کو سناؤں گا۔"

میں نے ان سے پوچھا:

"کیا آپ ثمر سے میرا ذکر کر چکے ہیں؟"

انہوں نے مسکرا کر کہا:

"میں تمہارا ذکر کہاں نہیں کرتا ہوں۔ تنہائی میں ہوتا ہوں تو تمہارا ذکر کرتا رہتا ہوں۔ محفل میں بیٹھتا ہوں تو تمہارا ذکر ضرور کرتا ہوں۔ تمہاری تعریف کرتے وقت مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا اپنا مقام بلند ہو رہا ہے۔ میں نے ثمر کے سامنے تمہاری بڑی تعریفیں کی ہیں۔"

میں نے کسی قدر پریشان ہو کر کہا:

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ثمر کے سامنے میری ٹیلی پیتھی کی صلاحیتوں کا ذکر بھی کیا ہے؟"

وہ ذرا گڑبڑا کر بولے:

"آں، نہیں تو۔ میں نے ٹیلی پیتھی کے سلسلے میں ثمر کو کچھ نہیں بتایا۔"

"کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں فرہاد میں تم سے جھوٹ کیسے بول سکتا ہوں کیا میں نہیں جانتا کہ اگر میں جھوٹ بولوں گا تو تم سوچ کے ذریعے کسی وقت بھی سچ تک پہنچ جاؤ گے۔ یقین کرو میں تمہاری تعریف اِس انداز میں کرتا ہوں جیسے تم ایک سپرمین ہو۔ حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک ہو۔ مگر وہ صلاحیتیں کیا ہیں اس کا ذکر کبھی میں نے کسی کے سامنے نہیں کیا۔ یوں سمجھو کہ میں تمہاری ذہانت اور دلیری کی تعریف کیا کرتا ہوں۔"

باتوں کے دوران بہت زیادہ وقت گزر گیا ہم جہلم پہنچ کر ایک بہت ہی اسٹینڈرڈ کے ہوٹل کے سامنے رک گئے۔ میں نے بیل منڈو نا کار سے باہر آتے وقت کار کی چابی اگنیشن میں چھوڑ دی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے بھی نہیں چڑھائے البتہ سعید احمد نے اپنی کار کو لاک کر دیا تھا پھر ہم دونوں ہلکا سا ناشتہ کرنے کے لیے اس ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ ہوٹل میں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ چار پانچ میزوں کے اطراف کچھ لوگ بیٹھے ہوئے نظر آرہے تھے ہم دونوں ایک میز کے اطراف آکر بیٹھ گئے سعید احمد بیرے کو بلا کر ناشتے کا آرڈر دینے لگے۔

اتنے میں ایک شخص ہوٹل کے دروازے پر نظر آیا۔ وہ معمولی سا آدمی تھا۔ میری توجہ کا مرکز نہیں بن سکتا تھا لیکن تھوڑی دیر پہلے میں نے کار سے اترتے وقت عقب نما آئینے میں اسے دیکھا۔ وہ ہوٹل کے باہر کھڑا ہوا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اور بڑی خاموشی سے اور للچائی ہوئی نظروں سے بیل منڈو کی کار کو دیکھ رہا تھا۔ جب میں کار کو لاک کیے بغیر ہوٹل میں داخل ہونے لگا تو اس کے قریب سے گزرتے وقت میں نے اس کی آنکھوں میں حیرانی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات دیکھے۔ اس وقت میں نے پھر بھی کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اب وہ ہوٹل کے دروازے پر آتے ہی ٹھٹک گیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے مجھ پر نظر ڈالی تھی۔ پھر مجھ سے نظریں ملتے ہی وہ تیزی سے پلٹ کر دور ایک میز کی جانب چلا گیا۔ اس میز کے اطراف دو خوش پوش ادھیڑ عمر کے آدمی بیٹھے ہوئے کھانے کے دوران گفتگو کر رہے تھے۔ وہ اس شخص کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ یا تنی دور سے کوئی بھی ان کی باتیں نہیں سن سکتا تھا لیکن میرے لیے ان کی باتیں سن لینا ناممکن نہیں تھا۔ اس شخص نے آنے والے کو مخاطب کیا:

"کیا بات ہے جعفر کیا کوئی خاص خبر ہے؟"

جعفر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھنے سے پہلے اس نے دور سے میری جانب نظر دوڑائی۔ مگر اب میں اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔ سر جھکائے ان کی سوچ کے ذریعے ان کی ایک ایک حرکت کو اور ایک ایک بات کو سن رہا تھا اور سمجھ رہا تھا جب جعفر نے مجھے اپنی طرف سے غافل پایا تو وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

"کنور صاحب، ہمیں ابھی اور اسی وقت کار مل سکتی ہے۔"

"کیسے؟" کنور نام کے آدمی نے حیرانی سے پوچھا۔

جعفر اسے بتانے لگا اور ہماری طرف اشارہ کرنے لگا کہ اس میز پر جو دو آدمی بیٹھے ہیں وہ دونوں ابھی اپنی کار میں آئے ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص نے کار کو لاک نہیں کیا ہے اور کار کی چابی اگنیشن میں چھوڑ دی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے کنور سے پوچھا۔

"کیا یہ ہمارے لیے بہترین موقع نہیں ہے؟ ہم کسی ٹیکسی میں جانے کی بجائے اس کار کو لے کر یہاں سے فرار ہو سکتے ہیں۔ وہ دونوں ابھی یہاں کچھ دیر بیٹھ کر ناشتہ کریں گے اور چائے پئیں گے۔"

کنور نے اپنے دوسرے ساتھی کو دیکھ کر مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"کیوں اسد تمہارا کیا خیال ہے؟"

اسد نے جواب دینے سے پہلے ہماری جانب دیکھا اور کہا۔

"خیال نیک ہے۔ وہ دونوں ابھی ہوٹل میں داخل ہوئے ہیں ابھی بیرے نے ان کے لیے ناشتہ بھی نہیں لگایا ہے۔ وہ یہاں کافی دیر بیٹھیں گے۔ ہمیں اسی وقت یہاں سے اٹھ جانا چاہیے۔"

کنور نے اسی وقت بیرے کو بلایا تاکہ وہ بل لے آئے اور وہ لوگ بل ادا کر کے فوراً ہی وہاں سے جا سکیں۔ میں نے سعید احمد کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا:

"سعید صاحب کار چھوٹنے کا مسئلہ خود بخود حل ہو رہا ہے۔"

انہوں نے پوچھا:

"وہ کیسے؟"

میں سنتے ہوئے انہیں ساری باتیں بتانے لگا اور انہیں تاکید کردی کہ وہ اس میز کی جانب پلٹ کر نہ دیکھیں ورنہ کام بگڑ جائے گا سعید احمد نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا:

"یہ تو ٹھیک ہے فرہاد۔ ہم کار کو کہیں نہ کہیں چھوڑنا چاہتے تھے اب اسے چرانے والے پیدا ہو گئے ہیں لیکن ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ یہ کس مقصد کے لیے کسی دوسرے کی کار یہاں سے لے جانا چاہتے ہیں؟"

میں نے سر ہلا کر ان سے کہا:

"اچھی بات ہے۔ آپ تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہیں میں ان کے متعلق معلومات حاصل کرتا ہوں۔"

اتنے میں بیرا ہمارے لیے ناشتہ لے کر آ گیا۔ میں نے ناشتے کی پلیٹ پر جھکتے ہوئے کنور نامی آدمی سے سوچ کے ذریعے رابطہ قائم کیا وہ شخص بڑی سنجیدگی سے اس بات پر غور کر رہا تھا کہ یہاں سے اس کار کو لے جانا کہاں تک مناسب ہے۔ میں نے اس کی سوچ میں کہا:

"ہاں مجھے یہ قدم اٹھانے سے پہلے اپنی پلاننگ پر اچھی طرح شروع سے آخر تک غور کر لینا چاہیے۔ ورنہ جلد بازی سے کام بگڑ جائے گا۔"

کنور کی سوچ نے کہا:

"کام اسی وقت بگڑے گا جب ہم یہاں سے کار لے جاتے وقت کار والے کی نظروں میں آ جائیں گے۔ اس کار والے کے علاوہ کسی دوسرے کو اس بات کا علم نہیں ہوگا کہ ہم کس کی کار لے جا رہے ہیں۔ دوسرے لوگ یہی سمجھیں گے کہ ہم اپنی کار میں بیٹھ کر جا رہے ہیں۔ نہیں زیادہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ قسمت سے یہ کار ہاتھ آ گئی ہے تو اسے ضرور حاصل کرنا چاہیے پہلے تو ہم نے سوچا تھا کہ یہاں سے ایک ٹیکسی حاصل کریں گے اور اس مل اونر امجد علی کا پیچھا کریں گے۔ وہ ٹھیک دس بجے بینک سے پچاس ہزار روپے نکالنے کے بعد اپنے ملازمین کو تنخواہ دینے مل کی طرف جائے گا۔ پھر ان راستے میں ہم اس کی کار کے سامنے رکاوٹ بن جائیں گے پھر ٹیکسی ڈرائیور کو ختم کر دیں گے۔ اس کے بعد ٹیکسی میں بیٹھ کر آگے نکل جائیں گے۔ آگے ہماری اپنی کار موجود ہوگی۔ وہاں ہم ٹیکسی کو چھوڑ دیں گے اور اپنی کار میں بیٹھ کر واپس پنڈی چلے جائیں گے۔ مگر اب ٹیکسی کا خیال چھوڑ دینا چاہیے اس طرح ایک بیچارے ٹیکسی ڈرائیور کی جان بچ جائے گی۔ صرف امجد علی ہمارے ہاتھوں ہلاک ہوگا۔ ہاں یہی مناسب ہے ہمیں فوراً ہی یہاں سے اس کار کو لے کر نکل جانا چاہیے۔"

اس کی سوچ پڑھنے کے بعد میں نے اپنی ریسٹ واچ کو دیکھا۔ دس بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ انہیں ٹھیک وقت پر ایک کار مفت حاصل ہو رہی تھی اور وہ اسے اپنی خوش نصیبی سمجھ رہے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق قسمت ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ میں سعید احمد کو وہ تمام باتیں بتانے لگا۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ہماری کار لے جا کر وہ صرف ڈاکہ نہیں ڈالیں گے بلکہ ایک بے گناہ انسان کو قتل بھی کریں گے تو سعید احمد نے کہا

"فرہاد! یہ مناسب نہیں ہے۔ انہیں امجد علی کا پیچھا کرنے سے باز رکھنا چاہیے۔ اور کسی طرح ان مجرموں کو قانون کے حوالے کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا "ابھی تو انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے صرف منصوبہ بنایا ہے۔ جب تک یہ جرم کے لیے کوئی قدم نہ اٹھائیں اور ہم انہیں رنگے ہاتھوں نہ پکڑیں اس وقت تک یہ قانون کی گرفت میں نہیں آ سکتے۔"

سعید احمد نے بحث شروع کر دی۔

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ انہیں ڈاکہ ڈالنے اور امجد علی کو قتل کرنے کا موقع دینا چاہیے پھر ہم انہیں گرفتار کر سکیں گے۔"

میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا:

"میں یہ نہیں چاہتا۔ آپ اطمینان رکھیں۔ میں انہیں امجد علی تک پہنچنے نہیں دوں گا۔ مگر آپ بھی انہیں قانونی گرفت میں نہیں لا سکیں گے۔ ویسے انہیں ان کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔"

انہوں نے پوچھا:

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے جواب دیا:

"آپ اطمینان سے بیٹھ کر ناشتہ کریں اور انہیں ہماری غفلت سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیں میں ان سے نمٹ لوں گا۔"

انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا:

"ہاں بھئی تم سے کوئی بات بعید نہیں ہے مجھے یقین ہے کہ تم انہیں سزا دو گے مگر ذرا محتاط رہنا فرہاد ایک انسانی زندگی کا سوال ہے ایسا نہ ہو کہ تمہاری ذرا سی غفلت سے فائدہ اٹھا کر وہ امجد علی کو قتل کر دیں اور [illegible] گرفت سے فرار ہو جائیں۔"

میں نے انہیں اطمینان دلایا۔ پھر ہم خاموشی سے سر جھکا کر ناشتہ کرنے لگے۔ اتنی دیر میں وہ تینوں اپنی میز سے اٹھ کر ہوٹل سے باہر چلے گئے۔ اور میں کنور کی سوچ کے ذریعے دماغ کی اسکرین پر دیکھتا جا رہا تھا کہ وہ باہر جا کر کیا کر رہے ہیں۔ انہوں نے جعفر کو بدستور ہوٹل کے دروازے پر کھڑے رہنے کے لیے کہا تھا تاکہ وہ ہم پر نظر رکھے۔ جب کنور بیل منڈو کی کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور اس کے پاس والی سیٹ پر اس کا ساتھی اسد آ گیا تو پھر جعفر بھی دروازے سے پلٹ کر ان کے پاس آ گیا اور کار کا دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی کنور نے کار اسٹارٹ کی اور تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا دور نکلتا چلا گیا۔ جعفر پچھلی سیٹ پر بیٹھا بار بار پلٹ کر ہوٹل کی جانب دیکھ رہا تھا۔ جب وہ ہوٹل نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے اطمینان کا سانس لے کر کہا:

"کنور صاحب! سب خیریت ہے۔ ان دونوں کو اس بات کا علم نہیں ہو سکا ہے کہ ان میں سے ایک کی کار غائب ہو گئی ہے۔"

وہ تینوں خوش فہمی میں مبتلا ہو کر ایک بینک کے سامنے پہنچے۔ جعفر

اسے اتر کر بینک کے اندر گیا۔ وہاں اس نے سیٹھ امجد علی کو دیکھا جو نوٹوں کی گڈیاں گن رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ فوراً واپس آ گیا پھر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے انہیں بتایا کہ امجد علی منیجر کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں اور روپے گن رہے ہیں۔ اس طرح انہیں اندازہ ہو گیا کہ اب وہ تھوڑی دیر بعد وہاں سے چلنے ہی والا ہوگا۔

یہ اندازہ کرنے کے بعد کنور نے کار اسٹارٹ کی پھر اسے ڈرائیو کرتا ہوا ایک ویران علاقے پر جانے لگا۔ میں اس علاقے کے متعلق زیادہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کس راستے پر جا رہے ہیں۔ بہرحال کچھ آگے جانے کے بعد کنور نے کار سڑک کے کنارے کھڑی کر دی اور وہاں بیٹھے ہوئے امجد علی کی کار کا انتظار کرنے لگے۔ میں سعید احمد کو تھوڑی دیر بعد رپورٹ سناتا جا رہا تھا تھوڑی دیر بعد انہیں امجد علی کی کار آتی ہوئی نظر آئی۔ پھر وہ کار تیزی سے گزرتی ہوئی ان کے قریب سے نکل گئی۔ کنور نے بھی کار اسٹارٹ کی اور آگے جانے والی کار کا پیچھا کرنے لگا۔ کچھ آگے جا کر شاید امجد علی کو کسی خطرے کا احساس ہوا تھا یا پتہ نہیں کیا بات تھی کہ انہوں نے کار کی رفتار تیز کر دی تھی۔ کنور نے بھی رفتار بڑھا دی۔ میں اس کی سوچ کے ذریعے سمجھ رہا تھا کہ جس راستے سے وہ گزر رہا ہے اس کے اطراف بڑے بڑے درخت ہیں۔ میں نے اچانک ہی اس کی سوچ میں چیخ کر کہا:

"اسٹیئرنگ دائیں طرف موڑ دو...."

ایک ذہنی جھٹکا پہنچتے ہی کنور کا ہاتھ بہک گیا۔ کار دائیں طرف کی اور سڑک سے نیچے جاتے ہوئے ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ میں نے چیخنے چلانے کی آوازیں سنیں۔ اس کے بعد کنور کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ اس وقت میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ بیہوش ہو گیا ہے یا ہلاک ہو گیا ہے۔ بہرحال بیل منڈو کی کار صحیح آدمیوں کے ہاتھوں سے صحیح جگہ پہنچ گئی تھی۔

ناشتہ کرنے کے بعد میں سعید احمد کے ساتھ ہوٹل سے باہر آیا اور ان کی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"آپ مجھے تھوڑی دیر پچھلی سیٹ پر سونے کا موقع دیں میرا نیند سے برا حال ہے۔ اتنا طویل راستہ آپ خاموش رہ کر طے کریں گے اور سوتے رہیں گے۔ میں بہت تھک گیا ہوں ورنہ آپ کو تنہا نہ چھوڑتا۔"

سعید احمد نے ڈرائیونگ سیٹ کو سنبھالتے ہوئے کہا:

"مجھے تمہاری تھکن کا احساس ہے۔ پیٹ بھرنے کے بعد نیند اور غنودگی غالب آنے لگتی ہے۔ ٹھیک ہے تم پچھلی سیٹ پر آرام کرو میں مری پہنچ کر تمہیں نیند سے بیدار کروں گا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے کار اسٹارٹ کی۔ پھر سے پنڈی کے راستے پر موڑ کر آگے بڑھنے لگے۔ میں نے ایک سگریٹ سلگا کر آرام سے لیٹنے کے بعد فوراً سونے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ ماسٹر یوشنے ایک نئے انداز سے میرے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ یہ شبہ کر رہا تھا کہ کہیں میں بھی ٹیلی پیتھی کا علم تو نہیں جانتا ہوں؛ وہ اپنے شبہ پر کس حد تک قائم ہے، میں یہ معلوم کرنے کے لیے اس کے ذہن میں جھانکنے لگا۔

اس وقت ماسٹر یوشنے دوسرے تین ماسٹروں کے ساتھ کسی کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور ان سے میرے ہی متعلق گفتگو کر رہا تھا۔ دو ماسٹروں کو تو میں پہلے ہی سے جانتا تھا۔ ایک ماسٹر یوشنے دوسرا ماسٹر دانیال، جو انجلا کا باپ تھا اور آگ کے شعلوں میں نہانے کا حیرت انگیز تماشا دکھاتا تھا۔ وہ اپنے ماسٹروں کے گروپ میں آگ کا دیوتا کہلاتا تھا۔ اس لیے کہ آگ اس پر اثر نہیں کرتی تھی۔ ان کی گفتگو کے دوران باقی دو ماسٹروں سے بھی غائبانہ تعارف ہو گیا کیونکہ وہ گفتگو کرتے وقت ایک دوسرے کو نام لے کر مخاطب کر رہے تھے۔ ان میں سے تیسرے ماسٹر کا نام سائمن تھا۔ اس وقت ماسٹر سائمن کہہ رہا تھا:

"ماسٹر یوشنے تمہاری رپورٹ سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ فرہاد علی بہت خطرناک انسان ہے۔ تم جیسا ٹیلی پیتھی جاننے والا بھی اب تک اسے اپنے قابو میں نہیں کر سکا۔ مجھے تمہارا شبہ درست نظر آتا ہے کہ فرہاد علی ٹیلی پیتھی سے واقف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم وہاں اپنے آلہ کاروں کو حکم دیتے ہو اور وہ تمہارے آلہ کاروں کے ذریعے اس حکم کو سن لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تمہاری سوچ کو پڑھ لیتا ہے اور تمہیں اتنا موقع نہیں دے رہا ہے کہ تم کسی ذریعے سے اس کی سوچ تک پہنچ سکو۔ ہمیں کسی نہ کسی طرح تمہارے اس شبے کی تصدیق کرنی چاہیے۔"

ماسٹر یوشنے نے کہا

"مگر ہم تصدیق کس طرح کریں گے۔ اگر وہ ٹیلی پیتھی جانتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس وقت بھی میرے ذریعے ہم سب کی گفتگو سن رہا ہے اور ہماری منصوبہ بندیوں سے واقف ہوتا جا رہا ہے۔ اس شیطان تک پہنچنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اسے ہمارے کسی بھی پروگرام کا علم نہ ہو۔"

ماسٹر سائمن نے اس کی تائید کی:

"ہاں اس کے متعلق گفتگو کرتے وقت میرے ذہن میں یہ بات نہیں رہی تھی کہ اگر وہ ٹیلی پیتھی جانتا ہے تو ہماری گفتگو سن رہا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری سوچ کے ذریعے وہ ماسٹر دانیال کی اور میری سوچ تک پہنچ چکا ہے کیونکہ تمہارے ساتھ ہم دونوں اب تک گفتگو کرتے رہے ہیں۔ اب یہی ایک راستہ رہ گیا ہے کہ چوتھا ماسٹر ہماری اس گفتگو میں بالکل حصہ نہ لے جس طرح فرہاد گونگا بنا ہوا ہے اسی طرح چوتھا ماسٹر بھی گونگا بنا رہے اور اپنے آپ کو صرف فرہاد سے نہیں، ہم سے بھی چھپا سکے اور ایک گمنام انسان کی طرح فرہاد تک پہنچنے کی کوشش کرے۔"

ماسٹر سائمن کی رائے سے سب ہی نے اتفاق کیا۔ اس کی بات سنتے ہی سب کی نگاہیں چوتھے ماسٹر کی طرف اٹھ گئیں۔ چوتھا ماسٹر اپنی کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کی سوچ کے ذریعے اس کی نگاہوں تک پہنچ سکتا تھا لیکن اس نے کالے شیشوں والی عینک پہن رکھی تھی۔ اس کا آدھا

چہرہ داڑھی اور مونچھوں سے چھپا ہوا تھا اور ساتھ ان کے مشورے کے مطابق یکدم سے گونگا بن گیا تھا۔ میں اس چوتھے ماسٹر تک نہیں پہنچ سکتا تھا ماسٹر موزنیال نے خوش ہوکر کہا:

"ماسٹر سائمن تم نے بروقت ایک بہت ہی عمدہ مشورہ دیا ہے۔ اب ہمیں اس طرح پروگرام بنانا چاہیئے کہ فرہاد خیال خوانی کے ذریعے بھی ہمارے کسی پروگرام کو نہ سمجھ سکے۔ ایسی صورت میں میں ماسٹر یوشے سے یہ پوچھوں گا۔ کیا وہ کل کی فلائیٹ سے فرہاد کے ملک میں جا رہے ہیں یا اپنا پروگرام منسوخ کر رہے ہیں کیونکہ اس پروگرام کا علم فرہاد کو ہو چکا ہوگا۔"

ماسٹر یوشے نے مستحکم لہجے میں کہا۔

"اگر اسے پروگرام کا علم ہو چکا ہے تو ہونے دو میں ضرور جاؤں گا۔ اگر وہ ٹیلی پیتھی جانتا ہے تو میں دیکھوں گا کہ وہ اس علم کے سمندر میں کتنا ڈوبا ہوا ہے میرا دعویٰ ہے کہ وہ خیال خوانی کے ذریعے مجھ سے نہیں ٹکرائے گا۔ اگر ٹکرانا ہوتا تو وہ اب تک کھل کر سامنے آ جاتا۔ وہ مجھ سے چھپتا پھر رہا ہے اس سے اس کی خیال خوانی کی کمزوری ظاہر ہو رہی ہے۔ آپ سب مطمئن رہیں۔ وہاں پہنچتے ہی جب بھی اس کا پتہ چلا تو میں اسے اپنے علم کی مٹھی میں بری طرح جکڑ لوں گا۔ پھر وہ تلملاتا رہ جائے گا لیکن میری شیطانی صلاحیتوں سے نجات نہیں حاصل کر سکے گا۔"

ماسٹر سائمن نے ہاتھ اٹھا کر کہا:

"اچھی بات ہے آپ جو کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے طور پر کریں ہم اس سلسلے میں مزید بحث نہیں کریں گے۔ ہمارے چوتھے ماسٹر کو اپنے طور پر جو کچھ کرنا ہوگا وہ کرے گا۔ اور وہ جو کرے گا اس کا ہم تینوں ماسٹروں کو بھی علم نہیں ہوگا کیونکہ ہم تینوں فرہاد کی خیال خوانی کی زد میں آ چکے ہیں۔ اسی لیے ہم سب چوتھے ماسٹر کے پروگراموں سے بے خبر رہا کریں گے۔ بس آج کی میٹنگ برخاست ہوتی ہے۔"

ان کی باتیں سن کر میری نیند بھی اڑ گئی اور ہوش بھی اڑ گئے۔ اب وہ ایسی پلاننگ کر چکے تھے کہ میں سوچ کے ذریعے بھی ان کی منصوبہ بندیوں کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ صرف ماسٹر یوشے کے متعلق اتنا علم تھا کہ وہ کل کی فلائیٹ سے کسی وقت بھی یہاں پہنچ رہا ہے۔ وہ چوتھا نادیدہ ماسٹر کیا سوچ رہا ہے اور کیا کرنا چاہ رہا ہے، یہ میں نہیں سمجھ سکتا تھا۔ مجھے مکمل طور سے اندھیرے میں رکھنے کے لیے انہوں نے بہت اچھی تدبیر سوچ لی تھی۔

میں بہت دیر تک اپنے طور پر یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ چوتھا ماسٹر میرے خلاف کس قسم کے اقدامات کرے گا۔ وہ کون ہے؟ کیسی صلاحیتوں کا مالک ہے کہ وہ چوتھا ماسٹر بنا ہوا ہے اس نے اپنی شخصیت کو بالکل ہی چھپا لیا تھا اور کسی وقت بھی اندھیرے کے تیر کی طرح کہیں سے بھی سنسناتا ہوا آ سکتا تھا۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ ماسٹر یوشے نے یہاں پہنچنے کے لیے دو سیٹیں ریزرو کرائی تھیں۔ وہ دوسری سیٹ کس کے لیے ہے؟ کیا اسی چوتھے ماسٹر کے لیے؟ یہ بات میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا مگر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ دوسری سیٹ چوتھے ماسٹر ہی کے لیے ہو۔ بہرحال مجھے کل تک ایک خطرناک شیطان کا انتظار کرنا تھا۔ دوسرا خطرناک شیطان جو ماسٹر یوشے سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا تھا، وہ چوتھا ماسٹر تھا۔ مجھے اس کا بھی انتظار کرنا تھا اس طرح کرنا تھا جس طرح یہ انسان موت کا انتظار کرتا ہے۔

کار تیز رفتاری سے بھاگی جا رہی تھی۔ سعید احمد کی نظریں ونڈ اسکرین پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں سو رہا ہوں مگر میں جاگ رہا تھا ایسے وقت مرزا غالب کا ایک شعر یاد آ گیا ہے

موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟

واقعی موت کے لیے ایک دن مقرر ہوتا ہے پھر اس فکر میں جاگتے رہنے سے فائدہ کیا ہے؟ میں نے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک کر سونے کا ارادہ کر لیا اور آنکھیں بند کر کے اپنے دماغ کو ہدایت دینے لگا کہ اس وقت تک میں گہری نیند سوتا رہوں جب تک کوئی مجھے آواز دے کر نہ اٹھائے۔ یہ ہدایت دینے کے بعد میں آہستہ آہستہ نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔

آہ نیند بھی کیا چیز ہے۔ سکون سے گہری نیند آئے تو آدمی [illegible] ہو جاتی ہے۔ ساری دنیا کی فکر سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ نیند کے وقفے تک کوئی ہمارا دشمن نہیں ہوتا۔ اتنی سی دیر کے لیے ساری دنیا دوست بن جاتی ہے۔ ہمیں اطمینان سے سونے کا موقع دیتی ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنے ہی دوست نیند کے دشمن بن جاتے ہیں۔ میرے دوست سعید احمد نے مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو کچھ دیر تک کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں کس دنیا میں رہتا ہوں پھر ذہن سے دھند صاف ہونے لگی۔ نیند کا خمار اتر گیا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ میں اسی طرح کار کی پچھلی سیٹ پر لیٹا ہوا ہوں۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سعید احمد نے کہا:

"تم تو گھوڑے بیچ کر سونے کا محاورہ ثابت کر رہے ہو۔ یہاں مری پہنچ کر میں نے تمہیں نیند سے بیدار کرنا چاہا مگر نیند کی حالت میں دیکھ کر مجھے تم پر بڑا پیار آیا۔ میں نے سوچا پتہ نہیں کتنی راتوں سے تم جاگتے پھر رہے ہو کبھی مجرموں کے آگے کبھی ان کے پیچھے۔ پتہ نہیں کبھی تمہیں اتنے اطمینان اور سکون سے سونے کا موقع بھی ملا ہے یا نہیں۔ میں نے سوچا جس حالت میں تم پڑے ہوئے ہو اگرچہ یہ آرام دہ نہیں ہے پھر بھی تم سکون سے ہو۔ تمہاری نیند میں مداخلت نہیں کرنا چاہیئے۔ اسی لیے میں کار کو لاک کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا کئی بار میں یہاں آ کر کار کی کھڑکی سے جھانک کر تمہیں دیکھتا رہا کہ شاید تم بیدار ہو گئے ہو مگر تم نے تو جیسے نہ اٹھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ یہ دیکھو شام کے چار بج رہے ہیں۔ مجبور ہو کر مجھے اٹھانا پڑا۔"

میں نے انگڑائی لے کر بدن کو توڑتے مروڑتے ہوئے کہا:

"یہ آپ نے اچھا کیا کہ مجھے اتنی دیر تک سونے کا موقع دیا۔ یہاں کافی سردی ہے اگر مجھے غسل کرنے کے لیے گرم پانی مل جائے تو رہی سہی تھکن بھی دور ہو جائے گی۔"

"آؤ کمرے میں چلو تمہارے لیے ہر چیز کا انتظام ہے غسل بھی کرو

گے، گرما گرم کھانا بھی کھاؤ گے اور کافی بھی پیو گے۔ تمہاری ساری تھکن دور ہو جائے گی۔ کم آن۔"

میں ان کے ساتھ کار سے اتر کر باہر آ گیا۔ ان کی کار ایک چھوٹے سے کاٹج کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ سعید احمد نے بتایا کہ یہ کاٹج ثمر کے والد برکت علی صاحب کی ملکیت ہے۔ میں ان کے ساتھ کاٹج کے اندر گیا تو سب سے پہلے ایک ادھیڑ عمر کی عورت سے سامنا ہوا۔ سعید احمد نے اس سے تعارف کرایا:

"فرہاد! یہ ثمر کی والدہ صاحبہ ہیں۔ میں پہلے ہی تمہارے سامنے ان کی کافی تعریفیں کر چکا ہوں۔"

یہ سن کر کہ سعید احمد ان محترمہ کی پہلے بھی تعریف کر چکے ہیں، وہ خوشی سے کھل گئیں۔ انہوں نے کہا:

"فرہاد! سعید احمد نے تمہارا غائبانہ تعارف کرایا ہے پھر میں نے کار کی کھڑکی سے جھانک کر تمہیں دیکھا ہے۔ چلو اچھا ہوا تم یہاں آ گئے۔ اچھی کمپنی رہے گی۔ تمہارے ساتھ اچھا وقت گزرے گا۔"

اس کی عمر پینتالیس برس سے کسی طرح کم نہ ہوگی مگر وہ ہم عمر سہیلیوں کی طرح بڑی بے تکلفی سے اور بڑی لگاوٹ سے مجھے کمپنی دینے کی بات کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پہنچتا ہوا میک اپ ایسے لگ رہا تھا جیسے شکستہ دیوار کو رنگ و روغن چڑھا کر اسے خوبصورت بنانے کی کوشش کی گئی ہو۔ میں نے بھی اس کی نفسیاتی کمزوری کو دیکھتے ہوئے کہا:

"یہ سعید صاحب آپ کے شوہر کو انکل کہتے ہیں اس رشتے سے میں آپ کو آنٹی کیسے کہوں؟ آپ تو اتنی کم عمر لگتی ہیں کہ کسی طرف سے آنٹی جیسی عمر رسیدہ خاتون نظر ہی نہیں آتیں۔ میرے لیے تو بڑی پرابلم ہو گئی ہے۔"

وہ میری بات سن کر خوشی سے کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔ اور کہنے لگیں۔

"مجھے بھی یہ آنٹی وانٹی کا رشتہ بالکل پسند نہیں ہے ہمیں تو دوستوں کی طرح وقت گزارنا چاہیئے۔ میرا نام فیروزہ ہے تم مجھے بے تکلفی سے فیروزہ کہہ کر مخاطب کر سکتے ہو سچ کہتی ہوں۔ مجھے تکلف بالکل پسند نہیں۔"

سعید احمد فیروزہ کو ناگواری سے دیکھ رہے تھے پھر انہوں نے کہا:

"آنٹی میں تو بچپن سے ہی آپ کو آنٹی کہتا ہوں اس لیے مجھے افسوس ہے میں آپ کو فیروزہ نہیں کہوں گا۔ بہرحال یہ بعد کی باتیں ہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ فرہاد بہت تھکا ہوا ہے۔ آپ ذرا اجازت دیں تو یہ غسل وغیرہ سے فارغ ہو جائے پھر ہم باتیں کریں گے۔"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں؟" فیروزہ نے چہکتے ہوئے کہا "فرہاد میں تمہارا انتظار کرتی رہوں گی۔ جلدی آ جانا پھر ہم تفریح کا پروگرام بنائیں گے"

میں نے بڑی لگاوٹ سے کہا:

"آپ کی شخصیت بڑی پرکشش ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں جی چاہتا ہے کہ آپ کو چھوڑ کر نہ جاؤں مگر غسل کرنا ضروری ہے بس، " یہ کہتا ہوا میں سعید احمد کے ساتھ ان کے کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آیا۔ سعید احمد نے اس کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا:

"فرہاد، کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ تم تو آنٹی سے ایسی باتیں کر رہے تھے جیسے وہ تمہاری گرل فرینڈ ہوں خیریت تو ہے؟ ارادہ کیا ہے؟"

میں نے ہنستے ہوئے کہا:

"ارادہ نیک ہے۔ میں ان سے دوستی نہیں کروں گا تو پھر کس طرح ثمر کے کام آؤں گا۔ تمہاری محبوبہ کی خاطر مجھے ایک بوڑھی عورت سے عشق کرنا ہوگا۔"

میری بات پر وہ بے اختیار قہقہہ لگانے لگے۔ میں نے ان سے کہا:

"آپ ہنستے ہی رہیں گے یا اپنی "ان" سے بھی ملاقات کرائیں گے وہ محترمہ کہاں ہیں جو آپ کا دل اپنے سینے میں لیے بیٹھی ہیں؟"

"کون ثمر؟"

"ہاں وہی۔ آپ انجان کیوں بنتے ہیں میں ثمر کو ہی پوچھ رہا ہوں"

انہوں نے ذرا قریب آ کر رازداری سے کہا:

"میں اس گھر میں یعنی آنٹی کی موجودگی میں ثمر سے ذرا دور رہتا ہوں۔ آنٹی جانتی ہیں کہ میں انٹیلی جنس کا ایک افسر ہوں اگر وہ مجھے ثمر سے بے تکلفی سے باتیں کرتے دیکھیں گی اور انہیں کچھ سازش کرنی بھی ہوگی تو ایک انٹیلی جنس والے کے سامنے نہیں کریں گی اس لیے میں بھی آنٹی کا اعتماد حاصل کرتا ہوں تاکہ ان کی چالبازیوں سے باخبر رہوں۔ یہ سب کچھ تمہارے آنے سے پہلے تھا۔ میں احتیاط کے طور پر ثمر سے دور رہتا تھا اب تم آ گئے ہو۔ آنٹی سے تمہارا عشق جلد ہی رنگ لائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ خود ہی ہنسنے لگے پھر غسل خانے کی طرف اشارہ کیا اور بولے "غسل خانے میں چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں تولیہ، صابن گرم پانی سب کچھ مل جائے گا۔ پندرہ منٹ کے بعد میں آ جاؤں گا۔ اوکے۔"

"اوکے۔" میں ان کی طرف سے پلٹ کر غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ اندر پہنچ کر میں ایک دم ٹھٹک گیا۔ ایک بہت ہی حسین لڑکی غسل خانے میں موجود تھی۔ وہ گرم پانی اور ٹھنڈے پانی کو ملا کر اس قابل بنا رہی تھی کہ میں غسل کر سکوں۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے جلدی سے اپنے سر پر دوپٹے کا آنچل رکھ لیا۔ اور ہاتھ اٹھا کر کہا:

"بھائی جان۔ آداب عرض۔۔۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا:

"آپ کون ہیں؟ اور کس رشتے سے مجھے بھائی جان کہہ رہی ہیں"

وہ نظریں جھکا کر زیر لب مسکراتی ہوئی بولی۔

"میرا نام ثمر ہے۔"

میں نے اسے دیکھ کر خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا:

"اچھا تو تم ثمر ہو۔ مگر ایک شرط پر تم مجھے بھائی جان کہہ سکتی ہو۔"

اس نے سر اٹھا کر پوچھا:

"کیسی شرط؟"

"یہی کہ اگر تم مجھے بھائی جان کہو گی۔ تو میں تمہیں بھابی جان کہوں گا"

یک بیک وہ فوراً ہی پلٹ کر باتھ روم کے دوسرے دروازے سے باہر چلی گئی۔ وہ دو کمروں کا مشترکہ باتھ روم تھا۔ باتھ روم کا دوسرا دروازہ اس کے کمرے میں کھلتا تھا۔ اس نے اپنے کمرے میں پہنچ کر دروازے کو بند کر لیا یعنی وہ مجھ سے چھپ گئی۔ بیچاری یہ نہیں جانتی تھی کہ کتنی پردوں میں رہ کر بھی کوئی مجھ سے نہیں چھپ سکتا ہے، میں دماغ کی اسکرین پر اسے خرماتے اور بجلاتے دیکھ رہا تھا۔ بھابی جان کا لفظ اسے بہت دور تک لے گیا۔ وہ خود کو سعید احمد کی دلہن کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔ میں تھوڑی دیر تک اس کی شرم و حیا سے لطف اٹھاتا رہا۔ پھر گنگناتے ہوئے اپنا لباس اتار کر غسل کرنے میں مصروف ہو گیا۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد غسل سے فارغ ہو کر اور سعید احمد کا ایک کرتہ اور پاجامہ پہن کر جب میں باتھ روم سے باہر آیا تو کمرے میں سعید احمد میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے سامنے ٹیبل پر کھانے کی پلیٹیں سجی ہوئی تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا:

"چلو آؤ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ پہلے پیٹ پوجا کر لو۔ پھر کام کی باتیں ہوتی رہیں گی۔"

میں نے فیروزہ آنٹی کے کمرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا:

"کیا کھانے میں فیروزہ کو شریک نہیں کرو گے؟"

سعید احمد نے بیزار ہو کر کہا:

"یار کیوں بور کرتے ہو۔ وہ محترمہ یہاں آئیں گی تو ہم کھانے کے دوران بھی کوئی کام کی بات نہ کر سکیں گے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا:

"آپ بہت جلد بھول جاتے ہیں کہ مجھ سے باتیں کرنے کے لیے زبان ہلانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ محترمہ موجود ہوں گی تب بھی ہم باتیں کر لیا کریں گے۔"

سعید احمد اچھل کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے:

"خدا کی قسم تم حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک ہو میں بھول جاتا ہوں کہ تم دشمنوں کے درمیان رہ کر بھی مجھ سے باتیں کر سکتے ہو۔ میں ابھی آنٹی کو بلاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ اتنے میں ثمر اپنے کمرے سے نکل کر سالن کی ایک ڈش لے کر وہاں پہنچ گئی۔ جب وہ میز پر سالن کی ڈش رکھنے لگی تو میں نے شرارت سے پوچھا:

"کیوں بھابی جان آپ میرے ساتھ کھانا نہیں کھائیں گی؟"

وہ ایک دم سے شرما کر سر پر آنچل رکھتے ہوئے اور کسی حد تک اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے حیا سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی:

"بھائی جان! خدا کے لیے آپ ابھی ایسا مذاق نہ کریں۔ امی نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی اس کی سوتیلی امی یعنی فیروزہ لہراتی بل کھاتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ وہ میرے ساتھ کھانے میں شریک ہونے کے لیے بڑے اچھے موڈ میں آئی تھی۔ مگر ثمر کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ذرا سی ناگواری کے تاثرات ظاہر ہوئے پھر وہ میری موجودگی کا احساس کرتے ہوئے جلد ہی سنبھل گئی اور کہنے لگی۔

"بھئی فرہاد! تم نے بڑا انتظار کرایا۔ حالانکہ ابھی ڈنر کا وقت نہیں ہوا ہے پھر بھی مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں صبح سے بھوکی تمہارے ہی انتظار میں بیٹھی ہوں۔"

میں نے مسکرا کر کہا "دل کو دل سے راہ ہوتی ہے چونکہ مجھے بھوک لگ رہی تھی، اس لیے آپ بھی بھوک محسوس کر رہی ہیں۔ آئیے کھانا شروع کیجئے۔ ارے ثمر تم الگ کیوں کھڑی ہو۔ ہم سب مل کر کھائیں گے باتیں کریں گے تو کھانے کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔"

میرے اصرار کرنے پر فیروزہ کو بھی کہنا پڑا۔

"ہاں ثمر! جب فرہاد کہہ رہے ہیں تو تمہیں انکار نہیں کرنا چاہیے۔ چلو بیٹھ جاؤ۔"

ہم سب سنٹر ٹیبل کے اطراف بیٹھ کر کھانے لگے۔ فیروزہ میرے ہی صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اتنے قریب آ گئی تھی کہ قربت بھی اسے دوری محسوس ہو رہی تھی۔ اگر اس بوڑھی محبوبہ کا بس چلتا تو وہ میری گود میں آ کر بیٹھ جاتی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ دوسروں کی موجودگی کا احساس کر رہی تھی سعید احمد نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کی موجودگی میں ہم باتیں نہیں کر سکیں گے۔ کھانے کے دوران میں نے کئی بار کوشش کی کہ میں سعید احمد سے سوچ کے ذریعے گفتگو کروں۔ مگر فیروزہ کی زبان تھی کہ پھسلتی ہی جا رہی تھی۔ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ لقمے بھی چبا رہی تھی اور بولتی بھی جا رہی تھی ایسی باتیں کرتی جا رہی تھی، جس سے اس کی اپنی شخصیت پر روشنی پڑتی تھی روشنی کیا پڑتی تھی وہ خود ہی جوانی کی رنگ برنگی روشنیاں اپنے اوپر ڈال رہی تھی اور اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ نوجوان اور پرکشش بنانے کے لیے بالکل کم عمر چھوکریوں کی طرح باتیں کیے جا رہی تھی۔ ثمر کے ہاتھوں کا پکایا ہوا کھانا بیحد لذیذ تھا۔ مگر اس لذت میں فیروزہ نے تلخیاں پیدا کر دی تھیں غلطی میری ہی تھی کہ پہلی ہی ملاقات میں اس سے عشق ملا کر بیٹھا تھا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ مجبوری تھی۔ عشق بڑے ہی کڑے مرحلوں سے گزر رہا تھا اور مجھے ان مراحل سے گزرنا ہی تھا۔

اللہ اللہ کر کے کھانا ختم ہوا۔ کافی کا دور چلا۔ پھر کافی پینے کے بعد میں نے خوامخواہ جماہی لیتے ہوئے کہا:

"سعید صاحب آپ نے مجھے اچھی طرح سونے نہیں دیا۔ اتنی جلدی نیند سے بیدار کر دیا میں چاہتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤں۔"

فیروزہ نے حیرت سے چیخ کر کہا:

"کمال کرتے ہو فرہاد! اس وقت ساڑھے پانچ بجے ہیں۔ شام کا

سہانا وقت ہے باہر اتنا خوبصورت ماحول ہے۔ ایسی ڈوبتی ہوئی شام میں کمرے کی چار دیواری میں قید رہنا بہت بڑی حماقت ہے۔ میں تمہیں سونے نہیں دوں گی۔ چلو ابھی ہم باہر چلتے ہیں۔"

وہ تو سچ مچ گلے پڑ گئی تھی۔ میں نے کہا:

"آپ میرا لباس دیکھ رہی ہیں۔ میں نے سعید صاحب کا کرتہ اور پاجامہ پہنا ہوا ہے۔ میرے پاس جو لباس تھا وہ باتھ روم میں پڑا ہوا ہے گھر سے باہر آپ کے ساتھ سیر کرنے کے لیے ایک اچھے لباس کی ضرورت ہے اور وہ میرے پاس نہیں۔"

میری بات سنتے ہی فیروزہ نے فوراً ہی اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا "تم تو غیروں کی طرح باتیں کرتے ہو۔ میرے ہوتے ہوئے بھی کیا تمہیں لباس کی کمی ہوگی۔"

"کیا تم اپنا لباس مجھے پہننے کے لیے دو گی؟"

یہ بات میں نے اتنی معصومیت سے پوچھی کہ سب ہی کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ وہ بھی ہنستے ہوئے بولی۔

"نہیں۔ تم ابھی ایک شال لپیٹ کر میرے ساتھ کسی دکان پر چلو۔ میں تمہارے آگے ملبوسات کے ڈھیر لگا دوں گی۔ چلو اب آؤ۔ کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔"

یہ کہتے ہی وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھ گئی مجھے بھی اٹھنا پڑا۔ میں نے سعید احمد سے کہا:

"سعید صاحب میں فیروزہ کے ساتھ جا رہا ہوں کیا آپ لوگ بھی ساتھ چلیں گے؟"

فیروزہ نے جلدی سے کہا:

"انہیں کیوں تکلیف دیتے ہو۔ ابھی تھوڑی دیر میں واپس آ جائیں گے۔ پھر تفریح کا پروگرام بنائیں گے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ میرے ساتھ تنہا جانا چاہتی ہے۔ اس لیے میں نے فیروزہ سے چھپ کر سعید صاحب کو آنکھ ماری پھر پلٹ کر فیروزہ کے ساتھ چلتے ہوئے کاٹیج سے باہر آ گیا۔ کار میں بیٹھتے وقت اس نے مجھے شال لپیٹنے کے لیے کہا کیونکہ سردی بہت زیادہ تھی میں نے کار کے شیشے چڑھاتے ہوئے کہا

"بس یونہی ٹھیک ہے شیشے چڑھا دیئے ہیں۔ اب اتنی سردی نہیں رہے گی۔ ہم کسی قریبی دوکان سے ہی کپڑا خرید لائیں گے۔"

یہ کہہ کر میں نے کار اسٹارٹ کی اور مال روڈ کی طرف جانے لگا اس وقت میری جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی لیکن میرے پاس والی سیٹ پر موٹی اسامی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں دولت حاصل کرنے کے سلسلہ میں ایسی موٹی مرغیوں کو ذبح و حلال کرتا ہوں۔ میں نے بظاہر شرمندگی سے کہا:

"فیروزہ میرا یہاں اچانک ہی آنا ہوا۔ بینک سے پیسے لانے کا وقت نہ ملا۔"

اس نے مجھے اپنی بات پوری نہیں کرنے دی۔ فوراً ہی بولی:

"تمہارے پاس پیسوں کی کیا کمی ہے کیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں؟"

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا:

"ہاں، میں نے سنا ہے شیخ برکت علی صاحب کروڑپتی ہیں ان کی بیگم ہونے کا رہے کہ تمہارے پاس پیسوں کی کیا کمی ہوگی لیکن مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ پھر بھی سوچتا ہوں کہ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔"

وہ خاص عاشقانہ لہجے میں بولی:

"ہاں پہلی ملاقات ہے لیکن مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں صدیوں سے تمہیں جانتی ہوں اور صدیوں سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ اب یہ انتظار ختم ہو گیا ہے فرہاد۔ وعدہ کرو کہ مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔"

یہ کہتے ہی اس نے اسٹیرنگ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بڑی محبت سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کا پرانا اور بوسیدہ ہاتھ ایسا پلپلا سا تھا جیسے میرے ہاتھ پر ایک مینڈک آ کر بیٹھ گیا ہو مگر مجبوراً میں نے اس مینڈکی کو برداشت کیا جسے عشق کا زکام ہو رہا تھا۔ اس وقت میری جیب بھی خالی تھی اور مجھے آئندہ کے لیے کہیں سے دولت حاصل کرنی تھی۔ اسی لیے میں نے اسے بڑی سعادت مندی سے برداشت کیا بلکہ اس کی تعریف کرنے کے لیے اور اسے نوجوان لڑکیوں سے بھی نوجوان ثابت کرنے کے لیے کہنے لگا

"یہ ثمر کیا شادی شدہ ہے؟ چہرے سے تو بڑی عمر والی لگتی ہے۔"

میری بات سن کر وہ خوش ہو گئی۔ پھر ذرا سا منہ بناتی ہوئی بولی:

"اونہہ بہت ہی بے حیا لڑکی ہے۔ پتہ نہیں کیسے کیسے لڑکوں سے دوستی کرتی رہتی ہے اسی لیے منہ پر پھٹکار برستی ہے تم نے خود ہی دیکھ لیا وہ وقت سے پہلے ہی بوڑھی نظر آ رہی ہے۔"

میں نے تائید میں سر ہلا کر کہا:

"ہاں تم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سگی بہنیں ہیں آپ چھوٹی بہن ہیں وہ بڑی بہن ہے۔ تم ماں بیٹی نہیں لگتیں لیکن میں دنیاداری کی بات کر رہا ہوں جب تک وہ تمہارے قریب یا آس پاس رہے گی لوگ تو یہی کہیں گے نا کہ وہ بیٹی ہے اور تم ماں ہو اور جب ماں کا لفظ آتا ہے تو تصور میں ایک بوڑھی عورت آ جاتی ہے۔ دیکھو برا نہ ماننا میں تمہارے حسن اور جوانی سے متاثر ہو کر یہ بات کہہ رہا ہوں کہ تمہیں ثمر کے قریب نہیں رہنا چاہیے۔ کہ تم کسی طرح ثمر کو اپنے سے دور کر دو۔ تاکہ خوامخواہ یہ ماں بیٹی کا رشتہ نہ رہے۔ مجھے تو وہ بری طرح کھٹکتی ہے۔ دیکھو میں پہلی ملاقات میں تمہاری بیٹی سے متعلق ایسی بات کہہ رہا ہوں۔ تم برا تو نہیں مان رہی ہو؟"

وہ جلدی سے بولی:

"نہیں نہیں تم تو بڑی سچی اور کھری باتیں کرتے ہو۔ تم وہی کہہ رہے ہو جو میں محسوس کرتی ہوں۔ بائی گاڈ تمہیں دیکھتے ہی میں نے محسوس کیا تھا کہ بڑی مدت کے بعد مجھے کوئی میرا ہم مزاج مل رہا ہے۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ مجھے کس طرح کھٹکتی رہتی ہے۔ تم نے بڑے پتے کی بات کہی ہے

کہ میری عمر کتنی ہی کم کیوں نہ ہو لوگ تو مجھے اس کی ماں کہیں گے تو یہ کیسی غلط سی بات ہے۔ وہ کم بخت مرتی بھی نہیں۔۔۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا:

"تمہارے کوسنے سے تو وہ مرے گی نہیں۔ مارنے کے لیے عقل کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ۔۔۔ لیکن میں ایسی باتیں کیوں کر رہا ہوں۔ نہیں نہیں مجھے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیے۔ پتہ نہیں تم کیسی ہو تم نے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے کہ میں تمہارے کسی دشمن کو برداشت نہیں کر سکتا۔"

اس نے خوش ہو کر میرے بازو کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور کھسک کر قریب آ گئی اور بڑے ہی رازدارانہ لہجے میں کہنے لگی۔

"محبت کا جادو اسی طرح سر چڑھ کر بولتا ہے۔ بس میں نے سمجھ لیا ۔۔۔ کہ واقعی تم مجھے سچے دل سے چاہتے ہو۔ پہلی ملاقات میں اتنی سچی اور کھری باتیں کوئی نہیں کرتا جیسی کہ تم کر رہے ہو۔ میں کیا بتاؤں فرہاد میں اس کم بخت ثمر کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ اب میں اس کے باپ سے ناطہ تو نہیں توڑ سکتی۔ اس سے ناطہ توڑنے کا مطلب یہ ہوگا کہ کروڑوں کی جائداد ہاتھ سے نکل جائے گی کیا یہ دانشمندی ہوگی؟"

میں نے انکار میں سر ہلا کر کہا:

"نہیں بالکل نہیں۔ کروڑوں کی جائداد محض ایک لڑکی کی وجہ سے چھوڑ دینا بہت بڑی حماقت ہوگی۔ تم کسی طرح اسے اپنی زندگی سے دور کیوں نہیں کر دیتیں؟"

اس نے گہرے رازدارانہ لہجے میں پوچھا:

"کیسے دور کروں؟"

"جیسے بھی ہو سکے۔ راستے میں اگر کوئی کانٹا ہو تو اسے اٹھا کر ایک طرف پھینک دینا چاہیے۔ اس طرح پھینکنا چاہیے کہ وہ پھر راستے میں نہ آ سکے ورنہ اپنا ہی پاؤں زخمی ہوتا ہے۔"

"اوہ فرہاد، تم کتنی اچھی باتیں کرتے ہو۔ اور کتنی گہری باتیں کہتے ہو۔ تم مجھے بتاؤ کہ میں کس طرح اسے اپنی زندگی سے دور کر سکتی ہوں۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا:

"مائی سویٹ فیروزہ۔ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ مگر پتہ نہیں کیوں میں تم سے اپنی کوئی بات نہیں چھپا سکتا۔ شاید یہ تمہیں نہیں معلوم کہ میں ماضی میں مجرمانہ زندگی گزار چکا ہوں۔ میرے ہاتھوں دو قتل ہو چکے ہیں تم کہو گی تو میں تمہاری خاطر اسے بھی ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں گا۔"

وہ حیرانی اور خوشی سے میرا منہ تکنے لگی۔ پھر وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی: "میں جانتی ہوں کہ تم میرے لیے بہت کچھ کر سکتے ہو۔ میرا یہ خیال غلط نہیں ہو سکتا۔ میں نے سوچ سمجھ کر تمہارا انتخاب کیا ہے۔ مگر فرہاد میں تمہیں ایسا کوئی کام نہیں کرنے دوں گی جس سے تم قانون کی گرفت میں آ جاؤ۔ تم میرے لیے ایک انمول ہیرا ہو۔ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے گنوانا نہیں چاہتی میں خود ہی اسے راستے سے ہٹا دوں گی۔"

میں نے خالص ایک عاشق جیسے انداز میں کہا:

"نہیں فیروزہ۔ میں نہیں چاہتا کہ تم کوئی ایسی حرکت کرو جس سے قانون کی گرفت میں آ جاؤ، تم بھی میرے لیے ایک نایاب ہیرا ہو میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے نہیں گنوانا چاہتا۔"

"میں اتنی نادان نہیں ہوں فرہاد کہ قانون کی گرفت میں آ جاؤں۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے رازدار ہیں۔ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ میں نے ہی ثمر کے باپ کو پاگل بنا کر پاگل خانے بھیج دیا ہے۔ اب میں ثمر کو بھی پاگل بنا دینا چاہتی ہوں۔ اس کے باپ کو پاگل خانے گئے ہوئے ایک سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس کی بیٹی بھی پاگل ہو جائے گی تو کچھ لوگ مجھ پر شک ضرور کریں گے لیکن یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اس کا باپ پاگل تھا۔ یہ پاگل پن بیٹی کو ورثے میں ملا ہے۔ وہ بھی ایک خاص عمر کو پہنچ کر پاگل ہو گئی ہے اگر دنیا نہ سمجھے تب بھی یہ کون ثابت کر سکتا ہے کہ میں نے اسے پاگل بنایا ہے۔"

"ہاں کوئی یہ ثابت نہیں کر سکے گا۔ تم واقعی پاگل بنانا جانتی ہو۔ دیکھو نا میں کس طرح تمہارے لیے پاگل بن رہا ہوں۔"

میری بات سنتے ہی وہ ہنسنے لگی پھر ہنستے ہوئے بولی:

"یہ پاگل پن تو بہت ہی خوبصورت ہے مگر میں دشمنوں کو اس طرح پاگل بناتی ہوں کہ انہیں دیکھ کر دوسرے دشمن عبرت حاصل کرتے ہیں۔"

"مگر تم کس طرح پاگل بناتی ہو؟"

"میرے پاس ایک دوا ہے میں نے ایک ڈاکٹر سے بڑی خوشامدیں کرنے کے بعد بڑی مشکل سے اسے حاصل کیا ہے۔ اس دوا کا نام لوٹفرانیل ہے اس کی دو گولیاں پیس کر اور دودھ میں ملا کر پلا دی جائیں تو پینے والے کا دماغ فوراً گڑبڑ ہو جاتا ہے اس کی یادداشت ختم ہو جاتی ہے۔"

میں نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"پھر تو یہ بڑے کام کی دوا ہے۔ تمہاری دریافت کا جواب نہیں ہے۔ اس طرح تو دشمنوں کو ہلاک کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہو گی صرف انہیں پاگل بنا کر ہی کام نکالا جا سکتا ہے۔"

"ہاں اچانک ایک ڈاکٹر سے میرے تعلقات ہو گئے تھے میں نے۔۔"

وہ کہتے کہتے ایک دم سے محتاط ہو گئی۔ وہ باتوں کی دھن میں کسی ڈاکٹر سے اپنے تعلقات کا ذکر کرنے والی تھی۔ پھر جلد ہی سنبھل کر بولی:

"تعلقات کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے درمیان منہ بولی رشتے داری تھی۔ وہ بھی یہی کہتے تھے کہ میں بہت کم سن ہوں اور بوڑھے برکت علی سے شادی کر کے اپنی زندگی برباد کر رہی ہوں۔ وہ ڈاکٹر بھی بوڑھے تھے میں انہیں انکل کہا کرتی تھی۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئی تو اس کا دماغ سوچنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اس کی زبان پھسلتے پھسلتے رہ گئی۔ اگر ڈاکٹر سے اس کے تعلقات کی نوعیت واضح ہو جاتی تو پتہ نہیں میں اس کے بارے

زندگی کی حیثیت سے اس کے متعلق کیا سوچتا۔ وہ مجھ سے چھپ کر سوچ رہی تھی اور میں اس سے چھپ کر سن رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا

"کیا وہ دوا اب بھی تمہارے پاس ہے؟"

"ہاں میں اس کی حفاظت جان سے بھی زیادہ کرتی ہوں۔ میں نے اسے اپنی الماری میں لاک کر کے رکھا ہے۔ یہاں مری آتے وقت اسے اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ میں اس دوا کو دودھ میں یا کسی کھانے کی چیز میں ثمر کو کھلا سکوں گی۔ مگر یہاں پہنچ کر جس دن میں نے یہ پروگرام بنایا اس دن اتفاق سے سعید احمد یہاں آ گیا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ وہ ایک انٹیلی جینس کا آفیسر ہے اس کی موجودگی میں اگر میں کوئی ایسی حرکت کروں گی تو پکڑی جاؤں گی۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا:

"تم میرے یار سے ڈر رہی ہو۔ وہ تو یاروں کا یار ہے میں نے تو اسی کی دوستی کے سائے میں دو قتل کیے ہیں اس نے مجھے قانون کی گرفت سے صاف بچا لیا تھا۔"

فیروزہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر بولی:

"میں نے کئی بار سوچا کہ سعید کو اپنے اعتماد میں لے لوں مگر ہمت نہ ہوئی۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ ثمر میں دلچسپی لے رہا ہے حالانکہ وہ مجھ سے چھپ چھپ کر اشارے بازیاں کرتا ہے مگر ہم عورتوں سے ایسی باتیں چھپی نہیں رہتیں۔ ایسی صورت میں تم ہی بتاؤ کہ میں اس کی موجودگی میں ثمر کے خلاف کوئی سازش کیسے کر سکتی ہوں؟"

"تم مرد کی کمزوریوں کو نہیں سمجھتی ہو۔ اگر وہ ثمر میں دلچسپی لے رہا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس سے شادی کرے گا۔ میں سعید احمد کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ وہ عاشق مزاج ضرور ہے لیکن بیوی کے نام پر ایک پلنگ نہیں پالنا چاہتا۔ تم اسے ذرا ڈھیل دو تاکہ وہ ثمر کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارے۔ دو چار راتیں گزارنے کے بعد ہی اس کا دل بھر جائے گا اور وہ خود ہی اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرے گا۔ ایسے وقت پر میں اسے وہ ذہن کو مفلوج کر دینے والی دوا لے جا کر دوں گا اور اسے مشورہ دوں گا کہ وہ ثمر کو پاگل بنا کر اس سے پیچھا چھڑائے۔"

وہ مارے خوشی کے لرزتے ہوئے بولی:

"کیا وہ تمہارا مشورہ مان لے گا؟"

"اس کا تو باپ بھی مانے گا۔ تم نہیں جانتیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے کتنے گہرے رازدار ہیں۔ تم وہ دوا مجھے دو اور یہ نیک کام مجھ پر چھوڑ دو۔ دوسری بات یہ کہ اسے ثمر کے ساتھ آزادی سے ملنے کا موقع دو۔ اس طرح ہم دونوں کا بھی فائدہ ہے۔ اگر وہ دونوں اپنے آپ میں مگن رہیں گے تو ہماری تنہائی میں مداخلت کرنے نہیں آئیں گے۔"

وہ شرماتی ہوئی بوڑھی اداؤں سے بولی:

"تم بڑے وہ ہو۔ اپنے مطلب کی بات پہلے سوچتے ہو مگر اس میں شبہ نہیں کہ تم زبردست پلاننگ کرتے ہو۔ ٹھیک ہے میں کالج میں پہنچ کر دوا اسی وقت تمہیں دے دوں گی۔"

مال روڈ کی ایک دکان پر پہنچ کر میں نے گاڑی روک دی۔ وہاں سے وہ میرے لیے ڈھیر سارے کپڑے خریدنا چاہتی تھی مگر میں نے صرف دو ریڈی میڈ سوٹ پسند کیے۔ وہ مجھے نقد رقم بھی دینا چاہتی تھی لیکن میں نے انکار کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ میں اس کی دولت سے نہیں بلکہ حسن و شباب سے متاثر ہو کر اس کے قریب آ رہا ہوں۔ میں اس کے ایک پیسے کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ میں خود اتنا دولتمند ہوں کہ پیسوں کو اہمیت نہیں دیتا ہوں۔ وہ سچ مچ مجھ سے متاثر ہوتی رہی۔ ایک گھنٹے بعد جب ہم کالج واپس جانے لگے تو اس وقت میں نے اس کی سوچ کو پڑھ لیا تھا۔ وہ کار کی تنہائی سے فائدہ اٹھا کر میرے بازوؤں میں آنا چاہتی تھی۔ میں چند لمحوں کے لیے بڑی الجھن میں پڑ گیا کہ اس قدر باسی کھانے کو کس طرح منہ لگاؤں؟ پھر میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے سوچ کے ذریعے سعید احمد سے کہا:

"سعید صاحب مجھے بوڑھی محبوبہ سے بچائیے۔"

انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا مصیبت میں پھنس گئے ہو؟"

"ہاں پھنسنے والا ہوں۔ اس وقت ڈرائیو کر رہا ہوں۔ اس لیے فیروزہ بڑے صبر سے میرا بازو تھامے بیٹھی ہوئی ہے مگر سوچ رہی ہے کہ کالج کے سامنے میں جیسے ہی کار روکوں گا وہ گلے کا ہار بن جائے گی۔ اب کالج قریب آ رہا ہے لہٰذا آپ فوراً ہی کالج سے باہر آ جائیں تاکہ وہ آپ کی موجودگی میں اپنی سوچ پر عمل نہ کر سکے۔"

سعید احمد نے ہنستے ہوئے یقین دلایا کہ وہ باہر آ رہے ہیں جب میں نے کالج کے سامنے پہنچ کر کار روکی تو وہاں سعید احمد کو دیکھتے ہی فیروزہ پھیکی پڑ گئی اور بڑی ناگواری سے منہ بنا کر بولی:

"یہ کم بخت باہر سردی میں کیوں کھڑا ہوا ہے؟"

میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی میں کہا:

"سعید صاحب شاید میرا انتظار کر رہے ہیں تم ابھی کار سے اترنے کے بعد کالج میں جا کر ان سے لگاوٹ کی باتیں کرو اور انہیں ثمر سے ملنے کی کھلی آزادی دو جب وہ دونوں ایک کمرے میں جائیں گے تو میں تمہارے کمرے میں آ جاؤں گا۔"

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی:

"اچھی بات ہے مگر تم بھول نہ جانا کہ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

میں نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا:

"بھلا تم بھی کوئی بھلائی جانے والی چیز ہو!"

وہ خوش ہو کر کار سے اتر گئی اور میرے مشورے کے مطابق سعید احمد کے پاس جا کر بولی:

"سعید میرے ساتھ آؤ۔ میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔"

میں نے سوچ کے ذریعے کہا:

"فیروزہ کے ساتھ چلے جائیے وہ تمہارے لیے ثمر سے ملنے کے راستے ہموار

کرے گی۔ اب وہ آپ کے لیے قطعی ممنوعہ نہیں رہے گی۔"

وہ فیروزہ کے ساتھ کلچ کے اندر چلے گئے۔ میں بھی کار کو لاک کرنے کے بعد سیدھا اس کے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر ایسی تازگی آگئی جیسے ایک ڈوبنے والی کو بہت بڑا سہارا مل گیا ہو۔ کچھ رسمی باتیں کرنے کے بعد اس نے کہا:

"سعید صاحب آپ کی بے حد تعریفیں کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آپ میرے ڈیڈی کو پاگل خانے سے لے آئیں گے۔ کیا یہ ممکن ہے؟"

"اس دنیا میں کوئی کام ناممکن نہیں ہے، اگر انسان کرنا چاہے۔ تم اطمینان رکھو۔ تمہارے ڈیڈی تم سے بہت جلد آکر ملیں گے۔"

"کیا ان کا پاگل پن دور ہو جائے گا؟"

"ہاں، وہ تمہیں پہچان لیں گے۔"

"دیکھیے! آپ مجھ سے کوئی بات نہ چھپائیں سچ سچ بتائیں کیا آپ کوئی عمل جانتے ہیں۔ سعید صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک ہیں، اس کا مطلب کیا ہوا؟"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو عامل ہوتے ہیں وہ کسی پر اپنی حقیقت ظاہر نہیں کرتے۔ ظاہر کرنے سے علم کی تاثیر ختم ہونے لگتی ہے۔ کیا تم چاہو گی کہ میرا علم مجھ سے چھن جائے؟"

"نہیں، میں آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گی، آپ صرف میرے ڈیڈی کو مجھ سے ملا دیں۔"

میں اسے یقین دلا کر اس کمرے میں آگیا جو میرے اور سعید احمد کے لیے مخصوص تھا۔ سعید احمد اس وقت فیروزہ کے کمرے میں تھے۔ اور فیروزہ انہیں سمجھا رہی تھی۔

"میں تمہاری آنٹی ہوں تمہیں شرمانا نہیں چاہیے میں تو تمہاری دوست بن کر رہنا چاہتی ہوں۔ اگر فرہاد تمہیں پسند ہے تو بلا جھجک اس سے ملا کرو، وہ میری سوتیلی بیٹی ہے۔ مگر میں تمہیں سگوں سے زیادہ چاہتی ہوں۔ تم پر ثمر جیسی ہزاروں لڑکیاں قربان کر سکتی ہوں۔"

وہ سمجھا رہی تھی اور سعید احمد خوش ہو رہے تھے۔ فیروزہ نے انہیں جلد ہی اپنے کمرے سے رخصت کر دیا تاکہ میں اس کے کمرے میں آسکوں۔ وہ میرے استقبال کے لیے آئینے کے سامنے جا کر اپنے بدن پر خوشبو اسپرے کر رہی تھی میں نے اس کی سوچ میں کہا:

"فرہاد اتنی جلدی نہیں آئے گا کیونکہ ثمر ابھی جاگ رہی ہے۔ اس وقت تک مجھے یہ سوچنا چاہیے کہ میں فرہاد کو اپنانے اور اسے پاس رکھنے کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

فیروزہ کی سوچ نے کہا۔

"ہاں میں کیا کر سکتی ہوں؟ میں اسے اپنی دولت کا لالچ نہیں دے سکتی کیونکہ وہ خود دولت مند ہے۔ وہ صرف میرے ظاہری حسن سے متاثر ہو گیا ہے لیکن جب وہ میرے باطن میں جھانک کر دیکھے گا تو ہو سکتا ہے کہ بدک جائے

جس طرح وہ مجھ پر مرمٹا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کے معاملے میں اناڑی ہے مگر میں اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ بس یہی سوچ کر ڈر لگتا ہے کہ ایک رات گذارنے کے بعد کہیں وہ مجھ سے مایوس نہ ہو جائے آہ میں عمر رفتہ کو کیسے آواز دوں؟ بیس برس پہلے کیسی قیامت کی جوانی تھی۔ کاش کہ وہ جوانی ایک رات کے لیے واپس آجاتی اور میں فرہاد کے پاؤں میں زنجیر ڈال دیتی۔"

میں نے اس کی سوچ میں کہا:

"مجھے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اس حقیقت کو یاد رکھنا چاہیئے کہ شراب جتنی پرانی ہوتی ہے اتنا ہی اس کا نشہ تیز ہوتا ہے میں اپنے پرانے تجربوں اور آزمودہ اداؤں سے اسے مدہوش کر دوں گی۔ اس کے علاوہ مجھے سہارا دینے کے لیے میرے پاس دولت ہے اگرچہ وہ خود کو دولتمند کہتا ہے مگر یہ مردشیخی بگھارنے کیلئے بھی جھوٹی شان دکھاتے ہیں ہو سکتا ہے کہ اس کا کچھ بینک بیلنس ہو مگر وہ میری طرح کروڑپتی تو نہیں ہو گا۔ کیا میں اسے اپنی دولت کی ہلکی سی جھلک نہیں دکھا سکتی؟"

"ہاں دکھا سکتی ہوں۔ اسے متاثر کرنے کے لیے یہ حربہ بھی استعمال کر کے دیکھنا چاہیے۔ یہاں مری کے بنک میں میں نے ہنگامی ضرورت کے لیے پانچ لاکھ روپے رکھ چھوڑے ہیں کل میں دو لاکھ روپے نکال کر لاؤں گی انہیں اپنے سوٹ کیس میں رکھوں گی پھر اس کے سامنے اپنی کسی ضرورت کے بہانے وہ سوٹ کیس کھولوں گی۔ نوٹوں کی اتنی ساری گڈیاں دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل جائیں گی اور میں بڑی فراخدلی سے کہوں گی کہ یہ روپے رکھ لو مجھے تو بوجھ لگتے ہیں۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا:

"شاباش، یہی بوجھ اٹھانے کے لیے تو میں بوڑھی محبوبہ کا بوجھ اٹھا رہا ہوں۔"

جب میں نے سوچ کے ذریعے اسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ کل صبح اسے بینک جا کر دو لاکھ روپے لے آنا چاہئیں تو اس کے بعد میں نے اس کی سوچ میں کہا

"اب مجھے وہ دوا نکال کر اپنے سرہانے رکھ لینی چاہیئے فرہاد آئے گا تو میں دوا کی شیشی اس کے حوالے کر دوں گی۔"

وہ اپنے سوٹ کیس سے وہ دوا نکال کر بستر پر آگئی پھر اسے سرہانے رکھ کر آرام سے لیٹ گئی۔ آرام سے لیٹتے وقت اس کے دماغ میں یہ بات آئی کہ لیٹنے کا انداز ایسا ہو جیسے ایک شگفتہ کلی قوم کے صاف ستھرے بستر پر کھلنے کے انتظار میں پڑی ہو۔ لیٹنے کا انداز ایسا ہو کہ مختلف زاویے سے بدن کے خطوط ابھر آئیں اور دیکھنے والے کی توبہ ٹوٹ جائے۔

اس خیال سے وہ لیٹے لیٹے ہی ادھر سے ادھر پہلو بدلنے لگی جیسے فوٹو اترواتے وقت خود کو بہت زیادہ پرکشش بنانے کے لیے لوگ ادھر سے ادھر پوز بدلتے ہیں اسی طرح وہ اپنے بدن کے زاویے بدل رہی تھی مگر تمام زاویے بتا رہے تھے کہ وہ ہر طرف سے پچکی ہوئی ہے۔

مرد ہو یا عورت دونوں ہی خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں۔ جوانی کی عمر گذارنے کے بعد بھی یہ تسلیم نہیں کرتے کہ وہ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ہمیشہ نت نئے انداز میں خود کو جوان بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں یہی حال اس کا تھا۔ مجھے اس پر ہنسی آرہی تھی۔

میں تھوڑی دیر تک اس کی بوڑھی اداؤں سے محظوظ ہوتا رہا پھر میں نے اس کی سوچ کے ذریعے کہا:

"ابھی مجھے آنکھ بند کر کے لیٹے رہنا چاہیئے تاکہ میں اس سے انجان بنی رہوں یہ دیکھتی رہوں کہ وہ کمرے میں آکر کس انداز میں محبت کا آغاز کرتا ہے"

اس سوچ کے مطابق اس نے آنکھیں بند کر لیں اور میرا انتظار کرنے لگی۔ میں نے پھر اس کی سوچ میں کہا:

"اف کتنی تھکن محسوس ہو رہی ہے جی چاہتا ہے کہ اب آنکھ نہ کھلے اسی طرح لیٹی رہوں اور آہستہ آہستہ سو جاؤں۔ ہاں سونے کو بڑا جی چاہ رہا ہے۔ مجھے تھوڑی دیر کے لیے سو جانا چاہیئے اور میں سو رہی ہوں میرے ہاتھ پاؤں سست پڑ رہے ہیں۔ میرے دماغ پر دھند چھا رہی ہے۔ چاروں طرف دھواں ہی دھواں محسوس ہو رہا ہے۔ میں ذہنی طور سے کسی ان دیکھی گہرائی میں ڈوبتی جا رہی ہوں۔ میں سو رہی ہوں۔ میں سو رہی ہوں میں سوتی جا رہی ہوں...."

اس نے سونے کی مخالفت کی۔ میرے مشورے کے خلاف اس نے آنکھ کھولنے کی کئی بار کوشش کی لیکن میری سوچ اس پر حاوی ہوتی رہی تھوڑی دیر کی جدوجہد کے بعد وہ آہستہ آہستہ سو گئی۔

اس کے سو جانے کے بعد میں بھی اپنے بستر پر آرام سے لیٹ گیا۔ اور ماسٹر یوشے کی خبر لینے لگا۔ ماسٹر یوشے جاگ رہا تھا اور اپنے بیڈ روم میں بیٹھا ہوا وسکی پی رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شیشے کا جو جام تھا اس میں چالیس برس پرانی پرتگالی شراب تھی جس کا ایک گھونٹ پیتے ہی کھوپڑی ہوا میں گھومنے لگتی ہے۔ اتنا تیز نشہ ہوتا ہے کہ اناڑی اسے پی کر سنبھل نہیں پاتے مگر وہ کئی گھونٹ پی چکا تھا اور ہوش میں تھا۔ اتنی پرانی شراب بھی اس کے لیے پانی ہو گئی تھی کیونکہ اس کے دماغ پر میری شخصیت بری طرح حاوی ہو گئی تھی۔ وہ اب تک میرے لیے پریشان تھا کہ میں اچانک کہاں غائب ہو گیا ہوں اور آئندہ کس طرح اس کے ہاتھ آسکتا ہوں؟

جس بیل منڈو کے ذریعے وہ مجھ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں تھا صرف ایک روما رہ گئی تھی جس کے سہارے وہ یہاں آکر مجھے تلاش کر سکتا تھا۔ اسی لیے وہ بار بار روما سے رابطہ قائم کرتا تھا۔ روما کا رو رو کر برا حال تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا انکل کہاں گم ہو گیا ہے۔ ماسٹر یوشے اسے جھوٹی تسلیاں دے رہا تھا کہ اس کا انکل اتنی آسانی سے نہیں مر سکتا۔ اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہے جس کی وجہ سے اس کا ذہن وقتی طور پر مفلوج ہو گیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ بیل منڈو سے ذہنی رابطہ نہیں کر سکتا ہے۔ آج نہیں تو کل اس کا انکل ضرور مل جائے گا۔

بس وہ روما کو اسی طرح جھوٹی تسلیاں دے رہا تھا تاکہ اس کے یہاں پہنچنے تک روما بھی کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے یا اپنے انکل کی زندگی سے مایوس ہو کر خود بھی مرنے کا ارادہ نہ کرے۔ اور اس شیطان سے متنفر ہو جائے۔ جب وہ باغی ہو جائے گی اور پاگل پن سے اور اپنی موت سے نہیں گھبرائے گی تو پھر اس کے قابو میں نہیں آئے گی۔ اسی لیے وہ روما کو بار بار سمجھا رہا تھا کہ کل اس ملک میں پہنچتے ہی وہ اس کے انکل کو ڈھونڈ نکالے گا۔

ہاں کل وہ یہاں پہنچنے والا تھا۔ کل سے میرے لیے نئی مصیبتوں کا آغاز ہونے والا تھا۔ نئے طوفان سر اٹھا رہے تھے اور میں آرام سے لیٹا ہوا تھا کیونکہ میری مٹھی میں یہی تھوڑا سا وقت رہ گیا تھا۔ کل تک میں ذرا سکون سے زندگی گذار سکتا تھا۔ کل کے بعد کیا ہونے والا تھا یہ میں نہیں جانتا تھا میری تقدیر جانتی تھی میں ساری دنیا کی سوچ پڑھنے والا اپنی تقدیر کے منصوبوں کو نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس لیے کل تک صبر کر رہا تھا اور زیادہ سے زیادہ سکون سے رہ کر اپنے آپ کو تازہ دم رکھنا چاہتا تھا۔

مگر مجھے نیند نہیں آرہی تھی اس لیے کہ دوپہر کو بہت دیر تک سوتا رہا تھا۔ میں بستر سے اٹھ کر پہلے فیروزہ کے کمرے میں گیا۔ وہ اپنے بستر پر گہری نیند سو رہی تھی۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر اس کے تکیہ کے نیچے ہاتھ ڈال کر دوا کی شیشی نکال لی اور اس پر ایک نظر ڈال کر اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر اس کے کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں آیا۔ باہر اچھی خاصی سردی پڑ رہی تھی۔ میں شال لپیٹے ہوئے تھا۔ تنہائی سے گھبرا کر میں نے سعید احمد کے ذہن میں جھانکنا شروع کیا۔ مگر جلد ہی ان کے ذہن سے پلٹ کر واپس لوٹ گیا کیونکہ وہ اپنی ثمر کے ساتھ ایسی حالت میں تھے کہ اس وقت ان کے ذہن کو پڑھنا خلافِ تہذیب تھا۔ میں پھر اپنے بستر پر آکر لیٹ گیا۔

میں بالکل تنہا تھا۔ اس وقت کوئی مجھ سے ملنے والا نہ تھا اور نہ ہی میں سوچ کے ذریعے کسی سے ملنا چاہتا تھا۔ جب سکون نصیب ہو رہا تھا تو سو جانا ہی مناسب تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے ذہن کو ہدایت کی کہ صبح پانچ بجے میری آنکھ کھل جائے اپنی عادت کے مطابق اس قسم کی ہدایت دے کر میں گہری نیند سو گیا۔

دوسرے دن صبح نو بجے فیروزہ دو لاکھ روپے نکالنے کے لیے بینک کی طرف چلی گئی پہلے تو اس نے مجھے ساتھ لے جانے کے لیے سوچا تھا مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ اتنی بڑی رقم وہ چپ چاپ لے کر آئے اور اپنے سوٹ کیس میں رکھ دے تاکہ اسے میرے سامنے کھول کر یہ ثابت کرے کہ اتنی بڑی بڑی رقمیں تو اس کے سوٹ کیس میں یونہی پڑی رہتی ہیں۔ میں نے بھی سوچا کہ اچھا ہے وہ تنہا ہی جائے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سعید سے کہا

"آپ اسی وقت ثمر کو ساتھ لے کر پاگل خانے کی طرف چلے جائیں اور وہاں پہنچ کر ثمر کے والد سے سامنا کریں ان سے باتیں کریں۔ آپ ان سے باتیں کریں گے اور ان کی آنکھوں میں جھانکیں گے تو میں آپ کے ذریعے ان کے دماغ تک پہنچ جاؤں گا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ میں ٹیلی پیتھی

کے ذریعے ان کا علاج کر سکتا ہوں یا نہیں؟"

سعید احمد یہ سن کر خوش ہو گئے۔ وہ اسی وقت ثمر کے پاس گئے اور فوراً ہی اسے تیار ہونے کے لیے کہا۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ دونوں وہاں سے رخصت ہو گئے۔ میں نے بھی پچھلی شام کا خریدا ہوا سوٹ پہن لیا اور آئینے کے سامنے اچھی طرح تیار ہو کر اپنا جائزہ لینے کے بعد کالج سے باہر چلا گیا کالج کی ایک چابی مجھے دے دی گئی تھی۔ دوسری چابی فیروزہ کے پاس تھی۔ اس لیے مجھے فکر نہیں تھی کہ میری غیر موجودگی میں وہ کالج کے باہر ہی میرا انتظار کرتی رہے گی۔

میں وہاں سے اس لیے چلا آیا تھا کہ تنہائی میں فیروزہ سے ڈر لگتا تھا۔ یوں بھی صبح اٹھتے ہی میں نے شکایت کی تھی کہ وہ نیند کی بڑی پکی ہے میں اس کے کمرے میں گیا تھا۔ اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ کروٹ بدل بدل کر سو گئی۔ میں نے ثبوت کے طور پر دوا کی وہ شیشی دکھائی تاکہ اسے یقین ہو جائے کہ میں اس کے کمرے میں گیا تھا۔ اسے یقین آ گیا تھا اور اب وہ دوسری بار تنہائی کا موقع تلاش کر رہی تھی۔ اسی لیے میں کالج سے نکل کر ادھر اُدھر بھٹکنے لگا۔

مری کے اونچے نیچے راستوں پر آوارگی کرتے وقت مجھے پھوپی جان کا خیال آیا کہ کہیں ان کی نرد بنیہ اور فرزانہ سے ملاقات نہ ہو جائے۔ میرا دل بہت چاہتا تھا کہ ان سے ملوں لیکن ان سے ملنے کا مطلب یہی ہوتا کہ فرزانہ مجھے دیکھتے ہی پھر بہک جاتی۔ اس نے دوسری شادی کرنے کا جو ارادہ کیا تھا اس ارادے میں کمزوری آ جاتی۔ اس وقت اس طرح آزادی سے گھومنا میرے لیے مناسب نہ تھا۔

آدھ گھنٹے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے فیروزہ کے کالج میں واپس جانا چاہیے۔ اس وقت فیروزہ وہاں پہنچ گئی تھی اور دروازے کھولنے کے بعد میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے دو لاکھ روپے کی مختلف گڈیوں کو اپنے سوٹ کیس میں پھیلا کر رکھ دیا تھا اور بستر پر پھیل کر میرے متعلق جوان لڑکیوں کے سے انداز میں سوچ رہی تھی۔ میں نے کالج کی طرف بڑھتے ہوئے اس کی سوچ میں کہا:

"میری عمر کیا ہو گی؟"

اس کی سوچ نے کہا:

"پینتالیس برس۔ مگر میں پینتالیس کی نہیں لگتی۔ میں اپنے جوان بیٹے کو اپنے سے دور رکھتی ہوں تاکہ لوگ اسے دیکھ کر میری عمر کا حساب نہ کریں اسی لیے فرہاد بھی دھوکہ کھا گیا ہے۔ اگر میری صحیح عمر کا راز کھلا تو یہ دو لاکھ روپے سہارا دیں گے۔" میں نے اس کی سوچ میں کہا:

"دولت کے باوجود مجھے اپنے آپ کو بھی ہر طرف سے حتی الامکان جاذب نظر بنا کر رکھنا چاہیے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے کہیں گیا ہے۔ اب آتا ہی ہو گا مجھے اپنے چہرے کی ٹوٹ پھوٹ کو درست کر لینا چاہیے۔"

وہ فوراً ہی بستر سے اٹھ کر آئینے کے سامنے آ گئی اور ہر زاویے سے اپنا جائزہ لینے لگی۔ آئینہ کبھی کسی سے یہ نہیں کہتا کہ تم بوڑھی ہو چکی ہو۔ وہ اتنی سچائی سے جھوٹ بولتا ہے کہ دنیا جہان کا تجربہ رکھنے والی عورتیں بھی اس کے فریب میں آ جاتی ہیں۔ آئینے کے ساتھ ساتھ میں بھی اسے فریب دے رہا تھا۔ "میں سولہ برس کی ہوں۔" وہ آئینے کے سامنے جھجکتی ہوئی بولی:

"نن۔ نہیں۔ یہ تو سفید جھوٹ ہو جائے گا۔ فرہاد یقین نہیں کرے گا۔ کل میں ایک جگہ شاپنگ کر رہی تھی ایک نوجوان میرے قریب سے یہ کہتا ہوا گذر گیا تھا "بوڑھی گھوڑی لال لگام" میرا بس چلتا تو اس کا منہ نوچ لیتی۔"

میں نے اس کی سوچ میں کہا:

"میں اب بھی اس کا منہ نوچ سکتی ہوں۔ یہاں سے باہر نکلنے کے بعد کتنے ہی ایسے نوجوان مل سکتے ہیں جو طنزیہ انداز میں میرے پیچھے ہوتے ہوئے میک اپ کو دیکھتے ہیں میں ان کا گریبان پکڑ کر انہیں یقین دلاؤں گی کہ میں سولہ برس کی ہوں۔ میں سولہ برس کی ہوں . . . ."

میں مسلسل اس کی سوچ میں چیخنے لگا۔ اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ بالوں کو اپنی مٹھیوں میں جکڑنے لگی اور بدحواسی میں چیخنے لگی

"میں سولہ برس کی نہیں ہوں۔"

"تو پھر میں بوڑھی ہوں۔"

"نہیں میں بوڑھی نہیں ہوں۔"

"کیسے نہیں ہوں؟ عورت کبھی سولہ برس سے آگے نہیں بڑھتی اگر بڑھ جائے تو بڑھاپے کا خیال آسیب کی طرح پیچھا کرتا ہے۔ دو میں سے کوئی ایک بات ہے۔ یا تو میں بوڑھی ہوں یا پھر جوان ہوں۔ اور جوان ہونے کے لیے سولہ برس کی عمر بے حد لازمی ہوتی ہے۔"

اس کی سوچ نے تھک ہار کر کہا:

"ہاں میں سولہ برس کی ہوں۔"

میں نے پھر اسے پاگل پن کے لیے اکسایا۔

"میں باہر جا کر دنیا والوں کو یقین دلاؤں گی کہ میں جوان ہوں۔"

"نہیں نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔"

"میں ایسا ضرور کروں گی۔ اگر نہ کروں تو بوڑھی کہلاؤں گی۔ میں باہر جاؤں گی۔ میں باہر جا رہی ہوں۔"

وہ بے اختیار باہر جانے کے لیے گھوم گئی۔ میری خاموشی کے وقفے میں اس نے اپنے قدموں کو باہر جانے سے روکنا چاہا۔ مگر میں رہ رہ کر اس کے دماغ کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ اس کی سوچ کو الٹ پلٹ رہا تھا۔ وہ کبھی رکتی تھی اور پاگلوں کی طرح جنون کی حالت میں آگے بڑھ جاتی تھی۔ کالج سے باہر آ کر وہ کار میں بیٹھ گئی اور اسے اسٹارٹ کر کے نوجوانوں کی تلاش میں نکل گئی۔ اب اس کا دماغ اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ وہی کر رہی تھی جو میں چاہتا تھا۔ پاگل پن کی حالت میں وہ کالج کو کھلا چھوڑ گئی تھی۔ میں کالج میں داخل ہو کر اس کے کمرے میں آیا۔ اس کے سوٹ کیس کو کھولا اور ایک چھوٹی سی اٹیچی خالی کر کے اس میں نوٹوں کی گڈیاں رکھنے لگا۔ نوٹوں کی گڈیاں تہ در تہ جمانے کے بعد میں نے اس پر اپنا ایک سوٹ رکھ دیا۔ پھر اس اٹیچی کو لے کر کالج سے باہر آ گیا۔ اس دوران میں فیروزہ کے دماغ میں ہلچل مچاتا جا رہا تھا۔ وہ کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ میری سوچ اسے محتاط ہو کر ڈرائیو کرنے کی ہدایت بھی دیتی تھی۔ ایک جگہ چند نوجوان ہنستے کھلکھلاتے سڑک کے کنارے چلے جا رہے تھے۔ میری سوچ نے ان کے قریب پہنچ کر فیروزہ کی کار رکوا دی۔ نوجوانوں نے اس کی جانب دیکھا تو فیروزہ میری ہدایت کے مطابق انہیں آنکھ مار کر مسکراتی ہوئی بولی:

"آئی ایم انڈر سویٹ سکسٹین۔"

کتنے ہی نوجوان حیرت اور مسرت سے سیٹیاں بجانے لگے۔ انہوں نے چاروں طرف سے اس کی کار کو گھیر لیا۔ ایک نوجوان نے شوخی سے کہا:

"جان من اگر تم سولہ برس کی ہو تو ابھی ہم پیدا نہیں ہوئے ہیں۔"

دوسرے نوجوان نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا:

"میں تو پیدا ہو چکا ہوں۔ مجھے بہت عرصے سے تاریخی کھنڈرات دیکھنے کا شوق تھا۔ آؤ ہم کسی ویرانے میں چلیں۔ میں سولہ برس کے کھنڈر کی سیر کروں گا۔"

وہ فیروزہ کو دوسری سیٹ کی طرف ہٹا کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے تمام ساتھی پچھلی سیٹ پر آ گئے کیونکہ کھنڈرات کی سیر باجماعت کی جاتی ہے۔

انہوں نے کار کو دوسرے راستے پر موڑ دیا۔ وہ راستہ انہیں کسی ویرانے کی طرف لے جاتا ہو گا۔ مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ وہ اسے کہاں لے جائیں گے۔ میں اس سے بہت دور نکل جانے تک اسے پاگل بنائے رکھنا چاہتا تھا۔ میں ایک بار پھر پنڈی کی طرف جا رہا تھا۔ دو لاکھ حاصل کرنے کے بعد میں ماسٹر یوشے کی پہنچ سے بہت دور جا سکتا تھا۔ کیونکہ آج وہ کسی وقت یہاں پہنچنے والا تھا۔ مگر ہم دونوں ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے لیے فاصلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ماسٹر یوشے جب یہاں پہنچے تو میں اس کے قریب ہی رہوں اور اسے اتنا موقع نہ دوں کہ وہ مجھے پہچان سکے۔ میں نے چہرے پر سے ماسک اور آنکھوں سے کانٹیکٹ لینس نکال لیا تھا اس لیے رومابھی اب مجھے نہیں پہچان سکتی تھی۔

پنڈی پہنچنے تک میں نے فیروزہ سے ذہنی رابطہ قائم رکھا۔ اس دوران وہ تمام نوجوان اسے ایک ویرانے میں لے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے اس کی کیا درگت بنائی تھی۔ میں قلم کی نوک سے اس کی تفصیل بیان نہیں کرنا چاہتا بس اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ انہوں نے اس کھنڈر کو اور زیادہ کھنڈر بنا دیا تھا۔ اسے اس طرح نوچا کھسوٹا تھا کہ وہ سچ مچ پاگل ہو گئی تھی کبھی چیخ رہی تھی کبھی قہقہے لگا رہی تھی۔ نوجوانوں نے اس کے بدن سے زیورات اتار کر اور اس کی انگلی سے ہیرے کی انگوٹھی نکال کر اسے ایک ڈھلان کی طرف دھکا دے دیا تھا۔ وہ اتنی ذلتیں اٹھا چکی تھی کہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ اب وہ خود کو نہیں سمجھ رہی تھی کہ وہ کون ہے اور کتنے دولت مند تاجر کی بیوی ہے؟ وہ معصوم ثمر کو دوا کے ذریعے پاگل بنانا چاہتی تھی۔ مگر حالات نے اسے دوا کے بغیر ہی سچ مچ پاگل بنا دیا تھا۔ مجھے اس پر ذرا بھی ترس نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بڑی حقارت سے اس سے رابطہ ختم کر دیا۔

میں نے پنڈی پہنچ کر انٹر کان میں ہی ایک کمرہ حاصل کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ماسٹر یوشے بھی اسی ہوٹل میں آ کر قیام کرے گا اور روما کا کمرہ تو پہلے ہی وہاں ریزرو تھا۔ میں نے اس کے باڈی گارڈ کو دیکھا جس سے پرسوں رات میں نے روما کے کمرے میں نسوار کی ڈبیہ لی تھی۔ وہ میرے سامنے سے گذرنے کے بعد بھی مجھے پہچان نہ سکا تھا۔

میں کمرے میں اٹیچی رکھنے کے بعد ڈائننگ ہال میں آ گیا۔ پھر کھانے کا آرڈر دینے کے بعد سعید احمد کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ سعید احمد کو میری ہدایت کے مطابق ثمر کے ساتھ پاگل خانے جانا چاہیے تھا مگر اسلام آباد سے گزرتے وقت انہوں نے سوچا کہ اپنا ایک فرض ادا کرتے جائیں یعنی وہ انٹیلی جنس کے دفتر جا کر اس مائیکرو فلم کو ایک سینئر آفیسر کے حوالے کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے وہ اس وقت انٹیلی جنس کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے اور ایک سینئر افسر سے کہہ رہے تھے۔

"میں ایک ماہ کی چھٹی پر ہوں۔ کل ایک مائیکرو فلم میرے ہاتھ لگی ہے میں ابھی ڈیوٹی پر جانا نہیں چاہتا۔ اس لیے یہ مائیکرو فلم آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ آپ مجھے اس کی رسید دے دیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے وہ مائیکرو فلم نکالی اور سینئر آفیسر کے سامنے میز پر رکھ دی۔ آفیسر نے اسے اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے پوچھا

"اس میں کیا ہو سکتا ہے؟ کہیں اس میں ہمارے ملک کا کوئی راز تو نہیں ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔ آپ اسے لیبارٹری میں بھیج کر ڈیویلپ کرائیں تو پتہ چل جائے گا۔"

سینئر آفیسر نے اس فلم کو سیف میں رکھنے کے بعد وصولی کی ایک رسید لکھ دی۔ اتنے میں وہاں ایک ماتحت نے آ کر سعید احمد سے کہا:

"سر! یہاں کے تھانے کا انچارج آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

سعید احمد نے کہا کہ اسے یہاں بھیج دیا جائے۔ ماتحت باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک تھانے دار وہاں آیا۔ اس نے سلام کرنے کے بعد کہا۔

"یہاں کے تمام تھانوں میں پشاور پولیس ہیڈ کوارٹر سے اطلاع بھیجی گئی ہے کہ چار ہزار بیالیس نمبر کی ایک کار چوری ہو گئی ہے اور اس کا مالک بھی لاپتہ ہو گیا ہے۔ کار کے مالک کا نام بیل منڈو ہے۔ وہ اٹلی کا باشندہ ہے۔ پہلے وہ کراچی سے پنڈی آیا پھر اپنی بھتیجی روما کے ساتھ پشاور گیا۔ روما نے یہ رپورٹ لکھوائی ہے اور پولیس والوں کے پیچھے چیختی پھر رہی ہے کہ اس کے انکل اور اس کی کار کا پتہ چلایا جائے۔"

یہ باتیں سن کر سعید احمد اندر ہی اندر گھبرانے لگے تھے میں بھی پریشان

ہوگیا کہ بیل منڈو اور اس کی کار کی گمشدگی کے سلسلے میں وہ تھانیدار صحیح آدمی تک کیسے پہنچ گیا؟ سعید احمد نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے تھانیدار سے پوچھا۔

"آپ اس سلسلے میں مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔ آپ یہاں تشریف رکھیں۔"

تھانیدار نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا:

"ہمیں بیل منڈو کی وہ کار جہلم کے ایک نواحی علاقے میں ملی ہے وہ کار سڑک کے کنارے ایک درخت سے ٹکرا گئی تھی۔ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دو آدمی حادثے کے وقت ہی مر گئے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا ہے اس کا نام جعفر ہے۔ جعفر سے حقیقت اگلوائی گئی ہے کہ وہ کار ان لوگوں نے کہاں سے حاصل کی تھی؟"

تھانیدار نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

"جعفر نے بیان دیا ہے کہ ان لوگوں نے ڈکیتی کے مقصد کے لیے وہ کار جہلم کے ایک ہوٹل کے سامنے سے حاصل کی تھی۔ اس ہوٹل میں دو شخص اپنی اپنی کار میں آئے تھے۔ ایک شخص بیل منڈو کی کار نمبر چار ہزار بیالیس میں تھا دوسرا شخص کار نمبر سات ہزار تین سو بتیس میں تھا۔ ابھی میں نے اس دفتر کے باہر وہی سات ہزار تین سو بتیس نمبر کی کار کھڑی ہوئی دیکھی ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس کار کے مالک آپ ہیں۔ اب آپ ہی ہمیں بتا سکتے ہیں کہ بیل منڈو کی کار نمبر چار ہزار بیالیس کو جہلم تک ڈرائیو کر کے لانے والا آپ کا وہ ساتھی کون ہے؟"

سعید احمد ذرا دیر کے لیے چکرا گئے کہ کیا جواب دیں چکر تو مجھے بھی آ رہے تھے۔ ہم کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ بیل منڈو کی کار کے حادثے کے بعد جعفر پولیس والوں کے ہتھے چڑھ جائے گا اور اس کم بخت کو سعید صاحب کی کار کا نمبر یاد ہوگا۔ اور اس طرح پولیس والے ہم تک پہنچ جائیں گے۔ مجھے پولیس والوں کا اتنا ڈر نہیں تھا کیونکہ سعید احمد ان سے منٹ لیتے مجھے تو ماسٹر یوشے کی طرف سے خطرہ تھا۔ میں نے فوراً ہی اس شیطان کے دماغ کی طرف چھلانگ لگائی۔

اف میں بھی بعض اوقات کیسی حماقتیں کرتا ہوں۔ میں دو لاکھ روپے حاصل کرنے اور فیروزہ کو پاگل بنانے کے سلسلے میں اس قدر مصروف ہو گیا تھا کہ صرف سات گھنٹے تک ماسٹر یوشے سے غافل ہو گیا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ آج رات کو کسی وقت پہنچے گا مگر اس وقت اس کا جہاز پنڈی ایرپورٹ پر لینڈ کر رہا تھا۔ اور وہ پشاور کے پولیس افسروں سے لے کر اسلام آباد کے پولیس افسروں تک سب کے ذہن سے چھلانگ لگاتا ہوا اس تھانیدار کے دماغ میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اور اب اس کے ذہن سے نکل کر سعید احمد کے ذہن میں جھانک رہا تھا۔

میں سوچتا ہی رہ گیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اتنی سی دیر میں ماسٹر یوشے بازی لے گیا۔ اس نے فوراً ہی سعید احمد کی سوچ کو پڑھا تو وہ ...

رہے تھے۔

"میں تھانیدار کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ میرا وہ ساتھی فرہاد ان دنوں میرے ساتھ مری میں ہے۔ کاش کہ اس وقت فرہاد سے ذہنی رابطہ قائم ہو جاتا۔ فرہاد کیا تم میرے ذہن میں جھانک رہے ہو؟"

سعید احمد کی سوچ نے کباڑا کر دیا۔ ماسٹر یوشے کے سامنے اس بات کی مکمل تصدیق ہو گئی کہ میں انسانوں کے ذہنوں کو پڑھنا جانتا ہوں اب سعید احمد کا دماغ ایسا ٹارگٹ بن گیا تھا جس پر نشانہ بازی کرنے کے لیے دو ٹیلی پیتھی جاننے والے بالکل تیار تھے۔

نہیں میں اپنے دماغ سے سوچ کی لہریں نشر کر کے سعید احمد کے دماغ تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اگر ایسا کرتا تو ماسٹر یوشے سوچ کی لہروں کو اپنی گرفت میں لے لیتا۔ میں پہلے ہی اعتراف کر چکا ہوں کہ ٹیلی پیتھی کے علم میں میں اس شیطان کے سامنے طفلِ مکتب ہوں۔ اسی لئے میں خاموش تماشائی کی طرح سعید احمد کے دماغ میں جھانکتا رہا۔

ماسٹر یوشے سعید احمد کو کنٹرول کرنے کے لئے وہی طریقہ اختیار کر رہا تھا جو کہ بیل منڈو کے لئے میں نے کیا تھا۔ یعنی جب ماسٹر یوشے گہری نیند سو رہا تھا تو اس وقت میں نے ماسٹر یوشے بن کر اسے ایک ویرانے میں بلایا تھا اور وہاں اس کا خاتمہ کیا تھا۔ ٹھیک اس طرح اب ماسٹر یوشے میری سوچ بن کر سعید احمد سے کہہ رہا تھا۔

"مسٹر سعید میں فرہاد بول رہا ہوں تم نے اس مائیکرو فلم کو کسی دوسرے افسر کے حوالے کیوں کیا ہے؟ اسے فوراً واپس لے لو؟"

سعید احمد نے ذرا حیرانی سے کہا۔

"کیا بات ہے فرہاد تم مجھے مسٹر سعید کہہ رہے ہو حالانکہ مجھے سعید صاحب کہا کرتے تھے۔"

ماسٹر یوشے کی سوچ نے ذرا موڈ میں آ کر کہا۔

"بھئی سعید صاحب میں اس وقت موڈ میں ہوں اور اس لئے موڈ میں ہوں کہ میرا دشمن اس ملک میں آ پہنچا ہے۔ ایسے خطرے کے وقت ہر دلیر انسان کو موڈ میں رہنا چاہیئے آپ فوراً میرے مشورے پر عمل کریں اور وہ مائیکرو فلم ان سے واپس لے لیں۔"

سعید احمد نے اس شیطان کے مشورے کو میرا مشورہ سمجھ کر فوراً ہی عمل کیا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے سینئر افسر سے کہا۔

"دیکھیئے حالات بدل گئے ہیں۔ یہ انسپکٹر صاحب ابھی کسی کار اور کار والے کی گمشدگی کے سلسلے میں مجھے ملوث کر رہے ہیں۔ بیشک میرا ایک ساتھی اس نمبر کی کار میں موجود تھا لیکن اس ساتھی سے بہت عرصہ بعد ملاقات ہوئی تھی۔ میں اس سے پوچھ نہ سکا کہ وہ کہاں سے آ رہا ہے میں نے سوچا کہ اطمینان سے بیٹھ کر اس سے اس کے حالات معلوم کروں گا۔ لیکن جہلم کے ایک ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد وہ فوراً ہی مجھ سے ... ہو کر لاہور کی طرف چلا گیا۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ لاہور کی

... طرف جاؤں اور ڈیوٹی پر بھی حاضر ہو جاؤں اور اپنے اس ساتھی کو بھی تلاش کروں۔ کیونکہ اسے تلاش کرنا اور قانونی طور پر پوچھ گچھ کرنا میرا ابھی ... ہے اب جب کہ میں لاہور جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں تو آپ یہ رسید ... کر وہ مائیکرو فلم واپس کر دیں میں اسے لاہور کے دفتر میں ڈپارٹمنٹ ... کر دوں گا۔"

اس کی باتیں سن کر سینئر افسر نے کوئی اعتراض نہیں کیا وہ اپنی ... سے اٹھا اور سیف کھول کر وہ فلم نکال لایا۔ سعید احمد سے اپنی دی ... رسید واپس لی اور مائیکرو فلم ان کے حوالے کر دی۔ میں بڑی ... سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ جس مائیکرو فلم کو میں نے دن رات کی ... جدوجہد کے بعد حاصل کیا تھا اور بیل منڈو جیسے خطرناک آدمی کو ... پیچھے دوڑتے رہنے پر مجبور کرتا رہا تھا۔ اب وہ فلم پھر ہاتھ سے ... جا رہی تھی اور میں مجبور تھا۔ اگر ذرا بھی مداخلت کرتا۔ سعید احمد کو ذرا ... اشارہ دیتا کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ ذرا سا اشارہ میری تباہی کا باعث ... جاتا۔ کیونکہ میں سمجھ رہا تھا کہ ماسٹر یوشے سعید احمد کو اسی لئے گھیر رہا ہے اور اسی لئے اپنا آلۂ کار بنا رہا ہے کہ میں پریشان ہو کر کسی نہ کسی وقت ... مداخلت کروں گا اور پھر اس کے ہتھے چڑھ جاؤں گا۔ میں بہت ... تھا اور اپنی اس حاصل کی ہوئی اس مائیکرو فلم کو بڑی آسانی سے ... یوشے کی طرف جاتے دیکھ رہا تھا۔ ماسٹر یوشے نے سعید احمد کو ... دی تھی کہ وہ ائرپورٹ کی طرف جائیں وہاں فرہاد سے ملاقات ہو ... گی۔ اب سعید احمد دفتر سے اٹھ کر ثمر کو ساتھ لے کر ائرپورٹ کی طرف ... رہے تھے۔ میں سوچتا ہی رہ گیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

میں حالات کی زنجیروں میں بری طرح جکڑ گیا تھا۔ وہ سعید احمد ... میرے عزیز ترین دوست تھے اب وہ ماسٹر یوشے کا آلۂ کار بن کر ... میرے دشمن بننے والے تھے۔

میں ہوٹل انٹرکان کے ڈائننگ ہال میں پریشان حال بیٹھا ہوا تھا۔ اس ہوٹل سے ذرا دور میرے چاروں ... دشمن پھیلے ہوئے تھے۔ ماسٹر یوشے خود ایرپورٹ پہنچ چکا تھا اور سعید احمد ثمر کے ساتھ ایرپورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ ماسٹر یوشے کی سوچ ... چلا کہ روما بھی پشاور سے اسی طرف آ رہی ہے۔ مجھے روما سے کوئی ... نہیں تھا کیونکہ میں نے ماسک اور آئی لنس اتار لئے تھے۔ اس وقت ... اصلی رنگ و روپ میں تھا۔ اس لئے روما مجھے پہچان نہیں سکتی تھی ... اگر سعید احمد ماسٹر یوشے کے ساتھ اسی طرف چلے آتے تو وہ اس کے ... میری شناخت کا ذریعہ بن جاتے۔

میرے لئے بڑی مشکل پیدا ہو گئی تھی۔ اگر میں ماسک لگا کر سعید احمد ... چاہتا تو روما مجھے پہچان لیتی اور اگر ماسک ہٹا کر سعید احمد کے ... آتا تو وہ ماسٹر یوشے کے لئے بڑی فرمانبرداری سے ایک آلۂ کار کا فرض انجام دیتے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو وہ شیطان انہیں ہمیشہ ذہنی عذاب میں مبتلا کرتا رہتا۔

میں نے فوراً ہی فیصلہ کیا کہ مجھے وہ ہوٹل چھوڑ دینا چاہیئے۔ ابھی وہاں آئے ہوئے صرف آدھا گھنٹہ گزرا تھا۔ میں نے بیرے سے جلدی سے بل لانے کے لئے کہا۔ جیسے ہی وہ بل لایا میں نے کھانا ادھورا چھوڑ دیا اور پیسے ادا کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرہ میں نے اندر سے بند کر لیا۔ ماسک اور کانٹیکٹ لینس نکالے اسکے بعد آئینہ کے سامنے آ کر میک اپ کرنے لگا۔ بوڑھے میک اپ مین کا دیا ہوا کچھ سامان میرے پاس موجود تھا اس کی مدد سے میں جلد ہی اپنے چہرے کو بدلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب اس روپ میں روما تو مجھے پہچان سکتی تھی مگر سعید احمد نہیں پہچان سکتے تھے۔

میں نے روما کے ذہن میں جھانک کر دیکھا کہ اس وقت وہ کہاں ہے پتہ چلا کہ وہ پنڈی سے آگے پچاس میل دور ہے۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔ میں نے اس کے باڈی گارڈ کے دماغ میں جھانک کر دیکھا جس سے نسوار کی ڈبیہ لی تھی اور جو مجھے پہچانتا تھا۔ وہ بھی روما کے کمرے میں بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ میں مطمئن ہو کر کمرے سے باہر آ گیا۔ فی الحال مجھے اس میک اپ میں پہچاننے والا کوئی نہ تھا۔ میں باہر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور اس سے ہوٹل دلشاد کی طرف چلنے کے لئے کہا۔ جب ٹیکسی آگے بڑھ گئی تو میں ماسٹر یوشے کی سوچ کو پڑھنے لگا۔ وہ لگیج روم سے اپنا سامان حاصل کر رہا تھا۔ ساتھ ہی سعید احمد سے دماغی رابطہ قائم کئے ہوئے تھا۔ اور ان سے کہہ رہا تھا۔

"سعید احمد صاحب! یہاں لگیج روم سے ایک ادھیڑ عمر کا شخص باہر آئے گا وہ نیلے سوٹ میں ملبوس ہے اور نیلے رنگ کی ٹائی لگائے ہوئے ہے اس کے ساتھ ایک حسین عورت ہے آپ اس کا پیچھا کریں۔"

سعید احمد نے سوچ کے ذریعہ پوچھا۔

"فرہاد تم کہاں ہو۔ میرے سامنے کیوں نہیں آتے؟"

ماسٹر یوشے کی سوچ نے کہا۔

"میں ابھی مجبور ہوں۔ میرا سب سے خطرناک دشمن سر پر آ پہنچا ہے۔ وہ جو نیلے رنگ کے سوٹ میں ہے! وہ ماسٹر یوشے ہے۔"

سعید احمد نے چونک کر کہا۔

"ماسٹر یوشے! فرہاد یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اتنے خطرناک دشمن سے میرا سامنا کرا رہے ہو۔ تم نے تو کہا تھا کہ تم خیال خوانی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکو گے۔ اگر اس نے مجھے ذہنی عذاب میں مبتلا کر کے اپنا آلۂ کار بننے پر مجبور کیا تو پھر کیا ہوگا۔"

ماسٹر یوشے نے فرہاد بن کر انہیں سمجھایا۔

"آپ فکر نہ کریں میں خیال خوانی میں اس شیطان کا مقابلہ نہیں کروں گا، بلکہ چپ چاپ آپ کے خیال میں جھانکتا رہوں گا۔ اور اس کی سرگرمیوں سے واقف ہوتا رہوں گا۔ جب بھی مجھے موقع ملے گا۔ میں اسے ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں گا۔ آپ اطمینان رکھیں میں آپ کو نقصان نہیں پہنچنے دوں گا۔

جیسا میں کہہ رہا ہوں آپ ویسا ہی کرتے جائیں۔ جس جگہ وہ قیام کرے گا آپ بھی اس جگہ ٹھہر جائیں۔ اگر اس سے سامنا ہو جائے تو اس سے کترانے کی کوشش نہ کریں۔"

ماسٹر لوشے فرہاد بن کر بڑی خوبصورتی سے سعید احمد کو بیوقوف بنا رہا تھا۔ اور میں بڑی مجبوری سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح ، اشارتاً ہی سعید احمد کو یہ سمجھا دیتا کہ وہ شیطان میرے نام سے فائدہ اٹھا کر انہیں اپنا آلۂ کار بنا چکا ہے۔

ہوٹل دلشاد میں پہنچ کر میں نے وہاں ایک کمرہ کرائے پر حاصل کیا اور خود کو اس کمرے میں قیدی بنا کر بیٹھ گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک حالات سازگار نہیں ہوں گے میں اس کمرے سے نہیں نکلوں گا اور نہ ہی کسی اجنبی سے ملاقات کروں گا۔ اب میرا کام یہی رہ گیا تھا کہ میں چپ چاپ ایک جگہ بیٹھ کر اس شیطان کی منصوبہ بندی کو پڑھتا رہوں۔

اس وقت چونکہ ماسٹر لوشے مسلسل سعید احمد کے ذہن میں جھانک رہا تھا۔ اس لئے میں اپنی جگہ خاموش بیٹھا ہوا صرف اس کی سوچ کو پڑھ سکتا تھا۔ اس وقت سعید احمد کے ساتھ کھڑی ہوئی ثمر نے ان سے کہا۔

"آپ میرے ساتھ پاگل خانے کیلئے نکلے تھے۔ راستے میں ارادہ بدل کر اٹیلی جینس کے دفتر چلے گئے۔ وہاں سے پھر پروگرام بدل کر ایئرپورٹ کی طرف لوٹ گئے۔ اب یہاں لگیج روم کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا چکر ہے۔ آپ نے تو کہا تھا کہ فرہاد بھائی ڈیڈی کے پاگل پن کو دور کر دیں گے۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ ہم جلد از جلد پاگل خانے پہنچیں اور میرے ڈیڈی ذہنی طور پر صحت یاب ہو جائیں؟"

سعید احمد نے بڑی محبت سے ثمر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا

"گھبراؤ نہیں ثمر تمہارے ڈیڈی جلد ہی اچھے ہو جائیں گے۔ میں اس وقت اپنے فرائض سے مجبور ہوں۔ یہاں ایک مجرم کی تلاش میں آیا ہوں۔

اگر وہ مل گیا تو میں اس کا پیچھا کروں گا۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ کہاں جاتا ہے جب اس کی قیام گاہ کا علم ہو جائے گا، تو پھر میں تمہیں لے کر پاگل خانے جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر سعید احمد بڑی توجہ سے لگیج روم کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک ادھیڑ عمر کا انگریز نیلے سوٹ میں ملبوس وہاں سے باہر آ رہا تھا اس کے ساتھ ایک جوان عورت تھی۔ اس عورت کا جغرافیہ کیا تھا، یہ میں معلوم نہ کر سکا۔ کیونکہ سعید احمد کی توجہ ماسٹر لوشے پر تھی۔ ماسٹر لوشے بھی اپنی ساتھی عورت کو نظر انداز کئے ہوئے تھا۔ اور اس کے ساتھ جو عورت تھی وہ بھی ماسٹر لوشے کو مخاطب نہیں کر رہی تھی۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ اس کا ادھیڑ عمر ساتھی اہم کاموں میں مصروف رہتا ہے اس لئے اسے اس کی اجازت کے بغیر مخاطب نہیں کرنا چاہیئے۔

ماسٹر لوشے نے ایک ٹیکسی والے سے انٹرکان کی طرف جانے کے لئے کہا۔ اور اپنی ساتھی عورت کے ساتھ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تمام سامان ڈگی میں رکھوا دیا گیا پھر ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ اس وقت اس نے سوچ کے ذریعے کہا۔

"بیٹے فرہاد! میں اتنا نادان نہیں ہوں۔ اس بات کو سمجھ رہا ہوں کہ تم بیل منڈو کے ذریعے میری سوچ تک پہنچ چکے ہو۔ اور ہمیشہ میرے منصوبوں کو پڑھتے رہتے ہو۔ اب یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ تم بیل منڈو کے حملوں سے کس طرح بچ جایا کرتے تھے۔ یعنی میری ہی سوچ کے ذریعے اس کے تمام منصوبوں سے بچ نکلتے تھے۔ اب بھی مجھے یقین ہے کہ تم میری سوچ کو مسلسل پڑھے جا رہے ہو۔ اور یہ دیکھے جا رہے ہو کہ میں تمہارے عزیز دوست سعید احمد کو کس طرح کنٹرول کر رہا ہوں۔ تم بہت مجبور ہو۔ اسے یہ نہیں سمجھا سکتے کہ وہ میرا آلۂ کار بن چکا ہے۔ مگر کب تک تم خاموش تماشائی کی طرح چھپے رہو گے۔ میں تمہارے دوست سعید احمد کو اور اس کی محبوبہ ثمر کو ایسے مقام پر لے آؤں گا، جہاں تم مجھ سے ٹکرانے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ نہیں ٹکراؤ گے تو سعید احمد اور ثمر کو سسک سسک کر مرتے دیکھو گے۔ میں تمہاری اطلاع کے لئے یہ بھی کہہ دوں کہ تم میرے کسی بھی منصوبے کو اب نہیں پڑھ سکو گے۔ کیونکہ اب میں اپنی مادری زبان انگریزی میں بھی نہیں سوچوں گا۔ جب مجھے منصوبہ بنانا ہوگا تو میں اجنبی زبان میں سوچوں گا۔ اور اپنی ساتھی سے اسی زبان میں گفتگو کروں گا۔ لو سنو! میں اپنی ساتھی عورت کو ہدایات دے رہا ہوں۔ سمجھ سکتے ہو تو سمجھ لو۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی ساتھی عورت سے مخاطب ہوا۔ واقعی وہ ایسی زبان بول رہا تھا جس سے میں واقف نہیں تھا۔ میرے پلے کچھ نہ پڑا کہ وہ کیا بول رہا ہے۔ لیکن اس سے باتیں کرنے کے دوران یہ پتہ چلا کہ وہ اسے مادام کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔

مادام تو ایسی عورت کو کہا جاتا ہے جو سوسائٹی میں بہت باعزت ہو یا پھر کوئی اس قسم کی عورت ہو یا کوئی زبردست صلاحیت کی مالک ہو یعنی اس عورت کی کوئی خاص اہمیت تھی۔ تبھی ماسٹر لوشے اسے مادام کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ میری سمجھ میں یہی آیا کہ چار ماسٹروں کے درمیان کچھ ایسی عورتیں بھی ہیں جو خاص صلاحیتوں کی مالک ہیں۔ ان میں سے ایک یہ مادام ہے جو اس وقت بظاہر ایک ساتھی بن کر ماسٹر لوشے کے ساتھ یہاں آئی ہے لیکن وہ بھی کسی نہ کسی طرح مجھے گھیرنے کی کوشش کرے گی۔ لہٰذا مجھے اس کی طرف سے بھی محتاط رہنا پڑے گا۔

کچھ دیر تک مادام سے گفتگو کرتے رہنے کے بعد ماسٹر لوشے نے انگریزی زبان میں سوچ کر کہا۔

"کہو فرہاد! کچھ سمجھ میں آیا کہ میں نے کیا باتیں کی ہیں۔ نہیں مجھے یقین ہے کہ تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتے اب تم برابر میرے ذہن میں جھانکتے رہو پھر بھی میری

سوچ کے ذریعے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکو گے۔"

اس دنیا میں ایک سے ایک بڑھ کر دماغ کے کھلاڑی موجود ہیں جو ہر وقت اپنی ذہانت کو استعمال کرنے کا طریقہ جانتے ہیں۔ ایک وقت تھا جب بیل منڈو سے میرا سامنا ہوا تھا اور ماسٹر لوشے اس کے دماغ کے ذریعے میرے دماغ تک پہنچنا چاہتا تھا، لیکن اس وقت میں نے چہرے پر ماسک چڑھا رکھے تھے اور آنکھوں پر کنٹیکٹ لینس کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے ماسٹر لوشے کے لئے تمام راستے مسدود کر دیئے تھے۔ وہ کسی طرح بھی میرے دماغ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس وقت ماسٹر لوشے نے بھی میرے سامنے ایک اجنبی زبان کی دیوار کھڑی کر دی تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ میرے لئے گونگا بن گیا تھا۔ میں اس کی گونگی زبان کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اور نہ ہی اس کے منصوبوں کو آئندہ پڑھ سکتا تھا۔

اب میرا کام یہی رہ گیا تھا کہ چپ چاپ دماغ کی اسکرین پر ان کے تماشے دیکھتا رہوں۔ آدھ گھنٹے بعد وہ انٹرکان میں اپنے اور مادام کے لئے دو کمرے حاصل کر چکا تھا۔ اور اپنے کمرے میں بیٹھا سعید احمد کو گائیڈ کر رہا تھا۔ سعید احمد بھی اس کا پیچھا کرتے ہوئے اس ہوٹل تک پہنچ گئے۔ اب اس انتظار میں تھے کہ میں ماسٹر لوشے کے سلسلے میں کچھ مشورہ دے سکوں۔ میں کیا مشورہ دیتا وہ تو اب تک ماسٹر لوشے کے ہاتھوں میں ناچتے رہے تھے۔ ماسٹر لوشے نے سوچ کے ذریعہ ان سے کہا۔

"سعید صاحب! اب آپ کاؤنٹر پر جا کر ماسٹر لوشے کے کمرے کا نمبر معلوم کریں اور پھر کمرے میں جا کر اس کا پاسپورٹ وغیرہ طلب کریں اور یہ دیکھیں کہ وہ کس طرح یہاں آیا ہے یعنی کس نام سے آیا ہے اور کس مقصد کے لئے یہاں آیا ہے؟"

سعید احمد نے ذرا پریشان ہو کر کہا۔

"فرہاد! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اتنے خطرناک شیطان سے اس طرح کیوں ٹکرانا چاہتے ہو۔ میں اس کے سامنے جاؤں گا۔ اس سے پاسپورٹ وغیرہ طلب کروں گا تو کیا وہ میرے ذریعے تم تک نہیں پہنچے گا۔"

ماسٹر لوشے نے سوچ کر کہا۔

"سعید صاحب آپ پریشان نہ ہوں میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اب میں زیادہ دنوں تک اس شیطان سے دور نہیں بھاگ سکتا۔ ایک نہ ایک دن تو مجھے اس سے ٹکرانا ہی تھا۔ لہٰذا آج یہ ٹکراؤ ہو جائے آپ بے فکر رہیں آپ کو میری صلاحیتوں پر اعتماد کرنا چاہیئے۔ اس لئے میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ بلا جھجک اس کے کمرے میں پہنچ جائیں۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں اس شیطان سے نمٹنے کے لئے پوری طرح تیار ہوں۔"

"مگر فرہاد، یہ تو سوچو اس وقت میرے ساتھ ثمر ہے۔ میں اس کی موجودگی میں کسی خطرے کا سامنا کیسے کر سکتا ہوں۔"

"آپ ثمر کی فکر نہ کریں اسے گیلری میں بیٹھنے کے لئے کہیں۔ وہ کوئی ٹھنڈا مشروب پیتی رہے گی۔ دیکھئے آپ دیر نہ کریں جلدی ماسٹر لوشے تک پہنچنے کی کوشش کریں۔"

سعید صاحب نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ انہوں نے ثمر سے جا کر کہا کہ وہ گیلری میں جا کر ان کا انتظار کرے، وہ تھوڑی دیر بعد وہاں آ جائیں گے۔ ثمر گیلری کی طرف چلی گئی اور سعید صاحب کاؤنٹر پر جا کر اس انگریز کا نام اور کمرہ معلوم کرنے لگے جو نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا اور ایک عورت کے ساتھ ریسیپشن روم سے ہو کر گزرا تھا۔ اس کا کمرہ نمبر معلوم کرنے کے بعد وہ لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پر پہنچ گئے۔ اور وہاں جا کر اس کے دروازے پر دستک دی۔

ماسٹر لوشے ان کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ دستک سنتے ہی دروازہ کھول دیا۔ پہلے تو انجان بن کر اس کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر اس نے مسکرا کر انہیں کمرے میں آنے کے لئے کہا۔ سعید احمد کمرے میں داخل ہو گئے وہ انٹیلی جینس کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنا تعارف کرانا چاہتے تھے مگر اس تعارف سے پہلے ہی ماسٹر لوشے نے دروازے کو اندر سے بند کر کے مسکرا کر کہا۔

"سعید صاحب تعارف کی کیا ضرورت ہے۔ تعارف تو دو اجنبیوں کے درمیان ہوتا ہے اور ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ کیا آپ مجھے نہیں جانتے؟"

سعید احمد چونک کر حیرانی اور پریشانی سے اسے دیکھنے لگے پھر انہوں نے پوچھا۔

"تم مجھے کیسے جانتے ہو؟"

ماسٹر لوشے نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"سعید صاحب ذرا آرام سے بیٹھیے تاکہ اطمینان سے گفتگو ہو سکے۔ میں آپ کو سب کچھ بتائے دیتا ہوں۔"

سعید احمد نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں تم سے جو کچھ پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔ تم مجھے کس طرح جانتے ہو؟"

ماسٹر لوشے نے بدستور اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ خواہ مخواہ غصہ دکھا رہے ہیں۔ میں آپ کے ملک میں مہمان ہوں۔ کیا مہمانوں سے اسی طرح گفتگو کرتے ہیں؟"

انہوں نے غصے سے کہا۔

"تم مہمان نہیں شیطان ہو۔ میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم یہ بتاؤ تم مجھے کس طرح جانتے ہو؟"

ماسٹر لوشے نے پھر ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جب تک آپ اطمینان سے بیٹھ کر گفتگو نہ کریں گے، مجھ سے اپنے سوال کا جواب نہیں پائیں گے۔ اگر آپ اپنے افسرانہ رعب اور دبدبے سے کام لینا چاہتے ہیں تو اپنے تمام اثر و رسوخ اور اپنی تمام طاقت کو استعمال کر کے دیکھ لیں

کوئی فائدہ نہ ہوگا۔"

سعید احمد نے غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے اسے دیکھا پھر آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لینا چاہتے تھے مگر اس سے پہلے ہی ماسٹر لوتشے ان کی سوچ سے ان کے ارادے کو سمجھ چکا تھا۔ جیسے ہی وہ گریبان پکڑنے کے لیے آگے بڑھے' ویسے ہی اچانک اس نے انکے دماغ میں گھونسہ سا مار دیا۔ وہ لڑکھڑا کر ایک دم سے پیچھے گئے۔ اس وقت ماسٹر لوتشے نے ان کی سوچ میں کہا

"میں پیچھے کی طرف لڑکھڑا رہا ہوں۔ میرے پیچھے گہری کھڈ ہے میں گر رہا ہوں۔"

اس سوچ کے ساتھ ہی وہ پیچھے کی طرف گر پڑے۔ ماسٹر لوتشے برابر کہتا جا رہا تھا۔

"میں دائیں طرف لڑھکتا جا رہا ہوں۔ لڑھکتا جا رہا ہوں۔۔۔"

وہ دائیں طرف لڑھکتے گئے۔ اسی طرح وہ ماسٹر لوتشے کی سوچ کے مطابق بائیں طرف الٹ پلٹ ہوتے گئے۔ تھوڑی دیر تک وہ انہیں اسی طرح پریشان کرتا رہا اور ان کے دماغ میں طرح طرح سے ہلچل مچاتا رہا۔ پھر وہ خاموش ہو گیا اس کے ساتھ ہی سعید صاحب بھی فرش پر لیٹے لیٹے بے حس و حرکت ہو کر ہانپنے لگے اور بوکھلا کر چھت کو گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر تک ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کے ساتھ کیا ہو گیا اور وہ اس وقت کہاں ہیں۔ پھر وہ جلد ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور اپنے سامنے کھڑے ماسٹر لوتشے کو وحشت زدہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ماسٹر لوتشے نے مسکرا کر کہا۔

"مسٹر سعید! یہ میرے کمالات کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ فرہاد سے تمہاری دوستی ہے۔ لہٰذا اس نے تمہیں بتایا ہوگا کہ میں کس طرح اپنے علم کے ذریعے تمہیں پاگل بنا سکتا ہوں۔ تم قانون کا سہارا لینا چاہو گے۔ میرے خلاف رپورٹ درج کرانا چاہو گے تو میں تمہیں اتنی مہلت نہیں دوں گا۔ اگر تم نے میری غفلت سے فائدہ اٹھا کر میرے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی کوشش کی تو میں تمہیں ذہنی عذاب میں مبتلا کر دوں گا۔ اگر تم ابھی اطمینان سے باتیں کر سکتے ہو تو اٹھو اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ ورنہ یاد رکھو کہ تمہاری محبوبہ اس وقت گیلری میں موجود ہے۔ سنا ہے کہ مشرق کی لڑکیاں بڑی باحیا ہوتی ہیں۔ اپنے سر سے دوپٹہ نہیں ہٹاتیں۔ میں یہاں سے بیٹھے بیٹھے اسے مجبور کر دوں گا کہ وہ اپنے جسم سے تمام کپڑے نوچ کر پھینک دے اور ننگی ہو کر تمام ہوٹل میں ناچتی پھرے

کیا تم اپنی محبوبہ کی بے حیائی پسند کرو گے؟"

سعید احمد دیدے پھاڑ پھاڑ کر اسے بڑی بے بسی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اور کر بھی کیا سکتے تھے؛ اس شیطان کی شیطانیت کو وہ ابھی دیکھ چکے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس کے بعد بھی وہ کیسی کیسی اذیتوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ ناقابل برداشت تھا کہ ثمر اس کی شیطانیت کا نشانہ بنتی۔ ایک معصوم لڑکی جو پہلے ہی باپ کے پاگل پن کی وجہ سے دکھ اور مصیبتیں اٹھا رہی تھی۔ اب وہ اسے پاگل ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

وہ چپ چاپ فرش پر سے اٹھ گئے اور ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گئے۔ ماسٹر لوتشے نے اپنا ایک ہاتھ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔

"لائیے۔ وہ مائیکرو فلم مجھے دیجئے۔"

اس وقت سعید صاحب کو پہلی بار مجھ پر غصہ آیا۔ وہ سوچنے لگے کہ فرہاد نے مجھے کیوں یہ مشورہ دیا کہ میں مائیکرو فلم واپس لے کر ایئرپورٹ کی طرف جاؤں اور ماسٹر لوتشے کا سامنا کروں۔ اب میں سعید صاحب کو کیسے سمجھا سکتا تھا کہ وہ مشورہ میں نے نہیں دیا تھا۔ ماسٹر لوتشے فرہاد بن کر ان کو بیوقوف بنا رہا تھا۔ میں مجبور تھا۔ بڑی بے بسی سے ان کی بے بسی کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن میں مایوس نہیں تھا۔ اپنے وقت کا انتظار کر رہا تھا۔

دوسری طرف ماسٹر لوتشے سعید احمد کو سوچتے ہوئے سن رہا تھا۔ اس نے پھر میرے خلاف چال چلی۔ وہ سعید احمد سے کہنے لگا۔

"مسٹر سعید! تم فرہاد کو اپنا بہت ہی عزیز دوست سمجھتے ہو۔ لیکن وہ بڑا مطلب پرست ہے۔ اپنے مفاد کے سامنے وہ دوستی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اپنے دوستوں کو بھی جہنم میں جھونک دیتا ہے اس کی زندہ مثال تمہارے سامنے ہے۔ تم خود ایک خطرے کو دعوت دینے کے لئے میرے پاس چلے آئے ہو۔ میں بہت دیر سے تمہارے ذہن کو پڑھ رہا ہوں اور خاموشی سے یہ دیکھتا آ رہا ہوں کہ فرہاد کس طرح تمہاری غلط رہنمائی کر رہا تھا۔ تم نے وہ مائیکرو فلم یہاں کے ایک سینئر افسر کے حوالے کی تھی۔ لیکن وہ بیوقوف فرہاد تمہیں یہ مشورہ دے رہا تھا کہ تم اس فلم کو لے کر ایئرپورٹ کی طرف جاؤ اور میرا سامنا کرو۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ جو کچھ تم سے کہتا آ رہا تھا اور جس طرح اس نے تمہیں میرا پیچھا کرنے کے لئے کہا تھا' وہ تمام باتیں میں سن رہا تھا۔ اور تم سے انجان بنا ہوا تھا۔ جب تم اس کمرے میں آئے تو میں نے تم پر یہ ظاہر کر دیا کہ نہ میں تمہارے لئے اجنبی ہوں اور نہ ہی تم میرے لئے اجنبی ہو۔ اب تم ٹھنڈے دماغ سے غور کرو کہ فرہاد نے تمہیں اور تمہاری محبوبہ کو کس مصیبت میں پھنسایا ہے؟"

سعید احمد کا ذہن اس کی باتوں میں الجھ کر رہ گیا۔ ان کے سوچنے سمجھنے کی اپنی تمام صلاحیتیں بالکل ہی بیکار ہو کر رہ گئیں۔ وہ اتنا بھی نہ سمجھ سکے کہ اگر میں ان سے ذہنی رابطہ قائم کرتا اور ان سے مائیکرو فلم واپس لے کر ایئرپورٹ کی طرف جانے کا مشورہ دیتا اور اس دوران ماسٹر لوتشے میرے مشورے کو ان کے دماغ کے ذریعے سنتا رہتا تو پھر وہ فوراً ہی میرے دماغ تک پہنچ جاتا۔ یہ بات شاید ایک آدھ بار میں نے سعید احمد کو سمجھائی تھی کہ ٹیلی پیتھی جاننے والے اس طرح ایک کے دماغ سے دوسرے کے دماغ تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت ماسٹر لوتشے نے ان کے دماغ کو اس بری طرح الجھا دیا تھا کہ وہ میری اس بات کو بھول گئے اور اس کی بات کا یقین کرنے لگے کہ واقعی میں نے اپنا مطلب نکالنے کے لئے اور کسی طرح ماسٹر لوتشے کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے انہیں آلۂ کار بنایا ہے اور اس طرح صرف ان کو ہی نہیں' ان کی محبوبہ ثمر کو بھی مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ وہ اس پہلو پر جتنا سوچتے جا رہے تھے اتنا ہی ان کو مجھ پر غصہ آ رہا تھا اور ان کے دل سے میری محبت کم ہوتی جا رہی تھی اور نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔

انسان کی عادت ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے سامنے کی چیز کو دیکھتا ہے اور جو کچھ پیچھے ہو اسے بھول جاتا ہے۔ ابھی سعید احمد کے سامنے ان کی محبوبہ ثمر کی زندگی کا سوال تھا اور اس کی شرم و حیا برقرار رکھنے کی فکر تھی اس لئے وہ ثمر کی خاطر ماسٹر لوتشے کی باتوں پر غور کر رہے تھے۔ اور میری باتوں کو بھول گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ماسٹر لوتشے کی باتوں سے مائل ہو گئے۔ انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر مائیکرو فلم نکالی اور اس کی طرف اسے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں آگئی ہیں۔ واقعی میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فرہاد مجھے اس طرح مصیبت میں پھنسائے گا۔ بہرحال میں نے زبردست دھوکہ کھایا ہے۔ یہ مائیکرو فلم وہی حاصل کر کے لایا تھا اور اسی مائیکرو فلم کے ذریعہ وہ مجھے یہاں پہنچا کر خود خاموش بیٹھا ہوا ہے۔ بہرحال اب میں ایک فرض شناس آفیسر کی حیثیت سے تم سے یہ کہوں گا کہ یہ مائیکرو فلم تم پھر مجھے واپس کر دو۔ اس لئے کہ یہ میرے ملک کی چیز ہے اور میں یہ کبھی گوارا نہیں کروں گا کہ یہ غلط ہاتھوں میں جائے۔"

ماسٹر لوتشے نے سامنے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تم کس حد تک فرض شناس ہو۔ تم کس حد تک محب وطن ہو۔ اس مائیکرو فلم کو حاصل کرنے کے لئے کتنی بڑی قربانی دے سکتے ہو؟"

"میں اس فلم کے لئے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔"

ماسٹر لوتشے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تمہاری جان کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف فرہاد کو چاہتا ہوں۔ تم مجھے فرہاد کا پتہ بتا دو اور یہ مائیکرو فلم واپس لے لو۔"

یہ کہہ کر اس نے مائیکرو فلم کو درمیانی میز پر رکھ دیا۔ سعید احمد اس فلم کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگے۔

"مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ میں نہیں جانتا کہ اس فلم میں اپنے ہی ملک کا کوئی راز ہے یا کسی دوسرے ملک کی اہم دستاویزات ہیں۔ مجھے ہر حال میں اس فلم کو حاصل کرنا ہے۔ میں ماسٹر لوتشے سے زبردستی نہیں کر سکتا۔ اس سے دشمنی کر کے اسے حاصل نہیں کر سکتا۔ کیا میں فرہاد کا پتہ بتا دوں؟"

یہ سوچتے ہی وہ کرسی پر پہلو بدلنے لگے۔ وہ بڑی الجھن میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اگرچہ ان کو مجھ پر زیادہ غصہ آ رہا تھا اور میرے خلاف نفرت پیدا ہوتی جا رہی تھی' پھر بھی انہیں میرے بہت سے احسانات یاد آ رہے تھے ــــ میرے خلوص اور میری دوستی کی بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں ــ

انہوں نے بڑی بے بسی سے ماسٹر لوتشے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔ اس کے بعد میں تمہاری بات کا جواب دوں گا۔"

ماسٹر لوتشے نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم کیا سوچو گے؛ جو سوچو گے اسے میں پڑھتا جاؤں گا۔ بہتر ہے کہ سوچنے کی بجائے زبان سے کہتے جاؤ۔ تمہارے سامنے ایک بہت بڑا فرض ہے۔ یہ مائیکرو فلم ابھی تمہارے ہاتھ آ سکتی ہے اور ابھی تمہارے ہاتھ سے نکل بھی سکتی ہے۔ اگر تم ایک فرض شناس آفیسر ہو۔ تمہیں اپنے ملک سے محبت ہے' تو ایک فرہاد کو نہ دیکھو۔ اگر دیکھو تو یہ سمجھو کہ وہ کتنا بڑا فراڈ ہے۔ وہ وقت آنے پر تمہارے ساتھ بھی فریب کر سکتا ہے اور اس نے تمہارے ساتھ فریب کیا ہے۔ عقل سے کام لو اور مجھے اس کا پتہ بتا دو۔ جیسے ہی وہ میرے قابو میں آئے گا۔ میں یہ مائیکرو فلم تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

اس وقت سعید احمد نے ایک اہم سوال کیا۔

"میں جانتا ہوں کہ فرہاد تمہاری سوچ کو پڑھتا رہتا ہے۔ کیا وہ اس وقت ہماری باتیں نہیں سن رہا ہوگا۔ اگر میں اس کا پتہ بتاؤں گا تو کیا وہ ہوشیار نہیں ہو جائے گا؟"

ماسٹر لوتشے نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"میں سب سمجھتا ہوں۔ اتنا نادان نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم اس کا پتہ بتاؤ گے تو وہ ابھی سے ہوشیار ہو جائے گا۔ اور وہاں سے کسی دوسری طرف نکل جائے گا۔ لیکن میرے ہاتھ میں ترپ چال کے لئے ایک پتہ ہے۔ میں اس پتے سے کام لوں گا۔ تم اس بات کی پرواہ نہ کرو کہ وہ مجھے ابھی کتنی دور دوڑائے گا۔ تم مجھے اس کا پتہ بتاؤ اور مجھے اس جگہ رہنمائی کرو جہاں وہ جا سکتا ہے یا کچھ وقت گزار سکتا ہے۔ میں ایسا کیوں چاہتا ہوں' یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔"

سعید احمد پھر تھوڑی دیر تک سوچتے رہے۔ وہ یہی سوچ رہے تھے کہ مائیکرو فلم حاصل کرنے کے لئے انہیں میرا پتہ دینا چاہیئے یا نہیں' آخر یہی بات سمجھ میں آئی کہ اگر وہ ماسٹر لوتشے کی بات نہیں مانیں گے تو مائیکرو فلم بھی ہاتھ نہیں آئے گی اور وہ ثمر کے ساتھ بھی برا سلوک کرے گا آخر مجبور ہو کر انہوں نے بتا دیا کہ جب وہ مری سے روانہ ہوئے تھے تو میں فیروزہ کے کاٹیج میں تھا۔

ان کی باتیں سن کر ماسٹر لوتشے نے کہا۔

"اچھی بات ہے ہم تھوڑی دیر بعد اس کاٹیج کی طرف جائیں گے ابھی میں دوستانہ انداز میں آپ کو ایک تکلیف دینا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میرا ایک کام کریں گے؟"

سعید احمد نے کہا۔

"ہاں! ضرور کروں گا۔ بتاؤ کیا کام ہے؟"

ماسٹر لوتشے نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے ایک سیر کچے گوشت کی ضرورت ہے۔ گوشت بے چربی زیادہ ہو تو بہتر ہے۔ میں یہاں اجنبی ہوں یہاں کے راستے جانتا نہیں ہوں۔

ورنہ بازار جاکر خود ہی خرید کرے آتا۔ کیا آپ یہ چیزیں میرے لئے خرید کر لاسکتے ہیں؟"

سعید احمد نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں تمہارا یہ کام کر دوں گا۔ لیکن مجھے مائیکرو فلم جلد از جلد ملنی چاہیئے۔"

ماسٹر لوشے نے انہیں یقین دلایا کہ وہ اپنے وعدے پر قائم رہے گا اور ٹھیک پر قابو پاتے ہی مائیکرو فلم ان کے حوالے کر دے گا۔ اس پر سعید احمد نے کہا۔

میرے سامنے ایک اور مسئلہ ہے۔ میں ابھی پاگل خانے کی طرف جارہا تھا۔ فرہاد نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ثمر کے ڈیڈی کا پاگل پن دور کر دے گا۔ اب یہ مسئلہ کھٹائی میں پڑ رہا ہے۔"

ماسٹر لوشے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"فرہاد اس پاگل کا پاگل پن کیا دور کرے گا۔ یہ کام میں چٹکی بجاتے کر سکتا ہوں۔ تم ثمر سے کہو وہ تنہا پاگل خانے جائے اور اپنے ڈیڈی سے ملاقات کرے۔ جب وہ اپنے ڈیڈی کا سامنا کرے گی تو میں اس کے ذہن سے چھلانگ لگا کر اس کے ڈیڈی کے پاگل دماغ تک پہنچ جاؤں گا اور اس کے بعد تم دیکھو گے میں اسے کس طرح ذہنی طور پر صحت یاب [illegible] بنا تا ہوں۔"

سعید احمد مطمئن ہو کر کمرے سے باہر نکل گئے اور اس گیلری کی طرف جانے لگے جہاں ثمر بیٹھی ہوئی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ میں ماسٹر لوشے کی اس بات پر غور کر رہا تھا کہ اس نے میرا پتہ معلوم کرنے کے بعد ایک سیر کچا گوشت کیوں منگوایا ہے۔ یعنی ایسا کچا گوشت جس میں ہڈیاں زیادہ ہوں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد سعید احمد بازار سے اس کی فرمائش کے مطابق ہڈیوں والا کچا گوشت لے آئے۔ انہوں نے ثمر کو پاگل خانے بھیج دیا تھا۔ اب وہ ماسٹر لوشے کے ساتھ اس مقصد سے لگے ہوئے تھے کہ انہیں مائیکرو فلم مل جائے گی۔ ماسٹر لوشے نے انہیں کمرے میں بیٹھنے کے لئے کہا۔ ہوٹل کے بیرے سے اس نے ایک سیر دودھ منگوایا۔ جب دودھ آگیا تو وہ ایک پلیٹ میں کچا گوشت۔ [illegible] کر اور دودھ کا برتن لے کر باہر چلا گیا۔ سعید احمد نہیں جانتے تھے کہ وہ کہاں گیا ہے۔ وہ اپنے بازو والے کمرے میں گیا تھا، جہاں مادام بیٹھی ہوئی تھی۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے اجنبی زبان میں گفتگو شروع کر دی جو میرے پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ لیکن ماسٹر لوشے جو کچھ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، اسے اپنی عادت سے مجبور ہو کر کبھی کبھی انگریزی میں سوچ رہا تھا، جس کے باعث مجھے یہ پتہ چل رہا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ماسٹر لوشے نے گوشت کا پیکٹ جاکر ایک میز پر رکھا تھا اور اسے کھول دیا تھا۔ مادام جو کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی وہ گوشت کو دیکھتے ہی اس پر جھک گئی۔ اور اسے چبا چبا کر کھانے لگی۔ اور ہڈیوں کو بھنبھوڑنے لگی۔ میں بڑی حیرانی سے دماغ کی سکرین پر وہ تماشہ دیکھ رہا تھا ایک سیر گوشت کھانے کے بعد اور ہڈیوں کو اچھی طرح بھنبھوڑنے کے بعد وہ دودھ کے پیالے میں منہ ڈال کر اس طرح پینے لگی جیسے کتے یا بلی زبان سے دودھ کو چاٹتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے یا بلی ہے یا کتیا ہے؟ جو کچھ بھی ہے عجیب و غریب ہے۔ لیکن عجیب الخلقت نہیں ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک عورت ہی ہوگی۔ اگر وہ عجیب الخلقت ہوتی تو جہاں سے وہ آئی تھی وہاں سے اس ہوٹل تک لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی۔

میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ ماسٹر لوشے میرے خلاف کوئی زبردست حربہ استعمال کر رہا تھا اور جو کچھ وہ کرنے والا تھا اس کا مجھے علم نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس مادام کتیا سے وہ اجنبی زبان میں باتیں کرتا تھا اور اسی زبان میں منصوبے بناتا تھا۔ ایسی صورت میں میں یہ کیسے معلوم کر سکتا تھا کہ وہ مجھ تک پہنچنے کے لئے کون سا طریقہ اختیار کرنے والا ہے۔

ماسٹر لوشے تھوڑی دیر تک مادام سے باتیں کرتا رہا اس وقت میرے دماغ میں آئی کہ ٹیلی پیتھی جاننے والے کیلئے دنیا کی معروف زبانیں سیکھنا کتنا ضروری ہے۔ اگر میں نے مختلف زبانیں سیکھنے پر توجہ نہیں دی تو آئندہ بھی اسی طرح اپنے دشمنوں کے سامنے احمق بنتا رہوں گا۔

تھوڑی دیر بعد ماسٹر لوشے اس کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں آگیا۔ وہاں سعید احمد اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے کہا۔

"میں یہاں کب تک بیٹھا رہوں گا۔ میں نے ثمر کو پاگل خانے کی طرف بھیج دیا ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے؟"

"تم فکر نہ کرو میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر ماسٹر لوشے ثمر کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ میں بھی ماسٹر لوشے کی معرفت دماغ کی سکرین پر ثمر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی پاگل خانے کی طرف جارہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ماسٹر لوشے نے کہا۔

"تمہاری ثمر اس وقت ایک گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تمہارے ہی بارے میں سوچ رہی ہے۔ شاید ابھی اس کا سفر ختم نہیں ہوا ہے جب وہ پاگل خانے پہنچے گی تو میں اس کے ڈیڈی سے متعارف ہو جاؤں گا۔ فی الحال تم میری بات کا جواب دو۔ کیا تمہارے پاس فرہاد کی کوئی چیز ہے؟"

سعید احمد نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی چیز سے کیا مراد ہے؟"

"یہی کہ فرہاد کا کوئی رومال یا قلم یا گھڑی یا ایسی کوئی چیز جو وہ تمہارے پاس بھول گیا ہو۔"

سعید احمد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔"

"تعجب ہے کہ آپ دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست ہیں کیا دو دوست ایک دوسرے کی نشانی یا یادگار کے طور پر کوئی چیز اپنے پاس نہیں رکھتے؟"

سعید احمد نے جواب دیا۔

"دوستوں کی نشانی اس لئے رکھی جاتی ہے کہ وہ بچھڑ جائیں تو ان

کی جدائی میں ان کی نشانی ان کے پاس رہے اور ان کی یاد دلاتی رہے۔ لیکن فرہاد جیسے شخص کے ساتھ دوستی کرنے کے لئے کوئی ضروری نہیں کہ اس کی کوئی چیز نشانی کے طور پر محفوظ رہے۔ کیونکہ وہ بچھڑ کر بھی اور ہزاروں میل دور جاکر بھی ہمارے اندر موجود رہتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کی کوئی چیز میرے پاس کیسے رہ سکتی ہے!"

ماسٹر لوشے نے تائید میں سر ہلا دیا۔

"ہاں تم نے بڑی اچھی بات کہی۔ ہم جیسے لوگوں سے دوستی کرنے کے بعد دوری کا احساس نہیں ہوتا۔ خواہ ہم کتنی ہی دور کیوں نہ چلے جائیں۔ بہرحال جس کاٹیج میں تم فرہاد کو چھوڑ گئے ہو وہاں تو وہ اب موجود نہیں ہوگا۔ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں وہ چپ چاپ بیٹھا ہوا میری سوچ کو پڑھ رہا ہوگا۔ اور اب تک وہاں سے نکل گیا ہوگا۔ اب میں کیا چاہتا ہوں تم سے یہ نہیں کہوں گا۔ اس لئے کہ میرا دشمن میری باتیں سن کر ہوشیار ہو جائے گا۔ تم میرے ساتھ آؤ، ہم ابھی اور اسی وقت اس کاٹیج کی طرف چلیں گے۔"

سعید احمد اس کے ساتھ جانے کے لئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس وقت وہ سوچ رہے تھے کہ مجھ سے کاٹیج میں سامنا ہوگا تو وہ میرے سامنے شرمندہ ہونے کی بجائے مجھ سے شکایت کریں گے کہ میں نے ہی انہیں مائیکرو فلم واپس لینے اور ایئرپورٹ جانے کا مشورہ دیا تھا۔ اور اس مشورے کو ماسٹر لوشے سوچ کے ذریعے سن رہا تھا۔ لہٰذا وہ میرے خلاف قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

ایسا سوچتے ہوئے وہ ماسٹر لوشے کے پیچھے چلتے ہوئے کمرے سے باہر جانے والے تھے۔ اچانک ہی ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ یک بیک ان کے دماغ میں یہ بات آگئی کہ اگر ماسٹر لوشے ان کے دماغ میں جھانک کر میرے دیئے ہوئے مشوروں کو سن رہا تھا تو پھر اس طرح تو وہ میرے دماغ تک بھی پہنچ سکتا تھا۔ انہیں بہت دیر بعد اس بات کا خیال آیا۔

ماسٹر لوشے دروازے کے پاس پہنچ کر رک گیا اور ان کی طرف پلٹ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"مسٹر سعید! میں تمہاری سوچ کو پڑھ رہا ہوں۔ بہت دیر بعد یہ بات تمہاری سمجھ میں آئی ہے کہ فرہاد سوچ کے ذریعے تمہیں مشورہ دیتا رہا [illegible] تمہارے [illegible] غ میں جھانکتا رہتا تو فوراً تمہارے دماغ کے ذریعے [illegible] کے دماغ تک پہنچ جاتا۔ اب جبکہ یہ بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہے —

تو پھر یہ سمجھ لو کہ میں نے غلط کہا تھا۔ فرہاد بالکل خاموش ہے۔ دراصل میں ہی تمہارے دماغ میں جھانک رہا تھا۔ اور میں نے ہی تمہیں مائیکرو فلم لے کر ایئرپورٹ کی طرف جانے کا مشورہ دیا تھا، تاکہ میں تمہیں اپنا آلۂ کار بنالوں۔"

سعید احمد نے غصے سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو تم ابھی تک مجھے بیوقوف بنا رہے تھے اور میں فرہاد جیسے دوست کو ایک دشمن سمجھ رہا تھا۔ اچھا ہوا کہ مجھے عقل آگئی۔"

ماسٹر لوشے نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری عقل اب تمہاری نہیں ہے، کیونکہ اب وہ میرے کنٹرول میں ہے۔ اب تمہاری عقل آئے یا جائے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جو کچھ میں کہوں گا وہی کچھ تمہارا دماغ سوچے گا۔ اگر تم سوچنا نہیں چاہو گے تو پاگل بن جاؤ گے۔"

سعید احمد نے بڑی تلخی سے کہا۔

"میں وہی کروں گا جو تم کہو گے۔ میں اپنی حماقتوں سے تمہارا آلۂ کار بن گیا ہوں۔ تمہارے حکم سے انکار کر کے میں ثمر کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ اور میری اس مجبوری کو فرہاد بھی سن رہا ہوگا۔ اس لئے مجھے اس کے سامنے شرمندگی نہیں ہوگی۔ میرے اطمینان کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ اب تک سوچ کے ذریعے تمہاری گرفت میں نہیں آیا ہے۔ اور میں یہ پیشگوئی کر دوں ماسٹر لوشے کہ تمہاری موت تمہیں یہاں کھینچ کر لائی ہے۔ فرہاد کتنا چالاک اور خطرناک ہے۔ بس تم اسی بات سے اندازہ کر لو کہ تم دوسروں کو اپنا آلۂ کار بناتے جارہے ہو مگر فرہاد تک نہیں پہنچ رہے ہو۔ وہ اب بھی تمہیں تگنی کا ناچ نچا رہا ہے۔ اب میں تمہارے ساتھ اطمینان سے چلوں گا۔ یہاں جہاں فرہاد کے ملنے کے امکانات ہیں میں ہر وہ جگہ بتا دوں گا۔ اور اس اعتماد کے ساتھ بتا دوں گا کہ وہ تمہارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ تمہیں ہمیشہ اپنے پیچھے دوڑاتا رہے گا۔"

"مسٹر سعید! اب وہ مجھے اپنے پیچھے دوڑاتا ہے یا میں اسے اپنے پیچھے دوڑنے پر مجبور کروں گا، یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ فی الحال تم میرے حکم کے پابند ہو، لہٰذا میرے ساتھ چلو۔"

یہ کہہ کر اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ سعید احمد اس کے ساتھ باہر آگئے۔ وہ اپنے کمرے کے دروازے کو لاک کرنے کے بعد اپنے ساتھ والے کمرے کی طرف گیا۔ اور اس کمرے پر دستک دے کر اجنبی زبان میں مادام سے کچھ کہنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مادام کمرے سے باہر آگئی۔ اس نے بھی اپنے کمرے کو لاک کر دیا۔ پھر وہ تینوں کوریڈور سے گزرتے ہوئے ہوٹل سے باہر جانے لگے۔

ماسٹر لوشے نے محض میرے دماغ کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے اپنے ملک سے یہاں تک ایک طویل سفر کیا تھا۔ وہ میرے لئے اپنا بہت قیمتی وقت ضائع کر رہا تھا۔ ایسے بین الاقوامی طرز کے مجرموں کا وقت بہت قیمتی ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے دن اور رات صرف میری ہی فکر میں گزار رہا تھا۔ وہ اب جو بھی قدم اٹھا رہا تھا اس کے پیچھے کوئی گہرا مقصد پوشیدہ تھا۔ مگر افسوس کہ میں اس کی بلاننگ کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ ہمارے درمیان اجنبی زبان کا پردہ حائل تھا۔ اس وقت بھی جب وہ مری کی طرف جارہا تھا تاکہ فرزانہ کے کاٹیج پہنچ کر مجھے تلاش کرے یا میرے متعلق مزید معلومات فراہم کرے تو اس وقت بھی مادام اس کے ساتھ تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا

کہ وہ کسی خاص اہمیت کی مالک تھی۔ اور میرے سلسلے میں وہ بہت زیادہ اس کے کام آسکتی تھی۔

وہ دونوں سعید احمد کی کار میں پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے اور سعید احمد کار ڈرائیو کرتے ہوئے مری کی طرف جانے کے لئے ہوٹل دلشاد کے قریب سے گزر رہے تھے۔ اگر ماسٹر لوشے کے پاس ٹیلی پیتھی کے علاوہ کوئی ایسا علم ہوتا جس سے وہ میری دوری اور نزدیکی کو سمجھ لیتا تو اس بیچارے کو اتنی دور مری جانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ بہرحال وہ میری تلاش میں میرے قریب سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ جب وہ اسلام آباد سے آگے بڑھ گئے۔ تب ماسٹر لوشے نے ثمر کے ذہن میں جھانک کر دیکھا۔ وہ پاگل خانے پہنچ گئی تھی اور ایک ڈاکٹر کے ساتھ اس کمرے کی طرف جا رہی تھی جہاں اس کے باپ کو رکھا گیا تھا۔ ماسٹر لوشے نے پچھلی سیٹ سے کہا۔

"مسٹر سعید۔ تمہاری ثمر پاگل خانے پہنچ گئی ہے۔ تم خاموشی سے کار ڈرائیو کرتے رہو۔ میں اس کے باپ کے دماغ میں جھانک کر دیکھتا ہوں کہ وہاں کیا گزر رہی ہے۔"

سعید احمد نے عقب نما آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ جب منزل آ جائے گی تب آپ کو مخاطب کروں گا۔"

"ایک بات بتائیں مسٹر سعید۔ ثمر کا باپ کن حالات میں پاگل ہوا تھا"

سعید احمد بتانے لگے کہ کس طرح ثمر کے باپ نے دوسری شادی کی اور دوسری بیوی فیروزہ نے ایک دوا کے ذریعہ انہیں پاگل بنا دیا۔

ان کی باتیں سننے کے بعد ماسٹر لوشے پچھلی سیٹ کی پشت پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ثمر کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ ثمر اس وقت اس کمرے کے سامنے پہنچ گئی تھی جس میں اس کے باپ کو قید کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے دروازہ کھول کر اسے اندر جانے کے لئے کہا۔ چونکہ ثمر کا باپ خطرناک قسم کا پاگل نہیں تھا اس لئے ملاقات کرنے والوں کو آسانی سے اجازت دے دی جاتی تھی۔

ثمر کا باپ کمرے میں اپنے بیڈ پر لیٹا ہوا خاموشی سے چھت کو گھور رہا تھا کسی کے اندر آنے سے اس کے دیکھنے کے انداز میں ذرا بھی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ ثمر جو اس کی بیٹی تھی قریب جاتے ہوئے ذرا گھبرا رہی تھی۔ اس نے سہارے کے لئے پلٹ کر دیکھا۔ ڈاکٹر بھی اس کے پیچھے ہی کمرے میں آ گیا تھا۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر ذرا ہمت بندھی تو اس نے باپ کو مخاطب کیا۔

"ڈیڈی۔ مجھے دیکھئے ڈیڈی۔ میں آپ کی بیٹی ہوں آپ کی ثمر ہوں"

اس کے باپ نے پلکیں جھپکائیں۔ پھر ذرا گردن گھما کر بیٹی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر کہا۔

"مسٹر تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو اور ہر شخص کو سمجھنے کی کوشش کرو گے۔ تم بہت اچھے آدمی ہو۔ اپنے وعدے کے مطابق بہت سی باتیں سمجھنے لگے ہو کہ یہ بستر ہے۔ یہ دیواریں ہیں۔ میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ میں تمہارا ڈاکٹر ہوں۔ اسی طرح اس بچی کو سمجھو یہ کون ہے؟ اور سمجھنے کے لئے اتنا اشارہ کافی ہے کہ یہ تمہیں ڈیڈی کہہ رہی ہے۔"

اس نے اپنی بیٹی کو ایک ٹک دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ڈاکٹر تم نے مجھے سمجھایا تھا کہ پچھلے دنوں مجھ سے ایک لڑکی ملنے کے لئے آئی تھی۔ وہ میری بیٹی تھی۔ شاید یہ وہی لڑکی ہے اور میری بیٹی ہے۔ مگر مجھے کچھ یاد کیوں نہیں آتا۔ مجھے بتاؤ میں کب اس کا باپ بن کر پیدا ہوا تھا؟"

ڈاکٹر نے کہا "اوہو۔ تم پھر بہک رہے ہو۔ تم باپ بن کر پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ تمہاری بیٹی بن کر پیدا ہوئی تھی۔ یعنی اس دنیا میں پہلے باپ پیدا ہوتے ہیں پھر بیٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔"

"اچھا سمجھ گیا۔ پہلے میں پیدا ہوا پھر میری بیٹی پیدا ہوئی۔ پہلے میں اس پاگل خانے میں آیا ہوں۔ اب میری بیٹی یہاں آ کر رہے گی۔"

"تمہاری بیٹی یہاں نہیں رہے گی۔ یہ تمہیں دیکھنے آئی ہے تمہاری بیٹی یہ امید لے کر آئی ہے کہ تم اسے پہچان لو گے۔"

انسان کا لاشعور اس قدر کمزور ہو جائے کہ اس میں دبی ہوئی تمام باتیں، تمام یادیں ابھر کر شعور کی حد تک نہ پہنچ سکیں تو انسان پچھلی باتیں بھول جاتا ہے۔ ایسے وقت میں کہتے ہیں کہ اس کی یادداشت گم ہو چکی ہے۔ فیروزہ نے ایسی دوا اس کو دودھ میں ملا کر پلائی تھی کہ اس کے سوچنے کی تمام صلاحیتیں ختم ہو گئی تھیں۔ ابتدا میں بہت سی سوچیں گڈمڈ ہو کر آندھیوں کی طرح اس کے دماغ میں گونجتی رہتی تھیں۔ پھر وہ رفتہ رفتہ نارمل ہوتا گیا اور اس طرح خاموش رہ کر اپنے سامنے کی چیزوں کو تکنے لگا، جیسے وہ بالکل خالی الذہن ہو گیا ہو۔ پھر ڈاکٹر اس کا علاج کرتا رہا۔ اسکے سامنے کی چیزوں کو تبلاتا رہا سمجھاتا رہا کہ یہ سب کیا ہیں؟ لیکن اس کے لاشعور کو نہ کرید سکا۔ اب اس بات کی ضرورت تھی کہ اس کا ماضی اس کو یاد دلایا جائے۔ لیکن کسی کے یاد دلانے سے دماغ ان یادداشتوں کو قبول نہیں کر سکتا، جب تک کہ پچھلی تمام باتیں اور پچھلی تمام یادداشتیں خود ہی اس کے ذہن میں نہ ابھریں۔ خود بخود اس کے ذہن میں گمشدہ یادوں کو ابھارنے کے لئے ماسٹر لوشے اس کے ذہن میں جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ جو لڑکی سامنے کھڑی ہوئی ہے یہ میری بیٹی ہے۔ ہاں مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا ہے۔ میرا نام برکت علی ہے۔ میں ایک بہت بڑا تاجر ہوں۔ کروڑوں کی جائیداد کا مالک ہوں۔ پہلی بیوی کے مرنے کے بعد میں نے فیروزہ نام کی ایک عورت سے شادی کی تھی۔ وہ عورت میری بیٹی اور میری جائیداد کی دشمن بن گئی۔ اب مجھے یاد آتا جا رہا ہے۔ ایک رات میں نے سونے سے پہلے دودھ پیا تھا اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا تھا کہ میں [illegible] ہوں۔ کون ہوں۔ شاید اسی دودھ میں اس دشمن عورت نے دوا ملا کر دی تھی۔ ہاں مجھے اب یاد آتا جا رہا ہے۔ یہ لڑکی جو سامنے کھڑی ہے میری بیٹی ہے اور اس کا نام ثمر ہے. . . ."

ماسٹر لوشے بڑے اطمینان سے ثمر کے باپ سیٹھ برکت علی کے دماغ کی تاریکیاں دور کر رہا تھا۔ اس کے لاشعور سے پچھلی یادوں کو ابھارتا ہوا اس کے شعور تک پہنچا رہا تھا۔ سیٹھ برکت علی اس دوران اس سوچ کو پڑھتا جا رہا تھا اور اپنے سامنے کھڑی ہوئی ثمر کو دیکھتا جا رہا تھا۔ ماسٹر لوشے نے ثمر کو نہیں دیکھا تھا کہ اس کا ناک نقشہ کیسا ہے۔ لیکن برکت علی کی نگاہوں کے ذریعے اور اس کی سوچ کے ذریعے وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ کیسی ہے۔ اس کے شکل و روپ کو سمجھ کر وہ برکت علی کے دماغ میں کہہ رہا تھا۔

"ہاں! اب میں اپنی بیٹی کو پہچان رہا ہوں۔ یہ اونچی سی ناک۔ یہ گلابی سے ہونٹ جو مجھے ڈیڈی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ یہ بڑی بڑی معصوم آنکھیں جو ضد کرتی تھیں اور ضد پوری نہ ہونے کی صورت میں آنسو بہانے لگتی تھیں۔ اب میں یہ پہچان رہا ہوں۔ ہاں یہ صورت اب میرے ذہن میں پوری طرح واضح ہو گئی ہے۔"

واقعی ماسٹر لوشے بڑی کامیابی کے ساتھ اس کی یادداشت کو بحال کر رہا تھا اور اس کے حافظے کو تقویت پہنچا رہا تھا۔ سیٹھ برکت علی کے ذہن میں ثمر کی کتنی ہی تصویریں واضح ہوتی جا رہی تھیں۔ اب وہ ماضی کے کتنے ہی واقعات کو تصوریں دیکھ رہے تھے۔ کبھی ثمر ایک ننھی سی بچی کی طرح ان کی گود میں کھیل رہی تھی۔ کبھی گھٹنوں کے بل رینگ رہی تھی۔ کبھی سکول کی کتابیں اٹھائے کار میں بیٹھ کر جا رہی تھی۔ اور کبھی بچپن سے جوانی کی طرف قدم رکھتی نظر آ رہی تھی۔ اور اب تصور میں ثمر بالکل ہی واضح ہو گئی تھی۔ وہ یاد آئی اور اس کا چہرہ بھی روشن ہوا تو ساتھ ہی سارے رشتہ داروں کے چہرے روشن ہوتے چلے گئے۔ فیروزہ کی تصویر بھی سامنے آ گئی کہ وہ کون ہے اور کیسی ہے؟ اور اس نے جائیداد کے لالچ میں ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے؟ تمام باتیں جب انہیں یاد آئیں تو انہوں نے دونوں بازو پھیلا کر کہا۔

"میری بچی۔ میں نے تجھے پہچان لیا ہے۔ مجھے سب کچھ یاد آ گیا ہے میرے سینے سے لگ جا. . . ."

ثمر بے اختیار دوڑتی ہوئی ان کے پاس آئی اور ان کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ دونوں باپ بیٹی کے آنکھوں میں آنسو رواں تھے ڈاکٹر انہیں مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ اور ان کی باتیں سن رہا تھا۔ سیٹھ برکت علی کہہ رہے تھے۔

"ثمر۔ جب میں رات کو سونے کے لئے اپنی خوابگاہ میں جا رہا تھا تو تم کہہ رہی تھیں کہ تم نئے ماڈل کی کار خریدنا چاہتی ہو اس کے لئے تمہیں ڈیڑھ لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ میں نے تم سے یہ کہا تھا کہ میں دوسرے دن تمہیں یہ رقم دے دوں گا۔ تم وہ نئے ماڈل کی کار خرید لینا۔"

ثمر نے اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ڈیڈی۔ اب وہ کار نئے ماڈل کی نہیں رہی۔ کیونکہ اس بات کو ایک سال گزر چکا ہے۔"

سیٹھ برکت علی نے حیرانی سے اسے اور ڈاکٹر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا واقعی؟ کیا اس بات کو ایک سال گزر چکا ہے؟ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے پچھلی رات ثمر سے یہ بات کہی تھی۔ اور اب صبح میری آنکھ کھلی ہے۔ صبح میں ثمر کو اس کی مرضی کی کار دلانا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ اس بات کو ایک سال گزر گیا ہے۔"

ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر سیٹھ برکت علی کے شانے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"ہاں آپ ایسا ہی محسوس کریں گے کیونکہ آپ ذہنی طور پر سوئے ہوئے تھے۔ جب ذہن سو جاتا ہے تو وقت گزرنے کا احساس نہیں رہتا۔ ذہن بیدار ہونے کے بعد ایسا ہی لگتا ہے، جیسے یہ تھوڑی دیر پہلے کی بات ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ پوری طرح ہوش میں آ گئے ہیں۔ اپنے ماضی کو اچھی طرح یاد کر رہے ہیں۔ اب یہاں آپ کے دوسرے رشتہ داروں کو بلایا جائے گا اگر آپ نے انہیں بھی پہچان لیا تو آپ کو چھٹی مل جائے گی۔"

ماسٹر لوشے نے سیٹھ برکت علی سے سوچ کا رابطہ ختم کر دیا۔ سعید احمد خاموشی سے کار ڈرائیو کر رہے تھے۔ اس وقت ان کی کار مری شہر میں داخل ہو چکی تھی۔ ماسٹر لوشے نے پوچھا۔

"مسٹر سعید یہ کون سی جگہ ہے؟"

"یہ مری ہے۔ ہم اپنی منزل پر پہنچ رہے ہیں۔ کیا آپ نے برکت علی کے ذہن میں جھانک کر دیکھا تھا؟"

ماسٹر لوشے نے پچھلی سیٹ پر ذرا سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ شمر کا باپ نارمل ہو گیا ہے۔ اور اسے ماضی کی تمام باتیں یاد آ رہی ہیں۔ پاگل خانے کا ڈاکٹر اس کے دوسرے رشتہ داروں کو بلائے گا۔ اگر برکت علی نے ان رشتہ داروں کو بھی پہچان لیا اور ان کے متعلق کچھ باتیں اپنی یادداشت کو صحیح ثابت کرنے کے لئے بتا دیں تو پھر اسے پاگل خانے سے چھٹی مل جائے گی۔ تو میں نے تمہارا یہ کام کر دیا اب تو خوش ہونا چاہئیے اور مجھ پر بھروسہ کرنا چاہیئے کہ میں آئندہ بھی تمہارے کام آتا رہوں گا۔"

سعید احمد نے ناگواری سے جواب دیا۔

"میں اس سلسلہ میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے شمر کے والد کا پاگل پن دور کر دیا ہے۔ لیکن میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ اگر تمہاری جگہ فرہاد ہوتا تو وہ کبھی یہ کام آسانی سے کر لیتا۔ میں فرہاد کے احسانات کو اور اس کی دوستی کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔ میں مجبوراً تمہارے کام آ رہا ہوں۔ مجھے اپنی اور شمر کی زندگی عزیز ہے۔ اس لئے جب تک تم مجھے اپنی انگلیوں پر نچاتے پھرو گے میں خواموشی سے ناچتا رہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس ملک کی زمین پر زیادہ عرصے سانس نہیں لے سکو گے۔ یا تو تمہیں منہ کی کھا کر یہاں سے بھاگنا ہوگا یا اسی مٹی میں دفن ہو جانا ہوگا۔"

ماسٹر لوشے ان کی بات سن کر قہقہے لگانے لگا۔

"مسٹر سعید۔ ہر شخص اپنے اپنے طور پر خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے تمہاری طرح میں بھی خوش فہمی میں مبتلا ہوں کہ فرہاد میرے ہاتھوں یہاں کی مٹی میں دفن ہوگا۔ اب یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ کون بازی لے جاتا ہے۔"

سعید احمد نے فیروزہ کے کاٹیج کے سامنے پہنچ کر گاڑی روک دی اور اس سے کہا۔

"یہی وہ کاٹیج ہے۔ جہاں میں فرہاد کو چھوڑ کر گیا تھا۔"

ماسٹر لوشے نے کار کی کھڑکی سے جھانک کر کاٹیج کی جانب یوں دیکھا جیسے معلوم کرنا چاہتا ہو کہ میں وہاں موجود ہوں یا نہیں۔ وہ کاٹیج میں میری موجودگی معلوم کرنا چاہتا تھا اور میں اس سے بہت دور ہوٹل فشا کے ایک کمرے میں بیٹھا اس کی موجودگی کو سمجھ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔

اس نے پلٹ کر مادام سے اجنبی زبان میں کچھ کہا۔ کیا کہا میں نہ سمجھ سکا۔ لیکن مادام کی حرکتیں سمجھ رہا تھا۔ جو ماسٹر لوشے کے ذہن کے ذریعے مجھ تک نشر ہو رہی تھیں۔ ماسٹر لوشے کی باتیں سنتے ہی مادام ایکدم سے جوش میں آ گئی تھی۔ مٹھیاں بھینچ رہی تھی اور غراتی ہوئی کاٹیج کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ماسٹر لوشے نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کچھ کہا جس کے بعد وہ نرم پڑ گئی۔ میری سمجھ میں یہی آیا کہ وہ مادام کو ذرا صبر کرنے کی نصیحت کر رہا ہے۔ پھر وہ اس کے ساتھ کار سے باہر آ گیا۔ اس نے سعید احمد سے کہا کہ وہ آگے بڑھ کر کاٹیج میں داخل ہوں تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ کاٹیج کے اندر کون کون موجود ہے۔ سعید احمد اس کے کہنے کے مطابق کاٹیج کے دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

میں یہ بات جانتا تھا کہ ماسٹر لوشے بالکل نہتا ہے۔ وہ اپنے پاس پستول وغیرہ نہیں رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بات تعجب خیز تھی کہ مجھ جیسے دشمن کا سامنا کرنے کے لئے خالی ہاتھ کیسے آیا ہے مگر یہ بات سمجھ میں آ تی تھی کہ مادام اس کے لئے بہت ہی بڑا اور خطرناک ہتھیار ہے جو ایسے موقعوں پر کام آتا ہے۔ کیا ایک عورت اس حد تک خطرناک ہو سکتی ہے کہ ماسٹر لوشے اسے اپنا آلۂ کار بنائے جب کہ بیل منڈو جیسا خطرناک آدمی بھی میرے مقابلے نہیں ٹھہر سکا تھا۔ تو وہ عورت کیسے میرے سامنے کھڑی رہ سکتی تھی اگر وہ محض عورت تھی تو ایک پھونک میں اڑ جاتی۔ لیکن اب میں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ ماسٹر لوشے نادان نہیں تھا۔ وہ بہت سوچنے سمجھنے کے بعد مادام کو اپنے ساتھ لایا تھا۔

وہ باہر مادام کے ساتھ کھڑا ہوا سعید احمد کی سوچ کو پڑھ رہا تھا ان کے ذریعہ یہ معلوم کر رہا تھا کہ اندر کتنے لوگ موجود ہیں۔ لیکن وہاں فیروزہ اپنے بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ یہ باتیں سعید احمد کو بتانے کی ضرورت نہ تھی۔ ماسٹر لوشے ان کی سوچ کو پڑھ کر کاٹیج کے اندر آ گیا۔

وہ سیدھا فیروزہ کے بیڈ روم میں آیا تھا۔ فیروزہ کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا اور جسم پر کئی جگہ زخم آئے تھے۔ کچھ اوباش قسم کے نوجوانوں نے ایک ویرانے میں لے جا کر اس کی بے حرمتی کی تھی۔ پتہ نہیں وہ کس طرح کاٹیج میں واپس آئی تھی۔ اور اب سعید احمد کو دیکھتے ہی وہ کہہ رہی تھی۔

"میں سولہ سال کی ہوں۔ ہاں ہاں تم یقین کرو، میں سولہ برس کی ہوں۔ سب لوگ مجھے بوڑھی کہتے ہیں۔ کیا میں بوڑھی نظر آتی ہوں۔ نہیں میں بوڑھی نہیں ہوں۔ میں سولہ برس کی ہوں۔"

وہ ایسے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی جیسے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔ ماسٹر لوشے کمرے میں داخل ہونے کے بعد اسے توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کی باتیں سمجھ نہیں رہا تھا کیونکہ فیروزہ اردو زبان میں بڑبڑا رہی تھی۔ اور وہ زبان ماسٹر لوشے کے پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ وہ اب تک سعید احمد سے انگریزی میں گفتگو کرتا آیا تھا۔ پاگل خانے میں بھی بار شمر نے انگریزی میں بات کی تھی اتنی بار وہ اسے سمجھتا گیا تھا۔ برکت علی بھی اسی زبان میں بولتے رہے تھے۔ ماسٹر لوشے نے بھی اسی زبان میں ان کی یادداشت کو ابھارا تھا اور پاگل خانے کا ڈاکٹر بھی اسی زبان میں گفتگو کرتا رہا تھا۔ لیکن فیروزہ یہ زبان نہیں جانتی تھی۔ فیشن کے طور پر دو چار جملے یاد کر لئے تھے۔ ورنہ عام حالات میں وہ اپنی مادری زبان میں گفتگو کرتی تھی۔ اسی لئے ماسٹر لوشے ان کی باتیں نہ سمجھ سکا۔ اس نے سعید احمد سے کہا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہے؟ مجھے سمجھاؤ۔"

سعید احمد خود ہی نہ سمجھ سکے کہ ان کی فیروزہ آنٹی کو کیا ہو گیا ہے اور وہ کس طرح پاگل ہو گئی ہے۔ انہوں نے تعجب کا اظہار کیا اور اس سے کہا کہ یہ عورت الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ماسٹر لوشے نے کہا۔

"اس عورت سے معلوم کرو کہ فرہاد کہاں ہے؟"

سعید احمد نے فیروزہ کو مخاطب کر کے اس سے میرے متعلق سوالات کئے۔ لیکن وہ جواب میں صرف اپنی کم عمری کا یقین دلاتی رہی۔ پھر سعید احمد نے بیزار ہو کر کہا۔

"ماسٹر لوشے، یہ کوئی بات نہیں سمجھتی ہے۔ خود اپنی ہی باتیں دہراتی رہتی ہے۔ اس سے کچھ پوچھنا فضول ہے۔"

ماسٹر لوشے نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"فرہاد کس کمرے میں رہتا تھا؟ مجھے وہاں لے چلو۔"

سعید احمد آگے بڑھ گئے۔ اور فیروزہ کے کمرے سے نکل کر اس کمرے کی طرف جانے لگے، جہاں میں رہتا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ماسٹر لوشے نے سوال کیا۔

"مسٹر سعید آپ دیکھیں۔ کیا فرہاد کی کوئی چیز یہاں رہ گئی ہے؟"

سعید احمد نے ان کے سامنے الماری کھولی۔ پھر بستر کے قریب جا کر تکیہ ہٹایا کہ شاید کوئی چیز مل جائے۔ لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ ماسٹر لوشے نے انہیں باتھ روم میں جا کر دیکھنے کے لیے کہا اور خود بھی ان کے پیچھے باتھ روم میں داخل ہوا۔ وہاں میرا وہ لباس پڑا ہوا تھا جسے غسل کرنے سے پہلے میں نے اتارا تھا اور سعید احمد کا کرتا اور پاجامہ پہنا تھا۔ سعید احمد میرے اس لباس کو دیکھتے ہی ٹھٹھک گئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ماسٹر لوشے کو میرا وہ لباس دکھائیں۔ وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ جو لباس پڑا ہوا ہے وہ خود ان کا ہے۔ لیکن اس ٹیلی پیتھی جاننے والے شیطان سے یہ بات کہاں چھپ سکتی تھی۔ وہ سعید احمد کی سوچ پڑھ چکا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"مسٹر سعید آپ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کریں مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ لباس فرہاد کا ہے۔ آپ ایک طرف کھڑے ہو جائیں۔"

یہ کہہ کر اس نے مادام کو اجنبی زبان میں مخاطب کیا۔ پھر اس کو تنے ہوئے میرے لباس کی طرف اشارہ کیا۔ اشارہ ہوتے ہی مادام غراتی ہوئی میرے لباس تک آئی اور فرش پر جھک گئی۔ پھر اسے اٹھا کر ادھر ادھر سے سونگھنے لگی۔ ذرا دیر اسے سونگھنے کے بعد اس نے اس کو فرش پر پھینک دیا۔ میں شدید حیرانی سے وہ منظر دیکھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر وہ مادام کرنا کیا چاہتی ہے؟ پھر اچانک میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اور میں ایک دم سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

مادام میرے لباس کو اچھی طرح سونگھنے کے بعد اب اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اور سر اٹھا کر فضا میں چاروں طرف بو سونگھ رہی تھی۔ میں فوراً ہی سمجھ گیا کہ اس عورت میں سونگھنے کی حس شکاری کتوں جیسی ہے۔ وہ میرے لباس کے ذریعے میرے جسم کی بو کو سونگھ رہی ہے۔ پھر اس نے اچانک ہی ہاتھ کے اشارے سے ماسٹر لوشے کو بتایا وہ اس سے اجنبی زبان میں گفتگو کر رہی تھی۔ مگر میں ماسٹر لوشے کی سوچ کے ذریعے سمجھ گیا کہ وہ میرا ٹھکانہ بتا رہی ہے۔

اتنی دور وہ صحیح مقام کا تعین نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن فضا میں میری بو سونگھتے ہوئے اس نے بتایا کہ میں جنوب کی طرف پایا جا سکتا ہوں اس کی بات سنتے ہی ماسٹر لوشے نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چھوٹا سا قطب نما نکال لیا۔ اور اس کے ذریعے معلوم کرنے لگا کہ جنوب کس طرف ہے۔ پھر اس نے سعید احمد کو کاٹیج سے باہر چلنے کے لیے کہا۔

وہ تینوں جب کاٹیج سے باہر آ گئے۔ تو ماسٹر لوشے نے قطب نما پر نظر ڈالتے ہوئے سعید احمد سے پوچھا۔

"ابھی ہم کس سمت سے یہاں کاٹیج میں آئے ہیں؟"

"ہم جنوب کی طرف سے آئے ہیں۔ یہ شمالی علاقہ ہے۔"

ماسٹر لوشے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔ اس کا مطلب ہے، ہم جس شہر سے آئے ہیں فرہاد اسی شہر میں ہے یا اسی کے آس پاس کسی علاقے میں ہے۔ ہمیں پھر اسی طرف واپس جانا ہے۔ مسٹر سعید آپ کار ڈرائیو کریں۔ میں آپ کے ساتھ بیٹھتا ہوں اور مادام پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی فرہاد کی بو سونگھتی رہے گی۔"

میرا اطمینان غارت ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ سیدھی میری ہی طرف آئے گی۔ ماسٹر لوشے ایک بڑی آلۂ کار کو اپنے ساتھ لگا کر لے آیا تھا۔ پولیس والے شکاری کتوں کے ذریعے بو سونگھتے ہوئے مجرموں تک پہنچتے ہیں اور ماسٹر لوشے مادام کتیا کو اپنے ساتھ لگا کر میری طرف آ رہا تھا۔ میری احتیاطی تدابیر کے باعث اس کی ٹیلی پیتھی کا علم بیکار ہو گیا تھا۔ وہ سوچ کی کڑیاں ملا کر مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ لہذا سونگھ سونگھ کر میری طرف چلا آ رہا تھا۔

اب میں اس ہوٹل میں چھپ کر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کی ایک آلۂ کار نے میری تمام پناہ گاہوں کے راستے مسدود کر دیئے تھے۔ میں نے اپنا بریف کیس اٹھا لیا جس میں فیروزہ کے دو لاکھ روپے رکھے ہوئے تھے۔ میں اس بریف کیس کو لے کر ہوٹل کے باہر آ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ اب کس طرف جانا چاہیئے۔ میں جدھر بھی جاتا ہوں، مادام ماسٹر لوشے کو ادھر ہی لے جاتی ہے۔ زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اب وہ میرا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں مایوس ہو کر خود ہی ماسٹر لوشے کے سامنے پہنچ کر گھٹنے ٹیک

دیتا۔
میں مایوس ہونا نہیں جانتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک دم میں دم ہے بھاگتا رہوں گا۔ اور انہیں اپنے پیچھے بھگاتا رہوں گا۔ میں ماسٹر لوشے کو اتنا تھکا دینا چاہتا تھا کہ وہ خود ہی تھک ہار کر گر پڑے اور اس میں مزید تعاقب کرنے کی سکت نہ رہے۔ اب یہی دیکھنا تھا کہ اس بھاگ دوڑ کا انجام کیا ہونا ہے۔

میں ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر سب سے پہلے پی۔آئی۔اے کے دفتر میں گیا۔ وہاں میں نے معلومات حاصل کیں کہ فوری طور پر کون سی فلائٹ مل سکتی ہے۔ اتفاق سے ایک فلائٹ ایک گھنٹے بعد کراچی کی طرف جانے والی تھی۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ مجھے ایک سیٹ مل گئی۔ فلائٹ کا ٹکٹ لینے کے بعد میں ٹیکسی میں آ کر ڈرائیور کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر سو سو کے دو نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے پینتالیس منٹ تک اس شہر میں گھماتے رہو۔ یہ دو سو روپے تمہارے پینتالیس منٹ کا معاوضہ ہے۔"

ڈرائیور نے پہلے تو مجھے تعجب سے دیکھا۔ پھر خوش ہو کر ان نوٹوں کو جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

"فرمائیے! کدھر لے چلوں!"

"ابھی تمہاری جہاں مرضی ہو چلتے رہو۔ میں تھوڑی دیر بعد بتاؤں گا کہ کس طرح اس شہر کا چکر لگانا ہے۔"

ڈرائیور گاڑی اسٹارٹ کر کے ایک طرف چلنے لگا۔ میں نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر ماسٹر لوشے کے ذہن میں جھانکنا شروع کر دیا۔ اس وقت وہ سعید احمد کے ذہن کو پڑھ رہا تھا۔ اس طرح دونوں سے میرا رابطہ قائم ہو گیا۔ سعید احمد مادام کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ ماسٹر لوشے سے پوچھنا چاہتے تھے کہ یہ کس قسم کی عورت ہے؟ سونگھنے کی حس تو جانوروں میں ہوتی ہے، انسانوں میں اتنی نہیں ہوتی کہ منہ اٹھا کر فضا میں اپنے جیسے کسی انسان کی بو سونگھ لیں۔ واقعی وہ سچ مچ حیران اور پریشان کر دینے والی عورت ہے۔

لیکن سعید احمد نے ماسٹر لوشے سے مادام کے متعلق کچھ نہیں پوچھا۔ انہوں نے سوچا کہ وہ جیسی بھی ہے سامنے نظر آ رہی ہے۔ اب یہ بات خود ہی سامنے آ جائے گی کہ یہ کتیا اپنے ماسٹر کو فرہاد تک پہنچاتی ہے یا نہیں؟

ماسٹر لوشے سعید احمد کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان کی سوچ پڑھنے کے بعد اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ مجھے فرہاد تک ضرور پہنچائے گی۔ تم اسے کتیا نہ کہو۔ ہم انسانوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں جانوروں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان سے شکار کرنے اور پنجے مارنے کے طریقے سیکھے ہیں۔ ان سے فضاؤں میں اڑنا سیکھا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کی طرح آپس میں لڑنا سیکھا ہے۔ تعجب ہے کہ ہم تمام ہنر جانوروں سے سیکھتے ہیں اور ڈینگیں مارنے کے لیے خود کو ان سے برتر سمجھتے ہیں۔ مادام کا باپ جانوروں کا ایک بہت بڑا ڈاکٹر تھا۔ اس نے جانوروں کی سونگھنے کی حس پر ساری زندگی حیرت انگیز تجربات کیے۔ اور پھر ان تجربات کو اپنی اس بیٹی پر آزمایا۔ آج یہ تمہارے سامنے ہے۔ یہ انسان ہے مگر اس نے سینکڑوں میل سے جانوروں کی سونگھنے والی حس کو اپنا لیا ہے۔ تم اسے جانور نہ کہو۔ ورنہ میں یہ ثابت کر دوں گا کہ ہم تمام انسان سیکھنے کے معاملے میں جانوروں کے شاگرد ہیں۔"

سعید احمد نے بڑی بے بسی سے کہا۔

"اگر میں کچھ پوچھنا نہ چاہوں۔ تب بھی تم سوچ کے ذریعے میرے سوال کو سمجھ لوگے۔ لہٰذا اب میں تم سے پوچھوں گا کہ مادام کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ہتھیلی کی طرف کیوں مڑی ہیں۔ بالکل جانوروں کے پنجے معلوم ہوتے ہیں۔"

ماسٹر لوشے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں بالکل جانوروں کی طرح پنجے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے باپ نے اس پر کیسے تجربات کیے ہیں۔ لیکن اس جانور نما عورت کے کمالات دیکھ چکا ہوں۔ جب فرہاد سے سامنا ہوگا تو تم بھی دیکھ لینا کہ یہ کیسے خطرناک انداز میں پنجے مارتی ہے۔"

وہ باتیں کر رہے تھے۔ اور میں سن رہا تھا۔ مادام کے متعلق نئی معلومات حاصل ہو رہی تھیں۔ اگرچہ میں اس سے دور بھاگ رہا تھا لیکن حقیقتاً اس سے نہیں ماسٹر لوشے سے دور بھاگ رہا تھا۔ ورنہ میری دلی خواہش تھی کہ میں اس عجیب و غریب عورت کو ایک بار قریب سے دیکھوں۔ یہ بات ہی مضحکہ خیز تھی کہ مجھ جیسا مرد ایک عورت سے دور بھاگ سکتا ہے، جب کہ میں انواع و اقسام کی عورتوں کو ہینڈل کر چکا ہوں، جن میں سب سے زیادہ خطرناک عورت بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جلنے والی انجلا تھی۔

بہرحال ابھی تو میں اس سے دور بھاگ رہا تھا۔ بیس منٹ گزر چکے تھے۔ مادام کتیا ماسٹر لوشے کے ساتھ اسلام آباد پہنچ رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے باہر سر نکالے نتھنے پھلا پھلا کر سونگھ رہی تھی۔ پھر ماسٹر لوشے کو اجنبی زبان میں مخاطب کرتی تھی۔ اسلام آباد پہنچ کر ماسٹر لوشے نے سعید احمد سے کہا۔

"مادام بتا رہی ہے کہ فرہاد یہاں سے بہت قریب ہے ---- ہاتھوں سے جہاں جہاں اشارہ کرے۔ تم گاڑی کو اسی طرف موڑتے جاؤ ---"

دوسری طرف میں ٹیکسی ڈرائیور کو بتانے لگا کہ اسے کن راستوں پر ٹیکسی دوڑانی ہے تاکہ میں ان سے زیادہ سے زیادہ فاصلہ قائم رکھ سکوں۔ وہ میری ہدایت کے مطابق پنڈی کی سڑکوں پر راستے بدل بدل کر

گاڑی دوڑانے لگا۔

پھر ہمارے درمیان چوہے بلی کا کھیل شروع ہو گیا۔ یہ بات واقعی حیرت انگیز تھی کہ میں جس راستے سے گزر جاتا، مادام میرے پیچھے اسی راستے سے ماسٹر لوشے کو لے کر گزرتی تھی۔ اور سعید احمد کو ہاتھ کے اشارے سے بتاتی تھی کہ ہمیں کس طرح سمتیں بدل بدل کر میرا پیچھا کرنا ہے۔ اب پینتالیس منٹ پورے ہونے والے تھے۔ مجھے فوراً ہی ائیرپورٹ پہنچنا تھا۔ اس وقت ماسٹر لوشے مادام سے اجنبی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ یعنی ذرا دیر کے لیے اس کی توجہ سعید احمد سے ہٹ گئی تھی۔ میں نے فوراً ہی سعید احمد کے ذہن پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

"سعید صاحب! اگر آپ اپنے فرہاد کو بچانا چاہتے ہیں تو فوراً ہی گاڑی میں کوئی خرابی پیدا کریں۔"

میں نے صرف گاڑی میں خرابی پیدا کرنے کے لیے کہا تھا۔ مگر سعید احمد نے میری توقع سے کہیں زیادہ دوستی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے فوراً ہی ایک جھٹکے سے اسٹیرنگ کو موڑتے ہوئے گاڑی کو فٹ پاتھ پر چڑھا دیا۔ گاڑی تیزی سے گھومتی اور ایک کوٹھی کے مین گیٹ کو توڑتی ہوئی احاطے میں گھس گئی۔

ٹیکسی ڈرائیور ٹھیک وقت کا حساب رکھتے ہوئے مجھے ائیرپورٹ کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس حادثے کے وقت میں نے ماسٹر لوشے کے ذہن میں جھانک کر دیکھا تو اس کی حاضر دماغی غائب ہو چکی تھی۔ اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا تھا۔ اس کے دماغ میں بیک وقت حادثے کا خوف تھا۔ اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔ اسے جو چوٹیں آئی تھیں۔ ان سے اٹھنے والی ٹیسیں اسے میری طرف سے غافل بنا رہی تھیں۔ جب اپنی ہی جان کے لالے پڑے ہوں تو فرہاد کہاں یاد آتا ہے۔ میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ البتہ مجھے اس بات کا افسوس تھا کہ سعید احمد اس سے زیادہ زخمی ہو کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ میں ان کی اس دوستی اور محبت کے جذبے کو کبھی نہیں بھولوں گا۔

پندرہ منٹ کے بعد میں جہاز میں آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس وقت میں نے ماسٹر لوشے کی بے بسی دیکھی۔ وہ زخمی ہونے کے باوجود ہوش میں تھا۔ مادام کو بھی معمولی سی چوٹیں آئی تھیں۔ لیکن وہ دونوں میرا پیچھا نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ اس حادثے کے باعث پولیس والوں نے انہیں گھیر لیا تھا۔ ابھی انہیں سعید احمد کے ساتھ ہسپتال پہنچایا اور ان کا بیان لینا بہت ضروری تھا۔ وہ اجنبی دیس میں آ کر ان قانونی اقدامات سے کترانے کی کوشش نہیں کر سکتے تھے۔ اگر اپنی صلاحیتوں کو آزماتے تو خطرناک مجرموں کی حیثیت سے منظر عام پر آ جاتے۔ لہٰذا ماسٹر لوشے کو صبر کرنا پڑا۔

ویسے مادام نے جہاز کے پرواز کرنے سے پہلے ہی ماسٹر لوشے کو اجنبی زبان میں بتا دیا تھا کہ میں اسی ائیرپورٹ پر ہوں جہاں صبح ان کے جہاز نے لینڈ کیا تھا۔ مادام کی وہ اجنبی زبان میری سمجھ میں نہ آتی۔ لیکن ماسٹر لوشے نے پولیس والوں کے ساتھ ہسپتال کی طرف جاتے ہوئے سوچ کے ذریعہ مجھ سے کہا۔

"فرہاد! میں سمجھ رہا ہوں کہ تم میری سوچ کی لہروں کو اپنی گرفت میں لے رہے ہو۔ اسی لیے فرار ہونے میں کامیاب ہو رہے ہو۔ میں مانتا ہوں کہ تم قسمت کے دھنی ہو۔ لیکن میں نے اس وقت ٹائم نوٹ کر لیا ہے۔ پولیس والوں سے نجات حاصل کرتے ہی میں معلوم کروں گا کہ اس وقت کونسی فلائٹ کہاں گئی ہے۔ بیٹے تم کہیں اپنی قبر بنا لو اور وہاں دفن ہو جاؤ، مادام مجھے لے کر وہاں بھی پہنچ جائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ کیوں خاموش ہو گیا؟ اس کی سوچ بتا رہی تھی کہ اس نے مجھے چیلنج کیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس کے چیلنج سے بھڑک کر بے اختیار کچھ کہنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ لیکن میں ایک خوبصورت سی ائیر ہوسٹس کے نازک ہاتھ سے لیمن جوس کا گلاس لینے کے بعد چسکیاں لے رہا تھا۔

سفر کے اختتام تک مجھے یہ معلومات حاصل ہو گئیں کہ سعید احمد بری طرح زخمی ہوئے ہیں۔ انہیں کم از کم ایک ہفتہ تک ہسپتال میں رکھا جائے گا۔ ماسٹر لوشے سعید احمد کی طرف سے بہت زیادہ محتاط تھا کہ کہیں وہ پولیس والوں کے سامنے اس کی اصلیت ظاہر نہ کر دیں۔ ایک گھنٹے کے بعد انہیں ہوش آیا تو ماسٹر لوشے نے فوراً ہی سوچ کے ذریعے انہیں وارننگ دی۔

"مسٹر سعید! پولیس کو میرے خلاف بیان نہ دینا۔ ورنہ نرس پاگل بنا دی جائے گی۔ اور تم بھی بیان دینے کے قابل نہ رہو گے۔"

سعید احمد نے بڑی نقاہت سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور اس کے جواب میں سوچا۔

"میں تمہارے خلاف کچھ نہیں کہوں گا۔ کیونکہ جو کچھ میں تمہارے خلاف کر سکتا ہوں، اس سے زیادہ فرہاد کر رہا ہے۔ اس حادثے نے مجھے سمجھا دیا ہے کہ وہ اسی طرح کسی دن تمہیں کسی حادثے کا شکار بنا دے گا۔ میرے ہاتھوں سے اسٹیرنگ یونہی نہیں بہک گیا تھا۔ پھر فرہاد نے تمہاری غفلت سے فائدہ اٹھا کر میرے دماغ میں ہلچل مچا دی تھی۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ ایسی حالت میں مجھے کس طرح مجبور کیا گیا تھا۔"

سعید احمد نے اپنے بچاؤ کی خاطر جھوٹ کہہ دیا تھا کہ میں نے ان کے دماغ میں ہلچل مچائی تھی۔ اس جھوٹ کی وجہ سے ماسٹر لوشے ان پر شبہ نہ کر سکا کہ وہ خود کو خطرے میں ڈال کر اس حادثے کے مرتکب ہوئے تھے۔ اس وقت ماسٹر لوشے دل ہی دل میں مجھے گالیاں دے رہا تھا۔ میرے بچ کر نکل جانے پر اندر ہی اندر تلملا رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"مسٹر سعید! فرہاد واقعی شیطان ہے۔ میں نے اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا کہ میری چند لمحوں کی غفلت سے وہ اتنا بڑا فائدہ اٹھائے

کا خیر وہ بکرا کب تک خیر منائے گا۔“
سعید احمد نے جواب دیا۔
”بکرا وہ ہے جو چھری تلے آجائے۔ اب تک تم ہی اس کی ذہانت تلے آتے جارہے ہو۔“
”ہاں یہ درست ہے۔ میں دشمنی کے باوجود اس کی ذہانت کی قدر کرتا ہوں۔ ایسے شخص کو اپنے سامنے جھکا کر اور اسے اپنا آلہ کار بنا کر مجھے کتنی خوشی ہوگی، یہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ ویسے فرہاد کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ دنیا کے جس حصے میں پناہ لینے جائے گا، مادام وہاں پہنچ جائے گی۔ وہ خواہ مخواہ میرا اور اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ اور تم بری طرح زخمی ہوکر اور زیادہ میرا وقت برباد کررہے ہو۔ تم پولیس انسپکٹر کو میری حمایت میں ایسا بیان دو کہ مجھے یہاں سے جلد ہی نکلنے کا موقع مل جائے۔“
سعید احمد ہوش میں آنے کے بعد مادام کو تھوڑی دیر کے لیے بھول گئے تھے۔ اس کا ذکر آیا تو انہوں نے پریشان ہوکر کہا۔
”یہاں سے نکلنے کے بعد مادام تمہیں کہاں لے جائے گی؟ فرہاد اس وقت کہاں ہے؟“
”ایک گھنٹہ پہلے وہ یہاں کی ایک فلائٹ سے کہیں گیا ہے۔ تم بتاسکتے ہو کہ وہ فلائٹ کہاں جاتی ہے؟“
سعید احمد بتانا نہیں چاہتے تھے۔ ماسٹر لوشے نے پھر دھمکی دی کہ وہ انہیں کس طرح ذہنی اذیتیں پہنچاسکتا ہے۔ وہ مجبور ہوکر بتانے لگے۔
”وہ فلائٹ کراچی کے لیے تھی۔ مگر میرا مشورہ ہے کہ ابھی تم وہاں نہ جاؤ۔ پہلے اس ملک کے تاریخی مقامات اور خوبصورت علاقوں کی سیر کرلو۔ نہیں تو فرہاد سے ملاقات ہونے کے بعد سیر و تفریح کی حسرتیں لے کر دنیا سے اٹھ جاؤ گے۔“
ماسٹر لوشے ان کی بات کا جواب نہ دے سکا۔ کیونکہ اسی وقت پولیس انسپکٹر بیان لینے آگیا تھا۔ ماسٹر لوشے نے کمرے سے باہر جاتے وقت سوچ کے ذریعے کہا۔
”سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ یہ نہ بھولنا کہ میں دور جانے کے بعد بھی تمہارے دماغ میں موجود رہوں گا۔“
سعید احمد اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے ایسا کوئی بیان نہیں دیا۔ جو ماسٹر لوشے سے اختلاف کا باعث بنتا جب پولیس انسپکٹر وہاں سے چلا گیا تو ماسٹر لوشے نے سوچ کے ذریعے ان سے کہا۔۔۔
”تم نے اپنے بیان میں مجھے اپنا غیر ملکی دوست اور مہمان بناکر دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ بس اسی طرح میرے وفادار رہو۔ میں بھی تمہارے کام آتا رہوں گا۔“
”اگر کام آنے کا دعویٰ کرتے ہو تو وہ مائیکرو فلم واپس کردو۔“
”ضرور واپس کروں گا پہلے فرہاد کو میری مٹھی میں آنے دو۔“
میں نے اس کی بکواس سن کر اس سے دماغی رابطہ ختم کردیا۔ پھر آنکھیں کھول کر جہاز کی محدود فضا میں نظریں دوڑانے لگا۔ وہاں کی فضا میں رنگوں اور خوشبوؤں کی بہار آئی ہوئی تھی۔ رنگین آنچل، مہکتی زلفیں خوبرو جوانوں اور حسین عورتوں کی دھیمی دھیمی سرگوشیاں۔ لبوں پر دھڑکتے ہوئے دل کی باتیں اور بات بات پر مسکراہٹیں۔ عجیب سا پُراسرار سا رومان انگیز ماحول تھا۔ میرا جسم انگڑائی کے لیے مچلنے لگا۔
میں جس سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گذرنے کا تنگ راستہ تھا۔ راستے کی دوسری طرف والی سیٹ پر ایک حسین مہ جبین دوشیزہ بیٹھی ہوئی تھی۔ تقریباً مجھ سے تین فٹ کے فاصلے پر تھی۔ میں ذرا جھک کر ہاتھ بڑھا کر چھو سکتا تھا۔ مگر چھونے سے وہ میلی ہو جاتی۔ اس کی ایسی اُجلی رنگت تھی اور چہرے پر ایسی چکناہٹ تھی جیسے مکھن کے ڈبے میں رکھ کر اُس کی پرورش کی گئی ہو۔ چہرے کی چکناہٹ پر میری نظریں دیر تک پھسلتی رہیں۔
اسکے ساتھ والی سیٹ پر ایک اچھی شکل و صورت کا نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ لڑکی سے باتیں کرتا تو یوں لگتا جیسے خوشامد کر رہا ہو۔ ایک مرد کی خوشامدوں نے شاید اسے مغرور بنا دیا تھا۔ وہ اسکی باتوں کا بہت کم جواب دیتی تھی اور کبھی کبھی چہرے سے بیزاری ظاہر کرتی تھی۔ اسے نظرانداز کرنے کے لیے کبھی کبھی ادھر اُدھر دیکھ لیتی۔ ایسے ہی وقت اس نے میری طرف بھی دیکھ لیا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پاکر اس نے مغرورانہ انداز میں ہونٹ بچکائے۔ اس کا غرور مجھے پسند نہ آیا لیکن اس کے تیلے خم کھاتے ہوئے لب بچکاتے وقت کچھ اور بھی خوبصورت لگے تھے۔ وہ دل ہی دل میں ”اونہہ“ کہہ کر نظریں پھیر لینا چاہتی تھی۔ لیکن وہ ایسا نہ کرسکی۔ میری مقناطیسی نگاہوں کی گرفت میں آگئی۔
میں نے چند ساعت کے لیے اسکی نگاہوں کو اپنی گرفت میں لیا۔ اس کی آنکھوں سے اس کے دماغ تک پہنچا۔ پھر اسے ڈھیل دے دی۔ اس کے بعد اس کی سوچ کے ذریعے یہ سمجھنے لگا کہ اس کا دل کس بُری طرح دھڑک رہا ہے۔
اس کا دل میری محبت سے نہیں دھڑک رہا تھا۔ بلکہ ایک انجانا سا خوف تھا۔ وہ میری آنکھوں کی مقناطیسی قوت سے گھبرا رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔
”یہ کیسی آنکھیں ہیں۔ نظریں ملتے ہی میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا ہے۔ میرا دل بُری طرح دھڑک رہا ہے۔ یہ شخص خطرناک معلوم ہوتا ہے۔“
میں نے اسکی سوچ میں کہا۔
”خطرناک نہیں ہے۔ میں سمجھنے میں غلطی کر رہی ہوں۔ دراصل اس کی آنکھیں اتنی پُرکشش ہیں کہ میں اپنی مرضی کے خلاف اس کی طرف کھنچ گئی تھی۔“
”اونہہ“ وہ حقارت سے سوچنے لگی ”جیسے دیکھو وہی اپنی نگاہوں کے پھندے میری طرف پھینکتا ہے۔ حسین ہونا بھی مصیبت ہے۔۔۔۔۔ مٹھاس زیادہ ہو تو ساری مکھیاں ایک ہی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔ اونہہ مکھی کہیں کا۔“
میرا خیال درست نکلا۔ وہ بہت مغرور تھی۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ اس کے نوجوان ساتھی نے اسے جھنجھلاتے ہوئے مخاطب کیا۔
”فریال۔ تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“
میں نے فریال کے ذہن میں کہا۔
”چپ مکھی کہیں کا۔۔۔۔۔“
اپنی ہی سوچ کے مطابق وہی بات اس کی زبان سے نکل گئی۔ اس کا ساتھی جوان اپنی توہین پر کچھ بوکھلایا۔ کچھ غصّے سے تمتمایا۔ پھر غصّے کو ضبط کرتے ہوئے دبی ہوئی زبان میں سرگوشی میں کہا۔
”تمہارا دماغ تو صحیح ہے۔؟ اگر میں تمہارے ناز اٹھاتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم میری انسلٹ کرو۔“
فریال پریشان ہوکر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے پھر پہلے کی طرح آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اب اسے دیکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو دماغ کی اسکرین پر اسکی سوچ کے ذریعے اس کی تمام حرکتیں دیکھ سکتا تھا۔ پہلے تو وہ فخریہ انداز میں یہ سمجھ رہی تھی کہ دوسروں کی طرح میں بھی گرما گرم نگاہوں سے اسے دیکھ رہا ہوں۔ اس کے تجربات نے اسے یہی سمجھایا تھا کہ اسے دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ مگر مجھے بڑی بے نیازی سے آنکھیں بند کیے دیکھ کر وہ جل گئی۔ پھر اس نے پلٹ کر اپنے ساتھی کے سامنے صفائی پیش کی۔
”حشمت۔ میں دراصل اس آدمی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جو دوسری طرف آنکھیں بند کیے اپنی سیٹ پر بیٹھا ہے۔۔۔۔۔ میں نے تمہیں نہیں اُسے مکھی کہا تھا۔“
حشمت کی تسلی ہوگئی اس نے مسکرا کر کہا۔
”تم ایسی میٹھی ہو کہ تمام نگاہیں بے اختیار تمہاری طرف اُڑنے لگتی ہیں۔ اس طرح اُڑنے والوں کو تم مکھی کہتی ہو۔ میرے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟“
”میں نے بے اختیار تمہیں مکھی کہا تو تم ناراض ہوگئے تم میری طرف اُڑنا چھوڑ دو، پھر میں اپنی رائے دوں گی۔“
”میں دل سے مجبور ہوں۔ کیا تم مجھے پروانہ نہیں کہہ سکتیں۔ اسکی پرواز میں سچی لگن ہوتی ہے۔“
فریال نے کھڑکی سے باہر پرواز کرتے ہوئے بادلوں کو دیکھا اور پوچھا۔
”یہ جہاز کتنی بلندی پر پرواز کر رہا ہے؟“
”تم ہمیشہ کی طرح پھر مجھے ٹال رہی ہو، میری پرواز میں سچی لگن ہے اس لیے تم مجھے پروانہ کہنے سے کترا رہی ہو۔“
”پی آئی اے کے اس طیارے کی پرواز میں بھی سچی لگن ہے۔ یہ ہمیں بخیریت ہماری منزل تک پہنچاتا ہے۔ اگر بات سچی لگن تک ہے تو میں تمہیں ہوائی جہاز کیوں نہ کہوں۔“
حشمت نے جھینپ کر مسکراتے ہوئے کہا۔
”تم پھر مذاق میں ٹال رہی ہو۔“
”دیکھو حشمت! بور نہ کرو میں کچھ دیر خاموش رہنا چاہتی ہوں۔“
فریال نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی میں نے اسکی سوچ میں کہا۔
”اس کی آنکھیں کتنی عجیب ہیں۔ میں آنکھیں بند کرتی ہوں تو دماغ کی آنکھوں سے اسے ہی دیکھنے لگتی ہوں۔“
اس سوچ کے ساتھ ہی میری آنکھیں اس کے دماغ میں روشن ہوگئیں۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ پھر ذرا گردن گھما کر کنکھیوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اب میری آنکھیں بند نہیں تھیں۔ اس کے باوجود میں اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ بڑی بے نیازی سے چھت کو تک رہا تھا۔ میرے اس رویے سے وہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ میں مکھی نہیں ہوں۔ وہ جتنی بھی میٹھی ہو میں اس کی طرف پرواز نہیں کروں گا۔ تھوڑی دیر پہلے جو ہماری نظریں ٹکرائی تھیں، وہ محض اتفاق تھا، میں کسی لڑکی کو خاطر میں لانے والا نہیں ہوں۔
عورت کے دل میں یہ خیال پیدا ہوجائے تو وہ ذرا کمزور پڑجاتی ہے۔ اسے چھپی چھپی سی توہین کا احساس ہوتا ہے کہ کسی کی نظروں میں اس کے حُسن کا بھاؤ گر گیا ہے۔ تعریفی نگاہوں کے بازار میں ہر حسین عورت اپنے حُسن کی قیمت زیادہ سے زیادہ دیکھنا چاہتی ہے۔ کوئی نگاہ اُسے گرائے تو بڑی جلدی غصّے میں آجاتی ہے۔ اس نے غصّے اور حقارت سے سوچا۔۔۔
”نان سنس۔ بہت سے لوگ بدذوق اور بے حس ہوتے ہیں۔ پھول اور عورت کی خوبصورتی کو نہیں سمجھتے۔ یہ شخص چھت کو دیکھ رہا ہے۔ اگر یہ باذوق ہوتا تو کھڑکی کے باہر اڑتے ہوئے سفید بادلوں کے حُسن کو دیکھتا۔ وہ انسان ہی کیا جو قدرت کے حسن کو نہ دیکھے نہ سمجھے۔ بلکہ ایک ٹھوس چھت کو یونہی گھورتا رہے۔ ایسے گھور رہا ہے، جیسے اس چھت کو اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔ بہت سے لوگ اپنے گھر کی چھت کو اور دیواروں کو محبت سے دیکھتے ہیں اور انہیں رنگ و روغن سے نکھارتے ہیں۔ مگر اپنی گھر والی کے جذبات کو نہیں سمجھتے۔ کیسے بے حس ہوتے ہیں یہ مرد۔۔۔۔۔!“
میں نے فوراً ہی اس کی سوچ میں کہا۔
”اگر میں اس کی گھر والی بن جاؤں تو؟“
”آں۔۔۔ یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ مجھے کیا ہوگیا ہے۔ میں

بہت دیر سے خواہ مخواہ اس کے بارے میں سوچے جا رہی ہوں۔ ممی ٹھیک کہتی ہیں مجھے ایسا ہی نوجوان پسند آئے گا جو مجھ سے بے نیاز رہے گا۔ لیکن میں نے اسے پسند تو نہیں کیا ہے۔ کیا اس کے متعلق سوچنے کا مطلب ہے کہ میں اسے پسند کر رہی ہوں۔ نہیں مجھے کچھ اور سوچنا چاہیئے۔"

وہ سوچنے لگی کہ کراچی پہنچ کر اپنی ممّی سے کس طرح ملوں گی؟ اور کس طرح انہیں سفر کی داستان سناؤں گی۔ اس نے سفر کے دوران بڑا اچھا وقت گذارا ہے اور بہت سی چیزیں دیکھی ہیں۔ ایک ایسے شخص کو بھی دیکھا ہے جسکی آنکھیں مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ واقعی عجیب سی آنکھیں ہیں اس مغرور سے نوجوان کی۔

وہ گھوم پھر کر پھر میرے متعلق سوچنے لگی۔ میں بے اختیار مسکرانے لگا۔ اسی وقت اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ میں اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کی سوچ کے ذریعے کہہ رہا تھا۔

"یہ شخص ایسے مسکرا رہا ہے جیسے سمجھ رہا ہو کہ میں اسی کے متعلق سوچے جا رہی ہوں۔"

وہ اس خیال سے گڑبڑا گئی کہ وہ کیوں میرے متعلق سوچ رہی ہے میں اسکی پریشانیوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس خیال سے خوشی ہو رہی تھی کہ میں ایک بدمزاج حسینہ کے غرور کو توڑ رہا ہوں۔ بہر حال کافی تفریح ہو چکی تھی۔ میں پھر ماسٹر پوشے کی طرف لوٹ گیا۔

وہ ہسپتال سے مرہم پٹی کرانے کے بعد سعید احمد سے رخصت ہو کر ہوٹل کے کمرے میں واپس آ گیا تھا۔ مادام اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہ تنہا بیٹھا سوچ رہا تھا۔

"اب فرہاد کا پیچھا کرنے کے لیے کسی اچھے گائیڈ کی ضرورت ہے سعید احمد اب تک گائیڈ کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ مگر ہسپتال کا ڈاکٹر ایک ہفتے سے پہلے اسے ڈسچارج نہیں کرے گا۔ اس مقصد کے لیے ڈیپارٹمنٹ آف ٹورزم سے رابطہ قائم کرنا ہوگا۔ وہ میرے لیے ایک گائیڈ مہیا کر دیں گے۔ مگر اب تو دفاتر بند ہو چکے ہیں۔ یہ کام کل ہی ہو سکتا ہے۔"

اس کی سوچ سے پتہ چلا کہ کل تک کے لیے خطرہ ٹل گیا ہے۔ مگر کل زیادہ دور نہیں تھا۔ مادام میری بو سونگھتی ہوئی ماسٹر پوشے کو پھر میرے پیچھے لگا دے گی۔ کیا ایسی کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ میں مادام کی سوچ تک پہنچ کر اسکے ذہن کو اپنے کنٹرول میں کر لوں؟

مگر نہیں۔۔۔ یہ احمقانہ خیال تھا۔ اس عورت کا ذہن یقیناً ماسٹر پوشے کے کنٹرول میں ہوگا۔ لہٰذا اس کے دماغ تک پہنچنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ماسٹر پوشے سے ٹکراؤ ہو جائے گا۔ اس خطرناک عورت کو قابو میں لانے کے لیے کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

آدھ گھنٹے بعد میں نے کراچی کی زمین پہ قدم رکھا۔ ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل کر پتہ چلا کہ ٹیکسیوں کی ہڑتال ہے۔ جن مسافروں کے پاس اپنی کاریں تھیں، وہ بڑے آرام سے اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔ فریال کی ممی اسے اپنی کار میں لینے آئی تھیں۔ لگیج ہال کے باہر دونوں ماں بیٹی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ باتوں کے دوران دو بار فریال نے دور سے میری جانب دیکھا۔ سفر کے دوران بھی وہ کئی بار میری طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ وہ اپنی ممی سے باتیں کر رہی تھی مگر میرے متعلق سوچ رہی تھی۔ اور سمجھ رہی تھی کہ میں ٹیکسی کے انتظار میں ساری رات وہاں کھڑا رہ جاؤں گا۔ اسکی گردن فخر سے تن گئی کہ اس کے پاس کار ہے اور میں بے کار ہوں۔ میں نے اس کے ذہن میں کہا۔

"اس شخص سے صرف ایک بار اتفاقیہ نظریں ٹکرائی تھیں۔ اس کے بعد یہ اب تک مجھے نظر انداز کر رہا ہے۔ شاید اس نے مجھے نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ اگر دیکھ لیتا تو بار بار دیکھنے پر مجبور ہو جاتا۔ اگر میں اسے اپنی کار میں لفٹ دوں تو یہ قریب آ کر مجھے دیکھنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

اس کی سوچ نے جھنجھلا کر کہا۔

"لعنت ہے مجھے کیا پڑی ہے کہ میں اسے لفٹ دوں۔"

وہ اپنی ممی اور حشمت کے ساتھ کار کی طرف بڑھنے لگی۔ میں نے بھی کار کی طرف بڑھتے ہوئے ان کے قریب پہنچ کر اسکی ممی کو نہایت مہذب انداز میں مخاطب کیا۔

"میڈم۔ میں اس شہر میں اجنبی ہوں کیا مجھے شہر تک لفٹ مل سکتی ہے؟"

فریال نے اپنی ممّی کے جواب دینے سے پہلے ہی تنک کر کہا۔

"جن کے پاس کاریں نہیں ہوتیں، وہ خواہ مخواہ ہمیں پریشان کرتے ہیں۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"ابھی میرے پاس کار نہیں ہے۔ مگر میں یہاں کار ہی خریدنے آیا ہوں۔ میرے اس بریف کیس میں دو لاکھ روپے ہیں۔"

دو لاکھ کی بات سنتے ہی ممی نے ایک زور کی سانس کھینچی حیرانی سے ایک بار مجھے اور دوسری بار بریف کیس کو دیکھنے لگیں پھر مجھ سے کہنے لگیں۔

"تم اتنی بڑی رقم ساتھ لیے پھرتے ہو اور دوسروں کو بتا بھی دیتے ہو۔ کیا تمہیں سمجھانے والا کوئی نہیں ہے؟"

حشمت مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں فریال پر اپنی امارت کا رعب جما رہا ہوں۔ میں نے تو سچ بات کہی تھی۔ مگر فریال اور اس کی ممی کی آنکھیں بریف کیس سے چپک گئی تھیں۔ اس کی ممی کی سوچ کہہ رہی تھی۔

"اگر یہ رقم مجھے مل جاتی تو کتنے ہی قرضے ادا ہو جاتے۔ میں اس

کار کو بیچ کر نئے ماڈل کی کار خرید لیتی۔ اس طرح دکھاوے کی شان و شوکت کا بھرم رہ جاتا۔ فریال کے ڈیڈی کے مرنے کے بعد میں نے دو لاکھ روپے اب تک ایک ساتھ نہیں دیکھے۔ پتہ نہیں یہ نادان لڑکا سچ کہہ رہا ہے یا ڈینگیں مار رہا ہے۔"

حشمت نے ناگواری سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم اتنے احمق نظر نہیں آتے کہ اتنی بڑی رقم ساتھ لئے پھرو۔ تم خواہ مخواہ اپنی امارت کا رعب کیوں جما رہے ہو؟"

میں نے بریف کیس کو ڈگی کے اوپر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں خواہ مخواہ رعب نہیں جماتا۔ جو سچ ہے وہی کہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے بریف کیس کھول دیا۔ بریف کیس کھلتے ہی فریال اور ممی کی سانسیں اوپر کی اوپر رہ گئیں۔ ممی نے جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"بند کرو۔ اسے جلدی بند کرو۔ لڑکے تم احمق ہو کسی نے دیکھ لیا تو ......"

ممی نے خود ہی بریف کیس کو جلدی سے بند کر دیا پھر گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بولیں۔

"چلو گاڑی میں بیٹھو! اگر میں نے تمہیں چھوڑ دیا تو اپنی حماقتوں سے اس شہر میں لٹ جاؤ گے۔"

میں نے بریف کیس کو لاک کر کے اسے ممّی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ممی اسے آپ ہی رکھیں جب میری ممی زندہ تھیں تو مجھے آپ ہی کی طرح ڈانٹتی تھیں۔ اور مجھ سے پیسے چھین کر رکھ لیتی تھیں۔ آپ بھی تو میری ممی جیسی ہیں۔"

وہ بریف کیس کو ہاتھوں میں لے کر یوں کھل گئیں جیسے سارے جہان کی دولت ہاتھ آ گئی ہو۔ انہیں وقتی طور پر دولت ملی مگر وہ زبان سے کہہ رہی تھیں۔

"مجھے تمہاری صورت میں بیٹا مل گیا ہے۔ مگر نادان بیٹا۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت دولت دیکھی ہے مگر دولت تو آنی جانی چیز ہے۔ تمہارے جیسا بیٹا اتفاق سے ہی ملتا ہے۔"

وہ اتنی محبت سے مجھے بیٹا کہہ رہی تھیں کہ میں یقیناً ان کی محبت کے فریب میں آ جاتا۔ مگر اے ٹیلی پیتھی کے علم تیرا شکریہ، تو مجھے انسانوں کے اصلی چھپے ہوئے بدنما چہرے دکھا دیتا ہے۔ انسان اسی لیے دوغلی حرکتوں کا حامل ہوتا ہے کہ اس کی میٹھی زبان کے پیچھے چھپی ہوئی مکاریوں کو دوسرے لوگ نہیں سمجھتے۔ اسی لیے وہ اپنے وجود کے اندر چھپ کر دوسروں سے فریب کرتا ہے۔

اس وقت ممی کا ذہن بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا کہ مجھے کس طرح وہ اپنی میٹھی چھری کے تلے رکھ سکتی ہیں۔ وہاں سب سے میٹھی فریال تھی۔

جب حشمت ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھا تو ممی بریف کیس لے کر فوراً ہی اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئیں تاکہ فریال میرے ساتھ پچھلی سیٹ پہ بیٹھ سکے۔ دوسرے لفظوں میں میں میٹھی چھری کے تلے آ سکوں۔

میں نے کنکھیوں سے فریال کو دیکھا۔ وہ قدرے نرم پڑ گئی تھی۔ جو تیوریاں چڑھی رہتی تھیں، وہ اتر گئی تھیں۔ وہ اپنے غرور کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ اسی لیے مجھ سے بات نہیں کر رہی تھی۔۔۔ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ عورت کا غرور بالکل ہی ختم ہو جائے۔ خدا نے جب حسن اور نزاکت دی ہے تو اسے اپنے آپ پر ناز کرنے کا حق بھی حاصل ہونا چاہیئے۔ لیکن اتنا زیادہ بھی نہیں کہ وہ دوسروں کو حقارت سے دیکھنے لگے۔

میں فریال سے بعد میں بھی نمٹ سکتا تھا۔ لہٰذا اسے چھوڑ کر اس کی ممی کے ذہن کو پڑھنے لگا۔ وہ بوڑھی عورت حشمت کی موجودگی سے ناگواری محسوس کر رہی تھی۔ کیونکہ حشمت عقب نما آئینے کو فریال کی طرف سیٹ کرنے کے بعد یہ دیکھ رہا تھا کہ میں اسکی محبوبہ سے کتنا قریب ہو چکا ہوں۔ یہ بات ممی کو ناگوار گزر رہی تھی، وہ سوچ رہی تھیں۔

"حشمت اسی طرح سر پہ سوار رہا تو یہ نادان لڑکا ہاتھ سے نکل جائے گا۔ میں اسے کہیں جانے نہیں دوں گی۔ یہ مجھے ممی کہتا ہے۔ میں اسے ماں کا پیار دے کر روک لوں گی۔ یہ درست ہے کہ حشمت بھی خاندانی رئیس ہے۔ مگر کنجوس ہے۔ نوٹ گن گن کر نکالتا ہے اور بینکوں میں چھپا چھپا کر رکھتا ہے۔ اس کے مقابلے میں یہ لڑکا بہت فراخ دل ہے۔ بریف کیس کھول کر دو لاکھ روپے یوں دکھا دیئے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے یہ بھی خاندانی رئیس ہے۔ میں نے تو اس کے بارے میں کچھ پوچھا ہی نہیں ......"

یہ سوچتے ہوئے وہ پلٹ کر مجھ سے پوچھنے لگیں۔

"بیٹے تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام فرہاد ہے۔ مگر میں نے اب تک کسی شیریں کے لیے نہر نہیں کھودی۔"

میری بات پر وہ اس طرح کھل کر قہقہے لگانے لگیں، جیسے میں نے پیٹ پکڑ کر ہنسنے والا لطیفہ سنایا ہو۔ میں نے دیکھا فریال کے لبوں پہ بھی دھیمی سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ ممی نے قہقہوں کی تال پر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے اب تک تمہیں کوئی شیریں نہیں ملی۔"

میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"شیریں تو بہت ملتی ہیں۔ مگر کدال نہیں ملتی۔ ملتی تو نقب لگا کر کسی شیریں کے گھر میں پہنچ جاتا۔"

وہ پھر ہنستے ہوئے کہنے لگیں۔

"تم بہت زندہ دل ہو، میری فریال کو زندہ دلی بہت پسند ہے۔ سنجیدہ لوگوں سے تو یہ دور بھاگتی ہے۔"

حشمت نے تیخ لہجہ میں کہا۔

"ممی پہلے آپ میری سنجیدگی کو دیکھ کر کہتی تھیں کہ فریال کو سنجیدگی پسند ہے۔ آپ بڑی جلدی اپنی بیٹی کے مزاج کو بدل دیتی ہیں۔"

فریال نے بڑی دیر کے بعد تنک کر کہا۔

"حشمت تم میری ممی کی انسلٹ کر رہے ہو۔ یہ میرے مزاج کو کیوں بدلیں گی۔ زندہ دلی کسے پسند نہیں ہوتی؟ مجھے بھی پسند ہے۔"

حشمت نے غصے سے کہا۔

"یہ تم نہیں کہہ رہی ہو۔ تمہاری زبان سے اس اجنبی کے دو لاکھ روپے کہہ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس اجنبی کے پاس دو لاکھ سے زیادہ نہ ہوں۔ کیا تم اس کے بعد میری طرف واپس آؤ گی؟"

فریال نے چیخ کر کہا۔

"یو شٹ اپ۔ تم فرہاد صاحب کو یہ تاثر دینا چاہتے ہو کہ ہم دولت کے لالچی ہیں اور اس لالچ میں تمہارے جیسے بدزبان سے تعلقات بڑھاتے ہیں۔ فوراً گاڑی روکو اور میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ میں تم جیسوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔"

حشمت نے لاپروائی سے کہا۔

"یہ گاڑی تو تمہاری کوٹھی پر پہنچ کر ہی رکے گی۔ تمہارے چیخنے چلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ میں کوٹھی پر پہنچ کر تم ماں بیٹی سے نمٹ لوں گا۔"

میں نے فریال سے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے یہ شخص تم سے بدزبانی کر رہا ہے۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ ایئرپورٹ سے یہ مجھے دشمن کی طرح دیکھتا آ رہا ہے۔ تم لوگوں کے متعلق اس لیے غلط باتیں کر رہا ہے کہ میں بدک کر اپنے دو لاکھ روپے لے کر یہاں سے بھاگ جاؤں۔ مگر میں اتنا نادان نہیں ہوں۔ میں نے ممی کے چہرے پر ممتا کا نور دیکھا ہے، ایسی الٹرا ماڈرن مائیں تو نصیب والوں کو ہی ملتی ہیں۔"

ممی نے خوش ہو کر میری بلائیں لینی چاہیں۔ مگر نہ لے سکیں، کیونکہ بلائیں لینے والے ہاتھوں میں دو لاکھ روپے کا بریف کیس دبا ہوا تھا۔ وہ مجھے زبان سے دعائیں دینے لگیں۔ ان کے پاس بیٹھا ہوا حشمت مجھے برا بھلا کہہ رہا تھا۔ اور چیلنج کر رہا تھا کہ کوٹھی میں پہنچ کر وہ مجھ سے بھی نمٹ لے گا۔ فریال بھی اپنی ممی کی طرف سے اسے باتیں سنا رہی تھی۔ کار کے اندر اچھا خاصا شور مچ گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں کسی نقار خانے میں پہنچ گیا ہوں۔

حشمت سوچ رہا تھا کہ کوٹھی میں پہنچتے ہی وہ کار سے اترے گا۔ اور میرا گریبان پکڑ کر مجھے باہر کھینچ لے گا۔ پھر مجھے فریال کے سامنے اتنا پیٹے گا کہ فریال کو مرد کی صحیح پہچان ہو جائے گی۔ اس کے بعد فریال اس کے بازوؤں میں سسک سسک کر روئے گی اور اپنی غلطی کا اعتراف کرے گی۔ وہ شیخ چلی کی طرح خیالی پلاؤ پکاتا جا رہا تھا۔

کوٹھی کے احاطے میں پہنچ کر اس نے کار روک دی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے ایسا ہی مٹی کا پتلا سمجھ لیا تھا کہ وہ باہر نکل کر مجھے مارتا اور میں خاموشی سے مار کھا لیتا۔ میں نے اسے اتنا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر اترنے کے لیے دروازے کے ہینڈل کی طرف اپنا ہاتھ لے جا رہا تھا۔ میں نے اس کی سوچ میں کہا

"دروازہ اس طرح نہیں کھلے گا۔ مجھے ریوالونڈر کی طرف ہاتھ لے جانا چاہیے۔"

اس کا ہاتھ بے اختیار ریوالونڈر کی طرف گیا اور اسے گھمانے لگا۔ دروازہ کھلنے کی بجائے اس کی کھڑکی کا شیشہ اوپر چڑھنے لگا۔ پھر جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں نے پھر اس کے دماغ کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا کہ اسے سیدھا برآمدے کی طرف جانا ہے۔ وہ نہیں جانا چاہتا تھا۔ میری سوچ نے چیخ کر کہا۔

"جاؤں گا۔ میں جا رہا ہوں۔ میں برآمدے کی طرف جا رہا ہوں....."

وہ بے اختیار برآمدے کی طرف چلا گیا۔ اس دوران ہم سب کار سے باہر نکل آئے تھے۔ فریال اور اسکی ممی حیرانی سے دیکھ رہی تھیں کہ وہ برآمدے کے آخری سرے تک کیوں جا رہا ہے۔ برآمدے کے آخری سرے پر مٹی کے بڑے بڑے گملے رکھے ہوئے تھے۔ جس میں نئے نئے پودے اگ رہے تھے۔ اس کے دماغ میں اس کی اپنی سوچ نہیں تھی۔ وہاں صرف میں ہی میں تھا۔ اس کی سوچ ابھرنا بھی چاہتی تو میری سوچ کی قوتیں اسے دبا دیتیں۔ میں نے اس کی سوچ میں کہا۔

"یہ گملے پودوں کے لیے نہیں ہیں۔ بلکہ ہمارے بیٹھنے کے لیے ہیں۔ مجھے بیٹھ جانا چاہیے۔ اف میں بہت تھک گیا ہوں۔"

یہ سوچتے ہی وہ گملے کی گیلی مٹی پر بیٹھ گیا۔ ممی نے چیخ کر کہا۔

"ارے حشمت تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم کہاں بیٹھ گئے ہو؟"

ممی کی باتیں سن کر وہ چونک گیا۔ وہ ایک دم سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ میری سوچ نے اسے پھر بٹھا دیا۔ فریال کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ میں نے ممی سے پوچھا۔

"کیا اس آدمی کو غصہ آتا ہے تو یہ پاگل ہو جاتا ہے؟"

حشمت نے دور سے چیخ کر کہا۔

"تم پاگل ہو۔ پاگل کے بچے ......"

وہ گملے سے اٹھ کر میری طرف آنا چاہتا تھا۔ لیکن گیلی مٹی کے باعث اس حد تک گملے میں دھنس گیا تھا کہ وہاں سے نکلنے کے لیے اسے سہارے کی ضرورت تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر چپت لگائی۔ وہ غصے سے تلملا گیا۔ اٹھنے کی کوشش کی تو گملے کے ساتھ گر پڑا۔ گملا ٹوٹنے کی وجہ سے وہ آزاد ہو گیا تھا۔ وہ مجھ پر حملہ کرنے کے لیے

فوراً ہی زمین پر سے اٹھنے لگا۔ میں نے اس کے منہ پر زور کی ٹھوکر ماری۔ میرے جوتے کی نوک اس کی ناک پر پڑی تھی۔ وہ برآمدے کے فرش پر زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ کر فرش پر ٹپک رہا تھا۔

فریال اور ممی خاموشی سے اس کے پٹنے کا تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ اس نے دونوں ماں بیٹیوں کو دھمکی دی تھی کہ وہ کوٹھی میں پہنچ کر ان سے نمٹ لے گا۔ نمٹنے کا مطلب یہی تھا کہ ممی نے اس سے اچھی خاصی رقم قرضے کے طور پر لی تھی۔ وہ اس رقم کا سختی سے مطالبہ کرنے والا تھا۔ ممی خوش تھیں کہ ایک ہی بار مار کھانے کے بعد وہ رقم کا مطالبہ کرنا بھول جائے گا۔

میں نے اسے مطالبہ کرنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ ایک ہی ٹھوکر میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ میرے کہنے پر فریال دوڑ کر چھوٹی سی بالٹی میں پانی لے آئی۔ میں نے وہ تمام پانی اس کے چہرے پر ڈال کر اسے ہوش میں لانا چاہا۔ اس نے کراہتے ہوئے ادھر سے ادھر کروٹ لی۔ پھر رفتہ رفتہ ہوش میں آ کر اٹھ بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک وہ آنکھیں پھاڑے خالی خالی نظروں سے ہم تینوں کو تکتا رہا۔ پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کار کی ڈگی تک گیا۔ وہاں سے اس نے اپنا سوٹ کیس نکالا۔ پھر کار کی چابی ممی کے قدموں کے پاس پھینکتا ہوا کوٹھی کے احاطے سے باہر چلا گیا۔ ممی نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"خس کم جہاں پاک۔ بیٹے تمہاری وجہ سے پیچھا چھوٹ گیا۔ ورنہ یہ تو ہم سے کمبل کی طرح لپٹ کر رہ گیا تھا۔"

وہ باتیں کرتی ہوئی مجھے ڈرائنگ روم لے آئیں۔ پھر مجھے وہاں بٹھا کر اپنی بیٹی کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ میرا بریف کیس بدستور ان کے ہاتھ میں تھا۔ دوسرے کمرے میں پہنچتے ہی فریال نے اپنی ممی سے کہا۔

"ممی حشمت کو کیا ہو گیا تھا۔ کیسی پاگلوں جیسی حرکتیں کر رہا تھا۔ اچانک ہی اس کا پاگل ہو جانا کیا عجیب سی بات نہیں ہے؟"

"بیٹی وہ رقابت اور غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔"

"پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔"

"پہلے کبھی فرہاد جیسا دولتمند رقیب اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔ ہمارے جو بھی طلب گار آتے تھے وہ اس کے سامنے کمزور پڑ جاتے تھے۔ فرہاد دولتمند بھی ہے اور دلیر بھی۔ تم نے دیکھا نہیں، اس نے ایک ہی ٹھوکر مار کر اس کے ہوش اڑا دیئے۔"

اپنی ممی کی باتیں سن کر فریال چشم تصور میں مجھے دیکھنے لگی۔ میرا دراز قد، چوڑا سینہ، فولادی بازو سبھی اس کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ پھر میری باتیں اسے یاد آنے لگیں۔ تصور میں ان آنکھوں کو دیکھتے ہی وہ اندر ہی اندر ہولے ہولے کانپنے لگی۔ جس مرد سے خوف آتا ہے۔ وہی دل کو اچھا لگتا ہے۔ اس کی قربت کے خیال سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ مگر ظلم سہنے کی فطرت پاس جانے پر مجبور کرتی ہے۔

ممی کی تجربہ کار نگاہیں بڑی خاموشی سے اپنی بیٹی کے چہرے کو ٹٹول رہی تھیں۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"فریال! فرہاد بہت اچھا لڑکا ہے۔ سب سے بڑی اچھائی یہ ہے کہ وہ دولتمند ہے۔ دوسری اچھائی یہ ہے کہ ذرا احمق ہے۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے اتنی بڑی رقم مجھے رکھنے کے لیے دے دی۔ جس مرد میں یہ سب خوبیاں ہوں، وہ آگے چل کر ایک فرمانبردار شوہر ثابت ہوتا ہے۔ میں نے کھانا تیار کر دیا ہے، تم جا کر کھانا لگاؤ۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر کھاؤ اور تنہائی میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارو۔ تم نے اب تک حشمت جیسے لوگوں کو انگلی پکڑنے کا موقع دیا ہے۔ مگر پہنچے تک پہنچنے کا موقع نہیں دیا۔ فرہاد کو بھی شادی سے پہلے یہ موقع نہ دینا۔ تم خود سمجھدار ہو۔ میں تمہیں کیا سمجھاؤں۔"

فریال کھانا لگانے کے لیے چلی گئی اور ممی میرے پاس آ کر مجھے بور کرنے لگیں۔ بوریت اس لیے ہو رہی تھی کہ وہ ایک ہونے والی ساس کی طرح میرا خاندانی شجرہ پوچھ رہی تھیں۔ اور میں فرہاد علی تیمور کے نام کی مناسبت سے اپنا شجرۂ تاریخ تیمور لنگ سے ملا رہا تھا۔ اور انہیں بتا رہا تھا کہ میرے لاہور کے ایک مکان میں تیمور لنگ کا تاریخی خزانہ دفن ہے۔ وہ مارے خوشی کے پہلو بدلتے وقت صوفے پر سے پھسل پھسل جا رہی تھیں۔ جب فریال نے مجھے ڈائننگ روم میں چلنے کے لیے کہا تو ممی یہ کہہ کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئیں کہ وہ پہلے ہی کھا چکی ہیں۔ میں فریال کے ساتھ ڈائننگ روم آ گیا۔

زندگی کہاں کہاں دوڑاتی ہے۔ کبھی تپتی دھوپ میں جلاتی ہے کبھی زلفوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں بٹھاتی ہے۔ میں کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ دوڑتے دوڑتے فریال جیسی حسین دوشیزہ کے قریب آ کر بیٹھ جاؤں گا۔ رات تھی، تنہائی تھی، کھڑکی کے باہر چاند مسکرا رہا تھا۔ اس وقت میں اپنے تمام دشمنوں کو بھول کر صرف مسکرانا چاہتا تھا صرف فریال کی گداز باہوں کے متعلق سوچنا چاہتا تھا۔ جو میرے گلے کا ہار بننے والی تھیں۔

پہلے پہل وہ چپ چپ سی رہی۔ پھر میں نے اسے بولنے پر مجبور کیا تو وہ عام عورتوں کی مانند ریکارڈ کی طرح بولنے لگی۔ وہ بتا رہی تھی کہ تین برس پہلے اس کے ڈیڈی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے باپ نے جتنی دولت چھوڑی تھی، وہ ساری دولت اس کی ممی تین سال کے اندر جوئے میں ہار گئی ہیں۔ اس کی ممی کو فلیش اور رمی کھیلنے کا مرض لگ گیا ہے۔ اب صرف یہ کوٹھی اور وہ پرانی سی کار رہ گئی ہے تاش کھیلنے کے سلسلے میں وہ حشمت سے [illegible] لے چکی ہیں۔ وہ اپنی ممی کی [illegible] عادت سے بیزار تھی چونکہ اپنی ماں سے بہت زیادہ محبت کرتی تھی اسی لیے ان کی یہ عادت برداشت کر لیتی تھی۔ لیکن اسے یہ بات بہت بڑی

گئی تھی کہ ممی جس سے بھی روپے قرض لیتی ہیں اسے یہ لالچ دیتی ہیں کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی اس سے کردیں گی حشمت بھی یہی امید لے کر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ وہ بڑی اداسی سے کہنے لگی۔

”میں کب تک اپنی ممی کے ہاتھوں میں تاش کا تپا بنی رہوں گی۔ جب بھی انہیں دولت حاصل کرنے کے لیے ترپ چال چلنی پڑتی ہے وہ مجھے آگے بڑھا دیتی ہیں۔ میں کوئی بے جان پتا تو نہیں ہوں۔ آخر انسان ہوں۔ ایک اچھے جیون ساتھی کے ساتھ اپنے گھر کی ایک جنت بنانا چاہتی ہوں۔ مگر یوں لگتا ہے جیسے میں یہ سپنا دیکھتے دیکھتے مر جاؤں گی۔“

یہ کہتے کہتے اچانک ہی اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ میں فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آیا اور اپنی جیب سے رومال نکال کر ان بہتے آنسوؤں کو رومال میں جذب کرنے لگا جو اس کے دل سے نکل رہے تھے۔ میں خیال خوانی کے ذریعے سمجھ رہا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے اس میں ذرہ برابر جھوٹ نہیں ہے۔ جب اس کی سچائی سامنے آئی۔ تب میں نے تسلیم کیا کہ ایسی لڑکی کو حالات کے تحت یقیناً مغرور ہونا چاہیئے۔ زندگی نے اسے یہی سکھایا تھا کہ وہ مغرور بن کر ہی اپنے پاس آنے والے مردوں سے دامن بچا سکتی ہے۔ اس کی ممی بڑے بڑے قرضے لینے کے لیے نوجوانوں سے اس کی دوستی کراتی تھیں — اور فریال اپنی ذہانت سے ان نوجوانوں کو ٹالتی رہتی تھی کہ وہ ابھی ان سے شادی کرنے کے متعلق سنجیدگی سے سوچ رہی ہے۔ اور جب تک شادی نہیں کرے گی، اس وقت تک انہیں اپنی انگلی سے پہنچے تک نہیں پہنچنے دے گی۔

میں عورت کے آنسوؤں سے کبھی متاثر نہیں ہوا۔ کیونکہ اکثر وہ مگرمچھ کے آنسو ہوتے ہیں۔ لیکن میری خیال خوانی نے مجھے یقین دلایا کہ فریال کے آنسو دل کی گہرائیوں سے نکل رہے ہیں۔ وہ واقعی مظلوم ہے مجھے اس پر بڑا پیار آرہا تھا۔ اتنی حسین لڑکی اپنی عمر کی بہاریں یونہی ضائع کردے اور اپنے خواب پورے نہ کرسکے، یہ مجھے گوارا نہ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”فریال جس طرح میں نے تمہارے آنسو پونچھے ہیں۔ اسی طرح میں تمہارے خواب بھی پورے کردوں گا۔ تم کسی ایسے نوجوان کا انتخاب کرو جو تمہارے ساتھ پوری سچائی اور محبت سے ایک خوشگوار زندگی گزار سکے۔ میں تمہاری ممی کے تمام قرضے ادا کرکے انہیں مجبور کردوں گا کہ آئندہ وہ تمہیں تاش کے پتے کی طرح استعمال نہ کریں۔“

میرا آنسو پونچھنے والا ہاتھ اس کے سامنے میز پر رکھا ہوا تھا۔ وہ میری بات کا جواب دینے کی بجائے آگے کو جھکی اور میرے ہاتھ پر اپنے رخسار کی ملائمت کو رکھ دیا۔ اس کی اس ادا سے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ اس نے جیون ساتھی کے طور پر مجھے پسند کیا ہے یا محض میری ہمدردی سے متاثر ہوکر میری ہتھیلی پر جھک گئی ہے۔ اس کے رخسار کی تپش میری ہتھیلی سے میرے دل تک پہنچ گئی۔ عورت کی ادائیں الجھا دیتی ہیں۔ لیکن میں اداؤں سے الجھنے والا بندہ نہیں ہوں۔ میں تو اس کے ذہن کو پڑھ رہا تھا۔ وہ میرے ہاتھ کا سہارا لیے سوچ رہی تھی۔

”مجھے اس سے اچھا سہارا اور کہاں ملے گا؟ دوسری حسین لڑکیوں کی طرح مجھے بھی اپنے حسن پہ ناز تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں تلاش کرتے کرتے اپنے سپنوں کے شہزادے تک پہنچ جاؤں گی۔ اور میں پہنچ گئی ہوں مگر زبان سے کیسے کہوں؟“

میں اس سوچ کو پڑھ کر الجھ گیا۔ کیونکہ میں سپنوں کا شہزادہ بن سکتا تھا جیون ساتھی نہیں بن سکتا تھا۔ اور ایسی لڑکی کو دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا جس نے اب تک بڑے جتن سے اپنی دوشیزگی کو برقرار رکھا تھا یہ درست ہے کہ اب سے پہلے کتنی ہی دوشیزائیں میری زندگی میں آچکی تھیں اور اپنی خوشی سے اپنا سب کچھ ہار گئی تھیں ——— اس وقت میں نے اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ساری عمر جذبات کے اندھیرے میں ایک اندھے کی طرح بھٹکتا رہتا۔ کبھی تو دل میں انسانیت کا ایسا جذبہ جاگتا ہے، جو عورت کی وفا اور پاکیزگی کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔

فریال کے سامنے میرے اندر کا انسان جاگ رہا تھا جو غلطیاں میں نے ماضی میں کیں، وہی غلطی میں فریال کے ساتھ نہیں دہرانا چاہتا تھا۔ میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”فریال میں اچھی طرح سمجھ نہیں سکا کہ تم نے میرے ہاتھ کا سہارا کیوں لیا ہے اگر تم محض ہمدردی سے متاثر ہو تو میں ایک دوست کی طرح تمہارے کام آؤں گا۔ مگر کسی کا جیون ساتھی نہیں بن سکتا۔ کیونکہ میں ایک آوارہ پتے کی طرح حالات کے جھونکوں پر اڑتا پھر رہا ہوں۔ تمہاری جیسی حسین لڑکی کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ اپنے پاؤں میں زنجیر پہ ڈال لوں۔ تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا کر ایک گھر کی جنت میں گم ہوجاؤں۔ تم ایسی ہو کہ میں تمہارے لیے ساری دنیا کو چھوڑ سکتا ہوں۔ لیکن بہت سی مجبوریاں ایسی ہیں کہ میں اپنی اس خواہش کو پورا نہیں کرسکتا۔“

فریال نے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا پھر نظریں جھکا کر آہستگی سے بولی۔

”مجبوری ہے یا آپ بڑی خوبصورتی سے ٹال رہے ہیں۔ یہ سوچ کر ہی میں مر جاؤں گی کہ آپ نے مجھے اپنے قابل نہیں سمجھا۔ میرا دل بہت نازک ہے۔ میں اپنی یہ توہین برداشت نہیں کرسکوں گی۔“

”تم یقین کرو فریال، میں بہت مجبور ہوں۔ سفر کے دوران جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو تمہیں حاصل کرنے کے لیے میرا دل مچل گیا۔ میں ایک عیاش مرد کی طرح تمہاری آرزو کر رہا تھا۔ مگر تمہارے حالات سننے کے بعد میرے ضمیر نے مجھے سمجھایا ہے کہ میں تمہاری معصومیت سے نہ کھیلوں اور میں ساری زندگی تمہارے ساتھ اس لیے نہیں رہ سکتا

کہ میں بہت خطرناک دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں۔ کبھی دشمنوں پر میرا پلہ بھاری ہوتا ہے کبھی وہ بھاری پڑتے ہیں تو میں ان سے چھپتا پھرتا ہوں۔ اسی طرح چھپتا ہوا میں یہاں تک پہنچ گیا ہوں۔ اب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ دشمن کب یہاں پہنچ جائیں گے۔ مجھے یہاں سے بھی بھاگنا پڑ جائیگا۔ تم میرے ساتھ کہاں کہاں تک بھاگتی پھرو گی؟“

اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کے ساتھ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھاگتی پھروں گی۔ آپ مجھے آزما کر دیکھ لیں۔“

”میں ابھی تنہا ہوں۔ دشمنوں سے لڑتا ہوں تو اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتا۔ آگ اور خون کے دریا سے گزرتا چلا جاتا ہوں۔ تم ساتھ ہوگی تو میں تمہارے لیے فکر میں مبتلا ہو جاؤں گا۔“

”یہی تو عورت چاہتی ہے کہ کوئی اس کی فکر کرے۔ کوئی فکر کرتا ہے تو اس کی محبت کا ثبوت ملتا رہتا ہے۔ صرف اپنے لیے لڑنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میرے لیے خطرات میں کودو گے تو یہی مردانگی ہوگی۔“

وہ کتنے سلیقے سے اپنی محبت اور اہمیت کا احساس دلا رہی تھی دشمنوں کے بھیانک چہرے دیکھتے دیکھتے اچانک ہی محبت کا دمکتا مسکراتا چہرہ سامنے آجائے تو زندگی کے حسن کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے جی چاہتا ہے اچانک کہ اپنی محبت کی باہوں میں گر پڑیں۔ مگر باہوں میں گرنے سے پہلے میں نے اس سے کہا۔

”تم میرے متعلق کچھ نہیں جانتی ہو کہ میں کون ہوں۔ میں نے تمہاری ممی سے جھوٹ کہا تھا کہ میں خاندانی رئیس ہوں۔ آج میرے پاس دو لاکھ روپے ہیں۔ ہو سکتا ہے کل پھر ایک کوڑی نہ ہو۔“

وہ ایک دم سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور میرے بالکل قریب آکر بولی —

”آپ میرے سامنے روپے پیسے کی باتیں نہ کریں۔ روپے ممی کی ضرورت ہیں۔ میری ضرورت آپ ہیں۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ آپ کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہوگی تب بھی آپ میرے لیے روٹی کپڑے کا فکر کریں گے۔ مرد کی اسی فکر کا دوسرا نام ازدواجی محبت ہے۔“

وہ میرے اتنے قریب آگئی تھی کہ میں اس سے دور نہ ہو سکا۔ اس کی باتوں میں صداقت تھی، اس کی اداؤں میں محبت تھی، اور وہ اپنے آپ کو صرف میرے لیے مخصوص کر رہی تھی تو میں انکار کیسے کرسکتا تھا؟ میں نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ مجھے آگ اور خون کے دریا سے گزرتے وقت بس ایسی ہستی کی ضرورت ہے جو اپنے پیار سے زندگی کے دوسرے پہلو روشن کرتی رہے وہ میرے ساتھ خطرات میں کود جایا کرے۔ جب دشمن پہنچائے تو وہ محبت کا مرہم لگاتی رہے۔ میری زخمی زندگی کو ایک مرہم کی ضرورت ہے۔ میں نے اسے گلے لگا لیا کہ اب وہ میری تیمار دار بن گئی تھی۔

جب صبح ہوئی تو مجھے ذرا عقل آئی اسلیئے کہ بڑی دیر تک میں نے ماسٹر لوشے کو کو بھلا دیا تھا۔ وہ تو میرے نصیب اچھے ہیں کہ وقت پر عقل آجاتی ہے۔ میں نے ماسٹر لوشے کے ذہن میں جھانک کر دیکھا تو ایک دم سے چونک گیا۔ وہ کسی طیارے میں سفر کر رہا تھا اور مادام کے ساتھ اسی شہر کی طرف چلا آرہا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے اتنی جلدی کوئی گائڈ مل جائے گا۔ بعد میں اس کی سوچ کے ذریعہ پتہ چلا کہ وہ کسی گائڈ کا سہارا لیے بغیر ہی چلا آرہا ہے۔ جس کے ساتھ مادام جیسی کتیا ہو اور جو سونگھ سونگھ کر اس کی منزل کا پتہ اسے بتا دیتی ہو ایسا شخص بھلا گائیڈ کا کیا محتاج ہوگا؟

ابھی وہ طیارے میں سفر کر رہا تھا۔ کوئی غیر ملکی طیارہ تھا، جو کراچی سے ہوتا ہوا مغربی ممالک کی طرف جا رہا تھا۔ ماسٹر لوشے وقت ضائع کیے بغیر مجھ تک پہنچنے والا تھا۔ میں اس کے ذریعے ائیر ہوسٹس کی آواز سن رہا تھا۔ وہ مسافروں سے اطلاعاً کہہ رہی تھی کہ ان کا جہاز ایک گھنٹے بعد کراچی پہنچ جائے گا۔

یہ اطلاع مجھے بھی مل گئی تھی کہ دشمن ابھی مجھ سے ایک گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ یہاں ٹیکسیوں کی ہڑتال تھی۔ یہ بات ماسٹر لوشے نہیں جانتا تھا۔ لیکن وہ بہت محتاط تھا۔ کرائے کی ٹیکسی میں بیٹھ کر میرا پیچھا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے پنڈی انٹرکان سے ٹرنک کال کے ذریعے کراچی انٹرکان میں یہ خبر پہنچائی تھی کہ اس کے لیے فلاں وقت ائیرپورٹ پر کرائے کی کار مہیا کی جائے۔ اس نے مجھ تک پہنچنے کے لیے پورے انتظامات کرلیے تھے۔

یہ ایک گھنٹہ میرے لیے بہت تھا۔ اب مجھے وہاں سے فرار ہونے کا منصوبہ بنانا تھا۔ ماسٹر لوشے مجھ پہ قابو پانے کے لیے کس حد تک بے چین ہو گیا تھا۔ اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے اصول کے خلاف تمام رات جاگتا رہا تھا۔ اس کی زندگی میں کوئی ایسا دشمن نہیں آیا تھا۔ جو اسے ایک رات بھی جاگنے پر مجبور کرسکے۔ وہ ایک رات آرام سے سوکر بل منڈ جیسے آلہ کار کو گنوا چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ میرے اتنے قریب پہنچنے کے بعد رات کو سونا اور مجھے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

میں بیٹھا سوچ رہا تھا اور میرے چہرے سے پریشانی کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ فریال نے اپنی ہتھیلیوں کے کنول میں میرے چہرے کو سجا کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے آپ کچھ پریشان نظر آرہے ہیں؟“

میں اسے کیا بتاتا کہ میں کس طرح اپنے دشمنوں کو قریب آتا دیکھ رہا ہوں۔ وہ قابل اعتماد تھی۔ اس کے باوجود میں پہلی ملاقات میں یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ مجھ میں کیسی حیرت انگیز صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ رفتہ رفتہ اس پر اپنی صلاحیت ظاہر کرنا مناسب تھا۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔

”میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میرے پاؤں میں چکر ہے۔ میں

زیادہ دیر تک ایک جگہ نہیں ٹھہر سکتا۔ اور اب تمہیں اپنے پیچھے چھوڑ کر تنہا آگے بھی نہیں بڑھ سکتا۔ میں ابھی یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گی؟"

اس نے میرے گلے میں باہیں ڈال کر کہا۔

"میرے انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں آپ کے ساتھ سائے کی طرح رہوں گی۔ مگر آپ کو یہاں کیا تکلیف ہے۔ آپ اتنی جلدی مجھے کہاں لے جائیں گے۔ دیکھئے آپ کچھ خیال نہ کریں۔ اب مجھے پوچھنے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔ اس لیے میں پوچھ رہی ہوں۔"

"میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ لیکن ابھی وقت نہیں ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل چلو۔ یہاں سے نکل کر میں راستے میں تمہیں تمام باتیں بتا دوں گا۔ اپنی ممی سے جا کر کہو کہ وہ اپنی کار ہمیں دے دیں۔ دو لاکھ روپے اپنے پاس رکھیں۔ اپنے قرضے ادا کریں اور آرام سے زندگی گذاریں۔ تم ان کے اخراجات کے لیے پیسے بھیجتی رہو گی۔"

فریال نے حیرانی سے پوچھا "کیا آپ ممی کو اتنی بڑی رقم یونہی دے دیں گے؟"

"اس کے بغیر وہ تمہیں آزاد نہیں کریں گی۔ تم دو لاکھ کو اہمیت نہ دو۔ میرے ساتھ آگے بڑھو گی تو تمہارے قدموں میں دنیا جہان کی دولت بکھری ہو گی۔ جلدی جاؤ۔ وقت برباد نہ کرو۔"

وہ ممی کے کمرے کی طرف جانے لگی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے رسٹ واچ کو دیکھا، تاکہ معلوم کر سکوں کہ کتنا وقت گذر چکا ہے۔ مگر کلائی کی گھڑی بند ہو چکی تھی۔ گھڑی دیکھ کر یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ خطرے کی آمد میں کتنے منٹ رہ گئے ہیں۔ اسی وقت مجھے ممی کے کمرے کی طرف سے فریال کی چیخ سنائی دی۔

وہ ایسی دل ہلا دینے والی چیخ تھی کہ میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں بوکھلاہٹ میں یہ نہ سمجھ سکا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک گھنٹہ کیسے گذر گیا؟ اور کیسے آندھی کی طرح مادام اپنے ماسٹر یوشے کو لے کر سر پر پہنچ گئی ہے؟

میں نے ایک جست میں سوئچ بورڈ کے پاس پہنچ کر کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ تاکہ مادام بو سونگھتی ہوئی کمرے کے اندر نہ آسکے۔ اور کمرے کے اندھیرے میں ماسٹر یوشے میرے نقلی چہرے کی نقاب کشائی نہ کر سکے۔ فوری طور پر مجھے بچاؤ کا یہی راستہ نظر آیا تھا۔ مگر میں نے بوکھلا کر خود کو ایک کمرے میں قید کر لیا تھا۔ فرار ہونے کے لیے اس بند دروازے کے سوا دوسرا راستہ نہ تھا۔

اسی وقت دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ کالی آندھی میری طرف چلی آ رہی تھی۔

صبح ہو رہی تھی لیکن کمرے کے اندر لائٹ آف کرنے کے بعد اندھیرا چھیل گیا تھا کھڑکی کے پردوں نے باہر کی روشنی کو روک لیا تھا۔ میں تاریکی میں دروازے کے قریب دیوار سے چپک کر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن رہا تھا جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔

نہ جانے فریال پر کیسی قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ میں اپنی بوکھلاہٹ میں اس کی سوچ تک پہنچنا بھول گیا تھا۔ اب اس کے دماغ تک پہنچنا چاہا تو اچانک ہی اس کی آواز قریب سے سنائی دی۔

"فرہاد آپ کہاں ہیں؟ جلدی آیئے..."

یہ کہتے ہی وہ بند دروازے کو زور زور سے پیٹنے لگی اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ محفوظ تھی کسی دشمن نے اسے نقصان نہیں پہنچایا تھا وہ دشمن کون ہے؟ یہ سمجھنے کے لئے میں نے اپنے سب سے خطرناک دشمن کے ذہن میں جھانک کر دیکھا تو مجھے اپنی بوکھلاہٹ پر بڑی ندامت ہوئی۔ ماسٹر یوشے مادام کے ساتھ ابھی تک طیارے میں سفر کر رہا تھا۔ ابھی ایک گھنٹہ پورا نہیں ہوا تھا میری گھڑی بند ہونے کی وجہ سے مجھے وقت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ جس طرح میں ماسٹر یوشے کے ذہن میں ایک آسیب بن کر چھا گیا تھا۔ اسی طرح ماسٹر یوشے کی کتیا میرے لئے آسیبی چڑیل بن گئی تھی۔ کیونکہ اس کے سونگھنے کی حس کے سامنے میری صلاحیتیں کام نہیں آ رہی تھیں اسی لئے فریال کی چیخ سن کر میرے دماغ میں سب سے پہلے اسی دہشت نے سر اٹھایا کہ مادام پہنچ گئی ہے لعنت ہے اس پر.....

فریال کی دستک سن کر میں نے فوراً ہی لائٹ آن کی اور دروازہ کھول دیا۔ اب کیسا ہی خطرناک دشمن فریال کے پیچھے پڑا ہو میں اسے ٹھکانے لگا سکتا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی فریال بدحواسی میں آگے بڑھی پھر گرپڑنے کے انداز میں میرے بازوؤں میں جھول گئی۔ اور ہانپتی کانپتی کہنے لگی۔

"ممی میری ممی کو کسی نے ہلاک کر دیا ہے۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی میں اسے تھپک تھپک کر تسلیاں دینے لگا۔ پھر اسے سہارا دیکر اس کی ممی کے کمرے میں آیا۔ ممی پلنگ پر چاروں شانے چت پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے سینے پر ایک تکیہ پڑا ہوا تھا اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ قاتل نے اس تکئے کو ان کے منہ پر رکھ کر ان کی سانس روک دی تھی۔ اب وہ دوبارہ کبھی سانس نہیں لے سکیں گی۔ زندگی سے انکا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔

فریال ان کی طرف دوبارہ نہ دیکھ سکی۔ منہ چھپا کر [illegible] اس کے قریب آ کر اسے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگا۔

"صبر کرو فریال تمہاری ممی اب کبھی واپس نہیں آئیں گی۔ ہمیں

سب سے پہلے یہ سوچنا چاہئیے کہ کس نے ان سے دشمنی کی ہے۔"

ایسا کہتے وقت میں دیوار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ماسٹر یوشے کے یہاں پہنچنے کے لئے صرف ۲۰ منٹ رہ گئے تھے۔ میری پریشانی بڑھ گئی۔ ایک نئی افتاد آن پڑی تھی۔ میں ممی کی لاش کو یونہی چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ فریال بھی ان کی لاش کو بے گور و کفن چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ میں اس قاتل پر جھنجھلانے لگا جس نے میرے راستے میں رکاوٹ پیدا کر دی تھی۔ اسی جھنجھلاہٹ میں حشمت یاد آیا۔

فریال میرے سینے سے لگی رو رہی تھی۔ میں اسے تھپکتے ہوئے حشمت کے ذہن میں جھانکنے لگا وہ اپنی کار ڈرائیو کرتا ہوا اپنی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ اور اس قتل کے متعلق سوچ رہا تھا جو اس کے ہاتھوں سے ہوا تھا وہ اپنی کامیابی پر مسکرا رہا تھا کہ اس نے ممی جیسی بیٹی کی دلالہ سے اچھی طرح انتقام لیا ہے۔ اس نے ممی کو بارہ ہزار روپے قرض کے طور پر دیئے تھے۔ اب وہ سود در سود دو لاکھ روپے لے کر جا رہا تھا میں نے اس کی سوچ میں کہا۔

"بیٹے حشمت کہاں جا رہے ہو؟"

اس نے اک دم سے چونک کر کار روک دی اور بوکھلا کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھنے لگا اور سوچنے لگا۔

"یہ۔ یہ کون بول رہا تھا؟ مجھے یوں لگا جیسے پچھلی سیٹ پر کوئی بیٹھا ہو۔ نہیں میرے دماغ میں کسی کی آواز گونج رہی تھی۔"

میں نے پھر اس کے دماغ پر دستک دی۔

"بیٹے اپنے دل کے دروازے کھولو۔ میں تمہارا ضمیر بول رہا ہوں۔ اگر تم اپنے ضمیر کی بات نہیں سنو گے تو ابھی کسی حادثے کا شکار ہو جاؤ گے۔"

اس نے بیزاری سے کہا۔

"نان سنس۔ کبھی ضمیر بھی اس طرح بولتا ہے۔ میں نے تو کبھی نہیں سنا۔ یہ سب بکواس ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے دوبارہ کار اسٹارٹ کی اور ایکسلیٹر پر پوری قوت سے دباؤ ڈالا یہ میں نے اس کی سوچ میں ہدایت کی تھی کہ وہ ایکسلیٹر پر اسی طرح دباؤ ڈالے۔ الٹے سیدھے گیئر بدلتا رہے۔ اور اس کے ہاتھ جھٹکے سے اسٹیرنگ کو ادھر ادھر گھماتے رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کار ادھر سے ادھر ڈگمگانے لگی۔ کبھی دائیں طرف اور کبھی بائیں طرف جانے لگی۔ اسی وقت ایک ٹریفک پولیس انسپکٹر اپنی بھاری بھرکم موٹر سائیکل دوڑاتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے اس کی کار رکوا کر اندر جھانک کر دیکھا تو پچھلی سیٹ پر نوٹوں کی گڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ حشمت نے میرے دو لاکھ روپے پچھلی سیٹ پر ڈال کر بریف کیس کہیں پھینک دیا تھا۔ انسپکٹر نے غرا کر پوچھا۔

"تم کس طرح ڈرائیو کر رہے ہو کیا تم نے شراب پی رکھی ہے؟"

حشمت کے جواب دینے سے پہلے ہی میں نے اس کے دماغ کو کنٹرول میں لیتے ہوئے کہا۔

"انسپکٹر۔ میں نے ایک عورت کو قتل کر دیا ہے۔ اس سے دو لاکھ چھین کر لے آیا ہوں۔ اب میرا دل بُری طرح گھبرا رہا ہے خدا کے لئے تم میری مدد کرو۔ مجھے حفاظت سے گھر پہنچا دو میں تمہیں اس میں سے آدھی رقم دے دوں گا۔"

میری سوچ کے مطابق یہ باتیں اس کی زبان سے نکلتی گئیں پھر وہ اپنے سر کو تھام کر سوچنے لگا۔

"یہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔؟ میں واقعی گھبرا رہا ہوں کسی انسانی زندگی کو چھین لینا آسان کام نہیں ہے۔ شاید اسی لئے اناڑی قاتلوں پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔"

اس وقت تک پولیس انسپکٹر نے اپنی گاڑی ایک طرف کھڑی کر دی تھی۔ پھر اس کے پاس آ کر اسے دوسری سیٹ کی طرف دھکیل کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ابھی تم تھانے چلو وہاں سے پولیس والوں کے ساتھ جا کر تمہیں اس عورت کی لاش اور وہ جگہ دکھانی ہو گی۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہر پولیس والا بے ایمان اور رشوت خور ہوتا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں نے فریال سے کہا۔

"دیکھو فریال اگر ہم یہاں رہے تو میں مصیبت میں پڑ جاؤں گا تم ممی کی لاش کو یہیں چھوڑ کر میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ابھی تھوڑی دیر میں قاتل گرفتار ہو کر یہاں آئے گا اور تمہاری غیر موجودگی میں بھی تمہاری ممی کے کفن دفن کا انتظام ہو جائے گا۔"

وہ روتے روتے کہنے لگی۔

"میں نے آپ کے ساتھ چلنے سے انکار نہیں کیا ہے مگر آپ یہ سوچئے کہ اس حالت میں ایک بیٹی اپنی ماں کو چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہے؟"

"تم درست کہتی ہو تمہاری یہاں موجودگی ضروری ہے۔ ایسی صورت میں مجھ پر بھروسہ کرو اور مجھے تنہا جانے دو۔"

وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ میں اُسے چھوڑ کر چلا جاؤں۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا پھر ماسٹر یوشے کے ذہن کے ذریعہ ایئر ہوسٹس کی آواز سنی وہ کہہ رہی تھی

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین، ہمارا طیارہ پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی کی فضا میں پرواز کر رہا ہے۔ دس منٹ کے بعد آپ اس شہر کی زمین پر قدم رکھ سکیں گے....."

یہ سنتے ہی میں فریال کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے کوٹھی سے باہر جاتے ہوئے کہنے لگا

"اب اگر میں نے تمہیں اپنی اصلیت نہیں بتائی تو میں ادھر کا

رہوں گا نہ اُدھر کا۔ سنو میں غیب کی باتیں جان لیتا ہوں۔ دوسرے انسان جو سوچتے ہیں اسے میں سن لیتا ہوں تم اس وقت کچھ بھی سوچو میں اسے سن کر بتا دوں گا۔"

وہ مجھے حیرانی سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

"میں کیا سوچوں۔ آپ عجیب سے پُراسرار آدمی ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ آپ مجھ سے دور بھاگنے کے لئے خیالی دشمنوں کی باتیں کرتے ہیں۔ پھر آپ کی محبت کا اندازہ دیکھتی ہوں تو آپ کے بازوؤں میں مر جانے کو جی چاہتا ہے۔"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"بس کرو اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہی ہو۔"

جب میں نے اسے بتایا تو شدید حیرانی سے اس کا منہ کھل گیا میں نے کہا۔

"تم تعلیم یافتہ ہو تم نے ٹیلی پیتھی کے علم کے متعلق بہت کچھ سنا بھی ہوگا اور پڑھا بھی ہوگا۔ اسی علم کے ذریعے میں نے حشمت کو پاگل بنا کر گلے میں بٹھایا تھا۔ اسی علم کے ذریعے میں نے تمہارے دل کی سچائی کو سمجھا ہے جو تمہارے دل میں تھا وہی تم نے زبان سے کہا اسی لئے میں نے بھی تمہیں ایک عیّاش مرد کی طرح دھوکہ نہیں دیا تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنانے کا عہد کر لیا ہے۔ اسی علم کی بدولت میں نے ابھی معلوم کیا ہے کہ ممّی کا قاتل حشمت ہے۔ میں نے ابھی اسے پولیس کے ہتھے چڑھا دیا ہے بہت جلد پولیس والے اسے لے کر یہاں آئیں گے۔"

فریال میری باتیں حیرانی سے سنتی جا رہی تھی اور یقین کرتی جا رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گئی اور کہنے لگی۔

"میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مجھے زندگی گذارنے کیلئے اتنی حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک ملے گا۔ آپکو پا کر میرے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں۔"

میں نے پیار سے اس کے سر کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"اب میرے پاس یہاں ٹھہرنے کا وقت نہیں ہے میں نے یہ بات تمہیں اس لئے بتائی ہے کہ تمہیں اطمینان رہے کہ میں دور جانے کے باوجود تمہارے دل اور دماغ میں موجود رہوں گا اور سوچ کے ذریعے تم سے گفتگو کرتا رہوں گا۔ اب میں جا رہا ہوں تمہیں جو کچھ کہنا ہے سوچ کے ذریعے کہو تمہیں میری طرف سے جواب مل جائے گا۔"

یہ کہہ کر میں کار کی طرف بڑھنے لگا۔ فریال نے سوچ کے ذریعے پوچھا۔

"میری جان میرے ایمان پھر ہم کب ملیں گے ؟"

میں نے بھی سوچ کے ذریعے جواب دیا پھر کار کا دروازہ کھولتے ہوئے اس سے پوچھا

"کیا تمہارے دماغ نے میرا جواب سن لیا ہے ؟"

وہ خوش ہو کر بولی۔

"ہاں آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ جلد واپس آئیں گے اور سوچ کے ذریعے اپنے حالات سے آگاہ کرتے رہیں گے۔ اللہ آپ کتنے عجیب و غریب آدمی ہیں ذرا ایک منٹ ٹھہریئے میں ابھی آتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ دوڑتی ہوئی کوٹھی کے اندر چلی گئی۔ میں کار کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا وہ جلد ہی واپس آئی اس کے ہاتھ میں ایک سینٹ کی شیشی تھی اس نے اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس خوشبو کو رکھ لیجئے میری یاد آتی رہے گی۔"

اپنی محبوبہ کی یاد ایک خوشبو ہی ہوتی ہے اس نے محبت کا بہت اچھا تحفہ دیا تھا۔

دوسری طرف طیارہ کسی دیو کی طرح سانس لیتا ہوا لینڈ کر رہا تھا میں نے کار اسٹارٹ کی اُسے خدا حافظ کہا اسکے بعد نیشنل ہائی وے کی طرف چل پڑا۔ دس منٹ بعد میں اس راستے پر چلتا ہوا ائیرپورٹ کے قریب سے گذر رہا تھا۔ مادام طیارے سے اترتی ہوئی اجنبی زبان میں ماسٹر یوشے سے کچھ کہہ رہی تھی میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ میری بُو کو اپنے بہت قریب محسوس کر رہی ہے

ماسٹر یوشے اس کے ساتھ تیزی سے لگیج ہال کی طرف بڑھ رہا تھا تاکہ جلد از جلد اپنا سامان حاصل کر کے میرے پیچھے آسکے۔ وہ جتنی جلدی کر رہا تھا۔ اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ سامان ابھی طیارے سے اتار کر لگیج ہال میں پہنچایا جا رہا تھا۔ ابھی اسے حاصل کرنے میں کافی وقت لگ سکتا تھا۔ اتنی دیر میں میں دس میل آگے جا چکا تھا۔ مادام اسے بتا رہی تھی کہ میری بُو کس طرف دور ہوتی چلی جا رہی ہے ماسٹر یوشے کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا سامان بھی ضروری تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر میری طرف نہیں بڑھ سکتا تھا۔

میرے نصیب اچھے تھے کہ اسے دیر ہوتی جا رہی تھی اور مجھے بہت دور نکل جانے کی مہلت ملتی جا رہی تھی۔ جب وہ سامان لے کر کرائے کی کار کی طرف آیا تو ڈرائیور سے باتیں کرنے میں پندرہ منٹ گذر گئے۔ اس نے پنڈی سے ٹرنک کال کے ذریعے یہ خبر بھیجی تھی کہ ڈرائیور صرف ائیرپورٹ تک کار لے کر آئے۔ اس کے بعد وہ خود کار کو ہینڈل کرے گا۔ ڈرائیور نے اسے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں سمجھایا

"صاحب آپ ہوٹل چل کر بات کریں۔ ضروری کاغذات کی خانہ پُری کریں پھر یہ کار آپکو مل جائے گی۔"

ماسٹر یوشے کی جھنجھلاہٹ دیکھنے اور سمجھنے کے قابل تھی۔ وہ چاہتا تو خیال خوانی کے ذریعے ڈرائیور کو اپنا تابع فرمان بنا سکتا تھا۔ مگر اس طرح وہ کار کو غیر قانونی طور پر حاصل کرتا۔ کار اپنی مقررہ مدت پر ہوٹل نہ پہنچتی تو ماسٹر یوشے کے خلاف ایکشن لیا جاتا۔ وہ مجبور تھا

اسے ہوٹل تک جانا ہی پڑا۔

میں نے اطمینان کی سانس لی کچھ دیر کے لئے پھر اس شیطان سے پیچھا چھوٹ گیا۔ اب وہ واقعی صبر سے کام لے رہا تھا۔ جلد بازی چھوڑ دی تھی۔ وہ سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔

"مجھے جلد از جلد ایسی گاڑی حاصل کرنی چاہئیے جسے استعمال کرتے وقت قانون آڑے نہ آئے اس مقصد کے لئے ہوٹل پہنچ کر کسی احمق گاڑی والے کو پھانسنا ہوگا۔"

میں نے اس کے ہوٹل پہنچنے تک اس سے ذہنی رابطہ ختم کر دیا اور فریال کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ اس کی سوچ بتا رہی تھی کہ پولیس والے حشمت کو لے کر وہاں پہنچ گئے ہیں اور ممّی کی لاش کے پاس۔ . . . ضروری کارروائیوں میں مصروف ہیں حشمت پولیس انسپکٹر سے کہہ رہا تھا

"جناب۔ اُس وقت میرا ذہن قابو میں نہیں تھا۔ پریشانی میں نہ جانے کیا کہہ گیا۔ دراصل میں صرف دو لاکھ روپے کر بھاگ رہا تھا۔ اس بوڑھی عورت کو فرہاد نامی ایک شخص نے قتل کیا ہے۔ وہ شخص فریال کا عاشق ہے۔"

فریال نے غصّے سے کہا۔

"یہ جھوٹ ہے خود کو بچانے کے لئے دوسروں پر الزام لگا رہا ہے۔ فرہاد صاحب میرے منگیتر ہیں۔ ممّی میری شادی اُن سے کرنا چاہتی تھیں۔ وہ کل رات کو پنڈی سے میرے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ یہ حشمت بھی میرے ساتھ تھا۔ یہاں پہنچ کر فرہاد صاحب نے ہمارے ساتھ رات کا کھانا کھایا پھر ممّی کی کار لے کر میرے اور ممّی کے سامنے ہی رخصت ہو کر حیدرآباد چلے گئے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ آج شام کو واپس آجائیں۔ وہ بیچارے جانتے بھی نہیں ہیں کہ میری ممّی کے ساتھ کیا ہو چکا ہے اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ میں اس دنیا میں تنہا رہ گئی ہوں تو وہ اپنی ساری مصروفیات چھوڑ کر یہاں چلے آئیں گے میں انہیں اطلاع بھی نہیں دے سکتی پتہ نہیں وہ حیدرآباد پہنچ کر کہاں رہیں گے۔"

حشمت نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"یہ اپنے عاشق کو بچانے کے لئے غلط بیان دے رہی ہے۔ جب میں یہاں صبح پانچ بجے پہنچا تو ممّی یہاں گہری نیند سو رہی تھیں اور یہ اپنے عاشق کے ساتھ اپنے کمرے میں تھی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔

انسپکٹر نے سوال کیا۔

"دروازہ اندر سے بند تھا اس لئے تم فرہاد کو نہیں دیکھ سکے"

میں نے حشمت کے ذہن میں کہا۔

"جی ہاں۔"

انسپکٹر نے دوسرا سوال کیا۔

"لہٰذا تم یہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ فرہاد فریال کے کمرے میں یا کوٹھی میں موجود تھا۔"

میں نے پھر حشمت کے ذہن میں کہا۔

"جی ہاں۔"

انسپکٹر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"لہٰذا تم موقع غنیمت جان کر اس کمرے میں آئے اس بوڑھی عورت کو ہلاک کیا اور دو لاکھ روپے لے کر نکل گئے۔"

"جی ہاں۔"

حشمت میری سوچ کے مطابق جی ہاں۔ کہتا جا رہا تھا۔ انسپکٹر نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ حشمت کے دونوں ہاتھ ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے وہ سنبھل نہ سکا طمانچہ کھاتے ہی پیچھے کی طرف لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ اب وہ یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف خود بخود کس طرح اقبالِ جرم کر رہا ہے۔ میں نے اس کے دماغ پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹے یاد کرو تمہیں پہلے ہی بتایا گیا ہے کہ تمہارے اندر اب تمہارا ضمیر بول رہا ہے۔ اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو پوری طرح ہوش و حواس میں آکر اپنے قاتل ہونے کا اقرار کر لو۔ اب کسی طرح تمہاری جان نہیں بچے گی۔"

پولیس انسپکٹر اس کے سامنے کھڑا ہوا حقارت سے کہہ رہا تھا

"بیوقوف کے بچے۔ ایک تو تم نے قتل کیا دوسرے یہ کہ پاگل بننے کی کوشش کر رہے ہو تھوڑی دیر میں اپنا بیان بدلتے ہو جب حوالات میں ڈنڈے پڑیں گے تو تمہارا سارا پاگل پن دور ہو جائے گا۔"

مجھے اطمینان ہو گیا کہ حشمت اب کسی طرح بچ نہیں سکے گا۔ میرے دو لاکھ روپے جو پولیس کی کسٹڈی میں جا چکے تھے۔ مجھے ان روپوں کی فکر نہیں تھی میں جانتا تھا کہ مقدمے کا فیصلہ ہونے کے بعد یہ روپے فریال کو مل جائیں گے۔ کیونکہ فریال یہ بیان دے رہی تھی کہ وہ روپے اس کی ممّی کے تھے وہ اس دولت کو بینکوں میں رکھنے کی بجائے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتی تھیں بیٹی نے ماں کو کئی بار سمجھایا کہ وہ روپے بینک میں محفوظ رہیں گے مگر وہ کسی کی نہیں سنتی تھیں انجام کار اس دولت کی خاطر اپنی جان گنوا بیٹھیں۔

فریال اتنی ذہانت سے بیان دے رہی تھی کہ وہ روپے بھی اسے مل جاتے اور مجھ پر بھی کوئی آنچ نہ آتی۔ ایک تعلیم یافتہ ذہین عورت کی رفاقت سے مرد کو بڑا حوصلہ ملتا ہے میں نے فریال جیسی حسین لڑکی کے ساتھ زندگی گذارنے کا فیصلہ کر کے غلطی نہیں کی تھی۔ وہ شریکِ سفر بنتے ہی یہ ثابت کر رہی تھی کہ وہ قدم قدم پر میرے لئے ڈھال بھی بن سکتی ہے اور میری امان میں بھی رہ سکتی ہے۔ میں نے خوش

ہو کر اس کے ذہن پر دستک دی۔

"ہیلو فریال۔ میں تمہارا فرہاد ہوں اور سوچ کے ذریعے تم سے مخاطب ہوں۔"

وہ گھبرا کر آس پاس کھڑے ہوئے پولیس کے آدمیوں کو دیکھنے لگی کہ کہیں کوئی میری آواز تو نہیں سن رہا ہے؟ پھر جلد ہی اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ بھلا دماغ کے اندر ہونے والی باتیں کون سن سکتا ہے؟ وہ اتنے لوگوں کے درمیان خاموش رہ کر سوچ کے ذریعے گفتگو کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ اس نے اپنا سر تھام کر انسپکٹر سے کہا۔

"یہاں میری طبیعت گھبرا رہی ہے۔ کیا آپ مجھے میرے کمرے میں جا کر آرام کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں؟"

انسپکٹر نے اسے اجازت دے دی وہ تیزی سے پلٹ کر اس کمرے سے نکل گئی اور اپنے بیڈ روم کی طرف جانے لگی۔ میں نے کہا۔

"میری جان یہ تم نے اچھا کیا کہ تنہائی کا بہانہ ڈھونڈ لیا۔"

فریال نے اپنے کمرے میں پہنچ کر کہا۔

"فرہاد۔ آپکو اپنے دماغ میں موجود پا کر عجیب سا لگ رہا ہے آپ نے مجھے کیسی عجیب سی سوچ کی نگری میں پہنچا دیا ہے۔ آپ سے دور رہ کر بھی دوری کا احساس نہیں ہوتا عورت یہی تو چاہتی ہے کہ اس کا چاہنے والا اس کے اندر موجود رہے۔"

"ہاں میں ہمیشہ تمہارے دماغ کی رگوں میں لہو کی طرح دوڑتا رہوں گا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تھوڑی دیر بعد پولیس والے قاتل کو گرفتار کر کے وہاں پہنچنے والے ہیں۔ اب میں تمہیں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ حشمت پولیس والوں کے سامنے کس طرح بیانات بدلتا رہا ہے اور کس طرح انسپکٹر کا طمانچہ کھا کر زمین پر گر پڑا تھا۔

وہ بستر سے تکیے کو اٹھا کر اسے اپنے سینے سے لگا کر بھینچتے ہوئے بولی۔

"جان فریال۔ آپ جادوگر ہیں۔ آپ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رہتی۔ آپ نے میرا بیان بھی سن لیا ہوگا۔ اگر کوئی غلطی کی ہو تو بتایئے؟"

"اگر تم کوئی غلطی کرتیں تو بیان دینے کے دوران ہی میں تمہیں ٹوک دیتا اور تمہاری رہنمائی کرتا۔ مگر تم واقعی ذہین ہو۔ میں تم پہ فخر کرتا ہوں۔"

میری بات سن کر وہ خوش ہو رہی تھی۔ اور تکیے کو بدستور سینے سے لگا کر بھینچے جا رہی تھی میں نے شرارت سے کہا۔

"وہ تکیہ ہے۔ میں نہیں ہوں۔۔۔۔۔"

وہ اک دم سے جھینپ گئی۔ بوکھلا کر خلاء میں یوں تکنے لگی جیسے مجھے دیکھتے ہوئے مخاطب کر رہی ہو۔

"کمال ہے میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ آپ ٹیلی پیتھی کے ذریعے صرف انسان کی سوچ پڑھتے ہیں۔ مگر آپ تو ان کی حرکتیں بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

"ہاں دماغ کی اسکرین پر اس وقت تم صاف طور سے نظر آرہی ہو تم ذہین ہو اس نکتے پر غور کرو کہ انسان اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتا جب تک کہ دماغ حکم نہ دے تمہارا اٹھنا بیٹھنا ہاتھ پاؤں ہلانا۔ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ تمہاری سوچ ان کاموں کی تحریک پیدا نہ کرے۔ بہت ہی غیر محسوس طریقے سے دماغ بولتا جاتا ہے اور انسان اس کے مطابق حرکتیں کرتا جاتا ہے۔"

فریال نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں بھول گئی تھی کہ انسان کے دماغ میں پہلے کچھ کرنے کا خیال آتا ہے پھر وہ اسی خیال کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اب میں اچھی طرح سمجھ گئی کہ آپ نے حشمت کو بھی کس طرح انسپکٹر کا طمانچہ کھا کر گرتے دیکھا ہے۔ اس طرح تو آپ جب چاہتے ہوں گے۔ دوسرے انسانوں کی عجیب و غریب حرکتیں دیکھتے رہتے ہوں گے۔ کوئی آپ سے اپنے اندر کی بات چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔ اللہ میں تو بڑی الجھن میں پڑ گئی ہوں۔"

"الجھن کیسی؟" میں نے پوچھا۔

"ہر عورت اپنے چاہنے والے سے بھی اپنے بہت سے نازک جذبوں کو چھپا کر رکھتی ہے۔ وہ ان کھٹے میٹھے جذبوں کو اپنی اداؤں سے ظاہر کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ مرد اس کی اداؤں کی زبان سن لے۔ مگر آپ تو خطرناک قسم کے چور ہیں۔ اِدھر میں کچھ سوچوں گی اُدھر آپ سمجھ لیں گے۔ میں تو بڑی الجھن میں پڑ گئی ہوں۔"

میں اس کی باتیں سن کر ہنسنے لگا۔

"آپ کی سوچ کی لہریں بتا رہی ہیں کہ آپ میری باتوں پر ہنس رہے ہیں۔ اچھا بتایئے اس وقت میں کیا سوچ رہی ہوں؟"

"تم سوچ رہی ہو کہ اس وقت تکیہ کی جگہ میں آجاؤں۔"

اس کی شرماتی لجاتی سوچ نے کہا۔

"آجایئے نا۔۔۔۔۔"

"دشمنوں سے نجات نہیں ملی ہے ورنہ تمہارے بولنے سے پہلے چلا آتا۔"

"آخر وہ دشمن کون ہیں مجھے بھی تو بتایئے۔"

میں اسے بتانے لگا: "میں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے خطرناک دشمنوں کو نیچا دکھایا ہے لیکن اس بار جو دشمن ٹکرا رہا ہے وہ مجھ سے زیادہ ٹیلی پیتھی کا عالم ہے میں اس سے بچتا پھر رہا ہوں اس کی سوچ کی لہریں اتنی طاقتور اور شیطانی ہیں کہ اگر میرا دماغ اسکی گرفت میں آگیا تو وہ مجھے بڑی آسانی سے اپنا غلام بنا لے گا اور مجھے محکومانہ زندگی گذارنے پر مجبور کرے گا اسی لئے میں نے اب تک یہی

کوشش کی ہے کہ وہ میرے دماغ تک نہ پہنچنے پائے۔ میں تمہیں یہ بات سمجھا دوں کہ کوئی بھی ٹیلی پیتھی جاننے والا کسی کی دماغی سوچ تک کیسے پہنچتا ہے؟ دوسرے کی سوچ تک پہنچنے کے دو اہم ذرائع ہیں۔ پہلا ذریعہ انسان کی آنکھیں ہیں کیونکہ آنکھیں اکثر اندرونی جذبات کی چغلی کھاتی ہیں۔ دوسرا ذریعہ انسان کی گفتگو ہے۔ ایک شخص کی گفتگو کا جو لہجہ ہوتا ہے وہی اس کی سوچ کا بھی لہجہ ہوتا ہے وہ جس انداز میں سوچتا ہے اسی انداز میں بولتا ہے۔ میرا ٹیلی پیتھی جاننے والا دشمن انہی دو ذرائع سے میرے دماغ تک پہنچ سکتا ہے۔ اسی لئے میں اس کے آلہ کاروں کے سامنے اب تک گونگا بنا رہا ہوں کیونکہ وہ اپنے آلہ کاروں کی سوچ کے ذریعے میری گفتگو اور میری سوچ کے لہجے تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔"

فریال نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"دشمن کی یہ حرکتیں آپ کے لئے جتنی خطرناک ہیں دوسرے سننے والوں کے لئے اتنی ہی دلچسپ ہیں۔ مجھے دلچسپی بھی ہوتی جا رہی ہے اور یہ سوچ سوچ کر الجھتی بھی جا رہی ہوں کہ آپ کتنی پریشانیوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ آپ کے دن رات کا سکون برباد ہو گیا ہے۔"

"یہ درست ہے کہ دشمن پریشانیوں میں مبتلا کر رہا ہے مگر مجھے تم سے کچھ سکون بھی مل رہا ہے۔ مصیبتوں کی دھوپ بھی ہے اور تمہاری زلفوں کی چھاؤں بھی، اسی کا نام زندگی ہے۔ تم میری فکر نہ کرو۔ میں نے اس کے تمام آلہ کاروں کو ٹھکانے لگا دیا ہے اب ماسٹر یوشنے خود ہی پریشان ہو کر مجھے اپنے قابو میں کرنے کے لئے اس ملک میں آگیا ہے۔ میں اس کے ذہن میں جھانک کر دیکھ لیتا ہوں مجھے اس کے منصوبوں کا علم ہو جاتا ہے۔ اس بار وہ ایک بہت ہی خطرناک آلہ کار کو اپنے ساتھ لے کر آیا ہے اور وہ آلہ کار ایک عورت ہے۔"

فریال نے تعجب سے پوچھا۔

"عورت اور خطرناک؟"

"ہاں عورت معصوم اور بے حد کمزور ہوتی ہے۔ مرد کے تابع فرمان ہوتی ہے۔ مگر جب خطرناک بن جاتی ہے تو پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ماسٹر یوشنے اس عورت کو مادام کہتا ہے۔ مادام میں سونگھنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے۔ میں پچھلے دنوں مری کے ایک کاٹیج میں لباس بدلتے وقت اپنا پرانا لباس چھوڑ گیا تھا۔ مادام نے اس لباس میں میری بو سونگھ لی ہے اس کے ذریعے وہ فضا میں میری بو سونگھتی ہوئی ماسٹر [illegible] کو بتا دیتی ہے کہ میں کس سمت میں پایا جا سکتا ہوں۔ ماسٹر یوشنے مجھے چہرے سے نہیں پہچانتا۔ لیکن مجھ تک پہنچنے کے لئے مادام ایک بہترین آلہ کار بن گئی ہے۔"

فریال میری باتیں بڑی حیرانی اور بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

"آپ جتنے عجیب و غریب ہیں اتنے ہی عجیب و غریب دشمنوں سے آپ کا سابقہ پڑ رہا ہے۔ میری جان میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں؟"

"تمہاری محبت مجھے زندگی کی کتنی ہی لطافتوں کا احساس دلا رہی ہے۔ تم میرے تھکے ہوئے ذہن کی ایک زود اثر دوا ہو اس سے زیادہ تم اور کیا کر سکتی ہو؟"

"نہیں فرہاد میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر صرف اپنے مرد کی پریشانیوں کا رونا روتی ہیں۔ مگر ان پریشانیوں کا حل تلاش نہیں کر سکتیں۔ میں اگر اپنی ذہانت کو استعمال کروں تو کیا آپ کے کام نہیں آسکتی؟ دیکھئے میں ابھی سے کوشش کرتی ہوں۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ اس دشمن سے نمٹنے کے سلسلے میں کس کمزوری کا شکار ہو گئے ہیں؟"

میں نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"مادام کی صلاحیتوں نے مجھے وقتی طور پر کمزور بنا دیا ہے پہلے میں ماسٹر یوشنے کے دوسرے آلہ کاروں کی آنکھوں میں جھانک کر یا ان کی باتیں سن کر ان کے دماغ کو چپکے چپکے اپنے کنٹرول میں لے لیتا تھا۔ پھر ماسٹر یوشنے کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر انہیں ٹھکانے لگا دیتا تھا لیکن میں مادام کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔ میں نے کئی بار ماسٹر یوشنے کی سوچ کے ذریعے مادام کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی تاکہ اس کی آنکھوں کے تاثرات مجھے اس عورت کی سوچ تک پہنچا سکیں۔ مگر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کی آنکھوں پر آئی لینس چڑھا ہوا ہے۔"

"وہ عورت ماسٹر یوشنے سے باتیں تو کرتی ہوگی؟"

فریال نے پوچھا۔

"ہاں! کسی اجنبی زبان میں باتیں کرتی ہے۔ اور اسی اجنبی زبان میں سوچتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سوا اسے کوئی دوسری زبان نہیں آتی۔"

میری بات سنتے ہی فریال سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس نے جوشیلے انداز میں کہا۔

"اگر زبان کی بات ہے تو مجھے پہلے ہی بتانا چاہیے تھا۔ میں نے دس برس تک مشرقِ بعید کی معروف زبانوں کو پڑھا ہے۔ میں نے چودہ برس کی عمر میں میٹرک پاس کیا تھا۔ اب چھبیس برس کی عمر تک میں نے چینی، جاپانی، ملائی اور تھائی زبانوں کو لکھنا پڑھنا اور بولنا سیکھا ہے میرے ڈیڈی چاہتے تھے کہ میں بہت سی زبانیں سیکھ جاؤں۔ ڈیڈی نے جو لگن مجھ میں پیدا کی وہ اب بھی قائم ہے آپ مجھے بتائیں کہ مادام کون سی زبان بولتی ہے؟ اگر اس سے ایک

بار میرا سامنا ہو جائے تو میں اس کی زبان اور اس کی گفتگو کا لہجہ آپ تک پہنچا دوں گی۔"

اب میں حیرانی سے اپنی جانِ حیات کی باتیں سن رہا تھا میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی باصلاحیت محبوبہ میرے حصّے میں آئے گی۔ ایسے ہی وقت خدا کے سامنے بے اختیار سر جھک جاتا ہے کہ وہ ربِّ کریم جدوجہد کرنے والوں کو کیسی کیسی سہولتیں فراہم کرتا رہتا ہے۔ وہی ہم انسانوں کو زندگی کی آگ میں جھونکتا ہے اور وہی پھولوں کی انجمن میں فریال جیسی رفیقہ تک پہنچا دیتا ہے۔ میں نے کہا۔

"فریال مجھے تمہاری صلاحیتوں کے متعلق جان کر اتنی خوشی حاصل ہو رہی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ واقعی تم ایسی ہو کہ تم جیسی عورت نصیب والوں کو ہی ملتی ہے۔ میں جو تم پر فخر کرتا ہوں تو یہ بے جا نہیں ہے۔ مگر میں تمہیں یہ نہیں بتا سکتا کہ مادام کون سی زبان بولتی ہے اتنا بتا سکتا ہوں کہ وہ ایک مغربی ملک سے آئی ہے اس کا ساتھی ماسٹر یوشے انگریز ہے۔ مادام کی قومیت اور اس کی زبان کا پتہ نہیں چل رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کوئی افریقی زبان بولتی ہے۔ میں مختلف زبانوں کی شناخت نہیں کر سکتا۔ اس معاملے میں کچا ہوں۔"

فریال نے مجھے حوصلہ دیا۔

"آپ مایوس نہ ہوں۔ اگر آپ کسی طرح ایک بار مادام سے میرا سامنا کرا دیں تو میں اس کی کمزوریوں کو سمجھنے کی کوشش کرونگی۔"

"میں یہ نہیں کر سکتا۔ مادام سے سامنا کرانے کا مطلب یہ ہو گا کہ ماسٹر یوشے سے بھی تمہارا سامنا ہو گا۔ وہ شیطان تمہاری سوچ کے ذریعے سمجھ لے گا کہ تم سے میرا گہرا رشتہ ہے بلکہ تم میری بہت بڑی کمزوری بن چکی ہو۔ وہ مجھے ذہنی پریشانیوں میں مبتلا کرنے کیلئے تمہیں دماغی مریضہ بنا دے گا۔ اور میں یہ کسی طرح برداشت نہیں کر سکوں گا۔ تمہیں بچانے کے سلسلہ میں کوئی غلطی کر بیٹھوں گا نہیں فریال تم اس معاملہ میں بالکل الگ رہو۔"

وہ میری بات کا جواب نہ دے سکی اسی وقت ایک سپاہی نے آکر کہا کہ انسپکٹر صاحب اسے بلا رہے ہیں۔ کیونکہ اس کی ممّی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے لے جایا جا رہا ہے۔ وہ سپاہی کے ساتھ جاتے وقت سوچ کے ذریعے کہنے لگی۔

"میں تھوڑی دیر کے لئے جا رہی ہوں یہ پوچھنا تو بھول ہی گئی کہ اس وقت آپ کہاں ہیں اور دشمنوں سے کتنی دور ہیں اب واپس آکر پوچھوں گی۔ اس وقت تک آپ کیا کریں گے؟"

"ابھی میں تمہارے دیئے ہوئے تحفے کو جیب سے نکال رہا ہوں سینٹ کی یہ شیشی کھول کر تمہارے وجود کی خوشبو کو یاد کرتا رہوں گا"

یہ کہہ کر میں نے فریال کا دیا ہوا تحفہ جیب سے نکال لیا۔ وہ بہت ہی خوبصورت سے ڈیزائن کی شیشی تھی۔ ایسی نازک سی خم کھائی ہوئی جیسے عورت کا جسم ہوتا ہے۔

کار کی محدود فضا میں شیشی کھلتے ہی ایک نہایت لطیف سی خوشبو پھیلنے لگی۔ خوشبو میں فریال کے چہکتے ہوئے بدن جیسی شدت بھی تھی اور نزاکت بھی تھی۔

میں شیشی پکڑے ہوئے تھا میرے اطراف پیار کی خوشبو بکھر رہی تھی۔ اس انوکھی خوشبو کے ساتھ میرا ذہن اس کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرنا چاہا۔ مگر وہ پولیس انسپکٹر سے باتوں میں مصروف تھی۔ میں نے ان کے درمیان مداخلت نہیں کی چُپ چاپ اس شیشی کو دیکھنے لگا جہاں سے فریال کی یادیں بکھر رہی تھیں۔

اچانک ہی مجھے پھر اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں بڑی دیر سے دشمنوں کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ وہ دونوں انٹر کان کے ڈیمی ٹاس کے ایک حصے میں بیٹھے ہوئے کسی ایسے شکار کو تلاش کر رہے تھے جو ان کے لئے مفت میں ایک کار مہیا کر سکے۔ ماسٹر یوشے سوئمنگ پول میں غوطہ لگانے اور تیرنے والی نیم عریاں عورتوں کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اس کی سوچ بتا رہی تھی کہ وہ پچھلی رات کا جاگا ہوا ہے اور نیند کو بھگانے کے لئے نیند حرام کر دینے والی جوان حسیناؤں کو دیکھ رہا ہے۔

اس نے سوئمنگ پول کی طرف سے نظریں ہٹا کر مادام سے کچھ کہا۔ اس کے جواب میں مادام ذرا سر اٹھا کر فضا میں بُو سونگھنے لگی۔ میں ماسٹر یوشے کی سوچ کے ذریعے اس عورت کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ بُو سونگھنے کے دوران وہ کچھ پریشان ہو گئی تھی۔ وہ چار بار ہر سمت سر گھما کر سونگھنے کے بعد اس نے پریشان ہو کر ماسٹر یوشے سے کچھ کہا۔ ماسٹر یوشے اپنی عادت کے مطابق اپنی زبان میں سوچ رہا تھا۔

"یہ کیا جادو ہے؟ فرہاد کہاں غائب ہو سکتا ہے؟ مادام ایک بار کسی کی بُو سونگھنے کے بعد اسے کبھی نہیں بھولتی۔ ہر انسان کے بدن کی ایک مخصوص بُو ہوتی ہے۔ کوئی بھی انسان اپنی بُو سے جُدا نہیں ہو سکتا پھر فرہاد اپنی بُو سے کیسے جُدا ہو گیا؟ اپنی اس بُو کو اس نے کہاں دفن کر دیا ہے؟"

وہ مادام سے اجنبی زبان میں پھر کچھ کہنے لگا۔ شاید اصرار کر رہا تھا کہ مادام میری بُو کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے اور میں حیرانی سے اس سینٹ کی شیشی کو دیکھ رہا تھا جو فریال کی محبت بن کر میرے ہاتھوں میں آگئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں ایک ڈھال بن کر دشمنوں کا راستہ روک رہی تھی۔

چشم زدن میں یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ یہ فریال کی پیش کی ہوئی سینٹ کی شیشی کا کمال ہے۔ اس کمال کو سمجھنے کے لئے بُو کی خاصیتوں کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ ہر انسان کی اپنی ایک مخصوص بُو ہوتی ہے۔ مگر وہ اس قدر دھیمی دھیمی اور دبی دبی سی ہوتی ہے کہ حساس جانور ہی اسے سونگھ سکتے ہیں یا ایک انسان بہت [illegible] سے دوسرے انسان کی بُو کو محسوس کرتا ہے۔ خصوصاً عورتیں اپنے مرد کی بُو کو بڑی جلدی پا لیتی ہیں اور اس بُو کی انفرادیت کو نہیں بھولتیں۔ لیکن میں نے مادام جیسی پہلی عورت دیکھی تھی جو میلوں دُور سے اپنے شکار کی بُو سونگھ لیتی تھی۔

لیکن اب وہ بھی ناکام ہو گئی تھی۔ کیونکہ میرے بدن کی جو دھیمی دھیمی سی بُو تھی اس پر ایک تیز خوشبو حاوی ہو گئی تھی جس طرح ہر بڑی طاقت چھوٹی سی طاقت کو کچل دیتی ہے یا وقتی طور پر دبا دیتی ہے اسی طرح وقتی طور پر اس خوشبو نے میری بُو کی انفرادیت کو دبا کر چاروں طرف سے چھپا دیا تھا۔ قدرت کے ایسے اٹل اصولوں کو سمجھنے کے باوجود پہلے میرے دماغ نے کام نہیں کیا تھا! مادام نے اچانک ہی اپنی حیرت انگیز صلاحیت کا مظاہرہ کر کے مجھے بدحواس کر دیا تھا [illegible] وقت سے مجھے صرف یہی فکر تھی کہ میں دشمنوں سے کس طرح زیادہ سے زیادہ دُور رہ سکتا ہوں۔ اسی فکر نے مجھے خود حفاظتی کے دوسرے پہلوؤں پر غور کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اب مجھے فریال کی محبت اور اس کی البیلی خوشبو کا سہارا مل گیا تھا۔

میں اس وقت ٹھٹھہ سے آگے جا کر رُک گیا تھا۔ اب اور آگے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کار کی محدود فضا میں بکھر جانے والی خوشبو مجھے فریال کی طرف جانے کے لئے کہہ رہی تھی۔ اب کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ میں مادام سے قریب رہ کر بھی ماسٹر یوشے سے نمٹ سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے کار کو واپس گھما لیا اور پیار کی منزل کی طرف بڑھتے ہوئے فریال کے ذہن میں جھانکنے لگا۔

وہ بار بار اپنی سوچ کے ذریعے مجھے پکار رہی تھی اور میری طرف سے جواب نہ پا کر پریشان ہو رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"سوری فریال! میں دشمنوں کی طرف متوجہ تھا اس لئے تم سے دماغی رابطہ قائم نہ کر سکا۔"

فریال نے پریشان ہو کر پوچھا "آپ خیریت سے تو ہیں؟ آپ کی طرف سے جواب نہ پا کر میرا دل گھبرا رہا تھا۔ کاش کہ میں بھی ٹیلی پیتھی جانتی اور آپ کے ذہن میں جھانک کر آپ کی خیریت معلوم کر لیتی۔"

"میری جان! میں خیریت سے ہوں اور بخیریت تمہارے پاس آ رہا ہوں۔"

"کیا سچ؟" وہ ایک دم سے مسرتوں کے ہجوم میں گھر گئی۔

"ہاں۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ وہاں پولیس والوں کا کام مکمل ہوا ہے یا نہیں؟"

"ہاں۔ وہ لوگ ممّی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے لے گئے ہیں۔ شام سے پہلے ان کی لاش واپس نہیں ملے گی۔ میں یہاں تنہا ہوں۔ میری عجیب حالت ہے۔ آپ کو [illegible] کی خوشی بھی ہے اور [illegible] سے بچھڑ جانے کا غم بھی۔ مگر آپ سر مجھے اپنی [illegible] اور حیرت انگیز صلاحیتوں سے اس طرح چونکا دیتے ہیں اور اپنی ذات سے اس طرح چپکے رہنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ ممّی کے بچھڑ جانے کا غم ہلکا پڑ جاتا ہے۔"

"تم چونکانے والی بات کر رہی ہو لیکن میں تمہیں یہ بتا دوں کہ اس بار تم نے مجھے چونکا دیا ہے۔"

"اچھا۔ وہ کیسے؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ مادام میری بُو سونگھ لیتی ہے مگر جس طرح لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اسی طرح تم نے ایک عورت ہو کر دوسری عورت کی صلاحیت کو کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ تم نے جو خوشبو تحفے کے طور پر دی تھی، اس خوشبو کے ہجوم میں میرے بدن کی بُو چھپ گئی ہے۔ اب مادام پریشان ہو کر چاروں طرف سونگھ رہی ہے اور مجھے نہیں پا رہی ہے"

"کیا واقعی؟" وہ حیرانی سے کہنے لگی "یہ کیسی عجیب سی بات ہے میں نے یہ سوچ کر وہ تحفہ نہیں دیا تھا کہ وہ آپ کے لئے ڈھال بن جائے گا۔ قدرت کے تماشے بھی عجیب ہیں۔ اب میری سمجھ میں بھی آگیا ہے، ہم خوشبو اسی لئے لگاتے ہیں تاکہ پسینے کی بُو چھپ جائے۔ اور ہماری شخصیت میں ایک نئی خوشبو پیدا ہو جائے۔ مگر میرے دماغ میں ایک بات کھٹک رہی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"جس جگہ آپ کی بُو چھپ گئی تھی کیا اسی جگہ مادام نے میری دی ہوئی خوشبو سے پتہ نہیں لگایا ہو گا کہ ٹھیک اسی سمت آپ دوسری خوشبوؤں میں نہا گئے ہیں؟"

"تم نے بہت اچھا سوال کیا ہے۔ مادام سونگھنا چاہے تو ہر طرح کی بُو کو سونگھ سکتی ہے۔ لیکن چوبیس گھنٹے میں دُنیا کی کتنی ہی عورتیں اور کتنے ہی مرد طرح طرح کی خوشبو لگاتے رہتے ہیں۔ جو خوشبو میرے بدن پر ہے وہی خوشبو نجانے دُنیا کے کتنے لوگوں کو معطّر کر رہی ہو گی لہٰذا مجھ تک پہنچنے کے لئے میری ہی مخصوص بُو کو پانا بہت ضروری ہے اور وہ بُو وقتی طور پر گُم ہو چکی ہے۔"

فریال خوشی سے نہال ہو رہی تھی۔ دشمنوں سے چھپنے کے لئے مجھے غیر متوقع طور پر ایسا سہارا مل گیا تھا کہ ہم دونوں بار بار خدا کا شکر ادا کر رہے تھے۔ فریال نے کہا۔

"اب میں سمجھ گئی آپ اسی لئے بڑے اطمینان سے میرے پاس چلے آ رہے ہیں۔ مگر یہ خوشبو کب تک آپ اپنے بدن پر چھڑکتے رہیں گے؟"

میں نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے جواب دیا "یہی میں بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں جتنی مقدار میں ابھی خوشبو لگا رکھی ہے وہ میری بُو پر کتنی دیر تک اثر انداز رہے گی یہ میں گھڑی دیکھ کر معلوم کروں گا۔ ساتھ ہی ماسٹر یوشے کے ذہن میں بھی جھانکتا رہوں گا تاکہ اس کے ذریعے پتہ چل جائے کہ مادام میری بُو کو کتنی دیر بعد پا [illegible]

"پھر تو آپ کو اُن ہی کی طرف دھیان دینا چاہیئے۔"

"ہاں۔ مگر میرا دھیان تو تمہاری ہی طرف چلا جاتا ہے۔ اب بتاؤ میں اپنے دل و دماغ کو کیسے سمجھاؤں؟"

پہلے تو وہ مسکرائی۔ پھر اچانک ہی سنجیدہ ہو کر بولی۔ "یہ سوچ کر مجھے عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا ہے کہ آپ صرف میرے لئے سوچتے ہیں اتنی مصروفیتوں اور اتنے خطرناک دشمنوں میں گھر کر رہنے کے باوجود آپ کا دھیان میری طرف لگا رہتا ہے لیکن فی الحال یہ ہم دونوں کے لئے مناسب نہیں ہے۔ آپ فوراً ہی دشمنوں کی طرف توجہ دیں۔"

"اچھی بات ہے میں تم سے تھوڑی دیر کے لئے رابطہ ختم کرتا ہوں۔"

لیکن رابطہ توڑنے سے پہلے میں ذرا دیر تک اس کی سوچ کو پڑھتا رہا۔ اس نے مجھے منع کیا تھا کہ میں اس کے متعلق نہ سوچوں لیکن یہ سوچ کر وہ خوشی سے جھوم رہی تھی کہ میں ہر لمحے اسی کے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔ میں مسکراتے ہوئے ماسٹر لوپشے کے دماغ میں جھانکنے لگا۔

وہ دونوں ابھی تک ڈیمی ٹاس کے ایک حصے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ماسٹر لوپشے مادام کی زبان میں اس سے گفتگو کر رہا تھا۔ وہ زبان تو میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ وہ دونوں کسی خاص موضوع پر بحث کر رہے ہیں۔ جب کسی کی زبان سمجھ میں نہ آتی ہو تو اس کی حرکتوں سے معلوم کرنا چاہیئے کہ وہ کس قسم کی باتیں کر رہا ہے؟ اس سلسلے میں وقت اور ماحول کو بھی مدِنظر رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ انسان وقت کے مطابق کوئی سی بھی بات سوچتا ہے۔ اس وقت میری بُو نے انہیں پریشان کیا ہوا تھا' لہٰذا میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بُو کی خاصیتوں پر بحث کر رہے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد مادام ــــ پھر ذرا سر اُٹھا کر چاروں طرف سُونگھنے لگی۔ اس کے بعد ماسٹر لوپشے کے سامنے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ خوشبو نے ابھی تک مجھے چھپا رکھا تھا۔ یہ کب تک میری بُو پر حاوی رہے گی' اسے بڑی توجہ سے سمجھنا ضروری تھا۔ میں پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ کار کے تمام شیشے چڑھا دیئے تھے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گزرنے والے ہوا کے جھونکے اس خوشبو کو کب کا اڑا کر لے جاتے۔ اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ مجھے خوشبو لگا کر زیادہ دیر کھلی فضا میں نہیں رہنا چاہیئے۔ اگر میں بند کار یا بند کمرے میں رہوں تو خوشبو دیرپا ہو گی۔

ایک گھنٹے کے بعد میں نے فریال کی سوچ میں کہا کہ میں اس کی کوٹھی کے قریب پہنچ رہا ہوں۔ ذرا سی دیر میں وہ کار کا ہارن سُنے گی۔ وہ خوشی سے اُچھل پڑی اور اپنے کمرے سے نکل کر دوڑتی ہوئی باہر آ گئی۔ میں ہارن دیتا ہوا کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوا۔ میں نے دُور ہی سے دیکھا مارے خوشی کے اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ میں کار سے اتر کر اس کی طرف بڑھا۔ وہ بھی دوڑتی ہوئی میری طرف آئی۔ میں نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے اور اسے اپنی گرفت میں سمیٹ لیا۔

"ان بازوؤں میں آ کر کتنا سکون ملتا ہے۔" وہ سوچ رہی تھی۔ "سکون اس لئے ملتا ہے کہ عورت کے لئے اس سے زیادہ اہم اور اس سے زیادہ مستحکم کوئی پناہ گاہ نہیں ہوتی۔ طویل انتظار کے بعد تو یہاں اور بھی آرام ملتا ہے۔ تشنگی مٹ سی جاتی ہے اور دل طمانیت کے احساس سے بھر جاتا ہے۔"

عورت جب اپنے مرد کے متعلق سوچتی ہے تو سوچتے وقت صرف اس کے اپنے خود غرض جذبات نہیں ہوتے۔ اگر ہوتے تو فریال صرف اپنے ہی جذبات اور احساسات میں ڈوبی رہتی مگر اس نے میری فکر میں فوراً ہی سر اُٹھا کر پوچھا۔

"دشمن کیا کر رہے ہیں؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم انہیں یاد کر رہی ہو۔ میں تو سب کچھ بھول گیا ہوں۔"

"آپ تو دیوانے ہیں مگر میں اتنے ہوش میں ہوں کہ وقت کی نزاکت کو سمجھ سکتی ہوں۔ اب آپ پہلے دشمنوں کی خبر لیں' اس کے بعد میرے قریب آئیں۔"

"اچھی بات ہے میں دشمنوں کی خبر لینے جا رہا ہوں۔"

میں شرارت سے واپس جانے کے لئے مین گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ جلدی سے دوڑتی ہوئی پھر میرے قریب آ گئی۔

"میں نے کب کہا تھا کہ آپ بہ نفسِ نفیس جائیں۔ آپ محض مجھے پریشان کر رہے ہیں۔"

میں نے اس کے دونوں بازوؤں کو اپنی گرفت میں لیکر قریب لاتے ہوئے کہا۔

"تم نے مجھے قریب آنے کے لئے منع کیا تھا لہٰذا تمہیں اس طرح قریب لانا پڑا۔"

اس نے ہنستے ہوئے میرے سینے میں مُنہ چُھپا لیا۔ اس کا چہرہ چُھپا ہوا تھا مگر اس کی ریشمی زُلفیں میرے نتھنوں کے قریب تھیں۔ میں ذرا جُھک کر ان معطر زلفوں کو چُومنے اور سُونگھنے لگا۔ سُونگھتے وقت مجھے فریال کی نصیحت یاد آئی کہ مجھے اس دوسری سُونگھنے والی کی خبر لینی چاہیئے۔

فریال بھی اپنی مثال آپ تھی۔ میں غافل ہوتا تو وہ خطرے کی بُو سُونگھ لیتی تھی۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ مجھے دشمنوں کی خبر لینا چاہیئے۔ اس وقت مادام میری بُو سونگھ رہی تھی اور شاید ماسٹر لوپشے کو بتا رہی تھی کہ میری بُو بہت قریب ہے اور اسی شہر میں ہے میں [illegible] کا بازو پکڑ کر کوٹھی کی طرف بھاگتے ہوئے کہا۔

"اندر چلو۔ وہ کُتیا میری بُو سونگھ رہی ہے۔"

فریال میرے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "وہ کُتیے کی اولاد مرتی بھی نہیں ــ ایسا کب تک ہو گا؟"

"فکر نہ کرو۔ وقتی طور پر محفوظ رہنے کا ایک سہارا مل گیا ہے۔ اب میں اطمینان سے بیٹھ کر اس سُونگھنے والی کی ناک کاٹنے کا منصوبہ بناؤں گا۔"

بیڈ روم کے دروازے پر پہنچ کر میں نے سینٹ کی شیشی نکالی۔ اور اپنے لباس پر اس کی خوشبو اچھی طرح چھڑک لی پھر بیڈ روم میں آ کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ اس وقت ماسٹر لوپشے کی سوچ بتا رہی تھی کہ مادام پھر پریشان ہو گئی ہے اور چاروں طرف سُونگھ رہی ہے۔ ماسٹر لوپشے اس سے کچھ کہتا ہوا وہاں سے اُٹھ گیا اور ڈیمی ٹاس سے باہر جانے لگا۔ یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ وہ میری تلاش میں نکل رہا ہے کیونکہ اسے دو اہم باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں اسی شہر میں ہوں۔ دوسری بات یہ کہ میں کس سمت پایا جا سکتا ہوں۔

اس وقت اُس کے اُٹھنے کا مقصد یہ تھا کہ جلد از جلد کسی گاڑی کا انتظام کرے تاکہ دوبارہ میری بُو پاتے ہی وہ فوراً ہی بُو کی سمت چل پڑے۔ یہی سوچ کر وہ سوئمنگ پول کے پاس آ گیا تھا وہاں وہ ایک ایک مرد اور ایک ایک عورت کے چہرے کو باری باری تک رہا تھا اور ان کی سوچ کے ذریعے یہ معلوم کر رہا تھا کہ کس کے پاس بہترین گاڑی ہے اور وہ بہترین گاڑی والا اس کا بہترین آلۂ کار بن سکتا ہے یا نہیں؟

میں بیڈ روم میں آ کر فوم کے ملائم بیڈ پر لیٹ گیا۔ فریال نے مادام کے متعلق پوچھا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ اپنا توازن نہ سنبھال سکی

"توبہ ہے۔ ذرا صبر نہیں کرتے۔ پہلے میری بات کا جواب دیجئے۔ مادام کیا کہہ رہی ہے؟"

"میں گم ہو چکا ہوں تمہاری ریشمی باہوں میں۔ مگر اسے علم نہیں ہے کہ یہ ریشمی باہیں کہاں پائی جا سکتی ہیں۔ اب تم یہ بتاؤ یہاں تمہارے پاس کتنی خوشبوئیں ہیں؟"

"شنیل کی ایک شیشی اور ہے۔"

"و[illegible] نوں شیشیاں زیادہ سے زیادہ چوبیس گھنٹے کام دے سکیں گی۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ خوشبوئیں خرید کر اسٹاک کر لینی چاہئیں۔"

وہ خود کو میری گرفت سے چھڑا کر پیچھے ہٹ گئی۔ پھر اُٹھتی ہوئی بولی۔ "ابھی چلئے۔ اس کام میں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔"

"میرا باہر جانا مناسب نہیں ہے کھُلی فضا میں خوشبو جلد اُڑ جاتی ہے۔"

وہ اپنی الماری کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ "ٹھیک ہے آپ کو اسی کمرے میں بند رہنا چاہیئے۔ میں جا کر لے آتی ہوں۔"

اس نے الماری کھول کر اپنا پرس نکالا اور اس میں سے کرنسی نوٹ نکال کر گننے لگی۔ اس کے پرس میں صرف پانچ سو روپے تھے۔ میں نے کہا۔

"میرے پاس وہی دو لاکھ روپے تھے جو اب پولیس والوں کی تحویل میں ہیں۔ میری جیب میں صرف سو روپے کا ایک نوٹ رہ گیا ہے۔"

اس نے کہا۔ "فی الحال پانچ سو روپے میں جتنا سینٹ ملے گا میں خرید کر لے آؤں گی' اس کے بعد دیکھا جائے گا۔"

میں جانتا تھا کہ ممی کیسی کنگال تھیں۔ فریال کے باپ نے جو بنک بیلنس چھوڑا تھا' وہ اسے جوئے میں ہار گئی تھیں اور اپنے سر پر قرض کا بوجھ لاد کر اس دُنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔ فریال کے پاس وہی آخری پانچ سو روپے تھے اور وہ میری حفاظت کے لئے اپنی آخری پُونجی بھی خرچ کر رہی تھی۔ اگر ضرورت پڑتی تو وہ میرے لئے اس کوٹھی کو بھی فروخت کر سکتی تھی۔

میں اسے بڑے پیار سے دیکھتا رہا۔ وہ الماری بند کرنے کے بعد سنگھار میز کے پاس گئی' وہاں سے شنیل کی شیشی اُٹھا کر میرے پاس لے آئی۔ پھر اسے سرہانے کی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اسے بھی احتیاطاً اپنے پاس رکھیں۔ پتہ نہیں کس وقت ضرورت پڑ جائے۔ میں ابھی دوسری خوشبو خرید کر لے آتی ہوں۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "جانے سے پہلے مجھے بھی اپنی خوشبو میں گُم کر دو۔ تاکہ میں اپنے آپ کو بھول جاؤں۔"

"جی نہیں۔ آپ خود کو گُم کر دیں گے تو دشمنوں کی خبر کون لے گا؟"

"میں نے اتنی خوشبو چھڑک لی ہے کہ تمہاری واپسی تک مادام مجھے نہیں پا سکے گی۔"

وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ جاتے وقت اس نے احتیاطاً دروازے کو بند کر دیا تھا۔ میں چند لمحوں تک خاموش پڑا اس کے پیار کی لذت کو محسوس کرتا رہا۔ ایسے احساس کے وقت آس پاس کی دُنیا بالکل یاد نہیں رہتی۔ اگر کوئی مداخلت کرے تو اُسے کچا چبا جانے کو جی چاہتا ہے۔ فی الحال میں ماسٹر لوپشے کو چبا نہیں سکتا تھا۔ اس کی طرف متوجہ ہونا ضروری تھا۔

اس نے کسی گاڑی والے کو پھانسنے کے لئے مادام کو سوئمنگ پول کے دوسری طرف بھیج دیا تھا۔ اس وقت وہ ایک نوجوان کو مخاطب کر رہی تھی۔ ماسٹر لوپشے کے ذریعے مجھے پتہ چل رہا تھا کہ وہ نوجوان مادام کی زبان نہیں

سمجھ رہا ہے۔ ماسٹر لوشے مادام کے ذریعے اس نوجوان کی سوچ کو پڑھ رہا تھا۔ وہ نوجوان مادام کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

"اس کی رنگت سانولی ہے۔ مگر بڑا زرخیز بدن ہے۔ آنکھ والے اسے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بہت کم حسینائیں ایسی ہوتی ہیں جن کا بدن خاموشی سے دیکھنے والوں کو پکارتا ہے۔ مگر پتہ نہیں یہ کس ملک سے آئی ہے۔ اس کی زبان سمجھ میں نہیں آ رہی اور یہ انگریزی بھی نہیں سمجھتی ہے۔"

ماسٹر لوشے نے اس کی سوچ میں کہا۔ "اگر یہ سانولی حسینہ مجھے مل جائے تو سب سے پہلے اسے کہاں لے جانا چاہیئے؟"

اس نوجوان کی سوچ نے کہا۔

"اور کہاں لے جاؤں گا۔ ایسی حسیناؤں کے لئے تو میں نے ایک فلیٹ لے رکھا ہے میرے پاس اپنی کار بھی ہے۔ میں اسے پورے کراچی کی سیر کراؤں گا۔ مگر اس کی تو زبان ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ اتنا پتہ چل گیا ہے کہ یہ میری شخصیت سے متاثر ہو کر میرے پاس آئی ہے۔"

اس کی سوچ کے دوران ماسٹر لوشے آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے قریب آتے ہی مادام نے اس سے کچھ کہا۔ اس کے جواب میں ماسٹر لوشے مسکراتے ہوئے اس نوجوان سے کہنے لگا

"مسٹر—— یہ ملائشیا کی رہنے والی ہے۔ سیاحت کی غرض سے یہاں آئی ہے مگر اپنی زبان کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں جانتی۔ یہ آپ سے پوچھ رہی ہے کہ آپ اس کے دوست بننا پسند کریں گے؟"

نوجوان نے خوشی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ضرور ضرور۔ میرا نام کمال احمد ہے۔ مجھے تم سے دوستی کرکے خوشی ہوگی۔"

ماسٹر لوشے کمال کی باتیں مادام کو سمجھا رہا تھا۔ کمال نے مادام سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو مادام کی مڑی ہوئی انگلیاں دیکھ کر چونک گیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ہتھیلیوں کی طرف اس طرح مڑی ہوئی تھیں کہ وہ جانور کے پنجے نظر آتے تھے۔ کمال نے حیرانی کا اظہار کیا تو ماسٹر لوشے مادام کی زبان میں اس کی حیرانی کا ترجمہ کرنے لگا پھر اس نے مادام کا جواب سنایا۔

"یہ کہتی ہے کہ بچپن میں اسے کوئی بیماری ہو گئی تھی۔ اس بیماری کے دوران یہ انگلیاں آپ ہی آپ مڑ گئی تھیں، اس کے بعد سیدھی نہ ہو سکیں۔"

پھر ماسٹر لوشے نے نوجوان کی طرف گھوم کر اور معنی خیز انداز میں ایک آنکھ دبا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"مسٹر کمال! ان انگلیوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر اس میں کوئی عیب نظر نہیں آتا۔ یہ سر سے پاؤں تک پٹاخہ ہے۔ مجھے مشرق کا سانولا حسن پسند ہے میں صاف گوئی کا عادی ہوں۔ اگر تم بھی میری طرح یہ ذوق رکھتے ہو تو اسے تفریح کے بہانے کہیں لے چلو۔ ہم دونوں کا بھلا ہوگا۔"

نوجوان نے خوش ہو کر کہا۔ "ہاں۔ اس نیک کام میں مجھے تمہاری ضرورت ہوگی۔ کیونکہ تم اس حسینہ کی زبان سمجھتے ہو۔ مگر اس سے پوچھو کہ یہ کیا چاہتی ہے؟"

ماسٹر لوشے مادام سے پوچھنے لگا۔ اور مادام اسے بتانے لگی کہ کیا چاہتی ہے۔ وہ دونوں بہت ہی عمدہ ڈرامہ پلے کر رہے تھے۔ ماسٹر لوشے نے کہا۔

"اس حسینہ کا نام سونیا ہے۔ یہ اپنی بے زبانی سے گھبرا گئی ہے۔ مجھے پا کر خوشی کا اظہار کر رہی ہے کہ میں اس کی زبان سمجھتا ہوں —— یہ تمہاری طرح مجھے بھی اپنا دوست بنانا چاہتی ہے۔ تاکہ ہم تینوں دوستوں کی طرح کہیں تفریح کے لئے جا سکیں۔"

نوجوان نے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ۔ میں اپنی کار میں تمام تفریح گاہوں کی سیر کراؤں گا۔"

ماسٹر لوشے نے مادام کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے اس نوجوان سے کہا۔

"مسٹر کمال! دانشمندی یہ ہے کہ ہم پہلے سونیا کو ایسی جگہ لے جائیں جہاں بالکل تنہائی ہو، شراب ہو اور سونیا کا شباب ہو۔ اس کے بعد دوستی اور مستحکم ہو جائے گی۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے کار کے پاس آ گئے۔ ماسٹر لوشے کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مادام سونیا کمال کو رجھانے کے لئے اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی پھر کمال نے کار اسٹارٹ کی اور اپنے فلیٹ کی طرف جانے لگا۔

میں سمجھ گیا کہ فلیٹ کی چار دیواری میں ماسٹر لوشے کو تنہائی نصیب ہوگی تو وہ کمال کے ساتھ کس طرح پیش آئے گا اور کس طرح اسے ذہنی طور پر اپنا غلام بنا لے گا۔ میں یہ تماشے بارہا دیکھ چکا تھا اور اس کے آلۂ کاروں کے ساتھ خود بھی یہ تماشے کر چکا تھا۔ لہٰذا میں نے یہ سوچ کر ان سے رابطہ ختم کر دیا کہ ماسٹر لوشے جب کمال کی گاڑی حاصل کر لے گا تو پھر میں ان کی طرف توجّہ دوں گا۔

اُن سے رابطہ ختم کرنے کے بعد میں فریال کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ وہ ایک دُکان پر پہنچ گئی تھی۔ دُکان کا مالک اس سے باتیں کر رہا تھا اور اسے سینٹ کی مختلف شیشیاں دکھا رہا تھا۔ وہ ہر سینٹ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ میں اس باتونی دُکان کے مالک کی سوچ کو پڑھنے لگا۔ اس کے دماغ میں کچھ تھا اور زبان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے فریال کے سامنے تمام غیر ملکی شیشیاں رکھی تھیں لیکن ان میں دیسی خوشبو بھری ہوئی تھی اور اتنی خوبصورتی سے ان کی پیکنگ کی گئی تھی کہ عام خریدار غیر ملکی خوشبو سمجھ کر دھوکہ کھا جاتے۔ دُکان میں اور بھی بہت سے گاہک تھے۔ وہ دُکاندار سبھی سے جھوٹ بول رہا تھا اور ان سے کئی گُنا دام وصول کر رہا تھا۔

میں نے بھی سوچ لیا کہ اس بے ایمان سے بے ایمانی کروں گا

اور اسے خوشبو کا ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ میں نے فریال کے دماغ پر دستک دی۔

"ہیلو فریال...!"

وہ ایک دم سے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی میں نے اسے سمجھایا۔ "میری جان! اس طرح چونکا نہ کرو۔ دیکھنے والے کیا سوچیں گے؟"

"اوہ سوری۔ میں کسی خوشبو کا انتخاب کرنے میں اس قدر گُم ہو گئی تھی کہ آپ کے اس طرح مخاطب کرنے کے انداز کو بھول گئی تھی۔ اب نہیں بھولوں گی۔"

"میں نے تمہیں یہ بتانے کے لئے مخاطب کیا ہے کہ دُکاندار بے ایمان ہے۔ تمہارے سامنے جتنی بدیسی شیشیاں رکھی ہوئی ہیں، ان سب میں دیسی سینٹ ہے۔"

"کیا آپ اتنی دُور سے خوشبو بھی سونگھ لیتے ہیں؟"

"نہیں جان! تم دماغی طور پر حاضر نہیں ہو ورنہ یہ سمجھ لیتیں کہ میں نے تمہارے ذریعے اس دُکاندار کی سوچ کو پڑھ لیا ہے۔ بہر حال دیسی خوشبوئیں ہی سہی، کام چلانے کے لئے وہی لے آؤ۔ مگر اس کا ایک پیسہ نہ دینا۔"

"قیمت ادا کئے بغیر میں کیسے لا سکتی ہوں؟"

"تم چپ چاپ کھڑی رہو۔ دو شیشیاں پیک کرنے کے بعد تم سے ایک پیسہ نہیں مانگے گا۔"

فریال کو یہ ہدایت دے کر میں دُکاندار کی سوچ کو گڑبڑانے لگا۔ وہ کاؤنٹر کے پیچھے بوکھلا کر سوچنے لگا۔

"میں نے کس گاہک سے پیسے لئے ہیں اور کس سے نہیں لئے ہیں؟ کسے مال دیا ہے اور کسے نہیں دیا ہے؟"

میں نے اس کی سوچ میں کہا۔

"وہ جو خوبصورت سی لڑکی کھڑی ہے، میں نے اس سے تین ہزار لئے ہیں۔ یہ سیلز مین کتنی دیر سے کھانے کے لئے گیا ہے۔ اگر وہ ہوتا تو اتنے گاہکوں کے درمیان میں اس طرح اُلجھ کر نہ گڑبڑاتا۔"

دکاندار میز کی دراز کھول کر دیکھنے لگا تاکہ اسے پیسوں کا حساب مل جائے۔ مگر وہاں دراز میں صبح سے کتنے ہی سو اور پچاس کے نوٹ پڑے ہوئے تھے۔ اگر وہ حساب کرنے بیٹھتا تو دوسرے تمام گاہک پریشان کرنے لگتے۔ اس نے سوچا۔

"اتنی جلدی آمد و خرچ کا حساب کرنا مشکل ہے۔ بہتر ہے کہ میں اس لڑکی سے ہی پوچھ لوں کہ اس نے مجھے کتنے روپے دیئے ہیں۔"

میں نے فوراً ہی فریال کو سمجھایا۔

"دیکھو فریال! میں تم سے جو کہوں، تم دُکاندار کو وہی جواب دینا۔ چہرے سے کبھی گھبراہٹ ظاہر نہ کرنا۔"

میں نے اتنا ہی سمجھایا تھا کہ دکاندار فریال کے پاس پہنچ گیا!

پھر اس نے پوچھا۔

"آپ نے مجھے کتنے روپے دیئے ہیں؟"

"تین ہزار۔" میں نے فریال کی سوچ میں کہا۔ فریال کی زبان نے بھی وہی رقم بتائی۔ اس کی سوچ مجھ سے کہہ رہی تھی۔

"غضب خدا کا۔ آپ مجھے اتنا بڑا جھوٹ بولنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ کیا یہ دُکاندار یقین کر لے گا؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی دُکاندار نے سر ہلا کر یقین کر لیا۔ کیونکہ اس کی سوچ میں پہلے ہی یہ بات آ گئی تھی کہ لڑکی نے تین ہزار دیئے ہیں۔ پوچھنے پر لڑکی نے بھی یہی رقم بتائی تھی۔ اس طرح اس بات کی تصدیق ہوئی کہ فریال اسے تین ہزار روپے ادا کر چکی ہے۔

دُکاندار سینٹ کی دو شیشیاں پیک کرتے ہوئے سوچنے لگا۔

"لڑکی بہت بھولی بھالی ہے۔ ان دو شیشیوں کی قیمت پانچ سو روپے سے زیادہ نہیں ہے۔ ان خوشبوؤں پر میں نے بدیسی لیبل لگا کر اس سے ڈھائی ہزار روپے زیادہ لئے ہیں۔"

میں نے دکاندار کی سوچ میں کہا۔ "بے چاری کتنی معصوم ہے اتنی حسین اور معصوم لڑکی کو دھوکہ دینے کا جی نہیں چاہتا۔"

اس کی سوچ نے چونک کر کہا۔

"ہائیں، یہ کیا سوچ رہا ہوں میں ؟ دھوکا نہیں دوں گا تو منافع کیسے حاصل کروں گا؟"

میں نے اس کی سوچ میں سمجھایا۔

"میں ہر شیشی پر دس گُنا منافع حاصل کرتا ہوں۔ اگر ایک لڑکی سے دھوکہ نہیں کروں گا اور ایمانداری سے پیسے لوں گا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے اپنے پانچ سو رکھ کر اسے ڈھائی ہزار روپے واپس کر دینے چاہئیں۔"

"نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ہاتھ میں آئے ہوئے ڈھائی ہزار واپس کر دوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔"

"اگر میں نے اس معصوم لڑکی کو صحیح قیمت پر مال نہیں لیا اور اس کے ڈھائی ہزار روپے واپس نہیں کئے تو میرا بہت بڑا نقصان ہوگا۔ یہ اچانک ہی میرے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں ؟ ارے میرے ہاتھ سے شیشیاں چھُوٹ رہی ہیں۔"

اچانک اس کے ہاتھ سے شیشیاں چھُوٹ کر گر پڑیں۔ وہ ان خوبصورت شیشیوں کو دو بہت ہی خوبصورت مخملی کیس میں رکھنے جا رہا تھا مگر رکھنے سے پہلے ہی وہ فرش پر گر کر ٹوٹ گئیں۔ وہ پریشان ہو کر فریال کی طرف دیکھنے لگا۔ ابھی اسے دماغ نے سمجھایا تھا کہ وہ نقصان اُٹھائے گا اور نقصان کی ابتدا ہو چکی تھی۔

دُکاندار نے بے یقینی سے سر جھٹک کر دل ہی دل میں کہا۔

"واہ، یہ بھی کوئی یقین کرنے کی بات ہے۔ یہ شیشیاں تو اتفاقاً

ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی ہیں۔ یہ لڑکی آسمان سے اُتر کر تو نہیں آئی ہے کہ اسے دھوکا دینے سے میرا نقصان ہو جائے گا؟"

اس نے فریال کے لئے دوسری دو شیشیاں اٹھائیں تو میں نے اس کے دماغ میں ہلچل مچا کر وہ شیشیاں بھی گرا دیں۔ وہاں کھڑے ہوئے سارے گاہک اُسے حیرانی سے دیکھنے لگے۔ ایک نے کہا۔

"بڑھاپے سے ہاتھ کانپ رہے ہیں، نازک سی شیشیاں اٹھائی نہیں جاتیں۔ بڑے میاں! اتنی بڑی دُکان ہے، اس کام کے لئے کوئی ملازم رکھ لو۔"

بڑے میاں اس بار واقعی گھبرا گئے تھے اور یقین کر لیا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ ایمانداری کا سودا نہ کیا تو اور زیادہ نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ اس نے آگے بڑھ کر فریال سے کہا۔

"بی بی! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم ذرا ادھر چلو۔ وہاں اپنی پسند کی شیشیاں خود ہی اُٹھا کر رکھ لینا۔"

میں نے فریال سے کہا کہ وہ بلا جھجک اس کے ساتھ چلی جائے وہ دُکان کے دوسرے حصے میں چلی گئی۔ وہاں سے دوسرے گاہک نظر نہیں آ رہے تھے۔ دُکاندار نے اپنی جیب سے تین ہزار روپے نکالتے ہوئے کہا۔

"بی بی! تم اپنے یہ پورے تین ہزار روپے رکھو اور اپنی پسند کی خوشبو بھی لے جاؤ۔ مگر خدا کے لئے یہاں سے جلدی چلی جاؤ۔ جب سے تم آئی ہو میں نقصان اُٹھا رہا ہوں۔"

میں نے فریال سے کہا کہ وہ تین ہزار لے کر رکھ لے اور سینٹ کی شیشیاں بھی لے آئے۔ وہ میری ہدایت کے مطابق عمل کرنے لگی۔ اس کے بعد میں نے رسٹ واچ کو دیکھا۔ ماسٹر لویشے اور مادام کو کمال احمد کے ساتھ گئے ہوئے آدھ گھنٹہ گزر چکا تھا میں نے ماسٹر لویشے کے ذہن میں جھانک کر دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ کمال احمد کے فلیٹ میں پہنچ گئے ہیں۔ وہاں کمال نے ان کے لئے وہسکی مہیا کی تھی اور ماسٹر لویشے اس کی دی ہوئی وہسکی کا مزہ چکھتا ہوا اُسے دوستی کا مزہ چکھا رہا تھا یعنی کمال احمد کے ذہن میں ہلچل مچانی شروع کر دی تھی۔

کمال احمد کا بُرا حال تھا۔ اسے ذرا سی سوچنے کی مہلت ملتی کہ آخر وہ ایسی اُلٹی سیدھی حرکتیں کیوں کر رہا ہے؟ مگر اس کے سمجھنے سے پہلے ہی ماسٹر لویشے اسے پھر پاگل پن پر مجبور کر دیتا تھا۔ کبھی وہ فرش پر لیٹ جاتا تھا کبھی اکڑوں بیٹھ کر مُرغے کی طرح بانگ دیتا تھا۔ کبھی مادام کے پاس بیٹھ کر اس کے پیروں کو چُومنے لگتا تھا۔

کمال اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں ایسا کر رہا ہے؟ اس کا مزاج ایسا تھا کہ وہ کسی عورت کے قدموں میں بیٹھنے کو اپنی توہین سمجھتا تھا۔ کجا یہ کہ اُن قدموں کو چُوم رہا تھا۔

وہ بے چارہ مجبور تھا۔ وہ جسمانی طور پر زندہ تھا مگر اس کا دماغ مُردہ ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ماسٹر لویشے کا دماغ آ گیا تھا جو ماسٹر کا دماغ کہہ رہا تھا اسی کے مطابق کمال احمد کا جسم حرکتیں کر رہا تھا پھر ماسٹر لویشے نے اسے ذرا ڈھیل دے دی۔ وہ فرش پر بیٹھ کر اپنا سر سہلاتے ہوئے سوچنے لگا۔

"اب تک میں کیا کر رہا تھا؟ کیا میں پاگل ہو گیا تھا؟ یہ کیسا پاگل پن تھا کہ جس عورت کو اپنے قدموں میں جُھکانا چاہتا تھا اسی کے قدموں کو چُوم رہا تھا۔ لعنت ہے مجھ پر۔"

وہ غصے سے مادام سونیا کو دیکھنے لگا۔ ماسٹر لویشے نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"مسٹر کمال! میں انسان کے دماغ پر بیٹھ کر حکومت کرتا ہوں۔ اب تک میں ہی تمہیں اس طرح ناچ نچا رہا تھا۔ بولو پھر نچاؤں؟"

کمال احمد نے گھبرا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا "تم کون ہو؟ کیا بلا ہو؟ شاید تم کالا جادُو جانتے ہو؟"

"نہیں۔ سفید جادُو جانتا ہوں جسے ٹیلی پیتھی کہتے ہیں۔"

"اوہ" کمال کا مُنہ حیرت سے کُھل گیا اور وہ سہمی ہوئی نظروں سے ماسٹر لویشے کو دیکھنے لگا۔ ماسٹر لویشے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دیکھو۔ اب تم میرے قدموں میں آؤ گے اور اپنا رومال نکال کر میرے جُوتے صاف کرو گے۔"

"نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

اس نے چیخ کر کہا تو اچانک ہی اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ پیچھے کی طرف گر پڑا۔ ماسٹر لویشے نے اس کی سوچ کی باگ ڈور سنبھال لی تھی۔ اب پھر ماسٹر لویشے کی سوچ کمال کی اپنی سوچ بن گئی تھی۔ اس سوچ کے مطابق وہ ماسٹر لویشے کے قدموں میں آ گیا تھا اور جیب سے رُومال نکال کر اس کے جُوتے صاف کر رہا تھا۔ جُوتے صاف کرنے کے دوران ماسٹر لویشے نے پھر ڈھیل دے دی تھی۔

وہ ہوش میں آتے ہی ایک دم سے اُچھل کر ماسٹر لویشے کے قدموں سے دُور ہو گیا اور بڑی حیرانی اور پریشانی سے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے رُومال کو دیکھنے لگا۔ جس سے وہ اپنا مُنہ صاف کرتا تھا اس سے ایک شیطان کے جُوتے صاف کر رہا تھا۔ اس نے غصے سے چیخ کر کہا۔

"شیطان کے بچے! یہ تم میرے ساتھ کیا کر رہے ہو؟ میں تمہیں دوست بنا کر یہاں لایا ہوں اور تم دشمنی کر رہے ہو۔ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

ماسٹر لویشے نے ہنستے ہوئے کہا "میں تم سے دشمنی نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ اپنے کمالات دکھا کر تمہیں یہ سمجھا رہا ہوں کہ تم دماغی طور پر میرے غلام بن چکے ہو۔ اب تم میرا ہر حکم مانو گے۔ بولو کیا کہتے ہو؟ غلام بن کر رہو گے یا حکم عدولی کرو گے؟"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا "تم مجھے غلام کیوں بنانا چاہتے ہو؟ کیا ارادہ ہے تمہارا؟"

"ارادہ نیک ہے۔ مجھے اس اجنبی ملک میں تمہارے جیسے ایک آلۂ کار کی ضرورت ہے۔ تم اپنی گاڑی مجھے استعمال کے لئے دو گے اور میرے لئے اس ملک کی کرنسی مہیا کرو گے۔"

"یہ کام تو میں دوست بن کر بھی کر سکتا ہوں۔"

"نہیں۔ جسے میں غلام بنا سکتا ہوں اُسے دوست نہیں بناتا۔ ویسے بھی تم دوست بن کر اپنے ملک کے خلاف یا اپنے ملک والوں کے خلاف میرا کوئی حکم نہیں مانو گے۔ اس سے پہلے کہ تم انکار کرو میں نے تمہارے سامنے چند نمونے پیش کر دیئے ہیں۔ حکم عدولی کی صورت میں میں تمہیں اس سے بھی زیادہ ذلیل کروں گا۔ ابھی تم نے سونیا کے قدموں کو چُوما ہے۔ اگر غلام بننے سے انکار کرو گے تو میں تمہیں اس کے تلوے چاٹنے پر مجبور کر دوں گا۔"

اس نے گھبرا کر انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا "نہیں نہیں، میرے دماغ سے اس طرح نہ کھیلو۔ ایک عورت کے سامنے مجھے اس قدر ذلیل نہ کرو۔ میں تمہارے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔"

"شاباش۔ اب اُٹھو اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھ کر وہسکی پیو۔ ہم بظاہر دوستوں کی طرح رہیں گے تاکہ دوسروں کو یہ شُبہ نہ ہو کہ میں تمہیں ناجائز کام کے لئے مجبور کرتا ہوں۔"

کمال احمد اپنی جگہ سے اُٹھ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوچنے لگا۔

"سُور کے بچے۔ ابھی تُو مجھے غلام بنا لے۔ مجھے موقع ملا تو میں تجھے کُتے کی موت ماروں گا۔"

بیچارہ یہ سوچتے وقت غصے کی حالت میں یہ بھول گیا تھا کہ وہ ٹیلی پیتھی جاننے والا شیطان اس کی سوچ کو پڑھ رہا ہے۔ اچانک ہی اس کے ذہن کو پھر ایک جھٹکا لگا۔ وہ کرسی سمیت پیچھے کی طرف اُلٹ گیا۔ اب وہ دماغ سے خالی ہو گیا تھا۔ اس نے ماسٹر لویشے کو کُتے کی موت مارنے کے لئے سوچا تھا لہٰذا اس کی سوچ کُتے کی طرح بھونکنے لگی۔ اسی کے مطابق وہ فرش پر ہاتھ پاؤں ٹیک کر کُتے کی طرح بھونک رہا تھا بھوں بھوں... بھوں بھوں.....

ماسٹر لویشے نے پھر اس کے ذہن کو آزاد کر دیا۔ وہ بھونکتے بھونکتے ایک دم سے خاموش ہو گیا اور اپنے آپ کو دیکھنے لگا کہ وہ فرش پر ہاتھ پاؤں ٹیک کر کیا کر رہا ہے؟ ماسٹر لویشے نے حقارت سے کہا۔

"دیکھو۔ اس وقت تم ایک کُتے ہو۔ مجھے مارنے کی بجائے تم خود ایک کُتے کی موت مرو گے۔ بیوقوف تمہیں اتنی عقل نہیں ہے کہ تمہارے دماغ کو کنٹرول کرنے والا تمہاری ایک ایک سوچ کو پڑھ سکتا ہے۔"

کمال اب پوری طرح دہشت زدہ ہو گیا تھا اور ماسٹر لویشے کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے شیطان انسان کے روپ میں اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا ہو۔ وہ فوراً ہی ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگا۔

"مجھے معاف کر دو۔ اب میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ اپنے دماغ کے اندر چھپ کر بھی تمہارے خلاف کوئی سازش نہیں کر سکوں گا۔"

"تم معافی نہ مانگو، تب بھی میں تمہیں معاف کر دوں گا کیونکہ تمہارے پاؤں میں میری سوچ کی زنجیر ہے جسے تم کبھی نہیں توڑ سکو گے۔"

ماسٹر لویشے اسے سمجھا رہا تھا کہ کمال اس کے خلاف سوچ کر کس طرح نقصان اُٹھا سکتا ہے۔ مجھے اچانک ہی سعید احمد کا خیال آیا۔ ماسٹر لویشے اُن کی طرف سے غافل تھا یعنی اُسے اطمینان تھا کہ سعید احمد نے اس کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی کی تو وہ بہت زیادہ نقصان اٹھائیں گے۔ میں نے موقع پا کر ان کے ذہن پر دستک دی۔

"ہیلو سعید صاحب! میں فرہاد بول رہا ہوں۔"

وہ ہسپتال کے ایک بستر پر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے سوچ کے ذریعے انہیں مخاطب کیا۔ پہلے تو وہ چونکے پھر خوش ہوئے کہ ایک طویل غیر حاضری کے بعد میں انہیں مخاطب کر رہا ہوں لیکن اچانک ہی ان کی خوشی معدوم ہو گئی۔ انہوں نے نفرت سے کہا۔

"ماسٹر لویشے! تم فرہاد بن کر مجھے بیوقوف بنا رہے ہو۔ میں تو مجبوراً تمہارا آلۂ کار بن چکا ہوں۔ میں تمہارے خلاف کچھ سوچ بھی نہیں سکتا اور تم فرہاد بن کر یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ میں تمہارے خلاف کوئی سازش کر سکتا ہوں یا نہیں۔"

میں نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔

"سعید صاحب! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں واقعی فرہاد بول رہا ہوں۔ یقین نہ ہو تو میں آپ کے اور ثمر کے درمیان ہونے والی پرائیویٹ گفتگو کا کچھ حصہ ثبوت کے طور پر سُنا سکتا ہوں۔"

سعید احمد نے بے بسی سے ہنستے ہوئے کہا "ماسٹر شیطان! میں یہاں زخمی حالت میں بستر پر پڑا ہوا زیادہ تر ثمر کے متعلق سوچتا ہوں اور اس کی تمام باتیں یاد کرتا رہتا ہوں۔ تم میری سوچ کو پڑھتے رہتے ہو اس لئے ہماری پرائیویٹ باتیں بھی بتا سکتے ہو۔ میں بیوقوف نہیں بن سکتا۔ تم ماسٹر لویشے ہو لہٰذا فرہاد بن کر گفتگو نہ کرو۔"

ان کی باتیں سُن کر مجھے بڑا دُکھ ہوا کہ اب میں ایک بہترین مُخلص دوست سے سوچ کے ذریعے بھی گفتگو نہیں کر سکتا۔ وہ بیماری کی حالت میں بستر پر پڑے ہوئے نجانے کیا کچھ سوچ چکے تھے۔ کوئی بھی شخص [illegible] نہیں بتا سکتا کہ وہ صبح سے شام تک ادھر اُدھر کی کتنی مختلف باتیں سوچتا رہا ہے [illegible] نہیں بتا سکتے تھے کہ انہوں نے کیا کچھ سوچا ہوگا اور ماسٹر لویشے نے کیا کچھ پڑھ لیا ہوگا۔ اگر میں ان سے ثبوت کے طور پر ان کی کوئی خاص بات بیان کرتا تو وہ یہی سمجھتے کہ ماسٹر شیطان نے وہ بات ان کی سوچ کے ذریعے پڑھ لی ہے۔

میں مجبور تھا۔ سعید احمد کو یقین نہیں دلا سکتا تھا کہ اس وقت میں ہی ان کے دماغ میں موجود ہوں۔ مجبور ہو کر میں نے سوچا چلو اچھا ہے سعید احمد کو اسی طرح محتاط رہنا چاہیئے۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ ماسٹر لویشے کو غافل سمجھ کر اس کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائیں ورنہ وہ شیطان انہیں عبرتناک سزا دینے کے لئے ثمر کو اس حد تک پاگل بنا دے گا کہ وہ اپنے کپڑے پھاڑ کر شارعِ عام پر آ جائے گی۔

مجھے یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ خود ہی سمجھ دار تھے چپ چاپ پڑے ہوئے بڑے صبر سے ماسٹر لویشے کے بھیانک انجام کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں پورا یقین تھا کہ میں [illegible] کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اور اب میں بھی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ [illegible] شیطان کو کس طرح ختم کر سکتا ہوں۔

ایک بار ماسٹر لویشے کی گہری نیند سے فائدہ اٹھا کر میں نے اس کی سوچ کو اپنے کنٹرول میں کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر میں اس کے دماغ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ پتہ نہیں سونے کے دوران اس کے دماغ کے چاروں طرف کیسی آہنی دیواریں کھڑی ہو جاتی تھیں۔ میں نے جتنی بار کوشش کی اتنی ہی بار میری سوچ کی لہریں ان نادیدہ رکاوٹوں سے ٹکرا کر واپس آ گئیں۔ مگر میں مایوس نہیں تھا سوچ رہا تھا کہ اس کی نیند سے کبھی نہ کبھی فائدہ ضرور اٹھاؤں گا۔ کیونکہ انسان کتنا ہی شیطانی دماغ کیوں نہ رکھتا ہو اور اپنی حفاظت کے لئے کتنی ہی احتیاطی تدابیر کرتا ہو وہ نیند کے وقت چاروں طرف پہرے بٹھانے کے باوجود ذاتی طور پر دشمنوں سے غافل ہو جاتا ہے لیکن وہ پچھلی رات سے جاگ رہا تھا۔ اس وقت کمال اور مادام کے سامنے بیٹھ کر وسکی پیتے وقت بھی اسے نیند آ رہی تھی۔ مگر وہ قوتِ ارادی سے جاگ رہا تھا۔ یوں کہنا چاہیئے کہ میرا خوف اسے جگا رہا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اس کے سوتے ہی میں اس کے خلاف حرکت میں آ جاؤں گا۔

میں نے بھی دل ہی دل میں کہا کہ بیٹے جاگتے رہو۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ تم کب تک نیند سے لڑتے رہو گے۔ اگرچہ میں بھی پچھلی رات سے جاگ رہا تھا لیکن میں ماسٹر لویشے کی طرح آرام طلب نہیں تھا۔ ماسٹر لویشے کو اب تک کسی نے اتنا پریشان نہیں کیا تھا اس لئے وہ شروع ہی سے وقت کے مطابق کھانے پینے آرام کرنے اور سونے کا عادی تھا۔ مجھے تو میری زندگی کانٹوں پر گھسیٹ رہی تھی اسی لئے اس سے زیادہ سخت جان تھا، ابھی ایک رات اور جاگ سکتا تھا۔

میں جاگتے ہوئے [illegible] سے اُسے دیکھ رہا تھا کہ وہ کس طرح تباہی کا سامان کر رہا ہے۔ نیند کو بھگانے کے لئے شراب پی رہا تھا۔ مگر وہی شراب اسے مدہوش بھی کر سکتی تھی۔ وہ پینے کے دوران کئی بار مادام سے کہہ چکا تھا کہ وہ میری بُو کو تلاش کرتی رہے۔ مگر وہ بار بار سونگھ کر میری عدم موجودگی کی خبر سناتی تھی۔ ماسٹر لویشے بار بار جھنجلا کر مجھے گالیاں دیتا تھا کہ میں کہاں مر گیا ہوں؟

کسی کی عدم موجودگی میں اسے گالیاں دینا، اس پر جھنجلانا اور اور اسے کچا چبا جانے کے خیال سے دانت پیس پیس کر اپنے دانتوں کو تکلیف دینا بھی ایک طرح کا پاگل پن ہوتا ہے۔ یہ بھی میری کامیابی تھی کہ میں اتنے بڑے شیطان کو پاگل بنا رہا تھا۔ فریال واپس آئی تو میں نے تھوڑی دیر [illegible] اس سے رابطہ ختم کر دیا۔

وہ اپنے ساتھ [illegible] چیزیں بھی لے کر آئی تھی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ پچھلی رات سے ہم دونوں نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ اس نے کھانے کی چیزیں میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کچھ کھا لیں، مجھے تو بھوک نہیں ہے۔“

”پچھلی رات سے ہم دونوں نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ اگر تمہیں بھوک نہیں لگ رہی ہے تو منطقی دلائل کے مطابق مجھے بھی بھوک [illegible]“

وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی پھر میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”میری ممی ہمیشہ کے لئے مجھ سے رخصت ہو گئی ہیں۔ اس دکھ میں آپ میرے لئے زندگی کی خوشیاں لے کر آئے ہیں لیکن ایک عزیز ہستی کی موت کا بھی غم ہے۔ میں آپ کے ساتھ خوشیوں میں شریک ہوں مگر اپنے غموں سے نڈھال بھی ہوں۔ جب تک یہ غموں کا غبار نہیں ڈھل جاتا۔ آپ مجھے کھانے پینے کے لئے مجبور نہ کریں۔“

”جب تم میری خوشیوں میں شریک ہو تو کیا میں تمہارے غم میں شریک نہیں ہو سکتا؟ یہ کھانا اٹھا کر رکھ دو۔“

وہ میٹھی ناراضگی سے بولی۔

”آپ تو ضد کر رہے ہیں۔“

”ضد نہیں کر رہا ہوں۔ تم خود سوچو یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ دکھ مصیبت میں انسان کھانا پینا چھوڑ دے۔ دکھوں کے وقت بھوکے رہنے کا دکھ اٹھانا کیا ضروری ہے؟“

”میرا دل نہیں چاہتا میں کیسے کھاؤں؟“

”بالکل اسی طرح تمہیں بھوکا رہتے دیکھ کر میرا بھی کھانے کو دل نہیں چاہتا۔ تم اپنے دل کی بات پر چلو میں اپنے دل کی بات پر چلتا ہوں۔“

”آپ بڑے ضدی ہیں۔“

وہ مجبوراً میرے ساتھ کھانے بیٹھ گئی۔ کھانے کے دوران اس نے کہا۔

”خوشبو آہستہ آہستہ زائل ہو رہی ہے آپ نے دوبارہ نہیں لگائی؟“

”میں چاہتا ہوں کہ مادام ایک بار پھر میری بُو کو پائے جب وہ ماسٹر لویشے کو لے کر میری طرف بڑھے گی تو میں خوشبو کو گلے لگا لوں گا۔“

یہ کہہ کہ میں نے بایاں ہاتھ فریال کی گردن میں ڈال دیا وہ جلدی سے پیچھے ہٹ کر بولی۔

”اچھا تو یہ آپ خوشبو کو گلے لگا رہے ہیں۔ آپ شرارت سے باز نہیں آئیں گے؟“

”اور تم مجھ سے اسی طرح کتراتی رہو گی۔“

”یہ بات نہیں ہے میں تو آپ کے پاس آ کر سب کچھ بھول جاتی ہوں۔ مگر آج میں اپنی ممی سے بچھڑ گئی ہوں۔ پلیز آج آپ اس [illegible] نہ چھیڑیں۔“

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ دراصل ممی جیسی جواری عورت کے مرنے کا مجھے ذرا بھی افسوس نہ تھا۔ فریال کے دل میں بھی بہت زیادہ گہرا صدمہ نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فریال کو باپ سے جو دولت ملی تھی، وہ ممی نے جوئے میں پھونک دی تھی۔ اس کے بعد وہ بڑے بڑے قرضے حاصل کرنے کے لئے بیٹی کو تاش کے پتے کی طرح استعمال کرتی تھی۔ وہ ایک ماں کا تقدس اور بے لوث ممتا کا نقش چھوڑ کر نہیں مری تھی۔ یہ تو بیٹی کی دلی محبت تھی کہ وہ اتنا بھی غم کر رہی تھی۔ فریال نے مجھے سوچتے دیکھ کر پوچھا۔

”آپ شاید میری بات سے ناراض ہو گئے ہیں؟“

”نہیں ـــ تم نے ایک معقول بات کہی ہے۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ ابھی میں تمہاری ممی کے متعلق سوچ رہا تھا بہرحال مادام کے متعلق یہ معلومات حاصل ہوئی ہیں کہ وہ ملائیشیا کی رہنے والی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ملائی زبان بولتی ہے یا پھر مشرق بعید کی کوئی دوسری زبان ہو گی۔ ایک بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ صرف ایک ہی زبان جانتی ہے۔“

مادام کے متعلق یہ باتیں سن کر فریال کی دلچسپی بڑھ گئی۔ اس نے بڑے یقین سے کہا۔

”وہ کوئی بھی زبان بولتی ہو۔ میں اس کی بولی سمجھ لوں گی۔ اگر میں اس کے قریب ہوتی تو آپ میری سوچ کے ذریعہ اس کی باتیں سمجھ لیتے۔“

”میں کبھی تمہیں اس کے قریب نہیں جانے دوں گا۔ ابھی پنڈی میں میرے ایک بہت ہی مخلص دوست سعید احمد ہیں۔ ماسٹر لویشے نے انہیں اپنا آلہ کار بنا لیا ہے اب میں ان سے سوچ کے ذریعہ رابطہ قائم کرتا ہوں تو وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ماسٹر لویشے فرہاد بن کر انہیں بیوقوف بنا رہا ہے۔ وہ ایسا سمجھنے پر مجبور ہیں۔ اگر تم بھی اس شیطان کی آلہ کار بن گئیں تو پھر اس شیطان کے مرنے تک نہ تو میں سوچ کے ذریعہ تم سے بات کر سکوں گا اور نہ ہی تمہاری صورت دیکھ سکوں گا۔ یاد رکھو اگر کبھی میری عدم موجودگی میں مادام سے سامنا ہوا تو تم فوراً ہی اس سے کترا جانا۔ اگر ایسا نہیں کرو گی تو مجھ سے ایک نامعلوم مدت تک کے لئے بچھڑ جاؤ گی۔“

”توبہ توبہ میرا کیا دماغ خراب ہوا ہے کہ میں آپ سے بچھڑ جانے کے لئے اس چڑیل کا سامنا کروں گی لعنت ہے اس پر۔ پتہ نہیں کمبخت کب مرے گی؟“

وہ اسے کوسنے لگی۔ میں مسکراتے ہوئے ماسٹر لویشے کے ذہن میں جھانکنے لگا۔ اس کے دماغ میں پہنچ کر پتہ چلا کہ اس کی نگاہوں کے سامنے فلیٹ کے در و دیوار گھوم رہے ہیں۔ نشہ اس کے دماغ پر مسلط ہو رہا تھا۔ شاید اس نے بہت زیادہ پی لی تھی اس کے باوجود وہ خود کو کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا اس کی سوچ کہہ رہی تھی

”میں پوری طرح ہوش و حواس میں ہوں۔ میں تو بہت زیادہ پینے کا عادی ہوں لیکن [illegible] کے بعد بھی نہیں بہکتا۔ پھر آج کیسے بہک سکتا ہوں؟ [illegible] محسوس ہو رہی ہے اُس اُلو کے پٹھے فرہاد نے مجھے بہت دور کر دیا ہے۔ بیٹے فرہاد کہاں ہو؟ آ جاؤ میری جان، آج تک میں نے کسی [illegible] کا بھی اتنا انتظار نہیں کیا۔ سالے کمینے کیوں میری نیند اڑا رہے ہو؟“

وہ نشے کی حالت میں بڑبڑا رہا تھا اس کے سامنے بیٹھا ہوا کمال احمد اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔

”یہ فرہاد کون ہے؟ اس کی بڑبڑاہٹ سے پتہ چل رہا ہے کہ فرہاد کوئی زبردست شیطان ہے جس نے میرے سامنے بیٹھے ہوئے شیطان کو پریشان کر رکھا ہے۔“

میں نے سوچ کے ذریعہ کمال سے کہا۔

”فرہاد شیطان نہیں ہے۔ وہ تمہارے لئے ایک فرشتہ بن کر تمہیں اس شیطان سے نجات دلا سکتا ہے۔“

وہ [illegible] دماغ میں میری سوچ کو سن کر ذرا گھبرا سا گیا اسے اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں ماسٹر لویشے اس کی سوچ میں نہ بول رہا ہو میں نے اسے سمجھایا۔

”تم غلط سوچ رہے ہو۔ تمہارے سامنے بیٹھا ہوا ماسٹر لویشے ابھی تم سے غافل ہے یقین نہ ہو تو ابھی اسے سوچ کے ذریعہ چیلنج کرو۔ اس کی طرف سے تمہیں کوئی جواب نہیں ملے گا۔“

کمال احمد سہمی ہوئی نظروں سے ماسٹر لویشے کو دیکھ رہا تھا۔ اسے چیلنج کرنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ پہلے اس نے دوستانہ انداز میں سوچ کے ذریعے اسے مخاطب کیا۔

”ماسٹر لویشے میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں اگر تم میری سوچ کو پڑھ رہے ہو تو مجھے جواب دو۔“

اسے جواب نہیں ملا۔ ماسٹر لویشے اب اپنی جگہ سے اُٹھ کر اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا کیونکہ بیٹھے بیٹھے لیٹنے کی طبیعت چاہ رہی تھی اور لیٹنے سے اس بات کا ڈر تھا کہ نیند آ جائے گی۔ اسی لئے وہ ٹہلتے ہوئے بدستور نشے کی حالت میں بڑبڑا رہا تھا جب کمال احمد کو اس کی طرف سے جواب نہ ملا تو اس نے ذرا دلیری سے کہا۔

”ابے او شیطان کے بچے ـــ تو میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہا ہے۔ کمینے ـــ بدمعاش۔“

کمال کا حوصلہ بڑھتا گیا۔ اس کے ساتھ ہی گالیاں بھی بڑھتی گئیں۔ اب وہ بڑی موٹی موٹی گالیاں دے رہا تھا۔ میں نے اس کی سوچ میں کہا۔

”اب بس بھی کرو۔ تم نے تو لڑاکا عورتوں کی طرح گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ذرا عقل سے کام لو اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے میرے مشوروں پر عمل کرو۔“

"فرہاد صاحب آپکے نام سے پتہ چلتا ہے کہ آپ میرے ملکی بھائی ہیں پھر آپ قومی زبان میں گفتگو کیوں نہیں کر رہے ہیں۔"

میں نے جواب دیا" ایک غیر ملکی دشمن کی سوچ پڑھتے پڑھتے میں دوسروں کے ساتھ بھی بے اختیار وہی زبان بولنے لگتا ہوں بہرحال اب تو تم قومی زبان میں میری باتیں سُن رہے ہو۔"

"ہاں سن رہا ہوں۔ میں تمہارا احسانمند ہوں کہ تم میری مدد کرنا چاہتے ہو۔ میں تمہاری ہر بات مانوں گا۔ بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے۔؟"

میں نے جواب دیا" ماسٹر یوشے پچھلی رات سے جاگ رہا ہے اور اپنی نیند سے لڑ رہا ہے۔ اسے کبھی نہ کبھی سونا ہی پڑیگا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ جلد از جلد سو جائے۔ کیا تمہارے فلیٹ میں ریڈیو یا ریکارڈ پلیئر نہیں ہے؟"

"دونوں ہی چیزیں ہیں۔ کیا تمہیں ان کی ضرورت ہے۔؟"

"ہاں ان میں سے ایک چیز کو وہیں استعمال کرو۔ کوئی ایسا ریکارڈ لگاؤ جس میں دھیمے سروں والا آرکسٹرا ہو۔ جسے سن کر لوری کا مزہ آ جائے۔"

"میں سمجھ گیا۔ آپ اس شیطان کو موسیقی کے ذریعے سُلانا چاہتے ہیں۔ میں ابھی ریکارڈ لگاتا ہوں۔"

وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر ریکارڈ پلیئر کی طرف جانے لگا میں نے اس سے رابطہ ختم کر کے فریال کی طرف دیکھا۔ وہ کھانے کی تمام چیزیں سمیٹ کر ایک طرف رکھنے کے بعد مجھے خاموشی سے تک رہی تھی۔ نگاہیں ملتے ہی اس نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہیں؟"

"دشمن اور کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتے ہیں۔ ماسٹر یوشے جھنجھلاہٹ کا شکار ہو گیا ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ شراب کا نشہ اسے نیم پاگل بنا رہا ہے۔ مگر وہ کمبخت بڑی زبردست قوت ارادی کا مالک ہے۔ اب بھی نیند سے لڑتا جا رہا ہے اور مجھے گالیاں دے دے کر محبت سے بلا رہا ہے۔"

فریال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"گالیاں بھی دے رہا ہے اور محبت سے بلا رہا ہے یہ کیا بات ہوئی؟"

"یہ بات خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ وہ کس طرح مجھے اپنے پاس بلائے۔ جب تک میں اس کے پاس نہیں جاؤں گا وہ سکون سے سو نہیں سکے گا۔ ذرا ٹھہرو میں دیکھ لوں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔"

میں دماغی اسکرین پر دیکھنے لگا۔ وہاں دھیمے سروں میں آرکسٹرا کی آواز سنائی دے رہی تھی کمال احمد کچھ زیادہ ہی سمجھدار تھا۔ اس نے ریکارڈ پلیئر آن کرنے کے بعد ماسٹر یوشے کے لئے ایک نیا جام تیار کر دیا تھا اور بڑے ادب سے شراب کے اس جام کو ماسٹر یوشے کے سامنے پیش کر رہا تھا۔

ماسٹر یوشے نے ارادہ کیا تھا کہ اور زیادہ نہیں پیے گا۔ مگر نگاہوں کے سامنے بھرا ہوا جام دیکھ کر ذرا تذبذب میں پڑ گیا کہ پینا چاہیئے یا نہیں؟ اسی وقت مادام سونیا نے آگے بڑھ کر بھرے ہوئے جام پر ایک ہاتھ مارا وہ فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا مادام غصے میں بڑبڑا رہی تھی اس کی حرکتوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ ماسٹر یوشے کو اور زیادہ پینے کی اجازت نہیں دے گی! اس نے ریکارڈ پلیئر کو بھی آف کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ ماسٹر یوشے سے کچھ کہہ رہی تھی کاش کہ فریال اس کی باتیں سن کر مجھے کچھ بتا سکتی۔

میں چپ چاپ ذہن کی اسکرین پر انھیں دیکھتا رہا مادام بھی مجھ سے بیزار ہو گئی تھی کیونکہ وہ بھی رہ رہ کر جھنجھلا رہی تھی۔ اس وقت وہ ماسٹر یوشے کو بستر کے قریب لے جا کر ہاتھ کے اشارے سے اسے وہاں لیٹنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ میں نے کمال احمد کے ذہن پر دستک دیتے ہوئے پوچھا۔

"کمال۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ مادام سونیا اپنے ماسٹر سے کیا کہہ رہی ہے؟"

اس نے ناگواری سے کہا۔

"پتہ نہیں کون سی بولی بول رہی ہے۔ مگر ہاتھ کے اشاروں سے بہت کچھ سمجھ میں آ جاتا ہے شاید یہ اپنے ماسٹر سے کہہ رہی ہے کہ سو جاؤ۔ وہ جاگ کر پہرہ دیتی رہے گی۔ سالی یہ کیا پہرہ دے گی۔ ماسٹر کے سوتے ہی میں اس کا گلا دبا دوں گا۔"

اس کی باتیں سُن کر میں سوچنے لگا۔

"کیا ماسٹر یوشے مادام پر اعتماد کر کے سو جائے گا۔"

اسی وقت فریال نے پوچھا۔

"مجھے بھی تو بتایئے وہاں کیا ہو رہا ہے۔"

میں اُسے بتانے لگا فریال نے گھبرا کر پوچھا۔

"آپ وہاں کمال سے سوچ کے ذریعے گفتگو کر رہے تھے اگر اسی وقت ماسٹر یوشے بھی اس کے ذہن میں جھانک کر آپ کی سوچ کو اپنی گرفت میں لے لیتا تو؟"

"ہاں اس بات کا خطرہ ہے۔ مگر یوشے نشے میں چُور رہے نشے کی حالت میں اسے صرف دو باتیں یاد رہ گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مجھے گالیاں دیتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ نیند سے لڑتا ہے۔ اب مادام اسے زبردستی سلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ ایسی سچوئیشن ہے کہ میں نے کمال سے سوچ کے ذریعہ گفتگو کرنے کا خطرہ مول لیا ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپکے لئے کیا کروں؟ میرا دل بُری طرح گھبرا رہا ہے آپ اسی طرح خطرات کو دعوت دیتے رہے تو میرا کیا بنے گا؟" پھر جلدی سے بولی۔

"سینٹ کی بُو تو بالکل ہی ختم ہو چلی ہے۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ سچ مچ خطرے کو دعوت دیتے جا رہے ہیں۔"

وہ فوراً ہی مجھ سے الگ ہو گئی پھر سرہانے کی میز پر سے سینٹ کی شیشی اٹھا کر اسے کھولنے لگی۔ میں نے کہا۔

"اب میں یہی سوچ رہا ہوں جب تک میں خطرات سے بھاگتا رہوں گا اس وقت تک یہ میرا پیچھا کرتے رہیں گے۔ میں آج دو ٹوک فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" اس نے خوشبو چھڑکنے کے بعد حیرانی سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ میں اس فلیٹ میں جاؤں گا۔ جہاں وہ دونوں موجود ہیں۔"

فریال کی سانس اوپر کی اوپر رہ گئی پہلے تو اس نے دم بخود ہو کر مجھے دیکھا پھر میرے بازوؤں کو پکڑ کر جھنجھوڑتی ہوئی بولی۔

"میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ آپ بہت غلط فیصلہ کر رہے ہیں۔"

"بالکل صحیح فیصلہ ہے۔ دیکھو فریال تم مجھے دل و جان سے چاہتی ہو۔ میری سلامتی کے لئے مجھے روک رہی ہو۔ لیکن میں بھاگتے بھاگتے تنگ آ گیا ہوں اور اب پلٹ کر انھیں بھگانا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں وہاں پہنچ کر کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"میں نہیں جانے دوں گی۔"

وہ ننھی سی بچی کی طرح پاؤں پٹخ کر ضد کرنے لگی۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"میں اپنے فیصلے کے سامنے کسی کی رکاوٹ پسند نہیں کرتا۔ تم اپنی محبت کو میرے لئے راستہ بناؤ دیوار نہ بناؤ۔"

میرے سخت لہجے سے اس کے دل کو ٹھیس پہنچی وہ ناراض ہو کر مجھ سے ذرا دور ہو گئی اور ایک کرسی پر منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"جاہل عورتوں کی طرح منہ نہ پھلاؤ۔ میری پلاننگ کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ کیا ایسے ہی وقت کے لئے تم نے عہد کیا تھا کہ میرے ساتھ سائے کی طرح رہو گی؟ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ذرا سی بات پر میرا سایہ مجھ سے الگ ہو گیا۔"

وہ اک دم سے اٹھی۔ سائے کی طرح بڑھی اور میرے سینے سے لگ گئی۔ میں نے اسے پیار سے تھپکتے ہوئے کہا۔

"میری باتیں سمجھنے کی کوشش کرو۔ ماسٹر یوشے بستر پر لیٹ گیا ہے اسے جلد ہی نیند آ جائیگی۔ وہاں صرف مادام سونیا تنہا پہرہ دیتی رہے گی۔ میں چٹکی بجا کر اسے قابو میں کر لوں گا۔ جیسے نیند کی حالت میں ماسٹر یوشے سے بھی سمجھ لوں گا۔ اس سے پہلے تمہیں میرا ایک کام کرنا ہو گا۔"

"آپ حکم دیں میں ابھی کرنے کو تیار ہوں۔"

"ٹھہرو ــــ میں ذرا کمال احمد سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کمال احمد سے رابطہ قائم کیا۔ اس وقت وہ اپنے لئے وہسکی کا ایک جام بنا رہا تھا اور ماسٹر یوشے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بستر پہ لیٹا ہوا بڑبڑانے کے انداز میں مادام سے باتیں کر رہا تھا میں نے کمال سے پوچھا۔

"تم ان دونوں کے ساتھ انٹرکان سے آئے ہو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کس نمبر کے کمرے میں ٹھہرے ہوتے ہیں۔"

"جس کمرے میں وہ ٹھہرے ہوتے تھے۔ اسے انھوں نے چھوڑ دیا ہے۔ اپنا تمام سامان لے کر یہاں فلیٹ میں آ گئے ہیں۔ وہ سامان ابھی تک میری کار کی ڈگی میں رکھا ہوا ہے۔ یہ شیطان میری گاڑی کو دن رات استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے سامان کو ڈگی میں چھوڑ دیا ہے۔"

"کار اور ڈگی کی چابی کس کے پاس ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے پاس ہے۔" کمال نے جواب دیا۔

"میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔ تمہارے فلیٹ کی جو کھڑکی باہر گلی کی طرف کھلتی ہے۔ اس کھڑکی سے کار اور ڈگی کی چابی نیچے پھینک دو یہ کام ہوشیاری سے کرنا۔ انھیں شبہ نہ ہونے پائے اور مجھے اپنے فلیٹ کا پتہ بتاؤ۔"

وہ پتہ بتانے لگا! اس جگہ کو اچھی طرح ذہن میں نقش کرنے کے بعد میں نے فریال سے کہا۔

"چلو اٹھو ہم ابھی اسی فلیٹ کی طرف جائیں گے۔"

اس نے مجھ سے بحث نہیں کی۔ چپ چاپ سینٹ کی شیشیاں اٹھا کر میرے ساتھ چلنے لگی۔ وہ ہر حال میں میری حفاظت کر رہی تھی۔ جب ہم دونوں کار میں بیٹھ کر فلیٹ کی طرف روانہ ہوئے تو میں نے اس سے کہا۔

"تم میری سلامتی کے لئے فکرمند ہو۔ اتنا یقین رکھو کہ خدا کی مرضی کے بغیر مجھ پر آنچ نہیں آئے گی۔ مگر تم ذرا بھی نادانی کرو گی تو میں پریشانیوں میں مبتلا ہو جاؤں گا۔"

"میں تو آپ کی بات مان رہی ہوں۔ اب تو آپکے فیصلے کی مخالفت نہیں کر رہی ہوں۔"

"صرف اتنا ہی نہیں۔ آئندہ بھی تم میری ایک اہم نصیحت کو یاد رکھنا اور وہ یہ کہ مجھ پر خواہ کتنی مصیبتیں ٹوٹ پڑیں خواہ میری جان پر بن آئے۔ مگر تم ماسٹر یوشے اور مادام کے سامنے نہ جانا۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ [illegible] چاہتے ہیں کہ ایسے وقت بھی میں خاموشی سے تماشہ دیکھتی رہوں!"

"ہاں اس اعتماد سے تماشا دیکھنا کہ تمہارا فرہاد آگ اور خون کے دریا سے گزر کر تمہارے پاس واپس آئے گا۔ اگر تم اپنی نادانی سے ماسٹر یوشے کے ہتھے چڑھ جاؤ گی تو تمہیں ذہنی عذاب میں مبتلا دیکھ

کر میں کمزور پڑ جاؤں گا۔ میں جتنی دور تک سوچتا ہوں، تمہاری سوچ اتنی دور تک نہیں جاسکتی۔ اس لئے تم چپ چاپ میرے مشوروں پر عمل کرتی رہنا۔"

"میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں آپ کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی۔"

فلیٹ کے قریب پہنچ کر میں نے گاڑی روک دی فریال کو انتظار کرنے کے لئے کہہ کر میں اس گلی میں داخل ہوا، جہاں اس فلیٹ کی کھڑکی کھلتی تھی۔ کمال احمد میرے لئے بڑا کارآمد ثابت ہوا۔ اس کی پھینکی ہوئی چابیاں کھڑکی کے نیچے ایک دوکان کے سامنے پڑی تھیں۔ وہ دوکان بند تھی اور گلی بالکل ویران تھی۔ میں چابیاں اٹھانے کے بعد پہلے احتیاطاً ماسٹر یوشے کے دماغ میں جھانکنے لگا۔ وہ بدستور بڑبڑا رہا تھا۔ مادام اپنی زبان میں اس سے کچھ کہہ رہی تھی اور اسے تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے مطمئن ہو کر کمال احمد کی کار کی ڈگی کھولی وہاں سے ایک سوٹ کیس اور ایک بریف کیس اٹھایا پھر ڈگی کو بند کرنے کے بعد فریال کے پاس واپس آگیا۔ میں نے اس کی کار کی ڈگی میں اُس سوٹ کیس اور بریف کیس کو رکھا پھر وہاں سے کار دوڑاتا ہوا، چابیاں بنانے والی ایک دوکان کے سامنے پہنچ گیا۔ آدھ گھنٹے کے اندر میں نے اس کے سوٹ کیس اور بریف کیس کی چابیاں بنوالیں پھر وہاں سے آگے بڑھ کر میں نے ایک پارک میں سامنے جاکر گاڑی روک دی۔ ڈگی سے اس کا سامان نکال کر کار کے اندر لے آیا۔ پہلے میں نے اس کے سُوٹ کیس کو کھول کر دیکھا۔ سوٹ کیس میں اس کے کپڑے اور کچھ اہم کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ وہ کاغذات میرے بہت کام آسکتے تھے لیکن میں نے انہیں ویسے ہی چھوڑ دیا۔ اس میں رکھی ہوئی ایک وہسکی کی بوتل اٹھائی۔ شراب کے متعلق میری معلومات محدود ہیں۔ مگر میرا اندازہ ہے کہ وہ کوئی بہت ہی اونچی کوالٹی کی وہسکی تھی۔ اسی لئے اس نے اپنے سوٹ کیس میں ایک بوتل رکھ چھوڑی تھی۔ اس میں سے کچھ پی بھی تھی اس لئے وہ بوتل مُہر بہ لب نہیں تھی۔

میں نے اس بوتل کو کھولا۔ پھر اپنی جیب سے ٹفرانیل کی ایک شیشی نکالی۔ یہ وہی شیشی تھی۔ جو فیروزہ کے پاس تھی۔ فیروزہ نے اسی دوا کو دودھ میں ملا کر ثمر کے باپ کو پلایا تھا اور اس کے باپ کے دماغ سے پچھلی تمام باتیں بھلادیں تھیں اور اسے پاگل بنا دیا تھا اب میں ماسٹر یوشے کے دماغ سے ٹیلی پیتھی کے علم کو مٹا دینا چاہتا تھا۔

وہسکی میں ٹفرانیل کی اچھی خاصی مقدار کو مل کرنے کے بعد میں نے بوتل کو اچھی طرح بند کر دیا۔ پھر جیسے وہ رکھی ہوئی تھی۔ ویسے ہی اُسے رکھ کر سوٹ کیس کو لاک کر دیا۔ اس کے بعد میں نے بریف کیس کو کھول کر دیکھا۔ اس میں بھی بہت اہم چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ جو میرے کام آسکتی تھیں لیکن میں نے انہیں بھی نہیں چھیڑا۔ وہاں رکھی ہوئی صرف ایک ٹانک کی شیشی اٹھائی اس شیشی کے لیبل کو پڑھنے کے بعد پتہ چلا کہ ماسٹر یوشے کسی عورت کی صحبت میں کمزور پڑتا ہے۔ اسی لئے وہ مردانہ قوت کو بحال رکھنے کے لئے وہ ٹانک استعمال کرتا ہے۔ میں نے اس میں بھی ٹوفرانیل کی تھوڑی سی مقدار ملا دی۔ میرا خیال تھا کہ اس کے استعمال کے بعد مردانہ قوت نہ سہی زنانہ قوت بحال ہو جائے گی۔

جب میں دوبارہ اسی گلی میں ماسٹر یوشے کا سامان لے کر واپس آیا تو ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ میں نے اس کا سامان پہلے کی طرح کمال احمد کی کار کی ڈگی میں رکھ دیا۔ اس دوران میں نے ماسٹر یوشے کی سوچ کو پڑھنے کی کوشش کی تو نہ پڑھ سکا۔ میری سوچ کی لہریں پھر نادیدہ رکاوٹوں سے ٹکرا کر واپس آگئیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سو چکا ہے اور سونے سے پہلے اپنے ذہن کو ایک مضبوط نادیدہ قلعہ میں بند کر چکا تھا۔

میں فریال کے پاس واپس آگیا وہ کار میں بیٹھی ہوئی تھی میں نے کار کی کھڑکی پر جھک کر کہا۔

"فریال ـــ میں جا رہا ہوں۔ تم کار کو آگے بڑھاؤ اور دور لے جاکر روک دو۔ میں جلد ہی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ تم ایک گھنٹے تک میرا انتظار کرنا۔ اگر میں نہ آسکا تو تم اِس طرف واپس نہ آنا۔"

فریال نے پریشان ہو کر میرے ہاتھ کو تھام لیا۔

"آپ مجھے کیسی آزمائش میں ڈال رہے ہیں۔ آپ نہیں آئیں گے تو میں ساری زندگی یہیں آپ کا انتظار کروں گی۔"

"میری جان جذباتی نہ بنو۔ اسے اچھی طرح یاد رکھو کہ میری عدم موجودگی میں وہی کرو گی جو تم سے کہہ چکا ہوں۔ وعدہ کرو فریال تم کوئی نادانی نہیں کرو گی۔"

"نہیں کروں گی۔" وہ رونے لگی۔

اس کے آنسو دیکھ کر مجھے دکھ بھی ہو رہا تھا اور اس پر پیار بھی آرہا تھا۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی تو میرے لئے رونے والی ایک ہستی ہے۔ میں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے تسلی دی۔

"تمہارے آنسو مجھے کمزور بنا دیں گے فریال ـــ کیا تم چاہتی ہو کہ میں دشمنوں کے سامنے کمزور پڑ جاؤں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور میں اسے روتا چھوڑ کر واپس گلی میں آگیا۔

جب تک میں بوجھل قدموں سے گلی میں پیدل چلتا رہا میری سوچ اس کے آنسوؤں میں بھیگتی رہی۔ فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھتے وقت بھی میں اسے روتا دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔ پہلی بار میرا دل ڈوب رہا تھا۔ اس وقت پتہ چلا کہ دل وجان سے چاہنے والی ایک عورت کی محبت مرد کو کمزور کتنا بنا دیتی ہے۔ بلکہ ذہنی طور پر بھی بیکار کر دیتی ہے۔ فلیٹ کے دروازے پر پہنچ کر ہوش آیا کہ دشمن کے دروازے پر پہنچتے وقت میں اپنی دلنواز محبوبہ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ایسے ہی وقت کہتے ہیں کہ محبت اچھے خاصے مرد کو اُلّو بنا دیتی ہے۔

میں نے بند دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر سوچ کے ذریعہ کمال احمد سے کہا۔

"میں فلیٹ کے دروازے پر پہنچ گیا ہوں اور اب دستک دینے والا ہوں۔ اگر مادام دروازہ کھولنے سے انکار کرے تو تم کسی بہانے سے دروازہ ضرور کھولنا۔ دروازہ کھلتے ہی میں اس سے نمٹ لوں گا۔"

اُسے ہدایت دینے کے بعد میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے دروازے پر دستک دی۔ دل اس لئے دھڑک رہا تھا کہ میں خطرے کے منہ پر دستک دے رہا تھا۔ فلیٹ کے اندر تھوڑی دیر تک خاموشی رہی مادام نے دروازے کے پاس آکر کمال کا راستہ روک لیا تھا اور اسے دروازہ کھولنے سے منع کر رہی تھی۔ کمال اسے اشاروں میں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ آنے والا فلیٹ کا چوکیدار ہوگا۔ وہ دروازہ کھول کر چوکیدار کو دوسرے وقت آنے کے لئے کہے گا۔

مادام راضی ہوگئی لیکن اس نے پیچھے سے کمال احمد کے سر کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لئے تاکہ کوئی خطرے کی بات ہو تو وہ فوراً کمال کو کھینچ کر دروازہ بند کرلے۔ لیکن جب کمال نے دروازے کی چٹخنی گرائی تو میں نے کمال کو کچھ پوچھنے اور مادام کو ذرا سنبھلنے کا بھی موقع نہیں دیا۔ میں نے دروازے پر ایک زور کی لات ماری۔ وہ دونوں لڑکھڑاتے ہوئے دور چلے گئے۔ میں نے اندر آکر فوراً ہی دروازے کو بند کر دیا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس ہنگامے سے ماسٹر یوشے بیدار بھی ہو جائے گا تو مجھ سے مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ وہ جسمانی طور سے کمزور تھا۔ میری سوچ کی لہروں کو گرفت میں نہیں لے سکے گا کیونکہ میری آنکھوں پر آئی لینس کا پردہ پڑا ہوا تھا اور ماسکنگ نے میرے چہرے کو بدل دیا تھا۔

میں نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہی سب سے پہلے ماسٹر یوشے کی طرف دوڑ لگائی۔ تاکہ میں اسے سوتے میں دبوچ لوں۔ مگر اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی میرے منہ پر ایک لات پڑی۔ میں اپنا توازن نہ سنبھال سکا اک دم سے الٹ کر صوفے پر گر پڑا لات مارنے والا کون تھا یا کون تھی۔؟

وہ میرے سامنے کراٹے فائٹ کے لئے پینترا بدل کر کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے ماسٹر یوشے کی طرف دیکھا تو اک دم سے گھبرا گیا کیونکہ وہ بستر پہ بیٹھا مسکرا رہا تھا اور طنزیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"بیٹے ـــ تم نے ماسٹر یوشے کو ایسا ہی چوہا سمجھا تھا کہ اتنی آسانی سے ہاتھ آجاتا۔ میں اس اجنبی زبان والی کو اسی لئے ساتھ لایا تھا کہ اس کے ساتھ جو پلاننگ کروں، وہ تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔ میں پچھلی رات سے اپنی سوچ کے ذریعہ تمہیں یہ تاثر دے رہا تھا کہ میں نیند کا کچا ہوں۔ میں کچا ہوں نہ بچہ ہوں، اپنے شیطانی ارادے کا سچا ہوں۔ میں پوری ایک بوتل پی کر بھی ہوش میں رہ سکتا ہوں صرف تمہیں بہلانے کے لئے یہ مدہوشی کا تماشا کر رہا تھا۔ ابھی سونے کا بہانہ کر کے اپنے ذہن کے چاروں طرف حفاظتی شعاعوں کی دیوار کھڑی کر دی تھی تاکہ تم میرے ذہن میں جھانکنا چاہو تو میری سوچ تک نہ پہنچ کر مطمئن ہو جاؤ کہ میں سو چکا ہوں اور تمہیں اطمینان ہو گیا تھا۔ اسی لئے بڑے اطمینان سے اس چوہے دان میں چلے آئے۔ اب آہی گئے ہو تو تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ اپنے چہرے سے نقاب اتار دو۔ آئی لینس کو الگ کر دو اور اپنی زبان کھولو تاکہ میں ایک آقا کی طرح تمہیں اپنا غلام بنالوں۔"

میں تو مرتے دم تک اس کا غلام نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس کی بات ختم ہوتے ہی میں صوفے سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ذرا محتاط ہو کر پیچھے ہٹنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی میں نے اس کے منہ پر ایک ٹھوکر ماری اسی وقت مادام کا ایک ہاتھ میری گردن پر پڑا۔ اس کی ایک ٹھوکر میرے گھٹنے پر پڑی۔ میں فرش پر گر کر لڑھکتا ہوا دور تک گیا پھر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ماسٹر یوشے نے غصے سے کہا۔

"فرہاد تم اپنی زبان نہیں کھولنا چاہتے اب دیکھو کہ سونیا تمہاری زبان کیسے کھلوائے گی۔"

اس نے سونیا کی زبان میں اس سے کچھ کہا۔ اس کی بات سنتے ہی سونیا یوگا کے اصولوں کے مطابق سانس کھینچتے ہوئے کراٹے کے ہاتھ تولنے لگی۔ یوگا کے اصولوں پر میں نے بھی سانسوں کی مشقیں کی تھیں۔ اس کے جواب میں جب میں سانسوں کو کھینچ کر کراٹے کے لئے پینترے بدلنے لگا تو وہ محتاط ہو گئی۔ پھر اچانک ہی اس نے مجھ پر حملہ کیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے کراٹے کے دو چار ہاتھ دکھائے۔ میں نے صرف اس کے ہاتھوں کو نہیں روکا بلکہ جواباً کراٹے کے بھاری ہاتھ جمائے وہ مار کھا کر ذرا پیچھے ہٹی تو میں نے گھوم گھوم کر دو عدد رولنگ کِک جمائی۔ وہ پیچھے جاکر دیوار سے ٹکرا گئی۔ میری رولنگ کِک ایسے نشانے پر بیٹھی تھی کہ اس کی ناک سے خون بہنے لگا تھا۔

تب میں نے اس شیرنی کو غراتے دیکھا۔ غصے کی شدت سے اس کی سانولی رنگت تانبے کی طرح سرخ ہو رہی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں وحشت اور جنون سے اُبلی پڑ رہی تھیں۔ اس نے "کی۔ یا" کے اصول پر للکارنے والی چیخ ماری کہ ہوشیار ہو جاؤ۔ پھر اس کا ایک ہاتھ آگے بڑھا اس ہاتھ کی مڑی ہوئی انگلیاں ایک ایک کر کے سیدھی

ہونے لگیں۔ ایک انگلی سیدھی ہوتی تھی اور شپ کی آواز کے ساتھ ایک چمکتا ہوا فولادی نوکیلا ناخن نکل آتا تھا۔ دوسری انگلی کھلتی تھی دوسرا نوکیلا ناخن نکل آتا تھا۔ میں حیرت زدہ اور دہشت زدہ ہو کر دیکھ رہا تھا وہ جنگلی درندے کی خاصیت رکھنے والی عورت اپنے چھپے ہوئے پنجے کھول رہی تھی۔

اب مجھے پتہ چلا کہ اس سانولی حسینہ کی انگلیاں کیوں مڑی رہتی تھیں۔ اور فولادی ناخن کہاں چھپے رہتے تھے۔ ان انگلیوں میں کسی میکنزم کے تحت وہ ناخن چھپاتے جاتے تھے۔ اس البیلی حسینہ کو دیکھ کر اور اس کے ملائم ہاتھوں کو تھام کر کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ گوشت پوست کی انگلیوں سے خنجر نما ناخن نکل سکتے ہیں۔ وہ دن کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ "شپ شپ" جیسے بجلی کوندتی ہو ویسے ہی ناخن نکل نکل کر چمک رہے تھے۔ "شپ شپ" جیسے تلواریں میان سے نکل رہی ہوں۔ مجھے پسینہ آنے لگا۔

اگر ایک خنجر نما یا دو ہوتے تو میں کسی نہ کسی طرح اپنا بچاؤ کر لیتا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ دس ناخن بن چکی تھی۔ میں پہنچا ہو کر اس کے جسم کو روکتا تو اس کے ناخن کہیں نہ کہیں ضرور کھب جاتے۔ آخر میں نے اپنی صلاحیتوں کو آخری بار آزمانے کے لئے اس کو شعلہ بار نگاہوں سے دیکھا۔ میری آنکھوں کی وہ جیسی شخصی مضبوط قوت ارادی دیکھنے والوں کو کسی حد تک کھینچ لیتی تھی۔ مگر میری آنکھوں پر آئی لینس کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے باوجود میری آنکھوں نے فریال کو پہلی ملاقات میں متاثر کیا تھا مگر یہی آنکھیں پوری قوت سے مادام سونیا پر اثر انداز نہ ہو سکیں وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک گئی یعنی ذرا سا متاثر ہوئی تھی پھر اچانک ہی اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ وہ حملہ کرنے کی جھونک میں آگے بڑھتی چلی گئی۔ اسکے دونوں ہاتھوں کے دس ناخن صوفے میں جا کر پیوست ہو گئے۔ جب وہ باہر نکلے تو صوفے کے ایک حصے کی دھجیاں اڑ چکی تھیں۔

اس کے پلٹنے سے پہلے ہی میں نے اس کی کمر پر ایک لات ماری وہ چیخ مار کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ میں نے دوسری طرف گھوم کر اس کی ران پر ایک زبردست کک ماری۔ وہ مار کھا کر غراتی ہوئی پلٹ گئی۔ پلٹتے ہی دایاں پنجہ مارا میں اچھل کر پیچھے گیا اور دیوار سے ٹکرا گیا پھرتی سے پیچھے ہٹنے کے باوجود اس کے فولادی ناخن میرے شانے تک پہنچ گئے تھے اور کچھ گوشت کچھ خون اور قمیض کا کچھ حصہ نوچ کر لے گئے تھے۔

میرے شانے میں ایسی جلن ہو رہی تھی جیسے انگارے بھر دیئے گئے ہوں وہ مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے فولادی ناخن میرے چہرے پر آئے۔ پتہ نہیں وہ میرے چہرے سے کتنا گوشت نوچ کر لے جاتی۔ پتہ نہیں میں کس طرح بچ گیا میرے دماغ نے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا تھا۔ میں نے فوراً ہی فرش پر گھٹنے ٹیک دیئے۔ اس کے پانچ فولادی ناخن سیدھے اس دیوار پر آئے جہاں میرا چہرہ تھا۔ اب وہاں چہرہ نہیں تھا اس لئے وہ دیوار کا پلاسٹر اکھاڑ کر لے گئے۔

اسی وقت میں نے اپنے سر سے اس کے پیٹ میں ٹکر ماری وہ پیٹ پکڑ کر کراہتی ہوئی پیچھے ہٹنے لگی۔ میں نے ایک گھونسہ اس کی ناک پر رسید کیا۔ وہ اک دم سے چکراتی ہوئی صوفے کے قریب فرش پر اوندھے منہ گر پڑی۔ میں نے اس پر چھلانگ لگائی۔ اور پھر آ کر اس کی پشت پر اپنے گھٹنے سے دباؤ ڈالا۔ پھر اس کی دونوں کلائیاں اپنی گرفت میں لے لیں۔ اب اس کے تمام فولادی ناخن میری گرفت میں تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ جدوجہد کرے گی لیکن وہ فرش پر پڑی تڑپ رہی تھی۔ میرا وہ گھونسہ اتنا زبردست تھا کہ اس کی ناک سے اور منہ سے خون ابلنے لگا تھا اور اس کا چہرہ اس کے ہی لہو میں بھیگ رہا تھا۔

بس یہی موقع تھا میں اس پنجے والی کی کلائیاں توڑ کر اس کے فولادی ناخنوں کو ہمیشہ کے لئے بیکار کر سکتا تھا۔ مگر نہ کر سکا۔ اسی وقت میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ ان فولادی ناخنوں نے مجھے اس طرح الجھا دیا تھا کہ میں اپنی حفاظت کرنے کے دوران ماسٹر پوشے کو بھول گیا تھا۔ اس نے پیچھے سے آ کر پیتل کے گلدان سے میرے سر پر ضرب لگائی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اک دم سے اندھیرا چھا گیا۔ سونیا کی کلائیاں میری گرفت سے نکل گئیں۔ میں چکرانے کے باوجود ماسٹر پوشے کی طرف غرا کر پلٹ گیا۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی اس پر ایک اندھی چھلانگ لگائی۔ مگر منہ کے بل فرش پر گر پڑا۔ دوبارہ اٹھنے سے پہلے ہی پھر میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ یہاں میری قوتِ مدافعت جواب دے گئی۔ میں بے دم ہو کر فرش پر چاروں شانے چت ہو گیا ڈوبتے ہوئے ذہن سے میں نے اتنا ہی محسوس کیا کہ میرے چہرے سے ماسک نوچا جا رہا ہے۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات
دوسرے حصے میں
ملاحظہ فرمائیں جو کہ اس حصے کے ساتھ ہی شائع ہو چکا ہے